بسم اللہ الرحمن الرحیم
اردو ترجمہ
مدارج النبوت
تصنیف
حضرت علامہ شیخ محمد عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ
ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاہور ۔ کراچی ۔ پاکستان

اُردو ترجمہ

مدارج النّبوّت

جلد اوّل

○

تصنیف

حضرت علاّمہ شیخ مُحمّد عبدالحق محدّث دہلوی رحمۃُ اللہ علیہ

ترجمہ و ترتیب

الحاج مُفتی غلام معینُ الدّین نعیمی

○

ضیاءُ القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی ○ پاکستان

نام کتاب	مدارج النبوۃ (جلد اول)
مصنف	علامہ شیخ محمد عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ
ترجمہ وترتیب	الحاج مفتی غلام معین الدین نعیمی
تاریخ اشاعت	اگست 2005ء
تعداد	ایک ہزار
ناشر	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
کمپیوٹر کوڈ	1Z48
قیمت	[illegible] روپے کامل سیٹ

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ فون: 7221953 فیکس:۔ 042-7238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: 7225085-7247350

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون: 021-221201-2630411۔ فیکس:۔ 021-2210212

e-mail:- sales@zia-ul-quran.com

zquran@brain.net.pk

Visit our website:- www.zia-ul-quran.com

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شیخ المحققین سید العلماء المدققین حضرت علامہ محمد عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کا

مختصرہ تذکرہ

حضرت شیخ محقق رحمتہ اللہ علیہ کا اسم گرامی محمد عبدالحق بن سیف الدین بن سعد اللہ ترک دہلوی بخاری ہے۔ آپ کی کنیت ابوالمجد تھی۔ آپ کے آباء واجداد، اصل میں بخارا کے رہنے والے تھے۔ جو دہلی میں آکر سکونت پذیر ہوئے اور آپ شہر دہلی میں 958ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے زمانے کے فقیہ، محقق، محدث، مدقق، بقیۃ السلف، حجۃ الخلف، مورخ اضبط، فخر مسلمانان بر صغیر (پاک وہند) اور جامع علوم ظاہری وباطنی تھے۔

آپ ہی وہ شیخ الکامل ہیں جنہوں نے عرب سے علم حدیث لاکر بر صغیر (پاک وہند) کو مالا مال کیا اور نور مصطفوی ﷺ سے جہان بھر کو منور فرمایا۔ اور اپنی تصنیفات جلیلہ ورفیعہ سے فن حدیث کو تمام ممالک ہند وپاکستان کے خطہ خطہ میں پھیلایا۔ آپ کے فن حدیث میں آپ کی تصانیف وتنقیدات سے کسی موافق ومخالف کو اصلاً شک وشبہہ نہیں ہو سکتا۔ ان سے ہمیں سروکار نہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے چشم بینا سے بے بہرہ کر دیا ہے یا آنکھوں میں تعصب کی پٹی باندھ رکھی ہے۔ **نعوذ باللہ من ذالک**

آپ نے بائیس سال کی عمر میں اکثر وبیشتر علوم دینیہ، عقلیہ ونقلیہ سے فراغت حاصل کر کے اور حفظ قرآن کر کے مسند افادت پر تمکن واجلاس فرمایا اور عین عالم شباب میں جذبہ الٰہی نے ایسا سرشار کیا کہ دفعتاً یار ودیار سے دل اٹھا کر حرمین شریفین کو متوجہ ہو گئے اور عرصہ دراز تک وہاں قیام فرما کر وہاں کے اولیائے کبار اور اقطاب زمانہ خصوصاً شیخ عبدالوہاب متقی، خلیفہ شیخ علی متقی کی صحبت اختیار کر کے فن حدیث کی تکمیل کی اور مع برکات فراواں وطن مالوف (دہلی) مراجعت فرمائی اور باون سال کی عمر میں ظاہر وباطن کی جمعیت سے تمکنت حاصل کر کے تکمیل فرزندان وطالبان میں مصروف ہوئے۔ اخبار الاخیار مطبع مجتبائی دہلی 1309ھ صفحہ 289 کے خاتمہ میں شیخ نے اپنا حال اس طرح لکھا ہے کہ۔

"میں تین سال کا بچہ تھا کہ والد ماجد نے اہل حقیقت کی باتیں اس فقیر کے کام جان میں ڈالیں اور تربیت باطنی کو ضمیمہ شفقت ظاہری فرمایا۔ ان میں سے کچھ باتیں جو اس وقت میرے گوش ہوش میں ڈالی گئی تھیں۔ اب تک خزانہ خیال میں یاد ہیں۔ جو ندرت وغرابت سے خالی نہیں ہیں۔ اور عجیب تر بات یہ ہے کہ جس وقت میرا دودھ چھڑایا گیا تھا اور میری عمر اس وقت دو اڑھائی سال کی تھی۔ اس وقت کی بات ایسی یاد ہے کہ گویا کل کی بات ہے۔ والد ماجد قرآن مجید، سبق سبق لکھتے تھے اور میں پڑھا کرتا تھا، یہاں تک کہ دو تین مہینے میں تمام قرآن کریم میں نے پڑھ لیا۔ اور ایک ماہ میں کتابت کی قدرت اور انشاء کا سلیقہ حاصل ہو گیا۔ اور نظم واشعار کی کتابوں سے بھی میں نے چیدہ چیدہ ہدایت وارشاد کو مطالعہ کیا۔ بارہ سال کا تھا کہ شرح شمسیہ اور شرح عقائد پڑھتا تھا اور پندرہویں سال میں مختصر اور مطول ختم کی۔ بعد ازاں حفظ قرآن پاک کیا۔ اور اسی قیاس پر باقی کتابوں پر عبور حاصل کیا۔ سات آٹھ سال تک فقہاء ماوراء النہر کے درس میں رہا۔ وہ فرمایا کرتے تھے "ہم نے تجھ سے فائدہ اٹھایا ہے ہمارا تم پر کوئی احسان نہیں ہے۔" بچپنے سے ہی میں نہیں جانتا تھا کہ کھیل کیا ہوتا ہے۔ اور خواب وآرام کیا چیز ہے۔ تحصیل علم کے شوق میں، کبھی وقت پر کھانا کھایا نہ وقت

پر سویا۔ موسم گرما ہو یا سرما دو میل کی مسافت طے کر کے دہلی میں روزانہ مدرسہ جایا کرتا تھا۔ اور چراغ کی روشنی میں روزانہ ایک جزو لکھا کرتا تھا۔ باوجود تقسیم اوقات کے، میں مطالعہ کتب و ابحاث میں مصروف رہتا اور علم حاضر کے مطابق ان پر حواشی و شروح کو قید کتابت میں لاتا جس طرح کہ مقولہ ہے کہ "العلم صيد، والكتابته قيد، تعليم التعليم۔"

مطالعہ کتب وغیرہ کے انہماک میں کئی مرتبہ میری دستار اور بالوں میں چراغ سے آگ لگی اور مجھے اس وقت پتہ چلتا جب کہ حرارت دماغ کو محسوس ہوتی۔ اس کے باوجود بچپنے ہی سے درود و سلام، اور اوراد و وظائف، شب خیزی اور مناجات میں اس قدر عملی جہد و سعی رہتی تھی کہ لوگ حیران تھے۔ اب تک تعلیم و استفادہ کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہوں اور حضور و جمعیت میرے اختلاط پر موقوف نہیں۔ اور زید و عمر کے ذکر سے بھی جو نحوی ترکیبوں میں مذکور ہوتا ہے ملال ہے۔ اور بموجب والد ماجد کی نصیحت وصیت کے کہ "خبر دار خشک ملانہ بننا۔" ہمیشہ عشق و محبت رسول ﷺ میں سرشار رہنا۔ یہاں تک کہ حق تبارک و تعالیٰ اپنی طرف بلائے اور اپنے گھر کی طرف لے جائے۔ اور جو کچھ حضور اکرم ﷺ کی بشارت سے انعام پایا ہے بیان نہیں کر سکتا۔ انتہی۔

یہ بھی واضح کر دینا مناسب ہے کہ آپ کے والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ جن کا اسم گرامی سیف الدین تخلص سیفی تھا وہ ہندوستان کے اجل افاضل اور اکابر علماء کرام میں سے تھے جو سلامت سخن اور درشگی زبان میں ممتاز تھے۔ حضرت شیخ محقق رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ والد ماجد کا سر سے ظاہری سایہ اٹھ جانا، حضرت امیر خسرو علیہ الرحمتہ کے اس مرثیہ کے مطابق تھا جو انہوں نے اپنے والد ماجد کے انتقال کے وقت فرمایا تھا ؎

سیف از سرم گذشت و دل من دو نیم ماندہ   دریائے رواں شد و در یتیم ماندہ

آپ کی تصانیف و تالیفات کے بہت سے رسالے طریقہ تصوف، توحید اور اشعار میں تھے۔ حضرت شیخ محقق شاہ محمد عبد الحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کی تالیفات و تصنیفات صغیر و کبیر کی سو جلدیں ہیں اور حسب شمار ابیات کے پانچ لاکھ تک پہنچتی ہیں۔ آپ کی مشہور تصانیف یہ ہیں۔

(۱) لمعات التنقیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح، اسی ہزار ابیات کے قریب ہیں۔ اور عربی زبان میں ہے۔ یہ کتاب ابھی تک نہیں چھپی ہے قلمی نسخے، بانکی پور، رامپور، حیدر آباد دکن، دہلی اور علی گڈھ میں موجود ہیں۔

(۲) اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ۔ یہ فارسی زبان میں ہے۔ افسوس ہے کہ بعض حضرات دونوں کتابوں میں فرق نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ ایک ہی کتاب ہے حالانکہ لمعات التنقیح ابھی تک چھپی ہی نہیں۔ صرف قلمی نسخے پائے جاتے ہیں۔

(۳) شرح سفر السعادۃ یا طریق القویم فی شرح صراط مستقیم یا طریق الافادہ فی شرح السعادہ۔

(۴) اخبار الاخیار (۵) جذب القلوب الیٰ دیار المحبوب (۶) جامع البرکات (۷) مرج البحرین فی جمع بین الطریقین در جمع بیان شریعت و طریقت (۸) زبدۃ الآثار منتخب بہجۃ الاسرار۔ در مناقب غوث اعظم رضی اللہ عنہ (۹) زاد المتقین (۱۰) فتح المنان فی مناقب النعمان (۱۱) تحصیل التعرف فی معرفۃ الفقہ والتصوف (۱۲) توصیل المرید الی المراد، بیان الاحکام والاضراب والاوراد (۱۳) شرح فتوح الغیب (۱۴) تکمیل الایمان و تقویت الایقان (۱۵) ماثبت من السنتہ فی ایام السنتہ۔ عربی زبان میں ہے۔ (۱۶) مدارج النبوۃ و مراتب الفتوۃ۔ فارسی میں ہے جس کا ترجمہ یہ مترجم غفرلہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے بایمائے حضرت مولانا محمد اطہر صاحب نعیمی مدظلہ شائع فرما رہے ہیں۔

حضرت شیخ محقق رحمۃ اللہ علیہ کی تالیفات اور تصنیفات کی تفصیل، "حدائق الحنفیہ" اور التالیف قلب الانیف بکتابۃ فہرس التوالیف میں ملاحظہ فرمائیں۔ شیخ محقق کی تصنیفات پاکستان اور ہندوستان وغیرہ میں مقبول خاص وعام ہیں۔ اور شہرت تمام رکھتی ہیں اور تمام مفید و محققانہ ہیں۔ آپ نے حضور اکرم سید عالم ﷺ کی نعت میں ایک قصیدہ ساٹھ ابیات کا لکھا ہے اور مدینہ منورہ پہنچ کر حضور ﷺ کے حضور میں ان کو پڑھا جس کا پہلا بیت یہ ہے ؎

بیا اے دل دے از ہستی خود، ترک دعوی کن　　　　میفگن چشم بر صورت نظر در عین مفتی کن

آپ کی ولادت کی تاریخ "شیخ اولیاء" 958ھ مطابق 1551ء اور تاریخ رحلت "فخر العلماء" 1052ھ اور "فخر العالم" 1052ھ ہے۔ آپ کا مقبرہ، حضرت قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہرولی واقع دہلی میں حوض شمسی کے کنارہ پر واقع ہے۔ (اب ہنود کی عمل داری میں خدا معلوم کس حال میں سے ہے)

اولاد:۔ آپ کے ایک صاحبزادے حضرت مولانا نور الحق رحمۃ اللہ علیہ بڑے فقیہہ، محدث، جامع کمالات صوری و معنوی، اور فاضل متبحر اور عالم ماہر تھے جو اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ و مرید، خلف السعید اور یگانہ روزگار تھے۔ چونکہ صاحب قران، شاہجہاں ایام شہزادگی سے آپ کے جوہر استعداد عالی سے اطلاع رکھتے تھے۔ جب وہ دکن جانے لگے تو آپ کو اکبر آباد کا قاضی مقرر کر گئے۔ چنانچہ آپ نے ایک مدت تک منصب قضاء کو باحسن وخوبی ادا کیا۔ آپ نے تصانیف بھی بہت فرمائیں جس طرح کہ آپ کے والد رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ و تشریح مشکوۃ میں دست احسان دراز فرمایا، اسی طرح آپ نے ترجمہ فارسی، صحیح میں صلائے فیض عام دے کر تیسیر القاری فی شرح البخاری اور نیز شرح مسلم تصنیف فرمائی اور نوے سال کی عمر میں 1073ھ میں دہلی میں وفات پائی "شیخ الاسلام" 1073ھ مادۂ تاریخ ہے (حدائق حنفیہ)

اللہ تعالیٰ آپ کے فیوض وبرکات سے طابع وناشر مترجم اور تمام مسلمانوں کو مالا مال فرمائے اور صراط مستقیم پر قائم ودائم رکھے۔ **آمین و تعالیٰ صلی اللہ علی خیر خلقہ محمد و علی آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین وبارک و سلم آمین۔**

فقیر پر تقصیر
غلام معین الدین النعیمی غفرلہ المراد آبادی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

ھو الاول والآخر والظاھر والباطن وھو بکل شیء علیم (وہی ذات اول و آخر اور ظاہر و باطن ہے اور وہی ہر شے کا جاننے والا ہے) یہ کلمات اعجاز اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں حمد و ثنا پر بھی مشتمل ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنی کبریائی کے ذکر و بیان کے خطبہ میں ارشاد فرمایا اور حضور اکرم سید عالم ﷺ کی نعت و صفت کو بھی شامل ہیں کیونکہ سبحانہ و تعالیٰ نے ان اسماء و صفات کے ساتھ آپ کی توصیف فرمائی باوجودیکہ یہ اسماء منجملہ اسماء حسنیٰ بھی ہیں۔ اور وحی متلو (جس کی تلاوت کی جاتی ہے جو کہ بواسطہ جبریل علیہ السلام خدا کا ارشاد ہوتا ہے) اور وحی غیر متلو (جس کی تلاوت نہ کی جائے جو بغیر کسی واسطہ کے القاء، خواب اور براہ راست کلام الٰہی کا نزول ہو) ان دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کا نام نامی اسم گرامی قرار دے کر آپ کے حلیہ مبارک، حسن و جمال اور کمال و خصال کا آئینہ دار بنایا۔ اگرچہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء صفات سے متخلق و متصف ہیں اس کے باوجود خصوصیت کے ساتھ ان میں سے کچھ صفات کو نامزد کر کے گنایا۔ مثلاً نور، علیم، حکیم، مومن، مہیمن، ولی، ہادی، رؤف اور رحیم وغیرہ اور یہ چاروں مذکورہ اسماء صفات یعنی اول، آخر، ظاہر، باطن بھی انہیں قبیل سے ہیں۔

حضور کی شان اولیت:۔ اب رہا یہ امر کہ حضور اکرم ﷺ کا اسم صفت "اول" کیسے ہے؟ تو یہ اولیت اسی بنا پر ہے کہ آپ کی تخلیق موجودات میں سب سے اول ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے

۱۔ اول ماخلق اللہ نوری اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے میرے نور کو وجود بخشا۔

۲۔ یہ کہ آپ مرتبہ نبوت میں بھی اول ہیں چنانچہ حدیث پاک میں ہے کنت نبیا وان آدم لمنجدل فی طینتہ (میں اس وقت بھی نبی تھا جب کہ آدم علیہ السلام اپنے خمیر میں ہی تھے۔

۳۔ یہ کہ آپ ہی روز میثاق سارے جہان سے پہلے جواب دینے والے تھے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا الست بربکم (کیا میں تمہارا رب نہیں؟) قالوا بلی (سب نے کہا ہاں)

۴۔ یہ کہ آپ ہی سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں چنانچہ فرمایا۔ واول آمن باللہ وبذلک امرت وانا اول المومنین (اللہ پر جو سب سے پہلے ایمان لائے۔ اور مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے۔ اور میں سب سے پہلا مومن ہوں۔

۵۔ یہ کہ جب زمین شق ہوگی اور لوگ اس سے نکلیں گے تو میرے لئے سب سے پہلے زمین شق ہوگی۔

۶۔ یہ کہ (روز قیامت) سب سے پہلے میں ہی سجدہ کرنے کی اجازت چاہوں گا۔

۷۔ یہ کہ باب شفاعت سب سے پہلے میرے لئے ہی کھلے گا۔

۸۔ یہ کہ سب سے پہلے میں ہی جنت میں داخل ہوں گا۔

شان آخر:۔ اس سبقت و اولیت کے باوجود بعثت و رسالت میں آپ آخر ہیں چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

۱۔ ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین (لیکن آپ اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں)

۲۔ یہ کہ کتابوں میں آپ کی کتاب قرآن کریم آخری اور دینوں میں آپ کا دین آخری ہے چنانچہ فرمایا۔

نحن الاخرون السابقون تمام سبقتوں کے باوجود بعثت میں ہم آخری ہیں۔

کیونکہ بعثت میں یہ آخریت و خاتمیت اور فضیلت میں اولیت و سابقیت کا موجب ہے۔ اس لئے کہ آپ ہی گذشتہ تمام کتابوں اور دینوں کے ماحی اور ناسخ ہیں۔

شان ظاہر و باطن: ۔اب رہا آپ کا ظاہر و باطن ہونا آپ ہی کے انوار نے پورے آفاق کو گھیر رکھا ہے جس سے سارا جہاں روشن ہے۔ کسی کا ظہور آپ کے ظہور کی مانند اور کسی کا نور آپ کے نور کے ہم پلہ نہیں۔ اور باطن سے مراد آپ کے وہ اسرار ہیں جن کی حقیقت کا ادراک ناممکن ہے اور قریب اور بعید کے لوگ آپ کے جمال اور کمال میں کھو کر رہ گئے۔

ہر شئی کے جاننے والے: ۔وھو بکل شیء علیم (وہی ہر شے کا جاننے والا ہے) کا ارشاد بلاشبہ حضور اکرم ﷺ ہی کے لئے ہے کیونکہ فوق کل ذی علم علیم (ہر صاحب علم کے اوپر اور زیادہ جاننے والا ہے) کی صفات آپ ہی میں موجود ہیں۔

علیه من الصلوات افضلها ومن التحیات اتمها واکملها۔

امابعد: ۔بعد حمد وصلوٰۃ کے بندۂ مسکین (حضرت شیخ محقق شاہ) محمد عبدالحق (محدث) بن سیف الدین دہلوی قادری "وفقه الله لما یحب و یرضاه وجعل اخراه خیر من اولاه" اس کتاب کے جمع و تالیف کے اسباب میں کہتا ہے کہ یہ کتاب جس کا نام "مدارج النبوۃ ودرجات الفتوۃ" ہے عرصہ سے میری روح اور دل وفور شوق اور ایمانی ذوق اس کی خواہش کر رہے تھے کہ سیر مصطفوی ﷺ اور شرح احادیث نبوی ﷺ میں کوئی کتاب ہونی چاہئے جس کی اس بندہ نے حق خدمت ادا کر کے غلامی کی ہے۔ اور اس کی تکمیل و تتمیم کی طرف مشغول ہونا چاہئے۔ ادھر فرزند عزیز نور نظر چشم بصر (مولانا) نور الحق "خصه الله تعالیٰ عزوجل بغیته المطلق" کا تاکید و اصرار بڑھتا رہا مگر چونکہ ہنوز امر الٰہی مساعد نہ ہوا تھا یعنی توفیق رب شامل حال نہ ہوئی تھی۔ اس بنا پر شاہد مقصود کے جلوۂ جمال، توقف میں تھا اور جب اس دور میں فساد کی بنا پر اس زمانہ کے کچھ مغرور درویشوں کے مزاج میں انحراف و روگردانی نے راہ پکڑلی اور صلاحیتوں کے آبگینے میں تیرگی نمودار ہوئی اور حضور اقدس ﷺ کے بلند و ارفع مقام کے سمجھنے میں تنگی و کوتاہی ہونے لگی۔ اور آپ کی شان و مرتبت کے علم و معرفت میں انہیں دشواری لاحق ہونے لگی اور حق اعتقاد کی ادائیگی میں ان سے کمی و قصور سرزد ہونے لگا اور وہ جادۂ دین قویم اور صراط مستقیم سے دور ہونے لگے تو ایسے مسلمانوں کے لئے حق نصیحت ادا کرنا لازم ہو گیا۔ حالانکہ سرور انبیاء ﷺ کے احوال و صفات قدسیہ کا بیان کوئی کیا کر سکتا ہے تاہم بے خبروں کو حقیقت حال سے روشناس کرانا، غافلوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنا، طالبان راہ حق کو راہ پر لانا اور عاشقوں کو ذوق و شوق میں برقرار رکھنا بھی ضروری تھا لہٰذا اس کتاب کو مرتب کیا جس میں حضور اکرم ﷺ کے فضل و کمال، حسن و جمال اور مبداء و مآل کے احوال کا ذکر و بیان ہے چونکہ اس تالیف کا منشاو مقصد ذوق و محبت کا پیدا کرنا تھا اس بنا پر حسب عادت قلیل عرصہ میں یہ کتاب منصۂ شہود میں آگئی اور راقم الحروف کو پتہ بھی نہ چلا کہ کب آغاز ہوا اور کب اختتام۔ واللہ ولی الرشاد الیہ المبداء والمعاد

اس کتاب کی ترتیب پانچ قسموں پر مبنی ہے۔

قسم اول۔ حضور اکرم ﷺ کے فضائل و کمالات کا بیان۔ اس میں ا۔ آپ کی حسن خلقت، جمال صورت۔ ۲۔ اخلاق عظیمہ، صفات کریمہ۔ ۳۔ وہ فضل و شرف جو آیات قرآنیہ اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں۔ ۴۔ آپ کا اور آپ کی امت مرحومہ کا وہ ذکر جو گذشتہ کتابوں میں مذکور ہے۔ ۶۔ ان کمالات کا ذکر جو صرف آپ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں مثلاً معراج وغیرہ۔

۷۔ معجزات قاہرہ اور آیات باہرہ کا ذکر۔ ۸۔ آپ کے اسماء گرامی کا ذکر۔ ۹۔ ان فضائل و کرامات اور درجات و مقامات کا بیان جو

روز آخرت آپ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہوں گے۔ جیسے عمومی شفاعت اور مخصوص وسیلہ وغیرہ۔۱۰۔ آپ کے ان حقوق کا تذکرہ جن کی رعایت وپائیداری تمام مخلوق پر واجب ہے۔ مثلاً ایمان، طاعت اور اتباع وغیرہ۔۱۱۔ اور آپ کی ان معظم عبادتوں کا تذکرہ جو بارگاہ الٰہی میں تقرب کا موجب ہیں اور ان مکرم عادتوں کا ذکر جو حق تعالیٰ کو محبوب دلپسند ہیں یہ قسم گیارہ ابواب پر منقسم ہے۔

قسم دوم :۔ حضور اکرم ﷺ کے نسب شریف، حمل، ولادت، شیر خوارگی (رضاعت) کا بیان، حضرت عبدالمطلب کی کفالت اور ان کی وفات، حضرت ابو طالب کی امداد و اعانت، ان کے ساتھ حضور اکرم ﷺ کا ملک شام کی جانب سفر کرنا، وہاں بحیرہ راہب کا آپ کو پہچاننا اور اس کا آپ کی نبوت پر ایمان لانا، ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے آپ کا نکاح، بنائے کعبہ کا تذکرہ، ابتدائے وحی، ظہور دعوت اسلام، ابو طالب کی رحلت، کفار کی ایذارسانی، صحابہ کی بجانب حبشہ ہجرت، حضور ﷺ کا طائف تشریف لے جانا، جنات کا بیعت کرنا، انصار مدینہ کی بیعت کرنا، مدینہ منورہ کی طرف ہجرت پر انگیز کرنا، مدینہ منورہ کی طرف تشریف لے جانا وغیرہ۔ یہ قسم چار ابواب پر منقسم ہے۔

قسم سوم :۔ ان ابواب کا ذکر و بیان جو باعتبار سن و سال ابتدائے ہجرت سے مرض وفات تک وقوع پذیر ہوئے چونکہ ہر سال دین کے واقعات جداگانہ ہیں اس لحاظ سے یہ قسم باعتبار معنی گیارہ ابواب پر مشتمل ہوگی مگر ابواب کے عنوانات کا ذکر نہ ہوگا۔

قسم چہارم :۔ حدوث و امتداد مرض اور ان واقعات کا بیان جو ایام مرض اور روز وفات وقوع پذیر ہوئے اس میں غسل، تجہیز و تکفین، نماز، دفن اور اثبات حیات انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے یہ قسم تین ابواب پر مشتمل ہے۔

قسم پنجم :۔ حضور اکرم ﷺ کے اولاد اطہار، ازواج مطہرات اور اہل بیت مسکن (باندیاں وغیرہ) کا ذکر اس میں آپ کے چچا۔ پھوپھیاں۔ اجداد اور دودھ شریک (رضاعی) بھائی بہن۔ خدام و موالی نگہبان و دبیر۔ امراء۔ ایلچی۔ عمال خطباء۔ شعراء۔ موذنین اور جنگی ساز و سامان وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ اس ترتیب سے یہ قسم گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔

تکملہ :۔ نبی کریم ﷺ کے بعض صفات کاملہ کا بیان بر طریق اہل معرفت و طریقت اور آپ سے استمداد کرنے کا ذکر ہے۔

قسم اول۔ فضائل و کمالات حضور اکرم ﷺ اس قسم میں گیارہ باب ہیں۔

باب اول

دربیان حسن خِلقت جمال صورت یعنی سراپا مبارک ﷺ

چہرۂ انور :۔ حضور اکرم ﷺ کا چہرۂ انور، آئینہ جمال الٰہی و مظہر انوار لامتناہی۔ بخاری و مسلم میں حضرت براء بن عازب سے مروی ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ خوبرو اور خوش خو تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے کہ۔

مَارَأَیْتُ شَیْئًا اَحْسَنَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے زیادہ حسین و بہتر میں نے کسی چیز کو نہ دیکھا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے قول میں "مَارَأَیْتُ شَیْئًا" (کسی چیز کو نہ دیکھا) فرمایا اور "مَارَأَیْتُ اِنْسَانًا یَارَجُلًا" (کسی انسان یا مرد کو نہ دیکھا) نہیں فرمایا کیونکہ اس میں بہت زیادہ مبالغہ ہے۔ مطلب یہ کہ آپ کی خوبی و حسن ہر چیز پر فائق تھی اور انہوں نے فرمایا کہ چہرۂ انور ایسا روشن و تاباں تھا کہ گویا آفتاب آپ کے رخ انور میں پھر رہا تھا۔

تاشب نیست روز ہستی زاد   آفتابے چو تو ندارد یاد

یعنی کسی رات کے بعد ایسا دن طلوع نہ ہوا جیسا آپ کا چہرۂ انور روشن و تاباں تھا۔ مقصود یہ ہے کہ آپ کے چہرۂ انور، روئے روشن کی آب و تاب، بہت ہی زیادہ تھی۔

صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ حضرت براء بن عازب سے دریافت کیا گیا کہ حضور اکرم ﷺ کا روئے روشن صفائی و تابانی میں شمشیر کی مانند تھا؟ فرمایا نہیں بلکہ چاند کی مانند تھا۔ کیونکہ شمشیر کی تشبیہ میں گولائی مقصود ہے اس لئے انہوں نے چاند سے تشبیہ دی۔ چاند میں چمک دمک بھی ہے اور گولائی بھی۔

صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ انہوں نے جواب دیا نہیں! آفتاب و ماہتاب کی مانند یعنی مستدیر اور گولائی میں۔ اگرچہ ماہتاب کے مقابلہ میں آفتاب میں چمک دمک زیادہ ہے لیکن ماہتاب میں جو ملاحت ہے وہ آفتاب میں نہیں۔ اور ملاحت ایسی خوبی ہے جو دیکھنے میں پرلطف اور دل نشین ہے جس کا ذوق سلیم ہی ادراک کر سکتا ہے۔

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد   بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

اہل سیر صباحت و ملاحت کے درمیان فرق کرتے ہیں کہ صباحت حضرت یوسف علیہ السلام کی صفت تھی اور ملاحت حضور انور ﷺ کی نعت مبارکہ۔ چنانچہ حضور نے فرمایا "اَنَا اَمْلَحُ وَاَخِیْ اَصْبَحُ" (مجھ میں ملاحت ہے اور میرے بھائی یوسف میں صباحت)

نبی کریم ﷺ کے چہرۂ انور کے مستدیر (گول) ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دائرہ کی مانند گول تھا۔ کیونکہ دائرہ کی مانند گولائی حسن و جمال کے برخلاف ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ ایک گونہ مستدیر تھا طویل و پر دازنہ تھا۔ یہ خوبی حسن و جمال اور عظمت و ہیبت میں داخل ہے۔ چنانچہ منقول ہے کہ آپ کا چہرۂ انور نہ مکلثم تھا نہ مطہم، "مکلثم" دائرہ کی مانند گول چہرہ کو کہتے ہیں۔ اور کتاب الشفاء (قاضی عیاض رحمہ اللہ) میں ہے کہ مکلثم وہ ہے جس کی ٹھوڑی (ذقن) چھوٹی ہو۔ اور یہ چہرہ کی گولائی کو مستلزم ہے۔ اس لئے کہ چہرہ کی لمبائی ٹھوڑی کی لمبائی سے ہوتی ہے اور "مطہم" بروزن معظم اس چہرے کو کہتے ہیں جس پر گوشت اور سوجا ہوا (متورم) معلوم ہو۔ قاموس میں تدویر و اجتماع کے معنی میں بھی آیا ہے اور وہیں سے معنی اخذ کئے ہیں اس کے معنی کمزور ناتواں کے بھی ہیں۔ اور یہ دونوں معنی حسن و جمال کے منافی ہیں۔ ایک روایت میں سہل الخدین (نرم رخسار) بھی آیا ہے۔ سہل نرم و ہموار

زمین کو کہتے ہیں۔ بعض روایتوں میں "سیل الخدین" (رواں رخسار) بھی آیا ہے جو سیلان سے ماخوذ ہے۔ "مواہب لدنیہ" میں ابن اثیر سے منقول ہے کہ اسالہ در خدین بمعنی استطالہ ہے۔ یعنی رخسار مبارک ایسے لانبے تھے کہ بلند و باہر نہ تھے۔

شیخ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ اسی روایت کے بموجب یہ بات ہر ایک کے لئے موجب استفسار بنی کہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور مثل شمشیر تھا۔ یہ مقام غور و فکر ہے۔

بعض احادیث میں تشبیہ وجۂ کریم بقطعۂ قمر و بشقۂ قمر بمعنی پارۂ قمر اور نصف قمر واقع ہوئی ہے اور اشعار میں بھی ایسی تشبیہ کا استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ مصرعہ ہے۔ ع

ہر دیدہ جائے آں ماہ پارہ نیست!

گویا کہ یہ تشبیہ دیکھنے والوں کے لئے چاند کی بلندی، اس کے حجم کی فراوانی اور اس کی گولائی سے ہے اور یہ خوبی دیگر اشخاص کی بہ نسبت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور میں زیادہ غالب تھی۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ، جو کہ فصیح ترین شعراء صحابہ میں سے ہیں ان کے کلام میں یہ تشبیہ آتی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس کی مناسب توجیہ کی جائے۔ چنانچہ کسی نے کہا کہ یہ تشبیہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال توجہ والتفات یا بعض اوقات قدرے رخ انور پھیر کر توجہ فرمانے پر محمول ہے۔ اس کی تائید میں حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث لاتے ہیں جو طبرانی میں ہے۔ فرمایا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری جانب اس شان سے توجہ فرمائی کہ گویا چاند کا نصف پارہ ہے۔ زیادہ عمدہ توجیہ یہ ہے کہ یہ تشبیہ آپ کی پیشانی مبارک کی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا۔

كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا سُرَّ اِسْتَنَارَ وَجْهُهٗ كَاَنَّهٗ قِطْعَةُ قَمَرٍ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پر جب شکن پڑتی تو آپ کا چہرۂ انور پارۂ قمر کی مانند چمکنے لگتا۔

کسیکہ تشنہ لب تست باز میداند ۔۔۔ کہ عین موج حیات است چین پیشانی

اور صراح (لغت کی کتاب) میں ہے کہ سُرر بفتحتین شکن پیشانی اور اس کی جمع اسرار و جمع الجمع اساریر ہے اور حدیث میں ہے کہ "كَانَ تَبْرُقُ اَسَارِيْرُ وَجْهِهٖ" یعنی آپ کے چہرۂ انور کی پیشانی کی شکنیں چمکنے لگتی تھیں۔ بعض نے کہا ہے کہ پارۂ قمر سے تشبیہ دینے سے چاند میں جو سیاہی اور جھائی ہے اس سے احتراز کی بنا پر ہے۔ یہ توجیہ کمزور ہے۔ اس لئے کہ جب کسی چیز کی چاند سے تشبیہ دی جاتی ہے تو اس کی سیاہی یا جھائی سے قطع نظر محض چمک دمک سے دی جاتی ہے۔

سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور دائرۂ قمر کی مانند تھا۔" دائرۂ قمر ہالہ کو کہتے ہیں۔ جسے فارسی میں خرمن ماہ کہا جاتا ہے۔

(شیخ محقق شاہ عبدالحق دہلوی "نور اللہ قلبہ بنور الیقین" فرماتے ہیں) کہ چاند کے نورانی جسم سے مشابہت یا ہالۂ قمر سے تشبیہ کا صریح اشارہ آپ کے چہرۂ انور کے اس نور کی طرف ہے جو انوار و اضواء کی شکل میں بمنزلۂ ہالہ احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہ تشبیہ آپ کے رخ انور کے کمال ضیاء و نورانیت اور اس کی عظمت و ہیبت و جلال کا طریقۂ اظہار ہے۔ اور کوشش کرنی چاہئے کہ اس سے نظر و مشاہدہ میں کیا چیز آتی ہے اور اس تشبیہ میں مشاہدہ کرنے والے کی نظر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جمال و جلال کیسے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ یہ آنکھوں کو سیراب کرتا اور دل کو نورِ عظمت و محبت سے بھرتا ہے۔

کعب بن مالک کی حدیث میں بھی دائرۂ قمر سے تشبیہ موجود ہے۔ قمر کے ساتھ تشبیہ میں بہت ظاہر و مشہور چودھویں رات کے چاند

(لیلتہ البدر) کی تشبیہ ہے۔ جسے بیہقی نے ابو اسحاق سے روایت کیا۔ وہ یہ کہ ایک ہمدانی عورت نے مجھ سے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کیا ہے میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کی کیفیت تو بیان کرو۔ اس نے کہا۔

كَالْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ لَمْ اَرَقَبْلَهٗ وَلَا بَعْدَهٗ مِثْلَهٗ۔ چودھویں رات کے چاند کی مانند تھا جس کی مانند نہ پہلے دیکھا نہ بعد میں۔

طالبان مشتاق ہمیشہ جمال جہاں آرا صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدہ میں ایام بیض کی راتوں میں مشرف رہتے تھے۔ اور اس مشاہدہ سے وہ کبھی غافل وفارغ نہ ہوتے تھے کیونکہ دیدار نقد ہے۔ اور ابن ابی ہالہ کی حدیث میں ہے کہ:۔

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخْمًا مُّفَخَّمًا يَتَلَأْلَأُ وَجْهُهٗ كَتَلَأْلُؤِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ۔ مشاہدہ کرنے والوں کی نظر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عظیم بزرگ، معظم اور مہیب تھے۔ گویا کہ آپ کا چہرۂ انور چودھویں رات کے چاند کی مانند روشن و تاباں تھا۔

اور جمال جہاں آرا صلی اللہ علیہ وسلم کو آفتاب کے مقابلے میں چاند سے تشبیہ دینے کی ترجیح میں اہلِ سیر فرماتے ہیں کہ چاند چونکہ اپنے نور سے آنکھوں کو ٹھنڈک اور فرحت بخشتا ہے اور اس کے مشاہدہ سے دل کو انس ولذت حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ کہ اس کی طرف نظر کرنا ممکن ہے بخلاف آفتاب کے۔ کہ وہ آنکھوں کو خیرہ کرتا اور دل کو ذوق نہیں پہنچاتا ہے۔ ہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات عظیم الصفات کو سطوت و جلالت میں آفتاب سے تشبیہ اور فروات عالم میں آپ کے نور وظہور کو اور ذات محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کنہ حقیقت کے عدم ادراک اور دور ونزدیک سے آپ کے فضل وکمال کی انتہا کے مطالعہ میں افہام و عقول کے عاجز و درماندہ رہ جانے کی وجہ سے آفتاب سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ یہ شعر ہے ؎

اَعْيَا الْوَرٰى فَهْمُ مَعْنَاهُ فَلَيْسَ يُرٰى ۔۔۔ فِى الْقُرْبِ وَالْبُعْدِ فِيْهِ غَيْرُ مُنْفَحِمِ

كَالشَّمْسِ تَظْهَرُ لِلْعَيْنَيْنِ مِنْ بُعُدٍ ۔۔۔ صَغِيْرَةً وَّتُكِلُّ الطَّرْفَ مِنْ اُمَمِ

مطلب یہ کہ آپ کی کنہ حقیقت فہم وادراک سے بہت بلند ہے۔ کوئی بھی دور ونزدیک سے پوری طرح معرفت نہیں کر سکتا۔ گویا آپ آفتاب کی مانند ہیں جو دور ہو کر بھی آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے۔ اسی طرح ساری مخلوق آپ کی کنہ حقیقت کے ادراک میں عاجز و سرگرداں رہی ہے۔

یہ تشبیہ حسب حال ہے لیکن مشاہدۂ عینی و حسی میں چاند سے تشبیہ دینا قرین و مناسب ہے۔

مواہب لدنیہ میں نہایہ سے منقول ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مسرور ہوتے تو آپ کا چہرۂ انور آئینہ کی مانند ہو جاتا جس میں در و دیوار کے نقوش اور لوگوں کے چہروں کا عکس جھلکنے لگتا۔

حضرت جابر بن سمرۃؓ سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چاندنی راتوں میں دیکھا ہے اس وقت آپ کے جسم اطہر پر سرخ جوڑا تھا۔ میں کبھی آپ کے روئے انور کو دیکھتا اور کبھی چاند کی تابانی کو۔ خدا کی قسم میرے نزدیک چاند سے زیادہ بہتر آپ معلوم ہوتے تھے۔ ان کے الفاظ "میرے نزدیک" میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن و جمال سے لذت اندوز ہونے کا اظہار موجود ہے۔ یہ ان کا اپنا اظہار تلذذ ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ آپ کا حسن و جمال سب سے بڑھ کر حسین تھا۔

تنبیہ:۔ حلہ کپڑے کے اس جوڑے کو کہتے ہیں جس میں چادر اور تہ بند ہوتا ہے اور حمراء سے سرخ دھاریوں والا کپڑا مراد ہے۔

یہ محدثین کی تحقیق ہے جو لوگ حلے کو ریشمی جامے اور حمراء کو محض سرخی پر محمول کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات عالیہ کو شاعرانہ انداز میں بیان کرنا شعری مزاج وعادت کے ماتحت ہے ورنہ اس دنیا کی کوئی چیز بھی آپ کی اخلاقی خوبیوں اور خلقی صنعتوں کے نہ تو مماثل ہو سکتی ہے اور نہ ہم پلہ۔ سُبْحَانَ اللہِ مِنْ خَلْقِہٖ وَحُسْنِہٖ وَاَجْمَلِہٖ وَاَتَمِّہٖ وَاَکْمَلِہٖ سُبْحَانَ اللہِ سُبْحَانَ اللہِ

چشم مبارک: ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم مبارک پر دو وجہوں پر بحث کی جاتی ہے۔ پہلی وجہ خانہ چشم اور اس کی شکل و ہیئت کے وصف میں ہے۔ چنانچہ سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے۔ فرمایا کہ آپ کی چشم مبارک بڑی اور بھنویں دراز تھیں۔ چشم مبارک کے بڑی ہونے کا مطلب تنگی اور کوتاہی کی نفی کرنا ہے۔ نہ کہ اتنی بڑی کہ آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ آپ کے اعضائے شریفہ کے اظہار میں قاعدۂ کلیہ، توسط واعتدال ہے۔ کیونکہ مدار حسن و جمال اور بنائے فضل وکمال یہی توسط واعتدال ہے۔
ایک اور حدیث میں "اشکل العینین" آیا ہے یعنی آپ کی چشم مبارک سفیدی میں سرخی لئے ہوئے تھیں۔ مطلب یہ کہ آنکھوں کی باریک رگیں سرخ تھیں۔ اور "شہلہ" یعنی سیاہی میں سرخی ہونا۔ یہ صفت آپ کی چشم مبارک کی تعریف میں بہت ہی کم مذکور ہے۔ لیکن نہایہ میں کہا گیا ہے کہ

کَانَ اَشْہَلَ الْعَیْنَیْنِ وَکَفْتَہٗ اَشْہَلُ حُمْرَۃٌ فِیْ سَوَادٍ۔ حضور کی دونوں چشم مبارک اشہل تھیں اور سیاہی میں سرخی کو اشہل کہا جاتا ہے۔

یہ بھی محبوبوں کے آنکھ کے حسن کی ایک قسم ہے۔ لیکن مشہور اشکل العینین (سفیدی میں سرخی) ہے اور اشعار میں جوانان تگ و تاز کی تعریف میں "شہلا" آیا ہے۔ قاموس (لغت کی کتاب) میں ہے کہ اشکل وہ ہے جس میں سرخی وسفیدی ممتزج ہو اور سفیدی میں سرخی کی جھنک نمودار ہوتی ہو اور شکلہ کو "سحرہ" بھی کہتے ہیں جو سحر سے مشتق ہے۔ ایسی آنکھ کو چشم سحر کار اور فسوں کار بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ دلوں کو موہ لیتی ہے۔ اور بعض حضرات اشکل العینین کو طویل شق العینین یعنی دراز وباریکی چشم (پھٹا دیدہ) سے تفسیر کرتے ہیں۔ قاموس نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔ قاضی عیاض مالکی رحمتہ اللہ علیہ بھی بیان کرتے ہیں۔ شمائل ترمذی میں بھی اسی قسم کی روایت ہے اور امیر المومنین سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کا قول عظیم العینین (بڑی آنکھیں) بھی بظاہر اسی معنی ومراد میں ہے۔ واللہ اعلم۔
ایک روایت میں "اَدْعَجُ الْعَیْنَیْنِ" بھی آیا ہے "اَدْعَجُ" گہری سیاہ آنکھ کو کہتے ہیں اور قاموس نے اس کے معنی فراخ وکشادگی کے بھی لئے ہیں۔ اور ایک روایت میں "اَکْحَلُ الْعَیْنَیْنِ" ہے یعنی سرگیں آنکھیں تھیں۔

دو چشم تو کہ سیاہ اند سرمہ ناکردہ   بسا سرمہ سیاہ کردہ خانۂ مردم

یعنی آپ کی چشم مبارک بغیر سرمہ لگائے سرگیں نظر آتی تھیں **دوسری وجہ:** حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بصارت وبینائی کی تعریف میں ہے چنانچہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کی تاریکی میں بھی ویسا ہی دیکھتے تھے جیسا دن کی روشنی میں (رواہ البخاری) بیہقی نے بھی سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایسا ہی روایت کیا ہے قاضی عیاض رحمہ اللہ کتاب "الشفاء" میں بیان کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ثریا میں گیارہ ستارے ملاحظہ فرماتے تھے اور سہیلی کے نزدیک بارہ منقول ہیں۔ آپ کی نظریں آسمان کی نسبت زمین کی طرف زیادہ رہتی تھیں یہ حد درجہ شرم وحیا کی دلیل ہے۔ حدیثوں میں جو یہ آیا ہے کہ حضور آسمان کی طرف نظر اٹھاتے تھے۔ کبھی کم اور کبھی زیادہ۔ تو ایسا انتظار وحی کے سلسلے میں ہوتا تھا۔ ورنہ نظر

مبارک کا زمین کی طرف رکھنا روزمرہ کے معمولات میں تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر گوشۂ چشم سے نظر فرماتے تھے جو نظر براہ راست ہوا سے جوق دماق کہتے ہیں۔ آپ کا گوشۂ چشم سے ملاحظہ فرمانا انتہائی حیاء و وقار کے سبب تھا لیکن جب آپ کسی کی جانب التفات فرماتے تو مکمل طور پر گھوم جاتے تھے۔ دائیں بائیں پہلو بدلنے یا محض گردن گھمالینے اور دزدیدہ نظری سے آپ گریز فرماتے تھے۔ کیونکہ یہ متکبروں اور سہل انگاروں کا شیوہ ہے۔ آپ کی نظر مبارک سامنے اور پس پشت یکساں تھی۔ چنانچہ صحیح حدیثوں میں وارد ہے کہ آپ مقتدیوں سے فرمایا کرتے تھے کہ رکوع و سجود میں مجھ سے پہل نہ کیا کرو۔ کیونکہ میں تمہیں اپنے آگے اور پیچھے سے یکساں دیکھتا ہوں اور مجھ سے تمہارا رکوع و سجود پوشیدہ نہیں ہے۔ اس روایت کی حقیقت کو خدا ہی جانتا ہے کہ کیا تھی۔ یہی نہیں بلکہ آپ کے تمام اعضائے شریفہ کا یہی حال ہے۔ کیونکہ ان کی کنہ حقیقت کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ اور ان کی کنہ تک جاننے کا دعویٰ ایسا ہی ہے جیسا کہ متشابہات کی تاویل وتفسیر کا حکم ہے۔ عقل وقیاس اور فکر ونظر کی رو سے یہ آپ کی فضیلت ہے۔ لیکن آپ کی یہ بینائی چشم رخ سے ہے یا دل کی آنکھ سے؟ یا تو یہ حالت نماز کے ساتھ مخصوص ہوگی جو محل انکشاف انام اور موجب ازدیاد نور ہے یا پھر یہ صفت تمام احوال واوقات میں عام ہوگی اور یہ روایت بصری چہرۂ مبارک کی چشم میں ہی ہوگی۔ ورنہ پروردگار عالم اس پر بھی قادر ہے کہ قوت بصریہ بدن کے ہر حصہ اور جزو میں پیدا فرمادے یا یہ کہ یہ بینائی آپ کو بطریق اعجاز بلا شرط مقابلہ حاصل تھی۔

بعض کہتے ہیں کہ آپ کے دونوں شانوں کے درمیان سوئی کے ناکہ کی مانند دو آنکھیں تھیں جن سے آپ پس پشت بھی دیکھ لیا کرتے تھے۔ آپ اسے کپڑوں سے نہیں ڈھانپتے تھے۔ یا یہ کہ قبلہ کی دیوار پر مثل آئینہ مقتدیوں کی صورتیں منعکس ہو جاتی تھیں۔ اور آپ ان کے افعال کا مشاہدہ فرمالیتے تھے۔ یہ دونوں باتیں عجیب وغریب ہیں۔ اگر یہ کسی صحیح روایت میں ہوں تو ہم ان پر ایمان لے آئیں گے ورنہ محل تامل ہے کیونکہ اہل سیر کے نزدیک باسناد صحیحہ ثابت نہیں ہیں۔

اگر یہاں رؤیت قلبی مراد ہے تو یہ وہ علم ہے جو بطریق وحی واعلام اور کشف والہام آپ کو حاصل تھا اہل سیر کے نزدیک درست بات یہی ہے کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلب اطہر کو معقولات کے علم وادراک میں وسعت اور احاطہ عنایت فرمایا ہے اسی طرح آپ کے حواس لطیف میں بھی محسوسات کے ادراک میں احاطہ مرحمت فرمایا ہو۔ اور شش جہات کو ایک ہی جہت بنا دیا ہو۔ واللہ اعلم۔

کچھ لوگ اس جگہ یہ اشکال لاتے ہیں کہ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”میں بندہ ہوں میں نہیں جانتا کہ اس دیوار کے پیچھے کیا ہے“ اس کلام کی کوئی اصل نہیں ہے اور نہ اس قسم کی کوئی صحیح روایت وارد ہے۔ بفرض محال اگر ہو بھی تو ہم جواب میں کہیں گے کہ یہ انکشاف حالت نماز کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور اگر علم ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے بتانے اور آپ میں ایسا علم پیدا فرمانے کے ساتھ موقوف ہے۔ جس طرح تمام غیوبات کے حال کا علم ہے۔ اس لئے ایسے موقع پر یہ لوگ اس روایت سے استدلال لاتے ہیں جو اونٹنی کی گمشدگی کے سلسلے میں منقول ہے۔ چنانچہ کچھ منافقوں نے کہا تھا کہ ”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آسمان کی خبریں تو دیتے ہیں مگر (معاذ اللہ) اتنا نہیں جانتے کہ ان کی اونٹنی کہاں ہے؟“ جب منافقوں کی یہ بدگوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ میں (از خود) نہیں جانتا۔ اور نہ (از خود) پاتا ہوں مگر اتنا ہی جتنا اللہ نے مجھے علم دیا اور عنایت فرمایا۔ اور آپ برابر یہی فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے آپ کی رہنمائی فرمائی کہ اونٹنی فلاں جگہ ہے۔ اور اس کی مہار ایک درخت سے الجھی ہوئی ہے۔ چنانچہ لوگ وہاں پہنچے تو اونٹنی کو اسی مذکورہ حال میں پایا گویا ثابت ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ سلم ذاتی علم نہیں رکھتے تھے مگر اتنا ہی جتنا اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم عطا فرمایا۔ خواہ یہ نماز میں ہو یا نماز کے سوا۔ اس میں کوئی اشکال،

رسوائی نہیں ہے۔
گوشہائے مبارک :۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سماعت شریفہ کے بارے میں ایک حدیث میں وارد ہے کہ آپ نے فرمایا "میں ان چیزوں کو دیکھتا ہوں جن کو تم نہیں دیکھ سکتے۔ اور میں ان آوازوں کو سنتا ہوں جن کو تم نہیں سن سکتے۔ میں آسمان کی اطیط (خاص قسم کی آواز ہے) کو سن رہا ہوں اونٹ کے پالان کی آواز، خالی معدہ کی آواز، درد و کرب سے اونٹ کے بلبلانے کی آواز یا کسی قسم کی آواز ہو ان سب کو "اطیطہ" کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا آسمان کو بھی لائق ہے کہ آواز نکالے کیونکہ آسمان میں ایک بالشت (ایک روایت میں چار انگل) کی جگہ بھی ایسی نہیں ہے۔ جہاں کسی فرشتے نے سجدہ نہ کیا ہو۔ ایک روایت میں ہے کہ بکثرت فرشتے سجدے میں ہیں یا قیام میں۔ سیر کی کتابوں میں آپ کے گوش مبارک کی، تمام صفات وہیئت کا تذکرہ نہیں ہے۔ ہاں جامع صغیر میں ایک روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گوشہائے مبارک کامل و مکمل تھے۔
جبین مبارک :۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جبین مبارک کی تعریف و توصیف میں سیدنا علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ واضح الجبین (کشادہ پیشانی) تھی۔ ایک دوسری روایت میں "صلت الجبین" بمعنی کشادہ پیشانی آیا ہے۔ ایک اور حدیث میں "واسع الجبین" ایک روایت میں "واسع الجبہۃ" منقول ہے۔ ان سب کے معنی فراخ پیشانی ہے۔ چہرۂ انور کے تذکرے میں حضرت کعب بن مالک سے گزر چکا ہے کہ جب آپ کی پیشانی شکن آلود ہوتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ گویا چاند کا ٹکڑا ہے۔ اہل سیر بیان کرتے ہیں کہ آپ کی پیشانی مبارک سے نیک بختی، سعادت مندی اور نورانیت مترشح ہوتی رہتی تھی۔ اور سرنوشت (جو شکم مادر میں لکھا جاتا ہے) کا مقام پیشانی ہے۔ بسا اوقات اس معنی کا مشاہدہ خانہ کعبہ کے دروازے میں ہوتا ہے۔ جب یہاں عادۃً پیشانی کو اس سے رگڑتے اور ملتے ہیں تو پیشانی سے نیک بختی و سعادت مندی کے آثار خوب واضح طریقہ پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔
حواجب شریف (بھنویں):۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بھنوؤں کی توصیف میں حضرت علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ نے اپنی حدیث میں بیان فرمایا کہ۔ "وَاضِحُ الْجَبِيْنِ مَقْرُوْنُ الْحَاجِبَيْنِ"
یعنی پیشانی کشادہ اور بھنوئیں ملی ہوئی تھیں۔ قرن ابرو کا مطلب بھنوؤں کے بالوں کا ملا ہوا ہونا ہے۔ لیکن ابن ابی ہالہ جو کہ واصفان حلیہ شریف میں سے ہیں ان کی حدیث میں من غیر قرن (ابرو کے بال ملے ہوئے نہ تھے) آیا ہے ان دونوں روایتوں میں اختلاف ہے۔
ارباب سیر کہتے ہیں کہ صحیح روایت یہ ہے کہ آپ غیر متصل ابرو تھے۔ اور بظاہر یہ اتصال بہت گہرا نہ تھا۔ جس سے دونوں ابرو کے بال باہم خوب پیوست ہو گئے ہوں اور نہ درمیان میں اتنی خالی جگہ تھی جسے غیر متصل کہا جائے بلکہ چند خفیف بالوں کا اتصال تھا۔ اس بنا پر اتصال و عدم اتصال کا اطلاق بادی النظر و الخیال میں صحیح ہو سکتا ہے واللہ اعلم۔
اہل سیر فرماتے ہیں کہ دونوں ابرو کے درمیان ایک رگ تھی جو حالت غضب میں نمودار ہوتی تھی۔ نیز ابن ابی ہالہ کی حدیث میں "اَزَجُّ الْحَوَاجِبِ" آیا ہے۔ ازج کے معنی لمبی کمان، کثیر بال اور کشیدہ ابرو کے ہیں۔ ایک دوسری روایت میں "اَزَجُّ الْحَوَاجِبِ سَوَابِغُ" (کشیدہ ابرو و گھنے بال) آیا ہے۔ قاموس اور صحاح میں زج کے معنی باریکی ابرو یا درازی ابرو کے ہیں جیسے فارسی میں کمان ابرو کہتے ہیں۔ اور بیہقی میں بعض صحابہ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "اَحْسَنُ الْوَجْهِ عَظِيْمُ الْجَبْهَةِ دَقِيْقُ الْحَاجِبَيْنِ" دیکھا ہے۔ یعنی آپ کا چہرہ نہایت حسین، عظیم پیشانی اور ابرو باریک تھے۔ باریکی کا مطلب یہ ہے کہ ابرو کے بالوں کا گھنا نہ تھا۔ اور بالوں کی کثرت کا یہ مطلب ہے کہ بال کم اور کہیں کہیں نہ تھے۔ یہ نہ تو پراگندہ تھے نہ چھدرے۔

بینی شریف :۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بینی مبارک کے بارے میں "اَقْنَى الْاَنْفِ وَاَقْنَى الْعِرْنِيْنِ" وارد ہے۔ عرنین (بکسر عین مہملہ وسکون راء وکسر نون) بمعنی بلندی جو موئے ابرو کے اتصال کے نیچے ہے۔ اور اقنی کی تفسیر "سائل الحاجبین" یعنی مرتفع الوسط سے کی گئی ہے۔ سائل سیلان سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ناک کی لمبائی اور باریکی میں یک گونہ ہمواری کے بھی منقول ہیں اور لفظ دقّت (باریکی) سیلان کے ہم معنی بھی آتا ہے جس کا مطلب ناک کے موٹاپے کی نفی کرنا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بینی مبارک ایسی نورانی اور روشن تھی کہ دیکھنے والا جب تک بغور نہ دیکھے یہی گمان کرتا تھا کہ آپ کی بینی شریف بلند ہے حالانکہ بلند نہ تھی بلکہ یہ بلندی نور کی تھی جو ہر ایک شے کو نمایاں دکھاتا تھا۔ نیز اس خوبی میں نیک بختی اور سعادت مندی کی نشانی بھی ہے۔

دہن شریف :۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک کے بارے میں صحیح مسلم میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ۔

"كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَلِيْعَ الْفَمِ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فراخ دہان تھے۔ اس طرح حضرت ابن ابی ہالہ نے بیان کیا ہے جو شمائل ترمذی میں حلیہ مبارک کی طویل حدیث میں مذکور ہے۔ اہل عرب مردوں کے لئے فراخ دہنی کو قابل تعریف اور تنگ دہنی کو لائق مذمت ٹھہراتے تھے۔ عرب کے شعراء تنگ دہن کو معشوق اور محبوب سے نسبت دیتے تھے گویا کہ ان کے نزدیک وہ عورتوں کے حکم میں تھے۔ لیکن بعضوں نے کہا کہ یہ کم سخنی اور محبوبی سے کنایہ ہے۔ دوسری حدیث میں لفظ "ضَلِيْعَ الْفَمِ" (فراخ دہنی) کے بعد یہ عبارت زیادہ کی ہے جس سے فراخ دہن مراد لیتے ہیں۔ يَفْتَتِحُ الْكَلَامَ وَيَخْتِمُهٗ بِاَشْدَاقِهٖ۔ یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کلام کا کشادگی دہن سے آغاز فرماتے اور اپنے شدق سے اسے ختم کرتے۔ شدق بکسر شین کنج دہان، اور شدق بتحریک فراخی دہاں کو کہتے ہیں۔ "خطیب اشدق" تالو کشادہ اور متشدق فصاحت سے بولنے والے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ آپ کے دہن مبارک سے کلام، تام، کامل اور بھرا ہوا نکلتا تھا۔ شکستہ وناقص الفاظ نہ نکلتے تھے۔ لہٰذا اس بیان سے فصاحت اور اثبات فصاحت دونوں کا اجتماع حاصل ہو گیا اور معلوم ہوا کہ آپ فصیح کامل تھے۔ ایسا تشدق لسانی مذموم وقبیح ہے جو بطریق تکلف، بناوٹ اور ناحق ہو۔ بعض اہل سیر نے کشادگی دہن سے ہونٹوں کی نزدیکی مراد لی ہے۔

آپ "مُفَلَّجُ الْاَسْنَانِ" تھے یعنی سامنے کے دانت کشادہ تھے۔ صراح میں فلج کے معنی سامنے کے دانتوں کی کشادگی ہے۔ ایک اور حدیث میں "اَشْنَبَ، مُفَلَّجُ الثَّنَايَا" یعنی سامنے کے دانت روشن تر، آبدار اور کشادہ مروی ہے اشنب کے معنی دانتوں کی آبداری و تابانی کے ہیں۔ اور قاموس میں اشنب بحرکتہ باء "ورقہ وبرود عذ دبتہ فی الاسنان" کے معنی بیان کئے ہیں۔ علی مرتضیٰ کی حدیث میں مُبْلِجُ الثَّنَايَا (سامنے کے دانت روشن و تاباں) آیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے انہوں نے بیان کیا کہ آپ کے لبہائے مبارک کشادہ تھے جب گفتگو فرماتے تو ایسا دکھا جاتا کہ گویا سامنے کے دندانہائے مبارک کی کشادگی کے درمیان سے نور نکل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ بوصیری پر رحم فرمائے کیا خوب شعر کہا ہے۔

كَاَنَّمَا اللُّؤْلُؤُ الْمَكْنُوْنُ فِيْ صَدَفٍ ۔۔۔ مِنْ مَّعْدَنِ مَنْطِقٍ مِّنْهُ وَمُبْتَسَمٖ

گویا کہ دندانہائے مبارک صدف میں چھپے ہوئے ہیں جو اپنے معدن میں بولتے اور تبسم فرماتے ہیں۔

طبرانی نے اوسط میں روایت کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لبہائے مبارک اور دہن شریف کا مہرہ تمام لوگوں سے زیادہ حسین ولطیف تھا۔ اور ایک روایت میں عظیم الاسنان (دندانہائے مبارک عظیم تھے۔) بھی آیا ہے ان سب روایتوں کا

مفہوم یہی ہے کہ آپ کا دہن شریف (حسن و جمال کے مطابق) درست و صحیح تھا۔

لعابِ دہن شریف : ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا لعابِ دہن بیماروں اور دلفگاروں کے لئے شفائے کامل تھا۔ چنانچہ وہ حدیث جس میں روز خیبر علی مرتضیٰ کی آنکھوں کے آشوب میں لعاب دہن لگانا اور اسی وقت صحیح و تندرست ہو جانا مذکور ہے مشہور ہے آپ کے حضور پانی کا ایک ڈول لایا گیا۔ اور آپ نے پانی کا ایک گھونٹ لے کر اس میں کلی کر دی پھر جب اس ڈول کے پانی کو کنویں میں ڈال دیا گیا تو اس کنویں سے کستوری کی مانند خوشبو پھیل گئی تھی۔ اور یہ کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے مکان کے کنویں میں جب آپ نے لعاب دہن ڈالا تو مدینہ طیبہ میں کوئی کنواں اس سے زیادہ شیریں نہ تھا۔ اسی طرح ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں کچھ شیر خوار بچے لائے گئے آپ نے ان کے منہ میں اپنا لعاب دہن ڈال دیا۔ پھر تو وہ ایسے سیراب ہوئے کہ اس دن انہوں نے دودھ ہی نہ پیا۔ ایک دن حضرت امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ سخت تشنگی میں تھے آپ نے اپنی زبان مبارک ان کے منہ میں دے دی۔ وہ اسے چوستے رہے۔ پھر وہ سارا دن سیراب رہے۔ اس قسم کے بے شمار معجزات مروی ہیں۔

تبسم شریف : ۔ صحیح بخاری میں ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے کبھی بھی آپ کو اس طرح قہقہہ لگا کر ہنستے نہ دیکھا جس سے آپ کے لہوات نظر آ جائیں لہوات تمام حروف کے فتح کے ساتھ لہاۃ کی جمع ہے۔ اور فتح لام سے وہ گوشت کا ٹکڑا جو حنجرے کے اوپر منہ کے آخر میں ہوتا ہے۔ (جسے اردو میں کوا کہتے ہیں)۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ متبسم رہا کرتے تھے۔ اور یہ جو بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ آپ اتنا ہنسے کہ آپ کے نواجذ یعنی سب سے پچھلی داڑھ ظاہر ہو گئی۔ نواجذ اس آخری داڑھ کو کہتے ہیں جس کا نام عقل داڑھ ہے اور جو بعد بلوغ اور کمال عقل پر نکلتی ہے۔ اس بیان ضحک میں مبالغہ ہے۔ حقیقت کا اظہار نہیں۔ کیونکہ اس کو شدت ضحک کے بیان میں مثال کے طور پر بولتے ہیں۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ اس جگہ نواجذ سے مراد عام داڑھ اور دانت ہیں۔ آپ کی ہنسی زیادہ تر مسکرانے تک تھی۔ ضحک کا بالکل ابتدائی مرحلہ مسکرانا ہے جس میں فرط خوشی سے دانت نمایاں ہو جاتے ہیں اگر ہنسی کی یہ آواز قلفہ سے سنی جائے تو اسے قہقہہ کہیں گے۔ ورنہ اسے ضحک کہیں گے اور اگر آواز بالکل ہی نہ ہو تو اسے تبسم یا مسکرانا کہتے ہیں۔ اور صراح میں لبوں کے ملانے کو تبسم کہا گیا ہے مگر مشہور یہ ہے کہ دانتوں کی سفیدی ظاہر ہو جانے کا نام تبسم ہے۔

حضرت شیخ ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں، تمام حدیثوں سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بڑی سے بڑی حالتوں اور اکثر اوقات میں تبسم سے آگے تجاوز نہیں فرماتے تھے۔ ممکن ہے کبھی اس سے تجاوز بھی کیا ہو مگر ضحک (تبسم) کی حد سے آگے نہ بڑھے ہوں گے۔ لیکن یہ قہقہہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ مکروہ ہے۔ کثرت کے ساتھ ہنسنے اور اس میں زیادتی کرنے سے آدمی کا وقار جاتا رہتا ہے۔ بیہقی نے بروایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ضحک فرماتے تھے تو دیواریں روشن ہو جاتی تھیں اور ان پر آپ کے دندانہائے مبارک کا نور آفتاب کی شعاعوں کی طرح جلوہ افروز ہوتا تھا۔ یہی حال آپ کے گریہ کا تھا۔ آواز قطعاً بلند نہ ہوتی تھی۔ البتہ چشم مبارک سے آنسو جاری ہو جاتے اور سینۂ اطہر سے ایک مخصوص آواز سنائی دیتی تھی۔ ایسی آواز جیسے تانبے کی دیگ میں جوش آ گیا ہو۔ بعض روایتوں میں اسے چکی کی آواز کی مانند کہا گیا ہے۔ آپ کا فعل گریہ فرمانا اللہ تعالیٰ کی جلالی صفت کی تجلی یا امت مرحومہ پر شفقت فرمانے یا میت پر طلب رحمت کی بنا پر ہوتا تھا۔ یہ کیفیت اکثر قرآن کریم سنتے وقت یا بعض اوقات رات کی نماز میں طاری ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جماہی لینے سے محفوظ رکھا ہے۔ کیونکہ جماہی کسلمندی اور اعضاء کی سستی کی نشانی ہے۔ تاریخ بخاری اور مصنف ابن ابی شیبہ میں منقول ہے کہ "لَمْ يَتَثَاءَبِ النَّبِيُّ قَطُّ" نبی کریم صلی اللہ علیہ

وسلم نے کبھی جماہی نہ لی۔ بعض روایتوں میں " لَمْ یَتَثَاءَبْ نَبِیٌّ قط " یعنی کسی نبی نے کبھی جماہی نہ لی بھی وارد ہے ایک حدیث ہے کہ جماہی شیطان کی طرف سے ہے۔ اور اگر جماہی غلبہ کرے تو چاہیئے کہ بایاں ہاتھ منہ پر رکھے یالبوں کو دانتوں میں دبا لوگ، جو ہاہاہایا آہ آہ کی آواز نکالتے ہیں۔ وہ حد درجہ فعل قبیح مرتکب ہوتے ہیں۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ جو ایسا کرتا ہے شیطان اس کے منہ میں ہنستا ہے۔

آواز مبارک: ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز مبارک غایت درجہ پیاری تھی۔ آپ کی آواز اور اس کی شیرینی تمام آوازوں سے زیادہ حسین و دلکش تھی اور کوئی شخص بھی آپ سے بڑھ کر خوش آواز و شیریں کلام نہیں گزرا۔ آپ کے کلام کی توصیف میں آیا ہے "اَصْدَقُ النَّاسِ لَہْجَۃً" یعنی کلام میں سب لوگوں سے سچے، کیونکہ آپ کی زبان مبارک مخارج سے کلام فرمانے میں جیسا کہ اس کا حق ہے سب سے بڑھ کر راست، درست تر اور بہتر تھی۔ آج تک کوئی ایک بھی اس پر قادر نہ ہو گا۔ فصاحت کے ساتھ کلام فرمانے کو صدق لہجہ کہتے ہیں۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو نہ بھیجا مگر خوش آواز اور خوش رو حتیٰ کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اوصاف میں سب سے فائق تھے۔ اسی مقام پر کسی نے کہا ہے کہ ۔

در دل ہر امتی گر حق مزہ است روئے آوازِ پیغمبر معجزہ است

جہاں تک کسی کی آواز نہ پہنچ سکتی تھی وہاں تک آپ کی آواز مبارک بے تکلف پہنچ جاتی تھی۔ خصوصاً ایسے خطبوں کی آواز جس میں نصیحت، تخویف یا خدا سے ڈرانا ہوتا تھا۔ چنانچہ پردہ میں بیٹھی ہوئی مستورات بھی آپ کی آواز سنتی تھیں۔ آپ نے ایام حج میں منیٰ میں جو خطبہ دیا تھا اس نے تمام لوگوں کے کان کھول دیئے۔ اور ہر ایک نے اس خطبہ کو اپنی اپنی منزلوں میں سنا۔ (منیٰ میں دور ونزدیک جو بھی تھا ہر ایک نے سنا) وہ جو دوسری حدیث میں آیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں خطبہ دیتے تھے اور حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے اس کی تعبیر کرتے جاتے تھے تو اس سے مراد کلام کی تفسیر و توضیح اور شرح و بیان اور اس سے رفع اشتباہ ہے نہ کہ آواز کو سنوانا۔

بیان فصاحت شریف: ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک کی فصاحت، جوامع کلم، انوکھا اظہار بیان اور عجیب وغریب حکم و فیصلے اتنے زیادہ ہیں کہ شاید ہی کوئی فکر واندیشہ کا محاسب اس کے حصر واحاطہ کے گرد پھر سکے۔ آپ کے اوصاف کا بیان اور ان کے بیان کا زبان کے ساتھ اظہار ممکن ہی نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ فصیح وشیریں بیان دوسرا پیدا ہی نہ فرمایا۔ ایک مرتبہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا یارسول اللہ نہ تو آپ کہیں باہر تشریف لے گئے اور نہ آپ نے لوگوں میں نشست وبرخاست رکھی پھر آپ ایسی فصاحت کہاں سے لے آئے۔ آپ نے فرمایا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی لغت اور اصطلاح جو ناپید اور فنا ہو چکی تھی اسے میرے پاس جبرئیل علیہ اسلام لے کر آئے جسے میں نے یاد کر لیا ہے نیز آپ نے فرمایا۔

اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَادِیْبِیْ میرے رب نے مجھے ادب سکھایا تو میرے ادب کو بہت اچھا کر دیا۔

عربیت کا وہ علم جو زبان عرب اور اس کی فصاحت وبلاغت سے تعلق رکھتا ہے اسے ادب کہتے ہیں۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری نشوونما قبیلہ بنی سعد بن بکر میں ہوئی ہے۔ یہ آپ کی دائی حلیمہ سعدیہ کا قبیلہ ہے۔ بنی سعد کے لوگ پورے عرب میں سب سے زیادہ فصیح اللسان تھے۔ اور یہ جو منقول ہے کہ آپ نے فرمایا "میں ضاد کو اس کے مخرج سے ادا کرنے میں اس سے زیادہ فصیح ہوں

جو ضاد کو ادا کرتا ہے۔ " اگرچہ اس حدیث کی صحت میں بعض اپنی مقرر کردہ اصطلاح حدیث کے تحت کلام کرتے ہیں لیکن اس کے معنی صحیح ہیں۔ حاصل کلام اس طرف راجع ہے کہ آپ نے فرمایا میں تمام عرب میں افصح ہوں کیونکہ حرف ضاد، عرب کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔ دنیا کی کسی دوسری زبان میں یہ حرف نہیں ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اہل عرب میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جو اس حرف کو کماحقہ ادا کر سکے۔ اس حرف ضاد کا مخرج داہنے یا بائیں اضراس یعنی عقل داڑھ ہے۔ کہتے ہیں کہ بائیں طرف سے اس کی ادائیگی زیادہ آسان ہے لیکن صحابۂ کبار میں سے کچھ حضرات اس کا دونوں جانب سے اخراج کرتے تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خوب واضح اور مفصل کلام کے ساتھ تکلم فرماتے تھے اور جدا جدا ان کلمات کو گنا جا سکتا تھا۔ آپ ایک کلمہ کی تین تین بار تکرار فرمایا کرتے تھے تاکہ خوب سمجھ لیا جائے۔ یہ تکرار گفتگو کے ابہام واشتباہ کو دور کرنے کیلئے ہوتی ہوگی ورنہ آپ ہر بات اور ہر کلام میں ایسا نہ کرتے ہوں گے۔ واللہ اعلم۔

بیان جوامع الکلم:۔ خاتم الانبیاء احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام مبارک کے خصائص میں آپ کا ارشاد ہے فرمایا

أُوتِيتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ وَاُخْتُصِرَ لِيَ الْكَلَامُ مجھے جوامع الکلم دیا گیا اور میرے لئے کلام مختصر کیا گیا۔

جوامع الکلم سے مراد وہ کلمات ہیں جو غایت اختصار میں ہوں اور معانی کثیرہ کے حامل ہوں۔ علماء نے اپنی وسعت اور طاقت کے اعتبار سے بعض ایسے کلمات جمع فرمائے ہیں اور خاص کردہ خطوط وپیغامات جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہوں، حاکموں اور بڑے بڑے امراء وقت کو ارسال فرمایا تھا ان میں ہر قوم کو اسی کی زبان میں مخاطب فرمایا تھا۔ علماء نے انہیں جمع کر کے ان کی شرح وتفسیر بیان کی ہے۔ ان میں سے کچھ کلمات جو آپ کے حلیۂ کمال اور زینتِ جمال کے حکم میں ہیں۔ تصور وخیال سے بیان کرتا ہوں کہ یہ کلمات آپ کی زبان مبارک سے صادر ہوئے ہوں گے۔

حرف از دہان دوست شنیدن چہ خوش بود با از دہاں آنکہ شنید از دہان دوست

اول حدیث:۔

إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ ہر عمل کا دارومدار نیت پر ہے۔

یہ حدیث اصول دین سے اصلِ عظیم اور تمام حدیثوں میں جامع تر اور مفید ترین ہے۔ بعض حضرات تو اسے علم دین کا تہائی حصہ کہتے ہیں بایں لحاظ کہ دین، قول وعمل اور نیت پر مشتمل ہے اور بعض نے اسے نصف علم دین قرار دیا ہے۔ اس اعتبار سے کہ اعمال دو قسم کے ہیں ایک عمل بالقلب دوسرا عمل بالجوارح۔ اعمالِ قلب میں نیت سب سے زیادہ افضل ہے۔ اس بنا پر عمل، اس نصف علم (نیت) سے متعلق ہوگا۔ بلکہ دونوں نصفوں میں بہت بڑا۔ دراصل نیت ہی قلبی، جسمانی اعمال اور جملہ عبادات کی اصل بنیاد ہے اگر اس اعتبار سے اسے تمام علم کہیں تو یہ مبالغہ بھی درست ہوگا۔

۲۔ مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ۔ جو مرد عمدہ طریق پر اسلام لایا اس نے ہر لغویت سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

۳۔ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ يَدِهٖ وَلِسَانِهٖ۔ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے تمام مسلمان محفوظ رہیں۔

۴۔ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ۔ تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

۵۔ اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ كُلُّهٗ۔ دین اول تا آخر نصیحت وبھلائی ہے۔

۶۔ اَلْبَلَاءُ مُوَكَّلٌ بِالنُّطْقِ۔ گویائی مصیبتیں پیدا کرتی ہے۔

۷۔ اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَةِ۔ — محفلوں کی باتیں امانت ہیں۔

۸۔ اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمِنٌ۔ — جس سے مشورہ لیا جائے وہ بات کا امین ہے۔

۹۔ تَرْكُ الشَّرِّ صَدَقَةٌ۔ — برائی کو چھوڑنا صدقہ ہے۔

۱۰۔ اَلْحَيَاءُ خَيْرٌ كُلُّهُ۔ — حیاء کامل بھلائی ہے۔

۱۱۔ فَضْلُ الْعِلْمِ خَيْرٌ مِّنْ فَضْلِ الْعِبَادَةِ۔ — علم کی فضیلت، عبادت کی فضیلت سے بہتر ہے۔

۱۲۔ اَلصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنَتَانِ فِيْهِمَا اَكْثَرُ النَّاسِ۔ — صحت و فراغت خسارے کی نعمتیں ہیں ان دونوں میں اکثر لوگ مبتلا ہیں۔

۱۳۔ مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا۔ — جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں۔

۱۴۔ اَلدَّالُّ عَلَى الْخَيْرِ كَفَاعِلِهِ۔ — نیکی کی راہ دکھانے والا ایسا ہی ہے جیسے اس نے نیکی کی۔

۱۵۔ حُبُّ الشَّيْئِ يُعْمِيْ وَيُصِمُّ — کسی چیز کی محبت اسے اندھا اور بہرا کر دیتی ہے۔

۱۶۔ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ۔ — آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے محبت رکھتا ہے۔

۱۷۔ لَا تَرْفَعْ عَصَاكَ عَنْ اَهْلِكَ — اپنی اہل سے اپنی لاٹھی کو نہ اٹھاؤ۔

۱۸۔ خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهِ — تم میں بہتر وہ ہے جو اپنی اہل کے لئے بہتر ہے۔

۱۹۔ مَنْ اَبْطَاَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ — جس کا عمل سست ہے اس کا نسب چست نہ کریگا۔

۲۰۔ زُرْ غِبًّا تَزْدَدْ حُبًّا۔ — زیارت کر ناغہ کے ساتھ توشہ کر محبت کے ساتھ۔

۲۱۔ اِيَّاكُمْ وَخَضْرَاءَ الدِّمَنِ — بچو تم امن کی فراخیوں سے۔

۲۲۔ لَنْ يُّشَادَّ الدِّيْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهُ۔ — ہر گز نہیں چاہتا کوئی دین داری مگر وہ اس پر غالب ہوتا ہے۔

۲۳۔ اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ — جو اپنے نفس کو دین دار بنا کر تھیلی تیار کرے وہ عمل کرے موت کے بعد کے لئے۔

۲۴۔ اَلْفَاجِرُ مَنِ اتَّبَعَ نَفْسَهُ وَتَمَنّٰى عَلَى اللهِ۔ — فاجر وہ ہے جو اپنی خواہش کی پیروی کرے۔ اور خدا سے امید رکھے۔

۲۵۔ لَيْسَ الشَّدِيْدُ مَنْ غَلَبَ النَّاسَ اِنَّمَا الشَّدِيْدُ مَنْ غَلَبَ نَفْسَهُ۔ — لوگوں کا غالب ہونا شدید نہیں البتہ اپنے نفس کا غالب ہونا شدید ہے۔

۲۶۔ اَلثَّنَاءُ رَبِيْعُ الْمُؤْمِنِ۔ — حمد و ثنا کرنا مومن کی بہار ہے۔

۲۷۔ اَلْقَنَاعَةُ كَنْزٌ لَا يَفْنٰى۔ — قناعت ایسا خزانہ ہے جو کبھی ناپید نہیں ہوتا۔

۲۸۔ اَلْاِقْتِصَادُ فِي النَّفَقَةِ نِصْفُ الْمَعِيْشَةِ۔ — خرچ میں میانہ روی نصف معیشت ہے۔

۲۹۔ اَلتَّوَدُّدُ اِلَى النَّاسِ نِصْفُ الْعَقْلِ — لوگوں سے محبت کا برتاؤ کرنا آدھی عقلمندی ہے۔

۳۰۔ حُسْنُ السُّؤَالِ نِصْفُ الْعِلْمِ۔ — عمدہ طریق سے پوچھنا آدھا علم ہے۔

۳۱۔ لَا عَقْلَ كَالتَّدْبِيْرِ۔ — تدبیر کی مانند عقل نہیں ہے۔

۳۲۔ لَا وَرَعَ كَالْكَفِّ۔ — زبان روکنے کی مانند پارسائی نہیں ہے۔

۳۳۔ لَا حُبَّ كَحُسْنِ الْخُلُقِ۔ — خوش اخلاقی کی مانند محبت نہیں ہے۔

۳۴۔ اَلرَّضَاعُ يُغَيِّرُ الطِّبَاعَ۔ — رضاعت غیر طبعی ہے۔

۳۵۔ اَلْاِيْمَانُ يَمَانٍ۔ — ایمان حفاظت ہے۔

۳۶۔ لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَۃَ لَہٗ — جو امانت دار نہیں وہ ایمان دار نہیں۔

۳۷۔ لَا دِیْنَ لِمَنْ لَّا عَہْدَ لَہٗ ۔ — جو عہد کو پورا نہ کرے وہ دیندار نہیں۔

۳۸۔ جَمَالُ الرَّجُلِ فَصَاحَۃُ لِسَانِہٖ ۔ — آدمی کی خوبصورتی اس کے زبان کی فصاحت ہے۔

۳۹۔ لَا فَقْرَ اَشَدُّ مِنَ الْجَہْلِ ۔ — جہالت سے بڑھ کر سخت محتاجی نہیں ہے۔

۴۰۔ لَا مَالَ اَعَزُّ مِنَ الْعَقْلِ ۔ — عقل سے زیادہ پیاری تونگری نہیں ہے۔

۴۱۔ مَا جَمَعَ شَیْئٌ اَحْسَنَ مِنْ عِلْمٍ اِلٰی عِلْمٍ — کسی چیز کو کسی چیز سے جمع کرنا علم کو علم سے زیادہ اچھا نہیں ہے۔

۴۲۔ کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ کَعَابِرِیْ سَبِیْلٍ وَّعُدَّ نَفْسَکَ مِنْ اَصْحَابِ الْقُبُوْرِ ۔ — دنیا میں مثل مسافر یا راہ چلنے والے کی مانند رہو اور اپنے آپ کو صاحب قبر شمار کرو۔

۴۳۔ اَلْعَفْوُ لَا یَزِیْدُ الْعَبْدَ اِلَّا عِزًّا ۔ — درگزری بندے میں عزت کو بڑھاتی ہے۔

۴۴۔ اَلتَّوَاضُعُ لَا یَزِیْدُ اِلَّا رِفْعَتَہٗ ۔ — نگونساری درجہ کی بلندی ہی کو زیادہ کرتی ہے۔

۴۵۔ مَا نَقَصَ مَالٌ مِّنْ صَدَقَتِہٖ — صدقہ دینے سے مال کم نہیں ہوتا۔

۴۶۔ کُنُوْزُ الْبِرِّ کِتْمَانُ الْمَصَائِبِ ۔ — نیکی کا خزانہ مصائب کے چھپانے میں ہے۔

۴۷۔ لَا تُظْہِرِ الشَّمَاتَۃَ بِاَخِیْکَ فَیُعَافِیْہِ اللّٰہُ وَیَبْتَلِیْکَ ۔ — اپنے بھائی کو شرمسار نہ کرو کہیں خدا تمہاری گرفت نہ کرے اور تمہیں بھی اس میں آلودہ کرے۔

ان کلمات سے ہر ایک کلمہ عجائب و غرائب اور دین و دنیا کے آداب پر مشتمل ہے اور یہ قاعدے دنیا و آخرت میں نیک بختی کو شامل ہیں۔ اس قسم کے کلمات بے شمار اور بے اندازہ ہیں۔ بالفعل اس وقت جو نظر میں آئے انہیں لکھ دیا۔ ان میں سے ہر ایک کی شرح اور تفصیل اگر بیان کی جائے تو دفتر کے دفتر سیاہ ہو جائیں لیکن کام ختم نہ ہو۔

حدیث مبارک اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ کُلُّہٗ (دین اول تا آخر نصیحت و بھلائی ہے) یہ اولین و آخرین کے تمام علوم پر مشتمل ہے۔ اگر دنیا کے تمام علماء جمع ہو کر اس کی تشریح میں لب کشائی کریں تو اس کے ایک حصہ سے بھی عہدہ بر آنہ ہو سکیں گے۔ کیونکہ وہ جو کچھ بھی کہیں گے اپنے علم و حوصلہ اور فہم کی سطح کے مطابق کہیں گے۔ فارسی کے رسالے میں اس کا اشارہ کیا گیا ہے۔

سر مبارک : حضور اکرم ﷺ کے سر مبارک کی توصیف میں ابن ابی ہالہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث مرقوم ہے۔ کہ "کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ عَظِیْمَ الْھَامَۃِ" رسول اللہ ﷺ کا سر مبارک عظیم تھا۔ سر کی بزرگی، وفور عقل اور جودت فکر کی اس بنا پر دلیل ہے کہ سر جوہر دماغ کا حامل ہوتا ہے یہاں پر سر کو عظیم کہنے سے کوتاہی اور اس کی چھوٹائی کی نفی کرنا مقصود ہے ورنہ آپ کے تمام اعضاء و جوارح میں وجود اعتدال کی رعایت کی گئی ہے جیسا کہ پہلے بھی اس طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اور ہر جگہ اس قاعدہ کلیہ کو یاد رکھنا چاہئے۔

موئے مبارک : حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ کے بالوں کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا آپ کے بال رَجِل (نرم) تھے۔ رَجِل بفتح را و کسر جیم اور فتح سے بھی آیا ہے۔ اسی طرح سبط و قَطَط مراد ہے۔ سبط بفتح سین و سکون با و کسر با بمعنی نرم لٹکے ہوئے بال اور قَطِط بفتح قاف و کسر طا و فتح طا ایسے بال جو سخت اور پیچیدہ ہوں جیسے حبشیوں کے بال ہوتے ہیں اردو میں انہیں گھونگریالے بال کہا جاتا ہے۔ بعض حدیثوں میں آپ کے موئے

مبارک کو "جعد" بمعنی سخت پیچیدہ بتایا گیا ہے حالانکہ مکمل جعد نہ تھے۔ بلکہ قَطَطْ ور جعد یعنی نرم، دراز اور گھونگھریالے تھے۔ سبط و قطط کی ضد کے معنی میں جعد کا اطلاق جائز نہ ہوگا اور بعض حدیثوں میں جعد کی نفی کی گئی ہے۔ جعد بہت سخت اور بل کھائے ہوئے بالوں کو کہتے ہیں اور صراح میں جعد بمعنی مرغول اور قطط بمعنی مرغول اور بسط بمعنی لٹکے ہوئے بال لکھا ہے۔ لہٰذا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بال بسط تھے نہ قطط بلکہ دونوں کے درمیان تھے جسے رَجِل کہتے ہیں۔

آپ کے بالوں کی لمبائی کانوں کے درمیان تک دوسری روایت میں کانوں تک اور ایک تیسری روایت کے بموجب کانوں کی لو تک تھی۔ ان کے علاوہ کندھوں تک یا کندھوں کے قریب تک کی روایتیں بھی ہیں۔ ان سب روایتوں میں باہمی مطابقت اس طرح ہے کہ آپ کبھی تیل لگاتے یا کنگھی فرماتے تو بال دراز ہو جاتے ورنہ اس کے برعکس رہتے یا پھر بال ترشوانے سے پہلے اور بعد ان میں اختصار طول ہوتا رہتا تھا۔ مواہب لدنیہ میں اور اس کے موافق "مجمع البحار" میں یہ مذکور ہے کہ جب بالوں کے ترشوانے میں طویل وقفہ ہو جاتا تو بال لمبے اور جب ترشواتے تو چھوٹے ہو جاتے تھے۔ اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بالوں کو ترشواتے تھے مونڈواتے نہ تھے۔ لیکن حلق (مونڈوانے) کے بارے میں خود فرماتے ہیں کہ آپ حج و عمرہ کے دو موقعوں کے سوا بال نہیں منڈواتے تھے واللہ اعلم۔ اور ام ہانی کی روایت میں ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں رونق افروز ہوئے تو آپ کے بالوں کی چار لٹیں تھیں اور سر کے بالوں کا چھوڑنا سنت ہے۔ زمانہ قدیم سے عربوں میں یہ عادت تھی۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ بالوں کی نگہداشت کی جائے۔ یعنی تیل اور کنگھی وغیرہ ہوتی رہنی چاہئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بالوں میں کثرت سے کنگھی کیا کرتے تھے۔ آپ جس کسی کے پراگندہ اور ابتر بال دیکھتے تو کراہت سے فرماتے کہ تم میں سے کسی کو وہ نظر آیا ہے یہ اشارہ شیطان کی طرف ہے۔ اسی طرح آپ بہت زیادہ بنے سنورے اور لمبے بالوں والوں سے بھی کراہت فرماتے تھے۔ اعتدال اور درمیانہ روی آپ کو بہت پسند تھی۔ جو کوئی بالوں میں تیل کنگھی نہیں کر سکتا اس کے لئے بالوں کا ترشوانا بہتر ہے۔ امیرالمومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ میں نے سر کے بالوں کو اس وقت سے دشمن جانا ہے جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے کہ ہر بال کے بیچ میں جنابت یعنی ناپاکی ہے۔ ورنہ ہر اہل زمانہ خصوصاً مشائخ وزہاد وعباد میں بالوں کے ترشوانے کا جو رواج ہوا ہے اس کی بظاہر یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ یا تو بالوں میں تیل و کنگھی کی استطاعت نہ رکھتے تھے یا انہیں اس کی فرصت نہ ملتی ہوگی۔

فائدہ: ۔ بالوں کے بارے میں سنت وہی ہے جسے اوپر بیان کیا گیا ہے اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں وارد ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بالوں میں "سدل" فرماتے تھے۔ اہل کتاب بھی سدل کرتے تھے لیکن مشرکین اپنے بالوں میں "فرق" کرتے تھے۔ "سدل" سے مراد بالوں کا پیشانی کے اطراف پر لٹکانا ہے اور "فرق" کا مطلب بالوں کو ایک دوسرے سے جدا کر کے اس طرح سنوارنا کہ درمیان میں مانگ نکل آئے اسے مفرق یعنی تارک سر کہتے ہیں۔ جسے مانگ کہا جاتا ہے۔ چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان امور میں جن کا حکم الٰہی نہ ہوا اہل کتاب کی موافقت کو پسند کرتے ہیں۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم "فرق" فرمانے لگے۔ یعنی بالوں کے درمیان سے مانگ نکالنے لگے۔ اس بناء پر علماء فرماتے ہیں کہ فرق کرنا سنت ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "سدل" سے "فرق" کی طرف رجوع فرمایا۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ آپ کو ایسا حکم دیا گیا۔ لہٰذا "سدل" منسوخ ہو گیا۔ اس کا بھی احتمال ہے کہ "فرق" کو اختیار فرمانا اجتہاد سے ہے کہ اس میں اہل کتاب کی مخالفت ہے۔ کیونکہ غیر مامور بہ امور میں اہل کتاب کی موافقت ان کی تالیف قلوب کے لئے تھی۔ جب حق تعالیٰ نے آپ کو ان سے بے نیاز کر دیا تو آپ نے ان کی موافقت کو ترک فرما دیا۔ خلاصہ کلام یہ کہ "سدل" اور "فرق" دونوں جائز ہیں۔ اور فرق زیادہ احب وافضل ہے۔ جیسا کہ علماء

نے فرمایااور مختار یہ ہے کہ اگر خود بخود مانگ نکل آئے تو مانگ نکال لے ورنہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دے واللہ اعلم۔

مسئلہ خضاب کی وضاحت۔۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے لیکن اکثر کا اور خصوصا محدثین کا مذہب یہی ہے کہ یہ مکروہ ہے۔ اس لئے کہ آپ کو ایسا بڑھاپا آیا ہی نہیں جس میں خضاب کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی۔ کیونکہ آپ کے سراقدس اور ریش مبارک میں چودہ یا سترہ یا اٹھارہ (سفید) بال تھے اور جب بالوں میں تیل کی مالش کرلی جاتی تھی تو یہ سفیدی بھی روپوش ہوجاتی تھی۔ حضرت انس رضی اللہ فرماتے ہیں کہ ریش مبارک اور سراقدس میں صرف چند بال سفید تھے اگر میں چاہتا تو شمار کرلیتا۔ اور فرماتے ہیں کہ آپ نے خضاب نہیں کیا۔ اور یہ جو مروی ہے کہ "حضرت انس رضی اللہ عنہ،حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ موئے مبارک جو ان کے پاس تھے مخضوب تھے۔" علماء فرماتے ہیں وہ مخضوب نہ تھے بلکہ وہ کسی خوشبو وغیرہ سے ممزوج و معطر تھے اور مخضوب معلوم ہوتے تھے۔ یا پھر حضرت انس نے انہیں محفوظ رکھنے کے لئے مخضوب کرر کھاتھا۔ اور یہی حال ام سلمہ کی حدیث میں کلام کا ہے۔ مواہب لدنیہ میں صحیحین سے بروایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نقل کیا ہے کہ "انہوں نے حضور کو زرد رنگ کردہ دیکھا۔" علماء فرماتے ہیں کہ اس زردی سے مراد زعفران ہے۔ اور میں نے حضرت شیخ امام اجل عبدالوہاب متقی سے سنا ہے کہ یہ خضاب نہ تھا۔ اس لئے کہ آپ کے موئے ہائے مبارک سیاہ تھے۔ اور سیاہی کوئی رنگ قبول نہیں کرتی بلکہ اس زردی سے صفائی و پاکیزگی فرمائی تھی یعنی اس سے دھویا اور صاف کیا ہو مگر وہ چند موئے شریف نے ضرور رنگ پکڑا ہوگا جو سفید تھے اور جب کہ یہ خضاب پیری میں کیا ہو۔ یہ مقام غور وفکر ہے۔ اور وہ امام نووی سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا مختار یہ ہے کہ کبھی کبھی رنگ کرتے ورنہ اکثر اپنے حال پر چھوڑ دیتے تھے۔ لہٰذا جس نے جس وقت جیسا دیکھا اسے بیان کردیا۔ ہر ایک صادق ہے۔ اور فرمایا یہ تاویل متعین ہے۔ اس لئے کہ حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما صحیحین میں ہے نہ اس کا ترک ممکن ہے اور نہ اس کی تاویل ممکن ہے۔ بعض علماء نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عدم شیب کے بارے میں باوجود اس احتمال کے کہ آپ کا سن شریف اس حد تک تھا جس میں عورتیں اکثر بالوں کی سفیدی کو ناپسند کرتی ہیں۔ کہا ہے کہ:۔
ہر کہ مکروہ پندار داز حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چیزے راکافر شود۔ (جو شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی چیز کو مکروہ جانے وہ کافر ہوجاتا ہے۔)

اور متعدد روایتوں میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ شیب (بڑھاپے) کو اس جگہ عیب گردانتے اور فرماتے "مَاشَانَہُ اللہُ بِالشَّیْبِ" یعنی اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شیب (بڑھاپے) کی حالت نہ دی اور علماء فرماتے ہیں کہ تعجب ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ایسا فرمایا حالانکہ حدیث مبارک میں وارد ہوا ہے کہ شیب یعنی بڑھاپا وقار اور نور ہے۔ اور بڑھاپے کی تعریف زبان نبوت پر ہے اور علماء فرماتے ہیں کہ جب حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خضاب اور ظاہر حالت کو بدلنے میں مبالغہ فرماتے دیکھا اور جب حضرت ابوبکر صدیق کے والد حضرت ابو قحافہ کے سر اور داڑھی کے تمام بال سفید ہوگئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مکروہ جانا اور ان سے فرمایا کہ بڑھاپے کو جوانی سے بدل دو۔ یعنی بالوں کی سفیدی کو سیاہی سے تبدیل کردو۔ لہٰذا چونکہ حضرت انس نے بڑھاپے کو مکروہ قرار دینے والی حدیث کو جان لیا تھا اس لئے دوسری حدیث انہوں نے نہ سنی یا یہ خیال کیا کہ وہ حدیث اس حدیث سے منسوخ ہے اور اسی پر انہوں نے حکم دیا۔ کذا فی المواھب اللدنیہ۔
(حضرت شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی "ثبتہ اللہ فی مقام الیقین" فرماتے ہیں کہ) اس میں شک نہیں کہ شباب، قوت و

قدرت اور ہیبت کے لحاظ سے اعداء دین کی آنکھوں میں کمال ہے۔ کیونکہ تقویت دین اور اظہار شوکت اسلام میں ان کا بڑا دخل ہے۔ خاص کر زمانہ نبوت میں کہ کفار سے جہاد کے سبب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شیب یعنی بڑھاپے سے محفوظ رکھا۔ جو ضعف اور عجز کی علامت ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرام کو خضاب یا جوانوں کے ساتھ مشابہت رکھنے کی ترغیب دینا اسی غرض کی بنا پر تھا اور آپ پر حدوث شیب اور اس کا ظہور چند بالوں کی حد تک تھا۔ اور یہ بھی خوف و خشیت الٰہی کی وجہ سے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا۔

شَيَّبَتْنِيْ سُوْرَةُ هُوْدٍ وَالْوَاقِعَةُ وَالْمُرْسَلَاتُ — مجھے سورہ ہود، الواقعہ، المرسلات، عم یتساءلون

وَعَمَّ يَتَسَاءَلُوْنَ وَاِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ — اور واذا الشمس کورت نے بوڑھا کر دیا۔

یہ بھی اتنا نہ تھا کہ شباب کی صورت میں خلل پیدا ہوتا بلکہ شباب کے ساتھ شیب کے وقار و نور بھی پائے جاتے تھے۔ جس طرح کہ حضرت خلیل اللہ صلوات اللہ وسلامہ علیہ اور آپ کے فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام کے درمیان امتیاز کے لئے بالوں کی سفیدی کو بھیجا تھا۔ اس پر آپ نے عرض کیا "ما ہذا یا رب" اے رب یہ کیا ہے۔ "قَالَ هٰذَا وَقَارٌ" حق تعالیٰ نے فرمایا یہ وقار ہے۔ انہوں نے کہا "رَبِّ زِدْنِيْ وَقَارًا" میرے رب میرے وقار کو اور زیادہ کر۔ "فافہم وباللہ التوفیق"۔

لحیہ شریف: ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی لحیہ مبارک یعنی ریش مبارک کے بارے میں ابن ابی ہالہ کی حدیث میں ہے کہ:

كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَثَّ اللِّحْيَةِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک میں بال بکثرت تھے۔

لغت میں کث بمعنی کثیف ہے جو کہ لطیف کی ضد ہے مقولہ عرب ہے کہ "رَجُلٌ كَثُّ اللِّحْيَةِ وَكَثٌّ كَثِيْفُ اللِّحْيَةِ وَلِحْيَةٌ كَثٌّ" شفاء قاضی عیاض میں کہا گیا ہے "اَللِّحْيَةُ يَمْلَأُ صَدْرَهٗ" یعنی آپ کی ریش مبارک کے بال اس کثرت سے تھے کہ جس سے آپ کا سینہ مبارک بھر گیا تھا اور ریش مبارک کی لمبائی میں کوئی معین انداز کتابوں میں نظر سے نہیں گزرا۔ وظائف النبی میں کہا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک طبعاً چار انگل تھی۔ اس سے کم نہ ہوتی تھی۔ اس پر کوئی سند نہیں پائی جاتی اور داڑھی کا لمبا کرنا موجب حسن و جمال ہے خصوصاً جب داڑھی گھنی ہو۔ واللہ اعلم۔

نیز یہ بات اس چیز کے مخالف ہے جو کہ شفا میں مذکور ہے اور اس روایت کے منافی ہے جو ترمذی کی حدیث میں آئی ہے کہ "حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ریش مبارک پکڑتے اور شارب یعنی لبوں کو ترشواتے اور فرماتے جو لبوں کو نہ ترشوائے وہ ہم میں سے نہیں۔"

صحیحین میں مذکور ہے کہ مشرکوں کی شکل کی مخالفت کرو اور ایک روایت میں ہے کہ مجوس یعنی آتش پرستوں کی مخالفت کرو۔ اور بہت کرو۔ اور اپنی داڑھیوں کو بڑھاؤ اور لبوں کے پست کرنے اور اس کے ترشوانے میں مبالغہ کرو۔ اور ائمہ کا مذہب لبوں کے ترشوانے میں مختلف ہے۔ کم سے کم یہ ہے کہ اطراف لب ظاہر ہوں اور لبوں کا منڈوانا بدعت ہے اور بعض کے نزدیک سنت ہے اور احناف کے نزدیک احفاء ہے یعنی جڑ سے اکھاڑنا ہے۔ لیکن حدیث میں آیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لبوں کو مسواک سے اٹھایا اور یہ بظاہر احفاء کے منافی ہے۔ جیسا کہ کہا گیا۔ حالانکہ یہ کسی خاص وقت میں ہوا ہو گا ورنہ اکثر اوقات احفا ہی ہو گا۔ اور ہمارے یعنی حنفیوں کے مذہب میں یہ ہے کہ ابرو کے مقدار میں چھوڑ دیئے جائیں۔ غازی اس سے مستثنیٰ ہیں اور انہیں مستحب ہے کہ لبوں کو لمبا رکھیں تاکہ دشمنوں کی نظر میں ہیبت و دبدبہ ظاہر ہو لیکن لبوں کو اتنا دراز نہ کرے کہ اطراف لب ہی ڈھک جائیں۔ "كَذَا فِيْ مَطَالِبِ الْمُؤْمِنِيْنَ نَقْلًا عَنِ الذَّخِيْرَةِ" لبوں کے دونوں کناروں کے بالوں کے چھوڑنے میں مضائقہ نہیں ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ اور دیگر صحابہ کبار لبوں کے گوشوں کو چھوڑ دیا کرتے تھے۔ اس لئے کہ وہ منہ کو

نہیں ڈھانپتے اور نہ کھانے سے آلودہ ہوتے ہیں اور مونڈ نے اور زیر لب جسے عنفقہ کہتے ہیں ان کے بالوں کے چھوڑنے میں بھی اختلاف ہے۔ اور افضل ان کا چھوڑنا ہے۔ لیکن عنفقہ کے دونوں کناروں کے مونڈنے میں مضائقہ نہیں ہے۔ اور داڑھی کے بڑھانے حد میں بھی اختلاف ہے۔ مذہب حنفی میں چار انگل ہے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ اس سے کم نہ ہو۔ لیکن ایک روایت میں یہ ہے کہ اس سے زائد بالوں کو کاٹنا واجب ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ اگر علماء و مشائخ اس سے زائد بڑھائیں تو بھی درست ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ صحیح بخاری میں کتاب اللباس کے آخر میں مذکور ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنی داڑھی کو مٹھی میں لے کر اس سے زائد بال قطع کرا دیا کرتے تھے۔

كَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا حَجَّ أَوِ اعْتَمَرَ قَبَضَ عَلَىٰ لِحْيَتِهِ فَمَا فَضَلَ أَخَذَهُ۔ حضرت ابن عمر جب حج یا عمرہ کرتے تو اپنی داڑھی کو مٹھی میں لیتے اور جو اس سے زائد بال ہوتے قطع کرا دیتے۔

حضرت نافع نے بروایت ابن عمر حدیث نقل کی ہے کہ :۔

قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْهَكُوا الشَّوَارِبَ وَاعْفُوا اللُّحٰى۔ لبوں کے تراشنے میں مبالغہ کرو اور داڑھی کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔ اس سے تعرض نہ کرو۔

جب داڑھی کو اپنے حال پر چھوڑنا مامور بہ ہے تو پھر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کیوں مابعد القبضہ کترواتے تھے حالانکہ وہی اس حدیث کے راوی ہیں۔ شارحین اس کا یہ جواب دیتے تھے کہ ان کا کتروانا حج و عمرہ کے ساتھ مخصوص تھا۔ اور عجمیوں کی مانند عمل کرنے کی ممانعت کی گئی ہے اور اس باب میں سلف کی عادت مختلف تھی۔ بیان کرتے ہیں کہ علی مرتضٰی کی داڑھی ان کے سینے کو بھرتی تھی۔ اسی طرح سیدنا عمر فاروق اور عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہما کے بارے میں منقول ہے اور حضرت سیدنا غوث الاعظم محی الدین شیخ عبدالقادر رضی اللہ عنہ کی داڑھی طویل و عریض تھی۔

عانہ شریف : ۔ موئے زیر ناف صاف کرنے کے بارے میں بعض حدیثوں میں آیا ہے مونڈتے تھے اور بعض میں آیا ہے کہ نورہ استعمال کرتے تھے۔ دونوں جانب کی حدیثیں ضعیف ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ حمام تشریف لے گئے نہ اسے دیکھا۔ حمام کا ظہور آپ کی رحلت کے بعد بلاد عجم فتح ہوتے وقت ہوا۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حمام کے ہونے کی خبر دے دی تھی۔ اور عورتوں کو حمام میں جانے کی ممانعت کر دی تھی مگر کسی ضرورت کے تحت جیسے فصد اور علاج وغیرہ ہیں۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن بعض روایتوں میں جمعرات کے دن لبیں اور ناخونہائے مبارک ترشواتے تھے۔ ناخنوں کے کاٹنے کی کیفیت میں کوئی چیز ثابت نہیں ہے لیکن انتخابات پائی جاتی ہے کہ ناخنوں کے کاٹنے کی ابتداء سبابہ یعنی انگشت شہادت سے فرماتے اور داہنے ہاتھ کے انگوٹھے پر ختم کرتے تھے۔ اور وہ نظم جو حضرت علی مرتضٰی سے منسوب ہے اس میں ہے کہ ۔

قَلِّمِ الْاَظْفَارَ بِالسُّنَّةِ وَالْاَدَبِ ۔ يُمْنٰهَا خوابس يسارها اوخسب

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسواک اور کنگھی کبھی جدا نہ فرماتے تھے۔ جب تیل ملتے تھے تو داڑھی شریف میں کنگھی فرماتے۔ اور اپنے جمال شریف کو آئینہ میں ملاحظہ فرماتے تھے۔ "الحق" آئینہ دیکھنا آپ ہی کو سزاوار ہے کیونکہ آپ کا جمال جہاں آرا نور، مطلع نور الٰہی اور مظہر اسرار نامتناہی ہے۔

ز آئینۂ حسن تراجدائی نیست غرض تجلی حسن است خود نمائی نیست = صلی اللہ علیہ و آلہ قدر حسنہ و جمالہ

گردن شریف : ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عنق یعنی گردن **شریف** کے بارے میں ابن ابی ہالہ کی حدیث میں ہے کہ
كَانَ عُنُقُهٗ جِيْدُ دُمْيَةٍ فِيْ صَفَاءِ الْفِضَّةِ ۔ آپ کی گردن مبارک چاندی کی صفائی میں چمکدار اور دمیہ کی مانند تھی۔
"دمیہ" بضم دال وسکون میم، وہ مجسمہ جو ہاتھی دانت سے تراشا گیا ہو "کذا فی النہایہ" قاموس میں ہے وہ مجسمہ جو رخام یعنی سنگ سفید سے تراشا گیا ہو۔ اگرچہ آپ کی گردن مبارک کو صنم یا مجسمہ سے تشبیہ دینے میں شان ادب کے خلاف نظر آتا ہے۔ لیکن چونکہ اس کاریگری میں خوب آراستگی اور مبالغہ کیا جاتا ہے۔ اس لئے اس کی تحسین میں اس سے تشبیہ دی گئی ہے "کذا فی النہایہ" اور شمائل ترمذی کے حاشیہ میں ہے کہ "اَلدُّمْيَةُ الْغَزَالُ" یعنی دمیہ غزال یعنی ہرن کو کہتے ہیں اور دوسرے حاشیہ میں دمیہ ہرن کے بچہ کو کہتے ہیں۔ لیکن لغت کی کتابوں میں یہ معنی نہیں پائے گئے۔ واللہ اعلم۔
اور حدیث میں الفاظ فی صفاء الفضۃ کی (چاندی کی صفائی میں) ظاہر عبارت سے گردن کی صفت معلوم ہوتی ہے اور مواہب کی دوسری حدیث میں ہے کہ
قَالَ اَبُوْهُرَيْرَةَ كَانَ جِيْدُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَبْيَضَ كَاَنَّمَا صِيْغَ مِنْ فِضَّةٍ ۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ کی گردن مبارک سفید تھی گویا کہ چاندی سے بنائی گئی ہے۔
معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی صفات میں سے یہ صفت علیحدہ ہے۔
منکبین شریف : ۔ منکب بفتح میم وکسر کاف بمعنی سر، شانہ اور بازو کے اجتماع کی جگہ۔ جسے کندھا کہتے ہیں اور صراح میں منکب، بمعنی بن وبازو وشانہ ہے اس کے وصف میں واقع ہوا ہے کہ "بَعِيْدُ مَا بَيْنَ الْمَنْكِبَيْنِ" دونوں منکب کے درمیان دوری تھی "بُعَيْدُ" کو بصیغہ "تصغیر بُعَيْد" بھی پڑھا ہے اور بعضوں نے اس کی تفسیر "عَرِيْضُ الصَّدْرِ" (سینہ کی چوڑائی) سے کی ہے۔ حالانکہ عرض صدر ایک علیحدہ صفت ہے جو کہ مروی ہے کہ "عَرِيْضُ الصَّدْرِ بَعِيْدُ مَا بَيْنَ الْمَنْكِبَيْنِ" اور یہ دونوں صفتیں ایک دوسرے کے ساتھ لازم ہیں چونکہ یہ صفت دو عضو سے متعلق ہیں اس لئے جدا جدا ذکر کی گئی ہیں۔
صدر شریف : ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا صدر مبارک یعنی سینہ شریف کشادہ اور محسوس تھا۔ یہ صورت ظاہری حلیہ کے بیان میں داخل ہے اس لئے اس قدر بیان ہے ورنہ صدر معنوی وہ ہے جس کا ذکر آیت کریمہ میں یوں آیا ہے۔
اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۔ اے محبوب کیا ہم نے آپ کو شرح صدر عطا نہ فرمایا۔
یہ اس طرف اشارہ ہے کہ آپ کا مقام بہت عالی ہے کیونکہ اس کا تمام وکمال، ذات بابرکات حضرت سید السادات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے۔
قلب اطہر : ۔ مواہب لدنیہ میں قلب اطہر کا بھی ذکر آیا ہے (چونکہ دل باطنی اعضاء سے ہے اور یہاں اس کی ظاہری صورت سے بحث نہیں اس لئے غور وفکر کرنا چاہئے۔ اور بعض روایتوں میں "عظیم مشاش المنکبین والکتد" بھی آیا ہے۔ کتد بفتح کاف وکسر تاء فوقانیہ اور فتح تاء وہ جگہ جہاں دونوں مونڈھے ملتے ہیں اور مشاش بضم میم، سر کی ہڈیوں کو کہتے ہیں۔
بطن اطہر : ۔ نیز ایک روایت میں "سَوَاءُ الْبَطْنِ وَالصَّدْرِ" بھی آیا ہے یعنی نہ سینہ شکم سے بلند اور نہ شکم سینہ سے دونوں برابر اور ہموار تھے۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں "مفاض البطن" بیان ہوا ہے۔ جس کی تفسیر "واسع البطن" سے کی گئی ہے جو کہ عریض الصدر کو لازم ہے اور بعض حضرات "مُسْتَوِي الْبَطْنِ وَالصَّدْرِ" سے تفسیر کرتے ہیں۔
حضرت ابن ام ہانیؓ نے آپ کے بطن شریف کی توصیف میں کہا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شکم اطہر کو دیکھا

ہے وہ گویا کاغذ تھا جنہیں لپیٹ کرتہ کر کے ایک دوسرے پر رکھ دیا ہے۔

سینہ کے موئے مبارک :۔ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سینہ مبارک کے موئے مبارک کی توصیف میں فرماتے ہیں کہ "ذومسربۃ" تھے۔ اور حدیث ابن ابی ہالہ میں دقیق مسربۃ ہے۔ مسربۃ ان بالوں کو کہتے ہیں جو سینہ کے اوپر سے ناف تک ہوں۔ یہ باریک تھے لہٰذا اسے خیط (ڈورا یا شاخ) سے تعبیر کرتے ہیں اور صراح میں مسربۃ بضم را، سینہ و ناف کے درمیان بالوں کو لکھا ہے "بظاہر مسربۃ" کا اشتقاق سرب ہے جس کے معنی راستے کے ہیں۔ صدر شکم کے علاوہ کہیں بال نہ تھے۔ لہٰذا اسی حدیث میں کہا گیا ہے۔ "عَارِیَ الثَّدْیَیْنِ وَالْبَطْنِ سِوٰی ذٰلِکَ" یعنی آپ کے سینہ پر دونوں طرف اور شکم اطہر بجز اس قدر بالوں کے جنہیں سرنبہ کہا جاتا ہے خالی تھے۔ اور بیان کرتے ہیں کہ "اَلذِّرَاعَیْنِ وَالسَّاعِدَیْنِ وَالْمَنْکِبَیْنِ وَاَعَالِی الصَّدْرِ وَالسَّاقَیْنِ" یعنی دونوں، کلائیاں دونوں بازو، دونوں کندھے، سینہ مبارک کا بالائی حصہ، دونوں پنڈلیاں ٹخنے تک بال والے تھے۔ اور وہ جو آپ کے وصف شریف میں "اجرد" یعنی بالوں سے خالی ہونا واقع ہے وہ اشعر کے مقابل ہے۔ یعنی اشعر اسے کہتے ہیں جس کے سارے بدن پر بال ہوں۔

بغل شریف :۔ آپ کی بغل شریف سارے بدن مبارک کی مانند سفید تھی۔ طبری کہتے ہیں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا تمام لوگوں کی بغل کا رنگ جدا اور اس میں سیاہی کی جھلک ہوتی ہے۔ اسی طرح قرطبی کے بیان میں اتنا زیادہ ہے کہ آپ کی بغل میں بال نہ تھے۔ لیکن کچھ لوگ اس میں کلام کرتے ہیں کہ یہ ثابت نہیں ہے۔ جلد کی سفیدی سے یہ لازم نہیں آتا کہ بغل میں بال ہی نہ ہوں۔ اور بعض حدیثوں میں "نَتْفَ اِبْطَیْہِ" بھی آیا ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم بغل کے بالوں کو اکھیڑ ڈالا کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔

اور بعض حدیثوں میں "عُفْرَۃُ اِبْطَیْہِ" واقع ہوا ہے۔ عفرہ، غیر قابض سفیدی کو کہتے ہیں "کذا قال الھروی" اور صراح میں "اعفر" ایسی سرخی وسفیدی جس میں سرخی کی جھلک ہو لکھا ہے۔

ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے بغل گیر ہوئے تو آپ کے بغل شریف کے پسینہ سے مشک کی مانند خوشبو مہکنے لگی۔

ظہر شریف یعنی پشت :۔ آپ کی ظہر شریف میں یعنی پشت مبارک ایسی تھی جیسی پگھلی ہوئی چاندی یعنی پاک وصاف اور سفید وہموار۔

مہر نبوت :۔ "بَیْنَ کَتِفَیْہِ خَاتَمُ النُّبُوَّۃِ وَھُوَ خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ" یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت تھی کیونکہ آپ خاتم النبیین ہیں۔ " مہر نبوت ایک ایسی ابھری ہوئی چیز تھی جو ہمرنگ بدن، مشابہ جسد اطہر اور صاف ونورانی تھی۔ اسی کو خاتم النبوۃ یا مہر نبوت کہتے ہیں۔ "خاتم" بکسر تا ختم کا فاعل ہے جس کے معنی اتمام رسیدن بآخر یعنی آخر میں پہنچ کر مکمل کرنا۔ اور فتح تاء سے بمعنی مہر وانگشتری کے ہیں یعنی وہ چیز جو دلیل اس پر ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ اور آپ کو اسی نام کے ساتھ موسوم کرنے کا سبب یہ ہے کہ کتب سابقہ میں آپ کی تعریف اسی کے ساتھ کی گئی ہے۔ لہٰذا یہ وہ علامت ہے جس سے آپ پہچان لئے جائیں کہ آپ ہی وہ نبی آخر الزماں ہیں، جن کی بشارت دی گئی ہے مہر نبوت اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں وہ عظیم نشانی ہے جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخصوص فرمایا۔ حاکم نے "مستدرک" میں حضرت وہب بن منبہ سے روایت کیا کہ کوئی نبی مبعوث نہ ہوا مگر یہ کہ ان کے داہنے ہاتھ میں کوئی علامت نبوت ہوتی لیکن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی علامت نبوت آپ کے دونوں شانوں کے درمیان تھی کیا خوب کسی شاعر نے کہا ہے۔

حضرت شیخ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں کہ آپ کی مہر نبوت میں لکھا ہوا تھا۔

اَللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ تَوَجَّهْ حَيْثُ كُنْتَ فَاِنَّكَ مَنْصُوْرٌ۔ اللہ یکتا ہے کوئی اس کا شریک نہیں آپ جس حال میں بھی ہیں توجہ فرمایئے بلاشبہ آپ ہی فتح یاب ہیں۔

روایتوں میں مرقوم ہے کہ مہر نبوت نوری تھی جو چمکتی تھی۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ آپ کی وفات کے بعد وہ مہر نبوت روپوش ہو گئی تھی۔ اور اسی علامت سے معلوم ہوا کہ آپ نے وفات پائی ہے کیونکہ لوگوں میں شبہ اور اختلاف واقع ہو گیا تھا یا اس لئے کہ یہ دلیل نبوت تھی۔ اب اس کے اثبات کی حاجت نہ رہی تھی۔ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی خاص بھید ہو جسے وہی خوب جانتا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے کہ بعد از وفات نبوت باقی نہ رہی۔ کیونکہ نبوت در حالت موت کے بعد بھی برقرار رہتی ہے۔

اکثر روایتوں میں "بین الکتفین" (یعنی دونوں شانوں کے درمیان) وارد ہے کہ "عِنْدَ نَاغِضِ كَتِفِهِ الْيُسْرٰى" یعنی مہر نبوت بائیں شانہ کے ناغض (نرم گوشت جسے غضروف کہتے ہیں) کے پاس تھی۔

علامہ تورپشتی فرماتے ہیں کہ دونوں قولوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس لئے کہ دونوں شانوں کے درمیان ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بالکل بیچ میں ہے اگر بائیں شانہ کے جانب بھی ہے تو "بین الکتفین" ہے۔ یہی حال اس روایت کا ہے جس میں "عِنْدَ كَتِفِهِ الْيُمْنٰى" (دائیں شانہ کے پاس) آیا ہے واللہ اعلم۔ راویوں نے مہر نبوت کی صورت و شکل کا بھی ذکر کیا ہے اور سمجھانے کے لئے تشبیہ استعمال کی ہے۔ چنانچہ کسی نے اسے بیضہ کبوتر سے اور کسی نے سرخ غدود سے جو عام طور پر جسم پر ہوتا ہے تشبیہ دی ہے۔ "صراح" میں ہے کہ غدہ جس کی جمع غدود ہے گوشت کی سخت گرہ کو کہتے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ غدہ کے مشابہ اور سرخ سے مطلب مائل بہ سرخی ہے۔ لہٰذا یہ اس روایت کے منافی نہیں ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مہر نبوت کا رنگ، جسم اطہر کے رنگ کے ہم رنگ تھا اس سے اس قول کا رد کرنا مقصود تھا جس میں ہے اس کا رنگ سیاہ یا سبز تھا جیسا کہ ابن حجر مکی نے شرح شمائل میں کہا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ مہر نبوت زر حجلہ کی مانند تھا۔ "زر" بتقدیم زاء مکسورہ بر رائے مشددہ بمعنی تکمہ (گھنڈی) جو پیراہن کے گریبان میں ہوتا ہے اور حجلہ بفتح حاء وجیم بمعنی وہ گوشہ جہاں دلہن کو (مائیوں) بٹھایا جاتا ہے اس کی جمع حجال ہے۔ "کذا قال الجمہور" اور بعض کہتے ہیں کہ حجلہ ایک مشہور پرندہ اور زر اس کا انڈہ ہے۔ یہ اس حدیث کے موافق ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ مہر نبوت کبوتر کے بیضہ کی مانند تھی۔ لیکن زر لغت میں بمعنی بیضہ نہیں آیا۔ بعض کہتے ہیں کہ رزایت بتقدیم راء بر زاء بھی آیا ہے۔ جس کے معنی بیضہ کے ہیں۔ اور ترمذی کی ایک اور حدیث ہے جس میں "شعرات مجتمعات" ہے۔ یعنی مہر نبوت گوشت کا ایک ٹکڑا تھا۔ ایک اور حدیث میں مشت (مٹھی) کی مانند آیا ہے جس میں ثالیل کی مانند تل تھے۔ ثالیل ان دانوں کو کہتے ہیں جو جلد کے نیچے چنے کے دانے کی مانند نکل آتے ہیں۔ یہ سب کچھ مہر نبوت کی ظاہری شکل و صورت کے بارے میں تھا لیکن اس کے پیچھے خدا کا عظیم اثر کار فرما ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھا اور جو کسی نبی کو حاصل نہ تھا۔ واللہ اعلم۔

دستہائے مبارک: ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی توصیف میں شمائل ترمذی میں کہا گیا ہے کہ "طویل الزندین" یعنی پنجہ (مٹھی بند) دراز تھا "زند" بفتح زاء و سکون نون (پنجہ) کو کہتے ہیں اور قاموس میں ہے کہ "الزند موصل الذراع والکف وہما زندان" یعنی کلائی اور ہتھیلی کے ملنے کی جگہ کو زند کہتے ہیں اور اس کا تثنیہ "زندان" ہے۔ مٹھی بند (پنجہ) کی درازی کی تفصیل واضح نہیں کی گئی باوجودیکہ ممکن ہے کہ یہ مٹھی بند آپ کے دست مبارک میں دراز واقع ہوا ہو اور ایک روایت میں "عبل الذراعین" اور ایک روایت میں "عبل العضدین" آیا ہے یعنی دونوں بازو اور کلائیاں فربہ (موٹی) تھیں اور صراح میں

"ذراع" کے معنی "رحب الراحتہ" یعنی ہاتھ کی ہتھیلی کے ہیں اور ایک روایت "بسط الکفین" یعنی فراخ ہتھیلی آیا ہے۔ مطلب یہ کہ ہتھیلی بھرپور اور مکمل تھی۔ یہ "رحب الراحتہ" کی روایت کے موافق تھی۔ اور صراح میں "بسط" بالکسر دست کشادہ کے معنی میں ہے۔ اور قراۃ عبداللہ میں آیۂ کریمہ بل یداہ بسطان آیا ہے۔ اور ایک اور روایت میں "سبط الکفین" (نرم ہتھیلیاں) بتقدیم سین برباء بمعنی نرم آیا ہے۔ یعنی آپ کے ہاتھوں کی ہتھیلیاں نرم تھیں اور موئے مبارک کی توصیف میں پہلے گزر چکا ہے کہ "سبط" یعنی لٹکے ہوئے نرم بال جو کہ "جعد" کے مقابل ہوں۔ گویا "سبط الکفین" کو اس جگہ سے لیا ہے۔ اور "سبطا لجسم" بمعنی مرد خوش قد، متناسب القامت بھی آیا ہے۔ اور قاموس میں رجل سبط الیدین (مرد کشادہ ہاتھوں والا ہے) سبط کے معنی سخی کے ہیں۔ یہ بھی کہا کہ سخی فراخ دست ہوتا ہے۔ اور "شثن الکفین" بھی تفسیر کی گئی ہے۔ شثن بفتح شین وسکون ثلثہ بمعنی بہت سخت، جس کی سختی پکڑنے میں محسوس ہو۔ احادیث میں کف دست کی توصیف میں سین و نرم وارد ہوا ہے۔ چنانچہ طبرانی نے مستورد بن شداد سے روایت کیا ہے کہ اس نے اپنے والد سے پوچھا انہوں نے کہا کہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں پہنچا اور میں نے آپ کے دست اقدس کو چھوا (مصافحہ کیا) آپ کا دست مبارک ریشم سے زیادہ نرم اور برف سے زیادہ سرد تھا۔ اور بخاری میں حضرت انس ابن مالک سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے زیادہ نرم، حریر و دیبا کو نہ پایا۔ حالانکہ حریر تمام ریشمی کپڑوں میں سب سے زیادہ نرم ہوتا ہے آپکے ہاتھ میں درشتی اور سختی کس طرح جمع ہو سکتی ہے۔ ہاں نرمی، فربہی کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے۔ جس طرح کہ آپ کا تمام بدن اقدس نرم، لطیف، فربہ اور قوی تھا۔ اسی طرح دست مبارک کی ہتھیلیاں بھی نرم اور پر گوشت تھیں۔

اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ آپ کے دست مبارک کی نرمی و سختی کا انحصار وقت اور حالات پر موقوف تھا۔ چنانچہ آپ گھر میں دست مبارک سے یا جہاد میں اسلحہ استعمال کرتے۔ یا کاروبار کرتے تو ہتھیلیاں سخت ہوتیں جب چھوڑ دیتے تو وہ اپنی اصلی اور جبلی نرمی اور ملائمت کی حالت میں آ جاتیں۔

منقول ہے کہ جب اصمعی نے جو لغت کے امام ہیں۔ "شثن" کی خشونت اور سختی سے تفسیر کی تو ان سے کہا گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی توصیف میں تو نرمی و ملائمت وارد ہے اور آپ نے خشونت و سختی سے تفسیر کی ہے؟ تو اس کے بعد اصمعی نے عہد کر لیا کہ وہ حدیث کی تفسیر ہی نہیں کریں گے مگر بعد از حزم و احتیاط۔ اصمعی غایت درجہ منصف تھے۔ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں ادب و انصاف کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ لوگوں نے حدیث مبارک لیغان علی قلبی (بعض وقت میرے دل پر حجابات آ جاتے ہیں) کی تفسیر دریافت کی پوچھا کہ یہ غین کیا ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے۔ جواب میں فرمایا کہ اگر تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر کے غین (حجاب) کے علاوہ کسی اور شخص کے غین (حجاب) کے بارے میں پوچھو تو میں بتا سکتا ہوں لیکن اب جو کچھ میں جانتا ہوں آپ کے سامنے اس کے بیان کرنے کی مجھ میں تاب و طاقت نہیں اس کی حقیقت بجز علام الغیوب کے کوئی نہیں جان سکتا۔

حضرت ابو عبیدہ نے شثن کی تفسیر غلظ و قصر یعنی فربہی اور کوتاہی سے کی ہے۔ قاضی عیاض (صاحب شفاء) فرماتے ہیں کہ یہ تعریف مردوں میں محمود ہے نہ کہ عورتوں میں، اس کی انہوں نے نفی کی ہے۔ یہ قول اس روایت کے بموجب ہے جس میں آیا ہے کہ "سائل الاطراف" یعنی اعضاء کی گرہیں دراز تھیں۔ یہ انگشتہائے مبارک کی تعبیر ہے۔ مراد یہ کہ آپ کی انگلیاں لمبی اور رواں تھیں اور شمائل میں "طویل الاصابع (لمبی انگلیاں) اور ایک دوسری روایت میں "شائل الاطراف" بشین معجمہ جو کہ "شول"

سے ماخوذ ہے جس کے معنی پتھر کھینچنا۔ زمین سے بوجھ اٹھانا اور اونٹنی کا اس کی طاقت بھر بوجھ اٹھانا" وارد ہوا ہے اور ایک روایت میں "شاین الاطراف" بہ تبدیل لام بنون مثلاً جبرئیل کو جبرین آیا ہے اسے ابن الانباری نے بیان کیا ہے۔ اور یہ صفت قصر (کوتاہی) کے منافی ہے۔ شثن بمعنی غلیظ (فربہ) جو بغیر کوتاہی اور سختی کے ہے۔ اگرچہ صحاح اور قاموس سے بمعنی خشونت بھی معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کے دست مبارک کے صفات، آثار، برکات اور معجزات اتنے زائد ہیں کہ حیطۂ تحریر میں نہیں لائے جاسکتے۔ تاہم مسلم کی ایک روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جابر بن سمرہ کے رخساروں پر دست اقدس پھیرا تو جابر کو آپ کے دست اقدس سے ایسی ٹھنڈک اور خوشبو محسوس ہوئی جیسے آپ نے ابھی عطار کی ڈبیہ سے اپنا ہاتھ نکالا ہے۔ بیہقی اور طبرانی میں ہے کہ حضرت وائل بن حجر فرماتے ہیں کہ میں جب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کرتا ہوں تو میرا ہاتھ آپ کے جسم اطہر سے مس ہونے کی وجہ سے ایسا معطر ہو جاتا ہے کہ میں تمام دن اپنے ہاتھوں کو سونگھتا رہتا ہوں اور اس میں سے مشک نافہ سے بہتر خوشبو پاتا رہتا ہوں۔

یزید بن اسود فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک میرے ہاتھوں میں دیا۔ تو میں نے آپ کا دست اقدس برف سے زیادہ سرد اور مشک سے زیادہ خوشبودار پایا اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کو تشریف لائے اور اپنا دست مبارک میری پیشانی پر رکھا پھر آپ نے میرے چہرے، سینہ اور شکم پر مسح فرمایا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ آج تک آپ کے دست اقدس کی ٹھنڈک اپنے جگر میں محسوس کرتا ہوں۔ لیکن اس کو نہیں بھولنا چاہئے کہ خوشبوئے مبارک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر میں موجود تھی۔ چنانچہ آپ کے پسینہ مبارک اور بول کی خوشبو کا بیان آگے آئے گا۔

اب رہا آپ کے دست اقدس سے ٹھنڈک کا محسوس ہونا اور یہ کہ اس کا مطلب کیا ہے تو یہ صحت و تندرستی کی نشانی ہے کیونکہ آپ گرم و معتدل ہیں۔ لہٰذا یہ ٹھنڈک وہ ٹھنڈک نہیں ہے جو مزاج و طبیعت کی برودت و خنکی سے ہوتی ہے اور سرد پسینہ آنے لگتا ہے اور اس کے چھونے کو لوگ ناپسند کرتے ہیں بلکہ یہ اعتدال مزاج اور عدم غلبہ حرارت پر دلالت کرتی ہے کیونکہ آپ کے دست اقدس کے چھو جانے سے لذت اور راحت میسر آجاتی تھی جیسا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی حدیث اور دیگر حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے۔ فافہم و باللہ التوفیق۔

قدم مبارک: ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک کی توصیف میں بھی "شثن القدمین" (یعنی دونوں قدم مبارک مزید تھے) وارد ہوا ہے جس طرح شثن الکفین (دونوں دست اقدس نرم و فربہ تھے) واقع ہوا ہے لیکن مواہب میں "غلاظ اصابع" (فربہ و نرم پاؤں کی انگلیاں) بیان ہوا ہے۔ اور "مشارق" میں دونوں کے معنی فخیم یعنی فربہ کے لکھے ہیں۔ ایک روایت میں "خمصان الاخمصین" آیا ہے۔ "خمص" قدم کے اس باطنی حصہ کو کہتے ہیں جو زمین پر قدم رکھتے وقت زمین سے نہ ملے۔ اور صراح میں کف پا کی باریکی لکھا ہے۔ اور خمصان بضم خاء خمص کا تثنیہ ہے۔ الاخمص اسے کہتے ہیں جس کے پاؤں زمین سے بہت بلند ہوں۔ اس جگہ یہ اضافت مبالغہ کے لئے ہے۔ جیسا کہ ابن الاثیر سے منقول ہے اور ایک روایت میں "مسیح القدمین" آیا ہے۔ یعنی آپ کے دونوں قدم مبارک ہموار تھے۔ جن میں آلودگی اور شکستگی بالکل نہ تھی۔ "ینبو عنهما الماء" اگر اس پر پانی ڈالا جائے تو اپنی لطافت و پاکیزگی کی وجہ سے بہہ جائے اور تیزی سے پانی گزر جائے۔ اور ابن ابی ہالہ کی حدیث میں بھی اسی طرح آیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ جب آپ زمین پر قدم مبارک رکھ کر چلتے تو پورے قدم رکھ کر چلتے اور اخمص

یعنی ابھری ہوئی جگہ نہ تھی۔ اسے بیہقی نے روایت کیا اور ابی امامہ سے مروی ہے کہ آپ کے پائے اقدس میں اخمص یعنی ابھار نہ تھا۔ اور زمین پر پورا قدم مبارک رکھتے۔ اسے ابن عساکر نے بیان کیا اور مسیح القدمین (ہموار قدم) کے بھی یہی معنی و مطلب ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی مسیح اسی معنی میں کہا جاتا ہے کیونکہ ان کے پائے مبارک میں بھی اخمص یعنی ابھار نہ تھا۔ واللہ اعلم اور ان کے نزدیک "ینبع عنہما الماء" (تیزی سے پانی بہہ جانا) یہ جداگانہ وصف ہے۔ مسیح القدمین سے متضمن نہیں ہے۔ اس حدیث میں منافات ظاہر ہے غایت وہ کہ جو کہا گیا۔ اور توفیق روایت اس طرح ممکن ہے کہ قدرے اخمص یعنی ابھار تھا۔ نچلا حصہ ہموار نہ تھا اور بہت بلند بھی نہ تھا۔ لیکن بایں تقدیر کہ اخمص (ابھار) میں مبالغہ کا اعتبار کیا جائے جیسا کہ بعض شارحوں نے کیا ہے اچھا نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن بریدہ سے منقول ہے کہ فرمایا۔

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحْسَنَ الْبَشَرِ قَدَمًا رَوَاهُ ابْنُ سَعْدٍ۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک کی ظاہری شکل بہت حسین تھی۔

اور آپ کی ایڑیوں کے بارے میں "منہوس العقب" مروی ہے یعنی آپ کی ایڑیوں پر گوشت کم تھا۔ اکثر لوگوں نے لفظ منہوس کو سین مہملہ سے روایت کیا ہے اور صاحب "البحرین" اور "ابن الاثیر" نے سین مہملہ اور شین معجمہ دونوں سے روایت کیا ہے۔ "مشارق" میں بھی دونوں لکھے ہیں۔ اور بعض حضرات نے منہوش بمعنی ابھری ہوئی ایڑی کہا ہے اور صراح میں منہوس بمعنی کم گوشت لکھا ہے۔

کاتب الحروف عفی اللہ عنہ (یعنی شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ) کا قول ہے کہ میرے پیر و مرشد سید الشیخ موسیٰ (پاک شہید ملتانی) الجیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ایڑیاں صفاء و لطافت میں اس حد تک تھیں کہ کسی حسین و جمیل کے رخسار بھی ایسے نہ ہوں گے اور وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیہ مبارک سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے تھے۔

مواہب لدنیہ میں کہا گیا ہے کہ سیدہ میمونہ بنت کرزم سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے میں آپ کے پائے اقدس میں انگشت سبابہ کی درازی کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ آپ کی انگشت سبابہ (پاؤں کے انگوٹھے کے برابر کی انگلی) پاؤں کی تمام انگلیوں سے بڑی تھی۔ اسے احمد و طبرانی نے روایت کیا ہے۔ اور جابر بن سمرہ سے منقول ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاءِ اقدس کی چھنگلیا متظاہر تھی اور مروی ہے کہ یہ لوگوں کی زبانوں پر مشہور ہے کہ آپ کے دست مبارک کی انگشت شہادت بہ نسبت بیچ کی انگلی کے لمبی تھی۔ اس پر حافظ ابن حجر مکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس کسی نے بھی یہ کہا ہے غلط ہے البتہ پاؤں کی انگلیوں میں قدم مبارک کی انگشت سبابہ دراز تھی۔ "مقاصد حسنہ" میں کہا گیا ہے کہ یہ غلطی ہے جو حضرت میمونہ بنت کرزم کی مطلق روایت پر بے سوچے سمجھے اعتماد کر لینے سے پیدا ہوئی ہے۔ لیکن یہ روایت مسند امام احمد میں پاؤں کی انگشت سبابہ کے ساتھ مقید ہے۔ اسی طرح بیہقی کے نزدیک ہے۔"

(حضرت شیخ محمد عبدالحق بن سیف الدین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں) کہ حدیث پاک میں مروی ہے آنحضرت نے انگشت شہادت اور بیچ کی انگلی کو ملا کر فرمایا کہ بھیجا گیا ہوں میں اور قیامت ان دو انگلیوں کی مانند" آپ نے قیامت پر اپنی بعثت کے مقدم ہونے کو اسی قدر تفاوت کے ساتھ اشارہ فرمایا جتنا کہ ان دونوں انگلیوں کے درمیان تفاوت ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ بعثت اور قیامت کی معیت سے مبالغہ کی طرف اشارہ ہے۔ ورنہ دونوں انگلیوں کے ملانے کی کیا حاجت تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں

انگلیوں کے ملانے سے تقدم و تاخر کا تفاوت ظاہر ہوتا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ انگشت شہادت اور بیچ کی برابر تھی اور ایک جماعت کہتی ہے کہ بطریق معجزہ اظہار معیت و مبالغہ کے لئے اس وقت میں برابر ہو گئی ہوں گی واللہ اعلم۔

پنڈلیاں شریف: ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پنڈلیوں کے بارے میں ہے کہ "کَانَ فِیْ سَاقَیْہِ حُمُوْشَۃٌ" یعنی آپ کی دونوں پنڈلیاں باریک و لطیف تھیں پر گوشت نہ تھیں۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ "نَظَرْتُ اِلٰی سَاقِہٖ کَاَنَّھَا جُمَّارَۃٌ" یعنی میں نے آپ کی پنڈلی کی طرف نظر ڈالی تو وہ گویا درخت خرما تھا۔ "جُمَّارَۃٌ" بضم جیم و تشدید میم بمعنی درخت خرما جسے شحم النخل بھی کہتے ہیں جو کہ ہموار صاف لطیف اور سفید ہوتی ہے۔ "ضخم الکرادیس" جن کے جوڑ فربہ۔ کردوس بضم ان دو ہڈیوں کو کہتے ہیں جو جوڑ میں پیوستہ ہوں۔ کہتے ہیں کہ اس سے فربہی اور اعضاء کا قوی ہونا مراد ہے۔ صراح میں ہے کہ کردوس جوڑوں کی دو گانہ ہڈیوں کو کہتے ہیں۔ دو شانے، بازو اور زانو وغیرہ۔

قامت زیبا: ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قامت زیبا یعنی قد مبارک، باغ قدس اور بوستان انس کی شاخ تھا۔ یعنی لطیف، درست اور چست تھا نہ کوتاہ نہ بہت دراز۔ لیکن مائل بہ درازی تھا۔ لہٰذا حدیث میں آیا ہے کہ "کَانَ رَبْعَۃً مِّنَ الْقَوْمِ" قوم میں متوسط القامت تھے۔ ربع بفتح راء و سکون باء بمعنی متوسط القامت۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ "اَطْوَلُ مِنَ الْمَرْبُوْعِ وَاَقْصَرُ مِنَ الْمُشَذَّبِ" پستہ قد سے طویل قامت اور طویل قامت سے کوتاہ تھے۔ مطلب یہ کہ پستہ قد سے دراز تر اس بنا پر کہ مائل بجانب درازی تھے۔

"مشذب" بضم میم و فتح شین وذال معجمہ باتشدید بمعنی بسیار دراز جس کے کھڑے ہونے میں خوف و اضطراب لاحق رہے۔ اور ابن ابی ہالہ کی حدیث میں ہے کہ "لَمْ یَکُنِ الطَّوِیْلُ الْمُمَّغِطُ" بہت زیادہ دراز قد نہ تھے۔ الممغط بضم میم اول و فتح میم ثانی، مشدد و کسر غین معجمہ، نیز مہملہ سے بھی آیا ہے اور بغین مشددہ و معجمہ وطاء مہملہ بروزن اسم مفعول از باب تفعیل بھی پڑھا گیا ہے۔ اسے کہتے ہیں جو دراز قد میں غایت درجہ طویل ہے۔ "وَلَا بِالْقَصِیْرِ الْمُتَرَدِّدِ" نہ متردد کی مانند کوتاہ قد، متردد اسے کہتے ہیں جس کے جسم کے کچھ اعضاء باہر نکل آئیں مثلاً کوبڑ وغیرہ۔ بعض حضرات اس عبارت سے اثبات قصر بھی کرتے ہیں مگر زیادہ نہیں جتنا کہ توسط و اعتدال کو لازم ہے اور ایک اور حدیث میں ہے "لَمْ یَکُنْ بِالطَّوِیْلِ الْبَائِنِ یَعْنِیْ مُفْرِطٌ" یعنی طول میں سب سے جدا اور دراز قد نہ تھے۔ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی حدیث میں ہے۔ "لَیْسَ بِالذَّاھِبِ طُوْلًا وَفَوْقَ الرَّبْعَۃِ اِذَا جَاءَ مَعَ الْقَوْمِ غَمَرَھُمْ" یعنی آپ بہت زیادہ دراز قد نہ تھے۔ لیکن مائل بطول ہونے کے اعتبار سے "ربعہ" سے بلند تھے۔ جب آپ کسی قوم میں تشریف لاتے تو انہیں چھپا لیتے اور ان کے پست و کوتاہ قد لوگ آپ کے قریب چھپ جاتے۔

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ جب تنہا ہوتے تو "ربعہ" یعنی متوسط القامت معلوم ہوتے۔ اور جب قوم کے درمیان ہوتے تو سب سے بلند و بالا معلوم ہوتے۔ اور اس وقت منسوب بہ طویل القامت کہلاتے اور اگر دو آدمی داہنے بائیں ہوتے تو آپ دونوں سے بلند نظر آتے۔ اور جب ان کے درمیان سے جدا ہوتے تو پھر منسوب بہ متوسط القامت (ربعہ) ہوتے نیز مجلس میں آپ کے دونوں شانے مبارک بلند سے بلند تر ہوتے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

بے سایہ و سائبان عالم: ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ تھا۔ نہ آفتاب کی روشنی میں نہ چاند کی طلعت میں۔ اسے حکیم ترمذی نے ذکوان سے "نوادر الاصول" میں روایت کیا ہے۔ ان بزرگوں پر تعجب ہے کہ چراغ کی روشنی کا ذکر نہ فرمایا۔ "نور" آپ کے اسماء مبارکہ میں سے ایک نام ہے۔ اور نور کا سایہ نہیں ہوتا۔ (مولانا جامی نے خوب کہا ہے)۔

امی و دقیقہ دان عالم بے سایہ و سائبان عالم

رنگ مبارک : ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ مبارک روشن و تاباں تھا۔ جمہور صحابہ کا اتفاق ہے کہ آپ کا رنگ مبارک مائل بہ سفیدی تھا۔ سفیدی کے ساتھ ہی آپ کی تعریف و توصیف کی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ "کان ابیض ملیحا" ایک اور روایت میں "ابیض ملیح الوجہ" آیا ہے یعنی سپید رنگ، ملیح بشرہ تھا۔ اس توصیف سے مراد، سفیدی و ملاحت ہے حالانکہ ملاحت، آپ کے حسن و جمال اور دیدار جانفزا کی دلربائی و لذت بخشی کے اظہار بیان کے لئے علیحدہ صفت ہے۔ یا خالص سفیدی بغیر نمکینی جسے ابہق کہتے ہیں اس سے بچنے کے لئے ہو۔ اور ابہق کی تفسیر وہ اس طرح کرتے ہیں کہ ابہق وہ سفیدی ہے جس میں نہ سرخی ہو نہ زردی اور نہ گندم گوں ہو اور اس سفیدی کے مشابہ ہے جو برص کے مریضوں کے چہرہ پر ہوتی ہے اور جست کے ہم رنگ ہو۔

ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ آپ کا چہرۂ انور بہت سفید اور آپ کے موئے ہائے مبارک سخت سیاہ تھے۔ ابو طالب کے اس شعر میں جو انہوں نے آپ کی مدح میں کہا ہے اس میں ہے کہ ۔

وَاَبْیَضُ یَسْتَسْقِی الْغَمَامُ بِوَجْهِهٖ ثِمَالُ الْیَتَامٰی عِصْمَۃٌ لِّلْاَرَامِلِ

یعنی آپ کے چہرۂ انور کی سفیدی سے برسنے والا سفید بادل بارش کی بھیک مانگتا ہے اور آپ یتیموں بیواؤں کی پرورش فرمانے والے ہیں۔ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی حدیث میں ہے کہ "اَبْیَضُ مُشْرَبٌ وَاَنَّہٗ شَرَابٌ خَلَطَ لَوْنٌ بِلَوْنٍ" یعنی آپ کا رنگ سفید مشربی تھا۔ مشرب اس شراب کو کہتے ہیں جس میں ایک رنگ میں دوسرے رنگ کی آمیزش ہو۔ گویا کہ ایک رنگ پلا کر دوسرا رنگ پلا یا گیا ہو۔ اس جگہ مشرب سے مراد سرخی ہے دوسری روایت میں تصریح بھی آئی ہے۔ ابیض مشرب بحمرۃ یعنی آپ کا رنگ سرخ و سفید تھا۔ اور بعض نے "ازہر اللون" کہا ہے جو کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے۔ اس کی بھی یہی تفسیر کرتے ہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ اس سے ان کی مراد چمک اور تابانی ہے۔

نسائی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا کہ ایک روز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے جھرمٹ میں تشریف فرما تھے ایک بدوی ایلچی بن کر آیا وہ اپنی سادگی و محبت اور تعجب سے پوچھنے لگا۔ "اَیْنَ ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِب" یعنی فرزند عبد المطلب کہاں ہیں اور تم میں سے وہ کون ہیں؟ یعنی وہ ذات کریم جس کے حسن و جمال نے عالمگیر شہرت حاصل کی ہے اور اس کے جاہ و جلال کے غلغلہ سے سارے جہان کے کان گونج رہے ہیں۔ صحابہ فرمانے لگے "ہٰذَا الْاَمْغَرُ الْمُرْتَفِقُ" یہ مرد سرخ و سفید رو جو اپنی کہنی کو تکیہ بنا کر ٹیک لگائے تشریف فرما ہیں۔ "اَللّٰہُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ قَدْرَ حُسْنِہٖ وَجَمَالِہٖ" قاموس میں امغر بمعنی معجمہ بمعنی وہ شخص جس کے چہرے پر سرخی و سفیدی ہو اور مرتفق وہ ہے جو اپنی کہنی کو تکیہ بنا کر ٹیک لگائے ہوئے ہو۔ بخاری میں حضرت انس کی حدیث میں ہے کہ "لَیْسَ بِاَبْیَضَ اَمْہَقَ" وہ برص کی مانند سفید نہ تھے۔ ابہق کے معنی گزر چکے ہیں از روئے قاموس ابہق کے معنی ہیں وہ سفیدی جس میں سرخی کی آمیزش نہ ہو۔ اور اس میں رنگ کی چمک بھی نہ ہو۔ " اس کے علاوہ آپ کے رنگ مبارک کی توصیف میں "اسمر" بھی آیا ہے "سمرہ" سفیدی و سیاہی کے درمیان ایک رنگ ہوتا ہے اور سمراء گندمی رنگ کو بھی کہتے ہیں لیکن صراح میں سمرہ بمعنی گندمی رنگ لکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ مشربی سفیدی کے ساتھ جمع ہو جاتا ہے۔ اور اہل عرب سمراء (گندمی) کا اطلاق اسی پر کرتے ہیں۔ اور دوسری حدیث میں ابیض آیا ہے یعنی آپ کے جسم انور کی سفیدی مائل بسمرہ (گندم گوں) کہتے ہیں کہ مشرب جب " مشبع " ہو تو مشابہ اسمر کے ہے لیکن "ادمہ" کی نفی کی گئی ہے۔ ادمہ وہ رنگ ہے جس میں سیاہی بہت گہری ہو۔ چنانچہ ترمذی کی حدیث میں ہے "لَیْسَ بِالْاَبْیَضِ الْاَمْہَقِ وَلَا بِالْاٰدَمِ" ـــــ آپ کا رنگ نہ تو مبروص کی مانند سفید تھا

اور نہ بالکل سیاہ قاموس وصراح سے معلوم ہوتا ہے کہ " اُدمہ " بمعنی سمرہ ہے اور اُدم بمعنی "اسمر" ہے۔ اس قول کے بموجب "لاباالآدم" کا مطلب ادمہ یعنی سخت سیاہی ہوگی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "سمرہ" سے مراد آمیزش شدہ سفیدی ہے اور سفیدی کے اثرات سے مراد وہ سفیدی ہے جس میں سرخی کی آمیزش ہو۔ اس خالص سفیدی کی نفی کی ہے۔ جسے ابہق یا مبروص کہتے ہیں۔ اس سے وہ قول ساقط ہو جاتا ہے۔ جس حدیث میں ابن جوزی کے بقول کہا گیا ہے کہ "کان اسمر" یہ اس لئے غلط ہے کہ یہ مخالف احادیث ہے۔ کیونکہ احادیث میں صریحاً "ابیض مشرب" (سرخی مائل سفیدی) اور لاباالادم واقع ہوا ہے۔ اس ادم سے اسمر (گندمی) مراد ہے اور ابن جوزی نے بیاض و سمرہ کی جمع کے سلسلے میں کہا ہے کہ آپ کے جسم اطہر کے وہ حصے جو دھوپ سے متاثر ہوتے رہتے تھے اسمر (گندم گوں) تھے اور جو حصے کپڑوں کے اندر رہتے تھے سفید تھے لیکن علماء کو اس سے اختلاف ہے۔ کیونکہ آفتاب کی شعاعیں اور ہوا آپ کے جسم اطہر کا رنگ متغیر نہیں کر سکتی تھیں۔ جس طرح کہ "انوار المتجرد" ابن ابی ہالہ کی حدیث میں واقع ہوا ہے کہ بدن اطہر کا جو حصہ باہر اور کپڑوں سے کھلا رہتا تھا وہ عام لوگوں کے برعکس روشن اور سفید تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ محبت اور شیفتگی اس در کے خادم ہیں پھر یہ کس طرح کوئی ایسی توصیف بیان کر سکتا ہے جو سرور دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہی نہ ہو بعض کہتے ہیں کہ آخر عمر شریف میں آپ کا رنگ مبارک پختہ ہو چکا تھا۔ اس وقت "حمرہ" مائل بسمرہ ہو گیا تھا۔

مشی اور رفتار مبارک: ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفتار مبارک کے متعلق حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی حدیث میں ہے کہ۔

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا مَشٰى تَكَفَّأَ كَأَنَّمَا يَنْحَطُّ مِنْ صَبَبٍ۔	رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم جب چلتے تو جھک جھک کر چلتے گویا کہ اوپر سے اتر رہے ہیں۔

"تکفوء" کی تفسیر میل کر دی بجانب مشی یعنی آگے کی جانب جھک کر چلنا" سے کی ہے جس طرح پھولوں والی ٹہنی جھکتی ہے۔ اور قدم مبارک چستی، طاقت اور سرعت کے ساتھ اٹھاتے تھے۔ بزار نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زمین پر ہمیشہ پورا قدم رکھتے تھے ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ کی رفتار مجمعاً یعنی قوت سے بھرپور بے استرخاء وسستی اعضاء تھی۔ حضرت علی مرتضیٰ سے ایک اور حدیث مروی ہے کہ آپ چلتے میں زمین سے پورا قدم اٹھاتے اور کشادہ رکھتے اور آسان وسبک اور تیز بغیر حرکت واضطراب کے چلتے۔ اوران کا قول "كَأَنَّمَا يَنْحَطُّ مِنْ صَبَبٍ" گویا کہ زمین کی بلندی سے اس کے نشیب و پستی میں اتر رہے ہیں۔ صبب بفتحتین وصبوب زمین منحدر کو کہتے ہیں اور "انحدار" بلندی سے نشیب کی طرف اترنے کو کہتے ہیں۔ بلاشبہ یہ تمثیل پورے قدم پاک اٹھانے کی قوت کے لئے ہے نہ کہ سبکی تحرک اور اضطراب کے لئے ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کسی کو راہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تیز تر چلتے نہیں دیکھا۔ گویا کہ زمین آپ کے قدموں کے نیچے پھٹی جاتی تھی اور ہم آپ کی ہمراہی میں تکان اور محنت محسوس کرتے تھے۔ آپ کے ساتھ رہنے کے لئے ہمیں دوڑنا پڑتا تھا جس سے ہمارے سانس پھول جاتے تھے لیکن آپ کو کچھ بھی محسوس نہ ہوتا تھا۔ اور آپ معمول کے مطابق بے تکلف چلتے تھے اور اصلاً اضطراب نہ فرماتے تھے۔ یہ چلنا ولوالعزم، اہل ہمت اور شجاعت کا آئینہ دار ہے۔ اور یہ چلنا اقسام رفتار میں قوی واعتدال پر ہے اس سے اعضاء کو راحت و آرام ملتا ہے۔ آپ کبھی نعلین مبارک پہن کر چلتے اور کبھی بغیر نعلین کے۔ کبھی آپ پاپیادہ چلتے اور کبھی سواری پر۔ خصوصاً غزوات میں۔

سر و پیادہ خوش بود اندر چمن بناز ۔۔۔ آں سرومن پیادہ خوش است و سوار خوش

اور جب آپ صحابہ کرام کے ساتھ چلتے تو صحابہ کو اپنے آگے آگے چلاتے۔ اور خود ان کے پیچھے رہتے۔ فرماتے میری پشت کو فرشتوں کے لئے خالی چھوڑ دو۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ "كَانَ يَسُوْقُ اَصْحَابَهٗ" آپ اپنے اصحاب کو آگے چلاتے تھے۔ "سوق" کے معنی سواری کے جانور کو پیچھے سے ہنکانا اور "قود" کے معنی جانور کو آگے سے کھینچنا۔ آپ سفر میں تمام صحابہ کو بھیجنے کے بعد روانہ ہوتے اور ناتواں و کمزوروں کو سہارا دیتے۔ اور رہ جانے والوں کو سوار فرماتے۔ کبھی اپنا ردیف یعنی پیچھے بٹھاتے تھے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اقسام رفتار۔ فائدہ۔ انواع رفتار دس ہیں۔ ایک تماوت ہے۔ یہ افسردہ اور مریل مانند خشک لکڑی کے، لوگوں کی مُتھی چال ہے۔ دوسری "ازعاج ہے یعنی طیش وخفت سبک سری اور اضطراب و پریشانی کی چال۔ یہ دونوں مذموم وقبیح قسمیں ہیں جو مردہ دلی پر دلالت کرتی ہیں۔ تیسری چال "ہون" ہے جو مکمل حرکت اور قدرے سرعت کی چال ہے اور یہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چال تھی۔ جو سکون ووقار اور بلا تکبر وتماوت کی علامت ہے۔ چوتھی چال "سعی" ہے جو تیزی سے چلی جائے۔ پانچویں چال "رمل" بفتح راء ہے جو جلدی جلدی قدم اٹھا کر اور مونڈھوں کو جنبش دے کر چلی جائے۔ جس طرح پہلوان چلتے ہیں۔ چھٹی چال "نسلان" ہے جو دوڑ کر تیزی سے چلی جائے۔ یہ رفتار سعی سے تیز تر ہے۔ ساتویں چال "خوزیٰ" بفتح خاء وسکون راء بازاء آخر الف مقصورہ ہے جو پنجوں کے بل چلی جائے آٹھویں چال "قہقری" ہے جو پشت کی طرف الٹے قدم چلی جائے نویں چال "جمزی" بفتح جیم ہے جو کود کود کر چلی جائے۔ اونٹنی کو "جمارہ" اسی معنی میں کہا جاتا ہے۔ دسویں چال "تبختر" ہے جو آہستہ خرامی سے ٹہلتے ہوئے گردن اٹھا کر متکبروں کے انداز میں چلی جائے۔ رفتار کی ان دو قسموں میں سب سے اکمل وافضل "ہون" ہے۔ قرآن کریم میں بھی اس رفتار کی مدح فرمائی موجود ہے چنانچہ فرمایا۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا اللہ کے وہ بندے ہیں جو زمین پر "ہون" کی رفتار سے چلتے ہیں۔

پسینہ وفضلات کی خوشبو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نرالی وعجیب صفتوں میں سے ایک پاکیزہ وطیب خوشبو ہے۔ یہ آپ کی ذاتی تھی۔ کسی قسم کی خوشبو استعمال کئے بغیر ہی دنیا کی کوئی خوشبو آپ کے جسم اطہر کی خوشبو سے ہمسری نہ کر سکتی تھی۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے ہر ایک خوشبو خواہ مشک ہو یا عنبر سونگھی ہے۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشبوئے اطہر سے زیادہ کوئی نہ تھی۔ اور ام عاصم زوجہ عتبہ بن فرقد سلمی بیان کرتی ہیں کہ ہم چار عورتیں عتبہ کی زوجیت میں تھیں۔ اور ہم میں سے ہر ایک یہی کوشش کرتی کہ زیادہ سے زیادہ خوشبو میں بس کر عتبہ کے قریب جائیں۔ ہم سب اس کوشش میں خوب خوشبو کا استعمال کرتیں۔ لیکن ہم میں سے کسی کی خوشبو عتبہ کی خوشبو تک نہ پہنچتی تھی۔ حالانکہ عتبہ خوشبو کو بھی اسی حد تک استعمال کرتے تھے کہ روغن کو اپنے ہاتھوں سے چھواتے اور اسے اپنی داڑھی پر ملتے مگر اس کی خوشبو ہم سب پر غالب رہتی۔ اور جب عتبہ باہر جاتے تو لوگ کہتے کہ ہم خوشبو استعمال کرتے ہیں لیکن کوئی خوشبو عتبہ کی خوشبو سے زیادہ تیز نہیں ہے ام عاصم کہتی ہیں کہ میں نے ایک دن عتبہ سے کہا ہم سب خوشبو کے استعمال میں خوب کوشش کرتی ہیں لیکن تمہاری خوشبو تک ہماری خوشبو نہیں پہنچتی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک مرتبہ مجھے "شرای" یعنی گرمی دانے جسے پت کہتے ہیں نکل آئے تھے۔ (اس مرض میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سارے بدن میں چنگاریاں لگی ہوئی ہیں) تو میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا کر اپنے اس مرض کی شکایت کی تاکہ علاج فرما دیں۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے بدن سے کپڑے اتار دو۔ تو میں کپڑے اتار کر آپ کے سامنے بیٹھ گیا۔ پھر آپ نے اپنا دست مبارک میری پشت وشکم پر ملا اور اس وقت سے یہ خوشبو مجھ

میں پیدا ہو گئی ہے۔ اسے طبرانی نے معجم صغیر میں روایت کیا۔
ایک شخص نے اپنی لڑکی کو اس کے شوہر کے گھر بھیجنے کے لئے خوشبو کی جستجو کی مگر اسے نہ مل سکی تو اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کیلئے عرض حال کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوئی خوشبو عطا فرما دیں مگر کوئی خوشبو موجود نہ تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شیشی طلب فرمائی تاکہ اس میں خوشبو ڈال دی جائے۔ پھر آپ نے اپنے جسم اقدس سے پسینہ لے کر اس شیشی میں بھر دیا اور فرمایا جا کر اسے اپنی لڑکی کے جسم پر مل دو۔ جب اسے ملا گیا تو سارا مدینہ اس کی خوشبو سے مہک گیا تھا اور اس گھر کا نام ہی "بیت المطیبین " خوشبو کا گھر رکھ دیا۔
حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف لائے اور دوپہر کے وقت قیلولہ فرمایا چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں بہت پسینہ آیا کرتا تھا تو میری والدہ جن کا نام "ام سلیم" ہے شیشی لے کر آپ کا پسینہ مبارک اس میں جمع کرنے لگیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھل گئی۔ فرمایا اے ام سلیم کیا کر رہی ہے۔ عرض کیا یا رسول اللہ آپ کا پسینہ مبارک جمع کر رہی ہوں تاکہ میں بطور خوشبو استعمال کروں کیونکہ اس کی خوشبو سب سے زیادہ بہتر ہے۔ (رواہ مسلم)
اور حضرت انس سے یہ بھی منقول ہے کہ جب کوئی صحابی بقصد حضوری آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا اور آپ کو کاشانۂ اقدس میں نہ پاتا تو وہ راہ میں آپ کی اس خوشبو کو سونگھتے۔ جو آپ کی گزرگاہ ہونے کے سبب راہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ مدینہ منورہ کے جس جس کوچے میں وہ خوشبو محسوس کرتے چلتے جاتے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس راہ سے گزرے ہیں۔
آج بھی مدینہ منورہ کے در و دیوار سے آپ کی خوشبوئے جانفزا کی لپٹیں آرہی ہیں جس سے محبوں کے دماغِ محبت معطر ہو جاتے ہیں۔ شاید کہ ایک شمہ اس خوشبو کا بعض غریب و مشتاق اور مفلس و نادار مسافروں کے شامۂ ذوق کو بھی میسر ہو۔ ابو عبداللہ عطار مدینہ طیبہ کی مدح میں کہتے ہیں۔

بِطِيبِ رَسُولِ اللهِ طَابَ نسيمُها　　فَمَا المسْكُ والكافُورُ المَنْدلُ الرَّطب

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشبو سے مدینہ طیبہ کی فضا مہک رہی ہے۔ مشک و کافور کیا ہیں ان کی مانند تو وہاں کھجوروں میں خوشبو ہے۔ حضرت شبلی جو علمائے صاحب وجدان میں سے ہیں فرماتے ہیں کہ مدینہ طیبہ کی خاک پاک میں خاص قسم کی خوشبو ہے جو مشک و عنبر میں قطعاً نہیں اور فرماتے ہیں کہ مدینہ میں ایسی خوشبو کا ہونا عجائب و غرائب میں سے ہے۔

دراں زمیں کہ نسیمے درزد ز طرۂ دوست　　چہ جائے دم زدن نافہائے تا تاریست

بروایت ابو نعیم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ کے چہرۂ انور پر پسینہ مبارک موتی کی مانند اور اس کی خوشبو مشک سے زیادہ ہوتی ہے۔
دستِ مبارک کی خوشبو۔ آپ کے دست مبارک کی توصیف میں حضرت جابر بن سمرہ کی حدیث گزر چکی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے رخسار پر اپنا دست مبارک پھیرا تو میں نے ایسی ٹھنڈک اور خوشبو پائی کہ گویا آپ نے ابھی عطر کی ڈبیہ سے اپنا دست اقدس نکالا ہے۔ جو کوئی بھی آپ سے مصافحہ کرتا وہ تمام دن اپنے ہاتھوں میں خوشبو پاتا۔ آپ جس بچے کے سر پر دست شفقت رکھتے وہ آپ کی خوشبو کی وجہ سے تمام بچوں میں ممتاز و معروف ہو جاتا۔
فائدہ۔ بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینہ مبارک سے گلاب کا پھول پیدا ہوا ہے۔ ایک اور

جگہ مروی ہے آپ نے فرمایا گل سفید یعنی چنبیلی میرے پسینے سے شب معراج پیدا ہوئی ، گل سرخ یعنی گلاب جبرئیل علیہ السلام کے پسینہ سے اور گل زرد یعنی چمپا براق کے پسینہ سے ۔ نیز مروی ہے کہ فرمایا معراج سے واپسی پر میرے پسینہ کا قطرہ زمین پر گرا تو اس سے گلاب کی روئیدگی ہوئی ۔ جو کوئی میری خوشبو سونگھنا چاہے وہ گلاب کو سونگھے ایک اور روایت میں آیا ہے کہ جب میرے پسینے کا قطرہ زمین پر گرا تو زمین ہنسی اور گلاب کے پھول کو اگایا لیکن محدثین ان حدیثوں کو اپنی ان اصطلاحوں کے بموجب جو وہ رکھتے ہیں کلام کرتے ہیں۔

مواہب لدنیہ میں ابو الفرح نہروانی سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا ان حدیثوں میں جو کچھ آیا ہے وہ نبی مختار صلی اللہ علیہ وسلم کے دریائے فضل وکرم کا ایک قطرہ ہے اور ان کثرت میں سے بہت تھوڑا ہے جن سے پروردگار نے اپنے حبیب کو مکرم فرمایا۔ محدثین کا ان میں کلام کرنا اپنی ان اصطلاحات وضاعت کے مطابق ہے جو انہوں نے اسناد کی تحقیق و تصحیح میں منضبط فرمائے ہیں ایسا استبعاد و محال یا ناممکن ہونے کی بنا پر نہیں ہوا ہے واللہ اعلم۔

بوقت قضائے حاجت زمین کا شق ہو جانا: ۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قضائے حاجت کا ارادہ فرماتے تو زمین میں شگاف پڑ جاتا۔ اور زمین آپ کا بول و براز اپنے اندر سمو لیتی اور اس جگہ ایک خوشبو پھیل جاتی تھی۔ آپ کے براز کو کسی نے بھی نہ دیکھا۔ سیدتنا عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم استنجا کر کے بیت الخلاء سے تشریف لاتے تو میں جا کر دیکھتی تو اس جگہ از قسم براز کچھ نہ دیکھتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عائشہ تم نہیں جانتیں ، انبیاء کرام سے جو کچھ ان کے بطن اطہر سے نکلتا ہے زمین اسے نگل جاتی ہے چنانچہ اسے دیکھا نہیں جاتا۔

ایک صحابی سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ ایک سفر میں حضور کے ساتھ تھا۔ آپ قضائے حاجت کے لئے ایک جگہ تشریف لے گئے جب آپ واپس تشریف لے گئے تو میں اس جگہ گیا جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فراغت فرمائی تھی میں نے اس جگہ بول و براز شریف کا کوئی نشان تک نہ دیکھا۔ البتہ چند ڈھیلے وہاں پڑے تھے میں نے اسے اٹھالیا تو اس سے نہایت لطیف و پاکیزہ خوشبو آ رہی تھی۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

قاضی عیاض مالکی رحمتہ اللہ علیہ نے شفا میں فرمایا ہے کہ اہل علم کی جماعت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے "حدثین" یعنی بول یا براز فرمانے کے بعد وضو کرنے کی قائل ہے۔ اور یہی قول بعض اصحاب امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے۔

بول مبارک : ۔ اب رہی بول مبارک کی کیفیت تو اس کا بکثرت صحابہ نے مشاہدہ کیا ہے۔ اور حضرت ام ایمن جو آپ کی خدمت میں رہا کرتی تھیں انہوں نے اسے پیا بھی ہے۔ چنانچہ منقول ہے کہ رات کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تخت مبارک کے نیچے پیالہ رکھا جاتا کہ رات میں اس میں بول مبارک فرمادیں چنانچہ ایک رات جب آپ نے اس میں بول مبارک فرمایا اور صبح ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ام ایمن سے فرمایا کہ اس تخت کے نیچے ایک پیالہ ہے اسے زمین کے سپرد کر دو۔ مگر انہوں نے کچھ نہ پایا۔ ام ایمن نے عرض کیا خدا کی قسم رات مجھے پیاس معلوم ہوئی میں نے اسے پی لیا تھا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا اور نہ انہیں اپنا منہ دھونے کا حکم فرمایا اور نہ دوبارہ ایسا کرنے سے منع فرمایا بلکہ یہ فرمایا کہ اب تمہیں کبھی پیٹ کا درد لاحق نہ ہو گا (خوشا نصیب)

ایک عورت تھی جس کا نام "برکہ" تھا وہ بھی آپ کی خدمت میں رہا کرتی تھی اس نے بھی آپ کا بول شریف پی لیا تھا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اصحمتِ یا ام یوسف" اے ام یوسف (برکہ اس کی کنیت تھی) تم ہمیشہ کیلئے تندرست بن گئیں۔ کبھی بیمار نہ ہو گی۔ چنانچہ وہ عورت کبھی بیمار نہ ہوئی بجز اس بیماری کے جس میں اس نے دنیا سے کوچ کیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ ایک شخص نے آپ کا بول شریف پی لیا تھا تو اس کے جسم سے ہمیشہ خوشبو مہکتی رہی حتیٰ کہ اس کی اولاد میں کئی نسلوں تک یہ خوشبو رہی۔

مواہب اور شفا میں یہ دونوں روایتیں مذکور نہیں ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ صحابہ کرام آپ کے بول مبارک اور لہو شریف کو تبرک گردانتے تھے۔ لہو شریف کا پینا صحابہ سے متعدد بار واقع ہوا ہے۔ چنانچہ اس حجام نے جس نے آپ کے پچھنے لگائے تھے تو سنگھی یا چسکی سے جتنا لہو شریف نکلتا وہ اسے حلق سے اپنے شکم میں اتار تا جاتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا تم خون کا کیا کرتے ہو؟ اس نے عرض کیا میں خون نکال کر اپنے شکم میں پنہاں کرتا جاتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خون مبارک زمین پر بہے۔ آپ نے فرمایا بلاشبہ تم نے اپنی پناہ تلاش کرلی۔ اور اپنے نفس کو محفوظ بنالیا یعنی بلا اور امراض سے بچ گئے۔

غزوۂ احد کے دن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مجروح ہوئے تو حضرت ابو سعید خدری کے والد مالک بن سنان رضی اللہ عنہما نے آپ کے زخموں کو اپنے منہ سے چوس کر زبان سے زخموں کو پاک وصاف کیا۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ اپنے منہ سے خون باہر نکالو انہوں نے کہا نہیں! خدا کی قسم زمین پر آپ کے خون کو ہر گز نہ گرنے دوں گا۔ وہ خون کو نگل گئے اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص خواہش رکھتا ہے کہ وہ کسی جنتی شخص کو دیکھے تو وہ انہیں دیکھ لے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنے لگوائے اور اپنا خون مبارک مجھے دے کر فرمایا اسے کسی ایسی جگہ غائب کر دو جہاں کسی کی نظر نہ پڑے۔ میں نے اسے پی لیا کیونکہ اس سے زیادہ پوشیدہ جگہ میں نہیں پاتا تھا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وائے تمہیں لوگوں سے اور وائے لوگوں کو تم سے۔ یہ ان کی قوت، مردانگی، شجاعت اور بہادری سے کنایہ تھا جو انہیں اس خون مبارک کے پی لینے سے حاصل ہوئی۔ یہی وہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے یزید پلید کی بیعت نہ فرمائی۔ اور مکہ مکرمہ میں اقامت رکھی۔ اور ان کے حلقہ میں حجاز و یمن اور عراق و خراسان کے لوگ آکر جمع ہوئے۔ لیکن عبدالملک بن مروان کے عہد امارت میں حجاج بن یوسف نے ان کو شہید کیا اور دار پر کھینچا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے خون مبارک کے پی لینے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لَا تَمَسُّكَ النَّارُ اِلَّا قَسَمَ الْيَمِيْنِ" یعنی تمہیں دوزخ کی آگ نہ چھوئے گی مگر قسم کے لئے۔

یہ حدیثیں دلالت کرتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بول و دم طیب و طاہر ہے۔ اور اسی قیاس پر آپ کے تمام فضلات کا حکم ہے۔ اور عینی شارح صحیح بخاری فرماتے ہیں کہ امام اعظم امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کا یہی مذہب ہے اور شیخ ابن حجر مکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات کی طہارت پر بہت زیادہ اور کثرت سے روشن دلائل ہیں اور ہمارے ائمہ کرام اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں شمار کرتے ہیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ازدواجی زندگی مبارک۔ اب رہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی بیویوں سے مباشرت فرمانے کا ذکر۔ اگرچہ اس وصف کا ذکر بظاہر پشت و سینہ اور شکم کے ذکر کے بعد مناسب تھا لیکن سلسلہ وسیاق کلام اور نظم و ضبط مضامین کی وجہ سے بعض ان مقامات کے سبب کہ اس ذکر کو آخر میں لے جاتے ہیں لیکن میرے نزدیک اس کا یہ مقام بہتر ہے۔ نکاح کے فوائد میں سے پہلا فائدہ نسل کی حفاظت، نوع انسانی کے دوام کے بعد، حصول لذت انتفاع نعمت اور حفظ صحت ہے اس لئے کہ مادۂ تولید یعنی منی کو عرصہ تک روکے رکھنے اور جماع نہ کرنے سے امراض پوشیدہ کے پیدا ہونے اور قویٰ واعضاء کے ضعف کا سبب اور انسداد مجازی کا موجب ہے۔ عورتوں سے محبت کرنا اور کئی کئی نکاح کرنا از قسم کمال ہے۔ اور ایک ان مقامات میں سے ہے جہاں کوتاہ اندیشوں کی عقل اس کی کمالیت کی حقیقت سے در پردہ اور محجوب ہے۔ بیویوں سے جماع و مباشرت کو عاقبت نااندیش نقصان و عیب کی صورت اور

لہو ولعب کی قبیل سے شمار کرتے ہیں حالانکہ یہ فہم کی کمی اور رہبانیت کی طرف طبیعت مائل ہونے کی وجہ سے ہے۔ اور نظر بحقیقت و جماعیت، فعل وانفعال اور تاثیر و تاثر جو کہ ظہور عالم کی علت غائیہ ہے جتنا اس میں ہے اور کسی دوسرے فعل میں نہیں ہے۔ حضور سید انبیاء و رسل صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل مبارک اس کی سند و حجت کے لئے کافی ہے اس بحث کا بقیہ حصہ انشاء اللہ تعالیٰ آخر کتاب میں ذکر ازواج مطہرات کے ضمن میں آئے گا۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ایک شب میں اپنی (گیارہ) بیویوں کے پاس تشریف لے جاتے تھے۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا حضور اتنی طاقت رکھتے تھے؟ حضرت انس نے فرمایا ہم آپس میں گفتگو کیا کرتے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے تیس مردوں کی طاقت عطا فرمائی تھی اسے بخاری نے روایت کیا اور ایک روایت میں جنتی چالیس مردوں کی قوت بتایا گیا ہے اور مروی ہے کہ ہر جنتی مرد کی قوت سو (دنیاوی) مردوں کی قوت کے برابر ہوگی اور ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک دیگ کھانے کی حضرت جبریل لائے میں نے اس میں سے کچھ تناول کیا تو مجھ میں جماع کی چالیس مردوں کی قوت آگئی۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ "شفاء" میں ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شرمگاہ کبھی نہیں دیکھی ایک اور روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شرم گاہ دیکھی اور نہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شرمگاہ دیکھی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی مرتضیٰ کو وصیت فرمائی کہ تمہارے سوا مجھے کوئی غسل نہ دے اور کسی کی نظر میری شرمگاہ پر نہ پڑے کیونکہ جس کی بھی نظر میری شرمگاہ پر پڑے گی اس کی دونوں آنکھوں کی بینائی جاتی رہے گی یہ آپ کی جسمانی قوت کا کمال ہے۔ اور آپ کی روحانی قوت ایسی تھی کہ آسمان کو حرکت سے باز رکھتی تھی۔ بلکہ وہ اپنی حرکت کے بر خلاف چلتا تھا۔ چنانچہ غروب کے بعد آفتاب کو لوٹانا احادیث میں آیا ہے۔ یہ محل عبرت اور مقام نصیحت ہے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عیش و تنعم اور کھانے پینے کا یہ حال تھا کہ کبھی شکم سیر ہو کر کھانا نہ کھایا اور جو کی روٹی پر قناعت فرمائی۔ اس مرتبہ و کیفیت کے باوجود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن اقدس کی قوت و توانائی کا مذکورہ عالم آپ کے معجزات میں سے ہے۔

احتلام سے محفوظ ہونا:۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم احتلام سے محفوظ تھے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کوئی نبی کبھی بھی محتلم نہ ہوا کیونکہ احتلام شیطان کے اثر سے ہے اسے طبرانی نے روایت کیا ہے۔

بخاری و مسلم (متفق علیہ) کی حدیث میں ہے کہ رمضان مبارک میں نماز فجر کے وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بغیر احتلام کے جنبی ہوتے تھے۔ (بیوی سے شب باشی کرنے کے بعد وجوب غسل کا نام جنبی ہے) پھر آپ غسل فرماتے اور روزہ رکھتے اس عبارت میں "بغیر احتلام" کی قید سے مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ آپ پر احتلام کی نسبت جائز ہے ورنہ استثنا کرنے کا کیا فائدہ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ استثناء کی بنیاد عدم جواز پر ہے۔ اور یہ قید اتفاقی ہے۔ اور بیان واقع ہے۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غسل جماع سے تھا نہ کہ احتلام سے، کیونکہ احتلام آپ پر جائز نہیں ہے۔ اگر یہ معنی نہ ہوں تو لازم آتا ہے کہ احتلام کے ساتھ جنابت میں غسل فرض نہیں ہوتا حالانکہ یہ فاسد خیال ہے۔ قرطبی فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ احتلام آپ پر جائز نہیں ہے کیونکہ احتلام فعل شیطان سے ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے معصوم تھے۔ اور روزے والی حدیث میں احتلام کا مطلب یہ بتایا ہے کہ "خواب میں بغیر کچھ دیکھے انزال ہو جائے" اور جو خواب میں دکھائی دیتا ہے وہ شیطان ہے۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں آپ کا

غسل فرمانا جماع کے بعد دیر ہو جانے سے تھا۔ جو کہ ہم لوگوں کی کثرت اجتماع کی بنا پر تھا۔

تکملہ ۔ اس طویل حدیث میں جو بطریق ائمہ اہل بیت نبوت ہے اور وہ حدیث امامین کریمین سیدنا امام حسن و سیدنا امام حسین شہید کربلا سلام اللہ علیہم پر ختم ہوتی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیہ شریف اور بعض سیر و عادات کریمہ پر مشتمل ہے اس میں آیا ہے کہ امام حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی پھوپھی ہند بنت ابی ہالہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیہ مبارک کے بارے میں سوال کیا اور میں امید رکھتا تھا کہ وہ ان چیزوں کو بھی بیان کریں گی جو میرے متعلق ہیں۔ یعنی میں جانتا تھا کہ جو چیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیہ شریف کی ہے وہ مجھ میں ہوگی کیونکہ حضرت امام حسن مجتبیٰ سلام اللہ علیہ اس حد تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیہ شریف سے مشابہت رکھتے تھے کہ اگر کوئی شخص خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوتا تو لوگ اس سے دریافت کرتے تھے کہ کس صورت میں دیکھا ہے اگر وہ بصورت امام حسن رضی اللہ عنہ دیکھتا تو کہتے تم نے ٹھیک دیکھا ہے چنانچہ ہند بنت ابی ہالہ نے کہا:۔

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخْمًا مُفَخَّمًا يَتَلَأْلَأُ وَجْهُهٗ تَلَأْلُؤَ الْقَمَرِ، لَيْلَةَ الْبَدْرِ اِلٰى اٰخِرِ الْحَدِيْثِ۔

دیکھنے والوں کی نظر میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور عظیم، بزرگ، دبدبہ والا تھا۔ آپ کا چہرہ چمکتا تھا جیسے چودھویں رات کا چاند چمکتا ہے۔

امام حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر میں نے ہند بنت ابی ہالہ سے دریافت کیا مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام فرمانے سکوت فرمانے اور قوت گویائی کے بارے میں بتایئے۔ تو انہوں نے کہا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ فکر مند اور غمزدہ رہتے تھے۔ بے ضرورت کلام نہ فرماتے۔ آپ کی خاموشی دراز ہوتی۔ کلام کی ابتدا اور اختتام کنج دہن سے فرماتے۔ یعنی لفظوں کو اپنے دہن مبارک سے تمام و کمال اور درست نکالتے۔ اور شکستہ و ناقص کلام نہ فرماتے اور آپ کا تکلم "جوامع الکلم" یعنی لفظ مختصر اور معانی بکثرت رکھتے تھے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

اُوْتِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ وَاُخْتُصِرَ لِيَ الْكَلَامُ مجھے جوامع الکلم دیا گیا اور کلام کو میرے لئے مختصر رکھا گیا۔

اور بیان فاصل و مفصول کے ساتھ تکلم فرماتے جس میں نہ نقص ہوتا نہ فضول۔ آپ نرم طبیعت اور خوش خلق تھے۔ درشت خو اور تند خو نہ تھے۔ نعمت کی عزت کرتے اگر چہ تھوڑی ہوتی۔ اور کسی چیز کو عیب نہ لگاتے کھانا جیسا بھی ہوتا ملاحظہ فرما لیتے۔ اگر برا نہ کہتے تو تعریف بھی نہ کرتے جس طرح زبان کے چٹخارے والوں کی عادت ہے۔ کوئی آپ کے غصے کے آگے نہ کھڑا رہ سکتا تھا اور نہ تاب لا سکتا تھا آپ کو غصہ اس وقت آتا جب کوئی حد سے تجاوز کرتا یہاں تک کہ حق کا بدلہ لے کر ہی رہتے۔ لیکن آپ اپنے ذاتی حق کے لئے نہ غصہ کرتے اور نہ بدلہ لیتے تھے۔ بشرطیکہ وہ دنیا سے متعلق ہوتا اور اگر کسی چیز کی طرف اشارہ کرتے تو پورے ہاتھ (کف دست) سے اشارہ کرتے نہ کہ صرف انگلی سے۔ اور بوقت تعجب کف دست کو اس وضع پر جس پر اسے پیدا کیا گیا نکالتے۔ گفتگو فرماتے تو داہنے ہاتھ کی سر انگلی کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مارتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تمام عادتیں اللہ تعالیٰ کو محبوب تھیں۔ یقیناً ان عادات کریمہ میں کوئی نکتہ اور بھید ہو گا جن کی کنہ دریافت کرنے سے عقل عاجز و قاصر ہے۔ واللہ اعلم۔

آپ جب غضب فرماتے تو اپنا چہرۂ انور اور پہلوئے مبارک اس طرف سے پھیر لیتے اور جب خوشی و مسرت کا اظہار فرماتے اور کسی چیز سے محظوظ ہوتے تو آنکھوں کو بند فرما لیتے۔ آپ کی اکثر ہنسی تبسم سے ہوتی اور تبسم میں دندان مبارک، صفاء و لطافت اور آب و تاب میں اولے کی مانند چمکنے لگتے۔

سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس حدیث پاک کو ابن ہالہ سے سن کر ایک زمانہ تک اپنے بھائی امام حسین سے پوشیدہ رکھا۔ مگر جب میں نے اسے ان سے بیان کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اس حدیث کو پہلے ہی سن چکے تھے اور اپنے والد سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے اس سے زیادہ دریافت کر چکے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا آنا جانا، شکل و صورت، نشست و برخاست سب کچھ معلوم کر چکے تھے۔ چنانچہ امام حسین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد ماجد علی مرتضیٰ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان میں داخل ہونے کے بارے میں پوچھا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکان میں تشریف لاتے تو کیا کرتے تھے۔ انہوں نے فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کاشانہ اقدس میں داخل ہوتے تو اپنے اوقات کے تین حصے کرتے ان میں سے ایک حصہ خدا کے لئے ہوتا۔ یعنی عبادت کرتے۔ اگرچہ آپ ہمہ وقت عبادت میں رہتے۔ لیکن اس جگہ مراد خالصًاللہ ہے۔ وقت کے اس حصے میں نہ اہل کا دخل ہوتا نہ اپنی ذات اور دوسرے لوگوں کے حقوق کی مداخلت ہوتی اور دوسرا حصہ اہل و عیال کے لئے ہوتا یعنی ان کے حقوق کی ادائیگی ہوتی۔ ان سے گفتگو فرماتے۔ ان کی ضروریات پوری فرماتے اور ان سے مباشرت وغیرہ کرتے۔ اور تیسرا حصہ اپنی ذات اقدس کے لئے ہوتا اور اس کے حقوق ادا فرماتے۔ مثلاً استراحت فرماتے سوتے اور اسی قسم کے کام وغیرہ۔ پھر اپنے اس تیسرے حصہ کو بھی اپنے اور دوسرے لوگوں کے درمیان تقسیم فرما دیتے اور اس میں ان کو شریک فرمالیتے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ آپ کے مخصوص اصحاب، عام لوگوں کی ضروریات اور ان کی حاجتوں کی اطلاع فرماتے پھر خواص صحابہ آپ کی مجلس مبارک کے فوائد ان عام لوگوں میں پہنچاتے مطلب یہ کہ سب سے پہلے بے واسطہ فوائد ان خواص کو پہنچتے۔ پھر دوبارہ ان خواص کے واسطے عام لوگوں کو پہنچتے تھے۔ اور فوائد و نصائح میں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ذخیرہ کر کے اور لوگوں سے بچا کر کچھ نہیں رکھتے تھے۔ یعنی جو کچھ ان کے حال و استعداد کے مناسب ہوتا آپ انہیں پہنچا دیتے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور عادات کریمہ میں ایثار اور اہل فضل و علم اور صاحبان صلاح و شرف کو اجازت کے ساتھ اختیار تھا یعنی ان کو اندر آنے کی اجازت مرحمت فرماتے اور اپنی مجلس شریف کی حاضری میں مخصوص گردانتے اور ان کے فضل و مرتبت کے مطابق دین میں تقسیم فرماتے۔ مطلب یہ کہ جو شخص آپ کی مجلس میں یا دین داری میں جتنا زیادہ مخصوص و ممتاز ہوتا وہ اپنے نصیب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عنایت و رعایت کا بہت زیادہ مستحق ہوتا تھا۔ آپ لوگوں کی حاجت روائی اور اصحاب کے مقاصد کی تحصیل میں مشغول رہتے اور ان کو اپنے احوال کی درستگی و اصلاح کے کاموں میں مشغول رکھتے تھے۔ اور ارشاد فرماتے کہ تم پر لازم ہے کہ جو اس مجلس مبارک میں حاضر ہو کر سنے وہ دوسرے غیر موجود لوگوں کو پہنچائے۔ آپ فرماتے تم سب پر فرض ہے کہ مجھ تک ان لوگوں کی حاجتیں پہنچاؤ جو میرے حضور حاضر ہو کر خود نہیں پہنچا سکتے۔

فائدہ:۔ آپ نے فرمایا جو کسی ایسے شخص کی حاجت، سلطانِ حاجت یعنی حاجت روا کے پاس پہنچائے جو اپنی حاجت خود اس کے سامنے نہیں پہنچا سکتا تھا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے قدم کو ثبات عطا فرمائیں گے۔ اس ارشاد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حضور پیش کرنے کا ذکر نہیں فرمایا۔ مگر چونکہ آپ کے حضور ایسی ہی حاجتیں پیش کی جاتی تھیں جن کی دنیا و دین میں ضرورت ہوتی ہے ان کے سوا آپ کی بزم شریف میں کوئی ذکر نہ ہوتا۔ خاص کر لغو و بیکار باتیں۔ لوگ آپ کی بارگاہ سے علم اور خیر و برکت کا حصہ لے کر لوگوں میں جاتے اور ان کی رہنمائی کرتے۔

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے والد علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے کاشانہ اقدس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے باہر تشریف لے جانے اور صحابہ کرام کے نشست فرمانے کے بارے میں دریافت کیا۔ حضرت علی نے فرمایا "کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْزُنُ لِسَانَهُ اِلَّا فِيْمَا يَعْنِيْهِ " یعنی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زبان مبارک کو بند رکھتے اور اس کی حفاظت فرماتے مگر اس چیز میں اور اس بات میں جو مفید و سود مند ہوتی۔ "یخزن" خزن سے ہے جس کے معنی خزانہ میں مال رکھنا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ آپ کی زبان مبارک اس دل کی جو حقائق و معرفت سے مالامال ہے کنجی تھی۔ یعنی امت کے لئے جو سود مند و مفید ہوتا۔ اس کے لئے آپ زبان مبارک کھولتے ورنہ اپنی زبان کو بند رکھتے۔ آپ امت کی دلجوئی فرماتے اور اپنے قرب سے دور بھاگنے سے انہیں محفوظ رکھتے۔ درحقیقت یہ فعل الٰہی سے ہے۔ جیسا کہ فرمایا " وَ اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ الاٰیۃ " یعنی حق تعالیٰ ایسا مہربان ہے کہ اس نے تمہارے دلوں میں محبت فرمائی...... آپ ضعیف الایمان لوگوں پر بہت زیادہ احسان و عطا فرماتے۔ ان لوگوں کو مؤلفۃ القلوب کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر قوم کے معزز فرد کی عزت و احترام فرماتے اور انہیں کو ان پر حاکم مقرر فرماتے۔ اور آپ لوگوں سے بچتے اور ان سے اپنا تحفظ فرماتے۔ اور دشمنوں سے اپنی نگہداشت فرماتے تاکہ اعداء ضرر نہ پہنچائیں۔ یہ تحفظ آیہ کریمہ "وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ " اللہ تعالیٰ لوگوں سے آپ کو محفوظ رکھے گا۔ " کے نازل ہونے سے پہلے تھا۔ قطع نظر اس کے اس میں علم و حکمت اور امت کے لئے تعلیم وارشاد ہے۔ درحقیقت یہ اپنا رعب و دبدبہ قائم رکھنے اور لوگوں سے عدم اختلاط و انبساط کی جانب کنایہ ہے۔ تاکہ وہ بے خوف اور بے باک نہ ہو جائیں۔ باوجود اپنا تحفظ فرمانے کے اپنی کشادہ روئی اور خوش خلقی کا رویہ ترک نہ فرماتے۔ ان کے احوال کو دریافت کرتے اور اپنے اصحاب کی دلجوئی اور باز پرس فرماتے۔ اور لوگوں سے ایک دوسرے کے احوال پوچھتے تاکہ ہر ایک اچھے حال میں رہے اور باہم حسن سلوک کرتے رہیں اور اچھے کام و احوال پر ان کو شاباشی دیتے اور تقویت و تائید فرماتے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اصلاح فرماتے برے کاموں کی مذمت فرماتے۔ اور باز رہنے کی تلقین فرماتے۔ آپ کی عادت کریمہ ہی یہ تھی کہ اچھائی کی تعریف فرماتے اور برائی کی مذمت کرتے اور جس سے بھی یہ برائی سرزد ہوتی اس کی سرزنش فرماتے۔ اور اس بدکار کی نہ پرواہ کرتے اور نہ اس سے خوف کرتے خواہ وہ کتنا ہی بظاہر بلند مرتبہ اور طاقتور ہوتا۔

لوگوں کے احوال ایک دوسرے سے دریافت کرنا "تجسس" کی قبیل سے نہ تھا۔ کیونکہ تجسس اسے کہتے ہیں کہ کسی کے پوشیدہ عیبوں کو بقصد اشاعت اور برائی پوچھا جائے۔ احوال کی یہ پرسش بقصد تربیت و اصلاح ایک دوسرے کے ظاہری احوال کی تھی۔ اور آپ ہر چیز میں معتدل الامر یعنی آپ کے تمام افعال کریمہ اور اوصاف شرعیہ معتدل اور ہموار اور متمکن و مستقل اور پائیدار تھے۔ آپ کے کاموں میں نشیب و فراز نہ تھا۔ نہ اختلاف اور افراط و تفریط کی راہ پیدا ہوتی تھی۔ اور امت کی تعلیم و تربیت اور تادیب و تہذیب سے غافل نہ رہتے تھے۔ اور ہمیشہ ان کی سیاست و رہنمائی اور تدبیر کار میں مشغول رہتے۔ اور اس سے خوف رکھتے کہ کہیں وہ غافل نہ ہو جائیں۔ سخت شاق عبادت کا التزام دوام، اس خوف سے نہ فرماتے کہ کہیں امت پر فرض نہ کر دیئے جائیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر حال میں ہر کام کے لئے آمادہ و تیار رہتے مثلاً جنگی اسلحہ اور حربی ساز و سامان وغیرہ میں۔ اور ان کے مصلحتی امور کے لئے جس چیز کی ضرورت لاحق ہوتی اسے تیار کرتے۔ اور حق میں نہ کوتاہی کرتے نہ حق سے تجاوز کرتے۔ ہمیشہ اقامت حق اور اثبات حق میں منہمک رہتے۔ اور آپ کے تمام مقربین و ہم نشین حضرات، اخیار و ابرار یعنی برگزیدہ و نیکوکار تھے۔ آپ کے حضور میں وہی فاضل تر اور مقرب تر ہوتا جو لوگوں کے لئے ناصح تر اور خیر خواہ تر ہوتا۔

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد ماجد سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے دریافت کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک کے آداب اور طور طریق کیا تھے۔ اور ان کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم نشینی کس طرح تھی۔ فرمایا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ بیٹھتے نہ اٹھتے مگر ذکر خدا کے ساتھ یعنی نشست و برخاست میں ہمیشہ ذکر خدا کرتے تھے۔ اور جب مجلس

مبارک میں تشریف لاتے تو جہاں بھی جگہ ہوتی بیٹھ جاتے۔ اور کسی بلند و ممتاز جگہ کا قصد نہ فرماتے۔ اور نہ اپنے لئے کوئی خاص جگہ متعین کر رکھی تھی۔ اور آپ امت کو اسی کی تلقین فرماتے۔ اور بلند و بالا جگہ کی خواہش سے منع فرماتے تھے۔ اور آپ اپنی عنایت اور توجہ والتفات کا حصہ تمام اہل مجلس کو مرحمت فرماتے اور کوئی بھی یہ گمان نہ کر سکتا کہ وہ ہم نشینی میں دوسرے سے بزرگ تر اور آپ سے زیادہ قریب ہے۔ ہر شخص کے ساتھ اس کے مرتبہ اور قابلیت اور اس کے حال کے مطابق عنایت فرماتے جو بھی آپ کے پاس کوئی حاجت یا ضرورت لاتا تو آپ اس وقت تک انتظار فرماتے کہ وہ شخص خود ہی واپس جائے۔ مجلس سے آپ خود اس وقت تک تشریف نہ لے جاتے جب تک کہ وہ خود اٹھ کر نہ چلا جاتا۔ آپ سے جو کوئی بھی سوال کرتا یا کسی حاجت و ضرورت کو پیش کرتا تو آپ اسے نہ منع کرتے اور نہ رد کرتے بلکہ اس کی حاجت برآری فرماتے۔ اور اگر بالفرض اس وقت کچھ موجود نہ ہوتا تو خوش خلقی سے دل جوئی کر کے میٹھی بات سے اس کو لوٹا دیتے۔ اس عادت کریمہ کی تفصیل آپ کے اخلاق شریفہ کے باب میں آپ کے جود و سخا کے ضمن میں آئے گی۔ آپ تمام لوگوں کے لئے بمنزلہ باپ کے تھے اور حق میں آپ کے نزدیک سب برابر تھے۔ آپ کی مجلس، علم، حلم، حیاء اور صبر و امانت کی مجلس تھی جہاں نہ کسی کی آواز بلند ہی ہوتی اور نہ اس میں حرام و ناشائستہ بات ہوتی تھی۔ اہل مجلس کی کسی ذلیل حرکت کو نہ تو ظاہر کیا جاتا اور نہ اسے پھیلایا جاتا۔ مطلب یہ تھا کہ بتقاضائے بشریت اگر کسی سے ذلیل یا ناشائستہ حرکت سرزد بھی ہو جاتی تو اس سے چشم پوشی کی جاتی۔ تمام اہل مجلس متساوی و موافق اور برابر تھے۔ ان میں باہم فضیلت تقویٰ کے اعتبار سے تھی۔ وہ باہم ایک دوسرے کی تعظیم و توقیر کرتے تھے۔ بڑے، چھوٹوں پر شفقت کرتے اور چھوٹے، بڑوں کی تعظیم کرتے اور محتاجوں پر ایثار کرتے اور غریب و مسافر کی رعایت کرتے تھے۔ صلی اللہ علیہ وسلم ورضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

باب دوم

دربیان اخلاق عظیمہ وصفات کریمہ صلی اللہ علیہ وسلم

اخلاق خلق کی جمع ہے اور خلق بضم خاء، باطنی سیرت کو کہتے ہیں اور خلق بفتح خاء، ظاہری صورت کو قاموس میں ہے "خلق" خاء اور لام کے ضمہ اور سکون کے ساتھ بمعنی خصلت و طبع ہے۔ اور صراح میں خلق بمعنی خوئے حسن اور کبھی بمعنی جوانمردی، شگفتہ روئی اور لوگوں سے حسن سلوک آتا ہے۔ لیکن اس کے معنی اس سے کہیں زیادہ عام اور وسیع میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق شریف انہیں معنوں پر موقوف نہیں ہیں۔ بلکہ جہاں آپ مسلمانوں کے ساتھ رحیم ورفیق تھے مہربان و شفیق تھے وہاں کفار پر اقامتِ حق و حجت میں بہت سخت و شدید تھے۔ اور دانشمندوں کے نزدیک، خُلق کے معنی ایسا ملکہ ہے جس کی وجہ سے بہ سہولت و آسانی افعال صادر ہوتے ہیں۔ خلق کی تعریف و توضیح معقولات کی کتابوں میں مستقلاً ذکر کی گئی ہے البتہ اس میں یہ اختلاف ہے کہ خلق غریزی یعنی طبعی اور پیدائشی خصلت ہے یا یہ اکتسابی خصلت ہے جس کو بندہ ریاضت و مجاہدے اور کسب و ہنر سے حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ بعض علماء کا مذہب یہ ہے کہ یہ غریزی یعنی طبعی و پیدائشی ہے ان کی دلیل سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم میں تمہارے اخلاق کو اسی طرح مقدر فرمایا جس طرح تمہارے رزق کو مقدر فرمایا۔ (رواہ البخاری) اور فرمایا کہ "اگر تمہیں یہ خبر پہنچے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے جنبش کر گیا ہے تو تم اس کی تصدیق کر دو۔ اور اگر یہ اطلاع ملے کہ فلاں آدمی نے اپنی عادت و خصلت بدل دی ہے تو اسے قبول نہ کرو۔" لیکن پھر بھی خدا کے اختیار میں سب کچھ ہے۔

یہ تحقیق ہے کہ لوگوں کے احوال مختلف و متفاوت ہیں۔ کچھ لوگ تو وہ ہیں جن کے بعض اخلاق ایسے راسخ اور پختہ ہو گئے ہیں کہ ان میں تغیر و تبدل متعذر ہے۔ بلکہ ان کا چھوڑنا ناممکن ہے ورنہ وہ مجاہدہ و ریاضت کے ساتھ مامور ہیں اگر ان کے زوال کی کوشش کرے اور انہیں محمود بنانا چاہے تو ممکن ہے اور بعض اخلاق ضعیف، کمزور ہیں جو ریاضت سے قوی ہو جاتے ہیں۔ اور بعض قوت سے ضعف میں آتے ہیں۔ اور شریعت میں اخلاق کو اچھا بنانے کا حکم آیا ہے اور انبیائے کرام صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہم کو اخلاق سنوارنے بنانے اور خلق کی ہدایت فرمانے کے لئے بھیجا گیا۔ اگر اخلاق میں تغیر و تبدل ممکن نہ ہوتا تو ان کو عمدہ بنانے اور نبیوں کو بھیجنے کا کیا فائدہ۔ دعائے ماثورہ میں مروی ہے کہ "اَللّٰھُمَّ کَمَا حَسَّنْتَ خَلْقِیْ فَحَسِّنْ خُلُقِیْ" یعنی اے اللہ جس طرح تو نے میری تخلیق اچھی بنائی اسی طرح میری خصلت کو اچھا بنا۔ دوسری حدیث میں فرمایا "اَللّٰھُمَّ اھْدِنِیْ لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ لَا یَھْدِیْ لِاَحْسَنِھَا اِلَّا اَنْتَ وَاصْرِفْ عَنِّیْ سَیِّئَھَا وَلَا یُصْرِفُ سَیِّئَھَا اِلَّا اَنْتَ" یعنی اے اللہ مجھے اچھے اخلاق کی رہنمائی فرما۔ تیرے سوا کوئی اچھے اخلاق کی توفیق نہیں دے سکتا۔ اور مجھے بری عادتوں سے پھیر دے تیرے سوا کوئی بری عادت سے نہیں پھیر سکتا۔" یہ سب تعلیم و تلقین کے لئے ہے۔

اور شیخ عبدالقیس کی حدیث میں مروی ہے "اِنَّ فِیْکَ لَخَصْلَتَیْنِ یُحِبُّھُمَا اللّٰہُ اَلْحِلْمُ وَالْاَنَاءَۃُ" یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عبدالقیس تجھ میں دو خصلتیں ہیں جو خدا کو بہت پیاری ہیں ایک بردباری اور دوسرا وقار۔ اس نے عرض کیا "یا رسول اللہ قدیما کان اَوْحدیثًا" اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میری یہ خصلت ہمیشہ سے ہے یا اب نمودار ہوئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قدیما" ہمیشہ سے ہے۔ اس پر اس نے کہا کہ میں خدا کا شکر بجالاتا ہوں کہ اس نے میری جبلت و طبیعت میں ایسی دو خصلتیں پیدا فرمائی ہیں جن کو وہ محبوب رکھتا ہے۔ تو سوال میں تردید کا اشارہ اس طرف ہے کہ بعض اخلاق جبلی و پیدائشی ہیں اور بعض کسابی و اختیاری۔

اس جگہ تطبیق کی ایک اور صورت بھی ہے وہ یہ کہ جو اخلاق، صحبت اور عادت کے سبب حاصل اور پیدا ہوتے ہیں ان کا تغیر و تبدل آسان ہے۔ لیکن بعض اخلاق، جبلی، طبعی، اور دائمی ہوتے ہیں ان کا تغیر و تبدل دشوار ہے۔ اس کے باوجود حیطۂ امکان سے باہر نہیں ہیں۔ واللہ اعلم۔

اور یہ اعتقاد رکھنا لازم ہے کہ تمام انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام کی صورت و سیرت میں مکارم اخلاق و محامد صفات اور ہر قسم کے کمالات و فضائل اور محاسن موجود ہوتے ہیں۔ اور انہیں تمام بنی نوع انسان اور افراد بشری پر فوقیت اور ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ رتبوں میں ان کا رتبہ سب سے بڑا اور درجوں میں ان کا درجہ سب سے بڑا ہوتا ہے۔ اور ان حضرات قدس کا درجہ اور مقام کتنا بلند و بالا ہوگا جن کو حق سبحانہ و تعالیٰ نے برگزیدگی میں منتخب فرمایا اور درجہ اجتہاد و اصطفا سے سرفراز فرما کر اپنی کتاب میں ان کی فضیلت اور مدح و ثنا بیان فرمائی۔ صلوٰت اللہ وسلامہ علیہم اجمعین ۔

عقائد میں یہ ثابت شدہ ہے کہ کوئی ولی نبی کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ شیخ امام حافظ الدین نسفی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر مدارک میں فرماتے ہیں کہ بلاشبہ بعض لوگوں کے قدم ولی کو نبی پر فضیلت دینے میں بھٹک گئے ہیں۔ حالانکہ یہ کھلا کفر ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رسل کو ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے چنانچہ فرماتا ہے۔ "تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ" ان رسولوں میں سے ہم نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔

شفاء قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ میں مذکور ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اخلاق کریمہ سب کے سب فطری، جبلی اور پیدائشی ہیں نہ کہ ملکیتی اور اعمال سے حاصل کردہ ہیں۔ بلکہ اول خلقت اور اصل فطرت میں بغیر اکتساب و ریاضت کی محنت اٹھائے حاصل ہیں اور وہ سب وجود الٰہی کے اجتباء اور اس کے نامتناہی فضل کے فیض سے ہیں۔

تَبَارَكَ اللّٰهُ مَا وَحْيٌ بِمُكْتَسَبٍ وَلَا نَبِيٌّ عَلَى الْغَيْبِ بِمُتَّهَمِ

اللہ تعالیٰ بزرگ و برتر ہے۔ کسی نبی کی وحی کسبی نہیں ہے اور نہ کوئی نبی غیبی خبریں بتانے پر متہم بالکذب ہے۔ اس شعر میں وحی سے مراد نبوت و رسالت ہے جو کہ وحی القاء اور حکمت کا مبدء اور سرچشمہ ہے۔ ورنہ اکتساب نفس وحی بیان کی حاجت نہیں رکھتا۔

بعض نبیوں کے بچپنے کی حالت کا بیان : ۔ اور بعض انبیاء کرام علیہم السلام سے اخلاق کریمہ اور منصب نبوت کا ظہور ان کی خورد سالی ہی میں ہوا جیسا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا "وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا" یعنی ہم نے انہیں خورد سالی ہی میں حکمتیں عنایت فرمادی تھیں۔ مروی ہے کہ ان کی عمر شریف دو یا تین سال کی تھی کہ بچوں نے ان سے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ کھیل کود کیوں نہیں کرتے۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے کھیل کود کے لئے پیدا نہیں فرمایا اور آیہ کریمہ "مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ" (اللہ کے کلمہ کی تصدیق کرنے والے) کی تفسیر میں منقول ہے کہ حضرت یحییٰ نے حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی تصدیق اس عمر میں فرمائی کہ ان کی عمر شریف تین سال کی تھی۔ اور گواہی دی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے کلمہ اور اس کی روح ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے پنگھوڑے میں فرمایا۔ ۔

إِنِّي عَبْدُ اللّٰهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا میں اللہ کا بندہ ہوں مجھے کتاب عطا فرما کر نبی بنایا گیا۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام اپنا فتاویٰ ارشاد فرماتے وقت بچوں کے درمیان عمر صبی رکھتے تھے۔ طبری بیان کرتے ہیں کہ آپ عنان مملکت کو سنبھالتے وقت بارہ برس کے تھے اور آیہ کریمہ "وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِنْ قَبْلُ" (بلاشبہ ہم نے ابراہیم کو پہلے ہی سے عقل کی پختگی عنایت فرمادی تھی) کی تفسیر میں مروی ہے "أَيْ هَدَيْنَاهُ الصَّغِيرَ" یعنی ہم نے انہیں بچپنے میں ہی ہدایت فرمادی تھی اور ایک قول یہ ہے کہ ابداء خلق

سے پہلے ولادت کے وقت ایک فرشتے کو ان کے پاس بھیجا کہ وہ کہے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ "کہ دل سے مجھے پہچانو اور زبان سے میرا ذکر کرو"۔ تو انہوں نے کہا بجان و دل قبول ہے۔ اور جب نمرود نے آپ کو آگ میں ڈالا اس وقت آپ کی عمر شریف سولہ سال کی تھی۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کی داڑھی پکڑنا بھی اسی قبیل سے ہے۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام کو جس وقت ان کے بھائیوں نے کنویں میں ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی فرمائی اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بوقت ولادت شریف اپنے دونوں ہاتھ اور اپنا سر مبارک آسمان کی طرف اٹھانے کا واقعہ تو مشہور ہی ہے۔ اور فرمایا زمانہ جاہلیت کے افعال کی طرف دو مرتبہ کے سوا میں نے کبھی قصد و ارادہ نہ فرمایا تو اس وقت بھی حق تعالیٰ نے مجھے محفوظ فرمایا اور میرے دل میں شروع ہی سے بتوں اور شعر گوئی کے خلاف نفرت پیدا کر دی گئی تھی۔ اس کے بعد انبیاء علیہم السلام کے امور پر متمکن و گامزن فرمایا گیا اور ان پر متواتر نفحات ربانی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ مرتبہ قصوای یعنی غایت درجہ مقام بلند اور درجہ کمال میں انتہا تک فائز ہوئے یہ سب بغیر محنت و کاوش اور ریاضت و مجاہدے کے تھا۔

ارشاد ربانی ہے:۔ "وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا" "اور جب وہ عقل کے کمال پر پہنچ کر مستحکم ہوئے تو ہم نے ان کو علم و حکمت عطا فرمایا۔

بعض اولیاء کو بھی ان سے بعض صفات حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن تمام صفات میں نہیں اور عصمت تو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ خاص ہی ہے۔ (دراصل یہ اس پہلے قول کی دلیل ہے جس میں کہا تھا کہ کوئی ولی نبی کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ فافہم، مترجم)

حضور اکرم سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات، عالی صفات منبع البرکات اپنے تمام اخلاق و خصائل، صفات جمال و جلال میں اس قدر اعلیٰ و اشرف، اتم و اکمل، احسن و اجمل اور خوب روشن و اقویٰ ہیں جو حدود عدد اور حیطہ ضبط و حصر سے باہر ہیں اور کمالات میں جو کچھ خزانہ قدرت اور مرتبہ امکان میں متصور ہے۔ وہ تمام آپ کو حاصل ہیں۔ اور تمام انبیاء و مرسلین آپ کے آفتاب کمال کے چاند اور انوار جمال کے مظاہر ہیں۔ اللہ ہی کے لئے تمام خوبیاں ہیں۔ امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا۔

وَكُلُّ اٰيٍ اَتَى الرُّسُلُ الْكِرَامُ بِهَا ۔۔۔ فَاِنَّمَا اتَّصَلَتْ مِنْ نُّوْرِهٖ بِهِمِ
فَاِنَّهٗ شَمْسُ فَضْلٍ هُمْ كَوَاكِبُهَا ۔۔۔ يُظْهِرْنَ اَنْوَارَهَا لِلنَّاسِ فِي الظُّلَمِ
وَكُلُّهُمْ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ مُلْتَمِسٌ ۔۔۔ غَرْفًا مِّنَ الْبَحْرِ اَوْ رَشْفًا مِّنَ الدِّيَمِ

یعنی تمام انبیاء و مرسلین جو نشانی لے کر تشریف لائے وہ سب آپ ہی کے نور جمال و جلال کا پرتو ہیں۔ بلاشبہ آپ ہی فضل کے آفتاب ہیں اور وہ سب آپ کے ستارے ہیں۔ جن کے انوار تاریکی میں لوگوں کے لئے مشعل نور بنے۔ وہ تمام رسول اللہ کے خوشہ چین ہیں۔ اور آپ کے دریائے فضل کے ایک گھونٹ اور سمندر کے ایک قطرہ ہیں۔ وصلی اللہ علیہ وآلہ قدر حسنہ و جمالہ وکمالہ و بارک وسلم۔

اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کریمہ میں مکارم اخلاق، محامد صفات اور ان کی کثرت و قوت اور عظمت جمع ہونے کے لحاظ سے قرآن کریم میں مدح و ثنا فرمائی ہے۔ ارشاد ہے۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ۝ بلاشبہ آپ بڑے ہی صاحب اخلاق ہیں۔ اور فرمایا۔

وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا۝ آپ پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔

اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔ "اُكَمِّلُ مَحَاسِنَ الْاَفْعَالِ" یعنی مجھے مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا اور ایک

روایت میں ہے "بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ" یعنی مجھے اچھے کاموں کو مکمل کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی ذات شریف میں تمام محاسن و مکارم اخلاق جمع تھے اور کیوں نہ ہو جب کہ آپ کا معلم حق تعالیٰ سب کچھ جاننے والا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمہ کی ایک جھلک

وصل :۔ سیدتنا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حدیث مبارک میں ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمہ کے بارے میں آپ سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا "كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ" آپ کا اخلاق قرآن تھا۔ اس کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جو کچھ قرآن کریم میں مکارم اخلاق اور صفات محمودہ مذکور ہیں آپ ان سب سے متصف تھے۔ "شفاء" میں قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ مزید ذکر فرماتے ہیں کہ "يَرْضٰى بِرِضَاهُ وَيَسْخَطُ بِسَخَطِهِ" یعنی آپکی خوشنودی قرآں کی خوشنودی کے ساتھ اور آپ کی ناراضگی قرآن کی ناراضگی کے ساتھ تھی۔ مطلب یہ کہ آپ کی رضا امر الٰہی کی بجا آوری میں اور آپ کی ناراضگی حکم الٰہی کی خلاف ورزی اور ارتکاب معاصی میں تھی۔ بادی النظر میں اس کے یہی معنی ہیں جو مذکور ہوئے۔ اور "عوارف المعارف" میں مذکور ہے کہ سیدتنا عائشہ رضی اللہ عنہا کی مراد یہ تھی کہ قرآن کریم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مہذب اخلاق تھا۔ حضرت شیخ نے اسے طویل بیان کے ساتھ ذکر کیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر سے حصہ شیطان کے نکالنے کے بعد اور اسے غسل و تطہیر دے کر آپ کے نفس زکیہ کو نفوس بشریہ کی حد پر برقرار رکھ کے اس میں بشری صفات و اخلاق اس حد تک باقی رکھے کہ اس کا ظہور نزول قرآن کا موجب بنے۔ (اس لئے کہ نبی ہوتا ہی وہ ہے جس میں صفات بشریہ علی وجہ الکمال ہوں اور جو منافی کمال بشریت صفات تھے ان کا اخراج کر دیا گیا۔) اور وہ صفات جو تادیب و تہذیب شان نبوی ہوں باقی رکھے گئے۔ تاکہ موجب رحمت خلق اور تہذیب اخلاق امت ہوں (مطلب یہ کہ آپ میں بعض صفات بشریہ اس لئے باقی رکھے گئے کہ لوگ آپ کو ہم شکل و صورت اور ہم جنس جان کر انس و محبت رکھیں۔ اگر خالص ملکی صفات ہی کے حامل ہوتے تو لوگ وحشت زدہ ہو کر انس و محبت سے دور ہو جاتے گویا آپ کی صفات بشریہ رحمت خلق کا موجب اور امت کی اخلاقی تہذیب و آراستگی کا باعث ہے۔ مترجم) اس لئے کہ انسانی نفوس میں اصل صفات بشری مزید ظلمت و کثافت کے جڑ پکڑنے اور برقرار رکھنے کا موجب بنتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا "لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ" (تاکہ تمہارے دل کو اس سے ہم ثابت و برقرار رکھیں) اور ثبات قلب، اضطراب قلب کے بعد ہوتا ہے کیونکہ حرکت نفس، اس کے صفات کے ظہور کے ساتھ ہے۔ اس لئے کہ قلب و نفس کے درمیان ایک تعلق و ربط ہے۔ جیسے کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات شریف اس وقت حرکت میں آئی جبکہ آپ کا دندان مبارک شہید ہوا اور خون بہہ کر چہرۂ انور پر آیا اور اس وقت آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔

كَيْفَ يَصْلَحُ قَوْمٌ خَضَبُوْا وَجْهَ نَبِيِّهِمْ وَهُوَ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ۔ وہ قوم کس طرح اصلاح پائیگی جس کے نبی کے چہرۂ پاک کو لہولہان کیا گیا ہو حالانکہ وہ نبی ان کو اپنے رب کی طرف بلاتا ہے۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے ثبات قلب اطہر کے لئے نازل فرمایا۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اے محبوب کسی معاملہ کی آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں۔

اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر نے صبر کا جامہ پہنا اور اضطراب کے بعد سکون و قرار حاصل ہوا۔ چنانچہ انہیں اسباب و علل کی بنا پر آیات قرآنیہ مختلف اوقات میں نازل ہوتی رہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر کو مہذب و مصفیٰ بناتی

رہیں۔ اور قرآن آپ کا اخلاق بن گیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا فرمانا کہ "کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْآن" قرآن ہی آپ کا اخلاق تھا۔ اس کے یہی معنی و مطلب ہیں۔ حقیقت واقعیہ یہ ہے کہ کسی کا فہم اور کسی کا قیاس حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام حقیقت اور آپ کے حال کی کنہ عظیم تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور بجز خدا کے کوئی نہیں پہچان سکتا۔ جس طرح خدا کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مانند کماحقہ کوئی نہیں پہچان سکتا "لَا یَعْلَمُ تَاوِیْلَہٗ اِلَّا اللہُ" اس کی تاویل کو بجز خدا کے کوئی نہیں جانتا۔

جز خدا نشناخت کس قدر تو زانکہ کس خدارا ہمچو تو نشناختہ

خدا کے سوا آپ کی قدر و منزلت کوئی نہیں جان سکتا اس لئے کہ جس طرح آپ کی مانند خدا کو کوئی نہیں جان سکتا۔ جب کہ آپ کا مقام سب سے بلند تر ہے تو اس کی دریافت بھی لوگوں کے فہموں سے اونچی ہے۔

تراچنانکہ توئی ہر نظر کجا بیند بقدر دانش خود ہر کسے کند ادراک

آپ کو جیسے کچھ کہ آپ ہیں کوئی نظر کہاں دیکھ سکتی ہے۔

ہر شخص اپنی فہم ادراک کے مطابق ہی سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

تحقیق معنیٰ میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ حیطۂ ادراک سے ماوراء تھے اگر آپ محسوس ہیں (یعنی ظاہری جسم شریف میں نظر بھی آتے ہیں) تو قوتِ باصرہ کے ادراک کی قوت سے بلند و بالا ہیں۔ جس طرح کوہِ عظیم کہ احساس باصرہ اس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ اور آپ معقول ہیں (یعنی نظر سے نہیں بلکہ عقل و فہم سے تعلق ہے) تو عقل آپ کے ادراک میں احاطہ کرنے سے عاجز ہے۔ جس طرح کہ حق تعالیٰ کی ذات و صفات کا حال ہے۔ (کہ کوئی عقل اس کی کنہ حقیقت کی رسائی نہیں کر سکتی) لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے خلق کریم کو عظیم فرمایا اور جو فضیلت اس نے آپ کو عنایت فرمائی اسے بھی عظیم فرمایا تو اس کے کنہ کے ادراک کرنے میں عقل قاصر ہے۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور اس پر اتفاق ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اخلاق حمیدہ اور صفات حسنہ جبلی، فطری اور پیدائشی ہیں۔ اور ان اخلاق عظیمہ کے حصول میں کسب و ریاضت کا کوئی دخل نہیں ہے اور نہ اس کی احتیاج، خصوصاً سید انبیاء صلوات اللہ تعالیٰ وسلامہ علیہ وعلیہم جو کہ تمام اخلاق عظیمہ اور صفات حمیدہ سے آراستہ و پیراستہ تشریف لائے ہیں۔

بتعلیم و ادب او راچہ حاجت کہ او خود ز آغاز آمد مؤدّب

ان کو تعلیم و ادب کی کیا ضرورت ہے جب کہ وہ خود ہی شروع سے سیکھے ہوئے تشریف لائے۔ اور آپ کے سراپردۂ عزت کے گرد، تغیر و تبدل کی کوئی راہ نہیں ہے۔ بعض احکام و آثار، جبلت بشری کو ظاہر نہیں کرتے۔ مگر وہ بھی گاہ بہ گاہ کبھی کبھی مخصوص مواضع میں تھے کہ جن پر قیاس کو دائر و سائر نہیں بنا سکتے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ رب العزت جل جلالہ ہی جانتا ہے کہ ان مواضع میں بھی کس عالم شہود اور تجلیات ربانی میں تھے۔ ع

اوبر تراز آنست کہ آید بخیال یعنی آپ اس سے برتر ہیں کہ کوئی خیال میں لاسکے۔

اسی سلسلہ میں غزوۂ احد کا قصہ مذکور ہے کہ جب آپ کے دندان مبارک شہید ہوئے اور آپ کا سر مبارک مجروح ہو کر آپ کے چہرۂ انور پر خون جاری ہوا تو صحابہ کرام کو آپ کی یہ حالت سخت دشوار اور ناگوار معلوم ہوئی۔ وہ عرض کرنے لگے کہ کاش آپ ان پر بد دعا فرماتے تا کہ وہ اپنے کرتوت کی سزا کو پہنچتے۔ اس پر آپ نے فرمایا مجھے لعنت و بد دعا کرنے کے لئے نہیں بھیجا گیا۔ بلکہ مخلوق خدا کو خدا سے ملانے اور ان پر رحمت و شفقت کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اور یہ دعا فرمائی۔

اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ اے خدا میری قوم کو ہدایت فرما کیونکہ وہ جانتے نہیں۔

اس جگہ خود کمالِ صبر و حلم اور بردباری ہے اس جگہ جزع و فزع اور اضطراب و وحشت کہاں ہے لہٰذا شیخ صاحب عوارف المعارف کا یہ کہنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات شریف حرکت و اضطراب میں آئی اور بے صبری کا ظہور ہوا پھر آیت کریمہ کے نزول نے صبر و استقامت کا جامہ پہنایا۔ اور اضطراب کے بعد زبان حال و قال میں سکون و قرار آیا۔ " یہ مسکین (شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ) ان لفظوں کے اطلاق سے وحشت زدہ ہے (کیونکہ شان ادب کے خلاف ہے) اگرچہ علمی قاعدے اور قیاسی بنیاد سے یہ بات ٹھیک و درست ہو سکتی ہے۔ نیز صاحب عوارف رحمہ اللہ کا فرمانا کہ بعید نہیں ہے کہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے " کان خلقہ القرآن " اس میں اخلاقِ ربانی کی جانب ایک گہرا رمز اور باریک اشارہ ہے۔ لیکن ام المومنین نے عظمت برقرار رکھی یعنی وہ چاہتی تھیں کہ یہ کہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عظیمہ، اخلاقِ الٰہی کے مظہر تھے مگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت حق عز اسمہ کی جلالت شان کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے فرمایا کہ " متخلق باخلاق اللہ " یعنی اخلاق ربانی پر پیدا فرمائے گئے۔ لہٰذا انھوں نے اسی معنی کو اس طرح پر ادا فرمایا کہ " کان خلقہ القرآن " یعنی قرآن آپ کا خلق تھا۔ یہ تعبیر حق تعالیٰ جلّ اسمہ سے حیاء اور حقیقت حال کو لطیف کنایہ سے مخفی کر کے بیان فرمایا۔ یہ ان کا وفور عقل اور کمال ادب ہے۔ رضی اللہ عنہا۔ یہ معنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی عظمت اور اس کے لامتناہی ہونے کے بیان میں بہت زیادہ داخل ہیں۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ جس طرح قرآن کے معنی غیر متناہی ہیں اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار و آثار اور اخلاق و اوصاف جمیلہ غیر متناہی ہیں۔ اور آپ کے مکارم اخلاق اور محاسن جمیلہ ہر آن اور ہر حال میں تازہ بہ تازہ نو بہ نو ہوتے ہیں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ آپ پر علوم و معارف کا افاضہ فرماتا ہے اسے بجز خدا کے کوئی نہیں جان سکتا۔ لہٰذا آپ کے اوصاف کے جزئیات کے احاطہ کی طرف درپے ہونا ایسا ہی ہے جیسے کسی ایسی چیز کی طرف جو انسان کے مقدور میں نہ ہو اور نہ وہ ممکنات عادیہ میں سے ہو درپے ہو۔ واللہ اعلم۔

بعض عرفاء سے حدیث پاک " اِنَّهٗ لَیُغَانُ عَلٰی قَلْبِیْ " بیشک میرے دل پر بعض اوقات حجاب غینی آ جاتا ہے۔ کے بارے میں استفسار کیا گیا کہ اس حجاب غینی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حالت کی نسبت کی حقیقت کیا ہے۔ تو اس عارف نے فرمایا اے سائل اگر تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر اور اس کے حجاب غینی کے علاوہ کسی دوسرے کے بارے میں دریافت کرتا تو جو کچھ میں جانتا ہوں اسے بیان کر دیتا۔ لیکن اس جگہ غین ایسے عین یعنی ذات کے ساتھ ہے جہاں غین دم نہیں مار سکتا۔ اس حدیث کی شرح رسالہ " مرج البحرین " میں مفصل موجود ہے۔ ہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بحار قدرت کے تلاطم امواج سے تقلبات اور تجلیات وارد ہوتے تھے جو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف لے جاتے تھے۔ نیز احکام میں ناسخ و منسوخ ہونا بھی اسی کی فرع ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر حال میں ہمیشہ ترقی و کمال میں تھے۔ اور آپ میں کسی عظیم حال سے کمی و تنزل کی راہ نہ تھی۔ لیکن بعض احوال، فاضل تر اور عالی تر ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ تمام انبیاء کامل و معصوم ہیں مگر باوجود اس کے " فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ " ان میں سے کسی کو کسی پر فضیلت بخشی گئی۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و طاعات اور عبادات نہ سب مجرد تعلیم و محض تشریع کے لئے تھے بغیر اس کے کہ آپ کی ذات شریف میں ان کے آثار و انوار رونما ہوں۔ (یہ صورت نہیں ہے) ہاں نبوت اور اس کے مقامات محض موہبی اور اصطفاء و اجتباء تھے۔ اور اس میں کسی کسب و ریاضت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ دن و رات اسرار و انوار کا ظہور، متواتر اور مسلسل اوراد و اذکار پر مترتب ہے۔ اور تمام کمالات کے حصول کی کفالت، اور تمام انوار کے ظہور کی ضمانت، نزول قرآن، تعلیم ربانی، تادیب رحمانی اور الٰہی اوامر و نواہی تھے۔ اور ذات کی خاصیت اور بشری طبیعت کا اثبات جو حسن

بصری سے تعلق رکھتا ہے یقیناً انحطاط و نقصان کا اثبات ہے جو اچھا نہیں ہے۔ (مطلب یہ کہ آپ چونکہ لباس بشری میں بحکمت الٰہی تشریف لائے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا۔ اب اس بشری لباس کے اقتضاء پر عوارض بشریہ کے اثبات کے درپے ہونا اور بشری مقتضیات کو موضوعِ بحث بنانا یقیناً آپ کی شان ارفع و اعلیٰ میں کمی اور اس کے گھٹانے کے درپے ہونا ہے جو کہ ایک مومن و مسلم کی شان سے بعید ہے۔ مترجم)

اور اگر تہذیب سے مراد، یک گونہ آگاہ و خبردار کرنا ہو۔ کسی سستی کے عارض ہونے کے سبب بایں طور کہ مقام عالی میں استغراقی کیفیت ہے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا استغفار کرنا یا نسیان کا طاری ہونا وغیرہ۔ علماء فرماتے ہیں اگر ان کی یہ مراد ہے تو کوئی صورت بیان کے جواز کی بن سکتی ہے ورنہ ایسی استغراقی کیفیتوں کا تذکرہ کرنا اور تہذیب و اصلاح کے اطلاق پر جو مبنی سابقہ آلائش سے ہے بیان کرنا یقیناً مرتبہ ارفع کو گھٹانے اور فساد کرنے کا موجب ہے جو مناسب نہیں ہے۔

قاموس میں ہے کہ تہذیب ہذبہ سے ہے جس کے معنی لطافت، صفائی، درستگی اور اصلاح کے ہیں۔ اور صراح میں ہے تہذیب کے معنی آدمی کو پاکیزہ کرنا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے رجل مہذب یعنی آدمی مطہرّ الاخلاق ہے۔ خلاصہ بحث یہ ہے کہ مرتبہ کمال کے اعلیٰ و اکمل پر محمول کرنا اور حقیقت حال کے ادراک سے عاجز ہونے کا اعتراف کرنا آپ کے ادب و جلالت شان کے زیادہ قریب ہے۔ واللہ الموفق۔

بیان رسالت عامہ:۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمہ چونکہ اعظم الاخلاق تھے۔ بنابریں اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام بنی نوع انسان کی طرف مبعوث فرمایا اور آپ کی رسالت کو محض انسان پر محدود و مقصود نہ گردانا بلکہ سارے عالم کے جن و انس اور سارے جہان کی مخلوق پر رسالت عام فرمائی۔ جس طرح حق تعالیٰ کی ربوبیت تمام اہل عالم کو شامل ہے۔ خلق محمدی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان سب کو شامل ہے صاحب مواہب لدنیہ نے بعض علماء عظام سے یہ سب نقل فرمایا ہے اور کہا ہے کہ یہ بعثت اس حد تک پھیلتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ملائکہ کی طرف بھی ہے۔ جیسا کہ ایک جماعت اس طرف گئی ہے۔ اور ان کی دلیل قرآن کریم سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے "لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا" تاکہ آپ سارے جہان کے لئے نذیر یعنی ڈرانے والے ہوں، لفظ عالمین تمام اہل عقل کو شامل ہے اور سنتِ حدیث سے ثابت و مسلم ہے جسے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اُرْسِلْتُ اِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً" مجھے ساری مخلوق کی طرف رسول بنایا گیا۔ بعض نے کہا کہ آپ کی رسالت بعض ملائکہ پر ہے گویا ان کی مراد بعض ملائکہ سے زمین کے فرشتے ہیں۔ تخصیص کی وجہ ظاہر نہیں ہے کیونکہ دلیل عام ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ "وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ" (ہم نے آپکو نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کی طرف) یہ بھی تخصیص پر دلالت نہیں کرتی۔ جیسا کہ مذہب مختار آیہ کریمہ کے مفہوم عمومی پر ہے۔ ورنہ جنوں کی طرف بھی مبعوث نہ ہونا لازم آتا ہے۔ یہ بات اجماع کے خلاف ہے۔ بلکہ آیہ کریمہ میں "الناس" کا ذکر اس وجہ سے ہے کہ بعض ناس کی طرف تخصیص رسالت کے قول کی تردید و نفی مقصود ہے۔ جس طرح کہ یہود گمان رکھتے تھے کہ آپ کی رسالت اہل عرب کے ساتھ خاص ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ۔ اے لوگو! میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف۔ واللہ اعلم

(حضرت شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ ثبتہ اللہ علی طریق الحق والیقین فرماتے ہیں) کہ بعض محققین اہل بصیرت فرماتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام اجزائے عالم کے ساتھ ہے۔ جس میں حیوانات، نباتات اور جمادات بھی شامل ہیں۔ لیکن اہل عقل کی طرف بھیجنا تعلیم و تکلیف اور انہیں بشارت دینے اور غضب الٰہی سے ڈرانے کے لئے ہے۔ اور غیر ذوی

العقول کی طرف بربنائے افاضہ اور اس کمال پر پہنچانا جو ان کے حال کے لائق ہے۔ اور تمام ذوی العقول کی طرف رسالت کی عمومیت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے کہ فرمایا

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۞ اورہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر سارے جہان کے لئے رحمت۔

یہ بر طریق تغلیب شامل ہے اور جمادات کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرنا اور ان کا کہنا کہ "السلام علیک یا رسول اللہ" آپ کی رسالت پر ان کا اقرار ہے۔ ابیات

شکر فیضِ تو چمن چوں کندا ے ابرِ بہار — کہ خار و گل ہمہ پروردۂ تست

اے غنچہ عروسِ باغ در پردہ تست — آخر اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

اگر کوئی کہے کہ رسالت کو تو امرونہی کی دعوت اور تبشیروانذار لازم ہے۔ اس کا وقوع ملائکہ سے کہاں ہے۔ مواہب لدنیہ میں اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے یہ دعوت شب اسریٰ (معراج کی رات) میں ہوئی ہو۔ یہ بات مخفی نہ رہنی چاہئے کہ شب اسریٰ کے ساتھ تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ تمام اوقات میں احتمال رکھتا ہے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اکثر اوقات میں ملائکہ کا نزول ہوتا رہا ہے۔ نیز جس طرح جنات کو دعوت دی۔ اور قرآن کریم میں جنات کا خاص طور پر ذکر کرنا ان کی تمرد و سرکشی کی بنا پر ہے۔ (واللہ اعلم) اور ملائکہ میں نہی وانذار کی حاجت ہی نہ تھی کیونکہ ان سے معصیت کا ارتکاب ہوتا ہی نہیں۔ جیسا کہ فرمایا۔

لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۞ وہ کسی بات میں پہل نہیں کرتے وہ خدا کے امرو حکم ہی کو جانتے ہیں۔

اسی بنا پر عالم ملکوت کو عالم امر کہا جاتا ہے کہ وہاں نہی و ممانعت کی گنجائش ہی نہیں۔ اور حضرت جبریل علیہ السلام کے سوا دیگر ملائکہ کا حاضر ہونا کتب احادیث میں اوقات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں مذکور ہے۔ چنانچہ مروی ہے کہ جبریل آئے اور ان کے ساتھ اسمٰعیل نامی فرشتہ تھا جو ایک لاکھ ایسے فرشتوں کا سردار ہے جن میں سے ہر فرشتہ ایک ایک لاکھ فرشتوں پر حاکم ہے۔ اور فضائل قرآن کے باب میں اور سورۃ فاتحہ کی فضیلت میں اور سورۃ بقر کی آخری آیتوں کی فضیلت میں مروی ہے کہ ایک فرشتہ حاضر ہوا جس کے بارے میں حضرت جبرئیل نے عرض کیا یہ وہ فرشتہ ہے، جو زمین پر آج کے دن کے سوا کبھی نہیں آیا۔ سبحان اللہ۔ اور حدیثوں میں آیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ انور پر تعظیم بجالانے کے لئے صبح و شام ستر ہزار فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔ للہذا زمانہ حیات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کیوں نہیں آتے ہوں گے۔

علم و عقل مبارک ۔ وصل: دربیان عقل کامل و علم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم۔ مذکورہ دلائل سے تحقیق کے ساتھ جان لیا ہوگا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حمیدہ اعظم واتم اور کامل تر اخلاق ہیں۔ اور ان اخلاق کی اصل و منبع اور جائے نشو عقل ہے۔ کیونکہ عقل ہی سے علم و معرفت کے سوتے پھوٹتے ہیں اور اسی سے رائے کی قوت، تدبیریں جودت، فکر و نظر میں اصابت، انجام کار پر صحیح نتیجہ کی برآمد، مصالح نفس، مجاہدۂ شہوت، حسن سیاست و تدبیر، خوبیوں کی اشاعت، اور رذائل سے اجتناب جیسی صفات متفرع ہوتی ہیں۔

عقل کی حقیقت میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ قاموس میں کہا گیا ہے کہ عقل، چیزوں کے حسن وقبح اور اس کے کمال ونقصان کی صفات کے علم کا نام ہے اور یہ علم، عقل کے نتائج وثمرات سے حاصل ہوتا ہے اور عقل ایسی قوت ہے جو اس علم کا مبدء اور سرچشمہ ہے۔ اور بیان کیا کہ کہا جاتا ہے کہ انسان کی حرکات وسکنات میں ہیئت محمودہ کا نام عقل ہے۔ حالانکہ یہ بھی عقل کے خواص و آثار کے قبیل سے ہے۔

قولِ حق جسے علماء نے بیان کیا یہ ہے کہ عقل ایک روحانی نور ہے۔ جس سے علوم ضروریہ اور نظریہ معلوم ہوتے ہیں اور عقل کا آغاز وجود بچے کی پیدائش کے ساتھ ہے۔ پھر وہ رفتہ رفتہ نشوونما پاتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بلوغ کے وقت کامل ہو جاتا ہے۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کمال عقل و علم میں اس مرتبہ پر تھے کہ کوئی بشر آپ کے سوا اس درجہ تک نہیں پہنچا۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آپ پر افاضہ فرمایا ان میں سے بعض پر عقول و افکار حیران ہیں اور جو بھی آپ کے احوال کی کیفیتوں اور آپ کی صفات حمیدہ اور محاسن افعال کی تلاش و جستجو کرتا ہے اور جوامع الکلم، حسن شمائل، نادر و لطیف خصائل، لوگوں کی سیاسی تدبیر، شرعی احکام کا اظہار و بیان، آداب جلیلہ کی تفاصیل، اخلاق حسنہ کی ترغیب و تحریص، آسمانی کتابوں اور ربانی صحیفوں پر آپ کا علم، گزشتہ امتوں کے تاریخی حالات، ایام ماضیہ کے احوال کہاوتوں اور ان کے وقائع و احوال کا بیان، اہل عرب جو مانند درندوں اور چوپائے کے تھے جن کی طبائع جہل و جفا اور نادانی و شقاوت کی بنا پر متنفر اور دور رہنے والی تھیں۔ ان کی اصلاح و تدبیر ان کے ظلم و جفا اور ایذا و تکلیفوں پر آپ کا صبر و تحمل، پھر ان کو علم و عمل، حسن اخلاق و اعمال میں غایت درجہ تک پہنچانا، انہیں دنیا و آخرت کی سعادتوں سے بہرہ ور کرنا۔ پھر کس طرح ان سعادتوں کو اپنے نفسوں پر ان کا اختیار کرنا۔ اور اپنے گھروں، دوستوں، عزیزوں کو آپ کی خوشنودی کی خاطر ان کا چھوڑنا۔ ان سب کا اگر کوئی مطالعہ کرے تو وہ جان لے گا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل کامل اور آپ کا علم کس مرتبہ و مقام پر تھا۔

نگار من کہ بمکتب نرفت و خط ننوشت بغمزہ مسئلہ آموز صدر مدرس شد

جو بھی آپ کے احوال شریف کو ابتداء سے انتہا تک مطالعہ کرے گا دیکھے گا کہ پروردگار عالم نے آپ کو کتنا علم عطا فرمایا۔ اور آپ پر اس کا کتنا فیضان ہے۔ اور ما کان و ما یکون یعنی گزشتہ و آئندہ کے علوم و اسرار بدیہی طور پر کس طرح حاصل ہیں تو وہ بے شک و شبہہ اور بغیر وہم و خیال "علم نبوت کو جان لے گا۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ثنا اور وفور علم کے بارے میں ارشاد فرمایا۔

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا۝ اور جو کچھ آپ نہ جانتے تھے وہ سب اللہ نے سکھا دیا۔ اور اللہ کا فضل آپ پر عظیم ہے۔ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ حَسْبَ وَصْلِهٖ وَكَمَالِهٖ

حضرت وہب ابن منبہ تابعی، جو ثقہ فی الاسناد، علامۂ صدوق، صاحب کتب و اخبار تھے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے متقدمین کی اکہتر کتابیں پڑھی ہیں میں نے ان تمام کتابوں میں پایا کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے آغاز دنیا سے انجام دنیا تک تمام لوگوں کو جس قدر عقلیں مرحمت فرمائی ہیں ان سب کی عقلیں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عقل مبارک کے پہلو میں، دنیا بھر کے ریگستانوں کے مقابلہ میں ذرہ کی مانند ہیں۔ آپ کی رائے ان سب سے افضل و اعلیٰ ہے۔ اسے ابو نعیم نے حلیہ میں اور ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں روایت کیا۔

عوارف المعارف میں بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ پوری عقل کے سو حصے ہیں ان میں سے ننانوے حصے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں ہیں اور ایک حصہ تمام مسلمانوں میں۔ بندۂ مسکین کہتا ہے (یعنی شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ورزقنا اللہ الثبات والیقین فرماتے ہیں) کہ اگر وہ یوں کہیں کہ عقل کے ہزار حصے ہیں جن میں سے نو سو ننانوے حصے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ہیں اور ایک حصہ تمام لوگوں میں تو اس کی بھی گنجائش ہے۔ اس لئے کہ جب آپ میں بے نہایت کمال ثابت ہے تو جو کچھ بھی کہا جائے گا بجا ہو گا۔

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝ بیشک ہم نے آپ کو خیر کثیر مرحمت فرمائی اور آپ کے بدگو ہی ذلیل و خوار ہیں۔

اب بعض اخلاقِ کریمہ میں سے جو دیکھنے میں آتے ہیں اس کتاب میں لکھتا ہوں اور اکثر بیان، کتاب الشفاء مواہب لدنیہ، روضۃ الاحباب اور معارج النبوۃ سے ہے۔ والتوفیق من اللہ المنعم۔

صبر، حلم اور عفو۔ ــــ وصل:۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صبر، بردباری اور درگزر کرنے کے صفات میں ہیں۔ یہ نبوت کی عظیم صفتوں میں سے ہیں۔ اور ان صفتوں کی قوت کے بغیر بارِ نبوت نہیں اٹھایا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلٰى مَا كُذِّبُوا وَاُوْذُوا — بیشک آپ سے پہلے تمام رسول جھٹلائے گئے تو انہوں نے ان کے کذب وایذا پر صبر فرمایا۔

نیز ارشاد باری ہے۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ — تو آپ بھی اولوالعزم رسولوں کی مانند صبر فرمایئے۔

اور ارشاد ربانی ہے۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ — تو آپ انہیں معاف فرمائیں اور درگزر فرمائیں۔

صبر کی خوبی تمام طاعات وعبادات کی جائے صدور، اور تمام خیرات وحسنات کا منبع ہے۔ کیونکہ ہر نیکی میں جب تک اس کے غیر و ضد پر صبر نہ کرے اس وقت تک وجود میں نہیں آتی۔ اسی بنا پر صبر کو پورا ایمان کہا گیا ہے اور جس جگہ صبر کو نصف ایمان کہا گیا ہے وہاں صبر سے معاصی کو چھوڑنا اور اس سے اجتناب کرنا مراد ہے۔ کیونکہ اقتضائے ایمان کا نصف حصہ معاصی سے اجتناب اور دوسرا نصف حصہ طاعات بجالانا ہے۔ اور اس جگہ صبر سے مراد لوگوں کے ایذا پر صبر اور ان کے ظلم وجفا کو برداشت کرنا ہے۔ اور سید الانبیاء صلوات اللہ تعالیٰ وسلامہ علیہ کا بلاؤ ایذا پر صبر فرمانا ان سب سے بڑھ کر زیادہ اور سخت تر تھا چنانچہ فرمایا۔

مَا اُوْذِيَ نَبِيٌّ مِّثْلَ مَا اُوْذِيْتُ اوکما قال — کسی نبی کو اتنی ایذا نہ پہنچائی گئی جتنی مجھے دی گئی۔

یہ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم امت کے اسلام لانے پر سب سے بڑھ کر خواہش مند تھے۔ اسی بناء پر ان کی ایذا رسانی ان کے کفر سے زیادہ تر تھی۔

مروی ہے کہ جب آیت کریمہ معاف کرنے، امر بالمعروف اور جاہلوں سے درگزر کرنے کے بارے میں نازل ہوئی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے اس کی توضیح دریافت کی۔ انہوں نے کہا جب تک میں رب العزت عز اسمہ سے دریافت نہ کرلوں عرض نہیں کرسکتا۔ چنانچہ جبریل گئے اور آئے اور کہا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے جو آپ سے دور ہو اس سے قریب ہوں۔ اور جو آپ کو محروم رکھے اسے عنایت فرمائیں۔ اور جو آپ پر ظلم وستم کرے اسے معاف فرمائیں۔

حدیث پاک میں ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی اپنے ذاتی معاملہ اور مال ودولت کے سلسلے میں کسی سے انتقام نہ لیا مگر اس شخص سے جس نے خدا کی حلال کردہ چیز کو حرام قرار دیا تو اس سے خدا کے لئے بدلہ لیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے زیادہ اشد وسخت صبر غزوۂ احد میں تھا کہ کفار نے آپ کے ساتھ جنگ ومقابلہ کیا۔ اور آپ کو شدید ترین رنج والم پہنچایا۔ مگر آپ نے ان پر نہ صرف صبر وعفو پر ہی اکتفا فرمایا بلکہ ان پر شفقت ورحم فرماتے ہوئے ان کو اس جہل وظلم میں معذور گردانا اور فرمایا "اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ" (یعنی اے خدا میری قوم کو راہ راست پر لا کیونکہ وہ جانتے نہیں) اور ایک روایت میں ہے۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُمْ (اے خدا انہیں معاف فرمادے)۔ اور جب صحابہ کو بہت شاق گذرا تو کہنے لگے یا رسول اللہ! کاش ان پر بددعا فرماتے کہ وہ ہلاک ہوجاتے۔ آپ نے فرمایا میں لعنت کے لئے مبعوث نہیں ہوا ہوں بلکہ میں حق کی دعوت اور جہان کے لئے رحمت ہو کر

مبعوث ہوا ہوں۔

فائدہ:۔ تعجب ہے کہ جس کسی نے یہ کہا کہ نفس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اس جگہ حرکت میں آئی اور بے صبری کا اظہار فرمایا اور فرمانے لگے "کَیْفَ یُفْلِحُ قَوْمٌ (الحدیث)" (وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جو اپنے نبی کو مجروح کرے) (آخر حدیث تک) اس پر آیہ کریمہ "لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ" (آپ پر کسی معاملہ کی کوئی ذمہ داری نہیں) نازل ہوئی۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "کَیْفَ یُفْلِحُ" اور حق تعالیٰ کے فرمان "لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ" میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو صبر و حلم کے خلاف اور اس کے منافی ہو۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں اظہارِ تعجب ہے جو کچھ انہوں نے سلوک کیا۔ اور حق تعالیٰ کے ارشاد میں آپ کے لئے تسلی و تشفی ہے۔ یہ بات آپ کی ذات شریف کے حق میں خاص تھی کہ آپ نے صبر و عفو سے کام لیا۔ لیکن کفار نے جب روز احزاب نماز سے باز رکھا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر دنیا و آخرت کے عذاب کی دعا کی اور فرمایا "مَلَأَ اللّٰہُ بُیُوْتَھُمْ وَقُبُوْرَھُمْ نَارًا" اللہ تعالیٰ ان کافروں کے گھروں کو اور ان کی قبروں کو آگ سے بھر دے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے ان قبائل پر بد دعا کی جو کمزور اور ناتواں مسلمانوں کو قسم قسم کے عذاب دیتے تھے۔ اور متفق علیہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد "لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ" (آپ کے اوپر کسی معاملہ کی ذمہ داری نہیں ہے) اسی موقع پر نازل فرمائی۔ اسی طرح ان کفار پر بد دعا کی جو فرار ہو گئے تھے۔ کفار پر یہ بد دعائیں، دین اسلام کے حق اور مسلمانوں کے حقوق کے فوت ہونے کی وجہ سے تھیں اور اس امر الٰہی کی بجا آوری میں تھی کہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

یٰۤاَیُّھَا النَّبِیُّ جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْھِمْ۔ اے نبی کفار و منافقین پر جہاد کیجئے اور ان پر خوب شدت کیجئے۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اشقیاء کے گروہ پر بد دعا کی جنہوں نے نماز کی حالت میں آپ کی پشت مبارک پر اونٹ کی اوجھ رکھی تھی۔

احبار یعنی علمائے یہود میں سے ایک شخص ابن سعنہ تھا اس سے روایت کرتے ہیں اس نے بتایا کتب سابقہ میں سے علامات نبوت میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہی مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور میں جب کہ میں نے آپ کی طرف نظر ڈالی نہ دیکھ لی ہو۔ لیکن دو باتوں کا میں امتحان نہ کر سکا تھا ایک یہ کہ توریت میں لکھا ہوا تھا اس کا حلم اس کے جہل کو زیادہ نہیں کرے گا اور شدت جہل اس کے حلم ہی کو بڑھائے گی۔ چنانچہ میں نے آپ سے تلطف کیا۔ یہاں تک کہ میں نے معاملہ میں خلط ملط کیا۔ اس طرح میں نے آپ کے علم و حلم کو پہچانا۔ چنانچہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ میں نے ایک معینہ مدت کے لئے آپ سے کھجوریں خریدیں اور اس کی قیمت مال کے قبضے سے پہلے آپ کو دے دی۔ پھر میں وقت مقررہ سے دو تین دن پہلے آیا اور آپ کے گریبان اور چادر کو پکڑ کے غیظ و غصہ کی نظر سے آپ کو دیکھا اور میں نے کہا "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرا حق کیوں ادا نہیں کرتے۔ خدا کی قسم تم آلِ عبدالمطلب حق کی ادائیگی میں تاخیر کرتے اور ٹال مٹول کرتے ہو۔" اس پر حضرت عمر رضی اللہ کہنے لگے۔ "او دشمن خدا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی بات کہتا ہے۔ تیری بد تمیزی کی جو باتیں میں نے سنی ہیں اگر مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کا خوف دامن گیر نہ ہوتا تو اپنی تلوار سے تیری گردن اتار دیتا۔" اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف آرام و آہستگی کے ساتھ نظر فرمائی اور تبسم کناں ہو کر فرمایا "اے عمر! میں اور یہ شخص تمہاری زبان سے ایسی بات کے برعکس بات سننے کے متمنی تھے۔ مطلب یہ کہ مجھ سے تو حق کی عمدہ طریق سے ادائیگی کو کہتے اور اس مرد سے حسنِ تقاضا کی تلقین کرتے۔" اب اے عمر! جاؤ اس

کا حق ادا کرو۔ اور جو کچھ تم نے اسے ڈرایا دھمکایا ہے اس کے بدلے میں اسے بیس صاع کھجوریں مزید دو۔ " چنانچہ حضرت عمر نے فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق عمل کیا۔ پھر اس یہودی نے کہا " اے عمر! میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ انور میں نبوت کی تمام علامتوں کو پہچانتا تھا مگر ان دو خصلتوں کو نہیں جانتا تھا جس کا میں نے ابھی امتحان کیا۔ اب تم کو گواہ بنا کر کہتا ہوں اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ ایک دن رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنی مجلس مبارک سے اٹھے اور ہم بھی اٹھ کھڑے ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قریب ایک اعرابی آیا۔ اس نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی گردن مبارک سے چادر کو اس سختی سے کھینچا کہ چادر کی درشتی سے آپ کی گردن مبارک چھل گئی۔ پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس اعرابی کی طرف نظر اٹھائی کہ وہ کیا کہتا ہے اس نے کہا میرے پاس یہ جو دو اونٹ ہیں اس پر مال لاد دو۔ کیونکہ میں بال بچے رکھتا ہوں اور آپ نہ اپنا مال لادیں گے نہ اپنے باپ کا۔ " اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " میں ہرگز اس وقت تک مال نہیں دوں گا جب تک مجھے اس چادر کی گرفت سے نہ چھوڑے گا جسے تو نے کھینچ رکھا ہے۔ " اعرابی نے کہا " خدا کی قسم میں ہرگز چادر کو نہ ڈھیل دوں گا جب تک آپ میرے ان دونوں اونٹوں کو نہ لدوا دیں۔ " پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص کو بلا کر فرمایا " اس کے ایک اونٹ پر کھجوریں اور دوسرے پر جو لاد دو " اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ امام بخاری نے اس حدیث کو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اس طرح روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن مبارک میں نجرانی سخت حاشیہ دار چادر تھی ایک اعرابی نے قریب آکر چادر کو پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کھینچا اور چادر کو سخت لپیٹنے لگا۔ حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن مبارک کی طرف دیکھا۔ تو سخت حاشیہ دار چادر کی لپیٹ نے آپ کی گردن مبارک کو چھیل دیا تھا۔ اس کے بعد اعرابی کہنے لگا۔ " اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کے اس مال میں سے جو آپ کے پاس ہے مجھے دینے کا حکم فرما دیں۔ " پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف ملاحظہ فرمایا اور تبسم فرمایا اور مجھے اسے دینے کا حکم فرمایا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلم و بردباری کا یہ بیان ہے کہ کس طرح آپ اپنی جان و مال کی ایذاؤں پر صبر فرماتے اور ظلم و جفا سے درگذر کرتے تھے۔ یہ سب اس خواہش میں تالیفِ قلوب تھی کہ یہ لوگ اسلام لے آئیں اور آپ کے اوصاف حمیدہ میں مذکور ہے کہ آپ نہ خود سخت کلامی فرماتے تھے اور نہ کسی کی سخت کلامی کا بدلہ لیتے تھے۔ بلکہ عفو و درگذر سے کام لیتے تھے۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ آپ نہ گالی دینے والے تھے نہ فحش کلامی اور لعنت کرنے والے تھے۔ فحش میں قول و فعل اور خصلت سب شامل ہیں لیکن اس کا استعمال اکثر قول و کلام پر ہوتا ہے۔ اور یہ صفت بیان کرنا کہ آپ کا قول نہ فاحش ہوتا نہ متفحش۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ آپ کی عادت ایسی تھی اور نہ آپ قصد و ارادہ سے سخت کلامی فرماتے۔ " متفحش " اسے کہتے ہیں جو قصد و ارادہ اور کثرت و تکلف سے سخت کلامی کرے۔ اور " فاحش " اس سے زیادہ عام ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ یہ حدیث پایہ صحت کو پہنچی ہوئی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ بن معیط اور عبداللہ بن خطل اور ان کے سوا وہ لوگ جو ایذائیں پہنچاتے تھے آپ نے ان کو قتل کرنے کا حکم فرمایا تو یہ کہنا کہ " مَا انْتَقَمَ لِنَفْسِهٖ " (اپنی ذات کے لئے کبھی بدلہ نہیں لیا، کیسے صحیح ہو گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لوگ " اِنْتِهَاکِ حُرُمَاتِ اللّٰهِ " اللہ تعالیٰ کی حرمتوں کو بھی پائمال کرتے تھے۔ " اور بعض یہ بھی کہتے ہیں ایذا رسانی کا بدلہ نہ لینے سے مراد یہ ہے کہ ایسا سبب ہو جو حد کفر کو نہ پہنچے اس میں بدلہ نہ لیتے تھے۔

مثلاً یہی مذکورہ واقعہ جس نے آپ کی چادر مبارک کھینچی اور اس کی مثل دیگر واقعات اور داؤدی نے عدم انتقام کو ان چیزوں پر محمول کیا ہے جو مال کے ساتھ خاص ہے۔ اور عزت وناموس کے قبیل سے نہ ہو۔ اور آپ کے عفوودرگذر کی مثالوں میں یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے لبید بن الاعصم یہودی کو جس نے جادو کیا تھا اور خیبر کی اس یہودیہ کو جس نے زہر آلود بکری کی ران دی تھی۔ معاف فرمایا۔ اسی طرح آپ قیلولہ فرمارہے تھے۔ حضور ﷺ نے چشم مبارک کھولی تو دیکھا کہ ایک اعرابی تلوار کھینچے آپ کے سرہانے کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے اب آپ کو کون بچائے گا۔ اور مجھ سے آپ کو کون محفوظ رکھے گا آپ نے فرمایا "اللہ" اس کے بعد اس کے ہاتھ سے تلوار گر پڑی اور حضور ﷺ نے تلوار اٹھالی اور فرمایا اب بتا تجھے اب کون بچائے گا۔ پھر وہ کانپنے اور لرزنے لگا۔ پھر حضور ﷺ نے اسے چھوڑ دیا اور معاف کر دیا۔ اس کے بعد وہ اپنی قوم میں آیا اور کہنے لگا کہ میں تمہارے پاس سب سے زیادہ بہتر شخص کے پاس سے آیا ہوں۔ اسی طرح آپ ﷺ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا۔ صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ یہ شخص ارادہ رکھتا ہے کہ آپ کو قتل کردے۔ آپ نے اس سے فرمایا نہ ڈر۔ اگر تو میرے قتل کا ارادہ رکھتا ہے تو مجھ پر قابو نہیں پاسکتا۔ یہ تمام مثالیں حضور ﷺ کے وسعت اخلاق اور آپ کے حلم پر مبنی ہیں۔

اب رہا وہ معاملہ جو منافقوں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا کہ عنبویت میں وہ آپ کو ایذا پہنچاتے اور جب حاضر ہوتے تو خوشامد و چاپلوسی کرتے۔ منافقوں کی یہ حرکت ایسی ہے جس سے ہر انسان کا دل نفرت کرتا ہے مگر جسے تائید ربانی حاصل ہے۔ اگرچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر شدت و تغلیظ کا ارشاد آچکا تھا۔ چنانچہ فرمایا۔

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۔ اے نبی کفار و منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر شدت برتئے۔

مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے عفو ورحمت اور استغفار کا دروازہ کھلا رکھا اور ان کے لئے دعائیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ اے محبوب آپ ان کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں اللہ ہرگز انہیں نہیں بخشے گا۔

پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے مختار رکھا ہے اب میں استغفار کو اختیار کرتا ہوں۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ

اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً اگر آپ ان کے لئے ستر مرتبہ بھی استغفار کریں تو......

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ستر مرتبہ سے بھی زیادہ ان کی بخشش کی درخواست کروں گا آپ کی یہ عادتِ کریمہ، ان کے جرم وایذا رسانی سے چشم پوشی اور عفوو درگذر کی بے مثل مثال ہے۔ قطع نظر اس کے کہ آیۂ کریمہ کی عبارت سے تکثیر ومبالغہ کا مفہوم بھی نکلتا ہے نہ کہ کسی خاص شمار کی تحدید وتعین۔ لیکن حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیۂ کریمہ کو غایت عفوودرگذر کی بنیاد پر ظاہر الفاظ پر ہی محمول فرمایا۔ یہاں تک کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے لڑکے کو جو کہ مخلص مسلمان تھے اپنے باپ کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم فرمایا۔ اور جب وہ مرگیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا پیرہن مبارک جسم اطہر سے اتار کر اس کا کفن بنایا اور نماز جنازہ پڑھنے کا ارادہ کیا اس وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن اقدس پکڑ کر عرض کیا یارسول اللہ ایسے منافق پر نماز پڑھ رہے ہیں جو تمام منافقوں کا سردار تھا اس پر حضور نے اپنا دامن مبارک چھڑا کر فرمایا اے عمر! تم دور رہو۔ تب یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اے محبوب آپ کسی منافق کی موت پر کبھی نماز نہ پڑھیں۔ اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوں۔

اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارادہ ترک فرمایا۔ یہ آپ کا انتہائی صبر و حلم اور شفقت و مہربانی امت پر تھی لیکن جب بارگاہِ الٰہی سے ہی ممانعت آجائے تو کیا کریں۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ اس کے لڑکے کی دلدہی کے لئے تھا کیونکہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ کے مخلص و صالح صحابی تھے اور انہوں نے درخواست کی تھی جس کی پذیرائی فرمائی۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی منافق کو قمیص مبارک پہنانا اس بنا پر تھا کہ اس نے آپ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو اس وقت قمیص پہنائی تھی جب کہ وہ بدر کے قیدیوں میں برہنہ اسیر ہوئے تھے۔ اور ان کے جسم پر طویل القامت ہونے کی وجہ سے کوئی قمیص نہ آتی تھی۔

غرض کہ اس بیان میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکارم اخلاق کی عظمت کا اظہار ہے باوجودیکہ منافقین ہمیشہ آپ کو برا جانتے اور اذیتیں پہنچاتے تھے۔ مگر اس کے مقابلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ حسن سلوک ہی فرماتے تھے تو اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مخلص مسلمانوں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہوگا؟ اسی مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ۝ بلاشبہ آپ کی خوبو بہت بڑی ہے اور یہ کہ حق تعالیٰ نے فرمایا "ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ کَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ" مطلب یہ کہ ممانعت اس بنا پر ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے باغی و سرکش ہیں۔

حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا امت پر شفقت و مہربانی فرمانے کے قبیل سے یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ امت کے کبیرہ گناہوں کے مرتکبین کے گناہوں اور اذیتوں کی پردہ پوشی کی جائے اور فرمایا جس سے محرمات کے ساتھ مباشرت کا گناہ سرزد ہو جائے اسے چاہئے کہ وہ گناہ کو چھپائے افشا نہ کرے۔ اور امت پر حکم فرمایا جن لوگوں پر حدِ شرعی قائم ہو جائے ان کے لئے خدا سے بخشش کی دعا مانگیں اور ان پر شفقت و مہربانی کریں، اور کسی پر تبرا کرنے گالی دینے اور لعنت کرنے کی ممانعت فرمائی چنانچہ فرمایا۔

لَا تَلْعَنُوْهُ فَاِنَّهٗ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔ کسی مسلمان پر لعنت نہ کرو کیونکہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔

اس میں اشارہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ دلوں کی باطنی حالت پر نظر فرماتا ہے اگرچہ ظاہر میں اس سے کوئی خطا یا ذلیل حرکت سرزد ہوئی ہو۔

صحیح بخاری میں ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ ایک شخص نے حاضر بارگاہ ہونے کی اجازت مانگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضر ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی جب دیکھا تو فرمایا یہ شخص اپنے قبیلہ کا بدتر شخص ہے اور جب وہ بیٹھ گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کشادہ روئی فرمائی اور خوشی و مسرت کا اظہار کیا۔ پھر جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اول نظر مبارک ڈالی تھی تو اس کے بارے میں ایسا ایسا فرمایا تھا اور جب وہ بیٹھ گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کشادہ روئی اور اس کے ساتھ خوشی و مسرت کا اظہار فرمایا۔ یہ کیا بات تھی۔ فرمایا اے عائشہ! تم نے مجھے "فحاش" (سخت کلام) اور درشت خو کب پایا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ خدا کے نزدیک وہ شخص بہت برا ہے جسے لوگ ڈر اور خوف کی بناء پر چھوڑ دیں اور اس کے شر و فساد سے بچتے ہیں۔ یہ عبارت دو معنی کا احتمال رکھتی ہے ایک یہ کہ اس میں اپنی ذات گرامی کی طرف اعتذار کے طور پر اور اس شخص سے تلطف و خوشی کے اظہار کرنے میں اشارہ فرمایا۔ اور سخت کلامی اور درشت خوئی سے منع فرمایا تاکہ لوگ قریب آنے سے نہ گھبرائیں اور دور نہ بھاگیں۔ اور دوسرا احتمال یہ کہ اس شخص کے مآل کی طرف نسبت و

اشارہ فرمایا۔ اور بیان کیا کہ وہ ایسا برا شخص ہے جس کے شر سے لوگ ڈرتے ہیں اور اسکی برائی کو اس کے سامنے نہیں لاسکتے۔ اور اس کے شر کے خوف سے اس کی مدارات کرتے ہیں۔

علماء فرماتے ہیں کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس شخص کے ساتھ حسن سلوک فرمانا تالیفِ قلب کے لئے تھا۔ تاکہ، وہ، اس کی قوم اور اس کا قبیلہ اسلام لے آئے کیونکہ وہ اپنی قوم اور قبیلہ کا سردار تھا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسے برا کہنا غیبت کے باب سے نہیں ہے اس لئے کہ شارع یعنی نبی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی امت کے عیوب اور اسکی برائیوں کو دیکھے اور اس کا اظہار کرے۔ نبی کا ایسا کرنا امت کی نصیحت وشفقت کے زمرہ میں سے ہے بخلاف امت کے کہ وہ ایک دوسرے کی غیبت کرتے اور عیب جوئی کرتے ہیں۔ اور یہ بھی معلن مجاہر یعنی کھلے عام فسق وفجور کرنے والے کا اظہارِ عیب کرنا جائز ہے باوجود ان باتوں کے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی طبعی خُو بُو ہی ایسی بنائی ہے جو کرم وحسنِ خلق پر ہے اور آپ میں تلطف وبشاشت اور خندہ پیشانی ہے، نیز اس میں امت کے لئے تنبیہ ہے کہ جن سرکشوں کی ایسی حالت ہو ان سے بچیں اور ان کے ساتھ تواضع ومدارات سے پیش آئیں تاکہ ان کے شر وفساد سے سلامت رہیں۔ لیکن مداہنت کی حد تک ہر گز نہ پہنچیں اور مدارات ومداہنت میں فرق یہ ہے کہ مدارت وہ ہے جو شر سے بچنے اور اپنی عزت محفوظ رکھنے کے لئے ہے اور مداہنت وہ ہے جو دنیاوی منفعت کے لئے ہے۔ بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ وہ اسی معنی کی طرف راجع ہے۔ مثلاً یہ کہ مدارات یہ ہے کہ دنیاوی اخراجات) دنیا کی اصلاح یا دین کی اصلاح یا دونوں کی اصلاح کے لئے ہے اور یہ مباح ہے۔ اور بسا اوقات یہ مستحسن وممدوح بھی ہوتا ہے۔ اور مداہنت یہ ہے کہ دینی تصرفات کو دنیاوی صلاح وحصول کے لئے استعمال کیا جائے (اللہ تعالیٰ مداہنت سے محفوظ رکھے) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص پر اپنے ان دنیاوی معاملات سے سلوک فرمایا جو اچھے برتاؤ اور نرم گفتاری سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے باوجود اپنی زبان مبارک سے اس کی مدح وتعریف نہ کی تاکہ مناقض یعنی واقعہ حال کے برخلاف نہ ہو۔ لہٰذا آپ کا قول حق کے اظہار میں تھا اور آپ کا فعل اچھے برتاؤ کے زمرہ میں۔ حضرت قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ معلوم نہیں وہ شخص اس وقت مسلمان تھا یا نہیں۔ اگر مسلمان نہ تھا تو آپ کا قول یعنی اسے "برا بتانا" غیبت نہ ہوگا۔ اور اگر وہ مسلمان تھا تو اس کا اسلام خالص اور ناصح نہ تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ اس کا حال بیان کر دیا جائے تاکہ کوئی ناواقف شخص اس سے دھوکا نہ کھائے۔ اور اس شخص کے حالات میں مرقوم ہے کہ اس شخص سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ظاہرہ میں اور بعد وصال ایسی حرکتیں واقع ہوئی ہیں جو اس کے ایمان کی کمزوری پر دلالت کرتی ہیں اس بناء پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا اخبار بالغیب یعنی غیبی خبر دینا اور علاماتِ نبوت میں سے ہوگا۔ لیکن آپ کا اس سے ترقی فرمانا اور انبساط کا اظہار کرنا مذکورہ قباحت کی موجودگی میں بر سبیل تالیفِ قلب تھا۔

تنبیہ:۔ اس شخص کا نام عُیَیْنہ بن حصن بن حذیفہ بن بدر بن فزاری تھا اور اسے لوگ "احمق المطاع" کہتے تھے۔ احمق اس کی حماقت اور تکبر کی بنا پر اور "مطاع" اس لئے کہ وہ قبیلہ کا سردار تھا۔ صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب عُیَیْنہ بن حصن بن حذیفہ اپنے بھتیجے حر بن قیس بن حصین کے پاس آیا یہ حر بن قیس ان لوگوں میں سے تھے جو امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مقرب اور آپس کی مجلس شوریٰ کے اصحاب میں سے تھے عیینہ نے اپنے بھتیجے سے کہا اے بھتیجے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی جناب میں تمہاری قدر ومنزلت ہے۔ تو میرے لئے ان سے اپنی نزدیکی کی درخواست کرو کہ میں بھی ان کے مقربوں میں ہو جاؤں۔ انہوں نے کہا میں درخواست کروں گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حر بن قیس نے عُیَیْنہ کے بارے میں درخواست کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے حاضری کا شرف بخشا اور اجازت مرحمت فرمائی۔ جب عُیَیْنہ

حضرت فاروق اعظم کے پاس گیا تو وہ کہنے لگا کہ اے خطاب کے فرزند! ہمیں بھی کچھ مال و منال دیجئے۔ خدا کی قسم آپ ہمیں بہت نہیں دیتے اور ہمارے درمیان انصاف نہیں فرماتے۔ اس پر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو غصہ آیا۔ یہاں تک کہ ارادہ فرمایا کہ اسے اس کی سزا دی جائے۔ اور تعزیری حد قائم کی جائے تو حر بن قیس نے کہا اے امیر المومنین! اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا۔

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ۝ — در گزر سے کام لیں اور بھلائی کا حکم دیں اور جاہلوں کی طرف التفات نہ فرمائیں۔

اور کہا کہ یہ شخص جاہلوں میں سے ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں خدا کی قسم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آیت سے سر مو تجاوز نہ کیا۔

اور "فتح الباری" میں منقول ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں عُیَیْنَہ مرتد ہو گیا تھا اور اس نے مسلمانوں کے خلاف جنگ بھی کی تھی اس کے بعد وہ دوبارہ اسلام لایا اور ارتداد سے توبہ کی اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں بعض فتوحات میں شریک ہوا اور اس کتاب کے آخر میں غزوات کے باب میں اس کے ایسے کوائف و حالات انشاء اللہ آئیں گے۔ جو اس کی بد خوئی اور شدت جفا پر دلالت کریں گے۔

تواضع، ادب اور حسن معاشرت:۔ وصل:۔ اس سلسلۂ بیان میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اہل و عیال اور خدام اور اصحاب کے ساتھ جو تواضع، ادب اور حسن معاشرت ہے اس کا ذکر ہے۔ صراح میں تواضع کے معنی انکساری دکھانے اور گردن کو جھکانے کے ہیں۔ اور قاموس میں تواضع کے معنی تذلل و اتضاع ہیں۔

اہل عرب اس کو اس وقت استعمال کرتے ہیں جب وہ اونٹ کی گردن کو نیچا کر کے اس پر پاؤں رکھ کر سوار ہوتے ہیں۔ تواضع وضع سے مشتق ہے۔ اور وضع کے معنی نیچے رکھنے کے ہیں۔ اور متواضع شخص چونکہ اپنے آپ کو اپنے مرتبہ اور مقام سے نیچے اتارتا ہے اس کی ضد تکبر ہے کہ متکبر خود کو اپنے مرتبہ سے بلند جانتا ہے اور جو اپنے مرتبہ سے کمتر رہے تو اسے تصنع اور بناوٹ کہتے ہیں۔ تواضع، تکبر اور تصنع کی درمیانی کیفیت کا نام ہے۔ لیکن چونکہ آدمیوں کو تکبر کرنے کی گنجائش ہی نہیں۔ کبھی تصنع کو تواضع کا مقام دیتے ہیں چنانچہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے دریافت کیا کہ تواضع کیا ہے فرمایا "خفض الجناح ولین الجانب" (بازوؤں کا جھکانا اور پہلو پر جھکنا) اور فرمایا "تَخَضُّعُ لِلْحَقِّ وَتَنْقَادُ لَهٗ وَتَقَبَّلُهٗ لِمَنْ قَالَهٗ وَتَسْمَعُ مِنْهُ" (حق کے آگے جھک جائے اور اس کا فرماں بردار بن جائے جو حق کہے اسے قبول کرے اور سنے) اور آپ نے فرمایا "مَنْ رَاٰى لِنَفْسِهٖ قِيْمَةً فَلَيْسَ لَهٗ فِي التَّوَاضُعِ نَصِيْبٌ" (جس نے اپنے آپ کو قیمتی جانا اس کے لئے تواضع کا کوئی حصہ نہیں ہے۔) عرفاء فرماتے ہیں کہ کوئی بندہ اس وقت تک تواضع کی حقیت کو نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کے دل میں مشاہدۂ نور کی تابانی نہ ہو۔ کیونکہ مشاہدہ نفس کو پگھلاتا اور اسے نرم کرتا ہے۔ اور نفس کا پگھلنا، تکبر و عجب کی کھوٹ سے صفائی ہے۔ چنانچہ نفس ملائم ہو جاتا ہے جمال حق مثل آئینہ منطبع اور منقش ہو جاتا ہے اور کبر و عجب کے آثار فنا اور کدورت کا غبار چھٹ جاتا ہے اس کا وافر حصہ اور بلند رتبہ حضور اکرم سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے کیونکہ آپ کمال کے مرتبہ اعلیٰ پر فائز تھے۔ اس کے باوجود آپ تواضع اختیار فرماتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے آپکو اختیار مرحمت فرمایا کہ آپ یا تو نبی بادشاہ ہونا پسند فرمائیں یا نبی بندہ ہونا تو آپ نے نبی بندہ ہونا اختیار فرمایا۔ لہذا آپ بحکم "مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ" (جس نے اللہ کے لئے تواضع اختیار کی اللہ اسکا مقام بلند فرمائے گا) تمام خلائق سے افضل و برتر ہیں اور

اللہ تعالیٰ نے آپ کی قدر و منزلت سب سے رفیع و بلند گردانی اور آپ کو نوعِ انسانی کا سردار بنایا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری مدح و ثناء میں نہ مبالغہ کرنا اور نہ حد سے تجاوز کرنا جس طرح کہ نصاریٰ حضرت ابن مریم عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا (معاذ اللہ) کہنے لگے۔ میں باایں فضل و کمال خدا کا بندہ ہی ہوں لہٰذا مجھے عبد اللہ اور رسول اللہ کہو۔

حضرت ابی امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم عصا پر ٹیک لگائے ہمارے پاس تشریف لائے تو ہم آپ کے لئے کھڑے ہوگئے آپ نے فرمایا جس طرح عجمی لوگ ایک دوسرے کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوتے ہیں اس طرح تم نہ کھڑے ہوا کرو۔ اور فرمایا میں خدا کا بندہ ہوں اسی طرح کھاتا ہوں جس طرح بندے کھاتے ہیں اور اسی طرح بیٹھتا ہوں جس طرح بندے بیٹھتے ہیں۔ آپ کا یہ فرمانا آپ کی بردباری اور متواضعانہ عادتِ کریمہ کی وجہ سے ہے۔

آپ کی اسی متواضعانہ شان میں سے یہ بھی ہے کہ آپ اپنے خادم کو نہ جھڑکتے اور نہ سخت وست فرماتے بلکہ یہ بھی نہ فرماتے کہ ایسا کیوں کیا اور ایسا کیوں نہ کیا۔ اور اہل و عیال کے ساتھ تو آپ سے بڑھ کر کوئی مہربان نہ تھا۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد فی سبیل اللہ کے سوا کسی کو ہاتھ سے نہ مارا اور آپ نے کسی سے دین خدا کے سوا اپنا بدلہ نہ لیا۔ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے لوگوں نے دریافت کیا کہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں تشریف فرما ہوتے تھے تو آپ کی خلوت کی کیا حالت تھی۔ فرمایا آپ لوگوں میں سب سے زیادہ نرم گفتار اور بہت زیادہ متبسم و خوش اطوار تھے اور کسی نے کبھی بھی آپ کو اپنے صحابہ کے درمیان قدم مبارک دراز کرتے نہ دیکھا اور آپ کے صحابہ میں سے کوئی یا آپ کے اہلِ خانہ میں سے کوئی آپ کو مخاطب کرتا تو آپ لبیک (حاضر ہوں) کہہ کر جواب دیتے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن معاشرت میں یہ ہے کہ آپ لوگوں کی دلجوئی فرماتے اور ان سے بیزاری کا اظہار نہیں فرماتے تھے۔ اور آپ ہر قوم کے سردار کی عزت کرتے اور ان کو انہیں پر حاکم مقرر فرماتے، آپ اپنے صحابہ کے احوال کی جستجو فرماتے اور ان کی دلجوئی کرتے اور اپنی التفات و عنایت کا حصہ اپنے تمام ہم نشینوں کو مرحمت فرماتے اور کوئی بھی یہ گمان نہ کر سکتا تھا کہ آپ کے قرب میں اس سے زیادہ اور کوئی بزرگ ہے۔ گویا مجلسی حق سب کو برابر دیا جاتا تھا۔ اور جو بھی آپ کے پاس حاضر ہوتا اور آپ کی خدمت میں کچھ عرصہ ٹھہرتا تو آپ اس وقت تک اس کے پاس سے نہ اٹھتے جب تک وہ خود نہ اٹھتا اور جب کوئی آپ کے گوش مبارک میں راز کی بات کرتا تو آپ اپنا سر مبارک نہ ہٹاتے یہاں تک کہ وہ خود نہ ہٹالے۔ اور جو کوئی آپ کے دست مبارک کو تھام لیتا تو آپ اپنا دست مبارک ڈھیلا چھوڑ دیتے اور اس کے ہاتھ سے نہ کھینچتے۔ جب تک وہ خود آپ کا دست مبارک نہ چھوڑے اور آپ لوگوں سے حذر کرتے اور اپنا بچاؤ کرتے۔ بغیر اس کے کہ کسی سے آپ کی پیشانی میں شکن آئے یا آپ کی خندہ پیشانی اور خوش خلقی میں فرق آئے۔ اور آپ کی کشادہ روئی اور خوش خلقی سے لوگ سیراب ہو جاتے تھے۔ اور آپ سب کے لئے بمنزلہ باپ کے تھے (بلکہ اس سے کہیں زیادہ شفیق و مہربان) اور آپ کے نزدیک حصولِ حق میں سب برابر تھے اور آپ ہمیشہ تازہ رو، خوش خلق اور نرم گفتار تھے۔ اور آپ درشت خو سخت گو، بلند آواز، فحش کلام اور عیب گو نہ تھے۔

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ خوش اخلاقی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی نہ تھا اور حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سال خدمت کی ہے اور مجھے کبھی اف تک نہ فرمائی اور نہ یہ فرمایا کہ ایسا کیوں کیا یا ایسا کیوں نہ کیا۔

حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ہمیشہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تبسم کناں دیکھا ہے۔ اور کبھی

بھی آپ کو اپنے صحابہ کے سامنے اپنا زانوئے مبارک پھیلاتے نہ دیکھا۔ اور جو بھی آپ کے پاس آتا آپ اس کا اعزاز فرماتے اور اس کے لئے اپنی چادر مبارک پھیلاتے اور اس کے لئے ایثار فرماتے اسے سرہانے بٹھاتے اور خود نچلی جانب تشریف رکھتے اور کسی بات کو نہ کاٹتے جب تک کہ وہ حد سے تجاوز نہ کر جاتا۔ اس وقت کھڑے ہو کر یا کسی اور طرح سے بات ختم فرماتے۔ اور کبھی کسی آنے والے کی خاطر نماز کو ہلکا کر دیتے اور اس سے اس کی حاجت دریافت فرماتے۔ اور جب اس کی حاجت روائی فرما دیتے تو نماز کی طرف مشغول ہو جاتے۔ ناداروں کی بیمار پرسی (عیادت) کرتے اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھ جایا کرتے۔ اور غلاموں کی دعوت کو قبول فرما لیا کرتے تھے۔ ان کی دعوت میں جو کی روٹی اور پگھلی ہوئی کہنہ چربی ہوتی تھی۔ مگر آپ اسے ہی قبول فرماتے اور اپنے صحابہ کے ساتھ گھل مل کر بیٹھتے اور مجلس کے آخری کنارے پر جہاں جگہ ہوتی تشریف رکھتے اور کبھی دراز گوش (حمار) پر سواری فرماتے۔ اور کسی کو ردیف بناتے۔ یعنی سواری پر اپنے پیچھے کسی کو بٹھالیتے۔ بنی قریظہ کے دن آپ ایسے دراز گوش پر سوار تھے جس کی لگام رسن کی تھی۔ اور پالان یعنی سواری کی نشست گاہ کھجوروں کے پوست کی تھی۔ اور آپ نے ایسے اونٹ پر حج کیا جس کا کجاوا بہت پرانا تھا۔ اور اس پر چار درہم قیمت کی چادر پڑی ہوئی تھی۔ یہ حج مبارک آپ کے عہد مبارک میں تھا جبکہ متعدد ممالک اور شہر مفتوح ہو چکے تھے۔ جس دن مکہ مکرمہ فتح ہوا ہے اس وقت آپ نے سو اونٹوں کی قربانی کی تھی اور جب آپ مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ کے حضور تواضع وانکسار کی یہ شان تھی کہ آپ کا سر مبارک کجاوہ کے اگلے سرے کی لکڑی کے قریب جھکا ہوا تھا حالانکہ شاہان جبابرہ فتح کے وقت سر کو اونچا کرتے اور اکڑ کر چلتے ہیں۔

حضرت قیس بن سعد انصاری رضی اللہ عنہ جو خود بھی اور ان کے والد بھی اکابر انصار میں سے تھے بیان کرتے ہیں کہ ایک دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف لائے۔ واپسی کے لئے حضرت سعد نے دراز گوش پیش کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس پر سوار ہوئے۔ اور حضرت سعد نے کہا اے قیس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی میں جاؤ۔ قیس کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا اے قیس سوار ہو جا۔ ! میں نے ادب کی خاطر انکار کیا۔ فرمایا یا تو تم سوار ہو جاؤ یا واپس چلے جاؤ۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے آگے سوار ہو جا کیونکہ جانور کے مالک کا حق ہے کہ وہ آگے رہے۔

ایک اور مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک صحابی سوار جا رہے تھے۔ جب انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو اتر پڑے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سوار کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے آگے بٹھایا۔ اس سے زیادہ عجیب وغریب بات یہ ہے جسے محب طبری نے مختصر السیر میں نقل کیا ہے کہ ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم بغیر پالان کے دراز گوش پر سوار قبا کی طرف تشریف لئے جا رہے تھے اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پیدل رکاب میں تھے فرمایا اے ابوہریرہ ! میں تمہیں سوار کر لوں عرض کیا جیسی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی ہو۔ فرمایا سوار ہو جاؤ انہوں نے سوار ہونے کے لئے زقند لگائی مگر چنگل حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر لگا اور دونوں زمین پر آ گئے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہوئے اور فرمایا کیا تمہیں بھی سوار کر لوں عرض کی جیسی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی وہ پھر سوار ہونے کی قدرت نہ پا سکے۔ اور حضور سے چمٹ گئے اور دوبارہ پھر زمین پر دونوں آ گئے۔ جب تیسری مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سوار ہونے کے لئے ان سے کہا تو وہ عرض کرنے لگے قسم ہے اس خدا کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا۔ اب میں نہیں چاہتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تیسری مرتبہ سواری سے زمین پر لاؤں۔

طبری بیان کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو ایک دنبہ تیار کرنے کا حکم فرمایا صحابہ اٹھے ایک کہنے لگا میں ذبح کروں گا دوسرے نے کہا میں اس کی کھال اتاروں گا تیسرے نے کہا میں اسے پکاؤں گا۔ پھر

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لکڑیاں جمع کرنا میرا کام ہے۔ صحابہ عرض کرنے لگے یارسول اللہ ہم کافی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی کیا ضرورت ہے۔ فرمایا میں جانتا ہوں تم کافی ہو لیکن میں اسے پسند نہیں کرتا ہوں کہ میں تم سے ممتاز وجدا رہوں۔ اور تمہارے درمیان متمیز ہو کر بیٹھا رہوں۔ اللہ تعالیٰ اسے ناپسند فرماتا ہے۔ کہ کوئی بندہ اپنے ساتھیوں کے درمیان ممتاز ہو کر بیٹھے۔

ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعلین مبارک کا بند ٹوٹا ہوا تھا۔ صحابہ میں سے کسی نے کہا یارسول اللہ مجھے عنایت فرمایئے۔ میں اسے درست کردوں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نہیں چاہتا میں ممتاز ہو کر رہوں اور کسی کو اپنے کام کے لئے فرماؤں (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

ایک مرتبہ نجاشی بادشاہ حبشہ کے کچھ ایلچی آئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی خاطر مدارات کے لئے کھڑے ہو گئے تو صحابہ عرض کرنے لگے یارسول اللہ ان کی خدمت کی سعادت ہمیں عنایت فرمایئے فرمایا انہوں نے ہمارے صحابہ کی بڑی خدمت و تکریم کی ہے میں پسند کرتا ہوں کہ ان کا بدلہ ادا کروں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اہل خانہ کے خود کام کاج کرتے اور اپنے کپڑے خود سیتے۔ اپنی نعلین مبارک خود درست فرماتے اور اپنی بکری کا دودھ خود دوہتے اور اپنے کپڑوں میں جوں وغیرہ کی خود نگہداشت فرماتے تھے۔ حدیث میں "وَيُفْلِي ثَوْبَهُ" آیا ہے۔ "فلی" کے معنی ہیں۔ کپڑے اور سر میں جوں تلاش کرنا، حالانکہ اہل سیر بیان کرتے ہیں کہ آپ کے بدن مبارک میں نہ جوں پڑتی تھی اور نہ جسم اطہر پر مکھی بیٹھتی تھی گویا لفظ یفلی (جوں تلاش کرنے) کے معنی یہ ہیں کہ آپ کپڑوں پر ایسی نگاہ مبارک دوڑاتے تھے جیسے جوں تلاش کر رہے ہوں اور مقصود یہ ہوتا تھا کہ کپڑوں سے گرد وغبار اور خس وخاشاک کو صاف کیا جائے۔ واللہ اعلم (نیز ایک وجہ امت کی تعلیم بھی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے کپڑوں وغیرہ سے جوں کو ڈھونڈا کریں اور امت اس سنت پر عمل کر کے ثواب کی مستحق بنے۔ مترجم غفرلہ)۔

آپ اپنی سواری کے اونٹ کو خود باندھتے۔ اور خود ہی اس کے لئے چارہ وغیرہ ڈالتے تھے۔ آٹا گوندھنے میں خادم کی مدد فرماتے۔ اور خادم کا ساتھ دے کر مدد فرماتے تھے۔ اس کے ساتھ کھانا کھاتے۔ مواہب لدنیہ میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ باتیں بعض اوقات کے ساتھ محمول ہیں یعنی کبھی کبھی ایسا بھی کیا کرتے تھے اس لئے کہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہوئی ہے کہ آپ بکثرت خدام اور دس غلام رکھتے تھے۔ لہٰذا بنفسِ نفیس کام سرانجام دیتے اور کبھی انہیں حکم فرما دیا کرتے اور کبھی ان کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے اور بازار سے اپنا سامان خود اٹھا کر لاتے اور کسی دوسرے پر اٹھانے کے لئے نہ چھوڑتے تھے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بازار آیا اور ایک سراویل (پائجامہ) کو چار درہم میں خریدا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وزن کرنے والے سے فرمایا قیمت میں مال کو خوب خوب کھینچ کر تولو (یعنی وزن میں کم یا برابر نہ لو بلکہ زیادہ لو) وہ شخص وزن کرنے والا حیرت زدہ ہو کر بولا میں نے کبھی بھی کسی کو قیمت کی ادائیگی میں ایسا کہتے نہیں سنا۔ اس پر حضرت ابوہریرہ نے کہا افسوس ہے تجھ پر کہ تو اپنے نبی کو نہیں پہچانتا پھر تو وہ شخص ترازو کو ہاتھ سے چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کو بوسہ دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک کھینچ کر فرمایا یہ عجمیوں کا دستور ہے وہ اپنے بادشاہوں اور سرداروں کے ساتھ ایسا کرتے ہیں۔ میں بادشاہ نہیں ہوں۔ میں تو تم میں سے ایک شخص ہوں (یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے از راہ تواضع فرمایا جیسا کہ آپ کی عادتِ کریمہ تھی) اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سراویل کو اٹھا لیا۔ حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ میں نے آگے بڑھ کر ارادہ کیا کہ آپ سے سراویل کو لے لوں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

سامان کے مالک ہی کو حق ہے کہ وہ اپنے سامان کو اٹھائے مگر وہ شخص جو کمزور ہے اور اٹھا نہ سکے تو اپنے اس بھائی کی مدد کرنی چاہیے۔ ا۔
تنبیہ:۔ سراویل سے مراد، تنبان یعنی پائیجامہ ہے جو عجمیوں کا پہناوا ہے۔ اس حدیث سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خریدنا تو معلوم ہو گیا لیکن آپ کا اس کے پہننے میں اختلاف ہے چنانچہ ابن قیم جو کتاب الہدیٰ میں کہتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ خریدنا پہننے کے لئے ہی تھا اور ایک روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سراویل کو پہنا اور صحابہ کرام نے آپ کے زمانہ مبارک میں آپ کی اجازت سے پہنا۔ لیکن ابن قیم کی اس بات کو محدثین ضعیف قرار دیتے ہیں۔ (واللہ اعلم)

بعض روایتوں میں باسناد ضعیف آیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ سراویل کو پہنیں گے فرمایا ہاں میں اسے سفر و حضر اور شب و روز پہنتا ہوں کیونکہ مجھے ستر پوشی کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے زیادہ ستر پوش دوسرا جامہ نہیں پاتا۔ ابن حبان، طبرانی اور عقیلی بھی اس حدیث کو روایت کرتے ہیں لیکن ضعیف سندوں کے ساتھ۔ اس حدیث کا دار و مدار، یوسف بن زیاد واسطی پر ہے اور وہ بہت ہی ضعیف ہے۔ منقول ہے کہ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کو جس دن شہید کیا گیا تو وہ سراویل پہنے ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں "شرح سفر السعادت" میں اس سے زیادہ بحث کی گئی ہے وہاں مطالعہ کریں۔ (سفر السعادت کا ترجمہ حاشیہ میں مذکور ہے۔)

ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا تو آپ کی ہیبت سے وہ لرزنے اور کانپنے لگا۔ آپ نے فرمایا اپنے پر قابو رکھو۔ لرزو نہیں۔ میں بادشاہ نہیں ہوں بلکہ مجھے والدہ نے تولد کیا ہے اور میں قریش سے ہوں جو کہ "قدید" کھاتے ہیں۔ "قدید" اس خشک کردہ گوشت کو کہتے ہیں جو فقراء و مساکین کا کھانا ہے۔ آپ کی خدمت میں ایک ایسی عورت آئی جس کی عقل میں فتور تھا۔ وہ کہنے لگی مجھے آپ سے حاجت ہے آپ نے فرمایا بیٹھو۔ مدینہ طیبہ کے جس کوچہ و بازار میں تو چاہے میں تیرے ساتھ بیٹھوں گا۔ اور تیری حاجت پوری کروں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس بیٹھے اور اس کی جو حاجت تھی اسے پورا فرما دیا۔ صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ مدینہ طیبہ کی باندیاں آتی تھیں اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک پکڑتی تھیں جہاں وہ چاہتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ تشریف لے جاتے تھے۔ اس جگہ تواضع میں یک گونہ مبالغہ ہے اس لئے کہ عورت ہو یا مرد، باندی ہو یا آزاد، جو بھی کوئی آپ کو لے جانا چاہتا آپ تشریف لے جاتے۔ اگرچہ مدینہ کے باہر ہی لے جائے۔ اس سے زیادہ تواضع اور کبر سے تنفر و بیزاری متصور نہیں ہے اور حضور انور اسے عار نہ جانتے تھے۔ کہ کسی مسکین بیوہ کے ساتھ جائیں۔

ا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ازار پائے کو پہنا ہے۔ اگر ازار پاء سے وہی مراد ہے جو چادر کی مانند بیان کرتے ہیں تو ظاہر ہے اسے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی اور اگر مراد سراویل یعنی پائیجامہ ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کے پہننے میں اختلاف ہے۔ بعض اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ آپ نے سراویل نہیں پہنی لیکن شمنی شرح شفا میں کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سراویل پہنی ہے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سراویل خریدنا معلوم و متفق علیہ ہے۔ چنانچہ "جامع الاصول" میں ترمذی و ابو داؤد کی حدیث سے مروی ہے کہ سراویل کا یہ خریدنا مکہ مکرمہ میں تھا۔ اور ابو علی موصلی اپنی مسند میں بہ سند ضعیف حضرت ابو ہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بازار آیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سراویل چار درہم میں خریدی اور بازار والوں کا ایک وزان یعنی تولنے والا تھا جو قیمت کو وزن کرتا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا خوب کھینچ کر (زیادہ) تو لو۔ اس شخص نے کہا میں نے کبھی بھی کسی کو ایسا کہتے نہیں سنا کہ وہ قیمت کی ادائیگی ایسا کلمہ کہہ کرے اس پر ابو ہریرہ نے کہا افسوس ہے تجھ پر تو اپنے نبی کو نہیں پہچانتا پھر وہ شخص ترازو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کو بوسہ دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک کھینچ کر فرمایا۔ یہ عجمیوں کا دستور ہے کہ وہ بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں میں بادشاہ نہیں ہوں بلکہ از قبیل شاہوں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم

عبداللہ بن ابی الحسماء بیان کرتے ہیں کہ بعثت سے پہلے میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی چیز خریدی کچھ رقم باقی رہ گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کیا کہ اسی جگہ لے کر حاضر ہوتا ہوں۔ پھر میں بھول گیا تین دن کے بعد مجھے یاد آیا میں وہاں پہنچا تو دیکھتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی جگہ تشریف فرما ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تم نے مجھے مشقت میں ڈال دیا۔ تین دن سے اسی جگہ تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے اس میں تواضع، صبر اور صدق وعدہ کی انتہا ہے۔ سیدنا اسمٰعیل نبی اللہ علیہ السلام کے بارے میں بھی اسی طرح آیا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا "انہ کان صادق الوعد" (بلاشبہ حضرت اسمٰعیل وعدے کے سچے تھے) بعض متبعین شریعت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ چنانچہ مروی ہے کہ حضور غوث الثقلین شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ ایک سال کامل کسی شخص کے وعدہ کے مطابق اس کے انتظار میں اسی جگہ بیٹھے رہے اور وہ شخص خضر علیہ السلام تھے۔

دستور تھا کہ مدینہ طیبہ کی باندیاں برتنوں میں پانی لے کر آتیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا دست مبارک پانی میں ڈال دیتے اور وہ اس پانی کو بیماروں پر چھڑک دیتیں۔ اور وہ کبھی موسم سرما میں صبح کے وقت ٹھنڈا پانی لاتیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی خاطر اپنا دست مبارک اس میں ڈال دیتے۔ (یہ دلیل ہے کہ بزرگوں سے تبرک حاصل کیا جائے۔ مترجم غفرلہ)

ازواجِ مطہرات کے ساتھ حسن سلوک:۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ بہت ہی

(بقیہ حاشیہ از صفحہ سابق) سراویل لے کر روانہ ہوئے۔ ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ میں نے چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے سراویل کو لے لوں اور خود اٹھا کر لے چلوں۔ فرمایا سامان کا مالک زیادہ لائق ہے کہ وہ اپنے سامان کو اٹھائے مگر وہ کہ کمزور وناتواں ہو تو اسے اس کا بھائی مدد دے۔ پھر میں نے عرض کیا یارسول اللہ کیا آپ سراویل کو پہنیں گے۔ فرمایا ہاں۔ میں سفر و حضر اور شب و روز پہنتا ہوں۔ اس لئے کہ مجھے ستر چھپانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور میں اس سراویل سے زیادہ ستر پوش کوئی جامہ نہیں پاتا۔ اور طبرانی و دارقطنی اور عقیلی بھی اس حدیث کو روایت کرتے ہیں لیکن سند ضعیف کے ساتھ۔ اور اس حدیث کا دارومدار یوسف بن زیاد واسطی پر ہے جو کہ بہت ہی ضعیف ہے۔ خلاصہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خریدنا صحیح و ثابت ہے۔ اور ابن قیم اپنی کتاب "ہدی النبی صلی اللہ علیہ وسلم" میں کہتے ہیں کہ ظاہر ہے کہ خریدنا پہننے کے لئے تھا۔ اور روایت بھی کیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سراویل پہنی اور آپ کے صحابہ نے بھی آپ کے زمانہ اقدس میں آپ کی اجازت سے پہنی اور امام بخاری اپنی صحیح میں ترجمہ لائے ہیں لیکن کوئی حدیث اس کے پہننے کی نہیں لائے اس لئے کہ صحیح نہ ہوگی اور اسی طریقہ اور شرط کے ساتھ جو امام بخاری کے نزدیک معتبر تھی محدثین روایت لاتے ہیں کہ امیرالمومنین سیدنا عثمان ذو النورین رضی اللہ عنہ جس دن شہید ہوئے وہ سراویل پہنے ہوئے تھے۔ اور روایت کیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سراویل (پائجامہ) پہننے کو لازم کرلو اس لئے کہ وہ سب سے زیادہ تمہارا ستر پوش ہے اور عورتیں جو باہر نکلتی ہیں ان کو محصن و محفوظ بناتا ہے یعنی سراویل ان کے لئے زیادہ لائق و مناسب ہے۔ خصوصاً گھر سے باہر نکلنے کی حالت میں۔ اسی طرح بعض مصنفین رحمہم اللہ بھی روایت لاتے ہیں اور اس حدیث کو علامہ امام جلال الدین سیوطی رحمتہ اللہ علیہ "جمع الجوامع" میں امیرالمومنین سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے ان لفظوں کے ساتھ لائے ہیں کہ انہوں نے فرمایا میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بقیع میں بارش کے دن بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عورت گدھے پر سوار گذری اس کے ساتھ بوجھ تھا گدھے کا پاؤں زمین کے نشیب میں پھسلا اور وہ عورت زمین پر گر پڑی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا رخ انور ادھر سے پھیر لیا۔ صحابہ کہنے لگے یارسول اللہ وہ سراویل پہنے ہوئے ہے۔ پھر دعا فرمائی۔ "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْمُتَسَرْوِلَاتِ مِنْ اُمَّتِیْ یَا اَیُّهَا النَّاسُ اتَّخِذُوا السَّرَاوِیْلَاتِ فَاِنَّهَا مِنْ اَسْتَرِ ثِیَابِکُمْ وَحَصِّنُوْا بِهَا مِنْ نِّسَاءِکُمْ" یعنی اے خدا میری امت کے پائجامہ پہننے والوں کو بخش دے، اے لوگو پائجامہ پہننے کو لازم کرلو یہ تمہارے کپڑوں میں سب سے زیادہ ستر پوش ہے اور تمہاری عورتیں تو اسے خاص ہی کرلیں۔ اس حدیث کو ترمذی اور الفقیلی نے "الضعفا" میں اور ابن عدی نے "الآداب" میں اور دیلمی نے "مسند الفردوس" میں روایت کیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اس حدیث کو ابن جوزی "موضوعات" میں لائے ہیں لیکن انہوں نے یہ ست نہیں کیا کیونکہ میرے نزدیک یہ حدیث متعدد سندوں سے ثابت ہے۔ (انتہیٰ) واللہ اعلم شرح سفر السعادت)

بہتر سلوک فرماتے۔ ان کی پاسداری کرتے ان کے ساتھ استراحت فرماتے۔ اور انصار کی بچیوں کو کھیلنے کے لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس چھوڑ دیتے۔ آپ جب پانی پیتے تو برتن کے اس جانب اپنا دہن مبارک رکھتے جس جگہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے منہ رکھ کر پانی پیا ہوتا۔ اور حضرت عائشہ کی کلائی کو پکڑ کر برتن کے اس جانب سے پیتے جہاں سے انہوں نے پیا ہوتا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مسواک صاف کرنے کے لئے حضرت عائشہ کو دیتے تو وہ اسے لے کر اپنے منہ میں چبا کر نرم کرتیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے منہ سے مسواک لے کر اپنے دہن مبارک میں لے لیتے۔ یہ غایت درجہ تواضع اور حضرت عائشہ سے انتہائی محبت کی دلیل ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ کے پہلو میں ٹیک لگاتے اور ان کا بوسہ لیتے۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم روزہ دار ہوتے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو حبشیوں کے کھیل (یعنی تیراندازی وغیرہ) دکھاتے اور وہ اپنا رخسار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شانہ مبارک پر رکھے ہوتیں۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب حضرت عائشہ صغر سنی میں تھیں۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عائشہ کے ساتھ مسابقت فرمائی اور ایک دوسرے کے ساتھ دوڑے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ دوڑ میں آگے نکل گئیں۔ پھر کچھ زمانہ بعد دوسری مرتبہ دوڑ ہوئی تو حضرت عائشہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم آگے نکل گئے وجہ یہ تھی کہ پہلی مرتبہ حضرت عائشہ عام جسم کی تھیں دوسری مرتبہ وہ تنومند بھاری جسم کی ہو گئی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پہلی مرتبہ میں مجھ سے تمہارے آگے نکل جانے کا آج تم سے میرے آگے نکل جانے میں بدلہ ہے۔

ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ کے گھر میں تشریف فرما تھے کہ حضرت ام سلمہ نے کھانا بھیجا۔ حضرت عائشہ کا ہاتھ کھانے کے برتن میں لگ گیا۔ برتن گر کر ٹوٹ گیا اور کھانا زمین پر بکھر گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے برتن کے ٹکڑوں کو چنا اور کھانا اٹھا کر برتن میں رکھا اور معذرت خواہی کے طور پر حاضرین سے کہا۔ ہمیں تمہارے اس رشک کے معاملے میں افسوس ہے۔ بیتابی کا اظہار ہوا۔ پھر حضرت عائشہ کے گھر سے درست پیالہ لے کر اور ایک روایت میں ہے کھانا بھی لے کر ان کے گھر خادم کے ہاتھ بھجوایا اور فرمایا پیالہ کے بدلہ میں پیالہ اور کھانے کے بدلہ میں کھانا ہے۔ اس حدیث میں غیرت کے موقع پر عورتوں سے مواخذہ نہ کرنے پر دلیل ہے اس لئے کہ ایسی حالت میں شدت غضب کی بنا پر عقل چھپ جاتی ہے کیونکہ اس معاملے میں غیرت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ عورت رشک و غیرت کی حالت میں اونچ نیچ کو نہیں پہچانتی۔

ایک مرتبہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شوربہ لائیں۔ حضرت عائشہ نے سودہ سے کہا اسے پی لو تو انہوں نے نہ پیا۔ پھر کہا اسے پی لو ورنہ میں تمہارے منہ پر مل دوں گی۔ انہوں نے پھر بھی نہ پیا تو حضرت عائشہ نے حضرت سودہ کے چہرہ پر مل دیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہنستے رہے آپ نے حضرت سودہ سے فرمایا تم بھی اس کے منہ پر مل دو۔ چنانچہ حضرت سودہ نے حضرت عائشہ کے چہرہ پر مل دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہنستے رہے۔ ازواج مطہرات کے ساتھ آپ کا یہ حال تھا کہ آپ ان کی غیرت و مزاح پر مواخذہ نہ فرماتے۔ اور انہیں اس میں معذور رکھتے تھے۔ اور جب ان پر عدل کی ترازو اور شریعت کے احکام قائم فرماتے تو نرمی و ملائمت کے ساتھ کرتے۔

اور جو شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کو اہل و عیال، اصحاب، فقراء، مساکین، یتامیٰ، بیوگان، مہمان اور آنے جانے والوں کے ساتھ سلوک کو بغور و فکر دیکھے گا تو وہ جان لے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب انور میں غایت درجہ رقت، نرمی، اور مہربانی تھی جو کسی مخلوق میں متصور نہیں ہو سکتی۔ اس کے باوجود آپ اللہ تعالیٰ کے حدود اور دین کے حقوق کے معاملہ میں اتنے شدید تھے کہ کوئی اس درجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و اعمال تک کسی کی رسائی ممکن نہیں۔

کیونکہ وہ سب کے سب معجزات اور آپ کی نبوت کی نشانیاں تھیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دوسرے کے ساتھ خوش طبع، گھلے ملے اور صحابہ کے ساتھ مل جل کر باتیں کرتے تھے۔ اور ان کے ساتھ مزاح فرماتے مگر اس سے مقصود صرف ان کی دلجوئی اور خوشنودی ہوتی تھی۔ اگر مزاح بھی فرماتے تو کلام کا مضمون و مفہوم بھی حق اور سچا ہوتا تھا۔ بچوں کے ساتھ کھیلتے اور ان کو اپنی گود میں بٹھاتے تھے۔ اور ہر آزاد و غلام اور باندی و مسکین کی دعوت کو قبول فرماتے اور مدینہ منورہ کے آخری کناروں تک بیماروں کی عیادت فرماتے تھے بعض حدیثوں میں جو مزاح اور ملاعبت یعنی کھیل وغیرہ کی ممانعت آئی ہے وہ کثرت اور زیادتی پر محمول ہے۔ کثرت و زیادتی کا مطلب یہ ہے کہ وہ خدا کی یاد اور دین کی مہمات پر غور و فکر سے غافل کر دے۔ اور جو اس میں صحیح و درست رہے اس کے لئے مباح ہے۔ اور اگر اس سے مقصود کسی کی خوشی اور قلبی الفت و دل جوئی ہے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل مبارک تھا تو وہ مستحب ہو گا۔

درحقیقت اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق عظیم میں تواضع و موانست اور خوش طبعی نہ ہوتی تو کس میں تاب و تواں اور قدرت و مجال ہوتی کہ آپ کے حضور بیٹھ سکتا یا آپ سے کلام کر سکتا۔ کیونکہ آپ میں انتہائی درجہ کی جلالت، ہیبت، سطوت، عظمت اور دبدبہ تھا۔ اس کی حکمت میں ارباب سیر بیان کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی سنت ادا فرمانے کے بعد اگر حضرت عائشہ بیدار ہوتیں تو ان سے گفتگو فرماتے ورنہ زمین پر پہلو کے بل قدرے آرام فرماتے پھر باہر تشریف لاتے اور فرض ادا فرماتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدائے رات سے قیام، تلاوت قرآن، ذکر رحمٰن میں مشغول رہنے کی بنا پر حضرت حق جل مجدہ کی جانب سے آپ پر انوار و اسرار، قرب و اختصاص اور حضرت جبار سے سماع کلام و مناجات کی قبولیت وغیرہ سے آپ کی ایسی حالت ہوتی کہ اس کے بیان و اظہار کی کسی زبان میں تاب و طاقت نہیں۔ اور اس حالت میں کوئی شخص ملاقات کرنے یا ہم صحبت ہونے کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حالت کو بدلنے کے لئے یا تو حضرت عائشہ سے گفتگو فرماتے یا پہلو کے بل زمین پر استراحت فرماتے تاکہ آپ کو حضرت عائشہ سے موانست حاصل ہو جائے یا اس زمین کے ذریعہ جو خلقت کی اصل ہے۔ اس کے بعد جب اس علو مقام سے آپ باہر آتے تو مخلوق خدا کی طرف متوجہ ہوتے۔ اور یہ اس وجہ سے تھا کہ آپ مسلمانوں کے ساتھ نرم اور مہربان تھے۔ "وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا" اور آپ مسلمانوں کے ساتھ مہربان تھے۔ یہ نکتہ وہ ہے جو مواہب لدنیہ میں "مدخل" میں ابن الحاج سے نقل ہوا ہے۔

بندۂ مسکین یعنی حضرت شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ثبتہ اللہ علی الطریق والیقین فرماتے ہیں کہ یہ حال اس مقام کے ساتھ ہی خصوصیت نہیں رکھتا بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ہی "اعلیٰ علیین" میں قرب و تمکین" کے مقام میں رہتے تھے اور باطن میں کسی مخلوق سے علاقہ و اتصال نہ رکھتے تھے۔ البتہ بحکم الٰہی، دعوت و تبلیغ احکام پر مامور ہونا اور اس رحمت و شفقت کی بنا پر جو مخلوق خدا سے آپ کو تھی مقام احدیت کی بلندی سے تخصیص بشریت کی طرف نزول فرماتے تھے۔ اور ان کے ساتھ ہم جلیس ہوتے تھے۔ اور بمصداق "اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ" (کیا ہم نے آپ کے سینہ مبارک کو کشادہ نہ فرمایا) آپ میں یہ کمال ودیعت فرما دیا گیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حق کے ساتھ دعوت خلق بر طریق اتم و اکمل جمع فرما سکیں۔ رات کا قیام اور صبح کا وقت آپ کے اوقات شریف میں ایک مخصوص وقت ہے۔ اور یہ مقام بسبب کمال و تمام، حضور سید انام علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور آپ کے سوا اولیاء کرام کو آپکی اتباع میں اس کا کچھ حصہ ملا ہے۔

کیفیت مزاح و ملاعبت:۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح و ملاعبت کے آثار و برکات حد و شمار سے باہر ہیں۔ ان کا

شمار و حصر ناممکن ہے۔ ایک مرتبہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی صاحبزادی جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ربیبہ تھیں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں۔ آپ غسل فرما کر تشریف ہی لائے تھے آپ نے مزاحاً ان کے چہرے پر پانی کی چھینٹیں ماریں اس کی برکت سے آپ کے چہرے پر وہ حسن و جمال رونما ہوا جو کبھی بھی نہ ڈھلا۔ شباب کا عالم ہمیشہ برقرار رہا۔

محمود بن ربیع جو نو عمر صحابیوں میں ہیں جب وہ پانچ برس کے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر تشریف لے گئے ان کے گھر میں ایک کنواں تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈول سے پانی پیا اور بطریق مزاح آب دہن مبارک کو ان کے چہرے پر ڈالا۔ اس کی برکت سے ان کو ایسا حافظہ حاصل ہوا کہ اسی بنا پر ان کا شمار صحابہ میں ہوا ان کی حدیث بخاری میں مذکور ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاحی واقعات میں سے ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ دیہاتیوں میں ایک شخص "زاہر" نام کا تھا کبھی کبھی وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دیہات کی ایسی ترکاریاں ہدیہ میں لایا کرتا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی واپسی پر شہر کی چیزیں مثلاً کپڑا وغیرہ عنایت فرمایا کرتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو دوست رکھتے تھے۔ فرماتے تھے کہ "زاہر" سے ہمارا دوستانہ ہے۔ ہم اس کے شہری دوست ہیں ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم بازار تشریف لے گئے تو زاہر کو وہاں کھڑا دیکھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پشت سے اپنا دستِ مبارک اس کی آنکھوں پر رکھ کر اسے اپنی جانب کھینچا اور لپٹا لیا۔ اور اپنا سینۂ مبارک اس کی پشت سے ملا دیا۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھ سکا تھا کہنے لگا یہ کون ہے؟ اور جب پہچان لیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو اس نے اپنی پشت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سینۂ مبارک سے اور ملا دیا۔ اور نہیں چاہا کہ وہ جدا ہو۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی ہے جو اس غلام کو خریدے۔ زاہر نے کہا یا رسول اللہ آپ نے مجھے کھوٹا اور کم قیمت مال تصور کر لیا ہے۔ فرمایا تم خدا کے نزدیک تو کھوٹے نہیں ہو اور نہ کم قیمت۔ بلکہ گراں بہا ہو۔

آپ کی تواضع میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کھانے میں کبھی عیب نہ بتاتے تھے اگر چاہا تو کھالیا ورنہ چھوڑ دیا۔ اور یہ کبھی نہیں فرمایا کہ یہ کھانا بُرا ہے، ترش ہے، نمک زیادہ یا کم ہے شوربا گاڑھا یا پتلا ہے۔

فائدہ:۔ اس جگہ معلوم ہوتا ہے کہ کھانے میں عیب نکالنا غلطی اور خلاف اتباعِ سنت ہے بعض علماء فرماتے ہیں کہ اگر طعام میں بتانے کی رو سے برائی بتائیں اور کہیں کہ برا پکا ہے اور مال ضائع کر دیا ہے تو یہ جائز ہے اس میں بھی پکانے والی کی دل شکنی ہے اگر ایسا نہ کریں تو بہتر ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع اور حسن خلق میں سے یہ بھی ہے کہ عام طور پر لوگوں کی زبانوں پر دنیا کی اہانت اور اس کی تحقیر و مذمت جاری ہے۔ مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ دنیا کو برا نہ کہو اسے گالی نہ دو کیونکہ دنیا اچھی سواری ہے جو مومن کو شر سے خیر و نجات کی طرف لے جاتی ہے۔

فائدہ:۔ اسی طرح حضور نے زمانہ (دہر) کو گالی دینے سے منع فرمایا ہے۔ حدیث قدسی میں ہے کہ "لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فَاَنَا الدَّهْرُ" یعنی زمانہ کو برا نہ کہو کیونکہ میں ہی زمانہ ہوں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دررود ربان نہ رکھتے تھے جس طرح بادشاہوں اور دنیا داروں کے ہوتے ہیں۔ ہاں! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضری اجازت پر موقوف تھی۔ تاکہ کوئی خلوت میں اہل و عیال میں نہ داخل ہو جائے۔ اور آپ کی مشغولیت میں داخل انداز ہو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع میں سے یہ بھی تھا کہ آپ نے فرمایا "لَا تُفَضِّلُوْنِیْ عَلٰی یُوْنُسَ بْنِ مَتّٰی وَلَا تُخَیِّرُوْنِیْ عَلٰی مُوْسٰی" مجھے یونس

علیہ السلام ابن متی پر فضیلت نہ دو۔ اور موسیٰ علیہ السلام پر مجھے فوقیت نہ دو (علیہم السلام) اسی کے مثل اور بھی روایتیں ہیں۔
اور آپ کا یہ ارشاد کہ انا سید ولد آدم (میں اولاد آدم کا سردار ہوں) یا اس کی مانند دیگر ارشادات تو یہ بیان واقع اور تحدیث نعمت وغیرہ کے لئے اور اللہ کے حکم کی فرمانبرداری میں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس قسم کی حدیثیں اس کے ثابت ہونے سے پہلے کی ہیں۔ جب کہ آپ کا تمام انبیاء و مرسلین پر افضل ہونا ثابت ہوا اور اس بارے میں وحی نازل ہوئی۔ اس مبحث کی تحقیق انشاء اللہ اس کے محل میں آئے گی۔

ابتداء بالسلام:۔ آپ کی تواضع میں یہ بھی ہے کہ جو بھی آپ کے پاس آتا آپ سلام کرنے میں سبقت فرماتے تھے اور آنے والے کے سلام کا جواب بھی دیتے تھے اس جگہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قبر انور کی زیارت کرنے والوں کے لئے یہ بشارت ہے کہ جب آپ اپنی ظاہری حیات میں اس خوبی کے ساتھ متصف رہے تو اب بھی ہر زیارت کرنے والا آپ کے سلام سے مشرف ہوتا ہوگا۔ چنانچہ بعض مقربین بارگاہ عالی ایسے ہوئے ہیں جو بطریق کرامت اپنے کانوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام سننے سے مشرف ہوئے ہیں۔ بلاشبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم امت کے لئے دنیادی حیات میں بھی رحمت ہیں۔ اور بعد از وفات بھی رحمت۔

جود و سخاوت

جود و سخا لغت میں ایک ہی معنی رکھتے ہیں۔ قاموس میں ہے جود، سخا ہے اور سخا، جود ہے۔ صراح میں جود و سخا کے معنی جوانمردی کے بیان ہوئے ہیں۔ منقول ہے کہ سخاوت صفت غریزیہ یعنی بالطبع خوبی ہے۔ اور اس کا مقابل شُح یعنی بُخل ہے۔ اور یہ طبعی لوازم میں سے ہے کیونکہ یہ شُح یعنی بخل آدمی کا ذاتی اور خلقی ہے اور سخی کا اطلاق ذات باری تعالیٰ پر جائز نہیں کیونکہ وہاں غریزہ یعنی طبع و نفس نہیں ہے جود کا مقابل بخل ہے۔ اور بخل بطریق عادت اکتساب کے ذریعہ راہ پاتا ہے لہٰذا ہر سخی جواد ہے اور ہر جواد سخی نہیں۔ اور جواد کی حقیقت یہ ہے کہ بے غرض اور بدلہ طلبی کے بغیر داد و دہش ہو اور یہ صفت حق سبحانہ و تعالیٰ کی ہے کیونکہ حق تبارک و تعالیٰ بغیر کسی غرض اور بدلہ کے تمام ظاہری و باطنی نعمتیں اور حسی و عقلی کمالات مخلوق کو مرحمت فرماتا ہے اللہ تعالیٰ کے بعد تمام جوادوں کے جواد، اجود الاجودین اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور آپ کے بعد امت کے علماء کرام ہیں کہ علم دین کو پھیلاتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

اَللّٰهُ اَجْوَدُ جُوْدًا ثُمَّ اَنَا اَجْوَدُ بَنِیْ آدَمَ وَاَجْوَدُهُمْ اللہ سب سے بڑا جواد ہے پھر میں بنی آدم میں سب سے بڑا جواد ہوں۔ اور هُمْ مِّنْ بَعْدِیْ رَجُلٌ عَلِمَ عِلْمًا وَنَشَرَهٗ الی۔ میرے بعد بنی آدم میں وہ مرد جو علم کو سکھائے اور اسے پھیلائے...... آخر الحدیث۔

قاضی عیاض مالکی رحمہ اللہ اس عنوان کے تحت کرم اور سماحت کو زیادہ کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جود و کرم، سخاوت اور سماحت ان سب کے معانی قریب قریب ہیں۔ مگر علماء فرق کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ایک ایسی چیز جو قدر و منزلت والی ہو اگر یہ خوش دلی کے ساتھ خرچ کی جائے تو یہ کرم ہے اسی کا نام "حریت" بھی رکھا ہے۔ جس کے معنی مرد آزاد کے ہیں۔ اور یہ "نذالت" کی ضد ہے۔ صراح میں نذالت کے معنی فرومایہ ہونا یعنی کمینہ پن ہے۔ نذل اور نذیل اسی سے ماخوذ ہیں۔ اور قاموس میں ہے کہ "اَلنَّذْلُ وَالنَّذِیْلُ اَلْخَسِیْسُ مِنَ النَّاسِ الْمُحْتَقَرُ فِیْ جَمِیْعِ اَحْوَالِہٖ" یعنی نذل اور نذیل وہ ہے جو لوگوں میں خسیس اور اپنے تمام احوال میں ذلیل و کمینہ ہے۔" اور کہا کہ "سماحت" وہ خوبی ہے جو کسی ایسی چیز کو جو اپنے زیادہ مستحق ہونے کے باوجود خوش دلی سے دوسرے کو دلوا

دے۔ اس کی ضد "شکاس" ہے۔ جس کے معنی سخت عادت کے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے "رجل شکس" یہ مرد سخت طبیعت کا ہے "وَقَومٌ شُكُسٌ" ۔ فلاں قوم سخت عادت کی ہے۔

منقول ہے کہ سخاوت نام ہے بآسانی خرچ کرنے اور جو چیز اچھی نہ ہو اس کے حاصل کرنے سے پرہیز کرنے کا۔ اور یہی جود کے معنی ہیں۔ اس کی ضد "التقتیر" ہے جس کے معنی خرچ میں تنگی کرنے کے ہیں۔ صراح میں ہے کہ "تقتیر" عیال پر خرچ کی تنگی کو کہتے ہیں۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ایسے اخلاق وصفات جن سے سب واقف ہوتے تھے اس میں کسی کے ساتھ ہمسری وبرابری نہیں کی جاتی تھی۔ انتہٰی۔

بخاری ومسلم میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں سب سے زیادہ حسین، بہادر اور اجود تھے اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی ذات، اشرفِ نفوس اور آپ کا مزاج سب سے زیادہ معتدل المزاج تھا اور جوان خوبیوں سے متصف ہو اس کا فعل، احسن افعال، اس کی صورت املح اشکال اور اس کا خلق احسن اخلاق ہوگا۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جملہ جسمانی وروحانی کمالات کے جامع اور خوبصورتی وخوب سیرتی پر حاوی تھے اور سب سے زیادہ کریم، سب سے بڑھ کر سخی اور سب سے بڑھ کر جود والے تھے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اور احادیث صحیحہ میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی کوئی ایسا سوال نہ کیا گیا اور نہ کوئی چیز ایسی مانگی گئی جس کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لا، یعنی "نہیں" فرمائی ہو۔ ہر شخص آپ سے جو کچھ مانگتا قبول کرتے اور مرحمت فرماتے۔

فرزدق شاعر نے آپ کی نعت میں کہا کہ

مَاقَالَ لَا قَطُّ اِلَّا فِیْ تَشَهُّدِهٖ   لَوْلَا التَّشَهُّدُ کَانَتْ لَاءُهُ نَعَمِ

آپ نے بجز اپنی تشہد میں پڑھنے کے لا کبھی نہیں فرمایا۔ اگر تشہد نہ ہوتا تو آپ کی "لا" نعم ہوتی۔

اس بیت کا فارسی ترجمہ کسی شاعر نے کیا ہے افسوس کہ اس نے اپنے کسی ظالم کی تعریف میں کہا ہے جو اس تعریف کا مستحق نہ تھا۔ اللہ اسے معاف کرے وہ یہ ہے کہ ۔

نرفت لا بزبان مبارکش ہرگز   مگر باشہدان لا الہ الا اللہ

یعنی اس کی زبان مبارک پر کبھی "لا" آیا ہی نہیں مگر اشہدان لا الہ الا اللہ میں۔

اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سائل کے سوال کے موقع پر بفرض کوئی چیز موجود نہ ہوتی تو توقف فرماتے اور اچھی باتوں کے ساتھ سائل کی دلجوئی فرماتے اور معذرت چاہتے۔ لیکن صراحت کے ساتھ یہ نہ فرماتے کہ میں نہیں دے سکتا۔

علماء فرماتے ہیں کہ "لا" کے ساتھ کلام فرمانا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عطا سے منع کرنے کی ہی غرض سے نہ ہوتا تھا اور یہ بھی لازم نہیں آتا کہ معذرت خواہی کے طور پر لا نہیں فرماتے تھے لہٰذا ایک جماعت سے معذرت کے طور پر حضور سے "لا" منقول ہے۔ اس جماعت نے آپ سے غزوہ جانے کے لئے سواری مانگی تھی آپ نے فرمایا۔

لَا اَجِدُ مَا اَحْمِلُكُمْ عَلَیْهِ ۔   کوئی سواری ایسی نہیں پاتا جس پر میں تمہیں سوار کروں۔

باوجود اس کے علماء بیان کرتے ہیں کہ "لَا اَجِدُ مَا اَحْمِلُكُمْ عَلَیْهِ" (کوئی سواری ایسی نہیں پاتا جس پر تمہیں سوار کروں) اور "لَا اَحْمِلُكُمْ" (میں تمہیں سوار نہیں کرتا) کے درمیان فرق ظاہر ہے۔ اگرچہ اشعریوں کے باب میں ان کے سواری کے سوال پر "لَا اَحْمِلُكُمْ" بھی فرمایا ہے۔ بلکہ بعض روایتوں میں قسم بھی یاد فرمائی ہے۔ فرمایا "وَاللّٰهِ لَا اَحْمِلُكُمْ" (خدا کی قسم میں سوار نہیں کروں

گا۔) اس مقام کی خصوصیت اس کا اقتضا کرتی ہے کہ کوئی سواری موجود نہ ہوگی۔ اور سائلوں کو بھی معلوم ہوگا کہ کوئی سواری نہیں ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر وہ ضد اور ہٹ دھرمی دکھاتے اور گستاخی کرتے تو ان کی طمع کو قطع کرنے کے لئے تاکید فرمائی تو یہ صورت عموم کے مقابلہ میں مستثنیٰ اور مخصوص ہوگی جیسا کہ مواہب لدنیہ میں کہا گیا ہے۔

بندۂ مسکین یعنی حضرت شیخ محقق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ ثبتہ اللہ فی مقام الصدق والیقین فرماتے ہیں کہ درست یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر کلمہ "لا" جاری نہ ہونے سے مراد بخل وخست کی نفی ہے جو کہ آپ کی وسعت قلبی اور فراخ دستی سے تعلق رکھتی ہے۔ اور جس طرح بخیل و کمزور لوگ کرتے ہیں۔ ویسے آپ نہ کرتے تھے۔ یہ عبارت یعنی عدم استعمال لفظ "لاء" کنایہ واشارہ ہے اسی مفہوم کی طرف، نہ یہ کہ یہ کلمہ آپ کی زبان پر کسی اور غرض کے لئے بھی نہ آیا۔

نیز یہ جو آیا ہے کہ "ہر کوئی جو مانگتا اسے مل جاتا۔" تو اس سے جود وسخا کا اثبات ہے اور اس کا یہ مطلب ہے کہ سائل کے لائق جو چیز ہوتی اس کی لیاقت کے مطابق عطا فرماتے تھے۔ اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ حضور سائل کی مصلحت کی خاطر نہ دینے میں مصلحت وقت ملاحظہ فرماتے۔ مثلاً عمل اور حکومت وغیرہ کہ مانگنے کے باوجود نہ عطا فرمائی تاکہ مسلمانوں کے معاملات کے انتظام اور اس شخص کے حال کی درستگی میں کوئی خلل واقع نہ ہو جائے۔ اور کبھی مخالفت اس غرض سے ہوتی کہ وہ شخص طمع و سوال اور حرص کی ذلیل عادتوں میں مبتلا ہو جائے جس طرح کہ حکیم بن حزام کا معاملہ ہے باوجودیکہ وہ مقبول بارگاہ اور ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی بہن کے صاحبزادے تھے۔ انہوں نے کوئی چیز مانگی حضور نے عطا نہ فرمائی اور فرمایا میں خود بھی دے سکتا ہوں لیکن ایک قسم کی کدورت اور کراہیت اس کے ہمراہ ہوگی اور انہیں نصیحت فرمائی کہ جہاں تک ہو سکے کسی شخص سے سوال نہ کرنا بیان کرتے ہیں کہ اس کے بعد حکیم بن حزام کا یہ حال ہو گیا کہ اگر کوڑا زمین پر گر جاتا تو کسی سے نہ کہتے کہ اسے اٹھا کر دے دو۔

اسی طرح حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے کسی عمل کی خواہش کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابوذر تم ضعیف و ناتواں ہو۔ عمل کی خواہش نہ کرو۔ اور کسی سے کسی چیز کا سوال نہ کرو۔ یہاں تک کہ اگر تمہارا کوڑا زمین پر گر جائے تو اسے بھی کسی سے نہ اٹھواؤ۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اکابر صحابہ اور ان میں بہت بڑے زاہد تھے۔ اور ان کا مذہب یہ تھا کہ مال جمع کرنا اور ذخیرہ اندوزی کرنا حرام ہے۔ اگرچہ ادائے زکوٰۃ کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی چیز کسی جماعت کو دینے کے لئے عطا فرمائی۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک ایسے شخص کے بارے میں سفارش کی جس کے حال اور اس کے مستحق ہونے کو جانتے تھے۔ کہا کہ "هُوَ مُؤْمِنٌ فِيْمَا اَعْلَمُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ" اے اللہ کے رسول اس کو اپنے علم کے مطابق مومن جانتا ہوں۔ ایسا تین مرتبہ عرض کیا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بہت سے ایسے ہیں جن کے بارے میں پسند کرتا ہوں کہ ان کے حال کی درستگی کی خاطر جسے میں دیکھ رہا ہوں انہیں نہ دیا جائے۔ اور دو مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کے قول کے برابر وہ مومن ہے یا مسلم ہے فرمایا۔ تیسری مرتبہ جب اصرار حد سے گزر گیا تو وہ فرمایا جو اوپر گذرا ہے۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ کے اخلاق کے ساتھ اپنا اخلاق بنانا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو جب دوست رکھتا ہے تو اسے دنیاوی آسائش سے محروم رکھتا ہے اور جس کسی کو خدا دوست نہیں رکھتا اسے خوب دیتا ہے۔ ہاں اس کا احتمال ہے کہ ان لفظوں میں لفظ "لا" آپ کی زبان مبارک پر نہ آیا ہے اور کسی اور طریقے سے مدعا بیان فرما دیا ہو۔ لیکن مفہوم و معنی پر نظر رکھنی چاہئے۔ لفظوں کا ہیر پھیر تو آسان ہے۔ واللہ اعلم۔

خلاصہ کلام یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سائل کو رد نہ فرماتے۔ اگر کوئی چیز نہ ہوتی تو فرماتے ہمارے نام پر قرض لے لو جب

ہمارے پاس کچھ آجائے گاتو ادا کر دیں گے ایک مرتبہ ایک سائل آیا فرمایا میرے پاس تو کچھ نہیں ہے تم جاؤ قرض لے لو۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس چیز کا مکلف نہیں بنایا جو آپ کی مقدرت میں نہ ہو۔ حضرت عمر کی یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار معلوم ہوئی پھر ایک انصاری نے عرض کیا یارسول اللہ خوب داد و دہش فرمایئے اور مالک عرش سے (کمی کا) خوف نہ کھایئے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا اور آپ کے چہرۂ انور پر بشاشت تازگی اور خوشحالی نمودار ہوگئی اور فرمایا مجھے یہی حکم دیا گیا ہے۔

ترمذی روایت کرتے ہیں کہ آپ کی خدمت میں نوے ہزار درہم لائے گئے آپ نے انہیں چٹائی پر رکھ کر تقسیم کرنا شروع کر دیا اور کسی کو محروم نہ رکھا۔ یہاں تک کہ سب تقسیم فرمادیئے۔

صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں "بحرین" سے کچھ مال لایا گیا آپ نے فرمایا اسے مسجد میں پھیلا دو، پھر آپ مسجد سے باہر تشریف لے آئے اور اس مال کی طرف نظر تک نہ ڈالی اور جب واپس تشریف لائے تو نماز سے فارغ ہو کر مال کے نزدیک تشریف فرما ہوئے اور ہر کسی کو وہ مال عطا ہوا۔ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ آئے اور انہوں نے کہا یارسول اللہ مجھے بھی اس مال میں سے عنایت فرمایئے۔ کیونکہ میں نے اپنا اور عقیل کا فدیہ دیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی چادر میں اتنا بھر دیا کہ وہ اٹھا نہ سکتے تھے۔ انہوں نے کہا یارسول اللہ کسی کو فرمایئے کہ اسے میرے لئے اٹھا کر لے چلے فرمایا! نہیں اے چچا جتنا تم اٹھا سکتے ہو اٹھا لو۔ یہ حضرت عباس کے طمع کے مادہ کو فنا کرنے اور ان کی تہذیب و تادیب کے لئے تھا۔ پھر حضرت عباس اپنے کندھے پر اٹھا کر چل دیئے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف دیکھتے رہے اور ان کی حرص پر تعجب فرماتے رہے۔ پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے تو ایک درہم بھی باقی نہ رہا تھا۔ ابن ابی شیبہ کی روایت میں ہے کہ یہ ایک لاکھ درہم تھے جسے علاء بن حضرمی نے بحرین کے خراج سے بھیجا تھا اور یہ پہلا مال تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا تھا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جود و سخا کے اثر کا ظہور اور ابواب کرم و بخشش کا فتوح حنین کے دن حد و شمار اور حصر و قیاس سے زیادہ تھا کیونکہ اس دن ہر عربی کو سو سو اونٹ اور ہزار ہزار بکریاں ملی تھیں اس دن کی بیشتر عطا تالیفِ قلب کے لئے تھی تاکہ ضعیف الایمان اشخاص دنیاوی امداد کے ذریعہ دین میں ثابت قدم ہو جائیں۔ صفوان بن امیہ بھی اسی زمرہ کا ایک فرد تھا۔ اسے پہلے سو بکریاں، دوبارہ سو بکریاں پھر سہ بارہ سو بکریاں دی گئیں۔ واقدی کی کتاب المغازی میں منقول ہے کہ اس دن صفوان کے اونٹ بکریوں سے اس کی وادی بھر گئی تھی۔ اس پر صفوان نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا بخشش و عطا میں کوئی اتنی جوانمردی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس عطا کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اس کفر کا علاج فرمایا جو اس میں تھا۔ ابو سفیان بن حرب اور اس کے بیٹے بھی انہیں مؤلفۃ القلوب میں سے تھے۔ چنانچہ ابو سفیان آئے اور کہا یارسول اللہ! آج قریش میں سب سے زیادہ مالدار آپ ہی ہیں اس مال میں سے کچھ ہمیں بھی عطا فرمایئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا اور بلال کو حکم فرمایا کہ چالیس اوقیہ چاندی اور سو اونٹ انہیں دے دو۔ ابو سفیان نے کہا میرے بیٹے یزید کا بھی حصہ عنایت فرمایئے۔ ابو سفیان کے ایک بیٹے کا نام یزید تھا۔ اور یہ حضرت معاویہ کے بھائی تھے۔ حضرت معاویہ نے اپنے بیٹے کا نام اسی نام پر یزید رکھا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس اوقیہ چاندی اور سو اونٹ دوبارہ اس کے حصے میں عنایت فرمائے۔ پھر ابو سفیان نے کہا کہ میرے دوسرے بیٹے معاویہ کا بھی حصہ عنایت ہو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید اتنا ہی مال اور مرحمت فرمایا۔ حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ عرض

کرنے لگے یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ خدا کی قسم جنگ کے زمانہ میں بھی آپ کریم تھے اور امن کے زمانے میں بھی آپ کریم ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ یہ واقعات ہوازن و حنین کی فتح میں بھی بیان ہوں گے جو کہ مکہ مکرمہ کی فتح کے بعد پیش آئے اگرچہ یہ مکرر ہوں گے مگر یہ مکرر نہیں "ھُوَا لمِسکُ مَاکَرَّرتہٗ یَتَضَوَّعُ" یہ مشک نافہ ہے جتنی بار کھولا جائے خوشبو کی مہک زیادہ ہوتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن پر ان کی چھ ہزار باندیاں واپس کر دیں۔ اس غزوہ میں غنیمتوں کا مجموعہ یہ ہے چھ ہزار آدمی تقریباً چوبیس ہزار اونٹ تقریباً چالیس ہزار بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی ایک اوقیہ کا وزن چالیس درہم ہے۔ (اور ایک درہم کا وزن ساڑھے تین ماشہ یا سوا چار ماشے کا ہوتا ہے) صاحب مواہب لدنیہ نے حساب لگایا ہے کہ حنین کے دنوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کو مال عطا فرمایا ان کی تعداد قریباً پانچ ہزار تھی۔

بندۂ مسکین یعنی شیخ محقق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ثبتہٗ اللہ علی طریق الحق والیقین فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جود و سخا حد و شمار اور اندازہ و قیاس سے باہر تھا اور جو کچھ موجود تھا اسی پر آپ کی جود و سخا منحصر نہ تھی لاکھ در لاکھ گنا بھی ہوتا تو بھی ان کا یہی حال ہوتا۔

حقیقت جود و سخا اور کرم و عطا کے متحقق ہونے کے لئے بالفعل صفت کا ہونا شرط نہیں ہے۔ یہ صفت ذاتی، طبعی اور پیدائشی ہے۔ اور اس کے اثر کا ظہور اور ہے۔ جو کچھ ہاتھ میں آتا عطا فرما دیتے۔ اور اس شان سے عطا کرتے کہ فقر اور مال نہ رہنے کا خوف کرتے اور نہ اندیشہ رکھتے۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی ضرورت مند محتاج کو ملاحظہ فرماتے تو اپنا کھانا پینا تک اٹھا کر عنایت فرما دیتے حالانکہ اس کی آپ کو بھی ضرورت ہوتی۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپ عطا و تصدق میں تنوع فرمایا کرتے۔ کسی کو ہبہ فرماتے کسی کو حق دیتے۔ کسی کو بار قرض سے چھڑاتے، کسی کو صدقہ دیتے۔ کسی کو ہدیہ فرماتے اور کبھی کپڑا خریدتے اور اس کی قیمت ادا کر کے اس کپڑے والے کو وہی کپڑا بخش دیتے اور کبھی قرض لیتے اور مبلغ سے زیادہ عطا فرما دیتے اور کبھی کپڑا خرید کر اس کی قیمت سے زیادہ رقم عنایت فرما دیتے۔ اور کبھی ہدیہ قبول فرماتے اور اس سے کئی گنا انعام عطا فرما دیتے۔

ایک عورت طباق میں ایسی کھجوریں جس پر دھاریاں اور نرم روئیں تھے لے کر آئی ایسی کھجوروں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت پسند فرمایا کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بحرین سے آئے ہوئے سونے کے زیورات سے اس کے دونوں ہاتھ بھر دیئے۔

بہرنوع جس طرح بھی ممکن ہے آپ طرح طرح کی صورتوں میں خیرات و عطیات تقسیم فرمایا کرتے باوجود اس کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی زندگانی فقیرانہ طور پر بسر ہوتی۔ ایک ایک، دو دو، مہینے گذر جاتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کاشانہ اقدس میں آگ تک نہ جلتی۔ اور بسا اوقات شدت بھوک سے اپنے شکم اطہر پر پتھر باندھ لیا کرتے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فقر، تنگی و مجبوری اور نہ ہونے کی بنا پر نہ تھا۔ بلکہ اس کا سبب زہد اور جود و سخا تھا۔ اور کبھی اپنی ازواج کے لئے ایک سال کا گذارہ مہیا فرما دیتے لیکن اپنے لئے کچھ بچا کر نہ رکھتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنی آدم میں علی الاطلاق سب سے زیادہ صاحب جود و سخا تھے۔ آپ کی جود و سخا کی مختلف قسمیں تھیں۔ یہ خواہ علم و مال کی عطا میں ہو یا بندوں کی ہدایت کے لئے دینِ حق کے اظہار میں ذاتی جہد و کوشش میں ہو۔ صلی اللہ علیہ وسلم و جزاہ عنا افضل ما جزی نبیاً عن امتہ۔

شجاعت اور بازوؤں کی قوت وطاقت :۔ وصل :۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت اور آپ کے بازوؤں کی قوت وطاقت کا بیان صراح میں ہے کہ شجاعت، دلاوری اور خوف کی جگہ دلیری دکھانے کو کہتے ہیں۔ کتاب الشفا میں ہے کہ شجاعت، قوتِ غضب کی فراوانی اور عقل کو اس کے تابع بنانے کا نام ہے۔ قاموس میں ہے کہ شجاعت، خوف کے وقت دل کو مضبوط رکھنے کا نام ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ صفت، صفتِ سخاوت کے کمال کی مانند تھی۔ بسا اوقات ایسے سختی اور شدت کے موقعوں میں جہاں دلاوروں اور دلیروں کے قدم اکھڑ گئے تھے۔ وہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ثابت و قائم رہے تھے۔ اور اپنی جگہ سے جنبش تک نہ فرمائی تھی۔ بلکہ بڑھ بڑھ کر آگے آتے تھے۔ اور پیچھے نہ ہٹتے تھے۔ چنانچہ غزوۂ حنین کے موقعہ پر کفار کے تیروں کی بوچھاڑ سے صحابہ کرام میں ایک قسم کا ہیجان، پریشانی، تزلزل اور ڈگمگاہٹ پیدا ہو گئی تھی مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ فرمائی حالانکہ گھوڑے پر سوار تھے۔ اور ابو سفیان بن حارث بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ آپ کے گھوڑے کی لگام پکڑے کھڑے تھے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ حملہ کریں۔ چنانچہ آپ گھوڑے سے اترے اور خدا سے مدد مانگی اور زمین میں سے ایک مشت خاک لے کر دشمنوں کی طرف پھینکی تو کوئی کافر ایسا نہ تھا جس کی آنکھ اس خاک سے بھر نہ گئی ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت یہ رجز پڑھا۔

أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ

میں نبی ہوں اس میں کذب نہیں۔ میں عبدالمطلب کی اولاد سے ہوں۔

اس روز آپ سے زیادہ بہادر، شجاع اور دلیر کوئی نہ دیکھا گیا۔ منقول ہے کہ جب مسلمان اور کافر باہم گتھم گتھا ہوئے اور مسلمانوں نے ہزیمت کھائی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت حملہ کیا۔ اسی وقت انصار کو ندا دی گئی اور مسلمان واپس ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہونے لگے بالآخر مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ پورا واقعہ اس کے اپنے مقام پر انشاء اللہ آئے گا۔

ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر میں نے کسی کو بہادر، دلیر، سخی اور خدا سے زیادہ راضی نہ دیکھا۔ حضرت امیر المومنین سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ جب گرم ہو گئی جنگ کی آگ اور سرخ ہو گئیں اس کی آنکھیں (یہ کنایہ جنگ کی سختی و شدت کی طرف ہے) تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پناہ کو ڈھونڈھتے تھے۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پناہ میں آجاتے تھے۔ دشمنوں کے قریب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی نہ تھا اور جنگ میں آپ سخت ترین شخص ہوتے تھے۔

اربابِ سیر فرماتے ہیں کہ لوگ اسے شجاع و بہادر شمار کرتے تھے جو دشمنوں سے نزدیکی کے اعتبار سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ قریب ہوتا تھا۔

عمران بن حصین فرماتے ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا لشکر ایسا نہ آیا مگر یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اس لشکر پر حملہ نہ کیا ہو۔

حکایت :۔ ایک رات مدینہ طیبہ میں شور و فغاں ہوا اور خوف وہراس پھیل گیا شاید کوئی چور یا دشمن گھس آیا تھا۔ آپ جلدی سے سب سے پیشتر اٹھے۔ شمشیر حمائل فرمائی اور حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ کیونکہ ان کا گھوڑا تیز رو اور سبک رفتار تھا۔ پھر جدھر سے آواز آئی تھی اس جانب تشریف لے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو واپسی میں وہ لوگ ملے جو آپ کے بعد نکل کر اس طرف جا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا لوٹ چلو۔ کوئی بات نہیں ہے۔ حضرت ابو طلحہ کا یہ گھوڑا پہلے بہت سست رفتار تھا

مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری میں آنے کے بعد اتنا تیز رفتار ہوا کہ کسی کا گھوڑا اس کے ساتھ نہ چل سکتا تھا۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قوت، زور بازو اور مضبوطی میں ایسے تھے کہ جہان بھر کے کُشتی گیر (پہلوان) آپ کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ محمد بن اسحاق اپنی کتاب میں بیان کرتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں "رکانہ" نامی ایک پہلوان تھا جو شدید القوت اور فن پہلوانی میں بے مثل و منفرد تھا۔ دور دور سے لوگ اس کے مقابلے کے لئے آتے تھے وہ سب کو پچھاڑ دیتا تھا۔ اچانک مکہ کی کسی گھاٹی سے وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آگیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا اے رکانہ! خدا سے کیوں نہیں ڈرتا اور میری دعوت کو کیوں قبول نہیں کرتا۔ رکانہ نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی صداقت پر کوئی شہادت لاؤ؟ آپ نے فرمایا اگر میں کشتی میں تجھے پچھاڑ دوں تو کیا تو ایمان لے آئے گا؟ اس نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا پھر کشتی کے لئے تیار ہو جا۔ چنانچہ رکانہ کشتی کے لئے تیار ہو گیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عام لباس چادر و تہبند ہی میں رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے قریب آئے اور اسے پکڑ کر زمین پر گرا دیا۔ رکانہ حیران و متعجب ہو کر درخواست کرنے لگا کہ چھوڑ دیا جائے اس نے پھر دوبارہ اور سہ بارہ کشتی کی آپ نے اسے ہر بار گرا دیا۔ پھر تو رکانہ تعجب کے ساتھ کہنے لگا آپ کی شان عجیب ہے آپ اتنی قوت و طاقت کے حامل ہیں۔ حدیث میں یہ نہیں بیان کیا گیا کہ وہ ایمان لایا یا نہیں۔ واللہ اعلم۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رکانہ کے علاوہ اور لوگوں نے بھی کشتی لڑی ہے اور آپ ان سب پر غالب رہے ہیں۔ چنانچہ ابوالاسد جحمی ایک شخص بڑا شہ زور تھا۔ وہ گائے کی کھال پر کھڑا ہو جاتا اور لوگ اس کے نیچے سے کھال کھینچنے کی پوری قوت صرف کرتے کھال پھٹ جاتی مگر اس کے نیچے سے نکال نہ سکتے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے ہٹتا تک نہ تھا۔ ایک روز اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارا کہ آپ اس کے ساتھ کشتی لڑیں۔ اس نے کہا اگر آپ مجھے زمین پر گرا دیں تو میں آپ پر ایمان لے آؤں گا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے زمین پر چت کر دیا مگر وہ ایمان پھر بھی نہ لایا۔ یہ طویل قصہ ہے جو اپنی جگہ مذکور ہے۔

حیائے مبارک :۔ وصل :۔ اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیائے مبارک کا ذکر ہے۔ حیا کے معنی شرمیلا پن اور شرم رکھنے کے ہیں۔ اس کا مادہ حیات ہے۔ اسی لحاظ سے حیاء بمعنی بارش کے آتے ہیں کہ بارش حیات کا موجب و سبب ہے۔ لیکن یہ متصور رہے اور شرم بھی دل کی زندگی اس اندازہ کے مطابق ہے۔ جس میں جتنا زیادہ دل زندہ ہوگا اس میں حیا بھی اتنی ہی زیادہ قوی اور بیشتر ہوگی۔ لغت میں حیا کے معنی تغیر و انکساری کے ہیں۔ جو انسان کو خوف اور از قسم معیوب چیز سے عارض ہوتا ہے۔ شریعت میں حیا اس خوبی کا نام ہے جو برائی کے ارتکاب سے بچانے کا موجب اور حق دار کے حق میں کوتاہی سے محفوظ رکھنے کا باعث ہے۔ حیاء کو ایمان کا جز بھی کہا ہے چنانچہ حدیث میں ہے "الحیاء من الایمان" (حیاء ایمان کا جزو ہے) اگرچہ یہ صفت غریزی یعنی طبعی و خلقی ہے لیکن اس کا استعمال بقصد علم و اکتساب قانون شریعت پر لازمی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس حیا سے مراد اکتساب یعنی حاصل کرنے والی صفت ہے۔ شارع نے اسے ایمان کا حصہ بتایا ہے۔ اور اس کے حصول پر مسلمان کو مکلف گردانا ہے۔ اگر یہ غریزی یعنی طبعی و خلقی ہوتی تو تکلیف اس میں جاری نہ ہوتی۔ لیکن جس میں یہ خوبی غریزی اور طبعی ہے تو اسے اس کے حصول پر معاون بن جاتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ غریزی کے حکم میں لے جاتی ہے واضح رہنا چاہئے کہ یہ بحث تمام صفات غریزیہ میں جاری ہوتی ہے مثلاً سخاوت اور شجاعت وغیرہ۔ کیونکہ ان کے بجالانے کا حکم ہے اور اس کی ضد پر ممانعت واقع ہے اور ان صفتوں میں وعدہ وعید دونوں وارد ہیں اور سب ہی ایمان کی شاخیں ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں دونوں قسم کی حیا بدرجہ کمال تھی۔ اس لئے کہ آپ کے قلبِ اطہر کی حیات اور اس کا مکروہات شرعیہ سے اجتناب سب سے زیادہ قوی "اتم" اکمل اور افضل تھا۔

صحیح بخاری میں بروایت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ "كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَشَدُّ حَيَاءً مِنَ الْعَذْرَاءِ فِيْ خِدْرِهَا" حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زن دوشیزہ اور اس کے حجاب سے سخت تر حیاء فرماتے تھے۔ صراح متن مخدّرہ کے معنی پردہ نشین عورت کے ہیں۔ حدیث پاک میں "خدرھا" کا استعمال عرف وعادت کی بناپر ہے۔ کیونکہ زنِ باکرہ پردہ نشین ہوتی ہے۔ بعضے شراح کہتے ہیں کہ یہ قید اس بناپر ہے کہ پردہ نشین حیاء میں بہت زیادہ ہوتی ہے یا یہ کہا کہ باہر پھرنے والی عورت کے مقابلہ میں خلوت نشین عورت میں زیادہ شرم وحیاہوتی ہے۔ اس کا ظاہر مطلب یہ ہے کہ قید دیگر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوبی ہے۔ یعنی جب کوئی شخص آپ کے پاس آتاتو تشریف لے آتے ورنہ خلوت میں مقیم رہتے۔ کیونکہ خلوت میں موجب حیانہیں ہے۔ مگر ان تکلیفوں کا ذکر اس مقام رفیع میں بشاشت یعنی بے مزگی سے خالی نہیں ہے۔ اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے اس تشبیہ کا ذکر بھی ادب و تعظیم کے ذوق کے لحاظ سے بھلانہیں معلوم ہوتا۔ لیکن مقصود کے اظہار وبیان میں مبالغہ کے قصد وارادہ سے واقع ہوا ہے۔

حیا کے بارے میں مشائخ کا مذہب:۔ مشائخ طریقت قدس اللہ اروا حہم کے حیاء کی تشریح وتفسیر میں کچھ اقوال ہیں۔ چنانچہ حضرت ذوالنون مصری قدس سرہ فرماتے ہیں کہ جو کچھ تم نے حق تعالیٰ کے حضور بھیجا ہے دل میں وحشت کے ساتھ ہیبت کے پائے جانے کا نام حیا ہے۔ فرمایا "اَلْحُبُّ يُنْطِقُ وَالْحَيَاءُ يُسْكِتُ وَالْخَوْفُ يُقْلِقُ" مطلب یہ ہے کہ محبت، محبوب کی مدح وثنا کے ساتھ محبوب کو قوت گویائی دیتی ہے اور حیاء محبوب کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کے مشاہدہ کی بناپر ساکت بناتی ہے۔ اور خوفزدہ اور بے آرام بناتی ہے۔

حضرت یحییٰ بن معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص طاعت میں خدا سے شرم رکھتا ہے خدا معصیت میں اس سے شرم رکھتا ہے۔ اور حیاء کبھی کرم اور خوف سے رونما ہوتی ہے۔ جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس جماعت سے حیافرمانا جو حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ولیمہ میں حاضر ہوئی تھی۔ اور آپ کی مجلس میں وہ دیر تک ٹھہرے رہے تھے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حیافرماتے تھے کہ ان کو کیونکر اٹھائیں اس پر حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا۔" جب تم کھانا کھا چکو تو چلے جایا کرو۔ اور فرمایا "اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِيْ مِنْكُمْ وَاللهُ لَا يَسْتَحْيِيْ مِنَ الْحَقِّ" بیشک تمہارا دیر تک بیٹھے رہنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچاتا ہے۔ اور نبی تم سے حیافرماتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ بیان حق سے حیاء نہیں فرماتا۔

اور کبھی حیا بندگی میں ہوتی ہے کہ معبود کی عظمت وکمال کے لائق وہ بندگی کو نہیں پاتا۔

حیا کی ایک قسم اپنی ذات کے لئے خود سے ہوتی ہے ایسی حیاء شریف وبزرگ شخصوں میں ہوتی ہے۔ جو نقص اور مرتبہ کی کمی سے راضی ہونے میں ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ اپنے آپ کو حیادار بنائے یعنی وہ اپنی ذات سے حیاو شرم کرے۔ گویا کہ اس میں دو ذاتیں ہیں۔ جو ایک ذات دوسری سے حیاکرتی ہے یہ حیا کی قسموں میں سب سے زیادہ کامل ہے اسلئے کہ آدمی جب اپنی ذات سے حیاکرتا ہے تو وہ دوسرے سے بطریق اولیٰ حیاکرے گا جیسا کہ مواہب لدنیہ میں مذکور ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اَلْحَيَاءُ لَا يُعْطِيْ اِلَّا الْخَيْرَ۔" یعنی حیاء نہیں لاتا مگر بھلائی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ "اَلْحَيَاءُ خَيْرٌ كُلُّهٗ" حیا سراسر بھلائی ہے۔ حدیث پاک میں آیا ہے کہ ایک شخص اپنے بھائی کو حیاء نہ کرنے کی نصیحت کرتا تھا۔ گویا کہ اس کا بھائی لوگوں سے شرم وحیا کی بناپر اپنے حقوق نہیں مانگتا تھا۔ (اس بناپر بھائی نصیحت کرتا تھا کہ اپنے حقوق کے مانگنے میں شرم وحیا

نہ کرے) اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص سے فرمایا اسے چھوڑ دو۔ کیونکہ حیا ایمان کا حصہ ہے۔
حیاکے آثار میں سے، لوگوں کے عیبوں سے اور ان چیزوں سے جو انسان اپنے لئے ناپسند و مکروہ رکھتا ہے تغافل و چشم پوشی کرنا ہے، اس معاملے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں سے زیادہ شدید تھے۔
ایک روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ایک شخص آیا جس کے چہرے پر زرد رنگ مانند زعفران کے لگا ہوا تھا۔ جو کسی عورت سے لگا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کچھ نہ فرمایا (کہ وہ شرمندہ ہوگا کیونکہ حضور اکرم کی عادت کریمہ تھی کہ کسی کے منہ پر ایسی بات نہ فرماتے جو آپ کو ناگوار معلوم ہوتی ہو۔ اگر کسی کو کچھ کہنا ضروری ہوتا اور اس کہنے پر آپ مجبور ہوتے تو اشارہ و کنایہ میں فرمایا کرتے) پھر جب وہ باہر گیا تو کسی سے فرمایا کہ اس سے کہو کہ چہرے کی زردی کو دھو ڈالے۔ اور ایک روایت میں آیا ہے کہ کہدو اپنے جسم سے کپڑے اتار دے۔ مخفی نہ رہنا چاہئے کہ یہ ارشاد غیر واجب اور حرام میں ہوگا۔ ورنہ محض زردی کی اباحت میں روایتیں ہیں۔
منقول ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاء کی یہ شان تھی کہ کسی چہرے پر بھرپور نظر نہ ڈالتے تھے۔ اگر کسی میں کوئی ایسی بات نظر آتی جو آپ کو ناپسند و مکروہ ہوتی تو آپ یہ نہ فرماتے کہ فلاں شخص ایسا کہتا ہے یا ایسا کرتا ہے بلکہ اس طرح فرماتے کہ اس قوم کی کیا حالت ہوگی جو ایسا کرتی ہے یا ایسا کہتی ہے اور اس کی مخالفت فرماتے۔ مگر کسی کرنے والے یا کہنے والے کا خاص طور پر نام نہ لیتے۔
آپ کی عادتِ کریمہ میں یہ عبارت قاعدہ کلیہ کا حکم بتاتی ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے صحیح حدیث میں مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ فحش گو تھے اور نہ کسی کو برا کہتے تھے۔ اور نہ اونچی آواز سے بولتے اور نہ بازاروں میں شور و غوغا کرتے تھے۔ اور نہ بدی کا بدلہ بدی سے دیتے بلکہ عفو و درگذر سے کام لیتے تھے۔ اور اسی کلام کے مطابق توریت سے حضرت عبداللہ بن سلام، اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم نقل فرماتے ہیں۔

شفقت، رافت اور رحمت:۔ وصل:۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت، رافت اور رحمت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۝ — نہیں بھیجا ہم نے آپکو مگر تمام جہانوں کے لئے رحمت۔

اور ارشاد فرمایا:۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۝ — بیشک تمہارے پاس تشریف لائے تم میں سے وہ رسول جن پر تمہارا مشقت میں پڑنا گراں ہے تمہاری بھلائی کے نہایت چاہنے والے، مسلمانوں پر کمال مہربان رحمت فرمانے والے۔

شفقت مہربانی کو کہتے ہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شفیق یعنی مہربانی فرمانے والے ہیں۔ اشفاق کے لغوی معنی ڈرانے کے ہیں۔ اور شفقت میں بھی یہی معنی پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ مشفق اس بات سے ڈرتا ہے کہ اسے کوئی گزند یا ضرر نہ پہنچے۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف حرص سے فرمائی گئی۔ کہ آپ صلاح و درستگی کی نصیحت فرمانے والے ہیں۔ نصوح و رافت اشد رحمت ہے۔ صراح میں ہے رحمت کے معنی بخشش کرنا اور مہربانی کرنا ہے اور رافت کے معنی بہت زیادہ بخشنا۔ اور مہربان ہونا ہے۔
حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم امت پر شریعت و احکام اور اس کے ترک میں آسانی و تخفیف کا لحاظ فرماتے اور بعض افعال اس خوف سے کہ امت پر فرض نہ قرار دے دیئے جائیں ترک فرما دیتے۔ جیسے ہر نماز کے لئے مسواک کا ترک فرمانا یا عشاء میں تاخیر کو ترک فرمانا یا

صوم وصال (پے در پے روزے رکھنے) کو ترک فرمانا اسی قسم کے اور احکام ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے دعا مانگا کرتے کہ سب ولعن کو رحمت وقربت اور موجب طہارت بنادے۔ جب کبھی آپ نماز با جماعت میں بچے کے رونے کی آواز سنتے اور اس کی ماں نماز میں ہوتی تو آپ نماز کو ہلکا فرمادیتے۔ تاکہ اس کی ماں فتنہ میں مبتلا نہ ہو۔ اور آپ فرمایا کرتے کہ تم میں سے کوئی شخص میرے پاس کوئی ایسی بات نہ پہنچائے جو مکروہ اور ناپسندیدہ ہو۔ اس لئے کہ میں پسند کرتا ہوں کہ جب میں تمہارے پاس آؤں تو میرا سینہ پاک وصاف ہو جب قریش نے آپ کو جھٹلایا اور حد سے زیادہ آپ کو ایذائیں پہنچائیں تو حضرت جبریل نے حاضر ہو کر کہا اللہ تعالیٰ نے اس فرشتہ کو حکم فرمایا ہے جو پہاڑوں پر مقرر ہے۔ اور تمام پہاڑ اس کے قبضہ وتصرف میں ہیں کہ جو کچھ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمائیں ان کا حکم بجالاؤ۔ چنانچہ پہاڑوں کے فرشتے نے عرض کیا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) حکم فرمایئے آپ کیا چاہتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو اخشبین نامی دونوں پہاڑوں کو ان پر زیروزبر کر دوں۔ اخشبین مکہ مکرمہ میں دو پہاڑیاں ہیں جن کے درمیان آبادی ہے۔ حضور نے فرمایا نہیں میں نہیں چاہتا کہ وہ ہلاک ہوں۔ میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی پشتوں میں سے ایسے لوگوں کو نکالے گا جو خدا کی عبادت کریں گے اور اس کا شریک نہ گردانیں گے۔ یہ قصہ طویل ہے جو حصہ دوم کے سال دوم میں مذکور ہے۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ جبریل علیہ السلام نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین اور پہاڑوں کو حکم دیا ہے کہ وہ آپ کی اطاعت کریں اور جو فرمائیں اسے بجالائیں اور آپ کے دشمنوں کو ہلاک کریں۔ حضور نے فرمایا۔ میں پسند کرتا ہوں کہ صبر کروں اور اپنی امت سے عذاب کی تاخیر کروں شاید کہ حق تعالیٰ انہیں بخش دے۔ اور انہیں توبہ کی توفیق دے کر ان پر رحمت فرمائے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دو باتوں کے درمیان حضور انور کو اختیار نہیں دیا گیا مگر یہ کہ آپ ان دونوں باتوں میں سے آسان کو اختیار فرماتے اس قول کے معانی و تاویلات بہت ہیں۔ اظہر واقرب یہ ہے کہ آسان تر سے مراد امت کے لئے ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور انور تذکیر وموعظہ کے لئے ہماری مزاج پرسی اور تیمار داری فرماتے مطلب یہ کہ یہ کبھی کبھی کرتے ہمیشہ نہ کرتے۔

وفاو حسن عہد صلہ رحمی اور عیادت۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وخصائل میں سے وفا، حسن عہد، صلہ رحمی اور عیادت ومزاج پرسی بھی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب کوئی چیز ہدیہ میں لائی جاتی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے اسے فلاں عورت کے پاس لے جاؤ۔ کیونکہ وہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی سہیلی ہے۔ ام المومنین عائشہ صدیقہ سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے جتنا رشک کرتی تھی اتنا کسی عورت سے میں نے رشک نہ کیا۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں بہت یاد کیا کرتے تھے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بکری بھی ذبح فرماتے تو اس میں سے بھی حضرت خدیجہ کی سہیلیوں کو ضرور بھجوایا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک مرتبہ ایک عورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی۔ آپ نے اسے دیکھ کر بڑی خوشی وشادمانی کا اظہار فرمایا۔ اور اس کی خوب خاطر ومدارات فرمائی۔ جب وہ عورت چلی گئی تو فرمایا یہ عورت حضرت خدیجہ کے زمانہ میں ہمارے یہاں آیا کرتی تھی۔ اور فرمایا حسن العہد من الایمان یعنی وضعداری کو عمدہ طریق سے پورا کرنا ایمان کی علامتوں میں سے ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ذوی الارحام یعنی قرابت داروں کا لحاظ و پاس فرماتے اور ان کی مدد فرماتے تھے۔ آپ فرماتے ابو فلاں کی آل میری دوست نہیں ہے۔ بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ فرمایا نہیں ہے کوئی میرا دوست بجز خدا کے اور مسلمانوں میں سے نیکو کاروں کے۔ ہاں ان لوگوں کے لئے رحم ہے کہ میں نرمی کرتا ہوں ان سے رحمی قرابت کی بنا پر۔ مطلب یہ کہ ان کے ساتھ بہت

کم احسان کرتا ہوں جس طرح کہ کسی کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے جائیں۔ بیان کرتے ہیں کہ ابو فلاں سے مراد ابن العاص ہے اس جماعت کا حال معلوم ہے۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امامہ بنت زینب کو گود میں لیتے اور نماز میں اپنے کندھے پر بٹھاتے اور جب سجدہ میں جاتے تو زمین پر اتار دیتے۔ پھر جب کھڑے ہوتے تو اٹھا لیتے تھے۔ آپ کی یہ عادتِ کریمہ اولاد کی شفقت اور مہربانی کی وجہ سے تھی۔ اور امامہ کا اٹھانا اور ان کا زمین پر رکھنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا فعل نہ تھا بلکہ وہ خود آتیں اور لپٹ جاتیں اور جب وہ سجدہ میں جاتے تو زمین پر اتر جاتیں تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ نماز میں یہ فعل کثیر تھا۔ یہ نفلی نماز میں تھا واللہ اعلم۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن جن کا نام شیما تھا اور وہ آپ کی رضاعی والدہ حلیمہ سعدیہ کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت و تربیت بجالاتی تھی۔ ان کا ذکر ابن اثیر نے صحابیات میں کیا ہے۔ جب وہ ہوازن کی باندیوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور انہوں نے اپنے آپ کو پہنچوایا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے اپنی چادر مبارک بچھائی۔ اور فرمایا اگر تم پسند کرو تو ہمارے ساتھ رہو عزت و اکرام سے رہو گی اور مال و منال سے بھی بہرہ مند ہو گی۔ یا اگر تم اپنی قوم کی طرف جانا چاہتی ہو تو کہدو انہوں نے اپنی قوم کی طرف جانا پسند کیا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ساز و سامان کے ساتھ بھیج دیا۔

ابو الطفیل بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اس وقت میں بچہ تھا کہ اچانک ایک عورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کے لئے اپنی چادر مبارک بچھائی وہ عورت اس پر بیٹھ گئی۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ عورت کون ہے تو صحابہ نے کہا یہ وہ عورت ہے جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ پلایا ہے ظاہر ہے کہ وہ حلیمہ سعدیہ ہوں گی۔ اور ابن عبد البر استیعاب میں کہتے ہیں کہ وہ حلیمہ تھیں۔ اور علماء یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ آٹھ عورتوں نے دودھ پلایا ہے انہیں میں سے کوئی ہو گی۔ واللہ اعلم۔

عمرو بن سائب بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز تشریف فرما تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی والد آئے۔ آپ نے ان کیلئے اپنی چادر مبارک بچھائی وہ اس پر بیٹھے۔ پھر آپ کی رضاعی والدہ آئیں تو چادر شریف کے ایک کونے پر انہیں بٹھایا۔ پھر آپ کے رضاعی بھائی آئے تو آپ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور اپنے سامنے انہیں بٹھایا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابو لہب کی باندی ثوبیہ کو بطور صلہ کھانا اور کپڑے وغیرہ بھجوایا کرتے تھے کیونکہ اس نے بھی آپ کو دودھ پلایا تھا۔ ثوبیہ کا انتقال ہو گیا تو آپ نے دریافت کیا کہ اس کا کوئی قریبی رشتہ دار باقی ہے لوگوں نے کہا کوئی باقی نہیں ہے۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی حدیث میں مروی ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

أَبْشِرْ فَوَاللّٰهِ لَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ أَبَدًا إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ)

اے میرے سرتاج آپ کو بشارت ہو۔ خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی بھی غمگین نہ کرے گا کیونکہ آپ صلہ رحمی فرماتے یتیموں کا بوجھ اٹھاتے معدوم کا کسب فرماتے۔ مہمان کو ٹھہراتے اور حق کی طرف دستگیری فرماتے ہیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

عدل و امانت اور عفت و صدق کلامی: ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غایت درجہ عادل و امانت دار اور سب سے زیادہ مہربان اور راست گو تھے۔ جن کا اعتراف آپ کے اظہار نبوت سے پہلے دشمن و بیگانے سب ہی کرتے تھے اور وہ آپ کو "محمد الامین" کہا کرتے تھے۔

ابن اسحاق روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی "امین" اس بنا پر رکھا گیا کہ آپ میں تمام اخلاق صالحہ جمع کر دیئے گئے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد "مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ" کی تفسیر میں بیشتر مفسرین اسی طرف گئے ہیں۔ اس سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔ ایسا ہی شفا میں کہا گیا ہے۔

جب قریش کے چار قبیلوں میں تعمیر کعبہ کے وقت حجر اسود کو اپنی جگہ نصب کرنے میں اختلاف رونما ہوا۔ تو سب کا اس پر اتفاق ہوا کہ علی الصباح جو سب سے پہلے خانہ کعبہ میں داخل ہو وہ جو کچھ حکم کرے اس پر ہم سب راضی ہوں گے۔ تو اس وقت سب سے پہلے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوئے اس پر وہ سب کہنے لگے یہ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ امین ہیں۔ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ جو کچھ فیصلہ فرمائیں گے ہم سب کو منظور ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چادر منگوائی اور اس کے درمیان میں حجر اسود کو رکھا۔ اور چادر کے چاروں کونوں کو چاروں قبائل کے سرداروں کو تھمادیا اور خود اپنے دست مبارک سے حجر اسود کو اٹھا کر اپنی جگہ نصب فرمادیا۔ یہ واقعہ اظہار نبوت سے پہلے اور حضرت خاتون جنت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے تولد کے سال کا ہے۔ زمانہ اسلام سے پہلے قریش حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا حکم اور ثالث بناتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے "وَاللّٰهِ إِنِّي لَأَمِينٌ فِي السَّمَاءِ وَأَمِينٌ فِي الْأَرْضِ" خدا کی قسم میں یقیناً آسمان میں بھی امین ہوں اور زمین میں بھی امین ہوں۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ ابو جہل لعین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتا تھا ہم نہ تو آپ کی تکذیب کرتے ہیں اور نہ آپ کو دروغ گو جانتے ہیں۔ اور نہ آپ ہم میں جھوٹ بولتے ہیں لیکن ہم اسے جھٹلاتے ہیں جو دین کی باتیں آپ لے کر آئے ہیں۔ اس کی یہ بات کتنی لغو، نامقبول اور متناقض ہے۔ اس لئے کہ جب تم آپ کو صادق و راست گو جانتے ہو تو جو کچھ وہ فرمائیں تم اس کی تصدیق کرو پھر یہ عناد و استکبار کیسا ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیتِ کریمہ نازل فرمائی۔

فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ۝ بیشک یہ اے محبوب تمہاری تکذیب نہیں کرتے لیکن یہ ظالم لوگ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ کی اور بھی تفسیر ہے مطلب یہ ہے کہ اے محبوب تم فارغ ہو اس کا غم نہ کھاؤ یہ تو مجھ پر بہتان باندھ رہے ہیں۔ میں ہی ان کو سزا دوں گا۔ جس طرح کوئی جماعت کسی کے غلام کو ایذائیں اور تکلیفیں پہنچائے پھر آقا اپنے غلام سے کہے کہ یہ لوگ تمہیں آزار نہیں پہنچاتے۔ یہ مجھے ایذا پہنچاتے ہیں میں جانوں۔ میں ہی ان سے نبٹوں گا۔

منقول ہے کہ اخنس بن شریک روزِ بدر ابو جہل سے ملا۔ اخنس نے کہا اے ابو الحکم (ابو جہل کی کنیت ہے) اس جگہ میرے اور تمہارے سوا کوئی نہیں ہے جو کہ ہماری باتوں کو سنے۔ مجھے بتاؤ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صادق ہیں یا کاذب؟ تو اس ملعون نے کہا "خدا کی قسم بلاشبہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) راستی پر ہیں اور وہ صادق ہیں ہرگز دروغ گو نہیں ہیں۔

ہرقل بادشاہ روم نے ابو سفیان سے اس حدیث میں جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و احوال کے بارے میں اس نے سوال کئے اور آپ کی نبوت پر اس نے استدلال کیا ہے دریافت کیا۔ کیا تم ان میں سے تھے کہ اس مرد کو متہم با لکذب گردانتے تھے۔ یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے دعویٰ نبوت سے پہلے ایسا جانتے تھے۔ ابو سفیان نے جواب دیا خدا کی قسم انہوں نے کبھی بھی دروغ گوئی نہ کی۔ ہرقل نے کہا جب یہ بات ہے تو یہ ذات خدا پر دروغ کیسے باندھ سکتی ہے۔ ہرقل کی یہ بات علامات نبوت کی معرفت میں مفید ترین چیز ہے بخاری شریف اول میں مذکور ہے اور مشکوٰۃ کی شرح میں اس کا ترجمہ اور شرح بیان کی گئی ہے۔

نضر بن حارث نے قریش سے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے سامنے ہی خورد سال سے جوان ہوئے۔ تمہارے سب

کاموں میں تمہارے محبوب وپسندیدہ، قول وقرار میں تم سب سے زیادہ صادق ترین اور دیانت وامانت میں تم سب سے زیادہ عظیم ترین رہے۔ اوراب جب کہ تم ان کی کنپٹیوں کے بالوں میں آثارِ پیری دیکھ رہے ہو اور تمہارے پاس دین وملت کی باتیں لے کر تشریف لائے ہیں تو تم انہیں جادوگر (ساحر) کہتے ہو۔ نہیں خدا کی قسم وہ ساحر نہیں ہیں۔ یہ نضر بن حارث کافر تھا اور اس کے دل پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ لیکن سمجھدار تھا اور انصاف رکھتا تھا۔ لیکن دوسروں کے اوپر تو غلیظ پردے پڑے ہوئے تھے۔ جب کبھی یہ پردے اٹھ بھی جاتے تھے تو پہلے سے زیادہ غلیظ پردے پھر پڑ جاتے تھے۔

ولید بن مغیرہ رؤساء کفار قریش سے تھا اس نے بارہا قرآن پاک سنا، رویا اور کہنے لگا، یہ بشر کا کلام نہیں ہے۔ اس کلام میں جو شیرینی ہے وہ کسی دوسرے کلام میں نہیں۔ بیشک اس میں حلاوۃ اور طلاوۃ ہے۔ صراح میں طلاوۃ کے معنی خوبی اور دل میں اثر کرنے کے ہیں۔

اور حارث بن عامران شریر لوگوں میں سے تھا جو لوگوں کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کیا کرتے تھے۔ لیکن جب یہ گھر والوں کے ساتھ تنہائی میں ہوتا تو کہتا خدا کی قسم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جھوٹ بولنے والوں میں سے نہیں ہیں۔

ایک روز ابو جہل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور مصافحہ کیا۔ لوگوں نے کہا۔ کیا تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ مصافحہ کرتے ہو؟ کہنے لگا خدا کی قسم میں جانتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیغمبر ہیں لیکن کیا کریں، ہم عبد مناف کی اولاد کے پیرو کار کب تھے۔ اور مشرکین جب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے تو کہتے خدا کی قسم! وہ نبی ہیں۔ یہ تھا مشرکوں کا حال۔

اور یہود ونصاریٰ اہل کتاب تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو بہت زیادہ جاننے والے تھے اور یقین کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتے تھے۔ "یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ" وہ آپ کو ایسا پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔ اور یہ پشت در پشت سے نبی آخر الزماں کے منتظر ہوئے تھے۔ اور مرتے وقت اپنے لڑکوں کو وصیت نامے لکھ کر دے جاتے کہ جب آخر الزماں تشریف لائیں تو ہمارا سلام پہنچائیں اور عرض کریں کہ ہم نے آپ کے انتظار میں جانیں دیدی ہیں۔ ہمارے سلام کو قبول فرمائیں اور ہمیں اپنے غلاموں میں قبول فرمائیں۔

بیان کرتے ہیں کہ شاہان یمن میں سے تبع نامی مسلمان بادشاہ تھا اور اس کی قوم کافر تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں نہیں جانتا تبع بنی تمیم تھا یا نہیں وہ اپنی جماعت کے ساتھ نبی آخر الزماں کا نشان پہچاننے مدینہ منورہ آیا۔ اور اس شہر مکرم میں ٹھہر گیا۔ اس کے ساتھیوں نے تبع سے کہا کہ انہیں اپنی صحبت سے معاف رکھیں۔ اور ایک قول یہ ہے کہ یہ انصار انہیں کی اولاد سے ہیں اور جب نور مبارک نے ظہور فرمایا تو وہ سب کفر کی تاریکیوں میں بھٹکتے رہ گئے۔ نعوذ باللہ من الخذلان"

عفت:۔ عفت کے معنی حرام سے بچنے کے ہیں۔ اور قاموس میں ہے "اَلْعِفَّةُ عَمَّا لَا یَحِلُّ وَلَا یَجْمُلُ" عفت اسے کہتے ہیں جو چیز حلال اور اچھی نہ ہو اس سے بچتا رہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں وجود عفت اور اس کے کمال کا کس زبان سے بیان ہو سکتا ہے۔ جہاں عصمت آگئی وہاں سب کچھ آگیا۔ حدیث مبارک میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی عورت کا ہاتھ تک نہ چھوا جس کے آپ مالک نہ ہوں۔ یہ ایک عبارت ہے جسے اہلِ عرف وعادت عفت وپارسائی کے بیان میں کہتے ہیں ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے عفت کی حقیقت ہی نہیں آپ کے تمام اخلاق واوصاف کی حقیقت اس سے بالاتر ہے جتنا کہ بیان کیا جا سکتا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت مبارک راست گوئی اور صدق کلامی بار بار بیان کی جاچکی ہیں۔

عدل:۔ لیکن عدل کے معنی خواہ عدالت وانصاف اور دادگستری کے لئے جائیں یا اخلاق وصفات میں اعتدال وتوسط لئے جائیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی میں دونوں معنی تھے اور دونوں ہی متصور ہیں۔

ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مال تقسیم فرمارہے تھے تو ذوالخویصرہ تمیمی نے کہا عدل فرمایئے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اس نے کہا جو تقسیم فرمارہے ہیں مبنی بر انصاف نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا افسوس ہے تجھ پر اگر میں عدل نہیں کروں گا تو دوسرا کون کرے گا۔ یہ قصہ طویل ہے۔

ابو العباس مبرد جو علم نحو کا امام ہے نے کہا کہ کسریٰ شاہ فارس نے اپنے دنوں کی تقسیم کر رکھی ہے۔ ہوا کا دن سونے کے لئے ابر آلود کا دن شکار کے لئے اور بارش والا دن شراب پینے کے لئے موزوں ہے اور روز آفتاب یعنی کھلا دن، لوگوں کی ضرورتیں پوری کرنے کیلئے اچھا ہے۔ بیان کرتے ہیں کہ کسریٰ لوگوں کی سیاسی سوجھ بوجھ میں عقلمند نہ تھا تو وہ اپنے دین میں کہاں ہو گا۔ لیکن ہمارے نبی سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دن کو تین جزو پر تقسیم فرما رکھا تھا۔ دن کا ایک حصہ عبادت کے لئے اور ایک حصہ اہل وعیال کے لئے اور ایک حصہ اپنے لئے پھر اس تیسرے حصے کو بھی اپنے لئے اور لوگوں کی حاجتیں پوری فرمانے کیلئے تقسیم کر دیا تھا۔ اس بیان کی تفصیل حلیہ شریف کے آخر باب میں گذر چکی ہے۔

ابو جعفر طبری سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے دو مرتبہ کے سوا کبھی بھی جاہلیت کے اعمال کا قصد نہ کیا اور ان دو مرتبہ میں بھی ہر بار اللہ تعالیٰ میرے اور میرے ارادہ کے درمیان حائل ہو گیا۔ پھر میں نے کبھی ایسا قصد نہ کیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی رسالت سے سرفراز فرمایا۔ ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ میں نے ایک رات اپنے اس ساتھی سے کہا جو میرے ساتھ بکریاں چرایا کرتا تھا کہ تم میری بکریوں کا خیال رکھنا۔ میں مکہ مکرمہ ہو آؤں اور افسانے کہوں اور سنوں۔ جس طرح نوجوان لوگ کہتے اور سنتے ہیں۔ میں وہاں سے چلا اور مکہ مکرمہ کی ایک سرائے میں آیا وہاں لوگ نشانہ بازی کر رہے تھے۔ اور دف ومزامیر بجارہے تھے۔ اس دن کسی کے گھر میں شادی تھی۔ میں بیٹھ گیا تاکہ اسے سنوں لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے سلادیا۔ اور مجھے اس وقت بیدار کیا جبکہ آفتاب کی گرمی پھیل چکی تھی میں لوٹ آیا دوسری مرتبہ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ پھر میں نے کبھی بھی اس برائی کا قصد نہ کیا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

وقار و دبدبہ، خاموشی و مروت اور راہ وروش:۔ وصل: وقار وتوءوت کے لغوی معنی آہستگی کے ہیں لیکن مراد رعب، ہیبت اور دبدبہ ہے۔ اور صمت کے معنی خاموش رہنے کے ہیں۔ اور مروت کے معنی مردمی وانسانیت کے ہیں۔ اور ہدی بمعنی سیرت اور راہ روش ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک میں حلم ووقار اور آپ کی حرکات وسکنات میں بردباری و آہستگی ایسی تھی جو کسی دوسرے میں ممکن نہیں۔ حدیث پاک میں مروی ہے کہ آپ مجلس مبارک میں سب لوگوں سے بڑھ کر باوقار تھے۔ اور آپ کے جسم واعضاء کا کوئی عضو باہر نہ نکلتا تھا جس طرح عام طور پر کوئی ہاتھوں کو گھماتا ہے کوئی پھیلاتا ہے وغیرہ۔

اکثر آپ کی نشست مبارک احتباء کے وضع پر ہوتی تھی۔ احتباء اس نشست کو کہتے ہیں جو سرین پر بیٹھ کر گھٹنے اٹھا کر پنڈلیوں کو ملا کر بیٹھا جائے۔ آپ اس طرح کبھی چادر مبارک لپیٹ کر کبھی بغیر اس کے تشریف رکھتے۔ اور کبھی مربع (جہاں زانو) نشست ہوتی۔ صبح کی نماز کے بعد اس وضع پر تشریف رکھ کر وظائف واوراد پڑھتے اور کبھی بوضع قرفصا تشریف رکھتے۔ اس کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے کہ سرین پر نشست فرماتے یعنی زانو کو اٹھاتے اور انہیں شکم اطہر سے ملاتے۔ اور دونوں ہاتھوں سے احتباء کرتے یعنی لپیٹتے۔ اور ان کو زانو یا پنڈلیوں پر رکھتے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ رکبتین یعنی زانوؤں کا احتباء فرماتے اور رانوں کو شکم سے ملاتے۔ اور دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو اپنی بغل میں لاتے۔ احتباء کی یہ ایک خاص نوع ہے کہتے ہیں کہ ایسا بیٹھنا اعراب وغرباء کا ہے۔

قیلہ بنت مخرمہ کی حدیث میں ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حالتِ خشوع میں بوضع قرفصا بیٹھے دیکھا تو میں خوف سے کانپ گئی۔ مطلب یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت خشوع میں اس طرح دیکھنے سے مجھ پر خود لرزہ طاری ہوگیا۔ خشوع کے معنی عاجزی کے ساتھ آنکھیں بند کرنا ہے۔ خضوع کے بھی قریب قریب یہی معنی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ خشوع کا تعلق بدن سے ہے اور خضوع کا تعلق آواز وبصر سے ہے اور بعض حدیثوں میں خشوع کو باطن پر اور خضوع کو ظاہر پر محمول کیا گیا ہے اور یہ دونوں لفظ سکون وتذلیل کے معنی میں مشترک ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بہت زیادہ خاموشی پسند تھے اور ضرورت کے وقت ہی کلام فرمایا کرتے تھے۔ اور جو کوئی غیر جمیل یعنی بغیر حسن وخوبی کے بات کرتا آپ اس سے رخ پھیر لیا کرتے۔ آپ کا کلام قول فیصل ہوتا۔ اظہارِ مطلب میں الفاظ نہ زیادہ ہوتے اور نہ کم۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ اس طرح کلام فرماتے کہ آپ کے کلمات کو شمار کیا جاسکتا تھا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ترتیل وترسیل کے ساتھ تھا۔ صراح میں ہے کہ ترتیل کے معنی آرام کے ساتھ ہموار اور خوب واضح لفظوں سے پڑھنا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا" یعنی قرآن کو خوب واضح حروف، آرام وسکون اور ہموار لفظوں سے پڑھو۔ ترسیل کے بھی یہی معنی ہیں۔ ان کے معانی کی تحقیق "رسالہ تجوید" میں کی گئی ہے۔

ابن ابی ہالہ کی حدیث میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاموش پسندی کا سبب چار چیزیں تھیں۔ حلم، حذر، یعنی خشیت الٰہی تقدیر اور تفکر یعنی غور وخوض، آپ کا ہنسنا مسکرانے کی حد تک تھا۔ اور آپ کے حضور میں صحابہ کا ہنسنا بھی آپ کی پیروی اور اتباع ہی میں تھا۔ آپ کی مجلس مبارک، حلم وحیا اور خیر وامانت کی مجلس تھی جس میں آوازیں بلند واونچی نہ ہوتیں۔ بری باتوں سے اجتناب کیا جاتا تھا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کلام فرماتے تو تمام صحابہ اپنے سروں کو جھکا لیتے۔ گویا کہ ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر سر اٹھایا تو وہ اڑ جائیں گے۔ صاحب الشفاء نے صحابہ کرام کی اس حالت کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام فرمانے کی حالت کے ساتھ مخصوص ومقید کیا ہے۔ حالانکہ دیگر کتابوں میں مطلقاً آیا ہے کہ مجلس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی حاضری میں صحابہ کرام کی ہمہ وقت یہی حالت رہتی تھی۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں منہ میں سنگریزہ رکھ کر بیٹھا کرتے تاکہ سانس نہ گھٹے اور بات نہ کرسکیں۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال پر محبت کی لڑی میں پرو کر نظر جمائے رکھتے تھے۔

آپ کی رفتار مبارک اور چلنے کی کیفیت حلیہ مبارک کے ضمن میں معلوم ہوگئی ہوگی۔ آپ کی مروت میں سے یہ بھی ہے کہ آپ نے کھانے پینے کو پھونک پھونک کر کھانے پینے سے منع فرمایا ہے اور جو سامنے رکھا ہوا سے کھانے کا حکم فرمایا اور مسواک کرنے، منہ، انگلیوں کے پوروں، گھائیوں اور جوڑوں کو خوب صاف کرنے کا حکم فرمایا۔

آپ کی سیرت مبارکہ یعنی راہ وروش بہترین سیرت تھی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ

خَيْرُ الْحَدِيْثِ كَلَامُ اللهِ وَخَيْرُ الْهَدْىِ هَدْىُ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم بہترین کلام کلام اللہ ہے اور بہترین سیرت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خوشبو اور معطر فضا کو محبوب رکھتے۔ خود بھی استعمال فرماتے۔ اور دوسروں کو ترغیب دیا کرتے تھے۔

چنانچہ فرمایا۔

حُبِّبَ اِلَیَّ مِنْ دُنْیَاکُمُ النِّسَآءُ وَالطِّیْبُ وَجُعِلَتْ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ۔ — تمہاری دنیا میں سے مجھے تین چیزیں محبوب کی گئی ہیں۔ بیویاں، خوشبو، اور نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک گردانی گئی۔

مطلب یہ کہ انہیں حق تعالیٰ نے میرے لئے محبوب بنایا ہے نہ یہ کہ میں نے اپنے عمل واختیار سے انہیں محبوب جانا ہے۔ نماز میں میری آنکھوں کے لئے آرام وقرار گردانا گیا یا میری آنکھوں کی خنکی وٹھنڈک قرار دی گئی ہے۔ بیان کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں خوشی ومسرت اور روشنی وخوش دلی پاتے اور جو ذوق وشہود حالتِ نماز میں آپ کو حاصل ہوتا وہ کسی دوسری عبادت اور کسی وقت نہ ہوتا۔

"قرۃ العین" فرحت وسرور، دریافت مقصود اور انکشافِ غیب سے کنایہ ہے۔ "قرۃ" قر سے مشتق ہے۔ جس کے معنی قرار و ثبات کے ہیں۔ چونکہ نظارۂ محبوب کی دید سے قرار اور راحت و آرام حاصل ہوتا ہے۔ آپ سرور کی حالت میں دائیں بائیں دیکھتے۔ اور خوش حالی میں اپنی جگہ پر ساکن رہتے۔ محبوب کے غیر پر نظر ڈالنے سے پریشانی اور حیرانی ہوتی ہے۔ اس طرح حزن وملال کی حالت میں بھی سرگردانی اور پریشانی لاحق ہوتی ہے۔ "تَدُوْرُ اَعْیُنُھُمْ کَالَّذِیْ یُغْشٰی عَلَیْہِ مِنَ الْمَوْتِ" اور انکی آنکھیں ایسی ہو جاتی ہیں گویا ان پر موت طاری ہو گئی ہے۔ یہ اس کی دلیل ہے۔

"یا قرۃ" قُر سے مشتق ہے بمعنی سردی وٹھنڈک۔ چونکہ محبوب کے مشاہدہ سے آنکھوں کو ٹھنڈک اور لذت حاصل ہوتی ہے۔ اسی بنا پر فرزند کو قرۃ العین کہتے ہیں اور یہ کہ فی الصلوٰۃ (نماز میں) کی بجائے الصلوٰۃ (نماز) نہ فرمایا اس میں یہ اشارہ ہے کہ آنکھوں کا سرور و آرام مشاہدۂ حق سے ہے کہ بحکم "کانک تراہ" گویا کہ تم نماز میں اسے دیکھ رہے ہو۔ یہ مشاہدۂ حق حالتِ نماز میں حاصل ہے نہ کہ نفس نماز یا اس کے ثواب وجزاء میں اس لئے کہ مشاہدہ کے وقت آرام والتفات غیر سے نہیں ہوتا۔ اور نماز حق کا غیر ہے۔ اگرچہ اسی کی نعمت اور اسی کا فضل ہے۔ اور حق کی نعمت اور فضل سے خوش ہونا بھی ایک مقامِ بلند ہے جیسا کہ فرمایا۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰہِ وَبِرَحْمَتِہٖ فَبِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوْا — فرمادو اللہ کے فضل ورحمت ہی کے ساتھ انہیں چاہئے کہ وہ مسرور ہوں۔

فضل ورحمت کا مقام مفضّل ومنعم یعنی ذات باری تعالیٰ کے مشاہدے سے کم ہے اور فضل ورحمت کے ساتھ فرح وسرور ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام کہیں زیادہ اعلیٰ وارفع ہے اسی بنا پر فلیفرحوا (انہیں خوش ہونا چاہئے) فرمایا اور فلتفرح نہ فرمایا کیونکہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوتا ہے۔ (مطلب یہ کہ امت کا چونکہ مقام و درجہ بمقابلہ نبی کے کمتر ہوتا ہے۔ انہیں تو اللہ تعالیٰ کے فضل ورحمت پر ہی خوشی ومسرت کرنی چاہئے اور نبی کا مقام اس سے بلند ہوتا ہے۔ خاص کر سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام جو کہیں زیادہ ارفع واعلیٰ ہے اس لئے ان کی خوشی ومسرت مشاہدۂ ذات باری تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ (فتدبر از مترجم غفرلہ)

تنبیہ۔ — واضح رہنا چاہئے کہ یہ کلمہ جو مذکور ہوا اس حدیث کا جزو ہے "حُبِّبَ اِلَیَّ الطِّیْبُ وَالنِّسَآءُ وَجُعِلَتْ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ" صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو امام احمد ونسائی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور سخاوی "مقاصد حسنہ" میں فرماتے ہیں کہ طبرانی اسے "اوسط" اور "الصغیر" میں مرفوعاً لائے ہیں اسی طرح خطیب "تاریخ بغداد" میں اور ابن عدی "الکامل" میں لائے ہیں۔ اور مستدرک میں بھی ہے۔ لیکن بغیر لفظ "جعلت" کے ہے اور کہا گیا ہے بر شرط مسلم صحیح ہے۔ نسائی کے نزدیک بروایت انس ایک اور سند سے بزیادتی لفظ "من الدنیا" مروی ہے اور بکثرت محدثین نے اسی وجہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ابن قیم نے کہا کہ اسے امام احمد نے "کتاب زہد" میں بزیادتی لطیف روایت کیا ہے وہ اضافہ یہ ہے کہ

أَصْبِرُ عَنِ الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ وَلَا أَصْبِرُ عَنْهُنَّ۔ کھانے پینے سے رک سکتا ہوں لیکن بیویوں سے نہیں رک سکتا۔

(وجہ یہ ہے کہ کھانا پینا اپنا ذاتی حق ہے اور ازواج کے حقوق، دوسرے کا حق ہے اپنے حق کو باختیار خود چھوڑا جاسکتا ہے لیکن دوسروں کے حقوق اپنی مرضی سے کسی حال میں بھی ترک نہیں کئے جاسکتے۔ فافہم مترجم)

سخاوی فرماتے ہیں کہ یہ جو مشہور ہے کہ اس حدیث میں لفظ ثلث (تین) کی زیادتی کے ساتھ ہے تو میں اس سے واقف نہیں مگر دو جگہ پر ایک "احیا" میں دوسرے کشاف کے سورۂ آل عمران میں۔

......اور میں نے اس اضافہ کو اسناد حدیث میں سے کسی سند میں باوجود بہت جستجو و تلاش کے نہیں دیکھا۔ زرکشی نے اس معنی کی تصریح کی ہے اور کہا کہ اس حدیث میں لفظ "ثلث" وارد نہیں ہوا ہے حالانکہ یہ اضافہ معنی میں خلل انداز ہوتا ہے۔ اس لئے کہ صلوٰۃ از قبیل اشیاء دنیا نہیں۔ اگرچہ اسکی تاویل بھی کی گئی ہے۔ شیخ حافظ ابن حجر عسقلانی نے رافعی کی روایت کردہ میں کہا ہے کہ لوگوں کی زبانوں پر لفظ "ثلث" مشہور ہوگیا ہے لیکن میں نے اس لفظ کو اس کی اسناد میں کہیں نہیں پایا۔ اور ولی الدین عراقی بھی اپنی کتاب "امالی" میں فرماتے ہیں کہ لفظ ثلث کسی حدیث کی کتاب میں نہیں ہے اور صلوٰۃ از امور دنیا نہیں ہے۔ (انتہیٰ کلام سخاوی) لہٰذا معلوم ہوا کہ اصل متن حدیث جس پر ائمہ حدیث کا اتفاق ہے اسی لفظ کے ساتھ ہے کہ۔

حُبِّبَ إِلَيَّ الطِّيبُ وَالنِّسَاءُ وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ۔ میرے لئے تین چیزیں محبوب کی گئی ہیں۔ خوشبو، ازواج اور نماز میں آنکھوں کی ٹھنڈک اور آرام بنائی گئی۔

یہ متن بغیر اشکال کے ہے۔ اور بعض روایتوں میں "من الدنیا" یا "من دنیاکم" آیا ہے۔ اور بعض کتابوں میں لفظ ثلث بھی آیا ہے۔ اگر ان دونوں میں ایک نہ ہو تو اشکال نہیں ہوتا۔ اگر دونوں ہوں جیسا کہ لوگوں کی زبانوں پر مشہور ہے تو اشکال وارد ہوتا ہے۔ اور اس کی تاویل میں کوئی کہتا ہے کہ "من الدنیا" سے مراد دنیا میں ہوتا ہے۔ اور اس کا وجود اس جہان کی زندگانی سے ہے۔ لہٰذا حاصل معنی یہ ہوئے کہ اس جہان میں مجھے تین چیزیں اچھی لگیں۔ دو تو دنیاوی امور سے ہیں اور تیسرا امر اختیاری دینی ہے۔

کوئی کہتا ہے کہ از روئے ملال، تیسرا امر دنیا سے ہے۔ اس کا ذکر نہیں کیا اور عدول کیا امر دینی سے بر طریق تکمیل اور دفع توہم اس سے کہ اس میں لذت و محبت ہے اور معاشرتِ ازواج میں انہماک، حق اور اس کی مناجات سے مشغولیت نہیں رکھتا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ امر ثالث جس کا اس حدیث میں ذکر نہیں وہ خیل (گھوڑا) ہے۔ والعلم عند اللہ جیسا کہ دوسری حدیث میں بروایت انس وارد ہے کہ۔

لَمْ يَكُنْ أَحَبَّ إِلَيْهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ النِّسَاءِ مِنَ الْخَيْلِ۔ (رواہ النسائی) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ازواج کے بعد گھوڑے سے زیادہ محبوب کوئی چیز نہ تھی۔

اور یہ بھی احتمال رکھتا ہے کہ تیسرا امر، طعام ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے۔ فرمایا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کی تین چیزیں اچھی معلوم ہوئیں۔ کھانا، ازواج، اور خوشبو۔ تو آپ نے ان میں سے دو سے تو حظ اٹھایا اور ایک سے نہیں یعنی ازواج اور خوشبو سے تو محظوظ ہوئے اور کھانے سے نہیں اسے امام احمد نے روایت کیا (واللہ اعلم۔)

زہد:۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت زہد اور اس کے کمال کا ذکر احادیث و اخبار میں بہت کافی و وافی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دنیاوی ملمع کاری سے کلیۃً مجتنب رہتے تھے۔ حالانکہ آپ کے سامنے دنیا پوری چمک دمک کے ساتھ لائی گئی۔ اور پے در پے فتوحات حاصل ہوئیں مگر جب آپ کا دنیا سے کوچ کرنے کا وقت آیا تو آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس گروی تھی جس سے اپنے اہل و عیال کے نفقہ کے لئے روپیہ حاصل کیا تھا۔ حالانکہ آپ دعا فرمایا کرتے "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ اٰلِ مُحَمَّدٍ قُوْتًا" اے خدا

میرے اہل و عیال کے جان کی رمق باقی رہنے کیلئے رزق عطا فرما۔ وفات کے وقت تک ایک زرہ کو نہ چھڑا یا جا سکا۔ اور یہ سب کچھ زہد و سخاوت اور ایثار کی وجہ سے تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی مسلسل تین دن شکم سیر ہو کر روٹی نہ کھائی۔ ایک اور روایت کے مطابق کبھی مسلسل دو دن جو کی روٹی ملاحظہ نہ فرمائی۔ اگر آپ چاہتے تو اللہ تعالیٰ آپ کو اتنا دیتا کہ کسی کے وہم و خیال میں بھی نہ آسکتا تھا۔ دوسری حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل و عیال نے کبھی سیر ہو کر گندم کی روٹی نہ کھائی۔ یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم واصل بحق ہوئے۔ سیدہ عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے درہم چھوڑا نہ دینار۔ نہ بکری نہ اونٹ اور عمرو بن حارث کی روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ترکہ میں کچھ نہ چھوڑا بجز ہتھیار، گھوڑا اور زین کے اور اسے بھی صدقہ یعنی بحق بیت المال دیدیا تھا۔ سیدہ عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حال میں رحلت فرمائی کہ گھر میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جسے کوئی جگر والا کھا سکے مگر نصف کیل جو۔ جو گھر کے ایک طاق میں پڑے ہوئے تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یقیناً مجھ پر پیش کیا گیا کہ اگر چاہیں تو مکہ کی وادی بطحا کو میرے لئے سونا کر دیا جائے تو میں نے عرض کیا، نہیں اے رب! بس تو اتنا کر دے کہ ایک دن تو بھوکا رہوں اور دوسرے دن کھاؤں۔ اور جس دن میں بھوکا رہوں تیرے حضور گریہ و زاری کروں۔ اور تجھ سے دعا مانگوں۔ اور جس دن کھاؤں اس دن تیرا شکر بجالاؤں۔ اور تیری حمد و ثنا کروں۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جبریل نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے بعد سلام ارشاد فرمایا ہے کہ کیا آپ کو پسند ہے کہ ان سب پہاڑوں کو سونا کر دیا جائے۔ اور جہاں آپ تشریف فرما ہوں ساتھ جایا کریں۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ دیر سر مبارک کو جھکائے رکھا پھر فرمایا اے جبریل دنیا اس کا گھر ہے جس کا کوئی گھر نہ ہو اور دنیا اس کا مال ہے جس کا کوئی مال نہ ہو۔ اور اسے وہی جمع کرتا ہے جسے عقل نہ ہو۔ جبریل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا اے حبیب خدا! اللہ تعالیٰ قول ثابت پر آپ کو قائم و ثابت رکھے۔

سیدہ عائشہ فرماتی ہیں کہ ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آل میں سے ہیں ہمارا حال یہ تھا کہ ہم ایک مہینہ آگ نہیں جلاتے تھے اور ہمارے پاس بجز کھجور و پانی کے کوئی خوراک نہ ہوتی تھی۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک بہت بڑا طباق کھانے کا لائے۔ اس پر آپ پر گریہ طاری ہوا اور فرمانے لگے "ہلاک شد رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم" اور جو کی روٹی سے خود اور آپ کی ازواج مطہرات سیر نہ ہوئے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواج مطہرات مسلسل کئی راتیں بغیر کھائے پیئے گذارتے تھے۔ اور رات کا کھانا موجود نہ ہوتا تھا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی دسترخوان یا سینی پر کھانا نوش نہ فرمایا۔ اور نہ آپ کے لئے چپاتی تیار کی گئی۔ کبھی بھی گوسفند ملیمہ یعنی دم پخت بکری آپ کے سامنے نہ دیکھی گئی۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی آسودہ خاطر نہ ہوئے اور نہ کبھی کسی سے اس کی شکایت فرمائی اور آپ کے نزدیک غنیٰ سے فاقہ کشی بہت زیادہ محبوب تھی اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فاقہ سے دن گزارتے۔ اور رات کو تمام شب بھوک سے شکم اطہر ملا کرتے۔ یہ شدت بھوک سے کنایہ ہے۔ آپ کی یہ حالت دن کے روزوں سے نہ روکتی۔ اگر آپ پروردگار سے مانگتے تو وہ آپ کو زمین کے تمام خزانے اور اس کے تمام میوے عنایت فرمادیتا۔ مجھے آپ کی محبت و شفقت کی بنا پر رونا آجاتا تھا جو کچھ کہ میں آپ کی

حالت دیکھتی یا اپنے ہاتھ سے آپ کے شکم اطہر کو ملتی۔ اور بھوک سے جو کیفیت آپ پر ہوتی تو میں عرض کرتی "روحی فداک یا رسول اللہ" اے اللہ کے رسول آپ پر میری جان قربان کاش کہ آپ دنیا سے اتنا لینا پسند فرماتے جو آپ کے کھانے کے لئے کافی ہوتا۔ اور قوت دیتا۔ اس پر آپ فرماتے اے عائشہ دنیا سے مجھے کیا سروکار؟ میں دنیا کا کیا کروں؟ میرے برادران جو کہ اولوالعزم رسول ہیں انہوں نے اس سے زیادہ سختیوں اور شدتوں پر صبر فرمایا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے حال سے گذر گئے۔ اور اپنے رب تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچ گئے اور ان کی اس مراجعتِ ربی کو حق تعالیٰ نے گرامی قدر بنایا اور انہیں بہت کچھ ثواب وصلہ مرحمت فرمایا۔ لہٰذا میں اپنے آپ کو پاتا ہوں اور تن آسانی سے شرماتا ہوں کہ اپنی زندگی ایسی گزاروں۔ پھر کل کو مجھے ان سے جدا کیا جائے۔ حالانکہ میرے نزدیک اپنے بھائیوں کے زمرہ میں شامل رہنے سے بڑھ کر کوئی چیز محبوب نہیں ہے۔ میں ہوں اور میرے محبوب برادران۔ (صلی اللہ علیہ و علیہم وسلم) سیدہ عائشہ فرماتی ہیں کہ اس واقعہ کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں ایک ماہ سے زیادہ اقامت نہ فرمائی۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی خاص بستر نہ تھا۔ فقط ایک ایسا بچھونا تھا جس میں روئی کی جگہ کھجور کے درخت کی چھال بھری ہوئی تھی۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے خانہ اقدس میں دو سوتی (پلاسی) تھی جسے میں دو تہہ کر کے بچھایا کرتی۔ آپ اس پر آرام فرمایا کرتے تھے۔ ایک رات میں نے اس کی چار تہہ کر دیں تاکہ کچھ نرم ہو جائے۔ چنانچہ جب صبح ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا آج رات تم نے میرے لئے کیا بچھایا تھا۔ میں نے عرض کیا وہی بستر تھا جو روز بچھایا کرتی تھی۔ لیکن آج رات میں نے اس کی چار تہہ کر دی تھیں۔ فرمایا اسے اسی حال پر رکھو اس لئے کہ اس کی نرمی مجھے رات کی نماز سے باز رکھتی ہے۔ آپ کی عادت کریمہ تھی کہ کبھی تخت پر آرام فرماتے یا کبھی اس کھجور کے پتوں کی چٹائی پر۔ چٹائی کے نشانات آپ کے پہلوئے اقدس پر مرتسم ہو جاتے تھے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

خوف و خشیتِ الٰہی و سختیٔ طاعت اور شدتِ عبادت

وصل:۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خوف و خشیتِ الٰہی اور اس کی طاعت و عبادت حق تعالیٰ جل شانہ کے علم و معرفت کے مطابق تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جو جتنا زیادہ جاننے والا اور حق تعالیٰ کی حقیقت کا شناسا ہو گا وہ اتنا ہی زیادہ اس کا خائف اور اس کا عبادت گذار ہو گا۔ اسی بنا پر حق تعالیٰ نے فرمایا۔

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بندوں میں سے علماء ہی اللہ کی خشیت رکھتے ہیں۔

صحیح بخاری میں بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم وہ جانو جو کچھ کہ میں جانتا ہوں تو تم کم ہنسو گے اور بہت زیادہ روؤ گے۔ ترمذی کی روایت میں اتنا زیادہ ہے کہ فرمایا میں وہ تمام کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ سکتے۔ اور میں وہ کچھ سن رہا ہوں جو تم نہیں سن سکتے۔ اور فرمایا کہ آسمان خاص قسم کی آواز نکالتا ہے اور اسے لائق ہے کہ آواز اطیط نکالے۔ "اطیط" پالان اور اونٹ کے درد و کرب سے کراہنے کی آواز کو کہتے ہیں اور آسمان کا "اطیط" کرنا ملائکہ کی کثرت و اژدہام کی گراں باری کی بنا پر ہے یہ کنایہ ہے اور فرمایا آسمان میں چار انگل بھی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں خدا کے حضور فرشتے پیشانی رکھے سجدہ نہ کر رہے ہوں۔

دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا خدا کی قسم اگر تم وہ کچھ جانو جو میں جانتا ہوں تو تم کم ہنسو گے اور بہت زیادہ روؤ گے۔ اور اپنی بیویوں سے ہم بستری سے لذت نہ اٹھاؤ گے۔ اور زمینوں اور اس کی بلندیوں اور راہوں کی طرف نکل کھڑے ہوؤ گے۔ اور خدا کے حضور گڑ

گڑاؤ گے۔ اور فریاد کرو گے۔ اور دعاؤں میں اونچی آوازوں سے پکارو گے۔ مطلب یہ کہ میں صبر و تحمل کی قوت سے ان کے بوجھ کو اٹھاتا ہوں۔ اگر تم جان لو تو ہر گز وہ بوجھ نہ اٹھا سکو گے۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ جو اس حدیث کے راوی ہیں فرماتے ہیں کہ ہمہ وقت تمنا کرتا ہوں کہ کاش میں درخت ہوتا کہ کاٹ ڈالا جاتا۔ اور ایک روایت میں آیا ہے کہ صحابہ کرام نے عرض کیا یارسول اللہ آپ کیا ملاحظہ فرمارہے ہیں؟ فرمایا میں دیکھ رہا ہوں بہشت و دوزخ کو۔

لہٰذا حق تعالیٰ نے آپ میں خشیۂ قلبیہ اور استحضار عظمت الٰہیہ کے ساتھ علم الیقین اور عین الیقین کو اس شان سے جمع فرمایا ہے کہ کوئی دوسرا ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز میں قیام اس طرح ہوتا کہ آپ کے پائے مبارک متورم ہو جاتے اس پر صحابہ عرض کرنے لگے یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتنی محنت و مشقت کس لئے برداشت فرماتے ہیں۔ حالانکہ حق تبارک و تعالیٰ نے آپ کے سبب تمام اگلوں اور پچھلوں کے گناہوں کو معاف فرمایا ہے۔ اور آپ تو مغفور ہیں ہی۔ فرمایا خدا کی اس عنایت و کرم پر کہ اس نے مغفور بنایا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

سیدہ عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر عمل لزوم و دوام لئے ہوئے ہے تم میں سے کس کی طاقت ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم جتنی مشقت برداشت کر سکے۔

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک رات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خواب استراحت سے بیدار ہوئے۔ مسواک کی اور وضو کر کے نماز کے لئے کھڑے ہو گئے تو میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز کے لئے کھڑا ہو گیا۔ پھر آپ نے سورۂ بقرکی تلاوت شروع فرمائی تو کوئی رحمت والی آیت ایسی نہ گزری جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے توقف کر کے خدا کے حضور رحمت کی درخواست نہ کی ہو۔ اور ایسی کوئی عذاب والی آیت نہ گذری جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے توقف کر کے خدا سے اس کے عذاب سے پناہ نہ مانگی ہو۔ پھر آپ نے قیام کے برابر طویل رکوع فرمایا۔ اور پڑھا "سُبْحَانَ ذِي الْجَبَرُوْتِ وَالْمَلَكُوْتِ وَالْعَظَمَةِ وَالْكِبْرِيَاءِ" پھر رکوع سے سر مبارک اٹھا کر اتنا ہی قیام فرمایا۔ اور اس میں یہی کلمات پڑھے۔ اس کے بعد سجدہ کیا اس میں بھی یہی کلمات پڑھے پھر دونوں سجدوں کے درمیان جلوس فرمایا۔ اس میں بھی اسی کی مانند کلمات پڑھے۔ (اس کے بعد بقیہ رکعتوں میں) سورۂ آل عمران، سورۂ نسا اور سورۂ مائدہ کی تلاوت کی۔ اور کبھی آپ ایک ہی آیت پر ساری رات قیام میں گزار دیتے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ وہ آیت یہ ہوتی۔

إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ اگر تو ان پر عذاب فرمائے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انہیں بخش دے تو تو ہی غالب حکمت والا ہے۔

اس سے مقصود امت کا عرض حال اور انکی مغفرت کی درخواست تھی۔ منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز ادا فرماتے ہوتے اور آپ کا شکم اطہر دیگ کے جوش مارنے کی آواز کی مانند آواز دے رہا ہوتا۔

ابن ابی ہالہ کی حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ آپ پر پے در پے غم آتے اور مسلسل آپ کو حزن و ملال پہنچتا رہتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اپنے رب سے روزانہ ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں اور ایک روایت میں سو بار ہے یہ سارا اندوہ و غم اور استغفار امت کے لئے تھا اس کے ماسوا اور بھی وجوہ علماء بیان کرتے ہیں جیسے رسالہ "مرج البحرین" میں ذکر کیا گیا ہے۔

سیدنا علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ سے وصالِ حق کے

طریقے کے بارے میں دریافت کیاتوفرمایامیرے مال کی راس معرفت ہے۔ میرے دین کی اصل عقل ہے۔ محبت میری اساس ہے۔ شوق میری سواری ہے ذکر اللہ میراانیس ہے شفقت میراخزانہ ہے، غم میرارفیق ہے، علم میراہتھیار ہے۔ صبر میری چادر ہے، رضا میری غنیمت ہے۔ فقر میرافخر ہے۔ زہد میری حرفت ہے۔ یقین میری قوت ہے۔ صدق میراشفیق ہے۔ طاعت میری محبت ہے۔ جہاد میری خوبو ہے۔ اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک و آرام نماز میں ہے۔ میرے دل کا پھل ذکر میں ہےاور میراغم، اپنی امت کے لئے ہےاور میراشوق اپنے رب کی طرف ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

قرآن پاک میں مذکورہ صفات وخصائل مبارک

وصل: ۔ صحیح بخاری میں بروایت عطاء رضی اللہ عنہ ایسی حدیث منقول ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر اخلاقِ کریمہ کی جامع ہےاور ان میں سے آپ کے کچھ صفاتِ علیا قرآن کریم میں بھی مذکور ہیں۔ چنانچہ حدیث قدسی میں ہے۔

"یَٰٓأَیُّهَا النَّبِیُّ إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّحِرْزًا لِّلْأُمِّیِّیْنَ" یعنی آگاہ ہوا ے نبی بیشک ہم نے آپ کو بھیجا گواہ اس کتاب پر جو ہم نے ان کی طرف بھیجی۔ ان کی تصدیق و تکذیب اور ان کی نجات و گمراہی پر گواہی دینے والااور فرماں برداروں کوبشارت دینے والااور نافرمانوں کوڈرانے والااور امیوں کے لئے یعنی اہل عرب کے لئے جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم تھی ان کو پناہ دینے والابھیجا۔ صراح میں " حرز " کے معنی ہموار اور اچھی جگہ کے ہیں "أَنْتَ عَبْدِیْ وَرَسُوْلِیْ" یعنی تم میرے بندۂ خاص ہو اس مقام کی حقیقت اور اس مرتبہ خاص کا آپ کے سوا کوئی سزاوار نہیں۔ اور میں نے تمام مخلوق کی طرف رسول فرمایا۔ "سَمَّیْتُكَ الْمُتَوَكِّلَ" میں نے تمہارانام متوکل رکھاکیونکہ تمام کاراور اپنابار تم نے میرے سپرد کر دیا۔ اور اپنی ہرایک قوت وطاقت سے دست کش ہوگئے۔ اور تمام کاموں میں میں ہی تمہارے ہرامر کا متولی ہوا "لَیْسَ بِفَظٍّ وَّلَا غَلِیْظٍ" ۔ میرایہ بندۂ خاص ایساہے کہ نہ درشت خوہےاور نہ سخت گو "وَلَا سَخَّابٍ فِی الْأَسْوَاقِ" نہ یہ بازاروں میں آوازیں بلند کرتا ہے۔ بازار کی قید اتفاقی ہے۔ کیونکہ بازاروں میں اکثر آوازیں اونچی ہوتی ہیں۔ اور معنوی لحاظ سے مراد یہ ہے کہ بازار میں آنے سے اجتناب فرماتے ہیں۔ کیونکہ وہ دنیاوی کاروبار کی جگہ ہےاور اہل آخرت کے لئے بلاضرورت جاناان کے حال کے لائق نہیں۔ "وَلَا یَدْفَعُ السَّیِّئَةَ بِالسَّیِّئَةِ" اور بدی کو بدی سے دور نہیں فرماتے۔ مطلب یہ کہ بدی کا بدلہ بدی سے نہیں دیتے۔ اگر حد سے تجاوز نہ کیاجائے توشریعت میں درست ہے "ولکن یعفو او یغفر" لیکن وہ معاف فرماتے چھپاتے اور بخشش کی دعامانگتے ہیں بلکہ احسان فرماتے ہیں جیساکہ دوسری جگہ خود ہی ارشاد فرمایا۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ أَحْسَنُ السَّیِّئَةَ وَلَا یَقْبِضُهُ بدی کواس سے جو بہت اچھی ہواس سے دور کرواور اللہ روح قبض نہیں فرمائے گا اللہُ حَتّٰی یُقِیْمَ بِهِ الْمِلَّةَ الْعَوْجَاءَ۔ جب تک کہ آپ کے ذریعہ ٹیڑھے لوگ سیدھے نہ ہو جائیں۔

اور یہ کج رواورٹیڑھے لوگ کلمہ طیبہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ" پڑھ کر سیدھے ہوجائیں۔ "وَیَفْتَحُ بِهِ أَعْیُنًا عُمْیًا" اور ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اندھی آنکھوں کوبینافرمائے گا "وَآذَانًا صُمًّا وَّقُلُوْبًا غُلْفًا" اور بہرے کان اور دلوں کے پردے کھولے گا۔ اس حدیث میں بعض روایتوں میں اتنازیادہ مروی ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا "أُسَدِّدُهُ بِكُلِّ جَمِیْلٍ" میں نے انہیں ہرخوبواور خصلت کے ساتھ درست فرمایاہے۔ صراح میں " سداد " کے معنی راست گفتاری اور راست کرداری کے ہیں "وَأَهَبُ لَهُ كُلَّ خُلُقٍ كَرِیْمٍ" اور میں نےان کو ہراچھی خصلت عطافرمائی ہے۔ "وَأَجْعَلُ السَّكِیْنَةَ لِبَاسَهُ وَالْبِرَّ شِعَارَهُ" اور میں نے آرام واطمینان کوان کالباس بنایا۔ جو انہیں گھیرے ہوئے ہے۔ اور نیکی و بھلائی کوان کی علامت اور شعار بنایا۔ مانند اندرونی کپڑے کے جو آپ کے ساتھ چسپاں ہے

"وَالتَّقْوٰى ضَمِيْرَهٗ" اور پرہیزگاری کو ان کا ضمیر اور ان کا دل بنایا ہے۔ اس لئے کہ تقویٰ کی جڑ دل میں ہوتی ہے اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا" سینہ کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے فرمایا تقویٰ کی جگہ یہ ہے۔ اس کو ضمیر کے ساتھ تعبیر فرمایا کیونکہ "اضمار" دل میں بات چھپانے کو کہتے ہیں۔ "وَالْحِكْمَةَ مَعْقُوْلَهٗ" اور میں نے حکمت کو ان کی عقل مبارک بنایا۔ حکمت نام ہے اشیاء کے احوال کو جس طرح نفس الامر میں ہے جاننے کا اور اس کے معنی راست گفتاری اور راست کرداری بھی آیا ہے۔ "وَالصِّدْقَ وَالْوَفَاءَ طَبِيْعَتَهٗ" اور میں نے سچائی اور ایفائے وعدہ کو ان کی طبیعت بنایا۔ "وَالْعَفْوَ وَالْمَعْرُوْفَ خُلُقَهٗ" درگزر فرمانا اور نیکی کا حکم کرنا ان کی خصلت رکھی "وَالْعَدْلَ سِيْرَتَهٗ وَالْحَقَّ شَرِيْعَتَهٗ وَالْهُدٰى اِمَامَهٗ وَالْاِسْلَامَ مِلَّتَهٗ" اور میں نے انصاف یا میانہ روی کو ان کی سیرت اور حق کو ان کی شریعت اور ہدایت کو ان کا امام اور اسلام ان کی ملت بنائی۔ "واحمد اسمہ" ان کا اسم گرامی احمد ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پچھلی امتوں میں محمد و احمد دونوں ناموں سے یاد کئے جاتے تھے۔ "وَاَهْدِيْ بِهٖ بَعْدَ الضَّلَالَةِ" اور میں نے ان کے ذریعہ گمراہی کے بعد راہ راست دکھائی۔ "وَاُعَلِّمُ بِهٖ بَعْدَ الْجَهَالَةِ" اور جہالت کے بعد ان کے ذریعہ مینارۂ علم روشن فرمایا "وَاَرْفَعُ بِهٖ الْخَمَالَةَ" اور ان کے ذریعہ مخلوق کو پستی سے بام عروج پر پہنچایا۔ "وَاُسَمِّيْ بِهٖ بَعْدَ النُّكْرَةِ" اور ان کو بلند کیا اور شناسا کیا۔ جہالت اور ناشناسائی کے بعد ان کے ذریعہ "وَاُكَثِّرُ بِهٖ بَعْدَ الْقِلَّةِ" اور کمی کے بعد انہیں زیادہ کیا ان کے ذریعہ "وَاُغْنِيْ بِهٖ بَعْدَ الْعَيْلَةِ"۔ اور ان کے ذریعہ انہیں بے نیاز کیا فقر و احتیاج کے بعد "وَاُؤَلِّفُ بِهٖ بَيْنَ قُلُوْبٍ مُخْتَلِفَةٍ وَاَهْوَاءٍ مُتَشَتِّتَةٍ وَاُمَمٍ مُتَفَرِّقَةٍ" اور مختلف دلوں پراگندہ خیالوں اور جدا جدا ٹولوں کے درمیان ان کے ذریعہ الفت و محبت پیدا فرمائی "وَاَجْعَلُ اُمَّتَهٗ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" اور بنایا ان کی امت کو بہترین امت ان سب میں جتنی لوگوں میں امتیں نکالی گئیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم وعلیٰ آلہ واصحابہ واجمعین۔

باب سوم

دربیان فضل وشرف از آیات قرآنیہ واحادیث صحیحہ

اس باب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان فضل وشرف کا بیان ہے جو آیات قرآنیہ سے ثابت اور احادیث صحیحہ سے حاصل ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت وتعظیم امر، علوشان، توقیر رتبی، اور آپ کی مدح وثنا صراحت کے ساتھ موجود ہیں۔ چنانچہ پہلی دلیل کلمہ "شاہد" ہے جو رفعتِ مقام علوِ مرتبت، عظمتِ شان اور حفظِ ادب پر صادق ہے۔ اور دلالت کرتا ہے کہ کوئی بزرگی، آپ کی بزرگی کے برابر اور کوئی قدر آپ کی قدر کے مساوی نہیں ہے۔ کتنی عظیم قدر ومنزلت ہے جس کی مدح وثنا پروردگارِ عالم مالکِ عرش عظیم فرمائے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات، مراتب اور درجات کی جو تفصیلات درج ہیں ان کو حد وشمار میں لانا ناممکن ہے۔ پہلی وہ آیۃ کریمہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود رسالت، شفقت اور آپ کی رحمت کی خبر دیتی ہے اور بشارت بخشتی ہے وہ یہ ہے کہ فرمایا۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾

بیشک تشریف لایا تمہیں میں سے وہ رسول جن کو تمہارا مشقت میں پڑنا گراں ہے۔ تمہاری فلاح کے خواہشمند مسلمانوں کے ساتھ بہت مہربانی ورحمت فرمانے والے ہیں۔

مطلب یہ کہ تمہارے پاس اس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری تمہارے ہی قبیل اور تمہاری ہی جنس سے ہے۔ اور تم ان کے صدق وامانت کے مقام ومرتبہ کو خوب جانتے ہو اور تمہارے درمیان وہ کبھی بھی متہم بالکذب نہ ہوئے اور تم ان کے آباء واجداد کو بھی جانتے ہو کہ وہ عرب میں سب سے اشرف، افضل، ارفع اور طاہر ومطہر تھے کہ ان میں نہ سفاح (فحاشی وزنا کاری وغیرہ) تھی۔ اور نہ جاہلیت کی خباثتیں۔ چنانچہ فرمایا۔ "اُخْرِجْتُ مِنَ الْاَصْلَابِ الطَّاهِرَاتِ اِلَى الْاَرْحَامِ الطَّاهِرَاتِ۔" یعنی مجھے اصلاب طاہرہ سے ارحام طاہرہ کی طرف منتقل کر کے عالم ظہور میں لایا گیا۔ اور تم ان کے شرف ذاتی، محامدِ صفاتی، عظایم اخلاقی اور محاسنِ افعالی کو دیکھتے رہے ہو۔ بعد ازاں ان کی بعض صفاتِ کریمہ کو بھی بیان کرتے رہے ہو۔ اس کے بعد حق تعالیٰ فرماتا ہے ان پر تمہارا مشقت میں پڑنا اور دنیا وآخرت میں تمہارا زیاں کار ہونا سخت دشوار ہے۔ یہ تمہاری رشد وہدایت پر غایت حرص اور نہایت ہمت رکھتے ہیں۔ اور مسلمانوں کے ساتھ کمال رافت ورحمت اور شفقت ومہربانی رکھتے ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ

بیشک اللہ نے مسلمانوں پر احسان فرمایا کہ انہیں میں سے ان میں رسول کو مبعوث فرمایا۔

اور فرمایا

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ

خدا کی یہ شان ہے کہ اس نے امیوں میں انہیں میں سے رسول کو مبعوث فرمایا۔

اور فرمایا۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ۔ جیسا کہ ہم نے بھیجا تم میں رسول تمہیں میں سے۔

اور انہیں کی جنس سے رسول کا بھیجنا، انسیت، تصدیق، ایمان واتباع اور امتنان میں زیادہ داخل واقرب ہے۔

سیدنا امام جعفر صادق سلام اللہ علیہ وعلی آباءٗ الکرام فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ اپنی معرفت وطاعت میں مخلوق کے عجز کو جانتا ہے۔ اس نے چاہا کہ معرفت کرائی جائے اور تعلیم دی جائے تو اس نے ان کے مابین ایسی مخلوق پیدا فرمائی جو انہیں کے جنس سے ہے۔ اور اپنی صفت میں سے رحمت ورافت کا لباس پہنا کر ان کا نام نبی صادق اور رسول برحق رکھا۔ اور ان کی اطاعت کو اپنی اطاعت کے موافق گروانا۔ چنانچہ فرمایا "مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ" جس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی اس نے یقیناً اللہ کی اطاعت کی "وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" اور نہیں بھیجا ہم نے آپکو مگر سارے جہان کے لئے رحمت (انتہیٰ کلام الامام)

حق تعالیٰ نے آپ کے ذاتی وجود کو اور آپ کے شمائل وصفات کو تمام مخلوق پر رحمت بنایا للذا جسے بھی رحمت کا حصہ پہنچا اس کے نصیب میں دنیا و آخرت میں نجات ملی۔ اور ہر برائی سے محفوظ رہا۔ اور محبوب حقیقی سے واصل وفائز المرام ہوا۔ جیسا کہ کتاب الشفاء میں ہے اس تقدیر سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مومنوں پر رحمت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مظہر ومصدر رحمت ہیں۔ اگر کوئی انکار وعناد اور استکبار کے مرض میں مبتلا ہو کر شقاوت وضلالت اور حرمان وخذلان میں پڑا رہے تو اس کا اپنے اوپر ہی ظلم ہو گا۔

یہ تقریر اس توجیہہ کے موافق ومطابق ہے جو اس ارشاد باری تعالیٰ کی تفسیر میں کی گئی ہے کہ فرمایا "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ" (ہم نے جن وانسان کو نہیں پیدا کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں) مفسرین فرماتے ہیں کہ ان کا اس صورت پر پیدا فرمانا کہ وہ عبادت کی طرف متوجہ ہوں گویا ان میں ایسی صلاحیت واستعداد رکھی گئی ہے کہ وہ عقلوں کے ذریعہ غور وفکر کر سکیں۔ اور عقل ہی غلبۂ شہوت اور غلبۂ غضبیہ کے لئے روک اور مانع ہے۔ اور عقل ہی اسباب وآلات اور اجسام منقادہ اور تمام اسباب عبادت کے ایجاد کا ذریعہ وسبب ہے۔ لہٰذا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے لئے بالفعل اور تمام لوگوں کے لئے بالقوۃ رحمت ہیں۔ اور بعض سب کے لئے بالفعل رحمت شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ مومن کے لئے رحمت ہیں ہدایت کے ذریعہ اور منافق کے لئے رحمت ہیں قتل سے امان کے سبب اور کافروں کے لئے رحمت ہیں عذاب سے تاخیر ہونے کی وجہ سے۔ دنیا میں ان پر عذاب کی جلدی کرنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کو قتل ونہب کرنا اور مفسدوں کو ہلاک کرنا بھی رحمت ہے۔ کیونکہ اس میں نظام عالم اور درستی واصلاح کا ترتب موقوف ہے۔ جس طرح کہ درخت سے خراب وخشک شاخوں کا کاٹنا کہ وہ دیگر شاخوں کی درستگی واصلاح اور پھل لانے کا سبب ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے لئے بھی رحمت ہیں۔ اور کافروں کے لئے بھی۔ اس لئے کہ انہیں سلامت رکھا ہے اس عذاب سے جو ان کے سوا جھٹلانے والی امتوں کو پہنچا تھا۔

احادیث میں مذکور ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے دریافت فرمایا کہ کیا تمہیں بھی میری رحمت کا حصہ ملا ہے عرض کیا ہاں! میں خوفزدہ رہتا تھا اپنے انجام سے اب میں بےخوف ہو گیا ہوں کیونکہ حق تعالیٰ نے اپنے ارشاد میں (جو کہ آپ پر نازل ہوا) میری تعریف فرمائی ہے فرمایا "ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ۔" قوت والا، عرش کے پاس مقیم، اطاعت گزار وہاں امانتدار اور جبریل علیہ السلام کا یہ خوف بارگاہ اقدس کی شانِ بے نیازی کی وجہ سے ہے جو کہ مقربان بارگاہ سے کبھی بھی جدا نہیں ہوتا۔

عرفاء فرماتے ہیں کہ جس دن سے ابلیس ملعون راندۂ درگاہ ہوا۔ عالم ملکوت کے رہنے والوں کا سکون جاتا رہا۔ ہمیشہ خوف زدہ رہنے لگے۔ اگرچہ بموجب وعدہ صادق امن وسکون میں رہنے کا بھروسہ ہے۔ جیسا کہ صحابہ کرام کے اصحاب مشورۃ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کوئی کہتا ہے کہ "کاش میں درخت ہوتا کہ کاٹ ڈالا جاتا۔ اور کوئی کہتا ہے کہ کاش میں گوسفند ہوتا کہ لوگ ذبح کر کے کھاجاتے۔"

فائدہ:۔ انبیاء عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے یہ اقوال کہ "لَآ اَخَافُ مَا تُشْرِکُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ" (میں نہیں خوف کرتا اس سے جسے تم شریک گردانتے ہو مگر یہ کہ میرا رب چاہے) اور یہ کہ "وَمَا یَکُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَآ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا (اور نہیں ہے ہمارے لئے یہ کہ ہم تمہارے دین میں آئیں مگر یہ کہ اللہ چاہے جو ہمارا رب ہے) یہ اسی قبیل سے ہیں۔

صاحب کشاف زمخشری کا اس آیت سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جبریلؑ کی افضلیت پر تمسک واستدلال کرنا کتنا ضعیف و کمزور ہے وہ اتنا نہ جان سکا کہ جبریل علیہ السلام کو یہ صفات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کے طفیل میں حاصل ہوئی ہیں۔ اور اتنا نہ سمجھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جتنا کمالِ صفت حاصل ہے اس کے پہلو میں جبریل علیہ السلام کی یہ صفت کہ "ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ" مضمحل اور کم حیثیت ہے اور جبریل علیہ السلام کی صفات گنتی کی ہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کا تو احصا و شمار دشوار اور ناممکن ہے نیز یہ کہ دو شخص میں سے کسی ایک میں کسی خاص صفت کے بیان کرنے سے لازم نہیں آتا کہ دوسرے شخص میں بھی وہ صفت نہیں ہے۔ ہاں اقتضائے مقام کے لحاظ سے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی فضیلت قرآن کریم میں بیان کر کے ان کی طرف نسبت کی گئی ہے۔ اور جب کہ نص قرآنی سے یہ ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم "رحمۃ للعالمین" ہیں۔ اور ملائکہ بھی از زمرۂ عالمیان ہیں تو ثابت وواجب ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے افضل ہیں۔ اور خود مفسرین رحمہم اللہ کی ایک جماعت ان صفات کو یعنی "ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ" کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر محمول کرتے ہیں اور "اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ" (یہ عزت والے رسول کا فرمان ہے) میں رسول کریم سے مراد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیتے ہیں۔

بعض علماء حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود گرامی سے اجزائے عالم میں رحمت کے حاصل ہونے کے بارے میں کہتے ہیں کہ مٹی کو آپ کی رحمت یہ ملی کہ وہ مطہر یعنی پاک کرنے والی ہوگئی اور پانی کو طوفان سے روک دیا گیا۔ اور ہوا شیاطین کے راستے سے سلامت ہوگئی اور آندھی کے ذریعہ کفار کو ہلاک کرنے سے محفوظ ہوگئی اور آگ صدقات کے جلانے سے بچ گئی۔ اور آسمان شیاطین کا اس تک پہنچنے اور باتوں کو چوری چھپے سننے سے محفوظ ہوگیا۔

ایک شخص نے اس بندۂ مسکینؒ (یعنی شیخ محدث دہلوی رحمہ اللہ) سے دریافت کیا کہ ابلیس کو اس رحمت سے کیا چیز ملی میں نے جواب دیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دبدبہ، شوکت، ہیبت، اور حقانیت کے صدمے اور "جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ" (حق آیا اور باطل نابود ہوا) اور حسب ارشاد باری تعالیٰ "فَیَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ" تو اس سے ملعون کا وجود ناپید ونابود ہوجاتا۔ اور قیامت تک اس کے باقی رہنے کے لئے انتظار کا حکم جو واقع ہے وہ متغیر ومنسوخ ہوجاتا۔ لہٰذا یہ رحمت ہی کا اثر ہے کہ وہ باقی رہا۔

بیان نور وسراج:۔ حق سبحانہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی انتہائی روشن اور منور ہونے کی بنا پر نور اور سراج منیر رکھا۔ اس لئے کہ آپ کے ذریعہ قرب ووصالِ حق کا طریقہ روشن وظاہر ہوا اور آپ کے جمال وکمال سے آنکھوں میں بینائی اور روشنی حاصل ہوئی۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:۔

قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ ۝ بیشک تمہارے پاس اللہ کی جانب سے نور اور روشن کتاب آئی۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝ اے نبی ہم نے آپ کو گواہی دینے والا (حاضر وناظر)، بشارت دینے والا، ڈرانے والا، اللہ کے حکم سے اس کی طرف بلانے والا اور روشن چراغ بھیجا۔

علماء فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے آپ کو چراغ (سراج) سے تشبیہ دی۔ باوجودیکہ تشبیہ میں مبالغہ شمس وقمر سے زیادہ ہے۔ چراغ سے تشبیہ دینے میں حکمت یہ ہے کہ آپ کا وجود عنصری ارضی ہے۔ دوسری حکمت یہ کہ چراغ اپنا قائم مقام بناتا ہے۔ چنانچہ ایک چراغ سے لاکھوں چراغ روشن کئے جاسکتے ہیں۔ اس کے برعکس چاند وسورج قائم مقام نہیں رکھتے۔ بیت ؎

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پرتوِ آں   ہر کجامی نگری انجمنے ساختہ اند

بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ حق تعالیٰ نے جو سراج سے تشبیہ دی ہے اس سے مراد تشبیہ ہے تو بعید نہ ہوگا اس لئے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے آفتاب کو سراج فرمایا ہے۔ ارشاد ہے "وَجَعَلَ فِيْهَا سِرَاجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا" (اور بنائے آسمان میں آفتاب وماہتاب روشن) اور فرمایا "وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا" اور بنایا آفتاب کو چمکتا دمکتا لہٰذا جس طرح عالم اجسام میں آفتاب افادۂ نور کرتا ہے اور اپنے غیر سے مستفید نہیں ہے اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود قدسی تمام نفوس بشریہ کے لئے افادۂ انوار عقلیہ فرماتا ہے اور بجز ذات باری تبارک وتعالیٰ کے کسی سے استفادہ نہیں فرماتا۔ اس اعتبار سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ذات الٰہی سے استفادہ فرماتے ہیں۔ اگر چاند سے تشبیہ دی جائے تو بھی درست ہوگا۔ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو "نور" فرمانے میں اپنے اس ارشاد سے تلمیح ہے کہ "اللہ نور السموات والارض" "اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے۔ لہٰذا آسمان وزمین میں نہیں ہے مگر نورِ الٰہی جو تمام موجودات میں ہویدا ہے اور وہی وجود وحیات کا مالک ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جمال وکمال اس نور الٰہی کا مظہر اتم اور اس کے ظہور کا واسطہ ہے۔ چنانچہ "مثل نورہ الآیہ" کی تفسیر میں مفسرین کہتے ہیں کہ قلبِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایمان کی مثال، اس مشکوٰۃ کی مانند ہے جس میں شمع روشن ہو۔ مشکوٰۃ آپ کے صدر مبارک کی مثال ہے اور زجاجہ، آپ کے قلبِ اطہر کی مثال ہے اور مصباح، آپ کے قلب شریف میں جو نورِ معرفت وایمان ہے اس کی مثال ہے۔

اور فرمایا اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ کیا ہم نے آپ کا انشراح صدر نہ فرمایا۔
آپ کے انشراح صدر میں جو عظیم نعمت ہے۔ اس نعمت کے اظہارِ احسان کے لئے فرمایا گیا اس سے مراد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک کی وسعت اور کشادگی ہے جو کہ حق تعالیٰ سے تمام مناجات اور دعوتِ خلق کے مابین، معارف کے انوار اور علوم، توحید، معرفت اور عجیب وغریب اسرار اور جہل ونکرت کی تنگی اور اعراض عن الحق اور اس کے ماسوی سے عدم تعلق خاطر اور القائے وحی میں آسانی اور رسالت وتبلیغ کے بارہائے گراں کے برداشت کی طاقت مرحمت فرمانے کے لئے ہے۔

چنانچہ فرمایا:۔
وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِيْۤ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝ اور ہم نے آپ سے اس بوجھ کو دور کر دیا جس نے آپ کی کمر دوہری کر رکھی تھی۔

انشراح صدر کی سب سے بڑی علت وغرض وہ نور ہے جو بندہ کے دل میں تاباں ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ "وَاِذَا دَخَلَ النُّوْرُ الْقَلْبَ اِنْفَسَحَ وَانْشَرَحَ" اور جب نور دل میں داخل ہو جاتا ہے تو وہ اسے کشادہ اور وسیع کر دیتا ہے اور اس کی بہترین خوبی یہ ہے کہ وہ دل کو

صفات ذمیمہ اور بری خصلتوں سے پاک وصاف کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس صفت میں سب سے کامل واتم اور اعلیٰ وافضل، سید السادات فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ اور آپ کے متبعین میں بقدرِ متابعت و محبت ان کو بھی اس میں سے حصہ ملتا ہے۔ اس بحث کو تفصیل کے ساتھ کتاب "سفرالسعادۃ" اور بعض رسائل فارسیہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ" ہم نے آپ کے نام اور آپ کے ذکر کو دنیا و آخرت میں نبوت وشفاعت کے ساتھ بلند فرمایا ہے۔ اور آپ کے اسم گرامی کو اپنے اسم جلالت کے ساتھ کلمہ اسلام، اذان، نماز، اور تمام خطبات میں شامل و جزو قرار دیا۔ کوئی بھی خطبہ دینے والا، تشہد پڑھنے والا اور نماز ادا کرنے والا ایسا نہ ہوگا جو "اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ" نہ کہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جبریل نے آکر عرض کیا کہ پروردگارِ عالم فرماتا ہے آپ جانتے ہیں کہ کس چیز کے ساتھ آپ کے ذکر کو میں نے بلند فرمایا ہے۔ میں نے کہا اللہ تعالیٰ ہی زیادہ جانتا ہے کہا اس طرح پر کہ "اِذَا ذُکِرْتُ ذُکِرْتَ مَعِیَ۔" جب میرا ذکر ہو تو میرے ساتھ آپکا ذکر کیا جائے۔ اور میں نے پورے ایمان کو آپ کے ذکر کے ساتھ اپنے ذکر کی معیت میں لازم کیا ہے یعنی "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" اور کہا میں نے آپ کے ذکر کو اپنا ذکر، آپ کی طاعت کو اپنی طاعت قرار دیا ہے۔ لہٰذا جو کوئی بھی آپ کا ذکر کرے گا وہ میرا ہی ذکر ہوگا۔ اور آپ کی طاعت میری ہی طاعت ہوگی "مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ" جس نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اور آپ کی متابعت کو اپنی محبت کا مستلزم قرار دیا "فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ" (فرمادو) میری اتباع کرو۔ اللہ تمہیں محبوب بنالے گا۔

ندا بذکر صفات۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو قدر و منزلت اور اعزاز و اکرام ہے اس کا اثر یہ ہے کہ حق تعالیٰ ندا کے وقت آپ کو وصفِ نبوت و رسالت کے ساتھ مخاطب فرماتا ہے چنانچہ فرمایا "یٰۤاَیُّھَا النَّبِیُّ۔ یٰۤاَیُّھَا الرَّسُوْلُ" (اے نبی، اے رسول، صلی اللہ علیہ وسلم) اور دیگر تمام نبیوں کو ان کے ناموں کے ساتھ یاد فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ یا آدم، یا نوح، یا موسیٰ، یا عیسیٰ اور "یٰۤاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ" (اے جھرمٹ مارنے والے) "یٰۤاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ" (اے چادر اوڑھنے والے) جیسے محبت آمیز الفاظ سے مخاطب فرمانا یہ اربابِ ذوق اور اہل محبت پر ظاہر ہے کہ اس میں کتنی محبت، پیار اور مہربانی جلوہ گر ہے۔ ابو نعیم نے بروایت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نقل کیا کہ فرمایا جب آدم علیہ السلام کو زمین ہند میں اتارا گیا تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ جبریل علیہ السلام نیچے آئے۔ اور اذان شروع کی اور کہا اللہ اکبر دوبار، اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دوبار، وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ دوبار آخر حدیث تک۔ اور آپکا اسم شریف عرش پر، ہر آسمان پر، جنت میں ہر جگہ اور حوروں کی گردنوں میں لکھا ہوا ہے۔ اور جنت میں کوئی درخت ایسا نہیں ہے جس کے پتے پتے پر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ نہ لکھا ہو۔

بزار بروایت سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نقل کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ جب مجھے آسمان کی طرف لے جایا گیا تو کوئی آسمان نہ گزرا مگر یہ کہ میں نے اپنا نام وہاں پایا وہاں لکھا ہوا تھا "محمد رسول اللہ" اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اسمِ گرامی سے آپ کے نام کو مشتق فرمایا جیسا کہ حسان بن ثابت فرماتے ہیں ع "فَذُوالْعَرْشِ مَحْمُوْدٌ وَّھٰذَا مُحَمَّدٌ" لہٰذا صاحب عرش کا نام محمود ہے۔ اور آپ کا نام محمد ہے صلی اللہ علیہ وسلم اور یہ کہ حق تعالیٰ نے اپنے اسماء حسنیٰ میں سے ستر ناموں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے موسوم فرمایا جیسا کہ انشا اللہ تعالیٰ اسماء شریفہ کے باب میں آئے گا۔

حق تعالیٰ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم یاد فرمانا۔ وصل:۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مناقب جلیلہ میں سے حق تعالیٰ جل اسمہ کا آپ کی عظمت اور قدر و منزلت کی قسم یاد فرمانا ہے۔ چنانچہ فرمایا "لَعَمْرُکَ اِنَّھُمْ لَفِیْ سَکْرَتِھِمْ یَعْمَھُوْنَ"

قسم ہے آپ کی عمر کی، بے شک یہ اپنے نشے میں بہک رہے ہیں۔ جمہور مفسرین کا یہ مذہب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدتِ حیات وبقا کی قسم یاد فرمائی ہے۔ اس میں انتہائی تعظیم اور غایت درجہ احسان وبزرگی ہے جس طرح محبّ اپنے محبوب کی قسم کھاتے وقت کہتا ہے تیرے سر کی قسم، تیری زندگی کی قسم وغیرہ۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک کوئی ذات، حضور اکرم رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ گرامی تر پیدا نہ ہوئی۔ کیونکہ اس نے آپ کی حیات طیبہ کی قسم یاد فرمائی حالانکہ کسی اور کی ذات اور اس کی حیات کی قسم یاد نہ فرمائی۔

اور ابو الجوزاء، جو کہ بزرگ ترین تابعین میں سے ہے فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا کسی کی ذات کی قسم یاد فرمانا بجز سیدِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واقع نہیں ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک آپ کی ذات گرامی ساری مخلوق سے بزرگ تر اور افضل ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کی قسم یاد فرمانا بیانِ صریح ہے ہمیں کب جائز ہے کہ ہم آپ کی حیاتِ مبارکہ کی قسم کھائیں۔

فائدہ:۔ امام احمد رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کی قسم کھائی اس پر ایفا واجب ہو جاتا ہے اور اس قسم کے توڑنے پر کفارہ واجب ہوتا ہے اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی، شہادت کے دو رکنوں میں ایک رکن ہے۔

اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے قسم کا رواج آج تک جاری ہے۔ اور اہلِ مدینہ ہمیشہ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم کھایا کرتے ہیں۔ اور ان کا معمول ہے وہ کہتے ہیں کہ اسی ذات کی قسم جو اس قبرِ انور میں پوشیدہ ہے۔ اور اس ذات کی قسم جسے اس قبرِ انور نے چھپایا ہے۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔

اللہ تعالیٰ نے ایک قسم اس طرح یاد فرمائی کہ اپنی ربوبیت کو اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کر کے قسم یاد کی۔ جیسے "فوربک" قسم ہے آپ کے رب کی۔

اور "یٰس والقرآن الحکیم" (قسم ہے حکمت والے قرآن کی) میں مفسروں کا اختلاف ہے اکثر کا مذہب یہ ہے کہ یٰس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی ہے جس طرح "طٰہٰ" ہے۔

سیدنا امام جعفر صادق سلام اللہ علیہ وعلی آبائہ واولادہ الکرام سے منقول ہے کہ یٰس سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی اور خطاب ہے یعنی اے سید وسردار، بعض کہتے ہیں کہ لغت نبطی میں اس کے معنی "اے رجل" یا "اے انسان" ہے۔ بہر تقدیر اس سے مراد ذات پاک مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے خواہ اس سے قسم مراد ہو یا ندا۔ یہ بھی آپ کی تعظیم اور علو شان کو متضمن ہے اور قرآن عظیم کے ساتھ قسم یاد کرنا۔ آپ کی رسالت کی تحقیق اور آپ کی ہدایت پر شہادت وگواہی کے لئے ہے۔ یعنی آپ صراطِ مستقیم پر گامزن ہیں۔ اور اس میں نہ کجی ہے اور نہ حق سے انحراف۔

شہر حرام کی قسم:۔ علماء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کسی نبی کی رسالت کی قسم یاد نہ فرمائی بجز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور سورۃ مبارکہ "لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ" (قسم ہے مجھے اس شہر کی کیونکہ آپ اس شہر میں تشریف فرما ہیں) اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم وتکریم کی زیادتی ہے کہ حق تعالیٰ نے قسم کو اس شہر سے جس کا نام بلدِ حرام اور بلدِ امین ہے مقید فرمایا ہے اور جب سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شہر مبارک میں نزول اجلال فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ

شہر معزز و مکرم ہوگیا۔ اور اسی مقام سے یہ مثل مشہور ہوئی کہ "شَرَفُ الْمَکَانِ بِالْمَکِیْنِ" یعنی مکان کی بزرگی رہنے والے سے ہے۔

اور آیہ کریمہ "وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ (قسم ہے والد کی اور جوان کے فرزند ہیں ان کی قسم) میں اگر والد سے مراد حضرت آدم علیہ السلام اور "وماولد" سے مراد ان کی نسل ہو تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عموم نسل میں داخل ہیں۔ اور اگر والد سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام اور "ماولد" سے مراد ان کی اولاد ہو تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہوں گے۔ غرض کہ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی دو مرتبہ قسم یاد فرمائی ہے۔

مواہب لدنیہ میں علماء بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا بابی انت وامی یا رسول اللہ، اے اللہ کے رسول! آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں۔ آپ کی فضیلت خدا کے نزدیک اس مرتبہ تک تحقق ہوگئی ہے کہ حق تعالیٰ آپ کی زندگانی کی قسم یاد فرماتا ہے اور کسی نبی کی زندگانی کی قسم یاد نہیں فرماتا۔ اور حق تعالیٰ کے نزدیک آپ کی فضیلت اس حد تک ہے کہ وہ فرماتا ہے "لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ" قسم ہے مجھے اس شہر کی یعنی اس شہر کی زمین کی قسم یاد فرماتا ہے جو آپ کے قدموں کے نیچے پامال ہوتی ہے۔ گویا کہ آپ کے خاک پاء کی قسم یاد فرمائی ہے۔ ظاہر نظر میں یہ لفظ جناب باری عزاسمہ کی نظر میں سخت معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ انہوں نے کہا "رسالت مآب کے خاکِ پاء کی قسم یاد فرماتا ہے" لیکن نظر بحقیقت ہر غبار سے یہ معنی پاک وصاف ہیں اس کی تحقیق یہ ہے کہ رب العزت جل جلالہ کا اپنی ذات وصفات کے سوا کسی غیر چیز کی قسم یاد فرمانا، اظہار شرف وفضیلت دیگر اشیاء کے مقابلے میں اس چیز کو ممتاز کرنے کے لئے ہے، جو لوگوں میں موجود ہے۔ تاکہ لوگ جان سکیں کہ یہ چیز نہایت عظمت وشرافت والی ہے تفصیل کلام یہ ہے کہ رب العزت جل وعلا نے کئی مرتبہ متعدد چیزوں پر قسم یاد فرمائی ہے۔ کبھی اپنی ذات وصفات کے ساتھ قسم یاد فرمائی اور کبھی ان بعض مخلوقات کی قسم یاد کی جو ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کی عظمت پر دلیل ونشان کے قبیل سے ہیں۔ جیسے آسمان، زمین، دن اور رات وغیرہ کہ یہ اس کی آیات عظیمہ اور دلائلِ قدرتِ خارجہ میں ہیں۔ نجوم، کواکب، شمس وقمر یہ سب مطالع انوار، مظاہر اسرار اور عالم کو روشن کرنے، نسل انسانی کی مصلحتوں کو منضبط کرنے اور راہ معلوم کرنے کے اسباب وعلل اور شیاطین کو مار بھگانے کے موجب ہیں۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جن کے اسرار کے ادراک سے کوتاہ بینوں کی نظریں عاجز وقاصر ہیں۔ پروردگارِ عالم جل جلالہ نے ان کی قسم یاد فرمائی ہے مثلاً والتین والزیتون (الآیہ) قسم ہے انجیر کی اور قسم ہے زیتون کی۔ کون جان سکتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان میں کتنی حکمتیں ودیعت فرمائی ہیں اور کتنے اسرار پنہاں فرمائے ہیں۔ یہ سب اظہار فضیلت اور بہ نسبت دیگر اشیاء کے انہیں ممتاز فرمانے کے لئے ہے۔ یہی حال آدمیوں کی قسم کا ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی ذات وصفات کے ساتھ قسم یاد فرمائی۔

زمانہ کی قسم:۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔" قسم ہے عصر کی بلاشبہ انسان یقیناً نقصان میں ہے الآیات۔

عصر کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ عصر سے مراد زمانہ ہے لیکن صراح میں ہے کہ دن رات کی گردش کا نام عصر ہے اور اسی کو دہر یعنی زمانہ بھی کہتے ہیں اور دہر عجیب وغریب واقعات وحادثات پر مشتمل ہے۔ جن کے بیان واحصار سے زبان قاصر ہے "لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فَاَنَا الدَّهْرُ" (زمانہ کو برا نہ کہو کیونکہ زمانہ میں ہوں) سے دہر مشرف ہے۔ اس میں خوشی وضرر، صحت وبیماری، آفات وخطرات، برکات وکمالات تمام شامل ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ　　بلاشبہ انسان یقینی نقصان میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک کام کیئے۔

لہٰذا حق تعالیٰ نے اس جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی قسم فرمائی ہے جس طرح لااقسم بہذا البلد (قسم ہے مجھے اس شہر کی) میں آپ کے مکان کی اور "لعمرک" میں آپ کی زندگانی کی قسم فرمائی گئی ہے۔ اور "الٓمٓ" کی تفسیر میں بھی کئی قول ہیں ایک قول یہ ہے کہ الف سے مراد اللہ کی طرف اشارہ کرنا اور لام سے جبریل اور میم سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ اور "قٓ" میں ایک قول کے بموجب اس سے قلب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت ہے۔ اس بناء پر کہ مشاہدہ و مکالمہ میں آپ تحمل فرماتے ہیں۔ اور "والنجم اذا ھویٰ" کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ "النجم" سے مراد قلب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور "اذا ھویٰ" سے انشراح صدر بالانوار اور انقطاع عن غیر اللہ مراد ہے۔ اور ھویٰ کے معنی اترنے کے بھی آتے ہیں۔

اور سورہ "والفجر" (قسم ہے صبح روشن کی) کی تفسیر میں کہتے ہیں فجر سے مراد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ آپ سے نور کی جھڑیاں برستی ہیں اور قول حق سبحانہ وتعالیٰ "وَمَآ اَدْرٰىکَ مَا الطَّارِقُ النَّجْمُ الثَّاقِبُ" (اور کچھ تم نے جانا وہ رات کو آنے والا کیا ہے خوب چمکتا تارا) اس سے بھی مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس لیتے ہیں اور سورۂ نون میں "نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ" (قسم ہے قلم کی اور جو وہ لکھتے ہیں) حق تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نفی جنون پر قسم یاد فرمائی ہے اور ثبوت، اجر غیر ممنون "یعنی غیر مقطوع اجر یعنی نہ ختم ہونے والا اجر ثابت ہے اور خلق عظیم پر آپ کا ثبات واستقرار ثابت ہے۔ "نون" اسماء حروف سے ہے جس طرح الٓمٓ وغیرہ یا تو یہ سورتوں کے نام ہیں یا یہ اسماء الٰہی میں سے ہیں۔ جیسا کہ حروف مقطعات کی تاویل میں مفسرین کے اقوال ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ نون مچھلی کا نام ہے۔ اور وہ مچھلی مراد ہے جس کے اوپر زمین ہے اور اس کا نام بہموت ہے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ فرمایا نون سے مراد دوات ہے لہٰذا دوات و قلم اور جو کچھ وہ لکھیں کہ اسکی منفعت بہت عظیم ہے اور ایک قول یہ ہے کہ نون، نور کی ایک تختی ہے۔ جس پر فرشتے قلم کے ساتھ اللہ تعالیٰ جو انہیں حکم فرمائے لکھتے رہتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ قلم یکے از آیات الٰہی ہے اور اولین مخلوقات میں سے ہے۔ اور اسکے ذریعہ حق تعالیٰ نے مخلوق کی تقدیریں قلم بند کرائیں۔

فائدہ: اس جہان کا قلم، اسی قلم اعلیٰ کا نمونہ ہے جس کے ساتھ خدا کی شریعت اور حق تعالیٰ کی وحی لکھی جاتی۔ اسی کے ذریعہ دین وملت کو احاطہ میں لایا جاتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ علوم کو منضبط اور مدون کیا جاتا ہے۔ پچھلوں کی خبریں اور ان کے مقالات اس سے قلم بند کئے جاتے ہیں اور اس کے ذریعہ نازل کردہ کتابیں اور آسمانی صحیفے لکھے جاتے ہیں۔ اگر قلم نہ ہوتا تو دنیا و آخرت کے امور دینی اور دنیوی برقرار نہ رہتے۔ صاحب کشاف نے تفسیر سورۂ اقرا دربیان عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (سکھایا قلم سے) میں لکھا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی دقیق حکمتوں اور اس کی لطیف تدبیروں پر قلم اور خط کے سوا دوسری کوئی دلیل نہ ہوتی تو یہی کافی ہوتا اور قلم کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ حمد الٰہی اور نعت مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم، کتاب اللہ کی تفسیر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی شرح اولیاء کرام کے مقالات اور ان کی نصیحتیں لکھی گئیں۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ فَوَيْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ

تو افسوس ہے ان پر جو اپنے ہاتھوں سے لکھ کر کہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ ان سے کچھ رقم لے سکیں۔ افسوس ہے ان کے لئے جو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا اور افسوس ہے ان کیلئے جو وہ کمائیں

اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا۔

وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ

اور کہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں اور کہتے ہیں اللہ پر جان بوجھ کر جھوٹ۔ (اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے پناہ میں

(اعاذنا من ذالك) رکھے۔ آمین)

کفار، غایت جہل و حماقت اور عناد و تکبر سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جنون وغیرہ کو منسوب کرتے تھے۔ حالانکہ آپ کے معارضہ و مقابلہ میں کفار کے تمام عقلاء و فصحاء عاجز آ گئے تھے۔ حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ سے وہ کچھ سیکھا اور سمجھا جہاں تک عالم کی عقلوں کا گزر نہ ہو سکتا تھا۔ اور آپ وہ کتاب لے کر تشریف لائے جس کے مقابلہ و معارضہ سے فصحاء و بلغاء عاجز رہ گئے۔ اس کے بعد حق تعالیٰ نے اس عطا کی تعریف و ثنا فرمائی جو اس کے تمام عطیوں میں سب سے عظیم ہے۔ فرمایا "اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ" بلاشبہ آپ کی خوبو بہت بڑی ہے۔ یہ آپ کی نبوت و رسالت کی سب سے بڑی نشانیوں میں سے ہے۔ سیدہ عائشہؓ خلق عظیم کی تفسیر میں فرماتی ہیں، "کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْاٰن" آپ کا خلق قرآن تھا۔

تکریم و تنزیہہ اور تعظیم الٰہی و وعدۂ اعطائے نعم۔ اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی قدر و منزلت آپ کی تعظیم و تکریم اور تنزیہہ و پاکی پر مشتمل ہے یہ اس کی نعمتوں اور رحمتوں پر دلالت کرتی ہے۔ اور نعمت غیر متناہی عطا فرمانے کا وعدہ کیا گیا ہے "سورۃ الضحیٰ" میں حق تعالیٰ نے دن و رات کی قسم یاد فرمائی۔ جو کہ مظہر آیات الٰہی ہیں۔ اور اس میں اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا و آخرت میں احوال شریف کی خبر دی گئی ہے۔ فرمایا "مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی" اے حبیب آپ کو آپ کے رب نے نہ چھوڑا۔ اور نہ دشمن بنایا جب سے کہ آپ کو برگزیدہ فرمایا۔ مفسرین "ضحیٰ" کو آپ کے روئے عالم آرا سے اور "لیل" کو آپ کے گیسوئے عنبریں سے تعبیر کرتے ہیں جیسا کہ امام فخر الدین رازی نے نقل کیا ہے۔ اس سورت کے بہ سلسلۂ شان نزول اپنی تفسیر میں بیان کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ تک سلسلہ وحی کسی سبب یا کسی مصلحت کی بناء پر بند رہا اس پر مشرکین چہ میگوئیاں کرنے لگے اور کہنے لگے کہ ان کے رب نے محمد کو چھوڑ دیا اور ان کو دشمن بنا دیا (معاذ اللہ)

وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی ۝ اور آپ کی آنے والی گھڑی پچھلی سے افضل ہے۔

مطلب یہ کہ ہر آن مراتب، درجات اور وہ نعمتیں جو حق تعالیٰ نے آخرت میں رکھی ہیں مثلاً شفاعت و مقام محمود وغیرہ۔ وہ دنیا میں عطا کردہ نعمتوں سے بہتر و عالی تر ہیں۔ کیونکہ دنیا اپنی تنگی اور گنجائش نہ رکھنے کی بنا پر اس کی جگہ نہیں رکھتی "اِذَا رَاَیْتَ ثَمَّ رَاَیْتَ نَعِیْمًا وَّمُلْکًا کَبِیْرًا" جب آپ دیکھیں گے تو اس جگہ بڑی بڑی نعمتیں اور بہت بڑا ملک دیکھیں گے۔

یا یہ کہ آپ کے امر کی انتہاء، ابتدا سے بہتر ہے۔ اس لئے کہ آپ کی ہر گھڑی، مراتب کمال اور فیضانِ عطا میں ترقی و عروج پر ہے۔ اور دنیا و آخرت میں جود و کرم اور بخشش و عطا اور وجوہِ کرامت، انواع سعادت میں یہ آیۂ کریمہ جامع ہے کیونکہ فرمایا۔

وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی ۝ عنقریب آپ کا رب آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے

مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کیا جا رہا ہے کہ میں آپ کو اتنا عطا کروں گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔ اس کا بیان حد و شمار اور حصر و احصار سے باہر ہے۔ اور شفاء شریف میں بعض اہل بیت نبوت سلام اللہ علیہم اجمعین سے منقول ہے کہ قرآن کریم میں اس آیت سے زیادہ کوئی دوسری آیت موجبِ رضا نہیں ہے اس لئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک کہ ایک ایک امتی کو آتش دوزخ سے نہ نکال لیں۔

بندۂ مسکین یعنی شیخ محقق شاہ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیۂ کریمہ۔

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو بیشک اللہ تمام گناہوں کو بخش دے گا۔

بھی موجب رجا اور باعث امیدواری ہے۔

فائدہ :۔ لیکن یہ آیت گناہوں کی مغفرت پر منحصر ہے۔ اور وہ آیت یعنی "وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ" رفع درجات اور حصول مراتب کی امید رکھنے میں بہت ہے "بُشْرَىٰ لَنَا مَعْشَرَ الْإِسْلَامِ" اے گروہ مسلمانان ہمارے لئے خوشی ہو۔

"إِنَّ لَنَا مِنَ الْعِنَايَةِ رُكْنًا غَيْرَ مُنْهَدِمِ" بے شک ہمارے لئے عنایت کا ایسا کنارہ ہے جو غیر متزلزل ہے۔

صاحب مواہب لدنیہ پر تعجب ہے کہ انہوں نے کہا کہ۔ جو جاہل لوگ "حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کسی امتی کو دوزخ میں داخل کئے جا[نے پر] راضی نہ ہوں گے۔ یہ شیطان کا دیا ہوا فریب ہے وہ ان کے ساتھ کھیل وتمسخر کرتا ہے۔ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر اس چیز پر راضی ہیں جس پر اللہ عزوجل راضی ہے۔ حق سبحانہ وتعالیٰ گناہ گاروں کو دوزخ میں رکھے گا۔ اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم خدا کو اور اس کے حق کو خوب پہچانتے ہیں۔ وہ اس سے بری ہیں کہ وہ خدا سے یہ کہیں کہ میں اس پر رضامند نہیں ہوں کہ میری امت میں سے کسی کو دوزخ میں داخل کرے یا اس کا وہاں ٹھکانہ بنادے بلکہ رب العزت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شفاعت کا اذن دے گا۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر اس شخص کی شفاعت کریں گے جسے خدا چاہے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی شخص کی شفاعت کریں گے جس کے بارے میں اذن ورضا حاصل ہوگی۔ انتہی کلامہ۔

پوشیدہ نہیں رہنا چاہئے کہ شفاعت والی حدیث میں آیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مختلف گناہ گار لوگوں مثلاً زناکار، چوری کرنے والے اور شراب پینے والے وغیرہ کی شفاعت کریں گے۔ پھر ان میں سے وہ لوگ باقی رہ جائیں گے جن میں رائی کے دانہ کے برابر یا حبہ کی برابر ایمان ہوگا۔ اور کوئی نیکی بجز رائی کے برابر ایمان کے نہ ہوگی۔ ان کے لئے اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ میرے بندے ہیں اور میرے خاص ہیں میں ان کے لئے اپنے آپ سے شفاعت کروں گا تو وہ بخشے جائیں گے اور دوزخ سے نکالے جائیں گے۔ یہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شفاعت کبریٰ کا ثمرہ ہوگا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

فائدہ :۔ یہ ظاہر ہے کہ شفاعت باری تعالیٰ کے اذن اور رضا کے بغیر نہ ہوگی لیکن حق تعالیٰ اپنے اس وعدہ کے بموجب جو دنیا میں آپ سے راضی کرنے کا دیا ہے۔ شفاعت کا اذن اور رضا مرحمت فرمائے گا۔ اور مواہب لدنیہ جس کا قول نقل ہوا ہے اس کی مراد دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے کے لئے ہے اور یہ مسلم ہے کہ گناہ گار ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دوزخ میں نہ رہیں گے۔ اور اس قول میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کسی امتی کے دوزخ میں داخل ہونے سے راضی نہ ہوں گے دوسرے یہ کہ اپنے کسی امتی کے دوزخ میں باقی رہنے پر راضی نہ ہوں گے۔

اس کے بعد سورۂ "والضحیٰ میں" ان نعمتوں کا بیان ہے۔ جو آپ کے ابتدائی احوال کے مطابق انعام واکرام فرمائی گئیں تاکہ معلوم ہوجائے کہ آخر میں بھی ایسا ہی اور اسی طرح خدا کا انعام واکرم رہے گا۔

"لَقَدْ أَحْسَنَ اللّٰهُ فِيمَا مَضَىٰ وَكَذٰلِكَ يُحْسِنُ فِيمَا بَقِيَ" بلاشبہ اللہ نے ماضی میں بہت خوب کیا اسی طرح حال ومستقبل میں بھی خوب اچھا کرے گا۔ مطلب یہ کہ سب کے ہاتھ کھینچ جانے اور یتیمی وبیکسی کے بعد بھی اپنی شفقت وعنایت کے دامن میں پرورش فرمائی اور مقام عطا فرمایا۔

بعض کہتے ہیں کہ یتیم کے معنی یگانہ اور بے نظیر کے ہیں۔ گویا آپ کی ذات گرامی کو ان جاہلوں کے درمیان جو جہالت کی گھاٹیوں اور گمراہی کے گڑھوں میں پڑے ہوئے تھے نفیس تر اور بے نظیر پایا۔ اور ان میں سے آپ کو نکال کر علم اور مقام ہدایت کی فضا میں داخل فرمایا۔ اور آپ کے قلب انور کو قناعت وبے نیازی کی دولت سے مالا مال کر کے اموال وغنائم عطا فرما کر غنی بنایا۔ اور جب آپ کو صغرسنی، بیکسی اور یتیمی میں مہجور اور محروم نہ چھوڑا تو نبوت ورسالت سے اختصاص کے بعد آپ کو کیوں چھوڑے گا۔

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ــــــــ تو اپنے رب کی نعمتوں کا خوب چرچا کرو۔

اس لئے کہ اظہارِ نعمت اور تحدیثِ نعمت، شکر گزاری اور احسان شناسی کا موجب ہے۔ اور شرائع و احکام کا پہنچانا اور لوگوں کی تعلیم و ہدایت فرمانا بھی تحدیث نعمت ہی کے قبیل سے ہے۔

سورۂ والنجم:۔ "سورۂ والنجم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضل و شرف اور آپ کی علامتوں پر اس طرح مشتمل ہے کہ ان کا شمار و احصار ناممکن ہے پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے النجم کی قسم یاد فرمائی۔ نجم سے مراد ستاروں کی جنبش یا ثریا ہے اکثر اسے بنات یا قران کے نام سے بولتے ہیں۔ نجماً نجماً یعنی تھوڑا تھوڑا نازل ہوا یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم شبِ معراج آسمان سے نیچے تشریف لائے یا قلب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ مشرح با نوار اور منقطع از اغیار ہے۔ اور وہ آسمان قدس سے زمینِ انس پر حضور کے ثبات پر نیچے آیا۔ اور ہدایت کا طریقہ بتایا۔ اور نفسانی خواہشات سے اسے پاک وصاف فرمایا اور حق و صداقت سے لبریز کیا۔ جیسا کہ اس پر آیتِ کریمہ شاہد ہے۔ اور ارادۂ قلب جو کہ محل صدق وہدایت ہے۔ بہت ہی مناسب ہے کہ اس پر قسم اٹھائی جائے۔

ارشاد باری تعالیٰ۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝۔ وہ کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتے وہ تو نہیں مگر وحی جو انہیں کی جاتی ہے۔

اس سے مراد قرآن ہے۔ اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر کلام اور حدیث مراد لی جائے جو کہ وحی خفی کہلاتی ہے تو دو تین مقامات کا استثناء کرنا ہوگا۔ مثلاً بدر کے قیدیوں کا واقعہ، ماریہ قبطیہ اور شہد کا واقعہ اور تابیر نخل کا قصہ اسی استثناء کے زمرہ میں آئیں گے۔ کیونکہ اس پر آگاہی واقع ہوئی ہے۔

نیز درست ہے کہ "مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى" حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کا کلام اپنا نہیں ہے بلکہ وحی ہے مواہب لدنیہ میں کہتے ہیں کہ قرآن کی طرف اعادۂ ضمیر سے یہ بہتر ہے اس لئے کہ نطق یعنی گویائی قرآن و سنت دونوں کو شامل ہے۔ اور دونوں ہی وحی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (ہم نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی) کتاب سے مراد قرآن اور حکمت سے سنت مراد ہے۔

اوزاعی، حسان بن عطیہ سے روایت کرتے ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں سنت لے کر اس طرح آتے جس طرح قرآن لے کر آتے۔ اور آپ کو تعلیم دیتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نطق، قرآن کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ آپ کا اجتہاد بھی وحی حق ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ اس آیتِ کریمہ کے بعد آپ کے فضائل میں قصہ اسریٰ یعنی شبِ معراج کا ذکر سورۂ والنجم میں کیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم "سدرۃ المنتہیٰ" تک پہنچے۔ یہ مقام مخلوق کے علوم کے پہنچنے کی انتہا ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی بصر مبارک یعنی چشم مبارک کی تشریح فرمائی کہ وہ آنکھ نہ کسی طرف پھری اور نہ حد سے بڑھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ ملاحظہ فرمایا اور جو کچھ آپ پر مقام جبروت ولاہوت سے منکشف ہوا اور جو عجائب ملکوت کا مشاہدہ فرمایا ان کو عبارت و الفاظ میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ اور افہام و عقول میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ کم سے کم کو بھی سن کر برداشت کرسکیں۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ایسے رمز و کنایہ اور اشارہ سے بیان فرمایا جو آپ کی عظمت و توقیر پر دلالت کرے۔ چنانچہ فرمایا:۔

فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى ۝ ــــــــ تو وحی فرمائی اپنے بندہ کو جو وحی فرمائی

اہلِ علم حضرات فرماتے ہیں کہ اللہ رب العزت نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے تین قسم کا کلام فرمایا ایک اس عبارت کے ساتھ جو لغتِ عرب پر ہے۔ اور جس کا ظاہر مخلوق کی سمجھ میں آتا ہے دوسرے اشاروں میں جیسے قرآن کے حروف مقطعات جن کے سمجھنے اور تحقیق کرنے کی کسی میں صلاحیت اور طاقت نہیں اور تیسرے خالص ابہام میں کلام فرمایا جو کسی کے تصور و خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ چنانچہ فرمایا۔

فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰىؕ ـــــ تو وحی فرمائی اپنے بندہ سے جو وحی فرمائی

اب رہا رؤیت کا مسئلہ! جس کا اثبات اس سورۃ میں کیا گیا ہے۔ تو اس میں مفسرین کا اختلاف ہے آیا یہ رویت جبرئل کی ہے یا رویت حق کی، دل سے ہے یا آنکھ سے متحقق قول آخر کا ہی ہے یعنی رویتِ حق بچشم سر۔

کعب احبار فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے رویت اور کلام کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان تقسیم فرمایا ہے۔ لہٰذا حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے دوبار کلام فرمایا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دوبار دیدار کرایا۔ سیدنا ابن عباس اور اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قول یہی ہے لیکن سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اس مسئلہ میں خلاف گئی ہیں۔ واللہ اعلم۔

فائدہ:۔ بہر تقدیر یہ سورۃ مبارکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتہائی فضل و کمال پر دلالت کرتی ہے۔ جو آپ کے سوا کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ اور سورۂ "اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ" میں۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍۙ ذِىْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِى الْعَرْشِ مَكِيْنٍۙ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍؕ بیشک یہ عزت والے رسول کا پڑھنا ہے جو قوت والا ہے مالک عرش کے حضور عزت والا وہاں اس کا حکم مانا جاتا ہے۔

بعض مفسرین کے نزدیک یہ آیۂ کریمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ پر محمول ہے۔ کیونکہ آپ ان صفات اور تمام فضائل و کرامات کے جامع ہیں۔ جس طرح کہ سورۂ "الحاقہ" میں "اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ" (یہ عزت والے رسول کا پڑھنا ہے۔) سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات شریف مراد ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔

سورۂ طٰہٰ و یٰس:۔ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا۔ "طٰهٰ مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰۤى" اے محبوب! ہم نے قرآن اس لئے نازل نہ فرمایا کہ آپ مشقت میں پڑیں۔

اس سورۂ مبارکہ کے نازل ہونے کا سبب "سورۂ یٰس" ہے۔ یعنی اس کے نازل ہونے کے بعد نازل ہوئی۔ کیونکہ سورۂ یٰس میں فرمایا گیا۔

يٰسۤۚ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِۙ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَۙ اے سیدِ عالم قسم ہے حکمت والے قرآن کی۔ بے شک آپ رسولوں میں سے ہیں۔

"طٰہٰ" کو بھی آپ کے اسماء مبارک میں شمار کرتے ہیں۔ اور انسان اور مرد بھی مراد لیتے ہیں۔ جس طرح کہ یٰس کو "یاسید" پر محمول کرتے ہیں۔ اسی طرح طٰہٰ کو بمعنی یا طاہر، یا ہادی پر محمول کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بحساب "ابجد" طا کے ۹ اور ہا کے پانچ کل چودہ عدد بنتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اے چودھویں رات کے چاند۔ جیسا کہ شعر ہے۔

رخت را خواندہ طٰہٰ را مردر گاہ   چو ماہِ چاردہ بل چاردہ ماہ

لیکن مفسرین اس قسم کی تفسیر و تاویل کو بدعت کہتے ہیں۔ اور طٰہٰ کو اسم الٰہی بھی شمار کرتے ہیں۔ غرض کہ دونوں سورتیں حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ثنا کا افادہ کرتی ہیں۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے۔

ترا عزّلولاک تمکیں بس است ثنائے تو طٰہٰ و یٰس بس است

"یٰس" میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صراطِ مستقیم اور دین قویم پر قسم وشہادت ہے۔ اور طٰہٰ میں محبت وشفقت کے طریقہ پر آپ کا اعزاز واکرام ہے۔ جب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طاعت وعبادت اور خصوصاً تہجّد اور قیام لیل میں سخت ترین مشقتیں اُٹھانی شروع فرمائیں کہ آپ کے پائے مبارک ورم کر جاتے اور کبھی ایک پاؤں سے قیام فرماتے اس وقت طٰہٰ اتری فرمایا:۔

طٰهٰ ۞ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۞ — اے محبوب ہم نے یہ قرآن اس لئے تو نازل نہ فرمایا کہ آپ مشقتیں جھیلیں۔

"طٰہٰ" اگر آپ کا اسم ہے تو بطریق ندا ہے۔ اور اگر اسم الٰہی ہے تو بطریق قسم ہے۔ اور اگر اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک شمار کر کے قسم کے طور پر مان لیا جائے تو بھی جائز ہے۔ اور اس التفات میں خطاب سے جہاں غَیبت حاصل ہوتی ہے تو اس میں بھی خاص شفقت واکرام ہے جو محبت کی چاشنی کے طریق پر لذیذ ہے فرماتا ہے "اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى" نہیں ہے قرآن مگر حق یاد دلانے کے لئے اسے جو خدا سے ڈرتا ہے۔ اس سے مراد آپ کی ذات شریف ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جب آپ رات میں قیام فرماتے تو اپنے سینۂ مبارک کو رسّی سے باندھتے تاکہ نیند نہ آئے۔ اور تمام رات بیدار رہتے تھے۔

صاحب مواہب لدنیہ نے اسے بعید از قیاس بتایا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ اس آیۂ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے کو مشقت میں نہ ڈالیں اور کفار کے کفروانکار پر غم وغصہ فرما کر خود کو تکلیف نہ دیں کیونکہ ہم نے قرآن کو آپ پر اسی لئے نازل فرمایا ہے کہ آپ انہیں خدا سے ڈرائیں اور تبلیغ فرمائیں جو بھی ایمان لائے گا اپنی ہی بھلائی کے لئے لائے گا اور جو بھی کفر پر قائم رہے گا وہ اپنے ہی لئے کرے گا۔ آپ کا فرض تو صرف حکم کا پہنچانا ہے اور بس۔ جیسا کہ دوسری جگہ بھی بطریق شفقت ومہربانی ارشاد فرمایا گیا۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۞ — تو کہیں تم اپنی جان پر کھیل جاؤ گے اگر وہ اس بات پر ایمان نہ لائیں غم سے۔

مطلب یہ کہ اے محبوب اگر وہ ایمان نہ لائیں تو کیا آپ اپنی جان کو غم وغصہ سے ان کے پیچھے ہلاکت میں ڈال دیں گے۔ "الحدیث" سے مراد قرآن ہے اور فرمایا:۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ۞ — اور بلاشبہ یقیناً ہم جانتے ہیں کہ آپ کا سینہ ان کی باتوں سے تنگ ہوتا ہے۔

اور یہ لوگ آپ پر اور حق تعالیٰ پر جھوٹ بولتے ہیں اور آپ کو جادوگر اور دیوانہ کہتے ہیں اور خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں اور قرآن پر طعن کرتے ہیں۔ لہٰذا صبر فرمایئے کہ کفار کا یہی حال رہا ہے۔ اور آپ خوش رہیئے۔ کہ آخر کار مدد آپ ہی کی ہوئی ہے۔ اور ہم نے قرآن کو آپ پر مشقت کے لئے تو نازل نہیں فرمایا کہ آپ ہمیشہ ہی غمگین رہیں جس طرح کہ تمام انبیاء رہے ہیں۔ اس جگہ غالباً تم کو شرح صدر کے ساتھ ضیق صدر (سینہ کی تنگی) خلجان میں ڈالے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ" (کیا ہم نے آپ کو انشراح صدر عطانہ فرمایا)۔ ممکن ہے یہ حال اس سے آگے کا ہو باوجود اس کے تلطف، محبت اور حق

کی جانب سے دل جوئی، اس حال کے اقتضاء اور اس کلام کے صدور میں باقی ہے۔

بعض اربابِ ذوق ووجدان فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عبادات اور تکالیفِ شرعیہ میں باوجود غایتِ محبت وعنایت کے جو مشقت اٹھاتے تھے یہ اس قبیل سے ہے کہ محبوب قوی وتوانا ہو اور محبّ ضعیف وناتواں۔ محبوب اپنے محبّ سے بغل گیر ہو کر اسے دبائے تو یہ ضعیف وناتواں محبّ لامحالہ خاص قسم کی مشقت وتکلیف پائے گا۔ لیکن اس ضمن میں یہ جانا جاسکتا ہے کہ اس میں کس قدر ذوق ولذت پنہاں ہے۔ جاننے والا ہی جانتا اور سمجھنے والا ہی سمجھتا ہے۔ ع گر نکتہ داں، عشقے خوش بشنو ایں حکایت۔

درود وسلام۔ وصل:۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم وتکریم، اعلائے شان، اظہارِ فضل وکرامت، اور رفع قدر ومنزلت کے سلسلے میں یہ آیتِ کریمہ ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۝ بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں اے ایمان والو تم بھی ان پر خوب درود وسلام بھیجو۔

مسلمانو! تم اپنے خدا کی اطاعت کرو اور فرشتوں کی موافقت کرو اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجو۔ تمہارا اور فرشتوں کا درُود بھیجنا یہی ہے کہ تم اپنے پرورد گار سے دعا مانگو کہ ان پر درود بھیجے اور رحمت فرمادے۔ تم میں کہاں قدرت وطاقت ہے کہ تم ان پر درُود بھیج سکو اور تم کو اتنی کہاں پہچان کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر ومنزلت اور شان کو جان سکو اور اس کے مطابق درُود بھیج سکو۔ ہاں پرورد گار عالم تقدس شانہ پہچانتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ كَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى اَنْ تُصَلّٰى عَلَيْهِ وَصَلِّ عَلَيْهِ كَمَا يَنْبَغِيْ اَنْ نُصَلّٰى عَلَيْهِ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ صَلٰوةً اَنَّهٗ لَهَا اَهْلٌ وَّهُوَ لَهَا اَهْلٌ وَّ بَارِكْ وَسَلِّمْ

لہٰذا حق تعالیٰ نے عالمِ علوی وسفلی سب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا وثنا میں مجتمع فرما کر آپ کے فضائل ومناقب کا اولین وآخرین میں اعلان فرمایا اور شرق وغرب، خشک وتر، بحروبر، آسمان وزمین، عرش وکرسی، قربِ استویٰ اور حریفِ اقلام میں ہر جگہ نشر فرمایا۔ اور مسلمانوں کے دلوں میں آپ کی محبت ایسی جاگزیں فرمائی کہ آپ کے ذکر سے ان کی روحیں راحت وسرور پاتیں اور آپ کا ذکر سننے سے خوشی میں ایسی لطف اندوز ہوتیں کہ آپ کی یاد میں جھوم جاتی ہیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ آپ کی اتباع میں تمام موجودات کو لبریز کردوں گا تاکہ وہ آپ کی ثنا اور پیروی کریں اور آپ پر درود وسلام بھیجیں۔ فرض نمازوں میں کوئی فرض ایسا نہیں ہے جس کو آپ نے سنت نہ بنایا ہو۔ یعنی فرض ادا کرنا آپ کی سنت کو پورا کرنا ہے۔ لہٰذا ان کی فرضیت میرے حکم سے فرض ہونے اور آپ کے حکم سے سنت ہونے میں متمسک ہے۔ حقیقت میں دونوں ہی میرے حکم اور آپ کے حکم کے ساتھ پیوست ہیں۔ یعنی ہر فرض میرے حکم اور آپ کے حکم کو شامل ہے۔ اور میں نے آپ کی طاعت کو اپنی طاعت، آپ کی بیعت کو اپنی بیعت بنایا۔ آپ کے فرامین کے لفظوں کو حفظ کریں گے۔ مفسرین میرے قرآن کے معنی کی تفسیر آپ سے کریں گے۔ واعظین آپ کی نصیحتوں کو لوگوں تک پہنچائیں گے۔ شاہان وسلاطین اور فقراء ومساکین دور دراز سے سفر کر کے آپ کے در پر حاضر ہو کر سلام عرض کریں گے۔ اور آپ کے روضۂ انور کی خاک پاک کو اپنے چہروں پر ملیں گے اور آپ کی شفاعت کے امیدوار ہوں گے۔ آپ کی بزرگی اور شرافت ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گی۔ والحمد للہ رب العالمین۔

اور بعض علماء حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک "وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ" (اور صلوٰۃ میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک رکھی گئی) کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ اس سے مطلب آپ پر درود وسلام بھیجنا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اور فرشتے آپ پر درود

بھیجتے ہیں۔ لیکن محقق قول یہی ہے کہ اس سے مراد نماز ہے جیسا کہ حسنِ ہدیٰ اور سیرتِ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان میں گزر چکا ہے۔

سورۂ فتح :۔ بارگاہ قدس جل اسمہ کی جانب سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو اتم نعمت اور اکمل کمالِ جاہ و جلال و کرامت اور برکات و مرتبت وارد و فائز ہیں سورۂ فتح ان سب پر مشتمل ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے رسول پاک کی مدح و ثنا کا اس میں خطبہ پڑھا ہے فرماتا ہے :۔

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۝ وَيَنصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا ۝

بے شک ہم نے تمہارے لئے روشن فتح فرمادی تاکہ اللہ تمہارے سبب سے گناہ بخشے۔ تمہارے اگلوں کے اور تمہارے پچھلوں کے اور اپنی نعمتیں تم پر تمام کر دے اور تمہیں سیدھی راہ دکھائے اور اللہ تمہاری زبردست مدد فرمائے۔

واضح رہنا چاہئے کہ اللہ سبحانہ و عز اسمہ کی جانب سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر فتوحات و فیوضات صوریہ و معنویہ اور کرامات و برکات ظاہرہ باطنہ جو فائض و صادر ہیں وہ غیر متناہی اور حد و شمار سے باہر ہیں ان میں سے ایک تو شہروں کی فتوحات، بندگانِ خدا کی تسخیر، حصولِ غنائم، تقویت دین، کثرتِ امت اور احکام اسلام کی اشاعت ہے اور سب سے بڑی مکہ مکرمہ کی فتح ہے۔ کیونکہ فتح مکہ کے بعد تمام عرب قبائل اور لوگوں کی جماعتیں فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہونے لگیں۔ اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم عالم قدس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس سورۃ میں اس کے فتح ہونے کا وعدہ فرمایا گیا اور یہ فتح یقینی طور پر واقع ہونے کا تذکرہ ماضی کے صیغہ "فتح مبین کے ساتھ کیا گیا۔ چونکہ یہ فتح ظاہر و باہر اور دین میں عزت و شوکت اور حصولِ یقین میں اضافہ کا موجب ہے۔ فتح مبین کے معنی عزت و شوکت کو ظاہر کرنے والی اور دین اسلام کو غلبہ مرحمت فرمانے والی فتح بھی مروی ہے۔

اور آیۂ کریمہ " لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ " کی تفسیر و تشریح میں بکثرت اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ چیز ہے جو آپ کی بعثتِ نبوت سے پہلے زمانہ جاہلیت میں واقع ہوئی۔ امام سبکی فرماتے ہیں کہ یہ قول مردود ہے اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جاہلیت کی ہوا تک نہ لگی۔ اور یہ کہ آپ قبل از نبوت اور بعد از نبوت معصوم ہیں۔ اور مجاہد نے کہا ماتقدمُ قبطیہ "ماریہ" میں اور "ماتاخر" حضرت زید کی زوجہ سے عقد کا ارادہ فرمانے کے بارے میں ہے۔ امام سبکی فرماتے ہیں یہ قول باطل ہے اس لئے کہ قبطیہ ماریہ اور حضرت زید کی زوجہ کے بارے میں اصلاً ذنب ہے ہی نہیں جو ایسا اعتقاد رکھتا ہے وہ غلطی کرتا ہے زمخشری نے کشاف میں اور تبعیت میں بیضاوی نے بھی اس کو نقل فرمایا کہ اس سے مراد وہ تمام لغزشیں ہیں جو محلِ عتاب ہیں۔ امام سبکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ قول بھی مردود ہے۔ اس لئے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی عصمت ثابت ہے۔ البتہ ایسے صغائر جو ان کے مرتبہ و شان کو کم نہ کرنے والے ہوں۔ اس میں اختلاف ہے۔ معتزلہ اور بہت سے غیر معتزلہ اس کے جواز کی طرف گئے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک مسلک مختار ممانعت ہے۔ اس لئے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے قول و فعل کی پیروی کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ لہٰذا ان سے ایسا فعل کیسے ہو سکتا ہے۔ جو ناشائستہ اور ناسزا ہے اور "حشویہ" حضرات انبیاء علیہم السلام پر جرأت و جسارت کرتے ہیں۔ اور وہ ان پر مطلقاً بغیر کسی قید کے جائز رکھنے کے قائل ہیں۔ اگر ان حشویوں کی طرف ان کے اس قول کی نسبت صحیح ہے تو یہ مجروح یعنی لائق التفات اور صحت کے قابل نہیں ہے کیونکہ امت کا اجماع اس کے خلاف ہے۔ اور جو لوگ انبیاء علیہم السلام پر صغائر کو جائز

رکھتے ہیں ان کے پاس نہ کوئی نص ہے اور نہ کوئی دلیل۔ بلکہ وہ صرف اسی آیت کو یا اس قسم کی دوسری آیتوں کو اپنا ماخذ ٹھہراتے ہیں۔ اور ان کا جواب بخوبی ظاہر کر دیا گیا ہے۔

صغائر غیر رذیلہ کو جائز رکھنے کے بارے میں ابن عطیہ فرماتے ہیں کہ آیا صغائر غیر رذیلہ میں سے کچھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے واقع ہوئے ہیں یا نہیں وہ اس میں اختلاف کرتے ہیں۔ لیکن صحیح یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان میں سے کچھ بھی واقع نہ ہوا۔ امام سبکی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ میں اس میں ذرہ بھر بھی شک وشبہ نہیں رکھتا کہ آپ سے کچھ واقع نہیں ہوا۔ اور آپ کے اس قول و حال کے برخلاف کوئی گمان بھی کیسے لاسکتا ہے۔ جب کہ آپ کی صفت میں حق تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝ یہ نبی اپنی خواہش سے فرماتے ہی نہیں، نہیں ہے یہ مگر وحی جو کی گئی۔

اب رہا آپ کا فعل مبارک، تو صحابہ کرام کا اجماع معلوم ہے کہ وہ آپ کی قطعیت کے ساتھ پیروی کرتے اور آپ سے جو کچھ قلیل و کثیر یا صغیر و کبیر عمل کرنا ظاہر ہوتا وہ ہر ایک میں آپ کی اقتداء کرتے تھے حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پوشیدگی و خلوت میں جو عمل فرماتے اس کے علم کی بھی وہ حرص و خواہش رکھتے اور اس کی متابعت کرتے تھے خواہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں آئے یا نہ آئے۔ جو بھی صحابہ کرام کے ان احوال پر جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کے سلسلے میں ہے غور و فکر کرے گا۔ بخوبی جان لے گا۔ اور جو شخص بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال مبارکہ کو اول سے آخر تک جانے گا اور مشاہدہ کرے گا وہ اس قسم کی بات اپنے منہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نکالنے یا اپنے دل میں اس قسم کا وہم و خیال تک لانے میں شرم محسوس کرے گا (اعاذنا اللہ منہا)

امام سبکی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے ایسی بات نہ کہی ہوتی تو میں اس کا ذکر نہ کرتا۔ اور اس آیت کی تفسیر میں زمخشری نے جو قول نقل کیا ہے ہم اس سے نہ صرف بیزار ہیں۔ بلکہ خدا سے انصاف چاہتے ہیں یہ امام سبکی کا کلام زمخشری کے مقالہ کے رد میں ہے جسے علامہ سیوطی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے رسائل میں ذکر فرمایا ہے۔ اس کے سوا اور بھی اقوال بیان کئے ہیں جو گیارہ بلکہ اس سے زیادہ تک پہنچتے ہیں۔ جسے امام سبکی نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں میں جب اس آیہ کریمہ "لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ" پر تامل اور اس کے ماقبل و مابعد پر غور و فکر کرتا ہوں تو میں ایک وجہ کے سوا اور کوئی وجہ اور احتمال کی گنجائش نہیں پاتا۔ اور وہ وجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تکریم ہے بغیر اس کے اس جگہ کوئی گناہ متصور ہو۔ امام سبکی فرماتے ہیں کہ جب میں اس معنی و وجہ کے ماخذ کے درپے ہوا تو ابن عطیہ کو بھی اس کا قائل پایا۔ چنانچہ کہا کہ "آیت کے معنی اس حکم کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شرافت و بزرگی کا ظاہر فرمانا ہے۔ اور اس میں کوئی گناہ متصور نہیں ہے۔" ابن عطیہ نے ایسا خدا کی توفیق پانے سے کہا۔ انتہیٰ۔

یہ کلام مجمل ہے اس کی تشریح و تفصیل یہ ہے کہ آقا کبھی اپنے غلاموں کو اپنے خواص و مقربوں کے ذریعہ نوازتا اور بزرگی بخشتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے تمہیں بخشا اور تمہارے تمام اگلے پچھلے گناہوں سے در گزر کیا۔ حالانکہ آقا خوب جانتا ہے کہ ان سے آگے پیچھے کسی وقت بھی کوئی گناہ اور غلطی سرزد ہی نہیں ہوئی لیکن اس کا یہ کلام غلاموں کے لئے باعثِ عزت و افتخار ہے۔ فافہم وباللہ التوفیق۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اسی جگہ مغفرت کا عصمت سے کنایہ ہے اس صورت میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ۔

لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے پچھلے گناہ بخشے

أَيْ لِيَعْصِمَكَ اللَّهُ فِيمَا تَقَدَّمَ مِنْ عُمُرِكَ وَفِيمَا تَأَخَّرَ مِنْهُ۔ یعنی اللہ تعالیٰ آپ کو آپکی پچھلی حیات میں بھی اور اگلی حیات میں بھی اپنی عصمت و پناہ میں رکھے۔

یہ قول انتہائی حسن قبول میں ہے۔

بلاشبہ بلغاء نے قرآن کے اسلوب کو بلاغت میں شمار کیا ہے کہ تخفیف و کمی کے مقامات کو لفظ مغفرت، عفو اور توبہ سے قرآن میں کنایہ کیا گیا ہے۔ جیسا کہ قیام لیل کے نسخ و کمی کرنے کے بارے میں حق تعالیٰ نے فرمایا:۔

عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ — اللہ جانتا ہے کہ اے مسلمانو! تم سے رات کا شمار نہ ہوسکے گا۔ (اور تم ضبط اوقات نہ کرسکوگے)

تو اس نے اپنی مہر سے تم پر رجوع فرمایا۔ (یعنی شب کا قیام معاف فرمایا) اب قرآن میں سے جتنا تم پر آسان ہو اتنا پڑھو۔ نیز تقدیم صدقہ کی منسوخیت میں فرمایا:۔

فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ — توجب تم نہ کرسکو تو اللہ نے اپنی مہر سے تم پر رجوع فرمایا (یعنی تقدیم صدقہ معاف فرمایا)

نیز رمضان مبارک کی راتوں میں جماع کے حرام ہونے کی منسوخیت میں فرمایا:۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ — روزے کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جانا تمہارے لئے حلال کیا گیا............

فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ — تو اس نے تمہاری توبہ قبول کی اور تمہیں معاف فرمایا۔ تو اب ان سے صحبت کرو۔

مفسرین یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جس جگہ انبیاء علیہم السلام کی توبہ و مغفرت کا ذکر فرمایا ہے وہاں ان کی ان لغزش و خطا کا بھی ذکر فرمایا ہے جو ان سے صادر ہوئیں جیسے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا "وَعَصٰى اٰدَمُ رَبَّهٗ" (اور آدم علیہ السلام نے اپنے رب کی نافرمانی کی) اور حضرت نوح علیہ السلام کی شان میں فرمایا۔ "اِنِّیْ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ" (میں تجھے نصیحت فرماتا ہوں کہ نادان نہ بن) اور حضرت یونس علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا۔ "فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ" (تو انہوں نے گمان کیا کہ ہم ان پر قابو نہ پاسکیں گے) اور حضرت داؤد علیہ السلام سے فرمایا "وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى" (تو تم اپنی خواہش کی پیروی نہ کرو) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا "فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى" لیکن سید المرسلین صلوات اللہ علیہ و علیہم اجمعین کی شان میں فتح کو مقدم رکھا۔ اور اس کے بعد گزشتہ و آئندہ کے غفران ذنوب کا ذکر فرمایا اور ذنب کو پوشیدہ رکھا۔

شیخ عزیز الدین عبدالسلام اپنی کتاب المسمّٰی بہ "نہایت السّول فیما صحّ من تفضل الرسول" میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام نبیوں پر بکثرت وجوہ فضیلت بخشی ہے۔ پھر انہوں نے ان وجوہات کا ذکر کرتے ہوئے ایک وجہ یہ بتائی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو پہلے ہی اگلے پچھلے ذنوب کی مغفرت کی خبر دے دی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے کسی بھی نبی کو اس جیسی خبر نہیں دی۔ بلکہ ظاہر یہ ہے کہ انہیں سرے سے اس سے باخبر کیا ہی نہیں گیا۔ اسی بنا پر جب عرصات محشر میں امتیں ان سے شفاعت کی درخواست کریں گی تو وہ اپنی لغزشوں کو بیان کریں گے۔ اور اس مقام کی ہیبت سے شفاعت میں پہل کا اظہار نہیں فرمائیں گے۔ اور جب وہ تمام مخلوق اس مقام میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کریں گے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے ہاں یہ میرا ہی کام ہے۔ اس آیت کریمہ کی تفصیل یہ ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کے لئے پہلے فتح مبین کا اثبات فرمایا اس کے بعد مغفرت ذنوب کا ذکر فرمایا۔ بعد ازاں اتمام نعمت، اثباتِ ہدایت صراطِ مستقیم اور نصرِ عزیز یعنی غالب مدد کا ذکر فرمایا للہذا ثابت اور متعین ہوا کہ مقصود

اثباتِ ذنوب نہیں ہے بلکہ اس کی نفی ہے فافہم وباﷲ التوفیق یہ ساری بحث علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی ہے۔ ا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ" (اور تم پر اپنی نعمتیں تمام وکمال فرمائیں) مخفی نہ رہنا چاہئے۔ کہ ہر قسم کے فضائل وکمالات، اور کرامات وبرکات اس کلمہ میں داخل ہیں۔ اور خاص وعام نعمتوں میں سے جتنا کچھ ذکر کیا جائے یا تصور وخیال میں آئے وہ سب اندیشہ وخیال اور عدد شمار کے محاسبہ سے عاجز وقاصر ہے اس کے ذکر وبیان سے حال وقال کی زبان گونگی ہے۔ حیطہ اظہار وبیان میں جو کچھ ہے وہ سب اجمال ہے اور اس کی تفصیل امکانی قدرت سے باہر ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا۝ اگر سمندر سیاہی بنیں اپنے رب کے کلمات لکھنے کے لئے تو یقیناً سمندر خشک ہو جائے اور رب کے کلمات ختم نہ ہوں اگر چہ اس کی مدد کیلئے اس کی مثل اور لائیں

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللّٰهِ۔ اور اگر زمین کے ہر شجر کو قلم بنائیں اور سات سمندر کو روشنائی بنائیں تب بھی رب کے کلمات ختم نہ ہوں۔

ان کلمات سے مراد، محققین کے نزدیک اللہ عزوجل کی طرف سے وہ فضائل وکمالات اور حقائق ومعارف ہیں جو درگاہِ قدس کے بندگان خاص انبیاء واصفیاء خصوصا سید انبیاء وسند اصفیاء صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین پر افاضہ ہوتے ہیں ورنہ جو کچھ صفت حق اور شیون ذات مطلق جل وعلا ہے وہ اس تمثیل سے منزہ وپاک ہے۔ اس کا کوئی نظیر نہیں۔ اور بعد از تعمیم نعمت اور دینوی واخروی نعمتوں کی شمولیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ دو نعمتوں کا ذکر فرمایا۔ ایک ہدایت صراطِ مستقیم ہے جو کہ اصل اصولِ نعیم اور مثمر فوز وفلاح اور لوگوں کی ہدایت ہے۔ کیونکہ بعثت ورسالت کا یہی مقصد اصلی ہے۔ دوسرا دنیوی ہے۔ جس کا مقصد بھی دین ہے جس طرح کہ پہلا ہے۔ اور جو صلاح عالم اور کارخانہ موجودات کے انتظام پر منتج ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا۝ وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا۝ اور تمہیں سیدھی راہ دکھائے اور اللہ تمہاری زبردست مدد فرمائے۔

ابن عطا فرماتے ہیں کہ اس سورت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے متعدد عظیم نعمتیں جمع فرمائی ہیں۔ ایک کھلی فتح جو اجابت اور قبول کی نشانیوں میں سے ہے۔ دوم مغفرت جو محبت کی علامتوں میں سے ہے۔ سوم اتمام نعمت جو اختصاص کی نشانیوں میں سے ہے۔ چہارم ہدایت جو ولایت کی علامتوں میں سے ہے۔ چنانچہ مغفرت تمام نقائص وعیوب سے تبری وتنزیہ یعنی ہر آلائش سے پاکی وصفائی سے کنایہ ہے اور اتمام نعمت بدرجۂ کامل آپ کی تبلیغ رسالت ہے۔ اور ہدایت مشاہدہ کی طرف دعوت ہے۔ اور آپ کی

ا۔ افادۂ خاص از مترجم غفرلہٗ:۔ اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں مفسرین کرام کے یہ اقوال وتوجیہات اس بنا پر محمول ہیں کہ انہوں نے آیۂ کریمہ کے "لیغفر لک الایہ" میں حرف جر لام کو تخصیص کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ لیکن اس لام کو اگر بجائے تخصیص کے "تعلیل وسبب" کے معنی میں لیتے تو ان بعید از کار تاویلات وتوجیہات کے جھمیلے سے بچ جاتے۔ اور لام سببیہ کو (جو کہ حرف جر لام کے معنی مشترکہ اور خواص میں سے ہے) مان لینے کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ شان اور رفعت مقام میں بے نظیر دلیل بن جاتی ہے چنانچہ لام تعلیل اور سببیہ کو صاحب تفسیر جلالین نے تسلیم کیا ہے اور اس صدی کے مجددِ اعظم اعلیٰ حضرت مولانا مفتی شاہ احمد رضا خاں صاحب فاضل بریلوی قدس سرہ نے اپنے ترجمہ قرآن المسمٰی بہ "کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن" میں سلام سببیہ ہی مان کر ترجمہ کیا ہے جیسا کہ شروع باب میں اس آیۂ کریمہ کے ترجمہ سے ظاہر ہے۔

شان اتنی بلند فرمائی کہ کوئی چیز قرب حق میں اس مرتبہ سے اونچی وفائق متصور نہیں ہے۔ اور فرمایا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ بیشک جنھوں نے آپ سے بیعت کی ہے بلاشبہ انہوں نے اللہ سے بیعت کی ہے اللہ کا ہاتھ (دستِ قدرت) ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔

جس طرح کہ فرمایا "مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ" جس نے رسول کی اطاعت کی یقیناً اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اگرچہ باصطلاح اہل عرب یہ از قبیل مجاز ہے۔ لیکن اہلِ حقیقت جانتے ہیں کہ اس میں کیا رمز ہے واللہ اعلم۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان مومنوں پر سکینہ، طمانیت اور آرام ویقین (جو نعمتوں کا خلاصہ ہے) کے نازل فرمانے کا احسان جتلایا۔ اور آخر سورۃ میں آپ کے اصحاب کامل النصاب کی مدح وثنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت کی فضیلت کے ساتھ فرمائی۔ کیونکہ یہ محبت کالازمی نتیجہ ہے۔ ان اصحاب کا کفار پر شدت کرنا اور ان کے خلاف چلنا اور باہم مسلمانوں کے ساتھ محبت ومودت کا برتاؤ کرنا کہ اس پر دین وملت کے کارخانہ کا انتظام ہے۔ ان کی تعریف فرمائی۔ اور ان کی اس صفت کو بمصداق "يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ" (وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اللہ ان سے محبت کرتا ہے) بنایا۔ جیسا کہ سورۂ مائدہ میں فرمایا "اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ" (مسلمانوں پر نرم اور کافروں پر سخت ہیں) اور ان سے دنیا و آخرت میں مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا گیا۔ یہ سب موجب امتنان اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضل وشرف کا بیان ہے۔

سورۃ کوثر۔ بارگاہِ رب العزت کی جانب سے جو ہر قسم کے فضائل وکمالات اور کرامات وبرکات فائز ہوئے ہیں وہ سب ایک کلمہ جوامع الکلم میں داخل ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝ اے محبوب! بیشک ہم نے تمہیں بیشمار خوبیاں عطا فرمائی۔

کیونکہ الکوثر سے مراد دنیا و آخرت میں خیر کثیر ہے۔ اور یہ کلمہ اپنے اس اختصار و ایجاز کے باوجود اس راز کے اظہار و بیان کو شامل ہے۔ اور اگر جہان بھر کے علماء و عرفا اس کلمہ کی شرح کریں تو اس کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ ہی حقیقت کو خوب جانتا ہے۔ تاہم فی الحال جو کچھ میری نظر میں ہے لکھتا ہوں ارشاد باری ہے "اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ" یعنی ہم نے آپ کو بے شمار خوبیاں عطا فرمائیں جن میں کی ہر نعمت ساری دنیا سے بڑی ہے۔ جب ہم نے آپ کو اتنی عظیم خوبیاں عطا فرمائیں تو۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝ تو تم اپنے رب کے لئے نماز پڑھو اور قربانی کرو بیشک جو تمہارا دشمن ہے وہی ہر خیر سے محروم ہے۔

عبادت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک عبادت بدنی دوسری عبادت مالی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد "فَصَلِّ لِرَبِّكَ" (اپنے رب کے لئے نماز پڑھو) عبادت بدنی کی طرف اور "وانحر" (قربانی کرو) سے عبادت مالی کی طرف اشارہ فرمایا اور یہ کہ "اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ" (بے شک ہم نے آپ کو عطا فرمایا) کو لفظ ماضی سے ذکر فرمایا اور لفظ مستقبل یعنی سَنُعْطِيْكَ (عنقریب آپ کو عطا فرمائیں گے) نہ فرمایا تاکہ اس پر دلالت کرے کہ یہ تمام عطائیں قبل از وجود عنصری آپ کو حاصل ہو چکی ہیں۔ جیسا کہ فرمایا:۔

كُنْتُ نَبِيًّا وَّاٰدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ۔ میں اس وقت بھی نبی تھا جب کہ آدم روح وجسم کے درمیان تھے۔

گویا کہ حق تعالیٰ کہتا ہے اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے لئے تمام اسبابِ سعادت، آپ کے دائرہ وجود میں داخل ہونے سے پہلے ہم نے عطا فرما دیئے ہیں۔ تو اب آپ کو بعد از وجود کیسے بے عطا چھوڑیں گے رہا آپ کا عبادت میں مشغول رہنا تو یہ فضل عمیم آپ کی طاعت و عبادت کے سلسلے میں نہیں دیا گیا ہے۔ بلکہ بغیر وجوب اور بے سبب، محض فضل و احسان ہے، یہی اجتباء

(برگزیدگی) کے معنی کا حاصل ہے۔ اگر کوئی کہے کہ تمام نبیوں کو بلکہ تمام انسانوں کو جو کچھ بھی دیا گیا وہ ان کے وجود عنصری سے پہلے دیا گیا۔ اور ان کی تقدیر میں لکھا گیا ہے تو فضیلت تو اس میں ہونی چاہئے کہ آپ کو ان میں سب سے زیادہ عطا کیا گیا نہ یہ کہ سب سے پہلے دیا گیا ہے تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کے کمالات عالم ارواح میں ظاہر کئے گئے اور انبیاء علیہم السلام کی ارواحِ قدسیہ نے آپ سے استفاضہ کیا ہے جیسا کہ فرمایا۔ کنت نبیاً (الحدیث) اور دیگر تمام انبیاء علیہم السلام کی نبوت علم الٰہی میں تھی نہ کہ خارج میں۔

ایک روایت میں ہے کہ "کوثر" سے مراد جنت کی ایک نہر ہے جیسا کہ اس کی صفت میں احادیث میں مروی ہے کہ "کوثر" نام اس بنا پر ہے کہ کثرت سے لوگ جائیں گے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی سیر کو بیان کرنے کے دوران فرمایا کہ میں جنت کی سیر کر رہا تھا تو اچانک میری نظر اس کی ایک نہر پر پڑی۔ دیکھا کہ اس کے ہر طرف گنبد ہی گنبد ہیں جو کھوکھلے موتیوں کے ہیں۔ اور اس کی مٹی مشکِ اذخری ہے۔ میں نے جبریل سے دریافت کیا یہ کیا ہے؟ بتایا کہ یہ کوثر ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا ہے۔ اسے بخاری نے روایت کیا۔ سلف کے درمیان مشہور و مستفیض یہی تفسیر ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ کوثر سے مراد آپ کی اولاد طیبہ ہے اس لئے کہ یہ سورۃ اس شخص کے رد میں نازل ہوئی ہے جس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو "بے اولاد" ہونے کا طعنہ دیا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم نے تم کو ایسی اولاد مرحمت فرمائی ہے جو قیامت تک باقی رہے گی۔

فائدہ۔ بعض فرماتے ہیں کہ کوثر سے مراد خیر کثیر ہے۔ اور کوثر لغت میں بمعنی کثرتِ درود ہے منجملہ اس کے ایک یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بدگویوں نے "ابتر" یعنی "بے اولاد" ہونے کا طعنہ دیا تھا۔

عین المعانی میں کہتے ہیں کہ کوثر بروزن فوعل کثرت سے ہے جیسے نفل سے نوفل، جہر سے جوہر وغیرہ اور اس کے مقابلہ میں خبر آئی کہ "اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْاَبْتَرُ" مطلب یہ کہ جو آپ پر بے نسل کا عیب لگاتے ہیں۔ آخر کار وہی ابتر "بے نسلے" ہیں۔ ابتر اسے کہا جاتا ہے جس کی نسل نہ ہو۔ اور کشاف میں ہے کہ کوثر فوعل کے وزن پر ہے۔ جس کے معنی کثرت کے ہیں۔ اور اس میں مبالغہ ہے یعنی بہت بہت۔ کسی بدوی کا لڑکا سفر سے واپس آیا تو لوگوں نے اس سے پوچھا تیرا لڑکا کس حال میں لوٹا۔ اس نے کہا "جاء بالکوثر" یعنی خیر کثیر کے ساتھ واپس آیا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ کوثر کے معنی خیر کثیر کے کرتے ہیں اس پر ان سے حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا لوگ ایسا کہتے ہیں کہ کوثر جنت میں ایک نہر کا نام ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ بھی از قسم خیر کثیر ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ کو دونوں جہان کی اتنی بھلائیاں عطا فرمائی ہیں کہ اس کی کثرت کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ اور آپ کے سوا کسی کو اتنا نہیں دیا گیا۔ اور ان کا دینے والا میں ہوں جو کہ اپنے تمام جہانوں کا مالک و رب ہوں۔ لہٰذا آپ کے لئے سب سے بڑھ کر بزرگی دینے والا، سب سے زیادہ عطا فرمانے والا، سب سے زیادہ بخشش کرنے والا اور عظیم ترین انعام فرمانے والا میں ہوں "فَصَلِّ لِرَبِّکَ" تو اپنے رب کی اطاعت کیجئے کہ اس نے آپکو اپنی عطا کا مستحق بنا کر نوازا اور ان لوگوں کے احسان سے جو اپنے گمان پر غیر خدا کو پوجتے ہیں۔ آپ کو محفوظ رکھا "وَانْحَرْ" اور خدا کے لئے اس کے نام کے ساتھ قربانی دیجئے اور ان لوگوں کے برخلاف کیجئے کہ یہ لوگ بتوں کے نام سے ذبح کرتے ہیں۔ "اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْاَبْتَرُ" بلاشک و شبہ جو بھی اپنی قوم میں سے آپ سے دشمنی رکھے اور آپ کی خلاف ورزی کرے وہی ابتر، بے نسلا اور بے برکتا ہے۔ نہ کہ آپ! کیونکہ قیامت تک مسلمانوں میں سے جو

بھی پیدا ہوگا۔ وہ آپ کی معنوی اولاد اور خلف ہوں گے۔ اور آپ کا ذکر منبروں پر بلند ہے۔ اور جہان بھر کی زبانیں قیامت تک آپ کے ذکر سے رطب اللسان رہیں گی۔ وہ ابتدا تو خدا کے نام سے کریں گے اور ثنیٰ یعنی دوسرا آپ کے نام کو بنائیں گے۔ اور آخرت میں جو عنایت ہوں گی وہ تو قدرتِ بیان سے باہر ہیں آپ جیسے کو "ابتر" (معاذ اللہ) کہنے والا در حقیقت خود ابتر ہے کہ دنیا و آخرت میں کوئی نام لینے والا تک نہیں۔ اگر کوئی لیتا بھی ہے تو لعنت بھیجتا ہے۔

ابو بکر بن عیاش رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کوثر سے مراد امت کی کثرت ہے۔ اور حسن بصری فرماتے ہیں کہ مراد قرآن ہے۔ بقول عکرمہ نبوت، بقول مغیرہ، اسلام اور بقول حسین بن الفضل قرآن کی آسانی اور شریعت کی تخفیف مراد ہے۔ بعض نے اکثر امت میں شفاعت، بعض نے معجزات نبوت، بعض نے نبوت و قرآن، ذکر عظیم اور دشمنوں پر مدد اور بعض نے علمائے امت مراد لیا ہے۔ کیونکہ "العلماء ورثۃ الانبیاء" علماء نبیوں کے وارث ہیں اسے امام احمد و ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ بعض نے کوثر سے علم مراد لیا ہے۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ اس کے بعد "فَصَلِّ لِرَبِّکَ" (اپنے رب کی عبادت کیجئے) کا ذکر فرمایا ہے۔ اور جو عبادت پر مقدم ہے۔ نتیجتًہ وہ علم ہے۔ اور کوئی چیز کثرت و کشادگی میں علم کی صفت کو نہیں پہنچتی۔ اور بعض کہتے ہیں کوثر خلق حسن ہے۔ صحیح یہ ہے کہ کوثر کسی چیز کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ تمام صفات کمال کو شامل ہے۔ اور خیر کثیر، تمام معانی کو شامل ہے۔

اور "مخاطبہ" فرمانے کے سلسلے میں ان حضرات نے جن کے اسماء اوپر مذکور ہوئے مذکورہ معانی بیان کرنے کے بعد اور بھی اقوال فرمائے ہیں چنانچہ ابن عطا فرماتے ہیں کہ اے محبوب ہم نے تم کو اپنی ربوبیت کی معرفت، اپنی وحدانیت کی یکتائی اور اپنی مشیت و قدرت کا عرفان عطا فرمایا۔ سہل تستری نے فرمایا "اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ" یعنی ہم نے تمہیں وحدت کے ساتھ کثرت علم توحید کی تفصیلات اور اپنی بے مثل تجلی کے ساتھ عین کثرت میں شہودِ وحدت کی معرفت عطا فرمائی اور یہ تجلی جنت میں اس نہر کی مانند ہے کہ جو بھی ایک مرتبہ اس سے پانی پئے گا وہ کبھی پیاسا نہ ہوگا۔ "فَصَلِّ لِرَبِّکَ" مطلب یہ کہ جب مشاہدہ اور عین کثرت میں وحدت کو پالیا تو استقامتِ نماز کے ذریعہ مکمل طور پر شہود روح، حضور قلب، انقیاد نفس اور طاعت بدن سے بار بار عبادات کی شکل اختیار فرما کر لطف اندوز ہوئیے۔ اس لئے کہ یہی نماز کامل اور "جمع" و تفصیل کے حقوق ادا کرنے کا طریقہ ہے "وَانْحَرْ" یعنی انانیت کے اونٹ اور گائے کو ذبح کیجئے تاکہ آپ کے شہود میں یہ انانیت تلونِ مزاج کی صورت میں ظاہر نہ ہو اور آپ سے مقام "تمکین" کو سلب نہ کرے اور حق تعالیٰ کے ساتھ قضائے محض میں رہئے۔ اور اس کی بقا کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ آپ باقی رہیں۔ تاکہ اپنے وصال حق اور اپنے حال میں اور آپ کے ساتھ جو آپ کی امت کا اتصال اور آپ کی ذریت ہے۔ اس میں ابتری واقع نہ ہو بلاشبہ آپ سے دشمنی رکھنے والا حق سے منقطع اور پھٹکارا ہوا ہے اور وہی ابتر ہے نہ کہ آپ!

اور مولانا تاج الملت والدین المصدر البخاری "حقائق الحدائق میں فرماتے ہیں کہ "اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ" بلاشبہ ہم نے آپ کو عدد و شمار سے باہر بکثرت خوبیاں اور ہر نوع کے بیشمار فضائل عطا فرمائے۔

غرض کہ کوثر کی تفسیر میں ائمہ کبار رحمہم اللہ کے اقوال و تاویلات بہت ہیں۔ جس نے اپنے نور باطن سے جتنا دیکھا بیان کر دیا لیکن تمام مخلوق کا علم کوثر کی کنہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس اجمال کے پہلو میں تمام اقوال و تفصیلات ایک دفتر کے مقابلہ میں بمنزلہ ایک حرف اور اس نہر کا ایک قطرہ ہے۔ انتہیٰ کلام فصل الخطاب واللہ اعلم۔

آیۂ میثاق:۔ یہ آیۂ کریمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غایت فضل و کرامت پر دلالت کرتی ہے۔ اور بتلاتی ہے کہ آپ نبی الانبیاء اور سردار انبیاء علیہم السلام ہیں۔ اور تمام نبی آپ کی امت کے حکم میں ہیں آیۂ کریمہ یہ ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ۝

اے محبوب یاد کیجئے اس وقت کو جب کہ اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں سے عہد و پیمان لیا تھا کہ جس وقت میں تم کو کتاب و حکمت دوں پھر وہ رسول تشریف لائے جو تمہارے پاس کی ہر چیز کی تصدیق کرنے والا ہو (یہ صفت تمام نبیوں کی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی تصدیق کرتے اور اصول دین میں باہم اتفاق کرتے ہیں) تو اس وقت تم اس رسول پر ایمان لانا اور ان کی مدد کرنا۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی گئی کہ ہر نبی جو آدم علیہ السلام سے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم تک بھیجا گیا اس سے عہد و پیمان لیا گیا ہے۔ جمہور مفسرین کا مذہب یہی ہے کہ آیہ کریمہ میں "رسول" سے مراد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات قدس ہے۔ اور کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا گیا جس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف نہ بیان کئے گئے ہوں اور اس سے آپ کے اوصاف بیان کرنے کے بعد اس پر عہد و پیمان نہ لیا گیا ہو کہ تم اگر آپ کا زمانہ پاؤ تو آپ پر ایمان لانا لازمی ہے جب نبیوں سے یہ عہد و پیمان لیا گیا تو انہوں نے اپنے اپنے امتیوں سے بھی یہی وعہد و پیمان ضرور لیا ہو گا۔ چونکہ انبیاء کرام اصل اور متبوع ہیں اس لئے آیت میں انہیں کے ذکر پر اکتفا کیا گیا۔

سیدنا علی ابن ابی طالب اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس پر عہد لیا گیا کہ اگر تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پاؤ تو آپ پر ایمان لانا اور آپ کی مدد کرنا۔ بعض فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک عہد لیا کہ وہ نبی اپنی اپنی امتوں سے عہد لیں کہ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مبعوث ہوں تو تم سب ان پر ایمان لے آنا۔ اور اس طرح اپنے بعد آنے والے کو بتاتے رہنا یہاں تک کہ یہ عہد حضور اکرم کے زمانے کے اہل کتاب یہودیوں تک پہنچا جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں رونق افروز ہوئے تو یہود آپ کی تکذیب کرنے لگے۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کو عہد و میثاق کی یاد دہانی کرانے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی اور وہ جنہوں نے یہ اخذ کیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے یہ عہد لیا کہ وہ اپنی امتوں سے ایسا عہد لیں اس سے یہ حجت پکڑی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے بعد اہل کتاب پر فرض ہو گیا تھا کہ وہ آپ پر ایمان لائیں۔ حالانکہ انبیاء علیہم السلام، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت سب کے سب دنیا سے گذر چکے تھے۔ اور میت مکلف نہیں ہوتی۔ لہٰذا متعین ہو گیا کہ میثاق امتوں پر ماخوذ ہے۔ اور اس کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی کر رہا ہے کہ فرمایا:۔

"فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ" تو جو اس عہد سے روگردانی کرے تو وہی فاسقوں میں سے ہے۔

ایسا وصف انبیاء کے لائق نہیں ہے بلکہ امت کے لائق ہے اس کا یہ جواب دیا گیا کہ اس آیت میں مراد بر طریق فرض و تقدیر ہے۔ مطلب یہ کہ اگر بفرض و تقدیر انبیاء زندہ ہوں تو ان پر واجب ہے کہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لائیں نہ یہ کہ اس کا وقوع ان کے وجود کے درمیان ہونے کی خبر دینا ہے اور بہت سے احکام بفرض و تقدیر آئے ہیں۔ جیسے کہ۔

"وَلَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ" (اگر تم نے شرک کیا تو ضرور تمہارے عمل اکارت ہوں گے) "وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ" (اور اگر کوئی ہم پر اپنی مونہوں کی باتوں کی نسبت کرے) "وَمَنْ يَّقُلْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ الآیات" (اور کوئی کہے میں معبود ہوں) تو یہ سب بفرض و تقدیر کی مثالیں ہیں۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضل و شرف اور کرامت کے اظہار کے لئے انتہائی

کافی ہے۔ جب کلام کی بنیاد فرض وتقدیر پر ہے تو حق تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ " جو کوئی اس کے بعد روگردانی کرے تو وہی فاسقوں میں سے ہے " یہ بھی درست ہے، نیز جب نبیوں کو حکم فرمایا اور ان سے یہ عہد لیا بر تقدیر حیات، تو انبیوں پر اس کا وجوب بطریق اولیٰ ہوگا کہ وہ آپ پر ایمان لائیں۔ اور " فَمَنْ تَوَلّٰی بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ " اس کی نسبت امتوں کے ساتھ ہے۔ لہٰذا انبیاء علیہم السلام سے اخذ میثاق، اور ان پر تاکید وتقریر اور تشدید فرمانا مقصود میں زیادہ قوی و داخل ہے۔

امام سبکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اشارہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بر تقدیر حیات انبیاء علیہم السلام ان کے زمانہ میں ان کی طرف مرسل ہیں لہٰذا آپ کی نبوت ورسالت عام ہے۔ اور تمام مخلوق کے لئے آدم علیہ السلام کے زمانہ سے قیامت تک شامل ہے اور تمام نبی اور ان کی امتیں سب آپ کی امت ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ " میں تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہوں " اور حق تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ " وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ " اور نہیں بھیجا ہم نے آپکو مگر تمام لوگوں کی طرف تو یہ ارشادات آپ کے زمانہ مبارک سے قیامت تک ہی کے لوگوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں۔ جو آپ سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اور انبیاء علیہم السلام سے آپ کے لئے اخذ میثاق اس لئے فرمایا گیا تا کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ آپ ان سب پر مقدم و معظم ہیں۔ اور آپ ان سب کے نبی ورسول ہیں صلی اللہ علیہ وسلم۔ لہٰذا اے طالبانِ صادق انصاف سے غور وفکر کرو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم وتکریم حق تعالیٰ کی جانب سے کتنی عظیم ہے۔ جب تم اسے جان لوگے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ سب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے امتی ہیں اور آپ نبی الانبیاء ہیں۔ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اسی جگہ سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ قیامت کے دن حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی تمام اولاد آپ کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔ جیسا کہ فرمایا " اٰدَمُ وَمَنْ دُوْنَہٗ تَحْتَ لِوَائِیْ " (آدم اور ان کے سوا سب میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے) اور بفرض اگر تمام نبی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کے زمانہ میں ہوتے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے زمانہ میں ہوتے تو وہ سب آپ پر ایمان لاتے۔ اور آپ کی مدد کرتے۔ اسی لئے فرمایا " لَوْ کَانَ مُوْسٰی حَیًّا مَا وَسِعَہٗ اِلَّا اتِّبَاعِیْ " اگر موسیٰ دنیاوی حیات میں زندہ ہوتے تو ان کو بجز میری اتباع کے کوئی چارہ نہ ہوتا۔ اور یہ اسی میثاق کی بنا پر ہوتا جو ان سے لیا گیا۔ لہٰذا حضرت عیسیٰ، علیہ السلام آخر زمانہ میں آپ کی شریعت پر تشریف لائیں گے۔ حالانکہ وہ عزت وکرامت والے اور اپنی نبوت پر باقی ہیں اور ان سے کسی چیز کی کمی نہیں کی گئی۔ اسی طرح دوسرے انبیاء کرام کی حیثیت ہے۔ وہ اپنی نبوت اور امت کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہیں۔ لہٰذا آپ کی نبوت اعم۔ اشمل اور اعظم ہے۔ اس معنی میں خوب غور کرو تا کہ اس جگہ انبیاء علیہم السلام سے ان کی نبوت ورسالت کی نفی کا گمان نہ لے جاؤ۔ اسی طرح مواہب لدنیہ نے کہا ہے۔ جتنا کچھ کہ کہا گیا ہے اس سے زیادہ اس کی تحقیق وتفصیل انہوں نے بیان فرمائی ہے۔

بندۂ مسکین یعنی شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پوشیدہ نہ رہنا چاہئے کہ بقرینہ ظاہر، واضح طور پر انبیاء علیہم السلام سے اخذ میثاق ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا " لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّحِکْمَۃٍ " (جب میں تم کو کتاب وحکمت دوں تو......)

امیر المومنین سیدنا علی مرتضیٰ اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تصریح سے ظاہر ہے کہ اخذ میثاق کے وقت انبیاء کرام علیہم السلام حضور علیہ السلام پر ایمان لاتے اور ان کی مدد کرتے کہ اس سے مراد، موافقت توثیقِ عہد یا قصد نصرت ہے جو عالم وجود میں آیا۔ اور بہت سے ایسے لوگ ہیں جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود عنصری سے پہلے ایمان لائے تھے۔ جیسے حبیب نجارؒ وغیرہ۔ اور زمانہ سابق میں بہت سے گزشتہ لوگ، آپ کے فضائل وکمالات اور نبوت کی خبر سننے سے مشرف ہو چکے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام اور ان کی امت کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہونے کے حکم میں اتنا ہی کافی ہے کہ آپ ان کی

طرف بھی رسول ہیں اور شب اسریٰ مسجد اقصیٰ میں انبیاء علیہم السلام اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سب یکجا جمع ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی امامت فرمائی اور سب نے آپ کی اقتداء کی۔ اس وقت وہ سب آپ پر ایمان لائے۔ اور انبیاء علیہم السلام کی حیات اور حیات حقیقی دنیاوی کے ساتھ ان کی بقاپر امت کا اتفاق ہے۔ اگرچہ انبیائے کرام کا اپنی اپنی امتوں سے نبی آخر الزماں پر ایمان لانا اور ان کی مدد کرنے پر عہد وپیمان لینا بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فضل وشرف ہے جو کسی دوسرے نبی کو نہ حاصل تھا۔ لیکن حق تبارک وتعالیٰ کا انبیاء کرام سے اس پر عہد ومیثاق لینا اعز واعظم ہے۔ فافہم وباللہ التوفیق۔

باہم تفصیل رسل :۔ وصل :۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یہ رسول ہیں جن کو ہم نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی۔ دوسری جگہ ارشاد ہے وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ اور بے شک ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی۔

یہ دونوں آیتیں انبیاء ومرسلین علیہم السلام کے مراتب کے متفاوت ومختلف ہونے میں نص ہیں کہ بعض، بعض پر افضل ہیں۔ یہاں پر معتزلہ کلام رہے۔ وہ قائل ہیں کہ بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت نہیں ہے۔ اور وہ سب برابر ہیں۔ اور ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام حق ابوت یعنی باپ ہونے کی وجہ سے افضل ہیں یہ قول فاسد ہے۔ اس لئے کہ گفتگو تو بحیثیت نبوت افضل ہونے میں ہے نہ کہ باپ ہونے میں۔ بسا اوقات فرزند باپ سے کمالات میں زیادہ فاضل ہوتا ہے۔ اگرچہ باپ حق ابوت رکھتا ہے۔ اور ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ اس مقام پر خاموشی زیادہ مناسب ہے۔ حالانکہ نص قرآنی کے بعد جو ایک دوسرے کی فضیلت پر ناطق ہے۔ خاموشی کی کون سی جگہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ ۔ کچھ نبیوں میں سے وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں کہ حق تعالیٰ نے ان سے بے واسطہ کلام فرمایا۔ حالانکہ موسیٰ علیہ السلام سے کلام کے ساتھ تخصیص نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ثابت ہے کہ حضور سید المرسلین صلوات اللہ علیہ وعلیہم اجمعین سے شب معراج بے واسطہ کلام فرمایا مگر یہ کہ موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمانا بوجہ خاص ہو۔ اور غالباً اسی وجہ تخصیص اور اس نعمت سے نوازے جانے پر ان کا غالب نام کلیم ہو گیا۔ جیسا کہ کہتے ہیں کہ انہوں نے کلام نفسی سنا یا کسی جہت سے سنا۔

اور جس وقت سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم فوق عرش گئے اور اس جگہ پہنچے جہاں مخلوق کے علوم کی حد وانتہا ہے اور جہاں تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسائی ہوئی وہاں تک رسائی کسی کو میسر نہ ہوئی تو وہاں آپ کلام اور ان درجات وکمالات سے نوازے گئے کہ جس قدر دوسروں کو حاصل ہوئے ان سے اعلیٰ اور اتم ہوں گے اور اسی معنی کی طرف حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ "وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ" (اور بعض کے درجات بلند کئے) مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس سے مراد حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اس ابہام میں آپ کی تعظیم، فضل اور اعلائے قدر ومنزلت ہے۔ اور جو کلام کے اسلوب کو جانتا ہے اس پر کچھ پوشیدہ نہیں ہے۔

علمائے کرام بیان کرتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام پر آپ کی جس فضیلت کا یہاں ذکر ہے۔ اس کی تین وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپ کے معجزات اور نشانیاں زیادہ ظاہر، مشہور، قوی اور روشن ہیں۔ یا آپ کی امت ازکی اعلم اور اکثر ہو گی۔ یا اپنی ذات میں آپ افضل واکمل اور اظہر ہوں۔ فضل ذاتی ان خصوصیات کی طرف راجع ہوتا ہے۔ جو اس نبی میں کرامات اور مراتب علیا کلام وغیرہ سے اختصاص موجود ہو۔ یا وہ خلت یا رؤیت وغیرہ الطاف وتحائف سے نوازا گیا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کے معجزات اور نشانیاں تو بہت زیادہ ظاہر، اتم روشن، اکثر باقی رہنے والی ہیں۔ اور آپ کا منصب اعلیٰ، آپ کا دبدبہ اعظم

وافر، اور آپ کی امت ازکیٰ، اعلم اور اکثر بحکم آیت قرآنی ہے کہ فرمایا " كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ " تم بہترین امت ہو۔ آپ کی امت اس خیر و بھلائی کے ساتھ موصوف ہے جس کا مفہوم تمام کمالات وفضائل کو شامل ہے اور آپ کی ذات اقدس اکمل واطہر ہے۔ اور آپ کی خصوصیات، کرامات اور کمالات زیادہ عظیم، مشہور تر اور ظاہر ہیں اور آپ کا درجہ تمام رسولوں کے درجات سے ارفع ہے اور تمام مخلوق سے ازکیٰ، اطہر اور افضل ہے صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ واتباعہ اجمعین ۔

شفاعت والی حدیث پر غور کیجئے کہ روز محشر ساری مخلوق خدا جمع ہو کر شفیع کی جستجو میں حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے پاس آئے گی اور شفاعت کی التجا کرے گی اور سب ہی اس مقام کی ذمہ داری قبول کرنے میں اپنے عجز و ناتوانی کا اعتراف کریں گے۔ اور فرمائیں گے کہ یہ کام ہمارا نہیں ہے۔ آخر میں یہ مخلوق سید المرسلین صلوات اللہ علیہم اجمعین کے حضور آئے گی اور آپ فرمائیں گے یہ کام میرا ہے پھر بارگاہ قدس میں حاضری دیں گے۔ آخر حدیث تک۔ اور فرمایا " أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ " میں اولاد آدم کا سردار ہوں۔ اور فرمایا " أَنَا أَكْرَمُ وُلْدِ آدَمَ " میں اولاد آدم میں بہترین ہوں۔ گویا کہ خدا کے نزدیک میں بہترین و بزرگ ترین اولاد آدم ہوں۔ بعض کہتے ہیں کہ " وُلْدِ آدَمَ " اور بنی آدم سے مراد عرف میں نوع انسانی ہے جس میں حضرت آدم علیہ السلام بھی داخل ہیں۔ چنانچہ ایک اور روایت میں ہے کہ " أَنَا سَيِّدُ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ " میں روز قیامت انسانوں کا سردار ہوں۔ اور سب سے بہتر استدلال اس حدیث سے ہے کہ فرمایا " آدَمُ وَمَنْ دُوْنَهُ تَحْتَ لِوَائِي " آدم اور ان کے ماسوا سب میرے جھنڈے کے نیچے ہیں اور بعضوں نے اس آیتِ کریمہ سے استدلال کیا ہے " خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ " جس قدر لوگ گزرے ان میں تم سب سے بہتر امت ہو۔ اس میں شک نہیں کہ امت کی افضلیت و خیریت دین میں کمال کے اعتبار سے ہے۔ اور یہ اپنے نبی کے کمال کے تابع ہے۔ کہ امت ان کی پیروی کرتی ہے۔

امام فخرالدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی تعریف اوصاف حمیدہ سے فرمائی ہے۔ چنانچہ ان میں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا " أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ " یہ وہ حضرات ہیں جن کی حق تعالیٰ نے ہدایت فرمائی ہے تو آپ ان کی راہ پر چلئے۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سب کی راہ پر چلنے کا حکم فرمایا تو لا محالہ امتثالِ امر اس کا بجالانا واجب ہوا۔ جب آپ بجالائے تو وہ تمام خوبیاں اور کمالات جو تمام نبیوں میں تھیں بلاشبہ آپ میں جمع ہو گئیں اور ہر خوبی و کمال جو متفرق اور جدا جدا تھے آپ میں یکجا جمع ہو گئے۔ اس طرح آپ ان سب سے افضل ہوئے۔ یہ استدلال لطیف ہے۔ اگرچہ بادی النظر و وہم میں ایسا آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء کی اقتداء و اتباع کا حکم فرمایا گیا ہے۔ اور آپ مفضول ہوئے لیکن اس جگہ اقتدا و اتباع سے مراد موافقت ہے۔ چونکہ انبیاء کرام آپ سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اس لئے لفظ اقتداء بولا گیا۔ اور یہی حال اس حکم کا ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ملتِ ابراہیم کے اتباع کا حکم فرمایا۔ نیز آپ کی دعوت تمام نبیوں کی دعوتوں سے زیادہ اکثر بلاد عالم میں پہنچی ہے۔ لہٰذا اہل دنیا کا آپ کی دعوت سے انتفاع کرنا بمقابلہ تمام نبیوں کی امتوں کے انتفاع دعوت، اکثر و اکمل ہے۔ لہٰذا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام نبیوں سے افضل ہوئے۔ " خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَّنْفَعُ النَّاسَ " بہترین و افضل ترین شخص وہ ہے جو لوگوں کو زیادہ نفع پہنچائے۔

فضائل صحابہ کے ضمن میں ایک حدیث ہے کہ سیدنا علی مرتضیٰ ایک دروازے سے نمودار ہوئے اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " هٰذَا سَيِّدُ الْعَرَبِ " یہ عرب کا سردار ہے۔ صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ کیا آپ سید العرب نہیں ہیں۔ فرمایا " أَنَا سَيِّدُ الْعَالَمِينَ وَعَلِيٌّ سَيِّدُ الْعَرَبِ " میں تمام جہان کا سردار ہوں اور علی عرب کے سردار ہیں۔

فائدہ : ۔ حاکم بیان کرتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے ۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ ضعیف ہے اور ذہبی نے اس کے وضعی ہونے کا حکم کیا ہے ۔ (واللہ اعلم)

لیکن قرآن کریم میں واقع ہوا ہے کہ "لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ" ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے ۔ اور صحیحین میں بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ "لَا تُفَضِّلُوْنِیْ عَلَی الْاَنْبِیَاءِ" مجھے نبیوں پر فضیلت نہ دو ۔ اور ایک روایت میں ہے "لَا تُفَضِّلُوْا بَیْنَ الْاَنْبِیَاءِ" نبیوں کے درمیان فضیلت نہ دو ۔ اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے ہے ۔ (لَا تُخَیِّرُوْا بَیْنَ الْاَنْبِیَاءِ" نبیوں کے درمیان فرق نہ کرو ۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں "مسلم کے نزدیک آیا ہے" کہ کسی بندہ کو لائق نہیں کہ وہ کہے کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں ۔ اور حضرت ابو ہریرہ کی حدیث جو صحیحین میں آئی ہے کہ جو کوئی یہ کہے کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں تو وہ بلاشبہ جھوٹ کہتا ہے ۔ ان کے جواب میں علماء فرماتے ہیں کہ اللہ عزوجل کے ارشاد "لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ" ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اس سے مراد، ایمان میں فرق کرنا ہے ۔ مطلب یہ کہ بعض پر تو ایمان لائیں اور بعض پر نہ لائیں ۔ جیسا کہ فرمایا "اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ" (بے شک جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کیا) "وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ" (اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں) "یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ" (اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لائے اور بعض کا انکار کرتے ہیں) حقیقت یہ ہے کہ کسی ایک رسول کی تکذیب تمام رسولوں کی تکذیب ہے ۔ اسی پر بعض علماء نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو محمول کیا ہے ۔ "اِنْ یُّکَذِّبُوْکَ فَقَدْ کُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِکَ" (اگر یہ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو آپ سے پہلے رسولوں کو بھی جھٹلایا گیا ہے) انبیاء و مرسلین کے درمیان ایمان میں برابری اس کے منافی نہیں ہے کہ بعض افضل ہوں ۔ اور حدیثوں کے جوابات متعدد وجوہ سے دیئے گئے ہیں ۔ بعض کہتے ہیں کہ تفضیل و تخییر کی ممانعت اس سے پہلے تھی کہ وحی کے ذریعہ معلوم ہو کہ آپ سید انبیاء افضل بشر اور سید ولد آدم ہیں ۔ لیکن اس کے قائل پر واجب ہے ۔ کہ اس کی تقدیم و تاخیر کو ثابت کرے ۔ بعض کہتے ہیں کہ ایسے طریقے پر فضیلت نہ دی جائے کہ مفضول کی تنقیص و اہانت لازم آئے ۔ بعض کہتے ہیں کہ ممانعت تفضیل، نبوت و رسالت کی اصل میں ہے اس لئے کہ تمام نبی، اصل نبوت میں حدِ واحد پر ہیں ۔ باعتبار نبوت ان میں باہم فضیلت نہیں ہے ۔ بلکہ تفاضل اس کے سوا زائد امور میں ہے ۔ مثلاً بعض رسول ہیں اور بعض نبی و اولوالعزم ہیں ۔ لیکن یہ بات خطا سے خالی نہیں ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ میں اسے فضیلت دیتا ہوں جس کے درجہ کو اللہ رب العزت نے خصائص قرب سے بلند فرمایا ہے ۔ اور امت کی سیاست ان کے ڈرانے، دین پر صبر کرنے، ادائے رسالت پر قائم رہنے اور گمراہوں کی ہدایت پر خواہش رکھنے پر کسی سے تعرض نہیں کرتا ۔ اس لئے کہ ہر ایک نے اپنی مقدور کی حد تک، اپنی جہد و سعی کو صرف فرمایا ہے ۔ اور اس سے زیادہ انہیں اللہ تعالیٰ نے مکلف نہیں فرمایا ۔ فافہم ۔ بعض کہتے ہیں کہ ہم اعتقاد رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبیوں کے درمیان ایک کو دوسرے پر اجمالی طور پر فضیلت دی ہے ۔ لیکن ہم اپنی ذاتی رائے سے فضیلت دینے سے باز رہتے ہیں اس لئے کہ ہم کسی کی فضیلت اپنی رائے سے نہیں بیان کر سکتے ۔ بلکہ بحکم کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فضیلت دے سکتے ہیں ۔ جیسا کہ دلائل سے پہلے گذر چکا ہے ۔

ابن ابی جمرہ جو کہ اعاظم علماء مالکیہ میں سے ہیں "حدیث یونس" کے بارے میں فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سے مراد جہت، تحدید، اور تکییف کی نفی حق سبحانہ سے ہے ۔ چنانچہ ابن خطیب رَے یعنی امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں کہ فرمایا مجھے حضرت یونس علیہ السلام پر فضیلت اس حیثیت سے نہیں ہے کہ مجھے آسمان پر لے جایا گیا ۔ اور حضرت یونس کو دریا کی گہرائیوں میں

اتار گیا۔ اور یہ کہ میں خدا کے قریب ہوں اور وہ دور تر لہٰذا اس حیثیت سے ان پر میری فضیلت کو ثابت کرنے سے لازم آتا ہے کہ حق تعالیٰ سبحانہ کے لئے بھی جہت و مکان ثابت کیا جائے۔ (اور یہ باطل ہے) اگرچہ مجھے آسمان کے ساتوں طبقوں پر لے جایا گیا اور حجاب اٹھادیئے گئے اور حضرت یونس علیہ السلام کو دریا کی گہرائیوں میں اتار گیا۔ مگر حق تعالیٰ سے میرے اور ان کے قرب کی نسبت برابر ہے۔ اور انبیاء و یونس علیہم السلام سے افضلیت ثابت کرنے کے سوا میرے دیگر فضائل و کمالات ثابت ہیں۔ اس طرح مجھے فضیلت دینے سے جہت لازم آتی ہے۔ یہ بات امام دارا لہجرۃ یعنی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے اور امام الحرمین سے بھی ایسی ہی حکایت منقول ہے۔ بعض فضلاء کا اس میں اختلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم وجود باری تعالیٰ کے لئے اثباتِ مکان کی جہت سے فضیلت نہیں دیتے۔ کیونکہ وجود باری تعالیٰ سے تمام جہتوں کی نسبت برابر ہے بلکہ ملاء اعلیٰ یعنی آسمانی مخلوق کو حضیض ادنیٰ یعنی اہل زمین پر جو فضیلت حاصل ہے اور اس عالم کی نسبت سے اس عالم کو جو شرف ہے اس جہت سے ہم حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر و منزلت کو حضرت یونس علیہ السلام پر فضیلت دیتے ہیں۔ گویا کہ یہ فضیلت مکانیت یعنی قدر و منزلت سے ہے نہ کہ مکان سے۔ لہٰذا تفضیل کی ممانعت، مکان کے ساتھ مقید ہے کہ اس سے قربِ مکانی کا مفہوم حاصل ہوتا ہے۔ (یہ ہمارا مقصود نہیں) فلیتامل۔

مسئلہ فضلِ بشر بر ملک:۔ فرشتوں پر بشر کی افضیلت کا مسئلہ جس پر جمہور اہل سنت و جماعت کا مسلک ہے۔ اس تفصیل سے مشہور ہے کہ خواص بشر یعنی انبیاء علیہم السلام خواص ملائکہ پر یعنی حضرت جبریل، میکائیل، اسرافیل، عزرائیل، حاملان عرش، مقربین، کروبیان اور روحانیین پر فضیلت رکھتے ہیں۔ اسی طرح مواہب لدنیہ میں تفسیر کی گئی ہے اور عقائد نسفی کی عبارت یہ ہے کہ "رُسُلُ الْبَشَرِ اَفْضَلُ مِنْ رُسُلِ الْمَلٰئِکَۃِ" یعنی "رسولانِ بشر" فرشتوں کے رسولوں سے افضل ہیں۔ فرشتوں کی وہ جماعت جن کا ذکر ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ فرشتوں کے مرسلین ہیں۔ کیونکہ یہ مرسلین ملائکہ فرشتوں کی جماعتوں کو تبلیغ احکامِ الٰہی اور تعلیم دیتے ہیں۔ اور عوام بشر جن سے مراد اولیاء و صلحاء و اتقیاء ہیں۔ نہ کہ فساق و فجار (تو یہ عامہ ملک سے افضل ہیں جو کہ غیر مرسلین ملائکہ ہیں)

فائدہ:۔ شعب الایمان میں اس پر عاصیوں، فاسقوں کی تنقیص کی گئی ہے اس کی عبارت جیسا کہ نقل کیا گیا ہے یہ ہے کہ ملائکہ اور بشر کے بارے میں پرانے لوگ اور آج کے لوگ بحث کرتے ہیں چنانچہ یہ فیصلہ کرنا ہے کہ رسل بشر رسل ملائکہ سے افضل ہیں۔ اور اولیاء بشر اولیاء ملائکہ سے افضل ہیں (انتہیٰ) "اور جمہور اہل سنت والجماعت" کہتے ہیں کہ بعض اشاعرہ ملائکہ کی افضیلت کی طرف گئے ہیں۔ اور قاضی ابو بکر باقلانی جو اس مذہب کے بہترین فاضل اور شیخ ابو الحسن اشعری رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں۔ ان کے نزدیک مسلک مختار یہی ہے۔ عبداللہ حلیمی بھی اسی جانب ہیں اور امام غزالی کے کلام سے بھی بعض مقامات میں مفہوم نکلتا ہے اور بعض کا مذہب یہ ہے کہ بحیثیت مجرد اور قرب کے ملائکہ افضل ہیں۔ اور کثرتِ ثواب کے لحاظ سے بشر افضل ہیں۔ اہلِ سنت کی افضلیت سے مراد، کثرتِ ثواب ہے جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں کہا گیا ہے۔

شیخ تاج الدین سبکی رحمہ اللہ جو علمائے شافعیہ میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ساری عمر مسئلہ افضلیت سے بچا رہے نہ اس کی نفی کرے اور نہ اثبات کرے تو میں امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن اس سلسلے میں اس سے کچھ بھی نہ پوچھا جائے گا۔

فرشتوں میں بھی بعض، بعض سے افضل ہیں۔ اور ان میں سب سے افضل حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں کہ ان کو "روح الامین" کہا جاتا ہے۔ وہ مظہر علم اور حاملِ وحی ہیں۔ ان کے علاوہ تین فرشتے تمام فرشتوں سے افضل ہیں۔ تمام رسول، تمام نبیوں سے افضل ہیں۔ اور بعض رسول بھی بعض سے افضل ہیں۔ اور حضور اکرم احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء و مرسلین سے افضل ہیں۔ آپ سید المرسلین، خاتم النبیین اور تمام مخلوق سے افضل ہیں۔ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَفْضَلَ مَا صَلّٰی عَلٰی

اَحَدٍ مِّنَ الْاَنْبِيَاۤءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ هُدَاةِ طَرِيْقِ الْحَقِّ وَمُحْيِيْ عُلُوْمِ الدِّيْنِ۔

انبیاء علیہم السلام کی تعداد میں بھی اختلاف ہے۔ اس باب میں حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی حدیث مشہور ہے۔ جسے ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! انبیاء کتنے ہیں؟ فرمایا ایک سو چوبیس ہزار۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ! رسول کتنے ہیں فرمایا تین سو تیرہ (والعلم عند اللہ تعالیٰ)

وہ نبی جن کے نام قرآن میں مذکور ہیں۔ یہ ہیں۔ حضرت آدم، ادریس، نوح، ہود، صالح، ابراہیم، لوط، اسماعیل، اسحٰق، یعقوب، یوسف، ایوب، شعیب، موسیٰ، ہارون، یونس، داؤد، سلیمان، الیاس، الیسع، زکریا، یحیٰی، عیسیٰ، اسی طرح اکثر مفسرین کے نزدیک الکفل ہیں۔ اور قرآن مجید میں حق تعالیٰ فرماتا ہے بعض نبیوں کے قصے تو آپ پر بیان کر دیئے ہیں۔ اور بعض کے ہم نے نہیں بیان کئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام نبیوں کے قصے نہیں بیان کئے گئے۔

خصوصی قدر و منزلت:۔ وصل:۔ اللہ رب العزت سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو منزلت و کرامت قرآن کریم میں ظاہر فرمائی گئی ہے اس میں سب سے اعظم و اعلیٰ قصہ اسریٰ (معراج) سورۂ سبحان الذی اسریٰ میں اور دَنٰی فَتَدَلّٰی (قریب ہوئے اور زیادہ قریب ہوئے) سورۂ النجم میں مذکور ہے۔ یہ آپ کے اعظم قدر و منزلت اور علوِ درجت اور قرب و مشاہدۂ آیات و عجائب قدرت جل وعلا پر مشتمل ہے۔ انہیں میں سے آپ کو اعداء خصوصاً مشرکین مکہ و مدینہ سے محفوظ رکھنا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:۔

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔ اور اللہ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو حفاظت و نگہبانی کے لئے مقرر فرمایا کرتے تھے۔ اور اس طرح آپ دشمنوں کے شر و فساد سے اجتناب اور بچاؤ کرتے تھے۔ اور یہ تحفظ بھی اگرچہ بحکم الٰہی اور اس کی حکمت بالغہ کے تحت تھا لیکن جب یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی تو آپ دشمنوں کے مکر و فریب سے بے نیاز ہو گئے۔ چنانچہ فرمایا۔

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ جب یہ کافر لوگ آپ کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ آپ کو یا تو محبوس کر دیں یا قتل کر دیں یا نکال دیں............

یہ کیفیت ہجرت کے ابتدائی دنوں کی تھی اور آپ کی ہجرت اسی بناء پر تھی۔ چنانچہ اس کا قصہ مشہور ہے اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اگر تم محبوب کی مدد نہ کرو تو یقیناً اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے گا۔

چنانچہ اس قصہ میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جانب مشرکوں کی ایذاؤں کو ان کی گروہ بندی اور آپ کے بارے میں ان کے اختلاف آراء سے دفع فرمادیا۔ ان کے روبرو آپ کے نکلنے کے وقت اللہ نے کفار کی آنکھوں کو اندھا کر دیا اور غار ثور میں اس یقین کے باوجود کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس میں ہوں گے۔ آپ کی جستجو میں غفلت ڈال دی۔ اور ان کے ارادوں کو پھیر دیا۔ اور نشانیوں کا ظہور، سکینہ یعنی اطمینان و سکون کا نازل ہونا اور حق سبحانہ وتعالیٰ کی معیت کا مشاہدہ کرنا یہ ایسے عظیم ترین معجزات اور آیات ہیں جن کا تذکرہ اپنی جگہ پر آئے گا۔ حق تعالیٰ جل شانہ کی طرف سے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت و عصمت میں ارشاد ہے۔ "اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" جب اپنے رفیق سے فرما رہے تھے کہ غم نہ کرو۔ بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

اس سے ملتا جلتا معاملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی پیش آیا۔ جس وقت آپ بنی اسرائیل کے ساتھ نکلے اور فرعون اور

اس کے لشکریوں نے ان کا پیچھا کیا تو بنی اسرائیل ڈرے کہ فرعونی انہیں پکڑلیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا "نہ ڈرو ان معی ربی" بیشک میرے ساتھ میرا رب ہے۔ لیکن علماء فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدہ رب میں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشاہدۂ رب میں فرق ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اول نظر وجودِ باری تعالیٰ پر پڑی۔ اس کے بعد دوسری نظر اپنے آپ پر۔ کہ فرمایا "ان اللہ مَعَنَا" (اللہ ہمارے ساتھ ہے۔) اور موسیٰ علیہ السلام کی اول نظر اپنے آپ پر پڑی اس کے بعد دوسری نظر وجودِ باری تعالیٰ پر۔ اور فرمایا "اِنَّ مَعِیَ رَبِّی" (میرے ساتھ میرا رب ہے) یہ دونوں قسمیں شہود وقرب کے اقسام سے ہیں مگر اول اتم واقرب۔ بمصداق "مَارَأَیْتُ شَیْئًا اِلَّا وَرَأَیْتُ اللہَ قَبْلَہٗ لَاثَانِیْ مَارَأَیْتُ شَیْئًا اِلَّا وَرَأَیْتُ اللہَ بَعْدَہٗ" یعنی میں نے کچھ نہیں دیکھا مگر یہ کہ سب سے پہلے اللہ کو دیکھا اور دوسرے میں یہ کہ میں نے کچھ نہیں دیکھا مگر اللہ کو اس کے بعد دیکھا۔ اول میں طریقِ جذب ہے۔ اور دوسرے میں طریقِ سلوک۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ بلاشبہ میں نے سبع مثانی اور قرآن عظیم آپ کو عطا فرمایا۔ سبع مثانی سے مراد وہ سات لمبی سورتیں ہیں جو قرآن کی سورتوں میں پہلے مذکور ہیں۔ یعنی سورۂ بقرہ سے آخر سورۂ انفال یا سورۂ توبہ تک۔ کیونکہ یہ حکم میں ایک سورۃ کے ہیں۔ اسی لئے ان دونوں سورتوں کے درمیان "بسم اللہ" سے فصل نہیں کیا گیا ہے۔

فائدہ:۔ قرآن عظیم کی سات آیتیں ام القرآن یا سبع مثانی ان کے سوا ہیں باقی کا نام قرآن عظیم ہے۔ چونکہ اس کی تکرار یا تو ہر رکعت میں ہے یا باعتبار تکرارِ نزول ہے۔ اس لئے ام القرآن کا نام سبع مثانی پڑا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان سات آیتوں کا استثنا فرمایا اور آپ کے لئے ان کو ذخیرہ بنایا ہے۔ آپ کے سوا کسی نبی کو یہ مرحمت نہ فرمایا گیا۔ اور قرآن کا "مثانی" سے موسوم کرنا یا تو اس بنا پر ہے کہ ان میں قصص بار بار دہرائے گئے ہیں۔ یا اس بنا پر کہ ان میں حق تعالیٰ جل جلالہ کی حمد وثنا کی گئی ہے یا اس بنا پر کہ اس کی حمد وثنا بلاغت واعجاز کے ساتھ کی گئی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں ارشاد فرمایا:۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا — اور نہیں بھیجا ہم نے آپکو مگر تمام لوگوں کی طرف بشارت دینے والا اور ڈرانے والا۔

اور ارشاد فرمایا:۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا — فرمادو اے لوگو! بیشک میں اللہ کی طرف سے رسول تم سب کی طرف ہوں۔

مزید ارشاد ہے:۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ — اور ہم نے کسی رسول کو نہ بھیجا مگر ان کی اپنی قوم کی زبان میں تاکہ انہیں خوب خوب بیان فرمائے۔

یعنی رسولوں کی تخصیص فرمائی گئی کہ وہ انہیں کی قوم میں سے ہوں گے۔ لیکن سید عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری مخلوق کی طرف بھیجا۔ جیسا کہ ارشاد ہے:۔

بُعِثْتُ اِلَى الْاَسْوَدِ وَالْاَحْمَرِ۔ — مجھے عرب وعجم کی طرف بھیجا گیا۔

اسود سے مراد عجم ہیں۔ کیونکہ ان کا رنگ سبزی مائل ہے۔ اور احمر سے مراد عرب ہیں کیونکہ ان کا رنگ سرخ وسفید ہے۔ اور ارشاد فرمایا:۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ — نبی پاک مسلمانوں کی جانوں سے زیادہ قریب ہیں۔ اور آپ کی ازواج مسلمانوں کی مائیں ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ نبی پاک کا حکم نافذ و جاری ہے۔ جس طرح آقا کا حکم غلاموں پر نافذ ہوتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ کے حکم کی پیروی، اپنی ذاتی رائے کی پیروی سے زیادہ بہتر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت واتباع کے اعتبار سے وجوب کے باب میں تفصیل کے ساتھ واضح کر دیا گیا ہے۔ کہ آپ کی بیبیاں مسلمانوں کی مائیں ہیں۔ یہ حکم آپ کے بعد آپ کی خصوصیت و کرامت کی وجہ سے حرمت نکاح میں ہے اور ایسا اس وجہ سے بھی ہے کہ یہ ازواج آخرت میں آپ کی بیبیاں ہیں اور ایک شاذ قرات میں آیا ہے کہ "هُوَ اَبٌ لَّهُمْ" (نبی ان کے باپ ہیں) حق تبارک و تعالیٰ نے آپ کی مدح و ثنا میں ارشاد فرمایا:۔

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ عَظِیْمًا — اور اللہ نے آپ پر کتاب و حکمت نازل فرمائی اور آپ کو وہ سب کچھ سکھا دیا جو آپ نہ جانتے تھے۔ اور اللہ کا فضل آپ پر بہت بڑا ہے۔

فضل عظیم کے ادراک اور اس کی اصل تک رسائی کسی کے لئے ممکن نہیں۔ کہتے ہیں کہ اس میں رویت الٰہی کی طاقت و برداشت کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کی تاب و طاقت نہ رکھ سکے تھے۔ ایسی آیاتِ قرآنیہ جن میں آپ کے فضل و شرف کا بیان ہے بہت ہیں۔ درحقیقت قرآن سب کا سب بعد از حمد و ثنائے الٰہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و کمالات کے بیان کا مظہر ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات اور فضائل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مشرکین اور دشمنانِ دین نے جس جگہ بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف طعن و تنقیص کی نسبت کی ہے حق سبحانہ و تعالیٰ نے بذاتِ خود متکفل ہو کر آپ سے اس کا دفعیہ فرمایا ہے۔ محب کی ایسی ہی عادت ہوتی ہے کہ جب وہ کسی سے اپنے حبیب کی بدگوئی سنتا ہے اسے وہ اپنے اوپر لے کر اس کے جواب اور اس کے الٹ دینے کے درپے ہوتا ہے۔ اور اپنے حبیب کو نصرت بخشتا ہے۔ درحقیقت اس کا رد، زیادہ بلیغ اور اس کی نصرت و اعانت، زیادہ قوی و بلند ہوتی ہے۔ چنانچہ جب کفار نے کہا:۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ — اے وہ جس پر قرآن نازل کیا گیا ہے یقیناً بلاشبہ تم دیوانے ہو (معاذ اللہ)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

مَاۤ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۚ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْنٍ ۚ وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ — اے محبوب آپ اپنے رب کے فضل سے دیوانے نہیں ہیں اور بلاشبہ آپ کے لئے نہ ختم ہونے والا اجر ہے اور یقیناً آپ کی خو بو بڑی اور عظیم ہے۔

اور جس کسی کی یہ خوبیاں ہوں وہ دیوانہ کیسے ہو سکتا ہے۔

چنانچہ جب عاص بن وائل سہمی نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام سے باہر تشریف لا رہے ہیں اور وہ اندر جا رہا تھا تو اس نے باب بنی سہم کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور کچھ باتیں کیں۔ اس وقت اشقیاء قریش یعنی کفار قریش مسجد حرام میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب عاص مسجد حرام میں داخل ہوا تو وہ کفار قریش اس سے پوچھنے لگے کہ تو کس سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے کہا اسی ابتر (بے اولادے) سے۔ مطلب اس کا یہ تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرزند حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے تولد

ہوا تھا اور اس کا انتقال ہو چکا تھا اور اس وقت حضور ﷺ کی اولاد میں کوئی فرزند نہ تھا تو اس کا جواب حق تعالیٰ نے یہ دیا کہ۔

إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ۝ — جو آپ کا بدگو اور دشمن ہے وہی ابتر اور بے نسلا ہے۔

اور جب کفار نے کہا "لَسْتَ مُرْسَلًا" یعنی آپ رسول نہیں ہیں تو حق تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ۔

يٰسٓ ۝ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ — اے سید عالم! قسم ہے حکمت والے قرآن کی بلاشبہ یقیناً آپ رسولوں میں سے ہیں۔

اور کفار نے کہا۔

اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ۝ — یعنی کیا ہم دیوانے شاعر کے لئے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟

تو اس پر حق تعالیٰ نے فرمایا۔

بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ — بلکہ وہ تو حق لائے ہیں اور انہوں نے رسولوں کی تصدیق فرمائی۔

اور فرمایا۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ — ہم نے ان کو شعر گوئی نہ سکھائی اور نہ وہ ان کے لائق ہے۔

اور جب کفار نے کہا۔

لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ — یعنی اگر ہم چاہیں تو ایسا کہہ سکتے ہیں۔ نہیں ہے یہ مگر پہلوں کی کہانیاں۔

اس پر حق تعالیٰ نے فرمایا۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ — اے حبیب فرمادو، اگر تمام انسان اور جنات اس قرآن کی مثل لانے پر جمع ہو جائیں تو اس کی مثل نہ لا سکیں گے۔

اور جب کفار نے کہا۔

مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ — اس رسول کو کیا ہوا کھانا کھاتے اور بازاروں میں چلتے ہیں۔

اس پر حق تعالیٰ نے فرمایا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۔ — اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے کسی رسول کو مگر یہ کہ یقیناً کھانا کھاتے اور بازاروں میں چلتے تھے۔

اور جب کفار نے انسانوں میں سے رسول کے مبعوث ہونے کو بعید جانا تو حق تعالیٰ نے فرمایا۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۔ — تم فرماؤ۔ اگر زمین میں فرشتے ہوتے چین سے چلتے تو ان پر آسمان سے ہم رسول بھی فرشتہ اتارتے۔

مطلب یہ کہ اگر ہم جنس ہونے میں انسیت و محبت پیدا ہوتی ہے تو غیر جنس میں بتاین اور غیریت۔ لہٰذا یہی قرین حکمت ہے کہ ملائکہ کے لئے ملک مبعوث ہو اور زمین والوں کے لئے بشر مبعوث ہو اور تمام نبی اپنی ذاتوں سے خود اپنی مدافعت کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا "لیس بی ضلالۃ" مجھ میں کج روی نہیں ہے۔ اور حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا "لیس بی سفاھۃ" مجھ میں نادانی نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ایسی مثالیں بہت ہیں۔ واللہ اعلم

ازالہ شبہات از بعض آیاتِ مبہمات

وصل:۔ اب ان شبہات کو دور کیا جاتا ہے۔ جو قرآن کریم کی بعض مبہم اور موہوم آیتوں سے جو لاعلمی، یا کجروی سے بادی النظر میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ رفیع میں نقص وخطا کا اشتباہ پیدا کرتی ہیں۔ یہ درحقیقت متشابہات کے قبیل سے ہیں اور علماء نے ان کی مناسب تاویلات اور لائق معانی کر کے حق تعالیٰ کی طرف راجع اور محوّل ٹھہرایا ہے۔ اسی قبیل سے حق سبحانہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ "وَوَجَدَکَ ضَالًّا فَھَدٰی" (اور آپ کو وارفتہ پایا تو راہ دی۔)

گویا اسے قبل بعثت کی (معاذ اللہ) ضلالت کی طرف منسوب کرتے۔ اور اس کا ازالہ ہدایت سے کرتے ہیں۔ حالانکہ علماء کا اتفاق ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ قبل از نبوت اور نہ بعد از نبوت ہرگز ضلالت سے متصف وموسوم نہ ہوئے۔ آپ کی تخلیق اور نشوونما، توحید، ایمان اور عصمت پر ہے۔ یہی حال تمام انبیاء ومرسلین علیہم السلام کا ہے۔ اور اہل اخبار میں سے کسی ایک نے بھی ایسے شخص کے بارے میں بیان نہیں کیا ہے۔ جسے نبوت ورسالت اور اصطفا واجتباء کے ساتھ نوازا گیا ہو اور وہ اس سے پہلے (معاذ اللہ) کفر و شرک اور فسق وضلالت میں مبتلا ہو چکا ہو۔ ہاں اس میں البتہ اختلاف ہے کہ آیا عقلاً یہ جائز ہے یا نہیں؟ معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ عقلاً جائز نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تنفر اور دوری کا موجب ہے لیکن ہمارے اصحاب اہل سنت کے نزدیک یہ عقلاً جائز ہے کہ حق تبارک وتعالیٰ کسی کو ضلالت کے کنوئیں سے نکال کر ہدایت فرما کر مرتبہ نبوت تک پہنچادے مگر نقل اور "دلیل سمعی" اسی پر ہے کہ یہ امر جائز کبھی عالم وقوع میں نہیں آیا۔ کیونکہ تمام انبیاء علیہم السلام قبل از نبوت بھی خدا کی ذات وصفات کے عدمِ عرفان یا اس میں شک وشبہہ کرنے سے بھی پاک ومعصوم ہیں۔ کفر ومعاصی اور ہر اس چیز سے، جو موجب نقص ونفرت ہو محفوظ رہے۔ نبوت سے پہلے اور بعد میں سہو ونسیان، غلطی وغفلت بحالت جوش وغضب اور جملہ وہ چیزیں جو ملت کی تشریع اور امت کی تبلیغ سے متعلق ہیں اور کبائر سے مطلقاً اور صغائر سے عمداً معصوم اور مامون ہیں۔ خصوصاً سید انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کہ آپ کی عصمت اتم واکمل اور آپ کا مرتبہ اعلیٰ وارفع ہے اور جو کوئی بھی آپ کی جناب میں اپنی رائے سے خلافِ ادب دم مارے وہ ساقط ہے اور وہ ضلالت کے اسفل ترین تاریک گڑھے میں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس تو اول سے ہی ایسی پاک اور آراستہ وپیراستہ ہے کہ عیب ونقص کا کوئی ہاتھ آپ کے عزت وجلال کے دامن سے مس ہونے کی تاب وطاقت ہی نہیں رکھتا۔ بیت۔

بہ تعلیم و ادب اوراچہ حاجت　　　که او خود ز آغاز آمد و مؤدب

لیکن حق تعالیٰ کی تربیت وتعلیم اور تائید قرآن بتدریج آہستہ آہستہ قوت سے فعل کی طرف لاتی ہے یہاں تک کہ باری عزاسمہ، کے وہ وعدے جو آپ سے کئے گئے تھے اوقاتِ مخصوصہ میں جب ان کا ظہور ہوتا تو وہ موجب کمالِ یقین اور انکشاف تام ہو جاتا تھا۔ چنانچہ بسا اوقاتِ ظہور معجزہ اور شہود قدرت باری عزوجل کے وقت آپ فرماتے "اَشْھَدُ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ" (میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اللہ کا رسول ہوں) اگر کوئی یہ سوال کرے کہ تمام اہلِ کمال کا یہی حال ہے کہ جو کچھ ان کے ظرف واستعداد میں پیدا کیا گیا ہے۔ وہ بتدریج اور بترتیب ظہور میں آتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ استعداد، قرب وبعد کے تفاوت اور فرق کے اعتبار پر ہے کیونکہ اہلِ کمال کا کمال کسبِ ریاضت سے وجود میں آتا ہے۔ لیکن یہاں سب کا سب بالفعل موجود وثابت ہے۔ لیکن پردہ میں مستور ہے۔ (یعنی عالم غیب میں موجود ہے) جس کا ظہور وقت کے ساتھ موقوف ہے۔ اور جو بتقریب نزول قرآن، بغیر سبب کسب وریاضت ظہور میں آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تہذیب وادب سکھانا یہ ہے کہ وہ آپ کو نقص وعیب سے کمال کی طرف اور عدم سے وجود کی طرف لاتا ہے۔

اس گروہ کے کچھ لوگ آپ کے جوہر قدس میں صفات بشریت کی بقا اور احکام طبیعت اور احکام نفس کی جزئیات کا اثبات کرتے ہیں۔ اور اسے بے صبری و تزلزل جیسے افعال کا مبدء و منشاء قرار دیتے ہیں۔ اور حکمت تشریع اور شرف اتباع کی دریافت کو اس کا باعث سمجھتے ہیں اور نزول قرآن کو تہذیب سکھانے اور اس کے ازالہ کا موجب کہتے ہیں۔ یہ لوگ بہ اقتضائے ذاتی علم و فہم سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال کی حقیقت جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور ایسا گمان رکھتے اور ایسی بات کہتے ہیں جو اس مسکین (صاحب مدارج النبوۃ) کے ذوق اعتقاد پر گراں ہے۔ حقیقتاً آپ کے احوال کو دوسروں کے احوال پر قیاس کرنا درست نہیں ہے۔

او برتر از آن ست کہ آید بخیال

اس بحث کا کچھ حصہ چونکہ اخلاق شریف کے باب میں گزر چکا ہے اس لئے تکرار کی حاجت نہیں ہے۔ اس جگہ وہ باتیں بیان کی جائیں گی جو گمراہ و کجرو لوگوں کو شک و شبہہ میں ڈالتی ہیں۔ ان کے ذکر سے اس مسکین (صاحب مدارج النبوۃ) کی زبان وقت، اگر چہ ان کے شبہ کے ازالہ اور دفع کرنے کے طریق پر ہے پھر بھی بیزاری ہے۔ لیکن جب علماء ان کے درپے ہوئے ہوں۔ اور انہوں نے اس میں مصلحت دیکھی ہو تو ہم بھی ان کی تبعیت میں چلنے سے مجبور ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ عاقبت بخیر ہو۔

جاننا چاہئے کہ اس جگہ ادب اور قاعدے کو جسے بعض اصفیاء اور اہل تحقیق نے بیان کیا ہے۔ ذہن میں رکھنا اور اس کی رعایت کرنا موجب حلِ اشکال اور سبب سلامتِ حال ہے وہ قاعدہ اور ادب یہ ہے کہ اگر حضرت ربوبیت جل وعلا کی جانب سے، کوئی خطاب، کوئی عتاب، کوئی دبدبہ، کوئی غلبہ، کوئی استغنا اور کوئی برتری ایسی واقع ہے جیسی کہ "انک لاتہدی" (بے شک آپ بالذات ہدایت نہیں دے سکتے۔) "اور لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ" (تمہارے کام ضرور باطل ہو جائیں گے) اور لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ" (نہیں ہے آپ پر کسی معاملہ کی ذمہ داری) اور تُرِیْدُ زِیْنَۃَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا" (تم دنیوی زندگی کی زیبائش کا ارادہ کرتے ہو) اس قسم کی اور بھی مثالیں ہیں۔ یا یہ کہ از جانب نبوت، بندگی، انکساری، احتیاج، عاجزی اور مسکینی کا ظہور ہو جیسے "اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ" (میں تم جیسا بشر ہی ہوں) "وَاَغْضَبُ کَمَا یَغْضَبُ الْعَبْدُ" (اور میں غصہ کرتا ہوں جیسے لوگ غصہ کرتے ہیں) "وَمَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ" (اور مجھے معلوم نہیں کہ میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ خدا کیا کرے گا) "وَلَا اَعْلَمُ مَا وَرَآءَ ہٰذَا الْجِدَارِ (اور میں بالذات نہیں جانتا کہ اس دیوار کے پیچھے کیا ہے) اس قسم کے تمام وہ اقوال جو وجود میں آئے ہمیں لازم نہیں ہے اور نہ ہمارا یہ مقام ہے کہ ہم اس میں دخل دیں یا اشتراک ڈھونڈیں اور خوشی کا اظہار کریں۔ بلکہ ہمیں ادب و سکوت کی حد پر رہتے ہوئے تحاشی (بیزاری) اور خاموشی کا اظہار کرنا چاہئے۔ آقا کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے بندے کو جو کچھ چاہے کہے۔ اور برتری و غلبہ کا اظہار فرمائے۔ اور بندہ بھی اپنے آقا کے حضور بندگی اور عاجزی کرتا ہے۔ کسی دوسرے کو کیا مجال اور کیا تاب و تواں ہے کہ وہ اس مقام میں داخل ہو۔ دخل اندازی کرے۔ اور حد ادب سے باہر ہو جائے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں بہت سے کمزوروں، جاہلوں کے پاؤں کے ڈگمگا جانے سے خود انہیں کا نقصان ہوتا ہے۔ "وَمِنَ اللّٰہِ الْعِصْمَۃُ وَالْعَوْنُ" اللہ کی جانب سے تحفظ اور نصرت ہے۔ اب واضح رہنا چاہئے کہ آیہ کریمہ:۔

وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی ○

اور پایا آپ کو وارفتہ تو راہ دی۔

مفسرین نے اس کی تفسیر و تاویل میں متعدد وجوہ بیان کئے ہیں اول یہ کہ پایا آپ کو معالم نبوت اور احکام شریعت سے ناواقف و وارفتہ یہ قول سیدنا ابن عباس، حسن، ضحاک اور شہر بن حوشب کا ہے۔ اس کی تائید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ

آپ نہیں جانتے کہ کتاب و ایمان کیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ آپ وحی سے پہلے قرآن کریم کو پڑھنا اور مخلوق کو ایمان کی دعوت دینا نہ جانتے تھے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ایمان

سے مراد فرائض واحکام ہیں ورنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وحی سے پہلے توحید حق پر ایمان رکھتے تھے اس کے بعد وہ فرائض نازل ہوئے۔ جو آپ کو دریافت نہ تھے۔ یا پھر ایمان سے مراد شریعت کی تفصیلات یا نماز مراد ہے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا:۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ اللہ تمہارے ایمان یعنی نماز کو ضائع نہیں فرماتا۔

مطلب یہ کہ جو نمازیں تم نے تحویل قبلہ سے قبل بیت المقدس کی طرف رخ کر کے پڑھی ہیں ان کو اللہ ضائع نہیں فرمائے گا۔

حدیث پاک میں مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی توحید بجالاتے، بتوں کو دشمن جانتے اور زمانہ جاہلیت میں حج و عمرہ ادا کرتے تھے۔ اور حدیثوں میں آیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے نہ تو کبھی شراب پی۔ اور نہ کبھی بتوں کی پوجا اور میں جانتا تھا کہ قریش کفر پر ہیں۔ حالانکہ میں قرآن پاک اور ایمان کی تفصیلات سے واقف نہ تھا۔ مروی ہے کہ قریش بھی دین اسماعیل علیہ السلام کے کچھ بچے کھچے احکام پر عامل تھے۔ مثلاً حج، ختنے اور غسل جنابت وغیرہ۔

دوم یہ کہ مرفوعاً مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اپنی صغر سنی میں اپنے دادا عبدالمطلب سے گم ہو گیا۔ اور قریب تھا کہ بھوک مجھے ہلاک کر دے تو مجھے میرے رب نے راہ دکھائی۔ اسے امام فخرالدین رازی نے ذکر کیا اور ایسا ہی "مواہب لدنیہ" میں بھی ہے۔ مشہور یہ ہے کہ حلیمہ سعدیہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر مکہ مکرمہ آئیں تا کہ آپ کو آپ کے دادا حضرت عبدالمطلب کے سپرد کر دیں مگر آپ راہ میں گم ہو گئے۔

سوم یہ کہ آیہ کریمہ میں لفظ ضلال، ضَلَّ الْمَاءُ فِي اللَّبَنِ " (دودھ میں پانی مل گیا) سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ کہ جیسے پانی کو دودھ میں مغمور و مغلوب کرتے ہیں (غالباً میٹھا یا لسی بنانے کے لئے دودھ میں غالب و اکثر پانی ملاتے ہیں) یعنی آپ کفار مکہ میں مغمور و مغلوب تھے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو قوت بخشی تا کہ خدا کے دین کو ظاہر و غالب فرما دیں۔

چہارم یہ کہ اہل عرب، اس درخت کو جو بیابان میں یکہ و تنہا ہوتا اسے "ضالتہ" سے موسوم کرتے تھے۔ گویا حق سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے کہ اے حبیب تم ان شہروں میں اس درخت کی مانند یگانہ و بے ہمتا اور منفرد تھے جو بیابان میں اکیلا و تنہا ہو۔ تم نے ایمان و توحید کے میوہ سے انہیں ثمرات بخشے۔ اور ہدایت فرمائی۔ اور حق تعالیٰ نے آپ کی طرف خلق کو راہ دکھائی۔ تا کہ وہ بہرہ ور ہوں۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

پنجم یہ کہ کبھی سردار قوم اور ان کے سربراہ کو مخاطب کیا جاتا ہے اور اس سے مراد ان کی قوم ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ آپ کی قوم کو گمراہ پایا تو ہم نے ان کو آپ کے ذریعہ آپ کی شریعت کے ساتھ ہدایت کی۔

ششم یہ کہ ضال سے مراد محبت ہے۔ مطلب یہ کہ آپ کو محب اور اپنا طالب معرفت پایا (تو اپنی راہ دی) اور محبت کو ضال (وارفتہ) کہنا بکثرت مستعمل ہے۔ کیونکہ محبت خود کو اور اپنے اختیار و قرار کو گم کر دیتی ہے۔ اور کبھی معقول نہج پر قائم نہیں رہ سکتی۔ جیسا کہ فرمایا "إِنَّا لَنَرَاهَا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ" (بیشک ہم اسے کھلی وارفتگی میں دیکھتی ہیں) اور فرمایا " إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ " آپ تو پرانی وارفتگی میں ہی ہیں۔ یہ تاویل عطاء سے مروی ہے جو کہ تابعین سے ہیں۔

ہفتم یہ کہ آپ کو ہم نے بھولا ہوا پایا تو آپ کو یاد دلایا۔ اسے شب معراج کی حالت پر محمول کرتے ہیں کہ اس مقام کی دہشت سے خود فراموشی طاری ہو گئی کہ کیا اور کیونکر عرض کریں اور حق تعالیٰ کی حمد و ثنا کس طرح بجالائیں تو حق تعالیٰ نے آپ کو راہ دکھائی اور حمد و ثنا کی کیفیت بتائی تو عرض کیا "لَا أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ" (تیری ثنا میں گھیر نہیں سکتا) مفسرین بھی ایسا ہی بیان کرتے ہیں ایسا نہیں ہے کہ بعض دیگر اوقات میں بھی سہو و نسیان ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خطائے اجتہادی کے ضمن میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس

کا جاری ہونا آپ پر جائز ہے۔ اور جب ایسا ہوتا ہے تو حق تعالیٰ آپ کو آگاہ فرما دیتا ہے۔ اور درستگی پر قائم فرما دیتا ہے۔ یہ آیۃ اسی تذکرہ احسان پر نازل ہوئی واللہ اعلم۔

ہشتم یہ کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ کو گمراہوں کے درمیان پایا تو آپ کو ان سے معصوم کر کے ان کے ایمان وارشاد کی ہدایت فرمائی۔ ہمارے نزدیک یہی توجیہہ ہے۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گمراہ قوم سے علاقہ رکھا اور ان سے صحبت اختیار فرمائی تو ضلال میں واقع ہونے کا گمان ہوا۔ اور جہل واختلال کے بھنور میں پھنسنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اگر خدا کی عصمت و حفاظت آپ کے شامل حال نہ ہوتی جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ" ــــــ (قریب تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فتنے میں ڈال دیتے) ارشاد باری ہے "لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ" (آپ قریب ہو گئے تھے کہ ان کی طرف جھک جائیں) تو اللہ تعالیٰ نے بطریق مبالغہ، ہدایت وعصمت کے تذکرۂ احسان میں اس آیتِ کریمہ کو نازل فرمایا تو مراد آپ کا ضلال ہے نہ کہ آپ کی قوم کا ضلال، فافہم۔

نہم یہ کہ کتاب الٰہی کی جو چیزیں آپ کی طرف نازل فرمائی گئیں آپ کو ان کے بیان کرنے میں متحیر پایا۔ تو حق تعالیٰ نے ان کے بیان فرمانے کی ہدایت فرمائی جیسا کہ فرمایا "ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ" (اس کا بیان کرنا ہمارے ذمہ ہے۔) اور فرمایا "اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ" (ہم نے آپ کی طرف ذکر اتارا۔) یہ توجیہہ حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

دہم یہ کہ سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے کسی وقت اور کسی حال میں بھی اہل جاہلیت کے کاموں کی طرف قصد نہ کیا بجز دو مرتبہ کے۔ اور ہر بار حق تعالیٰ نے مجھے اپنے فضل سے اس سے باز رکھا۔ اور میری عصمت میرے اور میرے ان ارادوں کے درمیان جن کا قصد کیا تھا حائل ہو گئی اس کے بعد پھر کبھی بھی اس قسم کی چیزوں کی طرف قصد نہ کیا۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے مجھے اپنی رسالت سے سرفراز فرمایا۔ آپ نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ قریش کا ایک غلام جو میرے ساتھ مکہ کی پہاڑیوں میں بکریاں چرایا کرتا تھا ملا۔ میں نے کہا اگر تم میری بکریوں کی دیکھ بھال کر لو تو میں مکہ میں جا کر ان کی قصہ کہانیاں سنوں جس طرح مکہ کے جوان کرتے ہیں۔ میں چراگاہ سے نکل کر مکہ میں آیا اور ان کے گھروں میں سے ایک گھر پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ وہ گاتے بجاتے اور کھیل کود کرتے ہیں۔ میں بیٹھ گیا۔ اور ان کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر حق تعالیٰ نے مجھ پر نیند کا غلبہ اتارا اور میں اس وقت تک سوتا رہا جب تک کہ میرے سر پر دھوپ نہ آ گئی۔ دوسری رات بھی ایسا ہی ہوا اس کے بعد میں نے کبھی بھی ان کی طرف رخ نہ کیا۔ اور کسی برائی کا قصد نہ کیا۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے مجھے اپنی رسالت سے مکرم فرمایا۔ لہٰذا اس آیۂ کریمہ سے یہی مراد ہے واللہ اعلم۔

رفعِ وِزر۔ وصل۔ ازالہ شبہات کے سلسلے میں ایک آیۂ کریمہ ہے کہ۔

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝ اور ہم نے آپ سے اس بوجھ کو دور کیا جس نے آپ کی کمر دوہری کر دی۔

بظاہر اس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ اثباتِ بار گناہ سخت ہے۔ حتیٰ کہ فقہا، محدثین اور متکلمین کی ایک جماعت نے انبیاء کرام صلوات اللہ تعالیٰ وسلامہ علیہم اجمعین پر صغائر کے جائز ہونے پر اس سے حجت اخذ کی ہے۔ اگر قرآن وحدیث کے ظاہر الفاظ کا التزام کیا جائے اور انہیں اس کا ماخذ بنایا جائے تو بکثرت لفظوں سے کبائر کا جواز اور خرق اجماع بھی لازم آتا ہے۔ اور اس قول کو کوئی مسلمان بھی قبول نہیں کرے گا۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ جماعت جس سے بھی حجت پکڑتی ہے ان سب کے معانی میں مفسرین کا اختلاف

ہے۔ اور ان کے اقتضاء میں، متعارض و متقابل احتمالات ہیں۔ اور سلف صالحین کے اقوال ہر اس چیز کے خلاف منقول ہیں جن کی یہ
جماعت التزام کرتی ہے۔ اور چونکہ ان کے مذہب کے بر خلاف اجماع ہے جن پر یہ جماعت مجتمع ہوئی ہے وہ سب محتمل و مؤوّل ہیں
اور باتفاق و اجماع سلف، ان کے قول کے بر خلاف دلائل قائم ہیں۔ اور ان کا ظاہر متروک ہے تو ظواہر پر قول کا ترک اور اقوالِ سلف
کی طرف رجوع لازم ہے۔ بلاشبہ اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ چنانچہ بعض کہتے ہیں کہ یہ اس بوجھ کے اندازہ کی
تمثیل ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر گرایا گیا ہے۔ اور اس کا ہلکا کرنا یا کم کرنا یہ کہ ان پر آپ کو صبر و رضا عطا فرمائی گئی۔ مشہور یہی ہے کہ
اس سے نبوت کے بوجھ کو ہلکا کرنا مراد ہے۔ کیونکہ امرِ نبوت کے قیام، موجباتِ نبوت کی حفاظت اور اس کے حقوق کی ادائیگی کی
محافظت نے آپ کی پشت کی طاقت کو شکستہ کر رکھا تھا جسے حق تعالیٰ کی نصرت و تائید نے آپ پر آسان و سہل فرمادیا۔ اور شرح صدر عطا
فرماکر دعوت خلق کے ساتھ حضورِ حق جمع کر کے اس کے بوجھ کو اتار دیا۔ اور انشراح صدر ایسا بلند مقام ہے جس کا تمام و کمال، حضور
سید السادات علیہ افضل الصلوٰۃ و اکمل التحیات کی ذات بابرکات کے سوا کسی اور کے لئے ثابت نہیں ہے۔ البتہ اربابِ تمکین میں سے
کامل ترین اولیاء کرام کو بقدر ادراک آپ کی متابعت کے شرف سے اس میں سے کچھ حصہ حاصل ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ صوفی قائم و
بر قرار ہے اور اس کی "جمع" میں فرق کا کوئی خلل نہیں ہے۔ چنانچہ یہ مجوبوں میں ہوتا ہے اور نہ "جمع" کو "فرق" پر غلبہ ہے۔
جیسا کہ مجذوبوں کو ہوتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ "وزر" (بوجھ) سے وہ ناپسندیدہ چیزیں مراد ہیں جو قریش حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی سنت میں تغیر و تبدل کی
شکل میں کیا کرتے تھے اور وہ آپ کی ذات پر ناگوار و گراں گزرتا تھا۔ اور آپ اس سے انہیں روکنے پر قابو نہ پاتے تھے۔ یہاں تک
کہ حق تعالیٰ نے آپ کو بعثت و رسالت اور امر و توفیق وغیرہ سے قوی بنایا اور فرمایا "وَاتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاہِیْمَ حَنِیْفًا" (آپ یکسو ہو کر ملت
ابراہیم کی پیروی فرمائیں (اس اتباع سے مقصود اللہ عزوجل کی توفیق و تائید اور اس کی نصرت و قوت سے، اجراء شریعت اور اوامر و
احکام الٰہی کا نفاذ ہے۔ اور سنت خلیل کے ذکر کی تخصیص، بیان واقع کے اعتبار سے ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد، وزر و ذنب سے آپ کی عصمت و حفاظت ہے۔ کیونکہ بر تقدیرِ وجودِ وزر و ذنب اس کی صفت نقض
ظہر یعنی پشت کی شکستگی ہے لہٰذا وضع وزر یعنی بوجھ دور کرنے کا نام مجازاً عصمت رکھا گیا ہے۔ عصمت کے معنی وزر و ذنب کے نہ ہونے
کے ہیں۔ جیسا کہ مغفرت ذنوب کے معنی میں دوسری آیت میں واقع ہے۔ کہتے ہیں کہ جس طرح حدیث میں آیا ہے کہ قبل از نبوت
حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک ولیمہ میں موجود تھے وہاں گانا ہو رہا تھا، دف اور باجے بج رہے تھے۔ اس وقت حق تعالیٰ نے آپ پر نیند کا
غلبہ دے دیا۔ اور آپ اس کے سننے سے محفوظ رہے۔ بعض کہتے ہیں کہ "وزر" سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غور و فکر
اور شریعت کی طلب میں پریشانی کا بوجھ ہے۔ یہاں تک کہ شریعت ظاہر ہوئی اور حق تعالیٰ نے شریعت کو بیان فرمادیا۔ اور آپ کی پشتِ
اطہر سے اس کا بوجھ اتارا۔

بعض کہتے ہیں کہ اس سے امر شریعت کے حفظ میں آسانی و سہولت مراد ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے طلب کی گئی ہوگی۔ اور
حفظ ایک بوجھ اور مشقت ہے۔ جس کا اٹھانا طبیعت پر سخت دشوار ہے۔ اور قریب ہے کہ پشت کی طاقت کو شکستہ کر دے۔

بعض کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان امور کا بوجھ محسوس فرماتے تھے۔ جن کا صدور قبل از نبوت ہوا۔ اور بعد از نبوت وہ
آپ پر حرام قرار دے دی گئیں۔ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دل کی گرانی شمار فرماتے۔ حق تعالیٰ نے اس بوجھ کو دور فرمادیا
اس سے اس قوم کی ظاہر مراد وہ صغائر ہیں جن کا صدور وہ قبل از نبوت جائز قرار دیتے ہیں لیکن بعد از نبوت ہرگز نہیں۔

اور ایک جماعت اس طرف گئی ہے اور کیا خوب گئی ہے کہ اس بوجھ سے مراد امت کے گناہ ہیں۔ جو رسول کریم رؤف رحیم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب انور پر ایک بوجھ تھے چنانچہ حق تعالیٰ نے انہیں اس دنیا میں اپنے عذاب سے محفوظ و مامون قرار دیا۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ۔ اور نہیں ہے اللہ کہ انہیں عذاب فرمائے جب تک آپ ان میں رونق افروز ہیں۔

اور آخرت میں ان کے لئے آپ کی شفاعت قبول فرمانے کا وعدہ دیا۔ چنانچہ فرمایا۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى۔ اور عنقریب آپکا رب آپ کو اتنا دیگا کہ آپ راضی ہو جائیں گے (واللہ اعلم)

لیکن حق سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے سبب آپ کے اگلوں اور پچھلوں کے گناہ بخشے۔

یہ آیہ کریمہ اس مطلب کے لئے عمدہ اور مشہور ہے لیکن علماء نے اس کی متعدد تاویلات بیان کی ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بر تقدیر وقوع اور بالفرض بامکان عقلی نہ کہ وجود فعلی، غفران ذنوب مراد ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ سہو و غفلت سے اس کا وقوع مراد ہے۔ یہ وہ تاویلیں ہیں جنہیں طبری نے نقل کیا اور قشیری نے اختیار کیا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ماتقدم سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کا خطبہ اور "وماتاخر" سے مراد، امت کے گناہ ہیں اسے سمرقندی نے بیان کیا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ذنب سے مراد ترک اولیٰ ہے۔ حالانکہ ترک اولیٰ حقیقت میں ذنب نہیں ہے۔ اس لئے اولیٰ اور ترک اولیٰ دونوں اباحت میں شریک ہیں۔ صحیح یہی ہے کہ یہ کلمہ اظہار بزرگی و کرامت کے لئے ہے۔ بغیر اس کے کہ اس جگہ کوئی ذنب (گناہ) ہو۔ اس آیت کریمہ کی مراد اور مکمل بحث "باب سوم میں در ذکر فضل و کرامت از آیات قرآنی" گزر چکی ہے۔

کفار اور منافقین کی عدم اطاعت کا مسئلہ: ۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ ارشاد کہ۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ۔ اے نبی اللہ سے تقویٰ کرو اور کفار و منافقین کی اطاعت نہ کرو۔

اس سے عدم تقویٰ اور بمقتضائے صیغہ امر و نہی وجود اطاعت کفار و منافقین کا امکان موہوم ہوتا ہے ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد تقوے اور عدم اطاعت پر ہمیشگی و دوام ہے جیسے کہ بیٹھنے والے کو کہتے ہیں کہ بیٹھو ہم تمہارے پاس ابھی آئے۔ یا خاموش رہنے والے سے کہا جاتا ہے۔ خاموش رہو تمہاری خواہش پوری کی جائے گی۔ مطلب یہ کہ بیٹھے رہو اور خاموش رہو۔ اس سے مقصود استقامت اور تاکید ہے نہ کہ اس کی طلب۔

بعض کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا علم و مرتبہ ہر آن بڑھتا جاتا تھا یہاں تک کہ آپ کا پہلا حال موجودہ حال کے مقابلہ میں ماضی اور ترک اولیٰ و افضل کے حکم میں ہو جاتا تھا۔ لہٰذا آپ کا علم و مرتبہ ہر آن اور ہر گھڑی ترقی و اضافہ اور تقویٰ نو بنو، تازہ بتازہ ہوتا رہتا تھا۔

اور بعض کہتے ہیں کہ بظاہر خطاب نبی سے ہے مگر مراد، امت سے خطاب ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آخر آیت میں فرمایا "اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا" (اور تحقیق اللہ تمہارے کاموں سے خبردار ہے) اور "بما تعمل" (جو تم کرتے ہو) نہ فرمایا اور اسی حکم میں اس کے مشابہ یہ ارشاد باری ہے "ولا تطع المکذبین" (اور جھٹلانے والوں کی اطاعت نہ کرو) حقیقت میں اس سے مقصود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر کی تقویت اور ایسے لوگوں سے خدا کا اظہار ناراضگی اور ان کی مخالفت پر قرار و ثبات ہے۔ اور یہ بالکل ظاہر و

واضح ہے تعجب ہے کہ یہ نادان ان آیتوں کو ظاہر پر محمول کر کے بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نقص وصدور ذنوب کی نسبت کا توہم پیدا کرتے ہیں۔ آپ کی بارگاہ عالی ان سب سے پاک ومنزہ ہے۔

نزول قرآن پر شک وتردد کا مسئلہ:۔ اب رہا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ۔

فَإِنْ كُنْتَ فِي شَكٍّ مِمَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِينَ يَقْرَءُونَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ لَقَدْ جَاءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ۝ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُونَ مِنَ الْخٰسِرِينَ ۝

اور اے سننے والے اگر تجھے کچھ شبہ ہے اس میں جو ہم نے تیری طرف اتارا تو ان سے پوچھ دیکھ جو تجھ سے پہلے کتاب پڑھنے والے ہیں بیشک تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے حق آیا تو ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہو اور ہرگز ان میں نہ ہونا جنہوں نے اللہ کی آیتیں جھٹلائیں کہ تو خسارے والوں میں ہو جائے گا۔

مفسرین کا اس میں اختلاف ہے کہ اس کلام کا مخاطب کون ہے آیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا دوسرے لوگ۔ جو یہ کہتے ہیں کہ یہ خطاب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے وہ تین وجہوں پر اختلاف کرتے ہیں اول یہ کہ خطاب اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن مراد آپ کے غیر کی تعریض ہے جیسے کہ اس کا ارشاد ہے "لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ" (اگر تم نے خدا کا شریک ٹھہرایا تو تمہارے عمل اکارت ہو جائیں گے) یا جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا "ءَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ دُونِ اللّٰهِ" (کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا معبود بنانا) کلام میں ایسی روش بکثرت ہے جیسے بادشاہ اپنا گورنر کسی قوم پر مقرر کرتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ رعیت کو کوئی حکم دے تو خطاب میں توجہ اس قوم کے ساتھ نہیں کرتا بلکہ اپنے گورنر سے کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ایسا کرو اور ایسا نہ کرو۔ اگر ایسا کیا یا ایسا نہ کیا تو ایسا کروں گا ویسا کروں گا اس کا بظاہر خطاب تو امیر و گورنر سے ہوتا ہے۔ لیکن مقصود و مراد قوم و رعیت ہوتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ حقیقت میں خطاب امت سے کرتا ہے۔

قراء فرماتے ہیں کہ خدا خوب جانتا ہے کہ اس کا رسول شک کرنے والا نہیں ہے۔ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ وحی اور تنزیل کی نورانیت کے باوجود رسول شک میں مبتلا ہو، یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے فرزند سے کہے کہ اگر تو میرا بیٹا ہے تو مجھ سے بھلائی کر (حالانکہ باپ اپنے فرزند کے بیٹا ہونے میں شک نہیں کرتا۔) یا آقا غلام سے کہے اگر تو میرا غلام ہے تو میری فرماں برداری کر" جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ وہ خوب جانتا ہے وہ اس کا بیٹا یا اس کا غلام ہے۔ لیکن شک کے صیغہ میں کہتا ہے۔ اور ایسا کہنا فرزند و غلام کی توبیخ و سرزنش کے لئے ہے۔

چنانچہ حق تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم شک میں مبتلا نہیں ہیں۔ لیکن خطاب میں اظہار شک فرماتا ہے۔ یہ تعریض وکنایہ کی ادائیگی کے لئے ہے۔ یہ دوسری وجہ ہے۔ پہلی میں مخاطب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور دوسری میں آپ کے سوا دوسرے ہیں۔ فافہم۔

تیسری وجہ یہ کہ اس جگہ شک سے مراد سینہ کی تنگی اور دل کی گرفتگی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اگر آپ اس سے تنگ آگئے ہیں کہ کوئی آپ سے کافروں کی ایذا اور دشمنی کے بارے میں دریافت کرتا ہے تو صبر فرمایئے اور ان لوگوں سے دریافت کر دیکھئے جن کو کتاب دی گئی ہے کہ نبیوں نے اپنی قوم کی ایذا و دشمنی پر کیسا صبر کیا ہے۔ اور کافروں کا انجام کیسا ہوا ہے؟ اور نبیوں پر اللہ تعالیٰ کی کیسی مدد و نصرت ہوئی ہے۔ یہ بر سبیل فرض وتقدیر ہے۔ گویا فرماتا ہے کہ اگر بفرض وتقدیر، جو کچھ آپ پر گذشتہ قصے بھیجے گئے ہیں اس میں شک واقع ہو

ہے یا شیطان خیال میں خلل ڈالتا ہے تو ان لوگوں سے جو خدا کی سابقہ کتابیں پڑھتے ہیں پوچھ دیکھئے اس لئے کہ یہ قصے ان کے نزدیک بھی محقق و ثابت ہیں۔ اور ان کی کتابوں میں ویسا ہی ہے جیسا کہ آپ پر وحی فرمایا گیا۔ اس سے تحقیق حال اور گواہی لینا مراد ہے۔ اور اس کا بیان ہے کہ قرآن پاک ہر اس چیز کا تصدیق کرنے والا ہے جو ان کی کتابوں میں ہے کہ اس سے رسول پاک کو انگیز کرنا اور ان کے یقین میں اضافہ کرنا مراد ہے نہ کہ امکان وقوع شک۔ لہٰذا جس وقت یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''لَا اَشُکُّ وَلَا اَسْاَلُ'' (نہ مجھے شک ہے اور نہ میں ان سے دریافت کرتا ہوں)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم! رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پلک جھپکنے کے برابر بھی شک نہیں کیا۔ اور نہ ان میں سے کسی ایک سے کچھ پوچھا۔

بندۂ مسکین عبدالحق بن سیف الدین (محدث دہلوی رحمہ اللہ) ''خَصَّہُ اللّٰہُ بِمَزِیْدِ التَّصْدِیْقِ وَالْیَقِیْنِ وَعَصَمَہٗ عَنِ الشَّکِّ وَالتَّخْمِیْنِ۔'' کہتے ہیں کہ اس جگہ شک سے وہ ظاہری معنی مراد نہیں ہے جو تصدیق و یقین کے منافی و خلاف ہے بلکہ وہ حالت مراد ہے جو معائنہ و مشاہدہ سے پہلے اطمینان قلب کا موجب ہوتی ہے۔ اسی لئے حضرت خلیل اللہ کے سوال کی حدیث کو ''شک'' نام رکھا گیا ہے کیونکہ انہوں نے عرض کیا ''رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی'' اے میرے رب تو مردے کو کیسے زندہ کرتا ہے اس جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطریق تواضع اور حضرت خلیل علیہ السلام کے درجہ کی بلندی کے لئے فرمایا ''نَحْنُ اَحَقُّ بِالشَّکِّ مِنْہُ۔'' ہم ان سے زیادہ شک کے مستحق ہیں۔

حضور اکرم سورۂ ''سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلَی الَّذِیْ۔'' کو اس سبب سے دوست رکھتے تھے کہ اس میں یہ ہے۔

اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی بیشک یہ اگلے صحیفوں میں ہے ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔

اور دجال کے وجود کے بارے میں تمیم داری کا خبر دینا اس ارشاد کے موافق جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرام کو بلانا اور ان کو اس قصہ کو سنوانا اسی معنی میں ہے۔ اور بعد ظہور معجزہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا کہ ''اشہد انی رسول اللہ۔'' (میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اللہ کا رسول ہوں) یہ بھی اسی باب سے ہے۔ لیکن جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ''لئن اشرکت۔'' (اگر تم نے شرک کیا) میں خطاب رسول پاک کے سوا سامعین کے لئے ہے تو ممکن ہے اس جگہ یعنی ''فان کنت فی شک'' الایہ میں بھی خطاب سننے والوں ہی کے لئے ہو۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں لوگوں کے تین فرقے تھے مصدقین، مکذبین، اور منافقین یا متوقفین۔ اور یہ آپ کے کام میں شک رکھتے تھے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے ان کو بطریق خطاب عام جو عام طور پر بصیغہ واحد ہوتا تھا خطاب کیا اور فرمایا اے متوقف! یعنی جو شک میں مبتلا ہے۔ اگر تو اس شک میں ہے کہ ہم نے جو اپنے نبی سید عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا ہے اور آپ جو دین لے کر تشریف لائے ہیں تو تو اہل کتاب سے پوچھ دیکھ تاکہ تجھے آپ کی نبوت کی صحت پر رہنمائی ہو اور امت کے لئے نزول قرآن کی نسبت ثابت ہو جائے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا — (ہم نے تمہاری طرف واضح نور کو نازل فرمایا۔

اور جب حق تعالیٰ نے ان کے لئے اس چیز کا ذکر فرمایا جو ان کے شک کا ازالہ کرتا ہے تو اس نے ان کو اس سے ڈرایا کہ اب وضوح حق کے بعد تم قسم ثانی یعنی مکذبین (جھٹلانے والوں) میں ہو جاؤ گے چنانچہ فرمایا۔

وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ ان لوگوں میں سے نہ ہونا جنہوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا کہ تو

الخٰسِرِيْنَ ۝ خسارے والوں میں ہو جائے۔

اور حق سبحانہ وتعالیٰ کا یہ ارشاد کہ:۔

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی جانتے ہیں کہ یہ تمہارے رب کی طرف سے حق نازل کیا ہوا ہے تو تم ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہونا۔

مطلب یہ کہ اہل کتاب اسے جانتے ہیں کہ خدا کی طرف سے رسول و نبی آتے ہیں اور کتابیں نازل ہوتی ہیں۔ یا یہ مراد ہے کہ "قُلْ یا مُحَمَّدُ لِمَنِ افْتَرٰی لَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ۔" اے نبی جو شک میں ہو اس سے فرما دو، کہ تم شک کرنے والوں میں نہ ہو جانا۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سوا اوروں کو مخاطب فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا خطاب کو محمول کرنے کی تائید حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ جو اس کے بعد کا ہے۔ غور و فکر کرو۔ فرماتا ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فرما دو، اے لوگو! میرے دین کے بارے میں اگر تم شک میں ہو تو............

نسبتِ جہل کا مسئلہ: ۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ:

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ اگر اللہ چاہتا تو انہیں ہدایت پر جمع کر دیتا تو تم جاہلوں میں نہ ہونا۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ مراد نہیں ہے کہ تم اس سے جاہل نہ ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو انہیں ہدایت پر جمع کر دیتا۔ اس لئے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی صفتوں میں ایک صفت جہل کا اثبات ہے۔ اور صفات خدا میں انبیاء پر جہل کا اثبات جائز نہیں۔ اس سے مقصود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیحت ہے کہ اپنے کاموں میں جاہلوں کے طور و طریق اختیار نہ کریں۔ نیز آیت میں کسی ایسی صفت کے ہونے پر دلیل نہیں ہے۔ جس کے ہونے سے آپ کو منع کیا گیا ہے بلکہ قوم کی روگردانی اور ان کی مخالفت پر صبر کو لازم کرنے کا حکم ہے اسے ابو بکر بن فورک نے بیان کیا۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ معنیٰ امت کے ساتھ خطاب ہے یعنی تم لوگ جاہلوں سے نہ ہونا جیسا کہ دیگر مقامات میں کہا گیا ہے۔ اور اس کی مثالیں قرآن کریم میں بکثرت ہیں۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے کہ فرمایا:۔

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اگر تم نے زمین میں بہتوں کی پیروی کی تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔

یہ خطاب دوسروں سے ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے کہ "وَاِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔" اور اگر تم لوگوں نے کافروں کی پیروی کی تو......" اسی طرح حق تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ "اِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ۔ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ ۔" (اگر اللہ چاہتا تو تمہارے دل پر مہر کر دیتا اور یہ کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے عمل ضرور اکارت ہو جائیں گے۔) اس قسم کی تمام مثالوں میں ہر جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ماسوا دوسرے لوگ مراد ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جس طرح چاہے امر و نہی فرمائے حالانکہ آپ سے ان کا صدور محال ہے۔ جیسا کہ فرمایا "وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ۔" اور ان لوگوں کو جو اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں اپنے قرب سے دور نہ کیجئے۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہرگز ان کو نہ اپنے قرب سے دور فرماتے ہیں اور نہ اپنے سامنے سے ہٹاتے تھے۔ کیونکہ آپ

ظالموں میں سے نہ تھے۔

اور حق تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ "وَاِنْ کُنْتَ مِنْ قَبْلِہٖ لَمِنَ الْغَافِلِیْنَ۔ " اور یہ کہ تم اس سے پہلے یقیناً غافلوں میں سے تھے۔ تو اس سے مراد آیات حق سے غفلت نہیں ہے بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ سے لاعلمی مراد ہے۔ اس لئے کبھی اس کا نہ تو آپ کے دل میں خیال آیا اور نہ آپ کے کانوں نے اس سے پہلے یہ قصہ سنا تھا۔ اور نہ اسے آپ نے از خود جانا مگر اللہ تعالیٰ کی وحی سے معلوم ہوا۔

لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ:۔

وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ ۔ اور اے سننے والے اگر شیطان تجھے کوئی وسوسہ دے تو اللہ کی پناہ مانگ۔

بظاہر الفاظ وہم میں ڈالتے ہیں۔ حالانکہ شیطان کا وسوسہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نہ تھا۔ لیکن اس سے مراد شیطان کا قصد و ارادہ ہے کہ وہ وسوسہ میں مبتلا کرے۔ مگر حق تعالیٰ نے اسے آپ سے پھیر دیا۔

مطلب یہ ہے کہ اگر تم کو کسی پر ایسا غصہ آئے جو اس سے ترک اعراض اور اس کے سامنے نہ آنے پر برانگیختہ کرے تو خدا سے پناہ مانگو تاکہ خدا اس سے آپ کو پناہ میں رکھے۔ نزغ شیطان کی ادنیٰ حرکت ہے۔ جیسا کہ زجاج نے کہا ہے۔ معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا ہے کہ جب آپ کو کسی دشمن پر غصہ آئے یا شیطان آپ کو ورغلانے کا ارادہ کرے یا وہ دل میں وسوسے ڈالے تو حق تعالیٰ سے پناہ مانگیں تاکہ وہ آپ کو اس کے شر سے محفوظ رکھے یہ آپ کی عصمت کی تکمیل کے لئے ہے کہ حق تعالیٰ نے شیطان کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر غلبہ پانے کی قدرت نہ دی۔ یہ اسی آیتِ کریمہ کا مدلول ہے جس میں فرمایا کہ۔

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ بیشک میرے بندوں میں ایسے ہیں کہ نہیں ہے تجھے ان پر غلبہ۔

اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ھُمْ مُّبْصِرُوْنَ۔ بیشک وہ لوگ جو خوف خدا رکھتے ہیں جب انہیں کسی شیطانی خیال کی ٹھیس لگتی ہے تو ہوشیار ہو جاتے ہیں اور اسی وقت ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

اس کا بھی یہی مطلب ہو گا۔ لیکن حق تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ "واما ینسینک الشیطن " (لیکن شیطان نے تم کو بھلا دیا) نسیان، نزغ کے سوا ہے۔ اور یہ صحیح نہیں ہے کہ شیطان رسالت سے پہلے یا رسالت کے بعد فرشتہ کی صورت و شکل میں آکر آپ کو دھوکا دے سکے۔ اور مشیت الٰہی جس نے رسول کو صدق کے اظہار پر قائم رکھا ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ نبی کے پاس جو آتا ہے وہ فرشتہ اور خدا کا بھیجا ہوا رسول ہی ہوتا ہے۔ یا اس کے علم ضروری سے معلوم ہو جاتا ہے جسے حق تعالیٰ نبی میں پیدا فرماتا ہے۔ یا اس دلیل و برہان سے معلوم ہوتا ہے جسے حق تعالیٰ نبی میں ظاہر فرماتا ہے۔ اس بیان کی مکمل تحقیق ابتدائے وحی کے بیان میں آئے گی "تمت کلمۃ ربک صدقاً وعدلاً لامبدل لکلماتہ" تمہارے رب کا کلمہ سچ وانصاف کے ساتھ مکمل ہوا اور کوئی اس کے کلمات کو بدلنے والا نہیں۔

تلاوت میں شیطان کی دخل اندازی کا مسئلہ:۔ وصل:۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ:۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّآ اِذَا اور ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول یا نبی بھیجے سب پر یہ واقعہ گذرا کہ جب

تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّیْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِیَّتِہٖ ۔ انہوں نے پڑھا تو شیطان نے ان کے پڑھنے میں لوگوں پر کچھ اپنی طرف سے ملا دیا (پ ۱۷ ع ۱۴)

اس کی تفسیر و تشریح میں سب سے بہتر اور مشہور جمہور مفسرین کا یہ قول ہے کہ اس جگہ "تمنی" سے مراد تلاوت ہے اور القائے شیطان کا مطلب، تلاوت کرنے والوں کے دلوں میں دنیاوی باتیں یاد دلا کر اس سے پھیرنا ہے۔ تاکہ اس میں وہم اور اس کی تلاوت میں نسیان پیدا کرے۔ یا یہ کہ سننے والوں کے فہموں میں تحریف اور فاسد تاویلات جیسی چیزوں کو داخل کر دے جسے اللہ تعالیٰ زائل اور منسوخ کر دیتا ہے۔ اور التباس و اشتباہ کو کھول دیتا ہے۔ اور آیات الٰہیہ کو محکم و ثابت بنا دیتا ہے۔ جیسا کہ مواہب لدنیہ میں ہے۔ اس سلسلے میں مفسرین کی بحث بہت کچھ ہے جس میں سے کچھ کا ذکر شفا میں کیا گیا ہے۔

اب رہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا "لیلۃ التعریس" کی وادی میں سونے سے متعلق ارشاد۔ تو "لیلۃ التعریس" ایک وادی کا نام ہے جو شیطان کا مسکن تھی۔ حضور کے اس قول مبارک سے یہ کہاں معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے آپ پر غلبہ کیا یا آپ کو وسوسہ میں ڈال دیا تھا۔ اگر یہ ممکن ہو تو ایسا حضرت بلال پر ہوا ہو گا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال کو نماز فجر کی حفاظت کے لئے مقرر فرما دیا تھا۔ شیطان نے آکر حضرت بلال کو گہری نیند میں سلا دیا تھا جس کی تفصیل "لیلۃ التعریس" کی حدیث میں مذکور ہے۔ اور یہ بھی اس تقدیر پر کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد، نماز کے وقت سو جانے کی وجہ پر تنبیہ کے لئے نہ ہو۔ اور اگر تنبیہ کے لئے ہے بھی تو اس وادی سے کوچ کرنے اور اس میں ترک صلوٰۃ کی علت بیان کرنے کے لئے ہے لہٰذا کوئی اعتراض و اشکال ہی نہیں۔ اور نہ اس کے دفع کرنے کی حاجت۔ (واللہ اعلم بحقیقۃ الحال)

حضرت ابن ام مکتوم نابینا کا واقعہ۔ اب رہا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ:۔

"عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى (ترش روئی کی اور منہ پھیرا جب کہ نابینا آپ کے پاس آیا۔) کہتے ہیں کہ اس کا ظاہر مفہوم یہ وہم پیدا کرتا ہے کہ جس وقت حضرت ابن ام مکتوم جو نابینا تھے اور طلب حق کے لئے آئے تھے اور وہ محل تذکرہ و خشیت تھے۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ترش روئی اور اعراض کا اظہار فرمایا۔ اور وہ کفار جو حق سے روگرداں تھے اور آپ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے آپ نے ان کی طرف توجہ و التفات فرمائی۔ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اثبات ذنب ہوتا ہے۔ اس پر حق تعالیٰ نے شکایت کی۔ اور اس رویہ پر اظہار ناپسندیدگی فرمایا۔ تفسیر کی کتابوں میں اس سورۃ کا شان نزول یہی بیان ہوا ہے۔

اب رہا اس جگہ اثبات ذنب! تو یہ توہم محض ہے۔ البتہ ترک اولیٰ و الیق سے بظاہر اظہار ناپسندیدگی کی صورت نکلتی ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ اگر ان دو شخصوں کی حقیقت حال آپ پر مکشوف و معلوم ہوتی تو نابینا کو آگے بٹھاتے۔ لیکن آپ نے جو کچھ کفار کے ساتھ توجہ و التفات فرمایا وہ آپ کی عین طاعت، تبلیغ احکام شریعت، تالیفِ قلوب اور ایمان پر تمنا و خواہش کا اظہار تھا۔ کیونکہ آپ کی بعثت و رسالت کا مقصد ہی یہ تھا نہ کہ معصیت اور امر دین کی مخالفت اور حق سبحانہ و تعالیٰ نے جو کچھ بیان کیا اور اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے یک گونہ اظہار ناپسندیدگی فرمایا اس سے مقصود تذکر و نصیحت ہے اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ آپ کا انہماک دعوت و تبلیغ برائے اسلام اس درجہ کو نہیں پہنچنا چاہئے کہ اس کی وجہ سے کسی مسلمان سے عدم التفات لازم آئے۔ صرف پہنچانا اور خبردار کرنا ہی کافی ہے۔ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ۔ "رسول پر صرف پہنچانا ہی ہے۔ درحقیقت حضرت ابن ام مکتوم ہی اس زجر و تادیب کے مستحق ہیں۔ اس لئے کہ وہ اگرچہ دیکھ نہیں سکتے لیکن کافروں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گفتگو فرمانا تو سن رہے تھے۔ اور یہ بھی خوب جانتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی دعوت و تبلیغ میں کتنا اہتمام و انہماک فرماتے تھے۔ لہٰذا ان کے آگے بڑھتے جانے سے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں رکاوٹ آرہی تھی۔ اور مجلس میں اژدہام ہورہا تھا۔ اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا کا موجب تھا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچانا بہت بڑی معصیت ہے تو معلوم ہوا کہ ابن ام مکتوم کی زجر و تادیب میں قرآن میں یہ نازل ہوا۔ جس طرح رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس زور سے بولنے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حجروں کے پیچھے سے آواز دینے کے بارے میں قرآن کریم میں احکام نازل ہوئے۔ لیکن نابینا اور صدق نیت ہونے کی وجہ سے انہیں معذور رکھا گیا۔ اور نرمی و مہربانی کا اظہار فرمایا۔ واللہ اعلم۔

منافقین کو اجازت دینے کا مسئلہ:۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ ارشاد:۔ "عَفَا اللّٰہُ عَنْکَ لِمَ اَذِنْتَ لَھُمْ" (اللہ تمہیں معاف کرے آپ نے انہیں کیوں اجازت دے دی۔ اس سے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذنب کے وقوع کا وہم ہوسکتا ہے۔ اس لئے کہ عفو متدعی ہے کہ پہلے کوئی تقصیر ہو۔ اور یہ بھی کہ "لِمَ اَذِنْتَ لَھُمْ" (آپ نے انہیں اجازت کیوں دی) میں استفہام انکاری ہے۔ لہٰذا منافقوں کے لئے یہ اجازت، منکر اور غیر رضائے الٰہی ہوگی۔ اگرچہ غایت تسلی وتسکین کے اظہار کے لئے انکار اذن پر عفو کو مقدم کیا۔ اور اظہار ناپسندیدگی سے پہلے عفو کی تقدیم بڑی ہی پیاری اور نادر ہے۔ جو کہ محبت واکرام کی خبر دے رہی ہے۔ وہ جماعت کہتی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دو کام ایسے کئے جس کا حکم حق تعالیٰ نے پہلے نہیں دیا تھا۔ ایک یہ کہ بدر کے قیدیوں کا فدیہ لیا اور دوسرا یہ کہ منافقوں کو اجازت دے دی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ پر اظہار ناپسندیدگی فرمایا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ "عَفَا اللّٰہُ" (اللہ معاف کرے) وہ نہیں ہے جہاں وقوع ذنب کے بعد ہوتا ہے۔ بلکہ یہ عبارت ایسی ہے جو تعظیم وتوقیر کے مبالغہ پر دلالت کرتی ہے۔ جس طرح کوئی شخص اپنے ایسے دوست سے جو عظیم المرتبت ہے کہے "خدا تجھے معاف کرے کیا کام کیا ہے، تونے میرے حق میں؟ حق تعالیٰ تجھ سے راضی ہو۔ میری بات کا کیا جواب دیا ہے؟ خدا تجھے عافیت دے۔ میرے حق کو پہچان؟ وغیرہ۔ ان باتوں کی غرض بجز اس کی عزت وتکریم کی زیادتی کے کچھ نہیں ہے۔ نہ یہ کہ اس کے لئے گناہ وقصور کا ثابت کرنا مقصود ہے۔ اور اس جگہ عَفَا بمعنی غفر نہیں ہے۔ اور اظہار ناپسندیدگی پر اس کی تقدیم، اس مذکورہ معنی کی خبر دینے اور اس مراد پر دلالت کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ جیسا کہ حدیث میں واقع ہوا ہے کہ "عَفَا اللّٰہُ لَکُمْ عَنْ صَدَقَۃِ الْخَیْلِ وَالرَّقِیْقِ" یعنی اللہ نے تمہارے لئے گھوڑے اور غلاموں سے زکوٰۃ معاف کر دی ہے۔ حالانکہ ان میں زکوٰۃ پہلے سے ہی واجب نہ تھی۔ مراد صرف یہ ہے کہ یہ تم پر لازم نہیں ہے۔

امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو یہ کہتا ہے کہ گناہ سے پہلے معافی ہوتی ہی نہیں وہ کلام عرب کے اسلوب کو نہیں پہچانتا۔ اور کہتے ہیں کہ "عَفَا اللّٰہُ عَنْکَ اَیْ لَمْ یُلْزِمْکَ ذَنْبٌ۔" مطلب یہ کہ اللہ تمہیں معاف کرے کے معنی یہ ہیں کہ تم پر کوئی ذنب والزام نہیں ہے۔ مواہب لدنیہ میں بھی اسی طرح ہے اب رہا دوسری بات کا جواب کہ "استفہام انکاری ہے" وہ کہتے ہیں کہ انکار و عتاب، ترک اولیٰ وافضل پر ہے اس کے جواب میں بعض کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے آپ کو اگر آپ چاہیں تو اذن دینے میں رخصت عطا فرمائی ہے۔ اور ارشاد ہے کہ۔

فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْکَ لِبَعْضِ شَاْنِھِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْھُمْ اب اگر تم سے کسی کام کیلئے وہ اجازت مانگیں تو ان میں سے جس کے لئے چاہیں اجازت دے دیں۔

تو حق تعالیٰ نے اذن کو آپ کے سپرد فرما کر آپ کو بطریق عموم دیدیا ہے اور مواہب لدنیہ میں نفطونیہ سے نقل کیا ہے کہ ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم معاتب ہیں۔ (معاذ اللہ) حاشا وکلا ہرگز ہرگز نہیں۔ بلکہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو مختار تھے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اذن دے دیا تو حق تعالیٰ نے آپ کو خبر دی کہ اگر آپ، اذن نہ دیتے تب بھی یہ اپنے نفاق کی بنا پر بیٹھے ہی رہتے۔ آپ پر ان کو اذن دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ انتہی

منافقین کی طرف میلان کا مسئلہ:۔ اب رہا حق تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۝ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ اور اگر ہم تمہیں ثابت قدم نہ رکھتے تو قریب تھا کہ تم ان کی طرف تھوڑا سا جھکتے۔ اور ایسا ہوتا تو ہم تم کو دونی عمر اور دو چند موت کا مزہ دیتے۔

یہ آیت بھی وقوع میلان اور منافقوں کی جانب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے راغب ہونے اور ان پر اشد عذاب واقع ہونے کے سلسلے میں وہم پیدا کرتی ہے۔ لیکن چونکہ حق تعالیٰ نے ان کی طرف راغب ہونے سے محفوظ رکھا ہے اس لئے یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے مجوز وقوع ذنب ہے۔ حالانکہ یہ توہم ساقط ہے۔ اس لئے کہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر آپ کے ساتھ اللہ کی جانب سے ثابت قدمی اور عصمت نہ ہوتی تو ان کی نزدیکی کی طرف ان کی خواہش کی پیروی میں جھک جاتے لیکن چونکہ ہماری عصمت آپ کے ساتھ تھی اس لئے اس نے آپ کو ان کی طرف مائل ہونے سے روکے رکھا۔ تو اس میں یہ بات خوب واضح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قبول کرنے کی طرف قصد نہ فرمایا۔ اور داعی اجابت کی قوت کے ساتھ ان کی طرف مائل نہ ہوئے۔ اور انبیاء کرام علیہم السلام سے وقوع معصیت کے سلسلہ میں خود ان کی بات گزر چکی ہے کہ شرعاً اور عقلاً اس کا وقوع ان پر جائز نہیں ہے۔ کیونکہ وہ عصمت سے حفاظت الٰہی میں ہیں اور عصمت اختیار کو باطل نہیں کرتی۔ اور عقلاً گناہ کو ممتنع نہیں بناتی۔ اور بحفظ الٰہی اس کے صدور وقوع سے مانع ہوتی ہے۔ لہٰذا ثابت ہو گیا کہ تمام انبیاء معصوم ہیں اور حضور ثابت قدم ہیں۔ اور آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال تطہیر و تقدیس میں مبالغہ ہے۔ اور یہ کہ آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حفاظت، عصمت اور محبت ہے نہ کہ تہدید و تشدید اور عتاب و تعذیر (معاذ اللہ)

اسیران بدر سے فدیہ لینے کا مسئلہ:۔ اللہ تعالیٰ کا وہ ارشاد جو بدر کے قیدیوں سے فدیہ لینے کے سلسلے میں ہے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ کسی نبی کو لائق نہیں کہ کافروں کو زندہ قید کرے جب تک زمین میں ان کا خون نہ بہائے۔ تم دنیا کا مال چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے۔ اور اللہ غالب حکمت والا ہے اگر اللہ پہلے ایک بات نہ لکھ چکا ہوتا تو اے مسلمانو! تم نے جو کافروں سے بدلے کا مال لے لیا اس میں تم پر بڑا عذاب آتا۔

اس آیت کو بھی ایک گروہ نے عتاب پر محمول کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے بدر کے قیدیوں کا فدیہ لینا اختیار فرمایا۔ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر قتل کو اختیار نہ فرمایا یہ اپنے اجتہاد سے تھا اور اجتہاد میں شریعت خطا کو جائز رکھتی ہے لیکن اس خطا پر نبی کا قائم رہنا جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ اصول فقہ میں مذکور ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ صحیح مسلم میں بروایت سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے بدر کے دن کفار کو شکست دی اور مشرکوں کے ستر آدمی مارے گئے اور ستر آدمی قید ہوئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قیدیوں کے بارے میں حضرت ابو بکر، حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے مشورہ فرمایا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ یہ قیدی

ہمارے چچاؤں کی اولاد، اپنے بھائی اور آپ کے قبیلہ کے لوگ ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ ان سے فدیہ لے لیا جائے تاکہ جو کچھ ان سے وصول ہو وہ ہمارے لئے کفار کے مقابلہ کے وقت ساز و سامان کی تیاری میں کام آئے اور یہ بھی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر انہیں ہدایت فرمادے تو یہ ہمارے قوتِ بازو اور مددگار بن جائیں۔ پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ اے عمر بن خطاب تم کیا رائے دیتے ہو۔ میں نے عرض کیا، خدا کی قسم! میری رائے ابو بکر کی رائے کے موافق نہیں ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔ اور مجھے حکم فرمایئے کہ میں فلاں کو قتل کروں۔ (اور میں نے اپنے عزیزوں کی طرف اشارہ کیا) اور علی کو حکم دیجئے کہ وہ اپنے بھائی عقیل کو ماریں۔ اور حمزہ کو حکم دیجئے کہ وہ فلاں عزیز کو قتل کریں۔ تاکہ اللہ تعالیٰ جو علام الغیوب ہے جان لے کہ ہمارے دل مشرکوں کی محبت و دوستی سے پاک ہیں مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابو بکر کی رائے پسند آئی اور اسی کو اختیار فرمایا اور آپ نے ان سے فدیہ لے لیا۔ پھر دوسرے دن جب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور حضرت ابو بکر آپ کے قریب ہیں اور دونوں رو رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! بتایئے آپ دونوں کو کس چیز نے رلایا ہے تاکہ اگر ہو سکے تو میں بھی روؤں۔ اگر رونا نہ آئے تو بہ تکلف زور ڈال کر رونے کی کوشش کروں اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم اس وجہ سے رو رہے ہیں کہ تمہارے یاروں پر فدیہ لینے کے سلسلے میں بلاشبہ میرے آگے اس درخت سے قریب تر عذاب ظاہر کیا گیا اور آپ نے ایک درخت کی طرف اشارہ فرمایا جو ہمارے نزدیک تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ کسی نبی کو لائق نہیں کہ کافروں کو زندہ قید کریں۔ جب تک زمین میں ان کا خون نہ بہائے۔

"اثخان" کے معنی زیادہ کرنا اور کسی چیز میں مبالغہ کرنا ہے۔ اور اس جگہ اثخان سے مراد قتل و جرح ہے۔ مطلب یہ کہ نبی کو چاہئے کہ جب ان کے ہاتھ قیدی آئیں تو وہ انہیں قتل کرائیں اور اس میں مبالغہ کریں تاکہ کفر زائل ہو اور اسلام غالب ہو۔

تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ تم تو دنیاوی مال و منال چاہتے ہو اور اللہ آخرت کو چاہتا ہے۔

مطلب یہ کہ تم دنیا میں غنیمت و اموال کی خواہش رکھتے ہو اور خدا آخرت کو چاہتا ہے کہ اس پر دینِ اسلام کی قوت اور آخرت میں ان کا ثواب مترتب ہوگا۔

لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ اگر اللہ پہلے ایک بات نہ لکھ چکا ہوتا تو اے مسلمانو! تم نے جو کافروں سے بدلے کا مال لے لیا اس میں تم پر بڑا عذاب آتا۔

مطلب یہ کہ اگر ازل سے حکم الٰہی ایسا نہ ہوتا کہ مجتہد کو خطا پر نہ پکڑا جائے تو اس وقت جو کچھ تم نے لیا یا اختیار کیا ہے تمہیں بڑا عذاب ہوتا۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر ہم پر عذاب اترتا تو بجز عمر کے کوئی نجات نہ پاتا۔ اسی بنا پر وہ جماعت کہتی ہے کہ اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر (معاذ اللہ) عتاب اور عذاب کی تہدید ہے۔ اس کے جواب میں صاحب مواہب لدنیہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس میں کسی گناہ کا الزام نہیں ہے بلکہ اس میں اس چیز کا بیان ہے جس سے تمام نبیوں کے سوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخصوص گردانا گیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی نبی کے لئے غنیمت جائز نہیں تھی۔ جیسا کہ فرمایا "أُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ۔" میرے لئے غنیمتوں کو حلال بنایا گیا۔ انتہیٰ۔

چاہے تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ حکم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا تمام نبیوں کے لئے ہے۔ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کے لئے درست ہے کہ وہ قتل نہ کریں اور فدیہ لے لیں اور فدیہ غنیمتوں میں سے ایک قسم ہے۔ لیکن حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے "تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا" (تم دنیاوی ساز و سامان چاہتے ہو) بعض کہتے ہیں کہ اس خطاب سے مراد وہ شخص ہے جو دنیا کا ارادہ کرے۔ اور دنیاوی غرض کے لئے دنیاوی ساز و سامان جمع کرے۔ اور اس آیت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اکثر صحابہ مراد نہیں ہیں۔ بلکہ ضحاک سے مروی ہے کہ یہ آیت اس ہنگامہ کے وقت نازل ہوئی تھی جب کہ روز بدر مشرکین شکست کھا کر بھاگ رہے تھے۔ اور لوگ ساز و سامان کے لوٹنے اور غنیمتوں کے جمع کرنے میں مشغول ہوگئے تھے اور ان کے قتل سے ہاتھوں کو روک لیا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں کفار پلٹ کر دوبارہ حملہ نہ کر دیں۔ اور روز احد ایسا ہی ہوا تو ان کے بارے میں نازل ہوا۔

مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ کچھ تم میں سے دنیا چاہتے ہیں اور کچھ تم میں سے آخرت چاہتے ہیں۔

اب رہا حق تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ۔ "لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ" (اگر روز ازل سے لکھا ہوا نہ ہوتا تو) اس کے معنی میں مفسرین اختلاف کرتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ معنی یہ ہیں کہ اگر پہلے نہ لکھا جاتا کہ میں کسی پر عذاب نہیں کروں گا۔ مگر بعد از ممانعت تو ضرور میں تم کو عذاب دیتا۔ تو یہ دلالت کرتی ہے کہ قیدیوں کا معاملہ گناہ نہ تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ تمہارا ایمان قرآن پر نہ ہوتا تو مراد کتاب سابق سے یہی ہے اور تم عفو کے مستوجب ہوئے ورنہ تم غنایم پر عتاب کئے جاتے۔ یا یہ مراد ہے کہ لوح محفوظ میں یہ لکھا نہ ہوتا کہ غنیمتیں حلال ہیں۔ یہ سب ذنب و معصیت کی نفی کرتی ہیں اس لئے کہ جس چیز کا کرنا حلال ہے وہ معصیت نہیں ہوتی۔ اس لئے حق سبحانہ وتعالیٰ نے آخر آیت میں فرمایا۔ "فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا" تو کھاؤ جو غنیمت تمہیں ملی حلال طیب ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قتل اور فدیہ میں اختیار دیا گیا ہے۔ بلاشبہ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کہا رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جبریل آئے اور کہا کہ آپ کے صحابہ کو قیدیوں کے بارے میں اختیار دیا گیا ہے کہ اگر چاہیں تو انہیں قتل کر دیں اور نہ چاہیں تو اس شرط پر ان سے فدیہ لے لیں کہ آئندہ سال ان میں سے ستر مارے جائیں گے۔ چنانچہ صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ ہم نے فدیہ کو اختیار کر لیا۔ تاکہ ہم میں سے مارے جائیں۔ بلاشبہ روز احد ستر صحابہ کا قتل واقع ہوا۔ یہ دلیل اس کی ہے کہ انہوں نے اذن و اختیار پانے کے بعد ایسا کیا للہذا معصیت کہاں رہی۔ بعض کہتے ہیں کہ اگرچہ قتل و فدیہ میں انہیں اختیار دیا گیا تھا لیکن قتل و اثخان زیادہ بہتر تھا جن پر عتاب کیا گیا لیکن کوئی عاصی و گنہگار نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

اظہارِ سطوت و غلبۂ ربوبیت:۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ اور اگر ہم پر کچھ باتوں کی یونہی نسبت کرتے تو یقیناً ہم ان کو داہنی جانب سے پکڑتے پھر ہم ان کی گردن کی رگ کاٹ دیتے۔

گویا فرماتا ہے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے بات بنا کر اس کی نسبت ہماری طرف کرتے تو ضرور انہیں دائیں جانب سے پکڑتے۔ اور ان کی شہ رگ کاٹ دیتے۔ اور ہلاک کر دیتے۔ اس میں عذاب کا کنایہ ہے جیسا کہ بادشاہوں کی عادت ہے کہ جن پر انہیں غصہ آتا ہے ایسا ہی کرتے ہیں۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی راست گوئی اور حق تعالیٰ کا آپ کو کذب و افتراء سے محفوظ رکھنے کے سلسلے میں مبالغہ ہے لیکن اس عبارت میں "لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ" کی مانند حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بزرگی و کرامت اور قدر و منزلت کے باوجود اظہارِ سطوت اور غلبۂ ربوبیت ہے۔ اور یہ آیت آپ کے مہتم بالشان حال اور کمال محبت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اور

در حقیقت مفتریوں اور کذابوں پر تعریض ہے تاکہ وہ خبردار ہو جائیں۔ بہرحال ہمیں ادب کا دامن نہ چھوڑنا چاہئے اور زبان کی حفاظت کرنی چاہئے اس چیز میں جو محبوب و محب کے درمیان ہو۔

تفصیلی علم کا مسئلہ:۔ لیکن حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ۔" اس سے پہلے نہ تم کتاب جانتے تھے نہ احکام شرع کی تفصیل۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد احکام ایمان اور صفات ایمان کی تفصیلات کا حکم ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے کیونکہ اس کا وجود، قرآن کے نازل ہونے اور دین و شریعت کے مکمل ہونے کے بعد ہے بلاشبہ یہ تو حدِ شہرت کو پہنچ چکا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قبل نبوت خدا کی توحید کا دم بھرتے اور بتوں کو اور ان کی پرستش کو دشمن جانتے اور حج و عمرہ کرتے تھے۔ آپ نے کبھی بھی شراب نہ پی۔ حالانکہ حق تعالیٰ نے بندوں کے لئے آپ کے ذریعہ جو شریعت مقرر فرمائی ہے وہ اس وقت تک آپ پر نازل نہ ہوئی تھی۔ اس آیت کا یہی مفہوم و مراد ہے۔ ایمان کا ارادہ کرنے کا مطلب، تصدیق و اقرار ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ایمان و احکام کی دعوت مراد ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ حذفِ مضاف کے باب سے ہے۔ یعنی "مَا کُنْتَ تَدْرِیْ اَھْلَ الْاِیْمَان" مطلب یہ ہے کہ تم اہل ایمان کو نہیں جانتے کہ اعمام و اقارب یعنی عزیزوں اور رشتہ داروں میں سے کون کون ایمان لائیگا۔ یہ معنی کلام کے سیاق و سباق سے بعید ہے۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَاِلَیْہِ الْمَرْجِعُ وَالْمَاٰبُ۔

باب چہارم

اس باب میں کتب سابقہ توریت اور انجیل وغیرہما کی ان پیشین گوئیوں اور خبروں کو بیان کیا جارہا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم وتوقیر اور رسالت سے متعلق ہیں۔ اور علمائے اہل کتاب نے اپنے اجمال اور تفصیل میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ

جو لوگ اس رسول ونبی امی کی پیروی کرتے ہیں وہ اپنے پاس توریت و انجیل میں لکھا پاتے ہیں کہ وہ انہیں نیکی کا حکم فرمائیں گے اور انہیں برائی سے بچنے کی تلقین فرمائیں گے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر شریف گزشتہ کتابوں میں بکثرت ہے۔ اور انبیاء ومرسلین کی مجلسوں میں حضور خاتم الانبیا علیہ السلام کا ذکر ہمیشہ رہتا تھا۔ چونکہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کو اس سے مطلع کیا ہے تو لامحالہ آپ کا ذکر شریف انہوں نے بطریق اولیٰ اپنی مجلسوں میں کیا ہوگا۔ کیونکہ "مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا اَکْثَرَ ذِکْرَہٗ" جو چیز بہت محبوب ہو اس کا ذکر اکثر کیا جاتا ہے۔ یہ آیۂ کریمہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی پر دلیل ہے۔ اگر یہ خبر واقع کے مطابق نہ ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی نفرت وتکذیب کا موجب ہوتا اور یہود ونصاریٰ سے زیادہ کوئی اور قوم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال اور صدق نبوت سے واقف اور شناسا نہ تھی کیونکہ یہود ونصاریٰ توریت وانجیل میں آپ کے اوصاف پڑھ چکے تھے۔ اور مدینہ منورہ میں مدتوں سے آپ کے منتظر تھے کیونکہ اس شہر میں آپ کے ظہور کی علامتیں اور نشانیاں پائی جاتی تھیں اور یہی یہود ونصاریٰ تھے جب ان سے مقابلہ اور جنگ کی نوبت آتی تو یہ آپ کی بعثت کا واسطہ دے کر فتح ونصرت طلب کرتے اور کہتے کہ اب وہ وقت آگیا ہے جب ہم نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے سایۂ عافیت میں تم سے نبٹیں گے۔ ان کے آباء اپنی موت کے وقت اپنی اولادوں کے لئے وصیت نامے چھوڑ جاتے اور کہتے کہ ہمارا سلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پہنچا کر عرض کریں کہ ہم نے آپ کے انتظار میں جانیں دی ہیں۔ اور اس جہان سے ایمان کے ساتھ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ " یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ " (یہ آپ کو ایسا پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں) مطلب یہ کہ یہ کافر لوگ آپ کو خوب پہچانتے ہیں۔ لیکن جب آپ کا ظہور قدسی ہوا تو ان کی سابقہ شقاوت ازلی عود کر آئی اور حسد وعناد سے آپ کو جھٹلانے لگے اور جان بوجھ کر راہ حق کو چھپانے کی خاطر اپنی کتابوں میں تحریف وتغیر کرنے لگے۔ اور دنیا کی محبت اور حب ریاست نے ذلت وشقاوت اور خسران کے سبب انہیں پست درجے میں گرا دیا۔ لیکن اس تحریف وتبدیلی کے باوجود ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے دلائل اور آپ کی شریعت کی نشانیاں ان کی کتابوں میں اب بھی روشن وتاباں ہیں۔

بیان کرتے ہیں کہ سریانی زبان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام "مشفح" ہے۔ اور مشفح کے معنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس لئے کہ ان کی زبان میں شفح بمعنی حمد ہے۔ اور جب وہ خدا کی حمد کرتے ہیں تو شفحا لاالٰہا یعنی الحمد للہ کہتے ہیں اور جب شفح بمعنی حمد ہوا تو مشفح بمعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوگیا۔ آپ کے احوال وصفات اور آپ کی نبوت کی علامات ونشانیاں صاف صاف اور آپ کی بعثت وہجرت کی جگہ متعین تھی۔ جس روز حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں رونق افروز ہوئے اسی دن حضرت عبداللہ بن سلام جو احبار و اشراف یہود اور اولاد حضرت یوسف علیہ السلام سے تھے حاضر ہوئے اور ایمان لائے اور جس دن سے مکہ مکرمہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی خبر سنی تھی یہ اسی دن سے آپ کے لقائے شریف کی سعادت حاصل کرنے کے منتظر تھے۔

مدتے بود کہ مشتاق لقایت بودم لاجرم روئے ترا دیدم و از جا رفتم

جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار پرانوار سے مشرف ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم ہی ابن سلام، یثرب کے عالم ہو؟ عرض کیا ہاں! فرمایا میں تمہیں اس خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے مجھے بھیجا کیا تم نے خدا کی کتاب توریت میں میری صفات کو پایا ہے؟ کہا ہاں! میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ آپ کو مظفر و غالب فرمائے گا۔ وہ آپ کے دین کو تمام دینوں پر غالب کرے گا۔ یقیناً بلاشک وشبہ میں نے خدا کی کتاب میں آپ کی خوبیاں اور صفتیں پائی ہیں۔ اور آپ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا۔ اے نبی یقیناً ہم نے آپ کو بھیجا امت پر گواہی دینے والا یعنی ان کی تصدیق و تکذیب اور نجات وہلاکت کی

گواہی دینے والا اور فرماں برداروں کو ثواب واجر کی بشارت دینے والا اور نافرمانوں کو عذاب سے ڈرانے والا۔ حرزاً للامیین" امیوں یعنی اہل عرب کو جن کی اکثریت لکھنا پڑھنا نہیں جانتی پناہ دینے والا، اور آپ سارے جہان کے لئے پشت پناہ ہیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ عرب کی تخصیص، ان میں آپ کی بعثت، اور آپ سے قریبی ہونے کی وجہ سے، یا اس وجہ سے کہ پہلے جہل و نادانی اور شقاوت قلبی میں مشہور و منہمک تھے اب آپ کی تعلیم و تربیت سے علم وہدایت کے بلند مقام پر فائز ہوگئے۔ "حرز" اس محفوظ جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی آفت و تکلیف نہ پہنچے۔ اس سے مراد ان کی حفاظت و پناہ آفتوں سے ہے۔ خواہ وہ آفت نفسانی ہو یا شیطانی و ساوس وغیرہ جیسا کہ فرمایا:۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّيْنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔ اللہ وہ ہے جس نے امیوں میں رسول کو انہیں میں سے بھیجا جو ان پر خدا کی آیتیں تلاوت کرتا اور ان کا تزکیہ فرماتا اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے اگرچہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

ممکن ہے کہ اس سے مراد دائمی عذاب وہلاکت اور انہیں نیست و نابود ہونے سے محفوظ و پناہ میں رکھنا ہو جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا:۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيْهِمْ۔ اور نہیں ہے خدا کہ ان کو دائمی عذاب دے در آنحالیکہ آپ ان میں تشریف فرما ہوں۔

عبداللہ بن سلام کی حدیث کا تتمہ یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا "وَأَنْتَ عَبْدِيْ وَرَسُوْلِيْ۔" آپ میرے بندۂ خاص ہیں کوئی اس صفت میں آپ کا ہمسر نہیں۔ اور آپ میرے رسول ہیں جو ساری مخلوق کی طرف مبعوث ہیں "وَسَمَّيْتُكَ الْمُتَوَكِّلَ"۔ اور میں نے آپ کا نام متوکل رکھا کیونکہ آپ نے اپنے تمام کام مجھ پر چھوڑ دیئے ہیں۔ اور آپ اپنی ذاتی قوت وطاقت سے باہر آگئے ہیں کیونکہ بندگی کے معنی کی حقیقت یہی ہے۔ "لست بفظٍ ولا غليظ۔" اور آپ نہ درشت خو ہیں اور نہ سخت دل۔ چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا:۔

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ۔ یعنی اگر آپ درشت خو اور سخت دل ہوتے تو آپ کے گرد سے یقیناً وہ ہٹ جاتے۔

اور یہ جو دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ "وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۔" (ان منافقوں اور کفار پر سختی فرمایئے) تو اس کا جواب یہ ہے کہ مزاج کی خوبی اور دل کی نرمی آپ کی طبعی اور جبلی خصلت ہے غلظت کا حکم مخلوق کے علاج کے لئے ہے جس کی بہتر توجیہہ یہ ہے کہ عدم سختی اور نرم دلی مسلمانوں کے لئے ہے۔ اور کافروں اور منافقوں کے لئے سختی و غلظت کا حکم دیا گیا ہے۔ آپ میں یہ دونوں صفتیں حق

تعالیٰ کے لئے ہیں۔ "اُحِبُّ لِلّٰہِ وَاُبْغِضُ لِلّٰہِ۔" (محبت بھی اللہ کے لئے اور دشمنی بھی اللہ کے لئے) اور فرمایا "اَنَا الضَّحُوْکُ القَتُول" (میں بہت تبسم کرنے والا اور بہت قتل کرنے والا ہوں) باب اخلاق میں اس کی طرف اشارہ گزر چکا ہے۔ "ولا سخاب فی الاسواق" (اور بازاروں میں شور و شغب کرنے والے نہ تھے۔) جیسا کہ جاہلوں کی عادت ہے۔ یہ عقلمندی کی نشانی ہے کہ نرم خو ہو اور آواز بلند نہ کرے۔ اور کج خلقی سے احتراز کرے، مجلس میں بھی، گھر میں بھی اور بازاروں میں بھی۔

وَلَا یَجْزِیْ بِالسَّیِّئَۃِ السَّیِّئَۃَ وَلٰکِنْ یَعْفُوْ وَیَغْفِرُ۔ وَلَنْ یَّقْبِضَہُ اللّٰہُ حَتّٰی یُقِیْمَ بِہِ الْمِلَّۃَ الْعَوْجَاءَ بِاَنْ یَّقُوْلُوْا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔

برائی کا بدلہ برائی سے نہ لے اور عفو و درگزر اور پردہ پوشی سے کام لے۔ اور اللہ تعالیٰ ہرگز دنیا سے آپ کو نہ اٹھائے گا جب تک کہ کجرو لوگوں کی درستگی نہ فرمادے اور لا الٰہ الا اللہ نہ کہہ لیں اور توحید کا اقرار کرکے شرک کا ازالہ نہ کرلیں۔

فَیَفْتَحُ بِہٖ اَعْیُنًا عُمْیًا وَّاٰذَانًا صُمًّا وَّقُلُوْبًا غُلْفًا (تو اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعہ ایسی اندھی آنکھوں کو کھولے گا جو راہ راست نہیں دیکھتیں۔ اور ایسے کانوں کو کھولے گا جو حق بات نہیں سنتے اور ایسے دلوں کو کھولے گا جو نہیں سمجھتے اور حقیقت حال کو نہیں پاتے۔)

ایک اور روایت میں اتنا زیادہ ہے کہ وہ بازار میں فریاد اور فحش کلامی نہ کریں گے اور جو فرمائیں گے جھوٹ نہ ہوگا۔ اور ہر خوبی و کمال اور ہر صفت و جمال سے آراستہ و پیراستہ ہوں گے۔ اور میں انہیں ہر خلق کریم عطا کروں گا اور اطمینان و سکون اور آرام و آہستگی کو ان کا لباس بناؤں گا اور تقویٰ و پرہیزگاری کو ان کا ضمیر کروں گا۔ حکمت ان کی عقل، صدق و وفا ان کی طبیعت، عفو و نیکی ان کی عادت، عدل ان کی سیرت، حق ان کی شریعت، ہدایت ان کا امام، اسلام ان کی ملت، اور احمد ان کا نام رکھوں گا۔ لوگ گمراہی کے بعد ان سے ہدایت پائیں گے۔ اور آپ کے وسیلہ سے جہالت کے بعد لوگ عقل مند بنیں گے۔ اور گم نامی کے بعد ان کا نام چار دانگ عالم میں گونجے گا۔ اور کمی کے بعد انہیں کثرت و زیادتی عطا کروں گا اور جدائیگی کے بعد انہیں بلاؤں گا۔ اور مفلسی کے بعد انہیں تونگر کروں گا۔ اور مخالف دلوں اور پراگندہ خواہشوں اور جدا جدا بکھری ہوئی جماعتوں میں الفت و محبت ڈالوں گا۔ اور ان کی امت کو بہترین امت قرار دوں گا۔ کعب احبار سے بھی ایسا ہی مروی ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ سیدنا ابن عباس نے حضرت کعب سے دریافت فرمایا تم نے توریت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف حمیدہ کیا کیا پائے انہوں نے بیان کیا کہ توریت میں لکھا ہوا ہے کہ محمد بن عبداللہ، عبدالمختار یعنی اللہ کے بندے، مکہ مکرمہ ان کی جائے پیدائش، مدینہ منورہ ان کا مقام ہجرت اور ملک شام ان کے زیر قبضہ ہوگا نہ وہ سخت گو ہوں گے نہ درشت خو۔ نہ بازاروں میں شور و غل کریں گے اور نہ برائی کا بدلہ لیں گے بلکہ عفو و درگذر سے کام لیں گے۔ اس روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مرحومہ کی تعریف بھی آئی ہے۔ چنانچہ انہوں نے بیان کیا۔ آپ کی امت غم و مسرت اور خوشی و ناخوشی میں شکر گذار ہوگی اور ہر پستی و بلندی پر حق تعالیٰ کی حمد و تکبیر کرے گی۔ نمازوں کے لئے آفتاب کی رعایت کریں گے۔ اور جب سورج کسی نماز کا وقت لائے گا تو وہ اس وقت نماز بجالائے گی اگرچہ وہ خاک نشین ہوں گے اور ٹخنے سے اوپر ازار بند اور پائجامے پہنیں گے۔ اور اپنے اعضاء کے اطراف یعنی ہاتھ پاؤں اور چہرے کا وضو کریں گے۔ اور ان کا منادی یعنی مؤذن آسمان میں ندا کرے گا یعنی بلند و بالا برجوں میں اذان دے گا۔ ان کی صفیں جنگ اور نماز میں یکساں ہوں گی۔ وہ راتوں میں نغمہ سنج ہوں گی۔ اس نغمہ سنجی سے مراد رات کے اوراد و وظائف اور تلاوت قرآن ہے۔

بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ فرمایا جب حضرت موسیٰ

علیہ السلام پر توریت نازل ہوئی اور انہوں نے اسے پڑھا اور اس میں انہوں نے اس امت مرحومہ کا ذکر پایا تو عرض کیا کہ اے خدا میں توریت کی ان تختیوں میں ایسی امت کا ذکر پاتا ہوں جو آخر بھی ہے اور سابق بھی ہے۔ مطلب یہ کہ وجود زمانی میں تو وہ آخری امت ہوگی اور فضل و شرف میں سابق یعنی اول و فائق ہوگی۔ ان کے لئے شفاعت کی جائیگی۔ ان کی دعاؤں سے بارشیں ہوں گی ان کے سینوں میں کلام الٰہی محفوظ ہوگا۔ جنہیں وہ ازبر، بطور حافظ پڑھیں گے۔ غنیمتوں کو کھائیں گے۔ اور صدقات کو ان کے اپنے ہی شکموں کے لئے گردانا گیا۔ یہ اسی امت کے خواص ہیں۔ جن پر احکام کو آسان کیا گیا ہے۔ اور غنیمتوں اور صدقات کو ان پر حلال کیا گیا۔ بخلاف پچھلی امتوں کے کہ یہ ان پر حلال نہ تھیں۔ اور جب وہ کسی بدی کا ارادہ کریں گے تو اسے نہ لکھا جائے گا اور جب وہ بدی کا ارتکاب کرلیں گے تو ایک ہی بدی لکھی جائے گی۔ اور جب نیکی کا قصد کریں گے تو اسے لکھا جائے گا۔ اور جب نیکی کرلیں گے تو دس نیکیاں لکھی جائیں گی۔ اور انہیں اول و آخر کا علم دیا جائے گا۔ اور دجال کو وہ قتل کریں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا امتی ہونے کی تمنا کرنا۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب توریت کی تختیوں میں امتِ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریباً ستر صفات کو پڑھا تو انہوں نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا "اے خدا! اس امت کو میری امت بنادے۔" فرمان باری آیا کہ اے موسیٰ! اس امت کو تمہاری امت کیسے بناؤں وہ امت تو نبی آخر الزماں احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا اے رب تو مجھے ہی امتِ محمدیہ میں بنادے۔ اس پر حق تعالیٰ نے انہیں اپنے اس ارشاد میں دو خوبیاں مرحمت فرمائیں۔ چنانچہ فرمایا۔

قَالَ يٰمُوسٰىٓ اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ اے موسیٰ میں نے تمہیں لوگوں پر اپنی رسالت اور اپنے کلام کے ساتھ برگزیدہ فرمایا تو تم لو جو میں نے تمہیں دیا اور شکرگزاروں میں ہو جاؤ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا، اے خدا! میں اس پر راضی ہوگیا۔

ابو نعیم بروایت سالم بن عبداللہ بن عمر بن خطاب نقل کرتے ہیں کہ کعب احبار سے ایک مرد نے کہا کہ میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا کہ لوگ حساب کتاب کے لئے جمع ہوئے ہیں اور تمام نبیوں کو بلایا گیا ہے جملہ نبی اپنی اپنی امت کے ساتھ آئے اور ہر نبی کے لئے دو نور اور ہر امتی کے لئے ایک نور جوان کے ساتھ ساتھ چلتا تھا دیکھا گیا۔ اس کے بعد حضور اکرم احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ علیہ التحیتہ والثنا کو بلایا گیا تو آپ کے ہر موئے تن کے ساتھ ایک ایک نور تھا۔ اور آپ کے ہر امتی کے ساتھ دو نور تھے۔ اس پر کعب احبار نے اس مرد سے دریافت کیا کہ تم نے جو اپنے خواب کی تفصیل بیان کی ہے کیا تم نے ایسا کہیں پڑھا ہے؟ اس شخص نے کہا خدا کی قسم! خواب میں ایسا دیکھنے کے سوا کہیں اور کسی جگہ ایسا نہ پڑھا۔ تو حضرت کعب فرماتے ہیں قسم ہے اس ذات کی جس کے دستِ قدرت میں کعب کی زندگی ہے یہ صفت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت کی ہے اور وہ صفت تمام نبیوں اور ان کی امتوں کی ہے یہی کتاب الٰہی میں ہے گویا کہ تو نے توریت میں اسے پڑھا ہے۔

وہ خبریں جن میں یہود کو پہلے ہی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت کا علم تھا

وصل:۔ اب رہیں وہ خبریں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کو رسول اکرم سید الابرار صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و صداقت کا پہلے ہی علم تھا۔ اور ان شریروں نے ان کے ظہور کے بعد عناد وا نکار کیا۔ بجز ان لوگوں کے جن کے حال کے ساتھ توفیق و ہدایت

ربانی شامل تھی۔ ایسی خبریں بے شمار ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ توریت کی تعلیم و تدریس کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے اور اپنی اولاد میں برابر چرچا کرتے رہتے۔ آپ کا حلیہ شریف بتلاتے، ہجرت و بعثت کا مقام متعین کر کے کہتے کہ نبی آخر الزماں مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ رونق افروز ہوں گے لیکن جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو انہوں نے حسد و عناد کی راہ اختیار کی اور کہنے لگے کہ یہ وہ شخص نہیں ہیں جن کے بارے میں ہم انہیں بتلاتے آ رہے ہیں۔ اور آپ کی صفات شریف میں تحریف کرنے لگے۔ لیکن ان کی اس تحریف و تغییر کے باوجود آپ کے دلائل و شواہد توریت میں روشن و تاباں تھے۔ قبیلہ اوس کا ایک شخص ابو عامر راہب تھا۔ اور قبیلہ اوس و خزرج میں اس سے زیادہ کوئی دوسرا شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف بیان کرنے والا نہ تھا۔ وہ مدینہ کے یہودیوں سے محبت کرتا اور ان کے پاس اٹھتا بیٹھتا تھا۔ وہ ان سے دین اسلام کے بارے میں پوچھتا وہ اسے رسولِ رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف بتاتے اور کہتے کہ مدینہ ان کے ہجرت کا مقام ہے پھر وہ یہودیوں کے پاس سے مقام تما گیا۔ انہوں نے بھی ایسا ہی بتایا اس کے بعد وہ ملک شام گیا اور نصرانیوں سے اس نے دریافت کیا انہوں نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی صفات بیان کیں تو ابو عامر گوشہ نشین ہو گیا اور راہب بن گیا۔ راہبوں جیسا لباس (پلاس) پہننے لگا۔ وہ برابر یہ کہتا رہا کہ میں ملتِ حنیفیہ ، دین ابراہیم علیہ السلام پر ہوں۔ اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کا منتظر ہوں۔ اور اسی ابو عامر نے جنات سے بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات اور نشانیاں سنی تھیں۔ لیکن جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہور فرمایا تو وہ اپنے حال میں برقرار رہ کر بغاوت، حسد اور نفاق کا مظاہرہ کرنے لگا۔ وہ کہتا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کس چیز پر مبعوث کئے گئے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے ملتِ حنیفیہ پر مبعوث فرمایا گیا ہے۔ وہ کہنے لگا نہیں بلکہ اسے غیر کے ساتھ خلط ملط کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بلکہ میں اسے روشن اور پاک وصاف لایا ہوں۔ پھر فرمایا اے ابو عامر! وہ خبریں کیا ہوئیں جو یہود نے تجھے میری صفات کے بارے میں بتائی تھیں۔ کہنے لگا! آپ وہ نہیں ہیں جن کے بارے میں یہود نے صفتیں بیان کی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا اے عامر! تو جھوٹ بول رہا ہے۔ ابو عامر نے کہا میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ "آپ دروغ فرما رہے ہیں۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ جھوٹ بولنے والے کو بے کس و ناچار مسافرت کی حالت میں ہلاک کرے۔ چنانچہ اس کے بعد ابو عامر مکہ کی طرف لوٹ گیا اور قریش کے دین کی پیروی کرنے لگا۔ اس نے سابقہ طریقہ رہبانیت کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد وہ ملک شام جاتے ہوئے یکہ و تنہا بیکسی و ناچاری اور مسافرت کی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بد دعا کے بموجب مر گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی جانب سے توفیق و ہدایت نہ ہو علم و دانش کام نہیں آتا "وَاللّٰهُ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔" اسی ابو عامر کے بیٹے حضرت حنظلہ تھے جنہیں "غسیل ملائکہ" کہا جاتا ہے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ اور ایمان لائے۔ اور ان کا اکابر صحابہ کرام میں شمار ہوا۔ ان کے "غسیل ملائکہ" ہونے کا مشہور قصہ ہے۔ چنانچہ ابن حبان اپنی "صحیح" میں اور حاکم "مستدرک" میں بر شرط شیخین بیان کرتے ہیں کہ یہ نئے شادی شدہ تھے بلکہ اسی روز شادی کر کے اپنی بیوی سے ہم بستر ہو کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ اچانک روزِ احد کفار سے جنگ کی شدت کا غلغلہ سنا بے چین ہو گئے۔ غسل جنابت کرنے کی بھی فرصت نہ پائی باہر نکل کر کفار سے مصروفِ پیکار ہو گئے یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ملاحظہ فرمایا کہ فرشتے انہیں غسل دے رہے ہیں۔ فرمایا کہ حنظلہ کی حقیقت حال کیا ہے اور کس سبب سے ان کو شہدا کے درمیان خاص طور پر فرشتے غسل دے رہے ہیں۔ (کیونکہ مسئلہ ہے کہ شہید میدان جنگ میں قتل ہو جائے تو اسے نہ تو غسل دیا جائے گا اور نہ اس کے کپڑے اتارے جائیں گے۔ اور یہاں تو انہیں فرشتے غسل دے رہے ہیں؟) اور ایک روایت میں تصریح ہے نہ فرمایا دو

جنبی تھے اور اپنی بیوی کے پاس سے اسی طرح اٹھ کر چل دیئے تھے۔ اور جب ان کی بیوی سے دریافت کیا تو اس نے یہی حقیقتِ حال بیان کی۔ اسی بنا پر امام اعظم ابو حنیفہ جنبی شہید کو غسل دینے کا حکم فرماتے ہیں لیکن صاحبین اور امام شافعی رحمہ اللہ اس کے برعکس رائے رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ غسل جو جنابت کی وجہ سے فرض تھا وہ تکلیف کے دائرے سے نکلنے کے بعد ساقط ہو گیا اور وہ غسل جو موت کے سبب لازم ہوتا ہے اسے شہادت نے ساقط کر دیا۔ اب اس پر کون سا غسل واجب ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ اپنی دلیل میں حضرت حنظلہ کے اسی قصہ کو لاتے ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو جو بعض روایتوں میں آیا ہے کہ وہ جنبی تھے دلیل میں پیش کرتے ہیں۔

اب ہم توریت، انجیل، زبور، اور صحف آدم وابراہیم وغیرہا علیہم السلام سے وہ خبریں نقل کرتے ہیں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف میں ہیں۔

توریت وانجیل وغیرہ سے بشارتیں۔ ۔ وصل۔۔ مخفی نہ رہنا چاہئے کہ قرآن کریم کی اس خبر کے بعد ان کتابوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال شریف اور آپ کی صفتیں موجود ہیں۔ اس مدعا کے ثبوت میں کسی مزید دلیل کی حاجت نہیں رہتی۔ لیکن ان دشمن خدا کافروں کی الزام تراشی سے بچنے کے لئے ان کا لانا ضروری ہے اور اس سے مسلمانوں میں اطمینان کی زیادتی اور نورانیت ویقین پیدا ہو گا۔ لیکن توریت میں حذف وتحریف، تغیر وتبدل اور ان خیانتوں کے بعد بھی جو ان بدبختوں نے اس امانت کی ادائیگی میں کی ہے۔ موجود ہے کہ "حق تعالیٰ نے سینا سے تجلی فرمائی اور ساغیر سے ظاہر ہوا اور فاران سے آشکارا ہوا۔"

"سینا" اس پہاڑی کو کہتے ہیں جس کو طور سینا اور طور سینین کہتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے اس پر تجلی فرمائی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا اور اس پر ان کی نبوت ظاہر ہوئی۔ ساغیر سے ان پر انجیل نازل ہوئی "فاران" عبرانی نام ہے اور مکہ مکرمہ میں بنی ہاشم کی ان پہاڑیوں کو کہتے ہیں جن میں سے ایک پہاڑی پر حضور اکرم صلی الہ علیہ وسلم اظہارِ نبوت سے قبل عبادت فرماتے تھے۔ اور اسی پہاڑی پر سب سے پہلے خدا کی وحی نازل ہوئی۔ یہ تین پہاڑ ہیں۔ ایک جبل ابو قبیس ہے جس کے نیچے مکہ مکرمہ کی آبادی ہے۔ اس کے مقابل جبل قیقعان، بطن وادی تک ہے اور اس کے مشرقی جانب جبل قیقعان کے متصل شعب بنی ہاشم ہے۔ اور اسی شعب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے ولادت ہے۔

اور ابن قتیبہ جو کہ علمائے امت میں سے ہیں۔ جنہوں نے کتب سابقہ پڑھی اور ترجمہ کی ہیں۔ وہ "اعلام النبوۃ" میں فرماتے ہیں کہ اس جگہ ہر اس شخص کو جو ذرا بھی اس میں غور وفکر کرے کوئی دشواری نہ ہوگی۔ اس لئے کہ جیسا کہ حقیقت الامر ہے کہ حق تعالیٰ کا طور سینا پر تجلی فرمانے کا مطلب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر توریت کا نازل فرمانا ہے۔ اور جبل ساغیر سے اس کا ظہور فرمانے سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل کا نازل فرمانا ہے چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ارض خلیل کے جبل ساغیر میں (جسے ناصرہ کہتے ہیں) سکونت واقامت فرماتے تھے۔ اور اسی بنا پر ان کے پیرو کاروں کا نام نصاریٰ رکھا گیا۔ اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ ساغیر سے حق تعالیٰ کا ظہور فرمانا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل کا نازل فرمانا مراد ہے تو فاران کی پہاڑیوں پر سے طلوع وآشکارا ہونے سے حضور اکرم ﷺ پر قرآن کریم کا نازل ہونا مراد ہے۔ اس بارے میں مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان کوئی اختلاف بھی نہیں ہے کہ فاران مکہ کی پہاڑیوں ہی کا نام ہے۔ اور اگر وہ یہ دعویٰ کریں کہ فاران مکہ کے سوا پہاڑوں کا نام ہے تو یہ ان کا بہتان وافتراء ہو گا۔ ہم کہتے ہیں کہ توریت میں یہ نہیں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہاجرہ واسمٰعیل علیہما السلام کو فاران پر بسایا تھا اور اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ پھر ہمیں وہ دوسرا مقام بتاؤ جہاں خدا آشکارا ہوا ہو۔ اور اس جگہ کا نام بھی فاران ہی ہو۔ اور وہاں کسی نبی کی بعثت ہوئی ہو اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام

کے بعد اس نبی پر خدا نے کتاب نازل فرمائی ہو۔ اور ہمیں وہ دین دکھاؤ جو ظہور و انکشاف میں دین اسلام کی مانند ظاہر و منکشف اور آشکارا ہو۔ کیا تم کیا جانتے نہیں کہ مشرق اور مغرب میں کوئی دین بھی اتنا آشکارا اور ظاہر نہیں ہوا جتنا کہ جہان بھر میں دین اسلام آشکارا اور ظاہر ہوا۔

توریت کی دوسری بشارت:۔ نیز توریت میں یہ بھی موجود ہے کہ حق تعالیٰ نے توریت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے "سفر خامس" میں یہ خطاب فرمایا کہ۔

"تمہارا رب بنی اسرائیل کے لئے تمہارے برادروں میں سے (اور ایک روایت میں ہے ان کے برادروں میں سے) نبی پیدا کر کے مبعوث فرمائے گا اور اس کے منہ میں اپنا کلام رکھے ہو گا پھر وہ ان کے لئے وہی فرمائے گا۔ جن کا میں حکم دوں گا۔ اور جو کوئی ان کے ارشاد کی اطاعت و تعمیل نہ کرے گا میں اسے سزا دوں گا۔"

اس کلام توریت کی دلالت، سید عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر واضح ہے اس لئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم بنی اسرائیل، حضرت اسحٰق علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ اور ان کے بھائی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں اور اگر یہ نبی موعود، ابناء اسحٰق علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے ہے تو وہ انہیں میں سے ہوں گے نہ کہ ان کے بھائیوں میں سے۔ اور اگر وہ یہ کہیں بنی اسرائیل، بنی اسرائیل کے بھائی ہیں۔ اس بنا پر اخوت کا اطلاق درست ہے تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ اس طرح تم توریت کو جھٹلا رہے ہو اس لئے کہ توریت میں مذکور ہے کہ بنی اسرائیل میں کوئی نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مانند قائم نہ ہوا۔ اور توریت کے ایک اور ترجمہ میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی مانند بنی اسرائیل میں کبھی بھی کوئی قائم نہ ہو گا۔ لہٰذا بعض یہودیوں کا یہ قول باطل ہو گیا کہ اس نبی موعود سے حضرت "یوشع بن نون" مراد ہیں۔ اس لئے کہ حضرت یوشع، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نہ کفو تھے اور نہ ان کی مثل۔ بلکہ ان کی حیات میں ان کے خادم تھے۔ اور وفات کے بعد ان کی دعوت کو موکد و موید کیا تھا۔ چنانچہ ثابت ہو گیا کہ اس نبی موعود سے سید عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی مراد جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کفو و مثل ہیں۔ اور یہ کہ آپ اقامت دعوت حق، تحدی معجزہ، تشریع احکام اور اجراء نسخ بر شرائع سابقہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مماثل ہیں۔ اور بجائے خود یہ بات بکثرت دلائل سے روشن ہے کہ نبی موعود اور نبی آخر الزماں حضور اکرم سید عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

فرماتے ہیں کہ توریت کا یہ فرمان کہ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ "میں اپنا کلام ان کے منہ میں رکھوں گا۔" اس سے مقصود اور معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے کلام کی وحی ان کی طرف کریں گے اور وہ اس کلام وحی سے وہی خطاب فرمائیں گے جو انہوں نے سنا ہو گا۔ اور ان کی طرف کوئی لکھا ہوا صحیفہ یا الواح نہیں اتاروں گا اس لئے کہ وہ امی ہیں لکھا ہوا نہ پڑھیں گے۔

انجیل کی بشارتیں:۔ انجیل میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت ہونے کے سلسلے میں ابن ظفر یل نے بیان کیا ہے کہ یوحنا جو حضرت عیسیٰ کا حواری تھا وہ اپنی انجیل میں حضرت مسیح کے حوالہ سے بتاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا:۔

> "میں اپنے باپ سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ تمہیں دوسرا "فارقلیط" عنایت فرمائے جو تمہارے ساتھ تا ابد ثابت و قائم رہے وہ روح حق ہے۔ اور وہ تمہیں ہر چیز سکھائے گا۔ اور فرمایا بیٹا جانے والا ہے۔ (اس سے کنایۃً اپنی ذات مراد لی ہے) کیونکہ اب اس کے بعد فارقلیط آنے والا ہے جو تمہارے بھیدوں کو زندہ کر کے ہر چیز کو بدل دے گا۔ اور وہ میری گواہی دیں گے۔ جیسا کہ میں ان کی گواہی دے رہا ہوں۔ میں تمہارے لئے "امثال" لایا ہوں اور وہ اس کی تاویل (یعنی تفسیر و تشریح) لائے گا۔ (اس تاویل سے مراد قرآن ہے جو کہ محتمل تاویلات اور معانی کثیرہ کا

حامل ہے بخلاف دیگر آسمانی کتابوں کے) اور دوسرا فارقلیط ایسا ہوگا جسے سارے جہان میں کوئی بھی توڑنے کی طاقت نہ رکھے گا۔ اگر تم میری دعوت مانتے ہو اور مجھے سے محبت رکھتے ہو تو میری اس وصیت کو یاد رکھنا۔ میں خدا سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ تمہیں فارقلیط عنایت فرمائے۔ جو آخر زمانہ تک تمہارے ساتھ رہے۔ "

اس میں اس کی وضاحت وصراحت ہے کہ حق تعالیٰ ان کی طرف کسی ایسے کو بھیجے گا جو حق تعالیٰ کی رسالت تبلیغ میں اور خلق کی سیاست اس کے مقام میں قائم فرمائے گا۔ اور اس کی شریعت باقی اور تا ابد یعنی جب تک زمانہ قائم ہے رہے گی۔ آیا ہے کوئی ایسا؟ بجز سید عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے۔

فارقلیط کی تفسیر میں نصاریٰ اختلاف کرتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ فارقلیط کے معنی حامد یعنی حمد کرنے والے کے ہیں اور بعض کہتے ہیں بمعنی مخلص ہے۔ اگر ہم مخلص کے معنی میں ان کی تائید کریں تو مخلص ایسا رسول ہوگا جو سارے جہان کی خلاصی اور رستگاری کے لئے تشریف لائے۔ اور یہ تفسیر ہماری منشا کے موافق ہے اس لئے کہ ہر نبی کفر سے امت کو نجات دلانے والا ہوتا ہے۔ اور ان معنی میں انجیل میں حضرت مسیح کا قول شاہد ہے کہ " میں لوگوں کو نجات دینے کیلئے آیا ہوں۔ " جب ثابت ہوگیا کہ حضرت مسیح نے اپنی توصیف " لوگوں کا نجات دہندہ " فرمائی ہے تب انہوں نے باپ سے استدعا کی کہ دوسرا فارقلیط یعنی نجات دہندہ عنایت فرمائے اور یہ اس کی دلیل ہے کہ ایک فارقلیط تو گزر گیا اب دوسرا فارقلیط آتا ہے۔

اگر ہم بطریق تنزل یہ تسلیم کرلیں کہ " فارقلیط " کے معنی حامد کے ہیں تو یہ لفظ " احمد " سے کتنا زیادہ قریب ہے۔ اسی بنا پر ابن ظفر نے کہا ہے کہ انجیل میں جس چیز کا ترجمہ کیا گیا ہے وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ فارقلیط رسول ہے اس لئے آپ نے فرمایا کہ جو کلام مجھ سے تم سنتے ہو وہ میرا نہیں ہے بلکہ وہ باپ کا کلام ہے۔ جو مجھ پر تمہارے لئے نازل فرمایا گیا ہے۔ اور وہ " فارقلیط " جو " روح القدس " ہے باپ اسے میرے نام سے بھیجے گا تاکہ وہ تمہیں ہر چیز کی تعلیم دے۔ اور تمہیں یاد دلائے اور نصیحت فرمائے جیسا کہ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں " لہٰذا کیا اس سے زیادہ واضح تر کوئی بیان ہے؟ کہ " فارقلیط " وہ رسول ہے جسے حق تعالیٰ بھیجے گا۔ اور وہ خدا کی مخلوق کو ہر چیز کی تعلیم دے گا۔ وہ انہیں وعظ ونصیحت فرمائے گا لیکن اس جگہ باپ کا بولنا محرف اور بدلا ہوا لفظ ہے اور اہل کتاب اس لفظ کے استعمال سے ناآشنا نہیں ہیں کہ یہ پروردگار سبحانہ وتعالیٰ کی جانب اشارہ ہے کیونکہ یہ تعظیم کا لفظ ہے۔ اور اس لفظ سے شاگرد استاد کو مخاطب اور اس سے اپنے علم میں استمداد کرتا ہے۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ نصاریٰ اپنے علمائے دین کو روحانی باپ سے مخاطب کرتے ہیں۔ اور یہ کہ بنی اسرائیل اور بنی عیص اپنے آپ کو " نحن ابناء اللہ " کہتے ہیں۔ یعنی ہم اللہ کے بیٹے ہیں۔ اس وجہ سے وہ اپنے تئیں بدگمانی میں ڈالے ہوئے تھے۔

لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول کہ باپ اسے (فارقلیط کو) میرے نام سے بھیجے گا۔ اس میں سید عالم محمد مصطفیٰ ﷺ کی شہادت کی طرف اشارہ ہے جو آپ نے عیسیٰ علیہ السلام کے سچے رسول ہونے کے بارے میں دی اور وہ آیات قرآنیہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مدح وتعریف اور ان کی پاکی وتنزیہہ کے سلسلے میں قرآن میں مذکور ہیں جن کے لئے بنی اسرائیل افتراء کرتے تھے ان کی طرف اشارہ ہے۔ انجیل کے ایک اور ترجمہ میں ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا کہ

" فارقلیط نہیں آئے گا جب تک میں نہ جاؤں اور جب فارقلیط آئے گا تو جہان کو غلطی وخطا پر سرزنش وتوبیخ کرے گا۔ اور وہ اپنے پاس سے کوئی بات نہیں فرمائے گا وہی فرمائے گا جو خدا سے سنے گا۔ اور حق وصداقت کے ساتھ لوگوں کی سیاست فرمائے گا اور حوادث کی ان کو خبریں دے گا۔ "

ایک اور روایت میں ہے کہ " وہ اپنی طرف سے کچھ نہ کہے گا۔ بلکہ وہی بات کرے گا جو کچھ خدا سے سنے گا۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے اسے بھیجا ہے"۔

جیسا کہ قرآن کریم میں حق تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا " وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى۔ " یعنی وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں فرماتے وہی فرماتے ہیں جو ان کی طرف وحی کی جاتی ہے۔

اور حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا " وہ (یعنی فارقلیط) میری بزرگی و عظمت بیان کرے گا اور میری نشانیوں کو معظم جانے گا۔ " اور یہ حقیقت واقعیہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جتنی عظمت و بزرگی حضور سید عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے کسی نے بھی ایسی بیان نہ کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے وصف رسالت کو بیان فرمایا اور ان کو ان چیزوں سے پاک و منزہ بتایا۔ جن کو ان کی امت نے ان کی طرف منسوب کر رکھا ہے۔

یہ تمام صفات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں۔ وہ کون ہے جس نے بنی اسرائیل کے علماء کو حق چھپانے اپنی جگہ سے کلمات ربانی کی تحریف کرنے اور تھوڑے داموں پر دین کو فروخت کرنے پر توبیخ فرمائی؟ اور وہ کون ہے جس نے حوادث کی اور غیبی حالات کی خبریں دیں ہیں؟ بجز سید عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے۔

انجیل میں حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ سید عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرو اور ان پر ایمان لاؤ۔ اور اپنی امت سے فرما دو کہ ہر وہ شخص جو آپ کا زمانہ پائے وہ آپ پر ایمان لائے۔ اے فرزند بتول (کنواری مریم) تم جان لو کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتے تو میں آدم، جنت اور دوزخ کسی کو بھی پیدا نہ فرماتا۔ اور جب میں عرش کو عالم وجود میں لایا تو وہ کانپتا تھا اسے قرار نہ تھا پھر میں نے عرش پر لکھا " لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ " تو وہ ساکن ہو گیا۔

مواہب لدنیہ میں بیہقی سے بروایت سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما منقول ہے کہ جب جارود نصرانی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام قبول کیا تو اس نے کہا کہ " اس خدا کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا بلا شبہ میں نے انجیل میں آپ کا وصف پڑھا ہے اور فرزند بتول نے آپ کی بشارت دی ہے۔ بیہقی دلائل النبوۃ میں از ابو امامہ باہلی از ہشام بن العاص اموی نقل کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ مجھے اور دیگر چند آدمیوں کو ہرقل قیصر روم کی طرف بھیجا گیا تاکہ میں اسے دعوت اسلام دوں پھر پوری حدیث بیان کی اور کہا کہ ایک رات ہرقل نے ہمیں اپنے پاس بلایا ہم اس کے پاس گئے تو اس نے بڑا زر نگار صندوق منگوایا جس میں چھوٹے چھوٹے خانے تھے۔ اور ہر خانہ کا دہانہ چھوٹا تھا۔ پھر اس نے اس صندوق کو کھولا۔ اور ایک سیاہ رنگ کا ریشم کا پارچہ نکال کر پھیلا دیا۔ اس میں ایک تصویر نظر آئی جس کی آنکھیں بڑی بڑی سرین بھاری، گردن دراز اور گیسو گندھے ہوئے تھے یہ خدا کی بہترین مخلوق کا پیکر تھا۔ اس نے پوچھا تم اس تصویر کو پہچانتے ہو۔ ہم نے کہا ہم نہیں پہچانتے۔ کہا یہ حضرت آدم علیہ السلام کی تصویر ہے۔ پھر اس نے دوسرا خانہ کھولا اور سیاہ رنگ کا ریشم کا پارچہ نکال کر پھیلایا۔ تو اس میں سفید پیکر میں بڑی بڑی سرخ آنکھیں اور سر و حسین داڑھی والی تصویر نظر آئی۔ اس نے پوچھا تم انہیں پہچانتے ہو۔ ہم نے کہا نہیں۔ اس نے کہا یہ حضرت نوح علیہ السلام کی شبیہ ہے۔ پھر اس نے ایک اور خانہ کھولا اور ایک ریشم کا پارچہ نکال کر پھیلایا تو اس میں ایک حسین شبیہہ سفید چہرے والی نظر آئی گویا بذات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اس نے پوچھا ان کو پہچانتے ہو ہم نے کہا ہاں! یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ پھر ہم رونے لگے اور ہرقل کھڑا ہو گیا اور پھر بیٹھ گیا۔ اور کہنے لگا کیا یہ وہی ہیں؟ ہم نے کہا ہاں وہی ہیں۔ اس شبیہہ کے دیکھنے کے بعد گویا تم نے خاص انہیں کو دیکھ لیا۔ اس کے بعد ہرقل بہت دیر تک اس شبیہہ کو دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا خدا کی قسم یہ آخری نبی ہیں

لیکن میں نے جلدی کی تاکہ علم کو میں پاسکوں۔ ورنہ اس صندوق میں حضرت ابراہیم ، موسیٰ، عیسیٰ اور سلیمان علیہم السلام وغیرہ کی صورتیں بھی ہیں۔ میں نے پوچھا تمہیں یہ صورتیں کہاں سے حاصل ہوئیں؟ اس نے کہا حضرت آدم علیہ السلام نے خدا سے درخواست کی تھی کہ تمام انبیاء اور ان کی اولاد کو دکھادے تو حق تعالیٰ نے یہ صورتیں ان کے پاس بھیجیں یہ سورج کے غائب ہونے کی جگہ حضرت آدم کے خزانہ میں رکھی ہوئی تھیں۔ حضرت ذوالقرنین نے مغرب شمس سے انہیں نکالا اور حضرت دانیال کے سپرد فرمادیا۔

زبور کی بشارتیں:۔ "زبور کے چوالیس ویں باب میں حق تعالیٰ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ "فَاضَتِ النِّعْمَۃُ مِنْ شَفَتَیْکَ۔" آپ کے دونوں ہونٹوں سے دنیاو آخرت کی نعمتیں فائض ہیں "مِنْ اَجْلِ ہٰذَا بَارَکَ اللّٰہُ لَکَ اِلَی الْاَبَدِ۔" اس کے لئے حق تعالیٰ نے آپ کو ابد تک برکت دی۔

لفظ فائض فیض سے بنا ہے۔ اور صراح میں فیض کے معنی خبر کا پھیل جانا، پانی کا کثرت سے ہونا، ندی میں لبالب ہو کر پانی کا بہنا اور پانی کا بہانا ہے۔ اور حدیث مستفیض کے معنی ہیں حدیث کا بہت زیادہ پھیل جانا۔ اور فیاض کے معنی جوانمرد اور بہت زیادہ بخشش کرنے والے کے ہیں۔

"تَقَلَّدِ اَیُّھَا الْجَبَّارُ السَّیْفَ۔" یعنی اے بزرگ اپنی شمشیر کو گردن میں حمائل کرو، شکستہ بندوں کے کام سنوارو۔ (جبار ایسے بلند درخت کو کہتے ہیں جس تک کسی کا ہاتھ نہ پہنچے۔ اور نخلہ جبارہ کے معنی ہیں کھجور کا بہت اونچا درخت) "فَاِنَّ شَرَائِعَکَ وَسُنَّتَکَ مَقْرُوْنَۃٌ بِھَیْبَۃِ یَمِیْنِکَ۔" یعنی بلاشبہ آپ کی شریعت وحکمت اور آپ کی سنت آپ کے داہنے ہاتھ کی بزرگی کے ساتھ پیوست ہیں۔ "سِہَامُکَ مَسْنُوْنَۃٌ۔" اور آپ کے تیر تیز کئے ہوئے ہیں۔ "وَجَمِیْعُ الْاُمَمِ یَخِرُّوْنَ تَحْتَکَ۔" اور ساری امتیں آپ کے تحت سرنگوں اور خمیدہ ہیں۔

اس فرمان سے مراد سید عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور وہ نعمت جو آپ کے دونوں لبہائے شیریں سے رواں ہے وہ کلام ہے جو آپ فرماتے ہیں اور وہ کتاب قرآن مجید ہے جو آپ پر نازل کی گئی ہے۔ اور سنت سے وہ عمل مراد ہے جسے آپ نے کیا ہے۔ اور "گردن میں اپنی تلوار کا حمائل کرنا۔" یہ قول دلالت کرتا ہے کہ وہ نبی آخر الزماں عربی ہیں کیونکہ عرب کے ماسوا کسی امت میں تلوار گردن میں حمائل نہیں کی جاتی۔ گردن میں تلوار کا حمائل کرنا اہلِ عرب سے مخصوص ہے اور یہ کہ آپ کی شریعت اور آپ کی سنت آپ کے داہنے ہاتھ کی بزرگی کے ساتھ پیوست ہے۔ یہ نص صریح ہے کہ آپ صاحب شریعت و سنت ہیں تو وہ نبی اپنی تلوار کے ساتھ مبعوث ہوتا ہے اور لوگوں کو تلوار سے درست کر کے حق پر مستحکم کرتا ہے۔ اور ان کو تلوار کے ذریعہ کفر سے نکالتا ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ نیز زبور میں ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں تضرع وزاری کے ساتھ مناجات کی کہ۔

"اے رب! سنت کے ظاہر کرنے والے کو بھیج تاکہ لوگ جان لیں کہ مسیح بشر ہیں۔"

یہ خبریں حضرت مسیح علیہ السلام اور حضور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا میں تشریف لانے سے پہلے ان کے حال کے اظہار میں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اے خدا! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھیج تاکہ لوگوں کو معلوم کرائیں اور وہ پڑھیں کہ حضرت مسیح بشر ہیں، الہ یعنی خدا نہیں ہیں۔ گویا حضرت داؤد علیہ السلام کو معلوم ہوگیا کہ لوگ حضرت مسیح کے بارے میں دعوے الوہیت کریں گے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر وبیان کے سلسلے میں مذکور ہے کہ

"اللہ تعالیٰ نے اس نبی آخر الزماں کو راستی ودرستی اور کردار وگفتار میں برگزیدہ فرمایا ہے۔ اور انہیں اور ان کی امت کو بزرگی وکرامت عطا فرمائی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں فیروز مندی عطا فرمائی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کی امت کو ایسی کرامت

مرحمت فرمائی ہے کہ وہ خواب گاہوں میں خدا کی تسبیح کرتے ہیں۔ اور بلند آوازوں سے تکبیر کہتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں تیز تلواریں ہیں تاکہ وہ خدا کی طرف سے ان لوگوں سے بدلہ لیں جو خدا کی عبادت نہیں کرتے اور اس زمانے کے بادشاہوں کو مقید کرتے اور ان کے عزت داروں کے گلے میں طوق ڈالتے ہیں۔

ایک اور بات زبور میں ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے "صیہون۔" سے (صیہون سے مراد مکہ مکرمہ ہے) تاج مرصع محمود کا ظاہر ہونا مقرر فرمایا ہے۔ تاج سے مراد عطا کردہ ریاست و امامت اور محمود سے مراد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

ایک اور بات زبور میں ہے کہ "وہ مالک ہو گا۔ اور جود و سخا کرے گا۔ دریا سے دریا تک اور نہروں سے زمین کے آخری کنارے تک اور ان کے روبرو اپنے زانوؤں پر اہل جزائر بیٹھیں گے۔ ان کے سب دشمن مٹی کو اپنی زبان سے چاٹیں گے۔ سلاطین زمانہ اپنے مصاحبوں کے ساتھ سجدہ کرتے ہوئے اور سر کو زمین پر رکھتے ہوئے حاضر ہوں گے۔ اور ان کی امت کی فرماں برداری پر وہ عجز و انکسار کریں گے اور گردن جھکانے سے انہیں نجات دے گا وہ نبی غمزدہ اور ستم رسیدہ لوگوں کو اس شخص سے جو اس سے بہت زیادہ قوی ہو گا رہائی عطا فرمائے گا۔ اور ہر کمزور و ناتواں کو جس کا کوئی مددگار نہ ہو وہ مدد فرمائے گا۔ اور ضعفاء و مساکین پر مہربانی کرے گا۔ اور ان پر ہر وقت درود بھیجا جاتا رہے گا اور ان کے لئے ہمہ وقت دعائیں کی جاتی رہیں گی۔ اور ابدالاباد تک ہمیشہ ہمیشہ ان کے ذکر کا چرچا رہے گا۔" صلی اللہ علیہ وسلم۔

صحائف انبیاء میں ذکر جمیل:۔ وصل:۔ جس طرح کتب ثلاثہ یعنی توریت، انجیل اور زبور میں سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف مذکور ہیں اسی طرح ہر نبی کے صحیفوں میں بھی آپ کے اوصاف مذکور و مسطور ہیں۔ یہاں تک کہ ابو الانبیاء حضرت آدم علیہ السلام کے صحیفے میں بھی نقل کئے گئے ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی کہ۔

"میں مکہ کا خداوند ہوں۔ اس کے رہنے والے میرے ہمسایہ ہیں اور خانہ کعبہ کی زیارت کرنے والے اور وہاں تک پہنچنے والے میرے مہمان ہیں۔ اور وہ میری عنایت و حمایت کی پناہ اور سایہ میں ہیں اور میری حفاظت و رعایت میں ہیں اور زمین و آسمان والوں سے اسے معمور کروں گا اور جوق در جوق جماعتیں بکھرے ہوئے اور گرد آلود بالوں سے لبیک پکارتے، تکبیر بلند آواز سے کرتے۔ آنکھوں سے آنسو بہاتے آئیں گے۔ اور جو بھی اس خانہ کعبہ کی زیارت کو آئے گا اس کا مقصود بیت اللہ کی زیارت اور میری خوشنودی و رضا کے سوا کچھ نہ ہو گا۔ کیونکہ میں ہی صاحب خانہ ہوں، گویا کہ ایسا ہو گا کہ اس نے میری ہی زیارت کی وہ میرا مہمان ہو گا۔ اور میرے کرم کے لائق و مستحق ہونے کا یہ مطلب ہے کہ میں اس کی تکریم کروں گا۔ اور محروم نہ چھوڑوں گا۔ اور اس خانہ کعبہ کا انتظام تیرے فرزندوں میں سے اس نبی کے سپرد کروں گا جسے ابراہیم کہیں گے۔ اس کے ذریعہ خانہ کی بنیادوں کو اونچا کراؤں گا اور اس کے ہاتھ سے اسے تعمیر کراؤں گا۔ اور اس کے زمزم کا چشمہ نکالوں گا۔ اور اس کی حرمت و حل اس کی میراث میں دوں گا۔ اور اس کے مشاعر کو اس کے ہاتھ سے آشکارا کروں گا۔ (مشاعر سے مراد، مشعر الحرام اور نشانات ہیں) پھر حضرت ابراہیم کے بعد ہر زمانہ میں لوگ اسے آباد رکھیں گے۔ اور اس کی طرف قصد و ارادہ رکھیں گے۔ یہاں تک کہ نوبت بہ نوبت تیرے فرزندوں میں سے اس نبی تک پہنچے گی جسے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہیں گے۔ وہ سلسلہ نبوت کو ختم کرنے والے ہوں گے۔ اور اسی نبی کو میں اس کے گھر کے رہنے والوں، منتظموں، متولیوں اور حاجیوں میں بزرگ تر بناؤں گا جو بھی میرا متلاشی اور میرا چاہنے والا ہو اسے لازم ہے کہ وہ اس جماعت کے ساتھ ہو۔ جن کے بال بکھرے ہوئے گرد آلود ہیں جو خدا کے حضور اپنی منتوں اور نذروں کو پورا کرتے ہیں۔"

صحیفۂ ابراہیم میں ذکر جمیل:۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ صلوات اللہ تعالیٰ وسلامہ کے صحیفہ میں ہے کہ "اے ابراہیم میں

نے تمہاری دعا تمہارے فرزند حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے حق میں قبول فرمائی ہے۔ میں نے ان پر اور ان کی اولاد پر برکتیں جاری فرمائیں۔ اور ان میں سے ایک ایسا فرزند عالم وجود میں لاؤں گا جو معظم و مکرم ہو گا۔ جن کا اسم گرامی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہو گا۔ وہ میرے برگزیدہ اور مبعوث شدہ ہوں گے۔ اور ان کی امت بہترین امت ہو گی۔"

کتاب حبقوق میں ذکر جمیل:۔ حضرت حبقوق ایک نبی تھے جو حضرت دانیال نبی کے ہم زمانہ تھے۔ (علیہما السلام) ان کی کتاب میں مذکور ہے کہ۔

جَآءَ اللّٰہُ مِنَ التَّیمَنِ وَالتَّقْدِیسِ مِنْ جِبَالِ فَارَانَ وَامْتَلَاَتِ الْاَرْضُ مِنْ تَحْمِیدِ اَحْمَدَ وَتَقْدِیسِہٖ وَمَلَکَ الْاَرْضَ وَرِقَابَ الْاُمَمِ۔

اللہ تعالیٰ نے برکت و پاکی کے ساتھ فاران کے پہاڑوں پر جلوہ فرمایا اور زمین کو احمد کی مدحت و ثنا اور اس کی تقدیس سے بھر دیا۔ جو کہ زمین اور امتوں کی گردنوں کا مالک ہے۔

لَقَدِ انْکَشَفَتِ السَّمَآءُ مِنْ بَہَاءِ مُحَمَّدٍ وَّامْتَلَاَتِ الْاَرْضُ مِنْ حَمْدِہٖ۔

بلاشبہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خوبیوں سے آسمان مجلّٰی ہوا اور زمین اس کی مدحت سے لبریز ہو گئی۔

اور یہ بھی آیا ہے کہ۔

یُضِیٓئُ بِنُوْرِہِ الْاَرْضُ وَیَحْمِلُ خَیْلَہٗ فِی الْبَحْرِ۔

ان کے نور سے زمین روشن ہوگی اور ان کے گھوڑے سمندر میں دوڑیں گے۔

اور حضرت حبقوق کے کلام میں یہ بھی ہے کہ:۔

سَتَنْزَعُ فِیْ قِسِیِّکَ اِغْرَاقًا وَّتَرْتَوِی السِّہَامُ بِاَمْرِکَ یَامُحَمَّدُ اِرْتِوَاءً۔

بہت جلد آپ کی کمان میں سخت تیر کھینچے جائیں گے۔ اور خوب سیراب ہونگے اے محمد تیر آپ کے حکم سے۔

یہ عبارت حکم میں مبالغہ اور کام کے انجام کی انتہا تک پہنچنے کی طرف کنایہ ہے اور اس طرف اشارہ ہے کہ آپ کے عہدِ مبارک میں دین و ملت کے کام کمال و اتمام تک پہنچیں گے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا۔

اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ

یعنی میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا۔ اور تم پر اپنی نعمتیں تمام فرمادیں۔

حضرت وہب بن منبہ سے منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے کتبِ قدیمہ میں پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ بہ قسم ارشاد فرماتا ہے:۔

"مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم ہے کہ میں عرب کے پہاڑوں پر اپنے نور کو نازل فرماؤں گا جس سے مشرق و مغرب کا درمیان نور سے پر نور ہو جائے گا۔ اور اولاد اسماعیل علیہ السلام میں سے ایک نبی عربی و امی پیدا فرماؤں گا۔ جس پر آسمان کے ستاروں کی تنگی اور زمین پر جتنی روئیدگی ہے ان کے برابر لوگ ایمان لائیں گے۔ اور میری ربوبیت اور اس کی رسالت پر سب ایمان لائیں گے۔ اور اپنے باپ دادا کی ملتوں سے نفرت کرتے ہوئے نکلیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے خدا پاکی ہے۔ تجھے اور تیرے اسماء پاک ہیں۔ بلاشبہ تو نے اس نبی آخر الزماں کو بڑی ہی عزت و شرافت سے نوازا ہے۔ فرمان باری آیا۔ میں دنیا و آخرت میں اس کے دشمنوں سے انتقام و بدلہ لوں گا۔ اور تمام دعوتوں پر ان کی دعوت کو ظاہر و غالب کروں گا جو ان کی شریعت کی مخالفت کرے گا میں اسے ذلیل و خوار کروں گا۔ وہ شریعت ایسی ہے جسے عدل سے آراستہ کیا ہے۔ اور عدل و انصاف کے قیام کے لئے ہی اس شریعت کو لاؤں گا۔ قسم ہے مجھے اپنی عزت کی، میں تمام

امتوں کو ان کے وسیلہ سے آتش دوزخ سے نجات دوں گا۔ اور دنیا کا آغاز میں نے ابراہیم سے کیا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اسے ختم کروں گا اب جو کوئی ان کا زمانہ پائے اور ان پر ایمان نہ لائے اور ان کی شریعت کی پیروی نہ کرے تو اس سے خدا بیزار ہے۔ "

صحیفۂ شعیا علیہ السلام میں ذکر جمیل: ۔ وصل:۔ حضرت شعیا علیہ السلام کے صحیفوں میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک اس طرح مذکور ہے کہ۔

" حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ وہ بندہ میرا محبوب ہے کہ میں اس سے خوش ہوتا ہوں وہ میرا مختار ہے کہ وہ مجھ سے خوش ہوتا ہے۔ میں اس پر اپنی روح کا افاضہ کرتا ہوں اور فرمایا۔ میں اپنی وحی اس پر نازل کرتا ہوں تو امتوں پر اس کا عدل ظاہر ہوتا ہے وہ ایسا بندہ ہے جو قہقہہ نہیں لگاتا۔ اور نہ بازاروں میں اس کی آواز سنی جاتی ہے۔ وہ بندہ اندھی آنکھوں کو بینائی بخشتا، بہرے کانوں کو کھولتا اور مردہ دلوں کو زندہ کرتا ہے۔ میں اس کو وہ دوں گا جو میں نے کسی کو نہیں دیا وہ بندہ احمد ہے کہ وہ اپنے رب کی تازہ حمد بجالاتا ہے۔ کوئی اسے کمزور نہ کرسکے گا اور نہ اسے مغلوب بنا سکے گا۔ وہ اپنی خواہش کی پیروی نہیں کرتا اور وہ نیکو کار، صلحاء جو کلک کی مانند کمزور و ناتواں ہیں ان کو وہ ذلیل و خوار نہیں جانتا۔ وہ صدیقوں کو قوی بناتا ہے وہ تواضع وانکساری کرنے والوں کا رکن ہے وہ خدا کا نور ہے جسے ہرگز کوئی نہ بجھا سکے گا۔ اس کے ذریعہ میری حجت، ثابت و برقرار ہوتی ہے۔ اور اس کے ذریعہ عذر منقطع ہوتا ہے اور اس کی توریت یعنی تلاوت قرآن سے جن وانس اطاعت گزار بنتے ہیں۔ (اس جگہ توریت سے مراد، اس کتاب کی تلاوت ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توریت کا قائم مقام ہے۔ یعنی قرآن پاک) نیز حضرت شعیا نبی علیہ السلام کے ذکر میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔

" اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں وہ خدا ہوں جس نے تمہیں حق کے ساتھ عظیم وقوی بنایا اور تمہیں ایسا نور بنایا جس سے تم امتوں کی اندھی آنکھوں کو بصارت عطا فرماؤ گے۔ اور تم ایسی دلیل ہو جس سے تم نفس و ہوا کے قیدیوں کو تاریکیوں سے نور کی طرف لے جاؤ گے۔ "

نیز حضرت شعیا علیہ السلام کی کتاب میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فرمایا:۔

" اے شعیا اٹھ اور دیکھ اور جو کچھ نظر آئے اس کی لوگوں کو خبر دے تو میں اٹھا اور دیکھا کہ دو سوار سامنے سے آرہے ہیں۔ ایک گدھے پر سوار ہے اور دوسرا اونٹ پر۔ ایک سوار دوسرے سے کہتا ہے گرا دو بابل کو اور ان بتوں کو جو انہوں نے تراش رکھے ہیں۔ "

ابن قتیبہ جو کہ علماء امت میں سے ہیں اور کتب سماوی کے زبردست عالم اور محقق ہیں فرماتے ہیں کہ گدھے پر سوار ہونے والے سے حضرت مسیح ابن مریم علیہم السلام مراد ہیں جس پر تمام نصاریٰ کا اتفاق ہے تو لا محالہ اونٹ پر سوار شخص، حضور سید عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس لئے کہ بابل کا سقوط اور وہاں کے بتوں کی شکستگی آپ ہی کے دست مبارک سے ہوئی ہے نہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے ہاتھ سے۔ کیونکہ اقلیم بابل میں حضرت ابراہیم کے زمانے سے ہمیشہ ہی وہاں کے بادشاہ بتوں کی پرستش کرتے رہے ہیں۔ اور یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹ پر سواری اور حضرت مسیح علیہ السلام کی گدھے پر سواری بہت زیادہ مشہور ہے۔

اور حضرت شعیا علیہ السلام کی کتاب میں مذکور ہے کہ

" آل قیدار محلات سے جنگلوں اور شہروں کو بھر دیں گے، وہ تسبیح کریں گے اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر اذانیں دیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حق سبحانہ وتعالیٰ کی عظمت و بزرگی بیان کریں گے اور بحر و بر اور ہر خشکی و تری میں خدا کی پاکی اور اس کی تسبیح کو پھیلا دیں گے اور زمین کے آخری کنارہ سے غلغلہ تکبیر بلند کرتے تیزی کے ساتھ آئیں گے اور اپنے پاؤں کو ماریں گے جس طرح گل کاری کرنے والا مٹی کو پاؤں سے گوندھتا اور کوٹتا ہے۔ "

اس سے مراد یہ ہے کہ وہ محبت کے ساتھ آئیں گے اوران کا تیزی کے ساتھ آنا۔ حج کے لئے بسرعت آنا آواز بلند کرنا، تلبیہ یعنی لبیک کہتے ہوئے آنا۔ اور طواف میں رمل یعنی اکڑ کر چلنا مراد ہے۔ ابن قتیبہ فرماتے ہیں کہ آلِ قیدار سے مراد، اہل عرب ہیں اس لئے کہ با جماع حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے پوتے کا نام قیدار ہے۔ ابن قتیبہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت شعیا کی کتاب میں مکہ مکرمہ خانہ کعبہ اور حجراسود کا بھی ذکر ہے کہ وہ حجراسود کا استیلام یعنی بوسہ دیں گے حضرت شعیا فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا آگاہ رہو میں صیہون یعنی مکہ مکرمہ میں اپنا گھر (بیت اللہ) بنانے والا ہوں جس کے گوشہ میں حجراسود ہے۔ اور اسے عظمت و کرامت دی گئی ہے۔ اسے بوسہ دیا جائے گا۔ اور حق تعالیٰ نے مکہ سے ارشاد فرمایا اے عاقر (یعنی بانجھ) تو خوش ہو اور تسبیح کے ساتھ گویائی کر کہ تیرے اہل (یعنی ماننے والے) میرے اہل سے زیادہ ہوں گے۔ اپنے اہل سے مراد، اہل بیت مقدس، بنی اسرائیل لیا ہو گا۔ اور مکہ کے حج وعمرہ کرنے والے ان سے زیادہ ہوں گے۔ اور یہ کہ حق تعالیٰ نے مکہ کو غاقر یعنی بانجھ سے تشبیہہ دی ہے بایں وجہ کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے پہلے اس میں کوئی آباد نہ تھا۔ اور نہ وہاں کوئی کتاب ہی نازل ہوئی۔ بخلاف بیت المقدس کے کہ وہاں بکثرت انبیاء علیہم السلام ہوئے۔ اور وہ مہبط وحی رہا۔ نیز کتاب شعیا میں ہے کہ حق تعالیٰ نے مکہ سے فرمایا قسم ہے مجھے اپنی ذات کی جیسا کہ مجھے قسم تھی حضرت نوح کے زمانہ میں کہ میں نے اہل زمین کو طوفان سے غرق کیا۔ اسی طرح اب تیرے لئے مجھے اپنی ذات کی قسم ہے کہ میں تجھ سے کبھی بھی ناراض نہ ہوں گا۔ اور نہ کبھی تجھے چھوڑوں گا۔ جب تک کہ تمام پہاڑ اپنی جگہ سے نہ جائیں اور اس کے قلعے پست نہ ہو جائیں۔ اس وقت تک اپنی نعمتیں تجھ سے زائل نہ کروں گا۔ اے مسکینہ تو آگاہ رہ کہ میں تیری بنیادوں کو پتھر اور گچ سے بنواؤں گا۔ اور تجھے زر وجواہر سے آراستہ کروں گا۔ اور تیری چھت کو آبدار موتیوں سے اور تیرے دروازوں کو زبرجد سے سجاؤں گا۔ ظلم کو تجھ سے دور رکھا جائے گا۔ اور کسی اوزار سے جس کا بنانے والا تجھے نقصان پہنچائے اس سے خوف نہ رکھ۔ اٹھ اور روشن ہو کہ تیرے نور کے پہنچانے کا وقت قریب آگیا ہے۔ خدا کی عظمت وتوقیر تجھ پر ہے۔ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کے ظہور کی بشارت ہے اسی طرح حرم شریف کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے کہ بھیڑیا اور بکری ایک جگہ چریں گے۔ اور اس کی راہوں کے بارے میں ہے کہ راہوں کی عظمت وبزرگی اتنی زیادہ ہے کہ تحریر وبیان سے باہر ہے۔

خلاصہ یہ کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے صفات واحوال کتب متقدمہ میں اس سے کہیں زیادہ ہیں اس میں کوئی اخفا واشتباہ نہیں ہے۔ بجز اس کے کہ اعداء دین آپ کے نام نامی کو بدل دیں یا تحریف کر دیں۔ اس کے باوجود دلائل وشواہد روشن وظاہر ہیں۔ يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو پورا ہی کرتا ہے خواہ کافر کتنا ہی برا مانیں۔

صلی اللہ علی سید الاولین والآخرین وخاتم الانبیاء والمرسلین وعلیٰ آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین۔

بشارات پر مشتمل چند روایات:۔ وصل:۔ اجمال کے ساتھ معلوم ہو گیا کہ سید عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر شریف گذشتہ آسمانی کتابوں میں موجود ومذکور ہے۔ اور اہل کتاب کو اس کا علم قطعی اور یقینی حاصل تھا۔ اور انہوں نے حسد وعناد اور غلبہ شقاوت وبدنصیبی سے راہ انکار وارتداد اور طریقہ استبعاد اختیار کر کے تحریف اور تغیر وتبدل میں مبتلا ہو گئے۔ مناسب ہو گا کہ اس جگہ ان حکایتوں اور روایتوں کا ذکر کر دیا جائے جو ان کے بغض وعناد اور حسد وارتداد پر مشتمل ہیں۔

حدیث:۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اپنے والد مالک بن سنان سے جو شہداء احد میں سے ہیں روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ میں ایک دن بنی عبد الاشہل کے پاس بات چیت کی غرض سے آیا۔ ان دنوں ہم نے یہودیوں سے صلح کر رکھی تھی

وہاں میں نے یوشع یہودی کو کہتے سنا کہ اب اس نبی کے ظہور کا زمانہ نزدیک آگیا ہے۔ جس کا نام احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ وہ حرم مکہ سے ظاہر ہوں گے اور اس شہر یعنی مدینہ میں ہجرت کر کے آئیں گے۔ پھر میں اپنی قوم کی طرف لوٹا۔ میں نے یوشع سے جو سنا تھا اس پر تعجب کرتا تھا۔ میں نے اپنی قوم کے ایک شخص کو یہ بات سنائی اس نے کہا یہ بات تنہا یوشع ہی نہیں کہہ رہا ہے بلکہ یثرب کے تمام یہودی یہی بات کہہ رہے ہیں پھر میں وہاں سے چل دیا۔ اور بنی قریظہ (ایک قبیلہ کا نام ہے) کے یہاں آیا تو وہ سب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی تذکرہ کر رہے تھے۔ چنانچہ زبیر بن باطانے کہا (یہ یہود کے رؤسا میں سے تھا) بلاشبہ وہ سرخ ستارہ طلوع ہو چکا ہے۔ جو کسی نبی کے ظہور کے بغیر کبھی طلوع نہیں ہوتا۔ اور کہا کہ اب کوئی نبی آنے والا نہیں بجز احمد (مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) کے اور یہ شہر یعنی یثرب ان کی ہجرت کا مقام ہے۔ حضرت ابو سعید خدری فرماتے ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ رونق افروز ہوئے تو میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حکایت بیان کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر زبیر اور اس کے ساتھی رؤساء یہود اسلام لے آتے تو سارے یہودی مسلمان ہو جاتے۔ کیونکہ وہ سب اس کے تابع تھے۔

حدیث:۔ قتادہ سے مروی ہے کہ جب یہودی کفارِ عرب کی جنگوں میں فتح و کامیابی کی دعائیں مانگتے تھے تو اپنی دعاؤں میں کہتے تھے کہ اے خدا اس نبی امی کا ظہور فرما جن کا ذکر ہم توریت میں پاتے ہیں۔ تاکہ ان کافروں کو سزا دیں اور ان کے ساتھ ہو کر انہیں قتل کریں ان کی یہ روش اس بنا پر تھی کہ ان کا گمان تھا وہ نبی آخر الزماں ان کی جنس یعنی بنی اسرائیل میں سے ظاہر ہو گا اور جب ان کی جنس کے سوا یعنی بنی اسمٰعیل میں مبعوث ہوئے تو حسد کرنے لگے اور کفر و انکار کے درپے ہو گئے۔

حدیث:۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ سے مروی ہے کہ وہ مقوقس بادشاہ کے پاس گئے اس نے ان سے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نبی و رسول ہیں۔ اگر وہ قبط (مصر) یا روم میں ہوتے تو سب ان کی پیروی کرتے۔ مغیرہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے اسکندریہ میں اقامت اختیار کی۔ اور کوئی کنیسہ (گرجا) ایسا نہ چھوڑا جہاں میں نہ گیا ہوں۔ میں نے قبط روم کے تمام اسقفوں یعنی ان کے مذہبی پیشواؤں سے پوچھا کہ جو کچھ تم نے اپنی کتابوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفتیں پائی ہیں بیان کرو۔ وہاں ان کا ایک بڑا سقف یعنی مذہبی پیشوا تھا۔ لوگ اس کے پاس اپنے بیماروں کو لاتے اور وہ ان کے لئے دعا کرتا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ انبیاء میں سے کوئی نبی ایسا باقی ہے جو آنے والا ہے۔ اور وہ ابھی تک نہ آیا ہو۔ اس نے کہا ہاں! وہ آخری نبی ہیں۔ ان کے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔ صرف وہی نبی ہے بلاشبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ہمیں ان کے اتباع کا حکم فرمایا ہے۔ وہ نبی عربی، امی ہے اس کا نام احمد ہے نہ دراز قد ہے نہ کوتاہ قد۔ اس کی دونوں آنکھوں میں سرخی ہے نہ سفید رنگ ہے نہ سیاہ رنگ۔ اس کے بال گچھے دار ہیں۔ وہ سخت و کھردرا لباس پہنتا ہے اور کھانے میں جو مل جائے اسی پر قناعت کرتا ہے۔ اس کے کندھے پر تلوار ہے اور جو بھی اس کے مقابل آئے اس سے وہ خوف نہیں کرتا۔ قتال میں وہ پہل نہیں کرتا۔ اس کے اصحاب ہوں گے جو اپنے آپ کو اس پر فدا کریں گے۔ وہ اپنے آباء و فرزندان سے کہیں بڑھ کر ان سے محبت رکھیں گے۔ ان کا ظہور اس مقام میں ہو گا، جہاں "سلم" کے درخت ہیں۔ وہ ایک حرم سے نکلیں گے اور دوسرے حرم کی طرف ہجرت کریں گے۔ وہ زمین شور سے نخلستان کی طرف ہجرت کرے گا۔ اور پنڈلی کے درمیان پر تہبند پہنے گا۔ اور اعضاء کے کناروں کو دھوئے گا۔ (یعنی وضو کرے گا) اور اس میں ایسی خاص صفتیں ہوں گی جو کسی نبی میں نہیں ہیں۔ ہر نبی اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوا ہے مگر وہ سارے جہاں کے لئے مبعوث ہوں گے۔ اور ساری زمین اس کے لئے سجدہ گاہ بنا دی جائے گی۔ اور زمین کو پاک کرنے والا جہاں بھی نماز کا وقت آئے وہیں مٹی سے (اگر پانی موجود نہ ہو یا قدرت نہ ہو تو) تیمم کر کے نماز ادا کرے گا۔ پھر جب مغیرہ اس سفر سے واپس آئے تو اسلام لے آئے۔ اور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو جو کچھ سنا تھا اس کی خبر دی۔

حدیث :۔ سعید بن زید سے مروی ہے کہ ان کے باپ زید بن عمرو، دین کی تلاش میں نکلے تو وہ موصل میں ایک راہب کے پاس پہنچے۔ راہب نے زید سے پوچھا کہاں سے آرہے ہو؟ زید نے کہا بیت ابراہیم یعنی خانہ کعبہ سے۔ اس نے کہا کس جستجو میں ہو۔ زید نے کہا دین کی تلاش میں ہوں۔ اس نے کہا واپس ہو جاؤ۔ قریب ہے کہ وہ ظاہر ہو تمہاری زمین پر جس کی تم تلاش میں ہو۔ اس لئے زید بن عمرو بن نفیل کو زمانہ جاہلیت کا موحد کہتے ہیں۔ یہ مشرکوں کے ذبح کردہ جانوروں کا گوشت نہ کھاتے تھے۔ اور توریت کو اپنی قوم پر نہ پڑھتے تھے۔ ان کا تذکرہ صحیح بخاری میں بھی ہے۔

حدیث :۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ایک مرد کے جنت میں داخل کرنے کے لئے بھیجا۔ اس مقولہ کا اصل قصہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز ایک یہودی کے کنیسہ میں تشریف لے گئے وہاں ایک یہودی کو دیکھا کہ وہ اپنی قوم کو توریت پڑھ کر سنا رہا ہے۔ جب وہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت پر پہنچا تو خاموش ہو گیا اور پڑھنے سے رک گیا پھر وہ بیمار بچوں کی مانند بڑبڑایا اور اس نے جاکر توریت لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت پڑھی اور کہنے لگا یہ آپ کی صفت ہے۔ "اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ۔" اسی کلمہ پر اس نے جان دے دی۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے فرمایا اپنے بھائی کی تجہیز و تکفین کرو۔

حدیث :۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ جب طائف کے بادشاہ تبع نے مدینہ پر چڑھائی کی تھی اور اس نے اعلان کیا تھا کہ میں شہر مدینہ کو ویران کر دوں گا اور اس کے رہنے والوں کو اپنے اس لڑکے کے انتقام میں قتل کر ڈالوں گا جسے انہوں نے فریب اور دھوکے سے قتل کیا ہے تو اس وقت سامول یہودی نے جو اس زمانے میں یہودیوں کا سب سے بڑا عالم تھا اس نے کہا اے بادشاہ یہ وہ شہر ہے جس کی طرف بنی اسمٰعیل سے نبی آخر الزماں کی ہجرت ہوگی اور اس نبی کی جائے ولادت مکہ مکرمہ ہے اس کا اسم گرامی احمد ہے یہ شہر اس کا دارِ ہجرت ہے۔ اور اسکی قبر انور اسی جگہ ہوگی۔ تبع یوں ہی واپس ہو گیا۔

محمد بن اسحاق کتاب مغازی میں نقل کرتے ہیں کہ تبع نے نبی آخر الزماں کے لئے ایک عالیشان محل تعمیر کرایا۔ تبع کے ہمراہ توریت کے چار سو علماء تھے جو اس کی صحبت چھوڑ کر مدینہ منورہ میں اس آرزو میں ٹھہر گئے کہ وہ نبی آخر الزماں کی صحبت کی سعادت حاصل کریں گے۔ اور تبع نے ان چار سو عالموں میں سے ہر ایک کے لئے ایک ایک مکان بنوایا۔ اور ایک ایک باندی بخشی اور ان کو مالِ کثیر دیا۔ تبع نے ایک خط لکھا جس میں اپنے اسلام لانے کی شہادت دی۔ اس خط میں چند شعر یہ تھے۔

شَهِدْتُ عَلٰی اَحْمَدَ اَنَّهٗ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ بَارِی النَّسَمِ
فَلَوْ لَا عُمْرِیْ اِلٰی عُمَرِهٖ لَکُنْتُ وَزِیْرًا لَّهٗ وَابْنَ عَمٍّ

میں حضور احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی گواہی دیتا ہوں کہ وہ بلاشبہ اس اللہ کی جانب سے رسول ہیں جس نے مٹی سے انسان کو پیدا کیا۔ اگر میں آپ کے ظہور مبارک کے زمانہ تک زندہ رہا تو میں ان کا وزیر اور ابن عم ہوں گا۔

پھر تبع نے اپنے اس خط کو سربہ مہر کر کے ان چار سو علماء کے سب سے بڑے عالم کے سپرد کر دیا، اور وصیت کی کہ اگر وہ نبی آخر الزماں کو پائے تو یہ خط ان کی خدمت میں پیش کر دے ورنہ اپنی اولاد در اولاد کو اس وصیت کو پہنچاتے رہنا۔ وہ مکان جو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بنایا گیا تھا وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم رنجہ فرمانے تک موجود رہا۔ کہتے ہیں کہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا وہ مکان جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد نزول اجلال فرمایا تھا وہی مکان تھا۔

روایت: ۔ بیان کرتے ہیں کہ زبیر بن بطا جو یہودیوں کا بڑا عالم تھا اس نے کہا کہ میرے باپ نے ایک خط جس میں احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر تھا مہر لگا کر مجھے دیا کہ وہ نبی ہیں جو زمین قرظ میں ظاہر ہوں گے۔ ان کی صفات یہ ہیں۔ پھر اس نے باپ کے مرنے کے بعد اس کا تذکرہ کیا۔ ابھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث نہ ہوئے تھے مگر جب اس نے سنا کہ مکہ مکرمہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر ہو چکے ہیں تو اس نے اس خط کو تلف کر دیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان و صفات کو چھپانے لگا۔

قبائل بنی قریظہ، نضیر، فدک اور خیبر کے یہودی اپنے پاس حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے پہلے سے تعریف و پہچان رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ ان کی ہجرت مدینہ میں ہوگی۔ اور جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے تو وہ کہتے تھے کہ آج کی رات احمد (مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) پیدا ہو گئے اور ان کی ولادت کا ستارہ طلوع ہو گیا لیکن جب وہ مبعوث ہوئے تو وہ کافر و منکر ہو گئے۔ ان کا یہ کفر و انکار محض سرکشی اور حسد و عناد کی بنا پر تھا۔

روایت: ۔ ہشام بن عروہ اپنے باپ سے بروایت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں ایک یہودی بغرض تجارت مقیم تھا۔ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی رات آئی تو وہ یہودی قریش کی مجلس میں آکر بیٹھا اور اس نے پوچھا آج کی رات کوئی بچہ تم میں پیدا ہوا ہے۔ قریش نے کہا ہمیں معلوم نہیں۔ اس نے کہا، اے قریشیو! جستجو و تلاش کرو جیسا کہ میں کہتا ہوں یقیناً آج کی رات وہ پیدا ہوا ہے۔ وہ اس امت کا نبی ہے اس کا نام احمد ہے۔ اور اس کے دونوں شانوں کے درمیان ایک نشان ہے جس میں بال ہیں۔ تو قریش اپنی مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس یہودی کی بات پر حیرت و تعجب کرنے لگے۔ جب وہ اپنے اپنے گھروں میں آئے تو اپنے گھر والوں سے سنا کہ حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہما کے گھر ان کا فرزند پیدا ہوا ہے جس کا نام محمد رکھا گیا ہے۔ وہ یہودی کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہاں آج ہم میں ایک بچہ پیدا ہوا ہے۔ وہ یہودی ہماری خبر سنانے سے پہلے یا بعد میں کہنے لگا۔ مجھ کو اس بچے کے پاس لے چلو۔ وہ اس کو حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کے پاس لے کر آئے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو باہر لائے تو اس یہودی نے آپ کی پشت مبارک میں وہ نشان (مہر نبوت) دیکھا۔ اور بیہوش ہو کر گر پڑا۔ جب ہوش آیا تو قریش نے کہا افسوس تجھے کیا ہو گیا۔ اس نے کہا بنی اسرائیل سے نبوت جاتی رہی۔ اور ان کے ہاتھوں سے کتاب (توریت) نکل گئی۔ یہ مولود (بچہ) انہیں مارے گا اور ان کے احبار و علماء کو قتل کرے گا۔ اور عرب نے نبوت کو پالیا، اے معشر قریش! تمہیں خوشی مبارک ہو۔ آگاہ رہو۔ خدا کی قسم مشرق سے مغرب تک تمہارا غلبہ اور دبدبہ ہوگا۔ اس حکایت کا کچھ آخری حصہ بھی ہے۔ جو انشاء اللہ تعالیٰ ذکر ولادت سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم میں آئے گا۔

حدیث: ۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیت مدراس میں تشریف لائے اور فرمایا تم میں جو سب سے زیادہ عقلمند ہے اسے میرے پاس لاؤ۔ تو وہ عبداللہ بن سوریا کو لائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے تنہائی میں گفتگو فرمائی۔ اور فرمایا میں تجھے تیرے دین کی قسم دیتا ہوں اور اس نعمت کی جو بنی اسرائیل کو دی گئی۔ اور جو "من و سلویٰ" کھلایا۔ اور ان پر ابر کا سایہ کیا گیا کہ میں خدا کا رسول ہوں؟ اس نے کہا "اللھم نعم" یعنی بار الہٰ ہاں! میں اور میری ساری قوم خوب جانتی ہے اور جو کچھ آپ کی تعریف و توصیف اور آپ کی خوبیاں ہیں میں جانتا ہوں وہ توریت میں واضح طور پر مرقوم ہیں۔ لیکن یہ قوم آپ پر حسد کرتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر تجھے کس چیز نے باز رکھا ہے کہ ایمان نہیں لاتا۔ اور مسلمان نہیں ہوتا۔ اس نے کہا میں اپنی قوم کے خلاف چلنے کو اچھا نہیں جانتا۔ میں خواہش رکھتا ہوں وہ سب آپ کی متابعت کریں اور اسلام لائیں تو میں بھی مسلمان ہو جاؤں۔

حدیث: ۔ حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا کہ میں ملک شام میں بصرے کے بازار میں موجود تھا کہ اچانک ایک صومعہ (عبادت خانے) سے کسی راہب کی آواز سنی وہ کہہ رہا تھا ان تاجروں سے دریافت کرو کیا تم میں کوئی اہل حرم یعنی مکہ کا باشندہ ہے۔ طلحہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے کہا ہاں! میں وہاں کا باشندہ ہوں۔ اس نے کہا کیا مکہ میں احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مبعوث ہوئے ہیں۔ میں نے کہا کون احمد؟ اس نے کہا وہ عبدالمطلب کے پوتے ہیں۔ یہی دن ہیں کہ وہ ان میں مبعوث ہوئے ہوں گے وہ آخری نبی ہیں ان کا جائے خروج، حرم ہے اور ان کی جائے ہجرت، خرمازار، سنگستان اور زمین شور ہے جس کا نام یثرب ہے۔ حضرت طلحہ فرماتے ہیں کہ راہب کی بات نے میرے دل میں جگہ کرلی۔ پھر میں وہاں سے چل کر مکہ مکرمہ آیا۔ میں نے دریافت کیا۔ کیا کوئی حادثہ (نئی بات) یا سانحہ ہوا ہے لوگوں نے کہا ہاں! محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دعوائے نبوت کیا ہے اور ابن ابی قحافہ یعنی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کی متابعت قبول کرلی ہے۔ پھر میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آیا ان سے راہب کی بات بیان کی اور کہا کیا تم نے اس شخص کی متابعت قبول کرلی ہے۔ انہوں نے فرمایا ہاں! پھر حضرت صدیق طلحہ کو لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور انہوں نے متابعت کی۔

حدیث: ۔ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے کہا جس زمانے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور ان کی نبوت مکہ میں مشہور ہوئی تو میں جانب شام نکل گیا اور جب بصرے پہنچا تو وہاں نصاریٰ کی ایک جماعت آئی اور مجھ سے پوچھنے لگی کیا تم حرم مکہ سے آئے ہو۔ میں نے کہا ہاں! وہ کہنے لگے کیا تم اس شخص کی صورت پہچانتے ہو۔ جس نے تم میں نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ میں نے کہا ہاں میں پہچانتا ہوں انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا۔ اور مجھے ایک ایسے عبادت خانے میں لے گئے جس میں بے شمار تصویریں اور تمثیلیں آویزاں تھیں انہوں نے مجھ سے کہا انہیں بغور دیکھو کیا ان میں اس کی شبیہہ ہے جس نے تم میں نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو میں نے ایک ایک کرکے بغور نظر ڈالی لیکن ان تصویروں میں مجھے آپ کی شبیہہ نظر نہ آئی۔ پھر وہ مجھے اس سے بڑے عبادت خانے میں لے گئے وہاں پہلے سے کہیں زیادہ تصاویر و تماثیل آویزاں تھیں۔ انہوں نے کہا دیکھو کیا تمہیں ان میں ان کی مبارک صورت نظر آتی ہے۔ میں دیکھنے لگا۔ اچانک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صورت و صفت نظر آئی۔ کہ ابو بکر صدیق، حضور کا زانوئے مبارک پکڑے ہوئے ہیں انہوں نے پوچھا کیا تمہیں ان کی شبیہہ نظر آئی ہے۔ میں نے کہا ہاں! پھر میں نے دل میں کہا مجھے ابھی ان کی نشاندہی نہیں کرنی چاہئے تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و صفت بیان کی۔ میں نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ وہی ہیں۔ پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا تم جانتے ہو وہ کون ہیں؟ جو آپ کا زانوئے مبارک پکڑے ہوئے ہے۔ میں نے کہا ہاں، میں گواہی دیتا ہوں وہ ان کے صحابی خاص اور ان کے بعد ان کے خلیفہ ہیں اور میں نے کہا لیکن میں ڈرتا ہوں کہ کہیں قریش انہیں قتل نہ کردیں۔ انہوں نے کہا خدا کی قسم! وہ ان کو ہرگز قتل نہیں کرسکتے۔ وہ نبی آخرالزماں ہیں اللہ تعالیٰ انہیں سب پر غالب فرمائے گا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

حدیث: ۔ حضرت صفیہ بنت حیی بن اخطب یہودی سے جو کہ امہات المومنین میں سے ہیں، مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قدم رنجہ فرمایا اور قبا میں قیام فرمایا تو میرے باپ حیی بن اخطب اور میرے چچا ابو یاسر بن اخطب رات اندھیرے بوقت سحر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے۔ پھر وہ نہ لوٹے۔ یہاں تک کہ شام ہوئی رات آگئی۔ جب وہ گھر آئے تو میں نے دیکھا وہ انتہائی بوجھل، کسل مند اور حد درجہ غم واندوہ میں تھے۔ جس کا میں اندازہ نہیں کرسکتی۔ وہ گھر میں آکر پڑ گئے۔ میں چونکہ ان کے نزدیک اولاد میں سب سے زیادہ پیاری اور محبوب تھی تو اپنی دیرینہ عادت کے موافق ان کے سامنے آگئی مگر

وہ غم واندوہ کے بوجھ تلے اتنے شکستہ اور محزون تھے کہ انہیں اتنی فرصت وطاقت نہ ہوئی کہ وہ میری طرف التفات کر سکتے۔ اسی حالت کے دوران میرے چچانے میرے باپ سے پوچھا کیا یہ وہی ہیں؟ کیا یہ شخص وہی نبی آخر الزماں ہیں جن کی توصیف ہم توریت میں پڑھتے ہیں تو میرے باپ نے میرے چچا سے کہاہاں یہ وہی ہیں۔ خدا کی قسم یہ وہی ہیں، چچانے پھر پوچھا کیا تم یقین سے جانتے ہو کہ وہی ہیں۔ میرے باپ نے کہا خدا کی قسم یقین سے جانتا ہوں کہ یہ وہی ہیں اس نے کہا اپنے دل میں ان کی نسبت کیا پاتے ہو۔ محبت یا عداوت؟ اس نے کہا عداوت، واللہ جب تک میں زندہ ہوں اس کی عداوت میں برابر کوشاں رہوں گا۔ چنانچہ یہ دونوں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں شقی ازلی، اور گرفتار وبال و نکال ابدی ہوگئے نعوذ باللہ من ذالک۔

ان یہودیوں میں سے کچھ بد بخت وشقی حیلہ ونفاق کو دنیاوی ذلیل وحقیر مال کے جمع کرنے کا ذریعہ اور دنیاوی فانی زندگی کی حفاظت وصیانت کا وسیلہ بنا کر اسفل السافلین کے درجہ میں اتر گئے اور ان ہی میں کچھ ایسے علماء واحبار بھی تھے جن کے اقبال کی پیشانی پر پہلے ہی سے ازلی رحمت وسعادت کے نقوش روشن تھے۔ انہوں نے اسلام لانے میں سبقت کی۔ اور دولتِ آخرت اور سعادت کو جمع کر لیا۔ جیسے حضرت عبداللہ بن سلام وغیرہ رضی اللہ عنہم۔ مخریق جو علمائے یہود میں نہایت عالم، تونگر اور بہت دانشمند تھا وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کو بھی خوب پہچانتا تھا۔ اور اس پر قائم تھا۔ روزِ احد اس نے اپنی قوم کو مخاطب کر کے کہا "اے معشر یہود! بخدا تم خوب جانتے ہو کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد ہم سب پر واجب ہے لہٰذا تم اس سعادت کے حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ یہودی کہنے لگے آج روز سبت یعنی ہفتہ کا دن ہے۔ اس نے کہا کوئی ہفتہ نہیں ہے۔ پھر انہوں نے اپنے ہتھیار اٹھائے اور نکل آئے اور ایمان لا کر وصیت کی کہ اگر آج میں مارا جاؤں تو میرا تمام مال ومنال حضور اکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے۔ وہ جو چاہیں کریں اور جسے چاہیں عنایت فرمائیں۔ پھر وہ شہید ہوگئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا تمام مال قبضے میں لے لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عام صدقہ فرمانا اسی مال میں سے تھا۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ جو تین سو سال سے اور ایک روایت کے مطابق اس سے زیادہ عرصہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر سن کر روئے مقصود کو دیکھنے کے منتظر بیٹھے تھے۔ ان کا قصہ مشہور ہے۔

باب پنجم
ذکر فضائل مشترکہ مابین حضور صلی اللہ علیہ وسلم و انبیاء کرام علیہم السلام و دیگر فضائل مختصّہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ فضائل تو آپ کے اور تمام انبیاء کرام صلوات اللہ تعالیٰ وسلامہ علیہم اجمعین کے مابین مشترک ہیں اور کچھ فضائل وکمالات وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے صرف آپ کے ساتھ مخصوص کیا ہے اور ان میں دنیا و آخرت میں کوئی نبی بھی آپ کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ حق تبارک و تعالیٰ نے جواہر نفوس انسانیہ کو مختلف فرمایا ہے۔ بعض مرتبہ صفا کے انتہائی مقام و جودت و طہارت کے غایت درجہ میں ہیں۔ بعض متوسط ہیں اور بعض انتہائی کدورت اور غایت رداءت میں ہیں۔ چنانچہ ہر قسم میں مراتب و درجات جداگانہ ہیں۔ مگر انبیاء کرام علیہم السلام کے تمام نفوس قدسیہ سب سے زیادہ صاف وجید ہیں اور ان کے ابدانِ مبارکہ بھی جملہ نفوسِ بشری کے مقابلے میں سب سے زیادہ پاکیزہ اور ہر نقص و عیب سے محفوظ و منزہ ہیں۔ باوجودیکہ یہ انبیاء کرام دائرہ کمال میں داخل اور اپنے غیر سے کامل و افضل ہیں مگر باہم ان کے درمیان بھی تفاوت و تفاضل ہے۔ اور حضور سید عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سب سے ازروئے مزاج اصح و اعدل اور اسلم، اور ازروئے بدن اطہران سب سے ازکیٰ و اصفیٰ ہیں۔ اور باعتبار روحانیت سب سے اکمل و اتم ہیں۔ اور تخلیق کے لحاظ سے بھی ان سب سے لطیف تر اور اشرف ہیں۔ آپ کے افضل البشر، سید ولد آدم اور افضل الناس ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ انبیاء کرام کو از قسم کمالات و کرامات جو کچھ حاصل تھا وہ تمام یا اس کے مثل اور ان مخصوص فضائل و کمالات کے ساتھ جو خاص طور پر آپ کو حاصل ہیں دوسرا کوئی نبی آپ کا شریک و سہیم نہیں۔

حضرت آدم اور ہمارے نبی علیہما السلام:۔ حضرت آدم علیہ السلام کو یہ فضیلت عطا فرمائی گئی کہ حق تعالیٰ نے انہیں اپنے دستِ قدرت سے پیدا فرمایا اور ان میں روح پھونکی گئی لیکن ہمارے نبی حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کمال عطا فرمایا گیا کہ حق سبحانہ وتعالیٰ آپ کے شرحِ صدر کا متولی و کارساز ہے۔ اور اس میں ایمان و حکمت رکھا اس طرح حق تعالیٰ آدم علیہ السلام کے خلق وجودی کا متولی ہوا اور ہمارے نبی حبیب خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلقِ نبوی کا اور آدم علیہ السلام کا مسجود ملائک ہونا درحقیقت حضرت آدم کے جوہرِ روح میں نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو ودیعت کرنے کے سبب سے تھا۔ اور اس نور مبارک کو ان کی پیشانی میں تاباں کیا گیا۔ اور اس عظمت و شرافت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سرفراز فرمایا گیا۔

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ   بلاشبہ اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔

سجدہ کرنے میں حق تعالیٰ فرشتوں کے ساتھ شامل نہ تھا۔ کیونکہ بجائے خود حق سبحانہ وتعالیٰ پر یہ جائز نہیں ہے۔ لیکن سید عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام بھیجنے میں حق تعالیٰ فرشتوں کے ساتھ شامل ہے لامحالہ یہ فضیلت اشرف و اتم اور اکمل و اعلیٰ ہے۔ نیز فرشتوں کے سجدہ کرنے میں عظمت و شرافت زیادہ نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایک بار واقع ہوا۔ لیکن صلوٰۃ وسلام بھیجنے میں حق تعالیٰ کے رحمت کے انوار اور اس کے اسرارِ قدس کا افاضہ ہر زمانے میں نوبہ نو دائم و مستمر ہے اور اس میں مسلمانوں کو بھی اشتراکِ عمل کا حکم دیا گیا ہے۔

اب رہا حضرت آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے اسماء کا تعلیم فرمانا تو دیلمی، مسند الفردوس میں بروایت ابورافع حدیث نقل کرتے

ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے لئے میری امت کو اس وقت جب کہ وہ پانی و مٹی کے درمیان تھی متمثل کیا گیا۔ اور مجھے ان سب کے اسماء تعلیم کیے گئے۔ لہٰذا جس طرح آدم علیہ السلام کو تعلیم اسماء ہوا۔ اسی طرح ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہوا۔ اس زیادتی و اضافہ کے ساتھ اور ذوات اور مسمیات کا علم بھی دیا گیا۔ اور بلاشبہ اسماء سے مسمیات کا رتبہ بہت بلند و اعلیٰ ہے۔ اس لئے کہ اسماء مسمیات کے اظہار و بیان کے لئے ہے۔ اور مسمیات مقصود بالذات اور اسماء مقصود بالغیر ہے اور یہ کہ علم کی فضیلت اس کے معلوم کی فضیلت سے ہوتی ہے۔

حضرت ادریس اور ہمارے نبی علیہما السلام:۔ حضرت ادریس علیہ السلام کی فضیلت میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا۔ ہم نے انہیں بلند مقام کی رفعت بخشی۔

اور ہمارے آقا سید عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج عنایت فرمائی گئی اور آپ کے سوا کسی کو بھی ایسی رفعت نہ ملی۔

حضرت نوح اور ہمارے نبی علیہما السلام:۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو یہ فضیلت عطا فرمائی کہ ان کے ذریعہ ایمانداروں کو غرقابی سے نجات ملی اور ہمارے نبی سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فضیلت عطا فرمائی کہ آپ کی امت کسی آسمانی عذاب عام سے ہلاک نہیں کی جائے گی جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ۔ اور نہیں اللہ تعالیٰ کہ انہیں عذاب فرمائے در آنحالیکہ آپ ان میں ہوں

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی عزت افزائی فرمائی کہ ان کی کشتی کو پانی میں محفوظ رکھا۔ اور ہمارے نبی سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اکرام اس سے عظیم تر فرمایا کہ ایک روز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ملاحظہ فرمایا کہ عکرمہ ابن ابی جہل پانی کے کنارے بیٹھا ہوا ہے۔ عکرمہ نے کہا اگر آپ صادق ہیں تو دوسرے کنارے کے پتھر کو حکم دیجئے کہ وہ پانی پر تیرتا ہوا اس کنارے پر آجائے اور غرق نہ ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا وہ پتھر اپنی جگہ سے اکھڑا اور تیرتا ہوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آگیا اور کھڑے ہو کر آپ کی رسالت کی شہادت دی۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عکرمہ اب تم خوش ہو۔ اتنا کافی ہے۔ عکرمہ نے کہا اب اسے حکم دیجئے کہ اپنی جگہ واپس چلا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر اشارہ فرمایا اور پتھر پانی پر تیرتا ہوا اپنی جگہ واپس جا کر نصب ہو گیا۔ چنانچہ پتھر کا پانی پر تیرنا اور اس کا غرق نہ ہونا لکڑی کی کشتی کے پانی پر تیرنے اور غرق نہ ہونے سے زیادہ عجیب ہے۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور ہمارے نبی علیہما السلام:۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ فضیلت عطا فرمائی کہ نمرود کی آگ ان پر سلامتی کے ساتھ سرد ہو گئی۔ اور ہمارے نبی سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کافروں کی آتش جنگ سرد کی۔ جنگ کی آگ میں تلواریں اس کی لکڑیاں اور ایندھن اور اس آگ کی لپٹ موت ہوتی ہے۔ اسے سلگانے والی شے حسد اور اس میں جلنے والی چیزیں روح اور جسم ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "كُلَّمَا اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ" ـــــ (یعنی جب بھی کافروں نے جنگ کی آگ بھڑکائی اللہ تعالیٰ نے اسے بجھا دیا) کافروں نے بہت چاہا کہ کفر کی آگ سے دین کے نور کو سرد کریں مگر اللہ تعالیٰ نے جو جبار و قہار بھی ہے ہر بار رد فرما دیا۔ اور اپنے نور کو مکمل و اتم فرما دیا۔ اور ان کی شرارت کی آگ کو بجھا دیا۔ چنانچہ فرمایا "يَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۔" یعنی اللہ انکار فرماتا ہے۔ مگر یہ کہ اپنے نور کو مکمل فرمائے اگرچہ کافروں کو برا معلوم ہو۔ اور یہ بھی مذکور ہے کہ شبِ معراج حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریائے آتش (کرۂ نار) پر سے بہ سلامت گزر فرمایا۔

نسائی روایت کرتے ہیں کہ محمد بن حاطب نے بیان کیا کہ میں بچہ تھا میرے اوپر جوش مارتی ہوئی ہانڈی الٹ گئی جس سے میری تمام کھال جل گئی۔ میرے والد مجھے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے تو آپ نے اپنا لعاب دہن مبارک جلی ہوئی جگہ پر لگایا۔ اور دعا کی "اَذْھِبِ الْبَأْسَ رَبَّ النَّاسِ۔" اے انسانوں کے رب اس کی تکلیف دور فرما۔ میں اسی وقت ایسا شفایاب ہوا گویا کہ مجھے کوئی تکلیف پہنچی ہی نہ تھی۔

مقام خلت و محبت :۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو مقام خلت عطا فرمایا اور ہمارے نبی سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام محبت مرحمت فرمایا۔ مقام محبت مقام خلت سے عالی تر ہے۔ حبیب اس محبّ کو کہتے ہیں جو مقام محبوبیت تک پہنچا ہوا ہو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شفاعتِ عام سے خاص فرمانا اور اس مقام میں تکلم کی اجازت دینا آپ کی محبوبیت ہی کے زیر اثر ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ میں مقام خلت اور مقام محبت دونوں جمع تھے۔ آپ کا مقام خلت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقام خلت سے اکمل و افضل ہے۔ یہ بحث بابِ ہشتم میں " بیان تخصیص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بفضائل آخرت " کے ضمن میں آئے گی۔

شکستِ اصنام :۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تبر سے بتوں کے توڑنے کی عزت مرحمت فرمائی تو ہمارے نبی سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مضبوط و مستحکم بتوں کو جو خانہ کعبہ کی دیواروں میں نصب تھے لکڑی کے اشارہ سے توڑا اور فرمایا "جَآءَ الْحَقُّ وَزَھَقَ الْبَاطِلُ۔" حق آیا اور باطل فرار ہوا۔

تعمیر خانہ کعبہ :۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت خلیل کو تعمیر خانہ کعبہ کی بزرگی سے نوازا تو ہمارے نبی سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجر اسود کو اپنے مقام میں نصب فرمایا (جیسا کہ قریش کا جھگڑا چکانے کے سلسلے میں یہ قضیہ مذکور و مشہور ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ :۔ "اَلْحَجَرُ الْاَسْوَدُ یَمِیْنُ اللّٰہِ۔" یعنی حجر اسود خدا کا داہنا ہاتھ ہے۔ کیونکہ اسے اس طرح بوسہ دیا جاتا ہے جس طرح کہ عہد و پیمان کے وقت داہنے ہاتھ کو بوسہ دیا جاتا ہے۔ قیامت کے دن حجر اسود کی آنکھ اور زبان ہوگی۔ آنکھ سے اپنے زیارت کرنے والوں کو پہچانے گا۔ اور زبان سے ان کی شفاعت کرے گا۔ لہٰذا تعمیر بیت اللہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مبارک فعل ابراہیم علیہ السلام سے قوی تر اور کامل تر ہے۔

حضرت موسیٰ اور ہمارے نبی علیہما السلام :۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ معجزہ مرحمت فرمایا کہ ان کا عصا اژدھا بن جاتا تھا اور ہمارے نبی سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی مانند یہ معجزہ مرحمت ہوا کہ :۔ "اُستنِ حنانہ۔" (یعنی کھجور کا وہ تنا جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگا کر خطبہ دیتے تھے۔ جب منبر بنا تو اسے علیحدہ کر دیا گیا۔) یہ اُستنِ آپ کے فراق میں فریاد کرتا۔ اور بزبان فصیح روتا تھا۔ جیسا کہ اس کا قصہ معجزات کے باب میں آئے گا۔

امام فخرالدین رازی اپنی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ابو جہل لعین نے ارادہ کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا پتھر مار کر کچل دے۔ (معاذ اللہ) مگر اس نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں کاندھوں پر دو اژدھے ہیں وہ ڈر کر بھاگ گیا۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ید بیضا اور وہ چمک عطا فرمائی جس سے آنکھیں چندھیا جاتی تھیں۔ اور ہمارے نبی سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سر تا بقدم مجسم نور تھے کہ دیدہ حیرت، آپ کے جمال باکمال سے خیرہ ہو جاتے تھے۔ اگر آپ بشریت کا نقاب نہ پہنے ہوتے تو کسی کے لئے تابِ نظر اور آپ کے حسن کا ادراک ممکن نہ ہوتا۔ اور آپ کا جوہر نوری حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عبداللہ تک اصلاب طاہرہ اور ارحام طیبہ میں منتقل ہو کر آتا رہا۔

فائدہ :۔ معجزہ۔ حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ، جو کہ صحابہ کرام میں سے ہیں۔ ایک ابر و باراں کی اندھیری رات

انہوں نے نماز عشا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گذاری۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کھجور کی ٹہنی ان کے ہاتھ میں دے کر فرمایا اسے لے جاؤ۔ یہ راستہ میں ارد گرد دس دس گز روشنی دیگی جب تم گھر پہنچو گے تو اس میں ایک کالا سانپ دیکھو گے۔ تم اسے مار کر پھینک دینا۔ رواہ ابو نعیم۔

معجزہ:۔ صحیح بخاری اور دیگر کتابوں میں مذکور ہے کہ حضرت عباد بن بشر اور اسید بن حضیر ایک اندھیری اور تاریک رات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سے باہر نکلے ان دونوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں راستہ میں ان میں سے ایک کی لاٹھی روشن ہو گئی یہ اس کی روشنی میں چلتے رہے۔ جب دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو دوسرے کی لاٹھی بھی روشن ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود عین نور تھے۔ اور نور آپ کے اسماء شریف میں سے بھی ہے۔

معجزہ:۔ امام بخاری اپنی تاریخ میں اور امام بیہقی و ابو نعیم بروایت حمزہ اسلمی نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ جب اندھیری رات میں ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا ہوئے تو میری انگلیاں روشن ہو گئیں۔ اور اس کی روشنیاں باہم مل گئیں۔ اور کوئی ایک ہلاک نہ ہوا۔

معجزہ:۔ حدیث میں آیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو ان کی قوم کو دعوت دینے کے لئے بھیجا۔ انہوں نے کسی نشانی کی درخواست کی۔ جو ان کے لئے حجت بنے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگشت مبارک کو ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان ملا۔ اس جگہ سفیدی اور نور روشن ہو گیا۔ وہ صحابی عرض کرنے لگے مجھے ڈر ہے کہ لوگ اسے برص نہ خیال کرنے لگیں جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں آیا ہے "بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوْءٍ" یعنی ایسی روشنی جو بے عیب ہے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روشنی کو ان کے تازیانے (کوڑے) کی طرف منتقل فرما دیا۔ اب رہا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے دریا کا پھٹ جانا تو ہمارے نبی سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا چاند کے ٹکڑے فرمانا اس سے زیادہ عظیم ہے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تصرف جہاں آب و گل میں ہے اور آپ کا تصرف جہان سماء پر ہے۔ ان دونوں کے درمیان فرق و امتیاز واضح ہے۔ روایتوں میں آیا ہے کہ زمین و آسمان کے درمیان ایک دریا ہے جسے "مکفوف" کہتے ہیں اور زمین کے دریا اس کے مقابلہ میں ایک قطرہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ دریا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے پھاڑا گیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج اس میں سے گزرے۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے دریا پھاڑنے سے زیادہ عظیم ہے۔

قبول دعا:۔ اب رہا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا کی قبولیابی جو فرعون کے غرق کرنے کے لئے تھی۔ تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کا قبول فرمانا بے حد و حساب ہے۔

پانی بہانا:۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ معجزہ کہ وہ پتھر سے پانی رواں فرما دیتے اور پتھر سے چشمہ بر آمد کرتے تو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اپنی انگشت ہائے مبارک سے چشمہ جاری فرما دیا۔ پتھر تو زمین ہی کی جنس سے ہے۔ اور اس سے چشمے بہا ہی کرتے ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف گوشت پوست سے پانی کا چشمہ جاری کرنا حد درجہ عظیم ہے۔

کلام فرمانا:۔ یہ جو حق تعالیٰ نے "حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت میں ارشاد فرمایا" وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۔ "یعنی اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے براہ راست کلام فرمایا۔" تو ہمارے نبی سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فضیلت شب اسریٰ مرحمت فرمائی مزید بر آں یہ کہ قرب اور کلام دونوں سے خاص فرمایا نیز یہ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مقام مناجات، آسمانوں سے اوپر سدرۃ المنتہیٰ ہے جہاں خلق کے علوم کی حد ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مقام مناجات طور سینا ہے اور حضور کی مناجات کی جگہ

سموات علیٰ ہے۔

فصاحت و بلاغت:۔ اب رہی یہ بات کہ حضرت ہارون علیہ السلام کو زبان کی فصاحت دی جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ”اَخِیْ هَارُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا۔“ یعنی میرے بھائی ہارون علیہ السلام زبان میں مجھ سے زیادہ فصیح ہیں۔ اور ہمارے نبی سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت و بلاغت اتنی زیادہ ہے کہ اس سے زائد تو درکنار اس کے برابر کا تصور کرنا بھی ممکن نہیں۔ حضرت ہارون علیہ السلام کی فصاحت صرف عبرانی تک محدود تھی۔ لیکن عربی زبان اس سے زیادہ فصیح ہے۔ نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام نے افصح منی یعنی مجھ سے زیادہ فصیح ہیں، فرمایا مطلقاً نہیں فرمایا۔ وجہ یہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت تھی۔

حضرت یوسف کا حسن و جمال اور ہمارے نبی علیہما السلام:۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو نصف حسن دیا گیا اور ہمارے نبی سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا کل دیا گیا۔ جو بھی آپ کے حلیہ شریف کے سلسلے میں منقولات پر غور و فکر کرے گا وہ آپ کے حسن و جمال کی تفصیلات کو پالے گا۔ کیونکہ آپ جیسا باکمال حسن کسی انسان میں نہ ہوا ہے نہ ہوگا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو حسن و جمال اور چہرے کی صباحت و تابانی دی گئی تھی لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل و صورت مبارک کو ایسے ملاحت و جمال عطا ہوئے جو کہیں اور موجود نہ تھے۔ صلی اللہ علیہ وسلم قدر حسنہ و جمالہ۔

تعبیر خواب:۔ وہ جو حضرت یوسف علیہ السلام کو خواب کی تعبیر بتانے اور ان تمام چیزوں کی تاویل جو منقول و معلوم ہیں عطا کی گئی۔ وہ تین چیزیں ہیں ایک یہ کہ چاند، سورج اور ستاروں کا اپنے لئے سجدہ کرتے دیکھنا دوسری یہ کہ قید خانے میں دو ساتھیوں کے خواب کی تعبیر کا واقعہ تیسری یہ کہ بادشاہ کے خواب کی تعبیر و تاویل بتانا مگر ہمارے نبی سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعبیر و تاویل رؤیا حد شمار سے باہر ہیں۔ جو بھی حدیثوں میں جستجو کرے گا اور روایتوں میں کدو کاوش اور عرق ریزی کرے گا اسے بڑے عجیب و غریب واقعات و حالات ملیں گے۔ جن کا کچھ حصہ اپنی اپنی جگہوں پر ذکر بھی کیا جا چکا ہے اور آگے بھی ہوگا۔

حضرت داؤد اور ہمارے نبی علیہما السلام:۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو لوہے کو نرم کر دینے کا جو معجزہ عطا ہوا کہ جب آپ لوہے پر ہاتھ پھیرتے تو وہ نرم ہو جاتا۔ اور آپ کے دستِ مبارک میں خشک لکڑی سبز ہو جاتی اور اس میں پتے نمودار ہو جاتے تو ہمارے نبی سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ام معبد رضی اللہ عنہا کی اس بکری پر اپنا دست اقدس پھیرا جو سوکھ کر لاغر و کمزور اور ناتواں ہو گئی تھی۔ آپ کے دستِ اقدس کی برکت سے اس کے تھن تر و تازہ ہو گئے اور دودھ جاری ہو گیا۔ اور وہ اتنا وافر دودھ دینے لگی جو عام طور پر بکریوں کی عادت کے خلاف تھا۔ اگر داؤد علیہ السلام کے لئے لوہا نرم ہو جاتا تھا تو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سخت پتھر کو نرم کیا گیا۔

حافظ ابو نعیم روایت کرتے ہیں کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غار میں داخل ہوئے اور اپنے آپ کو اس میں پنہاں کرنے کا ارادہ فرمایا تو اپنا سر مبارک غار میں پہلے داخل فرمایا۔ یہاں تک کہ آپ کا سر مبارک داخل ہو گیا اور سخت پتھر کشادہ ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ آپ کے لئے پتھر نرم کیا گیا۔ اور آپ کے بازوئے مبارک نے اس میں اثر کیا۔ اور صخرۂ بیت المقدس گندھے ہوئے آٹے کی مانند نرم کیا گیا۔ پھر اس میں اپنی سواری کے جانور کو باندھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ پہاڑوں نے تسبیح کی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں پتھروں نے تسبیح کی۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

حضرت سلیمان اور ہمارے نبی علیہما السلام:۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو پرندوں کی بولیوں کا علم، شیاطین اور ہوا کی تسخیر اور ایسی حکومت جو آپ کے بعد کسی کو بھی میسر نہ ہوئی عطا فرمائی گئی۔ مگر ہمارے نبی سیدِ عالم سلطان کونین صلی

اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کی مانند مع زیادتی واضافہ کے عطافرمایا گیا۔ اب رہا پرندوں کا بات کرنا تو فرمایا "عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ۔" یعنی مجھے پرندوں کی بولیوں کی سمجھ عطافرمائی گئی، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست اقدس پر پتھروں نے کلام کیا اور تسبیح کی۔ حالانکہ کنکریاں جمادات ہیں۔ تو پرندوں کے بولنے سے پتھر کا بولنا زیادہ نادر و عجیب ہے۔ اور آپ سے بھنی ہوئی زہر آلود بکری اور ہرن نے کلام کیا اور آپ سے اونٹ نے شکایت کی جیسا کہ معجزات کے باب میں آئے گا۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک پرند آیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک کے گرد چکر لگانے لگا۔ اور بات کی۔ آپ نے فرمایا لوگو! تم میں سے کس نے اس پرند کو اس کے بچہ کو پکڑ کر اذیت پہنچائی ہے۔ اسے لازم ہے کہ اس کے بچے کو واپس لوٹا دے اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھیڑیئے کے کلام کرنے کا قصہ بھی مشہور ہے۔

اب رہا ہوا کا مسخر ہونا جیسا کہ واقع ہے کہ:۔ "غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ۔" حضرت سلیمان علیہ السلام کو ان کا تخت روئے زمین پر جہاں چاہتا لے جاتا لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو براق دیا گیا جو ان کی ہوا سے تیز تر بلکہ برق خاطف سے بھی تیز تر تھا۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک لمحہ میں فرش سے عرش پر لے گیا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا کو مسخر کیا گیا تا کہ وہ آپ کو زمین کے کناروں اور گوشوں تک لے جائے اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے زمین کو لپیٹا اور کھینچا گیا۔ تا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے مشارق و مغارب کو ملاحظہ فرمالیں۔ یہ فرق و امتیاز ان دو شخصوں کے درمیان ہے جن میں سے ایک زمین کی طرف کوشش کے ساتھ دوڑ کر جائے اور دوسرے شخص کی طرف خود زمین کھنچ کر آ جائے۔

اب رہا شیاطین کا مسخر ہونا تو صحیح حدیث میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ شیطان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز میں سامنے آ گیا۔ تو حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر قدرت عطا فرمائی۔ آپ نے چاہا کہ اسے مسجد کے کسی ستون سے باندھ دیں تا کہ گلی کوچے کے بچے اس سے کھیلیں۔ اور یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے جنّات مسخر کئے گئے تو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جنّات ایمان لائے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنّات سے خدمت لی، ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنّات کو مسلمان بنایا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکریوں میں جن و انس اور پرندوں کو شامل کر دیا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر میں فرشتے یہاں تک کہ جبریل میکائیل علیہما السلام کو بھی شامل کیا گیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر میں پرندوں کو شامل کر لینے سے زیادہ عجیب غار ثور کے کبوتر کا قصہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غارِ ثور میں بوقت ہجرت اقامت فرمائی تو کبوتر نے اس کے دہانہ پر اپنا گھونسلہ بنایا انڈے رکھے اور اعدائے دین سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگہداشت کی۔ لشکر کا مقصد تو بچانا اور حمایت کرنا ہوتا ہے۔ بلاشبہ یہ مقصد آسان ترین طریقہ سے حاصل ہو گیا۔

اب رہا یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایسی حکومت فرمائی گئی جو آپ کے بعد کسی کے لائق نہ تھی تو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بادشاہ ہونے یا بندہ ہونے کے درمیان اختیار دیا گیا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بندگی کو اختیار فرمایا یہ ایسا ملکِ عظیم ہے جس کے زائل ہونے کا خدشہ ہی نہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایسا ملک کسی کو بھی میسر نہ ہوا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم:۔ یہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اندھے، کوڑھی کو تندرست کرنے اور مردوں کو زندہ کرنے کا معجزہ دیا گیا تو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ایسا ہی معجزہ دیا گیا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی وہ آنکھ جو باہر نکل پڑی تھی دوبارہ اپنی جگہ لوٹائی تو وہ پہلے سے کہیں زیادہ بہتر ہو گئی۔

مروی ہے کہ حضرت معاذ بن عفراء کی بیوی برص میں مبتلا تھیں وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اس کی شکایت لائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ کی لکڑی سے برص کے مقام پر ملا۔ حق تعالیٰ نے برص کو دور فرما دیا۔

مواہب لدنیہ میں امام فخرالدین رازی اور بیہقی دلائل النبوۃ میں یہ قصہ نقل فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں اس وقت ایمان لاؤں گا جب میری مری ہوئی لڑکی کو آپ دوبارہ زندہ فرما دیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی قبر پر کھڑے ہو کر آواز دی "اے فلانہ" اسی وقت لڑکی قبر سے نکل کر کہنے لگی۔ "لَبَّیْکَ وَسَعْدَیْکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ۔" (آخر حدیث تک) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مردوں کا زندہ فرمانا متعدد مرتبہ واقع ہوا ہے۔ نیز پتھروں اور کنکریوں کا آپ کے دست اقدس پر تسبیح کرنا اور حجر اسود کا آپ کو سلام کرنا اور استن حنانہ کا آپ کے فراق میں گریہ وزاری کرنا مردوں کے کلام سے زیادہ اتم وابلغ ہے۔ رہا حضرت عیسیٰ کا آسمان پر اٹھایا جانا تو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج میں اس سے کہیں بالاتر مقامات پر لے جایا گیا۔ اور وہاں تک کوئی بھی نہیں لے جایا گیا۔ پھر آپ کو مزید درجات عالیہ سے مخصوص فرمایا گیا۔ مثلاً خلوت قدس میں مناجات کا سننا اور قسم قسم کے مشاہدات وکرامات سے سرفراز ہونا وغیرہ۔ الحاصل تمام انبیاء ومرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کو جتنے بھی فضائل وکمالات اور معجزات دیئے گئے تھے وہ تمام حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ شعر

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری ــــ خوبی و شکل و شمائل حرکات و سکنات

فضائل ومعجزات مختصہ ۔۔ وصل:۔ مذکورہ بالا فضائل ومعجزات وہ تھے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام نبیوں کے درمیان مشترک تھے لیکن دیگر فضائل ومعجزات جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں شمار کیا جاتا ہے وہ حدوشمار اور حصر سے باہر ہیں۔ لیکن جس قدر ظاہر اور علماء کے قید وضبط میں محصور ہیں وہ دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو احکام شرع کے زمرہ میں ہیں، دوم وہ جو صفات واحوال اور معجزات کی قسم سے ہے۔ بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ پہلی قسم میں کلام کرنا اور اس پر بحث کرنا بے فائدہ ہے۔ کیونکہ وہ ایسا حکم ہے جو گزر چکا۔ مگر درست یہی ہے کہ اس کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اس کا پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ ان سے آپ کے حال شریف کا علم ہوتا ہے۔ اور بلاشبہ اس کی تحقیق ایک ایسی سعادت ہے جو از قسم کمالات اور سب سے اہم اور اعظم ہے۔ اس کی اقتداء اور اتباع کے لئے ضروری ہے کہ اس کو جانا جائے۔ اس پہلی قسم کی مزید چار قسمیں کی گئی ہیں۔ اول وہ جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بر طریق واجبات مخصوص ہیں۔ اور ان میں حکمت یہ ہے کہ قرب و درجات میں زیادتی ہو اس لئے کہ فرض کے ساتھ قرب پانا نوافل کے ساتھ قرب پالینے سے زیادہ کامل ہے۔ جیسا کہ حدیث مبارک شاہد ہے اور امر مکلف کا بوجھ اٹھانا زیادہ قوی اور اس کا اجر بہت بڑا ہے۔ ہم نے ہر قسم کے ساتھ چند مثالیں بیان کی ہیں۔ اور اس مثال کو مکمل طور پر معلوم کرنے کے لئے علماء کرام کی کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ مثلاً یہ کہ اس کا ذکر مواہب میں ہے وغیرہ۔ جیسے کہ ایک قول کے بموجب ضحیٰ کی نماز کا وجوب ہے مگر درست مسئلہ اس کے برخلاف ہے۔ اگرچہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ "أُمِرْتُ بِرَكْعَتَيِ الضُّحٰى۔" مجھے ضحیٰ کی نماز کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن تحقیق یہی ہے کہ ضحیٰ کی نماز سنت موکدہ ہے اور امر وجوب کے لئے نہیں ہے۔ اور نماز ضحیٰ سے مراد وہ نماز ہے جو صبح سورج نکلنے کے کچھ دیر بعد پڑھی جاتی ہے۔ جسے لوگ اشراق کی نماز کہتے ہیں۔ اور صلوٰۃ الضحیٰ چاشت کی نماز کو بھی کہتے ہیں۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول کہ۔ "مَارَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُسَبِّحُ سُبْحَۃَ الضُّحٰی۔" اسی نماز پر محمول ہے جس طرح کہ نماز وتر اور فجر کی دو رکعت۔ جیسا کہ حاکم نے مستدرک میں بیان کیا۔

امام احمد وطبرانی کی حدیث میں بھی آیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین چیزیں مجھ پر فرض ہیں اور تم پر نفل، وتر، فجر کی دو رکعتیں اور ضحی کی دو رکعتیں۔ قول باختصاص وتر، امام شافعی کے قول پر ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک وتر سب پر واجب ہے جیسا کہ نماز تہجد حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ نماز تہجد امت پر بھی فرض تھی۔ پھر اسکی فرضیت امت پر سے اٹھالی گئی اور بعض شافعی علما کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس کی فرضیت اٹھالی گئی۔ اسی طرح مسواک کا حکم ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے قریب مسواک کے ساتھ وضو پر مامور تھے۔ اور جب دشواری لاحق ہوئی تو ہر نماز کے لئے مسواک کا حکم دیا گیا۔ (یعنی اگر وضو ہو تو وضو کرنے کی ضرورت نہیں مگر مسواک ضرور کی جائے مترجم) اور دوسری حدیث میں بھی مسواک کے متعلق حکم آیا ہے۔ ایسی حدیثیں وجوبِ قطعی پر دلالت نہیں کرتیں۔

دوسری قسم ایسی حرمت میں ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے ہے یعنی وہ احکام جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر تو حرام ہیں مگر دوسروں پر حرام نہیں ہیں۔ جیسے تحریم زکوٰۃ، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مال زکوٰۃ حرام ہے۔ اسی طرح تحریم صدقہ۔ بر قول صحیح، مشہور، منصوص بقول حضور صلی اللہ علیہ وسلم "اِنَّا لَا نَاْكُلُ الصَّدَقَةَ" یعنی ہم صدقہ کا مال نہیں کھاتے اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ ان کے کھانے کی ممانعت، حرام ہونے کی بنا پر ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کے کھانے کی ممانعت سے حرام ہونا لازم نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ کھانے کی ممانعت، کراہتہ تنزیہی کی بنا پر ہو بر بنائے حرمت نہ ہو۔ بہرحال اموال صدقہ کے کھانے سے اجتناب، از قبیل "خصائص" ہے خواہ یہ ممانعت تحریمی ہو یا تنزیہی۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آل اور غلاموں پر تحریم زکوٰۃ ہے۔ جیسا کہ فقہ میں مقرر کیا گیا ہے۔

فائدہ:۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے ان کے زمانہ میں اس کی اباحت مروی ہے۔

اسی طرح ان چیزوں کا کھانا جن میں ناگوار بو پائی جاتی ہو۔ جیسے لہسن اور پیاز۔ جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے اسی طرح تحریم کتابت و شعر۔ اور تحریم کا قول اس تقدیر پر ہے کہ آپ کتابت اور شعر کو جانتے ہوں اور تحقیق یہ ہے کہ بحکم طبع و جبلّت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو چیزیں نہیں آئی ہیں اس کی تحقیق صلح حدیبیہ کے بیان میں آئے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ اسی طرح جنگ کے وقت ہتھیار باندھنے کے بعد پھر جنگ سے پہلے بدن سے ہتھیار اتارنا۔ اسی طرح کتابیہ غیر مسلم عورت سے نکاح کی تحریم اس لئے کہ حضور انور کی تمام بیویاں مسلمانوں کی مائیں اور جنت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج ہیں۔ اسی بنا پر آپ کا نطفۂ پاک کافرہ کے رحم میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اسی طرح اَمہ مسلمہ سے تحریم نکاح لیکن تسری بامہ باتفاق جائز ہے۔ تیسری قسم وہ مباحات جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہیں۔ جیسے کہ نیند سے وضو کا نہ ٹوٹنا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حکم نبیوں کے ساتھ عام ہے۔ اسی طرح بعد نماز عصر نماز کی اباحت، اسی طرح وجوب کے باوجود سواری پر وتر کی ادائیگی کا جواز، اسی طرح غائب پر نماز جنازہ (امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور شافعی کے نزدیک) ساری امت کے لئے عام ہے، اسی طرح صوم وصال، اس کی تحقیق انشاء اللہ روزے کے باب میں آئے گی۔ اسی طرح اجنبیہ عورتوں پر نظر ڈالنے کی اباحت اور جواز خلوت بااجنبیہ، اسی طرح چار سے زائد عورتوں سے نکاح اسی طرح دیگر انبیاء علیہم السلام کے لئے اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نو سے زیادہ تزوج جائز ہے۔ اسی طرح عورت کی جانب سے جواز نکاح بلفظ ہبہ کہ وہ عورت بغیر ولی اور بغیر گواہوں کے اپنے آپ کو ہبہ کر دے۔ اور مہر طلب نہ کرے۔ لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے لفظ نکاح یا تزوج ضروری ہے۔ (مطلب یہ کہ عورت خود کو ہبہ کرے اور عقد و نکاح کا لفظ اور شرائط نہ استعمال کرے تو وہ کر سکتی ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ضروری ہے کہ آپ لفظ نکاح یا عقد ضرور فرمائیں تاکہ اجابت شرعی پائی جائے

مترجم) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جائز تھا کہ کسی عورت کا نکاح کسی مرد سے بغیر اس کی اجازت یا بغیر اس کے اولیاء کی اجازت کے کر دیں۔ اسی طرح بغیر عورت کی رضا کے نکاح فرمانا اگر حضور کسی ایسی عورت کو نکاح میں لانے کی خواہش فرمائیں جو شوہر نہ رکھتی ہے تو اس عورت پر لازم ہے کہ اسے قبول کرے۔ ایسی عورت کو اگر دوسرے لوگ چاہیں تو یہ ان پر حرام ہوگی۔ اور اگر شوہر رکھتی ہے تو شوہر پر فرض ہوگا کہ وہ اسے طلاق دے دے کیونکہ اس جگہ اس کے ایمان کا امتحان ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ نَّفْسِهٖ وَاَهْلِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ

تم میں سے وہ مسلمان نہیں جسے میں اس کی جان، اس کی بیوی اس کی اولاد اور سب لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں۔

لہٰذا اس شخص پر واجب ہے جو کھانا اور پانی رکھتا ہے اور وہ اس کے صرف کرنے کا ضرورت مند بھی ہے مگر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی ضرورت ہو تو وہ آپ پر خرچ کرے۔ اور اپنے آپ کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان کر دے۔ کیونکہ "اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ ۔" نبی کریم مسلمانوں کے لئے ان کی جانوں سے زیادہ مستحق ہیں۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ اور سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے قصے کا مطلب بھی یہی ہے۔ حاصل اس قصہ کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے خود سیدہ زینب کا عقد حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کے دل میں زینب کی طرف سے کراہت پیدا فرمائی مگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ضعیف الایمان لوگوں کی وجہ سے کہ وہ ہلاکت کے بھنور میں نہ پڑ جائیں اس کے اظہار سے خوف کیا اس پر اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی "اے محبوب تم میرا ہی خوف دل میں رکھو۔ امر الٰہی کی خلاف ورزی نہ کرو۔ لوگوں سے کیا ڈرنا ہے۔" تب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے عقد فرمایا اور گھر میں لائے۔ بعض مفسرین اور ارباب سیر اس مقام میں کلام کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ منصب نبوت کے لائق نہیں ہے۔ اور اہل تحقیق اسے مفسرین کی لغزشوں میں شمار کرتے ہیں۔

اسی طرح یوسف علیہ السلام اور عزیز مصر کی بیوی زلیخا، اور حضرت داؤد علیہ السلام اور اوریاء کی بیوی کے قصے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کا مقام اس سے اعلیٰ ہے۔ عتق یعنی آزادی کو مہر کا قائم مقام گردانا جیسا کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے لئے فرمایا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بیویوں کے نان ونفقہ کے واجب ہونے کے بارے میں اختلاف ہے۔ علامہ نووی فرماتے ہیں کہ صحیح تر یہی ہے کہ واجب ہے اسی طرح یہ کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی بیویوں کے درمیان باری کی رعایت واجب نہیں تھی۔ اکثر علماء احناف بھی اسی طرف ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ برتاو فرمایا وہ بر طریق تفضل واحسان تھا نہ کہ بر بنائے وجوب۔

علماء بیان کرتے ہیں کہ ان تمام خصائص کے جمع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں نکاح تسرّی کے حکم میں ہیں اور تمام عورتیں اور مرد آپ کے لئے غلام اور باندی کے حکم میں ہیں۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مال غنیمت میں سے باندیاں، تلواریں وغیرہ جتنا چاہیں لینا مباح تھا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مکہ میں قتال کرنا اور بغیر احرام کے داخل ہونا مباح تھا۔ اس کی تحقیق وتفصیل انشاء اللہ فتح مکہ کے باب میں آئے گی۔

آپ کے خصائص میں سے یہ بھی تھا کہ آپ اپنے علم سے اپنے لئے، اپنی اولاد کے لئے حکم دیتے اور اپنی گواہی اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے استعمال فرماتے تھے اور آپ کا کسی کو برا کہنا یا لعنت کرنا، قربت ورحمت اور مباح تھا۔ اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی کہ فتح سے پہلے اراضی کو تقسیم فرماتے اس لئے کہ مالک الملک حق تعالیٰ نے آپ کو تمام اراضی اور ممالک کا مالک بنایا۔ امام غزالی رحمتہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب جنت کی زمینوں کو تقسیم فرماتے ہیں تو دنیاوی زمین تو بطریق اولیٰ تقسیم فرمانی چاہئے۔ ع

مالک کونین ہیں گو پاس کچھ رکھتے نہیں

خصائص صفات واحوال۔ ۔ وصل:۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ خصائص جو احکام کے قبیل سے نہیں بلکہ صفات واحوال کے قبیل سے ہیں۔ ان کا کوئی حدو حساب نہیں۔ خصوصاً وہ صفات واحوال جو باطن سے تعلق رکھتے ہیں کسی کا علم بھی ان کی کنہ تک نہیں پہنچا۔ ان میں سے چند ظاہری صفات کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ علماء نے ان کا احصار کر کے شمار کیا اور انہیں بیان کیا ہے اور تمام معجزات اسی قبیل سے ایسے ہیں کہ ایسے کسی نبی سے ظاہر نہ ہوئے لیکن ان کو ان کی عظمت و کثرت کی بنا پر مستقلاً جداگانہ باب میں رکھا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے اعلیٰ واکمل فضیلت یہ ہے کہ حق تبارک وتعالیٰ نے آپ کی روح پرانوار کو ساری مخلوق کی ارواح سے پہلے پیدا فرما کر تمام مکونات کی روحوں کو آپ کی روح سے تخلیق فرمایا۔ اور آپ اس وقت بھی نبی تھے جب حضرت آدم علیہ السلام ہنوز روح وجسد کے درمیان تھے جیسا کہ ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا اور عالم ارواح میں بھی انبیاء علیہم السلام کی ارواح مقدسہ کو آپ کی روح پرانوار نے مستفیض فرمایا۔

جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کا آفتاب پردۂ غیب میں رہا انبیاء علیہم السلام کے ستارہائے درخشاں آپ کے نور سے منور ہو کر عالم ظہور میں جگمگاتے رہے۔ جب آپ کی نبوت کے آفتاب نے طلوع وظہور فرمایا تو وہ روپوش اور مخفی ہو گئے۔ بعینہٖ اسی طرح جیسے رات میں ستاروں کا رنگ وروپ چمکتا دمکتا ہے اور جب سورج چمکتا دمکتا ہے اور یہ سورج طلوع ہوتا ہے تو وہ ماند پڑ کر روپوش ہو جاتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت فرمایا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا عالم آفرینش میں میں سارے نبیوں سے پہلے اور عالم ظہور وبعثت میں ان سب سے آخر میں ہوں۔ آپ کے خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ آپ ہی وہ اول ہیں جس نے روز الست میثاق لیا اور آپ ہی وہ اول ہیں جس نے اس روز سب سے پہلے "بلیٰ" (ہاں) کہا جیسا کہ حدیث پاک میں آیا ہے۔ اور انہیں خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ آدم وعالم اور آفرینش عالم کا مقصود اصلی، آپ ہی کا وجود گرامی ہے۔ آپ کا نام نامی اسم گرامی عرش پر جنت کے دروازوں پر اور اس کی ہر جگہ پر لکھا گیا۔ انہیں خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ تمام نبیوں سے اس کا عہد لیا گیا کہ جب آپ مبعوث ہوں تو وہ آپ پر ایمان لائیں۔ یہ عہد پاک اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے کہ "وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ۔" (اور یاد کرو جب اللہ نے تمام نبیوں سے عہد لیا کہ) جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ انہیں خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ گزشتہ تمام آسمانی کتابوں میں آپ کے وجود گرامی کی خبریں اور آپ کی بشارتیں واقع ہیں۔ یہ کہ آپ کے نسب مبارک میں آدم علیہ السلام تک آپ کے سبب کبھی بھی سفاح یعنی زنا واقع نہیں ہوا۔ جیسا کہ عہد جاہلیت میں عادت تھی اس کا ذکر باب ولادت میں انشاء اللہ آئے گا۔ اور یہ کہ ہر زمانے میں بنی آدم کے بہترین قرن میں اٹھایا گیا اور بہترین قبائل کے بہتروں میں منتقل کیا جاتا رہا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے بنی کنانہ کو سرفرازی بخشی بنی کنانہ سے قریش کو قریش سے بنی ہاشم کو بنی ہاشم سے مجھے برگزیدہ فرمایا۔ لہٰذا حضور سرفرازوں میں سرفراز اور بہتروں میں بہترین اور برگزیدگان میں برگزیدہ تر ہیں۔ بوقت ولادت مبارکہ تمام بت سرنگوں ہو کر گر پڑے شکم مادر سے ختنہ شدہ، غیر آلودہ پاک اور ناف بریدہ تولد ہوئے۔ پیدا ہوتے ہی سجدہ کیا اس طرح کہ بجانب آسمان نظر بلند تھی۔ اور انگشت شہادت اٹھی ہوئی تھی۔ آپ کی والدہ سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا کہ ان سے ایک نور نے جلوہ فرمایا جس سے شام کے تمام قصور اور محلات روشن ہو گئے۔ آپ کے جھولے کو فرشتوں نے جھلایا۔ اور مہد میں آپ نے کلام فرمایا۔ اہل سیر لکھتے ہیں کہ مہد میں چاند آپ سے باتیں کرتا۔ اور جدھر اشارہ فرماتے

جھک جاتا تھا۔ انہیں خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دھوپ میں بادل سایہ کرتے تھے۔ ایسا ہمیشہ نہ تھا بلکہ متعدد اوقات میں ایسا ہوا۔ زمانہ طفلی میں جب آپ اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ سفر میں تھے بحیرہ راہب نے آپ کو پہچانا۔ انہیں خصائص میں سے آپ کا شق صدر ہے۔ اس کا وقوع چار مرتبہ ہوا ہے۔ پہلی مرتبہ بچپن میں جبکہ آپ بنی سعد میں تھے۔ دوسری مرتبہ دسویں سال میں تیسری مرتبہ بعثت کے وقت چوتھی مرتبہ شب معراج میں اور انہیں خصائص میں سے آپ کی خدمت میں ابتدائے وحی کے وقت جبریل علیہ السلام کا آکر لپٹانا اور آپ کے وجود شریف میں تصرف کرنا ہے۔ اسے بھی علماء نے خصائص میں شمار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی نبی کے ساتھ ایسا نہ ہوا۔ انہیں خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کے ہر عضو مبارک کا قرآن پاک میں ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ کے قلب اطہر کا ذکر اس ارشاد میں ہے کہ: ـ "نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ ـ" جبریل امین آپ کے قلب اطہر پر اسے لے کر اترتے ہیں۔ اور آپ کی زبان مبارک کا ذکر اور ارشادات میں ہے کہ "فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ۔" یقیناً ہم نے قرآن کو آپ کی زبان پر آسان فرمایا اور فرمایا "وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ۔" اپنی خواہش سے زبان گویا نہیں ہوتی۔ چشم مبارک کا ذکر "مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ ـ" آنکھ نہ تو جھکی نہ بے راہ ہوئی۔ چہرہ مبارک کا ذکر "قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ۔" بے شک ہم نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر بار بار دیکھا اور گردن اور دست مبارک کا ذکر "وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ ـ" اور مت بنا اپنے ہاتھ کو بندھا ہوا اپنی گردن کی طرف۔ اور سینہ اور پشت مبارک کا ذکر "أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ الَّذِي أَنقَضَ ظَهْرَكَ۔" کیا ہم نے تمہارا سینہ کشادہ نہ کیا۔ اور تم سے تمہارا بوجھ اتار لیا۔ جس نے تمہاری پیٹھ توڑی تھی۔ ان آیات کریمہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ہر عضو کا ذکر فرمانا آپ پر کمال محبت اور عنایت حق جل وعلا پر دلالت کرتا ہے۔ انہیں خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے اسم صفت "محمود" سے آپ کا اسم مبارک احمد، محمد صلی اللہ علیہ وسلم نکالا۔ آپ سے پہلے یہ نام کسی اور کے نہیں رکھے گئے۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت ومدح میں فرماتے ہیں شعر۔

وَشَقَّ لَهُ مِنِ اسْمِهِ لِيُجِلَّهُ فَذُو الْعَرْشِ مَحْمُودٌ وَهٰذَا مُحَمَّدٌ

بعض کہتے ہیں کہ یہ شعر حضرت ابو طالب کا ہے جیسا کہ بخاری نے "تاریخ صغیر" میں ذکر کیا۔ انہیں خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کو بہشتی کھانا پینا کھلایا اور پلایا ہے اس کا ذکر صوم وصال میں آئے گا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ) اور یہ کہ انہیں خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پشت کی طرف بھی ایسا ہی دیکھتے تھے جس طرح سامنے سے دیکھتے تھے۔ اور رات کی تاریکی میں بھی ایسا ہی ملاحظہ فرماتے جیسا دن کی روشنی میں ملاحظہ فرماتے۔ انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ جب آپ پتھر پر چلتے تو آپ کے دونوں قدم مبارک پتھر میں نقش ہو جاتے۔ جس طرح کہ مقام ابراہیم علیہ السلام میں ہے۔ قرآن میں قطعی طور پر اس کا ذکر ہے اور آپ کی دونوں کہنیوں کا نشان مکہ کے پتھر میں مشہور ہے۔ آپ کے گھوڑے کے سموں کا نشان مدینہ طیبہ میں بنی معاویہ کی مسجد میں واقع ہے۔ آپ کا لعاب کھاری پانی کو شیریں بناتا۔ اور شیر خوار بچے کو دودھ سے بے نیاز کرتا۔ (بیماروں کو شفا دیتا اور زخمیوں کے زخموں کو بھر تا تھا از مترجم) آپ کی بغلوں کا رنگ سفید وسرخ تھا۔ جن میں بال نہ تھے۔ اور نہ جسم اطہر کے رنگ سے مختلف تھا۔ ان میں بو بھی نہ تھی۔ حدیث استسقاء میں مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اتنے اٹھائے کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی دیکھی گئی۔ بعض کہتے ہیں کہ بغلوں کی سفیدی سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہاں بال نہ ہوں۔ اس لئے کہ جہاں سے بال اکھیڑے جاتے ہیں وہ جگہ سفید ہو جاتی ہے۔ اور یہ تحقیق سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بغلوں کے بالوں کو اکھاڑا کرتے

تھے۔ اور بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ عبداللہ بن اقوم خزاعی کہتے ہیں کہ میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ فرمارہے تھے تو میری نظر آپ کی بغلوں پر پڑی۔ حدیث میں لفظ عفرۃ ابطین آیا ہے۔ کہتے ہیں کہ عفرہ خالص سفیدی کو نہیں بلکہ مٹیالے رنگ کو بولتے ہیں۔ یہ اس کی دلالت کرتا ہے کہ اس جگہ بالوں کے نشانات موجود تھے۔ اسی کو اعفر کہتے ہیں ورنہ بالوں سے خالی جگہ کو اعفر نہیں کہتے۔ مواہب لدنیہ میں بھی اسی طرح بیان کیا گیا ہے ہاں اس جگہ یہ اعتقاد ضرور رکھنا چاہئے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان ہے کہ آپ کی بغلوں میں ناگوار بو نہ تھی۔ بلکہ پاکیزہ اور طیب خوشبو تھی۔ جیسا کہ بخاری میں ثابت شدہ امر ہے۔

آپ کی آواز مبارک اتنی دور تک سنائی دیتی تھی جہاں تک آپ کے سوا کسی کی آواز نہیں پہنچ سکتی۔ اور یہ کہ آپ کی آنکھیں تو سوتی تھی لیکن دل نہ سوتا تھا۔ (رواہ البخاری) اور جو بھی آپ کے پاس بات کرتا اس کی بات سنتے تھے۔ یہی اس مسئلہ کی بنیاد ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وضو آپ کی نیند سے نہ ٹوٹتا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ نیند سے وضو نہ ٹوٹنے کا حکم تمام انبیاء علیہم السلام کے حق میں ہے۔ اس جگہ یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ پھر "لیلۃ التعریس" میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آفتاب کے طلوع ہوجانے کو کیوں نہ جان لیا جس سے نماز فجر قضا ہوگئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ طلوع وغروب کا جاننا آنکھوں کا کام ہے اور جب آنکھ نیند میں تھی تو نہ جانا گیا۔ اور دل میں وحی اس حکمت کی بنا پر نہ کی گئی کہ نماز قضا ہونے کی صورت میں مشروعیت آجائے یا کوئی ایسی وجہ جس سے اللہ تعالیٰ ہی خوب واقف ہے۔

اور یہ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی انگڑائی نہ لی، اسے ابن ابی شیبہ اور بخاری رحمۃ اللہ نے اپنی تاریخ میں روایت کیا۔ کبھی بھی جماہی نہ لینے کی روایت بھی ہے۔ چونکہ کسی نبی نے انگڑائی نہیں لی اس لئے یہ روایت خصوصیات میں سے نہیں ہے۔ اس کی تائیدوہ روایت کرتی ہے جو صحیح بخاری میں ہے کہ جماہی شیطان سے ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر پر کبھی مکھی نہ بیٹھی اور نہ آپ کے کپڑوں میں جوں پڑی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی احتلام بھی نہ ہوا۔ اور نہ کسی اور نبی کو۔ اسے طبرانی نے روایت کیا ہے۔ منقول ہے کہ احتلام بھی شیطان سے ہے۔ اور بعض علماء نے انزال کو جائز رکھا ہے کیونکہ ممکن ہے کہ مادہ منویہ کے غلبہ کی وجہ سے ایسا ہوا ہو نہ کہ شیطانی خواب سے کسی دوسرے مقام میں اس کی تحقیق کی گئی ہے۔

آپ کے پسینہ مبارک کی خوشبو، مشک نافہ سے زیادہ تھی۔ اور یہ کہ زمین پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ پڑتا تھا۔ کیونکہ زمین محل کثافت ونجاست ہے۔ اور سورج کی روشنی میں کبھی بھی آپ کا سایہ نہ دیکھا گیا۔ علماء کی یہ عبارت بڑی ہی عجیب وغریب اور نادر ہے کہ انہوں نے چراغ کی روشنی کا ذکر نہ کیا۔ اور حدیث طویل میں اس دعا کا پڑھنا جو بعد نماز شب آپ پڑھتے تھے مروی ہے اور اسے بعض مشائخ کرام فجر کی سنت وفرض کے درمیان پڑھتے ہیں۔ اس دعا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مناجات کرتے کہ اے خدا تمام اعضاء اور ہر جانب نور بخش دے۔ اور اس کے آخر میں یہ ہے کہ واجعلنی نورا (اور مجھے سراپا نور بنادے) چونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم عین نور ہیں تو نور کا سایہ نہیں ہوتا۔ اور یہ کہ جب آپ طویل القامت لوگوں کے درمیان چلتے تو آپ ان سب میں درازتر معلوم ہوتے اور یہ کہ آپ کے کپڑوں پر کبھی مکھی نہ بیٹھتی جیسا کہ فخرالدین رازی نے بیان کیا۔ لامحالہ بطریق اولیٰ آپ کے جسم اطہر پر بھی نہ بیٹھتی ہوگی۔ اور یہ کہ مچھر وپسو نے نہ کاٹا نہ خون چوسا اور کھٹل آپ کو گزند نہ پہنچاتے تھے۔ یہ ہیں علمائے کرام کی عبارتیں، اس سے مراد جوں وغیرہ کا نہ ہونا ہے۔ اور یہ جو بعض روایتوں میں آیا ہے کہ "کَانَ یُفْلِیْ ثَوْبَہٗ" آپ اپنے کپڑوں میں جوں دیکھا کرتے تھے تو اس سے جوں کا دیکھنا مراد نہیں ہے (بلکہ امت کی تعلیم مقصود ہے تاکہ امت اس پر عمل کرکے اجر وثواب کی مستحق

بنے۔ مترجم) اور آپ کے خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ آپ کی بعثت کے وقت سے کاہنوں اور شیاطین کا آسمان سے چوری چھپے خبریں سننے کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور آسمان کی حفاظت کی گئی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ شیاطین آسمانوں سے پوشیدہ اور چھپے ہوئے نہ تھے۔ وہ آسمانوں میں گھس کر وہاں سے چوری چھپے کچھ باتیں اور خبریں لے آیا کرتے تھے۔ اور وہ ان کاہنوں کے کانوں میں پھونکتے تھے جن کی روحیں شیاطین کی خبیث روحوں کی مانند تھیں۔ اور ان کا ان سے روحانی تعلق تھا۔ کاہن لوگ ان سے خبریں حاصل کر کے ان میں اپنی طرف سے کذب و افتراء ملا کر سناتے تھے۔ جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کو ارواح طیبہ یعنی فرشتوں سے مناسبت تھی۔ اسی مناسبت سے وہ وحی اور سچی و صادق خبروں کے مورد اور مقام نزول و ورود ہوتے تھے۔ اور جب حضور سید السادات فخر موجودات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تو شیاطین کو آسمان پر چڑھنے اور داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ اہل علم بیان کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کی برکت سے شیاطین کو صرف تین آسمانوں سے روکا گیا۔ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی برکت سے انہیں تمام آسمانوں سے روک دیا گیا۔ جب بھی کوئی شیطان آسمان پر چڑھنے کا ارادہ کرتا ہے تو آگ کی چنگاریوں یعنی شہاب سے انہیں مارا جاتا ہے۔ یہ شہاب کبھی خطا نہیں جاتا۔ کسی کو جلا ڈالتا ہے اور کسی کا چہرہ جھلس دیتا ہے۔ اور کسی کے اعضاء کو تباہ اور ناکارہ بنا دیتا ہے اور ان کی عقلیں فاسد اور خراب ہو جاتی ہیں۔

فائدہ:۔ یہ جو شیاطین کے غول، جنگلوں میں لوگوں کو راستے سے بھٹکاتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ بعثت سے پہلے ایسا نہ ہوتا تھا اور نہ کسی نے آپ کے زمانہ بعثت سے قبل اس کا ذکر کیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی امر و عہد میں ایسا رونما ہوا۔ یہ آپ کی نبوت کی اساس اور بنیاد کار تھی۔ حضرت معمر بیان کرتے ہیں کہ میں نے زہری سے پوچھا کہ کیا زمانہ جاہلیت میں بھی ستارے یعنی شہاب گرا کرتے تھے انہوں نے کہا ہاں! لیکن اس میں شدت اور زیادتی اس وقت سے ہوئی جب سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت فرمائی۔ لیکن ابن قتیبہ فرماتے ہیں کہ شیاطین کو آگ کے شعلوں یعنی شہاب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی مارا جاتا تھا لیکن آپ کی بعثت کے بعد اس میں شدت و زیادتی ہو گئی۔ اور آسمان کی حفاظت سخت کر دی گئی۔ بعض کہتے ہیں کہ ستارے گرتے تھے اور شیاطین کو ان سے مارا جاتا تھا۔ لیکن اپنی جگہ وہ پھر لوٹ آتے تھے۔ اسے امام بغوی نے بیان کیا ہے۔ انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے شب اسریٰ میں زین و لگام کے ساتھ براق لایا گیا۔ اہل علم فرماتے ہیں کہ اس پر دوسرے انبیاء کرام برہنہ پشت سوار ہوئے ہیں اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کے لئے بھی براق تھا۔ روایتوں میں ایسا ہی آیا ہے۔ لیکن کیا یہی براق تھا جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا یا ہر ایک نبی کے لئے جداگانہ براق تھا جو ان کے شان اور مرتبہ کے اندازہ پر تھا۔ وہ حدیث جو معراج میں آئی ہے کہ "جب براق نے شوخی و سرکشی کی تو جبریل علیہ السلام نے براق سے کہا آرام سے رہ کوئی تجھ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مانند سوار نہیں ہوا۔" بظاہر اس سے پہلے قول کی ہی دلالت ہوتی ہے (واللہ اعلم) اور یہ کہ راتوں رات حضور کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لیجایا گیا۔ اور وہاں سے مقام اعلیٰ تک اور "آیات کبریٰ" یعنی بڑی بڑی نشانیاں دکھائی گئیں اور نظر مبارک کو ماسوی سے بچایا گیا۔ حتیٰ کہ "مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی۔" (نہ آنکھ جھپکی اور نہ بے راہ ہوئی۔) آپ کے لئے تمام انبیاء حاضر کئے گئے اور آپ نے ان کی اور فرشتوں کی امامت فرمائی۔ آپ کو بہشت کی سیر کرائی گئی اور دوزخ کا معائنہ کرایا گیا اور اس مقام تک لے جایا گیا جہاں تک کسی کا علم نہ پہنچ سکا۔ اور بچشم سر پروردگار عالم کی دید کی۔ اور حق سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کے لئے کلام و رؤیت جمع فرمائے۔ اور آپ کو اس عالم میں اپنے جمال کی رؤیت سے مشرف

فرمایا۔ اور کسی فرشتے اور نبی وولی کو یہ فضیلت میسر نہ ہوئی۔ انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ جس جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سیر فرماتے اور چہل قدمی کرتے فرشتے آپ کی پشت مبارک کے پیچھے چلتے تھے۔ چنانچہ صحابہ کرام سے فرماتے تم آگے چلو اور میری پشت فرشتوں کے لئے چھوڑ دو۔ اور یہ کہ فرشتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں قتال کرتے جیسا کہ غزوۂ بدر اور حنین میں واقع ہوا۔ . اور اس پر قرآن کریم ناطق ہے۔ انہیں خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ آپ کو کتاب عزیز دی گئی۔ حالانکہ آپ اُمّی تھے نہ کسی سے کچھ پڑھا لکھا اور نہ کسی مدرسے میں گئے اور نہ اہل علم کی مجلس میں حاضری دی۔ یہیں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُمیّت آپ کی ذات مقدسہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیونکہ آپ حضرت الوہیت کے مظہر خاص ہیں اور آپ کسی سبب اور ذریعہ کے محتاج نہیں۔ انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ آپ کی کتاب مبارک کو تبدیل و تحریف سے محفوظ کیا گیا باوجودیکہ بکثرت ملحدوں، زندیقوں اور معطلہ و قرامطہ نے تغیر و تبدیلی کی کوشش کی مگر اس میں کامیاب نہ ہوسکے اور نہ اس کے کسی کلمہ اور حرف میں تغیر اور اشتباہ پیدا کرسکے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ۝ کوئی باطل نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے نہ اس کے پیچھے سے یہ حکمت والے سراہے کا نازل کردہ ہے۔

یہ کتاب عزیز ان تمام چیزوں پر مشتمل ہے جن پر گذشتہ تمام کتب ربانی تھیں۔ یہ کتاب ازمنہ سابقہ کی خبروں، گذشتہ امتوں کی حالتوں اور ان کے ان احکام و شرائع کا جامع ہے جن کا آج نام و نشان نہیں اور اہل کتاب میں سے صرف ایک دو ہی ایسے ہیں جنہوں نے پڑھنے پڑھانے میں ساری عمریں ختم کر کے ان کا تھوڑا بہت حال جانا ہو۔ بایں ہمہ اس کتاب کا ایجاز و اختصار اور اس کی مکمل تعریف و توصیف معجزات کے باب میں آئے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔ اور اس کتاب کو ہر اس امتی پر جو خواہش کرے اس کا حفظ کرنا آسان کر دیا گیا۔ اور دوسری امتوں میں سے کوئی ایک بھی اپنی کتاب کو حفظ نہیں کرسکا۔ چہ جائے کہ جم غفیر یاد کرے۔ سالہا سال اور صدیاں گزر جانے کے باوجود بچوں اور جوانوں کے لئے قرآن آج بھی آسان و سہل ہے کہ تھوڑی مدت میں حفظ کر لیتے ہیں۔ اور سہل و آسانی، شرافت و شفقت اور عزت افزائی کے لئے "سات حرفوں" پر اسے نازل کیا گیا۔ ان "سات حرفوں" کی تحقیق مشکوٰۃ شریف کی شرح میں گئی ہے۔ قرآن ہمیشہ وباقی رہنے والا معجزہ اور نشانی ہے۔ یہ تا ابد رہے گا۔ جنتی اسے جنت میں پڑھیں گے۔ اور اس کے ذریعہ ترقی درجات کریں گے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ رتل وارتق یعنی تلاوت کریں گے اور ترقی درجات پائیں گے۔ تمام نبیوں کے معجزے ختم ہوگئے اور ان میں سے بجز خبر کے کوئی معجزہ باقی نہ رہا۔ مگر قرآن ایسا معجزہ ہے کہ اس کی حفاظت و نگہبانی کا ذمہ حق تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ۝ ہم ہی نے قرآن اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت فرمانے والے ہیں۔

اور توریت وانجیل کی حفاظت کو انبیاء واحبار پر چھوڑا گیا لامحالہ تحریف و تبدیلی نے اس میں راہ پائی۔ چونکہ حق تعالیٰ نے چاہا کہ قرآن محفوظ رہے۔ اس لئے صحابہ کرام کو اس پر مقرر فرمادیا۔ تاکہ یہ نہ کہا جائے کہ جب خدا اس کا محافظ تھا تو صحیفوں میں اسے جمع کرنے کی کیا حاجت تھی۔ بعض شوافع کہتے ہیں کہ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کا ہر سورت کے جزو ہونے پر اس جگہ دلیل قوی ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں اسے ثابت و برقرار رکھا گیا ہے ورنہ زیادتی لازم آتی ہے پھر کمی کا گمان بھی ہوسکتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بسم اللہ کا ہر سورۃ کے شروع میں لکھنا باجماع صحابہ ہے اور بسم اللہ سورتوں کے فصل کے لئے نازل ہوئی ہے کیونکہ بعض متاخرین علماء سورتوں کے اسماء اور آیتوں کے شمار کو بھی جائز رکھتے ہیں۔ اور یہ تغیر میں داخل نہیں ہے۔ جس سے شبہ لاحق ہوسکے۔ اور قرآن کریم کو اس کی

حفاظت کے لئے لوگوں کے کلام سے بالکل مختلف و معجز بیان کیا گیا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی ذرا بھی کمی و بیشی کرتا ہے تو اس کا نظم واسلوب بدل جاتا ہے۔ اور ہر ایک جان لیتا ہے کہ یہ کلمہ قرآن کا نہیں ہے اور لوگوں کا اس کو حفظ کرنا بھی اس کے اسباب حفاظت میں سے ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی بڑے دبدبہ والا بزرگ بھی ایک حرف یا ایک نقطہ کی کمی بیشی بھی کرتا ہے تو چھوٹے سے لے کر جوان تک اس کی غلطی اور تبدیلی کو پکڑ لیتا ہے۔ اور یہ کہ حق تعالیٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۂ فاتحہ اور آیت الکرسی اور اٰمن الرسول یعنی سورۂ بقرہ کی آخری آیتوں سے مخصوص فرمایا کہ یہ عرش کے نیچے خزانوں میں سے ہیں۔ اور کسی نبی کو ان کی مثل آیتیں نہیں دی گئیں۔ انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خزانوں کی کنجیاں عطا فرمائی گئیں۔ اس کا ظاہر یہ ہے کہ ملک فارس وروم کے خزانے صحابہ کرام کے قبضہ میں آئے۔ اور اس کا باطن یہ ہے کہ خزائن سے مراد اجناس عالم ہیں کیونکہ تمام رزق آپ کے دست اقتدار کے سپرد فرمایا اور ظاہر و باطن کی تربیت و قوت آپ کو مرحمت ہوئی۔ جس طرح غیب کی کنجیاں در دست علم الٰہی ہیں۔ اس کے سوا ذاتی علم غیب کوئی نہیں جانتا۔ اسی طرح ان کے رزق و قسمت کے خزانے حضور سید کریم کے دست مبارک میں عطا فرمائے۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَّ الْمُعْطِیْ هُوَ اللّٰه۔ '' یعنی میں ہی تقسیم فرمانے والا ہوں اور وہی اللہ عطا فرمانے والا ہے۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہوئے۔ اور آپ رسول الثقلین ہیں۔ اور اجنہ اور انسان کی جانب مبعوث ہیں۔ اور بعض ملائکہ کی جانب بھی اور بعض تمام اجزائے عالم کی جانب بھی فرماتے ہیں۔ چنانچہ وہ آپ کی رسالت کی شہادت دیتے اور شجر و حجر آپ پر سلام عرض کرتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہونے پر حضرت نوح علیہ السلام سے یہ اشکال لاتے ہیں کہ طوفان نوح علیہ السلام کے بعد صرف وہی ایماندار لوگ باقی رہ گئے تھے جو آپ کی کشتی میں سوار تھے۔ ان کے سوا روئے زمین پر کوئی شخص باقی نہ رہا تھا۔ تو ان کی بعثت تمام لوگوں کے لئے ہے؟ اس کے جواب میں شیخ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کی یہ عمومی رسالت، ان کی بعثت میں نہ تھی۔ بلکہ اس کا اتفاق اس حادثہ کی بنا پر پڑ گیا جو طوفان سے واقع ہوا۔ اور لوگ ایمانداروں کی جماعت میں منحصر ہو کر رہ گئے لیکن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی عمومیت، اصل بعثت اور اس کی ابتدا میں ہی تھی۔

بندۂ مسکین یعنی شیخ محقق صاحب مدارج النبوۃ ثبتہ اللہ علی طریق الحق والیقین ورحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا کافۂ خلق کی طرف مبعوث ہونے کی عمومیت سے مقصود تمام عالم کا شرق سے غرب تک عرب اور عجم کا اس رسالت میں شامل ہونا ہے۔ جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر نبی خاص طور پر اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتا رہا ہے مگر میری بعثت ہر احمر و اسود (کالے و گورے) یعنی عرب و عجم کے لئے ہے۔ احمر سے عجم اور اسود سے عرب مراد ہے۔ کیونکہ عرب رنگ میں سیاہی و سبزی مائل ہوتے ہیں۔ اور قرآن کریم میں صاف طور پر ''اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ۔ '' بے شک ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف رسول بنایا۔ واقع ہے۔ نیز جماعت قلیلہ کو کافہ ناس نہیں کہا جا سکتا۔ اگرچہ حادثہ کے پیش آنے کی وجہ سے صرف اتنے ہی باقی رہے ہوں گویا حضرت شیخ ابن حجر مکی کے جواب کا مفہوم و مطلب یہی ہے۔ اور یہ بھی اشکال لایا گیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے تمام اہل زمین پر ہلاکت کی بد دعا فرمائی۔ اور ایمان داروں کے سوا جو آپ کی کشتی میں تھے آپ کی بد دعا سے سب ہلاک ہو گئے۔ اگر آپ ان کی طرف مبعوث نہ ہوتے تو وہ سب کیوں ہلاک کئے جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ''وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔ '' نہیں ہیں ہم عذاب کرنے والے جب تک کہ ہم رسول نہ بھیجیں اور بلاشبہ حدیث شفاعت میں آیا ہے کہ یہ

پہلے رسول تھے تو اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ ممکن ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت توحید ان لوگوں کو پہنچ گئی ہو۔ کیونکہ آپ کی عمر شریف اس جہان میں بہت طویل (یعنی طوفان سے قبل ساڑھے نوسو برس) تھی۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کی امت نے شرک پر سرکشی کی ہو جس سے وہ عذاب کے مستحق بن گئے ہوں۔ چنانچہ شیخ ابن دقیق العبد فرماتے ہیں کہ بعض نبیوں میں توحید عام ہو۔ اور شریعت کے احکامِ فروعی عام نہ ہوں۔ اس لئے کہ بعض نبیوں نے اپنی غیر قوم سے شرک پر قتال کیا جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی موجودگی کے دوران ان کے سوا کوئی اور نبی بھی مبعوث ہوا ہو اور حضرت نوح علیہ السلام کو معلوم ہو گیا ہو کہ لوگ ان پر ایمان نہیں لائے۔ اس بنا پر آپ نے ہر شخص پر بد دعا فرمائی جو ایمان نہیں لایا۔ خواہ اپنی قوم کے ہوں۔ یا کسی اور قوم کے۔ یہ جواب اچھا ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ کوئی اور نبی بھی آپ کے زمانے میں بھیجا گیا حالانکہ ایسا منقول نہیں ہے۔ اور محض احتمال و امکان کافی نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بعثت عامہ کی خصوصیت سے مراد، قیامت تک آپ کی شریعت کی بقا ہے۔ مطلب یہ کہ آپ تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہیں اور قیامت تک آپ کی شریعت یوں ہی برقرار رہے گی۔ اور حضرت نوح اور انکے سوا تمام انبیاء علیہم السلام ایک مدت کے لئے تھے۔ کیونکہ ان کے اپنے زمانہ میں یا ان کے بعد کوئی دوسرا نبی آتا اور ان کی شریعت کا کچھ حصہ منسوخ کر دیتا۔ لیکن یہ آپ کی شریعت غراء کے منسوخ نہ ہونے پر دال ہے۔ کیونکہ آپ خاتم النبیین یعنی آخری نبی ہیں۔ بعض یہودیوں کا یہ کہنا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خاص عرب کے لئے مبعوث ہیں فاسد اور متناقض ہے۔ اور جب بھی آپ کی رسالت کو مانیں گے تو وہ رسول کو صادق جانیں گے۔ اس لئے کہ رسول کاذب نہیں ہوتا۔ حالانکہ آپ خود دعویٰ فرماتے ہیں کہ میں تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہوں لامحالہ ضروری ہے کہ آپ کا یہ دعویٰ صادق ہے اور انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ماہ کی مسافت میں رعب و خوف سے مدد فرمائی گئی۔ ایک ماہ کی مدد کی تخصیص اس لئے ہے کہ آپکے شہر مبارک اور اعدائے دین کے شہروں کی مسافت ایک ماہ سے زیادہ نہ تھی۔ اور یہ خصوصیت آپ کو علی الاطلاق حاصل ہے۔ حتیٰ کہ اگر آپ تنہا ہوں اور کوئی لشکر نہ ہو تو بھی آپ کو یہ رعب حاصل ہے۔ مانا کہ یہ خصوصیت دیگر انبیاء علیہم السلام سے بھی منسوب ہے اور اگر بعض امراء و سلاطین کو یہ حاصل ہوا تو یہ دوسری بات ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ آپ کو فتح و نصرت بالفعل رعب کے ساتھ حاصل ہوتی ہے جس طرح کہ جنگ و قتال کے بعد حاصل کی جاتی ہے لیکن وہ جو دلوں میں رعب، خوف، دبدبہ اور اندیشہ ہوتا ہے وہ تمام انبیاء میں عام ہے۔ ممکن ہے کہ بعض امراء و سلاطین کو بھی حاصل ہو۔ فافہم وباللہ التوفیق۔ انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ جنگ و قتال میں آپ کی تائید فرشتوں سے کی گئی۔ یہ مرتبہ کسی نبی کو بھی نہ ملا۔ اس کی تفصیل غزوات کے بیان میں اور خاص کر غزوۂ بدر سے معلوم ہوگی۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ آپ کے لئے اور آپ کی امت کے لئے غنیمتوں کو حلال کیا گیا حالانکہ آپ سے پہلے کسی ایک کے لئے بھی غنیمتوں کو حلال نہ کیا گیا تھا اور بعضوں کو تو جہاد کا اذن نہ تھا کہ غنائم حلال نہ ہو جائیں۔ اور بعضوں کو جہاد کا اذن تھا مگر اس کا کھانا جائز و حلال نہ تھا۔ وہ مال غنیمت کو جمع کر کے کسی جگہ اکٹھا کر لیتے۔ آسمان سے آگ نمودار ہوتی اور اسے جلا دیتی۔ غنائم کا اس طرح جل جانا قبولیت کی علامت تھا۔ مگر اس اُمت مرحومہ کے لئے اسے حلال بنا دیا گیا۔ اہل علم بیان کرتے ہیں کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر وہ چیز جو امت کی طبیعت و خواہش کے موافق ہے عطا فرمائی گئی۔ اس لئے کہ ان کی طرف خواہشیں اپنی طبیعت سے لذت پاتی ہیں۔ اور انہیں وہ قہر و غلبہ محنت و مشقت اور رنج و تکلیف اٹھا کر حاصل کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ نہ چاہیں گے کہ ان نعمتوں سے تلذذ و تمتع ان کے لئے جاتا رہے۔ انہیں خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور آپ کی امت کے

لئے تمام روئے زمین سجدہ گاہ بنائی گئی کہ ہر جگہ نماز ادا کرنا جائز ہے۔ اور کسی خاص جگہ کو سجدہ کے لئے مخصوص نہیں کیا گیا۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ زمین کو ذریعہ پاکی بنایا گیا۔ اس سے مراد تیمم ہے۔ دوسری شریعتوں میں پانی کے سوا کسی دوسری شے سے طہارت کرنا درست نہ تھا۔ اسی طرح دیگر امتوں کے لئے مخصوص مقامات کے سوا نماز ادا کرنا جائز نہ تھا۔ مثلاً کنیسہ، کلیسا وغیرہ میں۔ اگر ان سے دور ہوتے ہوں گے تو کیا کرتے ہوں گے۔ یا تو نماز ہی نہ پڑھتے ہوں گے یا کسی شے کو اس کی طرف نسبت دے کر خاص کر لیتے ہوں گے۔ مثلاً کوئی کپڑا یا لکڑی وغیرہ۔ **فائدہ:**۔ میں نے علماء کی کسی کتاب میں اس کا ذکر نہ پایا۔ بجز اس کے کہ مواہب لدنیہ میں کہا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہمیشہ زمین پر چلتے رہتے تھے اور جس جگہ بھی نماز کا وقت آ جاتا وہیں نماز ادا کر لیتے۔ اسے "داؤدی" اور "ابن التنبین" سے نقل کیا گیا ہے۔ اور فتح الباری میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث کی مانند مروی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام میں سے کوئی نبی نماز ادا نہیں کرتے جب تک کہ اپنے محراب (بیت المقدس یا کنیسہ وغیرہ) میں نہ پہنچ جاتے۔ مگر ان دونوں نقلوں میں امت کا ذکر نہیں۔ غرض کہ یہ مقام اشکال و اختلال سے خالی نہیں۔ (واللہ اعلم) بعض کہتے ہیں کہ زمین کا مسجد و طہور ہونا دوسروں کے لئے نہ تھا کیونکہ زمین مسجد تو تھی مگر طہور نہ تھی۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے لئے ہر جگہ۔ بجز اس جگہ کے جائز نہ تھی جس کے پاک ہونے پر انہیں یقین نہ ہوتا اور اس امت کو جائز ہے کہ جہاں نجاست کے نہ ہونے کا یقین ہو ظاہر حال پر نظر کرنا کافی ہے۔ (واللہ اعلم)

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات تمام انبیاء علیہم السلام کے معجزات سے بہت زائد تھے۔ اور قرآن کریم سراسر معجزہ ہے اور اس میں کم سے کم جو اعجاز ہے اس کی چھوٹی سے چھوٹی سورۃ میں صرف ایک یہی کہ "اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ" (ہم نے آپ کو کثرت دی) ہے تو اسی میں غور کرنا چاہئے کہ "کثرت" کی حد کہاں تک پہنچتی ہے۔ یا اس کی مقدار میں کوئی اور آیت لے کر غور کریں۔ اس سلسلے میں شافی بیان باب معجزات کے آخر میں ذکر کیا گیا ہے۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء و مرسلین کے خاتم یعنی آخری ہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا قرآن مجید اس پر ناطق و شاہد ہے۔ حدیث مبارک میں آیا ہے کہ میرے قصہ و داستان اور انبیاء علیہم السلام کے قصہ و داستان کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے محل بنایا۔ اور اس محل کو مکمل کر دیا۔ مگر اینٹ کی جگہ کسی گوشے میں خالی رہ گئی۔ لوگ جوق در جوق اس محل کو دیکھنے آتے ہیں۔ اور چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھتے ہیں۔ اور تعجب کے ساتھ کہتے ہیں کہ اس خالی جگہ میں اینٹ کیوں نہ رکھی گئی تو سمجھ لو میں وہی اینٹ ہوں۔ میں خاتم انبیاء ہوں۔ اب عمارت تمام ہو گئی۔ کسی چیز کی حاجت نہ رہی۔ اور "بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ وَمَحَاسِنَ الْاَفْعَالِ۔" اور مجھے مکارم اخلاق اور محاسن افعال کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا۔ یہ اشارہ انبیاء کی ختمیت کی طرف ہے۔ اور یہ کہ آپ کی شریعت دائمی ہے، جو قیامت تک رہے گی۔ اور یہ انبیاء و مرسلین علیہم السلام کی شریعتوں کی ناسخ ہے۔ اور یہ آپ کی امت ان سب امتوں سے بہتر ہے اور آپ کی امت تمام نبیوں کی امتوں سے زیادہ ہے۔ اگر انبیاء علیہم السلام بھی آپ کا زمانہ پاتے تو وہ سب آپ کی پیروی کرتے۔ اس کی تحقیق باب فضائل میں گزر چکی ہے۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا۔ اگر رحمت سے مراد ہدایت لیں تو اس سے مقصود تمام لوگوں کی طرف رسول ہونا ہے اگرچہ وہ تمام لوگ ہدایت نہ پائیں۔ اور شک و شبہہ کی تاریکی میں پڑے رہیں، اگر عام تر مراد لیں تو آپ کے وجود گرامی کے واسطہ سے تمام کائنات کے لئے فیض وجودی میں شمولیت ہوگی۔ اس کا بیان باب سوم کے اول میں گزر چکا ہے۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حق تبارک و تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو ان کے ناموں سے مخاطب فرمایا۔ مثلاً یا

آدم، یانوح، یاابراہیم، یاداؤد، یازکریا، یاعیسیٰ، یایحییٰ وغیرہ مگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح خطاب نہ فرمایا بلکہ یَاَیُّھَا النَّبِیُّ، یَاَیُّھَا الرَّسُوْلُ، یَاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ اور یَاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ سے خطاب فرمایا۔ آخر کے دوناموں سے مخاطب فرمانا شفقت و محبت سے ہے اور محبت والے اس لذت کی لذت کو جانتے ہیں۔ انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ امت کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر فریاد کرنا حرام قرار دیا گیا۔ مثلاً یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ کر پکاریں جس طرح کہ لوگ اپنے جیسوں کو پکارتے ہیں حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ "لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَآءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا" (رسول کو آپس میں اس طرح نہ پکارو جس طرح تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔) بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صفتی نام سے فریاد کرو۔ مثلاً یا حبیب اللہ، یارسول اللہ، یانبی اللہ، وغیرہ۔ اور نہایت ادب و احترام، انکسار اور نیچی آواز سے۔ اس آیہ کریمہ کی تفسیر میں مروی ہے کہ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کو ثقل سماعت کی شکایت تھی اور ان کی آواز بہت بلند تھی۔ جب یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی تو وہ گھر میں بیٹھ گئے اور مجلس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر نہ ہوئے ایک دن سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ کیا بات ہے ثابت رضی اللہ عنہ نہ ہمارے پاس آتے ہیں اور نہ کہیں شکل دکھاتے ہیں۔ آپ نے انہیں بلوایا اور حاضر نہ ہونے کا سبب دریافت فرمایا۔ عرض کیا یارسول اللہ آپ پر یہ آیہ کریمہ نازل ہوگئی۔ اور میں بلند آواز ہوں ڈرتا ہوں کہ کہیں میرے عمل اکارت نہ جائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم اس آیت کے مصداق نہیں ہو۔ اور نہ ان میں سے ہوگے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ادب و احترام پر خوش ہو کر فرمایا تمہاری زندگی کے ایام بھی اچھے ہیں۔ اور جب رحلت کرو گے تب بھی اچھے رہو گے اور ان کو جنت کی بشارت دی۔ چنانچہ وہ جنگ یمامہ کے دن شہید ہوئے۔ ان کا ذکر آخر کتاب میں ذکر خطباء کے ضمن میں آئے گا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ) اسی طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے حجرۂ مبارک کے باہر سے آواز دینا بھی حرام تھی۔ اس میں حسن ادب یہ ہے کہ لوگ آئیں اور بیٹھ جائیں۔ حتیٰ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم خود باہر تشریف لا کر انہیں مشرف فرمائیں۔ غایت ادب میں تفصیلی ذکر اپنی جگہ پر آئے گا۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگانی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر مقدس اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک کی قسم فرمائی۔ جیسا کہ گزر چکا ہے۔ اور انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے وحی کے تمام اقسام میں کلام فرمایا۔ اس کی تحقیق مبعث کے بیان میں آئے گی۔ (انشاء اللہ) انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ اسرافیل علیہ السلام آپ کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نیچے آئے حالانکہ آپ سے پہلے کسی نبی کے پاس نہ آئے تھے۔ طبرانی بروایت ابن عمر رضی اللہ عنہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا کہ میرے پاس اسرافیل علیہ السلام آئے اور وہ پہلے کسی نبی کے پاس نہ آئے اور نہ آئندہ کسی پر آئیں گے۔ انہوں نے عرض کیا آپ کے رب نے مجھے بھیجا ہے اور آپ کو حکم دیا ہے کہ میں نے آپ کو اختیار دیا کہ اگر آپ چاہیں تو نبی اور بندہ رہیں اور اگر آپ چاہیں تو نبی اور بادشاہ رہیں۔ پھر میں نے حضرت جبریل علیہ السلام کی طرف بطریق مشورہ دیکھا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں اور تم کیا کہہ رہے ہو تو جبریل علیہ السلام نے میری جانب اشارہ کیا کہ متواضع رہو اور بندہ رہو۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر میں فرماتا کہ میں نبی اور بادشاہ رہوں تو سونے کے پہاڑ میرے ساتھ چلا کرتے۔ اسی طرح مواہب لدنیہ میں مذکور ہے۔ اسرافیل علیہ السلام ایک دوبار نہیں آئے بلکہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک کے ہمیشہ حاضر باشوں میں سے تھے۔

صاحب "سفرالسعادۃ" لکھتے ہیں کہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف سات سال کی ہوئی تو آپ کے دادا حضرت عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے وفات پائی اور آپ کی کفالت و تربیت کا شرف آپ کے چچا ابو طالب کو ملا۔ حضرت حق عزاسمہٗ نے

اسرافیل علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہمیشہ رہیں تو اسرافیل علیہ السلام ہمیشہ آپ کے نزدیک رہے۔ یہاں تک کہ آپ نے عمر شریف کا گیارہواں سال مکمل فرمایا۔ اس وقت جبریل علیہ السلام کو فرمان ہوا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہو۔ (صلی اللہ علیہ وسلم) انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم بہترین اولاد آدم ہیں۔ مسلم نے بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نقل کیا کہ حضور نے فرمایا "أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔" میں قیامت کے دن اولاد آدم کا سردار ہوں گا۔ جب آپ روز قیامت سب سے بہتر وافضل ہوں گے تو دنیا میں بطریق اولیٰ ہیں اس لئے کہ وہ جگہ تو سیادت، عزت اور کرامت کے ظہور کی ہوگی وہاں کسی ایک کو بھی دم مارنے کی طاقت نہ ہوگی۔ بجز آپ کے جیسا کہ آیہ کریمہ "مالک یوم الدین۔" کی تفسیر میں اسی نکتہ کی مانند کہتے ہیں۔

ترمذی میں بروایت حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہے کہ فرمایا "أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا فَخْرَ وَبِيَدِي لِوَاءُ الْحَمْدِ وَلَا فَخْرَ۔" میں بروز قیامت اولاد آدم کا سردار ہوں گا اور یہ فخر نہیں، میرے ہاتھ میں حمد کا جھنڈا ہو گا اور یہ فخر نہیں۔ مطلب یہ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حق جل جلالہ کی ایسی حمد کریں گے کہ کسی نے ایسی نہ کی ہوگی۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ کی جتنی معرفت آپ کو حاصل ہے اتنی کسی اور کو نہیں۔ اور آپ پر اس کی نعمتیں جتنی شامل ہیں اتنی کسی اور کے لئے نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ حمد بمعنی محمودیت یعنی تعریف کے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ روز قیامت جس قدر آپ کی مدح وثنا ہوگی کسی کی نہ ہوگی۔ وہ دن آپ ہی کا دن ہے۔ وہاں شان آپ کی ہی شان ہوگی۔ آپ کا ارشاد کہ "وَلَا فَخْرَ۔" اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ خصلت میری اپنی حاصل کردہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ فضل وکرامت خدا کی جانب سے ہے میں اسے از خود نہ پاؤں گا۔ اور نہ ایسی قوت از خود مجھے ہوگی۔ جس پر میں فخر کروں۔ (بلکہ یہ سب خدا کی طرف سے ہے) جیسا کہ اہل علم بیان کرتے ہیں۔ ممکن ہے اس سے یہ مراد ہو کہ مجھ کو جو اولاد آدم کی سیادت کی نسبت حاصل ہے اس پر کوئی فخر نہیں ہے۔ بلکہ مجھے تو اس نسبت پر فخر ہے جو مجھے حق تعالیٰ عز اسمہٗ سے حاصل ہے۔ جس طرح کہ بعض اہل علم، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولایت کو آپ کی نبوت پر فضیلت دینے میں کہتے ہیں۔ اور بعض ارباب معانی یعنی اہل کلام کہتے ہیں کہ میرا فخر تو در حقیقت ذات احدیت میں فنا وگم ہونے پر ہے نہ کہ وہ جو آثار وجود اور تحت حیطۂ تکوین سے ہے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ الفقر فخری، فقر میرا فخر ہے (واللہ اعلم) اسی طرح سید اولاد آدم اور سید تمامۂ خلق ہے اور خدا کے نزدیک تمام انبیاء ومرسلین، ملائکہ مقربین اور تمام زمین اور آسمان والوں سے زیادہ آپ معزز ومکرم ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم)

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کے سبب تمام اولین وآخرین کے ذنوب کو بخشا۔ چنانچہ فرمایا "مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ۔" شیخ عز الدین عبد السلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آپ کی ہی خصوصیت ہے کہ حق تعالیٰ نے دنیا میں آپ کو آمرزش کی خبر دی۔ اور یہ نقل نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو ایسی بشارت نہ دی۔ یہاں تک کہ وہ روز قیامت نفسی نفسی کہیں گے۔ (انتہی) مطلب یہ کہ تمام انبیاء علیہم السلام اگرچہ مغفور ہیں اور انبیاء کی تعذیب جائز نہیں ہے لیکن صراحت کے ساتھ کسی نبی کو اس فضیلت کی خبر دنیا میں دی گئی۔ اس کی تصریح حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خصوصیت سے ہے کہ آپ اپنے غم واندیشہ سے فارغ ہو کر جمع خاطر کے ساتھ اپنی امت کے حال کی غور وپرداخت کریں۔ اور ان کی شفاعت، مغفرت ذنوب اور ان کی درجات کی بلندی میں کوشش فرمائیں۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ آپ کا قرین (جسے ہمزاد کہتے ہیں) اسلام لے آیا۔ اس بات کی تفصیل یہ ہے کہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کوئی نہیں ہے مگر یہ کہ موکل کردانا گیا ہے

کے ساتھ جنات میں سے اس کا ایک قرین اور فرشتوں میں سے اس کا ایک قرین صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ کا بھی یہی حال ہے فرمایا ہاں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پر میری مدد و نصرت فرمائی تو وہ اسلام لے آیا۔ تو وہ بھلائی کے سوا کچھ نہیں کہتا بعض کہتے ہیں اسلام لانے سے مراد انقیاد و اطاعت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کے تصرف کا عدم نفاذ ہے اور اکثر کا یہی قول ہے کہ حقیقت اسلام ہی مراد ہے۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر خطا جائز نہیں ہے۔ اسے ماوردی اور حجازی نے "مختصر روضہ" میں بیان کیا ہے۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ نسیان یعنی بھول چوک بھی جائز نہیں ہے۔ امام نووی سے شرح مسلم میں اس قول کی حکایت بیان کی گئی ہے اسی طرح صاحب مواہب لدنیہ نے بغیر تفصیل اور بغیر ذکر اختلاف بیان کیا ہے کہ وہ اقوال و اخبار جو تبلیغ و شرائع اور وحی سے متعلق ہیں ان میں بھول چوک کے نہ ہونے یعنی عدم نسیان پر اجماع کرتے ہیں اور بسلسلہ اخبار بعض لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ اور ان میں نسیان کو جائز رکھا ہے۔ یہ قول ضعیف ہے اس لئے کہ خلاف واقعہ کی خبر دینا کذب و عیب ہے۔ حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن عزت کو اس سے پاک و صاف ماننا واجب ہے۔ اور یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عادت تھی کہ وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اقوال کی تصدیق اور تمام خبروں پر اعتماد کرنے میں عجلت اور سبقت کرتے تھے۔ خواہ وہ کسی باب یا کسی چیز میں ہوں۔ یہی جمہور علماء کا مذہب ہے۔ لیکن نسیان افعال میں جائز ہے۔ نماز میں اس کا وقوع درجہ صحت کو پہنچ چکا ہے۔ اب اس کے قائل ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ البتہ ضمناً یہ ضرور اعتقاد رکھنا چاہئے کہ اس میں تشریعی حکمت اور امت کو اس کی اقتداء کی سعادت پانے کی مصلحت ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ بشری اور جبلی احکام کے بقا اور اعضاء کے افعال اور جوارح کے حرکات اس عالم سے متعلق ہیں۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

اب رہی خطا کی نسبت تو اگر اس خطا سے مراد خطائے اجتہادی ہے جو بعض مواقع پر رونما ہوئی۔ مثلاً بدر کے قیدیوں سے فدیہ لے لینا تو حضور کو ایسی خطائے اجتہادی پر ثابت و قائم نہ رکھا گیا بلکہ اس سے باخبر کر دیا گیا۔ اسی طرح نسیان میں بھی ہے اب رہا شک تو یہ حضور سے ہرگز واقع نہ ہوا۔ مثلاً کبھی اس میں شک ہوا ہو کہ دو رکعت پڑھی ہیں یا تین۔ آپ نے فرمایا شک و شبہہ شیطان سے ہے۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ مردے سے قبر میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ سوال کیا جائے گا کہ "اس شخص کے بارے میں تو کیا کہتا ہے جو تم میں مبعوث ہوئے تھے۔" (آخر حدیث تک) جیسا کہ علماء خصائص میں بیان کرتے ہیں۔ اس کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اور امتوں سے دوسرے نبیوں کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔ یعنی قبر میں ان سے اپنے اپنے نبیوں کے بارے میں سوال نہ ہوگا اس سے بعض علماء کہتے ہیں کہ سوال قبر امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے ہے۔ اس لئے کہ انہیں عالم برزخ میں گناہوں سے پاک و صاف کر کے عالم آخرت میں لے جائیں گے۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ جائز ہے کہ خدا کی قسم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھائی جائے آپ کے غیر سے نہیں مثلاً فرشتے یا دیگر انبیاء وغیرہ۔ شیخ عز الدین ابن عبدالسلام فرماتے ہیں کہ لازم ہے کہ یہ جواز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص اور آپ سے مقصود ہے۔ کیونکہ کوئی دوسرا آپ کے درجہ میں نہیں ہے صلی اللہ علیہ وسلم مواہب لدنیہ میں مذکور ہے۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات آپ کے بعد امت پر حرام قرار دیدی گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ۔" یعنی حرمت میں وہ ماؤں کے حکم میں ہیں۔ یہ حضور کی تکریم و تعظیم کے سبب اور بایں وجہ آپ کی ازواج جنت میں بھی آپ کی ازواج ہوں گی۔ اور ارشاد ہے:۔

وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا تمہیں لائق نہیں کہ تم رسول اللہ کو ایذا دو اور نہ یہ کہ آپکی ازواج سے نکاح آپ کے بعد کبھی کرو۔

"روضۃ الاحباب" میں مروی ہے۔ کہتے ہیں کہ طلحہ بن عبید اللہ نے کہا تھا جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے پردہ فرما جائیں گے تو میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو پیام دوں گا تو یہ آیت نازل ہوئی اور بعض کتابوں میں کہا گیا ہے کہ یزید شقی نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں طمع کی تو لوگوں نے اس پر یہ آیت پڑھی۔ اور اس سے باز رکھا۔ یہ حرمت نکاح ان بیویوں کے بارے میں ہے جنہیں اختیار دیا گیا کہ وہ چاہیں تو دنیا اور اس کی زینت کو اختیار کر لیں۔ یا وہ چاہیں تو خدا اور اس کے رسول کو اختیار کر لیں لہٰذا جن عورتوں نے دنیا کو چاہا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا ہو گئیں۔ ان کے حلال ہونے میں اختلاف ہے۔ امام الحرمین اور امام غزالی ان کے حلال ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ لیکن وہ بیویاں جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تک زندہ رہیں وہ حضور کے سوا غیر پر حرام ہیں۔ دیکھنے کے جواز میں دو وجہ ہیں۔ زیادہ مشہور تو ممانعت ہے۔ اور "ماں" کے حکم میں ہونے کا مطلب احترام و اطاعت اور تحریم نکاح ہے نہ کہ خلوت، اور نفقہ و میراث کے جواز میں اور یہ حکم ان کے غیر کے ساتھ متعدی و متجاوز نہیں ہوتا۔ مثلاً کوئی یہ کہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیاں مسلمانوں کی بہنیں ہیں۔ بر قول اصح، ایسا ہی مواہب لدنیہ میں ہے۔

در حقیقت آپ کی ازواج مطہرات کی حرمت کا سبب، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قبر شریف میں زندہ ہونا ہے اسی بنا پر علماء کہتے ہیں کہ ازواج مطہرات پر وفات کی عدت نہیں ہے۔ اور وہ عورت جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار دے کر جدا فرما دیا۔ جیسے وہ عورت جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے استعاذہ کیا اور وہ عورت جس کے نچلے حصہ میں سفیدی دیکھ کر جدا فرما دیا تھا ان کے بارے میں کئی قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ حرام ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اسی پر پختگی سے قائم ہیں اور دوسرا قول یہ ہے وہ حرام نہیں ہے۔ امام الحرمین فرماتے ہیں کہ اگر مدخول بہا یعنی ہم بستری ہو چکی ہے تو حرام ہے۔ روایت ہے کہ اشعث بن قیس نے مستعیذہ عورت سے سیدنا فاروق اعظم عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں نکاح کیا۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارادہ کیا کہ اسے رجم کریں۔ پھر آپ کو باخبر کیا گیا کہ اس سے دخول واقع نہ ہوا تھا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے رجم کرنے سے رک گئے۔ اور اس باندی کے بارے میں جسے ہم بستری کے بعد جدا فرمایا اس میں بھی تین قول منقول ہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ وہ حرام ہے اگر موت سے جدا ہوئی جیسا کہ حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا جو کہ حضرت ابراہیم فرزند رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ہیں اور حرام نہیں ہے اگر حیات میں فروخت کر دیا جائے۔ (انتہی) یہ مسئلہ بھی اسی قبیل سے ہے۔ جس کے ذکر سے اب کوئی فائدہ نہیں۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ آیت حجاب نازل ہونے کے بعد ازواج مطہرات کے کالبد کا دیکھنا بھی حرام تھا۔ اگرچہ وہ برقع و چادر وغیرہ میں مستور ہوں۔ اور کسی ضرورت سے مثلاً گواہی وغیرہ کے لئے چہرہ اور ہتھیلی کھولنا بھی حرام تھا۔ جس طرح کہ تمام عورتوں کے لئے جائز ہے۔ اس کا فتویٰ قاضی خاں نے دیا ہے انہوں نے کہا کہ امہات المومنین پر بلا خلاف چہرہ اور ہتھیلیوں کا پردہ کرنا فرض کیا گیا ہے۔ اور گواہی وغیرہ میں بھی ان کا کھولنا جائز نہیں ہے اور نہ اظہار شخوص یعنی کالبد مستور در ثیاب وغیرہ مگر ان مواقع پر جو ضروریات بشری ہیں جیسے پیشاب، پاخانہ وغیرہ جائز ہے۔ اور موطا میں اس روایت سے یہ استدلال کیا ہے کہ جب حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہ نے وفات پائی تو عورتوں نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے وجود کو چھپا لیا کہ کوئی ان کے وجود کو نہ دیکھ سکے۔ اور زینب رضی اللہ عنہا بنت جحش نے ان کی نعش پر قبہ سا بنایا۔ تاکہ ان کا وجود پوشیدہ ہو جائے۔ صاحب مواہب لدنیہ نے شیخ ابن حجر عسقلانی سے نقل کیا ہے کہ جو کچھ فتاویٰ قاضی خان میں بیان کیا ہے اس کی فرضیت کے دعویٰ میں کوئی دلیل نہیں ہے۔

حالانکہ یہ بات متحقق ہے کہ ازواج مطہرات حج وطواف کے لئے باہر نکلتی تھیں۔ اور صحابہ وتابعین ان سے احادیث سنتے تھے ان کے بدن مبارک کپڑوں سے مستور ہوتے۔ اور کالبد یعنی مشخص وجودی پوشیدہ نہ ہوتے تھے۔ (انتہٰی)۔

امہات المومنین کے حجاب کا مطلب مشخص وجود (ڈھانچہ) کا عدم اظہار اگرچہ وہ کپڑوں میں مستور و محجوب ہوں۔ یہ کیوں مشہور وثابت ہوا۔ اور شیخ ابن حجر رحمہ اللہ کا اس باب میں بحث کرنے کا مطلب کیا ہے؟ آیا فرضیت کی نفی ہے جیسا کہ ان کے ظاہر کلام سے ظاہر ہے یا وہ انہیں "تحت ضرورت" میں داخل کرتے ہیں۔ حالانکہ امہات المومنین کے مشخص وجودی (ڈھانچہ) کا حج وطواف میں ظاہر ہونا ثابت ہے۔ چنانچہ حدیث مبارک میں آیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب ہم حج کی راہ میں عورتوں کے جھرمٹ کے درمیان چلتے تو ہم اپنے چہروں کے سامنے سے پردے اٹھا دیتے۔ اور جب ہم دیکھتے کہ لوگ پہنچنے والے ہیں تو اپنے چہرہ پر پردہ الٹ لیتے۔ اسی طرح جب ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ناتوانی کے باعث ہجوم میں طواف نہ کر سکتی تھیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگوں کے پیچھے سے طواف کرو۔ بہر تقدیر یہ بالکل ظاہر ہے کہ ان کا لبد (ڈھانچہ) ظاہر تھا اور یہ کہنا کہ قبہ یا عماری کی مانند کوئی چیز ان کے اوپر ہوتی ہوگی بعید ہے۔ اب رہا حدیث مبارک کے سنانے کی حالت تو ممکن ہے کہ وہ پس پردہ سناتی ہوں۔ چنانچہ حضرت عبدالواحد ابن ایمن اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا تو ان پر قطری اوڑھنی تھی۔ اس روایت سے ظاہر ہے کہ یہ اوڑھنی آپ کے جسم اطہر پر تھی۔ اور اگر حجاب سے یہ مراد لیں کہ وہ چیزیں جو عورتوں کو کھولنا جائز ہیں مثلاً چہرہ ہتھیلیاں تو یہ بھی ان پر حرام تھیں نہ کہ کالبد (ڈھانچہ) کا چھپانا۔

اور انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں کی اولاد کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی جاتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہر نبی کی اولاد اس کے صلب سے ہے۔ اور میری اولاد علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ کے صلب سے ہے۔ حضرت امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما کی شان مبارک کے سلسلے میں حدیث پاک میں آیا ہے۔

هٰذَانِ ابْنَا بِنْتِيَ اللّٰهُمَّ اِنِّيْ اُحِبُّهُمَا فَاَحِبَّهُمَا وَاَحِبَّ مَنْ يُّحِبُّهُمَا۔ — یہ دونوں میری بیٹی کے فرزند ہیں اے خدا میں ان دونوں کو محبوب رکھتا ہوں تو بھی انہیں محبوب رکھ۔ اور جو انہیں محبوب رکھے تو اسے بھی محبوب رکھ۔

دوسری حدیث میں آیا کہ:۔

اِنَّ اِبْنَيَّ هٰذَيْنِ رِيْحَانَتَايَ مِنَ الدُّنْيَا۔ — بیشک یہ میرے دونوں فرزند دنیا کے میرے دو پھول ہیں۔

نیز مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سیدتنا فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا سے فرماتے میرے ان دونوں فرزندوں کو میرے پاس لاؤ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی بو سونگھتے اور سینہ مبارک سے چپٹاتے۔ اور سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا "اِنَّ ابْنِيْ هٰذَا سَيِّدٌ۔ "بیشک میرا یہ فرزند سید ہے۔"

ایک اور حدیث میں آیا کہ امام حسن، امام حسین رضی اللہ عنہما میں سے کوئی صاحبزادے مسجد نبوی میں آئے اور بحالت سجدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پر بیٹھ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سر مبارک سجدہ سے نہ اٹھایا اور سجدہ دراز فرما دیا۔ بعد نماز صحابہ کرام نے سجدہ کی بابت دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! کیا سجدہ میں وحی آئی تھی؟ فرمایا میری پشت اطہر پر میرا فرزند سوار ہو گیا تھا۔ میں نے اسے اچھا نہ جانا کہ جلدی کروں یہاں تک کہ وہ خود نہ اترے اور مباہلہ والی آیت "نَدْعُ اَبْنَآءَنَا" (ہم اپنے فرزندوں کو بلائیں) بھی اس پر دلالت کرتی ہے۔

اور انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ قیامت کے دن ہر ایک کا سبب ونسب منقطع ہو جائے گا۔ یعنی قیامت میں کوئی فائدہ نہ دے گا۔ مگر میرا نسب اور سبب اور نسب سے مراد اولاد ہے اور سبب سے مراد ازواج ہیں اسی بناپر سیدنا فاروق اعظم عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی سے نکاح فرمایا یہ تمنا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سلسلہ سبب متصل ہو جائے۔ یہ قصہ اپنی جگہ اس سے زیادہ تفصیل سے آئے گا۔

اور انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ آپ کی صاحبزادیوں کی موجودگی میں کسی اور سے نکاح نہیں کیا گیا۔ مطلب یہ کہ جب کسی شخص کے نکاح میں آپ کی کوئی صاحبزادی ہو تو اسے جائز نہیں تھا کہ آپ کی صاحبزادی پر کسی اور عورت کو نکاح میں (سوت بناکر) لاسکے۔ دراصل اس باب میں سیدتنا فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کا قصہ ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ ابو جہل کی لڑکی سے جو مسلمان ہو کر مدینہ منورہ آگئی تھی نکاح کرنا چاہتے تھے۔ جب حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اس کا پتہ چلا تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں اور کہنے لگیں، آپ کی قوم کہتی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنی صاحبزادیوں کے حق میں غصہ نہیں کرتے۔ "حضرت علیؑ ابو جہل کی بیٹی سے نکاح کر رہے ہیں اور آپ کچھ نہیں فرماتے۔" اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے اور منبر پر رونق افروز ہو کر خطبہ فرمایا اور کہا میں نے ابو العاص کے نکاح میں اپنی بیٹی دی (یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ہیں۔ ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا منسوب ہوئی تھیں اور اس وقت تک وہ انہیں کے گھر تھیں۔) تو اس نے ہمارے ساتھ درست روی کو اختیار کیا اور ہماری رضا کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا میری جگر گوشہ ہے۔ میں ناپسند کرتا ہوں کہ اسے کوئی آزار و تکلیف پہنچے۔ اور انہیں کسی آزمائش میں مبتلا کیا جائے۔ اور جو چیز سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ایذا دیتی ہے اس سے مجھے ایذا ہوتی ہے اور میں نے سنا ہے کہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ابو جہل کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہتے ہیں! خدا کی قسم! رسول خدا کی بیٹی اور دشمن رسول خدا کی بیٹی ایک مرد کے عقد میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ انہیں چاہئے کہ وہ پہلے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دیں اس کے بعد اس سے نکاح کریں۔ چنانچہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے۔ معذرت چاہی اور ابو جہل کی لڑکی سے نکاح کرنے کا ارادہ ترک فرمادیا۔ اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ پر حرام فرمادیا کہ جب تک سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا حیات ہیں ان کے اوپر کوئی سوت لائی جائے اور فرمایا "اے علی! میں تمہیں اپنا محبوب رکھتا ہوں اور اس سے ڈراتا ہوں کہ تم فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ایذا پہنچاؤ۔ اور اس سے مجھے ایذا پہنچانا لازم آئے۔" یہ حدیث مبارک اگرچہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے ساتھ مخصوص و منطوق ہے لیکن آپ کی کسی بیٹی پر کسی اور کو سوت بنا کر لانا ایذا کا موجب ہے۔ اس لئے اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام بیٹیوں پر جاری گردانا گیا ہے۔

اور انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تعیین قبلہ کیلئے "محراب" میں جو کہ مدینہ منورہ میں ہے دائیں، بائیں اجتہاد و تحری نہیں کی جائے گی۔ اور شیخ الاسلام ابو زرعہ نے اس شخص کے بارے میں فتویٰ دیا۔ جس نے محراب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب نماز ادا کرنے سے انکار کیا تھا اور کہا تھا کہ میں تعیین سمت قبلہ میں اجتہاد کر کے نماز پڑھوں گا۔ اگر اس نے یہ تحری و اجتہاد یہ جان کر کیا کہ یہ محراب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھی تو وہ مرتد ہو گیا۔ (نعوذ باللہ منہا) اور اگر وہ یہ تاویل کرتا ہے کہ موجودہ محراب وہ نہیں ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھی بلکہ اس میں ردوبدل اور تغیر کیا گیا ہے۔ تو اسے کافر و مرتد نہ بنائے گا۔ کیونکہ روایتوں میں آیا ہے کہ درمیان سے تمام حجابات یعنی پردے اٹھا دیئے گئے تھے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر خانہ کعبہ تھا۔ اور بالمشافہ عین کعبہ کے مقابل محراب تعمیر کی گئی اور انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ جس

نے خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا بلاشبہ اس نے حق اور بے شک وشبہ آپ ہی کو دیکھا اس لئے کہ شیطان آپ کی صورت میں متمثل نہیں ہو سکتا اور نہ اسے اس کی قدرت دی گئی ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم شکل بن کر فریب و دھوکا دے سکے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ "مَنْ رَاٰنِیْ فَقَدْ رَاَی الْحَقَّ۔" (جس نے مجھے دیکھا اس نے حق ہی دیکھا) حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں آیا ہے کہ "مَنْ رَاٰنِیْ فِی الْمَنَامِ فَقَدْ رَاٰنِیْ۔" یعنی جس نے خواب میں مجھے دیکھا یقیناً اس نے مجھے ہی دیکھا۔ مطلب یہ کہ اگرچہ حق تعالیٰ نے شیطان کو قدرت دی ہے کہ وہ جو صورت چاہے اختیار کرلے۔ لیکن اسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت مبارکہ میں آنے کی قدرت نہیں دی گئی اس لئے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مظہر ہدایت ہیں۔ اور شیطان مظہر ضلالت و گمراہی اور ہدایت و ضلالت ایک دوسرے کی ضدیں ہیں۔ یہاں تک کہ شیطان بصورت پروردگار عالم تعالیٰ و تقدس آسکتا ہے اور دھوکہ و فریب دے سکتا ہے کیونکہ حق سبحانہ وتعالیٰ ہدایت و ضلالت کا خالق یعنی پیدا کرنے والا ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک دونوں کے لئے محل اشتباہ نہیں ہے۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ فضیلت تمام انبیاء علیہم السلام کے لئے عام ہے اور شیطان کسی نبی کی صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ لیکن صاحب مواہب لدنیہ اس فضیلت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص کے بیان میں لائے ہیں اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے میں کسی خاص شکل و صورت میں دیکھنے کی شرط نہیں ہے۔ جو شخص جس صورت میں بھی دیدار سے بہرہ ور ہو یقیناً اس نے آپ ہی کا دیدار کیا۔ اور بعض نے راہ شک اختیار کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ یہ اس تقدیر پر ہے کہ اس نے بصورت خاص دیکھا ہو۔ مطلب یہ کہ اس نے شکل و صورت میں دیکھا ہو جو واقعتہً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت مبارکہ رہی ہے۔ اور بعض نے اس سے زیادہ تنگی اختیار کرتے ہوئے کہا ہے کہ آپ کو اسی خاص صورت میں دیکھا ہے جو صورت مبارکہ دنیا سے رحلت کے وقت تھی حتیٰ کہ وہ آپ کی داڑھی شریف میں سفید بالوں کی گنتی کا بھی شمار ملحوظ رکھتے تھے۔ یعنی آپ کی داڑھی شریف میں بیس سے زیادہ سفید بال نہ تھے۔ اور کہتے ہیں کہ ابن سیرین جو کہ خواب کی تعبیر میں ماہر تھے ان کے پاس اگر کوئی شخص آکر کہتا کہ میں نے خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار کیا ہے تو وہ اس سے پوچھتے بتاؤ کس صورت میں تم نے دیکھا ہے۔ اگر وہ ویسی صورت نہ بتاتا جیسی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت تھی تو ابن سیرین کہتے کہ تو نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہیں کی ہے۔ علماء بیان کرتے ہیں کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ (واللہ اعلم)

کسی شخص نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے۔ آپ نے دریافت کیا کہ کس صورت میں دیکھا اس نے کہا میں نے سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کا ہم شکل دیکھا ہے۔ اس پر ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو درست دیکھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ آپ کی خاص صورت اور جانی پہچانی صفات کے ساتھ دیکھنا آپ کی حقیقت کا ادراک ہے۔ اور اس کے سوا میں دیکھنا مثال کا ادراک ہے لیکن درست بات یہی ہے جس پر تمام محدثین متفق ہیں کہ جس صورت میں بھی دیکھے حقیقتہً حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا دیکھنا ہے۔ لیکن آپ کی خاص صورت میں دیکھنا اتم و اکمل ہے۔ اور صورتوں میں تفاوت آئینہ خیال کا تفاوت ہے۔ جس کا آئینہ خیال نور اسلام سے جتنا صاف تر اور منور ہوگا اس کی رویت اتنی ہی درست اور کامل تر ہوگی۔ اس مقام کی تحقیق کی تفصیل مشکوٰۃ شریف کی شرح میں بیان کر دی گئی ہے۔ وہاں دیکھنی چاہئے۔

مسلم کی حدیث میں ہے کہ "مَنْ رَاٰنِیْ فِی الْمَنَامِ فَسَیَرَانِیْ فِی الْیَقْظَۃِ۔" ـــــ (جس نے مجھے خواب میں دیکھا تو وہ بہت جلد مجھے بیداری میں دیکھے گا۔" اس حدیث کی چند وجوہات سے توجیہیں کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ آخرت میں دیکھے گا۔ حالانکہ علماء بیان

کرتے ہیں کہ آخرت میں ساری امت ہی دیدار مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہرہ ور ہوگی۔ خواب میں رؤیت کی تخصیص کیا ہے۔ علماء کہتے ہیں کہ ایسی رؤیت کے لئے ایک خاص قسم کی رؤیت اور مخصوص قسم کی قربت ہوگی۔ ممکن ہے بعض گنہگاران امت، بعض اوقات میں جمال جہاں آرا کی رؤیت سے اپنے گناہوں کی بدبختی سے محروم رہیں۔ بخلاف ایسی رویت کے کہ وہ اس محرومی اور ناکامی سے محفوظ ہو جائیں۔

دوسری وجہ یہ کہ "بیداری میں دیکھنے سے مراد، خواب میں دیکھنے کی تاویل اور اس کی صحت ہے اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل زمانہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ گویا کہ انہیں بشارت دی گئی ہے کہ اہل زمانہ میں جو بھی خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے سے مشرف ہو گیا امید ہے کہ وہ شرف صحبت سے بھی مشرف ہوگا۔ یہ معنی اظہر ہیں۔ یعنی جیسا کہ بعض روایتوں میں بھی آیا ہے کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا میرا باپ بہت بوڑھا ہے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں حاضر ہونے کی طاقت نہیں رکھتا۔ لیکن وہ خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے مشرف ہو گیا ہے۔ فرمایا "مَنْ رَاٰنِیْ فِی الْمَنَامِ فَسَیَرَانِیْ فِی الْیَقْظَۃِ۔" (جس نے مجھے خواب میں دیکھ لیا عنقریب وہ بیداری میں بھی دیکھ لے گا۔) اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض مستعد و مقربان بارگاہ اور سالکان راہ کے لئے بشارت ہو کہ وہ گاہ بہ گاہ اس نعمت سے مشرف ہو کر بیداری میں دیدار کرنے کے مرتبہ و سعادت سے ہمکنار ہو جائیں۔ مگر علماء کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا سے رحلت فرما جانے کے بعد بیداری میں رؤیت ہونے کے خلاف ہیں۔ صاحب مواہب لدنیہ اپنے شیخ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا ہم میں سے کوئی ایک بھی خواہ وہ صحابہ کرام میں سے ہو یا ان کے بعد والوں میں سے بیداری میں شرف دیدار سے مشرف نہ ہوا اور یہ بات تو بخوبی تحقیق سے ثابت ہے کہ سیدتنا فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت پر انتہائی غم و اندوہ میں رہیں حتیٰ کہ بقول صحیح اسی غم نہانی میں گھل گھل کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے چھ ماہ بعد دنیا سے رخصت فرما گئیں۔ حالانکہ آپ کا گھر قبر انور کے جوار میں تھا۔ مگر اس ساری مدت فراق میں کسی ایک نے بھی ان سے بیداری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کی روایت نقل نہیں کی۔ لیکن بعض صالحین نے اپنے نفوس کی حکایات بیان کی ہیں۔ جیسا کہ بازری کی "توثیق عبرس الایمان" میں ابن ابی حمیرہ نے کی۔ "بہجۃ النفوس" میں عفیف یافعی کی "روض الریاحین" اور ان کی دیگر تصانیف میں اور شیخ صفی الدین بن المنصور کے اپنے رسالہ میں مذکور ہیں۔ نیز مواہب لدنیہ میں ابن ابی حمیرہ کی عبارت نقل کی ہے انہوں نے کہا کہ سلف و خلف کی ایک ایسی جماعت نے ذکر کیا ہے جو اس حدیث کی تصدیق کرتی ہے۔ "یعنی مَنْ رَاٰنِیْ فِی الْمَنَامِ فَسَیَرَانِیْ فِی الْیَقْظَۃِ۔" (جس نے خواب میں مجھے دیکھا عنقریب وہ بیداری میں مجھے دیکھے گا۔) کہ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اس کے بعد بیداری میں دیدار سے مشرف ہوئے۔ اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی پریشانیوں اور مشکلات سے نجات پانے کا ذریعہ معلوم کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ان سے رو خلاصی کی راہیں ہدایت فرمائیں۔ اگر انسان کرامات اولیاء پر اعتقاد نہ رکھے تو اس سے بحث ہی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ اس سے جو بھی کہا جائے گا وہ اس کی تکذیب کرے گا اور اگر وہ اعتقاد رکھتا ہے اور تصدیق کرتا ہے تو اس نے کہنا چاہئے کہ بیداری میں دیدار سے مشرف ہونا بھی انہیں کرامتوں کے زمرہ میں سے ہے۔ اس لئے کہ اولیاء کرام کے لئے ایسے ایسے خرق عادات اور عجیب و غریب واقعات خواہ وہ عالم علوی سے ہوں یا عالم سفلی سے منکشف ہوتے ہیں جن پر کسی اور انسان کی دسترس ناممکن ہے نیز صاحب مواہب لدنیہ نقل کرتے ہیں کہ شیخ ابو منصور نے اپنے رسالہ میں ذکر فرمایا کہ "اہل کمال بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ شیخ ابو العباس قسطلانی بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اَخَذَ اللّٰہُ بِیَدِکَ اَحْمَدُ۔" یعنی اللہ تعالیٰ

تمہاری دستگیری کرے اے احمد!

اور شیخ ابو السعود سے صاحب مواہب لدنیہ نقل کرتے ہیں کہ میں نے تمہارے شیخ ابو العباس اور دیگر مشائخ و صلحائے زمانہ کی زیارت کی ہے۔ پھر میں سب سے قطع تعلق کر کے مشغول ہو گیا اور مجھ پر انکشافات شروع ہو گئے۔ پھر میں نے شیخ کو بار گاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر دیکھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کے بعد مجھ سے مصافحہ فرمایا۔

حضرت شیخ ابو العباس حرال فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں بار گاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اولیاء کرام کے لئے احکام و فرامین تحریر فرما رہے ہیں۔ میرے بھائی جن کا نام محمد ہے ان کے لئے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فرمان تحریر فرمایا ہے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی فرمان نہ لکھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس کے سوا ان کا ایک مقام ہے۔

امام حجۃ الاسلام اپنی کتاب "المنقذ من الضلال" میں فرماتے ہیں کہ ارباب قلوب، بیداری میں فرشتوں اور ارواح انبیاء علیہم السلام کا مشاہدہ کرتے ان کی آوازیں سنتے اور ان سے انوار کا اقتباس اور فوائد کا استفادہ کرتے ہیں۔

حضرت سید نور الدین الحی والد ماجد سید صفی الدین و سید عفیف الدین سے حکایت بیان کی گئی ہے کہ انہوں نے بعض اوقات بوقت زیارت، قبر شریف کے اندر سے جواب سلام یعنی "عَلَیْکَ السَّلَامُ یَاوَلَدِیْ۔" کو سنا ہے۔

مواہب لدنیہ میں اس قسم کی بہت سی حکایتیں بیان کی گئی ہیں جن سے دیدار بحالت بیداری اور خواب دونوں کا احتمال موجود ہے۔ اور نقل کرتے ہیں کہ شیخ شہاب الدین سہروردی قدس اللہ سرہ العزیز "عوارف المعارف" میں حضور سیدنا غوث الاعظم شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا میں نے اس وقت تک نکاح کرنے کا ارادہ نہ کیا جب تک رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے نکاح کرنے کا حکم نہ فرمایا۔

رقم ایں حروف بندۂ مسکین عبد الحق بن سیف الدین (محدث دہلوی رحمہ اللہ) ثبتہ اللہ فی مقام الصدق والیقین کہتا ہے کہ "بہجۃ الاسرار" میں جو کہ شیخ ابو الحسن علی بن یوسف شافعی لخمی رحمہ اللہ کی تصنیف ہے۔ ان شیخ کے اور حضور سیدنا غوث الثقلین شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ کے درمیان صرف دو واسطے ہیں۔ وہ حضرت شیخ جلیل القدر ابو العباس احمد بن شیخ عبد اللہ ازہری حسینی رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ میں حضور سیدنا محی الدین شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ کی مجلس شریف میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپ کی مجلس مبارک میں دس ہزار لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور شیخ علی بن ہیتی غوث الاعظم کے بالکل سامنے مواجہ میں تھے۔ اس لئے کہ ان کے بیٹھنے کی جگہ یہی مقرر تھی۔ انہیں غنودگی نے گھیرا۔ اس وقت حضور غوث الاعظم نے فرمایا خاموش ہو جاؤ۔ چنانچہ تمام لوگ خاموش ہو گئے۔ اور ان کے سانسوں کی آواز کے سوا کوئی دوسری آواز سنائی نہ دیتی پھر حضور غوث الاعظم منبر شریف سے اترے اور حضرت شیخ ہیتی کے سامنے با ادب دست بستہ کھڑے ہو گئے اور خوب غور سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر جب شیخ علی نیند سے بیدار ہوئے تو فرمایا اے شیخ کیا تم نے خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار کیا ہے۔ وہ کہنے لگے ہاں! فرمایا میں اسی وجہ سے ادب بجالایا تھا۔ اور فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں کیا نصیحت فرمائی ہے۔ انہوں نے کہا مجھے آپ کی خدمت میں حاضر رہنے کا حکم فرمایا ہے۔ اس وقت شیخ علی ہیتی نے لوگوں سے فرمایا کہ میں نے جو کچھ خواب میں دیکھا۔ حضور غوث اعظم نے اسے بیداری میں دیکھ لیا۔ اس روز اہل مجلس میں سے سات آدمی (خوف وخشیت الٰہی سے) فوت ہو گئے تھے۔ واضح رہنا چاہئے کہ صاحب مواہب لدنیہ نے بعد از نقل اقوال مشائخ در رؤیت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شیخ بدر الدین حسن بن اہدل سے روایت

نقل کی ہے کہ بیداری کی حالت میں رؤیت شریف کا وقوع ان اولیاء کرام کی خبروں سے حد تواتر تک ثابت ہو چکا ہے۔ جن سے ایسا علم قوی حاصل ہوتا ہے جس سے کسی قسم کا شک وشبہ باقی نہ رہے۔ وقوع رؤیت کے وقت ان اولیائے کرام کے حواس گم ہو جاتے ہیں اور ان پر ایسا حال وارد ہوتا ہے جس کو لفظوں میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس رؤیت میں ان کے مراتب واحوال مختلف ومتفاوت ہیں۔ کبھی وہ خواب میں دیدار سے مشرف ہوتے ہیں اور کبھی حواس کی غیبوبیت میں جسے وہ بیداری خیال کرتے ہیں دیدار سے سرفراز ہوتے ہیں۔ اور کبھی اپنے ہی تصور وخیال کو دیکھ کر گمان کر لیتے ہیں۔ حقیقۃً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دیکھنا نیند اور بیداری کے مابین ہوتا ہے۔ جسے غنودگی کہتے ہیں۔ ہاں وہ ارباب قلوب جو ہمیشہ مراقبہ وتوجہ میں قائم رہتے ہیں اور نفسانی کدورتوں سے پاک وصاف اور دنیا و اہلِ دنیا سے مطلقاً کنارہ کش اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال پرانوار کے عاشق ومشتاق رہتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک ولی اپنے تمام اہل وعیال اور مال ومنال سے جدا ہو جاتا ہے پھر وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار اس شان کے ساتھ کرتا ہے جس طرح کہ حضور سیدنا غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ نے عالم شہود میں اپنی آنکھوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت متمثلہ کی زیارت کی۔ اور ان کو اتنا اختیار تھا کہ وہ ہر عالم میں جہاں جسمانی علائق سے مبرا ہوتے ہیں حالت ذوق میں کلام کرتے ہیں۔

حضرت شیخ ابوالعباس مرسی سے مروی ہے کہ کہا اگر مجھ سے ایک لحظہ کے لئے جمال جہاں آراء سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم پوشیدہ ہو جائے تو میں اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار نہ کروں۔ یہ بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سنن و آداب اور سلوک ومناہج میں دوامی مشاہدہ وحضور پر محمول ہے۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طریقہ ارشاد پر ہے جس میں فرمایا "اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ۔" یعنی "احسان" یہ ہے کہ تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اور بدر اہلال نے شیخ ابوالعباس مرسی کے اس قول کے بعد کہا کہ مشائخ کرام کے کلام واقوال میں جو کچھ واقع ہے اس کو جائز رکھنے کے بارے میں یہ قول ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ حجاب غفلت ونسیان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم در پردہ نہیں ہیں اور دائمی طور پر اعمال واقوال میں مراقبہ وحضور اور استحضار کی جہت سے مشاہدہ میں ہیں۔ اور یہ مراد نہیں لیا کہ اپنی آنکھوں سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پیکری سے محجوب نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ محال ہے واللہ اعلم۔ مواہب لدنیہ کی عبارت کا یہ اختصار وخلاصہ ہے کہ جو انہوں نے چشم سر سے بیداری میں رؤیت کے انکار میں نقل کیا ہے۔

بندہ مسکین ثبتہ اللہ علی طریق الصدق والیقین یعنی شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دوامی مراقبہ حضور غلبہ شوق ومحبت، رؤیت بچشم خیال اور مثال کا تصور کرنا یہ اہل طلب اور اصحاب سلوک کا ایک مرتبہ ہے۔ جس سے وہ متمتع اور محظوظ ہوتے ہیں۔ سلسلہ کلام صورت ومثال کی رؤیت پر چل رہا ہے۔ جیسا کہ خواب میں جائز ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جوہر شریف متصور و متمثل ہو جائے اور اس میں شیطان کے متصور و متمثل ہونے کا شبہ تک نہ رہے۔ یہ بات بیداری میں بھی حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ سونے والا نیند میں دیکھتا ہے۔ جاگنے والا بیداری میں دیکھتا ہے؟ "بہجۃ الاسرار" کی حکایت سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک حدیث میں آیا ہے کہ میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کئی ہزار بنی اسرائیل کے ساتھ احرام باندھتے، تلبیہ پڑھتے اور حج کرتے دیکھا ہے۔ اس کیفیت کو بھی خواب اور یقین میں مبالغہ پر محمول کرنا ظاہر کے خلاف ہے۔ تمثیل ملکوتی بصورت ناسوتی یعنی انسانی شکل میں فرشتوں کا آنا حقیقت امری ہے اس سے یہ مستلزم نہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم قبر شریف سے باہر نکل آئے ہوں گے۔ اور نہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ بیداری میں دیدار سے مشرف ہونے والوں کو "اصطلاحی صحابہ" کہا جائے۔ لیکن بعض

وجوہ میں یہ صحابی کے حکم میں ضرور ہوں گے اور اگر عالم حسی سے غلبۂ ذکر کی وجہ سے غیبوبت ثابت کریں اور نیند و خواب کا اثبات نہ کریں تو کوئی امر مانع نہیں ہے۔ اس لئے کہ نیند نام ہے دماغ میں غلبہ رطوبت مزاجی کی وجہ سے حواس کے معطل ہوجانے کا۔ اور اس جگہ حواس کی غیبوبیت، ذکر شہود کے غلبہ کی وجہ سے ہے اور یہ بیداری میں ہے نہ کہ نیند میں۔

خلاصہ مبحث یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بعد از رحلت دیکھنا مثالی ہے جیسا کہ نیند میں دیکھا جاتا ہے۔ اسی طرح بیداری میں بھی مشرف ہوا جاسکتا ہے اور وہ وجود مبارک جو مدینہ منورہ میں اپنی قبر شریف میں آسودہ ہے وہی متمثل ہوتا ہے۔ اور ایک آن میں متعدد مقامات میں جلوہ افروز ہوتا ہے جو عوام کو خواب میں اور خواص کو بیداری میں دیدار سے مشرف فرماتا ہے۔

صاحب مواہب لدنیہ خود فرماتے ہیں کہ جو شخص اولیائے کرام کی کرامتوں کی تصدیق کرتا ہے اور یہ کہ اولیاء کرام اس قابل ہیں کہ ان پر زمین و آسمان کی ہر چیز بے شک وشبہ منکشف ہوجائے۔ تو یہ دیدار بھی اسی قبیل سے ہے اور امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عوام میں سے ہر وہ شخص جو کچھ خواب میں دیکھتا ہے اسے خواص حالت بیداری میں پاتے ہیں اور عوام جو کچھ محنت و مشقت سے حاصل کرتے ہیں اولیاء کرام ان کو اللہ تعالیٰ کی موہبت یعنی عطا سے پاتے ہیں۔ "وَاللّٰہُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَھُوَ یَھْدِی السَّبِیْلَ۔"

تنبیہ۔ اگرچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب میں دیدار سے مشرف ہونا حق و ثابت ہے لیکن علماء فرماتے ہیں کہ خواب میں جو کچھ از قبیل احکام سنے اس پر عمل نہ کرے۔ یہ اس بنا پر نہیں کہ رؤیت میں کوئی شک و تردد ہے بلکہ اس لئے ہے کہ خواب میں یعنی نیند کی حالت میں ضبط و حفظ ناپید ہے۔ جیسا کہ علماء فرماتے ہیں اور احکام سننے سے مراد ایسے شرعی احکام ہیں جو دین و شریعت کے مخالف ہوں (ان پر عمل نہیں کیا جائے گا) ورنہ بعض وہ علوم جو اس قبیل سے نہیں ہیں ان کے ماننے اور ان پر عمل کرنے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ کیونکہ بکثرت محدثین کرام نے احادیث کریمہ کی تصحیح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے اور عرض کیا ہے کہ کیا فلاں حدیث آپ سے روایت کی گئی۔ اس پر حضور نے فرمایا ہاں یا نہیں۔ اور بیداری میں رؤیت سے بھی بعض مشائخ نے استفادۂ علوم کیا ہے۔ (واللہ اعلم)

اسم مبارک پر نام رکھنا۔ انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک پر نام رکھنا مبارک و نافع اور دنیا و آخرت میں حفاظت میں لینے والا ہے۔ چنانچہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بارگاہ حق میں دو بندے کھڑے کئے جائیں گے اس پر حق تعالیٰ انہیں جنت میں داخل کرنے کا حکم فرمائے گا۔ یہ دونوں بندے عرض کریں گے اے خدا کس چیز نے ہمیں جنت کا اہل اور مستحق بنایا حالانکہ ہم نے کوئی نیک عمل نہیں کیا بجز اس کے کہ تیری رحمت سے ہم جنت میں جانے کے امیدوار تھے۔ اس پر اللہ رب العزت جل وعلا فرمائے گا جنت میں داخل ہوجاؤ۔ اس لئے کہ ہم نے اپنی ذات کی قسم اپنے اوپر لازم کرلیا ہے کہ میں اسے ہرگز جہنم کی آگ میں نہ بھیجوں گا جس کا نام احمد یا محمد ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا مجھے قسم ہے اپنی عزت و جلال کی کسی ایک پر عذاب نہ کروں گا جس کا نام تمہارے نام پر ہے۔ سیدنا علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ فرمایا کوئی دسترخوان نہیں ہے کہ بچھایا گیا ہو اور اس پر لوگ کھانے کے لئے آئیں اور ان میں احمد یا محمد کے نام والے ہوں مگر یہ کہ حق تعالیٰ اس گھر کو جس میں یہ دسترخوان کھانے کا بچھایا گیا ہو اسے روزانہ دو مرتبہ پاک نہ فرمائے۔ اسے ابو منصور دیلمی نے روایت کیا۔ نیز یہ بھی مروی ہے کہ کوئی گھر نہیں ہے جس میں محمد نام والے ہوں مگر یہ کہ حق تعالیٰ انہیں برکت دے۔ ایک حدیث میں ہے جو قوم کسی مشورہ کے لئے جمع ہوئی اور ان میں کوئی شخص ایسا موجود ہے جس کا نام محمد ہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ ان کے کام میں برکت عطا فرمائے گا۔ ایک حدیث میں یہ بھی ہے

کہ جس کا نام محمد ہو گا حضور اس کی شفاعت کریں گے اور جنت میں داخل کرائیں گے۔ امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

فان لی ذمتہ منہ تبسمیتی   محمداوھواوفی الخلق بالذمم

صاحب مدارج النبوۃ نے ایک مرتبہ خواب میں حضور غوث الثقلین رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا کہ ان کے سامنے کھڑے ہیں۔ حاضرین مجلس نے عرض کیا کہ محمد عبدالحق (محدث دہلوی رحمہ اللہ) سلام عرض کر رہے ہیں۔ حضور غوث پاک کھڑے ہو گئے اور معانقہ فرمایا اور فرمایا کہ تم پر آتش دوزخ حرام ہے۔ بظاہر یہ بشارت اسی نام رکھنے کی برکت کے نتیجہ میں ہے۔ کیونکہ علماء کا اس پر اتفاق ہے۔ بعض علماء اسم مبارک اور آپ کی کنیت دونوں کو جمع کر کے نام رکھنے کو منع فرماتے ہیں اور ایک ایک کر کے رکھنے کو جائز کہتے ہیں (یعنی یا تو ابو القاسم نام رکھو یا محمد نام رکھو) یہ قول زیادہ صحیح ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں کئی مذہب ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ مطلقاً ممنوع ہے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ مطلقاً جائز ہے اور تیسرا مذہب یہ ہے کہ ابو القاسم نام رکھنا اس شخص کے لئے جائز ہے جس کا نام محمد نہیں ہے۔ اور جو حضرات مطلقاً جائز کہتے ہیں وہ ممانعت والی حدیثوں کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کی حالت کے ساتھ مخصوص و مقید کرتے ہیں۔ یہ قول اقرب الی الصواب ہے۔ (انتہی)۔

بارگاہ نبوی میں بلند آواز کی ممانعت۔ انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حدیث رسول پڑھتے وقت غسل کرنا اور خوشبو ملنا مستحب ہے۔ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے وقت آواز کو پست کیا جائے۔ جس طرح کہ حالت حیات طیبہ میں جب گفتگو ہوتی تو آواز پست رکھی جاتی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ   اے ایمان والو نبی کی آواز سے اپنی آوازوں کو نہ بلند کرو۔

اس لئے کہ آپ کا کلام اور حدیث پاک مروی و ماثور ہے اور یہ آپ کے بعد عزت و رفعت میں آپ ہی کی آواز کی مانند ہے۔ اور یہ بھی لازم ہے کہ کسی اونچی اور بلند جگہ پر پڑھا جائے۔

حضرت مطرف سے مروی ہے کہ جب لوگ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آتے تو پہلے باندی کو باہر بھیج کر دریافت کراتے کہ شیخ سے کیا چاہتے ہو؟ آیا حدیث پاک یا مسائل شرعیہ؟ اگر لوگ مسائل کہتے تو فوراً باہر تشریف لے آتے۔ اور ان کو مسائل تعلیم فرماتے ایک اور روایت میں یہ ہے کہ آپ اندر ہی سے مسائل کے جواب بھیج دیتے اور اگر لوگ حدیث پاک سننے کی استدعا کرتے تو پہلے آپ غسل خانے میں جاتے غسل کرتے سفید لباس پہنتے، سر پر عمامہ باندھتے۔ چادر اوڑھتے، خوشبو لگاتے، کرسی رکھی جاتی پھر آپ باہر تشریف لاتے اور کرسی پر جلوس فرماتے۔ اور عود و عنبر کی دھونی لگائی جاتی اور خشوع و وقار کے ساتھ حدیث مبارک پڑھتے حالانکہ قرات حدیث مبارک فرمانے کے سوا آپ کرسی پر نہ بیٹھا کرتے تھے۔ علماء بیان کرتے ہیں کہ امام مالک رحمہ اللہ نے یہ روش حضرت سعید بن مسیّب سے حاصل فرمائی تھی۔

حضرت قتادہ اور مالک اور دوسری جماعت بے وضو قرات حدیث کو مکروہ جانتے ہیں۔ حضرت اعمش کی تو یہ عادت تھی کہ جب یہ بے وضو ہو جاتے تو تیمم لیتے تھے۔ اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک، حدیث پاک، اسم مبارک اور آپ کی سیرت پاک کے سننے کے وقت ویسا ہی احترام، تعظیم، اور توقیر لازم ہے۔ جیسی کہ آپ کی مجلس مبارک کی حاضری میں تھی۔

کسی آنے والے کی خاطر قرات حدیث کے وقت کھڑا نہیں ہو جانا چاہئے اس لئے کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب و احترام پر دوسرے کو ترجیح ملتی ہے۔ اور یہ کہ غیر کی طرف متوجہ ہونے سے آپ کی حدیث میں رکاوٹ لازم آتی ہے۔ خاص کر فساق و فجار اور مبتدع لوگوں کے لئے تو ہر گز نہ کھڑا ہو۔ سلف صالحین کی یہ عادت مستمرہ تھی کہ احترام حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر نہ حدیث میں قطع کرتے اور نہ حرکت کرتے اگرچہ انکے جسموں پر کوئی آفت یا ضرر ہی کیوں نہ پہنچتا۔ منقول ہے کہ ایک مرتبہ امام مالک رحمۃ اللہ کے جسم مبارک پر بچھونے سترہ مرتبہ ڈنک مارا مگر آپ نے جنبش تک نہ کی اور صبر و تحمل فرماتے ہے۔ اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر کی خاطر حدیث کو قطع نہ کیا۔ اسے ابن الحاج نے "المدخل" میں بیان کیا ہے۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ ہر وہ شخص جس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک لمحہ کے لئے ملاقات کی یا آپ کی مجلس مبارک میں بیٹھا اور ایک لحظہ اور ایک نظر جمال مبارک کو دیکھا اس کے لئے صحابیت ثابت ہے۔ علماء اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں لکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عرف و عادت میں تو طویل عرصہ رہنے اور عرصہ دراز تک ہم نشینی حاصل ہونے کو مصاحبت کہتے ہیں مگر یہاں ایک لحظہ اور ایک نظر بھی میسر آ جائے تو صحابیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور بقول صحیح و مختار ایسے ہی کو صحابی کہتے ہیں۔

علماء نے بکثرت ایسے خصائص کا بھی ذکر کیا ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام کے درمیان مشترک ہیں۔ مثلاً نیند سے وضو کا نہ ٹوٹنا اور شیطان کا متمثل نہ ہونا اور جماہی وغیرہ کا نہ آنا وغیرہ۔ ممکن ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یک نظر جمال انور دیکھنے اور صحبت اختیار کرنے سے نورانیت اور کمال حاصل ہو جاتا ہو ۔ اور یہ صفات ان میں ظاہر ہو جاتی ہوں۔ جیساکہ کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی محض ایک نظر مبارک کی یہ تاثیر ہے کہ بیوقوف و نادان پر پڑ جائے تو وہ حکمت و دانائی کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ اور قوت القلوب میں ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال جہاں آرا پر ایک نظر پڑنے سے ایسا کچھ نظر آنے لگتا ہے اور ایسے ایسے انکشافات ہونے لگتے ہیں جو متعدد چلوں اور مراقبوں سے نہیں حاصل ہو سکتے۔ حضور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ایسے خصائص و معجزات ہیں جو کسی دوسرے نبی میں نہ تھے۔ اسے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں شمار کیا ہے۔

نیز یہ بھی منجملہ خصائص میں سے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہ کرام عادل ہیں کیونکہ ان کی مدح و تعدیل میں کتاب و سنت واضح طور پر شاہد ہیں ان کی عدالت میں کسی ایک کے بارے میں بھی کسی کو کلام نہیں ہے۔ جیساکہ حدیث کے تمام راویوں میں تنہا صحابی کی (منفرد) روایت کو فرد و غریب نہیں کہتے۔ بلکہ صحابہ کے بعد تابعین اور ان کے بعد کے راویوں میں فرد و غریب بولا جاتا ہے۔ اہل سنت و جماعت کا تمام صحابہ کے عادل ہونے پر اجماع ہے اگرچہ ان میں سے بعض پر فتنوں اور شورشوں کی نسبت ہے۔ حسن ظن کی بنا پر کہتے ہیں کہ شورشیں اور فتنے ان کے اجتہاد اور تاویل میں خطا واقع ہونے کی بنا پر ہوئے ہوں گے۔ ان کے فضائل و کمالات میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ حضور کے اوامر و نواہی کو غایت درجہ بجا لاتے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں حاضر رہتے۔ غزوہ جہاد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب رہتے، ممالک و اقالیم کو فتح کرتے، لوگوں میں احکام و ہدایت کرتے، نماز و روزہ اور زکوۃ وغیرہ عبادات میں ہمیشہ مشغول رہتے اس میں کوئی اشتباہ نہیں پایا جاتا۔ ان صحابہ کرام میں جرات و شجاعت، بخشش و کرم اور اخلاق حمیدہ کے ایسے صفات کمال تھے کہ گزشتہ امتوں میں سے کسی امتی کو حاصل نہ تھے۔

نیز جمہور علماء کا مذہب ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین خیار امت اور افاضل ملت ہیں اور ان کے بعد والوں میں سے کوئی ایک بھی ان کے مرتبہ و مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور بعض علماء نے جیسے حضرت ابن عبداللہ (جو کہ مشہور محدثین میں سے ہیں) اور

ان کی مانند اوروں نے بھی ان کے بارے میں یہی کہا ہے کہ اس جماعت میں وہ کون ہوگا جو ان کے بعد آئے۔ اور ان کے کمالات علمی و عملی میں ان سے افضل ہو؟ بعض صحابہ سے ارتکاب گناہ کبیرہ ہوا۔ اور ان پر حد شرعی قائم کی گئی۔ ابن عبد اللہ نے ان حدیثوں سے استدلال کیا۔ جو آخر امت کی فضیلت میں وارد ہوئی ہیں۔ اور بعض محدثین کہتے ہیں کہ صحابہ کی افضلیت اور سب سے بہتر ہونے کی فضیلت ان صحابہ کبار کے ساتھ خاص ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں طویل عرصے حاضر رہے۔ اور انہوں نے حضور سے بہت استفاضہ اور استفادہ کیا۔ قول مختار پہلا ہی قول ہے۔ اور حق یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رؤیت کی فضیلت اور یقین کا حاصل ہونا اور بالمشاہدہ ایمان سے مشرف ہونا صحابہ کرام ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ کوئی دوسرا ایسی فضیلت نہیں رکھتا۔ اور وہ حدیثیں جو آخر امت کی فضیلت میں وارد ہیں ان کی حیثیت اور ہے۔ کیونکہ ان کا ایمان بالغیب ہے جیسا کہ "یؤمنون بالغیب" (بے دیکھے ایمان لائیں) کی تفسیر میں مفسروں نے بیان کیا ہے۔ (واللہ اعلم)

انہیں خصائص میں سے یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ مصلی یعنی نماز پڑھنے والا نماز میں یا درود و سلام بھیجنے والا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو صیغہ خطاب سے اپنے قول میں السلام علیک ایہا النبی " سے مخاطب کرتا ہے۔ آپ کے سوا کسی اور کو ایسے صیغہ خطاب سے مخاطب نہیں کرتا۔ اگر اس خطاب سے یہ مراد ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور پر خاص کر کے سلام بھیجنا واقع نہیں ہوا ہے تو یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس حدیث مبارک کے موافق ہے جس میں مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جب ہم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتے تھے تو ہم کہتے "السلام علیٰ اللہ، السلام علیٰ جبریل، السلام علیٰ میکائیل، السلام علیٰ فلان۔" پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو اپنا رخ انور ہماری طرف پھیر کر فرمایا "السلام علیٰ اللہ" نہ کہو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ خود سلام ہے یعنی ہر نقص و خوف سے وہ سالم و محفوظ ہے۔ اور بندوں کے لئے ہر نقص و خوف سے سلامتی بخشنے والا ہے اور اس پر ایسا سلام جو خوف و احتیاج کا وہم پیدا کرتا ہے بے معنی ہے۔ لہٰذا جو کوئی تم میں سے نماز کے قعدہ میں بیٹھے تو وہ کہے کہ "التحیات للہ والصلوات والطیبات السلام علیک ایہا النبی ورحمۃ اللہ برکاتہ السلام علینا وعلیٰ عباد اللہ الصالحین۔" جب بندے نے یہ کلمات کہے تو خدا کے ہر صالح بندے کو خواہ آسمان میں ہو یا زمین میں سلام پہنچتا ہے۔ (آخر حدیث تک) لہٰذا اس جگہ خصوصیت کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام کا پیش کرنا واقع ہے اور دوسروں کو عمومیت کے زمرہ میں رکھا ہے۔ اور اگر "التحیات" میں باوجود غیبوبت نظر کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صیغۂ خطاب سے سلام عرض کرنا خصائص سے مراد لیں تو اس کی بھی ایک وجہ ہے۔ وہ یہ کہ علماء فرماتے ہیں چونکہ شب معراج میں صیغۂ خطاب سے رب العزت جل وعلا کی جانب سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وارد ہوا تھا اس کے بعد اسی صیغہ کو بحالہ برقرار رکھا گیا۔ اور "کرمانی شرح صحیح بخاری" میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رخصت کے بعد صحابہ کرام السلام علی النبی کہتے تھے نہ کہ صیغۂ خطاب سے (واللہ اعلم)۔

بعض عرفاء کے کلام میں واقع ہوا ہے کہ نمازی کا التحیات میں صیغہ خطاب سے حضور پر سلام عرض کرنا حضور اکرم ﷺ کی روح مقدس کے شہود و ملاحظہ کرنے اور تمام موجودات زواری (زائرین) میں روح مقدس کے سرایت کرنے خصوصاً نمازیوں کی روحوں میں جلوہ فگن ہونے کی بنا پر ہے غرضیکہ نماز کی حالت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہود و حضور اور وجودِ گرامی سے جلوہ فگن ہونے سے غافل و بے خبر نہ رہنا چاہئے۔ اور امید رکھنا چاہئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پر فتوح پر فیوضات وارد ہوں۔ اور انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ ہر اس شخص پر واجب ہے جسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پکاریں کہ وہ جواب میں حاضر ہو۔ اگرچہ وہ نماز میں ہو جیسا کہ سعید بن معلیٰ رضی اللہ عنہ کی حدیث شاہد و ناطق ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ میں نماز میں تھا کہ حضور

انور صلی اللہ علیہ وسلم نے پکارا میں نے جواب نہیں دیا۔ پھر میں نے نماز کے بعد بارگاہ قدس میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ میں نماز میں تھا جواب عرض نہ کر سکا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ۔

اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ اللہ اور رسول کے بلانے پر حاضر ہو جب رسول تمہیں اس چیز کیلئے بلائیں جو تمہیں زندگی بخشے گی

لہٰذا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجابت فرض ہے اور اس کے ترک سے گنہگار ہوتا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ نماز باطل ہو جاتی ہے یا نہیں؟ تو "صاحب مواہب" فرماتے ہیں کہ علماء شوافع اور دیگر حضرات نے یہ تصریح کی ہے کہ نماز باطل نہیں ہوتی۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ باطل ہو جاتی ہے بہرحال حدیث سے کوئی چیز معلوم نہیں ہوتی۔ (واللہ اعلم)

انہیں خصائص میں یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنا دوسروں پر جھوٹ باندھنے کے برابر نہیں ہے۔ لہٰذا جو شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھے اس سے کبھی بھی کوئی روایت قبول نہیں کی جاتی۔ اگرچہ وہ جھوٹ سے توبہ کر لے جیسا کہ محدثین کی ایک جماعت نے بیان کیا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھا اس پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کو بھیجا اور فرمایا "جاؤ اگر وہ تمہیں مل جائے تو اسے قتل کر دو۔" شیخ محمد جوینی جو کہ امام الحرمین کے والد ہیں وہ اس طرف گئے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر قصداً جھوٹ باندھنا کفر ہے۔ لیکن ان کے اس قول میں ائمہ کرام نے موافقت نہیں کی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنا عظیم ترین بدی اور گناہِ کبیرہ ہے مگر کافر نہیں ہوتا۔ جب تک کہ وہ اسے حلال نہ جانے اور توبہ اگر صحیح ہو اور اس کے آثار و قرائن ظاہر و عیاں ہوں تو مقبول ہے اور شہادت و روایت کے درمیان فرق نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہر قسم کے گناہ خواہ کبیرہ ہوں یا صغیرہ۔ عمداً ہوں یا سہواً ہر ایک سے معصوم ہیں۔ یہی مذہب مختار ہے اور ایسی ہی عصمت تمام انبیاء علیہم السلام میں ہے۔ اس کی تفصیل علم کلام کی کتابوں میں ہے۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جنون، دیوانگی اور طویل بے ہوشی کی نسبت جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ عیب و نقص ہے۔ اسی طرح تمام نبیوں پر بھی یہ جائز نہیں ہے۔ علامہ سبکی علیہ الرحمتہ نے اس پر تنبیہہ فرمائی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی بے ہوشی دوسروں کی بے ہوشی کے برخلاف ہے اور یہ کہ درد و الم کا غلبہ ظاہری حواس پر ہوتا ہے نہ کہ دل پر۔ اس لئے کہ حدیثوں میں آیا ہے کہ ان کی آنکھیں محو خواب ہوتی ہیں نہ کہ ان کے دل۔ جب کہ ان کے دلوں کو نیند و خواب سے جو کہ بے ہوشی سے بہت ہی ہلکا اور سبک تر ہے۔ اس سے محفوظ رکھا گیا ہے تو بے ہوشی سے وہ بطریق اولیٰ محفوظ ہوں گے۔ نیز علامہ سبکی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہ السلام پر نابینائی یعنی آنکھوں کی روشنی کا زائل ہو جانا بھی جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ نقص و عیب ہے اور کوئی نبی بھی اعمیٰ و نابینا کبھی نہیں ہوئے اور وہ جو حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے میں مذکور ہے وہ ثابت نہیں ہے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے چشم مبارک پر پردہ آ گیا تھا جس نے روشنی کو ڈھانپ لیا تھا۔ امام فخرالدین رازی، ارشاد باری تعالیٰ "وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ" (ان کی آنکھیں غم سے سفید ہو گئیں) کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ "ان پر گریہ و بکا غالب ہو گیا اور غلبہ گریہ و بکا کے وقت ان کی آنکھ میں بہت پانی آ جاتا گویا کہ وہ سفید ہو گئیں۔ اور وہ سفیدی پانی سے تھی۔ یہ اس قول کی صحت پر دلیل ہے۔ کیونکہ غلبہ بکا میں غم اثر انداز ہوتا ہے نہ کہ نابینائی کے حصول میں۔ اس کے بعد امام فخرالدین رازی فرماتے ہیں کہ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ کیا وہ کلیتہً نابینا ہو گئے تھے۔ بعد ازاں حق تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیض مبارک سر مبارک پر ڈالتے وقت

بصارت واپس لوٹادی تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ کثرتِ بکاو حزن سے ان کی بصارت کمزور ہوگئی تھی۔ اور وہ بصارت کی کمزوری کو محسوس فرماتے تھے۔ پھر جب حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص مبارک ان کے چہرۂ انور پر ڈالی گئی توان کی بصارت قوی ہوگئی اور کمزوری جاتی رہی۔ (انتہیٰ کلامہ)۔

علامہ سبکی علیہ الرحمۃ نے نابینائی کے جائز نہ ہونے کی علت اس کا نقص و عیب ہونا قرار دیا ہے۔ توانبیاء علیہ السلام پر ایسے مرض میں مبتلا ہونا جو نقص و عیب ہیں ان کے اطلاق پر بھی یہ حکم داخل ہے۔ خصوصاً وہ ابتلاء وامتحان جو حضرت ایوب علیہ السلام کے بارے میں عارض ہیں (ان کے لئے ایسے مرضوں کی نسبت جو موجب نقص و عیب ہیں، جیسے کوڑھ، جذام، نابینائی، ان کا گھوڑے پر ڈالنا وغیرہ ان سب کی نسبت جائز نہیں ہے کیونکہ یہ سب امراض منافی شان نبوت اور موجب نقص ونفرت ہیں انبیاء علیہم السلام ان سب باتوں سے معصوم ہیں۔ فافہم۔ مترجم) اسی طرح حضرت شعیب علیہ السلام کی نابینائی کا قصہ باوجود عدم ثبوت کے ان سے اس کی نسبت کرنا سراسر تحکم اور دیدہ دلیری ہے۔ البتہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بصارت کے بارے میں صحیح ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے فرمایا "فَارْتَدَّ بَصِيرًا" (توان کی بصارت لوٹ آئی۔) مقاتل فرماتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے چھ سال تک نہیں دیکھا حتیٰ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص سے ان کی بصارت واپس آئی۔ امام فخرالدین رازی کا قول ہے کہ تاثیر حزن غلبہ بکا میں ہے نہ کہ حصول عمیٰ میں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ تاثیر حزن غلبۂ بکا میں ہے اور تاثیر غلبۂ بکا عمیٰ میں ہے۔ لہٰذا تاثیر حزن کے واسطہ سے عمیٰ میں ہوگیا۔ مشہور ہے کہ کوئی نبی گونگا نہ ہوا۔ البتہ ان میں سے بعض اعمیٰ ہوئے ہیں (واللہ اعلم)

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ جو بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دشنام دیتا ہے یا کسی قسم کی تنقیص وتوہین کرتا ہے خواہ صراحۃً ہو یا کنایۃً اس کا قتل کرنا واجب ہے اس میں سب کا اتفاق ہے۔ البتہ اختلاف اس میں ہے کہ یہ قتل کرنا بہ طریق حد ہے۔ اور فی الفور قتل کردینا چاہئے اور اس سے توبہ کا مطالبہ نہ کرنا چاہئے۔ یا بہ طریقِ ردّت یعنی مرتد ہوجانے کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ مرتد سے توبہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اور اگر توبہ کرے تو بخش دیا جاتا ہے مگر پہلا قول مختار ہے اور یہ اس تقدیر پر ہے کہ وہ مسلمان ہو اور اگر کافر ہے اور اسلام لے آئے تو درگزر کیا جائے گا۔ یہ بحث آخر کتاب میں تفصیل سے آئے گی۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم احکام میں جس کے لئے جو چاہیں تخصیص فرمادیں۔ اس جگہ دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف احکام مفوض ہونگے۔ (یعنی تفویض احکام میں آپ مختار ہوں گے۔) جو چاہیں آپ حکم فرمادیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ کسی حکم کے لئے جدا وحی آتی ہوگی۔ چنانچہ حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کے لئے تخصیص فرمائی کہ ان کی ایک شہادت دو شہادتوں کا حکم رکھتی ہے۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک بدوی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گھوڑا خریدا تھا پھر وہ بدوی گھوڑے کی فروختگی سے منکر ہوگیا۔ اور کہنے لگا کہ کوئی ایسا گواہ لاؤ جو یہ گواہی دے کہ میں نے اسے آپ کے ہاتھ فروخت کیا ہے۔ جو بھی مسلمان آتا وہ بدوی سے کہتا "افسوس ہے تجھ پر۔ خدا کا نبی نہیں فرماتا مگر حق۔" لیکن بدوی کسی کی نہ مانتا۔ یہاں تک کہ حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ آئے اور انہوں نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ تو نے فروخت کیا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے خزیمہ رضی اللہ عنہ تم کیسے گواہی دیتے ہو حالانکہ میں نے تمہیں گواہ نہیں بنایا اس پر انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ ہم آپ کی آسمان کی باتوں کی تصدیق کرتے ہیں تو کیا ہم اس بدوی پر تصدیق نہ کریں۔ بنابریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کی گواہی کو دو گواہوں کے برابر قرار دیا۔ اور اس فضیلت میں انہیں مخصوص فرمایا۔ خطابی کہتے ہیں کہ اس حدیث کو بہت سے لوگوں نے غیر محل پر محمول کیا ہے اور اہل بدعت کے ایک گروہ نے اپنے کسی معروف وجانے پہچانے

شخص کی گواہی کو حلال بنانے میں ذریعہ بنایا ہے۔ مطلب یہ کہ ان کے نزدیک وہ شخص معروف جو بھی دعویٰ کرے وہ صادق (بلاثبوت شرعی سچا) ہے۔ حالانکہ حدیث کی وجہ یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے بدوی پر اس کے اپنے علم پر حکم فرمایا اور حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کی گواہی کو اپنے قول کی تاکید اور مخالف پر حصول غلبہ کے قائم مقام بنایا اس بنا پر معنی میں دو گواہوں کے حکم میں ہو گیا۔ (فافہم)

اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ام عطیہ رضی اللہ عنہا کو جو فضلائے صحابیات میں سے ہیں بعد نزول آیۂ مبایعتِ نساء کیونکہ اس جگہ واقع ہے "ولا یعصینک فی معروف۔" (نیکی میں نافرمانی نہ کرنا) انہیں نوحہ کی رخصت عطا فرمائی۔ چنانچہ انہوں نے عرض کیا "یارسول اللہ آل فلاں" (یعنی فلاں قبیلہ) زمانۂ جاہلیت میں نیاحت پر میری مدد کرتی تھیں۔ اب مجھے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں بھی ان کے ساتھ موافقت کروں اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ام عطیہ رضی اللہ عنہ کو نیاحت میں رخصت دی۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ ام عطیہ رضی اللہ عنہ کو رخصت عطا فرمانا اور نیاحت میں (خاص فلاں قبیلہ کے لئے) انہیں مخصوص کرنا ہے اور شارع کو یہ حق پہنچتا ہے کہ جس کے لئے جو چاہے خاص فرمادے۔

اسی طرح حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کو ان کے شوہر حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے سوگ کو ترک کرنے پر انہیں رخصت عطا فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا تین دن تک ماتمی لباس پہنو اور سوگ کرو۔ اس کے بعد جو چاہو کرو۔

اسی طرح حضرت ابوبردہ بن نیار کو قربانی کے لئے جذعہ بزغالہ یعنی بکری کے اس بچہ کو جس پر سال پورا نہ ہوا تھا اس کی قربانی دینے کو جائز قرار دیا۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا جو نماز عید سے پہلے قربانی کرے گا اس کی قربانی شمار نہ ہوگی۔ حضرت ابوبردہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا "یارسول اللہ میں ایک بکری رکھتا تھا میں نے اس کے ذبح کرنے میں جلدی کی (یعنی نماز عید سے پہلے ذبح کر دیا) اور عرض کیا کہ میں نے خیال کیا کہ چونکہ آج کا دن کھانے پینے کا ہے تو میں نے اپنے اہل و عیال اور اپنے ہمسایوں کو کھلا دیا اب میرے پاس سوائے بزغالہ کے کوئی جانور نہیں ہے مگر وہ بزغالہ (ایک سال سے کم بکری کا بچہ) فربہ اور دنبہ سے بہتر گوشت رکھتا ہے کیا میری طرف سے اس کی قربانی کفایت کرے گی۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہاری طرف سے وہ کفایت کرلے گا مگر تمہارے سوا دوسروں کے لئے نہیں۔

اسی طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کا نکاح ایک مرد سے اس چیز کے مقابلہ میں جو وہ مرد قرآن سے رکھتا تھا جس کا ذکر قرآن پاک میں اس طرح ہے کہ "اِمْرَأَةً وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ ۔" ایک عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں نے آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہبہ کر دیا۔ حالانکہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جائز تھا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول نہ فرمایا۔ پاس ہی ایک مرد مسکین کھڑا تھا اس نے کہا یارسول اللہ اگر یہ عورت آپ کے قابل نہیں ہے تو اس کا عقد میرے ساتھ کر دیجئے۔ فرمایا مہر میں دینے کے لئے کچھ تمہارے پاس ہے۔ کہا میرے پاس اس پہنے ہوئے تہبند کے سوا کچھ نہیں ہے فرمایا تلاش کرو خواہ وہ لوہے کی انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو۔ عرض کیا قرآن مجید کی ان چند سورتوں کے سوا جو کہ یاد ہیں میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ فرمایا قرآن کا جتنا حصہ تجھے یاد ہے اس کے عوض نکاح کرلو۔ تم اسے تعلیم دے دینا اور اسی کو اپنا مہر قرار دے لو۔ حالانکہ تمہارے بعد کسی کے لئے قرآن مہر نہ ہو گا۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دو آدمیوں کے برابر بخار چڑھتا تاکہ اجر و ثواب دونا ملے۔ انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری میں حضرت جبریل علیہ السلام آپ کی عیادت اور احوال شریف کی

پرستش کے لئے تین روز آئے۔ انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ (جو کہ محض صلوٰۃ وسلام عرض کرنا تھا) بغیر امامت کے مسلمانوں کی فوج در فوج نے ادا کی اور یہ کہ بعد از وفات تین دن کے بعد دفن کیا گیا اور آپ کے لحد شریف میں اس قطیفہ کو بچھایا گیا جو آپ کے نیچے بچھا ہوا تھا۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کے لئے جائز نہیں۔ (یعنی نہ بغیر امامت کے نماز جنازہ اور نہ لحد میں کسی چادر وغیرہ کا بچھانا) بعض کہتے ہیں کہ لحد میں قطیفہ یعنی مخملی چادر کا بچھانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام شقران کی جانب سے تھا۔ جس کا صحابہ کو علم نہ تھا یہ اس لئے کہ کوئی اور اس چادر کو اپنے نیچے نہ بچھائے۔ انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد زمین تاریک ہو گئی جیسا کہ اپنے مقام پر اس کی تفصیل آئے گی۔ انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد شریف کو زمین نہیں کھاتی اسی طرح تمام انبیاء علیہم السلام کے اجساد طیبہ کو زمین نہیں کھاتی۔ علماء نے اسے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں ہی شمار کیا ہے۔ حالانکہ بعض اولیاء امت کے بارے میں بھی وہ نقل کرتے ہیں۔ جیسا کہ شیخ علی متقی کی قبر کو ایک خاص تقریب کے موقع پر کھولا گیا تو وہ اسی طرح درست، کفن کے ساتھ باقی تھے۔ وہ تقریب یہ تھی کہ ان کے بھتیجے نے جو کہ جوان اور صالح تھے خواہش ظاہر کی کہ انہیں ان کی قبر میں دفن کریں کیونکہ مکہ معظمہ میں دستور ورواج ہے کہ اموات کو بزرگوں کی قبر میں تبرکاً دفن کرتے ہیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر کو زمین کے نہ کھانے سے ظاہر مطلب یہ ہے کہ یہ حیات طیبہ کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ حیات حضور انور اور تمام انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت، حیات وبقا کی وجہ سے پائی نہیں گئی۔ آپ کا ترکہ آپ ہی کی ملکیت ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ صدقہ ہوتا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ "مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ" ہم جو ترکہ چھوڑیں وہ صدقہ ہے اور اس ترکہ کو انہیں مصارف پر خرچ کیا جائے گا جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم خرچ فرماتے تھے۔ یعنی اہل وعیال، اولاد احفاد، فقراء ووصایا اور مسلمانوں کے مصالح پر خرچ کیا جائے گا۔ جیسا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اس دنیاوی حیات میں خرچ فرمایا کرتے تھے۔ اور یہ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مباح ہے کہ اپنے تمام مال کے لئے وصیت فرمائیں اور آپ کے سوا دوسروں کے لئے تہائی مال کے سوا پر وصیت جائز نہیں ہے۔ یہی حکم تمام انبیاء علیہم السلام کا ہے کہ ان کی میراث نہیں ہوتی۔ اور حق تعالیٰ کے ان ارشادات کا مطلب کہ "وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ۔" (حضرت سلیمان، حضرت داؤد علیہم السلام کے وارث ہوئے) اور ارشاد باری کہ "رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا يَّرِثُنِيْ۔" الخ (اے میرے رب اپنی طرف سے میرا وارث بنا جو میری میراث لے) تو اس وراثت سے ارث نبوت وعلم مراد ہے۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر انور میں زندہ ہیں اسی طرح تمام انبیاء علیہم السلام بھی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اذان واقامت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔

ابن زبالہ اور ابن نجار بیان کرتے ہیں کہ ایام حرہ (یہ وہ زمانہ ہے کہ یزیدی لشکر نے مدینہ منورہ پر حملہ کر کے صدہا صحابہ کو شہید کیا۔ عورتوں کی عصمت دریاں کیں۔ اور مسجد نبوی میں گدھے گھوڑے باندھے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ) کے موقع پر مسجد نبوی شریف میں تین دن تک اذان نہ ہوئی اور لوگ مدینہ چھوڑ کر باہر نکل گئے تھے۔ اس وقت حضرت سعید بن مسیّب مسجد نبوی شریف میں رہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب ظہر کا وقت آیا تو میں متوحش وپریشان ہو گیا اور قبر انور کے پاس چلا گیا اور اذان کی آواز میں نے سنی اور نماز ظہر ادا کی۔ اس کے بعد ہر نماز کے وقت قبر شریف سے اذان واقامت کی آواز سنتا رہا یہاں تک کہ تین راتیں گذر گئیں۔ پھر جب

لوٹ واپس آئے توانہوں نے بھی قبر شریف سے ویسی ہی آواز سنی جیسی کہ میں سنتا رہا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زندہ وحیات پر اتفاق کرنے کے بعد علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ آپ قبر انور میں زندہ ہیں یا کسی خاص مقام میں۔ یا ہر وہ جگہ جہاں خدا چاہے۔ خواہ جنت میں یا آسمان میں یا کسی اور جگہ جیسا کہ مقید، بجائے معین نہ تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ ہم نے آپ کے جسد شریف کو قبر میں رکھا ہے۔ ہم وہاں سے نکلنے پر کوئی دلیل نہیں رکھتے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ آپ اسی بقعۂ انور میں جلوہ افروز ہیں اور اگر کوئی کہے کہ وہ بقعۂ انور تنگ ہے اس میں جسد شریف کا محبوس ہونا مناسب نہیں ہے تو اس کے جواب میں وہ حدیث پیش کریں گے جس میں ہے کہ مومن کی قبر کو ہر جانب ستر گنا کشادہ کر دیا جاتا ہے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر انور کی کشادگی کا کیا اندازہ! اس کی وسعت تو دائرہ قیاس اور وہم وگمان سے بھی باہر ہے۔

اور اگر کوئی یہ کہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمکن واستقرار کے لئے آپ کے بقعۂ قبر سے فردوس اعلیٰ انسب واولیٰ ہے تو اس کے جواب میں کہیں گے کہ قبر شریف سے کون سی جنت بہتر وشریف تر ہوگی (کیونکہ جنت تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کے رہنے کی جگہ ہے) اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اسی جگہ رونق افروز ہیں تو امام تقی الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر اس بقعہ کو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعضائے شریف سے متصل ہے تمام مقامات اور ہر جگہ سے اسے ترجیح وفضیلت دیں حتیٰ کہ کعبہ معظمہ اور عرش عظیم سے بھی فوقیت دیں۔ میں نہیں جانتا کہ اس میں کوئی مومن ومسلمان توقف کرے گا۔

ظاہر طور پر حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث کہ قبر انور سے اذان کی آواز سنی اور شب معراج کی وہ حدیث کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی قبر شریف میں نماز پڑھتے دیکھا اس قول کی تائید کرتی ہیں اور انبیاء علیہم السلام کو شب معراج میں آسمان پر دیکھنے والی حدیث اور دوسری وہ حدیث کہ میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ستر بنی اسرائیل کے ساتھ حج کرتے اور تلبیہ کرتے دیکھا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ ناظر در اطلاق مکان ہے۔

اور اگر کوئی کہے کہ قرآن کریم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موت پر ناطق ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا "اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ" (بیشک تمہیں انتقال فرمانا ہے اور ان کو بھی مرنا ہے) اور حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اِنِّیْ رَجُلٌ مَّقْبُوْضٌ۔" (میں ایک انتقال فرما جانے والا شخص ہوں) اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْمَاتَ" (بلاشبہ محمد مصطفیٰ یقیناً انتقال فرما چکے) اور اس رحلت وموت پر امت کا اجماع ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضور انور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یقیناً موت کا درد والم اور اس کا ذائقہ چکھا اور رحلت فرما گئے لیکن بعد ازاں حق تعالیٰ نے آپ کو زندہ فرما دیا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ میں خدا کے نزدیک اس سے زیادہ مکرم ہوں کہ وہ مجھے قبر میں چالیس دن سے زیادہ رکھے۔ نیز حدیث میں آیا ہے کہ حق تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء کے جسموں کو کھائے لہٰذا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حیات جسمانی، دنیاوی اور اس بدنی حیات کے ساتھ زندہ ہیں جو آپ رکھتے تھے۔ یہ حیات شہداء کی حیات سے زیادہ کامل ہے۔ کیونکہ شہدا کی حیات روحانی اور اخروی ہے۔ اور یہ روح کے لئے ثابت ہے۔ اور حق تعالیٰ قادر ہے کہ ان کی روحوں کے لئے اجسام مثالیہ اس عالم میں پیدا فرمائے یا انہیں بدنوں میں رکھے جو ان کے لئے ظروف کا حکم رکھتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ مسلمانوں کی روحیں سبز پرندوں کے جوف میں ہیں جو عرش کی قندیلوں کے نیچے آسائش پاتے ہیں یا جنت میں۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کی ارواح مقدسہ ان کے انہیں ابدان طیبہ میں لوٹادی جاتی ہیں جو وہ دنیا میں رکھتے تھے۔ ان کے اجسام وابدان نہ بوسیدہ ہوتے ہیں اور نہ خاک بنتے ہیں۔ اور حق تعالیٰ قادر ہے کہ ارواح کو بغیر بدنوں کے محفوظ رکھے۔ لیکن ان کے لئے بدنوں میں وجود رکھنے پر نقل وارد ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ

السلام کا قبر میں نماز پڑھنا۔ کیونکہ نماز ادا کرنا جیتے بدن کا تقاضا کرتا ہے۔ اور وہ صفات جو شب معراج انبیاء علیہم السلام کے بارے میں مذکور ہیں وہ صفات اجسام کی ہیں ان سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ حیات حقیقی ہو جو وہ دنیاوی رکھتے تھے۔ اور کھانے پینے اور جسمانی دیگر ضروریات کی احتیاج جیسا کہ ہم دنیا میں مشاہدہ کرتے ہیں رکھتے ہوں بلکہ برزخ میں ان کے احکام اور ہوں۔ کھانے پینے اور دیگر جسمانی ضرورتوں کی احتیاج امر عادی ہے۔ اور وہاں کا حال بخلاف عادت ہے اور ممکن ہے کہ وہاں روائح و نسائم اور ارزاق وغیرہ روحانی ہوں جیسا کہ شہداء کی شان میں واقع ہوا ہے کہ "يُرْزَقُونَ فَرِحِيْنَ۔ " (رزق دیئے جاتے ہیں خوش ہیں) اور اگر جنتی کھانے دیئے جاتے ہوں تو عجب نہیں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ" يُطْعِمُنِيْ وَ يَسْقِيْنِيْ ۔ " (مجھے وہ کھلاتا ہے اور مجھے وہ پلاتا ہے۔

اب رہا علم و سماع یعنی جاننا اور سننا تو ان حضراتِ قدس کے لئے اس کے ثبوت میں کوئی شک و شبہہ نہیں ہے بلکہ بہ تصریح علماء کرام یہ بات تو تمام مردوں کو حاصل ہے۔ حدیثوں میں آیا ہے کہ نماز پڑھتے تلبیہ کہتے اور ذکر و تسبیح کرتے ہیں۔

اگر کوئی کہے کہ برزخ نہ تو دار العمل ہے اور نہ وہاں احکام شرعیہ کی تکلیف ہے تو یہ اعمال کس لئے کرتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عالم برزخ میں اجر و ثواب کا اجراء ہے اور اس پر دنیاوی احکام مثلاً کثرت عمل اور زیادتی اجر و ثواب کا حکم جاری ہے۔ اور بسا اوقات بغیر تکلیف یعنی مکلف ہوئے بغیر بلحاظ تلذذ و شوق و ذوق اعمال رونما ہوتے ہیں جیسا کہ نوافل و حسنات کا حال ہے۔ وہاں بھی یہی ہے۔ لہٰذا جنت میں تسبیح کریں گے۔ اور قرآن پڑھیں گے۔ چنانچہ قاری قرآن کی شان میں واقع ہے۔ رتل وارتق یعنی تلاوت قرآن کرتے ہوئے بڑھتے چلے جاؤ۔ اور اسی قبیل سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا باب شفاعت کھولنے کے وقت سجدہ فرمانا ہے۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مال آپ کی ملک پر قائم ہے۔ اور آپ کے نفقہ پر وعدہ کیا گیا ہے۔ اور امام الحرمین نے اسے خصائص میں نقل کیا ہے کہ جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوڑا ہے وہ آپ کی ملک پر باقی ہے۔ اور سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ کی نیابت و خلافت کے طریقہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل و عیال و خدام اور آپ کے تمام مصارف پر خرچ کئے جانے پر اتفاق کیا ہے۔ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ آپ کا مال آپ کی ملک پر باقی ہے۔ یہ قول تقاضا کرتا ہے کہ دنیاوی احکام میں آپ کی حیات ثابت ہے۔ نیز حیات شہداء سے آپ کی حیات بہت زائد وارفع ہے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور بعض زوالِ ملک کے قائل ہیں۔ غرض کہ دونوں قسم کے اقوال بر بعنوائے ارشاد نبوی "ماترکناہ صدقہ" ہم جو کچھ چھوڑیں صدقہ ہے۔ حق و صادق ہے۔ واللہ اعلم یہ بحث حیات انبیاء علیہم السلام اور حیات سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی مناسبت سے آگئی ہے۔ ورنہ آخر کتاب میں "باب وفات النبی" میں دونوں باتیں مستقلاً ذکر کی جائیں گی۔ اگرچہ موجب تکرار ہے مگر کوئی مضائقہ نہیں تاکہ یہ مسئلہ موکد و مستحکم ہو جائے۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر انور پر فرشتے مقرر کئے گئے ہیں۔ جو زائر کے صلوٰۃ و سلام کو پیش حضور کرتے ہیں۔ اس حدیث کو امام احمد و نسائی اور حاکم نے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس حدیث کو ان لفظوں کے ساتھ صحیح بتایا ہے کہ إِنَّ لِلّٰهِ مَلٰٓئِكَةً سَيَّاحِيْنَ فِي الْأَرْضِ يُبَلِّغُوْنِيْ عَنْ أُمَّتِي السَّلَامَ۔ بیشک اللہ نے فرشتوں کو زمین میں پھیلا دیا ہے جو میری امت کا سلام میرے حضور لا کر پیش کرتے ہیں۔

اور اصحاب کے نزدیک بروایت عمارہ رضی اللہ عنہ حدیث یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ ایک فرشتہ ہے اسے سماعت کی ایسی قوت عطا فرمائی گئی ہے۔ جو کسی بندے میں نہیں ہے میری امت میں سے جو بھی جہاں بھی مجھ پر صلوٰۃ و سلام بھیجتا ہے وہ فرشتہ اس صلوٰۃ و سلام کو میرے حضور پیش کرتا ہے (صلی اللہ علیہ وسلم)

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور امت کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لئے استغفار یعنی طلب آمرزش کرتے ہیں۔ ابن مبارک نے سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ کوئی دن نہیں ہے مگر یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں صبح و شام امت کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں ان کی علامتوں اور ان کے اعمال سے پہچانتے ہیں۔ اور بعض روایتوں میں آیا ہے کہ فرمایا کہ مجھ پر امت کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں ان میں سے جو بد ہیں انہیں چھپاتا ہوں اور جو نیک ہیں انہیں بارگاہ الٰہی میں پیش کرتا ہوں "چھپانے سے" پیش نہ کرنا مراد ہوگا۔ گویا اس پر سنت الٰہی جاری ہے کہ پیش کرنے کے بعد اعمال ثبت ہو جاتے ہیں۔ اور وہ جو پیش نہیں کئے جاتے وہ درجہ اعتبار سے محو و ساقط کر دیئے جاتے ہیں (فافہم وباللہ التوفیق)

کعب احبار کی حدیث میں ہے کہ ہر صبح و شام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف پر ستر ہزار فرشتے اترتے ہیں اور مزار پر انوار کا طواف کرتے ہیں اور اپنے بازوؤں کو ہلاتے ہیں۔ اور جب حضور اپنی قبر شریف سے (روز قیامت) مبعوث ہوں گے۔ تو ان فرشتوں کے جھرمٹ میں باہر تشریف لائیں گے اور ان سے زفاف کریں گے زفاف کے اصلی معنی "دلہن کو شوہر کے گھر لیجانا" ہے مگر اس جگہ لازم معنی مراد ہیں کہ محبوب کو محب کے حضور لے جایا جائے۔ مطلب یہ کہ فرشتے اپنے جھرمٹ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو درگاہ عزت میں لے جائیں گے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ مسجد نبوی شریف میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا منبر مبارک آپ کے حوض شریف کے اوپر ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ میرا منبر جنت کے ترعہ میں سے ایک ترعہ ہے۔ اور ترعہ کی تفسیر باب یعنی دروازہ سے کی گئی ہے۔ اور بعض نے درجہ سے اور بعض نے باغ کے بلند جگہ ہونے سے کی ہے اور حدیث میں آیا ہے کہ ایک دن سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم منبر شریف پر ایستادہ تھے۔ آپ نے فرمایا اس وقت میرا قدم جنت کے ترعہ میں سے ایک ترعہ پر ہے۔ اور ایک اور روایت میں یہ ہے کہ فرمایا میرا منبر میرے حوض پر ہے۔ دوسری حدیث میں ہے کہ اب میں اپنے حوض کے عقر پر استادہ ہوں۔ عقر اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں سے حوض میں پانی آتا ہے۔ اور اس کی تاویل میں بعض علماء کہتے ہیں کہ "حوض پر منبر ہونا اس سے اس کی جانب قصد کرنے اس سے برکت لینے اور اس کے سامنے اعمال صالحہ کو ہمیشہ بجالانے کی طرف کنایہ ہے تاکہ وہ اس طرح حوض نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر آنے اور اس سے جانفزا شستہ پانی پینے کے سزاوار بنیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ممکن ہے سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس منبر کو جو شرافت بخشی ہے کل قیامت کو تمام خلائق کے رنگ میں اعادہ فرمائیں اور حوض کوثر کے کنارے پر رکھیں رہا اسے "ترعہ جنت فرمانا تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و شان کے اظہار کے لئے اسے کھڑا کریں گے۔ ایک جماعت کی تاویل یہ ہے کہ یہ اس منبر کی خبریں دی جا رہی ہیں جو روز قیامت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قائم کیا جائے گا نہ کہ یہ منبر جو مسجد نبوی شریف میں ہے۔ یہ قول توسیاق لفظ حدیث سے بہت ہی بعید ہے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میرے حجرہ اور میرے منبر کے درمیان جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری ہے۔ اور میرا منبر حوض پر ہے۔ اس ارشاد و کلام کا ظاہر و روشن پہلو اسی منبر شریف کی طرف ہے۔ جو روضہ مقدسہ کی تحدید کے لئے ذکر فرمایا گیا ہے۔ اسی طرح "تاریخ مدنیہ" میں مذکور ہے۔

صاحب مواہب لدنیہ فرماتے ہیں کہ کسی ایک عالم نے اس حدیث کو اپنے ظاہر پر محمول کرنے میں اختلاف نہیں کیا ہے۔ اور یہی حق ہے کیونکہ مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے امور غیب کی جو کچھ خبریں دی ہیں ان پر ایمان رکھنا واجب ہے۔ انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر اور قبر شریف کے درمیان جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری ہے اسے بخاری نے بلفظ

"مابین بیتی ومنبری" روایت کیا ہے اس مقام پر بھی علماء نے بحث کی ہے۔ چنانچہ بعض کہتے ہیں کہ روضہ جنت یعنی جنت کی کیاری سے اس بقعہ شریف کی تشبیہہ مراد ہے۔ نزولِ رحمت اور حصولِ سعادت اس شخص کے لئے جو وہاں ذکر و مجالست کو اختیار کرنے سے حاصل کرے۔ جیسا کہ مسجدوں کو ریاضِ جنت نام رکھنے میں ہے۔ چنانچہ فرمایا "اِذَا مَرَرْتُمْ بِرِیَاضِ الْجَنَّۃِ فَارْتَعُوْا" (جب تم ریاض جنت یعنی مسجدوں سے گزرو تو ان کے آداب کی رعایت کرو) اس اشارہ کا پرتو بھی اسی جانب ہے۔ خصوصاً حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ سعادت نشان میں کہ وہاں سے ثمرات علوم، انوار، اذکار اور مجلس جنت آثار، تمام لوگ حاصل کرتے تھے۔

بعض کہتے ہیں کہ اس مقام میں طاعت و عبادت بجالانا جنت میں پہنچنے کا موجب بنتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے "اَلْجَنَّۃُ تَحْتَ ظِلَالِ السُّیُوْفِ۔" یعنی جنت تلواروں کے سایوں میں ہے۔ اور فرمایا۔ "اَلْجَنَّۃُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّھَاتِ۔" یعنی جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔ مذکورہ دونوں اقوال ضعیف و بعید ہیں۔ اس لئے کہ ریاض جنت سے تشبیہہ نزول رحمت، جنتی باغوں میں پہنچنا اور ان پر ثواب کا مترتب ہونا یہ تمام مسجدوں اور ہر خیر کی جگہوں کو شامل ہے۔ یہ بشارتیں مسجد نبوی شریف اور منبر مبارک کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہیں اور اگر انہیں رحمت خاص اور جنت کے مخصوص باغ کے ساتھ محمول کریں پھر بھی بعد و تکلف سے خالی نہیں ہے۔ حق یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام حقیقت اور اپنے ظاہر پر محمول ہے۔ اور حجرۂ نبوی اور منبر شریف کے درمیان کی جگہ حقیقتاً جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری ہے۔ بایں معنی کہ روز قیامت یہ جنت میں منتقل ہوگا۔ اور زمین کے تمام مقامات کی مانند فنا و ناپید نہ ہوگا۔ جیسا کہ ابن فرحون اور ابن جوزی نے حضرت امام مالک سے نقل کیا ہے اور علما کی ایک جماعت کے اتفاق کو بھی اس کے ساتھ شامل کیا ہے۔ اور شیخ ابن حجر عسقلانی اور اکثر محدثین اسی قول کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور اکابر علماء مالکیہ میں سے ابن ابی جمرہ نے فرمایا ہے کہ احتمال رکھتا ہے کہ یہ بقعہ فی نفسہ جنت کے باغوں کی ایک کیاری ہے جسے وہاں سے دنیا کے اس مقام پر اتارا گیا ہے۔ جیسا کہ حجر اسود اور مقام ابراہیم علیہ السلام کی شان میں واقع ہے اور بعد از قیام قیامت پھر اسے اس کے اصلی مقام میں لے جایا جائے۔ اور نزولِ رحمت اور استحقاق جنت اس مقام کے فضل و علو مرتبت کو لازم و مترتب ہے۔ یا یہ کہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جنت کے ایک خاص پتھر سے مرتبہ جلیلہ امتیازی شان سے عطا فرمایا گیا اسی طرح حبیب خدا احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو روضہ من ریاض الجنتہ سے اختصاص فرمایا گیا۔ اگر وہ ظاہری آنکھوں سے تمام دنیائے ارضی کے اجزاء کی مانند نظر آئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس لئے کہ جب تک انسان اس دنیا میں طبیعت کے کثیف حجابوں اور بشریت کی عادت و خصلت کے حجاب میں محجوب ہے اس وقت تک اس پر اشیاء کی حقیقتوں کا انکشاف اور امور آخرت کا ادراک اس سے ممکن نہیں۔ اور تمہیں یہ وہم نہ کرنا چاہئے کہ جب اس بقعۂ طیبہ کی حقیقت "روضۃ من ریاض الجنتہ" ہے تو تشنگی و برہنگی وغیرہ دور ہونا جنت کے خواص اور لوازم میں سے ہے اس جگہ میں نہ ہو جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا۔

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ بیشک تمہارے لئے جنت میں نہ بھوک ہوگی نہ برہنگی۔

اس لئے کہ ممکن ہے کہ لوازم جنت نے اس بقعہ کے اخراج کے بعد انتقال و جدائی کی صورت قبول کرلی ہو، لہٰذا حجر اسود اور مقام ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کیا کہوگے۔ اس جگہ بھی تو یہ آثار ظاہر نہیں ہیں۔

اگر تم یہ کہو کہ اس قسم کی باتیں بغیر سماع و خبر (حدیث) ثابت نہیں ہوتیں چونکہ رکن یعنی حجر اسود اور مقام ابراہیم علیہ السلام کے لئے دلائل و شواہد بطریق تعبد و تسلیم واقع و موجود ہیں ان پر ایمان لانا واجب ہوگیا۔ اور ان کے سوا میں ایسا نہیں ہے تو جواب میں ہم کہیں گے کہ دلیل و شہادت خبرِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا نہیں ہے۔ اسی طرح روضہ شریف اور منبر مبارک کا حال بھی

معلوم ہوا ہے۔ اگر اس جگہ تاویل ہو سکتی ہے تو یہ دونوں جگہ ممکن ہے۔ اور اگر حقیقت کی جانب لے جاتے ہو تو بھی یہ دونوں جگہوں میں ثابت ہے۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے سب سے پہلے قبر انور شق ہوگی اور سب سے پہلے باہر تشریف لائیں گے۔ اور مبعوث ہوں گے۔ مطلب یہ کہ روزِ قیامت موقف میں حاضر ہوں گے۔ اور آپ ہی وہ پہلے شخص ہوں گے جو "پل صراط" سے گذریں گے۔ اور آپ ہی وہ پہلے شخص ہوں گے جو جنت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں روز قیامت جنت کے دروازہ پر آؤں گا اور اسے کھلواؤں گا۔ پھر خازن جنت کہے گا "بِکَ أُمِرْتُ لَا أَفْتَحُ لِأَحَدٍ قَبْلَکَ" مجھے آپ ہی کے لئے حکم دیا گیا ہے کہ میں آپ سے پہلے کسی کے لئے باب جنت نہ کھولوں۔ اور ممکن ہے کہ "بِکَ" میں باقسم کے لئے ہو۔ یعنی قسم ہے مجھے آپ کی الخ یہ معنی احسن اور ذائقہ محبت میں زیادہ لذیذ ہیں۔ اور آپ ہی وہ پہلے شخص ہیں جو جنت میں سب سے پہلے داخل ہوں گے اور آپ ہی سب سے پہلے شفاعت کا دروازہ کھولیں گے۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم براق پر سوار محشور ہوں گے۔ اور آپ کو جنت کے نفیس ترین جوڑوں میں سے سب سے اعلیٰ خلعت ولباس عطا فرمایا جائے گا۔ دوسری حدیث میں ہے کہ روزِ قیامت لوگ محشور ہوں گے۔ اس وقت میں اور میری امت "رتل" یعنی مقام بلند پر ہوں گے۔ اور حق تعالیٰ مجھے سبز حلہ (جوڑا) پہنائے گا۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مقام عرش پر اس جگہ کھڑے ہوں گے جہاں کوئی بھی کھڑا نہ ہوا ہوگا اور اس پر اگلے پچھلے رشک وغبطہ کریں گے۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو "مقام محمود" عطا فرمایا جائے گا۔ مجاہد جو کہ آئمہ تفسیر سے ہیں کہتے ہیں کہ اس سے مراد، عرش پر جلوس فرمانا ہے اور عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "کرسی" پر جلوس فرمانا ہے تفسیر بیضاوی میں کہا گیا ہے کہ یہ مقام وہ ہے کہ جو بھی وہاں کھڑا ہوگا اور آپ کو پہچانے گا آپ کی تعریف وثنا کرے گا۔ یہ مطلقاً ہر مقام کے لئے ہے۔ گویا آپ جہاں بھی قیام فرمائیں گے وہی مقام کرامت وبزرگی کو شامل ہے۔ لیکن مشہور یہ ہے کہ یہ مقام شفاعت ہے اس پر مزید بحث آپ کے ان فضائل کے ضمن میں آئے گی۔ جو انشاء اللہ آخرت میں ظہور پذیر ہوں گے۔

انہیں خصائص میں یہ ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اہلِ موقف کے درمیان شفاعت عظمیٰ دی جائے گی جس وقت کہ تمام انبیاء ومرسلین کے بعد وہ آئیں گے کسی جماعت کو جنت میں بے حساب داخل کرائیں گے اور کسی کے درجات بڑھائیں گے۔ اس کی تفصیل اپنی جگہ آئے گی۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا لواء حمد (حمد کا جھنڈا) ہوگا۔ روز قیامت حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے ماسوا سب ہی اس جھنڈے کے نیچے ہوں گے اور وسیلہ جو اعلیٰ درجہ جنت میں سے ہے وہ بھی مخصوص آپ کے لئے ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنی ساری مخلوق میں سب سے زیادہ مکرم وافضل ہیں اور روزِ قیامت سب کے پیشوا ہیں جیسا کہ فرمایا:۔

أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَأَنَا أَكْرَمُ الْأَوَّلِيْنَ وَالْآخِرِيْنَ وَبِيَدِيْ لِوَاءُ الْحَمْدِ وَلَا فَخْرَ وَمَا مِنْ نَبِيٍّ يَوْمَئِذٍ آدَمُ فَمَنْ سِوَاهُ إِلَّا وَهُوَ تَحْتَ لِوَائِيْ۔

روز قیامت میں اولادِ آدم کا سردار ہوں اور میں اولین و آخرین میں سب سے زیادہ مکرم ہوں اور میرے ہاتھ لواءِ حمد ہوگا یہ فخر سے نہیں ہے اس دن کوئی نبی بھی آدم اور ان کے ماسوا ایسا نہ ہوگا مگر یہ کہ وہ میرے جھنڈے تلے ہوگا۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ جب نبی کریم سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم جنت کا دروازہ کھلوانے تشریف لے جائیں گے تو تعظیم و تکریم کے لئے خازن جنت کھڑے ہوجائیں گے۔ اور آپ کا استقبال کریں گے۔ اور جنت کا دروازہ کھولیں گے۔ کہیں گے میں آپ سے پہلے کسی کے لئے نہ کھولتا۔ اور نہ آپ کے بعد کسی کے لئے میں کھڑا ہوں گا اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبت کی زیادتی کا اظہار ہے ورنہ خزنۂ جنت یعنی نگہبانانِ بہشت سب کے سب آپ کے خادم ہیں۔ اور بحکم الٰہی آپ ان کے بمنزلہ بادشاہ کے ہیں۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حق تبارک وتعالیٰ نے حوض کوثر کو آپ کے لئے مخصوص فرمایا جس میں شہد سے زیادہ شیریں اور دودھ سے زیادہ سفید پانی بہتا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ برف سے زیادہ سفید ہے۔ اور اس کے پیالے ستاروں سے زیادہ ہیں بعض کہتے ہیں کہ آخرت میں ہر نبی کے لئے ایک حوض ہوگا۔ جو ان کے فضل و مرتبت کے لائق ہوگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حوض کوثر ان سب سے عظیم تر اور شریف تر ہے۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی کتاب مجید میں چونکہ انبیاء علیہم السلام کے توبۂ وغفران اور ان سے واقع شدہ زلت وخطا کا ذکر فرمایا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں فرمایا۔ "اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ○ لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ" تو فتح کو مقدم رکھا اس کے بعد غفران ذنوب گزشتہ و آئندہ کا ذکر فرمایا۔ اور ذنب کو مستور رکھا۔ اس مقام کی تحقیق باب دوم میں گزر چکی ہے۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کو جو کچھ سوال کرنے اور مانگنے کے بعد عطا فرمایا وہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو بے سوال اور بغیر مانگے مرحمت فرمایا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے عرض کیا "وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ۔" جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے مجھے رسوا نہ کرنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کی شان میں فرمایا "یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ۔" "اس دن اللہ رسوا نہ فرمائے گا نبی کو اور ان ایمانداروں کو جو آپ کے ساتھ ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا "رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ" "اے میرے رب میرے سینہ کو کھول دے تو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی شان میں فرمایا "اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ" "کیا ہم نے آپ کا سینہ نہیں کھولا۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام محبت سے نوازا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مقام خلّت سے ممتاز فرمایا۔ مقام محبت، مقام خلت سے بالاتر ہے۔ پہلے باب میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ بعض علماء عارفین، خلیل و حبیب کے درمیان فرق میں لطیف بحث فرماتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ خلیل خلت سے بنا ہے جس کے معنی حاجت کے ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا کی طرف سراپا محتاج و مفتقر تھے۔ اسی لحاظ سے حق تعالیٰ نے انہیں خلیل فرمایا اور حبیب بروزن فعیل بمعنی فاعل یا مفعول ہے لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم بے واسطہ غرض محب بھی ہیں اور محبوب بھی۔ اور کہتے ہیں کہ خلیل کا فعل خدا کی رضا کے لئے ہوتا ہے۔ اور حبیب کی رضا کے لئے خدا کا فعل ہوتا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا "فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبْلَۃً تَرْضٰھَا" ـــــ ضرور بالضرور ہم آپ کو اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس سے آپ راضی ہیں اور فرمایا "وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی۔" "عنقریب آپ کا رب آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔ اور خلیل کبھی لقائے محبوب کے لئے عجلت نہیں کرتا۔ جیسا کہ مروی ہے کہ جب قبض روح کے لئے ملک الموت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توقف فرمایا۔ اور ان سے کہا پروردگار عالم سے دریافت کرو کہ کیا حکم ہوتا ہے؟ آیا جلدی حاضری ہے یا کچھ توقف ہے۔ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اِخْتَرْتُ الرَّفِیْقَ الْاَعْلٰی۔" "یعنی میں نے رفیق اعلیٰ حق تعالیٰ کو اختیار کیا۔ اور آپ اپنی دعائیں کہتے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ النَّظَرَ اِلٰی جَلَالِ وَجْھِکَ وَالشَّوْقَ اِلٰی لِقَائِکَ۔ اے خدا میں تجھ سے مانگتا ہوں وہ نظر جو تیرے چہرۂ جلال کی طرف ہے اور وہ شوق جو تیرے دیدار کی طرف ہے۔

اور خلیل وہ جس کی مغفرت، حدِ طمع میں ہے جیسا کہ فرمایا "وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓـئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ۔" اور وہ جو طمع کرتا ہے کہ میری خطاؤں کی مغفرت قیامت کے دن ہو اور حبیب وہ جس کی مغفرت حدِ یقین میں ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ وَیُتِمَّ نِعْمَتَہٗ عَلَیْکَ تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے پچھلے ذنب کی مغفرت کرے اور آپ پر اپنی نعمت تمام فرمائے۔

اور خلیل نے دعا کی "وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ۔" جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے مجھے رسوا نہ کرنا اور حبیب سے فرمایا گیا "لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ۔" جس دن اللہ نبی کو رسوا نہ کرے گا۔ بندۂ مسکین (شیخ محقق) کہتا ہے کہ اس پر مزید فرمایا کہ "وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ۔" اور وہ لوگ جو ایمان لائے آپ کے ساتھ۔ اور خلیل وہ ہے جس نے کہا "اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ۔" میں اپنے رب کے حضور جانے والا ہوں۔ عنقریب وہ رہنمائی فرمائے گا اور حبیب وہ ہے جس کے لئے فرمایا گیا "وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰی۔" اور آپ کو وارفتہ پایا تو رہنمائی فرمائی۔ خلیل وہ ہے جس نے کہا "وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ۔" اور بنا میرے لئے سچی زبان پچھلوں میں۔ اور حبیب کے لئے فرمایا "وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ۔" ہم نے آپ کے لئے آپ کا ذکر بلند کیا۔ خلیل نے کہا "وَاجْعَلْنِیْ مِنْ وَّرَثَۃِ جَنَّۃِ النَّعِیْمِ۔" اور بنا مجھے جنت نعیم کے وارثوں میں سے۔ اور حبیب کے لئے فرمایا "اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ۔" ہم نے آپ کو کوثر عطا فرمایا۔ خلیل نے کہا "وَاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ۔" اور بچا مجھے اور میری اولاد کو بتوں کے پوجنے سے۔ اور حبیب وہ ہے جس سے فرمایا گیا:۔

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَکُمْ تَطْهِیْرًا۝ اللہ تو یہی چاہتا ہے اے نبی کے گھر والو کہ تم سے ہر ناپاکی دور فرمائے اور تمہیں پاک کر کے خوب ستھرا کر دے۔

چنانچہ ثابت ہوا کہ خلت خلیل اور محبت حبیب کی فضیلت میں موخر الذکر فائق ہے۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو نفلی نماز بیٹھ کر ادا کریں تو آپ کے لئے اس کا ثواب کھڑے ہو کر ادا کرنے کے برابر ہے۔ بخلاف دوسروں کے کہ فرمایا "مَنْ صَلّٰی قَاعِدًا فَلَہٗ نِصْفُ اَجْرِ الْقَائِمِ۔" جو بیٹھ کر نماز پڑھے اس کے لئے کھڑے ہونے والے کے اجر کا آدھا ہے۔ اگرچہ اس حدیث کا ظاہر عام ہے۔ لیکن سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس عموم سے مستثنیٰ اور مخصوص ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے حدیث مروی ہے انہوں نے کہا کہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور حاضر ہوا تو میں نے آپ کو بیٹھ کر نماز پڑھتے دیکھا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے سنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "صَلٰوۃُ الرَّجُلِ قَاعِدًا عَلٰی نِصْفِ الصَّلٰوۃِ قَائِمًا۔" بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کی نماز کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے سے آدھی ہے اور اس وقت آپ بیٹھ کر ادا فرما رہے تھے۔ فرمایا "ہاں! میرا ارشاد یہی ہے لیکن "لَسْتُ کَاَحَدٍ مِّنْکُمْ۔" تم میں سے کوئی بھی میرے برابر نہیں۔"

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ جو کچھ دنیا میں زمانہ آدم سے نفخۂ اولیٰ یعنی قیام قیامت تک ہے۔ وہ سب آپ پر منکشف کیا گیا یہاں تک کہ آپ کو اگلوں اور پچھلوں کے تمام احوال کا علم دیا گیا اور ان میں سے بعض کے احوال آپ نے اپنے صحابہ کرام کو بھی بتائے اور بعض صلحاء اہل فضل سے سنا گیا ہے کہ بعض عارفوں نے ایک کتاب لکھی ہے۔ جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ حضور سرور عالم

صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام علوم الٰہی بتائے گئے تھے۔ یہ بات بظاہر بہت سے دلائل کے مخالف ہے مگر قائل نے اس سے کیا مقصد لیا ہو گا اللہ تعالیٰ ہی زیادہ جانتا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و خصائص

وصل:۔ امت مرحومہ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے فضائل وخصائص بھی بے شمار ہیں اور یہ فضائل وخصائص بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف راجع ہوتے ہیں کیونکہ آپ تابع وفرمانبردار امت رکھتے ہیں۔ معلوم ہونا چاہئے کہ اگرچہ انسان و جنات سب ہی آپ کی امت ہیں۔ لیکن اس خصوصیت و قابلیت کے لحاظ سے جو انسان میں ہے عنایت ربانی انسانی رافت کے ساتھ ظاہر ہوئی اور آپ نے انسانوں میں ظہور فرمایا۔ " کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ " (تم تمام امتوں میں بہترین امت ہو) یہ خطاب بے واسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے ہے۔ ایمان میں سبقت پانے والے مقربین بارگاہ ہیں۔ اور فرمایا کہ "تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۔ " (نیکیوں کا حکم دیتے اور برائیوں سے بچاتے ہو) در حقیقت یہی سبب افضیلت اور بہتری کی شرط ہے۔ صحابہ کرام میں یہ خوبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی فضیلت کی وجہ سے اتم واکمل اور سب سے فائق ہے۔ کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مشاہدۂ جمالِ جہاں آرا اور آپ کے انوار و آثار کا بے واسطہ اقتباس واستفاضہ کرنے میں مخصوص ہیں۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس امت کے اولین بعد والوں سے افضل ہیں۔ اس کی ایک ترتیب بھی اس ضمن میں شارع علیہ السلام سے واقع ہے فرمایا:۔

خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ الَّذِیْنَ اَنَا فِیْهِمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ۔ — سب سے بہتر زمانہ میرا وہ زمانہ ہے جس میں میں ہوں پھر وہ جو ان سے متصل ہے پھر وہ جو ان سے متصل ہے۔

مشہور یہ تین مرتبے ہیں۔ اول صحابہ، دوم تابعین، سوم تبع تابعین، صحیح بخاری کی ایک حدیث سے مرتبہ چہارم بھی معلوم ہوتا ہے۔ جس کو اتباع تبع کہتے ہیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " ثُمَّ یَفْشُوْا الْکِذْبُ " (پھر جھوٹ پھیل جائے گا)۔ مطلب یہ کہ ان تین یا چار مرتبوں کے بعد جس طرح اوائل زمانہ میں دین، صدق، تقویٰ اور یقین میں ربط وضبط تھا وہ ختم ہو جائے گا اس کے بعد کذب، جھوٹ اور افتراء عام ہو جائے گا۔

صحابہ کرام کی ایک جماعت تو وہ ہے جو ایک لحظہ کی شرفیابی دیدارِ مصطفیٰ کے بعد ایمان لا کر اپنے کام و کاج میں مشغول ہو گئی اور جسے عرصہ دراز تک آپ کی خدمت اور صحبت میں حاضر رہ کر استفادہ کا موقع نہ ملا۔ ان کے بارے میں بھی بعض علماء اس کے قائل ہیں کہ انہیں اپنے بعد کے آنے والوں پر افضلیت حاصل ہے۔ معلوم نہیں ان کے اس کہنے کا مقصود کیا ہے؟! اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت ومشاہدہ کی برکت سے انہیں وہ تمام کمالات حاصل ہو جاتے ہیں جو متاخرین یعنی عرصہ دراز تک صحبت رکھنے والوں میں ہیں تو یہ محل توقف ہے اور صحابہ کرام کے مابین عدم تفاضل وتفاوت کو مستلزم ہے۔ اور یہ خلاف واقع ہے اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت ومشاہدہ ایسی فضیلت ہے جو تمام فضائل وکمالات سے اتم واکمل ہے اور کوئی فضیلت اس کی ہمسری نہیں کر سکتی۔ بہر حال کچھ بھی ہو وہ صحابہ کرام جنہوں نے آپ کی مختصر سی صحبت حاصل کر لی اپنے ان بعد کے آنے والوں سے افضل ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ورویت سے محروم رہے۔ اہل اصول کی جماعت اسم صحبت کے اطلاق کو بھی جماعت اولیٰ سے مخصوص جانتی ہے۔ حالانکہ یہ محدثین کے مذہب کے خلاف ہے۔ کیونکہ وہ اطلاق صحبت میں رویت و

ملاقات کو اگرچہ ایک ہی بار ہو کافی رکھتے ہیں۔

امت کے فضائل و خصائص علی الاطلاق بیشمار اور اس بارے میں اخبار و آثار بکثرت ہیں ان کی سب سے بڑی اور اتم و اکمل فضیلت یہی ہے کہ وہ امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہیں۔ جس طرح یہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین اور تمام نبیوں کے فضائل و کمالات کے جامع ہیں اور آپ پر مکارم اخلاق اور صفات حمیدہ تمام ہیں اسی طرح آپ کی امت خاتم الامم ہے۔ اور کمال دین اور اتمام نعمت سے مخصوص ہے۔ جیساکہ فرمانِ الٰہی ہے کہ "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ۔" (آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا۔ اور اپنی تمام نعمتیں تم پر تمام کر دیں۔)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے رب تیرے نزدیک میری امت جیسی بھی کوئی امت ہے جس پر تو نے بادلوں کا سایہ فرمایا ہو۔ اور ان کے لئے من و سلویٰ اتارا ہو۔" حق تبارک وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا۔ اے موسیٰ! تم امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کو نہیں جانتے۔ جتنا میرا فضل ہے تمام خلق پر اتنا تنہا اس امت پر ہے موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے رب مجھے اس امت کو دکھا دے۔ حق سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا تم ان کو دیکھ تو نہیں سکتے (کیونکہ وہ آخر زمانے میں ہے) لیکن میں تمہیں ان کا کلام سنواتا ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو ندا فرمائی تو سب نے بیک آواز جواب دیا "لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ۔" (حاضر ہوں اے خدا حاضر ہوں) حالانکہ اس وقت وہ سب اپنی ماؤں اور باپوں کے رحموں اور بطنوں میں تھے اس کے بعد حق سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا۔

صَلٰوتِیْ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ وَعَفْوِیْ سَبَقَ عَذَابِیْ۔ میرا کرم تم پر ہے اور میری رحمت میرے غضب پر اور میرا عفو میرے عذاب پر سبقت کر گیا۔

اس سے پہلے کہ تم دعا مانگو۔ میں نے تمہاری دعا کو قبول کیا اور جو کوئی میرا ادراک اس حال میں کرے کہ وہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" کی گواہی دیتا ہو میں اس کے تمام گناہوں کو بخش دوں گا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حق تبارک وتعالیٰ نے چاہا کہ مجھ پر اس نعمت کا اظہارِ احسان فرمائے تو حق تعالیٰ نے فرمایا "وَمَا کُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَیْنَاہُ" یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! نشاء عنصری میں جس وقت ہم نے تمہارے نور کو ندا کی اور ندا کی ہم نے تمہاری امت کو، تاکہ موسیٰ علیہ السلام کو ان کا کلام سنائیں تو اس وقت آپ طور پر تشریف فرما نہ تھے۔ اس حدیث کو قتادہ نے روایت کیا۔ اس میں اتنا اور زیادہ کیا گیا ہے کہ "تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے رب تعجب ہے کہ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کتنی اچھی اور پیاری ہے۔ اے پروردگار مجھے دوبارہ سنا۔

اور ابو نعیم "حلیہ" میں بروایت حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ جو کوئی مجھ سے اس حال میں ملے کہ وہ احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا منکر ہے تو میں اسے آتشِ دوزخ میں جھونک دوں گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں؟ فرمان باری تعالیٰ ہوا کہ احمد وہ ذات گرامی ہے کہ میں نے اپنے نزدیک اس سے بڑھ کر گرامی تر کسی کو پیدا نہ فرمایا۔ اور زمین و آسمان کی پیدائش سے قبل اس کا نام اپنے نام کے ساتھ عرش پر لکھا اور اس وقت تک میری مخلوق پر جنت حرام ہے جب تک کہ وہ اور اس کی امت اس میں پہلے داخل نہ ہو جائیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کی امت آپ کی تبعیت میں داخلہ جنت میں دیگر تمام انبیاء علیہم السلام سے پہلے ہے۔ اور جب مہمان عزیز ہے تو اس کا طفیلی بھی عزیز ہو گا۔ خلق سے مراد غیر انبیاء ہیں حالانکہ جمیع خلق کہا گیا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ امت انبیاء سے فاضل تر یا برابر ہے۔ حاشا وکلا، ایسا ہرگز ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ کوئی ولی نبی کے مرتبہ کو نہیں پہنچتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا امت محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کیسی ہے اور ان کی صفتیں کیا ہیں۔ تو حق تبارک وتعالیٰ نے ان کی صفات کا ذکر فرمایا۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے خدا مجھے اس امت کا نبی بنادے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا امت کا نبی ان کی قوم سے ہوگا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا خداوندا مجھے اس نبی کی امت بنادے۔"

حضرت وہب ابن منبہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیا نبی علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ میں نبی امی کو بھیجوں گا۔ جو کہ بہرے کانوں، اندھی آنکھوں اور ان دلوں کو جو پردۂ غفلت سے پوشیدہ ہیں کھولے گا۔ ان کی جائے ولادت مکہ مکرمہ اور اس کا مقام ہجرت مدینہ طیبہ اور اس کا ملک شام ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفتوں کا ذکر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں تک فرمایا کہ میں ان کی امت کو تمام امتوں میں بہترین بناؤں گا۔ وہ نیکی کا حکم دے گی اور بدی سے روکے گی۔ میری وحدانیت کو مانے گی۔ مجھ پر ایمان لائے گی۔ مجھ سے اخلاص برتے گی۔ اور میں نے جو کچھ نبیوں پر نازل کیا ہے وہ سب کی تصدیق کرے گی۔ آفتاب وماہتاب کی حفاظت کرے گی۔ یعنی عبادت کے اوقات کے لئے ان کی محافظت کرے گی۔ خوش نصیب ہیں وہ دل چہرے اور روحیں جو مجھ سے اخلاص برتتی ہیں۔ میں انہیں تسبیح وتکبیر اور تحمید وتوحید کو ان کی مجلسوں میں، ان کی آرام گاہوں میں اور ان کے سفر وحضر اور ہر حرکت و سکون میں الہام کروں گا۔ مسجدوں میں ان کی صفیں، فرشتوں کی صفوں کی مانند ہیں۔ فرشتے عرش کے گرد ہیں۔ وہ میرے دوست اور میرے مددگار ہیں۔ میں ان کے ذریعہ اپنا کینہ بت پرست دشمنوں سے نکالوں گا۔ وہ میرے لئے کھڑے ہو کر بیٹھ کر اور رکوع و سجود کے ساتھ نمازیں ادا کریں گے۔ وہ میری خوشنودی کی خاطر اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکلیں گے۔ اور میری راہ میں جہاد و قتال کریں گے اور میں ان کی کتاب یعنی قرآن سے دیگر کتابوں کو، ان کی شریعت سے دیگر شریعتوں کو اور ان کے دین سے دیگر دینوں کو ختم کروں گا۔ اور جو کوئی ان کے زمانہ کو پائے اور ان کی کتاب پر ایمان نہ لائے اور ان کے دین وشریعت کو نہ مانے وہ میرا نہیں ہے میں اس سے بیزار ہوں۔ میں نے انہیں ساری امتوں سے افضل اور امت وسط بنایا۔ جو تمام لوگوں پر گواہ ہیں۔ جب غضب میں آئیں گے تو میری تہلیل لا الٰہ الا اللہ کا نعرہ لگائیں گے اور جب نزاع کریں گے تو تسبیح کریں گے اور میری پاکی بیان کریں گے یعنی سبحان اللہ وبحمدہٖ کہیں گے اور اپنے چہروں اور اعضاء کو پاک وصاف کریں گے۔ اور ٹخنوں سے اوپر ازار باندھیں گے۔ ہر چڑھائی و اتار پر اللہ اکبر کہیں گے۔ اور خون بہا کر قربانی دیں گے۔ ان کی کتاب یعنی قرآن ان کے سینوں میں ہے۔ رات میں عبادت گذار اور دن میں شیر یعنی مجاہد ہیں۔ وہ کتنا خوش نصیب ہے جو ان کے ساتھ ہے۔ ان کے مذہب اور ان کی راہ ورسم پر ہے۔ یہ میرا فضل ہے جسے میں چاہتا ہوں اسے دیتا ہوں۔ میں خداوندِ فضلِ عظیم ہوں۔ اسے ابو نعیم نے روایت کیا۔

عبادات میں اس امت کی خصوصیات:۔ یہ فضائل اس امت مرحومہ کے ہیں جو پچھلی کتابوں میں ہیں لہٰذا امت کو چاہئے کہ ان صفات پر ہو کیونکہ بہتری اور افضلیت کی علت یہی صفات ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس امت کے پہلے حضرات جو کہ صحابہ کرام اور ان سے متصل ہیں ان صفات میں اکمل واتم ہیں۔ اس امت کے خصائص میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر غنیمتوں کو حلال قرار دیا حالانکہ اس سے قبل کسی پچھلی امت کے لئے یہ حلال نہ ہوا تھا۔ اور یہ کہ تمام زمین کو مسجد گردانا۔ (کہ جہاں چاہیں نماز پڑھیں) اور یہ کہ مٹی کو پاک کرنے والا بنایا۔ (یعنی اگر پانی میسر نہ ہو یا اس پر قدرت نہ ہو تو مٹی سے تیمم کر کے نماز پڑھ لی جائے) جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں گزرا۔ یعنی امت بھی آپ کے ساتھ ان صفات واحکام میں شریک ہے۔ بعض علماء وضو کو بھی اس کے خصائص میں شامل کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ اِنَّ اُمَّتِیْ یُدْعَوْنَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ غُرًّا مُّحَجَّلِیْنَ مِنْ اٰثَارِ الْوُضُوْءِ۔" (بے شک قیامت کے دن آثار وضو سے میری امت کے اعضاء روشن وتاباں

ہوں گے۔ اس طرح آئے گی) اور ممکن ہے کہ یہ تابانی وضو کی جزا بتیں ان کے ساتھ مخصوص ہو۔ کیونکہ "فتح الباری" میں حضرت سارہ کے قصے کے درمیان مذکور ہے کہ جب بادشاہ جابر و کافر نے انہیں گرفتار کرنا چاہا تو وہ اٹھیں، وضو کیا اور نماز میں مشغول ہو گئیں۔ جریج راہب کے قصہ میں بھی آیا ہے کہ وضو کیا، نماز پڑھی اور بچے کے ساتھ کلام کیا۔ للٰذا ظاہر ہے کہ جو چیز اس امت کے ساتھ مخصوص ہے وہ غرہ اور تحجیل یعنی نورانیت اور تابانی ہے وضو نہیں۔ مسلم شریف کی ایک روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ پیشانی کی تابانی تمہارے سوا کسی میں نہیں۔

اس امت کے خصائص میں سے پانچ نمازیں بھی ہیں گزشتہ امتوں میں چار نمازیں تھیں نماز عشا نہیں تھی۔ سب سے پہلے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عشا ادا کی۔ حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز عشا میں تاخیر کرو۔ (ایک تہائی رات تک) اس لئے کہ تمہیں گزشتہ امتوں کی نمازوں پر فضیلت دی گئی ہے۔

اذان، اقامت اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا کہنا بھی اس امت کے خصائص میں سے ہے۔ کیونکہ کسی دوسری امت پر اس کا نزول نہیں ہوا تھا۔ مگر حضرت سلیمان علیہ السلام اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ انہوں نے ملکہ سبا کو جو خط تحریر فرمایا وہ بسم اللہ سے شروع کیا تھا۔

اس امت کے خصائص میں سے " آمین " کہنا بھی ہے۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہود ہم پر کسی چیز پر حسد نہیں کرتے جیسا کہ وہ جمعہ پر حسد کرتے ہیں۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے ہمیں ہدایت فرمائی۔ اور امام کے پیچھے " آمین " کہنے پر بھی وہ حسد کرتے ہیں۔ اس امت کے خصائص میں سے نماز میں رکوع کرنا بھی ہے۔ حضرت علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ فرمایا سب سے پہلے جس نماز میں ہم نے رکوع کیا وہ نمازِ عصر تھی۔ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یہ رکوع کیا ہے جسے آپ نے آج کے سوا کبھی نہیں کیا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ہمارے دین میں بھی ابتدائی وقت میں رکوع نہ تھا بعد [illegible]س کا حکم ہوا۔ البتہ ایک جگہ ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا " یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّکِ وَاسْجُدِیْ وَارْکَعِیْ ۔ " (اے مریم اپنے رب کی اطاعت کرو اور سجدہ ورکوع کرو) یہ آیت وجود رکوع پر دلالت کرتی ہے کہ امم سابقہ میں رکوع تھا۔ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ قنوت سے مراد دائمی طاقت ہے کیونکہ حق سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا " اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ اللَّیْلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا ۔ " اور قنوت کے معنیٰ، طاعت، قیام اور خشوع کے آتے ہیں۔ سجود سے مراد نماز ہے جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا " وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ " اور رکوع سے مراد، خشوع، عاجزی اور فروتنی ہے رکوع پر سجدہ کو مقدم کرنا یہ ایک قسم کا قرینہ ہے۔ جو اس معنی پر دلالت کرتا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ رکوع مقدم ہوتا ہے۔ یہ جواب وتوجیہہ اس تقدیر پر ہے کہ نص سے ثابت ہو ورنہ امم سابقہ میں رکوع شروع نہ ہونے پر علماء نے حضرت مرتضٰی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے اگرچہ یہ استدلال مکمل نہیں ہے۔

نماز و تہائی میں ان کی صفوں کی قدر و منزلت اور قرب بارگاہ میں فرشتوں جیسا تقرب بھی اس امت کے خصائص میں ہے۔ اگر یہ کہیں کہ جماعت بھی اس امت کے خصائص میں سے ہے تو اللہ تعالیٰ ہی زیادہ جانتا ہے۔

اس امت کے خصائص میں سے تحیۂ سلام بھی ہے جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں گزرا۔ باخبر رہنا چاہئے کہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کا ظاہر مطلب، نماز کے آخر میں سلام پھیرنا ہے اور تحیۂ سلام کی عبارت کا ظاہر مطلب یہ ہے کہ وقت ملاقات ایک دوسرے کو سلام کرنا۔

اس امت کے خصائص میں سے جمعہ بھی ہے جو دوسری امتوں میں نہیں ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ هٰذَا يَوْمُهُمُ الَّذِیْ فَرَضَ

اللّٰهُ عَلَيْهِمْ يَعْنِىْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَاخْتَلَفُوْ فَهَدَانَا اللّٰهُ لَه وَالنَّاسُ فِيْهِ لَنَا تَبِعٌ اَلْيَهُوْدُ غَدًا وَّالنَّصَارٰى بَعْدَ غَدٍ (رواہ البخاری)
یہ ان کا وہ دن ہے جو اللہ نے ان پر فرض فرمایا یعنی جمعہ کا دن لیکن انہوں نے اختلاف کیا تو اللہ نے ہمیں اس کی ہدایت بخشی۔ دوسرے لوگ اس میں ہمارے بعد ہیں یہود کے لئے سنیچر (ہفتہ) اور نصاریٰ کے لئے اتوار ہے۔

اس امت کے خصائص میں سے جمعہ کی وہ گھڑی ہے کہ اس گھڑی میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے جو مانگا جائے ملتا ہے۔ اس ضمن میں تقریباً چالیس اقوال ہیں جنہیں "شرح سفر السعادۃ" میں ہم نے اقوال میں مطابقت پیدا کر کے بیان کیا ہے۔ ان میں صحیح تر دو قول ہیں۔ اول یہ کہ وہ خاص مذکورہ گھڑی امام کے خطبہ کے لئے نکلنے کے وقت سے نماز کے فارغ ہونے تک، پر محیط ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ روز جمعہ کی آخری گھڑی ہے۔ سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا اسی جانب ہیں۔ علماء کہتے ہیں کہ انہوں نے ایک خادم کو مقرر کر رکھا تھا کہ اس آخری گھڑی کی خبر دے۔ واللہ اعلم

اس امت کے خصائص میں سے یہ ہے کہ جب رمضان مبارک کی پہلی رات آتی ہے تو حق سبحانہ وتعالیٰ ان کی طرف نظر عنایت سے دیکھتا ہے۔ اور جس کی طرف حق تعالیٰ نظر عنایت فرمائے وہ پھر اس کو کبھی بھی عذاب نہیں دیتا۔ اور جنت کو ان کے لئے مزین کرتا اور سنوارتا ہے۔ اور یہ کہ روزہ دار کے منہ کی بو کو اپنے نزدیک مشک کی خوشبو سے پاکیزہ بنایا اور رمضان کی ہر رات میں فرشتے ان کے لئے استغفار کرتے ہیں اس وقت سے جب کہ وہ روزہ افطار کرتے ہیں اور جب رمضان کی آخری رات ہوتی ہے تو ان سب کو بخش دیتا ہے اور اس امت کو ماہ رمضان میں پانچ ایسی خوبیاں مرحمت فرمائی ہیں جو ان سے پہلے کسی نبی کی امت کو نہیں دی گئیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ روزہ دار جس وقت افطار کرتا ہے۔ اس وقت سے فرشتے استغفار کرتے رہتے ہیں۔ اور شیطانوں کو زنجیر میں جکڑ کر قید کر دیا جاتا ہے۔

اس امت کے خصائص میں سے سحری کھانا، افطار میں جلدی کرنا مستحب کیا گیا ہے۔ رات میں صبح صادق تک کھانے، پینے اور جماع کرنے کو مباح قرار دیا گیا۔ حالانکہ ہم سے پہلے ہر ایک پر یہ چیزیں حرام تھیں اسی طرح شروع اسلام میں ہم پر بھی تھیں۔ بعد میں یہ منسوخ ہو گیا۔

اس امت کے خصائص میں شب قدر ہے۔ جیسا کہ امام نووی نے "شرح مہذب" میں کہا ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا جس نے ہزار مہینے تک راہِ خدا میں جہاد کیا اور اپنے جسم سے ہتھیار نہ اتارے۔ صحابہ کہنے لگے کیا ہم میں سے کسی میں اتنی طاقت ہے جو ایسا کر سکے۔ اس وقت سورۂ قدر نازل ہوئی کہ شب قدر ہزار مہینے سے بہتر ہے۔ اور اس ایک رات میں قیام کرنا ہزار مہینے راہ خدا میں جہاد کرنے سے افضل ہے۔ باقی بحث اپنے مقام میں آئے گی۔ اہل علم کا اس میں اختلاف ہے کہ رمضان مبارک کے روزے اس امت کی خصوصیتوں میں سے ہیں یا پچھلی امتوں پر بھی فرض تھے۔ آیۂ کریمہ ہے:۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ — تم پر روزے فرض کئے گئے جیسے کہ تم سے پہلوں پر فرض کئے گئے۔

اس سے مراد رمضان کے روزے ہی ہیں۔ اس میں ظاہر بات یہی ہے کہ پچھلی امتوں پر بھی فرض کئے گئے تھے۔ ابن ابی حاتم بروایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما مرفوعاً نقل کرتے ہیں کہ رمضان کے روزے پچھلی امتوں پر بھی فرض تھے۔ اس حدیث کی اسناد میں ایک شخص مجہول ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ مطلق روزہ مراد ہے نہ کہ ان کی مقدار اور وقت تو یہ تشبیہ بھی مطلقاً روزوں پر ہوئی۔ جمہور کا قول بھی یہی ہے۔

اعمال میں خصوصیات:۔ اس امت کی خصوصیات میں سے مصیبت کے وقت استرجاع یعنی "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔"

کہنا:ن ہے جو کہ پرور د گار عالم کی جانب سے فضل ورحمت کا مستوجب اوران کے لئے سبب ہدایت ہے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا اس امت کو مصیبت کے وقت وہ چیز دی گئی ہے جو کسی نبی کو اس کی مانند نہیں دی گئی۔ اور وہ قول اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ "کو مصیبت کے وقت کہنا ہے۔ اگر یہ چیز انبیاء کو دی جاتی تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو بھی مرحمت ہوتی جس وقت کہ انہوں نے کہا "یَا اَسَفٰی عَلٰی یُوۡسُفَ۔" آہ مجھے یوسف پر رنج ہے۔

بندۂ مسکین (یعنی شیخ محقق) ثبتہ اللہ علی طریق الحق والیقین کہتا ہے کہ یہ قول اس امت کو انبیاء علیہم السلام پر ترجیح دینے کا وہم پیدا کرنے کا موجب ہے۔ حالانکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا" فَصَبۡرٌ جَمِیۡلٌ وَاللّٰہُ الۡمُسۡتَعَانُ۔ " (اب صبر جمیل ہے اور اللہ ہی مدد گار ہے) تو یہ استرجاع کے ہی ہم معنی ہے۔ اور ان کا یہ فرمانا کہ "یَا اَسَفٰی عَلٰی یُوۡسُفَ۔ "اس کے منافی نہیں ہے۔ اگر یہ کہیں کہ "اس امت کو استرجاع کی ایسی چیز دی گئی ہے جو کسی دوسری امت کو نہیں دی گئی۔" تو بہتر ہوگا۔ ظاہر ہے کہ امت کی تخصیص بہ نسبت امم سابقہ ہوگی نہ کہ بنسبت انبیاء کرام صلوات اللہ تعالیٰ وسلامہ علیہم اجمعین۔

اس امت کے خصائص میں سے یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس امت سے اِصر اور اغلال اٹھالیا ہے جو امم سابقہ پر تھا۔ (اصر اگر الف کے زیر سے ہے تو اس کے معنی عہد، بوجھ اور گناہ کے ہیں اور اگر الف کے زبر سے ہے تو اس کے معنی توڑنے، بند کرنے اور باز رکھنے کے ہیں اور اغلال کے معنی کینہ رکھنا اور مالِ غنیمت میں خیانت کرنے کے ہیں۔) اس سے مراد تخفیف اور ان تکلیفوں کو دور کرنا ہے جو پچھلی امتوں پر لازم تھیں۔ مثلاً قتلِ عمد اور خطا کے درمیان تعیین قصاص، خطا کار کے اعضا کاٹنا، موضع نجاست کو کاٹنا اور توبہ میں اپنی جان کو ہلاک کرنا وغیرہ تھا۔ اگر بنی اسرائیل میں سے رات کو کوئی گناہ کرتا تو پچھلی صبح کے وقت اس کے گھر کے دروازے پر لکھا ہوتا کہ اس گناہ کا کفارہ یہ ہے کہ اپنی دونوں آنکھیں نکالے۔ چنانچہ وہ دونوں آنکھوں کو نکال دیتا۔

اس امت کے خصائص میں سے یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان پر ان چیزوں کو آسان فرمایا جو ان کے ماسوا پر بہت سخت تھیں۔ اور ان کے دین میں کوئی دشواری لازم نہ رکھی۔ جیسے کہ اگر کوئی کھڑے ہو کر نماز ادا کرنے سے مجبور ہے تو وہ بیٹھ کر ادا کرے۔ اور حالت سفر میں افطار اور نماز فرض میں قصر کو مباح فرمایا۔ اور ان پر توبہ کا دروازہ کھلا رکھا گیا۔ اور حقوق اللہ میں ان کے لئے کفارہ جات مشروع فرمائے اور حقوق العباد میں دیت وضمان کو مشروع فرمایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ فرمایا بنی اسرائیل پر جس قدر شدائد اور دشواریاں تھیں حق تعالیٰ نے اس امت سے اٹھالیں۔

اس امت کے خصائص میں سے یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس امت کو خطا ونسیان (وسوسہ) اور ہر وہ عمل جو جبر واکراہ سے سرزد ہو ان سب کے مواخذہ سے بری فرمایا۔ بلاشبہ بنی اسرائیل کا یہ حال تھا کہ جس چیز کا انہیں حکم دیا جاتا جب وہ اس میں کچھ بھول جاتے یا خطا ہو جاتی تو ان پر عذاب میں جلدی کی جاتی تھی۔ اور ان کے گناہ کے قدر و انداز ہ کے مطابق کھانے پینے کی کچھ چیزیں ان پر حرام کر دی جاتیں بلاشبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اِنَّ اللّٰہَ تعالٰی رَفَعَ عَنۡ اُمَّتِیۡ الۡخَطَاءَ وَالنِّسۡیَانَ وَمَا اسۡتُکۡرِھُوۡا عَلَیۡہِ۔ " رواہ احمد و ابن حبان والحاکم وابن ماجہ (یقیناً اللہ تعالیٰ نے میری امت سے خطا ونسیان اور جس پر مجبور کئے جائیں اٹھالیا) خطا ونسیان کے درمیان فرق یہ ہے کہ نسیان میں مطلقاً بھول جاتا ہے جیسے کہ روزہ دار، روزے کو بھول کر کچھ کھا پی لے۔ اور خطا میں یادداشت ہوتی ہے لیکن غلط کر جاتا ہے مثلاً روزہ دار کو اپنا روزہ یاد ہے مگر کلی کرنے میں پانی حلق میں اتر جائے اور اکراہ یہ ہے کہ کسی سے بزور اور جبر کوئی کام کرایا جائے۔ مثلاً کوئی ظالم زور و جبر کرے اور کہے کہ کلمہ کفر زبان سے بول ورنہ میں تجھے قتل کر دوں گا اس وقت اگر کلمہ کفر بول دے۔ اور دل میں اپنے ایمان پر برقرار رہے تو نقصان نہ ہوگا۔ اس پر مواخذہ نہیں ہے۔ لیکن "حدیث نفس" جسے خیال و

وسوسہ کہتے ہیں اس کی کئی صورتیں ہیں ایک یہ کہ کسی چیز کا خیال بے اختیار دل میں یکایک آ جائے تو اسے "ہاجس" کہتے ہیں۔ اس میں بالکل کوئی مواخذہ نہیں ہے خواہ کچھ بھی ہو۔ اس کے بعد وہ دل میں جاگزیں ہو جائے۔ اور دل کو برانگیختہ کرے تو اسے "خاطر" کہتے ہیں اس کے بعد قصد و ارادہ ہے چاہے کرے یا نہ کرے۔ یہ اس امت سے مرفوع ہے۔ بلکہ اگر نہ کیا تو ایک نیکی لکھی جاتی ہے اس کے بعد "عزم و تہیہ" ہے کہ ضرور کرنا چاہتا ہے مگر خارج میں کوئی چیز مانع پیدا ہے۔ جس سے وہ کر نہیں سکتا۔ البتہ اگر مانع نہ ہو تو کرے۔ اس صورت میں مواخذہ ہے۔ اس لئے کہ یہ فعل قلب ہے۔ اور اسی پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد محمول ہے۔

وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ جو تمہارے دلوں میں ہے خواہ اسے ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ تمہارا محاسبہ کرے گا۔

لیکن عزم زنا کا زنا نہیں ہے۔ اس پر مواخذہ زنا کا سا نہیں بلکہ یہ اپنا ایسا مخفی گناہ ہے جس پر آدمی کا مواخذہ کیا جاتا ہے۔

اس امت کے کامل ترین خصائص میں سے اس کا خیر الامم ہونا ہے۔ کیونکہ اس کی شریعت تمام گزشتہ شریعتوں سے زیادہ کامل ہے اور یہ ظاہر ہے جو بیان کا محتاج نہیں۔ جب کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکارم اخلاق اور افعال حمیدہ کو پورا کرنے کیلئے مبعوث ہیں تو لامحالہ آپ کی شریعت اور آپ کا دین تمام ادیان و شرائع سے اتم و اکمل ہے۔ شریعت موسوی پر غور کرو تو معلوم ہو جائے گا کہ اس میں کتنی تکالیف شاقہ ہیں۔ مثلاً قتل نفوس، تحریم طیبات، تعجیل عقوبات، عہد و میثاق اور ناقابل برداشت بوجھ کا اٹھانا اور اظہار قہر و جلال وغیرہ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیبت و غضب اور گرفت و مواخذہ میں مخلوق خدا میں سب سے بڑھ کر اعظم و اشد تھے۔ چنانچہ خلق کو ان کی جانب نظر کرنے کی طاقت نہ تھی۔ بیان کرتے ہیں کہ جس دن سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کلام ربانی اور تجلی الٰہی سے مشرف و ممتاز ہوئے تو اپنے چہرۂ مبارک پر کپڑا ڈال لیا تاکہ اس کے دائمی قہر و جلال سے لوگ بے تاب نہ ہوں۔ اور آپ کی امت کے لوگ بھی سخت و شدید درشت خو، اور کجرو تھے۔ بجز تکالیف غلیظہ اور احکام شدیدہ کے اصلاح و استقامت پر نہیں آسکتے تھے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا "ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِىَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً" (پھر اس کے بعد تمہارے دل شدید سخت ہوگئے گویا کہ وہ پتھر ہیں۔ یا اس سے زیادہ سخت تر)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں فضل و احسان اور لطف و نرمی تھی۔ لیکن اس میں مقاتلہ و محاربہ نہ تھا۔ اور دین نصاریٰ میں قتال حرام ہے اگر وہ کریں گے تو گنہگار و عاصی ہوں گے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کے لوگ ملائم و نرم خو تھے ان کے اوپر، اصر و اغلال، احکام شدیدہ اور اوامر غلیظہ نہ تھے۔ بلکہ انجیل میں ہے کہ "اگر کوئی تمہارے داہنے رخسار پر طمانچہ مارے تو اس کے آگے بایاں رخسار بھی کر دو۔" اور جو کوئی تم میں کپڑے کے بارے میں جھگڑے اور کپڑے اتارنا چاہے تو اپنے کپڑوں کے ساتھ اپنی چادر بھی اسے دیدے۔ اور جو کوئی تمہیں ایک میل تک لے جائے تم اس کے ساتھ دو میل تک جاؤ۔ اور یہ رہبانیت جو نصاریٰ نے پیدا کی ہے وہ بدعت ہے جسے انہوں نے اپنی طرف سے گھڑا ہے۔ بغیر اس کے کہ اسے حق تعالیٰ نے ان کے لئے انجیل میں لکھا اور واجب کیا ہو۔ چنانچہ قرآن کریم ناطق ہے کہ: ۔ "وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ ۔" (اور ان کی رہبانیت جسے انہوں نے اپنی طرف سے بطور بدعت دین قرار دیا۔ ہم نے ان پر اسے فرض نہ کیا۔) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام خالص جمال و لطف اور احسان کے مظہر تھے۔ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام محض جلال و قہر اور دبدبہ کے مظہر تھے۔ لیکن ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مظہر کمال اور جلال و جمال کے مابین جامع تھے۔ اور قوت، عدل، شدت، نرمی، مہربانی اور رحمت والے تھے۔ آپ کی شریعت شرائع میں اکمل، آپ کی امت تمام امتوں میں اکمل اور ان کے احوال و مقامات اکمل احوال و مقامات ہیں۔ لہٰذا آپ کی شریعت

انتہائی توسط واعتدال اور غایت جامعیت وکمال میں آئی۔ آپ کی شریعت میں کہیں فرض وایجاب ہے اور کہیں ندب واستحباب۔ اور شدت کے مقام میں شدید اور نرمی کی جگہ میں نرمی، کسی جگہ شمشیرزنی ہے تو کسی جگہ جود وعطا ہے۔ کہیں عدل وانصاف کا ظہور ہے تو کہیں فضل وکرم کی بارش ہے۔ چنانچہ ایک وقت میں "جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۔" (ایک بدی کے بدلے میں اس کے برابر بدی ہے) فرمایا جارہا ہے اور یہ عدل وانصاف ہے اور ایک وقت میں "فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ" (جو معاف کرے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ کرم پر ہے) ارشاد ہوتا ہے اور یہ فضل وکرم ہے "اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ" (بیشک اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا) یہ ظلم کو حرام قرار دیتا ہے "وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۔" (اور اگر کوئی تمہیں ایذا پہنچائے تو تم اس کی ایذا کے برابر بدلہ لے لو) یہ عدل وانصاف کو واجب بھی کرتا ہے اور ظلم کو حرام بھی "وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ" (اور اگر تم صبر کرو تو یقیناً وہ بہتر ہے صابروں کے لئے)۔ اس میں فضل وکرم پر خبرداری اور تنبیہ ہے۔ اور اس امت پر ہر ضرر دینے والی برائی کو حرام قرار دیا۔ اور ہر امر پسندیدہ ونافع کو مباح فرمایا۔ حرام قرار دینا اس شریعت میں رحمت ہے ورنہ پچھلی امتوں پر حق تعالیٰ نے ان کی وجہ سے ان پر عذاب فرمایا۔ "هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ" فرمایا (اس نے تمہیں پسند کیا ہے اور دین میں تم پر کوئی دشواری نہ رکھی۔) اور اس امت کو لوگوں پر گواہ بنایا۔ اور رسولوں کے مقام میں انہیں کھڑا فرمایا کیونکہ وہ اپنی اپنی امتوں پر گواہ ہیں اور اس امت کو "خیر امة اخرجت للناس" (لوگوں میں جتنی امتیں گزریں ان سب میں بہتر) بنایا اور ان کو فضائل وکرامات اور مراتب ودرجات کے ساتھ مخصوص فرمایا "واللّٰهُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ" اور اللہ اپنی رحمت سے جس کو چاہے خاص کرے۔ وہی صاحب فضل عظیم ہے۔

اس امت کے خصائص میں سے یہ ہے کہ یہ ضلالت وگمراہی پر مجتمع نہیں ہوگی۔ یہ حدیث کثیر سندوں سے مشہور ہے۔ حدیث پاک میں آیا ہے کہ میں نے اپنے رب سے سوال کیا کہ میری امت ضلالت وگمراہی پر مجتمع نہ ہو چنانچہ حق تعالیٰ نے میرے سوالوں کو قبول فرمایا۔ اور یہ عنایت فرمائی یہ "اجماع" کی حجت پر دلیل ہے۔ اور ان کا اجماع حجت ہے۔ اور ان کا اختلاف رحمت ہے۔ جو پچھلی امتوں کا عذاب تھا۔ حدیث پاک میں آیا ہے کہ "اختلاف اصحابی لکم رحمة۔" (میرے صحابہ کا اختلاف تمہارے لئے رحمت ہے۔) اور مشہور ان لفظوں سے ہے کہ اختلاف امتی رحمة (میری امت کا اختلاف رحمت ہے)

علماء صاحبانِ فتویٰ واجتہاد میں ہمیشہ یہ اختلاف رہا ہے۔ چنانچہ کسی نے حلت کا فتویٰ دیا تو دوسرے نے حرمت کا۔ اور کسی ایک نے دوسرے پر عیب نہ لگایا۔ بعض علماء نے اس حدیث سے حرفت اور صنعت کے درمیان امت کا اختلاف مراد لیا ہے جو کہ موجب ہنر اور امور دنیا اور کارخانہ صنعت کے انتظام میں آسانی پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح مسائل فقہیہ میں علماء کے اختلاف سے رخصت اور دینی امور میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

اس امت مرحومہ کے خصائص میں سے یہ ہے کہ طاعون، ان کے لئے شہادت ورحمت ہے حالانکہ یہ دوسری امتوں پر عذاب تھا۔ جیسا کہ وارد ہوا ہے کہ "اَلطَّاعُوْنُ رِجْزٌ اُنْزِلَ عَلٰى بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ ۔" (طاعون ایک عذاب ہے جو بنی اسرائیل پر اترا) اور ایک روایت میں علی من قبلکم (تم سے پہلوں پر) آیا ہے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ "اَلطَّاعُوْنُ شَهَادَةٌ لِّكُلِّ مُسْلِمٍ" (طاعون ہر مسلمان کے لئے شہادت ہے) ایک اور روایت میں یہ ہے کہ "اَلطَّاعُوْنُ شَهَادَةٌ لِّاُمَّتِیْ وَرَحْمَةٌ بِهِمْ وَرِجْزٌ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ" یعنی طاعون میری امت کے لئے شہادت اور ان کے ساتھ رحمت فرمانا ہے اور کافروں پر عذاب ہے اور اس سے بھاگنا لشکر سے بھاگنے کے حکم میں ہے۔ چنانچہ سیدہ عائشہ صدیقہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما کی

حدیث میں ہے کہ طاعون سے بھاگنا بلاشبہ معصیت و گناہ کبیرہ ہے۔ دوسرے مقام میں ہم اس سے زیادہ روشن و واضح کلام لائے ہیں۔
اس امت کے خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ جب کسی شخص کے لئے دو آدمی بھلائی کے ساتھ گواہی دیں تو اس کے لئے جنت واجب ہو جاتی ہے لیکن پچھلی امتوں میں جب سو آدمی گواہی دیتے تھے تو اس وقت جنت واجب ہوتی تھی۔ حدیث مبارک میں آیا ہے کہ "مَنْ اَثْنَیْتُمْ عَلَیْہِ بِخَیْرٍ وَجَبَتْ لَہُ الْجَنَّۃُ وَمَنْ اَثْنَیْتُمْ عَلَیْہِ بِشَرٍّ وَجَبَتْ لَہُ النَّارُ۔" تم میں سے جس نے کسی کے لئے بھلائی سے تعریف کی تو اس کے لئے جنت واجب ہو گئی۔ اور جس نے کسی پر برائی سے تعریف کی تو اس کے لئے جہنم واجب ہو گئی۔
اس امت کے خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ گزشتہ امتوں کی بہ نسبت ان کی عمریں کم اور ان کے اعمال اقل ہیں۔ مگر ان کا اجر و ثواب بہت زیادہ ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے کہ فرمایا تمہاری داستان اور ان لوگوں کی داستان جو تم سے پہلے یہود و نصاریٰ تھے اس شخص کی داستان کی مانند ہے کہ جس نے تین مزدور لئے ایک سے صبح سے دوپہر تک یعنی وقت ظہر تک کام لیا۔ دوسرے سے وقت ظہر سے وقت عصر تک کام لیا۔ اور تیسرے سے وقت عصر سے غروب آفتاب تک کام لیا اور ہر ایک کی ایک درہم اجرت مقرر کی۔ جب مزدوروں کو اجرت دینے کا وقت آ گیا تو تینوں مزدور کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ ہمارے عمل متفاوت و کم و بیش ہیں مگر یہ عجیب بات ہے کہ اجرت سب کی برابر ہے۔ اس شخص نے کہا میں نے جو کچھ شرط کی تھی وہ میں نے تم کو دے دی باقی میرا فضل ہے جس کو چاہوں میں دوں۔ پہلے مزدور کی مثال یہود کی ہے اور دوسرے مزدور کی مثال نصاریٰ کی ہے اور تیسرے مزدور کی مثال اس امت مرحومہ کی ہے۔
اس امت کے خصائص میں سے اسناد حدیث کا عطا کیا جانا ہے۔ کیونکہ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ باقی ہے۔ اور قیامت تک یہ سلسلہ یوں ہی رہے گا۔ یہ ان کی خاص خصوصیت اور سنت سنیہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس امت کو یہ شرافت اور فضیلت اور اکرام عطا فرمایا۔ کیونکہ پچھلوں میں سے کسی امت کو یہ بزرگی عطا نہ ہوئی تھی۔ باوجودیکہ انبیاء علیہم السلام کے صحیفے ان کے ہاتھوں میں تھے مگر انہوں نے اپنی ان خبروں کو ان میں ملا دیا جو انہیں غیر ثقہ لوگوں سے حاصل ہوئیں۔ اور ان کے سامنے توریت و انجیل اور جو کچھ انہوں نے خبریں وغیرہ ملائیں ان کے درمیان فرق و امتیاز کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اور اس امت فاضلہ شریفہ زادہا اللہ فضلاً و شرفاً نے احادیث نبوی کو ان ثقہ حضرات سے حاصل کیا جو اپنے زمانہ میں صدق و دیانت کے ساتھ مشہور تھے۔ اور انہوں نے ایسے ہی دوسروں سے یہاں تک کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا اور بحث و تفتیش کرتے رہے تاکہ مرتبہ میں احفظ و اضبط کو پہچان سکیں اور امتیاز کرتے رہے۔ ان لوگوں کے درمیان جن کی صحبت و مجالست اپنے شیخ کے ساتھ زیادہ طویل تھی اور ان کی جن کی صحبت و مجالست کم تھی اور مختلف سندوں اور متعدد طریقوں سے حدیثوں کو لکھتے رہے اور غلط و خطا اور زلۃ و خلل سے حدیثوں کے حروف و کلمات کو ضبط کرتے رہے اور مسلسل تہذیب و تنقیح کرتے رہے۔ خصوصاً اصحاب صحاح کہ ان میں سے عمدہ بخاری و مسلم ہیں کیونکہ یہ دونوں آسمان جلالت و عدالت کے آفتاب ہیں۔ "جَزَاھُمُ اللّٰہُ عَنِ الْمُسْلِمِیْنَ خَیْرًا" یہ خدائے عزوجل کا اس امت پر خاص فضل ہے۔ "نَشْکُرُہُ اللّٰہَ عَلٰی ہٰذِہِ النِّعْمَۃِ وَسَائِرِ نِعَمِہٖ وَنَسْأَلُہُ الْمَزِیْدَ مِنْ فَضْلِہٖ وَکَرَمِہٖ۔"
ابو حاتم رازی فرماتے ہیں کہ گزشتہ امتوں میں سے کسی ایک امت میں حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے وقت سے ایسے علماء و اُمَنَاءُ نہ تھے جو اپنے نبیوں اور رسولوں کے آثار کی حفاظت کریں بجز اس امت مرحومہ کے۔
اور تواریخ و انساب کی معرفت میں بھی یہ امت مخصوص ہے اور یہ اس کی خصوصیات میں سے ہے۔ چنانچہ علماء بیان کرتے ہیں کہ صحابہ کرام میں علم انساب کے سب سے زیادہ جاننے والے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہفتہ میں ایک دن اشعار، تواریخ انساب اور ایام عرب کے بیان کرنے میں صرف کرتے تھے۔ سیدنا عمر

بن خطاب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ شعراء عرب کے دیوانوں اور عرب کے لغات کو یاد کرنے اور التزام رکھنے کی وصیت کرتے تھے تاکہ قرآن کی تفسیر کے وجوہات اور اس کے اعراب کی معرفت میں مددگار ہو۔

اس امت کے خصائص میں سے یہ ہے کہ یہ امت دین کے بارے میں کتابیں تصنیف کرنے میں مخصوص اور توفیق الٰہی پائے ہوئے ہے۔ اور یہ اس حدیث کی مصداق میں ہے کہ

لَا يَزَالُ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ ظَاهِرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ حَتّٰى يَأْتِيَ أَمْرُ اللهِ وَمُجَاهِدِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ وَمُتَمَسِّكِيْنَ بِهٖ سُنَّةَ رَسُوْلِ اللهِ۔

اس امت کے کچھ حضرات ہمیشہ حق کو ظاہر و غالب کرنے والے رہیں گے۔ یہاں تک کہ قیامت آجائے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اور اللہ کے رسول کی سنت کو مضبوطی سے تھامنے والے رہیں گے۔

قرن اول اور قرن ثانی کے شروع میں لوگوں میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع نہ ہوا تھا اگرچہ کتابت علم، جمع احادیث کا سلسلہ موجود تھا مگر یہ تصنیف و تالیف اور اس کی ترتیب کے طریقہ پر نہ تھا۔ اسی طرح تبویب و تفصیل، وضع و اصلاح، تدوین علوم، تعیین موضوع اور مسائل سلوک کا طریقہ بھی نہ تھا۔ مگر اس کے بعد یہ اتنا ہوا کہ گنتی و شمار اور حد و حصر سے باہر ہے۔ جس کا بجز علام الغیوب کے کوئی دوسرا احاطہ نہیں کر سکتا۔ (قرن کے مدت کی تعیین میں کئی قول ہیں ایک قرن تیس سال کی مدت کو بھی کہتے ہیں۔ بیس یا اسی یا سو برس کی مدت کو بھی کہتے ہیں۔ اور آخری قول زیادہ درست ہے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بچہ کو فرمایا "عِشْ قَرْنًا" (تو وہ بچہ سو سال تک زندہ رہا۔)

اولیاء کرام اور مردان غیب:۔ اس امت کے خصائص میں سے ان میں اقطاب، اوتاد، نقباء اور ابدال کے وجود کا ہونا بھی ہے۔ حدیث مرفوع میں بروایت سیدنا انس رضی اللہ عنہ ہے کہ ابدال چالیس مرد و زن ہیں۔ جب ان مرد و زن سے کوئی مرجاتا ہے تو حق تعالیٰ اس کے بدلے کسی دوسرے مرد و زن کو پیدا فرماتا ہے۔ ابن خلاد نے کرامات اولیاء میں اسے نقل کیا ہے۔ اور طبرانی اوسط میں اسے یوں روایت کرتے ہیں کہ زمین ایسے چالیس شخصوں سے خالی نہیں رہتی جو خلیل الرحمٰن (علیہ السلام) کی مانند ہیں۔ ان کے ساتھ زمین قائم ہے۔ اور ان کی برکت سے لوگوں کے لئے بارشیں ہوتی ہیں۔ ان میں کوئی نہیں مرتا۔ مگر یہ کہ حق تعالیٰ کسی دوسرے مرد کو اس کا بدل فرمادیتا ہے۔ ان کا "نام ابدال" اسی بنا پر رکھا گیا ہے اور بعض مشائخ عظام نے فرمایا انہیں ابدال اس لئے کہتے ہیں کہ انہوں نے بری صفتوں کو صفاتِ حمیدہ سے بدل دیا ہے۔ اور یہ صفاتِ بشریت سے باہر آئے ہوئے ہیں۔ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ وہ خلیل الرحمٰن کی مانند ہیں۔ یہ ان کی کمالی صفتوں میں سے ایک خاص صفتِ کمال مراد ہے۔ جو اخص صفات ہیں اور اس میں حضرت خلیل علیہ السلام سے مشارکت رکھتے تھے۔ اور یہی مطلب مشائخ کرام کے اس قول کا ہے کہ ہر "ولی، نبی کے قدم پر ہے"۔ حاشاوہ نبی کے تمام صفات میں ہم مثل مراد نہیں ہے۔ اور ابن عدی "کامل" میں نقل کرتے ہیں کہ ان چالیس ابدال میں سے بائیس افراد ملک شام کے ہوتے ہیں اور اٹھارہ افراد ملک عراق سے اور جب حکم الٰہی ہوگا تو وہ سب انتقال کر جائیں گے۔ اور قیامت قائم ہو جائے گی۔ مسند احمد میں بھی یہی ہے۔

ابو نعیم "حلیہ" میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خیار امت پانچ سو شخص ہیں۔ اور ابدال چالیس ہیں نہ کہ پانچ سو۔ یہ چالیس سے نہ کم ہوتے ہیں نہ زیادہ۔ جب ان میں سے کوئی مرتا ہے تو دوسرا اس کے بدل میں آجاتا ہے۔ یہ تمام روئے زمین میں ہوتے ہیں۔ نیز "حلیہ" میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کے چالیس مرد ایسے ہیں جن کے دل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی برکت سے خلق کو بلاؤں سے محفوظ فرماتا ہے۔ انہیں کو ابدال کہا جاتا ہے۔ انہوں نے یہ درجہ روزہ و نماز اور صدقہ سے نہیں پایا۔ حضرت ابن مسعود نے دریافت کیا پھر کس چیز سے یہ درجہ پایا۔ فرمایا، مسلمانوں کی خیر خواہی اور سخاوت سے۔ مطلب یہ کہ نماز روزہ و صدقہ میں تو وہ مسلمانوں کے ساتھ شریک ہیں لیکن ان کی وہ خاص صفت جس کی بنا پر انہیں یہ درجہ ملا یہی دو صفتیں ہیں۔

حضرت معروف کرخی رحمتہ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ جو شخص روزانہ یہ دعا مانگے کہ:۔ "اَللّٰھُمَّ ارْحَمْ اُمَّۃَ مُحَمَّدٍ۔" (اے خدا امت محمد پر رحم فرما) تو حق تعالیٰ اسے ابدال میں لکھتا ہے۔ اور "حلیہ" میں ہے کہ جو روزانہ دس بار ان لفظوں کو کہے:۔ "اَللّٰھُمَّ اَصْلِحْ اُمَّۃَ مُحَمَّدٍ اَللّٰھُمَّ فَرِّجْ عَنْ اُمَّۃِ مُحَمَّدٍ اَللّٰھُمَّ ارْحَمْ اُمَّۃَ مُحَمَّدٍ" (اے خدا! امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاح فرما۔ اے خدا امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کشادگی فرما۔ اے خدا امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رحم فرما ۔)

منقول ہے کہ ابدال کی نشانی یہ ہے کہ ان سے اولاد پیدا نہیں ہوتی۔ اور وہ کسی چیز پر لعنت نہیں کرتے۔ زید بن ہارون سے مروی ہے کہ ابدال اہل علم ہیں اور امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابدال اگر محدثین نہ ہوں گے تو پھر کون ہوں گے؟

خطیب نے "تاریخ بغداد" میں ایک کتاب سے نقل کیا ہے کہ فرمایا "نقباء" تین سو ہیں اور "نجباء" ستر "ابدال" چالیس "اخیار" سات "عمد" (غالباً اوتاد) چار اور "غوث" ایک ہے۔ نقباء کا مسکن مغرب اور نجباء کا مسکن مصر اور ابدال کا مسکن شام اور اخیار زمین میں سیاح ہیں۔ عمد زمین کے گوشوں میں ہیں اور غوث کا مسکن مکہ مکرمہ ہے۔ اور جب کوئی امر عام عارض ہوتا ہے تو نقبا دعا کرتے ہیں اور اس حاجت کے پورے ہونے کے لئے وہ عاجزی کرتے ہیں۔ ان کے بعد نجباء ان کے بعد ابدال، ان کے بعد اخیار، ان کے بعد عمد، اگر ان کی دعائیں مستجاب ہو جائیں تو فبہا ورنہ غوث عاجزی کرتے ہیں، گڑ گڑاتے ہیں اور سوال کے تمام ہونے سے پہلے غوث کی دعا قبول کر لی جاتی ہے۔

قبر و حشر میں امت کے خصائص:۔ اس امت کے خصائص میں سے یہ ہے کہ قبروں میں گناہوں کے ساتھ داخل ہوں گے اور بے گناہ ہو کر باہر نکلیں گے۔ مسلمانوں کے استغفار کرنے کی بنا پر انہیں گناہوں سے پاک وصاف کر دیا جائے گا۔ اسے طبرانی نے "اوسط" میں بروایت حضرت انس رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے۔ اس حدیث سے خاص قسم کی انسیت ان سے حاصل ہوتی ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ قول شاذ ہے کہ "عذاب قبر اس امت مرحومہ کے ساتھ خاص ہے تاکہ انہیں پاک وصاف کر کے آخرت میں لے جائیں اور ان پر کوئی دوسرا عذاب نہ ہو۔"

انہیں خصائص امت میں سے یہ ہے کہ انہیں کے لئے سب سے پہلے زمین پھاڑی جائے گی۔ مطلب یہ کہ تمام امتوں سے پہلے یہ اپنی قبروں سے باہر آئیں گے۔ حدیث مبارک میں آیا ہے کہ فرمایا میں پہلا ہوں گا کہ سب سے پہلے میرے لئے اور میری امت کیلئے زمین شق ہوگی۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ جب اس امت کو بلایا جائے گا تو ان کے اعضاء وضو سے جو کہ روشن وتاباں محجل ہوں گے۔ غرہ اس سفیدی کو کہتے ہیں جو گھوڑے کے چہرے پر ہو اور محجل گھوڑے کی اس سفیدی کو کہتے ہیں جو اس کے پاؤں پر ہوتی ہے۔ اجل اس بناء پر کہا گیا کہ وضو میں ہاتھوں کو کہنیوں تک اور پاؤں کو ٹخنوں تک خوب دھویا جاتا ہے اور "غر" اس لئے کہا گیا کہ وضو میں مقدم سر، گردن کا بالائی حصہ اور چہرہ دھویا جاتا ہے۔

انہیں خصائص امت میں سے ہے کہ روز حشر موقف میں یہ بلند مقام پر ہوں گے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اور میری امت ایسی بلند جگہ پر ہوگی جو خلائق میں سے کسی کے لئے ایسی مشرف نہ ہوگی مگر یہ کہ وہ ہم میں سے ہونے کو پسند کرے اور نہیں ہے کوئی نبی کہ اس کی امت نے ان کی تکذیب کی ہے مگر یہ کہ ہم گواہی دیں گے کہ انہوں نے حق تعالیٰ کی رسالت پہنچائی۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ میں اور میری امت "رتل" یعنی بلند جگہ پر ہوں گے۔

اس امت کے خصائص میں سے یہ ہے کہ ان کی پیشانیوں پر ایک نشان ہوگا جوان کے سجدہ ریزی کا اثر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ "سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِہِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ۔" (ان کی پیشانیوں میں اثر سجدہ کا نشان ہے۔) لیکن یہ علامت دنیا میں ہے یا آخرت میں۔ اس میں دو قول ہیں ایک یہ کہ یہ سیما یعنی علامت دنیا میں ہے اور اس سے مراد حسن سیرت اور سیمائے اسلام و خشوع ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ بیداری کی وجہ سے ان کے چہرے میں زردی ہے۔ جس سے لوگ گمان کرتے ہیں کہ شاید یہ بیمار ہیں۔ حالانکہ وہ بیمار نہیں ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ سیما و علامت آخرت میں ہوگی کہ ان کے مواضع سجود روشن ہوں گے جس سے وہ پہچانے جائیں گے کہ یہ دنیا میں سجدہ کرنے والے ہیں۔ شہر بن حوشب سے مروی ہے کہ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہروں کے مواضع سجود چودھویں رات کے چاند کی مانند دمکتے ہوں گے۔ عطاء خراسانی فرماتے ہیں کہ اس آیت کے تحت ہر وہ شخص ہے جو نماز پنجگانہ ادا کرتا ہے۔

اس امت کے خصائص میں سے یہ ہے کہ ان کو ان کے نامہ اعمال، ان کے داہنے ہاتھ میں دیئے جائیں گے اسے امام احمد و بزار نے روایت کیا ہے۔ ایسا ہی مواہب میں بھی ہے، مشکوٰۃ میں بھی امام احمد کی حدیث بروایت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اپنی امت کو روز قیامت اس سے پہچانوں گا کہ ان کے اعضاء وضو چمکتے دمکتے ہوں گے۔ اور ان کے نامۂ اعمال ان کے داہنے ہاتھ میں ہوں گے۔ اور میں اس سے پہچانوں گا کہ ان کی اولاد ان کے آگے سعی کرے گی۔ شیخ ابن حجر شرح میں لکھتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ ان کا نامۂ اعمال دوسروں سے پہلے داہنے ہاتھ میں دیا جائے۔ اب رہا "اولاد کی سعی؟" ممکن ہے کہ یہ بھی خصائص میں سے ہو۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ اس امت کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنی جانب چلتا ہوگا۔ جیسا کہ قرآن کریم ناطق ہے۔ انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ ہر وہ چیز ان کے لئے خاص ہے جو انہوں نے بذات خود سعی کی یعنی اعمال کئے۔ اور وہ بھی جو ان کے بعد لوگوں نے ان کے لئے سعی و اعمال کئے۔ (ایصالِ ثواب، صدقہ جاریہ، اور استغفار وغیرہ) حالانکہ ان سے پہلی امتوں کے لئے صرف وہی اعمال تھے جو انہوں نے بذات خود کئے۔ ابن عکرمہ اس جگہ حق سبحانہ وتعالیٰ کے ارشاد سے ایک اشکال بیان کرتے ہیں کہ فرمایا "وان لیس للانسان الاما سعی" (بیشک نہیں ہے انسان کے لئے مگر وہی جو اس نے عمل کئے) کیونکہ یہ آیت اس پر دلالت کر رہی ہے کہ آدمی کے لئے بجز اس چیز کے جو اس نے خود عمل کئے کوئی نفع دینے والی چیز نہیں ہے۔ علماء نے اس اشکال کے کئی جواب دیئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ آیہ کریمہ اس ارشاد باری سے منسوخ ہے کہ فرمایا:۔ وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ

ایصال ثواب کا ثبوت۔ لہٰذا بچہ ماں باپ کے میزان میں گردانا جاتا ہے اور ان سے وہ خوشی و مسرت پاتے ہیں۔ اور حق تبارک وتعالیٰ، ماں باپ کی شفاعت بیٹوں کیلئے اور بیٹوں کی شفاعت ماں باپ کیلئے قبول فرماتا ہے اس کی دلیل حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے "اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَیُّھُمْ اَقْرَبُ لَکُمْ نَفْعًا" (تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے تم کیا جانو کہ ان میں کون تمہارے زیادہ کام آئے) قرطبی فرماتے ہیں کہ بکثرت احادیث اس قول پر دلالت کرتی ہیں کہ مومن کو عمل صالح کا ثواب اس کے غیر کی جانب سے اسے پہنچتا ہے۔ "صحیح" میں مروی ہے کہ فرمایا جو کوئی اس حال میں مرجائے کہ اس کے ذمہ روزہ ہے تو اس کا ولی اس کی طرف سے روزہ رکھے۔ اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی اپنے غیر کے لئے حج کرے اسے لازم ہے کہ پہلے اپنا حج کرے پھر اس کی

طرف سے حج (بدل) کرے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنے بھائی عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کی طرف سے اعتکاف کیااور ان کی طرف سے غلام آزاد کیا۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ میری ماں کا انتقال ہو گیاہے کیامیں ان کی طرف سے صدقہ دوں۔ فرمایاہاں! عرض کیاکون ساصدقہ افضل ہے؟ فرمایاپانی دینا۔ اس پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ایک کنواں بنایا۔ اور کہا "ہٰذِہٖ لِاُمِّ سَعْدٍ" (یہ سعد کی ماں کا کنواں ہے) حضرت عبداللہ بن بکر رضی اللہ عنہ کی دادی نے نذر مانی تھی کہ پاپیادہ مسجد قبا جائیں گی۔ پھر ان کا انتقال ہو گیااور نذر پوری نہ کر سکیں اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فتویٰ دیا کہ ان کے بیٹے ان کی جانب سے وہاں تک جائیں۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آیۂ کریمہ "وَلَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی" اس میں انسان سے مراد ابوجہل ہے۔ لیکن بعض کے نزدیک عقبہ بن ابی معیط اور ولید بن مغیرہ ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اس جگہ انسان سے مراد، زندہ ہے نہ کہ مردہ۔ لیکن بعض کی رائے ہے کہ ہماری شریعت دلالت کرتی ہے کہ انسان کے لئے اپنے عمل اور دوسروں کے عمل دونوں ہی نافع ہیں۔

صاحب کشاف (زمخشری جو کہ معتزلی ہے) نے کہاہے کہ "اپنی ذات کو غیر کے عمل نفع نہیں دیتے مگر وہ جو مبنی ہوں اپنے نفس کے عمل پر۔ اور ہے وہ مومن ومصدق۔" لہٰذا اس اعتبار سے غیر کا عمل خاص اس کے اپنے عمل کے تابع ہونے کی بناپر حکم میں اپنے عمل اور اس کے قائم مقام کے ہوگا۔ اور نیز غیر کے عمل نافع نہیں جب کہ وہ غیر اپنے لئے عمل کرتاہے۔ لیکن جب اس نے دوسرے کے لئے نیت کرلی تو وہ حکم شرع میں اس کا نائب ووکیل ہو گیا۔ اور اس کا قائم مقام بن گیا۔ (انتہی) بلاشبہ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ قرأت قرآن کا ثواب میت کو پہنچتاہے یا نہیں۔ مذہب شوافع کے اکثر مشہور علماء اور امام مالک اور احناف کی مختصر جماعت کے نزدیک نہیں پہنچتا۔ لیکن شوافع اور احناف کے اکثر علماء کا یہ مذہب بھی ہے کہ پہنچتاہے۔ امام احمد بھی اسی کے قائل ہیں۔ بلکہ امام احمد سے تو یہ منقول ہے کہ میت کو ہر چیز پہنچتی ہے۔ خواہ صدقہ ہو یانماز وحج، اعتکاف وقرأت اور ذکر وغیرہ۔ لیکن کہا گیاہے کہ قبر پر قرأت بدعت ہے۔ شیخ شمس الدین قسطلانی کہتے ہیں کہ قرآن کریم کا ثواب پہنچنا صحیح ہے۔ قریب سے ہو یا اجنبی یا وارث یا غیر وارث کی طرف سے ہو۔ جس طرح کہ با جماع صدقہ، دعا اور استغفار نفع دیتاہے۔

امام عبداللہ یافعی رحمہ اللہ "روض الریاحین" کے تکملہ میں ذکر فرماتے ہیں کہ لوگوں نے شیخ عزیز الدین بن عبدالسلام کو خواب میں دیکھا کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم دنیامیں حکم دیتے تھے کہ میت کو قرآن کی قرأت کا ثواب نہیں پہنچتا اب معلوم ہوا کہ پہنچتاہے۔ قرآن پڑھو اور اس کا ثواب پہنچاؤ۔

قاضی حسین نے فتویٰ دیاہے کہ قبر پر قرأت قرآن کی اجرت لیناجائز ہے۔ جس طرح کہ اذان اور تعلیم قرآن کیلئے اجرت لیناجائز ہے۔ چاہئے کہ قرآن کے بعد میت کے لئے دعا کرے۔ اس لئے کہ دعا اس کے ساتھ مل جاتی ہے۔ اور بعد قرأت دعا کرنا قبولیت سے زیادہ نزدیک اور برکت کی رو سے زیادہ ہے۔

شیخ عبدالکریم سالوسی بیان کرتے ہیں کہ اگر قاری اپنی قرأت کے دوران نیت کرے کہ اس کا ثواب میت کیلئے ہے تو نہیں پہنچے گا۔ کیونکہ یہ عبادت بدنی ہے۔ لہٰذا غیر سے واقع نہیں ہوگی۔ لیکن اگر نیت کرنے کے بعد قرأت کی اور جو کچھ حاصل ہواہے اسے میت کے لئے بخش دے تو یہ دعاہے۔ اور اس کے حصول سے ثواب میت کو نفع دیتاہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ موضع قرآن، برکت اور نزولِ رحمت کی جگہ ہے۔ اور مردہ حکم میں زندہ کے موجود ہے۔ لہٰذا جس وقت قاری اسے ثواب پہنچائے تو نزولِ رحمت اور حصولِ برکت کی امید رکھنی چاہئے۔

صاحبِ "غدہ" بیان کرتے ہیں کہ اگر کوئی چشمہ نکالے، کنواں کھودے یا درخت لگائے یا قرآن کو اپنی زندگی میں وقف کرے۔ یا ان کاموں کو دوسرے کے مرنے کے بعد کرے تو اس کا ثواب میت کو پہنچتا ہے جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے۔ اور وقف کرنا مصحف اور قرآن کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر وقف اس کے ساتھ شامل ہے۔ اور یہ قیاس میت کی طرف سے قربانی کے جائز ہونے پر تقاضا کرتا ہے اس لئے کہ یہ صدقہ کی ایک قسم ہے۔ لیکن "تہذیب" میں کہا گیا ہے کہ اس کے حکم کے بغیر غیر کے لئے قربانی کرنا جائز نہیں ہے۔ یہی حکم میت کا ہے مگر یہ کہ اس پر وصیت کر دی گئی ہو۔

امیر المومنین سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد آپ کی طرف سے قربانی دیتے تھے اور ابو العباس محمد بن اسحاق سے "سراج" میں مروی ہے کہ انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ستر جانوروں کی قربانی دی ہے اب رہا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہدیہ کرنا تو اس کے انکار میں میرے پاس نہ کوئی حدیث ہے نہ کوئی اثر۔ ایک قلیل جماعت نے اس کا انکار کیا ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ اسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نہیں کیا۔ (حالانکہ اوپر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا عمل گزر چکا ہے) بعض فقہائے متاخرین نے اسے مستحب قرار دیا ہے۔ اور کچھ لوگ اسے بدعت جانتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے غنی ہیں۔ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے بحکم "من سن سنۃ حسنۃ۔۔۔ الی آخر الحدیث۔ یعنی جس نے کوئی عمل خیر کیا آپ کی امت میں سے بغیر اس کے کہ عامل کے ثواب میں سے کچھ کمی ہو تو ان سب کے برابر اسے اجر ملے گا۔ الخ۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کوئی چیز نہیں ہے کہ عمل کرے اسے کوئی امتی مگر یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس میں اصل بنیاد ہیں۔ نصرت کی تحقیق میں کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کے تمام حسنات اور ان کے ہر عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحائف یعنی نامہ اعمال میں اس سے زیادہ ہیں۔ جو عامل کے اجر میں ہے اور اس زیادتی کو بجز خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ اس لئے کہ مہتدی یعنی ہدایت پانے والا اس کا اجر اور عامل قیامت تک ہوں گے۔ اور اس کا تازہ بتازہ اجر شیخ و معلم کے لئے اس کے ثواب کے برابر ہوتا ہے۔ اور استاد کے استاد کو دونا تیسرے استاد کو چار گنا اور چوتھے استاد کو آٹھ گنا، اسی طرح بعد اجور حاصلہ ہر مرتبہ میں اجر پہنچتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ سلسلہ پہنچ جاتا ہے اور اسی بنیاد پر بعد والوں پر پچھلے لوگوں کی فضیلت معلوم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دس مراتب کو جب فرض کئے جائیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک ہزار چوبیس گنا ثواب حاصل ہوگا۔ پھر جب دسویں سے گیارہواں ہدایت پائے گا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اجر و ثواب دو ہزار اڑتالیس ہو جائے گا۔ اسی طرح جتنے زیادہ مرتبہ ہوتے جائیں گے اتنے ہی ماقبل سے دوچند اجر و ثواب بڑھتا جائے گا اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ جیسا کہ محققین جواب دیتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام اقسام شرف میں کامل ہیں لیکن چونکہ قاری کی قرآت کا ثواب اس کے معلم کو بھی پہنچے گا اور پھر معلم کے معلم کو یہ سلسلہ اسی طرح اوپر کو جاری ہوگا۔ یہاں تک کہ معلم اول جو کہ شارع علیہ السلام ہیں آپ کو ان سب کے برابر اجر پہنچے گا جیسا کہ اوپر مذکور ہوا اُسی زمرہ میں اس دعا کی مشروعیت ہے جو خانۂ خدا کی رؤیت کے وقت ہے۔ زائرین کہتے ہیں "اَللّٰھُمَّ زِدْ ہٰذَا الْبَیْتَ تَشْرِیْفًا وَّتَعْظِیْمًا" (اے خدا! اس گھر کی شرافت اور عظمت کو اور زیادہ فرما) یہ سب مواہب لدنیہ میں بیان ہوا ہے۔ چنانچہ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ:۔ "مَنْ سَنَّ سُنَّۃً حَسَنَۃً فَلَہٗ مِثْلُ اَجْرِ مَنْ عَمِلَہَا۔" (جس نے کوئی اچھی بات نکالی تو اس کے لئے اس کے عمل کرنے والوں کے برابر ثواب ہے) یہ سنت حسنہ کے عمل کے سنت ہونے پر امت کو ترغیب و تحریص ہے۔ اور اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اجور غیر متناہی کے اثبات اور اپنے کمال کی طرف اشارہ ہے۔

اس امت کے خصائص میں سے یہ ہے کہ یہ امت تمام امتوں سے پہلے جنت میں داخل ہوگی۔ طبرانی نے "اوسط" میں بروایت سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حرام کر دی گئی جنت انبیاء پر جب تک کہ میں داخل نہ ہوں۔ اور حرام کر دی گئی ہے دوسری امتوں پر جنت جب تک کہ میری امت داخل نہ ہو۔

انہیں خصائص میں سے یہ ہے کہ جنت میں اس امت کے ستر ہزار لوگ بے حساب داخل ہوں گے اسے شیخین نے روایت کیا اور بیہقی وطبرانی کے نزدیک ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ میری امت کے ستر ہزار افراد کو بے حساب جنت میں داخل فرمائے گا۔ میں نے حق تعالیٰ سے اس سے زیادہ کیلئے سوال کیا حق تعالیٰ نے وہ بھی مجھے عنایت فرمایا یعنی ان ستر ہزار میں سے ہر ایک شخص مزید ستر ہزار شخص کو بے حساب لے جائے گا۔

غرض کہ حق تبارک وتعالیٰ نے اس امت کو وہ کچھ عنایت فرمایا ہے جو کسی دوسری امت کو مرحمت نہ ہوا۔ جیسا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ کچھ دیا ہے جو دوسرے نبیوں کو نہیں دیا۔

جب بھی اللہ تعالیٰ سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اطاعت کے لئے دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام رسولوں میں مکرم فرمایا اور ہمیں تمام امتوں میں مکرم بنایا۔ صلی اللہ علی خیر خلقہ محمد و آلہ واصحابہ وامتہ اجمعین ۔

ذکر معراج مبارک

وصل:۔ اخص خصائص، اشرف فضائل وکمالات، ابہر معجزات وکرامات میں سے اللہ تعالیٰ جل مجدہٗ کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسریٰ ومعراج کے ساتھ مخصوص ومشرف فرمانا ہے کیونکہ کسی نبی یا رسول کو اس سے مشرف ومکرم نہ کیا گیا اور جس مقام علیا تک آپ کی رسائی ہوئی اور جو کچھ وہاں دکھایا گیا کوئی ہستی کبھی وہاں نہ تو پہنچی ہے اور نہ دیکھا ہے۔ فرماتا ہے۔

سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝

پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندۂ خاص کو رات کے تھوڑے عرصے میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا وہ جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھیں تاکہ دکھائیں ہم انہیں اپنی نشانیاں بیشک وہ سنتا دیکھتا ہے۔

اسریٰ کا معنی ہے لے جانا۔ مطلب یہ کہ حضور ﷺ کو مکہ مکرمہ سے مسجد اقصیٰ تک لے جایا گیا۔ اس کا منکر کافر ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب سے ثابت ہے۔ پھر وہاں سے آسمان پر لے جانے کا نام معراج ہے۔ یہ احادیث مشہورہ سے ثابت ہے اس کا منکر مبتدع، فاسق اور مخذول ہے۔ دیگر جزئیات اور عجیب وغریب احوال کا ثبوت حدیثوں سے ہے۔ اس کا منکر جاہل ومحروم ہے۔ مذہب صحیح یہی ہے کہ وجود اسریٰ ومعراج سب کچھ بحالت بیداری اور جسم کے ساتھ تھا۔ صحابہ، تابعین اور اتباع کے مشاہیر علماء اور ان کے بعد محدثین، فقہا اور متکلمین کا مذہب اسی پر ہے۔ اس پر احادیث صحیحہ اور اخبار صریحہ متواتر ہیں۔ بعض اس پر ہیں کہ معراج خواب میں روح سے تھی۔ اس کی جمع وتطبیق اس طرح کی ہے کہ یہ واقعہ متعدد مرتبہ ہوا۔ ایک مرتبہ بیداری میں اور دیگر اوقات خواب میں روح سے۔ کچھ مرتبہ مکہ مکرمہ میں اور کچھ مرتبہ مدینہ طیبہ میں، اس کے باوجود اس پر سب متفق ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی رؤیا یعنی خواب وحی ہے جس میں کسی شک وشبہہ کو دخل نہیں۔ اور خواب میں ان کے دل بیدار ہیں۔ اور ان کی آنکھیں پوشیدہ اس طرح پر کہ جیسے حضور ومراقبہ اس کے وقت آنکھیں پوشیدہ ہوتی ہیں تاکہ محسوسات میں سے کوئی چیز مشغول نہ کردے۔

قاضی ابُو بکر بن العربی کہتے ہیں کہ اس کا وقوع خواب میں توطیہ وتنبیہ یعنی سمجھانے اور آسان کرنے کے لئے تھا۔ جیسا کہ ابتدائے نبوت میں رؤیائے صادقہ دیکھتے تھے تاکہ وحی کا بوجھ جو ایک امرِ عظیم ہے اس کی برداشت آپ کو آسان و سہل ہوجائے۔ چنانچہ قوائے بشریہ اس کی برداشت میں کمزور اور عاجز ہیں۔ ایسے ہی معراج پہلے خواب میں واقع ہوئی تاکہ بیداری میں اسے پانے کی قوت واستعداد حاصل ہوجائے بلکہ اسکے قائلین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ خواب میں اس کا وقوع بعثت سے پہلے تھا۔ (واللہ اعلم)

بعض عارفین فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اسرات اور معاریج بہت تھیں اور بعض نے چونتیس کہا ہے۔ جن میں سے ایک تو بچشم سر بیداری سے تھی۔ باقی خواب میں روحانی تھیں۔ (واللہ اعلم)۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ اسریٰ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جسمانی بیداری میں تھی۔ اور وہاں سے معراج آسمانوں تک خواب میں روحانی تھی۔ اور وہ اسی آیتہ کریمہ سے دلیل لیتے ہیں کہ اس میں مسجد اقصیٰ کو اسراء کی غایت ٹھہرایا ہے۔ اگر اسراء جسمانی، مسجد اقصیٰ سے آگے ہوتی تو ذکر فرمایا جاتا۔ یہ ذکر فرمانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بزرگی ومدح میں اور حق تبارک وتعالیٰ کی قدرت کی تعظیم وتعجب میں زیادہ بلیغ تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آیتہ کریمہ میں مسجد اقصیٰ کے ذکر کی تخصیص، وقوع خلاف ونزاع اور اس میں قریش کے انکار کی بنا پر ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منکرین قریش کا اس کی علامتوں اور نشانیوں کو دریافت کرنے کی وجہ سے اس کا ذکر ہے۔ جیسا کہ آگے تذکرہ آئے گا۔ اس بارے میں احادیث مشہورہ اور اخبار صحیحہ بکثرت وارد ہیں بلکہ آیات قرآنیہ بھی ہیں۔ چنانچہ سورۂ "والنجم" میں واقع ہے۔ اگرچہ سورۂ والنجم میں جو کچھ واقع ہوا ہے اسے جبریل علیہ السلام کی رؤیت اور ان کے نزدیک ہونے پر کچھ حضرات محمول کرتے ہیں لیکن تحقیق یہی ہے کہ یہ قصہ معراج پر محمول ہے۔

بندۂ مسکین (شیخ محقق رحمہ اللہ) ثبتہ اللہ فی مقام الصدق والیقین کہتا ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کا یہ اشارہ کہ:۔ "لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا" (تاکہ ہم دکھائیں انہیں اپنی نشانیاں) معراج کے ساتھ ہے۔ مطلب یہ کہ مسجد اقصیٰ لیجایا گیا۔ یہاں تک کہ وہاں سے آسمانوں پر لے جاکر نشانیوں کو دکھایا گیا۔ اس لئے کہ نشانیوں کا دکھانا اور غایت کرامات ومعجزات کا ظاہر فرمانا آسمانوں میں تھا۔ اور مسجد اقصیٰ میں جو واقع ہوا ہے اس پر انحصار نہ تھا۔ مسجد اقصیٰ لے جانا وہ اس معراج کا مبدء ہے۔ اسی بنا پر مسجد اقصیٰ کا ذکر فرمایا۔ اور واقعہ اگر خواب میں ہوتا تو کفار اسے مستبعد نہ جانتے۔ اور ضعفاء مومنین فتنہ میں نہ پڑتے نیز خواب میں واقعات وقضایا کے وقوع پذیر ہونے کو خارج میں حصر واحصاء غیر متعارف ہے۔ نیز صیغہ "اسریٰ" کا اطلاق خواب پر نہیں کرتے اور جب اسریٰ بیداری میں ہوا تو معراج جو اس کے بعد واقع ہوا بیداری میں ہوگا اور اس کے بعد خواب میں ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ جو لوگ وقوع معراج کو خواب میں ہونے کے قائل ہیں ان کے شبہات کی موجب چند چیزیں ہیں۔ ایک تو حق تعالیٰ کا یہ قول ہے کہ:۔ "وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِیْٓ اَرَیْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ۔" نہیں بنایا ہم نے اس خواب کو جو آپ کو دکھایا مگر لوگوں کے امتحان کے لئے اس آیۂ کریمہ کو بعض مفسرین قضیۂ معراج پر محمول کرتے ہیں۔ کیونکہ "رؤیا" نیند میں خواب دیکھنے کو کہتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ "رؤیا" یا تو قضیہ حدیبیہ کے رؤیا پر یا واقعہ بدر کے رؤیا پر محمول ہے۔ اور اہل علم رویت بصری کے معنی میں بھی رؤیا استعمال کرتے ہیں اور وہ "متنبیؔ" شاعر کے اس قول سے استناد کرتے ہیں کہ "وَرُؤْيَاكَ اَحْلٰى فِی الْعُيُوْنِ مِنَ الْغَمْضِ ۔" اور بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ چونکہ معراج رات میں واقع ہوئی اس بنا پر اس کا نام رؤیا رکھا۔ اور یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ فرمایا "فَاسْتَيْقَظْتُ" (تو میں بیدار ہوگیا) اس میں بھی دلیل ہے کہ اسریٰ ومعراج نیند میں نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ احتمال رکھتا ہے کہ یہ اس نیند سے بیداری مراد ہے جو فرشتے کے حاضر ہونے سے پہلے تھی۔ مطلب یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں تھے کہ فرشتے نے حاضر ہوکر بیدار کیا۔ اور براق پر سوار

کیااور لے گئے۔ اور اگر بیداری سے مراد، قضیہ معراج کے مکمل ہونے کے بعد کی نیند سے ہے جیسا کہ واقع ہوا "ثُمَّ اسْتَيْقَظْتُ وَاَنَا فِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" (پھر میں بیدار ہوا تو میں مسجد حرام میں تھا) تو ممکن ہے کہ "اِسْتَيْقَظْتُ" بمعنی اصبحت "یعنی میں نے صبح کی ہے۔" یا یہ بیداری اس دوسری نیند سے ہے جو بیت الحرام آنے کے بعد واقع ہوئی ہے۔ اور "اسریٰ" تمام شب کی نہ تھی بلکہ رات کے مختصر حصے میں تھی۔ بعض محققین کہتے ہیں کہ "استیقاظ" سے مراد، افاقہ، ہشیاری اور اس حال سے اپنے حال پر آنا ہے۔ چونکہ جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ملکوت سموات وارض کے عجائب و غرائب کا مطالعہ فرمایا اور ملاء اعلیٰ اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نشانیوں اور اسرار نامتناہی کا مشاہدہ کیا آپ کی حالت سخت ہوگئی تھی۔ اور آپ کا باطن، نیند کی حالت کے مشابہ ہوگیا تھا۔ اہل علم فرماتے ہیں کہ مشاہدہ ملکوت اگرچہ بیداری میں ہے مگر وہ ایک قسم کی عالم محسوسات سے غیبوبت ہے اسی کو وہ بین النوم والیقظہ یعنی نیند و بیداری کی درمیانی حالت سے تعبیر کرتے ہیں۔ درحقیقت وہ حالت بیداری میں ہے۔ لیکن غیبت کے عارض ہونے کے سبب اور اس کے زائل ہونے کی وجہ سے کبھی کبھی اسے نیند سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ اور ایک روایت میں "وَاَنَا بَيْنَ النَّائِمِ وَالْيَقْظَانِ۔" (میں سونے اور جاگنے والے کی حالت کے مابین تھا) بھی آیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ نوم سے مراد سونے کی مانند کروٹ سے لیٹنا ہے۔ اور ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ "بَيْنَ اَنَا نَائِمٌ فِی الْحِجْرِ وَرُبَّمَا قَالَ مُضْطَجِعٌ۔" (حجر اسود کے قریب میں سونے کے قریب قریب تھا اور بعض نے روایت کیا میں کروٹ سے لیٹا ہوا تھا) باوجود اس کے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اس حال کا مشاہدہ نہیں کیا اور نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی سنا۔ کیونکہ قصہ معراج ہجرت سے پہلے کا ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ بعد ہجرت بارگاہ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے اور اس وقت بھی وہ سات آٹھ سال کے بچے تھے۔ جیسا کہ اہل علم تصریح کرتے ہیں۔ یہی حال حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کا ہے کہ کہا "مَا فُقِدَ جَسَدُ مُحَمَّدٍ۔" (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم اطہر بستر مبارک سے گم نہ ہوا) یہ ان لوگوں کے دلائل ہیں جو کہتے ہیں کہ "اسریٰ" خواب میں ہوئی۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس زمانہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہ تھیں اور نہ ضبط و حفظ کی عمر ہی تھی۔ بلکہ ممکن ہے کہ پیدا بھی نہ ہوئی ہوں۔ اس قول کے بموجب جو کہتے ہیں کہ اول اسلام میں بعثت سے ایک یا ڈیڑھ سال کے بعد "اسریٰ" ہوئی (واللہ اعلم)۔ مقصود یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ان دوسری حدیثوں پر راجح نہیں ہے۔ جو بطریق مشاہدہ حدیث روایت کرتے ہیں۔ اور حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں واقع ہوا ہے کہ "مَا فُقِدَ جَسَدُ مُحَمَّدٍ۔" (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم اطہر گم نہ ہوا) اس سے استدلال بے شبہ خطا ہے۔ اور وہ جو آیا ہے کہ "مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى۔" (دل نے نہیں جھٹلایا جو آنکھ نے دیکھا) یہ خواب پر دلالت نہیں کرتا اس لئے کہ مراد یہ ہے کہ دل نے آنکھ کو غیر حقیقت کا وہم نہیں ڈالا۔ بلکہ اس کی رؤیت کی تصدیق کی اور جس چیز کو آنکھ نے دیکھا دل نے اس کا انکار نہ کیا۔ بدلیل:۔ "مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى۔" (نہ آنکھ جھپکی اور نہ بے راہ ہوئی) اب رہا فلسفیوں کے اباطیل و منزخرفات سے تمسک و استدلال کرنا کہ "طبعی طور پر جسم ثقیل بلندی کی جانب نہیں جاسکتا اور آسمان میں خرق والتیام (پھٹنا اور ملنا) جائز نہیں ہے" وغیرہ۔ یہ باتیں طریقۂ اسلام میں باطل و لغو ہیں۔

ایک اور جماعت اہل اشارات و تاویلات کی صورتوں کو معانی پر محمول کرتی ہے یہ معراج کو روحانی تصور کرتی ہے۔ ان کے اس قیاس پر کہ حشر کو روحانی کہتے ہیں اس معنی میں نہیں کہ روح کو خواب میں معراج ہوئی۔ بلکہ اس معنی میں کہ معراج، ترقی کے مقامات و احوال اور عروج کمال کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ وہ جبریل علیہ السلام سے روح محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اور براق سے آپ کا نفس مبارک جو روح کی سواری ہے جو اپنی خاصیت میں سرکش ہے اور رام نہیں ہوتا مگر روحانی قوت سے۔ اور آسمان سے مراد مقام قرب

اور سدرۃ المنتہیٰ سے انتہائی مقامات ہیں، ان کے اسی قیاس کے مطابق یہ فرقہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں فرعون، عصا، نعلین اور وادی مقدس کی تاویلات کرتا ہے اگر یہ صورتوں کا اثبات کریں (یعنی الفاظ و کلام کے ظاہری مطلب و مفہوم کو برقرار رکھیں) پھر وہ ان کو معانی کی طرف اشارہ کریں تو علم و معرفت میں ایک چیز ہے اور اس کا کوئی مرتبہ ہے۔ ان کے قیاس پر کہ حشر جسمانی و روحانی کے درمیان جمع کریں۔ امام غزالی رحمہ اللہ بھی اسی خیال کے بھنور میں ہیں اگر صرف معانی کا اعتقاد کریں اور الفاظ وصور کے قائل نہ ہوں تو یہ بجائے خود کفر والحاد ہے۔ اور یہ مذہب باطنیہ ہے۔ اس مسکین (یعنی شیخ محقق رحمہ اللہ) کے ایمانی ذائقہ پر یہ طریقہ اولیٰ بھی استبعاد اور انکار کی طرف مشیر اور موہم ہے گویا انہوں نے وجود صور کو جب دائرہ امکان عادی سے بعید جانا تو تاویل کی طرف گھوم گئے۔ حالانکہ ایمان اس کے سننے اور ماننے ہی کا نام ہے جیسا کہ اس واقعہ معراج کے سلسلے میں سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کیا اور اسی دن سے آپ "صدیق" کے نام و لقب سے موسوم ہوئے اور چند ایک ضعیف الاعتقاد مسلمان دائرہ ایمان سے نکل گئے۔ علم الیقین، عین الیقین سے پہنچتا ہے۔ جب بھی کلام کرنا اور زبان تاویل اور اس کے امکان کا اثبات دلائل کلامیہ سے کھولنا عقل اور اس کے حیلوں میں گرفتار ہونا ایمان و بندگی سے بعید ہے۔ اور ہم ایمانداروں کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے بڑھ کر کوئی دلیل نہیں ہے، جو کچھ ہم ان سے سنیں گے کریں گے۔ یہ فرقہ اسے تقلید کہتا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ یہ تقلید کس کی ہے؟ یہ تقلید اس کی ہے جس کا تحقق معجزات قاہرہ سے ثابت ہے۔ اور محقق کی تقلید عین تحقیق ہے۔ اور حقیقتہً یہ تقلید بھی نہیں ہے یہ صراطِ مستقیم کا اتباع ہے۔ مقلد تو تم ہو کہ عقل کی تقلید کرتے ہو اور اس کے کہے پر چلتے ہو۔ جس کی تحقیق ثابت شدہ نہیں ہے۔ اور اس کی راہ میں سراسر شکوک و شبہات ہیں۔ فلاسفر اصلیت میں خود انبیاء علیہم السلام کے منکر ہیں۔ ہمیں ان سے کیا کام۔ ان کا نبی تو ان کی عقل ہے اور ان متکلمین خانہ خراب کو کیا ہو گیا ہے کہ باوجود راہ راست کے وہ گم گشتہ ہیں۔ اور راہ میں گفتگو، شبہہ اور جدال پیدا کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کی نیت، فلاسفہ کی مخالفت اور ان کا رد ہے لیکن سلوک راہ میں عقل اور اس کے پیروؤں کی موافقت کرتے ہیں۔ خود بھی گم راہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گم راہ کرتے ہیں۔

اثبات معراج شریف:۔ وصل:۔ باخبر رہنا چاہئے کہ معراج مبارک کی حدیث کو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی جماعت کثیرہ نے تواتر معنوی کے مرتبہ میں روایت کیا ہے اگرچہ بعض خصوصیات میں روایات مختلف ہیں۔ ان میں مشہور وہ طویل حدیث ہے جسے امام بخاری و مسلم نے اپنی صحیح میں بروایت حضرت قتادہ، حضرت انس، مالک بن صعصعہ رضی اللہ عنہم ذکر فرمایا ہے اور حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب انور کے شق کرنے اور اسے سونے کے طشت میں آب زم زم سے غسل دینے اور اسے حکمت و ایمان سے پر کرنے پھر اسے سینہ اطہر میں اپنی جگہ رکھنے اور اسے برابر کرنے کا ذکر ہے۔ شق صدر شریف چار بار ہوا ہے۔ سب سے پہلے عہد طفولیت میں جبکہ آپ حضرت حلیمہ سعدیہ کے پاس تھے، دوسری مرتبہ وقت بلوغ کے قریب دسویں برس میں، تیسری مرتبہ بعثت کے وقت اور چوتھی مرتبہ اس وقت جبکہ آپ کو "اسریٰ" یعنی معراج ہوئی۔ تاکہ کمال طہارت و صفا کے ساتھ عالم ملکوت میں پہنچنے میں مستعد و متہی ہوں۔ اسی قیاس پر وضو ہے کہ نماز سے پہلے پاکیزگی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ نماز معراج کا نمونہ ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو (طور پر کلام الٰہی سے مشرف ہوتے وقت) اس تہیہ اور استعداد کا اتفاق نہ ہوا۔ اسی وجہ سے رؤیت الٰہی سے مشرف نہ ہوئے۔ یہ اس مقام کی خوبی ہے جس کا فطرت کے پرستار یعنی نیچری انکار کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ شق صدر اور اخراجِ قلب، موت کی علت ہے۔ یہ زندگی کے ساتھ جمع نہیں ہوتی۔ اور اربابِ عقل تاویل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ غسل و طہارتِ قلب سے مراد، حدوث و امکان کے میل سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باطنی صفائی ہے۔ اور اہلِ ایمان بغیر تاویل،

بغیر ظاہر سے انحراف کے تصدیق کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ سب اسباب عادی ہیں اور حق تعالیٰ کے لئے کوئی چیز محال و ممتنع نہیں ہے۔ لیکن سونے کا طشت لانا اور اس میں غسل دینا یہ عرف و عادت کے اعتبار سے ایک قسم کی تکریم ہے۔ اور اس طرف اشارہ ہے کہ آپ تمام عالم میں معظم و مکرم ہیں لیکن یہ کہ آپ کی شریعت میں سونے کے برتن کا استعمال حرام ہے تو اس کے جواب میں اہل علم فرماتے ہیں کہ سونے کا حرام ہونا اس دنیا کے لئے ہے۔ لیکن آخرت میں خالصاً مسلمانوں کیلئے ہی ہوگا۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ اے نبی فرمادو یہ انہی کے لئے دنیا میں ایمانداروں کیلئے اور یہ خالص ہے قیامت کے دن۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ: ”هُوَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَنَا فِي الْآخِرَةِ“ سونا کفار کے لئے دنیا میں ہے اور ہمارے لئے آخرت میں۔ قصہ اسراء در حقیقت عالم آخرت کے قبیل سے ہے نیز اس کا استعمال اور فائدہ اٹھانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے حاصل نہیں ہے بلکہ ملائکہ نے کیا ہے جو اس کے مکلف نہیں ہیں۔ بلکہ احتمال رکھتا ہے کہ یہ واقعہ حرام ہونے سے پہلے کا ہے اور واقعہ بھی یہی ہے اس لئے کہ اس کی تحریم مدینہ منورہ میں بعد از اسریٰ ہوئی ہے۔ بعض ارباب معانی نے سونے اور قلب نبوی میں مناسبتیں نکالی ہیں۔ یہ کہ سونا جنت کے ظروف میں سے ہے۔ اور معدنیات میں اثقل جواہر ہے۔ نہ اسے مٹی کھاتی ہے اور نہ اس میں زنگ لگتا ہے۔ اسی طرح ہر دل سے قلب نبوی ثقیل تر، زرین تر اور مزین تر ہے اس میں وحی کا بوجھ ہے اور اسے سفلیات کی خاک نہیں کھاتی۔ اور نہ اس پر کدورات کونیہ کا زنگ لگتا ہے اور لفظ ذہب (سونا) ذہاب الی اللہ (خدا کی طرف جانے) اور تطہیر اور اذہاب رجس (ناپاکی کو دور کرنے، پاک و صاف کرنے) کی طرف مشعر ہے اور یہ چمک، بقا، صفا اور رزانت کے معنی کو متضمن ہے۔ اور طشت کو حکمت و ایمان سے پر کرنے کا مطلب ان جواہر نورانیہ سے جو کہ ایمان و حکمت کے کمال کا خلاصہ ہے اس سے لبریز کرنا ہے اور احتمال رکھتا ہے کہ یہ معنوی اجسام کے قبیل سے ہوں۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ میں آیا ہے کہ روز قیامت ظلہ (سایہ دار چیز) اور موت بکری کی شکل میں لائی جائے گی اور اعمال حسنہ صورِ حسنہ سے متمثل کئے جائیں گے پھر یہ میزانِ عدل میں رکھے جائیں گے۔ بعض عرفاء فرماتے ہیں کہ اس میں یہ دلیل ہے کہ ایمان و حکمت جواہر محسوسہ ہیں نہ کہ معنی معقولہ اور نہ از قسم اعراض جیسا کہ متکلمین کا مذہب ہے اور شارع علیہ السلام حقائق اشیاء میں اعلم و اعرف ہیں۔ اہلِ عقل کی نظر ظاہر پر ہے کیونکہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہ جواہر سے صادر ہوئے ہیں تو ان پر عرضیت یعنی قائم بالغیر کا حکم لگا دیتے ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس واقعہ سے مشاہدہ فرمانا یقین و ایمان کی تکمیل و اضافہ اور عاداتِ مہلکہ سے بے خوف ہونے کا موجب ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر حال و مقام میں سب سے بڑھ کر شجاع، ثابت قدم اور اقوی تھے۔ لیکن قلبِ اطہر کو آبِ زم زم سے پہلے غسل دینے کی حکمت میں اہلِ علم فرماتے ہیں کہ آبِ زم زم دل کو تقویت دیتا ہے۔ اس لئے قلبِ شریف کو غسل دیا کہ عالمِ ملکوت کے مشاہدہ پر قوی ہو جائے۔ اسی بنا پر بعض علماء استدلال کرتے ہیں کہ آب زم زم آب کوثر سے افضل ہے۔ اس لئے کہ قلبِ شریف کو غسل نہیں دیا گیا مگر افضل پانی سے یہ قول کہ آب زمزم قریب تھا اور آب کوثر دور۔ تو یہ بہت ضعیف قول ہے اس لئے کہ یہاں قرب و بعد متصور نہیں ہے یہاں تو دونوں برابر ہیں (واللہ اعلم)

ذکر براق: اس کے بعد حضرت جبریل علیہ السلام ایک سفید چوپایہ لائے جس کا نام براق ہے۔ وہ خچر سے پست اور گدھے سے اونچا تھا۔ اور منتہائے نظر پر اس کا قدم پڑتا تھا۔ حدیث شریف میں ہے کہ مجھے سوار کیا گیا اور حضرت جبریل علیہ السلام مجھے آسمان پر لے گئے۔ ظاہر حدیث یہ ہے کہ آسمان تک براق پر تھے اور وہ ہوا میں اس طرح چلتا تھا جس طرح زمین پر چلتے ہیں۔ یہ بھی عادت کے خلاف ہے کیونکہ بشر ہوا پر نہیں چلتا چہ جائیکہ چارپایہ پر سوار ہو کر۔ یہ سب قدرت الٰہی کے ہاتھ میں ہے اور خدا کی قدرت عادت

کے جاری ہونے میں مقید نہیں ہے۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ براق کے دو بازو تھے جن سے وہ اڑتا تھا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ براق پر سواری مسجد اقصیٰ تک تھی۔ اس کے بعد ایک معراج یعنی سیڑھی رکھی گی جس کے ذریعہ اوپر لے جایا گیا۔ یہ بھی ایک روایت میں ہے۔ ان دونوں روایتوں کے درمیان تطبیق یہ ہے کہ بعض راویوں نے ان تفصیلات کا ذکر نہیں کیا جسے دوسرے راویوں نے بیان کیا۔ پہلے راوی نے مسجد اقصیٰ تک براق پر سواری کا ذکر صراحت سے کیا۔ اور پھر اسی سواری کے ذریعہ آسمان پر جانے کا تذکرہ نہیں کیا۔ اور دوسرے راوی نے آسمان پر عروج فرمانے کا ذکر کیا۔ ممکن ہے کہ یہ بے سواری ہو۔ (واللہ اعلم) براق کے بھیجنے میں حکمت، سید عالم محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تکریم مقصود تھی جس طرح کہ محبین اپنے محبوبوں کے لئے گھوڑا بھیجتے ہیں اور اخص خواص، جو کہ محرم و انیس مجلس خاص ہو اس کے بلانے کے لئے پیادوں کو بھیجتے ہیں اور رات کے وقت جو کہ خلوتِ خاص کا وقت ہے غیروں کی آنکھوں سے بچا کر بلاتے ہیں۔ وَلِلّٰہِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی وَتَعَالٰی وَتَقَدَّسَ۔ " خچر سے پست اور حمار سے بلند نہ بر شکل فرس، براق بھیجنے کی حکمت یہ ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ بلانا سلامتی و امن میں ہے نہ کہ حرب و خوف میں۔ اور براق کی ایسی تیز رفتاری جس کا عرف و عادت میں رواج نہیں ہے اظہارِ معجزہ کیلئے تھی۔ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ اس کا نام براق ہے گھوڑا اور خچر نہیں ہے اور یہ براق بریق سے بنا ہے جس کے معنی روشنی کی شعاعوں کے ہیں۔ اسی جہت سے اس کی تیز رفتاری بھی ہے۔ حضرت قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسے براق اس بنا پر کہا گیا ہے کہ اس کے دو رنگ تھے جیسے "شاۃ برقاء" (چمکدار بکری) کہا جاتا ہے جس کے بالوں میں سفیدی و سیاہی دونوں ہوں صاحب مواہب کہتے ہیں کہ ممکن ہے براق بریق سے مشتق نہ ہوں۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رکاب میں پائے اقدس رکھنے لگے تو براق نے شوخی کی اس وقت جبریل علیہ السلام نے براق سے کہا تجھے کیا ہو گیا ہے کیوں شوخی کرتا ہے۔ تجھ پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ بزرگ تر سوار نہیں ہوا۔ پھر براق نے شوق کا اظہار کیا اور زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پشت پر سواری فرمائی۔ یہ بات دلالت کرتی ہے کہ براق انبیاء علیہم السلام کی سواری کے لئے آمادہ تھا۔ بعض فرماتے ہیں کہ ہر نبی کے لئے ان کے قدر و مرتبہ کے مطابق جدا گانہ براق ہوتا ہے، چنانچہ روایتوں میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت المقدس سے مکہ مکرمہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے ملاقات کے لئے براق پر سوار تشریف لاتے تھے گویا حضرت جبریل علیہ السلام کا اشارہ جنس براق کی جانب ہے (واللہ اعلم)۔ اور براق کی شوخی اس وجہ سے تھی۔ اب تک اس پر کسی نے سواری نہیں کی تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ براق کی یہ شوخی، ناز و طرب اور افتخار سے تھی نہ کہ بطریق استبعاد و سرکشی۔ جیسا کہ پہاڑ کے جنبش کرنے کے سلسلے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اُثْبُتْ یَا ثَبِیْرُ فَاِنَّمَا عَلَیْکَ نَبِیٌّ وَّ صِدِّیْقٌ وَّشَہِیْدَانِ " اے ثبیر پہاڑ قائم رہ بلاشبہ تجھ پر نبی صدیق اور دو شہید ہیں۔ کہتے ہیں کہ براق کی رکاب حضرت جبریل کے ہاتھ میں اور لگام حضرت میکائیل کے ہاتھ میں تھی۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ردیف یعنی سواری پر پس پشت بیٹھے تھے۔ ممکن ہے کہ پہلے رکاب تھامی ہو۔ اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اثنائے راہ میں اپنی محبت و عنایت کے اقتضاء میں اپنا ردیف بنا لیا ہو۔ یا یہ کہ پہلے ردیف بنے ہوں گے۔ اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تکریم اور طریقہ ادب کی رعایت سے اتر کر رکاب تھام لی ہو۔ (واللہ اعلم) پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری زمین نخلستان میں پہنچی تو جبریل نے عرض کیا یہاں دوگانہ پڑھئے۔ یہ زمین یثرب ہے جسے بعد میں مدینہ منورہ کہا جائے گا۔ اس کے بعد جب "مدین" اور اس زمین میں پہنچے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تھی۔ ان دونوں جگہوں میں بھی حضرت جبریل علیہ السلام نے یہی عرض کیا کہ اتر کر دوگانہ ادا کیجئے۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک جانب بوڑھی عورت کھڑی

ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل سے دریافت کیا یہ کیا ہے؟ عرض کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم بڑھے چلئے۔ پھر آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ایک جانب ایک شخص کھڑا ہے وہ آپ کو بلا رہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا یہ کون ہے۔ عرض کیا حضور بڑھے چلئے۔ اس کے بعد ایک جماعت پر گزر ہوا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام عرض کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی السلام علیک یا اول، السلام علیک یا آخر، السلام علیک یا حاشر، اس پر جبریل علیہ السلام نے عرض کیا۔ حضور ان کے سلام کے جواب مرحمت فرمایئے۔ آپ نے ان کے سلام کا جواب مرحمت فرمایا (آخر حدیث تک) اس وقت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا وہ بوڑھی عورت جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ملاحظہ فرمایا وہ دنیا تھی اب اس کی عمر باقی نہیں رہی ہے مگر اسی قدر جتنی اس بڑھیا کی عمر باقی ہے اور وہ جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا تھا وہ ابلیس و شیطان تھا۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف التفات فرماتے اور اسے جواب دیتے تو آپ کی امت دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتی اور شیطان انہیں گمراہ کر دیتا۔ اور وہ جماعت جو آپ پر سلام عرض کر رہی تھی وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر انور پر ہوا تو وہ اپنی قبر شریف میں نماز پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "اَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللهِ" میں شہادت دیتا ہوں یقیناً آپ اللہ کے رسول ہیں۔ چونکہ انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں تو وہ خدا کے حضور عبادت کرتے ہیں جیسا کہ اصحاب جنت، جنت میں کریں گے۔ بغیر اس کے کہ وہ اس کے مکلف ہوں۔

اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے نیک و بد لوگوں کے گروہوں اور قوموں پر گذرے جو عالم برزخ و مثال میں اپنے احوال و افعال کے ثمرات و نتائج میں مشغول و گرفتار تھے ان کا ذکر طویل ہے۔ پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس پہنچے اور براق کو مسجد کے دروازے کے حلقے سے باندھا جسے اب باب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہتے ہیں اس کے بعد مسجد میں داخل ہوئے اور دو رکعت ادا کیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دوگانہ تحیۃ المسجد تھا یہاں فرشتے حاضر ہوئے اور تمام انبیاء حضرت آدم سے حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی ارواح مقدسہ متمثل ہو کر حاضر ہوئیں۔ خدا کی حمد و ثنا کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام عرض کیا۔ اور سب ہی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت کا اعتراف کیا پھر اذان کہی گئی اور نماز کے لئے اقامت ہوئی اور سب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو امامت کے لئے آگے بڑھایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امامت فرمائی اور تمام انبیاء و ملائکہ علیہم السلام نے اقتداء کی۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ نماز نفل تھی یا فرض، اگر فرض تھی تو نمازِ عشاء، یا نمازِ فجر؟ سیاق حدیث سے ظاہر ہے کہ بیت المقدس میں تشریف آوری آسمانی عروج سے پہلے ہے تو یہ نماز عشاء ہوگی۔ اور اس قول کے بموجب جس نے یہ کہا کہ یہ قضیہ بعد از نزول معراج ہے تو یہ نمازِ صبح ہوگی اور بعض نے اس کو ترجیح دی ہے۔ کیونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جب تمام کمالات و برکات لے کر اترے تو انبیاء علیہم السلام پر اپنے فضل و شرف کے اظہار کے لئے یہ نماز پڑھی۔

اس مسکین (یعنی شیخ محقق رحمہ اللہ) کے دل میں یہ خیال گزرا تھا کیوں نہ دونوں حالتوں میں ہوا ہو یعنی قبل از عروج بھی اور بعد از عروج بھی۔ لیکن بغیر ذکر علماء حدیث اس خیال کے لکھنے کی جرات نہ ہوئی مگر جب ان روایتوں کے دیکھنے کا وقت آیا تو میری نظر سے شیخ کبیر عماد الدین بن کثیر جو کہ اعاظم علماء حدیث و تفسیر سے ہیں ان کا قول گزرا۔ انہوں نے ذکر کیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبل از عروج اور بعد از عروج دونوں حالتوں میں انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نماز ادا کی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ حدیث میں ایسے اشارے موجود ہیں جو اس پر دلالت کرتے ہیں۔ اور اس کی کوئی مخالفت بھی نہیں ہے۔ والحمد للہ۔ لیکن شیخ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا ہے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان میں اقامت کی ہے حالانکہ متظاہر و متواتر روایتوں میں یہ

ہے کہ بیت المقدس میں اقامت کی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بعد از رجوع فرمائی۔ اس جگہ شیخ کبیر کیوں نہ فرمائیں کہ یہ دونوں جگہوں میں تھی یا دونوں حالتوں میں تھی۔ اور کیوں نہ وہ منتظاہر و متواتر روایات و درایات سے قطع نظر فرمائیں (واللہ اعلم)

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد سے باہر تشریف لائے تو جبریل علیہ السلام نے ایک پیالہ شراب کا اور ایک پیالہ دودھ کا پیش کیا۔ اور عرض کیا حضور کو اختیار ہے جو پیالہ چاہیں نوش فرما سکتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ کے پیالہ کو پسند فرمایا۔ جبریل نے عرض کیا آپ نے فطرت کو اختیار فرمایا۔ اس جگہ فطرت سے مراد اسلام اور اس پر استقامت ہے۔ مطلب یہ کہ آپ نے اسلام کی علامت اور استقامت کو اختیار فرمایا۔ دودھ اسلام کی علامت اس لئے ہے کہ پینے والے کے لئے سہل و طیب اور ظاہر و شائع ہے اور اس عالم میں دودھ کو دین و علم کی مثال جانتے ہیں۔ اور جو کوئی خواب میں دیکھے کہ دودھ پی رہا ہے تو اس کی تعبیر یہی ہوگی کہ علم و دین سے بہرہ ور ہوگا۔ الحمدللہ کاتبِ حروف (یعنی شیخ محقق رحمہ اللہ) نے بعض خوابوں میں دیکھا کہ نیا پیالہ ہے۔ وہ شفاف میٹھے اور دودھ سے بھرا ہوا ہے اور اس سب کو پی لیا ہے۔ بخلاف شراب کے کہ وہ ام الخبائث اور حال و مال میں گوناگوں شر و فساد کو پیدا کرنے والی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ فطرت سے مراد خلقت ہے اور خلقت کی بنا دودھ سے ہے اور گوشت و پوست اور ہڈیوں کی نشو و نما بھی اسی سے ہے۔ اور نومولود بچے کے پیٹ میں جو چیز سب سے پہلے جاتی ہے جس سے اس کے پیٹ کی رگیں کشادہ ہوتی ہیں وہ یہی دودھ ہے۔ اور یہ بات بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ بہت مرغوب تھا۔ اور شراب اگرچہ اس وقت تک مباح تھی اس لئے کہ قصہ اسریٰ مکہ مکرمہ میں ہوا۔ اور شراب کی حرمت مدینہ منورہ میں ہوئی لیکن چونکہ اس کا آخر امر حرمت تھی یا یہ کہ حضور کا اس سے اجتناب فرمانا از روئے ورع و تقویٰ اور اس تعریض کی وجہ سے تھا کہ انجام کار اسے حرام ہونا ہی ہے اور یہ بات بھی تھی کہ یہ علم الٰہی میں عین درست تھی۔ اور جبریل نے عرض کیا۔ "اَصَبْتَ الْفِطْرَۃَ۔" آپ نے فطرت کو پا لیا اور ایک روایت میں ہے کہ۔۔ "اَصَبْتَ اَصَابَ اللّٰہُ بِکَ۔" آپ نے راہ صواب کو اختیار فرمایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے سبب راہ صواب دکھائے۔ اگر کہیں کہ یہ شراب تو جنت کی تھی اس کے باوجود آپ نے مشابہت اور مماثلت کی بنا پر اس سے اجتناب فرمایا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ جبریل علیہ السلام نے کہا اگر آپ شراب کو اختیار فرماتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی اور اس کے پینے میں پڑ جاتی۔ اور آپ کی امت اس خمر کے پینے میں یعنی دنیاوی شراب میں مبتلا ہو جاتی جو کہ مادۂ فساد اور مادۂ خباثت ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ دو پیالے آئے۔ ایک دودھ اور ایک شہد کا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ تین پیالے آئے ایک دودھ کا دوسرا پانی کا تیسرا شراب کا۔ اس میں شہد کا ذکر نہیں ہے۔ بہر تقدیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پسند دودھ، کا ہی اختیار فرمانا ہے۔ ان پیالوں کا آنا "سدرۃ المنتہیٰ" پہنچنے کے قریب ہی ہوا۔ اس کی تصریح حافظ عماد الدین بن کثیر رحمہ اللہ نے فرمائی ہے۔

مروی ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے پروردگار عالم کی حمد و ثنا کی۔ ان میں حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام بھی تھے۔ اور ان کی یہ ثنا گستری اور بلیغ خطبہ خوانی ان فضائل و کرامات اور معجزات پر مشتمل تھی۔ جن سے حق تبارک و تعالیٰ و تقدس نے انہیں مخصوص فرمایا۔ حق تعالیٰ نے ان کی زبان شکر گذاری کے لئے کھولی اس کے بعد سید عالم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک کھولی۔ اور ارشاد فرمایا تم سب نے اپنے رب العزت جل و علا کی حمد و ثنا کر لی اب میں بھی اس کی حمد و ثنا کرتا ہوں۔ اور فرمایا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَرْسَلَنِیْ رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ بَشِیْرًا تمام تعریفیں اس خدا کو جس نے مجھے جہانوں کیلئے رحمت اور سب

وَنَذِيْرًا لِّلنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ وَاَنْزَلَ عَلَيَّ الْفُرْقَانَ فِيْهِ تِبْيَانُ كُلِّ شَيْءٍ وَّجَعَلَ اُمَّتِيْ وَسَطًا وَّجَعَلَ اُمَّتِيْ هُمُ الْاَوَّلُوْنَ وَهُمُ الْاٰخِرُوْنَ وَشَرَحَ لِيْ صَدْرِيْ وَوَضَعَ عَنِّيْ وِزْرِيْ وَرَفَعَ لِيْ ذِكْرِيْ وَجَعَلَنِيْ فَاتِحًا وَّخَاتِمًا۔

لوگوں کے لئے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بھیجا۔ اور مجھ پر وہ فرقان اتارا جس میں ہر چیز کا روشن بیان ہے اور بنایا میری امت کو درمیانی اور گردانا میری امت کو کہ وہی اول ہیں اور وہی آخر ہیں۔ اور کھولا میرے لئے میرا سینہ اور دور کیا مجھ سے میرا بوجھ اور بلند کیا میرے لئے میرا ذکر اور بنایا مجھے فاتح اور سلسلہ نبوت کا آخری نبی۔

اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا:۔ "بِهٰذَا فَضَلَكُمْ محمدٌ" (ان خوبیوں کی وجہ سے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تم سب (انبیاء علیہم السلام) سے افضل ہیں۔)

اس کے بعد جنت الفردوس سے ایک سیڑھی لائی گئی۔ جس کے داہنے بائیں فرشتے تھے آپ اس سے آسمانوں پر پہنچے۔ وہاں آپ نے ان نبیوں کو دیکھا جنہیں آپ کے استقبال اور ملاقات کے لئے مامور کیا گیا تھا۔ انہیں بیت المقدس میں تمثیل کے بعد آسمانوں میں متمثل فرمایا گیا ہوگا۔ اور اس طریق پر سلام عرض کیا۔ جس طرح حدیثوں میں مذکور ہوا ہے۔ اس واقعہ میں جو عجیب وغریب حالات و حکایات روایتوں میں مذکور ہیں وہ یہ ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم چھٹے آسمان پر پہنچے اور وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پایا وہاں سے جب اوپر تشریف لے جانے لگے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام رونے لگے اور کہنے لگے ایک شخص جسے میرے بعد بھیجا گیا اسے ایسا برگزیدہ فرمایا گیا کہ اس کی امت جنت میں میری امت کے جانے سے پہلے جائے گی۔ علماء بیان کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ رونا معاذ اللہ حسد کی بنا پر نہ تھا۔ اس لئے کہ اس عالم میں ہر ایک مومن کے دل سے حسد کے مادہ کو نکال دیا جائے گا۔ چہ جائیکہ اس شخص سے متصور جسے حق تبارک وتعالیٰ نے اپنے کلام سے ممتاز فرمایا ہو۔ اور اپنی رسالت سے سرفراز کر کے اولوالعزم کیا ہو۔ بلکہ یہ اس چیز کے فوت ہونے پر اظہارِ افسوس وحسرت ہے جو درجہ کی بلندی پر مترتب ہوتی ہے۔ بایں سبب کہ ان کی امت سے ایسی کثرتِ مخالفت واقع ہوئی جو ان کے اجر وثواب میں کمی کا مقتضی بن کر ان کے اجر وثواب کی کمی کو مستلزم ہے۔ اس لئے کہ ہر نبی کے لئے اس کے برابر اجر وثواب ہے جتنا ان کی اتباع کرنے والے کا اجر ہے۔ اور جتنوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اتباع کیا ہے وہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے والوں کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ ایسا ہی شیخ ابن حجر نے فتح الباری میں فرمایا ہے۔

ابن ابی جمرہ جو کہ عرفائے مالکیہ میں سے ہیں فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے ہر نبی کے دل میں اپنی امت کے لئے رحمت ومہربانی رکھی ہے۔ اور انہیں اس سے طبعی طور پر خلق فرمایا اسی بنا پر بعض امورات پر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی گریہ فرمایا ہے۔ چنانچہ اس پر آپ سے عرض کیا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو کس بات نے رلایا ہے۔ فرمایا رونا رحمت ہے اور حق تبارک وتعالیٰ رحمت کرنے والوں پر ہی رحمت فرماتا ہے۔ بلاشبہہ انبیاء علیہم السلام نے رحمتِ خداوندی کا وافر حصہ لیا ہے تو ان کے دلوں میں رحمت بھی دیگر تمام لوگوں سے بڑھ کر اور وافر تر ہے۔ اسی بنا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی امت پر رحمت وشفقت کی خاطر روئے کیونکہ یہ وقت، افضال وجود وکرم اور وقت قدوم حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہے تاکہ فضلِ عمیم اور قرب کی خلعت سے فائز ہوں لہٰذا اس قبول وایصال کے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے امید رکھی کہ اس وقت کی ساعت وبرکت سے حق تعالیٰ ان کی امت پر رحمت فرمائے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لفظ "غلام" سے ذکر کرنا اس کے معنی کم عمری کے ہیں نہ کہ کسی اور معنی میں۔ یہ اس سبب سے کہ دیگر انبیاء علیہم السلام کی بہ نسبت آپ صغیر السن تھے۔ اور اہل عرب، مرد مستجمع السن کو جب تک اس میں قوت وتوانائی ہے "غلام" کہتے ہیں۔ (گویا لفظ "غلام" بمعنی جوان، صحت مند کے ہے)۔

فتح الباری میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لفظ "غلام" بول کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ رب العزت جل جلالہ کا انفضال واکرام اور اس کا انعام دائمی قوت کے ساتھ شامل ہے حتیٰ کہ سن کہولت سے سنِ شیخوخت میں داخل ہو جائیں اس وقت بھی آپ کے بدن شریف میں ضعف پیری اثرانداز نہ ہوگی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت و توانائی میں ضعف و کمزوری کی کوئی راہ نہ ہوگی۔ یہاں تک کہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو لوگوں نے آپ پر "اسم شاب" یعنی مرد جوان کا اطلاق کیا۔ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو "اسم شیخ" یعنی بوڑھے مرد سے مخاطب کیا۔ باوجودیکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف حضرت ابو بکر سے زیادہ تھی (بندۂ مسکین) یعنی شیخ محقق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسی بنا پر آپ پر آثارِ پیری نمایاں نہ تھے۔ بجز ان چند سفید بالوں کے جو آپ کے سر مبارک اور داڑھی شریف میں تھے۔ تاکہ لوگوں کی نظروں میں آپ بوڑھے اور ضعیف نہ معلوم ہوں۔

اس امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شفقت واعتنا کا اثر بلا شبہہ نمازوں کی کمی کے ضمن میں ظاہر ہوا کہ پچاس نمازوں سے پانچ نمازیں ہوئیں۔ علماء فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اس امتِ مرحومہ پر اتنی رحمت و شفقت فرمانا اس بنا پر تھا کہ انہوں نے توریت میں اس امت کی صفات اور ان کی خوبیوں کو پڑھ لیا تھا اور آرزو تھی کہ اس امت کو ان کی امت بنا دے۔ اس پر حق تعالیٰ نے فرمایا یہ امت تو احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ اس تمنا کو دل سے نکال دو۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے خدا تو مجھے اس احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی بنا دے۔

سدرۃ المنتہیٰ پہنچنا۔ ۔ وصل:۔ اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو "سدرۃ المنتہیٰ" کی جانب لے جایا گیا۔ اس جگہ مخلوق کے اعمال اور ان کے علوم ختم ہو جاتے ہیں اور امر الٰہی نزول فرماتا ہے۔ اور احکام حاصل کئے جاتے ہیں۔ اور فرشتے اسی کے پاس ٹھہرتے ہیں اس سے آگے بڑھنے اور وہاں سے تجاوز کرنے کی کسی میں تاب و تواں نہیں ہے۔ یہیں پر سب رک جاتے ہیں۔ اور ہر وہ چیز جو عالم سفلی سے اوپر جاتی ہے اور عالم علوی سے از قسم اوامر و احکام الٰہی نزول فرماتے ہیں ان سب کی انتہا یہی ہے۔ اس سے آگے کسی مخلوق نے تجاوز نہیں کیا۔ بجز سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ حضرت جبریل علیہ السلام بھی اس جگہ رک گئے اور آپ سے جدا ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے فرمایا یہ کون سی جگہ ہے اور جدا ہونے کا کون سا مقام ہے؟ یہ جگہ تو ایسی نہیں کہ دوست، دوست کو چھوڑ کر جدا ہو جائے، جبریل علیہ السلام نے عرض کیا اگر ایک انگلی کے برابر بھی نزدیک ہو جاؤں تو میں جل جاؤں گا۔

بدو گفت سالار بیت الحرام — کہ اے حامل وحی برتر خرام
بگفتا فراتر مجالم نماند — بماندم کہ یزدی بالم نماند
اگر یک سر موئے برتر پرم — فروغ تجلی بسوزد پرم

بعض روایتوں میں آیا ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے فرمایا اگر کوئی حاجت رکھتے ہو تو مجھ سے عرض کرو میں جنابِ باری میں پیش کروں گا۔ جبریل علیہ السلام نے عرض کیا میری تمنا یہ ہے کہ بارگاہِ الٰہی میں عرض کریں کہ روزِ قیامت میرے بازوؤں کو اور زیادہ کشادہ فرما دے۔ تاکہ پل صراط سے اپنے بازوؤں کے ذریعہ آپ کی امت کو گزار سکوں۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ "سدرۃ المنتہیٰ" چھٹے آسمان میں ہے۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ ساتویں آسمان میں ہے اور ان دونوں روایتوں کی تطبیق اس طرح کرتے ہیں کہ اس کی جڑ تو چھٹے آسمان میں ہے اور اس کی شاخیں ساتویں آسمان میں۔ سدرہ جس کے معنی بیری کے

درخت کے ہیں۔ اس سے اس کا نام رکھنے کی وجہ، علم شارع علیہ السلام پر مفوض وموقوف ہے۔ کہتے ہیں کہ اس درخت کی تین طرح کی صفتیں ہیں۔ ایک یہ کہ سایہ طویل ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کا مزہ لطیف ہے۔ تیسرے یہ کہ اس کی بو لطیف ہے۔ اور یہ بمنزلہ ایمان کے ہے۔ جو قول وعمل اور نیت کا مجموعہ ہے۔ ممکن ہے یہ آسمان میں اسی طرح پیوست ہو جس طرح زمین میں درخت پیوست ہوتا ہے۔ نیز قدرتِ الٰہی سے بعید نہیں ہے کہ جس طرح درخت زمین میں نشوونما پاتے ہیں اسی طرح ہوا میں ہو۔ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوا میں سیر فرمائی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ جنت کی مٹی میں جمادیا گیا ہو۔ جس طرح جنتی درختوں کی کیفیت ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اسے جمایا ہی نہ گیا ہو۔ واللہ اعلم بحقیقتہ الحال۔ سدرۃ المنتہیٰ سے چار نہریں نکلتی ہیں دو ظاہر میں اور دو باطن میں۔ باطن میں وہ ہیں جو جنت میں جاتی ہیں اور ظاہر میں وہ ہیں جو نیل وفرات کہلاتی ہیں۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چاروں نہریں جنت کی ہیں۔ نیل، فرات، سیحان، اور جیحان۔ اور بعض کہتے ہیں کہ جنت سے ان کے ہونے سے مراد یہ ہے کہ ان کے منافع وثمرات دائمی اور بے شمار ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ بہشت کی جنس سے نکلے ہیں۔ (واللہ اعلم) نیل کے احوال میں بہت سی عجیب وغریب چیزیں لکھتے ہیں جن میں عقل حیران ہے اور پانی، دودھ، شہد اور شراب کی نہریں جدا ہیں جو جنت میں جاری ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم منطوق ہے۔ ابن ابی حاتم نے بروایت سیدنا انس رضی اللہ عنہ حدیث نقل کی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جب ساتویں آسمان سے نکلے تو ایک نہر ملاحظہ فرمائی۔ جو یاقوت وزمرد کے سنگریزوں پر جاری ہے۔ اس کے پیالے سونے چاندی، یاقوت وموتی اور زبرجد کے ہیں۔ اور اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہے، فرمایا اے جبریل علیہ السلام یہ کیا ہے؟ عرض کیا یہ حوض کوثر جسے حق تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا ہے۔ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ جنت میں جو چشمہ جاری ہوتا ہے اور جس کا نام سلسبیل ہے اس سے دو نہریں پھوٹتی ہیں ایک کا نام کوثر ہے اور دوسری کا نام نہرِ رحمت ہے۔ یہ وہ نہرِ رحمت ہے کہ جب گنہگار (جرم کی سزا بھگتنے کے بعد یا شفاعت سے) دوزخ میں جلے بھنے سیاہ نکلیں گے پھر وہ اس نہر میں نہائیں گے اور وہ اسی وقت تروتازہ ہو جائیں گے۔ "سدرۃ المنتہیٰ کو انوار ڈھانپے ہوئے ہیں سونے کے پرندوں اور پتنگوں کی مانند۔ اور ہر ایک پتہ پر ایک فرشتہ ہے اس مقام کی تعریف وتوصیف حدِ قیاس وعقل سے باہر ہے۔ اس جگہ بھی یہ روایت مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شراب، دودھ اور شہد کے پیالے پیش کئے گئے تو آپ نے دودھ کو اختیار فرمایا۔ اس کے بعد "بیت المعمور" نمودار ہوا اور اس سے پردہ اٹھا یا گیا۔ حدیث کے الفاظ ایسے ہی ہیں کہ:۔ "ثُمَّ رُفِعَ اِلَیَّ الْبَیْتُ الْمَعْمُوْرُ" پھر بیت المعمور کی طرف لے جایا گیا اور اس کی تفسیریوں کی گئی ہے کہ گویا اس کے اور بیت المعمور کے درمیان بہت سے عالم تھے اور اس کے دریافت کرنے پر قدرت نہ تھی۔ لہٰذا ان پردوں کو اٹھایا گیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بصیرت اور چشم مبارک میں لایا گیا اور آپ نے خوب ملاحظہ فرمایا۔ بیت المعمور وہ مسجد ہے جو خانہ کعبہ کے محاذ ومقابل ہے۔ یہاں تک کہ اگر اس کا زمین پر گرنا فرض کیا جائے تو وہ کعبہ معظمہ پر آکر گرے۔ یہ گھر وہ ہے جسے آدم علیہ السلام کے لئے زمین پر اترنے کے بعد بھیجا گیا۔ پھر آدم علیہ السلام کے بعد اٹھا لیا گیا۔ اور آسمان پر اس کی قدر ومنزلت ایسی ہی ہے جیسے زمین میں خانہ کعبہ کی۔ فرشتے اس کا طواف کرتے ہیں۔ اور اس کی طرف نماز پڑھتے ہیں۔ جس طرح انسان کعبہ معظمہ کا طواف کرتے ہیں۔ روزانہ ستر ہزار فرشتے بیت المعمور کی زیارت کو آتے ہیں اور واپس ہوتے ہیں تو دوبارہ اس کی طرف کبھی نہیں آتے۔ اسی طرح ہر روز آتے جاتے ہیں۔ یہ حال اس دن سے ہے جب سے اسے پیدا فرمایا اور ابد تک یوں ہی رہے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم تر قدرت پر دلیل ہے۔ اور کوئی مخلوق فرشتوں سے زیادہ اور بڑی نہیں ہے حدیث شریف میں آیا ہے کہ آسمان وزمین میں ایک بالشت بھر جگہ بھی ایسی نہیں ہے جہاں کسی فرشتے نے سجدہ کے لئے اپنی پیشانی نہ

رکھی ہو اور دریاؤں کا ایک قطرہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر کوئی فرشتہ موکل نہ ہو اور مروی ہے کہ آسمان میں ایک نہر ہے۔ جسے ''نہر الحیوۃ'' کہتے ہیں۔ جبریل علیہ السلام روزانہ اس میں غسل کرتے ہیں۔ جب باہر آتے ہیں تو اپنے بال و پر کو جھاڑتے ہیں اور اس سے ستر ہزار قطرے پانی کے ٹپکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر قطرہ سے ایک فرشتہ پیدا فرماتا ہے تو یہی وہ فرشتے ہیں جو بیت المعمور کی حاضری دیتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں۔ پھر دوبارہ اس کی طرف آنے کی نوبت نہیں آتی۔ مواہب لدنیہ میں ایسا ہی منقول ہے۔

امام فخرالدین رازی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں زیر تفسیر ارشاد باری تعالیٰ: ''یَخْلُقُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ'' پیدا فرماتا وہ چیزیں جو تم نہیں جانتے کہتے ہیں کہ عطا، مقاتل، اور ضحاک جو کہ ائمہ تفسیر میں سے ہیں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا عرش کی داہنی جانب نور کی ایک نہر ہے جو سات آسمانوں، سات زمینوں اور سات دریا کے برابر ہے روزانہ علی الصباح جبریل علیہ السلام آتے ہیں اور اس میں غسل کرتے ہیں اور اپنے نور پر مزید نور کا اضافہ کرتے اور اپنے جمال کو بڑھاتے ہیں۔ جب وہ بازوؤں کو جھاڑتے ہیں تو حق تعالیٰ اس کے ہر قطرے سے کئی ہزار فرشتے پیدا فرماتا ہے۔ یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ جتنے فرشتے وہاں حق تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں حق تعالیٰ ہر تسبیح سے فرشتہ پیدا فرماتا ہے۔

بندہ مسکین (شیخ محقق رحمہ اللہ) ثبتہ اللہ علی طریق الحق والیقین فرماتے ہیں کہ اگر آسمانوں میں فرشتوں کی تسبیحات سے فرشتے پیدا ہوتے ہیں تو کیا تعجب ہے کہ زمین پر بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، خاصانِ بارگاہِ قدس اور صلحائے امت کی تسبیحات و تہلیلات سے پیدا ہوتے ہوں گے۔ ''وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ'' صاحب مواہب فرماتے ہیں یہ فرشتے ان فرشتوں کے ماسوا ہیں جو دائمی عبادت میں مشغول رہتے ہیں اور ان فرشتوں کے بھی ماسوا ہیں جو نباتات اور ارزاق اور نگہبانی اور بنی آدم کی تصویر کشی پر موکل ہیں۔ اور وہ فرشتے جو بادلوں کے ساتھ اترتے اور وہ جو جمعہ کے دن لوگوں کو لکھنے اور جنت پر خازن و محافظ ہیں اور وہ جو رات و دن کی گردش میں آتے ہیں تاکہ دن اور رات میں بندوں کے اعمال لکھیں اور وہ ستر ہزار فرشتے جو حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ انور پر حاضر ہوتے اور رعب و ہیبت ڈالتے ہیں اور وہ جو نمازی کی قرات پر آمین کہتے ہیں اور وہ جو ''ربنالک الحمد'' کہتے ہیں اور وہ جو نماز کے انتظار کرنے والوں پر دعائیں مانگتے ہیں اور وہ جوان عورتوں پر لعنت کرنے پر مقرر ہیں جو جامہ خواب میں اپنے شوہروں سے دور رہتی ہیں۔ اور ہر ہر آسمان پر جو فرشتے مقرر ہیں ان میں سے ہر ایک کی تسبیح جدا ہے۔ حدیث مبارک میں آیا ہے کہ وہ فرشتے جو حاملانِ عرش ہیں ان کے چہرے اور ان کے اجسام جدا ہیں جو ایک دوسرے میں مشتبہ نہیں ہوتے اگر ان میں سے کوئی ایک فرشتہ اپنا بازو پھیلائے تو اپنے بازو کے ایک پر سے دنیا کو ڈھانپ لے۔ اور حاملانِ عرش آٹھ فرشتے ہیں اتنے عظیم و جسیم کہ ایک کان کی لو سے دوسرے کان کی لو تک دو سو برس کی مسافت ہے۔ اور ایک روایت میں سات سو برس کی راہ ہے۔ ابو الشیخ نے اپنی کتاب ''العظمتہ'' میں اعجب العجائب چیزیں بیان کی ہیں۔ اس جگہ سے خالق و مالک، باری تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کا تصور کرنا چاہئے کہ اس کی قدرت و شان کتنی عظیم ہوگی۔ حدیث مبارک میں ہے کہ سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جب میں ساتویں آسمان پر پہنچا تو میں نے حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو بیت المعمور سے ٹیک لگائے بیٹھے دیکھا آپ کے پاس بہت خوشرو جماعت ہے۔ میں نے ان پر سلام کیا۔ انہوں نے بھی مجھ پر سلام بھیجا اور اپنی امت کو دو قسموں میں پایا ایک جماعت تو وہ جو سفید لباس میں ہے اور جو قراطیس (سفید کاغذ) کی مانند ہے اور دوسری جماعت ایسی ہے جو ملگجے کپڑے میں ملبوس ہے تو میرے ہمراہ وہ لوگ جو سفید لباس میں تھے بیت المعمور آئے اور وہ لوگ جو ملگجے لباس میں تھے پیچھے رہ گئے۔ پھر میں نے ان سفید لباس والوں کے ساتھ بیت المعمور میں نماز پڑھی۔ لباس کی سفیدی، حسنِ اعمال سے کنایہ ہے۔ جیسا کہ آیہ کریمہ وَثِیَابَکَ فَطَہِّرْ۔'' (اور اپنے لباس کو پاکیزہ رکھئے) کی تفسیر میں کہا

گیا ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ فرمایا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس ایک جماعت ایسی دیکھی جو سفید رو اور خوش رنگ مانند قراطیس تھی اور ایک اور جماعت تھی جن کی رنگت تیرگی و تاریکی مائل تھی۔ پھر یہ جماعت ایک نہر پر آئی اور غسل کیا تو ان کی رنگتیں کچھ صاف ہو گئیں۔ پھر دوسری نہر میں آئے اور غسل کیا تو اب ان کی رنگتیں مکمل طور پر اس جماعت کی مانند ہو گئیں جو سفید رو اور خوش رنگ تھی۔ پھر حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سفید چہروں کے بارے میں دریافت کیا یہ کون لوگ ہیں؟ اور وہ تیرہ رنگت والی جماعت کون ہے اور ٹیک لگائے کون صاحب بیٹھے ہیں اور یہ نہریں کون سی ہیں جس میں آکر انہوں نے غسل کیا؟ جبریل علیہ السلام نے کہا یہ صاحب آپ کے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اور یہ سفید لباس والے وہ ہیں جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کی آمیزش سے محفوظ رکھا اور یہ تیرہ رنگت والے وہ ہیں جنہوں نے اعمال صالحہ کو اعمالِ بد سے ملا دیا۔ پھر انہوں نے توبہ کی اور حق تعالیٰ نے ان پر رحمت فرمائی اور رہیں یہ نہریں تو پہلی نہر رحمت اور دوسری نہر نعمت اور تیسری نہر "وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا۔" (اور پلایا ان کو ان کے رب نے پاکیزہ) اس کے بعد حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری اور بلند ہوئی یہاں تک کہ ان اقلام کی آوازیں سنائی دی جانے لگیں۔ جو فرشتے حق تعالیٰ کی تقدیروں کی کتابت کرتے ہیں۔ اگرچہ قضاو تقدیر الٰہی قدیم ہے لیکن ان کی کتابت حادث ہے۔ اور لوح محفوظ کی تحریر جہاں کائنات ثبت ہے آسمان و زمین کے پیدا کرنے سے پہلے ہے۔ "وَجَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ۔" (اور قلم اسے لکھ کر خشک ہو گیا جو کچھ کہ آئندہ ہونے والا ہے) یہ اس طرف اشارہ ہے لیکن یہ کتابت (جس کی آواز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سماعت فرمائی) فرشتوں کے صحیفوں میں ہے جو اصل سے نقل کر کے دوسری جگہوں پر ہوتی ہے۔ جیسا کہ شب نصف شعبان (شب برات) اور دیگر راتوں میں لکھا جاتا ہے۔ اس میں محو و اثبات کی گنجائش ہے۔ "يَمْحُو اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ۔" (اللہ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور باقی رکھتا ہے) اسی کتابت در صحفِ ملائکہ کی تعبیر ہے جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے اور صاحب مواہب لدنیہ ابن قیم سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا اقلام بارہ (۱۲) ہیں اور مرتبے میں جدا جدا ہیں اور سب سے اعلیٰ و اجل قلم قدرت ہے جس سے حق تبارک و تعالیٰ نے مخلوق کی تقدیروں کو تحریر فرمایا ہے۔ چنانچہ "سنن ابو داؤد" میں سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے منقول ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ۔ "أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ۔" سب سے پہلے اللہ نے جو پیدا فرمایا وہ قلم ہے۔ اور اسے حکم فرمایا لکھ! قلم نے عرض کیا کیا لکھوں؟ فرمان جاری ہوا قیامت تک کی مخلوق کی تقدیریں لکھ۔ یہ قلم، اول اقلام اور اجل اقلام ہے۔ بلاشبہہ بکثرت علماء تفسیر نے اسی قلم کی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہی وہ پہلا قلم ہے جس کی حق تبارک و تعالیٰ نے قسم فرمائی ہے۔ دوسرا قلم وحی ہے، تیسرا قلم توقیع ہے جو اللہ و رسول کی طرف سے نشان ہے۔ چوتھا قلم طب ابدان ہے جس سے بدنوں کے صحت کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اور پانچواں وہ قلم توقیع ہے جس سے نوابوں، بادشاہوں پر نشان ہوتا ہے اس سے امورِ ممالک کی سیاست و اصلاح کی جاتی ہے۔ اور چھٹا قلم حساب ہے اس سے ان اموال کا حساب و کتاب ہوتا ہے جو نکالے جاتے اور خرچ کئے جاتے ہیں اسے قلم ارزاق بھی کہتے ہیں۔ اور ساتواں قلم حکم ہے اس سے حکم نافذ کئے جاتے اور حقوق باقی رکھے جاتے ہیں۔ آٹھواں قلم شہادت ہے جس سے حقوق کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اور نواں قلم تعبیر ہے یہ وحی خواب میں ہے اسے اور اس کی تعبیر و تفسیر کو لکھنے والا ہے۔ دسواں قلم تواریخ و وقائع عالم ہے اور گیارہواں قلم لغت اور اس کی تفصیلات کا لکھنے والا ہے اور بارہواں قلم جامع ہے جو مبطلین کا رد کرتا اور محرّفین کے شبہات کو دور کرتا ہے۔ یہ وہ اقلام ہیں جن سے مصالحِ عالم کا انتظام ہے۔ اور اس قلم کی جلالت و فضیلت ہیں کہ جس سے کتاب الٰہی لکھی گئی ہے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا اس کی قسم یاد فرمانا کافی ہے۔ (انتہیٰ)۔ واضح رہنا چاہئے کہ بعد از قلمِ الٰہی جو کہ اعلیٰ و اجل ہے اور اس کی حقیقت کو بجز خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی نہیں جانتا

یہ دنیا کا قلم ہے کہ اس سے علوم لکھے جاتے ہیں۔ اور وہ چیزیں جو اس قائل نے بیان کیں یہ معلومات ہیں جو علوم کے متعلقات ہیں۔ اور اگر یہ سب باتیں جو کچھ اس قائل نے بیان کیں ان میں منحصر ہیں تو فبہا۔ نہیں تو یہ سب ان اقلام کے لئے مثالیں ہیں۔

اس کے بعد سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ملاحظہ میں جنت و دوزخ لائی گئی ان صفات و خوبیوں کے ساتھ جو کتاب و سنت میں مذکور ہیں۔ چنانچہ آپ نے جنت کو رحمتِ الٰہی کا مظہر دیکھا اور دوزخ کو حق تعالیٰ کے عذاب و غضب کی جگہ۔ اور جنت کھلی ہوئی تھی اور دوزخ بند۔ آپ نے چشمہ سلسبیل میں غسل فرمایا اور آپ کے ظاہر و باطن سے کون و حدوث کی آلائشیں پاک وصاف کی گئیں۔ اور "مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَاتَاَخَّرَ" کا تاج عطا فرمایا گیا۔ اور بعض روایتوں میں آیا ہے کہ سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت کے درختوں میں سے ایک ایسے درخت پر کھڑا کیا گیا جو احسن واطیب تھا۔ پھر آپ کو اس کا پھل کھلایا گیا۔ جو آپ کی پشت میں نطفہ بن گیا۔ اور جب زمین پر تشریف لائے تو ام المومنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شب باشی فرمائی اور وہ خاتون جنت سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا سے حاملہ ہوئیں۔

اس جگہ پر ایک واضح اور صریح اشکال واقع ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ولادت اظہار نبوت سے سات سال اور کچھ پہلے ہے۔ اور واقعہ معراج و اسراء بعد از نبوت ہے مگر یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قبل از اظہار نبوت بھی اسراء کو لازم قرار دیں اور وہ خواب میں سے ہوا ہو تو یہ حکایت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس خواب کی ہوگی جو اظہار نبوت سے پہلے آپ کو جنت میں لے گئی ہوگی۔ اور یہ بغیر اسراء کے ہوگی اور یہ واقعہ وہاں کا ہے لیکن اس جگہ اس کا ذکر کرنا درست نہ ہوگا۔

رؤیتِ الٰہی: ۔ وصل: جب سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نشانیوں کو ملاحظہ فرما چکے تو اب قرب و اختصاص میں باریابی اور حضوری کا وقت آیا اور آپ آخر تک پہنچے اور تمام سے انقطاع تام ہوگیا۔ آپ تنہا رہ گئے۔ کوئی فرشتہ اور انسان آپ کے ساتھ نہ رہا۔ ہنوز ستر نورانی حجاب ایسے ہیں کہ ایک حجاب دوسرے حجاب کے ہم مثل نہ تھا۔ روایت میں آیا ہے کہ ہر حجاب کی تہ (موٹائی) پانچ سو برس کی راہ تھی۔ ابھی ان کا طے کرنا باقی تھا۔ چنانچہ آپ نے ان سب کو حق تعالیٰ عز اسمہ کی امداد و اعانت سے قطع فرمایا۔ اس وقت خاص قسم کی حیرت و دہشت اور حق تعالیٰ کی جلالت و عظمت پیش آئی۔ منادی نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہم آوازی میں ندا دی کہ "قِفْ یَامُحَمَّدُ فَاِنَّ رَبَّکَ یُصَلِّیْ۔" (اے محمد ٹھہریئے بیشک آپ کا رب صلوٰۃ بھیجتا ہے) آپ متفکر ہوئے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی آواز کہاں سے آئی۔ آپ کو اس آواز سے ایک انس معلوم ہوا اور اس وحشت سے باہر نکلے جو در پیش تھی۔ پھر حضرت حق جل مجدہ سے ندا آئی "اُدْنُ یَاخَیْرَالْبَرِیَّۃِ اُدْنُ یَااَحْمَدُ اُدْنُ یَامُحَمَّدُ" (اے ساری مخلوق سے افضل قریب ہوجایئے، اے احمد قریب ہوجایئے، اے محمد قریب ہوجایئے) پھر میرے رب نے مجھے اپنے سے اتنا قریب فرمایا اور میں اتنا نزدیک ہوگیا کہ جیسا کہ خود فرمایا۔ "ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْاَدْنٰی۔" (پھر وہ جلوہ نزدیک ہوا۔ پھر خوب اتر آیا تو اس جلوہ اور محبوب میں دو ہاتھ کا فاصلہ رہا بلکہ اس سے بھی کم) پھر میرے رب نے مجھ سے کچھ دریافت فرمایا تو مجھ میں اتنی تاب نہ تھی کہ جواب دے سکتا۔ اس وقت اپنا دست قدرت میرے دونوں شانوں کے درمیان بے کیف و حد بڑھایا میں نے اس کی ٹھنڈک کو اپنے سینہ گنجینہ میں محسوس کیا۔ اس وقت مجھے تمام اولین و آخرین کا علم عطا فرمایا اور طرح طرح کے علوم تعلیم فرمائے جن میں سے ایک علم ایسا تھا جس کے ظاہر نہ کرنے کا عہد مجھ سے لیا گیا کہ اسے کسی سے نہ کہوں اور ہر کوئی اس کے برداشت کی طاقت بھی نہیں رکھتا بجز میرے۔ ایک علم ایسا تھا جس کے ظاہر کرنے اور چھپانے کا مجھے اختیار دیا گیا۔ اور ایک علم ایسا تھا جس کو اپنی امت کے ہر خاص و عام میں تبلیغ کرنے کا حکم فرمایا۔ پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ اے میرے رب تیرے حضور حاضری کے وقت میں متوحش ہوگیا تھا چانک میں

نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی آواز کے مشابہ سنا کہ "قِفْ یَا مُحَمَّدُ فَاِنَّ رَبَّکَ یُصَلِّیْ" (اے محمد ٹھہریئے بیشک تمہارا رب صلوٰۃ بھیجتا ہے۔) میں اس سے متعجب ہوں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ اس جگہ کہاں سے آئے اور یہ کہ پروردگار نماز گزارنے سے بے نیاز ہے حکم رب ہوا میں دوسروں کے لئے نماز گذارنے سے بے نیاز ہوں اور میں فرماتا ہوں کہ "سُبْحَانِیْ سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ عَلٰی غَضَبِیْ۔" (پاکی ہے مجھے میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی ہے) اے محمد اس آیتہ کو پڑھئے "هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَمَلٰٓئِکَتُهٗ لِیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا ۔" (خدا وہ ہے جو تم پر صلوٰۃ بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے۔ تاکہ تمہیں اندھیریوں سے نور کی طرف لائے اور وہ مسلمانوں کے ساتھ رحیم ہے) تو میری صلوٰۃ تم پر اور تمہاری امت پر رحمت ہے۔ اب رہا میرا تمہارے رفیق ابو بکر رضی اللہ عنہ کی آواز سنوانا۔ تو یہ انسیت کے لئے ہے۔ تاکہ تم انس گیر ہو کر اس پر ہیبت مقام میں اپنے حال پر آسکو۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! جب ہم نے چاہا کہ ہم تمہارے بھائی موسیٰ (علیہ السلام) سے ہم کلام ہوں تو ان پر ایک عظیم ہیبت طاری ہو گئی تھی۔ اس وقت میں نے ان سے پوچھا۔ "وَمَا تِلْکَ بِیَمِیْنِکَ یٰمُوْسٰی" (اے موسیٰ وہ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟) تو موسیٰ علیہ السلام کو عصا کے ذکر سے انسیت ہوئی۔ اور اپنے حال پر آگئے۔ اسی طرح اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے لئے چاہا کہ انس پا سکو۔ تو تمہارے لئے تمہارے رفیق ابو بکر کی آواز پیدا فرمائی کیونکہ تم اور ابو بکر رضی اللہ عنہ دونوں ایک ہی طینت پر پیدا کئے گئے ہو وہ تمہارا انیس دنیا اور آخرت میں ہے لہٰذا میں نے ایک فرشتہ کو ان کی صورت پر پیدا فرمایا کہ وہ ان کی مشابہ آواز میں ندا کرے تاکہ تم سے وحشت جاتی رہے۔ اور ہیبت سے وہ چیز تمہیں لاحق نہ ہو۔ جو تمہاری فہم کو اس سے باز رکھے جسے میں نے تمہارے لئے چاہا ہے۔ اس کے بعد حق تعالیٰ نے دریافت فرمایا جبریل علیہ السلام کی وہ حاجت جس کے بارے میں تم سے عرض کیا تھا وہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا خداوندا! تو اسے خوب جانتا ہے۔ فرمان باری ہوا میں نے اس کی حاجت قبول فرمائی لیکن ان لوگوں کے حق میں جو اے محبوب تمہیں چاہتے، دوست رکھتے اور تمہاری صحبت میں رہتے ہیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کے بعد میرے لئے سبز رنگ کی رفرف بچھائی گئی۔ جس کا نور آفتاب کے نور پر غالب تھا۔ اس سے میری آنکھوں کا نور چمکنے لگا۔ مجھے اس رف رف پر بٹھایا گیا وہ مجھے لے کر روانہ ہوا۔ یہاں تک کہ میں عرش پر پہنچا اس کے بعد ایک ایسا امر عظیم دیکھنے میں آیا جس کی توصیف سے زبانیں قاصر ہیں۔ پھر عرش سے ایک قطرہ میرے قریب آیا اور وہ میری زبان پر گرا۔ میں نے اس چیز کو چکھا جسے کسی چکھنے والے نے کبھی اس سے زیادہ شیریں نہ چکھا ہو گا۔ اور مجھے اولین و آخرین کی خبریں حاصل ہوئیں۔ اور میرا دل روشن ہو گیا۔ اور عرش کے نور نے میری آنکھ کو ڈھانپ لیا اس وقت میں نے تمام چیزوں کو اپنے دل سے دیکھا۔ اور اپنے پس پشت بھی ایسا ہی دیکھنے لگا جیسا اپنے سامنے سے دیکھتا ہوں۔ رفرف، بچھونے کو کہتے ہیں۔ دراصل یہ اس بچھونے کو کہا جاتا ہے جو نرم ہو اور دیباج وغیرہ سے بنایا گیا ہو۔

تنبیہہ : باخبر رہنا چاہئے کہ یہ جو بیان کیا گیا ہے کہ اس محل رفیع میں حجابات تھے تو یہ حجابات مخلوق کے حق میں ہیں نہ کہ خالق عزوجل کے حق میں۔ حق تبارک و تعالیٰ پاک و منزہ ہے کہ وہ محجوب ہو ۔ اور اسے کوئی چیز چھپا سکے ۔ اس لئے کہ حجاب، بمقدار محسوس محیط ہوتا ہے اور خلق خدا، حق تعالیٰ سے اسماء و صفات اور ان افعال کے معانی سے محجوب ہیں اور ساری مخلوق میں سے انوار و ظلمات میں سے ہر ایک کے لئے حجاب کا ایک جانا پہچانا مقام ہے۔ اور ادراک و معرفت کا مقررہ حصہ ہے۔ اور وہ ملائکہ مقربین جو عرش کے گرداگرد ہیں اور وہ کروبیان جو مقربانِ بارگاہِ قدس ہیں یہ سب حضرت حق قدوس و قیوم کی کبریائی، جلالت، عظمت اور ہیبت کے نور سے محجوب ہیں اور صفاتِ حجاب ہیں۔ فرشتے محجوب ہیں اور ان کے طبقات مختلف ہیں اور ان فرشتوں کے لئے ایک مقام معلوم اور درجہ معین ہے۔ اور ساری مخلوق، خالق سے محجوب و درپردہ ہیں کوئی مخلوق تو منعم کی نعمتوں کی رؤیت سے اور محول کے

حوال کی رویت سے اور مسبب کے اسباب کی رویت سے محجوب ہے۔ اور کوئی مخلوق علم سے علم میں، فہم سے فہم میں، اور عقل سے عقل میں محجوب ہے۔ یہ سب منعم کی نعمتوں سے اور وہاب یعنی عطا فرمانے کی مواہب و عطایا سے معنی میں حجاب ہیں۔ اور کوئی مخلوق مباح شہوتوں سے اور کوئی حرام شہوتوں سے اور کوئی معاصی و سیئات سے محجوب ہیں۔ اور کوئی مخلوق مال و اولاد اور دنیاوی زینتوں سے محجوب ہیں:۔ "اَللّٰهُمَّ لَا تَحْجُبْنَا عَنْكَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ (اے خدا ہمیں دنیا و آخرت میں اپنے سے محجوب نہ کرنا۔) اس کلام کو بعض عارفوں نے (رحمتہ اللہ علیہم اجمعین) بیان فرمایا ہے۔

معلوم ہونا چاہئے کہ یہ جو "ثُمَّ دَنٰى فَتَدَلّٰى" مذکور ہوا ہے اور اسکی تعبیر "قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى" سے کی گئی ہے یہ معراج کی حدیثوں میں مذکور ہے اور یہ اس کے سوا ہے۔ جو سورۂ والنجم میں مذکور ہے۔ کیونکہ بقول مختار، اس کی نسبت جبریل علیہ السلام کی رؤیت اور اس سے نزدیکی کی طرف کی گئی ہے۔ اور آیۃ کریمہ کا ظاہر سیاق و سباق بھی یہی ہے۔ بعض مفسرین نے پروردگار عالم کی رؤیت اور اس سے قرب کی طرف محمول کیا ہے جیسا کہ کتب تفسیر میں مذکور ہے۔ اور بارگاہ ربوبیت میں اتم کمال اور غایت ادب و اجلال، حد عبودیت کی نگہداشت ہے۔ اور سکونِ قلب، طمانیتِ باطن اور علو ہمت کی نہایت، بصر و بصیرت کے موافقت ہے۔ اس کے باوجود کہ بیشمار آیات و کرامات کے ظہور ہوئے مگر کسی ایک کی جانب توجہ والتفات نہ فرمائی۔ اور رغبت و میلان کا اظہار نہ فرمایا۔ چنانچہ حق تبارک و تعالیٰ نے فرمایا:۔ "وَمَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى" (نہ تو آنکھ جھپکی اور نہ بے راہ ہوئی) جس طرح کہ بندگان خاص بادشاہوں کے حضور میں حاضری دیتے ہیں اور یہ وہ کمال ہے جو اکمل بشر سید رسل علیہ صلوات اللہ تعالیٰ وسلامہ کے سوا کسی کو میسر نہیں۔ لوگوں کی عام عادت یہ ہے کہ جب وہ کسی بلند مقام میں ٹھہرتے ہیں تو اس مقام عالی کے بارے میں معلومات حاصل کرتے اور بزرگی پانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام مقام مناجات اور مرتبہ کلام پر فائز ہوئے تو انہوں نے دیدار باری کی خواہش ظاہر کی۔ یہ ایک قسم کی مدہوشی و خوشی ہے کیونکہ مقام قرب میں ادب کی رعایت دور ہو جاتی ہے۔ مگر ہمارے سردار سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب مقام قرب میں فائز المرام ہوئے تو اس کے حقوق کو پورا فرمایا اور کسی چیز کی جانب اپنی بصر و بصیرت سے التفات نہ فرمایا۔ بجز اس مقام کے جس پر آپ جلوہ افروز تھے۔ اور کسی بات کی خواہش و تمنا ظاہر نہ فرمائی۔ لہٰذا مراتب و درجات کے تمام منازل طے فرمائے۔ اور ان میں سب سے بلند و اعلیٰ مرتبہ دیدار باری تعالیٰ ہے اور یہ وہ مقام ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اللہ تعالیٰ نے اقامت کرائی اور اہل صحو اور ارباب تمکین کے مقامات میں یہ مقام سب سے اونچا اور بلند ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا۔ "مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى" (جو آنکھ نے دیکھا دل نے اسے نہ جھٹلایا) اور بصر و بصیرت دونوں ایک دوسرے کی تائید و تصدیق کرتی رہیں جو کچھ بصیرت نے پایا آنکھ نے اس کا ادراک کیا۔ اور جو کچھ آنکھ نے دیکھا دل نے اس کی تصدیق کی۔ اور سب ہی حق و صحیح تھا۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کمال پایا کہ تمام اولین و آخرین پر سبقت لے گئے اور تمام انبیاء و مرسلین صلوات اللہ علیہم اجمعین غبطہ کرنے لگے اور آپ دنیا و آخرت میں صراطِ مستقیم پر مستقیم ہوئے اور آپ کی اس استقامت کو حق تعالیٰ نے قسم سے یاد فرمایا۔ چنانچہ ارشاد باری ہے۔

يٰسٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۙ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ؕ (اے سید عالم) قسم ہے حکمت والے قرآن کی یقیناً بلاشبہہ آپ رسولوں میں سے ہیں، صراطِ مستقیم پر قائم ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے وہ جس کو چاہے نوازے۔ وہی بڑے فضل والا ہے اس کے بعد فرمایا۔ "فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى" (پھر وحی فرمائی اپنے بندۂ خاص پر جو وحی فرمائی) اور تمام علوم و معارف حقائق و بشارات، اشارات و اخبار، آثار و کرامات اور وہ کمالات

جواس ابہام کے احاطہ میں ہیں سب داخل ہیں اور اس کی ہر کثرت و عظمت کو شامل ہیں ۔ کیونکہ مبہم صیغہ لایا گیا ہے اور اس اشارے بیان نہ فرمایا۔ اس لئے کہ بجز علام الغیوب اور رسول محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی اس پر احاطہ کرنے والا نہیں ہو سکتا۔ مگر اتنا ہی جتنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا۔ اسی قدر جتنا آپ کی روح اقدس کے مقابلہ و محاذات کرنے سے باطنوں پر القا ہوا۔ چنانچہ بعض اکمل اولیاء کرام جنہوں نے آپ کے اتباع سے استعداد و شرافت حاصل کرلی وہ کچھ ان امور مبہمہ سے مشرف ہوئے۔ (واللہ اعلم)

بیان کرتے ہیں کہ جب حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم عرش پر پہنچے تو عرش نے دامن اجلال کو تھام کر زبان حال سے عرض کیا اور کہا آپ ہی ہیں اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہ حق تعالیٰ نے اپنے جلال احدیت سے مشاہدہ کرایا اور اپنے جمال صمدیت سے مطلع فرمایا۔ اور میں غم زدہ آہیں بھرتا ہوں کوئی راہ نہیں پاتا کہ کس رستہ سے داخل ہو کر کیونکر اپنے کام کی گرہ کھولوں۔ باوجودیکہ حق تعالیٰ نے مجھے اعظم خلق بنایا اور میں ہیبت و تحیر اور خوف میں "اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم" واقعۃً ہوں جب پروردگار نے مجھے پیدا فرمایا تو میں اس کے ہیبت و جلال سے کانپنے لگا۔ پھر میرے پایہ پر لکھا "لا الٰہ الا اللہ" تو ہیبت سے میں اور کانپنے لرزنے لگا پھر جب لکھا۔ محمد رسول اللہ۔ تو میرا قلق ٹھہر گیا۔ اور میرا اضطراب کم ہو گیا۔ آپ کا اسم گرامی میرے دل کے چین کا سبب اور میرے سر کے اطمینان کا باعث ثابت ہوا۔ مجھ پر آپ کے اسم گرامی کی یہ برکت رونما ہوئی۔ اب تو کیسی کچھ برکتیں حاصل ہوں گی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی نظر مبارک مجھ پر پڑ گئی۔ "اَنْتَ الْمُرْسَلُ رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" آپ تو سارے جہانوں کے لئے رسول رحمت ہیں لازمی آپ کی اس رحمت میں میرا بھی حصہ ہو گا۔ اے میرے حبیب میرا حصہ یہ ہے کہ آپ میری براءت کی گواہی دیں۔ ان چیزوں سے جن کی میری طرف مکر و افترا والے نسبت کرتے ہیں۔ اہل غرور مجھ پر بہتان رکھتے ہیں کہ مجھ میں اتنی گنجائش ہے کہ میں اس ذات کو سما سکوں جس کا کوئی مثل نہیں۔ اور میں اس کا احاطہ کر سکوں جو حد و کیف سے خارج ہے۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جس ذات قدس کی کوئی حد و کیف نہ ہو اور جس کے صفات بے عدد و شمار ہوں وہ ذات میری کیسے محتاج ہو گی۔ اور وہ کیوں کر مجھ پر سوار ہو سکے گی۔ جب کہ رحمٰن اس کا نام ہے اور استویٰ اس کی صفت ہے۔ اور اس کی صفت اس کی ذات سے متصل ہے تو وہ کس طرح مجھ سے متصل یا منفصل ہو سکتی ہے اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قسم ہے مجھے اس کی عزت و جلال کی میں وصل کے ساتھ اس سے قریب ہوں اور فصل سے اس سے بعید نہیں۔ اور نہ میں اس کا حامل ہوں اور نہ اس کو اپنے میں سمونے والا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے فضل سے سے پیدا فرمایا اگر وہ مجھے اپنے عدل سے نیست و نابود کر دے تو میں اس کی قدرت اور اس کی حکمت کا محمول و معمول ہوں۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان حال سے عرش کو جواب دیا۔ مجھ سے ایک طرف ہو جا۔ میں تجھ سے بے پروا اور تجھ سے بے نیاز ہوں۔ میرے صفائے وقت کو مجھ پر مکدر نہ کر اور میری خلوت و تنہائی کو پراگندہ نہ بنا۔ اس کے بعد آپ نے عرش کی جانب توجہ و التفات کی نظر ڈالی۔ مگر اس کی طرف مکمل طور پر مائل نہ ہوئے۔ اور جو کچھ اس پر لکھا ہوا تھا اسے نہ پڑھا۔ اور "مَا اَوْحٰى اِلَيْهِ" (جو کچھ ان کی طرف وحی کی گئی) اس بھید کا ایک حرف و کنایہ یہ بھی ہے "مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى" (نہ ان کی آنکھ بھٹکی اور نہ بے راہ ہوئی)۔

بیان کرتے ہیں کہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مرتبہ "قاب قوسین او ادنیٰ" پر فائز ہوئے تو آپ نے امت کے احوال پیش کئے۔ عرض کیا اے رب! تو نے بہت سی امتوں پر عذاب فرمایا۔ کسی کو پتھروں سے۔ کسی کو خسف سے یعنی زمین میں دھنسا کر اور کسی کو مسخ سے یعنی صورتوں کو بگاڑ کے۔ حق سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا میں ان پر رحمت نازل کروں گا اور ان کی بدیوں کو نیکی سے بدل ڈالوں گا۔ اور جو کوئی مجھ سے دعا کرے گا میں اسے لبیک کہوں گا اور جو مانگے گا اسے عطا فرماؤں گا۔ اور جو مجھ پر توکل کرے گا میں اسے کفایت کروں گا۔ اور دنیا میں اس کے گناہوں کو چھپاؤں گا اور آخرت میں تمہیں اس کا شفیع بناؤں گا اگر نہ ہوتا حبیب، تحت معاتبۂ حبیب، تو

میں ان سے حساب نہ لیتا۔

مراجعت از معراج شریف:۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عالم میں واپسی کا ارادہ فرمایا تو بارگاہ قدس میں عرض کیا اے رب! ہر مسافر کیلئے واپسی کا تحفہ ہوتا ہے۔ میری امت کے لئے اس سفر کا تحفہ کیا ہے۔ حق تبارک وتعالیٰ نے کہا زندگی بھر میں ان کا ہوں انکے مرنے کے بعد بھی ان کا ہوں اور قبروں میں بھی میں ان کا ہوں اور حشر میں بھی میں ان کا ہوں۔ غرضیکہ ہر حال میں میں ان کا مددگار ہوں۔ " فَطُوْبٰی لَکُمْ یَا اُمَّۃَ مُحَمَّدٍ وَّبُشْرٰی لَکُمْ " تو خوشی ہے تمہارے لئے اے امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور بشارت ہو تمہیں۔ اور جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائے اور صبح ہوئی تو آپ نے لوگوں سے اس کا تذکرہ فرمایا تو کچھ ضعیف الایمان لوگ اس پر مرتد ہو گئے اور کچھ مشرکین دوڑ کر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے۔ کہنے لگے کچھ اپنے یار اور رفیق کی خبر ہے کہ وہ کیا کہتے ہیں؟ وہ فرماتے ہیں " آج رات مجھے بیت المقدس لیجایا گیا " حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کیا یقیناً ایسا فرماتے ہیں؟ مشرکین نے کہا ہاں یہی فرماتے ہیں۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا پھر تو وہ جو کچھ فرماتے ہیں ٹھیک ہی فرماتے ہیں۔ میں اس پر ایمان لاتا ہوں۔ مشرکین کہنے لگے کیا تم اس کی تصدیق کرتے ہو کہ رات میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بیت المقدس تشریف لے گئے اور صبح سے پہلے یہاں واپس تشریف بھی لے آئے۔ انہوں نے فرمایا ہاں۔ میں تو اس سے دور تر کی بھی تصدیق کرتا ہوں اگر آپ یہ فرمائیں کہ میں آسمان پر گیا اور پھر واپس آگیا تو اس کی بھی تصدیق کروں گا۔ بیت المقدس کیا چیز ہے؟ چنانچہ اسی دن سے حضرت ابو بکر کا لقب "صدیق" مشہور ہو گیا۔ (رضی اللہ عنہ) اس کے بعد سیدنا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا حضور بیت المقدس کی علامات و نشانیاں ان لوگوں کو فرمائیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں بتاؤں گا۔ عرض کیا یا رسول اللہ بیان فرمایئے۔ میں وہاں گیا ہوں اور اسے میں نے دیکھا ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نشانیاں بیان فرمائیں اس پر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا " اَشْھَدُ اَنَّکَ رَسُوْلُ اللّٰہِ " (میں شہادت دیتا ہوں یقیناً آپ اللہ کے رسول ہیں) حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ مطالبہ کرنا از طریق شک و تردد نہ تھا وہ تو کفار کی زبانوں سے محض سنتے ہی تصدیق فرما چکے تھے بغیر اس کے کہ آپ سے نشانیاں دریافت کریں۔ بلکہ یہ دریافتگی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے اظہار میں اپنی قوم کے لئے تھی۔ اس لئے کہ قوم کو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی خبر پر وثوق تھا۔ اور آپ کی تصدیق ان کے لئے حجت تھی اس کے باوجود علامت دریافت کرنے اور حقائق واضح کرانے کے مقام میں آئے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بیت المقدس کے احوال و اوصاف دریافت کئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب باتیں بیان فرمائیں۔ مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بعض باتوں کا تفصیلی جواب مجھے حاضر نہ ہوا تو میں بہت زیادہ فکر مند ہوا۔ اور ایسا فکر مند ہوا کہ اس سے پہلے کبھی اتنا فکر مند نہ ہوا تھا۔ اس وقت بیت المقدس میرے پیش نظر کیا گیا تو جو کچھ انہوں نے پوچھا میں نے بتا دیا۔ کہتے ہیں کہ اس کے دو احتمال ہیں یا تو مسجد اٹھا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لائی گئی جس طرح کہ بلقیس کا تخت پلک جھپکنے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے لایا گیا تھا۔ یا اس کی مثل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے لایا گیا جس طرح کہ جنت و دوزخ کو نماز میں متمثل کیا گیا۔ ایسا ہی علماء بیان کرتے ہیں۔ ایک اور احتمال یہ ہے کہ وہاں سے بیت المقدس تک تمام پردے اٹھا دیئے گئے۔ اور آپ کے پیش نظر بیت المقدس کر دیا۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام مسجد اقصیٰ کو عقیل کے گھر کے پاس میری نظر کے سامنے اٹھا کر لائے۔ میں اسے دیکھتا جاتا تھا اور جو وہ دریافت کرتے جاتے تھے جواب دیتا جاتا تھا۔ ام ہانی رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ لوگوں نے دریافت کیا بیت المقدس کے کتنے دروازے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا۔ میں نے اس کے دروازوں کو گنا نہیں تھا۔ اب جو مجھ پر مکشوف ہوا اور اسے اٹھا کر لایا گیا تو میں نے گن کر انہیں بتایا۔
بیان کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر اسراء سے تشریف لا رہے تھے تو قریش کا ایک قافلہ غلہ لاد کر لا رہا تھا اس قافلے میں دو غرارے تھے ایک سیاہ اور ایک سفید جب اٹھا کر اونٹ کے سامنے لائے تو اونٹ بھاگ گیا ان میں سے ایک اسے گھیر کر لے آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں نے ان لوگوں پر سلام کیا۔ وہ کہنے لگے یہ آواز تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہے جو آرہا ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبل از صبح تشریف لائے اور اس قوم کو اس کی خبر دی۔ اور جو کچھ دیکھا تھا بیان فرمایا۔ اور فرمایا اس کی نشانی یہ ہے کہ میں نے تمہارے اونٹوں کو فلاں مقام پر آتے ہوئے چھوڑا ہے۔ ان کا ایک اونٹ گم ہو گیا تھا جسے فلاں شخص گھیر لایا تھا۔ اور قافلے کے آگے سفید و سیاہ رنگ کا اونٹ ہے جس پر سیاہ پالان ہے اور دو غرارے فلاں روز یہاں پہنچیں گے۔ اور جب وہ دن آیا اور قافلہ نہ پہنچا تو لوگ انتظار کرنے لگے اور نصف دن تک قسم قسم کی چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ آدھا دن تھا کہ قافلہ پہنچ گیا اور اسی شان سے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا تھا۔ اور دشمنوں اور منکروں کے چہروں پر خاک پڑ گئی۔
ایک روایت میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی کہ قافلہ بدھ کے دن آئے گا وہ سورج کے غروب ہونے تک نہ آیا اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی اور سورج کو غروب ہونے سے باز رکھا گیا اور قافلہ آگیا۔

دیدار الٰہی میں اختلاف سلف۔ وصل:۔ قدیم و جدید صحابہ و تابعین اور بعد والوں نے معراج میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رؤیت باری تعالیٰ میں اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور صحابہ و سلف کی ایک جماعت نفی کی جانب ہے۔ امام بخاری، مسروق سے حدیث لائے ہیں کہ انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ اے مادر من! کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے؟ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا بلاشبہ میرے جسم کے رونگٹے تمہارے اس سوال سے کھڑے ہو گئے جو تم نے پوچھا۔ جو کوئی تم سے یہ کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا۔ یقیناً اس نے دروغ کہا۔ اس کے بعد انہوں نے اس آیت کو پڑھا۔ "لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ" کوئی آنکھ اس کا ادراک نہیں کر سکتی۔ وہ آنکھوں کا ادراک فرما رہا ہے اور وہی مہربان و خبردار ہے۔ اور مسلم کی روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا "مَنْ حَدَّثَكَ أَنَّ مُحَمَّدًا رَأَى رَبَّهُ فَقَدْ أَعْظَمَ الْفِرْيَةَ۔" (جو تم سے یہ کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا بیشک اس نے بڑا جھوٹ باندھا) امام نووی اور ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کسی مرفوع حدیث سے رؤیت الٰہی کے وقوع کی نفی نہیں کی۔ اگر حدیث مرفوع ہوتی تو اسے وہ بیان فرماتیں۔ اور انہوں نے اسی آیت پر اعتماد و استنباط فرمایا۔ بلاشبہ بعض صحابہ نے ان کے اس اجتہاد کی مخالفت کی۔ اور کوئی صحابی جب اپنی بات کہتا ہے اور کوئی دوسرا صحابی اس کی بات کی مخالفت کرتا ہے تو وہ قول بالاتفاق حجت نہیں ہوتا۔ آیۂ کریمہ کی کئی توجیہات ہیں۔ ادراک، رؤیت سے اخص ہے۔ ادراک کی نفی سے رؤیت کی نفی لازم نہیں آتی۔ ادراک حقیقت کی معرفت ہے۔ اور یہ منفی ہے۔ جس طرح کہ کوئی چاند کو دیکھتا ہے اور اس کی حقیقت و کنہ اور ماہیت کو نہیں پاتا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ادراک کا مطلب احاطہ یعنی گھیرنا ہے۔ اور عدم احاطہ، عدم رؤیت کو لازم نہیں آتا۔ جیسا کہ عدم احاطہ علم سے عدم علم لازم نہیں آتا۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ "لَا أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلَى نَفْسِكَ۔" اے رب مجھ سے تیری ایسی ثنا نہیں ہو سکتی جیسے تو نے اپنی ثنا خود فرمائی ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ثنا کی ہی نہیں گئی۔
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور تابعین رؤیت الٰہی کا اثبات کرتے ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ انہوں نے کسی کو ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس بھیجا کہ کیا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ حضرت ابن

عباس نے فرمایاہاں! اور فرمایا، حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلت سے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کلام سے اور سید عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رؤیت سے خاص فرمایا ہے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ وہ بقسم کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا۔ اور ابن خزیمہ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ اس رؤیت باری پر کعب، زہری، معمر، اور بہت سے صحابہ نے اثبات و جزم کیا ہے۔ اور اشعری کا قول بھی یہی ہے۔ اور امام مسلمؒ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پروردگار عالم کی رویت کے بارے میں پوچھا تو فرمایا "هُوَ نُوْرٌ اَنّٰی كَيْفَ اَرَاهُ۔ " یعنی وہ نور ہے میں کیسے اسے دیکھ سکتا ہوں۔ یہ حدیث اس حدیث سے معارض ہے۔ جس میں واقع ہوا ہے کہ " رايت نوراً " میں نے نور کو دیکھا۔ امام احمد سے بھی اثبات رؤیت منقول ہے۔ امام احمد سے لوگوں نے کہا کہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے قول کو کس چیز سے ہم اٹھائیں۔ فرمایا قول نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ فرمایا "رَاَيْتُ رَبِّیْ۔ " میں نے اپنے رب کو دیکھا اور قول نبی صلی اللہ علیہ وسلم قول عائشہ رضی اللہ عنہا سے اکبر ہے اور نقاش امام احمد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا میں حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جواب دوں گا کہ فرمایا "رَاٰهُ رَاٰهُ" اسے دیکھا اسے دیکھا۔ اور برابر کہتے رہے یہاں تک کہ ان کا سانس منقطع ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا " حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا" فرمایا ہاں !! اور سلف کی ایک جماعت نے راہ توقف اختیار کی ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم اثبات و نفی کی کسی جانب جزم نہیں کرتے اور قرطبی نے اس قول کو ترجیح دی ہے اور کہا کہ کسی جانب کوئی قطعی دلیل نہیں ہے زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ دونوں گروہوں نے جس سے استدلال کیا ہے ان کی ظاہری عبارات متعارض ہیں اور قابل تاویل نہیں ہیں اور نہ یہ اعمال سے متعلق ہیں جو دلائل ظنیہ پر اکتفا کیا جا سکے بلکہ یہ معتقدات سے ہے اس میں قطعیات ہی اکتفا کرتی ہیں۔ (واللہ اعلم)

ایک گروہ کا مذہب یہ ہے کہ دیدار الٰہی دیدۂ دل سے کیا ہے نہ کہ چشم سر سے۔ اور دیدۂ دل سے مراد، نہ علم ہے نہ دانستن۔ کیونکہ یہ تو بروجہ اتم ہمیشہ حاصل تھا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ حق تبارک و تعالیٰ نے رؤیت کو دل میں پیدا فرمایا جیسا کہ آنکھ میں بینائی پیدا فرمائی۔ لہٰذا دل کا جاننا اور ہے اور دل سے دیکھنا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کے دونوں قول کی تطبیق کرتے ہیں کہ اس میں بظاہر اختلاف آنکھ سے دیکھنے میں ہے۔ دل سے دیکھنے میں نہیں۔ اس میں سب متفق ہیں۔

بندۂ مسکین (یعنی شیخ محقق) عبدالحق بن سیف الدین خصہ اللہ بمزید الصدق والیقین کہتا ہے کہ دلائل و اخبار اور آثار پر نظر کرتے ہوئے علماء کا کلام یہی ہے لیکن اتنا خلجان رہتا ہے کہ یہ معراج جو اتم مقامات اور اقصیٰ کمالات حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور اس میں کسی ایک نبی کی شرکت نہیں اور نہ اس مقام میں کسی انسان یا فرشتہ کی گنجائش ہے تو جائے تعجب ہے کہ اس مقام میں لے جایا جائے اور خلوت خاص میں حضوری کرائی جائے۔ اور سب سے اعلیٰ و اقصیٰ مطلوب جو کہ دیدار باری تعالیٰ ہے اس سے مشرف نہ کیا جائے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دیدار نہ کرنے پر راضی ہوں۔ اگرچہ کمال بندگی اور حق تعالیٰ کی کبریائی کی سطوت کا ادب اس کا مقتضی ہے کہ سوال نہ کیا جائے اور ذوق کلام سے مست ہو کر خوشی و مسرت کا اظہار کریں۔ اور دیدار کی خواہش نہ کریں۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے کیا۔ لیکن کمال محبت و محبوبیت جو کہ آپ کو جناب قدس سے ہے کہاں باز رکھتا ہے کہ درمیان میں کوئی حجاب باقی رہے اور یہ دولت طلب سے ہاتھ نہ آئے۔

اہلِ علم فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے لئے طلب، سوال اور انبساط، دیدار الٰہی سے مانع رہا۔ کبھی بے مانگے دیا جاتا ہے اور

بھی مانگنے اور چاہنے سے بھی نہیں دیا جاتا۔ نادر بات یہ ہے کہ ایک قوم کہتی ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام طلب کے بعد بھی اس سے محروم رہے تو بیہوش ہو گئے اور اس وقت وہ دیکھا جو ہرگز نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہ جزا ان کی بیتابی اور جلد بازی کی تھی۔ تحقیق یہی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ ہنوز سید المحبوبین صلی اللہ علیہ وسلم نے دیدار نہ کیا تھا اور آپ اس دولت تک پہنچے نہ تھے۔ دوسرے کی کیا مجال کہ طلب کرے اور دیکھ سکے۔ اور خود تمام علماء بھی اس پر متفق ہیں کہ دنیا میں رؤیت باری ممکن ہے۔ پھر بعد از امکان کیا چیز مانع ہے۔ اور خود یہ مقام معراج در حقیقت عالم آخرت سے ہے۔ اور جو کچھ عالم آخرت میں دیکھنا اور پانا ہوگا وہ اب دیکھ لیا اور پالیا تاکہ خلق کو بحکم عین الیقین دعوت فرماسکیں۔ جیسا کہ کہا گیا ہے۔ مصرعہ ۔ از دیدہ بسے فرق بود تا بشنیدہ۔ (واللہ اعلم)

باب ششم

وہ معجزات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحتِ نبوت اور صداقتِ رسالت پر دلیل و نشان ہیں

معجزہ، خرق عادت کو کہتے ہیں جو مدعی رسالت و نبوت کے ہاتھ سے ظاہر ہوتا ہے جس سے مقصود تحدی ہے۔ تحدی کے معنی کسی کام میں برابری کرنا۔ اور دشمن کو عاجز کر کے غلبہ حاصل کرنا ہے۔ تحقیق یہی ہے کہ معجزہ میں تحدی شرط نہیں ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے بہت سے معجزے ظاہر ہوئے جس میں تحدی نہیں تھی مگر کہتے یہ ہیں کہ مراد یہ ہے کہ اس کی شان سے تحدی ہو۔ "اس تقدیر پر "مدعی رسالت سے واقع" ہونے کی قید کافی ہے۔ اور یہ بات مشہور ہے کہ جو کچھ مدعی رسالت سے واقع ہوتا ہے اسے معجزہ کہتے ہیں۔ اور جو کسی غیر نبی سے واقع ہوتا ہے اگر اس کے ساتھ کمالِ ایمان وتقویٰ اور معرفت واستقامت جسے ولایت کہتے ہیں شامل ہے تو اس کا نام کرامت ہے۔ اور اگر کسی عام مومن وصالح سے صادر ہو تو اسے معونت کہتے ہیں اور وہ جو فاسقوں اور کافروں سے صادر ہوتا ہے اسے استدراج کہتے ہیں مگر یہ کہ توبہ واسلام پر منتج ہو۔ علم کلام میں معجزات کے ضمن میں بہت بحثیں ہیں اس جگہ اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور جتنی اس جگہ ضرورت تھی اسی قدر ہمارا بیان کرنا بہتر ہے۔

تمام انبیاء و مرسلین صلوات اللہ تعالیٰ وسلامہ علیہم اجمعین صاحب معجزات ہیں اور کوئی نبی بغیر معجزہ کے نہیں ہے۔ اور ہمارے نبی سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات ان سب سے زیادہ اور وافر واقوی اور روشن واظہر اور مشہور تر ہیں۔ اور کلام میں معجزات کی عبارتیں جو کہ دلائل و آیات پر مشتمل ہیں بکثرت واقع ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے دلائل میں توریت وانجیل اور دیگر تمام کتبِ سماوی میں بے شمار خبریں واقع ہوئی ہیں۔ ان میں آپ کا ذکر اور مکہ مکرمہ سے ہجرت کا تذکرہ اس کا کچھ حصہ پہلے گزر چکا ہے اور وہ جو امور غریبہ وعجیبہ آپ کی ولادت وبعثت کے دنوں میں ظاہر ہوئے۔ مثلاً آثار کفر کا مٹانا، مشرکانہ استھانوں کا ذلیل وخوار ہونا۔ اہل عرب کے شیون اور ان کی چہ میگوئیاں وغیرہ ان سب کا تذکرہ اپنی جگہ تفصیل سے آئے گا۔ چنانچہ اصحاب فیل کا قصہ، فارس کی ہزار سالہ آگ کا ٹھنڈا ہونا، کسریٰ کے محل کے کنگرے گرنا، دریائے ساوی کا پانی خشک ہونا، پجاریوں کا خوابیں دیکھنا، غیبی نداؤں اور آوازوں کا سننا وغیرہ یہ سب آپ کی نبوت وصفات کی علامتیں ہیں۔ اور اخبار مشہورہ میں بوقت ولادت مبارکہ اور شیر خوارگی کے زمانہ سے بعثت وظہور کے وقت تک اور بعد از بعثت غلبۂ تصرف کے سلسلے میں جو عجیب وغریب امور کا ظہور ہوا ان سب کو نقل کیا گیا ہے۔ حالانکہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اتنا مال نہ تھا جن سے قلوب کو جھکایا جاتا اور لوگ اس کی طمع میں آپ کے گرویدہ ہو جاتے اور نہ قوت وطاقت ہی اتنی تھی کہ ان لوگوں پر قہر وغلبہ حاصل کیا جاتا۔ اور جس دین کو آپ نے ظاہر فرمایا اور جس کی طرف آپ نے ان کو دعوت دی اس کو غالب کرنے کیلئے آپ کے پاس نہ لاؤ لشکر تھا اور نہ مال وزر، وہ لوگ سب کے سب بت پرستی اور زمانہ جاہلیت کی رسموں اور عادتوں پر مجتمع ومتفق تھے۔ اور دین جاہلیت میں از حد تعصب وتباغض، فسق وفجور اور خونریزی میں انتہائی غلو اور انہماک تھا اور امر خیر میں اتفاق واتحاد مفقود تھا۔ اور وہ اپنے ان افعال میں عاقبت کی طرف نظر ڈالتے ہی نہ تھے۔ نہ انہیں کسی عذاب وسزا کا خوف تھا اور نہ کسی ملامت وپشیمانی کا ڈر۔ ایسے لوگوں کے احوال وافعال کی حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلاح فرمائی۔ اور ان کے دلوں میں باہمی محبت والفت کی لہر دوڑائی اور ان سب کو ایک کلمہ پر جمع فرما دیا۔ یہاں تک کہ ان کی آراء متفق اور

ان کے دل مجتمع ہوگئے۔ حتیٰ کہ وہ سب مطیع و فرماں بردار بن گئے اور نصرت میں مختلف لوگ ایک دل ہوگئے۔ اور آپ کے جمال جہاں آراء کی طلعت کے عاشق و فریفتہ ہوگئے۔ اور آپ کی محبت میں اپنے شہروں، اپنے وطنوں اور اپنے گھروں کو چھوڑ دیا۔ اور اپنی قوم اور اپنے کنبوں سے منہ موڑ لیا۔ اور آپ کی نصرت میں اپنے جان و مال کو قربان اور آپ کے اعزاز میں اپنی جانوں کو تلواروں کے مقابل کھڑا کر دیا اور اس پر طرفہ یہ کہ وہ بے ساز و سامان تھے نہ ان پر مال نچھاور کیا گیا اور نہ مال و منال ہی تھا کہ دنیا میں جس کے حصول کے لالچ میں انہیں ڈالا جاتا اور ان ممالک و بلاد کا جن کے حاصل کرنے کیلئے اس جہان میں بھیجا گیا تھا۔ انہیں ان کا مالک و متصرف نہ قرار دیا بلکہ خود حضور ﷺ ان میں تصرف فرماتے غنی کو فقیر بناتے اور شریف کو برابر کمتر کے کرتے تھے۔ کیا ایسی جملہ باتیں اور ایسے تمام احوال کسی ایسے شخص میں جمع ہو سکتے ہیں اور اسے ان کا اتفاق پڑ سکتا ہے جو باختیار عقلی اور بتدبیر فکری بہ تکلف ان سب کو انجام دے سکے۔ اور ان کی کشود کار کر سکے؟ حالانکہ حضور ﷺ خود یتیم، بے زور و زر اور بے مال و منال اور بے معاون و مددگار اور تنہا تھے۔ لیکن حق تبارک و تعالیٰ نے آپ کو ایسی عزت، قدرت، تمکنت، مدد و نصرت اور قوت و شوکت عطا فرمائی کہ آپ سب پر غالب رہے۔ اور آپ کو اختیارات کی مضبوط گرفت عطا فرمائی۔ "لا واللہ" قسم ہے خدائے عز و جل کی ان سب کو مسخر و گرویدہ بنالیا۔ یہ تمام وہ باتیں ہیں جن میں کوئی عقلمند شک کبھی نہیں کرتا اور کامل یقین سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ امر الٰہی اور فیض سماوی ہے۔ قوت بشری کے ساتھ انتی رسائی پانا از روئے عادات عاجز ہے اور خالق و قوی کے سوا بشر اس پر قادر نہیں۔ الا له الخلق والامر تبرك الله رب العالمين

اُمّی ہونا معجزہ ہے:۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دلائل نبوت میں سے ایک یہ ہے کہ آپ امی و ناخواندہ تھے اور آپ خط و کتابت بالکل نہیں جانتے تھے۔ آپ اس قوم میں جو تمام کی تمام امی، جاہل اور ناخواندہ تھی آپ ان میں امی مولود ہوئے آپ کی نشو و نما اس شہر میں اور ان ہی لوگوں میں ہوئی جن میں گذشتہ علوم کا جاننے والا کوئی بھی نہ تھا اور نہ آپ نے کسی ایسے شہر کی طرف سفر ہی فرمایا جس میں کوئی عالم ہوتا اور آپ اس سے تحصیل علم کر سکتے اور توریت و انجیل اور گزشتہ امتوں کے اخبار و حالات جان سکتے۔ بلاشبہ ان کتابوں کے بڑے بڑے عالم ایسے گذرے تھے جو اپنی اپنی جگہ ان کتابوں کے ماہر و شناور تھے اور ان کتابوں کے علماء و عرفاء میں سے چند کے سوا کوئی باقی نہ رہا، پھر ان ملتوں کے ہر فریق سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی حجت قائم فرمائی کہ اگر جہان بھر کے تمام عالم و نقاد جمع ہو جاتے تو بھی اس کی مثل کوئی دلیل نہ لا سکتے۔ یہ اس امر پر پہلی دلیل ہے کہ آپ کے پاس جو کچھ تھا آپ اسے خدا کی طرف سے لائے تھے۔ اب تصور کرنا چاہئے اور یہ معلوم ہونا چاہئے کہ بغیر تعلیم و اکتساب علم، آپ علم و معرفت کے جتنے اعلیٰ مقام پر فائز تھے علوم اولین اور آخرین کی رسائی وہاں تک ناممکن ہے۔ حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے کیا خوب کہا ہے: بیت۔

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست کتب خانہ چند ملت بشست

اور مولانا جامی علیہ الرحمۃ نے بھی کیا خوب فرمایا ہے۔

امی و دقیقہ دان عالم بے سایہ و سائبان عالم

اور یہ بھی دیکھنا چاہئے اور غور کرنا چاہئے کہ وہ لوگ جو جہل و نادانی اور فسق و فجور کے اسفل السافلین میں تھے وہ آپ کی صحبت آپ کی خدمت اور آپ کی تعلیم و تربیت سے علم و عمل کے اعلیٰ علیین پر پہنچ گئے اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے تھا۔

اور اگر تم آپ کے اخلاق و صفات، کمالات و اوضاع اور آداب و اطوار میں غور کرو گے تو تم سب سے پہلی دلیل یہ پاؤ گے کہ کوئی بشر آپ کی مثل ایسا پیدا نہ ہوا جس نے نبوت و رسالت کا دعویٰ کیا ہو اور اسی طرح لوگوں کو مسخر کیا ہو تو اب کس چیز میں شک و شبہہ باقی رہتا ہے

اعظم معجزات قرآن کریم:۔ آپ کے معجزات میں سب سے قوی، روشن اور باقی و مشہور تر، قرآن مجید ہے جو قیامت

تک باقی و پائندہ رہے گا۔ قرآن کریم معجزات کثیرہ پر مشتمل ہے بایں حساب کہ "انا اعطینک الکوثر" سب سے چھوٹی سورۃ ہے اس میں جتنے معجزات ہیں ان کو کوئی شمار نہیں کر سکتا چنانچہ قرآن کریم کے معجزات کا اس سورۃ کی تعداد سے اندازہ لگاؤ کہ ہر ایک میں کتنے معجزات ہوں گے۔

وجوہ اعجاز قرآن: ۔ وصل:۔ قرآن کریم کے وجوہ اعجاز متعدد ہیں ان کے اعجاز کی تفصیلی معرفت، وجوہ اعجاز کی معرفت پر موقوف ہے۔ اور اجمالی طور پر معرفت اعجاز اس طرح ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے تحدی فرمائی اور انہیں اس کے ہم مثل مقابلہ میں ایک سورۃ ہی کے لانے کا چیلنج فرمایا ارشاد ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ۪ اگر تمہیں شک ہے اس میں جو ہم نے اپنے بندۂ خاص پر نازل فرمایا تو اس کی مثل ایک سورۃ ہی لے آؤ۔

چنانچہ لوگ اس کے معارضہ و مقابلہ میں کچھ پیش کرنے سے عاجز ہو گئے۔

پہلی بحث تو یہی تھی اگر وہ اس کی مثل لانے کی قدرت رکھتے تو وہ ہرگز ان ہلاکتوں میں نہ پڑتے بعض علماء فرماتے ہیں کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل عرب پر جو کلام پیش فرمایا وہ اس کی مثل لانے سے عاجز و مجبور رہے۔ کیونکہ وہ کلام دلالت میں مردوں کے زندہ ہونے اور اندھوں اور بہروں کے تندرست ہونے کے سلسلہ میں عجیب اور واضح تر ہے۔ اس لئے کہ اہل فصاحت، ارباب بلاغت اور تمام رؤسائے اہل زبان جو کلام لاتے ہیں وہ کلام، مطلب و مفہوم اور لفظ و معنی میں ان کی اپنی جنس سے تعلق رکھتا ہے اس کے باوجود وہ اس کی مثل لانے سے عاجز رہے اور ان کا یہ عجز اس سے کہیں زیادہ عجیب ہے جس نے حضرت مسیح علیہ السلام کو مردے زندہ کرتے اور اندھے اور کوڑھیوں کو تندرست کرتے دیکھا ہے اس لئے کہ دیکھنے والوں کے لئے اس میں کوئی چیلنج نہ تھا اور نہ اس تک پہنچنے کا انہیں کوئی علم ہی تھا۔ لیکن جہاں تک کلام فصیح، بلاغت اور خطابت کا تعلق ہے یہ تو ان کا ہنر اور پیشہ تھا۔ اور اس میں ان کا عاجز ہو جانا مفید صحت رسالت اور یہ حجت قاطع اور برہان واضح ہے اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔

ابو سلیمان خطابی جو کہ اعاظم علماء حدیث اور شراح حدیث میں سے ہیں فرماتے ہیں کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانے کے لوگوں میں سب سے زیادہ دانا اور عقل مند ہیں بلکہ علی الاطلاق قطعی اور حتمی طور پر اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق سے زیادہ عاقل تھے۔ وہ لوگ اس کی مثل لا ہی نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا اگر آپ کا علم ایسا نہ ہوتا بایں سبب کہ یہ خدا کی طرف سے ہے تب بھی آپ کی خبریں یہ خلاف واقع نہ ہوتا۔ اس وقت بھی یہ لوگ آپ کی عقل تک نہیں پہنچ سکتے تھے اور یہ تحدی حتمی و قطعی رہتی جیسا کہ فرمایا:۔ "ولن تفعلوا۔" (ہرگز ہرگز تم نہ لا سکو گے) غرضیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں چیلنج دیا اور لوگ معارضہ میں سامنے آنے سے عاجز رہے۔ اور بوقت مناقضہ بلاغت میں ان کے قاصر رہنے کا حکم فرمایا حتی کہ انہیں ان کے تمام حمایتیوں سمیت مجتمع ہونے کا موقع دیا۔ لیکن ان میں کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جو معارضہ کے میدان میں اترتا۔ اور اس مقام پر کھڑا ہوتا چنانچہ فرمایا۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا۝ اگر تمام انسان و جنات اس قرآن کی مثل لانے میں اکٹھے ہو جائیں تب بھی اس کا مثل نہیں لا سکتے۔ اگرچہ وہ ایک دوسرے کی مدد کریں۔

حدیث میں آیا ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام کے ایک گوشہ میں تنہا تشریف فرما تھے کہ عتبہ بن ربیعہ جو اشقیاء قریش میں سے تھا۔ قریش کی مجلس میں کہنے لگا۔ "اے گروہ قریش! میں اس شخص (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جاتا ہوں

اور چند چیزیں عرض کرتا ہوں۔ ممکن ہے ان میں سے کچھ کو قبول کرلیں اور اس کام سے باز آجائیں اور ہمارا پیچھا چھوڑ دیں۔ قریش نے کہا اے ابو الولید! ٹھیک ہے جاؤ۔ " عتبہ اٹھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ وہ آپ سے باتیں کرنے لگا۔ اور اس نے آپ کو مال و دولت کا لالچ دیا اس نے کہا آپ جو کچھ چاہیں گے حاضر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب کچھ سنتے رہے اس کے بعد فرمایا اے ابو الولید! کیا تو اپنی بات ختم کرچکا؟ اس نے کہا ہاں! فرمایا "اب مجھ سے بھی کچھ سن " اس نے کہا فرمایئے اور جو چاہئے کہئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا۔

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۲﴾ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳﴾ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۔ یہ اتارا ہوا ہے بڑے رحم والے مہربان کا۔ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں مفصل فرمائی گئیں عربی قرآن عقل والوں کے لئے خوشخبری دیتا اور ڈر سناتا۔ الخ۔

عتبہ اسے خاموشی سے کان دھرے سنتا رہا اور اپنے دونوں ہاتھ پس پشت لے جا کر اس پر ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تلاوت کرتے ہوئے اس سورۃ کی آیتِ سجدہ پر پہنچے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا اے ابو الولید! تونے سنا؟ اس نے کہا "میں نے اس کلام کو سنا آپ کو سنا آپ اس میں مشغول رہئے اور کسی سے خوف مت کریئے۔ " اس کے بعد عتبہ اپنی قوم کی طرف لوٹ گیا۔ جب اس کی قوم نے اسے دیکھا تو کہنے لگے خدا کی قسم! عتبہ اترا ہوا دامنہ لے کر آیا ہے۔ پھر جب عتبہ بیٹھ گیا تو کہنے لگا "خدا کی قسم! میں نے آج وہ کلام سنا ہے کہ اس جیسا کلام کبھی نہیں سنا۔ خدا کی قسم نہ وہ شعر ہے نہ جادو نہ کہانت۔ اے گروہِ قریش انہیں اپنے کام میں لگا رہنے دو۔ کیونکہ وہ راستی پر ہیں۔ میں اس کلام کے بارے میں قسم کھا کر کہوں گا کہ اس کی بہت بڑی شان ہے اور بخدا وہ بہت عجیب چیز ہے۔ تم جانتے ہو وہ جو کچھ کہتے ہیں جھوٹ نہیں ہوتا اور وہ جو دعا کرتے ہیں کبھی نامقبول نہیں ہوتی۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں عذاب نہ نازل ہو جائے۔ اسے بیہقی وغیرہ نے نقل کیا ہے۔

حدیث میں بسلسلہ اسلام ابو ذر رضی اللہ عنہ ہے کہ خود حاضر ہونے سے پہلے اپنے بھائی انیس نامی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات شریفہ کو معلوم کرنے اور جستجو کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ بخدا میں نے اپنے بھائی انیس رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کسی دوسرے شاعر کو نہ دیکھا اور نہ سنا اس نے بارہ شاعروں کو زمانہ جاہلیت میں شکست دی تھی اور ان میں سے ایک میں خود تھا۔ چنانچہ وہ مکہ مکرمہ گئے اور مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال آکر بتایا میں نے پوچھا لوگ ان کے بارے میں کیا کہتے ہیں اس نے کہا کہ لوگوں میں سے کوئی انہیں شاعر کہتا ہے کوئی کاہن۔ خدا کی قسم میں خود شاعر ہوں اور میں نے کاہنوں کی باتیں بھی سنی ہیں نہ تو وہ شاعر ہیں اور نہ ان میں کاہنوں جیسی باتیں ہیں وہ صادق ہیں اور لوگ کاذب۔

اور ولید بن مغیرہ، فصاحت و بلاغت میں قریش کا سب سے بڑا ہنر مند تھا اس نے بارہا قرآن کریم سن کر کہا۔ "وَاللّٰهِ اِنَّ لَهٗ لَحَلَاوَةً وَّاِنَّ عَلَيْهِ لَطَلَاوَةً۔ " خدا کی قسم اس میں بڑی ہی شیرینی ہے اور اس میں عجیب لذت ہے۔ اس میں ایسی رونق و تازگی ہے جو کسی دوسرے کلام میں نہیں ہے "وَاِنَّ اَعْلَاهُ لَمُثْمِرٌ وَّاِنَّ اَسْفَلَهٗ لَمُغْدِقٌ۔ " یقیناً اس کا بالائی حصہ پھل دار ہے اور اس کا نچلا حصہ سیراب ہے۔ "وَمَا هُوَ قَوْلُ الْبَشَرِ۔ " اور وہ انسان کا کلام نہیں ہے۔ "وَاِنَّهٗ لَيَعْلُوْا وَلَا يُعْلٰى ۔ " بلاشبہ وہ بلند ہو گا اور کوئی چیز اس پر غالب نہ ہو گی۔ اور ابن ولید اپنی قوم سے کہتا تھا کہ خدا کی قسم تم میں کوئی بھی مجھ سے زیادہ تمہارے شعروں کا جاننے والا نہیں۔ اور نہ جنات کے شعروں کا جاننے والا ہے۔ خدا کی قسم جو کچھ وہ فرماتے ہیں ان سے بہتر کسی کا کلام نہیں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حج کا ایک سال تھا اور قریش کے تمام قبیلے آئے ہوئے تھے۔ اس وقت ولید بن مغیرہ نے کہا کہ عرب کے

تمام وفود آئے ہوئے ہیں۔ توقع ہے کہ سب کے سب ایک رائے پر مجتمع اور متفق ہو جائیں اور ایک دوسرے کی تکذیب اور باہمی اختلاف رائے نہ کریں لوگوں نے کہا کہ "ہم سب متفقہ طور پر کہیں گے کہ وہ کاہن ہیں۔" ولید نے کہا کہ خدا کی قسم نہ تو وہ کاہن ہیں اور نہ ان میں کاہنوں کی مانند گنگناہٹ اور سجع ہے۔ پھر لوگوں نے کہا کہ "ہم انہیں دیوانہ کہیں گے۔" اس نے کہا "خدا کی قسم نہ وہ مجنون ہیں نہ دیوانے، وہ تو لوگوں میں سب سے زیادہ عقلمند ہیں۔ پھر وہ کہنے لگے کہ ہم انہیں شاعر کہیں گے۔ اس نے کہا وہ شاعر بھی نہیں۔ ہم شعر اور اس کے اقسام کو جانتے ہیں اور رجز، ہزج، قرض، مبسوط اور مقبوض کو خوب پہچانتے ہیں۔ پھر لوگوں نے کہا ہم کہیں گے کہ وہ ساحر یعنی جادوگر ہیں اس نے کہا خدا کی قسم وہ جادوگر بھی نہیں ہیں وہاں جھاڑ پھونک اور گنڈا تعویذ نہیں ہے۔ اور کہا تم انہیں جو کچھ بھی مذمت میں کہو گے ہم جانتے ہیں کہ وہ باطل ہے اسے ابن اسحاق اور بیہقی نے بیان کیا ہے۔

بعض اہل علم کہتے ہیں کہ یہ قرآن اگر کسی جنگل و بیابان میں کتابی شکل میں لکھا ہوا پایا جائے اور کوئی نہ جانے کہ کس نے رکھا ہے اور کون لایا ہے تو تمام عقل سلیم اور فہم مستقیم گواہی دیں گی یہ خدائے عزوجل کے حضور سے نازل کیا ہوا ہے اور کسی بشر کو اس کی تالیف پر قدرت نہیں ہے اور جب صادق العقول اور متقی لوگوں کے ہاتھوں میں آئے تو وہ کہیں گے کہ یہ خدا کا کلام ہے اور اس میں لوگوں کو تحدی اور چیلنج کیا گیا ہے کہ اس کی مانند ایک سورۃ ہی بنا کر لے آئیں اور سب عاجز رہیں گے۔ اب اور شک و شبہ کی کون سی گنجائش ہے۔ اعجاز قرآن کی معرفت میں یہ اجمالی وجوہ ہیں۔ اور اس پر آسان طریقہ ہے اور اس تحدی میں عالم و جاہل سب شریک ہیں اور اس روش سے مناسب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن کی قرآنیت کا ثبوت، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ہے اور نبی کریم کی نبوت کا ثبوت دوسرے معجزات سے ہے۔

اب رہے دوسرے تفصیلی طریقے، جس میں اعجاز قرآن کا اثبات ہے۔ مثلاً فصاحت، بلاغت، عجیب و غریب اسلوب بیان اور غیبی خبریں دینا وغیرہ۔ یہ دوسری روش کے ساتھ مناسب ہے جو کہتے ہیں کہ اعجاز قرآن کا ثبوت ان وجوہ سے ہے ایسا اثبات، ان علماء کے ساتھ مخصوص ہے۔ جو فصاحت و بلاغت کے معنی کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔ لیکن معرفت اعجاز کے اقسام، متعدد ہیں۔ اول ایجاز یعنی مختصر الفاظ اور معانی بیشمار، اور بلاغت ہے جیسا کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:۔ "وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ۔" اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے۔ ان دو کلموں میں جو گنتی کے صرف دس حرف ہیں معانی کثیرہ جمع کر دیئے ہیں۔

حضرت ابو عبیدہ سے مروی ہے کہ ایک بدوی نے کسی سے سنا کہ اس نے پڑھا "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ۔" تو وہ سجدہ میں گر گیا اور کہنے لگا کہ میں اس کلام کی فصاحت کو سجدہ کرتا ہوں۔ ایک اور بدوی نے کسی دوسرے شخص سے سنا کہ اس نے:۔ "فَلَمَّا اسْتَيْأَسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا" جب اس سے وہ سب مایوس ہو گئے تو انہوں نے اس سے کنارہ کیا۔ تو اس نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی مخلوق اس کی مثل لانے پر قادر نہیں ہے۔

بیان کرتے ہیں کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایک دن مسجد میں لیٹے ہوئے سو رہے تھے تو اچانک ایک ایلچی روم کے حاکموں کی طرف سے آکر آپ کے سرہانے کھڑا ہو گیا اور دیکھتے ہی حق کی گواہی دینے لگا۔ یہ ایلچی عربی زبان کو خوب جانتا تھا اس نے کہا کہ میں نے مسلمان قیدیوں میں سے ایک قیدی سے تمہارے قرآن کی ایک آیت پڑھتے سنی ہے پھر میں نے اس پر خوب غور کیا تو میں نے دیکھا اس میں تمام وہ جو حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام پر دنیا و آخرت کے سلسلے میں اتری ہیں ان سب کو باوجود اختصار کے ایک آیت میں جمع کر دیا گیا ہے وہ آیت یہ ہے:۔

وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ

اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اور اللہ سے ڈرے اور اس سے تقویٰ کرے تو یہی لوگ فائز المرام ہیں۔

اصمعی سے ایک حکایت منقول ہے کہ انہوں نے ایک لڑکی کو غایتِ فصیح کلام کرتے سنا تو انہوں نے اس کی فصاحت پر اظہارِ تعجب کیا۔ اس پر اس لڑکی نے کہا کیا تم مجھے اس کلام الٰہی کے بعد فصیح خیال کرتے ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو وحی کی کہ اسے دودھ پلا پھر جب تم خطرہ محسوس کرو تو (صندوق میں بند کر کے) دریائے نیل میں بہا دو، تم نہ تو خوف کرو اور نہ غم کرو۔ ہم اسے تمہاری طرف لوٹا دیں گے اور اسے بنائیں گے رسولوں میں سے۔

اس ایک آیت میں دو حکم، دو نہی، دو خبر اور دو بشارتیں فرمائی گئی ہیں۔ اسی طرح حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝ اسے خوب اچھی طرح سے دور کرو پھر جب وہ تمہارے اور اس کے درمیان عداوت ہو گویا کہ وہ ولی حمیم ہے۔

اسی طرح یہ ارشاد کہ۔ " يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ " اے زمین اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان تھم جا اس قسم کی بے شمار آیتیں ہیں جو اختصار و ایجازِ الفاظ رکھنے کے باوجود معانی کثیرہ، مفاہیم عظیمہ، حسن ترکیب الفاظ اور اتصال کلمات کے حامی ہیں۔ اسی طرح ان طویل قصوں اور قرآن میں سابقہ لوگوں کی خبروں کے بیان کا حال ہے۔ جن سے فصحائے کلام کی عادت میں سستی واقع ہو جاتی ہے۔ مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کا وہ طویل قصہ جسے قرآن پاک نے بیان فرمایا کہ کس حسن و خوبی کے ساتھ باہم کلمات کا ارتباط والتیام اور عبارت میں روانی اور دلائل کا وہ سیل رواں ہے جو غور و فکر کرنے والوں اور ارباب فہم و بصیرت کیلئے عبرت و ندرت کا مقام ہے۔ اس قسم کے اعجاز کا دریافت کرنا اہل عرب کے سلیقے اور ان کے ذوق پر موقوف ہے اور ان کے کلام کا ماہر اور زبان داں ہونا شرط ہے۔ اگرچہ زبان عربی کے ماہروں نے اس فن میں علوم منضبط کئے اور کتابیں مدون کی ہیں۔ ان سب کے باوجود عرب کے جاہلوں، ان کی عورتوں اور غلاموں میں جو ان کا اپنا خاص ذوق و وجدان اور سلیقہ پایا جاتا ہے وہ غیر عرب کے علماء فن، مردان روزگار اور بزرگان ملت میں پایا جانا ممکن ہی نہیں۔

اور وجوہ اعجاز کی دیگر قسمیں مثلاً نظم عجیب اور اسلوبِ غریب کی صورت جو کہ فواصل و قواطع مخالف اور تمام کلام عرب کے مبائن ہے اور ان کے نظم و نثر، خطبات و اشعار اور ارجاز و اسجاع کے طریقے جو ان کے روزمرہ کے معمولات ہیں۔ ان اعتبارات سے قرآن پاک کا ایک خاص زائد وصف ہے جو اہلِ عرب کے کلام سے ممتاز ہے اور یہ قرآن اہل عرب کے کلام میں نہ تو مختلط ہوتا ہے نہ مشتبہ۔ باوجودیکہ قرآن کے کلمات و حروف انہیں کے کلام کی جنس سے ہیں جو وہ اپنے نظم و نثر میں استعمال کرتے ہیں۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس سے ان کے عقلاء حیرت زدہ ہیں اور ان کے خطباء و بلغاء متحیر و سرگرداں ہیں۔ وہ اپنے کلام کی جنس میں اس جیسی خوبیاں پیدا کرنے کی راہ نہیں پاتے۔ اور حق تعالیٰ کے دلائل قاہرہ اور براہین ساطعہ و باہرہ کے ظہور کی بنا پر ان سے معارضہ اور مقابلہ کرنے کی طاقت پاتے ہی نہیں۔ لہٰذا جب ولید بن مغیرہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم سنا تو اس کا دل پگھل گیا اور اس کا اسے اعتراف کرنا پڑا۔ اس کے بعد اس کے پاس ابو جہل آیا اور اسے سخت و سست کہنے لگا اس پر بھی وہ انکار نہ کر سکا۔ یہی حال تمام اشقیاء قریش کا تھا۔ باوجودیکہ وہ بلاغت و فصاحت کی صنعتوں کے حاذق و ماہر اور عارف تھے۔ وہ سب اسلوب کلام اور طرز بیان سے متحیر ہو کر رہ گئے اور انہیں اعتراف کرنا پڑا۔ بعض مغرور و نادان لوگوں کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے اس کا مقابلہ کرنا

چاہا مگر وہ ذلیل ور سوا ہو کر رہ گئے۔ جیسے یحیٰی بن غزالی جو بلاشبہ اپنے زمانے میں بے نظیر فصیح و بلیغ تھا اس نے قرآن سے مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا اور سورۂ اخلاص پر نظر ڈالی۔ اور قصد کیا کہ اس کی مثل کوئی عبارت بنائے۔ چنانچہ اس کوشش میں اس نے بڑی سختی و مشقت اٹھائی۔ مگر قادر نہ ہو سکا پھر اس میں ہیبت و خشیت الٰہی طاری ہو گئی۔ اور اس ارادہ سے اس نے توبہ کر لی۔ حالانکہ اس نے اپنے زمانے میں مقفٰی و مسجع اور افصح کلام بنایا تھا اور اس نے اپنے اس کلام کا نام قرآن کی سورتوں کے طرز پر "مفصل" رکھا تھا۔ وہ ایک دن بچوں کے مکتب کی طرف گزرا اس وقت بچے یہ آیت پڑھ رہے تھے۔ "وَقِيْلَ يٰاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ" کہا گیا اے زمین اپنا پانی نگل لے۔ تو وہ لوٹ کر گھر آیا اور اس نے اپنے لکھے ہوئے کو تلف کر دیا۔ اور کہنے لگا خدا کی قسم میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کلام کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ انسان کا کلام نہیں ہے۔

وجوہ اعجاز قرآن کی تیسری صورت یہ ہے کہ قرآن غیبی خبروں پر متضمن و مشتمل ہے جو نہ واقع ہوئیں اور نہ رونما ہوئی تھیں۔ لیکن جب وہ واقع ہوئیں تو اس طرح وارد ہوئیں جس طرح ان کی خبریں دی گئی تھیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد:۔

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ — ضرور بالضرور انشاء اللہ مسجد حرام میں امن و امان کے ساتھ داخل ہو گے۔

اور حق تعالیٰ کا یہ ارشاد: "وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ۔" اور وہ اپنے غلبہ کے بعد بہت جلد مغلوب ہوں گے۔

اور اس کا یہ ارشاد کہ: "لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ" تاکہ وہ تمام دینوں پر اسے غالب فرمائیں۔

اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ:۔ "وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ۔" اور اللہ نے تم میں سے ایمانداروں اور عمل صالح کرنے والوں سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ زمین میں تمہیں خلیفہ بنائے گا۔" اور یہ فرمایا کہ

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ — جب اللہ کی مدد اور فتح آئے گی۔ الخ

اور اس کا یہ فرمان کہ:۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ — بلاشبہ قرآن کو ہم نے ہی اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت فرمانے والے ہیں۔

چنانچہ یہی ہوا کہ بے شمار اعداء و ملاحدہ اور معطلہ و قرامطہ نے مجتمع ہو کر مکر و حیلہ اور قوت و طاقت سے کوششیں کیں کہ قرآن کے نور کو بجھا دیں مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئے اور اس کے کلمات میں سے ایک کلمہ میں بھی تغیر پیدا نہ کر سکے اور مسلمانوں کو اس کے کسی حرف کے بارے میں شک میں مبتلا نہ کر سکے۔ اور فرمایا کہ:۔

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ۝ — بہت جلد یہ لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔

اور اس کا ارشاد:

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ — ان سے جنگ کرو اللہ تمہارے ہاتھوں سے ان پر عذاب فرماتا ہے۔

اور اس کا ارشاد کہ:۔

وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗ اَبَدًا — وہ اس کی کبھی بھی آرزو نہ کریں گے۔

اور فرمایا وَلَنْ تَفْعَلُوْا۔ تم ہرگز ہرگز ایسا نہ کر سکو گے۔ اس قسم کی بے شمار آیات و اخبار ہیں۔

وجوہ اعجاز قرآن میں چوتھی صورت میں گذشتہ لوگوں کے وہ واقعات و حوادث ہیں جنہیں کچھ لوگ جانتے تھے اور بہت سے نہ

جانتے تھے۔ جیسے اصحاب کہف کا قصہ اور حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام کی شان اور حضرت ذوالقرنین کے احوال اور حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کا قصہ اور حضرت لقمان اور ان کے بیٹے کا قصہ اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے ان کی امتوں کے ساتھ قصے اور اس قسم کی بے شمار وہ خبریں جو گذشتہ زمانوں اور پچھلی امتوں اور ان کی شریعتوں اور اگلے پچھلے علوم سے متعلق ہیں ان واقعات کو اہل کتاب میں سے وہی جانتے ہیں جن کی عمریں اس قسم کے علم کی تحصیل میں کٹی تھیں۔ ان واقعات کو قرآن میں ایسے طریقے پر لایا گیا اور انہیں اس انداز سے بیان کیا گیا کہ ان لوگوں کو اس کے صدق و صحت کا اعتراف کرنا پڑا۔ در آں حالیکہ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ حضور ﷺ امی ہیں جنہوں نے پڑھنا لکھنا نہ تو سیکھا اور نہ کسی مدرسے میں درس و تدریس کی اور نہ ان کی مجلسوں میں شمولیت فرمائی وہ ان کے سامنے سے کبھی باہر نہ گئے اور اس کے باوجود وہ خبریں بیان فرماتے ہیں جو توریت و انجیل اور صحف ابراہیم و موسیٰ اور دیگر انبیاء علیہم السلام میں ہیں۔ وجوہِ اعجازِ قرآن میں یہ چار صورتیں خوب ظاہر ہیں نہ اس میں کوئی خفا ہے نہ شک و شبہ اور نزاع و جدال کی گنجائش ہے ان کے سوا جو اور وجوہات اعجاز ہیں وہ از قبیل صفات قرآن ہیں جن کو علماء بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ قرآن ممتاز و منفرد ہے اس کے ساتھ کوئی مشارکت نہیں رکھتا۔ ان میں سے ایک صفت تو یہ ہے کہ بوقت سماعِ قرآن، سننے اور سنانے والوں کے خوف و ہیبت پیدا کرتا ہے اور تلاوت کے وقت قاریوں پر ایک رعب طاری ہوتا ہے اور یہ کیفیت کافروں اور جھٹلانے والوں پر بہت زیادہ ہوتی ہے اور اس کا قہر و جلال ان پر بہت زیادہ غالب آجاتا ہے۔ اس کیفیت میں فرق کی وجہ یہ ہے کہ جھٹلانے والوں اور منکروں پر اس کا سننا بھی بھاری ہوتا ہے اور اس سے ان میں اور نفرت بڑھتی ہے۔ اور ان کے سینے تنگ ہوجاتے ہیں۔ وہ اس سے دور رہنے کو پسند کرتے اور اس کے سننے کو ناپسند کرتے ہیں۔ مومن و مصدق کے دل میں بھی اس کی ہیبت اور دبدبہ جاگزین ہوجاتا ہے اور اس کا ذوق و شوق بڑھتا ہے اور اس کا باطن، انجذاب، خفت، راحت، اور انشراح کے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی یہ انجذاب و کشش کی کیفیت، اس کے میلان، محبت قلبی اور تصدیق کی بنا پر ہوتی ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا:

"تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ" (قرآن سے ان لوگوں کے جسموں کے بال کھڑے ہوجاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں) اور فرمایا:۔ "ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ" (پھر ان کے اجسام اور قلوب ذکر الٰہی کی طرف جھک جاتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔ "لَوْ أَنزَلْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ" (اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اتارتے تو تم اسے خشیت الٰہی سے جھکتا اور پاش پاش ہوتا دیکھتے) یہ آیت کریمہ دلالت کرتی ہے کہ قرآن کریم کی خاصیت و طبیعت عظیم ہے اگرچہ سننے والا اہل علم و فہم سے نہ ہو، اور وہ اس کے معنی و تفسیر کو نہ جانتا ہو اس حالت کا صحیح مشاہدہ، عورتوں سے اور جاہل عوام سے ہوتا رہتا ہے۔ وہ اس کے سنتے ہی سے کافی متاثر و متنبہ ہوتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ کلام، دوسرے کلاموں کی مانند نہیں ہے۔

ایک حکایت میں ہے کہ ایک نصرانی کا ایک قاری پر گذر ہوا۔ تو وہ کھڑا ہوگیا اور رونے لگا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا کس چیز نے تمہیں رلایا حالانکہ تم اس کا مفہوم تک نہیں جانتے۔ اس نے کہا میں اس اسلوب کلام کی لطافت سے رونے لگا۔ اس کے سننے سے عجیب لطف و سرور حاصل ہوتا ہے۔

سماعت قرآن کریم کا یہ رعب و ہیبت، اسلام و ایمان لانے سے پہلے ایک جماعت پر طاری ہوا تھا جس سے وہ بے توقف و مہلت اس وقت ایمان لے آئے تھے چنانچہ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز مغرب میں سورۂ طور کو تلاوت کرتے سنا۔ پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت پر پہنچے۔

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ ۝ کیا وہ کسی اصل سے نہ بنائے گئے یا وہی بنانے والے ہیں۔

أَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُونَ ۝

اسے سن کر قریب تھا کہ میرا دل نکل پڑے اور میری جان باہر آجائے۔ میرا یہ حال اس وقت ہوا تھا جس لمحے سب سے پہلے ایمان نے میرے دل میں اثر کیا تھا۔ اور عتبہ بن ربیعہ نے سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سورہ "حٰم السجدہ" کو سنا تو وہ مدہوش اور متاثر ہو گیا۔ پھر جب وہ اپنی قوم میں گیا تو کہنے لگا خدا کی قسم میں نے (حضور سید عالم) محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ کلام سنا ہے جس کی مانند آج تک میں نے کوئی کلام نہ سنا۔ مجھ میں طاقت گویائی نہیں کہ کس طرح اس کی توصیف کروں۔ لیکن وہ کفر پر ثابت قدم رہا۔ ایمان نہ لایا بلکہ اس کا انکار و عناد اور زیادہ بڑھ گیا اس سے یہ معلوم ہوا کہ ایمان عطائے باری تعالیٰ ہے۔ علم و دانش اس میں کفایت نہیں کرتا اور: "يَعْرِفُوْنَه كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَ هُمْ- وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ" (وہ آپ کو اپنے بیٹوں سے زیادہ جانتے ہیں اور اس کے باوجود وہ اس کا انکار کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں ان کا یقین تھا) اس کی دلیل ہے۔

وجوہاتِ اعجاز قرآن میں سے ایک وجہ اعجاز یہ بھی ہے کہ قاریٔ قرآن اکتاتا نہیں اور سننے والا اسے ناپسند نہیں کرتا۔ بلکہ یہ حلاوت، چاشنی، سرور، محبت، تروتازگی اور لذت کو بڑھاتا ہے اور تنہائی میں اس سے لذت اور اس کی تلاوت سے انس محسوس کرتا ہے۔ یہ کیفیت ہر حال میں ہے۔ بخلاف دوسرے کلاموں کے، اگرچہ وہ حسن و بلاغت میں کتنے ہی بلند پایہ ہوں مگر ان کی بار بار تکرار ناپسند معلوم ہوتی ہے۔ جیسا کہ تجربہ شاہد ہے یہ سب ایمان و محبت کی شرط کے ساتھ ہے لیکن کفار، منافقین اور اعداء: "فَلَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا خَسَارًا (تو ان کو سوائے خسارہ کے کچھ نہیں بڑھتا) کے مصداق ہوتے ہیں۔

وجوہاتِ اعجاز قرآن میں سے ایک وجہ اعجاز یہ بھی ہے کہ قرآن میں ان علوم و معارف کو جمع کیا گیا ہے جو عرب میں معمول نہ تھے۔ اور قبل از نبوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان کی معرفت نہ تھی اور پچھلی امتوں کے علماء میں سے کسی ایک نے بھی نہ انہیں قائم کیا اور نہ ان کا احاطہ کیا اور ان کی ایک کتاب بھی ان علوم و معارف پر مشتمل نہ تھی چنانچہ علم شرائع، محاسن آداب و شیم، مواعظ و حکم، سیر انبیاء و امم اور آخرت کے اخبار و آثار کو بروجہ اکمل و اتم جمع فرما کر حق تعالیٰ جل جلالہ و عز اسمہ کی توحید اور صانعِ عالم کے صفاتِ کمال پر حجج عقلیہ، براہینِ یقینیہ اور ادلۂ مبینہ کے طریقہ پر تنبیہ فرمائی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ — ہم نے کسی چیز کو قرآن میں بیان سے نہیں چھوڑا)

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ — (اور ہم نے آپ پر ہر چیز کا خوب واضح بیان کرنے والا قرآن اتارا)

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ — اور بیشک ہم نے لوگوں کیلئے اس قرآن میں ہر ایک مثل بیان فرمائی)

اور فرمایا:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ — (بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل کے وہ واقعات بیان فرماتا ہے جن سے ان کے اکثر لوگ اختلاف کرتے ہیں)

اور فرمایا:

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى — (یہ لوگوں کے لئے بیان و ہدایت ہے)

سب سے عجیب و غریب بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں دلیل و مدلول دونوں جمع کئے گئے ہیں۔ اس لئے نظم قرآن اور اس کے حسنِ وصف و بلاغت کے ساتھ احتجاج و استدلال کیا جاتا ہے اور اسی کے درمیان اس کا حکم، اس کی ممانعت اور وعدہ وعید کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ ایک جملہ کا غور و فکر کرنے والا جب اس بارے میں سوچتا ہے اور اس سے حجت حاصل کرتا ہے تو ساتھ ہی ایک ہی کلام

میں حکم بھی معلوم کر لیتا ہے۔

انہیں وجوہاتِ اعجاز میں سے ایک یہ ہے کہ قرآن کریم کو حق تعالیٰ نے نظم کے پیرایہ میں رکھا ہے نہ کہ نثر کے اس لئے کہ منظوم نفوس پر زیادہ آسان، دلوں کو کھینچنے والا، کانوں کو سبک تر، اور فہموں پر زیادہ مرصع ہے اس کی جانب طبیعتیں مائل ہوتیں ہیں اور خواہشیں دوڑتی ہیں۔

انہیں وجوہاتِ اعجاز میں سے ایک یہ ہے کہ قرآن کریم کو حق تعالیٰ نے متعلموں اور حافظوں پر اس کا حفظ کرنا آسان و سہل فرد یا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ اور ہم نے یاد کرنے کیلئے قرآن کو آسان بنایا۔

پچھلی امتیں اپنی کتابوں کو یاد نہیں کرتی تھیں۔ بجز ایک دو شخص کے چہ جائیکہ جماعت کثیرہ یاد کرے باوجود درازی عمر اور مرور سنین کے اور بچوں اور علماء کے لئے مختصر مدت میں اس کا حفظ کر لینا سہل و آسان ہے۔

انہیں وجوہات اعجاز میں سے یہ ہے کہ قرآن کریم کے اجزاء ایک دوسرے سے مشاکلت رکھتے ہیں اور انواع و اقسام کے مضامین باہم پیوست ہیں اور نہایت حسن و خوبی کے ساتھ ایک قصہ سے دوسرے قصہ کی طرف اور ایک جملہ سے دوسرے جملہ کی طرف باوجود اختلاف معانی کے بدلتے چلے جاتے ہیں۔ اور ایک ہی سورۃ میں امر، نہی، خبر، استخبار، وعد، وعید، اثبات نبوت و توحید اور ترغیب و ترہیب وغیرہ مضامین بغیر اس کے کہ ان کو فصلوں میں تقسیم کیا جائے موجود ہے۔ اور اگر کسی اور کلام فصیح میں اس قسم کے اختلاف مضامین لاحق ہوں تو یہ اسے فصاحت کے ضعف کی طرف لے جاتا ہے اور اس کی روانی کو کمزور اور سست کر دیتا ہے۔ اور الفاظ کا تسلسل ختم ہو جاتا ہے۔ اور عبارتیں متزلزل ہو جاتی ہیں (مگر قرآن پاک میں یہ اندازِ بیان نرالا ہی حسن و خوبی بڑھاتا اور اس کی شان کو دوبالا کرتا ہے۔)

اور انہیں وجوہ اعجاز میں سے یہ ہے کہ اس کی آیتیں باقی رہنے والی ہیں۔ اور حق تعالیٰ نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:۔ " نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ " ہم ہی نے قرآن اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت فرمانے والے ہیں۔ حالانکہ دوسری کتابوں کی حفاظت رہبان واحبار کے سپرد کی گئی یقیناً انہوں نے اس میں تغیر و تبدل اور تحریف و تصرف کیا۔ حق تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: " لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ " کوئی باطل اس میں نہ سامنے سے نہ پیچھے سے آسکے گا۔ انبیاء علیہم السلام کے تمام معجزات اپنے اوقات و زمانہ گزارنے کے بعد منقضی اور ختم ہو گئے اور ان میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ لیکن قرآن کریم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ معجزہ ہے جس کی آیتیں روشن ہیں۔ جس کے معجزات ظاہر اور آج تک کہ ایک ہزار پینتیس سال گزر چکے ہیں (یہ مدارج النبوۃ کی تالیف کا سن ہے) باقی ہیں۔ ہر زمانہ میں اہل بیان، ماہرین زبان، ائمہ بلاغت، شہسوارِ خطابت اور ملاحدو اعدائے دین دنیا میں موجود رہے۔ لیکن قرآن کے معارضہ و مقابلہ میں کوئی چیز نہ لا سکے۔ البتہ اس کے مناقضہ میں کوئی تالیف پیش نہ کر سکے۔ اور نہ ہی طعنِ صحیح و قدح صریح پر قادر ہو سکے بلکہ جس نے بھی ایسا ارادہ کیا وہ عاجز ہو کر رہ گیا۔ اور میدان چھوڑ بھاگا۔ قاضی عیاض رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اعجازِ قرآن میں آئمہ کرام نے وجوہ کثیرہ بیان کئے ہیں لیکن ان میں سے اکثر اس کی بلاغت و فصاحت ہی کی طرف راجع ہیں لیکن ہر شخص کا فصاحت و بلاغت میں ماہر ہونا واجب نہیں ہے۔ ہر ایک نے وجہ منفرد اور علیحدہ باب اختیار فرمایا ہے مگر بقصد فنونِ بلاغت در حقیقت اعجاز کے ذکر کا مقصد وہی چار وجوہ ہیں جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ ان کے ماسوا قرآن کے خواص اور اس کی صفات کے عجائب ہیں۔ (وباللہ التوفیق)

معجزۂ شقِ قمر۔ وصل: تمہیں معلوم ہو چکا کہ حضور سید المرسلین، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سب سے

عظیم و اعلیٰ معجزہ قرآن مجید ہے لیکن چاند کا ٹکڑے کرنا، پانی کا چشمہ بہانا، کھانے کو زیادہ کرنا اور جمادات کا بولنا وغیرہ بھی عظیم معجزے ہیں۔ ان میں سے بعض معجزے تو حد تواتر و شہرت تک پہنچ گئے ہیں اور بعض معجزے اگرچہ خبر واحد سے ہیں۔ لیکن تعدد طرق و اسناد سے منجر بحد تواتر ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ معجزے تو قبل از زمان بعثت ظاہر ہوئے جنہیں "ارہاصات" کہا جاتا ہے۔ ارہاص کے معنی بنیاد رکھنے کے ہیں۔ گویا وہ نبوت و رسالت کی تاسیس کے حکم میں ہیں۔ اور کچھ معجزے زمانہ اظہار نبوت میں ظاہر ہوئے۔ معجزے کی ایک اور قسم بھی ہے۔ یہ بعد از رحلت ظاہر ہوتے رہتے ہیں جیسے اولیائے کرام کی کرامات وغیرہ۔ کیونکہ یہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے معجزے ہیں اور وہ آپ کی نبوت کی صحت اور آپ کی رسالت کی صداقت پر دلالت کرتے ہیں۔

لیکن شق قمر یعنی چاند کا ٹکڑے کرنا معجزات میں روشن و تابندہ تر ہے کیونکہ اس سے عالم علوی میں تصرف فرمایا گیا ہے۔ جو کسی نبی سے واقع نہیں ہوا۔ یہ معجزہ قرآن کریم میں بھی بیان کیا گیا ہے چنانچہ فرمایا "اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ" (قیامت قریب آگئی اور چاند ٹکڑے ہو گیا) اس آیہ کریمہ کا اشارہ دنیا میں اسی واقعہ کی طرف ہے۔ اور مفسرین اس کی یہی تفسیر کرتے ہیں۔ رہا اس کا روز قیامت انشقاق پر محمول کرنا تو اس کا رد اللہ تعالیٰ کے اس قول سے کر دیتے ہیں کہ: "وَاِنْ یَّرَوْا اٰیَةً یُّعْرِضُوْا وَیَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ" (اگر وہ کسی نشانی کو دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو پرانا جادو ہے) اس لئے کہ کفار "سحر مستمر" روز قیامت کے لئے نہیں کہتے۔

یقیناً حدیث شریف میں آیا ہے کہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ اقدس میں چاند کے دو ٹکڑے ہوئے ایک ٹکڑا پہاڑ کے ادھر اور دوسرا ٹکڑا پہاڑ کے نیچے تھا۔ اس روایت کو صحابہ کرام کی جماعتِ کثیرہ نے نقل فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ کفار قریش نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزہ طلب کیا اور کہنے لگے اگر صادق ہو تو چاند کے دو ٹکڑے کر دو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چاند کی جانب اشارہ فرمایا وہ دو ٹکڑے ہو گیا اور لوگوں نے کوہ حرا کو دونوں ٹکڑوں کے درمیان دیکھا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اشهدوا" گواہ رہو۔ اس پر کفار کہنے لگے۔ بلاشبہ ابن ابی کبشہ نے تم پر جادو کیا ہے۔ ان میں سے ایک نے کہا اگر وہ جادو کر سکتے ہیں تو تم پر کر سکتے ہیں۔ تمام روئے زمین والوں پر تو جادو نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جب آفاق سے مسافر وہاں آئے اور انہوں نے چاند کے ٹکڑے ہونے کی خبر دی تو ابو جہل علیہ اللعنۃ نے کہا "ہٰذا سحر مستمر" یہ پرانا جادو ہے۔

ابن عبدالبر جو اکابر علماء حدیث سے ہیں فرماتے ہیں کہ چاند کے ٹکڑے ہونے والی حدیث کو صحابہ کرام کی جماعت کثیرہ نے اور اسی طرح تابعین کی جماعت کثیرہ روایت کرتی ہے اور ان سے ایک جم غفیر نے اسی طرح ہم تک یہ روایت پہنچی اور آیہ کریمہ نے اس کی تائید فرمائی۔ (انتہیٰ)

اسی طرح متقدمین و متاخرین کی حدیث کی کتابیں بکثرت طرق اور متعدد اسانید سے مملو اور بھری ہوئی ہیں۔

مواہب لدنیہ میں منقول ہے کہ علامہ ابن سبکی رحمہ اللہ مختصر ابن حاجب کی شرح میں فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ انشقاق قمر یعنی چاند کے ٹکڑے ہونا متواتر ہے اور قرآن میں منصوص علیہ ہے اور صحیحین وغیرہما میں بطرق کثیرہ صحیحہ مروی ہے جس کے تواتر اور اس کی صحت میں شک نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس معجزہ کا بعض مبتدعہ نے انکار کیا ہے۔ یہ ملت کے ان مخالفوں کی راہ کی موافقت میں ہے جو کہتے ہیں کہ اجرام علویہ خرق والتیام کو قبول نہیں کرتے۔ اور ملت کے متبعین کے علماء اس بارے میں فرماتے ہیں کہ اس میں عقلاً کوئی استحالہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ چاند سورج خدا کی مخلوق ہیں وہ جو چاہے اس میں کرتا ہے جیسا کہ نصوص میں احوال قیامت کے ضمن میں مذکور ہے۔

اب رہا ملحدوں کا یہ کہنا کہ اگر اس معجزہ کی حدیث بطریق تواتر واقع ہوتی تو اس کی معرفت میں روئے زمین کے تمام لوگ شریک ہوتے

اور یہ اہل مکہ کے ساتھ مخصوص نہ ہوتے۔ اس لئے کہ یہ ایسا معاملہ ہے جو حس و مشاہدہ میں آتا ہے۔ اور اس قسم کے عجیب و غریب و نرالی باتوں کے دیکھنے کی طرف لوگوں کو شوق ہوتا ہے اور غیر عادی چیز کی نقل میں خاص جذبہ کام کرتا ہے۔ اگر اس کی کوئی صحت و اصلیت ہوتی تو ہمیشہ تاریخوں میں لکھی جاتی۔ نہ اس کا تذکرہ تاریخوں میں ہے نہ علم نجوم کی کتابوں میں۔ اس کا ذکر و بیان نہ کرنا اور ان کا اتفاقیہ طور پر چھوٹ جانا یا غفلت برتنا جائز نہیں ہوتا کیونکہ یہ معاملہ بہت عظیم اور واضح تھا

علمائے کرام اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ واقعہ ان باتوں سے خارج ہے جن کا وہ تذکرہ کرتے ہیں، یہ وہ چیز ہے جس کا ایک قوم نے اور خاص لوگوں نے مطالبہ کیا تھا۔ اور یہ کہ یہ واقعہ رات میں ہوا تھا۔ رات میں اکثر لوگ سوتے ہوتے ہیں اگر کچھ لوگ جاگتے بھی ہوں تو وہ گھروں میں اور کونوں میں آرام کرتے ہوتے ہیں۔ ان کی صحرا میں موجودگی اور بیداری اتفاقیہ اور شاذ شاذ ہے۔ اور یہ کہ یہ واقعہ ایک لحظہ کے لئے واقع ہوا تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس وقت تمام لوگوں کیلئے اسکے مشاہدہ کی راہ میں رکاوٹیں ہوں۔ مثلاً بادل یا پہاڑ حائل ہوں یا لوگ کسی تفریحی مشغلہ میں ہوں۔ مثلاً قصے کہانیاں وغیرہ سنتے سناتے ہوں۔ اور وہ اس کے دیکھنے سے رہ گئے ہوں۔ اور یہ بات بھی عادتاً بعید ہے کہ لوگ چاند پر ٹکٹکی لگائے بیٹھے ہوں اور ایک لحظہ کے لئے صرف نظر نہ کرتے ہوں۔ ایسی صورت میں اسی وقت متصور ہو سکتی ہے جب کہ انہیں پہلے سے اسے دیکھنے اور مشاہدہ کرنے کے لئے تیار و آمادہ کیا گیا ہو۔ اور ایک تاریخ و وقت مقرر کر کے سارے جہان میں اس کا اعلان و اشتہار دے دیا گیا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ چاند اپنی اس منزل میں ہو۔ جس سے افق پر کہیں تو ظاہر ہوتا ہے اور کہیں نہیں ہوتا گویا کہ ایک قوم کے تو نظروں کے سامنے ہے اور دوسری قوم سے مستتر و پوشیدہ ہے۔ جیسا کہ چاند گرہن اور سورج گرہن میں ہوتا رہتا ہے کہ کسی شہر میں تو یہ دیکھا جاتا ہے اور کسی میں نہیں۔ کہیں کچھ حصہ گرہن کا نظر آتا ہے اور کہیں کچھ حصہ۔ بعض شہر تو ایسے ہوتے ہیں جو گرہن کو جانتے ہی نہیں۔ بجز ان لوگوں کے جو حساب سے اس کے علم کے دعویدار ہیں۔ اور یہ کہ اہل حق کے نزدیک دیکھنا یا نہ دیکھنا قدرت الٰہی میں ہے وہ جسے چاہتا ہے دکھاتا ہے اور جسے چاہتا ہے نہیں دکھاتا۔ مقصود تو محض ان لوگوں کو دکھانا تھا جن سے تحدی کی گئی تھی اور جنہوں نے اس معجزہ و نشانی کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے دیکھ لیا تھا ممکن ہے کہ دوسروں نے دیکھا ہو۔ پھر یہ کہ جب گرد و پیش کے مسافر آئے تو انہوں نے اس کی خبر دی تو اب تمام عالم کے دیکھنے کی کیا حاجت ہے۔

تنبیہہ ۔ مواہب لدنیہ میں فرماتے ہیں کہ بعض قصہ گو جو یہ بیان کرتے ہیں کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن مبارک میں چاند داخل ہو کر آپ کی آستین شریف سے باہر آیا۔ یہ بے اصل ہے۔ جیسا کہ شیخ بدر الدین زرکشی نے اپنے شیخ عماد الدین بن کثیر سے نقل کیا ہے۔ (واللہ اعلم)

سورج کا لوٹانا۔ اب ردِ شمس یعنی غروب ہونے کے بعد سورج کا لوٹانا تو یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بنت عمیس سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس حالت میں وحی نازل ہوئی جب کہ آپ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ران پر سر مبارک رکھے ہوئے تھے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس وقت تک نماز عصر ادا نہیں کی تھی۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے علی کیا تم نے نماز عصر ادا کر لی تھی۔ عرض کیا نہیں۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مناجات کی اور کہا اے خدا یہ تیرا بندہ (علی) تیری اور تیرے رسول کی اطاعت میں تھا تو تو اس کے لئے سورج کو لوٹا دے۔ اسی وقت سورج لوٹ آیا۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے سورج کو غروب ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد میں نے بعد از غروب طلوع ہوتے بھی دیکھا اور اس کی شعاعیں پہاڑوں اور زمینوں پر پھیل گئیں۔ یہ واقعہ مقام "صہبا" کا ہے۔ اس

حدیث کی مکمل بحث، غزوۂ خیبر میں انشاء اللہ آئے گی۔

انگشتہائے مبارک سے پانی کا چشمہ جاری کرنا۔ وصل:۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور معجزوں میں سے ایک یہ پانی کا معجزہ بھی ہے۔ جو بار بار متعدد مقامات پر اجتماع عظیم کے سامنے رونما ہوا ہے۔ اور یہ اس قدر کثیر سندوں سے مروی ہے، جو علم قطعی بتواتر معنوی کا افادہ کرتا ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتہائے مبارک کے درمیان سے پانی کا چشمہ جاری ہوا ہے۔ ایسا معجزہ کسی نبی کے بارے میں نہیں سنا گیا۔ اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دست مبارک کے ذریعہ پتھر پر عصا مارنے سے پانی کے چشمے جاری ہوئے تھے مگر اس میں شک نہیں کہ انگلیوں سے پانی نکالنا پتھر سے پانی نکالنے کے اعجاز کے مقابلہ میں زیادہ بلیغ ہے۔ کیونکہ پتھر سے پانی عادۃً نکلا ہی کرتا ہے بخلاف گوشت و پوست اور ہڈیوں سے پانی نکالنا۔ بلاشبہ اس حدیث کو صحابہ کرام کی جماعت کثیرہ نے روایت کیا ہے۔ ان میں سے حضرت انس، جابر، اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم کی حدیث ہے۔ لیکن حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث بخاری و مسلم میں واقع ہوئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ نماز عصر کا وقت آگیا اور لوگ چاروں طرف پانی کو تلاش کر رہے تھے لیکن پانی نہ پاتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پانی لایا گیا آپ نے اپنا دستِ مبارک پانی کے برتن میں رکھ دیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ اس سے وضو کریں۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتہائے مبارک کے درمیان سے چشمہ کی مانند پانی ابل رہا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ انگلیوں اور اس کے پوروں سے پانی نکل رہا تھا۔ چنانچہ ساری جماعت نے وضو کر لیا لوگوں نے حضرت انس سے پوچھا تم کتنے آدمی تھے۔ فرمایا ہم تین سو اشخاص تھے۔

ابن شاہین کی حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں غزوہ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا مسلمانوں نے عرض کیا "یارسول اللہ! ہم اور ہمارے اونٹ اور جانور پیاسے ہیں"۔ فرمایا تھوڑا بہت جتنا بھی پانی ہو لاؤ۔ وہ لوگ مشکیزوں میں سے جمع کر کے چند گھونٹ لائے آپ نے فرمایا برتن میں لوٹ دو اس کے بعد آپ نے اپنا دست مبارک اس پانی میں رکھ دیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتہائے مبارک سے چشمے ابل رہے ہیں۔ پھر ہم نے اپنے اونٹوں اور جانوروں کو پانی پلایا۔ اور باقی پانی ہم نے مشکیزوں میں بھر لیا۔

بیہقی سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبا کی جانب تشریف لے گئے وہاں ایک شخص اپنے گھر سے چھوٹا سا پیالہ لے کر آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست اقدس پیالہ میں رکھا مگر پورا دست مبارک پیالہ میں نہ آسکا تو آپ نے اپنی چار انگلیوں کو رکھا۔ انگوٹھا باہر رہا۔ پھر انگشتہائے مبارک سے پانی بہنے لگا۔ (آخر حدیث تک)

بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حدیبیہ کے دن ہم سب پیاسے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک چھاگل تھی جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم وضو فرما رہے تھے۔ صحابہ کرام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد حلقہ ڈال دیا حضور نے فرمایا کیا بات ہے۔ کیوں حلقہ بنائے کھڑے ہو؟ عرض کرنے لگے یارسول اللہ ہمارے پاس پانی نہیں ہے جو وضو کریں اور پئیں بجز اس پانی کے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک چھاگل میں رکھ دیا جس سے پانی چشموں کی مانند جوش مارنے لگا۔ پھر ہم نے پانی پیا۔ اور وضو بھی کیا۔ لوگوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے پوچھا تم کل کتنے آدمی تھے۔ انہوں نے فرمایا اگر ہم ایک لاکھ بھی ہوتے تو وہ پانی ہمیں کفایت کر جاتا لیکن ہم صرف پندرہ سو تھے۔ صحیح مسلم میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے بیان کیا کہ ہم غزوۂ بواط میں تھے ہمارے پاس مشکیزہ میں چند قطروں

کے سوا پانی نہ تھا اسے پیالہ میں نچوڑا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انگشتہائے مبارک کو اس پیالے میں پھیلا دیا۔ تو انگلیوں کے درمیان سے پانی جوش مارنے لگا۔ پھر لوگوں کو پانی پینے کا حکم دیا تو سب نے خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک نکالا۔ تو پیالہ ویسا ہی بھرا ہوا تھا۔ حضرت جابر سے امام احمد بیہقی اور ابن شاہین نے بھی یہ روایت نقل کی ہے۔

اب رہی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث! تو صحیح بخاری میں بروایت علقمہ مروی ہے کہ حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے ہمارے پاس پانی نہ تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا کہ تلاش کر کے کسی کے پاس سے تھوڑا سا پانی لے آؤ۔ ہم پانی لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اسے ایک برتن میں ڈالا۔ آپ نے دستِ مبارک پانی میں رکھ دیا (آخر حدیث تک) یہ حدیثیں اگرچہ ایک ایک صحابی مثلاً حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یا حضرت جابر رضی اللہ عنہ وغیرہ سے منقول ہیں لیکن وہ تمام حضرات جو اس وقت موجود تھے۔ گویا وہ سب راوی اور حکایت کرنے والے ہیں۔ اگر وہ اس کا انکار کرتے تو یقیناً ان سے خاموشی ناممکن ہے۔ جیسا کہ انسانی خصلت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عادتِ شریفہ ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ خبرِ واحد اگر صحابۂ کرام کی جماعت کے سامنے بیان کی جائے اور وہ سب خاموش رہیں تو اس کا حکم یہ ہے کہ گویا وہ سب روایت کرنے والے ہیں۔ (فتدبر)

سوال: اس طرح انگشتہائے مبارک سے چشمے کے جاری ہونے کے سلسلے میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی بطرقِ متعدد حدیثیں مروی ہیں۔ اب اس حدیث میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میں کیا حکمت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے تو پیالہ میں پانی ڈلواتے اس کے بعد اس میں دستِ اقدس رکھتے جس سے چشمے ظاہر ہوتے کیوں نہ پہلے ہی چشمے جاری ہو گئے۔

جواب: جواب میں علماء فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ بارگاہِ الٰہی کا ادب ملحوظ تھا۔ کیونکہ ذاتِ باری تعالیٰ ہی بے اصل و مادہ معدومات کے ایجاد و ابداع (یعنی از سرِ نو کسی چیز کو وجود میں لانے) میں منفرد و یکتا ہے۔ بلکہ پانی اصل تھا۔ معجزہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے اس میں برکت حاصل ہوئی۔ (کذا قالوا واللہ اعلم)

کم پانی کو زیادہ کرنا۔ اسی کے مشابہ اور اسی زمرہ میں کم پانی کو زیادہ کرنے اور اس کے جاری کرنے کا معجزہ ہے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا و برکت سے ہوتا تھا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے غزوۂ تبوک کے سلسلے میں مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا تم انشاء اللہ طلوع آفتاب کے وقت چشمۂ تبوک پر پہنچ جاؤ گے۔ تم میں سے جو بھی وہاں پہنچے پانی کو ہاتھ نہ لگائے جب تک کہ میں وہاں نہ پہنچ جاؤں۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ہم چشمہ پر پہنچے تو دو آدمی وہاں ہم سے پہلے پہنچے ہوئے تھے۔ اس چشمہ سے قطرہ قطرہ پانی ٹپک رہا تھا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں سے دریافت فرمایا کیا تم نے پانی کو ہاتھ لگایا ہے؟ انہوں نے کہا "ہاں"! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ملامت فرمائی۔ اور فرمایا خدا جو چاہتا ہے ہوتا ہے۔ صحابہ نے اپنے ہاتھوں سے چشمہ کو کھودا تاکہ کچھ پانی اکٹھا ہو جائے۔ پھر اس پانی سے ایسی چیز نکلی جیسے تیز آندھی ہوتی ہے۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا چہرۂ انور اور دونوں دستہائے مبارک دھوئے اور غسالہ شریف کا پانی اس چشمہ میں ڈال دیا جس سے چشمہ میں پانی بہت ہو گیا۔ اور لوگوں نے پانی پیا۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے معاذ! اگر تمہاری زندگی دراز ہوئی تو تم اس جگہ میں عمارتوں اور باغوں کو دیکھو گے چنانچہ ایسا ہی واقع ہوا۔ یہ خبر دینا بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور غیبی خبریں دینے میں ہے۔ اس قسم کے معجزات تو ان گنت اور بے حد و شمار ہیں۔

قضیہ حدیبیہ میں آیا ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم چار سو صحابہ کے ساتھ حدیبیہ کے کنویں پر تشریف لائے۔ اس کنویں

سے پچاس بکریوں کو بھی پانی نہیں پلایا جا سکتا تھا۔ صحابہ نے اس کنویں کا تمام پانی کھینچ لیا اس میں ایک قطرہ بھی باقی نہ رہا۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کنوئیں کی ایک جانب تشریف فرما ہوئے۔ ڈول سے پانی نکالا گیا۔ اس سے وضو فرمایا اور اپنے دہن مبارک کا پانی اس میں ڈالا اور دعا فرمائی تو اسی وقت اس میں پانی جوش مارنے لگا۔ اور سطح آب بلند ہو گئی۔ پھر تمام صحابہ سیراب ہوئے اور اپنے اونٹوں کو بھی پلایا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے اپنے ترکش سے تیر نکالا۔ اور کنویں میں تیر مارا تو پانی جوش مارنے لگا۔ یہاں تک کہ سب سیراب ہوئے۔

حدیث جابر میں بھی ایسا ہی گزرا ہے اور مقام حدیبیہ میں حضور کی انگشت ہائے مبارک کے درمیان چشمۂ آب کے جاری ہونے کی روایت بھی آئی ہے۔ اور ان دونوں قصوں کے درمیان مغائرت ہے۔ علماء دونوں قصوں کو ایک وقت کے ساتھ جمع کرتے ہیں۔ چنانچہ حدیث جابر رضی اللہ عنہ کا وقت وہ ہے جب کہ نماز کا وقت آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا اور سب سیراب ہوئے اور ڈول کا بقیہ پانی کنوئیں میں ڈال دیا گیا جس سے اس کا پانی زیادہ ہو گیا اس طرح دونوں روایتوں کی تطبیق کرتے ہیں۔

حضرت ابو قتادہ سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک سفر میں اطلاع بخشی اور فرمایا کہ تم رات بھر چلوگے اور کل صبح انشاء اللہ تعالیٰ تم پانی پر پہنچ جاؤ گے تو لوگ ادھر ادھر پانی کی جستجو و تلاش میں بھٹکتے رہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت کا بھی خیال نہ رکھا۔ اور پانی کی تلاش میں آگے نکل گئے۔ جب رات کا پچھلا پہر آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنا سر مبارک رکھ کر محو خواب ہو گئے۔ اور صحابہ سے فرمایا نماز فجر کا خیال رکھنا یعنی بیدار رہنا اور نماز فجر کے وقت کا انتظار کرنا۔ تاکہ نماز فجر کا وقت فوت نہ ہو جائے مگر وہ سب کے سب سو گئے۔ سب سے پہلے بیدار ہونے والے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے اس وقت جب کہ آفتاب آپ کی پشت مبارک پر دھوپ ڈال رہا تھا۔ آپ نے فرمایا سوار ہو جاؤ۔ یہ شیطان کی جگہ ہے تو سب سوار ہوئے یہاں تک کہ سورج خوب اونچا ہو گیا۔ اس کے بعد پڑاؤ کیا اور پانی کا چھاگل طلب فرمایا۔ یہ میرے پاس تھی۔ اس میں تھوڑا سا پانی تھا آپ نے وضو فرمایا اور باقی ماندہ پانی کی چھاگل مجھے عنایت فرما کر فرمایا اس کو محفوظ رکھنا اس سے ایک عظیم معجزہ رونما ہو گا۔ اس کے بعد حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے نماز کے لئے اذان دی۔ پھر فجر کی نماز ادا فرمائی اور سوار ہو کر چل دیئے۔ جس وقت آفتاب کی گرمی تیز ہو گئی اور ہر چیز تپنے لگی تو ہم نے عرض کیا " یارسول اللہ! ہم پیاس سے مرے جا رہے ہیں فرمایا " تم پیاس سے ہلاک نہ ہو گے"۔ پھر مجھ سے وہ چھاگل طلب فرمائی۔ اس کے دہانہ پر اپنا دہن مبارک رکھا۔ ہمیں معلوم نہیں آپ نے اس میں اپنا لعاب ڈالا یا پھونک ماری (واللہ اعلم) تو چھاگل سے پانی بہنے لگا اور مجھے پلانے کا حکم دیا۔ لوگ ہجوم کر کے آ گئے۔ فرمایا ہجوم نہ کرو اطمینان رکھو سب کو پانی ملے گا۔ چنانچہ سب سیراب ہو گئے۔ اس وقت ہم تین سو آدمی تھے۔ اس کے بعد میں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم دو ہی آدمی پانی کے پینے سے باقی رہ گئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی میری طرف بڑھا کر فرمایا "پیو" میں نے عرض کیا یارسول اللہ! جب تک آپ نہ پئیں گے میں نہ پیوں گا۔ فرمایا:۔ "اِشْرَبْ سَاقِی الْقَوْمِ اٰخِرُھُمْ شُرْبًا" پیو قوم کو پلانے والا آخر میں پیتا ہے۔ چنانچہ میں نے پیا اور آخر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیا۔

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث "جیش عسرت" کے ضمن میں مروی ہے کہ لوگوں کو پیاس نے اس حال پر پہنچا دیا کہ لوگ اپنا اونٹ ذبح کر کے اس کا اوجھ نچوڑ کر پینے لگے تھے۔ اس وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بارگاہ نبوی میں دعا کی استدعا کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کے لئے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے ابھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست ہائے مبارک کو واپس نہ کیا تھا کہ بارش ہونے لگی۔ اور جس جس کے پاس برتن تھے پانی سے بھر گئے۔ کمال یہ ہے کہ اس بارش نے لشکر کے

باہر تجاوز نہ کیا۔

بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب ابو طالب ایک سواری پر سوار سفر کر رہے تھے ابو طالب نے عرض کیا اے بھتیجے مجھے سخت پیاس لگی ہے۔ اور میرے پاس پانی بھی نہیں ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سواری سے نیچے اترے اور اپنا قدم مبارک زمین پر مارا۔ زمین سے پانی ابلنے لگا۔ فرمایا اے چچا لو پانی پیو۔

بخاری و مسلم میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ بیان کرتے کہ ایک سفر میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ لوگوں نے پیاس کی شکایت کی تو آپ نے ان سے اپنے دو صحابیوں کو بلایا ان میں سے ایک حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے۔ ان سے فرمایا جاؤ پانی کو تلاش کرو۔ تمہیں ایک عورت ملے گی جس کے اونٹ پر پانی کی دو مشکیں ملیں گی۔ یہ دونوں تلاش میں نکلے اور اس عورت کو پالیا جو پانی کی دو مشکیں لئے ہوئے تھی۔ یہ دونوں اس عورت کو مع پانی کے بارگاہ رسالت میں لے آئے۔ اور اس کے اونٹ سے مشکوں کو اتار اگیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی کے برتن طلب فرمائے۔ اور پانی ان میں لوٹ دیا پھر لوگوں سے فرمایا "آؤ اور پانی پیو اور پلاؤ۔" وہ عورت کھڑی دیکھ رہی تھی کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ خدا کی قسم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کا پانی لوٹا یا اور میں نے خیال کیا کہ یہ پہلے سے زیادہ ہے۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کے لئے کھانے کا انتظام کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ لوگوں نے کھجوریں، آٹا اور ستو جمع کر کے اس کی چادر میں باندھ کر اونٹ پر رکھ دیا۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت سے فرمایا " جاؤ۔ تم جانتی ہو ہم نے تمہارا پانی کچھ کم نہیں کیا ہے۔ لیکن خدا نے ہمیں اپنی قدرت سے پانی عطا فرمایا۔" جب وہ عورت اپنے قبیلہ میں پہنچی تو لوگوں سے اس نے کہا میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ دو شخص مجھے اس شخص کے پاس لے گئے جسے وہ لوگ اپنا آقا کہتے تھے اس کے بعد اس نے تمام قصہ بیان کیا۔ اور کہا خدا کی قسم! یا تو وہ لوگوں میں سب سے بڑا جادوگر ہے یا وہ خدا کا سچا رسول ہے پھر اس نے کہا کیا تم میں سے کسی کو اسلام لانے کی تمنا ہے۔ (آخر حدیث تک جو کہ طویل ہے) "کذافی المواہب اللدنیہ" اور بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ لوگوں نے اس عورت کا کہنا مانا اور اسلام لے آئے۔ (واللہ اعلم) اس ضمن میں احادیث بکثرت ہیں۔ احادیث استسقاء بھی اسی زمرہ سے تعلق رکھتی ہیں جن کا ذکر انشاء اللہ اپنے مقام میں آئے گا۔

معجزات در طعام وغیرہ: جس طرح کم پانی کے زیادہ کرنے میں احادیث مروی ہیں اسی طرح کم کھانے کو زیادہ فرمانے میں بھی مروی ہیں۔ یہ دونوں معجزے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت اور مالک نعمت ہونے کے اثرات کو ظاہر کرتے ہیں جس طرح کہ روحانیت کے اعتبار سے آپ عالم جسمانیت میں قلوب وارواح کی تربیت فرماتے اور انہیں کامل بناتے ہیں۔ نیز آپ ہی پرورش فرمانے والے اور جسموں کو کھانا پینا وغیرہ عطا فرمانے والے ہیں۔ بیت۔

شکر فیض تو چمن چوں کند اے ابر بہار   کہ اگر خار و گر گل ہمہ پروردۂ تست

حدیث جابر رضی اللہ عنہ: اس خصوصیت میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث مشہور ہے۔ جسے غزوۂ خندق کے ضمن میں بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں اپنی بیوی کے پاس آیا ان سے پوچھا کیا تمہارے پاس کچھ کھانا ہے، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر سخت بھوک کے آثار دیکھے ہیں تو میری بیوی نے ایک تھیلا نکالا جس میں ایک صاع کے قریب جو تھے اور ایک فربہ بکری کا بچہ تھا۔ میں نے اسے ذبح کیا بیوی نے جو کا آٹا پیسا۔ گوشت بنا کر دیگچی میں چڑھا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے ایک بکری کا بچہ ذبح کیا ہے اور میری

بیوی نے جو کا آٹا پیسا ہے۔ حضور اپنے چند صحابیوں کو لے کر میرے غریب خانہ پر تشریف لے چلیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بآواز بلند فرمایا۔ جابر نے کھانا تیار کیا ہے آؤ ان کے یہاں چلیں۔ (اس جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بوقت اعلان لفظ "سور" بضم سین وسکون واو بمعنی طعام استعمال فرمایا یہ لفظ فارسی کا ہے جو کہ بے ساختہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر جاری ہوا۔) پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے فرمایا میرے پہنچنے تک دیگچی کو چولہے سے نہ اتارنا اور گوندھے ہوئے آٹے کو یونہی رکھنا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ تشریف لائے۔ ہم آٹے اور دیگ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ملاحظہ میں لائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا لعاب دہن مبارک ان میں ڈالا۔ اور برکت کی دعا فرمائی اور میری بیوی سے فرمایا روٹی پکاؤ اور کسی ایک عورت کو اپنے ساتھ ملالو اور دیگ سے گوشت نکالتے رہو مگر اس میں جھانک کر نہ دیکھنا۔ وہ فرماتے ہیں خدا کی قسم ان ہزار آدمیوں نے شکم سیر ہو کر کھایا اور دیگ میں بدستور گوشت جوش مار رہا تھا اور آٹا بھی باقی تھا۔

حدیث انس رضی اللہ عنہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی بخاری ومسلم میں مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے ام سلیم رضی اللہ عنہا سے کہا کہ خدا کی قسم میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز میں سخت نقاہت محسوس کی ہے۔ بھوک نے آپ کو بہت نڈھال کر دیا ہے تو کیا کھانے کی کچھ چیز ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ام سلیم رضی اللہ عنہا نے جو کی چند روٹیاں نکالیں اور کپڑے میں لپیٹ کر مجھے دیدیں۔ میں انہیں لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ اس وقت مسجد میں تشریف فرما تھے اور آپ کے پاس بہت سے آدمی جمع تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کیا تمہیں ابو طلحہ نے بھیجا ہے۔ میں نے عرض کیا "ہاں یارسول اللہ!" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے فرمایا اٹھو چلو! اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں ہمراہ لے کر چل دیئے۔ میں ان سے پہلے چل دیا۔ یہاں تک کہ میں نے اس کی اطلاع ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کو دی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے ہیں۔ اس پر ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے ام سلیم رضی اللہ عنہا سے کہا "اے ام سلیم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جماعت صحابہ کے ساتھ تشریف لا رہے ہیں۔ اور ہمارے پاس ان چند روٹیوں کے سوا ان کے کھلانے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے ان چند روٹیوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔" ام سلیم رضی اللہ عنہا نے کہا خدا اور اس کے رسول خوب جانتے ہیں۔ یعنی جو کچھ کہ واقعتہً موجود ہے گویا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمارے حال کے علم کے باوجود جماعت صحابہ کے ساتھ تشریف لانا حکمت کے بغیر نہیں ہے۔ یقیناً کوئی معجزہ ظاہر ہوگا۔ پھر ابو طلحہ رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیر مقدم اور استقبال کے لئے چل دیئے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لا کر ام سلیم رضی اللہ عنہا سے فرمایا "اے ام سلیم رضی اللہ عنہا لاؤ جو کچھ تمہارے پاس ہے ام سلیم رضی اللہ عنہ نے وہی بھیجی ہوئی چند روٹیاں پیش کر دیں۔ آپ نے فرمایا انہیں ریزہ ریزہ کر کے تھوڑا سا گھی ملا کر ملیدہ بنالو اور کسی برتن میں رکھ کر لے آؤ۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ پڑھ کر اس پر دم فرمایا اور دعائے برکت فرمائی۔ اس کے بعد فرمایا دس دس کی ٹولیاں بنا کر کھاؤ۔ یہاں تک کہ دس دس کی ٹولیاں آتیں اور خوب شکم سیر ہو کر چلی جاتیں۔ تقریباً ستر یا اسی (شک راوی کو ہے) مسلم کی ایک روایت میں بغیر شک راوی اسی آدمی آئے ہیں۔ سب کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے گھر والوں نے باقی ماندہ ملیدہ کھایا ایک روایت میں آٹھ آٹھ آدمیوں کی ٹولیاں آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی اور واقعہ ہوگا۔ اس لئے کہ بخاری ومسلم میں اکثر روایتیں دس دس کی ہیں۔ (کذا فی المواہب واللہ اعلم)۔

اور ایک ایک ٹولی کر کے بلانے اور سب کو یکبارگی نہ بلانے کی حکمت میں علماء یہ کہتے ہیں کہ اگر سب کو یکبارگی بلایا جاتا تو ان کی

نظریں کھانے پر پڑتیں اور اسے کم جانتیں اور گمان رکھتیں کہ یہ کافی نہ ہو گا تو ان کی یہ سوء ظنی برکت کے اٹھ جانے کا موجب بنتی۔ یا یہ وجہ ہے کہ جگہ تنگ ہو گی۔ سب کے بیٹھنے کی گنجائش نہ ہو گی یا یہ کہ تھالی ایک ہو گی اور جماعت کثیر کی گنجائش دشوار ہو گی۔ اور گڑ بڑ و اژدحام کا اندیشہ ہو گا۔ (واللہ اعلم)

حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ غزوۂ تبوک میں (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری غزوہ تھا) جب لوگ بھوک سے بیتاب ہو گئے تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! لوگوں کو حکم فرمایئے کہ جو کچھ بچا کھچا کھانا ہے جمع کر کے لائیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس پر دعائے برکت فرمائیں فرمایا ہاں ٹھیک ہے میں دعا کروں گا۔ چنانچہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا تو لوگ بچا کھچا توشہ لانے لگے کوئی ایک مٹھی ستو لایا کوئی روٹی کا ٹکڑا لایا ایک شخص تھا جو ایک صاع (تقریباً ساڑھے چار سیر) کھجوریں لایا۔ جب دسترخوان پر یہ تھوڑی سی چیزیں جمع ہو گئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا فرمائی پھر حکم فرمایا کہ اپنے اپنے توشہ دانوں میں بھر لو تو لشکر اسلام کا کوئی فرد ایسا نہ رہا جس کا توشہ دان نہ بھر گیا ہو سب نے خوب شکم سیر ہو کر کھایا۔ پھر بھی دسترخوان پر کھانا بچ گیا۔ اس غزوۂ تبوک میں لشکری (ایک روایت کے مطابق) ستر ہزار تھے۔ اور جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معجزے کا مشاہدہ فرمایا تو راوی کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ "اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ" میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یقیناً میں اللہ کا رسول ہوں۔ " فرمایا جو کوئی اس شہادت کے ساتھ حق تعالیٰ سے ملے گا یقیناً اس کا مسکن جنت ہو گا۔

بندۂ مسکین (یعنی شیخ محقق رحمۃ اللہ علیہ) ثبتہ اللہ فی مقام الصدق والیقین کہتا ہے کہ امت جو مشاہدہ معجزہ کے وقت شہادت دیتی ہے تو وہ نبی کے دعوئ نبوت میں تصدیق و یقین حاصل ہونے کی وجہ سے ہے۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس مقام میں شہادت دینا کس عالم سے ہے یا تو یہ حضور و غیب کی حالت میں ہے چونکہ یہ دونوں حالتیں متفاوت و جداگانہ ہیں اس میں یقین و ایمان کی زیادتی حاصل ہونے کی وجہ سے ہے یا یہ شہادت امت کو تنبیہہ و تلقین کے لئے ہے۔ (واللہ اعلم بحقیقۃ الحال)

حدیث انس رضی اللہ عنہ: ۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ام المومنین سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کی شادی کے وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ام سلیم رضی اللہ عنہا نے "حیس" کا ایک بڑا پیالہ میرے ہاتھ بھیجا۔ حیس ایک خاص قسم کا کھانا ہے جسے کھجور، گھی اور ستو وغیرہ ملا کر بنایا جاتا ہے۔ ام سلیم رضی اللہ عنہا نے انس رضی اللہ عنہ سے فرمایا اے انس اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے جاؤ اور عرض کرو کہ یا رسول اللہ یہ طعام میری والدہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا ہے اور سلام عرض کیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کم مقدار میں بھیجنے کی معذرت کرنا حضرت انس رضی اللہ عنہ اسے بارگاہ نبوی میں لائے آپ نے فرمایا رکھ دو۔ اور فرمایا فلاں فلاں لوگوں کی جماعت کو لاؤ۔ اور نام بنام ارشاد فرمایا راستہ میں جو بھی ملے اسے بھی بلاتے لاؤ۔ چنانچہ میں نے ہر اس جماعت کو جس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نام بتایا تھا اور ہر اس شخص کو جو راستے میں ملا، بلاتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ جب میں واپس آیا تو میں نے کاشانۂ اقدس کو لوگوں سے بھرا ہوا دیکھا۔ صحابہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کتنے حضرات ہوں گے؟ بتایا تقریباً تین ہزار ہوں گے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک کو اس حیس کے برتن کے اوپر رکھ کر کچھ پڑھا اس کے بعد دس دس کی ٹولیوں کو اپنے پاس بلا کر انہیں کھانے کا حکم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ ہر شخص بسم اللہ پڑھ کر اپنے آگے سے کھانا جائے اسی طرح گروہ در گروہ لوگ آتے اور کھا کر چلے جاتے یہاں تک کہ سب کے سب شکم سیر ہو کر فارغ ہو گئے اس کے بعد فرمایا اے انس برتن اٹھا لاؤ۔ میں نے برتن اٹھایا تو میں کہہ نہیں سکتا

کہ اس میں حیس رکھتے وقت پہلے زیادہ تھا یا اب اٹھاتے وقت زیادہ تھا۔ اسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔
حدیث حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ: حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لئے اتنا کھانا پکایا جتنا ان دونوں حضرات کے لئے کافی ہو۔ پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا اشراف انصار میں سے تیس آدمیوں کو بلاؤ، تو وہ بلا کر لائے انہیں کھلایا گیا مگر کھانا پھر بھی باقی رہا پھر ساٹھ آدمیوں کو بلایا گیا انہیں بھی کھلایا گیا لیکن کھانا پھر بھی باقی رہا۔ پھر ستر انصار کو طلب فرمایا۔ انہوں نے بھی آکر کھایا اور کھانا باقی رہا۔ ان سب لوگوں میں کوئی ایسا نہ تھا جو اسلام لا کر اور بیعت کر کے نہ نکلا ہو۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے اس کھانے کو ایک سو اسی آدمیوں نے کھایا تھا۔
حدیث سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ: حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے خدا کی قسم ہم نے یکے بعد دیگرے صبح سے شام تک لوگوں کو کھانا کھلایا۔ دس آدمی کھڑے ہوتے اور دس آدمی بیٹھتے اور کھاتے رہتے۔ کسی نے ان سے پوچھا یہ برکت کہاں سے آتی تھی انہوں نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا وہاں سے آتی ہے۔ اسے دارمی، ابن ابی شیبہ، ترمذی، حاکم، بیہقی اور ابو نعیم نے روایت کیا۔
حدیث عبدالرحمٰن بن ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ: حضرت عبدالرحمٰن ابن ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہما کی حدیث میں آیا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سو تیس افراد تھے تقریباً ساڑھے چار سیر آٹا گوندھا گیا اور ایک بکری کا سالن تیار کیا گیا۔ پھر بکری کا جگر گردہ اور دل بھونا گیا۔ خدا کی قسم ہم ایک سو تیس شخصوں میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ٹکڑا عنایت نہ فرمایا ہو۔ اس کے بعد اس بکری کے سالن کو دو بڑے برتنوں میں رکھا گیا اور سب نے خوب سیر ہو کر کھایا اور دونوں برتنوں میں جو باقی بچا اسے اپنے برتنوں میں بھر کر اونٹ پر لاد لیا۔
دیگر حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ میں اہل صفہ کو بلا کر لاؤں چنانچہ میں انہیں تلاش کر کے لایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک پیالہ کھانے کا رکھا ہوا تھا اسے ہم سب نے خوب سیر ہو کر کھایا جب ہم کھانے سے فارغ ہو گئے تو پیالہ ویسا ہی بھرا تھا جیسا کہ پہلے رکھا تھا بجز اس کے کہ اس میں انگلیوں کے نشان تھے، حدیث میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں بہت سخت بھوکا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیالہ دودھ کا رکھا ہوا تھا۔ آپ نے "اصحاب صفہ" کو بلانے کا حکم فرمایا اس وقت میں نے اپنے دل سے کہا کہ یہ دودھ تو بہت کم ہے کاش مجھے عنایت فرما دیتے تو میں سیر ہو کر پی لیتا۔ لیکن اب شارع علیہ السلام کے فرمان اور آپ کے حکم کی بجا آوری کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ تو میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے باہر آیا اور اصحاب صفہ کو بلا کر لے گیا۔ ان سب نے پیا بجز میرے اور حضور علیہ السلام کے کوئی باقی نہ رہا۔ پھر پیالہ مجھے عنایت فرمایا۔ سب کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیا اور فرمایا "ساقی القوم اخرھم" قوم کا ساقی ان کے آخر میں پیتا ہے۔
حدیث علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ: حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالمطلب کی اولاد کو جمع فرمایا یہ چالیس افراد تھے اور ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو سالم ایک ایک بکرا چٹ کر جاتے تھے اور اس کا شوربا تک پی جاتے تھے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے صرف ایک برتن کھانے کا تیار کرایا تو ان سب نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ اور کھانا اتنا ہی باقی رہا جتنا پہلے تھا۔ پھر ایک پیالہ پانی کا طلب فرمایا ان سب نے پیا اور سیراب ہو گئے۔ لیکن پیا۔

میں پانی جوں کا توں رہا۔ اسے الشفاء نے بیان کیا ہے۔
حدیث جابر رضی اللہ عنہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ام مالک انصاریہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک کپی گھی بھیجا کرتی تھیں اور وہ اس کپی کو ہمیشہ گھی سے بھرا ہوا پاتی تھیں۔ ایک روز ام مالک رضی اللہ عنہا کے فرزندوں نے سالن مانگا گھر میں سالن کی قسم سے کچھ نہ تھا تو وہ اس کپی کی طرف گئیں جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ گھی بھیجا کرتی تھیں اور اس میں ہمیشہ گھی ملا کرتا تھا تو انہوں نے اس کپی سے تمام گھی نچوڑ لیا۔ (اس کے بعد اس میں گھی نہ ملا) پھر ام مالک رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر صورت حال بیان کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم نے اس کپی کو نچوڑ لیا اگر تم اسے نہ نچوڑتیں تو تم اس میں سے ہمیشہ گھی نکالتی رہتیں۔"
افادہ:۔ بندۂ مسکین (یعنی شیخ محقق رحمہ اللہ) فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی جو بھی خدمت بجالائے اور آپ کی محبت میں جو بھی کچھ خرچ کرے اللہ تعالیٰ اپنے دیئے ہوئے رزق میں برکت دیتا ہے۔
دیگر حدیث جابر رضی اللہ عنہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ کھانا مانگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ساٹھ صاع جو عنایت فرما دیئے بعد میں وہ شخص ہمیشہ اپنی بیوی، بچوں اور مہمانوں کے ساتھ اسے کھاتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن اس نے اسے ناپ لیا (تو وہ ختم ہو گیا) پھر اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا فرمایا اگر تم اسے نہ ناپتے تو وہ ہمیشہ ہمیشہ تمہارے لئے باقی رہتا اور تم اسے کھاتے رہتے۔
افادہ: اہل علم بیان کرتے ہیں کہ کپی سے گھی نچوڑنے اور جو کے ناپنے سے جو برکت جاتی رہی ہے اس کی حکمت یہ ہے کہ نچوڑنا اور ناپنا، اللہ تعالیٰ پر توکل و بھروسہ رکھنے کے خلاف اور متضمن تدبیر و اخذ بحول و قوت ہے۔ چنانچہ اس کے فاعل کو زوال نعمت کے ساتھ سزا دی گئی۔ اسے امام نووی نے بیان فرمایا ہے اور اسی کی مانند وہ نکتہ ہے۔ جس میں دیگ اور آٹے میں نظر نہ ڈالنے کی ممانعت ہے۔ جو تکثیر طعام کی حدیث میں گزر چکی ہے۔ (واللہ اعلم بالاسرار والحکم)

اسی سلسلہ میں وہ حدیث بھی مشہور ہے جسے بخاری نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد حضرت عبداللہ انصاری کے قرضہ کی ادائیگی کے سلسلے میں روایت کی ہے کہ قرض خواہوں نے اصل رقم کی ادائیگی کا مطالبہ کیا اور کوئی عذر تسلیم نہ کیا۔ کیونکہ ان کے کھجوروں کے باغ میں اتنی کھجوریں نہ تھیں جن سے ان کی اصل رقم ادا ہو سکتی۔ اس وقت حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ خوب جانتے ہیں کہ میرے والد روز احد شہید ہو گئے ہیں۔ اور انہوں نے بہت قرضہ چھوڑا ہے۔ میری خواہش ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ملاحظہ میں کھجوریں لائی جائیں لیکن وہ اتنی مقدار میں نہیں ہیں جس سے بارِ قرض اتارا جا سکے۔ حضور نے فرمایا "جاؤ کھجوروں کی ڈھیریوں کو علیحدہ علیحدہ ایک گوشے میں اکٹھا کر لو۔" چنانچہ جیسا فرمان تھا اس کے مطابق میں نے کیا۔ پھر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر چلا۔ جب قرض خواہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو وہ میرے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا تو آپ نے کھجوروں کی ڈھیریوں کے چاروں طرف چکر لگایا اور سب سے بڑی ڈھیری کے پاس بیٹھ گئے اور فرمایا "اپنے قرض خواہوں کو بلاؤ"۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ناپ ناپ کر دینا شروع فرمایا یہاں تک کہ میرے والد مرحوم کا بارِ قرض اتر گیا اور میں خوش تھا کہ میرے والد کی امانت ادا کر دی جائے خواہ میری بہنوں کے لئے کوئی چیز باقی نہ رہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی نو بہنیں تھیں۔ جن کو ان کے والد ماجد نے چھوڑا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بڑے ڈھیر ہی سے سب کا مطالبہ پورا فرما دیا۔ اور باقی تمام ڈھیریاں یوں ہی رہ گئیں۔ اور

مین نے جب اس بڑے ڈھیر پر نظر ڈالی جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے تو وہ بھی جوں کا توں تھی۔ اس میں سے ایک کھجور بھی کم نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اس وقت تمام قرض خواہ بھی تعجب کرنے لگے۔

دیگر حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث میں مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ لوگ سخت بھوک میں مبتلا تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے دریافت فرمایا اے ابو ہریرہ تمہارے پاس کچھ ہے عرض کیا "ہاں" یارسول اللہ! توشہ دان میں کچھ کھجوریں ہیں فرمایا انہیں میرے پاس لے آؤ۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک توشہ دان میں ڈالا اور ایک مٹھی کھجوریں نکال کر برکت کی دعا مانگی۔ پھر دس دس آدمیوں کو بلایا یہاں تک کہ تمام لشکر سیر ہوگیا۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا "جو کچھ تم لائے تھے اسے لے جاؤ اور حفاظت سے رکھ لو جب تمہیں ضرورت ہو تو اس توشہ دان میں اپنا ہاتھ ڈال کر نکال لیا کرنا۔ نہ کبھی اسے شمار کرنا نہ کبھی توشہ دان کو الٹ کر جھاڑنا۔" تو میں جتنا لایا تھا اس سے زیادہ پایا۔ اس کے بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام مدت حیات اور حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کے زمانہ خلافت تک کھاتا اور کھلاتا رہا۔ پھر جب حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ شہید کئے گئے اور میرے گھر کو لوٹا گیا تو وہ توشہ دان مجھ سے جاتا رہا۔ ایک اور روایت میں آیا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے کتنے ہی وسق اس سے کھجوریں نکال کر راہ خدا میں تقسیم کی ہیں یا اونٹ پر لاد کر دی ہیں۔ خیال رہے کہ ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے۔ اور ایک صاع ساڑھے چار سیر کا۔ علماء بیان کرتے ہیں کہ توشہ دان میں کل کھجوریں دس دانوں سے زیادہ نہ تھیں اور بعض کہتے ہیں کہ اکیس دانوں سے زیادہ نہ تھیں۔ (واللہ اعلم)

روضۃ الاحباب میں اس باب کے ضمن میں ایک بیت بھی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے۔

لِلنَّاسِ ہَمٌّ وَلِیْ فِی الْیَوْمِ ہَمَّانِ ہَمُّ الْجِرَابِ وَہَمُّ الشَّیْخِ عُثْمَانَ (واللہ اعلم)

مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اونٹوں پر کھجوریں بار کرنے کا حکم فرمایا۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر میں کھجوروں سے چار سو اونٹوں کو بار کر دیا اور وہ کھجوریں یوں ہی رہیں گویا ان میں سے ایک دانہ کم نہ معلوم ہوتا تھا۔

غرضیکہ تکثیر طعام کے سلسلے میں بکثرت حدیثیں ہیں۔ ان میں بالاتر غزوۂ تبوک کی حکایت ہے کہ بچے کھچے کمتر زاد راہ کو ایسی برکت عطا فرمائی کہ ستر ہزار لشکری اس سے نہ صرف شکم سیر ہوئے بلکہ اپنے اپنے برتنوں میں محفوظ بھی کر لیا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی سید کائنات فخر موجودات علیہ افضل الصلوٰۃ واکمل التحیات کی برکتوں سے محروم نہ رکھے اور فقر وفاقہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری وباطنی نعمتوں سے متبدل فرما دے۔ (آمین) اس وقت مجھے وہ حکایت یاد آگئی کہ مکہ مکرمہ زادہا اللہ تعظیماً وتکریماً کے بازار میں ایک ککڑی فروش اپنی ککڑیوں پر پانی چھڑکتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا۔

یابرکۃ النبی اِتَعَالَیْ وَانْزِلِیْ ثُمَّ لَا تَرْتَحِلِیْ۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ۔

حیوانات کا کلام کرنا اور اطاعت بجالانا

جس طرح انسان پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام اور آپ کے دین و شریعت کی اطاعت، فرمانبرداری اور امتثال امر واجب وفرض ہے اسی طرح جانوروں کو بھی حضور کا مطیع وفرماں بردار کیا ہے۔ کیونکہ سعادت مندی کا طرّہ انسانوں میں اہل ایمان کو حاصل ہوا۔ اسی طرح حق سبحانہ وتعالیٰ نے بطریق اعجاز وخرق عادات، تمام حیوانات کو آپ کا مطیع ومنقاد بنایا۔ اسی بنا پر ارباب تحقیق واہل باطن فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تمام حیوانات، نباتات، جمادات اور ساری مخلوق کی طرف ہے لیکن

چونکہ وہ دائرہ عقل اور امرونہی کی تکلیف سے خارج ہیں اس لئے ان سے، بجز طاعت وایمان اور صدق رسالت کی شہادت کے کچھ اور متصور نہیں اور وہ معصیت سے موسوم نہیں ہوتے۔ جس طرح کہ آدمی ہوتے ہیں۔

کلام حیوانات: اب رہا حیوانات میں معجزات کا ظہور! تو ان میں سے ایک تو اونٹوں کا سجدہ کرنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اپنی شکایتیں پیش کرنا ہے۔ چنانچہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہر ایک اہل بیت انصار اونٹوں کو پالتے تھے ان میں سے ایک نے سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آکر عرض کیا یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارا ایک اونٹ ہے جس پر ہم پانی لاد کر لاتے ہیں اب وہ سرکشی وسختی کرنے لگا ہے۔ اور وہ اپنی پشت پر بوجھ لادنے سے ہمیں منع کرتا ہے۔ ہمارے نخلستان اور باغات سب پیاسے ہیں۔ اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ اٹھے اور اونٹ کی جانب تشریف لے چلے۔ جب باغ میں پہنچے اور کھڑے ہوئے تو اونٹ اس کے ایک گوشے میں بیٹھا ہوا تھا۔ انصار عرض کرنے لگے یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ ہے وہ اونٹ جو کتوں کی مانند کاٹتا ہے ہمیں ڈر ہے کہ کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات کو بھی یہ گزند نہ پہنچائے۔ فرمایا میرا کوئی خوف نہ کرو۔ پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اونٹ کے سامنے آئے تو اس نے اپنا سر اٹھایا دیکھتے ہی سر کو آپ کے آگے سجدہ میں رکھ دیا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کی پیشانی کے بال پکڑے اور اسے کام میں لگا دیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ حیوان لا یعقل یعنی بے سمجھ جانور ہے جب یہ آپ کو سجدہ کرتا ہے تو ہم تو زیادہ مستحق ہیں کہ ہم آپ کو سجدہ کریں۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی بشر کو نہ یہ چاہئے اور نہ یہ اسے سزاوار ہے کہ دوسرے بشر کو سجدہ کرے۔ اگر جائز ہوتا کہ ایک بشر دوسرے بشر کو سجدہ کرے تو میں عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کے عظیم حقوق کی بنا پر انہیں سجدہ کریں اسے امام احمد ونسائی نے روایت کیا ہے۔ اور بعض روایتوں میں آیا ہے کہ اس مقام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آسمان وزمین میں کوئی مخلوق ایسی نہیں ہے جو یہ نہ جانتی ہو کہ میں خدا کا رسول ہوں۔ بجز نافرمان جنات وانسان کے۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ وہ لوگ اس اونٹ کو ذبح کرنا چاہتے تھے تو اونٹ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی شکایت کی۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ اونٹ نے حاضر ہو کر اپنی گردن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھ دی اور اپنی آواز میں فریاد کرنے لگا اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سر کے بال پکڑ کر اٹھایا اور اس کے مالک سے فرمایا اس اونٹ کو میرے ہاتھ فروخت کردو اس نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ لیکن یہ اونٹ گھر والوں کے لئے ہے ان کے لئے اس کے سوا کوئی اور ذریعہ معاش نہیں ہے فرمایا یہ اونٹ کام کی زیادتی اور چارہ کی کمی کی شکایت کرتا ہے۔ تم اس کے ساتھ نرمی برتو اور اس کے حقوق کا لحاظ رکھو۔ یہ حدیث بطریق متعددہ بالفاظ مختلفہ مروی ہے اور صحیح ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا علیہ التحیۃ والثناء حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ ایک انصاری کے باغ میں تشریف لے گئے وہاں ایک بکری تھی۔ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ! ہم زیادہ سزاوار ہیں کہ ہم آپ کو سجدہ کریں۔ فرمایا "کسی بشر کو زیبا نہیں کہ وہ دوسرے بشر کو سجدہ کرے، (آخر حدیث تک)

ایک مرتبہ ایک اونٹ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور آکر اپنی قوم کی شکایت کی کہ وہ نماز عشا پڑھنے سے پہلے سو جاتے ہیں۔ مجھے خوف ہے کہ حق تعالیٰ ان پر عذاب نازل کرے حضور نے اس قوم کو بلایا اور انہیں نماز عشاء سے پہلے سو جانے کی ممانعت فرمائی۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہمارے گھر میں ایک بکری تھی جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم یہاں خواب

استراحت فرماتے تو وہ بکری خاموش پر سکون اور آرام وچین سے رہتی۔ اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لے جاتے تو وہ بکری، پریشان و بے قرار اور متوحش بن کر ادھر ادھر ماری ماری پھرتی۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جب اونٹوں کی قربانی فرماتے تو ہر اونٹ ایک دوسرے کو ہٹا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آنے کی کوشش کرتا تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہلے اسے ذبح فرمائیں۔

مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک ام معبد کی بکری کے تھنوں پر پھیرا جن کا دودھ خشک ہو گیا تھا وہ اسی وقت دودھ سے لبریز ہو گئے۔ آپ نے انہیں دوہ کر خود بھی پیا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بھی پلایا۔ ام معبد کی اس بکری کا مشہور قصہ انشاء اللہ باب ہجرت میں تفصیل سے آئے گا۔ اس قسم کی حدیثیں تکثیر طعام میں بھی ذکر کی گئی ہیں اور حیوانات کی اطاعت وفرماں برداری میں بھی مذکور ہیں۔

کلام گرگ۔ اسی ضمن میں بھیڑیئے کا کلام کرنا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر شہادت دینے کا واقعہ بھی ہے۔ بھیڑیئے کے کلام کرنے کی حدیث کو جماعت صحابہ نے بطریق متعددہ روایت کیا ہے۔ چنانچہ امام احمد رحمہ اللہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کرتے ہیں۔ وہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک بھیڑیا ایک بکری پر جھپٹا اور بکری کو اپنے چنگل میں لے لیا لیکن چرواہے نے دوڑ کر بکری کو اس کے چنگل سے چھڑا لیا۔ اس کے بعد درندوں کی عام عادت کے مطابق بھیڑیا اپنی دم پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا "چرواہے تو خدا سے نہیں ڈرتا کہ تو میرے اس رزق کو چھینتا ہے جسے خدا نے میرے قبضہ میں دیا تھا" چرواہے نے کہا کہ "سبحان اللہ تعجب ہے کہ بھیڑیا آدمیوں کی مانند بات کرتا ہے؟" اس پر بھیڑیئے نے کہا کیا تجھے اس سے تعجب خیز بات نہ بتاؤں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مدینہ منورہ میں لوگوں کو گزری ہوئی باتوں اور خبروں کی اطلاع دے رہے ہیں۔ اور لوگ ہیں کہ آپ پر ایمان نہیں لاتے۔ پھر تو چرواہا ان بکریوں کو ایک گوشے میں اکٹھا کر کے چھوڑ کر چل دیا۔ یہاں تک کہ مدینہ منورہ میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام احوال سنایا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بلانے کیلئے اعلان عام کا حکم دیا۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چرواہے سے فرمایا کہ جو کچھ تم نے سنا اور دیکھا ہے انہیں بتاؤ۔ اسی طرح بیہقی نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے اور ابو نعیم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں بسند صحیح مذکور ہے کہ بھیڑیئے نے کہا کہ اس سے عجیب تر بات یہ ہے کہ ایک شخص حرمین کے درمیان کھجوروں کے باغوں میں گزشتہ اور آئندہ کے حالات بتا رہا ہے۔ یہ چرواہا یہودی تھا۔ تو وہ بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوا اور ایمان لے آیا۔ بعض اسناد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ آیا ہے کہ بھیڑیئے نے چرواہے سے کہا کہ میرے مقابلے میں تیرا حال عجیب تر ہے کہ تو اپنی بکریوں کے ریوڑ پر کھڑا ہے اور ایسے برگزیدہ کو چھوڑے ہوئے ہے جن سے بلند تر اور عظیم المرتبت کوئی نبی حق تعالیٰ نے مبعوث نہیں فرمایا۔ بلاشبہ ان کے لئے جنت کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں۔ اور اہل جنت اور اس کے اصحاب مشرف ہو چکے ہیں۔ اور وہ ان کے شہداء کے منتظر ہیں۔ مطلب یہ کہ جنت کے حور و غلمان اور فرشتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا استقبال کریں گے اور وہ منتظر و مشتاق ہیں کہ کب وہ مقتول و شہید ہو کر جنت میں داخل ہوں گے اس کے بعد بھیڑیئے نے چرواہے سے کہا تیرے اور ان کے درمیان بجز اس تودۂ پہاڑ کے کچھ حائل نہیں۔ تو پہاڑ سے حضرت کی بارگاہ میں جا اور اپنے آپ کو خدا کے لشکروں میں شامل کر۔ چرواہے نے کہا پھر بکریاں کون چرائے گا۔ بھیڑیئے نے کہا میں ان کی نگہداشت کروں گا۔ تو وہ بارگاہِ نبوی میں آیا اور اسلام لایا اور ان میں سے ایک بکری اس نے بھیڑیئے کے لئے ذبح کر دی۔

اسی کے مشابہ حضرت ابو سفیان بن حرب اور صفوان بن امیہ سے بھی ایک روایت ہے کہ ایک بھیڑیا ایک ہرن کا پیچھا کر رہا تھا۔ جب ہرن حدود حرم میں داخل ہو گیا تو بھیڑیا لوٹ گیا لوگ اس پر تعجب کرنے لگے اس پر بھیڑیا نے کہا اس سے عجیب تر بات یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو جنت کی طرف بلاتے ہیں اور تم لوگوں کو جہنم کی طرف کھینچتے ہیں؟ اس پر ابو سفیان نے صفوان سے کہا قسم ہے لات و عزیٰ کی اگر تم اس کا تذکرہ مکہ مکرمہ میں کردو تو مکہ کی عورتیں بغیر مردوں کے زندگی گزاریں اور ابو جہل اور اس کے ساتھیوں سے بھی اسی کی مانند لوگ حکایت کرتے ہیں۔

اسی قبیل سے ضب یعنی سوسمار (گوہ) کی حدیث ہے کہ اس نے کلام کیا اور حدیث مشہور ہے جسے بیہقی نے احادیث کبیرہ میں روایت کیا ہے اور قاضی عیاض نے کتاب الشفاء میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرام کی محفل میں تشریف فرما تھے کہ اچانک بنی سلیم کا ایک بدوی گوہ کا شکار کر کے لایا اسے اس نے اپنی آستین میں اس لئے چھپا رکھا تھا کہ وہ اسے اپنی قیام گاہ میں لے جا کر بھون کر کھائے گا۔ جب اس بدوی نے ایک جماعت کو بیٹھے دیکھا تو کہنے لگا جماعت کے درمیان میں یہ کون شخص ہیں؟ صحابہ نے کہا یہ اللہ کے رسول ہیں۔ اس نے گوہ کو اپنی آستین سے نکالا اور کہنے لگا قسم لات و عزیٰ کی میں اس وقت تک ہرگز ایمان نہ لاؤں گا جب تک کہ یہ گوہ آپ کی شہادت نہ دے یہ کہہ کر گوہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ڈال دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گوہ کو آواز دی اے گوہ! گوہ نے سنجیدہ زبان میں جواب دیا "لبیک و سعدیک" حاضر ہوں، فرماں بردار ہوں۔ جسے ساری جماعت نے سنا۔ پھر فرمایا اے گوہ! قیامت میں کون آئے گا؟ گوہ نے جواب دیا ساری مخلوق آئے گی۔ پھر پوچھا تو کس کی عبادت کرتی ہے۔ گوہ نے جواب دیا اس خدائے پاک کی جس کا عرش آسمان میں ہے اور جس کی سلطنت زمین میں ہے اور جس کا دریاؤں پر غلبہ ہے۔ اور جنت میں اس کی رحمت ہے اور جہنم میں اس کا عذاب ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں کون ہوں؟ اس نے جواب دیا آپ رسول اللہ، رسول رب العالمین اور خاتم النبیین ہیں۔ "قَدْ اَفْلَحَ مَنْ صَدَّقَكَ وَخَابَ مَنْ كَذَّبَكَ" یقیناً وہ کامیاب ہے جس نے آپ کی تصدیق کی اور وہ نامراد ہے جس نے آپ کی تکذیب کی۔ یہ سن کر وہ بدوی اسلام لے آیا۔

کلام آہو: اسی باب سے حدیث غزالہ ہے جسے آئمہ حدیث متعدد طریقوں اور سندوں سے روایت کر کے ایک کو دوسرے سے قوی بناتے ہیں۔ قاضی عیاض نے الشفاء میں اور ابو نعیم نے دلائل میں ام سلیم رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحرا میں گشت فرما رہے تھے کہ اچانک تین مرتبہ "یا رسول اللہ" کی آواز سماعت فرمائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے دیکھا ہرنی بندھی ہوئی پڑی ہے اور ایک بدوی چادر اوڑھے لیٹا ہے۔ آپ نے ہرنی سے دریافت فرمایا "بتا کیا حاجت ہے"؟ ہرنی نے کہا مجھے اس بدوی نے شکار کر کے باندھ رکھا ہے۔ میرے دو بچے اس پہاڑ کی کھو میں ہیں اگر آپ مجھے آزاد کر دیں تو میں اپنے بچوں کو دودھ پلا کر آجاؤں گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تو ایسا کرے گی اور لوٹ آئے گی۔ ہرنی نے کہا اگر میں لوٹ کر نہ آؤں تو خدا مجھے وہ عذاب دے جو محصول لینے والوں پر عذاب کرتا ہے۔" اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رہا کر دیا اور وہ چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوٹ آئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے باندھ دیا۔ جب بدوی بیدار ہوا تو کہنے لگا یا رسول اللہ کوئی خواہش ہے؟ فرمایا خواہش یہ ہے کہ تو اس ہرنی کو رہا کر دے تو اس بدوی نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ خوش خوش جنگل میں دوڑتی اور چوکڑیاں بھرتی چلی گئی وہ کہتی جاتی تھی "وَاَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔"

مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک لشکر میں جلوہ افروز تھے۔ لشکر کے تمام آدمی پیاسے تھے وہ پانی کی جگہ اترے اس

وقت ایک ہرنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آئی آپ نے اس کا دودھ دوہا۔ اور تمام لشکر کو سیراب فرمایا یہ لشکری تقریباً تین سو تھے۔ اور حضرت رافع سے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام تھے فرمایا اس ہرنی کی نگہداشت کرو انہوں نے اسے باندھ دیا۔ کچھ دیر بعد دیکھا تو وہ بھاگ گئی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اِنَّ الَّذِیْ جَاءَ بِھَا ھُوَالَّذِیْ ذَھَبَ بِھَا" جو اسے لایا تھا وہی اسے لے گیا۔

کلام حمار: انہی میں سے حمار یعنی گدھے کا کلام کرنا ہے۔ اسے ابن عساکر نے روایت کیا ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر فتح کیا تو ایک گدھے نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں کیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گدھے سے پوچھا تیرا نام کیا ہے؟ اس نے کہا میرا نام یزید بن شہاب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میرے جد کی نسل سے ساٹھ ایسے گدھے پیدا فرمائے ہیں جس پر بجز نبی کے کسی نے سواری نہیں کی ہے اور میں یہ تمنا رکھتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کا شرف حاصل کروں۔ میرے جد کی نسل میں میرے سوا کوئی باقی نہیں رہا ہے اور آپ کے سوا کوئی نبی بھی اب آنے والا نہیں ہے۔ اس نے کہا آپ سے پہلے میں ایک یہودی کے قبضہ میں تھا۔ جب وہ مجھ پر سواری کا ارادہ کرتا تو میں قصداً اچھل کود کر اسے گرا دیتا اور اسے اپنے پر سوار نہ ہونے دیتا۔ وہ یہودی غصے میں مجھے بھوکا رکھتا تھا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا آئندہ تیرا نام "یعفور" ہوگا۔ یہ یعفور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب اسے کسی کو بلانے بھیجتے تو وہ اس کے دروازے پر جاتا اور اپنے سر سے دروازے کو کوٹتا جب مالک مکان باہر آتا تو وہ اشارہ کرتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھے بلایا ہے اور وہ اسے لے کر آجاتا۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی تو یعفور نے رنج والم اور فراق وجدائی کے غم میں ابو السمم بن السہان کے کنوئیں میں چھلانگ لگا کر خود کو مار ڈالا۔

تسخیرِ شیر: اور اسی باب سے شیر کا مسخر ہونا اور حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کا اس کی چاپلوسی کرنا ہے۔ جب کہ حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ لشکر سے دور ہو کر راہ بھٹک گئے تھے۔ اور انہوں نے شیر سے کہا تھا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہوں مجھے راہ بتاؤ تو شیر نے ان کو لشکر تک پہنچا دیا تھا۔

ابن وہب روایت کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جن کبوتروں نے مکہ معظمہ میں سایہ کیا تھا پھر حضور نے ان کے لئے برکت کی دعا فرمائی۔ اسی طرح غار ثور میں ہجرت کے وقت مکڑی کا جالا بننے اور ان پر کبوتروں کا انڈے دینے کا واقعہ مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ غار ثور میں جن کبوتروں نے انڈے دیئے تھے اس کی نسل سے حرم کے کبوتر ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چھوٹے سے درخت کو حکم دیا کہ وہ بقدر آدمی بلند ہو کر غار کو چھپا لے اسے قاضی عیاض رحمہ اللہ نے الشفا میں بیان کیا اور فرماتے ہیں کہ کلام حیوانات اور ان کی اطاعت وفرماں برداری میں حدیثیں بکثرت ہیں۔ ان میں سے جو مشہور تھیں اور ائمہ نے ان کا کتابوں میں ذکر کیا تھا ہم نے بھی انہیں کا ذکر کر دیا۔

اطاعتِ نباتات

وصل: جس طرح تمام حیوانات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطیع ومنقاد تھے اسی طرح آپ کی فرماں برداری واطاعت میں نباتات بھی ہیں۔ اس باب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درختوں کا کلام کرنا۔ آپ پر سلام عرض کرنا، آپ کی رسالت کی گواہی دینا اور آپ کے حکم کی اطاعت کرنا ہے۔

ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب سے میری طرف

وحی بھیجی گئی اس وقت سے ہر شجر و حجر مجھ پر السلام علیک یارسول اللہ عرض کرتا ہے۔

مولائے کائنات سیدنا علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ مکرمہ کے بعض اطراف میں چلے راہ میں جو بھی درخت یا پہاڑ ملتا وہ کہتا "السلام علیک یارسول اللہ" اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔ یہ روایتیں وہ ہیں جو آپ کے ابتدائے عہد کی ہیں۔ جیسا کہ پہلی حدیث میں گزرا یا یہ کسی اور زمانے کی ہیں۔ (واللہ اعلم)

حاکم نے مستدرک میں باسناد جید سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے کہ ایک بدوی سامنے آیا جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہاں جارہے ہو؟ اس نے کہا اپنے اہل و عیال کی طرف۔ فرمایا کیا تجھے بھلائی کی رغبت ہے۔ یعنی تو چاہتا ہے کہ نیکی و سعادت اپنے لئے حاصل کرے۔ اس نے پوچھا وہ کیا ہے۔ فرمایا گواہی دینا اس کی کہ: "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ" بدوی نے کہا کیا آپ اس پر کوئی شہادت رکھتے ہیں۔ مطلب یہ کہ جو کچھ فرمایا کوئی اس کا گواہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یہ درخت میرا گواہ ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس درخت کو بلایا جو وادی کے کنارے پر تھا۔ وہ درخت زمین کو چیرتا ہوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پھر آپ نے اس سے تین مرتبہ شہادت لی اور اس درخت نے گواہی دی۔ اس کے بعد وہ درخت اپنی جگہ پلٹ گیا۔ (آخر حدیث تک) دارمی بھی اسی کی مانند روایت کرتے ہیں۔

غزوۂ احد کی لڑائی میں بدنہاد کافروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رخسار کو گزند پہنچایا اور آپ کے دندان مبارک کو ضرر پہنچا اور جسم اطہر خون آلود ہو گیا۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک گوشہ میں تشریف فرما ہو گئے۔ جبریل علیہ السلام نے حاضر ہو کر مزاج پرسی کی۔ جبریل نے آپ کو غمگین پا کر عرض کیا۔ کیا پسند فرمائیں گے کہ میں آپ کو ایک ایسی نشانی دکھاؤں جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی خاطر ہو۔ اس کے بعد جبریل علیہ السلام نے اس درخت پر نظر ڈالی جو وادی کے پیچھے تھا۔ اور عرض کیا حضور اس درخت کو بلائیں چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس درخت کو بلایا وہ چلتا ہوا آپ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ پھر جبریل علیہ السلام نے عرض کیا اب اسے اپنی جگہ لوٹ جانے کا حکم دیں آپ نے حکم دیا تو وہ لوٹ گیا اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حَسْبِی حَسْبِی، مجھے کافی ہے مجھے کافی ہے۔ اسے دارمی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

حضرت بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک بدوی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزہ مانگا تو حضور رضی اللہ عنہ نے بدوی سے فرمایا اس درخت سے کہو کہ رسول اللہ تجھے بلاتے ہیں اس درخت نے ادھر ادھر اور آگے پیچھے جنبش کی اور زمین سے اپنی پھیلی ہوئی جڑوں کو نکالا پھر زمین کو چیرتا ہوا اور جڑوں کو گھسیٹتا ہوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا السلام علیک یارسول اللہ! پھر بدوی نے کہا اب اس درخت کو اپنی جگہ واپس ہونے کا حکم دیجئے تو وہ لوٹ کر اپنی جگہ چلا گیا۔ اس کے رگ و ریشے زمین میں پیوست ہو گئے اور زمین ہموار ہو گئی۔ اس کے بعد بدوی نے عرض کیا مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کو سجدہ کروں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت نہ دی۔ پھر اس نے عرض کیا تو مجھے دست مبارک اور قدم شریف کے بوسہ لینے کی اجازت مرحمت فرمائیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دے دی۔

منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں اونٹ پر سوار تاریک رات میں محو خواب تشریف لئے جارہے تھے کہ سواری کے آگے بیری کا درخت آگیا وہ فوراً دو ٹکڑے ہو گیا اور حضور کو سلامتی کے ساتھ گزرنے کی راہ چھوڑ دی۔ اس بنا پر اس واقعہ سے مستفاد اس بیری کے درخت کا نام "سدرۃ النبی" صلی اللہ علیہ وسلم مشہور و معروف ہو گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے

مروی ہے کہ ایک بدوی نے بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر کہا کہ میں کس طرح جانوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس طرح کہ کھجور کی ٹہنی کو بلاتا ہوں۔ وہ گواہی دے گی کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ چنانچہ وہ ٹہنی درخت سے ٹوٹ کر گر پڑی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ٹہنی سے فرمایا جا "اپنی جگہ قائم ہو جا۔" تو وہ ٹہنی اٹھ کر اپنی جگہ نصب ہو گئی۔ پھر وہ بدوی اسلام لے آیا۔ اسے ترمذی نے روایت کیا اور اپنی جگہ صحیح بتایا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس درختوں کے آنے سلام عرض کرنے پھر اپنی جگہ واپس جانے کے سلسلے میں بکثرت حدیثیں مروی ہیں۔ قصیدہ بردہ میں ہے ۔

جَاءَتْ لِدَعْوَتِهِ الْاَشْجَارُ سَاجِدَةً   تَمْشِیْ اِلَیْهِ عَلٰی سَاقٍ بِلَا قَدَمِ

كَاَنَّمَا سَطَرَتْ سَطْرًا لِمَا كَتَبَتْ   فُرُوْعُهَا مِنْ بَدِيْعِ الْخَطِّ فِي اللَّقَمِ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے طویل صحیح حدیث مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے ایک کھلے صحرا میں پڑاؤ کیا۔ پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قضائے حاجت کے لئے تشریف لے چلے میں بھی آپ کے پیچھے پیچھے پانی کا آفتابہ لئے چلنے لگا مگر کہیں بھی پردہ دار جگہ نہ تھی۔ اچانک وادی کے کنارے پر دو درخت نظر آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف چل دیئے۔ پھر آپ نے ایک درخت کی ٹہنیوں کو پکڑ کر کہا کہ اللہ کے حکم سے میری متابعت کر تو وہ ٹہنیاں آپ کی ایسی پیروی کرنے لگیں جیسے وہ اونٹ جس کے نکیل پڑی ہو متابعت کرتا ہے۔ پھر وہ دوسرے درخت کی طرف کھنچ گیا۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ان کی ٹہنیوں نے باہم مل کر مجھ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پوشیدہ کر لیا۔ ایک اور روایت میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے جابر اس درخت سے کہو کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ اپنے ساتھ والے درخت سے مل جا تاکہ میں تم دونوں کے پیچھے بیٹھوں۔ میں گیا اور درخت سے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہہ دیا تو وہ دوسرے سے مل گیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں کے پیچھے بیٹھ گئے۔ میں نکل کر باہر آگیا۔ اور دور جا کر دیکھنے لگا اور دل میں باتیں کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد جو دیکھتا ہوں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لئے آرہے ہیں۔ اور وہ دونوں درخت جدا ہو کر اپنی اپنی جگہ کھڑے ہیں۔

اسی طرح حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک غزوہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کیا تم نے رسول خدا کی قضائے حاجت کے لئے کوئی جگہ دیکھی ہے۔ میں نے عرض کیا اس وادی میں لوگوں سے خالی کوئی جگہ نہیں دیکھی آپ نے فرمایا کھجوروں کے درخت یا کوئی پتھر دیکھا ہے۔ عرض کیا ہاں قریب قریب کھجوروں کے درخت دیکھے ہیں۔ فرمایا جاؤ ان درختوں سے کہو کہ رسول خدا تمہیں حکم دیتے ہیں کہ رسول خدا کی قضائے حاجت کے لئے باہم مل جاؤ وہ تمہیں حکم دیتے ہیں اور پتھروں سے بھی یہی کہنا۔ میں گیا اور یہی کہا۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا۔ میں نے دیکھا وہ درخت ایک دوسرے کے قریب ہو گئے اور سنگریزے باہم پیوست ہو گئے۔ پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم قضائے حاجت سے فارغ ہوئے تو فرمایا جاؤ ان سے کہو ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں۔ اس قسم کے معجزات بکثرت منقول ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ لوگوں نے سوال کیا کون سی چیز ہے جو آپ کی رسالت کی گواہی دے۔ فرمایا یہ درخت میری رسالت کی گواہی دے گا۔ پھر فرمایا اے درخت قریب آ۔ وہ درخت قریب آگیا۔ اور گواہی دی۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اعاظم واکابر صحابہ کرام کی ایک جماعت کثیرہ اس قصہ پر متفق ہے اور تابعین مزید ہیں۔ (رضوان اللہ علیہم اجمعین)

اطاعتِ جمادات

جس طرح نباتات کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کا مطیع و فرماں بردار بنایا گیا ہے اسی طرح جمادات بھی حکم کے مطیع و منقاد ہیں۔ وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں سلام عرض کرتے ہیں اور آپ سے باتیں کرتے تھے۔ جیسا کہ گذر چکا ہے کوئی شجر و حجر نہیں ہے مگر یہ کہ مجھ پر سلام پیش کرتا ہے اور کہتا ہے "اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَارَسُوْلَ اللہِ" اور حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ اور سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی اس باب میں حدیثیں گزر چکی ہیں۔ اور حضرت جابرؓ سے بھی مروی ہے۔ اسی طرح راہب والی وہ حدیث جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم، ابو طالب کے ہمراہ قبل بعثت اوائل عمر شریف میں سفر کیلئے نکلے تھے تو کوئی شجر و حجر ایسا نہ تھا جس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ نہ کیا ہو۔ انشاء اللہ یہ قصہ اپنی جگہ آئے گا۔

صحیح مسلم میں بروایت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا۔ بلاشبہ میں اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو بعثت سے پہلے مکہ مکرمہ میں مجھے سلام کرتا تھا۔ میں اسے خوب جانتا ہوں۔ لوگوں کا اس میں اختلاف ہے کہ وہ پتھر کون سا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ حجر اسود ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کے سوا اور کوئی پتھر اس کوچے کا ہے جسے زقاق الحجر کہتے ہیں جو کہ سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے گھر جاتے ہوئے راستے میں ایک دیوار میں لگا ہوا ہے۔ اور لوگ اسے چھو کر برکت حاصل کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہی پتھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گزرنے کے وقت سلام پیش کرتا تھا۔

شیخ ابن حجر مکی ہاشمی فرماتے ہیں کہ اہل مکہ سے بتواتر منقول ہے۔ کہ وہ پتھر زقاق الحجر میں ہے اور یہی پتھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گزرتے وقت سلام کرتا تھا۔ اس کے مقابل دوسری دیوار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کہنیوں کا نشان ہے جو ایک پتھر میں بنا ہوا ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے لئے پتھر اور لوہا نرم کر دیا گیا ہے۔ اور مکہ مکرمہ کے اس پہاڑ میں جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بکریاں چراتے تھے آپ کے قدم ہائے مبارک کے نشان ہیں۔ (واللہ اعلم)

صاحب مواہب لدنیہ ابو حفص میانجی سے نقل کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں مکہ مکرمہ کے رہنے والوں میں سے جس سے بھی ملا ہوں اس نے یہی بتایا کہ وہ پتھر جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرتا تھا یہی کوچہ "زقاق الحجر" کا پتھر ہے۔

اسی باب میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے وقت گھر کے ہر در و دیوار اور ستونوں کا آمین کہنا بھی ہے۔ جب آپ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور ان کے فرزندوں کے بارے میں دعا مانگی جسے بیہقی نے دلائل میں اور ابن ماجہؒ نے مختصر میں روایت کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔ کل تم اور تمہارے فرزندان اس وقت تک گھر سے نہ نکلیں جب تک کہ میں نہ آؤں اسلئے کہ مجھے تم سے کام ہے تم سب میرا انتظار کرنا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز چاشت کے وقت ان کے گھر تشریف فرما ہو کر فرمایا السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ دریافت فرمایا کیسے صبح کی انہوں نے عرض کیا الحمد للہ صبح بخیر ہوئی فرمایا تم سب مل کر بیٹھ جاؤ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر اپنی ردائے مبارک ڈالی اور دعا کی۔ "اے رب یہ میرے چچا ہیں اور میرے والد کے ہم شبیہہ ہیں۔ اور یہ سب میرے اہل بیت ہیں تو ان سب کو آتش دوزخ سے ایسا چھپا جیسا میں نے ان کو اپنی چادر میں چھپالیا ہے۔" اس پر گھر کے ہر در و دیوار نے آمین کہی اور ان سب نے بھی آمین آمین کہی۔

ایک مرتبہ حضرت عقیل رضی اللہ عنہ بن ابی طالب، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں پیاسے ہو گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس پہاڑ پر جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ افروز تھے بھیجا اور فرمایا اس پہاڑ سے کہو کہ پانی دے، وہ پہاڑ گویا ہوا

کہ "تم رسول خدا سے کہنا کہ جس دن یہ آیۂ کریمہ قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (اور ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں) نازل ہوئی میں خوفِ خدا سے اتنا رویا کہ میرے اجزا میں پانی ہی نہ رہا۔

اس باب میں "حنین جذع" ہے۔ صراح میں حنین کے معنی آرزومندی، نالہ اور اس اونٹنی کی آواز کے ہیں جس سے بچہ جدا کر دیا گیا ہو اور جذع بکسر جیم و سکون ذال اس کے معنی درخت کے تنہ کے ہیں اور حنینِ جذع کی حدیث کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کثیرہ نے نقل کیا ہے جو کہ مفید قطع ویقین ہے، مواہب لدنیہ میں شیخ تاج الدین سبکی سے منقول ہے کہ شرح مختصر ابن حاجب میں کہا گیا ہے میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ حدیث حنینِ جذع متواتر ہے اور اسے بخاری و مسلم اور دیگر ائمہ حدیث نے علماء حدیث سے بطرق کثیرہ متعددہ خارج از حد حصر واحصاء روایت کیا ہے کہ یہ متواتر ہے ممکن ہے کسی اور کے لئے یہ غیر متواتر ہو۔ شیخ ابن حجر فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ حنینِ جذع انشقاق قمر کی مثل نقل کیا گیا ہے اس کی ہر ایک نقل مشہور شائع ہوئی ہے اور ہر اس شخص کیلئے جو طرق حدیث پر مطلع ہے مفید قطع ہے۔ یہ اس کے لئے نہیں جو فن حدیث سے لگاؤ نہ رکھتا ہو (واللہ اعلم)

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ حنینِ جذع کا قصہ، امور ظاہرہ سے ہے جسے خلف نے سلف سے ان اکبر آیات اور ابہر معجزات پر محمول کیا ہے۔ جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلالت کرتے ہیں۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جتنا کچھ عطا فرمایا گیا ہے اتنا کسی نبی کو حق تعالیٰ نے نہیں عطا فرمایا۔ اس کے بعد امام شافعی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مردے زندہ کرنے کا معجزہ عطا فرمایا۔ اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حنینِ جذع کا معجزہ مرحمت فرمایا یہاں تک کہ اس کھجور کے تنہ کے آہ و نالہ کی آواز کو سب نے سنا۔ یہ احیاءِ موتیٰ کے معجزے سے اعظم و اکبر ہے۔ بعد ازاں انہوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے ان علمائے حدیث کی گنتی بیان کی جنہوں نے اسے روایت کیا ہے اور ان کی اسانید و طرق اور روایات کا ذکر فرمایا ہے جو بہت طویل ہے۔

حنینِ جذع یعنی استنِ حنانہ کا بیان۔ مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد شریف کھجوروں کے تنوں پر مسقف تھی۔ منبر شریف کی تعمیر سے پہلے اس کے ایک تنہ سے ٹیک لگا کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دیا کرتے تھے۔ پھر جب منبر شریف بنایا گیا تو اسے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس تنہ سے رونے کی آواز سنی گئی۔ جیسے وہ اونٹنی روتی ہے، جس کا بچہ اس سے جدا کر دیا گیا ہو۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ اس کے رونے کی آواز سے ساری مسجد لرزنے اور کانپنے لگی اور اس کی بے قراری اور بے چینی کو دیکھ کر لوگوں کی بھی چیخیں نکل گئیں۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ تنہ پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک رکھا اور اسے چپٹا لیا وہ خاموش ہو گیا۔ اور فرمایا یہ تنہ اس وجہ سے روتا ہے کہ وہ ذکر خدا سے دور ہو گیا۔ اگر میں اسے نہ چپٹاتا تو وہ قیامت تک رسول اللہ کے اظہار غم و حزن میں یوں ہی روتا رہتا۔ پھر فرمایا کہ اسے منبر شریف کے نیچے دفن کر دیا جائے۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف رخ کر کے نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔ ایک اور روایت میں یہ ہے کہ اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف بلایا تو وہ زمین کو چیرتا ہوا حاضر ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے چپٹا لیا یہاں تک کہ وہ اس کے مقام میں پہنچا دیا گیا۔

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تنے سے فرمایا کہ اگر تو چاہے تو تجھے اس باغ میں بو دیا جائے جہاں تو پہلے تھا اور تیرے رگ و ریشے کو مکمل کر دیا جائے اور تیری شاخوں کو تروتازہ کر دیا جائے۔ اور تجھ سے پھل نمودار ہوں۔ اور اگر تو چاہے تو تجھے جنت میں جما دیا جائے تاکہ محبوبانِ خدا تیرے پھل کھائیں۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے اپنے مبارک کانوں کو اس کی جانب کیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ پھر فرمایا وہ کہتا ہے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے جنت میں قائم کر دیا جائے تاکہ محبوبان خدا کو اپنا پھل کھلاؤں۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں نہ میں پرانا ہوں گا اور نہ مجھے فنا ہوگی۔ ان باتوں کو ہر اس آدمی نے بھی سنا جو کہ اس کے قریب تھا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں یہی کرتا ہوں اور فرمایا تو نے دارِ فنا پر دارِ بقا کو پسند کیا۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ جب اس حدیث کو بیان کرتے تھے تو فرمایا کرتے اے خدا کے بندو! ایک لکڑی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شوق میں اتنا روتی ہے تو تم تو اس سے کہیں زیادہ مستحق ہو کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے لقا کے مشتاق بنو۔ بیت

بہ زاوی داں کہ درد معرفتی نیست — سنگے و گیا ہے کہ در و منفعتی ہست

اس حدیث کو بالفاظ مختلفہ بھی روایت کیا گیا ہے لیکن میں نے جتنا کچھ ذکر کر دیا ہے وہ کافی ہے۔

پہاڑ کا کلام کرنا۔ اس باب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پہاڑ سے کلام فرمانا اور اس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں کرنا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین جبل احد پر تشریف لے گئے۔ جبل احد مدینہ منورہ کا ایک پہاڑ ہے اور اس کی شان میں واقع ہے کہ: ۔ "اُحُدٌ جَبَلٌ یُحِبُّنَا وَنُحِبُّہٗ" (احد ایسا پہاڑ ہے جو ہمیں محبوب رکھتا ہے اور ہم اسے محبوب رکھتے ہیں) جب یہ تینوں حضرات قدس پہاڑ پر چڑھے تو پہاڑ کانپنے لگا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا پائے اقدس مار کر فرمایا اے احد اپنی جگہ قائم رہ تجھ پر ایک نبی ایک صدیق اور دو شہیدوں کے سوا کوئی نہیں۔ اسے امام احمد، بخاری، ترمذی اور ابو حاتم نے روایت کیا۔

ایک اور حدیث حضرت عثمان بن عفان ذوالنورین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کوہ "ثبیر" بروزن کبیر پر جو کہ منیٰ کا پہاڑ ہے تشریف فرما تھے اور آپ کے ساتھ حضرت ابو بکر صدیق، عمر فاروق اور میں تھا، وہ پہاڑ کانپنے لگا یہاں تک کہ اس کے سنگریزے گڑھوں میں لڑھکنے لگے۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا پائے اقدس مار کر فرمایا اے ثبیر اپنی جگہ قائم رہ! تجھ پر نبی و صدیق اور دو شہیدوں کے سوا کوئی نہیں۔ اسے بخاری، احمد، ترمذی اور ابو حاتم نے روایت کیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم "کوہ حرا" بکسر حاء مہملہ جو کہ مکہ مکرمہ کا پہاڑ ہے اس پر تشریف فرما تھے، نزول وحی سے قبل اسی پہاڑ پر مشغول عبادت رہتے تھے اور یہیں سب سے پہلے وحی نازل ہوئی تھی، اس پہاڑ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت ابو بکر عمر، عثمان و علی اور طلحہ و زبیر تھے۔ کوہ حرا نے جنبش کی اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے حرا آرام سے رہ، نہیں ہے تجھ پر مگر نبی یا صدیق یا شہید۔

حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی حدیث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر نہیں ہے اور ایک روایت میں حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ بن الجراح کے سوا تمام عشرہ مبشرہ کا ذکر ہے۔

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ جب قریش نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالبہ کیا تو "ثبیر" نامی پہاڑ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ مجھ پر سے اتر جائیے اس لئے کہ میں ڈرتا ہوں اگر دشمنوں نے آپ کو شہید کر دیا تو حق تعالیٰ مجھ پر عذاب فرمائے گا۔ اس پر کوہ حرا نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ مجھ پر تشریف لے آئیے۔ ثبیر اور حرا دونوں مکہ مکرمہ میں آمنے سامنے پہاڑ ہیں۔

علماء فرماتے ہیں کہ ان پہاڑوں کا کانپنا اس قسم کا نہ تھا جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر اس وقت واقع ہوا تھا جب وہ کلمہ میں تحریف و تبدیل کر رہے تھے ان پر پہاڑ کا لرزنا، جھنجھوڑنا اظہار غضب کیلئے تھا۔ یہاں پہاڑوں کا کانپنا طرب و مسرت کے لئے تھا اسی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام نبوت، صدیقیت اور شہادت کے ذریعہ وضاحت فرمائی۔ کیونکہ یہ موجب سرور اور استقرار جبال ہیں۔

کنکریوں کا تسبیح کرنا۔ اور اسی باب سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر کنکریوں کی تسبیح کرنا ہے جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مٹھی میں کنکریوں کو لیا۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں تسبیح کرنے لگیں۔ اور ہم نے انہیں تسبیح کرتے سنا۔ پھر ان کنکریوں کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دیا وہ برابر تسبیح کر رہی تھی۔ اس کے بعد جب یہ ہمارے ہاتھوں میں آئیں تو ان کی تسبیح بند ہو گئی۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے شفا شریف میں اسی کی مانند حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں میں بھی وہ اسی طرح تسبیح کر رہی تھیں اس اجمال کی تفصیل یہ ہے (جسے مواہب لدنیہ میں ذکر کیا گیا ہے) کہ ولید بن سوید بیان کرتے ہیں کہ قبیلہ بنی سلیم کا ایک بوڑھا شخص حضرت ابو ذر کے مکان پر آیا جو کہ ربذہ میں تھا۔ وہ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے کہ دوپہر کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تشریف فرما دیکھا۔ اور آپ کے پاس اس وقت کوئی شخص نہیں تھا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی حالت طاری ہے تو میں نے سلام عرض کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دے کر فرمایا "اے ابو ذر رضی اللہ عنہ! تمہیں کیا ضرورت یہاں لے کر آئی ہے؟" میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول زیادہ جاننے والے ہیں۔ پھر مجھ سے فرمایا "بیٹھ جاؤ۔" میں آپ کی ایک جانب بیٹھ گیا۔ اور میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ کچھ دریافت کیا اور نہ حضور نے مجھ سے کچھ دریافت کیا۔ کچھ دیر خاموشی کا عالم رہا۔ پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائے انہوں نے بھی سلام عرض کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دے کر فرمایا کس واسطے آئے ہو۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا مجھے خدا اور رسول خدا لایا ہے تو آپ نے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھ جانے کو فرمایا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو بیٹھ گئے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے ان سے بھی یہی معاملہ ہوا۔ اور وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پہلو میں بیٹھ گئے پھر حضرت عثمان آئے وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے برابر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریوں کے سات یا نو دانے یا کچھ کم و بیش دست مبارک میں لئے تو وہ کنکریاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں اتنی آواز سے تسبیح کرنے لگیں کہ ہم سب نے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی مانند اس تسبیح کو سنا۔ پھر ان کنکریوں کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور مجھے چھوڑ دیا۔ وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں بھی تسبیح کر رہی تھیں۔ پھر ان کو ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے لے کر زمین پر رکھ دیا تو وہ خاموش ہو گئیں۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دیا تو وہ ان کے ہاتھ میں تسبیح کرنے لگیں جیسا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں کر رہی تھیں۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دیا تو ان کے ہاتھ میں بھی ویسے ہی تسبیح کر رہی تھیں جیسے ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں۔ اس کے بعد ان کنکریوں کو زمین پر رکھ دیا تو وہ خاموش ہو گئیں۔ اس حدیث کو بزار نے روایت کیا ہے اور طبرانی نے اوسط میں اور بیہقی نے زہری سے روایت کیا اور طبرانی کی حدیث میں ہے کہ ابو ذر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ وہ کنکریاں ہمارے ہاتھ میں دی گئیں تو ان میں سے کوئی بھی تسبیح نہ کر رہی تھی۔ اسی کی مانند مواہب لدنیہ میں ہے۔ اور روضۃ الاحباب میں تمہید ابو شکور سلمی سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ بھی اس مجلس شریف میں تھے اور ان کے ہاتھ میں بھی وہ تسبیح کر رہی تھیں۔

تسبیح طعام: اسی باب سے طعام کا تسبیح کرنا ہے۔ چنانچہ بخاری میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے اور کھانے کی تسبیح کو سن رہے تھے۔ حضرت امام جعفر بن محمد باقر بن علی زین العابدین سلام اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے تو جبریل علیہ

السلام ایک طباق انگور و انار کا لائے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تناول فرمانے لگے تو وہ آپ کے دست مبارک میں تسبیح کرنے لگے۔
حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک روز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر مبارک پر آیہ کریمہ "وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حق قدرہ" اور یہود نے اللہ کی قدر نہ جانی جیسی چاہئے تھی۔ پڑھی اس کے بعد فرمایا۔ جبار و قہار اپنی ذات اقدس کی ثنا میں فرماتا ہے:۔ "اَنَا الْجَبَّارُ اَنَا الْجَبَّارُ اَنَا الْکَبِیْرُ الْمُتَعَالُ" تو اس پر منبر شریف اتنا لرزا کہ ہمیں خطرہ ہوا کہ کہیں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم منبر سے نیچے نہ آ رہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت تھے جنہیں سیسہ سے پتھر میں جمایا گیا تھا۔ پھر جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن مسجد حرام میں داخل ہوئے تو آپ کے دست مبارک میں ایک چھڑی تھی۔ آپ اس چھڑی سے انہیں چھوتے اور فرماتے جاتے "جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ" اشارہ مکمل بھی نہ ہوتا کہ بت سر کے بل گر پڑتے اور وہ سب کے سب آپ کے دست مبارک کے قہر و سلطنت سے ذلیل و خوار ہوئے۔
شیر خوار بچوں کا بولنا اور شہادت دینا:۔ اور اسی حکم میں شیر خوار بچوں کا بولنا اور ان سے اپنی رسالت کی شہادت لینا ہے حضرت معیقیب رضی اللہ عنہ یمامی سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں حجۃ الوداع میں تھا۔ میں اپنے گھر گیا تو وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جلوہ افروز دیکھا اور ایک عجیب بات مشاہدہ میں آئی کہ ایک یمامی شخص ایک نوزائیدہ بچے کو لایا جو اسی وقت پیدا ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بچے سے فرمایا میں کون ہوں؟ اس بچے نے کہا "اَنْتَ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" آپ اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔" اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ "صَدَقْتَ بَارَکَ اللّٰہُ فِیْکَ" تو نے سچ کہا اللہ تیری عمر میں برکت دے۔ اس کے بعد وہ بچہ نہ بولا۔ یہاں تک کہ وہ جوان ہو گیا۔ ہم نے اس بچے کا نام "مبارک الیمامہ" رکھا۔ فہد بن عطیہ سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک غلام کو لایا گیا جو قطعاً بات نہ کر سکتا تھا۔ یعنی گونگا تھا۔ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں کون ہوں؟ اس نے کہا آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اسے بیہقی نے روایت کیا ہے۔

بیماروں کو تندرست کرنا اور مردوں کو زندہ کرنا

وصل:۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک عورت اپنے لڑکے کو لائی اور عرض کیا یا رسول اللہ! میرا یہ بچہ دیوانہ ہے اور تکلیفیں پہنچاتا ہے۔ جب صبح و شام ہوتی ہے تو یہ میرا وقت خراب کرتا ہے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بچے کے سینے پر اپنا دست اقدس پھیرا، اس نے قے کی اور اس کے پیٹ سے ایک کالے رنگ کا کیڑا نکلا جو چلتا تھا اسے دارمی نے روایت کیا ہے۔ امام بوصیری رحمہ اللہ نے کیا خوب کہا ہے شعر۔

كَمْ اَبْرَأَتْ وَصِبًا بِاللَّمْسِ رَاحَتُهٗ ۔۔۔ وَاَطْلَقَتْ اَرِبًا مِنْ رِبْقَةِ اللَّمَمِ

قبیلہ بنی خثعم کی ایک عورت اپنے بچے کو جو بالکل گونگا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی طلب فرمایا۔ اور اس میں کلی فرمائی اور پھر دونوں دست مبارک دھوئے پھر وہ پانی اس بچے کو پلا دیا۔ وہ بچہ اسی وقت گویا اور سمجھدار بن گیا۔ اور تمام لوگوں سے بڑھ کر عقلمند ہو گیا۔
حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کی آنکھ پر روز احد چوٹ لگی۔ یہاں تک کہ آنکھ کا ڈھیلا نکل کر رخسار پر آ گیا۔ حضرت قتادہ

رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آئے اور عرض کرنے لگے یارسول اللہ میری ایک بیوی ہے جو مجھے بہت پیاری ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ زخمی اور مکروہ آنکھ کے ساتھ اس کے سامنے جاؤں۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے آنکھ کو پکڑ کر اس کے حلقے میں رکھا اور فرمایا اے خدا اس آنکھ کو خوب درست فرما دے۔ ان کی یہ آنکھ دوسری آنکھ سے زیادہ خوبصورت و بہتر اور بیناتر ہوگئی۔ جب کبھی دوسری آنکھ میں درد ہوتا تو یہ آنکھ اس سے محفوظ رہتی۔ حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کے ایک فرزند سے منقول ہے کہ وہ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئے تو انہوں نے اس سے پوچھا تم کون ہو؟ تو اس فرزند نے جواب دیا شعر:

أَبُوْنَا الَّذِيْ سَالَتْ عَلَى الْخَدِّ عَيْنُهُ فَرُدَّتْ بِكَفِّ الْمُصْطَفٰى أَيَّمَا رَدِّ

فَعَادَتْ كَمَا كَانَتْ لِأَوَّلِ أَمْرِهَا فَيَا حُسْنَ عَيْنٍ وَّيَا حُسْنَ مَا خَدِّ

اس پر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اسے انعام دیا اور اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کی۔

طبرانی اور ابونعیم حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں وہ بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے چہرے سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے انور کی تیروں کی بارش میں حفاظت کر رہا تھا۔ مطلب یہ کہ میں نے اپنے آپ کو حضور کے لئے ڈھال بنا رکھا تھا۔ بالآخر دشمن کا ایک تیر مجھے ایسا لگا کہ میری آنکھ حلقہ سے باہر نکل پڑی۔ میں نے اپنی آنکھ کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جانب دیکھا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میری آنکھ کو میرے ہاتھ میں ملاحظہ فرمایا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ آپ بارگاہ الٰہی میں دعا کرنے لگے اے خدا جیسے اس نے اپنے چہرے سے تیرے نبی کے روئے مبارک کی حفاظت کی ہے اور اسے زخم پہنچا ہے اب اس آنکھ کو اس کی دوسری آنکھ سے بہتر بنا دے۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک استسقاء کے مریض نے کسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے مرض کی شفایابی کیلئے بھیجا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مٹھی خاک دست مبارک میں لے کر اپنا لعاب دہن اس میں ڈالا اور اس فرستادہ کو دے دیا۔ وہ متعجب و حیران ہوا۔ اس نے گمان کیا کہ شاید اس سے استہزا فرمایا گیا ہے مگر وہ اس خاک کو لے کر مریض کے پاس پہنچا دیکھا کہ وہ تو مرنے کے قریب ہے اس نے جلدی سے وہ خاک اسے چٹائی۔ پھر وہ شفایاب ہوگیا۔

ایک اور شخص تھا جس کی دونوں آنکھیں سفید ہوگئی تھیں۔ اور اسے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی آنکھوں پر دم فرمایا جس سے اس کی دونوں آنکھیں ایسی روشن ہوگئیں کہ وہ اسی سال کی عمر میں بھی سوئی کے ناکہ میں ڈورا ڈال لیتا تھا۔ اس قسم کے بے شمار معجزات موجود ہیں۔

غزوۂ خیبر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کہاں ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا "موجود نہیں ہیں۔ انہیں آشوب چشم ہے۔" حضور نے کسی کو بھیج کر انہیں طلب فرمایا اور ان کا سر مبارک اپنی آغوش مطہر میں لے کر دونوں میں تفل یعنی لعاب دہن مبارک ڈالا اور دعا فرمائی چنانچہ وہ اسی وقت تندرست ہوگئے گویا کہ انہیں درد ہی نہ تھا پھر ان کی دونوں آنکھیں کبھی نہ دکھیں۔ روز خیبر ہی سلمہ بن اکوع کی ٹوٹی ہوئی پنڈلی پر تین بار دم فرمایا وہ اسی وقت ٹھیک ہوگئی اور پھر کبھی اس میں درد نہ ہوا اور زید بن معاذ رضی اللہ عنہ کے پاؤں پر اس وقت تلوار کا زخم آیا تھا جب کہ انہوں نے کعب بن اشرف کو مارا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تفل فرمایا یعنی تھتکارا۔ جس سے اسی وقت ٹھیک ہوگیا۔

صحیح بخاری میں مروی ہے کہ جب عبداللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ نے ابورافع یہودی کو قتل کیا تو چاندنی رات تھی۔ جب پاؤں زینہ

پر رکھا تو پھسل گیا اور زمین پر گر پڑے جس سے ان کی پنڈلی ٹوٹ گئی۔ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک ان کی پنڈلی پر پھیرا۔ وہ اسی وقت شفایاب ہوگئے۔ اس قسم کے واقعات و حکایات بہت کثرت کے ساتھ مشہور اور کتب حدیث میں مذکور و مسطور ہیں۔

احیائے موتیٰ: اب رہا مردے زندہ کرنے کے معجزات تو بیہقی نے دلائل میں روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو اسلام کی دعوت دی۔ اس شخص نے کہا میں اس وقت تک ایمان نہیں لاؤں گا جب تک آپ میری اس لڑکی کو جو مرچکی ہے زندہ نہ فرمائیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے اس کی قبر دکھاؤ۔ اس نے اس کی قبر دکھادی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اس شخص نے کہا میں نے ایک لڑکی کو وادی میں ڈال دیا ہے فرمایا مجھے وہ وادی دکھاؤ تو اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ وادی دکھا دی۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لڑکی کو آواز دی۔ لڑکی نے جواب میں کہا لبیک وسعدیک (حاضر ہوں فرماں بردار ہوں) پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کیا تو دنیا میں دوبارہ آنا پسند کرتی ہے اس نے کہا نہیں خدا کی قسم یارسول اللہ! میں نے آخرت کو دنیا سے بہتر پایا ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تیرے ماں باپ ایمان لاچکے ہیں اگر تو پسند کرے تو تجھے دنیا میں لوٹادوں؟ اس نے کہا مجھے ماں باپ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اپنے رب کو ان سے بہتر اور مہربان تر پایا ہے۔

اس حدیث کی روایت دلالت کرتی ہے کہ مشرکین کی اولاد پر (اگر وہ زمانہ فہم سے پہلے مرجائیں تو) عذاب نہیں ہے۔

اسی طرح حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے فرزندوں کو زندہ کرنے کا واقعہ ہے۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر مہمان بن کر تشریف لے گئے تھے حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ایک بکرا ذبح کیا تھا ان کے بڑے لڑکے نے یہ دیکھ کر کہ باپ نے بکرے کو کیسے ذبح کیا ہے اپنے چھوٹے بھائی کو لٹا کر گلے پر چھری پھیر دی۔ جب ان کی ماں نے یہ صورت حال دیکھی تو دوڑ کر ان کی طرف آنے لگیں۔ بڑے لڑکے نے جب یہ دیکھا کہ ماں آرہی ہے اس نے بالاخانہ سے چھلانگ لگادی وہ بھی گر کر مرگیا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں بیٹوں کو زندہ فرمایا اس کا تذکرہ شواہد النبوۃ میں مفصل مذکور ہے۔

اسی طرح احیاءِ ابوین شریفین ہے یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے والدین کریمین کو زندہ فرمانا اور ان کا ایمان لانا ہے۔ جیسا کہ احادیث میں آیا ہے لیکن محدثین ان حدیثوں کی صحت میں کلام کرتے ہیں اور بعض متاخرین انہیں ثابت کر کے درجہ اعتبار تک پہنچاتے ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک انصاری جوان تھا اس نے وفات پائی اس کی اندھی بوڑھی ماں تھی تو لوگوں نے اس جوان پر کپڑا ڈال دیا۔ اور اس کی ماں سے لوگ افسوس کرنے لگے۔ اس نے پوچھا کیا میرا لڑکا مرگیا؟ لوگوں نے کہا ہاں! وہ کہنے لگی خداوند! تو خوب جانتا ہے کہ میں نے تیری طرف اور تیرے نبی کی طرف اس امید پر ہجرت کی تھی کہ تو میری مدد فرمائے گا۔ اور ہر شدت و سختی میں میری فریادرسی کرے گا تو اے خدا مجھے اس مصیبت میں نہ ڈال۔ ابھی ہم وہاں سے ہٹے بھی نہ تھے کہ ہم نے مردے کے چہرے سے چادر کو اٹھا کر دیکھا تو وہ زندہ تھا۔ پھر اس نے ہمارے ساتھ کھانا کھایا۔ اسے ابن عدی، ابن ابی الدنیا، بیہقی اور ابونعیم نے روایت کیا ہے۔ یہ اس عورت کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں استغاثہ کرنے کی برکت تھی۔

اسی طرح وہ روایت ہے جو ابی بکر بن ضحاک نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے کی ہے مروی ہے کہ ایک انصاری مرد کا انتقال ہوگیا۔ جب لوگ تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر اٹھا کر لے جانے لگے تو اس نے کہا "محمد رسول اللہ"

اسی طرح مروی ہے کہ زید بن خارجہ رضی اللہ عنہ انصاری خزرجی اپنے والد کے ساتھ حاضر ہوئے تھے اور بیعتِ رضوان میں بھی

شریک تھے انہوں نے خلافت عثمانی میں وفات پائی تھی۔ انہوں نے بعد از انتقال کلام کیا اور ان کا کلام محفوظ کر لیا گیا انہوں نے کہا:۔

اَحْمَدُ اَحْمَدُ فِی الْکِتَابِ الْاَوَّلِ، صَدَقَ اَبُوْبَکْرِ الصِّدِّیْقُ الضَّعِیْفُ فِی نَفْسِہٖ الْقَوِیُّ فِیْ اَمْرِہٖ فِی الْکِتَابِ الْاَوَّلِ صَدَقَ صَدَقَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ فِی الْکِتَابِ الْاَوَّلِ صَدَقَ صَدَقَ عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ عَلٰی مِنْهَاجِهِمْ مَضَتْ اَرْبَعُ سِنِیْنَ وَبَقِیَتْ سَنَتَانِ، اَتَتِ الْفِتَنُ وَاَکَلَ الشَّدِیْدُ الضَّعِیْفَ وَقَامَتِ السَّاعَۃُ۔ کَذَا فِی جَامِعِ الاصولِ۔

مواہب لدنیہ میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت زید بن خارجہ رضی اللہ عنہ سرداران انصار میں سے تھے وہ مدینہ منورہ کی راہوں میں چلتے ہوئے ظہر و عصر کے درمیان کسی جگہ منہ کے بل گر پڑے اور ان کا انتقال ہو گیا۔ انصار عورتوں اور مردوں نے آکر رونا شروع کر دیا۔ اور وہ اسی حال پر رہے۔ یہاں تک کہ مغرب اور عشاء کے درمیان ایک آواز سنی جو کہہ رہی تھی خاموش رہو۔ اس کے بعد جب غور سے دیکھا تو چادر کے نیچے سے آواز آرہی تھی۔ انہوں نے ان کے چہرے اور سینے سے چادر اتار دی تو دیکھا وہ کہہ رہے تھے:۔

مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰہِ النَّبِیُّ الامی خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ لَا نَبِیَّ بَعْدَہٗ وَکَانَ ذٰلِكَ فِی الْکِتَابِ الْاَوَّلِ وَصَدَقَ صَدَقَ ھٰذَا رَسُوْلُ اللّٰہِ، اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ۔

اسے ابو بکر ابن ابی الدنیا نے کتاب "من عاش بعد الموت" میں روایت کیا ہے۔ انتہی۔

حضرت عبد اللہ بن عبید اللہ انصاری سے منقول ہے وہ روایت کرتے ہیں کہ میں اس جماعت میں شریک تھا جنہوں نے ثابت بن قیس بن شماس کو دفن کیا تھا۔ اور وہ مکمل طور پر وفات پا چکے تھے۔ اس وقت جب کہ انہیں قبر میں اتار دیا گیا تھا میں نے انہیں یہ کہتے ہوئے سنا "محمد رسول اللہ، ابو بکر الصدیق، عمر الشہید، عثمان بن عفان البر الرحیم" پھر جو میں نے غور سے دیکھا تو وہ مردہ تھے۔ اسی طرح الشفا میں مروی ہے۔

اگر کوئی شک کرے اور کہے کہ ممکن ہے کہ زندہ ہوں اور کوئی پردہ لاحق ہو گیا ہو اور نیز یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر واقع نہیں ہوا جسے معجزہ کہہ دیا جائے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مرنا دکھاوا نہیں ہے جسے چھپایا جا سکے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک اور آپ کی مدح و ثنا کرنے میں یہ دکھانا مقصود ہے کہ یہ سب کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت اور آپ کی عزت کے نتیجہ میں ہے۔ اگر کرامت بھی ہو تو یہ بھی حضور ہی کا معجزہ ہے۔

ابو نعیم نے نقل کیا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ایک بکری ذبح کر کے اسے سالم دم پخت کیا اور اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے پھر ساری جماعت نے کھایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم سب کھاؤ لیکن اس کی ہڈیاں نہ توڑنا۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب ہڈیوں کو جمع فرمایا اور ان پر اپنا دست مبارک رکھ کر کچھ پڑھا۔ تو کیا دیکھتے ہیں کہ بکری زندہ ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے کان ہلانے لگی۔

اور بعض ایسے کامل ترین اولیاء ہیں جو حضرت حق جل شانہ کی قدرت کے مظہر ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کے شرف سے آپ کے پرتو ہیں ان سے خارق عادات ظاہر ہوتے ہیں جیسے کہ لوگوں نے ایک مرغ کھایا۔ ایک بزرگ نے اس کی ہڈیوں کو جمع فرمایا اور ان پر اپنا دست مبارک رکھ کر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیا مرغ زندہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور چلا آیا۔ یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ہے۔

جاننا چاہئے کہ خیبر میں زہر آلود بکری کا کلام کرنے کو بعض علماء احیاء موتیٰ کے زمرہ میں شمار کرتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ ایسا کلام ہے جو حق تعالیٰ نے مردہ بکری میں پیدا فرمایا جس طرح کہ شجر و حجر میں حروف و آواز کو حق تعالیٰ پیدا فرماتا ہے۔ اور انہیں بغیر تغیر اشکال اور ان کی ہیئت صوری بدلے بغیر سنواتا ہے۔ شیخ ابو الحسن اور قاضی ابو بکر باقلانی کا مذہب یہی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ حیات کی تخلیق کی مانند پہلے انہیں پیدا کرتا ہے پھر انہیں قوت گویائی دیتا ہے اور ان کا ظاہر قول یہی ہے۔ (واللہ اعلم)

اجابتِ دعا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کے انواع واقسام میں اجابت دعا بھی ہے کتاب الشفاء میں کہا گیا ہے کہ یہ باب بہت وسیع ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی قبولیت کسی جماعت کے بارے میں خواہ نفع میں ہو یا ضرر میں بداہۃً متواتر المعنی ہے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کیلئے دعا فرماتے تو اس کا اثر بیٹوں، پوتوں، اور پرپوتوں تک پایا جاتا۔ اس باب میں سب سے زیادہ مشہور حدیث حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دعا فرمانا ہے۔ انہوں نے دس سال خدمت کی۔ اور ظاہری و باطنی انواع انعام واکرام سے مخصوص ہوئے ان کو ان کی والدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائیں اور عرض کیا یا رسول اللہ یہ آپ کا خادم انس (رضی اللہ عنہ) حاضر ہے۔ اس کیلئے دنیا کی فراغت کی دعا فرمایئے یوں تو دینی دعائیں اس بارگاہ کے ہر خاص وعام کیلئے موجود ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کیلئے دعا فرمائی اور کہا خداوند اس کے مال اور اس کے اولاد میں خوب برکت عطا فرما اور جو نعمتیں تو نے اسے دی ہیں اس میں بھی برکت زیادہ فرما۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم میرا مال بہت ہے اور میری اولاد سو بچوں سے زیادہ ہے اور ایک روایت میں آیا ہے کہ انہوں نے فرمایا میں کسی اور کو نہیں جانتا جسے زندگانی کی اتنی عیش وخوشی میسر ہو۔ جتنی کہ مجھے حاصل ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں اپنے ان دونوں ہاتھوں سے اپنی اولاد کے سو جسموں کو دفن کر چکا ہوں اور اسقاطِ حمل اور اولاد کی اولاد کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کے باغ کے کھجور سال میں دو مرتبہ پھل دیتے تھے۔

اسی باب میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کیلئے برکت کی دعا فرمانا ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ اگر میں کسی پتھر کو اٹھانے کا ارادہ کرتا تھا تو میں امید رکھتا تھا کہ اس کے نیچے سونا ہوگا۔ ان پر رزق کے دروازے کھول دیئے گئے تھے۔ حالانکہ جب انہوں نے ہجرت کی تھی تو مفلس تھے۔ ان کے پاس کچھ بھی موجود نہ تھا لیکن ان کے ترکہ میں سونے کو چھینیوں سے کاٹا گیا تھا۔ ان کی چار بیبیوں میں چوتھائی حق کے حساب سے ہر ایک کے حصے میں اسی ہزار اشرفیاں آئیں۔ ایک روایت میں ایک لاکھ ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کی مطلقہ بیوی سے کچھ اوپر اسی ہزار اشرفیوں پر صلح کی گئی۔ اور پچاس ہزار اشرفیوں کی وصیت کی گئی اور یہ سب ان بڑے بڑے خیرات وصدقات کے ماسوا ہے جو وہ اپنی زندگی میں کرتے رہے تھے چنانچہ وہ ایک ایک دن میں تیس غلام آزاد کیا کرتے تھے اور ایک مرتبہ تو انہوں نے اپنا پورا کاروان صدقہ کر دیا تھا اس کاروان میں سات سو اونٹ تھے جس میں ہر قسم کی جنس تھی۔ ان اونٹوں کو اس پر لدے ہوئے مال اور مع سازوسامان کے صدقہ کر دیا تھا۔ اس کاروان کے صدقے کرنے کا باعث یہ خبر تھی کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے انہیں بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں نے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو جنت میں ایک محل خریدتے دیکھا ہے اس کے شکرانہ میں انہوں نے پورے کارروان کو صدقہ کر دیا۔ (رضی اللہ عنہ)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امیر معاویہ بن ابو سفیان رضی اللہ عنہما کے لئے ملکوں پر حکومت کرنے کی دعا فرمائی تھی۔ چنانچہ انہیں امارت وحکومت ملی۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ فرمایا۔ "یَا مُعَاوِیَۃُ اِذَا مَلَکْتَ فَاسْجَحْ" اے معاویہ جب تمہیں حکومت دی

جائے تو اپنی عادت و خصلت کو نرم رکھنا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے اسی روز سے حکومت کی امید و خواہش ہوگئی تھی۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے لئے آپ نے دعا فرمائی جسے حق و تبارک و تعالیٰ نے قبول فرمایا۔ آپ نے جس کیلئے بھی اچھی دعا فرمائی وہ ضرور مستجاب ہوئی۔ اور دعا کو تیر سے تشبیہ دی گئی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعزاز اسلام کی خاطر حضرت عمر رضی اللہ عنہ یا ابو جہل کے لئے دعا فرمائی تھی یہ دعا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حق میں قبول کی گئی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب سے حضرت فاروق رضی اللہ عنہ ایمان لائے ہیں برابر اسلام کو عزت و غلبہ حاصل ہوتا رہا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غزوہ میں لوگوں پر پیاس کی بیتابی ہوئی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی استدعا کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی بادل نمودار ہوا اور سب کو پانی میسر آگیا۔ استسقاء میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور بارش کا نزول اور اس کا کھلنا مشہور و معروف ہے۔

نابغہ جعدی کے لئے دعا فرمائی:۔ "لَا يَفْضُضِ اللّٰهُ فَاكَ" یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے منہ کے دانتوں کو نہ توڑے تو ان کا کبھی ایک دانت بھی نہ اکھڑا۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ دانتوں کے معاملہ میں سب سے زیادہ خوش نصیب تھے۔ جب کوئی دانت گرتا تو دوسرا اس کی جگہ نمودار ہو جاتا وہ ایک سو بیس سال زندہ رہے۔ بعضوں نے اس سے بھی زیادہ کہا ہے۔ یہ نابغہ ان پرانے شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے اسلام قبول کیا ان کا ذکر آخر کتاب میں در ذکر شعراء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آئے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کیلئے دعا فرمائی:۔ "اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاوِيْلَ۔" خداوندا انہیں دین میں سمجھ دے اور تاویل میں ان کی مدد فرما۔ تو وہ حبر امت اور ترجمانِ قرآن کے نام سے مشہور و معروف ہوئے۔

اور حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کے لئے تجارت میں برکت کی دعا فرمائی تھی تو وہ جو بھی خریدتے اس میں انہیں خوب نفع ہوتا۔

اور مقداد رضی اللہ عنہ کیلئے برکت مال کی دعا فرمائی تو ان کے پاس بکثرت مال رہتا اور اسی طرح عروہ بن ابی الجعد کیلئے دعا فرمائی تھی۔ عروہ کہتے ہیں کہ میں بازار کے ایک گوشے میں کھڑا ہوتا تھا اور ایک دن میں چالیس چالیس ہزار نفع کماتا تھا۔ بخاری میں ان کی حدیث میں ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ اگر میں مٹی خریدتا تو مجھے اس میں بھی نفع حاصل ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی بھاگ گئی تھی آپ نے اسے بلایا اور آواز دی لیکن میں نے اسے پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیا۔ اس وقت آپ نے مجھے یہ دعا دی تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی والدہ کیلئے اسلام کی دعا فرمائی تو وہ فوراً مسلمان ہوگئیں۔ باوجودیکہ وہ پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت بدگوئیاں کرتی تھی۔

اور حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کیلئے دعا فرمائی کہ وہ گرمی و سردی سے محفوظ رہیں تو ان کی یہ حالت تھی کہ گرمی میں سردی کے اور سردی میں گرمی کے کپڑے پہنتے تو انہیں گرمی و سردی کچھ نقصان نہ پہنچاتی۔

اور سیدۃ نساء عالم فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے لئے دعا فرمائی کہ وہ کبھی بھوکی نہ ہوں۔ تو وہ اس کے بعد کبھی بھوکی نہ ہوئیں۔

اور طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی قوم کیلئے کوئی نشانی و کرامت مانگی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کیلئے دعا فرمائی اور کہا خداوندا انہیں نور عطا فرما تو ان کے دونوں آنکھوں کے درمیان ایک نور چمکنے لگا اس پر انہوں نے عرض کیا میں ڈرتا ہوں کہ لوگ اسے مثلہ یعنی برص خیال کرنے لگیں گے تو اسے بدل دیا گیا۔ اور وہ نور ان کے کوڑے کے دستہ میں آگیا اور رات کی تاریکی میں ان کا کوڑا روشنی دیتا تھا۔ اسی وجہ سے ان کا نام ذوالنور یعنی روشنی والے مشہور ہوگیا۔ اور قبیلہ مضر کے لئے دعا کی تو

وہ قحط میں مبتلا ہوگئے پھر قریش نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مہربانی کی خواہش کی تو دعا کی اور قحط دور ہوگیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسریٰ کیلئے دعا کی تھی (اس نے حضور کا مکتوب گرامی پھاڑ دیا تھا) کہ اس کا ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو تو اس کا کوئی ملک باقی نہ رہا۔ اور دنیا کے نقشے پر فارس کی ریاست ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کیلئے دعا کی جس نے آپ کی نماز قطع کی کہ اللہ تعالیٰ اس کی ٹانگوں کو توڑ دے تو وہ بیٹھا رہ گیا۔

ایک شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بائیں ہاتھ سے کھاتے دیکھا فرمایا داہنے ہاتھ سے کھا۔ اس نے کہا میں داہنے سے نہیں کھا سکتا حالانکہ یہ اس نے جھوٹ بولا تھا فرمایا کبھی تو داہنے ہاتھ سے نہ کھا سکے گا تو وہ اپنے داہنے ہاتھ کو کبھی نہ اٹھا سکا۔

اور عتبہ بن ابولہب کے لئے فرمایا خداوندا اپنے کتوں میں سے ایک کتا اس پر مسلط فرمادے، تو اسے شیر نے پھاڑ ڈالا۔

اور قریش کے ان لوگوں کیلئے جنہوں نے نماز کی حالت میں آپ کی گردن مبارک پر اوجھ رکھ دی تھی آپ نے بددعا کی تھی۔ مشہور ہے کہ غزوۂ بدر میں یہ سب کے سب مارے گئے اور حکم بن العاص نے ازراہ غرور و تکبر و استہزا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منہ چڑایا تھا اور اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں فرمایا تو ایسا ہو گا تو وہ ایسا ہی ہوگیا یہاں تک کہ وہ مرگیا۔ اور محلم بن جثامہ کیلئے بددعا فرمائی کہ اسے زمین قبول نہ کرے تو جب وہ قبر میں دابا گیا تو زمین نے اسے نکال باہر کیا۔ متعدد بار ایسا ہی ہوا بالآخر اس کی لاش کو دو گڑھوں کے درمیان رکھ کر دیواریں کھینچ دیں لیکن وہاں سے بھی اسے نکال پھینکا گیا۔

ابن عامر راہب پر بددعا کی کہ وہ یکہ و تنہا ذلیل و خوار مرے تو وہ ایسا ہی مرا (خدا اور اس کے رسول کے غضب و غصہ سے پناہ مانگنی چاہئے)

صاحب شفا قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔ یہ باب حصر و احاطہ کرنے سے باہر ہے۔

کرامات و برکات حضور صلی اللہ علیہ وسلم

وصل:۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں کو چھوا یا شرف قرب بخشا انہیں کرامات و برکات حاصل ہونے کے سلسلے میں صحیح حدیث میں مروی ہے کہ سیدہ اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک اطلسی جبہ نکالا اور فرمایا کہ اس جبہ شریف کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زیب تن فرمایا ہے۔ اور ہم بیماروں کے لئے اس کا دامن مبارک دھو کر پلاتے ہیں تو انہیں فی الفور شفا حاصل ہو جاتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک پیالہ تھا اس میں پانی ڈال کر بیماروں کو پلاتے تو انہیں شفا حاصل ہو جاتی۔

اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی ٹوپی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند موئے مبارک تھے وہ اسے پہن کر جس جنگ میں بھی شریک ہوتے تو انہیں فتح و نصرت حاصل ہوتی اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کے گھر کے کنویں میں اپنا لعاب دہن ڈالا تو بعد میں مدینہ طیبہ میں اس سے زیادہ شیریں پانی کسی کنویں کا نہ تھا۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی زمزم شریف کا ایک ڈول پانی نکال کر لایا آپ نے اس میں لعاب دہن ڈالا تو وہ مشک سے زیادہ خوشبودار ہوگیا۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا امام حسن و امام حسین کے منہ میں اپنی زبان مبارک دی انہوں نے اسے چوسا تو وہ خاموش ہوگئے حالانکہ اس سے پہلے پیاس سے وہ دونوں رو رہے تھے۔

اور آپ جن شیر خوار بچوں کے منہ میں اپنا لعاب دہن شریف ڈالتے تو یہ انہیں رات تک کافی ہوتا۔ اور وہ بھوک سے نہ بلکتے۔

اس کا تذکرہ حلیہ شریف میں گزر چکا ہے اور ام مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ ان کے پاس گھی کی ایک کپی تھی جس میں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گھی بھیجا کرتی تھیں تو جب تک انہوں نے اسے نچوڑا نہیں اس میں سے گھی برابر نکالتی رہیں۔ اور وہ کم نہ ہوتا تھا۔

اور اسی دستِ مبارک اور اس کے چھونے کی برکتوں سے یہ ہے کہ ایک یہودی کیلئے آپ نے کھجور کا درخت بو دیا وہ اسی سال پھل لے آیا۔

اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے قصہ میں ہے کہ یہودی مالک نے چالیس اوقیہ سونا اور تین سو کھجوروں کے درخت اگانے اور اس کے پھل لانے پر انہیں مکاتب کیا ان تین سو درختوں میں سے ایک کے سوا سب نے پھل دیئے۔ اور وہ درخت بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور نے بویا تھا۔ ابن عبدالبر بیان کرتے ہیں کہ غالبًا۔ اسی ایک درخت کو شاید حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بویا تھا۔ اور امام بخاری فرماتے ہیں کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے بویا تھا۔ ممکن ہے کہ دونوں نے مل کر اسے بویا ہو۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اکھیڑ کر دوبارہ بویا تو وہ اسی سال پھل لے آیا اور مرغی کے انڈے کے برابر سونا لے کر زبان مبارک سے مس فرما کر اس یہودی کو چالیس اوقیہ دے دیا۔ اس کے بعد اس سونے کی ڈلی سے چالیس اوقیہ کے برابر سونا باقی رہ گیا۔ اس طرح حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ مکاتبت سے آزاد ہوئے۔

اور حنش بن عقیل رضی اللہ عنہ (ایک صحابی) فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ستو کا شربت پلایا۔ اس میں سے کچھ پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پی لیا تھا اور آخر کار مجھے عنایت فرمایا تھا اور میں نے پیا۔ اس کے بعد ہمیشہ جب کبھی بھوک لگتی اپنے میں سیرابی پاتا رہا اور جب گرمی معلوم ہوتی اور پیاس کی شدت ہوتی تو خنکی و ٹھنڈک محسوس کرتا۔

آپ کی انہیں برکات سے بکریوں کے دودھ کے واقعات ہیں مثلاً ام معبد اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی بکریوں کا قصہ اور دائی حلیمہ سعدیہ جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضعہ ہیں ان کی بکری اور ان کے اونٹ کا قصہ یا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس بکری کا قصہ جسے ابھی تک نر نے چھوا تک نہ تھا۔ اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کی بکری کا قصہ وغیرہ۔

آپ کی انہیں برکات میں سے یہ ہے کہ آپ نے اپنے صحابہ کو ایک مشکیزہ کا منہ باندھ کر سفر کے لئے توشہ دیا اور دعا فرمائی۔ جب نماز کا وقت آیا تو وہ اترے اور اس مشکیزہ کو کھولا تو دیکھا اس میں نہایت شیریں دودھ ہے اور اس کا جھاگ دہانے پر موجود ہے۔

اور عمر بن سعد کے سر پر اپنا دست مبارک پھیرا اور برکت کی دعا کی تو ان کی اسی۸۰ سال کی عمر ہوئی مگر ہنوز جوان تھے۔ اور بحالت جوانی ہی جہان سے گذرے۔ صاحب شفا فرماتے ہیں کہ اس قسم کے بے شمار قصص و حکایات روایت کی گئی ہیں۔

اور قیس بن زید جذامی کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا فرمائی چنانچہ سو سال کی عمر میں جب کہ ان کا تمام سر سفید تھا مگر وہ حصہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دستِ مبارک پھیرا تھا سیاہ تھا اور عابد بن عمرو روز حنین مجروح ہو گئے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے چہرے کو پاک و صاف فرما کر دعا فرمائی۔ تو ان کا چہرہ ہمیشہ چمکا کرتا تھا۔ اور "غر" ان کا نام پڑ گیا۔ اور ایک اور شخص کے چہرے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دستِ مبارک پھیرا تھا تو اس کا چہرہ ہمیشہ نورانی رہتا تھا۔

اور عبدالرحمٰن بن زید بن خطاب کے سر پر دستِ مبارک پھیرا۔ وہ کوتاہ قد تھے حالانکہ ان کے والد طویل القامت تھے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کیلئے برکت کی دعا مانگی تو لوگوں میں ان کا سر طویل، حسین، جمیل اور خوبصورت ہو گیا۔

سیدہ زینب بنت ام سلمہ کے چہرے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی کے چھینٹے دیئے تو ان کا چہرہ ایسا حسین و جمیل ہو گیا کہ کوئی اور

غورت ایسے حسن و جمال کی دیکھی نہ گئی کہتے ہیں کہ یہ پانی کے چھینٹے مارنا از روئے مزاح و ہزل تھا۔ تعالیٰ اللہ جب آپ کے مزاح و ہزل کا یہ حال ہے تو عزم و کوشش اور قصد و ارادہ کی کیا تاثیر ہوگی۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اور حضرت حنظلہ بن جذیم رضی اللہ عنہ کے سر پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک رکھا اور برکت کی دعا فرمائی تو ان کا یہ حال تھا کہ وہ لوگ جن کے چہرے متورم ہوتے آتے یا ان بکریوں کو لایا جاتا جن کے تھن متورم ہو جاتے تو حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ اس مقام سے مس کراتے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دست مبارک رکھا تھا۔ اور اسی وقت ان کا ورم جاتا رہتا۔

ایک اور بچے کے سر پر دست مبارک پھیرا۔ اس کے سر میں گنج تھا وہ اسی وقت ٹھیک ہو گیا اور اس کے بال برابر ہو گئے اور دوسرے بچے جو بیمار و دیوانہ لائے جاتے اور کوئی بچہ بھی کہ جسے دیوانگی اور آسیب ہوتا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سینے پر دست مباک مارتے تو اس کی دیوانگی اور آسیب جاتا رہتا۔

اور عتبہ بن فرقد رضی اللہ عنہ ایک شخص تھا جس کی بیویاں تھیں اور وہ سب ایک دوسرے سے بڑھ کر خوشبوئیں ملا کرتی تھیں لیکن عتبہ رضی اللہ عنہ کی خوشبو ان سب پر غالب رہتی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عارضۂ نملہ کی وجہ سے اس کے شکم اور پشت پر اپنا دستِ مبارک پھیرا تھا۔

اور آپ کے دستِ مبارک کے عظیم ترین معجزات میں "روز حنین" ایک مٹھی خاک لے کر کفار کے چہروں پر پھینکنا اور ان شریروں کی آنکھوں میں ڈالنا ہے اور کفار کے غلبہ پانے کے بعد اس معجزے کی وجہ سے ان کو ہزیمت اٹھانا اور بھاگ کھڑا ہونا پڑا۔ اور اس سے اسلام کو کامیابی کی راہ نصیب ہوئی۔

اور حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سواری کرنے کے بعد آپ کی برکت سے اس میں تیزی و سبک رفتاری پیدا ہو گئی باوجودیکہ آپ کی سواری سے پہلے وہ گھوڑا انتہائی تنگ گام اور سست رفتار تھا۔ پھر وہ ایسا ہوا کہ چلنے اور مقابلہ کرنے میں کوئی گھوڑا اس کی مماثل نہ تھا۔

اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے اونٹ میں تیزی اور سبکی کا بعد سستی و ماندگی کے پیدا ہونا بایں وجہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے سبز ٹہنی کھلائی تھی۔ پھر اس کی یہ حالت ہوئی کہ لگام سے اس روکا نہ جا سکتا تھا۔

اسی طرح حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے سست رفتار دراز گوش (گدھے) پر سوار ہونا پھر واپسی کے وقت ترکی گھوڑے کی مانند اس میں تندی و تیزی کا پیدا ہونا ہے اور کوئی جانور اس کی رفتار کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔

اور حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ گھوڑے کی پشت پر بیٹھ نہیں سکتے تھے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینہ پر دستِ مبارک مارا تو وہ عرب میں سب سے بڑھ کر گھوڑ سوار اور جم کر بیٹھنے والے بن گئے۔

انہیں برکتوں میں سے یہ ہے کہ عکاشہ رضی اللہ عنہ کو بدر میں ان کی تلوار ٹوٹ جانے کے بعد درخت کی ٹہنی دے دی گئی اور وہ ٹہنی شمشیر براں بن گئی۔ پھر اس سے عکاشہ ہمیشہ ہر مواقف و مشاہد میں قتال کرتے رہے یہاں تک کہ وہ مرتدین سے جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ انہوں نے اس تلوار کا نام "عون" یعنی مددر رکھا تھا۔ اسی طرح جب روز احد عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو کھجور کی ٹہنی دی گئی تو وہ اس سے ان لوگوں کو قتل کرتے رہے جن کے ہاتھوں میں تلوار تھی۔

اور قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کو اندھیری رات میں کھجور کی ٹہنی دینا اور اس کا راستہ میں روشن ہو جانا اور انہیں یہ خبر دینا کہ جب تم گھر پہنچو گے تو اس میں سیاہی دیکھو گے تو اس سے سیاہی کو جھاڑ دینا کیونکہ وہ شیطان ہے۔ چنانچہ جب وہ گھر پہنچے تو اس سیاہی کو جھاڑ

کر پھینک دیا۔

اور یہ کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا حدیث کو بھول جانے کی شکایت کرنا اور انہیں چادر پھیلانے کا حکم فرمانا پھر اپنا دستِ مبارک اس چادر پر رکھنا اور ملا کر اٹھانے اور سینے سے لگانے کا حکم فرمانا اور انہیں دستِ مبارک کی برکت سے حفظِ علوم کا حاصل ہونا مشہور ہے۔

اطلاع بر علوم غیبیہ

وصل:۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روشن ترین معجزات میں آپ کا غیب پر مطلع ہونا اور جو کچھ آئندہ ہونے والا ہے ان علوم غیبیہ کی خبر دینا ہے۔ اصالۃً اور بالذات علم غیب، اللہ تعالیٰ عزاسمہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیونکہ وہی علام الغیوب ہے اور وہ علم غیب جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک اور آپ کے بعض متبعین سے ظاہر ہوا ہے خواہ وحی کے ذریعہ ہو یا الہام سے۔ اس کے متعلق حدیث پاک میں آیا ہے کہ فرمایا:۔ "وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَا اَعْلَمُ اِلَّا مَا عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ۔" خدا کی قسم میں اپنے آپ سے کچھ نہیں جانتا مگر وہ سب کچھ جس کا میرے رب نے مجھے علم مرحمت فرمایا۔

علامہ قاضی عیاض رحمہ اللہ شفا میں فرماتے ہیں کہ اقتضائے مانی الباب یہ ہے کہ ذاتی طور پر آپ کو یہ علم حاصل نہ تھا۔ اور قطعی و یقینی طور پر باعطائے الٰہی آپ کو علم تھا اور یہ علم بحدِ تواتر پہنچ چکا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مغیبات کی خبریں دینا دو قسم کی ہیں ایک تو یہ کہ قرآن کریم ناطق و شاہد ہے مطلب یہ کہ قرآن کریم گذشتہ و آئندہ کی خبریں دیتا ہے اور گزشتہ و موجودہ امتوں کے احوال اور زمانہ حال کی باتیں بتاتا ہے اور مخلوق کے مبدء و معاد کے احوال کی اطلاع بخشتا ہے۔

اور دوسری قسم یہ ہے کہ جو آئندہ ہونے والا ہے۔ ان کا تذکرہ حدیثوں میں آچکا ہے۔

اب رہا یہ کہ جو کچھ قرآن کریم میں ارشاد ہے تو ان میں سے ایک تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے معارضہ قرآن کے وقت اس کی خبر دینا ہے کہ کوئی بھی قرآن کی مانند ایک سورۃ بھی نہیں لا سکتا۔ جیسا کہ فرمایا:۔ "وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ" یعنی جو ہم نے اپنے بندۂ خاص پر اتارا ہے اگر تمہیں اس میں شک ہے تو تم اس کی مانند ایک سورۃ ہی لے آؤ۔ پھر حق تعالیٰ نے فرمایا:۔ "وَلَنْ تَفْعَلُوْا اَوْلَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ" تم ہرگز نہ کر سکو گے اور اس کی مانند نہ لا سکیں گے۔ چنانچہ ان کافروں پر اس خبر کی صداقت ظاہر ہو گئی۔ جیسا کہ اس کا بیان "اعجاز قرآن" کے ضمن میں گزر چکا ہے۔ اور انہیں قرآنی غیبی خبروں میں سے ایک یہ ہے جسے قصہ بدر کے سلسلے میں ارشاد فرمایا کہ:۔

وَاِذْ یَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ۔

اور جب اللہ نے تمہیں وعدہ دیا تھا کہ ان دونوں گروہوں میں ایک تمہارے لئے ہے اور تم یہ چاہتے تھے کہ تمہیں وہ ملے جس میں کانٹے کا کھٹکا نہ ہو۔

قریش کے دو گروہ یعنی قافلے تھے ان میں سے ایک میں غنیمت و مال زیادہ تھا اور کانٹا یعنی خطرات کم تھے۔ اور دوسرا قافلہ اس کے برعکس تھا اور مسلمان اس قافلہ سے بھڑنا چاہتے تھے جس میں غنیمت زیادہ تھی اور خطرات بھی کم تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے جو ان کے دلوں میں تھا اس کی خبر دی اور فتح و کامرانی اور اپنی نصرت و مدد کا ان سے وعدہ فرمایا۔ یہ سب باتیں دشمن سے مڈبھیڑ ہونے سے پہلے کی ہیں۔ تو یہ سب غیوبات کی قسم سے ہیں۔ مکمل واقعہ، قصہ بدر کے ضمن میں آئے گا۔

اور انہیں قرآنی اخبار بالغیب میں سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ : ۔ " سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ " عنقریب کفار کی جماعت پراگندہ ہو کر پیٹھ پھیر کر بھاگے گی ۔ یہ آیہ کریمہ بھی کفار قریش کے اظہار حال میں ہے ۔ اور اس کا ظہور روز بدر میں ہوا ۔ باوجودیکہ ان کی عددی طاقت ہزار سے زیادہ اور ہر قسم کے ساز و سامان سے مسلح تھی اور مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ سے متجاوز نہ تھی ان کے پاس صرف دو گھوڑے تھے ایک حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس دوسرا حضرت مقداد کے پاس ۔ اس کے باوجود حق تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد فرمائی ۔ اور ان کے بڑے بڑے کافر سرداروں کے قتل پر قدرت دی اور ان کے ساز و سامان کو غنیمت بنایا ۔

اور انہیں قرآنی اخبار بالغیب میں سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ " سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ ۔ " بہت جلد ہم ان کافروں کے دلوں میں رعب ڈالیں گے ۔ یہ روز احد کفار مکہ کی حالت کے اظہار میں ہے باوجودیکہ اس روز انہیں یک گونہ غلبہ ہو چلا تھا مگر حق تعالیٰ نے ان کے دلوں پر ایسا رعب و شوکت ڈالا کہ وہ مکہ کی جانب لوٹ پڑے ۔ اور لوٹتے ہوئے ابو سفیان جو کہ اس وقت مشرکین مکہ کا سردار تھا آواز بلند کہنے لگا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر تم چاہو تو آئندہ سال مقام بدر میں پھر نبرد آزمائی ہوگی ۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر خدا نے چاہا تو ۔ کفار و مشرکین مکہ لوٹ جانے کے بعد راستے میں پشیمان ہوئے اور انہوں نے ارادہ کیا کہ پلٹ کر دوبارہ حملہ کر کے مسلمانوں کا استیصال و خاتمہ کر دیں مگر حق تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا ۔ وہ پلٹ نہ سکے اور مکہ چلے گئے ۔

اور انہیں قرآنی اخبار بالغیب میں سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ : ۔ " وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ فِي بِضْعِ سِنِينَ (الی قولہ) لَا يُخْلِفُ اللَّهُ وَعْدَهُ ۔ " یہ لوگ اپنا غلبہ پانے کے بعد بہت جلد چند سالوں میں مغلوب ہوں گے ۔ (یہاں تک کہ) اللہ اپنے وعدہ کا خلاف نہیں کرتا ۔ اس آیتِ کریمہ کا شان نزول ، قیصر و کسریٰ کی جنگ ہے ۔ جب کسریٰ نے قیصر پر غلبہ پالیا تو مشرکین مکہ کسریٰ کی محبت میں بڑے خوش ہوئے کیونکہ کسریٰ آتش پرست مجوسی تھا اور کتاب نہ رکھتا تھا ۔ اور قیصر نصرانی اور اہل کتاب میں سے تھا ۔ مشرکین مکہ کہنے لگے کہ ہمارے بھائی یعنی مجوسی ، تمہارے بھائی یعنی اہل کتاب پر غالب آ گئے اسی طرح ہم بھی تم مسلمانوں پر غالب آ جائیں گے ۔ مگر سات سال بعد جس سال حدیبیہ کا غزوہ ہوا کسریٰ پر قیصر غالب آ گیا اور فارسیوں اور مجوسیوں کو نکال باہر کیا ۔

اور انہیں قرآنی اخبار بالغیب میں سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ

وَلَا يَتَمَنَّوْنَهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ۔ اور وہ یہودی کبھی اس کی موت آرزو نہ کریں گے ان کرتوتوں کے سبب جو ان کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں ۔

اس آیہ کریمہ میں حق تعالیٰ نے اس کی خبر دی ہے کہ یہودی کبھی بھی موت کی تمنا نہ کریں گے نہ دل سے اور نہ زبان سے ۔ باوجودیکہ اس پر انہیں قدرت حاصل ہے ۔ لہٰذا یہ سب کی سب ایسی غیبی خبریں ہیں کہ جیسا فرمایا گیا ویسا ہی ہو کر رہا ۔ اس لئے کہ اگر انہوں نے موت کی تمنا کی ہوتی تو منقول ہوتا ۔ اور اس کی شہرت بھی ہوتی ۔ اور ایک مرفوع حدیث میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر وہ تمنا کرتے تو اسی وقت مر جاتے ۔ اور روئے زمین پر ایک یہودی باقی نہ رہتا ۔ اگر آئندہ بھی وہ ایسی تمنا کریں گے تو انشاء اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی پاداش میں اسی وقت مر جائیں گے ۔ گویا کہ وہ اس کے معترف ہیں کہ اگر تمنا کریں گے تو مر جائیں گے ۔

اسی طرح حق تعالیٰ نے یہود کے بارے میں ارشاد فرمایا ۔ " ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ " یہودیوں پر ذلت و خواری مسلط کر دی گئی ۔ چنانچہ یہودی ہر زمان و مکان میں ذلیل ترین کافر ہیں جیسی کہ خبر دی گئی ۔

اور انہیں قرآنی اخبار بالغیب میں سے حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ :-

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ — اللہ نے وعدہ دیا ان کو جو تم میں سے ایمان لائے اور اچھے کام کئے کہ ضرور انہیں زمین میں خلافت دے گا۔ جیسی ان سے پہلوں کو دی......

یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وعدہ ہے کہ آپ کی امت میں سے زمین میں خلفاء لوگوں کے امام اور صاحبانِ امر و صلاح بنائے گا اور ان کے ذریعہ ممالک صلاح پائیں گے۔ اور خدا کے بندے خدا کے حضور عاجزی و انکساری کریں گے۔ اور خوف و خطرہ کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں مامون و بے خوف بنا کر قوی بنائے گا اور ضعف و بے چارگی کے بعد انہیں حاکم کرے گا بلاشبہ حق تعالیٰ نے اپنے وعدہ کو پورا کر دیا۔ "وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ۔" اور اللہ سے بڑھ کر ایفائے وعدہ کرنے والا کون ہے (وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ)

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس جہاں سے اس وقت تک تشریف نہیں لے گئے جب تک کہ حق تعالیٰ نے مکہ مکرمہ خیبر اور بحرین، باقی جزیرہ عرب اور زمین یمن کو مکمل نہ فتح کرا دیا اور اطراف شام کے بعض حصوں کے مجوسیوں سے جزیہ لیا اور ہرقل شاہ روم اور حاکم مصر و اسکندریہ کہ مقوقس نام ہے انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیشکش اور ہدایا بھیجے۔ اور عمان و نجاشی ملک حبشہ کے بادشاہ ایمان لائے۔ اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جہان سے کوچ فرمایا اور حق تعالیٰ نے آپ کیلئے وہ پسند فرمایا جو اس کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و کرامت کے لائق تھا تو آپ کے بعد قیام امر آپ کے پہلے خلیفہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ انہوں نے اصلاح احوال کر کے ان لوگوں کو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پریشان اور ست ہو کر بکھر گئے تھے انہیں جمع کر کے قوی بنایا اور ایسی شجاعت بروئے کار لائے جس کا بڑے سے بڑا صحابہ میں سے کوئی ایک بھی مقابلہ کی تاب نہ رکھتا تھا اور ان فتنوں سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا تھا وہ سب توقف کی ہی رائے دے رہے تھے مگر انہوں نے ہمت و شجاعت کی کمر باندھی اور جزیرۂ عرب کو پیٹ کے رکھ دیا اور فارس کے ممالک میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں اسلامی عساکر روانہ کر دیئے۔ انہوں نے فتوحات کے جھنڈے گاڑ دیئے اور دوسرا لشکر حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں زمین شام کی طرف روانہ کر دیا اور تیسرا لشکر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں مصر کی جانب بھیج دیا تو شام کے لشکر نے ان کے زمانے میں بصریٰ، دمشق اور ان کے نزدیکی ممالک خوران وغیرہ میں فتح حاصل کی، پھر حق تبارک وتعالیٰ نے ان کو بھی اس جہان سے بلالیا اور ان کیلئے وہ پسند فرمایا جو اپنی رحمت و منت سے اس کے نزدیک بہتر تھا۔ اور اسلام و مسلمانوں پر خدا نے اس الہام کے ذریعہ کرم و احسان فرمایا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قیام امر کیلئے اپنے بعد حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین و خلیفہ نامزد فرما دیا تو آپ کے بعد سیرت کی قوت اور عدل کے کمال میں مکمل طریق پر قیام امر ہوا اور بلادِ شام مکمل طور پر اور دیارِ مصر آخر تک اور اکثر بلادِ فارس فتح ہوا۔ اور کسریٰ کی شوکت کو توڑ دیا۔ اسے انتہائی ذلیل و خوار کیا۔ اور اس کے ممالک کے تمام گوشوں پر قبضہ فرما دیا۔ قیصر روم کو بلاد شام سے نکال باہر کیا۔ اور قسطنطنیہ تک فتح یابی کے پھریرے اڑا دیئے اور ان ممالک کے اموال کو راہِ خدا میں مسلمانوں کے درمیان تقسیم فرما دیا۔ اور ویسا ہی ہوا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی تھی اور وعدہ فرمایا تھا۔ اس کے بعد خلافت عثمانیہ میں ممالک اسلامیہ کا سلسلہ مشرقی کناروں تک پھیل گیا اور ان کے زمانہ خلافت میں اندلس، قیروان سبتہ اور اس کے متصل بحرِ محیط کو فتح کر کے مشرقی کناروں میں بلاد چین تک اسلامی سرحدات وسیع ہو گئیں اور کسریٰ کو

مار کر ہلاک کیا اور مکمل طور پر اس کی حکومت فنا کر دی۔ مدائن، عراق خراسان اور اہواز کو فتح کیا اور مسلمانوں نے ترکوں سے زبردست جنگ کی اور مشرق و مغرب سے خراج آنے لگا۔ یہ سب قرآن عظیم کی تلاوت اور اس کی برکت سے ہوا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کی بہت زیادہ اور بے مثال خدمت کی ہے اور ان پر اکثر و بیشتر بلاد اسلامیہ مفتوح ہوئے۔ ان کے بعد خلیفہ مطلق، امام برحق سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ ہوئے لیکن لوگوں نے ان کی قدر و منزلت کو نہ پہچانا اور خلاف و نزاع کی روش کی جانب چل دیئے اور ان کی مخالفت پر کمر باندھ لی۔ (فانا للہ وانا الیہ راجعون)

اور تورپشتی جو کہ فقہ و حدیث کے علماء میں سے حنفی المذہب گزرے ہیں اپنی کتاب عقائد میں لکھا ہے کہ سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے مخالفوں کے تین گروہ ہیں ایک وہ جو ان کو پہچان نہ سکا۔ دوسرا وہ جو دنیا کی محبت میں مبتلا رہا تیسرا وہ جس نے اجتہاد میں خطا کی اور فرماتے ہیں کہ سیدہ عائشہ صدیقہ، حضرت طلحہ و زبیر وغیرہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں ایسا گمان واعتقاد نہ رکھنا چاہیے۔

انہیں قرآنی اخبار بالغیب میں سے حق تعالیٰ سبحانہ کا یہ ارشاد ہے کہ:۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ — وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا کہ اسے سب دینوں پر غالب کرے۔

یہ ارشاد بالکل ظاہر و عیاں ہے کہ دینِ اسلام جیسا کہ خبر دی گئی تمام دینوں پر غالب ہے۔

انہیں قرآنی اخبار بالغیب میں سے حق سبحانہ و تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ — جب اللہ کی مدد اور فتح آئے اور لوگوں کو تم دیکھو کہ اللہ کے دین میں فوج فوج داخل ہوتے ہیں۔

تو حضور اکرم سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس جہان سے اس حال میں تشریف لے گئے کہ بلادِ عرب میں کوئی مقام ایسا نہ تھا جہاں اسلام کا حکم داخل نہ ہو چکا ہو۔ (وللہ الحمد)

اور اخبار بالغیب کی وہ دوسری قسم جو کہ حدیثوں میں مروی ہیں ان میں سے ایک وہ روایت ہے جسے حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن خطبہ دیا اور اس میں کوئی ایسی چیز جو قیامت تک ہونے والی ہے بیان کرنے سے نہ چھوڑی۔ اس میں سے کسی کو کچھ یاد رہا اور کسی نے کچھ بھلا دیا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی چیز کو بظاہر بھلا چکے ہوتے ہیں لیکن جب وہ سامنے آتی ہے اور اسے دیکھتے ہیں تو جان لیتے اور بات یاد آجاتی ہے جیسے کہ وہ شخص جس کا چہرہ عرصہ تک غائب رہا ہو مگر وہ سامنے آتا ہے تو اسے پہچان لیا جاتا ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں یہ گمان نہیں کرتا کہ میرے ساتھیوں نے ان باتوں کو جان بوجھ کر بھلا دیا ہے بلکہ خدا کی قسم انہیں بھلا دیا گیا ہے۔ یقیناً قیامت تک اٹھنے والے ہر ایک فتنہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خوب واضح اور صاف صاف بیان فرما دیا یہاں تک کہ فتنہ گروں کے نام ان کے باپوں کے نام اور ان کے قبیلوں کے نام تک بیان فرما دیئے۔ ابتداءً فتنہ گروں کی تعداد تین سو تک ہوگی۔ لیکن ان کے پیرو کاروں کی کوئی حد نہیں۔

(۲) حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے کوئی چیز بیان کرنے سے نہ چھوڑی حتیٰ کہ وہ پرندہ جو آسمان میں بازو پھیلاتا ہے اس کا علم بھی ہم سے بیان فرما دیا۔

(۳) صحیح مسلم میں بروایت سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ ذکر دجال کے باب میں مذکور ہے کہ مسلمانوں کو دس سواروں کا رسالہ پہنچے گا۔ میں ان کے ناموں اور ان کے باپوں کے ناموں کو جانتا ہوں۔ اور ان کے گھوڑوں کی رنگتوں کو بھی پہچانتا ہوں۔ وہ روئے

زمین پر بہترین گھوڑ سوار ہوں گے۔

(۴) اور بلاشبہ ائمہ حدیث نے احادیث صحیحہ میں بیان فرمایا ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو خبردار کر دیا اور ان سے دشمنوں پر غلبہ پانے، مکہ مکرمہ، بیت المقدس، یمن، شام، عراق کے فتح ہونے اور راہ میں ایسا امن وامان کا وعدہ فرمایا ہے کہ اگر کوئی عورت تنہا حرہ یمن سے مکہ کی جانب سفر کرے تو اسے بجز خدا کے کسی کا خوف نہ ہو گا۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ اور مدینہ منورہ میں قیام فرمانا اور حق تعالیٰ کا آپ کی امت پر دنیا کو فتح کرانا اور قیصر و کسریٰ کے خزانوں کا ان میں تقسیم ہونا۔ اور کسریٰ و فارس کے جانے کے بعد نہ کسریٰ ہو گا نہ قیصر، اس کی خبر دینا تو کسریٰ اور اس کا ملک تو مکمل طور پر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ جیسا کہ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب گرامی کو پارہ پارہ کیا تھا۔ اور قیصر نے شام سے راہ فرار اختیار کی اور اس کے ممالک اسلامی سرحدوں میں شامل ہو گئے اور مسلمانوں نے اس کے دیگر ممالک کو فتح کیا۔ اور یہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ہوا۔ جیسا کہ آئندہ بھی ذکر آئے گا۔

اور یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنوں کے پیدا ہونے، خواہشات کے پیرو بننے اور گزشتہ یہود و نصاریٰ کی روش پر چلنے اور امت کے تہتر فرقوں میں بٹنے اور ایک فرقہ کی نجات پانے اور عیش و عشرت کے خوگر ہونے اور صبح و شام جدا جدا لباس پہننے، زرق برق پوشاکیں پہننے۔ گھروں میں اچھے فرش و فروش بچھانے، چھت گیریاں اور دیواروں پر پردے لٹکانے جیسے کہ خانہ کعبہ میں لٹکے ہوئے ہیں۔ اترا اترا کر چلنے اور قسم قسم کے کھانے پکانے اور فارس و روم کی لڑکیوں کی مانند عورتوں سے خدمت لینے کی خبر دی ہے اور فرمایا جب وہ ایسا کریں گے تو حق تعالیٰ ان پر عذاب برپا کرے گا اور ان میں جنگ و جدال برپا ہو گا۔ اور نیکوں کی جگہ بد لوگ لے لیں گے۔ اور نیک لوگوں کو ان کے درمیان سے اٹھا لے گا اور خبر دی کہ یہ وقت اور زمانہ بہت تیزی سے گزرے گا۔ اور قرب قیامت علم اٹھ جائے گا اور اہل علم دنیا سے اٹھ جائیں گے اور فتنے ظاہر ہوں گے اور ہرج مرج رونما ہو گا جس کی ابتداء واقعہ عثمان رضی اللہ عنہ سے واقعہ حرہ تک ہے۔ اور واقعہ حرہ شناعتوں میں سب سے بدتر شنیع واقعہ ہے۔ جو کہ یزید کے زمانے میں رونما ہوا۔ اور ہم نے تاریخ مدینہ میں اسے بیان کیا ہے۔

اور مسیلمہ کذاب کے فتنہ و فساد کی خبر دی گئی اور اس کی ردت (قبول نہ کرنا) سے ڈرایا گیا اور فرمایا عرب پر افسوس ہے کہ اس کا نشان قریب آ گیا ہے اور فرمایا میرے لئے زمین کو لپیٹا گیا اور مجھے اس کے مشارق و مغارب دکھائے گئے۔ اور وہ زمانہ نزدیک ہے کہ جہاں تک مجھے زمین کو لپیٹ کر دکھایا گیا وہاں تک میری امت کا قبضہ ہے۔ اور اس طرح مشرق و مغرب میں مابین ارض ہند کے حکومت دراز ہو گی جو کہ اقصائے شرق سے بحر طنجہ تک ہے جس کے بعد کوئی عمارت یا آبادی نہیں ہے۔ اور گزشتہ امتوں میں سے کسی حکومت کی حکومت اتنی دراز نہ ہوئی نہ جنوب میں اور نہ شمال میں۔

اور فرمایا اہلِ غرب ہمیشہ حق پر رہیں گے یہاں تک کہ قیامت قائم ہو۔ اہلِ غرب سے مراد بعض عرب لیتے ہیں، اس کیلئے غرب بعین معجمہ وسکون راء بمعنی دلو یعنی ڈول کے ہیں اور عرب ڈول سے پانی دینے میں مخصوص ہیں۔ کذا قیل۔ اور بعض اہلِ غرب سے مغربی بلاد مراد لیتے ہیں کیونکہ ان میں کے اکثر لوگ حق پر قائم ہیں اور بعض روایتوں میں اہلِ مغرب بھی واقع ہوا ہے۔ یہ روایت معنوی اعتبار سے بھلائی اور خیر کے معنی میں ہے۔ اور ایک اور حدیث میں بروایت ابی امامہ رضی اللہ عنہ آیا ہے کہ میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر قائم اور دشمنان دین پر قاہر و غالب رہے گی یہاں تک کہ حکم رب یعنی قیامت آ جائے ان کا حال ہمیشہ حق پر ہی ہو گا۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ لوگ کہاں ہوں گے؟ فرمایا بیت المقدس میں۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی امیہ کی حکومت اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ولایت کی خبر دی۔ اور فرمایا آگاہ رہو آخر عمر میں تم میری امت کے حاکم ہوگے اور جب حاکم بنو تو نیکوں کی صحبت اختیار کرنا اور بدوں سے دور رہنا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے اسی دن سے امید ہو گئی تھی کہ میں ملک داری میں مبتلا ہوں گا۔ مواہب لدنیہ میں منقول ہے کہ ابن عساکر نے بیان کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا معاویہ رضی اللہ عنہ کبھی بھی مغلوب نہ ہوں گے اور حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ روز صفین فرماتے تھے کہ اگر میں اس حدیث کو پہلے سنتا تو میں ہرگز معاویہ رضی اللہ عنہ سے جنگ نہ کرتا۔ (واللہ اعلم)

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی والدہ سے فرمایا کہ تمہارے شکم میں لڑکا ہے وہ پیدا ہو تو اسے میرے پاس لے آنا۔ چنانچہ بچے کی پیدائش کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت فرمائی۔ اور اپنا لعاب مبارک انہیں چٹایا اور ان کا نام عبداللہ رضی اللہ عنہ رکھا اور فرمایا کہ یہ ابوالخلفا ہیں۔ اور عرب پر ترکوں کے غالب آنے کی خبر دی۔ اور بنی عباس رضی اللہ عنہما کے سیاہ جھنڈے کے ساتھ نکلنے اور ان کے ملک میں پہنچنے اور زیادہ علاقہ پر قبضہ کرنے اور اہل بیت رسول علیہ السلام کو دیکھتے ہی قتل کرنے، شدت و سختی کرنے کی خبر دی۔

اور سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے شہید ہونے کی خبر دی۔ اور فرمایا قوم کا وہ شخص بدبخت و بدتر ہے جو ان کے سر اور داڑھی کو خون سے لت پت کرے گا۔ اور فرمایا کہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ جنت اور دوزخ کے تقسیم کرنے والے ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کو جنت میں اور اپنے دشمنوں کو جہنم میں داخل کریں گے اور یہ ان خبروں پر مبنی ہے جو دیگر حدیثوں میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فضائل میں مروی ہیں۔ اور کتاب الشفا میں کہا گیا ہے کہ علی مرتضیٰ کے دشمن خارجی، ناصبی اور روافض کی وہ جماعت ہے جو ان کی طرف نسبت کرتی ہے۔ علماء اس کی تکفیر کرتے ہیں۔ (کذا ذکرہ فی الشفا)

اور حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام سے انہیں ایک قسم کی مشابہت ہے کیونکہ یہود حضرت عیسیٰ کو دشمن جانتے اور ان کی والدہ ماجدہ پر بہتان دھرتے ہیں اور نصاریٰ محبت کا دعویٰ کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ انہیں اس مرتبہ تک لے جاتے ہیں جو ان کے لائق نہیں۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا میرے بارے میں دو گروہ ہلاک ہوں گے ایک محب مفرط، جو کہ میری تعریف اس حد تک کرے گا جو مجھ میں نہیں ہے اور دوسرا مبغض، کہ جو مجھ سے عداوت رکھے اور مجھ پر بہتان باندھے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر دی اور فرمایا کہ اس حال میں شہید ہوں گے کہ وہ تلاوت قرآن کر رہے ہوں گے۔ اور کہتے ہیں کہ بالآخر ان کا خون قرآن کریم کی آیہ کریمہ۔ "فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ۔" پر گرا اور فرمایا کہ یہ ظلماً شہید کئے جائیں گے۔ اور خبر دی کہ حق تعالیٰ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ایک قمیص پہنائے گا اور لوگ چاہیں گے وہ اپنے جسم شریف سے اس قمیص کو اتار دیں۔ (قمیص پہنانے سے مراد خلافت ہے) ایک روایت میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ جب حق تعالیٰ تمہیں قمیص پہنائے تو تم پر لازم ہے کہ تم اسے اپنے جسم سے نہ اتارنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جنت کی بشارت دی اور اس امتحان کی خبر دی جو انہیں پہنچا۔

اور فرمایا جب تک حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ زندہ ہیں فتنے ظاہر نہ ہوں گے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شہید کئے جانے کی خبر دی اور فرمایا وہ شہید ہوں گے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے جنگ کرنے اور اس کے بعد ان کے پشیمان ہونے کی خبر دی۔ اور ازواج نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کسی ایک مقام پر "حواب" میں جو کہ مکرمہ اور بصرہ کے درمیان

ایک موضع ہے کتوں کے بآواز بولنے اور وہاں مقتولوں کے انبار لگنے کی خبر دی۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر یہ حال گزرا جب کہ وہ بصرہ کی طرف جارہی تھیں۔ جسے واقعہ "جمل" کہتے ہیں۔

اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو خبر دی کہ انہیں باغی قتل کریں گے تو ان کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے قتل کیا۔ اور یہ خبر تواتر کے قریب ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تم سے لوگوں کو افسوس ہے اور لوگوں سے تم کو افسوس ہے چنانچہ حجاج کے حکم سے ایسا ہی ہوا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا تم اپنی آنکھ کی بصارت گم کر دو گے پھر روز قیامت حق تعالیٰ اسے تمہاری طرف لوٹائے گا۔

اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر دی اور غزوۂ موتہ کی جنگ میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے فتح پانے کی خبر دی۔ حالانکہ موتہ ایک ماہ کی مسافت پر ہے۔

اور قرمان (بضم قاف وسکون راء " ایک شخص تھا جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آیا تو اس کے جہنمی ہونے کی خبر دی اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک جنگ میں اس نے اتنی پامردی سے جنگ لڑی کہ لوگ حیران رہ گئے اور غالباً بعض صحابہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کے بارے میں جہنمی ہونے کی خبر دینے پر شک بھی گزرا۔ بالآخر وہ زخموں سے چور چور ہو گیا اور تکلیف سے بے تاب ہو گیا تو اس نے اپنی تلوار سے اپنے آپ کو مار ڈالا۔ جب لوگوں نے اس کی خبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچائی تو فرمایا۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت سے فرمایا جن میں حضرت ابو ہریرہ، سمرہ بن جندب اور حذیفہ رضی اللہ عنہم تھے کہ ان میں سے آخری مرنے والا شخص دنیاوی آگ سے جل کر مرے گا۔ تو ان سب میں آخری مرنے والے حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ تھے جو کہ بہت بوڑھے اور ناتواں تھے وہ بدن کو گرم رکھنے کیلئے آگ تاپتے تھے بالآخر اسی آگ نے ان کی جان لے لی۔ اور غزوۂ احد میں حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا کہ فرشتے انہیں غسل دے رہے ہیں فرمایا ان کی بیوی سے دریافت کرو کہ حقیقت حال کیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ وہ جنبی تھے انہیں غسل کی حاجت تھی۔ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے جب یہ سنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت معرکہ درپیش ہے تو ان کو غسل کی فرصت نہ ملی وہ اسی حالت میں اٹھ کر چل دیئے اور شہید ہو گئے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ان کے سر سے پانی کے قطرے ٹپکتے دیکھے ہیں۔ اور خبر دی کہ ثقیف میں کذاب اور مبیر ہوں گے چنانچہ ان دونوں صفتوں کے شخص پائے گئے۔ کذاب مختار بن عبید کو کہتے ہیں اور مبیر بمعنی مہلک وقتال، حجاج بن یوسف کو۔ مختار کا قصہ اسماء الرجال کی کتابوں میں دیکھنا چاہئے۔

اور سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا کہ میرا یہ فرزند سید ہے اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا اور اس قصہ کا مصدق حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مصالحت ہے جیسا کہ مشہور ہے۔

اور سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے بارے میں خبر دی کہ میرے اہل بیت میں سے یہ سب سے پہلے مجھ سے ملیں گی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے رحلت فرمانے کے آٹھ مہینے یا چھ مہینے بعد وفات پائی (رضی اللہ عنہا)

اور فرمایا میری ازواج میں سب سے پہلے مجھ سے ملنے والی وہ زوجہ ہے جس کے ہاتھ دراز ہیں۔ اس سے مراد ام المومنین سیدہ

زینب رضی اللہ عنہا ہیں کہ ان کے ہاتھ کاروبار اور صدقہ دینے میں دراز تھے (آخر حدیث تک)۔

اور سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کے مقام طف میں شہید ہونے کی خبر دی اور نشانی بھی دی کہ انہیں کلبِ ابقع قتل کرے گا۔ اس کا نام شمر بن ذی الجوشن تھا اور اپنے دستِ مبارک میں سے تھوڑی سی خاک نکال کر فرمایا یہ ان کے مقتل کی مٹی ہے۔

اور خبر دی کہ میرے بعد خلافت (مسلسل) تیس سال ہوگی اس کے بعد ملوکیت و بادشاہت ہوگی۔ اور ایک روایت میں "ملک عضوض" فرمایا اس امر کی ابتداء نبوت و رحمت ہے۔ اس کے بعد خلافت پر رحمت ہے پھر ملک عضوض (کاٹنے والا)، اس کے بعد عبون و جبروت اور فساد ہوگا۔ اور اس کے ظہور کی خبر دی اس کے بعد ایک سینگ نکلے گا۔ اور امراء کو نشانی دی کہ نماز کی ادائیگی میں تاخیر وقت سے کام لیں گے اور فرمایا آخر زمانہ میں میری امت میں تیس دجال کذاب پیدا ہوں گے۔ اور ان میں چار عورتیں بھی ہوں گی اور ان میں کا ہر ایک خدا اور اس کے رسول پر جھوٹ باندھے گا۔ ان کا آخر دجال کذاب ہوگا یعنی وہ جو آخیر زمانے میں نکلے گا۔ اور ایک جگہ آیا ہے کہ وہ سب کے سب نبوت کا دعویٰ کریں گے۔

اور فرمایا عنقریب تم میں بکثرت عجمی لوگ ایسے ہوں گے جو تمہاری گردنوں کو ماریں گے۔ اور قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ قحطان کا ایک شخص جو تم پر حاکم و بادشاہ ہوگا وہ لوگوں کو اپنی لاٹھی سے نہ مارے۔

اور فرمایا

خَيْرُكُمْ قَرْنِي ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ۔

تم میں سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے پھر وہ جو اس کے متصل ہے۔ پھر وہ جو اس کے متصل ہے پھر وہ جو اس کے متصل ہے۔ اس سے مراد صحابہ، تابعین اور تبع تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا زمانہ ہے اور بخاری کی ایک روایت میں بطریق شک راوی چار مرتبہ آیا ہے۔ اس کے بعد جھوٹ پھیل جائے گا۔

اور ایک روایت میں آیا ہے کہ لوگ از خود آکر گواہی دیں گے بغیر اس کے کہ انہیں گواہی کیلئے بلایا جائے اور خیانت کریں گے اور امانت ادا نہیں کریں گے اور وعدہ کریں گے مگر اسے پورا نہیں کریں گے۔

اور فرمایا کوئی زمانہ ایسا نہیں مگر یہ کہ دست درازی اور ظلم و تشدد کے بعد اس سے بدتر آئے۔ علماء کرام، حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے زمانے سے اس کی نقیض لاتے ہیں۔ کیونکہ ان کا زمانہ آل مروان کے ظلم و تشدد کے دور کے بعد آیا۔ اور جواب دیتے ہیں کہ یہ حکم باعتبار اغلب ہے۔

اور فرمایا میری امت قریش کے بچوں کے ہاتھ پر ہلاک ہوگی (اس سے مراد یزید وغیرہ ہیں) اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جو اس حدیث کے راوی ہیں فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں چاہوں تو ان کا نام بنام بیان کر دوں مگر میں نہیں چاہتا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یہ بھی فرمایا کرتے کہ "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ اِمَارَةِ السِّتِّيْنَ" میں اللہ سے ۶۰ ہجری کی حکومت سے پناہ مانگتا ہوں (جو کہ یزید کی تخت نشینی کا سن ہے) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس جہان سے ۶۰ ہجری سے پہلے ہی رحلت کر گئے۔

اور خبر دی کہ فرقہ قدریہ، مرجیہ، رافضیہ اور خوارج ظاہر ہوں گے اور خوارج کے بارے میں فرمایا وہ بہترین گروہ سے نکلیں گے بہترین گروہ سے مراد علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں۔ اور فرمایا کہ ان کی نشانی یہ ہے کہ ان میں ایک سیاہ رنگ کا آدمی ہوگا جسے "ذوالثدیہ" کہیں گے اور اس کا ایک بازو عورت کی پستان کی مانند ہے جسے وہ حرکت دے گا اور گھمائے گا اور ان کے سر منڈے ہوں گے۔ اور ان سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ جنگ کریں گے ایک اور حدیث میں آیا ہے اگر میں

انہیں پاتا تو عاد و ثمود کی مانند انہیں ہلاک کرتا۔

اور خبر دی کہ آنے والے لوگ پچھلوں کو برا بھلا اور گالیاں دیں گے جیسا کہ روافض کرتے ہیں۔

اور فرمایا کہ دین کے مدد گار کم ہو جائیں گے یہاں تک کہ آٹے میں نمک کی مانند رہ جائیں گے اور ان میں ہمیشہ تشتت وافتراق رہے گا۔ اور اس افتراق سے کوئی جماعت نہ بچے گی۔ اور ان پر "اثرہ" (چناؤ) ہو گا یعنی ان کے امراء و حکام لوگوں پر جبر و تشدد اور دراز دستی کریں گے اور جبراً حکومت وولایت کو اختیار کریں گے اور دوسروں کے ساتھ ایسی رعایت کریں گے جو اپنوں کے ساتھ نہ کریں گے اور شمنی، شرح شفا میں یعمری سے نقل کرتے ہیں کہ "یہ اثرہ" حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تھا۔

اور خبر دی کہ آخر زمانے میں لوگ انتہائی ذلیل اور کمینہ خصلت ہوں گے۔ بکریوں کو چرائیں گے ننگے بدن اور ننگے پاؤں رہیں گے۔ اور اپنی عمارتوں کو اونچا بنائیں گے۔ اور اس میں باریاں اور کھڑکیاں رکھیں گے۔ یہ کثرت مال وزر اور عیش پرستی سے کنایہ ہے۔

اور خبر دی کہ قریش اور احزاب حضور کے ساتھ غزوہ نہ کریں گے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ غزوہ کرتے تھے۔ اور یہ غزوۂ خندق میں فرمایا۔ کیونکہ اس کے بعد کفار قریش ہمارے سروں پر جنگ نہ لا سکیں گے چنانچہ ایسا ہی واقع ہوا۔

اور بیت المقدس کی فتح کے بعد وقوعِ موتان کی خبر دی۔ لفظ "موتان" بضم میم وسکون واؤ اور لغت میں فتح سے بھی آیا ہے اس کے معنی وبا اور طاعون کے ہیں اور لفظ موتان کا اکثر استعمال مویشی کے مرنے پر ہوتا ہے مگر ظاہر مطلب وہ عام طاعون ہے جو امیر المومنین سیدنا عمر بن خطاب کے زمانے میں پھیلا تھا۔ کہتے ہیں کہ تین دن میں ستر ہزار آدمی طاعون سے مرے تھے۔ (واللہ اعلم)۔

اور بصرہ کے آباد ہونے کا وعدہ فرمایا۔ اور ایک صحابی کو بشارت دی کہ وہ سمندر میں جنگ کریں گے جس طرح بادشاہ تختوں پر بیٹھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس کا وقوع حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں امیر المومنین سیدنا عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں ہوا۔

اور خبر دی کہ اگر دین ثریا پر معلق ہو جائے تو ابنائے فارس کے لوگ اسے پالیں گے۔ کچھ لوگ اسے حضرت سلمان فارسی وغیرہ حضرات پر محمول کرتے ہیں۔ اور کچھ لوگ اسے حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ اور ان کے تلامذہ پر محمول کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کی اصل ابنائے فارس سے ہے اور ایک روایت میں "رَجُلٌ مِّنْ فَارِسٍ" آیا ہے (واللہ اعلم)۔

اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ طیبہ کے ایک ایسے عالم کی خبر دی جس کا اتباع علماء کی ایک جماعت کرے گی۔ کہتے ہیں کہ اس سے مراد حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ اس سے مراد مدینہ طیبہ میں عالم کا وجود ہے۔ کہ اس زمانہ میں دوسرا کوئی نہیں ہو گا جیسا کہ سیاق حدیث اس پر دلالت کرتی ہے حالانکہ یہ خبر بعد والوں کے لئے ہے۔

اور عالم قریش کی خبر دی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ "لَا تَسُبُّوْا قُرَيْشًا فَاِنَّ عَالِمَهَا يَمْلَأُ طِبَاقَ الْاَرْضِ عِلْمًا" قریش کو برا نہ کہو کیونکہ ان کا ایک عالم جہان بھر کو علم سے بھر دے گا۔ امام احمد وغیرہ کا یہ مذہب ہے کہ اس سے مراد امام شافعی ہیں اور جورقانی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث لاتے ہیں کہ:۔ "يَكُوْنُ فِيْ اُمَّتِيْ رَجُلٌ يُقَالُ لَهُ اَبُوْحَنِيْفَةَ هُوَ سِرَاجُ اُمَّتِيْ۔" میری امت میں ایک شخص ہو گا جسے ابو حنیفہ کہیں گے وہ میری امت کا آفتاب ہے۔

"تنزیہ الشریعہ" میں کہا گیا ہے کہ امام احمد کی حدیث کی سند میں جوبیاری ہے اور اس کا راوی مامون سلمی ہے ان دونوں میں سے کسی ایک نے اس حدیث کو وضع کیا ہے اور صاحب "سفر السعادۃ" فرماتے ہیں کہ امام شافعی اور امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہما کے فضائل و ان کے ذم کے باب میں کوئی روایت درجہ صحت کو نہیں پہنچتی۔ اس باب میں جو کچھ مروی ہے وہ موضوع ومنکر ہے (واللہ اعلم)

اور خبر دی کہ میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر قائم رہے گی یہاں تک کہ حکم خدا یعنی قیامت آجائے۔

اور خبر دی کہ اللہ تعالیٰ ہر صدی کے شروع میں ایسا مجدد پیدا فرمائے گا جو دین کی تجدید کرے گا اور الامثل فالامثل کے جانے کی خبر دی اور حاکم نے بلفظ الخیر فالخیر روایت کر کے صحیح کہا ہے اور بعض غزوات میں تند و تیز ہوا چلنے کی خبر دی اور فرمایا کہ یہ ہوا مدینہ منورہ میں ایک منافق کے مرنے کے سبب چلی ہے۔ جب غزوہ سے واپس پہنچے تو ایسا ہی پایا۔

ایک اور شخص کے بارے میں خبر دی کہ اس نے مال غنیمت میں سے یہودی کے ایک منکہ کی خیانت کی ہے وہ اس کی جائے رہائش سے بر آمد ہوا۔ اسی طرح ایک شخص کو چادر چرانے کی خبر دی اور وہ چادر اس کے سامان میں سے بر آمد ہوئی۔

اور ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی کی گم شدگی کا پتہ فرمایا فلاں وادی میں اس کی مہار ایک درخت کی شاخ سے لپٹی ہوئی ہے۔

اور صحابہ کرام کو خبر دی کہ اہل مکہ کا لکھا ہوا خط لے جایا جارہا ہے اور نشان بتایا کہ اس قسم کی ایک عورت فلاں وادی میں جارہی ہے اس سے وہ خط بر آمد کرلو۔ چنانچہ علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ ایک دو ساتھیوں کے ساتھ اس عورت کی تلاش میں نکلے۔ اور اسے اسی جگہ پایا جہاں کا آپ نے نشان و پتہ بتایا تھا۔ یہ قصہ کتب احادیث میں مذکور و مسطور ہے اور سورۂ ممتحنہ کا شان نزول بھی یہی قصہ ہے۔

اور حضور نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو اس مال کی خبر دی جو اپنی بیوی ام الفضل کے سپرد کر کے چلے تھے اور اس کی خبر ان کو اور ان کی بیوی کے سوا کسی کو نہ تھی۔ پھر وہ اسلام لے آئے جیسا کہ غزوۂ بدر میں انشاء اللہ آئے گا۔

اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے اس وقت جب کہ ان پر موت کی سی کیفیت طاری تھی فرمایا ممکن ہے کہ تم اس سے نجات پالو اور زندہ رہو یہاں تک کہ تم سے ایک قوم نفع پائے یعنی مسلمان اور دوسری قوم نقصان اٹھائے یعنی کفار۔ گویا انہیں طویل عمر پانے کی بشارت دی اور وہ عشرہ مبشرہ میں سب کے آخر میں انتقال فرمانے والے تھے اور ۵۵ھ یا ۵۷ھ میں رحلت فرمائی اور بعض کہتے ہیں کہ ۵۸ھ میں وفات پائی۔

اور خبر دی کہ ابی ابن خلف میرے ہاتھ پر مارا جائے گا۔ اور فرمایا کہ عتبہ بن ابو لہب کو اللہ کا کوئی کتا کھائے گا۔ چنانچہ اسے شیر نے کھایا اور بدر کے دن کفار کے قتل ہو کر گرنے کی جگہ پر نشانات لگا کر بتلایا اور وہ ٹھیک اسی جگہ مر کر گرے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نشان لگائے تھے۔

اور نجاشی کے انتقال کی خبر اس دن دی جس دن کہ وہ حبشہ میں فوت ہوئے اور جنازہ گاہ میں تشریف لے جاکر چار تکبیروں کے ساتھ نماز جنازہ ادا فرمائی۔

اور فیروز دیلمی کو جب کہ وہ کسریٰ کا قاصد بن کر آیا تھا اسی دن کسریٰ کے مرنے کی خبر دی جب فیروز نے اس کی تحقیق کی تو اسلام لے آیا۔

اور حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کو خبر دی کہ لوگ انہیں مدینہ منورہ سے نکال دیں گے جب کہ وہ ایک دن مسجد نبوی میں سو رہے تھے۔ فرمایا اے ابو ذر تمہارا اس وقت کیا حال ہوگا جب کہ تمہیں لوگ اس مسجد سے نکالیں گے۔ عرض کیا میں مسجد حرام میں اقامت گزیں ہو جاؤں گا فرمایا جب تمہیں وہاں سے بھی نکال دیں گے تو (آخر حدیث تک) اور انہیں خبر دی کہ تم یکہ و تنہا زندگی گزارو گے اور اسی حالت میں وفات پاؤ گے اور حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کا "ربذہ" جانے کا واقعہ جہاں وہ قیام پذیر تھے اور وہاں اس جہان سے رخصت ہونے کا قصہ مشہور ہے اور کتب سیر میں مذکور ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ آخر کتاب میں حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کے ذکر میں آئے گا۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پہاڑ سے فرمانا کہ قائم رہ، نہیں ہیں تجھ پر مگر نبی وصدیق اور شہید۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت ابو بکر و عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم تھے۔ یہ بھی مشہور ہے اور حضرت سراقہ سے یہ فرمانا کہ اس وقت تمہارا کیا حال ہو گا جب کہ تم اپنے دونوں ہاتھوں میں کسریٰ کے سونے کے کنگن پہنو گے تو جب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کسریٰ کے اموال آئے اور ان میں اس کے کنگن بھی تھے تو حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں میں وہ دونوں کنگن پہنائے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر کی تصدیق کیلئے اس وقت حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا حمد ہے اس خدا کی جس نے کسریٰ کے ہاتھوں میں سے چھین کر سراقہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں میں پہنائے۔

اور دجلہ و دجیل کے درمیان ایک شہر آباد ہونے کی خبر دی۔ اس سے مراد بغداد کا شہر ہے۔ اور فرمایا کہ اس امت میں ایک شخص پیدا ہو گا جسے لوگ ولید کہیں گے وہ اس امت کا بدترین شخص ہو گا اور یہ اپنی قوم کا فرعون ہو گا۔

اور فرمایا کہ اس وقت تک قیامت نہ ہو گی جب تک کہ دو گروہ آپس میں نہ لڑیں اور دونوں کا ایک ہی دعویٰ ہو گا۔ یعنی دونوں مسلمان ہوں گے۔ علماء فرماتے ہیں اس سے مراد واقعہ صفین ہے۔ اور قاضی ابو بکر بن العربی فرماتے ہیں کہ یہ پہلا معاملہ ہے جو اچانک اسلام میں داخل ہوا اور قرطبی فرماتے ہیں کہ وہ پہلا حادثہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اسلام کو درپیش ہوا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سلسلہ وحی ختم ہوا اور عرب وغیرہ میں ردت کا فتنہ ظاہر ہوا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت سے فتنہ کی تلوار بے نیام ہوئی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ اس کے بعد قضاو قدر الٰہی سے جو ہوا وہ عیاں ہے۔

اور سہیل بن عمرو قریش کے سرداروں میں سے تھا اور ان کا خطیب تھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر سب وشتم کرتا رہتا تھا روز بدر جب وہ قید ہو کر سامنے آیا تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کے دانتوں کو توڑ دوں۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا عنقریب یہ ایسے مقام پر کھڑا ہو گا کہ اے عمر رضی اللہ عنہ تم اس سے خوش ہو جاؤ گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا وہ اسلام لا کر مکہ مکرمہ میں رہنے لگا جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت اور سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کی خبر پہنچی تو اس نے خطبہ دیا اور مسلمانوں کے دلوں کو ثابت وقوی اور ان کی بصیرتوں کو روشن کر دیا۔

اور ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ کیا خوب زندگی گزاری اب موت بھی شہادت کی پاؤ گے تو وہ یمامہ میں مسیلمہ کذاب کی لڑائی میں شہید ہوئے۔

اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے فرمایا جب کہ انہیں "اُکَیْدَرْ" (بضم ہمزہ وفتح کاف وسکون یا) جو کہ ایک نصرانی کا نام تھا اس کی طرف بھیجا کہ تم اسے نیل گائے کا شکار کرتا ہوا پاؤ گے۔ غرضیکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیبی اسرار و رموز کی ہر اعتبار سے خبریں دیں۔ اور آپ پر منافقین کے تمام اسرار اور مسلمانوں کے وہ تمام واقعات جو آپ کی حیات طیبہ اور بعد از وفات پیش آئے سب منکشف و مطلع تھے یہاں تک کہ لوگ ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ خدا کی قسم! اگر خبر دینے میں کوئی جلدی نہ کرتا تو بطحا کے سنگریزے آپ کو خبر دیتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جادو کی خبر دی جسے لبید بن اعصم یہودی نے ان بالوں پر جو حضور کی کنگھی کرتے ہوئے گرے تھے کیا تھا۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاہدے کی تحریر کو دیمک کے کھا جانے کی خبر دی جسے قریش نے بنی ہاشم کے خلاف تحریر کیا تھا

مگر جہاں خدا کا نام تحریر تھا وہ محفوظ رہی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کی کیفیات اس وقت بیان فرمائیں جب کہ قریش نے شب معراج کے سلسلے میں آپ کی تکذیب کی تھی۔

اور آخر زمانے میں امت کے اندر برائیاں ظاہر ہونے کی خبر دی کہ امانت جاتی رہے گی، شیطان کا سینگ نکلے گا۔ خیانت پھیل جائے گی، ہم زمانوں سے حسد کریں گے۔ مردوں کی کمی ہوگی اور عورتوں کی کثرت ہوگی اور مال کے کم ہونے، فتنوں کے واقع ہونے، صلہ رحمی اٹھ جانے، زلزلے آنے، حجاز سے آگ ظاہر ہونے کی خبر دی۔ یہ ساری تفصیلات تاریخ مدینہ معظمہ میں مذکور ہیں اور علامات قیامت، حشر و نشر اور باقی احوال آخرت اور اہوال قیامت تو یہ ایک بہت وسیع باب ہے جن کے اظہار و بیان کے لئے مستقل کتاب در کار ہے۔ یہاں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ آپ کی نبوت کی صداقت اور ظہورِ معجزات کے لئے بہت کافی ہے (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم)

حفظ و عصمت سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

وصل:۔ حضور اکرم ﷺ کے معجزات عظیمہ کے ظہور کے ابواب میں ایک حق تبارک و تعالیٰ کی جانب سے آپ کو لوگوں کے شر اور اعدائے دین کے مکر و کید سے حفاظت و عصمت فرمانا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا: "وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" اور اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں کے شر سے بچائے گا۔ "وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا" آپ اپنے رب کے حکم کیلئے ثابت قدم رہئے کیونکہ آپ ہماری نظروں کے سامنے ہیں اور فرمایا: "اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ" بیشک ان ہنسنے والوں پر ہم تمہیں کفایت کرتے ہیں جنہوں نے اللہ کے ساتھ دوسرا معبود بنا رکھا ہے اور فرمایا:۔ "وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" اور یاد کیجئے جب کافر لوگ آپ کے ساتھ خفیہ تدبیریں کر رہے تھے۔

اور خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نگہداشت فرماتے تھے۔ اور صحابہ کرام علیہم الرضوان بھی آپ کی پاسبانی کرتے تھے جب یہ آیہ کریمہ:۔ "وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" نازل ہوئی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خیمہ سے باہر تشریف لائے اور ان اصحاب سے جو آپ کی پاسبانی کر رہے تھے فرمایا اے لوگو! اب پاسبانی چھوڑ دو اور چلے جاؤ اس لئے کہ میری حفاظت میرا رب عزوجل فرما رہا ہے۔ اب مجھے تمہاری نگہبانی کی حاجت نہیں ہے۔

مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں کسی درخت کے نیچے قیام فرما تھے اور عادت شریفہ ایسی تھی کہ جب کوئی پہلے منزل آتی تو صحابہ کرام آپ کیلئے کوئی درخت پسند کرتے تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سایہ میں دوپہر کا قیلولہ فرمائیں۔ ایک اعرابی آیا اس نے تلوار سونت کر کہا کون ہے جو تم کو مجھ سے بچائے گا فرمایا اللہ! اس پر اعرابی کانپنے لگا اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر پڑی اور یہ اس کے سر پر پڑی جس سے اس کا بھیجا کھل گیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور بلاشبہ یہ قصہ صحیح حدیث میں مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اعرابی کو معاف فرما دیا پھر وہ اپنی قوم میں جاکر کہنے لگا کہ میں تمہارے پاس بہترین قوم کے سامنے سے آیا ہوں۔ نیز ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ہاتھ سے تلوار پکڑ کر فرمایا تجھے کون میرے ہاتھ سے بچائے گا تو وہ قدموں پر گر پڑا۔

اسی کی طرح غزوۂ بدر کے سلسلے میں بھی ایک حکایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قضائے حاجت کیلئے صحابہ سے جدا ہو کر دور تشریف لے گئے آپ کے تعاقب میں ایک منافق بھی چل دیا۔ آگے حکایت مذکورہ بیان کے مطابق ہے۔ اور اسی روایت کے مثل غزوۂ غطفان میں بھی مروی ہے اس میں مشہور ہے کہ وہ حملہ آور جوان مسلمان ہوگیا اور وہ اپنی قوم کی طرف واپس گیا وہ اپنی قوم کا

سردار اور ان کا بڑا ابھادر شخص تھا۔ قوم کے لوگ اس سے کہنے لگے کہ تجھے کیا ہو گیا تو تو کہتا تھا کہ میں انہیں ہلاک کر دوں گا۔ اور یہ تیرے امکان میں بھی تھا پھر تو نے ایسا کیوں نہ کیا؟ اس نے کہا میں نے ایک سفید رو بلند شخص کو دیکھا جس نے میرے پُر مارا جس سے میں اپنی پشت کے بل گر پڑا اور تلوار زمین پر گر گئی تو میں نے جان لیا کہ وہ فرشتہ ہے پھر میں اسلام لے آیا۔ اور ایک روایت میں آیا ہے کہ وہ تلوار سونت کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر کھڑا ہو گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی خداوندا مجھے اس کے شر سے محفوظ رکھ جس طرح کہ تو چاہے، وہ کمر کے درد میں مبتلا ہو کر چہرے کے بل گر پڑا اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور حق سبحانہ کا یہ ارشاد کہ:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَنْ يَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ۔ اے ایمان والوں یاد کرو اس نعمت الٰہی کو جو تم پر اس وقت نازل ہوئی جب کہ ایک قوم نے ارادہ کیا کہ تم پر دراز دستی کرے۔

یہ خطاب مومنوں کی جانب ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نفع و ضرر حقیقتہً انہیں کی طرف لوٹتا ہے۔

منقول ہے کہ جب سورۂ تبت یدا ابی لہب نازل ہوئی ابو لہب کی بیوی لعنتہ اللہ علیہا جس کا نام ام جمیل بنت حرب تھا اور وہ ابو سفیان کی بہن تھی اور اسے " حمالۃ الحطب " یعنی لکڑیاں اٹھانے والی کہا گیا تو اس نے ارادہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دے اور دشنام طرازی کرے اس وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے انہوں نے دیکھا کہ ام جمیل آ رہی ہے تو عرض کرنے لگے یا رسول اللہ یہ عورت انتہائی بے حیا اور بے ادب و بد زبان ہے اگر یہاں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جائیں تو بہتر ہے۔ فرمایا وہ مجھے نہ دیکھ سکے گی۔ پھر ام جمیل آئی اور اس نے کہا اے ابو بکر رضی اللہ عنہ تمہارے آقا نے میری ہجو کی ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میرا آقا نہ شعر گوئی کرتا ہے اور نہ کسی کی برائی کرتا ہے تو وہ ملعون عورت خائب و خاسر ہو کر لوٹ گئی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی جگہ تشریف فرما رہے اور وہ نہ دیکھ سکی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ بھیجا تا کہ وہ مجھے اس سے اپنے پروں میں پوشیدہ کر لے۔ محمد بن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ اس عورت کے ہاتھ میں ایک پتھر تھا۔ اس نے کہا اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھتی تو اس پتھر سے ان کا منہ...... " (نعوذ باللہ)

کتاب الشفا میں مذکور ہے کہ بنی مغیرہ کا ایک شخص آیا تا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) قتل کر دے تو اس کی آنکھیں اندھی ہو گئیں اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھ سکا حالانکہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سن رہا تھا۔ پھر وہ اپنی قوم کی طرف پلٹا تو وہ انہیں بھی نہ دیکھ سکا یہاں تک کہ لوگوں نے اسے آواز دی۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھنا اور نہ پہچاننا ہجرت کی ابتدا میں بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کاشانہ اقدس سے باہر تشریف لائے اور ان سے باتیں کیں اور ان کے آگے سے گزر گئے تو وہ یا تو دیکھ نہ سکے یا دیکھا تو پہچان نہ سکے۔ اور ان کے سروں پر خاک ڈالنا بھی اسی ضمن میں ہے جیسا کہ انشاء اللہ اپنے مقام میں آئے گا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھنا اور نہ پہچاننا غار ثور میں بوقت ہجرت اسی حال کے قریب ہے۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک رات ابو جہم بن حذیفہ کے ساتھ وعدہ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل پر اتفاق کیا پھر ہم گھر آئے تو ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان آیات کو تلاوت کرتے سنا کہ۔

الْحَاقَّةُ ۝ مَا الْحَاقَّةُ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحَاقَّةُ ۝ (الی قولہٖ تعالیٰ) فَهَلْ تَرَىٰ لَهُمْ مِنْ بَاقِيَةٍ ۝ وہ حق ہونے والی، کیسی وہ حق ہونے والی، اور تم نے کیا جانا کیسی وہ حق ہونے والی (یہاں تک کہ) تو کیا تم ان میں کسی کو بچا ہوا دیکھتے ہو۔

اس پر ابو جہم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بازو پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا ہمیں تو بچنا چاہئے اور دونوں وہاں سے بھاگے اور اپنے

ارادوں سے باز رہے۔ یہ حکایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے مقدمات میں سے تھی اور ان کے اسلام لانے کا۔۔
بہت عجیب اور احسن القصص میں سے ہے۔ جیسا کہ اپنے محل میں انشاء اللہ مذکور ہو گا۔

اور سراقہ بن مالک بن جعشم کا وقت ہجرت کا قصہ کہ انہیں اہل مکہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جستجو اور آپ کو پکڑنے کے لئے مقرر کیا تھا۔ اور ان کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنا اور گھوڑے کے پاؤں کا زمین میں دھنسنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے ان کا نکلنا اور پلٹ جانا مذکور ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ہجرت کے وقت پہچان لیا تھا وہ دوڑا دوڑا قریش کی طرف چلا تا کہ انہیں پتہ بتائے جب مکہ مکرمہ پہنچا تو دل سے وہ بات نکل گئی۔ اور یاد ہی نہ آیا کہ کیا کرنا تھا اور کس لئے آیا تھا وہ بالکل ہی بھول گیا کہ کس لئے گھر سے نکلا تھا یہاں تک کہ وہ اپنے گھر واپس چلا گیا۔

ابن اسحاق وغیرہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں تھے کہ ابو جہل لعین ایک پتھر لے کر چلا دوسرے ملاعنہ دیکھ رہے تھے اس نے چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر مارے تو پتھر اس کے ہاتھ میں چپک کر رہ گیا اور اس کے دونوں ہاتھ خشک ہو کر رہ گئے اور کچھ نہ کر سکا پھر وہ الٹے قدم جانب پشت پلٹ گیا اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے درگزر فرمانے کی دعا مانگی جس سے اس کے دونوں ہاتھ کھل گئے۔

ایک اور مرتبہ اس نے بہت بڑے اونٹ کو دیکھا کہ اتنا بڑا اونٹ کبھی دیکھا نہ گیا تھا تو اس نے اس کے کھانے کا قصد کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ جبریل علیہ السلام تھے۔ جو اس شکل میں نمودار ہوئے تھے اگر کوئی بھی ان کے قریب جاتا تو وہ مار ڈالتے۔

اور ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دیوار کے نیچے تشریف فرما تھے تو ایک شقی القلب بدبخت نے چکی کا پاٹ اٹھا کر چاہا کہ آپ کے سر مبارک پر گرا دے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے اور جانب مدینہ تشریف لے گئے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ابو جہل لعین نے قریش سے وعدہ کیا کہ اگر میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نماز میں دیکھوں گا تو حالت نماز میں ان کی گردن کو پائمال کر دوں گا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لئے نکلے تو لوگوں نے اس بدبخت کو خبر دی وہ آیا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوا تو خود کو دونوں ہاتھوں سے ہٹاتا بچاتا بھاگا۔ جب اشقیاء نے پوچھا تو کہنے لگا میں جب نزدیک پہنچا تو میں نے آگ کی ایک خندق دیکھی کہ میں اس میں گرا پڑتا ہوں۔ اور میں نے ہولناک آوازیں اور پروں کی سنسناہٹ سنی جو زمین کو پر کئے ہوئے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ فرشتے تھے اگر وہ اور نزدیک آتا تو اس کے جوڑ جوڑ توڑ ڈالتے۔ اور ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے۔ اس وقت یہ سورۃ نازل ہوئی۔ "کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰٓی" ہرگز نہیں بلاشبہ انسان ہی سرکش ہے (آخر سورۃ تک)

مروی ہے کہ شیبہ ابن عثمان حجبی اس کی قوم بیت اللہ الحرام کی دربان تھی اور خانہ کعبہ کی کنجی اس کے ہاتھوں میں تھی۔ قبل اس کے کہ وہ مشرف بہ اسلام ہوں شیبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ آور ہوا اور کہنے لگا "میرے باپ اور چچا کو ان کے چچا حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے مارا ہے۔ آج میں اپنا کینہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے نکالوں گا۔ اور ان کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے عوض ان سے اپنے باپ اور چچا کا بدلہ لوں گا۔ جب عرصہ کارزار گرم ہوا تو اس نے تلوار سونتی تا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرے مگر یکایک چیختا چلاتا بھاگا اس نے بتایا کہ جب میں حضور رضی اللہ عنہ کے قریب آیا تو دیکھا کہ آگ کا ایک بڑا شعلہ میری جانب لپکتا آ رہا ہے۔ میں اسے دیکھ کر گھبرا کر بھاگ آیا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھا تو مجھے بلایا اور اپنا

دستِ مبارک میرے سینہ پر رکھا۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے نزدیک لوگوں میں سخت ترین دشمن تھے ابھی دست مبارک اٹھایا نہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے نزدیک مخلوق میں محبوب ترین ہستی ہوگئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قریب آؤ اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں سے لڑو۔ میں حضور کے سامنے پہنچا در آں حالیکہ میں تلوار سونتے ہوئے تھا اگر اس وقت میرے سامنے میرا باپ بھی آتا تو اسے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر تلوار سے اڑا دیتا۔

فضالہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے سال جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم طواف میں مشغول تھے میں نے دل میں چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دوں۔ جب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوا تو فرمایا اے فضالہ تم دل سے کیا باتیں کر رہے تھے تم چاہتے تھے کہ رسول خدا کو شہید کر دو۔ عرض کیا نہیں یا رسول اللہ! اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا۔ میرے لئے استغفار کی اور اپنا دستِ مبارک میرے سینے پر رکھا تو میرے دل کو سکون محسوس ہوا۔ خدا کی قسم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی اپنا دستِ مبارک اٹھایا نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے میری یہ حالت کر دی کہ کوئی چیز میرے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبوب نہ معلوم ہوتی تھی۔

اس سلسلے میں مشہور ترین واقعہ عامر بن طفیل اور اربد بن قیس کا ہے۔ جس وقت یہ دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تو عامر نے اربد سے کہا کہ میں تیری طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ ہٹا کر باتوں میں اپنی طرف مشغول رکھوں گا اور تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی تلوار سے حملہ کر دینا تو عامر نے اربد کو کچھ کرتے نہ دیکھا۔ وہاں سے ہٹنے کے بعد عامر نے اس سے پوچھا کیا ہو گیا تھا تجھے۔ تو نے حملہ کیوں نہ کیا۔ اس نے کہا خدا کی قسم میں نے جب بھی حملہ کا ارادہ کیا تو میں تجھے اپنے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان پاتا تو کیا میں تجھے مار ڈالتا۔

حق سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت و حفاظت اس حد تک تھی کہ بہت سے یہودی کاہنوں نے قریش کو خبردار کیا۔ اور ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے طرح طرح کا خوف دلایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ان پر غلبہ وسطوت پانے سے ڈرایا اور ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل پر خوب ورغلایا اور ابھارا مگر حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ ہی ان کے شر سے بچائے رکھا۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

يُرِيدُونَ لِيُطْفِـُٔوا نُورَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُونَ۝ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ کے پھونکوں سے بجھا دیں۔ اللہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا چاہے کافر لوگ برا مانیں۔

علوم وخصائص مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء

وصل:۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات جامع الکمالات میں معجزات باہرہ، آیات مبینہ اور علوم و معارف کے خزانے جمع فرمائے۔ اور ان خصائص وخصائل اور اسوۂ کامل سے مخصوص فرمایا ہے جو تمام مصالحِ دنیا و دین اور معرفتِ الٰہی پر مشتمل ہیں جنہیں احکام شرعیہ، اصولِ دینیہ، سیاستِ مدینہ اور مصالحِ عباد یہ کہا جاتا ہے اور امم سابقہ اور قرونِ ماضیہ زمانۂ آدم سے تا ایں دم احوال واخبار، اور ان کی شریعتوں، کتابوں، سیرتوں اور شخصی صنعتوں اور ان کے مذاہب واختلاف آراء اور ان کی معرفت اور طویل عمروں اور ان کے دانشوروں کی حکمت کی باتوں اور ہر امت کے کفار پر حجتوں اور اہلِ کتاب کے ہر فرقہ کے ان

معارضوں کو جو ان کی کتابوں میں ہیں اور ان کے علوم واسرار و مخفیات اور ان خبروں کو جو وہ چھپاتے ہیں اور انہیں بدلتے ہیں اور عرب کی لغتوں، نادر لفظوں اور احاطہ اقسام فصاحت اور حفظِ ایام وامثال و حکم، ضرب امثال صحیحہ اور ان کی مرادوں پر حکم گہری فہم رکھنے والوں کے انداز کے مطابق اور ان کی مشکلات کے بیان وضاحت وغیرہ کے علوم کا علم عطافرمایا اور آپ کی شریعت مطہرہ ان محاسن واخلاق، محامدو آداب، حفظِ نفس کے اصول وقواعد اور ان کے اغراض واحوال پر مشتمل ہے جو ارباب عقل کے نزدیک مستحسن ہیں۔ حتیٰ کہ ان کفار وجہال وملاحدہ کے نزدیک بھی مستحسن ہیں جو عقلِ سلیم وانصاف رکھتے ہیں برخلاف ان کے جو معاندِ مخذول اور مخالف معقول ہیں۔ اور آپ کا کلام جوامع الکلم ہے۔ یعنی لفظوں میں اختصار ہوتا ہے اور یہ معانی بے شمار رکھتے ہیں۔ اور وہ جانے پہچانے علوم وفنون کے اقسام پر حاوی ہیں مثلاً طب، تعبیر، فرائض وحساب وغیرہ۔ یہ وہ علوم ہیں جنہیں ہر شخص جانتا ہے جو معاملات علمیہ میں شغف رکھتا ہے اور کتب بینی کا مشغلہ رکھتا ہے۔ اور جو اہل کتاب کی مجلسوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے اور اس میں ریاضت ومشقت اٹھاتا ہے۔ باوجودیکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو پڑھے لکھے تھے اور نہ ان مجلسوں میں بیٹھے اٹھے تھے جو ان اوصاف کے ساتھ متصف ہیں۔ اور نہ اپنی قوم کے درمیان سے باہر نکلے اور نہ ان کے طلب وحصول کے لئے کوئی سفر کیا۔ اور اہلِ عرب کا زیادہ سے زیادہ عرفان، علم انساب، پچھلوں کی کہانیاں اور ان کے شعروبیان پر ہے۔ اور ان کا حصول بھی اچھی طرح سیکھنے، مشغول رہنے اور اہلِ فن کے ساتھ بحث ومباحثہ کرنے کے بعد ہوتا ہے حالانکہ یہ فن آپ کی کتاب فضل وکمال کا ایک نقطہ اور بحر علم کا ایک قطرہ ہے۔ شعر

كَفَاكَ بِالْعِلْمِ فِى الْأُمِّيِّ مُعْجِزَةً فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَالتَّأْدِيبِ فِى الْيُتُمِ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کے دلائل وعلامات میں سے راہبوں، پادریوں کی مترادف ومتواتر خبریں اور علمائے اہل کتاب کا آپ کی صفات اور آپ کی امت کے اوصاف اور ان کی علامات ونشانیاں بیان کرنا جیسا کہ حلیہ شریف کے ضمن میں مذکور ہوچکا ہے اور مہر نبوت اور اس قسم کی اور بھی نشانیاں ہیں اور اس طرح کی نشانیاں پچھلے موحد شاعروں کے اشعار میں بھی واقع ہیں جیسے کہ شعراء میں تبع، قس بن ساعدہ اور سیف بن ذی یزن وغیرہ ہیں۔ اور زید بن عمرو بن نفیل نے آپ کی نبوت کی تعریف کی۔ ان لوگوں کو "موحدۂ جاہلیت" کہتے ہیں۔ اور ورقہ بن نوفل نے تو دینداری وتنہائی اختیار کر رکھی تھی۔ اور آپ کا ذکر شریف کتب سابقہ میں ہونا اور علماء یہود کا اس کا اعتراف کرنا باوجود اس کے ان کا حسد وعناد کی راہ پر چلنا۔ یہ سب کچھ ابواب سابقہ میں تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے اور وہ باتیں جو کہ جنات سے سنی گئیں اور بتوں کی زبانوں پر جاری ہوئیں اور جانوروں کے ذبیحوں اور پرندوں کے شکموں میں آپ کا اسم شریف دیکھا گیا۔ اور قبروں اور پتھروں میں بخط قدیم آپ کی رسالت کی شہادت کا پایا جانا اور ان کو مشاہدہ کرنے کے بعد کسی کا اسلام لانا یہ سب دلائلِ نبوت کے ضمن میں مذکور ومسطور ہیں۔

ان کے علاوہ دیگر علامات ونشانیاں جو وقت ولادت، وقت وفات اور اسفار وغزوات میں ظاہر ہوئیں انہیں ان کے مقام میں انشاء اللہ بیان کیا جائے گا۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائل وکرامات اور آیات واخبار کے ضمن میں فرشتوں، جنات اور حضرت حق عزاسمہ کا ملائکہ سے آپکی مدد فرمانا اور جنات کی اطاعت کرنا اور بکثرت صحابہ کا انہیں دیکھنا جیسا کہ غزوۂ بدر وغیرہ میں ہوا تھا۔ یہ سب باتیں ظاہر ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک موقعہ تو وہ ہے جب کہ جبریل علیہ السلام اسلام، ایمان اور احسان کے معنی سکھانے کے لئے صورت بدل کر ظاہر ہوئے تھے اور صحابہ نے انہیں دیکھا تھا اس کے علاوہ حضرت ابن عباس، حضرت اسامہ رضی اللہ عنہم نے جبریل علیہ السلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی صورت میں دیکھا جن کے کپڑے سفید تھے اور کچھ صحابہ کرام نے فرشتوں کو گھوڑا

ہنکاتے دیکھا اور کچھ صحابہ کرام نے دیکھا کہ کافروں کے سر تواتر رہے ہیں مگر مارنے والا نظر نہیں آتا۔ اور ابو سفیان بن حارث رضی اللہ عنہ نے ایسے مردوں کو جن کے لباس سفید ہیں انہیں ابلق گھوڑوں پر سوار زمین و آسمان کے درمیان معلق دیکھا اور عمران بن الحصین رضی اللہ عنہ جو کہ مشاہیر صحابہ میں سے ہیں ان سے فرشتوں نے مصافحہ کیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ کعبہ میں جبریل علیہ السلام کو دیکھا۔ پھر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بیہوش ہو کر گر پڑے۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک جن کو لیلۃ الجن میں دیکھا اور جنات کی باتیں سنیں۔ یہ سب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ہیں۔

منقول ہے کہ جب حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ روز احد شہید ہوگئے تو ایک فرشتے نے ان کی صورت اختیار کر کے جھنڈے کو تھام لیا۔ پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز دی کہ اے مصعب رضی اللہ عنہ آگے آؤ تو فرشتے نے کہا میں مصعب نہیں ہوں۔ اس وقت جانا کہ وہ کوئی فرشتہ ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک بوڑھا شخص لکڑی ہاتھ میں لئے آیا اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دیا اور کہا یہ جن کی آواز ہے فرمایا تو کون؟ اس نے کہا میں ہامہ بن الیم بن الاقیس بن ابلیس ہوں۔ میں نے حضرت نوح علیہ السلام سے بھی ملاقات کی ہے اور ان کے بعد ہر نبی سے ملتا رہا ہوں۔ اسے قرآن کی سورۃ سکھائی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے شیطان کو دیکھا کہ وہ تین روز برابر صدقہ فطر کے اس مال پر آیا جو ان کے سپرد تھا اور وہ اس میں سے چراتا رہا۔ اور اس نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو آیۃ الکرسی سکھائی۔

واقدی بیان کرتے ہیں کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے بت عزیٰ کو گراتے وقت سیاہ رنگ کی ایک عورت اس میں سے نکلتی دیکھی جو برہنہ تھی اور اس کے بال بکھرے ہوئے تھے انہوں نے اپنی تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ عزیٰ تھی۔

اور حدیث میں ـــــ ایک شیطان کا اچھلنا کودنا بھی آیا ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز قطع کرے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ چاہنا کہ اسے مسجد کے کسی ستون سے باندھ دیں۔ اور دعائے سلیمان کو جو تسخیر جن کے سلسلہ میں ہے یاد کرنا اور پھر اس شیطان کو چھوڑ دینا مشہور ہے۔

تتمہ بیان معجزات

وصل:۔ وہ معجزات و آیات جو بوقت ولادت اور اس کے بعد ایام رضاعت و صغر سنی میں بعثت و ظہور نبوت کے وقت تک اور تمام زمانہ عمر شریف میں ظاہر ہوتے رہے ان میں سے کچھ کا تذکرہ کر دیا گیا ہے مگر وقت وفات تک تمام کا بیان حصر و احصاء کی حد سے باہر ہے۔ اگر خدا نے چاہا تو مزید کچھ اپنے محل میں مذکور ہو گا۔

قاضی ابوالفضل عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اب ہم کچھ معجزات واضحہ کو اس باب میں بیان کرتے ہیں اور یہ ان کے معجزات باہرہ میں سے ایک شمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارا اتنا ہی بیان کرنا زیادتی کی طلب سے بے نیاز و کفایت کر دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کے معجزات تمام انبیاء و مرسلین کے معجزات سے بہت وافر و زیادہ اور خوب ظاہر و واضح ہیں

بلکہ اکثر معجزے ایسے عطا ہوئے جو کسی نبی کو نہیں دے گئے۔ اور جتنے معجزات انبیاء کو مرحمت ہوئے یا توان کی مثل یا ان سے زیادہ بلیغ ہمارے سردار سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ظاہر ہوئے ہیں اور ان وجوہِ اکثریت میں سے ایک یہ قرآن کا معجزہ ہے جو تمام کا تمام معجزہ ہے اور اس قرآن پاک کے وجوہ اعجاز میں سے چھوٹی سے چھوٹی سورۃ بعض محققین کے نزدیک سورۃ انا اعطینک الکوثر ہے یا وہ آیت جو اس کی مقدار میں ہو۔ پھر اعجاز قرآن کے سلسلے میں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے دو وجہ ہیں ایک بطریق فصاحت و بلاغت دوسرا بطریق نظم و تالیف۔ تو اس لحاظ سے ہر ایک جز میں دو دو معجزے ہوئے پھر اس گنتی پر دیگر وجوہات اعجاز کو بڑھاتے جایئے جواز قسم اخبار بعلوم غیبیہ ہیں اور ممکن ہے کہ اس تجزیہ سے ایک سورۃ اشیاء متعددہ کے اجزاء مولف ہے اور ہر چیز معجزہ ہو تو گنتی میں اضافہ کی ایک اور کثرت کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر ان دیگر وجوہات اعجاز کا اعتبار کریں جو پہلے مذکور ہو چکے تو اضافہ اور کثرت کی کوئی حد ہی نہ رہے۔ یہ صورت صرف قرآن عظیم میں ہے۔ اس کے بعد وہ حدیثیں جو مروی ہیں اور وہ خبریں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہیں اپنے حال پر ہیں۔

اب رہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کی اس جہت سے وضاحت کہ یہ انبیاء و مرسلین کے معجزات سے زیادہ ہیں۔ اس زمانہ میں جو علم و ہنر کمال پر ہوتا ہے اس کے مطابق معجزات دیئے جاتے ہیں۔ جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اہل زمانہ کے علم کی انتہا جادوگری تھی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اس معجزے کے ساتھ مبعوث کئے گئے جو اس کے مشابہ تھا جس پر ان کے زمانہ کے لوگ قدرت رکھنے کا دعویٰ کرتے تھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وہ چیز پیش فرمائی جو ان کی عادتوں کو توڑتی تھی اور وہ ان کی قدرت سے باہر تھی۔ اور ان کے سحر کا ابطال کیا۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں فن طب کی بڑی قدر و منزلت تھی اور اہل طب فن میں فخر و مباہات کرتے تھے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایسا معجزہ لائے جو ان کی قدرت سے باہر تھا اور ایسی چیز انہوں نے پیش فرمائی جس کا وہ لوگ گمان تک نہ رکھتے تھے مثلاً مردے کا زندہ کرنا، اندھے کو بینا کرنا اور کوڑھی کو تندرست کرنا جن کا معالجہ طب سے ناممکن تھا۔ اسی طرح تمام انبیاء علیہم السلام کے معجزات کا حال تھا۔ آخر میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے سید عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ آپ کے زمانۂ اقدس میں اہل عرب کے تمام معارف علوم چار تھے۔ فصاحت و بلاغت، شعر، خبر اور کہانت۔ تو حق تعالیٰ نے آپ پر قرآن نازل فرمایا۔ جو ان چاروں کا خارق ہے جو ایسی فصاحت و بلاغت ایجاز و نظمِ غریب اور اسلوبِ عجیب پر مشتمل ہے جو ان کے طریقۂ کلام سے خارج ہے اور وہ اس کے نظم و کلام تک کسی طریقہ سے راہ نہیں پاتے۔ اور اسالیب اوزان میں اس کے نہج کو نہیں جانتے اور آئندہ رونما ہونے والے حوادث کی خبروں اور اسرار و خفایا اور ان دلی بھیدوں کو جو قرآن میں پاتے ہیں اور جیسا بتایا گیا ویسا ہی رونما ہوا ان تک ان کی رسائی ممکن نہ ہوئی اور ہر ایک کو اس کی صداقت و صحت کا اعتراف کرنا پڑا۔ کہانت کو باطل قرار دیا۔ کیونکہ کبھی ان میں کوئی ایک آدھ بات سچی نکل آتی ہے اور دس جھوٹی۔ اور ان شیاطین کو شہاب مار کر جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیا۔ جو ان کے کانوں میں باتیں پھونکا کرتے تھے۔ ان شیاطین کو شہاب مار کر اور ستارے پھینک کر اوپر چڑھنے سے روک دیا گیا۔ اور ازمنۂ ماضیہ، انبیاء و امم سابقہ اور حوادث ماضیہ اور پچھلی امتوں کی ہلاکتوں کی ایسے طریقہ پر خبر دی کہ کوئی شخص اس سے جدا ہو کر تنہا بیان کرنے سے عاجز ہے۔ گویا یہ قصص باہم ایسے پیوست ہیں کہ ان سے علیحدہ کئے ہی نہیں جاسکتے۔ پھر یہ کہ قرآن اپنے تمام معجزات اور وجوہ اعجاز کی جامعیت کے ساتھ قیامت تک باقی و برقرار رہنے والا ہے تاکہ بعد کا آنے والا بھی جو اس میں نظر ڈالے اور اس کے وجوہ اعجاز میں غور و تامل کرے۔ تو کوئی ایسا عہد و زمانہ نہیں گزرا مگر یہ کہ ہر زمانہ میں اس کی بتائی ہوئی خبروں کی صداقت ظاہر ہوتی رہی جس سے ایمان میں تازگی

آتی رہی اور اس کے دلائل و براہین غالب آتے رہے۔ "وَلَيْسَ الْخَبَرُ كَالْمُعَايَنَةِ" (خبر معائنہ کی مانند نہیں ہوتی) اور یقین زیادتی میں مشاہدے کی خاص تاثیر ہے اور "علم الیقین" کے مقابلے میں عین الیقین سے بہت زیادہ اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اگرچہ ہر صورت میں حقانیت و یقین حاصل ہے اور انبیاء علیہم السلام کے تمام معجزات ان کی مدت ختم ہونے کے بعد ختم ہوگئے اور ان کے زمانوں کے خاتمہ کے ساتھ وہ معدوم ہوگئے۔ لیکن ہمارے آقا سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ نہ فنا ہوا اور نہ منقطع و مضمحل ہوا۔ ہر دم آپ کی نشانیاں متجدد و تازہ ہیں کیا خوب امام بوصیری نے فرمایا ؎

دَامَتْ لَدَيْنَا فَفَاقَتْ كُلَّ مُعْجِزَةٍ مِنَ النَّبِيِّيْنَ إِذْ جَاءَتْ وَلَمْ تَدُمِ

ہمارے آقا سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے کے ظہور و وضوح کی ایک اور وجہ بھی ہے وہ یہ کہ آپ کے معجزات آپ پر وحی و کلام کے ہونے کے سبب ہیں۔ جس میں تخیل، حیلہ اور تشبیہ ممکن نہیں۔ کیونکہ آپ کے سوا تمام انبیاء و مرسلین کے معجزات کو معاندوں، مکابروں اور دشمنوں نے طلب کیا تھا۔ اور ان کی یہ طلب ان کے اپنے تخیل اور ضعیفوں اور احمقوں کے نمونے کے مطابق اپنی طمع میں ان چیزوں کی خواہش تھی جیسے کہ فرعون کے جادوگروں کا رسیاں اور لاٹھیاں ڈالنا اور حیلہ گری و جادوگری کرنا تو اس کے توڑ میں اژدھا لایا گیا جو دوڑتا تھا۔ اور ممکن ہے کہ کوئی نادان و بیوقوف کہے کہ انہیں کی جنس سے ہے حالانکہ قرآن ایسا کلام ہے جس میں کوئی حیلہ اور جادوگری نہیں ہے۔ اور نہ اس میں تخیل و تشبیہ کی گنجائش ہے۔ جس طرح غیر شاعر اور خطیب کے لئے ممکن نہیں ہے اور اسے حاصل نہیں ہوتا کہ بتکلف اور اپنے حیلہ سے شعر و خطابت کر سکے۔ واضح رہنا چاہئے کہ تمام علماء اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ قرآن کی مثل لانا کسی کے مقدور میں نہیں ہے اگر مقدور میں ہوتا تو ضرور اس کا مثل لے آتے۔ اور معتزلہ اور ہمارے بعض علماء کا مذہب یہ ہے کہ مقدور تو تھا لیکن حق تبارک و تعالیٰ نے ان کی ہمتوں اور قوتوں کو جب وہ اس کی مثل لانے کے لئے ارادہ کر رہے تھے پھیر دیا اور انہیں آزاد نہ چھوڑا کہ اس کا مثل لا سکیں۔ اگرچہ اس مذہب پر بھی اعجاز و وضوح حاصل ہے اس لئے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کا اس کی مثل لانے سے جو ان کے مقدور کی جنس سے ہے انہیں روک دینا اس کے صدق و اعجاز پر خوب واضح دلالت اور روشن نشانی ہے یہ بات بمنزلہ اس کے ہے کہ کوئی نبی فرمائے "میری نشانی یہ ہے جس پر باوجود اس پر قدرت رکھنے کے لوگوں کو اس کے مشابہ نشانی لانے سے منع کر دیا ہے" اور یہ محض احتمال و توہم ہے جو اس طرف لے جاتا ہے کہ جب قرآن ان کے کلام کی جنس سے ہے تو کیوں اس پر انہیں قدرت نہ ہوگی۔ بنابریں پہلا قول زیادہ قوی و محکم ہے۔ (واللہ اعلم بحقیقۃ الحال)۔

عیادتِ مریض یعنی بیمار پرسی اور معالجہ

وصل:۔ جاننا چاہئے کہ صاحبِ مواہب لدنیہ اپنی کتاب میں ساتویں مقصد کے بعد (جو وجوب محبت و اتباع سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور محبت آل و اصحاب اور اہل قرابت و عشیرات نبوی، اور آپ پر صلوٰۃ و سلام بھیجنے کے حکم میں ہے) آٹھواں مقصد طب و تعبیر رؤیا اور غیبی خبروں میں وضع کیا ہے۔ کاتب الحروف (یعنی شیخ محقق رحمہ اللہ) کی نظر میں یہ ترتیب و وضع موقع و محل کے اتنی مناسب نہیں ہے اور اخبارِ مغیبات یعنی غیبی خبروں کو اس مقام پر پہنچنے سے پہلے معجزات کے باب میں ذکر کر دیا ہے اور طب و تعبیر رؤیا کو ان کی اپنی ترتیب کے اعتبار پر کوئی مقام نہ ملا تو اسے بھی اسی باب میں یعنی معجزات کے باب میں رکھ دیا۔ اور روحانی بلکہ جسمانی نظر والوں کے نزدیک جس طرح وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہیں اسی طرح تعبیرات رؤیا بھی از قبیل معجزات اور حیطۂ عادت سے خارج ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام افعالِ مستقیمہ، اعمال قویمہ، علوم و معارف، محاسن

و آداب وفضائل، بدائع حکم، جوامع کلم اور تدبیرانام کے قواعد و قوانینِ احکام سب ہی طاقت اوران کے حیطہ عادت سے خارج ہیں۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

مقدمہ:۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیماروں کی عیادت اوران کی مزاج پرسی کیلئے تشریف لے جاتے اور بیمار کے قریب اس کے سرہانے کے نزدیک بیٹھتے اور اپنا دست مبارک اس کی پیشانی پر رکھتے اور کبھی درد و تکلیف کے مقام پر دست اقدس رکھ کر دریافت فرماتے کہ حال کیسا ہے اور فرماتے بسم اللہ۔ یہ بھی ایک قسم کی طب اور علاج ہے جو بیمار کے دل میں مسرت و خوشی داخل کرنے اوراس کے باطن میں اثرانداز ہونے کا ذریعہ ہے۔ بیت

گر قدم رنجہ کند یار بہ پرسیدنِ ما   باز دار سر پر سیدن بیمار غمش

مصرع: خوش طبیب است بیا تاہمہ بیمار شویم

مریض کے لئے حصولِ شفا اور تخفیف مرض میں تفریح نفس، تطییب قلب اور مسرت و خوشی کے داخل ہونے کی عجیب تاثیر ہے اس لئے کہ ارواحِ قوی اس سے طاقت پکڑتیں اور طبیعت کو موذی کے دفعیہ میں مدد ملتی ہے۔ خصوصاً عزیزوں، بزرگوں اور دوستوں کی ملاقات سے۔ ایسے ہی موقعہ پر کہا گیا ہے کہ:۔ "لِقَاءُ الْخَلِیْلِ شِفَاءُ الْعَلِیْلِ" دوست کی ملاقات مریض کی شفا ہے۔

ایک یہودی کا لڑکا تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتا تھا۔ یکایک وہ بیمار ہو گیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی مزاج پرسی کے لئے تشریف لائے اوراس کے قریب بیٹھ کر اسے سلام کیا اور وہ مسلمان ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَنْقَذَہٗ مِنَ النَّارِ اس خدا کی حمد جس نے اسے نار جہنم سے نجات دی۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں بیمار ہوا اور مجھ پر بے ہوشی طاری ہو گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے وضو فرمایا اور وضو کے پانی سے مجھ پر چھینٹے مارے تو میں ہوش میں آ گیا۔ اور ایک روایت میں آیا ہے کہ میرے منہ پر دم فرمایا میں اسی وقت صحت یاب ہو گیا اور فرمایا "عُوْدُوْا الْمَرْضٰی" مریضوں کی عیادت کرو، یہ استحبابی حکم ہر مرض کے لئے عام ہے اور بعض اس حکم عام سے، آشوب چشم، پھنسی اور درد دنداں کا استثناء کرتے ہیں۔ یہ اس روایت کے بموجب ہے۔ جسے بیہقی نے روایت کیا اور صحیح اس کے برعکس ہے۔

اسی طرح روز شنبہ (سنیچر کے دن) عیادت کرنے کی ممانعت روایت کرتے ہیں۔ یہ خلاف سنت ہے اس کی بنیاد ایک یہودی طبیب سے ہے کہ ایک بادشاہ بیمار ہوا اس نے طبیب کو حکم دیا کہ شبانہ روز خدمت میں حاضر رہے لیکن یہودی نے چاہا کہ اپنی آسانی کے لئے چھٹکارا ملے تو اس نے افترا کیا اور کہا کہ روز شنبہ بیمار کے پاس نہ آنا چاہئے۔ اس کے بعد یہ بات لوگوں میں پھیل گئی۔

اور بعض کہتے ہیں کہ موسم سرما میں رات کو اور موسم گرما میں دن کو عیادت کرنا مستحب ہے بایں وجہ کہ مریض کو ضرر نہ پہنچے کیونکہ سردیوں میں راتیں لمبی اور گرمیوں میں دن لمبے ہوتے ہیں اور اعداء دین اور بدمذہبوں کی عیادت و مزاج پرسی مکروہ ہے مگر بوقت ضرورت شدیدہ اور عیادت کے استحباب میں حدیثیں بکثرت ہیں۔ اوراس کے آداب و مسائل کتابوں میں مذکور ہیں۔

جاننا چاہئے کہ مرض کی دو قسمیں ہیں ایک دلوں کا مرض، دوسرا بدنوں کا مرض۔ لیکن امراضِ قلب کا علاج، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ ہے۔ کسی اور سے اس کا ازالہ ممکن نہیں۔ اور امراض بدن کا علاج تو وہ اور کو بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا حصول بطریق اتباع و طفیل ہے۔ آپ کی بعثت کا اصل مقصود دلوں کی بیماریوں کا معالجہ اوراس کی اصلاح ہے اور دلوں میں جو گناہوں کے ضرر اور امراض ہوتے ہیں ان کا ازالہ اسی طرح ہے جس طرح بدنوں میں زہروں کا زہر مختلف

نوعیتوں کا ہوتا ہے اور اس کا علاج کیا جاتا ہے۔ اور بندے کو دنیا و آخرت کی اکثر حالتوں میں جو ضرر و نقصان پہنچتا ہے ان کا اصل سبب یہی معاصی و نافرمانی ہے اعاذنا اللہ منہا بمعاصی کے اثرات دل کو بھی شامل ہیں اور بدن کو بھی۔ اور اس کی ایک وجہ علم کی محرومی ہے۔ کیونکہ علم کا نور، معصیت کی ظلمت و تاریکی کے ساتھ جمع نہیں ہوتا۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ شعر

شَكَوْتُ إِلَىٰ وَكِيعٍ سُوءَ حِفْظِي ۔۔۔ فَأَرْشَدَنِي إِلَىٰ تَرْكِ الْمَعَاصِي

وَقَالَ اعْلَمْ أَنَّ الْعِلْمَ نُورٌ ۔۔۔ وَنُورُ اللهِ لَا يُؤْتَىٰ لِلْعَاصِي

مطلب یہ کہ میں نے استاد وکیع سے حافظہ کی کمی کی شکایت کی تو انہوں نے مجھے ترکِ معاصی کی ہدایت فرمائی اور فرمایا جان لو کہ علم ایک نور ہے۔ اور اللہ کا نور نافرمانوں کو نہیں ملتا۔ اس کی دوسری وجہ رزق سے محرومی ہے۔ حدیث پاک میں آیا ہے کہ بندہ گناہوں کی پاداش میں اس رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے جو اسے تقویٰ کی بدولت رزق مزید حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ۔ اگر بستی والے ایمان لاتے اور تقویٰ کرتے تو یقیناً ہم ان پر آسمان و زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

جیسا کہ چنگھاڑ والی قوم کے سلسلے میں انقطاع رزق کا سلسلہ وارد ہو چکا ہے۔

اس جگہ ایک خلل و شبہہ لاحق ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر کوئی کہے کہ بہت سے گنہگاروں اور صبح کے وقت مانگنے والوں کو ہم نے دیکھا ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ رزق و نعمتیں پاتے ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ وعید و خوف، مسلمانوں اور اسلام کی تصدیق کرنے والوں کیلئے ہیں اس جگہ میں اس کا خطرہ ہے کہ ایمان کا تخم اس کے حال کی زمین سے نکال پھینکا گیا ہو۔ یا یہ کہ یہ مکرو استدراج ہے۔ کیونکہ ارتکاب معصیت کے وقت دل میں خاص قسم کی ظلمت و وحشت پائی جاتی ہے یہ محسوس و قطعی ہے۔ اور کبھی یہ بد نصیبی وسیاہی چہرے پر بھی سرایت کر جاتی ہے۔ یہ بھی ایمان کی فرع ہے۔ اور قلب و بدن کی سستی بھی معاصی کی علامتوں میں سے ہے۔ نیز معصیت عمر کو کم کرنے کا موجب ہے۔ جس طرح کہ طاعت اس کی زیادتی کا سبب ہے اور بعض اسے خیر و برکت کے اٹھ جانے پر محمول کرتے ہیں کیونکہ یہ ذلت، فسادِ عقل، زوالِ نعمت اور شقاوت کے شامل ہونے کا موجب ہے۔ جس طرح کہ بدن کی صحت حفظِ قوت، پرہیز، اور موادِ فاسدہ و اخلاطِ ردیئہ کے استفراغ سے ہوتا ہے۔

دل کا بھی یہی حال ہے۔ اس کا استفراغ توبہ اور اعضاء کو نواہی سے بچانا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا میں تمہیں تمہارے درد اور اس کی دوا نہ بتاؤں۔ فرمایا تمہارا درد تمہارے گناہ ہیں اور اس کی دوا استغفار ہے تو معلوم ہوا کہ طبِ قلوب کی معرفت اور اس کا معالجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ہے اور طبِ قلوب کی معرفت اور اس کا معالجہ اکثر راجع بہ تجربہ ہے اور گاہے وحی سے بھی ہوا ہے۔ جیسے کہ سفر و مرض میں افطار کی رخصت اور خوف و مرض یا پانی بہم نہ ہونے پر تیمم کی مشروعیت مسائل شرعیہ کو ظاہر کرتے ہیں۔ نیز وہ معالجات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئے ظاہر ہے کہ وہ وحی سے ہوئے ہوں گے اگر تجربہ و قیاس سے بھی ہو تو بعید نہیں۔ کیونکہ علاج تجویز کرنا اور اسباب کو ثابت کرنا صحیح ہے اور یہ توکل کے منافی نہیں ہے۔ جس طرح بھوک و پیاس کو کھانے پینے سے دور کرنا توکل کے خلاف نہیں ہے۔ اور علاج و معالجہ کے جائز ہونے پر سیدا لمتوکلین صلی اللہ علیہ وسلم کا حال دلیل ہے۔ کیونکہ غایت توکل تداوی فرماتے اور اسباب و علل کا لحاظ فرماتے تھے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسا مرض پیدا نہ فرمایا مگر یہ کہ اس کے لئے دوا بھی پیدا فرمائی۔ ایک روایت میں ہے کہ ہر مرض کیلئے شفا ہے مگر موت کی نہیں۔ مطلب یہ کہ وہ مرض جس میں

موت مقدر کی جا چکی ہو اس کا کوئی علاج نہیں۔ اور بعض حدیثوں میں مداوات یعنی علاج کرانے کا حکم ہے۔ اور اشارہ ہے کہ مداوات میں حکم الٰہی اور اس کی تقدیر پر نظر رکھنی چاہئے اور دوا ہی کو شفایابی کا ذریعہ نہ سمجھ لینا چاہئے۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ حکم وجوب کیلئے نہیں ہے (بلکہ مسنون و مستحب ہے) اور تقدیر الٰہی پر اعتماد کے ساتھ قائم رہنا توکل کے منافی نہیں ہے۔ البتہ بعض اوقات تحقیق حال اور تحصیل مقام توکل کے لئے ترک اسباب بھی فرماتے ہیں یہ اشارہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں ہے کہ:۔

يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ اُمَّتِي سَبْعُوْنَ اَلْفًا مِّنْ غَيْرِ حِسَابٍ هُمُ الَّذِيْنَ لَا يَسْتَرْقُوْنَ وَلَا يَتَطَيَّرُوْنَ وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ بدولیت دیگر وَلَا يَكْتَوُوْنَ۔ میری امت کے ستر ہزار لوگ بے حساب جنت میں جائیں گے یہ وہ ہیں جو نہ علاج کراتے ہیں اور نہ بدفالی لیتے ہیں۔ وہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں اور ایک روایت میں ہے کہ وہ داغ نہیں لگواتے۔

علماء فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان افعال کو بیماری کے لئے بطریق اعتماد و اعتقاد کامل نہ کرنا چاہئے۔

مواہب لدنیہ میں ھل یتداوی المتوکل (کیا متوکل علاج کرائے) میں حارث محاسبی سے منقول ہے کہ فرمایا تداوی، توکل کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا وجود سید المتوکلین صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے پھر کسی نے حضرت حارث رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مَنِ اسْتَرْقٰى اَوِاكْتَوٰى بَرِئَ مِنَ التَّوَكُّلِ۔" (جس نے علاج کرایا یا داغ لگوایا وہ توکل سے نکل گیا) اس کے جواب میں فرمایا کہ مراد اس توکل سے نکلنا ہے جس کا ذکر حدیث پاک "يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ اُمَّتِي۔" (جو اوپر مذکور ہوئی) میں ہے۔ اور فرمایا توکل کے مدارج ہیں جن میں بعض بعض سے افضل ہیں (انتہی) اور "صاحب تمہید" نقل کرتے ہیں کہ توکل سے نکلنا اس وقت سے مراد ہے جب کہ وہ خلافِ شریعت علاج کرائے۔ اور داغ لگوانے میں اسے ایسی رغبت ہو کہ وہ اسی میں شفا کو منحصر جانے اور اس پر یقین کامل رکھے۔ اور وہ فعل الٰہی سے روگرداں ہو اور وہ شخص جو یہ اعتقاد رکھے کہ شفا من جانب اللہ ہے تو اس کے جواز میں قرآن پاک اور فاتحۃ الکتاب سے معالجہ کرنا اس کی دلیل ہے جیسا کہ آئندہ آئے گا۔

اور اس باب کی تحقیق یہ ہے کہ اسباب تین قسم کے ہیں ایک اسباب یقینیہ جس کی رعایت بحکم الٰہی و تقدیر ربی واجب ہے جیسے کہ کھاتے وقت لقمہ کو خوب چبا کر نگلنا اور پیالہ منہ سے لگا کر گھونٹ گھونٹ پانی پینا تو اس کا ترک داخل توکل نہیں بلکہ گناہ کا موجب ہے دوسری قسم اسباب ظنیہ ہیں جو بحکم تجربہ صحیح اور توکل میں اس کا داخل ہونا ثابت شدہ ہے جیسے گرمی میں سرد دوائیں اور سردی میں گرم دوائیں وغیرہ کا استعمال۔ اس قسم کے استعمال میں عادی بننا یہ بھی توکل کے منافی نہیں ہے۔ بجز تحصیل مقام توکل میں حال نفس کی تحقیق کیلئے کیونکہ بعض متوکلین نے ایسا کیا ہے اس کے باوجود وہ فتوائے شریعت میں محلِ عتاب ہوئے ہیں اور تیسری قسم اسباب و ہمیہ ہیں جو نہ یقینی ہوں اور نہ ظنی، محض وہم و خیال ہے۔ تو ان کا ارتکاب و استعمال باتفاق منافی توکل ہے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسموں کا علاج فرمانا تین قسم کا تھا ایک طبعی دواؤں سے جنہیں اجزائے جماداتی، نباتاتی اور حیوانی تعبیر کیا جاتا ہے دوسرا روحانی اور الٰہی دواؤں سے جو کہ ادعیہ، اذکار، اور آیات قرآنیہ ہیں اور تیسرا ادویہ مرکب سے جو ان دونوں قسموں سے مرکب ہیں۔ یعنی دواؤں سے بھی اور دعاؤں سے بھی۔

قرآن کریم سے بڑھ کر کوئی شے اعم و انفع اور اعظم شفا نازل نہیں ہوئی جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ — اور ہم نے قرآن سے وہ نازل فرمایا جو مسلمانوں کیلئے شفا و رحمت ہے۔

امراض روحانیہ کے لئے مکمل قرآن شفا ہے خواہ امراض روحانی، اعتقادات فاسدہ کے ہوں یا اخلاق ذمیمہ اور افعال قبیحہ کے

ہوں۔ قرآن کریم عقائدِ حقہ کے اثبات اور اخلاق حمیدہ اور اعمال محمودہ کے بیان وارشاد میں دلائل واضحہ، قطعیہ پر مشتمل ہے۔

اب رہاامراضِ جسمانیہ کے لئے قرآن کریم کا شفا ہونا تو یہ اسی وجہ سے ہے کہ اس کی تلاوت کے ذریعہ برکت و تیمن حاصل کرنا بہت سے امراض وعلل میں نافع اوران کا دافع ومزیل ہے۔ جبکہ مجہول افسون ومنتر کا پڑھنا اور پھونکنا جس کے مفہوم ومعانی بھی معلوم نہیں اور وہ اہل فسق وفجور سے منقول ہیں۔ اوران لوگوں کو ہم ان ظاہری آنکھوں سے نجاست وکثافت میں آلودہ دیکھتے ہیں۔ پھران سے جلب منفعت اور دفع مفاسد میں عجیب وغریب آثار ظاہر ہوتے ہیں تو وہ قرآن کریم جو جلالِ کبریائے الٰہی اور ذات وصفات باری تعالیٰ کے ذکر پر مشتمل ہے ان لوگوں سے وہ صادر ہوتا ہے جن کی صفاو پاکیزگی اور عظمت وکمال ظاہر وثابت ہے۔ اور بذات خود یہ قرآن معجزاتِ قاہرہ کا حامل ہے تو اس سے کیوں نہ شفا حاصل ہوگی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص قرآن سے شفا حاصل نہ کرے اسے حق تعالیٰ کبھی شفا نہ دے گا۔ حدیث میں ہے کہ فاتحۃ الکتاب ہر مرض کی دوا ہے۔ زہریلے جانور کے کاٹے کا افسوں اور مجنون ومعتوہ کا فاتحۃ الکتاب سے علاج حدیثوں میں ثابت شدہ اور مسلمہ ہے۔ امیرالمومنین سیدنا علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ کی حدیث میں ہے جو ابن ماجہ میں مرفوعاً مروی ہے کہ "خَیْرُ الدَّوَاءِ الْقُرْاٰنُ" بہترین علاج قرآن ہے۔[1]

صاحب بیضاوی نے اپنی تفسیر میں قول باری تعالیٰ:۔ "وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَاهُوَ شِفَاءٌ" اور دیگر آیات شفا کا ذکر کیا ہے۔ اور چلپی نے ان آیات کی تعیین کی ہے۔ اور کتب معتبرہ میں مثلاً مواہب لدنیہ وغیرہ میں ان آیات شفاکے ضمن میں وہ حکایت بیان کی گئی ہے۔ جو امام طریقت ابوالقاسم قشیری رحمہ اللہ سے منقول ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ان کا ایک بچہ بیمار ہوگیا اس کی بیماری اتنی سخت ہوگئی کہ وہ موت کے قریب پہنچ گیا۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بچے کا حال پیش کیا۔ حضور نے فرمایا تم آیاتِ شفاء سے کیوں دور ہوتے ہو۔ کیوں ان سے تمسک نہیں کرتے اور شفا نہیں مانگتے۔ میں بیدار ہوگیا اور اس پر غور کرنے لگا تو میں نے ان آیات شفاء کو کتاب الٰہی میں چھ جگہ پایا۔

آیاتِ شفا

(۱) وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (۲) وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ

(۳) يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ

(۴) وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ

(۵) وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۝ (۶) قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَاءٌ

میں نے ان آیتوں کو لکھا اور پانی میں گھول کر بچے کو پلا دیا وہ بچہ اسی وقت شفا پا گیا گویا کہ اس کے پاؤں سے گرہ کھول دی گئی ہو۔ اور شیخ تاج الدین سبکی رحمہ اللہ جو کہ اعاظم علمائے شافعیہ میں سے ہیں بیان کرتے ہیں کہ میں نے بکثرت مشائخ عظام کو بیماروں کی عافیت کیلئے ان آیاتِ شفا کو لکھتے دیکھا ہے اور کاتب الحروف (یعنی شیخ عبدالحق رحمہ اللہ علیہ) نے بھی حضرت شیخ عبدالوہاب متقی کو بیماروں کیلئے اس عمل کو کرتے دیکھا ہے لیکن اس جگہ ایک بات ہے جسے جاننا اور دریافت کرنا چاہیئے وہ یہ کہ یہ آیاتِ کریمہ اور دیگر اذکار وادعیہ جن کو بطور علاج پڑھتے اور ان سے شفا حاصل کرتے ہیں یقیناً یہ فی نفسہٖ نفع وشفا کی حامل ہیں۔ لیکن قبول وصلاحیت کا محل اور فاعل کی قوت وہمت اور اس کی تاثیر بھی اس میں شرط ہے۔ اور جہاں کہیں شفایابی میں اختلاف پڑے تو وہ یا تو فاعل کی تاثیر اور اس کی ہمت کی کمزوری ہوگی۔ یا بسبب عدم قبول ہوگا یا اس جگہ کوئی ایسا قوی مانع ہوگا جو باوجود قوت فاعل اور صلاحیت محل کے وصول اثر

اور ظہور تاثیر سے حاجب و حاجز آیا ہو گا اور یہ بات اَدوِیہ حِسِّیہ میں بھی رونما ہوتی ہے۔ کیونکہ ان دواؤں کی عدم تاثیر کبھی دوا کے لئے بسبب عدم قبول طبیعت ہوتی ہے۔ اور کبھی اس تک دوا اثر کرنے اور وہاں تک پہنچنے میں کسی مانع کا وجود ہوتا ہے اس لئے کہ طبیعت جب دوا کو اچھی طرح قبول اور ہضم کر لیتی ہے تو اس کے ذریعہ بدن مکمل طور پر بحسب قبول انتفاع کرتا ہے۔ اسی طرح دل جب دعائے شفا اور تعویذوں کو پورے طور پر قبول کر لیتا ہے اور فاعل کی جانب سے ہمت قوی ہوتی ہے تو ازالہ مرض میں خاص اثر دکھاتا ہے۔ اسی طرح ازالہ مرض، دفع بلا اور حصول مطلوب میں دعا بہت قوی اسباب میں سے ہے لیکن کبھی کبھی اس کا اثر برخلاف ہوتا ہے اور یہ یا تو اس کے اس ضعف کی بناپر ہو گا جو فی نفسہ اس میں موجود ہو گا جیسے کہ کوئی دعا مانگتا ہے اور حق تعالیٰ اس دعا کو اس بندے کیلئے بہتر نہیں جانتا با یں جہت کہ اس کی قبولیت میں حقانیت وانصاف کی حد سے تجاوز پایا جاتا ہے جو اس کی ذات اقدس سے بعید ہے یا اس ضعف کی بناپر ہوا جو دعا مانگنے والے کے دل میں ہے کہ وہ پوری دل سوزی اور کامل دلجمعی کے ساتھ دعا مانگتے وقت خدا کے حضور حاضر نہیں ہے یا اس بناپر ہو گا کہ اس کی حالت میں حصول مدعا کیلئے کوئی امر مانع ہے مثلاً اکل حرام یا دل پر دین کی تاریکی کا عارض ہونا یا دل پر غفلت، لہو اور کھیل کود کا غالب ہونا وغیرہ۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حق تبارک وتعالیٰ قلب لاہی، تباہی یعنی جس کا دل کھیل کود اور لغویت میں مبتلا رہے اور خدا سے غافل ہے اس کی دعا قبول نہیں فرماتا اور دعا بلا کی دشمن ہے وہ اسے دور کرتی ہے اور درست بناتی اور دعا بلاؤں کے اترنے سے روکتی ہے اور اترنے کے بعد یا تو دفع کرتی ہے یا اس میں تخفیف کرتی ہے اور دعا مومن کا ہتھیار ہے۔

اور اگر دعا حضور قلب، جمعیتہ کاملہ بر مطلوب کے ساتھ مانگی جائے اور قبولیت کے اوقات میں خشوع وخضوع، انکساری وتذلل اور تضرع وطہارت کے ساتھ دونوں ہاتھ اٹھا کر حمد وصلوٰۃ کے ساتھ بعد از توبہ واستغفار، صدق والحاح وتملق، توسل باسماء وصفاتِ الٰہی وتوجہ صادق بحضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور دعا کی تمام شرائط کے ساتھ کرے تو ایسی دعا اس تیراندازی کی مانند ہے جس کا تیر وکمان ٹھیک ہو اور درست ہو اور بازو میں بھی پوری قوت ہو اور نشانہ بھی سامنے ہو اور وہ قابل تاثیر وصلاحیت ہو اور درمیان میں نشانہ تک پہنچنے میں کوئی روک اور مانع نہ ہو اور تیراندازی کا علم رکھتا ہو اور اس کے آداب وشرائط سے بھی واقف ہو۔

اب رہا ان معوذات وغیرہ سے جو کہ اسماءِ الٰہی سے ہیں ان سے طلب شفا کرنا تو یہ بھی از قسم طب روحانی ہے۔ اگر وہ نیکوں، متقیوں اور پرہیز گاروں کی زبان پر پوری ہمت وتوجہ کے ساتھ جاری ہوں لیکن چونکہ اس قسم کا وجود شاذ ونادر ہے اس لئے لوگ طبِ جسمانی کی طرف دوڑتے ہیں اور اس سے غافل وبے پرواہ بیٹھے رہتے ہیں۔ معوذات سے مراد وہ ہے جو حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس" پڑھ کر اپنے اوپر دم فرمایا کرتے تھے اور بعض قل ہو اللہ احد اور قل یٰۤاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ بھی مراد لیتے ہیں۔ یا ہر وہ جگہ جہاں قرآن میں متضمن استعاذہ آیات واقع ہوئی ہیں مثلاً۔ "رَبِّ اَعُوْذُبِکَ مِنْ ھَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ وَاَعُوْذُبِکَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ۔" وغیرہ اور اس باب میں جس میں ہم بحث کر رہے ہیں ان سے بہت زیادہ عام مراد ہے۔ اور استعاذہ کے ضمن میں اوراد ووظائف بکثرت وارد ہیں۔

بلاشبہ علماء کرام نے تین شرطوں کے مجتمع ہونے کے وقت رقیہ یعنی دعائے شفا کے جائز ہونے پر اجماع کیا ہے۔ پہلی شرط یہ کہ وہ دعا کلام خدا اور اس کے اسماء وصفات کے ساتھ ہو خواہ عربی زبان میں ہو یا کسی اور زبان میں مگر یہ کہ اس کے معنی جانے جاتے ہوں۔ اور اس اعتقاد کے ساتھ ہو کہ مؤثر حقیقی حق تبارک وتعالیٰ ہی ہے۔ اور اس رقیہ یعنی دعا کی تاثیر اس کی مشیت وتقدیر پر موقوف ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یہ دعائیں اور اوراد ووظائف اور دیگر وہ اسباب جو ہم کرتے ہیں کیا اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو بدل دیتے ہیں۔ فرمایا یہ بھی تقدیر الٰہی سے ہی ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ کہا ہم زمانہ جاہلیت میں منتر و جنتر پڑھا کرتے تھے۔ ہم نے عرض کیا یارسول اللہ اس ضمن میں حضور کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ فرمایا اپنے منتر کو میرے سامنے پیش کرو۔ اگر اس میں شرکی باتیں نہ ہوئیں تو پڑھ سکتے ہو کوئی مضائقہ نہیں۔

نا دزہر عقرب:۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منتروں کے پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ اس کے بعد کچھ صحابہ کرام خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے یارسول اللہ ہمارے پاس بچھو کے کاٹے کا ایک منتر ہے جسے ہم کرتے ہیں پھر اس منتر کو سنایا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس میں کوئی حرج نہیں دیکھتا تم کرو اور فرمایا جس سے جتنا ممکن ہو اپنے بھائی کو نفع پہنچائے۔ اسی عموم سے ایک گروہ نے تمسک واستدلال کیا ہے اور ہر مجرب و نفع دینے والے منتروں کو جائز رکھا ہے اگرچہ اس کے معنی معلوم نہ ہوں لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ جس کے معنی معلوم نہ ہوں نہ کریں۔ مبادا کہ متضمن شرک ہو۔ یہ حکم غیر ماثور میں ہے ورنہ جو ماثور ہیں جیسا کہ بچھو کے کاٹے میں آیا ہے کہ "بِسْمِ اللہِ وَ بِشَجَّۃٍ قَرَنِیَّۃٍ مِلْحِ بَحْرٍ قَفْقَطَا۔" وہ جائز ہوگا بے شبہ۔ اور یہ تو عوف بن مالک کی حدیث سے یقیناً معلوم ہو گیا کہ ہر وہ رقیہ جو متضمن شرک ہے جائز نہیں ہے اسی طرح سریانی و عبرانی زبان کی وہ دعائیں اور اسماء جن کے معنی معلوم نہیں ہیں انہیں نہ پڑھنا چاہئے۔

حکایت مشائخ میں منقول ہے کہ ایک شخص کوئی دعا پڑھ رہا تھا ایک اور شخص اس جگہ موجود تھا اس نے کہا اسے کیا ہو گیا ہے کہ یہ مرد خدا اور اس کے رسول کو گالیاں دے رہا ہے۔ اتفاق سے اس دعا کا مضمون ہی ایسا تھا اور وہ شخص لاعلمی میں اسے پڑھ رہا تھا یارب (خدا کی پناہ)۔

مگر بعض کلمات ثقہ حضرات سے ایسے منقول ہیں جن کے معنی معلوم نہیں اور مشائخ عظام سے تواتر کے ساتھ ان کا پڑھنا مروی ہے جیسے کہ حرز یمانی جسے سیفی بھی کہتے ہیں۔ اس کے ماسوا اور بھی ایسی دعائیں ہیں جنہیں وہ پڑھتے ہیں۔ (واللہ اعلم)

ابن ماجہ وابو داؤد کی حدیث میں آیا ہے اور حاکم نے بروایت سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ اس کی تصحیح کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رقیہ، تمیمہ اور تولہ شرک ہے۔ رقیہ جاہلانہ منتروں پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور تمیمہ بجر ہٹو وغیرہ کو کہتے ہیں جو کالے سفید دانے بچوں کے گلوں میں بلاؤں کے دور کرنے کی غرض سے لٹکا دیتے ہیں اور تولہ ٹوٹکے اور ٹونے کو کہتے ہیں جو عورتیں مردوں کو اپنا گرویدہ بنانے کیلئے کرتی ہیں۔ یہ ایک قسم کا جادو ہے اور دعا حزب اور رقیہ جسے کاغذ کے ٹکڑے پر لکھا جاتا ہے اسے "تعویذ" کہتے ہیں اسے گردن یا بازو پر باندھتے ہیں۔ بعض علماء ان کو بھی منع کرتے ہیں لیکن جن علماء کے پاس حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کی سند ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خوف و پریشانی اور بے خوابی کے ازالہ کیلئے انہیں یہ کلمات تلقین فرمائے تھے کہ:۔

اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللہِ التَّآمَّۃِ مِنْ غَضَبِہٖ وَعِقَابِہٖ شَرِّ عِبَادِہٖ وَمِنْ ھَمَزَاتِ الشَّیَاطِیْنِ وَاَنْ یَّحْضُرُوْنِ

اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ ان بچوں کو جو عقل رکھتے سکھاتے اور وہ بچے جو عقل و سمجھ نہیں رکھتے انہیں کاغذ کے ٹکڑے پر لکھ کر گردن میں لٹکاتے وہ علماء اسے جائز رکھتے ہیں۔

اور تعویذ کا لفظ حدیث میں آیا ہے جیسے:۔ "تَعْوِیْذُ الطِّفْلِ بِکَلِمَاتِ اللہِ التَّآمَّۃِ الْحَدِیْث۔" اور "تعویذات النبی" وغیرہ جیسا کہ ان کا ذکر آگے آئے گا۔ تعویذ کے معنی اللہ عزوجل سے شر و خوف سے استعاذہ و پناہ مانگنا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ حضرت زینب سے منقول ہے کہ حضرت عبداللہ نے میری گردن میں ایک ڈورا

گیا گیا ہے تو عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اس کو پکڑا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور فرمایا عبداللہ رضی اللہ عنہ کے گھر والے شرک سے بے نیاز ہیں انہیں اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جنتر منتر اور گنڈے، بجر بٹوا اور ٹونے ٹوٹکے شرک ہیں۔ زینب رضی اللہ عنہ نے کہا آپ ایسا کیوں فرماتے ہیں؟ بات یہ ہے کہ میری آنکھ درد کی شدت میں نکلی پڑتی تھی اور اس میں چیپڑ اور آنسو بھرے رہتے تھے تو میں فلاں یہودی کے پاس گئی اس نے کچھ پڑھ کر میری آنکھ پر دم کیا تو میری آنکھ کا تمام دکھ درد اسی وقت جاتا رہا اور مجھے سکون مل گیا۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا تمہاری آنکھ کا یہ درد شیطان کے عمل سے تھا کہ اس نے تمہاری آنکھ میں چوکھنے لگائے۔ جب اس نے منتر پڑھا تو وہ باز آ گیا۔ حالانکہ تمہیں یہ لازم تھا کہ تم وہ پڑھتیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ:

اَذْهِبِ الْبَاْسَ رَبَّ النَّاسِ وَاشْفِ اَنْتَ الشَّافِی لَا شِفَاءَ اِلَّا شِفَاءُكَ شِفَاءً لَّا يُغَادِرُ سَقَمًا۔ (رواہ ابوداؤد)

شرک کی مانند انہیں کیوں کہا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جاہلیت کے لوگ ان میں حقیقی اثر کا اعتقاد رکھتے اور غیر خدا کے نام پر کرتے ہیں۔ تو وہ جو نام خدا اور کلام خدا سے ہو وہ اس حکم میں نہ ہوگا۔ اور وہ کیسے شرک ہو سکتا ہے جب کہ اس بارے میں احادیث و اخبار صحیحہ وصریحہ وارد ہیں۔ اور خدا کے حضور گڑگڑانے اور التجائیں کرنے کی مشروعیت میں کوئی اختلاف نہیں ہے خواہ یہ کسی طرح ہے اور کسی موقع پر ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ ان منتروں کی ممانعت ہے جو اہل عزائم اور مدعیان تسخیر جنات پڑھتے ہیں اور ان میں امور مشتبہ اور حق و باطل سے مرکب کلمات استعمال کرتے ہیں کیونکہ ذکر خدا اور اسماء باری تعالیٰ کے ساتھ اسماء شیاطین اور ان کے ذکر کو ملاتے ہیں اور ان سے استغاثہ کرتے اور ان سے پناہ تلاش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جنات تعلق کی بنا پر اپنی طبیعت میں انسان سے خاص دشمنی رکھتے ہیں۔ اور شیاطین سے دوستی رکھتے ہیں۔ اور جب منتروں کو شیاطین کے ناموں کے ساتھ پڑھا جاتا ہے تو وہ اسے قبول و پسند کرتے ہیں اور اپنی جگہ سے نکل جاتے ہیں۔ یہی حال جانور کے کاٹے کا ہے۔ کیونکہ یہ بھی جنات کے اثر سے ہوتا ہے اور جنات سانپ بچھو کی طرح اختیار کر لیتے ہیں تو جب بھی شیاطین کے ناموں کے ساتھ منتر پڑھا جاتا ہے تو اس کا زہر ان کے بدنوں میں سرایت کر جاتا ہے۔ اس بنا پر وہ منتروں سے بھاگتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ علماء امت کا اس پر اجماع ہے کہ جو منتر کتاب اللہ اور اسماء وصفات باری تعالیٰ کے سوا ہیں وہ مکروہ ہیں۔

جاننا چاہئے کہ اس مقام کا حاصل یہ ہے کہ قرطبی جو فقہ و حدیث کے مشاہیر علماء میں سے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ "رقایا" کی تین قسمیں ہیں ایک وہ جس سے زمانہ جاہلیت میں رقیہ کرتے تھے اور اس کے معنی معلوم نہیں ہیں۔ اس قسم کے رقایا اور منتروں سے بچنا واجب ہے۔ ممکن ہے کہ اس میں کوئی شرک ہو یا مؤدی بشرک ہو۔ دوسرا وہ جو کتاب اللہ اور اسماء وصفات باری تعالیٰ عزاسمہ سے ہو تو یہ جائز ہے اور اگر کوئی چیز ماثور ہے تو وہ مستحب ہے تیسرا وہ جو غیر خدا کے ناموں سے ہے مثلاً فرشتہ یا بندۂ صالح یا کوئی اور معظم مخلوق جیسے عرش و کرسی وغیرہ تو اس قسم سے اجتناب واجب نہیں ہے۔ اور اس کا ترک اس بنا پر اولیٰ ہے کہ اس میں غیر خدا سے التجا کا وجود ہے اور اگر متضمن تعظیم مرقّی بہ ہے تو اس سے اجتناب لازم ہے۔ جس طرح کہ غیر خدائے عزوجل سے قسم کھانا۔

بندۂ مسکین (یعنی شیخ محقق رحمہ اللہ) عفی اللہ عنہ کہتا ہے کہ محبوبان خدا اور اسماء الٰہی سے تمسک و توسل کرنا اس لئے جائز ہے کہ انہیں بارگاہ حق اور درگاہِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم میں قرب و منزلت حاصل ہے اور اگر ہم ان کی تعظیم بھی کرتے ہیں تو اسی وجہ سے کہ انہوں نے خدا کی بندگی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت خوب کی ہے یہ استقلال و استبداء کے طور پر نہیں ہے اس کو غیر

خدائے عزوجل کے ساتھ قسم کھانے پر قیاس نہیں کر سکتے بلکہ بطریق توسل وتشفع ہے نہ کہ بطریق اشتراک جیسا کہ جہال اور عوام الناس کرتے ہیں (اللہم صل علیٰ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وسلم)

حضرت ربیع رحمتہ اللہ علیہ سے منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے امام شافعی رحمہ اللہ سے رقیہ یعنی دعائے شفا کے بارے میں پوچھا تو فرمایا کوئی حرج نہیں اگر وہ کتاب اللہ اور جانے پہچانے ذکر الٰہی سے ہو۔ میں نے کہا کیا یہ صحیح ہے کہ مسلمان اہل کتاب سے رقیہ کرتے ہیں؟ فرمایا ہاں جب کہ وہ ان کلمات سے جو جانے پہچانے اور کتاب خدا اور ذکر الٰہی سے ہوں۔ انتہیٰ ظاہر یہ ہے کہ کتاب خدا سے مراد قرآن ہو گا ورنہ چونکہ توریت وغیرہ میں تغیر و تحریف واقع ہو گیا ہے تو ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ شرط یہ ہے کہ ان کا مضمون حق کے موافق اور قرآن کے مطابق ہو۔

امام مالک رحمہ اللہ موطا میں سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے یہودی عورت سے فرمایا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے لئے کتاب خدا سے رقیہ کر۔ نووی فرماتے ہیں کہ امام مالک رحمہ اللہ کا یہود ونصاریٰ سے مسلمان کیلئے رقیہ کرانے کے قول میں علماء اختلاف رکھتے ہیں۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ جواز کے قائل ہیں۔ ابن وہب امام مالک سے روایت کرتے ہیں کہ لوہے کی چیز اور نمک اور ڈورے میں گرہ لگانے سے رقیہ کرنا مکروہ ہے اور وہ جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگشتری سے متعلق ہے لکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ قدیم زمانہ کے لوگوں کے معمولات میں نہ تھا۔ مطلب یہ کہ وہ بدعت و مکروہ ہے۔

تنبیہ:۔ اکثر و بیشتر عامتہ الناس کی غلطیوں کی بنیاد اس سے یہ ہے کہ ان افسوں ہائے باطلہ اور شگوفہائے جاہلیت کی عجیب وغریب تاثیر پاتے ہیں اور حیران ہو کر رہ جاتے ہیں کہ رقیہ ہائے مشروعہ سے کبھی ایسے اثرات ظاہر نہیں ہوتے۔ ایسے موقع پر وہ انکار کی روش اور حیرت کے گڑھے میں گر پڑتے ہیں جیسا کہ حضرت زینب زوجہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ظاہر ہوا ہے کہ انہوں نے کہا میں کیا کروں کہ جس وقت میری آنکھ درد سے نکل پڑتی تھی اس وقت فلاں یہودی سے افسوں کرایا تو اسی وقت درد جاتا رہا۔ حالانکہ عام لوگ اتنا نہیں جانتے کہ فاد و بطلان کا مطلب یہ ہے کہ شارع علیہ السلام نے ان کی ممانعت فرمائی ہے اور شارع علیہ السلام کے نزدیک اس ممانعت کی حکمت اور ظاہری فائدہ و مقصود یہ ہے کہ انہیں شرک اور کفر کے گڑھے سے نکالیں۔ لہٰذا جن لوگوں کا قدم صدق وایمان کے مقام میں ثابت و مستحکم ہے وہ کسی حال میں ان چیزوں کا ارتکاب نہیں کرتے خواہ وہ ہلاکت اور حیات فانی کے زوال کے خطرہ میں ہی مبتلا کیوں نہ ہوں اور وہ یقین رکھتے ہیں کہ سعادت ابدی اور باقی رہنے والی حیات وزندگی، شارع علیہ السلام کے حکم کے بجالانے میں ہے اور جن لوگوں کا مطمح نظر دنیاوی زندگی ہے وہ مقام استقامت سے لڑھک جاتے ہیں اور کفر و معصیت کے گڑھے میں گر پڑتے ہیں۔ اعاذنا اللہ من ذالک۔

ہمارے شہروں میں ایک افسوں ہے جس کی نسبت واضافت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری قدس سرہ کی طرف کرتے ہیں۔ اور لوگ اس سے شغف رکھتے ہیں۔ اور جب اس کی نسبت حضرت شیخ رحمہ اللہ کی طرف لکھا پاتے ہیں تو اور زیادہ اس کے گرویدہ و متوالے ہو جاتے ہیں اور اس میں ایسے اسماء ہیں جو ہندوؤں کی زبانوں میں مشہور و معروف ہیں تو اس سے اجتناب لازمی و ضروری سمجھنا چاہئے (واللہ اعلم بحقیقتہا)۔

رقیہ ہائے ماثورہ

وصل:۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر باب میں رقیہ یعنی دعائے شفا مروی ہے خصوصاً آنکھ اور زہریلے جانور کے کاٹے

کے سلسلے میں۔ حتیٰ کہ حدیث میں آیا ہے کہ نظر بد اور زہریلے جانور کے کاٹے اور نملہ یعنی اس پھوڑے پر جو انسان کے پہلو پر نکلتا ہے آپ افسوں کرنے کی تاکید فرماتے ہیں۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ:۔ لَارُقْیَۃَ اِلَّا فِیْ نَفْسٍ اَوْ حُمَّۃٍ " افسوں کی اجازت نہیں ہے مگر نظر بد اور جانور کے کاٹے میں، حمہ سے مراد زہریلے جانور کا کاٹنا اور نفس سے مراد نظر بد ہے اور ایک روایت میں "لدغ" زیادہ کیا گیا ہے۔ لدغ سے مراد دانتوں والے زہریلے جانور کا کاٹنا ہے۔ جیسے سانپ وغیرہ اور حصر سے مراد مبالغہ ہے نہ کہ ان چیزوں کے ساتھ رقیہ کی تخصیص۔ اس لئے کہ رقیہ انہیں چیزوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام امراض و آلام میں مشروع و مسنون ہے جیسے کہ تپ و لرزہ، درد سر، درد دندان وغیرہ ہیں۔

بدنظری:۔ رسول کریم علیہ التحیتہ والتسلیم نے فرمایا "العین حق" یعنی بد نظری اور اس کی کار فرمائی نفس الامر میں موجود وثابت ہے اور حق تعالیٰ نے بعض جانوں میں ایسی خاصیت رکھی ہے کہ جب وہ کسی چیز کی طرف اچھی نظر سے دیکھتے ہیں تو وہ چیز نقصان پہنچاتی ہے جس طرح کہ جادو میں ہے۔

اور فرمایا:۔ "لَوْ کَانَ شَیْءٌ سَابِقَ الْقَدَرِ لَسَبَقَتْہُ الْعَیْنُ" اگر کوئی چیز ایسی ہوتی کہ سبقت کرے قضا و قدر پر تو ضرور آنکھ، (بدنظری) سبقت کرتی۔ اور بد نظری کی تاثیر میں یہ مبالغہ ہے۔ اور دوسری حدیث میں آیا ہے کہ قضا و قدر کے بعد اکثر لوگ بد نظری کا شکار ہوتے ہیں۔ علماء کی اکثریت کا مذہب یہ ہے کہ عین یعنی بد نظری حق ہے۔ اور مبتدعین کا ایک گروہ مثلاً معتزلہ اور ہر وہ شخص جو ان کی روش پر چلے اس میں شک و شبہ کرتے ہیں۔ حالانکہ جب مخبر صادق ﷺ نے اس کی خبر دیدی ہے تو اس پر اعتقاد واجب اور انکار باطل ہے۔

اگر کوئی کہے کہ سب کچھ تقدیر الٰہی سے ہے بد نظری کا کیا اعتبار؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بد نظری بھی تقدیر الٰہی سے ہے اور آنکھ کی تاثیر ذاتی نہیں ہے۔ اور ہر وہ شخص جو اہلِ سنت و جماعت کے طریقہ پر ہے کہے گا کہ یہ از اسباب عادی ہے بایں معنی کہ عادت الہیہ اسی طرح جاری ہے کہ جب ایک شخص دوسرے کے سامنے آئے اور اس کی طرف بنظر استحسان دیکھے تو حق تعالیٰ اس میں ضرر پیدا فرماتا ہے۔ لیکن وہ چیز جو دیکھنے والے کی آنکھ سے نکلتی ہے اور شیئ مقابل کو پہنچتی ہے تو نفی و اثبات کے کسی پہلو پر جزم نہیں کر سکتے یہ دونوں جانب محتمل ہے۔ اور بعض اصحاب طبایع کہتے ہیں کہ دیکھنے والے کی آنکھ سے جواہر لطیفہ غیر مرئیہ پھوٹتی ہیں۔ اور شیئ مقابل پر جا کر جم جاتی ہیں۔ اور باہر کی شیئ مسامات کے ذریعہ اس کی آنکھ میں داخل ہوتی ہے اس وقت حق تعالیٰ ہلاکت کو اس کے نزدیک پیدا فرماتا ہے اسی طرح جس وقت کہ زہر پیتے وقت ہلاکت کو پیدا فرماتا ہے۔ یہ بات محتمل ہے کیونکہ قطعی و یقینی بات کا دعویٰ کرنا غلط ہے۔ اور بعض بد نظروں سے منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ جب ہم کسی چیز کو دیکھتے ہیں اور وہ چیز ہمیں اچھی معلوم ہوتی ہے تو اپنی آنکھوں سے خاص قسم کی حرارت نکلتی پاتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ دیکھنے والے کی آنکھ سے زہریلی قوت پھوٹتی ہے جو دیکھی ہوئی شے پر چسپاں ہو جاتی ہے۔ اور وہ ہلاکت و فساد کرتی ہے۔ اس زہر کی مانند جو سانپ کے ڈسنے سے ہے برپا کرتی ہے۔ اور بعض سانپ تو تیز نظر کے ذریعہ زہر پہنچاتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ کوئی تیز چیز دیکھنے والے کی آنکھ سے دیکھی ہوئی چیز کی طرف جاتی ہے اگر کوئی ایسی چیز مانع نہ ہو جو اسے اس سے محفوظ نہ کر سکے اور بچا سکے تو وہ پہنچ کر اثر انداز ہو جاتی ہے اور اگر درمیان میں کوئی مانع حائل ہے مثلاً کلمات، حرز، تعوذ اور دعا وغیرہ تو وہ سپر بن کر اس کے وصول و نفوذ سے محفوظ رکھتی ہے اور اگر سپر سخت و قوی ہو تو ممکن ہے کہ اسی کے جانب تیر کی مانند پلٹا دے۔

اور اس علت یعنی بد نظری کا نبوی علاج، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے معوذات کے ذریعہ تھا یعنی وہ آیات و کلمات جن میں شرور سے استعاذہ ہے جیسے معوذتین، سورۂ فاتحہ، آیۃ الکرسی وغیرہ۔ علماء کہتے ہیں کہ سب سے اہم و اعظم رقیہ، سورۂ فاتحہ، آیۃ الکرسی اور

معوذتین کا پڑھنا ہے۔ اور ان تعویذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ضمن میں جو احادیث صحیحہ سے ثابت شدہ ہیں ایک یہ ہے کہ۔

اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّامَّاتِ الَّتِیْ لَا یُجَاوِزُھُنَّ بَرٌّ وَّلَا فَاجِرٌ وَّ بِاَسْمَآءِ اللّٰہِ الْحُسْنٰی مَا عَلِمْتُ مِنْھَا وَمَا لَمْ اَعْلَمْ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَمَا بَرَأَ وَمِنْ شَرِّ مَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمِنْ شَرِّ مَا یَعْرُجُ فِیْھَا وَمِنْ شَرِّ مَا ذَرَأَ فِی الْاَرْضِ وَمِنْ شَرِّ مَا یَخْرُجُ مِنْھَا وَمِنْ شَرِّ فِتَنِ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَمِنْ شَرِّ طَوَارِقِ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ اِلَّا طَارِقًا یَّطْرُقُ بِخَیْرٍ یَا رَحْمٰنُ۔

اور نظر بد کے دفع کرنے کے لئے یہ کہنا چاہئے۔ "مَا شَآءَ اللّٰہُ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔" اور اگر دیکھنے والا اس سے خوفزدہ ہے کہ اپنی ہی نظر کا ضرر اسے نہ پہنچے تو وہ یہ کہے۔ "اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلَیْہِ" یہ نظر بد کو دور کر دے گا۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ نے سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ غسل کر رہے ہیں۔ اور وہ خوبرو اور حسین ہیں۔ اس پر عامر رضی اللہ عنہ کو ان کے حسن بدن پر تعجب ہوا اور وہ کہنے لگے خدا کی قسم! میں نے اتنا خوش نما بدن نہ کسی پردہ نشین عورت کا دیکھا اور نہ کسی مرد کا سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ اسی دم چکرائے اور زمین پر گر پڑے اس کی اطلاع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پہنچی تو فرمایا کسی پر تہمت دھرتے ہو۔ لوگوں نے عرض کیا کہ عامر رضی اللہ عنہ نے اس کے بدن کو دیکھ کر تحسین و تعریف کی اس کے بعد آپ نے عامر رضی اللہ عنہ کو طلب فرمایا اور اظہار ناراضگی کرتے ہوئے فرمایا جب تمہیں اپنے بھائی کی کوئی چیز اچھی معلوم ہوئی اور تم نے اسے دیکھا اور تمہاری نظر میں وہ اچھا معلوم ہوا تو تم نے "اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلَیْہِ" کیوں نہ پڑھا۔ اس کے بعد فرمایا سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کے لئے اپنے بدن کا غسالہ دو تو انہوں نے اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھ کہنیوں تک اور دونوں ٹانگیں ران اور شرمگاہ تک دھو کر ایک پیالہ میں دیا پھر وہ غسالہ سہل رضی اللہ عنہ کے سر اور پشت پر ڈالا گیا وہ اسی وقت اچھے ہو کر لوگوں کے ساتھ چل دیئے گویا انہیں کوئی ضرر پہنچا ہی نہ تھا۔ مواہب لدنیہ میں بروایت ابن کثیر نہایہ سے نقل کر کے اعضاء کے دھونے اور اس کی خاص کیفیت کے بیان میں کہا ہے کہ قوم کی یہ عادت تھی جس کسی کو کسی کی بد نظری لگتی تو پانی کا ایک برتن دیکھنے والے کے پاس لاتے وہ اپنے داہنے ہاتھ سے پانی کو جسم پر ڈالتا اور کلی کرتا اور برتن میں پانی ڈالتا اس کے بعد اپنے چہرہ کو برتن میں دھوتا پھر بایاں ہاتھ برتن میں ڈالتا پھر پانی کو برتن سے جسم پر ڈالتا اور داہنے ہاتھ پر بہاتا پھر داہنا ہاتھ پانی میں ڈالتا اور بائیں ہاتھ پر بہاتا۔ پھر بایاں ہاتھ پانی میں ڈالتا اور داہنی کہنیوں پر بہاتا پھر بایاں ہاتھ ڈالتا اور بائیں کہنیوں پر بہاتا پھر بایاں ہاتھ ڈالتا اور داہنے قدم پر ڈالتا پھر داہنا ہاتھ ڈالتا اور بائیں قدم پر ڈالتا پھر بایاں ہاتھ ڈالتا اور داہنے زانو پر بہاتا پھر داہنا ہاتھ ڈالتا اور بائیں زانو پر بہاتا اس کے بعد تہبند کے اندر شرمگاہ کو دھوتا اور پاؤں زمین پر نہ رکھتا پھر اس آب غسالہ کو نظر بد لگنے والے کے سر پر پیچھے کی جانب بہایا جاتا تو وہ باذن خدا تندرست ہو جاتا (انتہی) مخفی نہ رہنا چاہئے کہ ابن کثیر نے قوم کی جو عادت بیان کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی ایسا ہی کیا گیا (واللہ اعلم) بہر تقدیر اس کا بھید عقل کی راہ سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔

قاضی ابو بکر بن العربی فرماتے ہیں کہ اگر کوئی متشرع اس میں توقف کرے تو اس سے کہنا چاہئے کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جاننے والے ہیں تجربہ سے اس کی تائید اور معائنہ سے اس کی تصدیق کی گئی ہے اور اگر کوئی فلسفی توقف کرے تو اس کا رد بہت آسان ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک مقرر و ثابت ہے کہ بعض دوائیں اپنی قوت سے تاثیر کرتی ہیں اور اپنی خاصیت سے کام کرتی ہیں تو یہ بھی اسی قبیل سے ہے اور کہربا اور آہن ربا یعنی مقناطیس بھی اسی قبیل سے ہے۔ اب رہا یہ کہ داخلہ ازار یعنی شرمگاہ سے کیا مراد ہے بعض کہتے ہیں کہ فرج مراد ہے جو کہ طرف ازار ہے اور وہ جو داہنی جانب سے اس کے بدن سے ڈالا گیا ہے۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں

کہ مراد اس کا جسم ہے جو کہ ازار سے متصل ہے یا موضع ازار کا جسم مراد ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ مراد "سرہ" ہے جو کہ مقعد ازار ہے۔

سلف صالحین کی جماعت یہ جائز رکھتی ہے کہ آیات قرآنیہ لکھ کر نظر بد لگے ہوئے کو پلایا جائے مجاہد فرماتے ہیں کہ کوئی حرج نہیں ہے کہ قرآن کو لکھ کر اور اسے دھو کر بیمار کو پلایا جائے۔ خواہ مطلق قرآن لکھ کر یا کوئی ایسی آیت جو مناسب شفا ہو یا مشتمل بر ذکر اسماء و صفاتِ باری تعالیٰ ہو ہوا لانسب۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک عورت درد زہ میں مبتلا تھی آپ نے ایک آیت یا دو آیتیں قرآن کی بتائیں اور فرمایا کہ انہیں لکھ کر اور دھو کر اسے پلا دو۔ پہلے بھی شیخ امام ابو القاسم قشیری کی حکایت آیات شفا میں گذر چکی ہے وہ بھی اسی معنی کی تائید کرتی ہے۔

حکایت:۔ ابو عبداللہ نباجی رحمہ اللہ علیہ سے ایک حکایت مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں اونٹ پر سوار سفر میں جا رہا تھا۔ میرے ہمراہیوں کے درمیان ایک ایسا شخص تھا جو نظر بد لگانے میں منسوب تھا وہ جس چیز پر اچھی نظر ڈالتا وہ گر کر تلف ہو جاتی۔ اور عبداللہ نباجی رحمہ اللہ علیہ سے لوگوں نے کہا اپنے اونٹ کو اس کے شر سے محفوظ رکھو۔ نباجی رحمہ اللہ علیہ نے کہا اسے میرے اونٹ پر کوئی قدرت نہیں ہے جب اس بد نظر شخص کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ اس گھات میں رہا کہ نباجی رحمہ اللہ علیہ ادھر ادھر ہو تو اونٹ پر نظر بد لگائے۔ جس وقت نباجی رحمہ اللہ علیہ دور ہوا تو وہ اس کی قیام گاہ پر آیا اور اس کے اونٹ پر نظر بد ڈالی۔ اونٹ اس طرح تڑپ کر گر پڑا جس طرح درخت جڑ سے اکھڑ کر گر پڑتا ہے۔ نباجی رحمہ اللہ علیہ کو خبر کی گئی کہ بد نظر نے اونٹ پر نظر بد لگائی ہے۔ وہ آئے اور بد نظر کو دیکھ کر یہ رقیہ پڑھا۔

بِسمِ اللہ حبس حَابسٍ وَشَجرٍ یابسٍ وشہاب قابسٍ رُدِدَت عینُ العاینِ وَعلیٰ احبَّ الناس الیہ

فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِيْرٌ۝

جب نباجی رحمہ اللہ علیہ نے یہ دعا پڑھی تو اس وقت اس مردِ نظرِ بد کی آنکھ اپنے حلقۂ چشم سے نکل کر باہر گر پڑی اور اونٹ تندرست ہو کر کھڑا ہو گیا۔ یہ دعا و رقیہ بھی نظرِ بد کیلئے ہے۔

مواہب لدنیہ میں ابن قیم سے منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ بد نظری کے علاج کے سلسلے میں اس سے احتراز و اجتناب اور اس شخص سے جس کی نظر سے خطرہ ہو خوبصورت چیز کو اس کی نظر سے بچانے کے سلسلے میں ایسی چیز لگانا جس سے اس کی نظر پلٹ جائے جائز ہے جیسا کہ بغوی نے شرح السنہ میں نقل کیا ہے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے ایک خوبصورت بچے کو دیکھا تو انہوں نے فرمایا کہ اس کی ٹھوڑی پر سیاہ نقطہ لگا دو تا کہ اسے نظر بد نہ لگے۔ (کذافی المواہب) مخفی نہ رہنا چاہئے کہ بچے کی تھوڑی میں سیاہ نقطہ لگانے سے اس کی خوبصورتی چھپانا نہیں ہے بلکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ بھی ایک بھید ہے جو بد نظری کے ضرر سے محفوظ رکھتا ہے۔ اور رقیہ کا حکم رکھتا ہے۔ (واللہ اعلم)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمہ کے گھر ایک لڑکی کو دیکھا جس پر جن کی نظر کا اثر تھا۔ صحیحین کے الفاظ ایسے ہی ہیں کہ لڑکی کو دیکھا کہ اس کے چہرے پر زردی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس لڑکی کے لئے افسوں پڑھو کیونکہ اس پر جن کی نظر کا اثر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح آدمی کی نظر لگتی ہے اسی طرح جن کی بھی نظر لگتی ہے اور کہتے ہیں کہ جن کی نظر تیر سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے گئے وہاں ایک لڑکی کے چہرے پر زردی دیکھی لوگوں نے عرض کیا اسے نظر بد لگی ہے فرمایا نظر بد کا افسوں کیوں نہیں پڑھتے۔ کہتے ہیں کہ نظر بد لگنا عجب و استحسان کے سبب ہوتا ہے اگرچہ دشمنی و حسد نہ ہو اور مرد صالح کی جانب سے محبت کے طور سے بھی ہوتا ہے جیسا کہ عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کی

نظر سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کو لگی۔ دیکھنے والے کو چاہئے کہ جب کوئی چیز اس کی نظر میں اچھی اور بھلی معلوم ہو تو وہ دعا اور برکت میں جلدی کرے یہ بمنزلہ رقیہ ہوگا اور حاکم پر لازم ہے کہ اس شخص کو جس کی نظر لگتی ہو اور وہ اس میں مشہور و معروف ہوا سے لوگوں سے ملنے جلنے سے باز رکھے۔ اور اسے گھر سے باہر نہ نکلنے دے اور اگر وہ محتاج ہے تو اسے اتنی روزی دے کہ وہ زندگی گذار سکے۔ اس لئے کہ اس کا ضرر، کوڑھی کے ضرر سے زیادہ سخت ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسے شخص کو لوگوں سے ملنے جلنے سے روکا۔ اور لوگوں کے ساتھ کھانے پینے اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے سے منع فرمایا۔ علمائے کرام نے نظر بد سے ہلاک ہونے والے کی دیت وقصاص کے وجوب میں اختلاف کیا ہے۔ اور قرطبی جو کہ علماء فقہ وحدیث میں سے ہیں فرماتے ہیں کہ اگر عاین کسی چیز کو نظر سے تلف کر دے تو اس پر ضمان ہے اور اگر کسی کو نظر سے مار ڈالے تو اس پر قصاص یا دیت ہے۔ اور اگر اس شخص سے دوبارہ ایسا ہو تو وہ عادی کی مانند ہے اس کا حکم جادوگر کا سا ہے۔ اور نووی روضہ میں فرماتے ہیں کہ اس میں نہ دیت ہے نہ کفارہ۔ اس لئے کہ یہ کام منضبط وعام نہیں ہے اور بعض اشخاص کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور بعض حالتوں میں اس سے یہ فعل واقع نہیں ہوتا بلکہ یہ خاصیت کی قبیل سے ہے اور وہ عمل بد جواس سے سرزد ہوتا ہے وہ قتل واہلاک وزوال حیات میں متعین نہیں ہے اور کبھی وہ عمل بد حاصل ہو جاتا ہے بغیر اس کے کہ اسے ہلاک کرنے کا قصد ہو (انتہی) اور اکابر احناف کے اقوال اس جگہ معلوم نہ ہوئے۔ ناظرین متلاشی رہیں اگر کسی کو معلوم ہو جائے تو اس جگہ لکھ دیں (واللہ اعلم)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام امراض جسمانی کیلئے رقیہ اور دعا کرتے تھے مثلاً بخار تپ ولرزہ مرگی، صداع، خوف، وحشت، بے خوابی، سموم، ہموم، الم، مصائب، غم واندوہ، شدت وسختی، بدن میں درد وتکلیف، فقر وفاقہ، قرض، جلنا درد دنداں، حبس بول، خراج، نکسیر، عسر ولادت اور تمام امراض وآلام اور تمام مصیبت وبلاوشدائد وغیرہ میں ان سب کی دعائیں، رقایا اور تعویذات حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں وہاں سے تلاش کرنا چاہئے۔ اسی طرح جسمانی علاج کے سلسلے میں ادویہ حسیہ سے معالجہ کرنا بھی واقع ہوا ہے۔ اس جگہ ہم اپنے مقصد ومطلب کے لحاظ سے جادو اور اس کا حکم بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ کیونکہ یہودی کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر کرنے کا قصہ طویل کلام کے ساتھ واقع ہے۔

ذکر سحر۔ وصل:۔ صراح میں سحر کے معنی افسوں کرنا اور جادو کرنا لکھا ہے۔ اور سحر حرام ہے۔ اور یہ با جماع گناہ کبیرہ میں سے ہے۔ کبھی کفر بھی ہوتا ہے اگر اس میں کوئی قول یا فعل ایسا ہے جو موجب کفر ہو۔ سحر کو سیکھنا اور سکھانا دونوں حرام ہیں۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ سحر کو سیکھنا اس نیت سے کہ اپنے سے اسے دور کیا جائے تو حرام نہیں ہے۔ ساحر یعنی جادوگر اگر اس کے سحر میں کفر نہ ہو تو تعزیر کی جائے گی اور اگر کفر ہے تو قتل کیا جائے گا۔ اور اس کی توبہ کے بارے میں اختلاف ہے جیسا کہ زندیق میں ہے۔ اور زندیق وہ ہے جو نبوت، دین، حشر ونشر اور قیامت کا منکر ہو۔

سحر کی حقیقت میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ یہ محض تخیل و وہم ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ مطلب یہ کہ سحر زدہ میں جو حالات وانفعال نمودار ہوتے ہیں وہ محض وہم وخیال کی پیداوار ہیں۔ ان کی حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔ یہ ابو بکر استر آبادی شافعیوں میں سے اور ابو بکر رازی حنفیوں میں سے اور کچھ اور لوگوں کا اختیار کردہ مسلک ہے۔ اور نووی فرماتے ہیں کہ مسلک صحیح یہ ہے کہ اس کی حقیقت ہے۔ اسی پر جمہور علماء ہیں اور کتاب وسنت مشہورہ اسی پر دلالت کرتے ہیں۔ کذافی مواہب اور شیخ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ مقام نزاع یہ ہے کہ آیا سحر سے انقلاب ذات اور قلب حقیقت واضح ہوتی ہے یا نہیں۔ جو حضرات تخیل محض کہتے ہیں وہ ان اثرات کو منع کرتے ہیں اور جو حضرات اس کے قائل ہیں کہ وہ حقیقت رکھتی ہے وہ اس میں اختلاف کرتے ہیں کہ آیا یہ محض تاثیر ہے

جیسے کوئی خاص مرض مزاج کو بدل دیتا ہے یا وہ کسی حالت پر منتہی ہوتی ہے جیسے پتھر حیوان بن جائے یا حیوان پتھر ہو جائے۔ جمہور علما پہلی نوع کے قائل ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ سحر کا نہ ثبوت ہے نہ حقیقۃً اس کا کوئی وجود ہے یہ بات مکابرہ و باطل ہے اور کتاب و سنت اس کے برخلاف ناطق ہے اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ جتنی تاثیر قرآن کریم میں سحر کی بیان کی گئی ہے اس سے زیادہ نہیں ہے یعنی "یفرقون بین المرء وزوجہ" میاں بیوی کے درمیان جدائیگی کرتے ہیں، اگر اس سے زیادہ تاثیر ہوتی تو اس کا ذکر کیا جاتا اور از جہتِ عقل و نقل صحیح یہ ہے کہ اگر سحر کی تاثیر واقع ہے اور قرآن کریم میں جو کچھ ہاروت و ماروت کے قصہ میں بیان کیا گیا ہے اتنا یا اس سے زیادہ بھی تاثیر واقع ہو تو زیادتی پر کوئی مخالفت دلالت نہیں کرتی لہٰذا اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔

سحر از حیل صناعیہ ہے یعنی بناوٹی حیلوں کی قسم سے ہے جو اعمال و اسباب سے بطریق اکتساب حاصل ہوتا ہے اور ظاہری اعتبار، سے ان کا شمار خارق عادات سے کرنا مسامحت ہے اور اکثر اس کا وقوع فساق و فجار سے ہوتا ہے اور شرط یہ ہے کہ وہ جنبی اور ناپاک ہو، اور اگر وہ وطی حرام بلکہ محارم کے ساتھ وطی سے جنبی و ناپاک ہوا تو زیادہ دخل انداز ہوتا ہے۔ (کذا قیل)

کہتے ہیں کہ فرعون کے جادوگروں نے جو رسیاں اور لاٹھیاں لپیٹی تھیں اور موسیٰ علیہ السلام نے جو انہیں دوڑتا ہوا خیال فرمایا تھا وہ جادو نہ تھا بلکہ کھوکھلی لکڑیاں تھیں اور رسیاں چمڑے کی خالی تھیلیاں تھی اور ان میں پارہ پھرا یا تھا اور ان کی تہہ میں آگ رکھ دی گئی تھی یا آفتاب کے آگے ڈال دیا گیا تھا تو پارہ جب گرم ہوا تو حرکت کرنے لگا۔ ان کا ایسا کہنا عجیب و غریب ہے کیونکہ حق تبارک و تعالیٰ نے متعدد مقامات میں سحر و جادو کا ذکر فرمایا ہے۔ اور بعض جگہوں پر تو سحر عظیم فرمایا اور کرنے والوں کو سحرہ یعنی جادوگر فرمایا۔ اب اگر ان کو خیالی اور وہمی کہا جائے تو بعید نظر آتا ہے۔ مگر یہ کہ سحر سے مراد قرآن کریم میں لغوی ہوں تو یہ تو بہت ہی عجیب ہوگا حالانکہ حقیقۃً سحر پر محمول کرنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعجاز میں زیادہ داخل ہے۔ بشرطیکہ یہ لغوی معنی نقل صحیح سے ثابت کیا جائے کہ واقعۃً ایسا ہی تھا۔ (وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِحَقِیْقَۃِ الْحَالِ)

اور نقل صحیح سے ثابت ہے کہ یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا اس کی تاثیر آپ کی ذات جلیلہ میں ظاہر ہوئی جس سے نسیان، تخیل اور ضعف قوتِ جماع وغیرہ عارض ہوا۔ اور اس حادثہ کا وقوع حدیبیہ سے واپسی کے بعد ۶ ہجری کے ماہ ذوالحجہ میں ہوا اور اس عارضہ کے باقی رہنے کی مدت ایک قول کے بموجب چالیس روز ہے اور ایک روایت میں چھ مہینے اور ایک روایت میں ایک سال ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت صحیح و معتمد ہے غالباً سحر کا زور و قوت چالیس دن تھا اور علامتوں کا وجود اس کی بقا اول سے آخر تک عرصہ دراز تک رہی۔ یہاں تک کہ ایک رات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے یہاں تشریف فرما تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی اور خوب دعا مانگی اس کے بعد فرمایا اے عائشہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ حق تبارک و تعالیٰ نے مجھے جواب عنایت فرمایا ہے اور جس چیز کا میں نے سوال کیا تھا اسے قبول فرمالیا ہے۔ فرمایا دو شخص آئے ان میں سے ایک میرے سرہانے کے قریب بیٹھا اور دوسرا میرے پاؤں کی طرف۔ ان میں سے ایک نے اپنے دوسرے ساتھی سے کہا اس شخص کا کیا حال ہے اور اسے درد کیسا ہے۔ اس نے کہا یہ مطبوب ہے یعنی مسحور و سحرزدہ ہے۔ لغت میں طب کے معنی سحر کے آتے ہیں۔ اس نے پوچھا کس نے اس پر سحر کیا ہے؟ اس نے کہا لبید بن اعصم یہودی نے۔ پوچھا کس چیز میں سحر کیا؟ اس نے کہا کنگھی اور ان بالوں میں جو سر میں داڑھی میں کنگھا کرتے ہوئے گرتے تھے اور "وعائے شگوفہ نخل" میں ہے کہ اس نے پوچھا انہیں کہاں رکھا ہوا ہے۔ اس نے کہا ذروان کے کنویں میں! وہاں چھپا کر رکھا ہے۔ ایک روایت میں بیراز دان، الف کے ساتھ آیا ہے۔ علماء کہتے ہیں یہی اصح ہے۔ اس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چند صحابہ کے ساتھ اس کنویں پر تشریف لائے اور فرمایا کہ یہ وہ کنواں ہے جو مجھے دکھایا گیا اور اس کا پانی سرخ

تھا۔ گویا مہدی پانی میں گھول دی گئی ہے۔ اور اس کے کھجور کے درختوں کے سر، شیاطین کے سروں کے مانند ہیں۔ پھر اس میں سے جادو کی چیزوں کو نکالا۔ ایسا ہی صحیحین میں روایت ہے۔

بخاری کی روایت میں آیا ہے کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یا رسول اللہ جس نے یہ حرکت کی ہے اسے ظاہر کیوں نہیں فرماتے اور اسے رسوا کیوں نہیں کرتے فرمایا مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ میں لوگوں میں کسی کی برائی پھیلاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے تندرستی دے دی اور کسی سے کیا مطلب کہ ظاہر کر کے برائی پھیلاؤں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کو بیہقی "دلائل نبوت" میں بسند ضعیف بیان کرتے ہیں کہ لوگوں نے اس میں وتر یعنی کمان کے چلہ کو پایا جس میں گیارہ گرہ تھیں اور سورۂ الفلق اور سورۂ والناس نازل ہوئی ان کی ہر آیت پڑھی جاتی تو ایک ایک گرہ کھلتی جاتی تھی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے حضرت علی اور حضرت عمار رضی اللہ عنہما کو بھیجا انہوں نے کھجور کی کونپل پائی جس میں گیارہ گرہیں تھیں۔ فتح الباری کی ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص اندر اترا اس نے اس میں کچھ کھجور کی کونپل پائی۔ جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہہ موم سے بنی ہوئی سوئیوں سے چبھی ہوئی اور گیارہ گرہوں کے ساتھ ڈورے سے بندھی ہوئی تھی اس وقت جبریل علیہ السلام معوذتین لے کر آئے۔ جب ایک آیت پڑھی جاتی تو ایک گرہ کھل جاتی اسے پڑھتے جاتے اور گرہ کھولتے جاتے اور سوئی نکالتے جاتے تھے۔ جب تمام سوئیاں نکال لی گئیں تو درد سے تسکین ملی اور خاص آرام و راحت حاصل ہوئی۔ ان دونوں سورتوں کی آیتیں بھی گیارہ ہیں۔ اور ہر آیت پر ایک گرہ کھلتی جاتی تھی۔

اور بعض صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قضیہ میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے مسلکِ تسلیم و تفویض پر سلوک فرمایا اور اس بلا پر صبر فرما کر اجر طلب فرمایا۔ جب اس بلا نے طول پکڑا اور طوالت سے خطرہ محسوس فرمایا کہ کہیں فنونِ طاعات اور امر دعوت و تبلیغ کے اجراء اور توجہ الی اللہ میں کمزوری نہ آجائے تو دعا مانگی اس پر آپ کو حسی و روحانی علاج کے ذریعہ معالجہ دوا کرنے کی طرف اشارہ فرمایا گیا روحانی علاج اس طرح کہ آپ پر معوذتین نازل ہوئیں۔ اور حسی علاج اس طرح کہ سر مبارک پر پچھنے لگوائے۔

صاحب سفر السعادۃ فرماتے ہیں کہ جو دین و ایمان سے بہرہ ور نہیں ہے یقیناً وہ اس علاج سے انکار کرے گا۔ مطلب یہ کہ وہ کہے گا کہ پچھنے تو استفراغ کی قسم سے ہے یہ سحر کے علاج سے کیا مناسبت رکھتا ہے اور اس کا ازالہ کس طرح کیا جا سکتا ہے وہ جواب میں فرماتے ہیں کہ اگر کافر طبیبوں میں سے کوئی مثلاً جالینوس اور ارسطاطلیس وغیرہ اسے نقل کرتا اور تجویز کرتا تو وہ یقیناً انکار نہیں کرتے۔ یعنی وہ کہتے کہ جب انہوں نے ایسا حکم دیا ہے تو لازمی کوئی وجہ اور حکمت ہوگی۔ حالانکہ انہیں یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل مبارک میں کہنا انسب و اولیٰ ہے۔ باوجودیکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد پچھنے لگوانے کے نفع میں اور سحر کے دفعیہ میں عقلی حکمت کے ساتھ بھی اشارہ فرمایا وہ جواب میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ چونکہ سحر کا مادہ سر مبارک میں بھی پہنچ گیا تھا یعنی یہ قوائے دماغیہ میں بھی اثر انداز ہو گیا تھا۔ چنانچہ کسی ایسی چیز کا جسے کیا نہ ہو خیال فرماتے کہ کر لیا ہے۔ اور یہ تصرف ساحر کی جانب سے آپ کی طبیعت اور مادۂ دموی میں ہے۔ یہاں تک کہ اس مادہ نے بطن دماغ کے حصہ مقدم میں غلبہ پا لیا اور اس کا مزاج، طبیعت اصلیہ سے بدل گیا۔ اس لئے کہ سحر ارواح خبیثہ از قسم جن و شیاطین اور خبیث نفوس بشریہ اور انفعال قوائے طبعیہ بدنیہ کی تاثیر سے مرکب ہے تو ان تاثیرات کی وجہ سے یعنی چونکہ تاثیر سحر بدن و روح حیوانی میں ہے جو اس کا مقام ہے وہ بعد انضمام تاثیرات، تجویف قلب سے ایک لطیف بخار بطون دماغ کی جانب متصاعد ہو کر قوائے دماغیہ میں حائل ہو جاتا ہے۔ اور سحر کے مزاج و تصرف سے اس مقام

کو ضرر رسیدہ اور خارج از طبیعت اصلیہ کر دیتا ہے اور فرماتے ہیں کہ اس مقام میں پچھنے لگوانا جو سحر سے ضرر رسیدہ ہے غایت حکمت اور نہایت بہتر معالجہ ہے۔

اور بعض مبتدعین، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات جلیلہ میں سحر کی تاثیر کے وقوع کا انکار کرتے ہیں۔ اور گمان لے جاتے ہیں کہ یہ آپ کے علو مرتبہ جلیلہ رفیعہ کے انحطاط کا موجب اور آپ کی نبوت میں شک کے داخل ہونے کا باعث ہے۔ اور ہر وہ بات جو اس طرف لے جائے وہ باطل ہے اور یہ کہ شریعت پر عدم وثوق کا موجب ہے۔ اس لئے کہ اس تقدیر پر احتمال ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خیال کیا ہو کہ جبریل علیہ السلام کو دیکھا ہے اور وہ جبریل علیہ السلام نہ ہوں۔ اور یہ خیال کیا ہو کہ وحی نازل ہوئی ہے اور واقع میں ایسا نہ ہوا ہو اور یہ کہ جادو کا اثر ناقصوں میں ہوتا ہے نہ کہ ارباب کمال میں، تو ان مبتدعین کی یہ تمام باتیں مردود ہیں اس لئے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت میں آپ کی صداقت پر برہان قائم ہو چکا ہے اور آپ اپنی تبلیغ میں جو کچھ خدا کی طرف سے پہچانتے ہیں اس کی عصمت و حفاظت پر معجزات باہرہ شاہد ہیں اور وہ باتیں جو بعض دنیاوی امور سے متعلق ہیں اور جن کی طرف آپ مبعوث نہیں کئے گئے وہ آپ کے احاطۂ رسالت میں نہیں ہیں۔ اور وہ ایسے عوارضات ہیں جو عام انسانوں کو عارض ہوتی ہیں جیسے مرض وغیرہ تو ایسی دنیاوی چیزوں میں بعید نہیں ہے کہ ان کی طرف خیال کیا ہو کیونکہ وہ حقیقت میں آپ کی عصمت میں امور دینیہ کے مانند داخل نہیں ہیں۔ اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ نے جس پر گمان کیا ہے کہ فلاں کام کر لیا ہے حالانکہ اسے کیا نہ ہو۔ لیکن اس کے کرنے پر یقین کر لیا ہو بلکہ یہ از جنس خاطر ہے کہ خدشات رونما ہوتے ہیں اور ثابت و برقرار نہیں رہتے۔ لہٰذا ملاحدہ کی اس پر کوئی دلیل و حجت باقی نہیں رہی۔ خلاصہ یہ کہ رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کے بارے میں خبروں میں کوئی ایسی چیز منقول نہیں ہے جو کہ کسی چیز کے برخلاف کوئی چیز فرمائی ہو اور وہ خلاف واقعہ ہو۔

اب رہا ان کا یہ کہنا کہ یہ موجب منقصت ہے سو یہ ایسا نہیں ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں صحت کی تاثیر کا ظہور، دلائل نبوت اور صدق رسالت میں سے ہے اس لئے کہ کفار آپ کو ساحر کہتے تھے۔ اور یہ مسلمہ امر ہے کہ ساحر میں سحر اثر نہیں کرتا۔ اور آپ میں سحر کی تاثیر کا اظہار اسی حکمت و مصلحت کی بنا پر ہے۔

ان کا یہ کہنا کہ تاثیرِ سحر، ناقصوں کے ساتھ مخصوص ہے یہ کوئی کلیہ نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ کاملوں میں بھی کسی حکمت و مصلحت کی بنا پر ظاہر ہو جائے۔ اس باب میں صحیح حدیثیں آئی ہیں اور وہ قابل انکار نہیں ہیں۔ (واللہ اعلم)

آگاہ ہو کہ رقیہ اور تعویذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بہت ہیں ان کا حصر و احاطہ طاقت کتابِ ہذا اور کاتبِ حروف سے باہر ہے۔ اسی وجہ سے شروع میں امراض گنانے پر اجمالاً اکتفا کیا گیا۔ لیکن برکت حاصل کرنے والی طبیعت اس سے آسودہ نہیں ہوتی۔ اس لئے قرار پایا کہ ان تمام ابتلاء و مصائب میں سے جو کہ کثیر الوقوع ہیں ان کے لئے کچھ اقتباس کر کے تبرک و تیمن کے لئے ذکر کر دیا جائے۔ (وباللہ التوفیق)

رقیہ ہائے برائے نظرِ بد اور برائے جمیع امراض و آلام و بلایا۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور و اکثر نظر بد کا رقیہ ہے۔ اور اس کے رقیہ بھی بکثرت ہیں ان میں سب سے افضل رقیہ اس کے لئے اور تمام بلاؤں مرضوں اور آفتوں کے لئے سورۂ فاتحہ، معوذتین، آیۃ الکرسی کی قرأت اور یہ دعا ہے۔

اَذْهِبِ الْبَاْسَ رَبَّ النَّاسِ وَاشْفِ اَنْتَ الشَّافِیْ لَا شِفَآءَ اِلَّا شِفَآءُكَ شِفَآءً لَّا يُغَادِرُ سَقَمًا

تمام امراض و آلام اور دردوں کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کلیۃً یہی دعا تھی۔

ان میں سے ایک دعا یہ ہے:۔

أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّآمَّاتِ مِنْ غَضَبِهٖ وَعِقَابِهٖ وَشَرِّ عِبَادِهٖ وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَاَنْ يَّحْضُرُوْنِ۔

اور ایک دعا یہ ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ بِوَجْهِكَ الْكَرِيْمِ وَ بِكَلِمَاتِكَ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا اَنْتَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا۔ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ تَكْشِفُ الْاِثْمَ وَالْمَغْرَمَ اَللّٰهُمَّ لَا يُهْزَمُ جُنْدُكَ وَلَا يُخْلَفُ وَعْدُكَ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ.

اور ایک دعا یہ ہے۔

اَعُوْذُ بِوَجْهِ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ الَّذِيْ لَيْسَ شَيْءٌ اَعْظَمَ مِنْهُ وَ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ الَّتِيْ لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَّلَا فَاجِرٌ وَ بِاَسْمَآءِ اللّٰهِ الْحُسْنٰى مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَمَا لَمْ اَعْلَمْ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَمَا ذَرَاَ وَمَا بَرَاَ وَمِنْ شَرِّ كُلِّ ذِيْ شَرٍّ لَا اُطِيْقُ شَرَّهٗ وَمِنْ كُلِّ ذِيْ شَرٍّ اَنْتَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهٖ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ه

اور ایک اور دعا یہ ہے کہ:۔

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ عَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَاَنْتَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ه مَا شَآءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا وَّ اَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ نَفْسِيْ وَمِنْ شَرِّ الشَّيْطَانِ وَشِرْكِهٖ وَمِنْ شَرِّ كُلِّ دَآبَّةٍ اَنْتَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ه

اور ایک دعا یہ ہے

تَحَصَّنْتُ بِالَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِلٰهِيْ وَاِلٰهُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ اعْتَصَمْتُ بِهٖ وَهُوَ رَبِّيْ وَرَبُّ كُلِّ شَيْءٍ وَّ تَوَكَّلْتُ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَاسْتَدْفَعْتُ الشَّرَّ

بِلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ وَحَسْبِيَ الرَّبُّ مِنَ الْعِبَادِ وَحَسْبِيَ الْخَالِقُ مِنَ الْمَخْلُوْقِ حَسْبِيَ الرَّزَّاقُ مِنَ الْمَرْزُوْقِ حَسْبِيَ الَّذِيْ هُوَ حَسْبِيْ وَحَسْبِيَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ حَسْبِيَ اللّٰهُ وَكَفٰى سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ دَعٰى لَيْسَ وَرَاءَ اللّٰهِ مَرْمًى۔ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ه

ان میں سے ایک دعائے جبریل ہے جسے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے پڑھا اور صحیح مسلم میں ثابت ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُّؤْذِيْكَ وَمِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ اَوْ عَيْنٍ حَاسِدٍ اَللّٰهُ يَشْفِيْكَ بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ رُقْيَةً وَجْعَ جَسَدٍ۔

صحیح مسلم میں حضرت عثمان بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے اس درد کی شکایت کی جوان کے بدن میں تھا اور اس کے بعد وہ اسلام لائے اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بدن کے اس حصہ کو ہاتھ سے پکڑ کر جہاں درد ہے تین مرتبہ بسم اللہ اور سات مرتبہ "اَعُوْذُ بِعِزَّةِ اللّٰهِ وَقُدْرَتِهٖ مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُ وَاُحَاذِرُ۔" کو پڑھ کر دم کرو۔

خوف وبے خوابی کی دعا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خوف وبے خوابی کی شکایت کرتے ہوئے کہا یارسول اللہ مجھے رات بھر نیند نہیں آتی۔ فرمایا جب تم سونے کا ارادہ کرو تو یہ دعا پڑھو:

اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَمَا اَظَلَّتْ وَرَبَّ الْاَرْضِيْنَ وَمَا اَقَلَّتْ وَرَبَّ الشَّيَاطِيْنِ وَمَا اَضَلَّتْ كُنْ لِّيْ جَارًا مِّنْ شَرِّ خَلْقِكَ كُلِّهِمْ جَمِيْعًا اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيَّ اَحَدٌ مِّنْهُمْ اَوْ يَبْغِيَ عَلَيَّ عَزَّ جَارُكَ وَجَلَّ ثَنَاءُكَ وَلَآ اِلٰهَ غَيْرُكَ ۔

کرب و غم کی دعا:۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کرب و بے چینی کے وقت یہ دعا پڑھے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْعَظِيْمُ الْحَلِيْمُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ۔

ابوداؤد نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت الکروب میں فرمایا:۔ "اَللّٰهُمَّ رَحْمَتَكَ اَرْجُوْ فَلَا تَكِلْنِيْ اِلٰى نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ وَّاَصْلِحْ لِيْ شَاْنِيْ كُلَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ۔" مسند امام احمد میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی بندے کو اس دعا کے پڑھنے سے حزن و غم لاحق نہ ہوگا وہ دعا یہ ہے کہ

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ عَبْدُكَ وَابْنُ عَبْدِكَ وَابْنُ اَمَتِكَ نَاصِيَتِيْ بِيَدِكَ مَاضٍ فِيَّ حُكْمُكَ عَدْلٌ فِيَّ قَضَاءُكَ اَسْئَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهٖ نَفْسَكَ اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِيْ كِتَابِكَ اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ اَوِ اسْتَاْثَرْتَ بِهٖ فِيْ عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ رَبِيْعَ قَلْبِيْ وَنُوْرَ صَدْرِيْ وَجِلَاءَ وَذِهَابَ هَمِّيْ۔

اللہ تعالیٰ اس کے حزن و غم کو دور کرکے اس کی جگہ فرح و کشادگی لے آئے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ہمیشہ توبہ و استغفار کرتا رہے اللہ تعالیٰ اس کے غم کو خوشی سے بدل دے گا۔ اور اسے ہر تنگی سے نجات فرمائے گا اور اسے وہاں سے رزق پہنچائے گا جہاں اس کا گمان بھی نہ ہوگا۔

لاحول ولاقوۃ کا عمل:۔ نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ فرمایا جسے غم و افکار گھیر لیں اسے چاہئے کہ "لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" بکثرت پڑھے اور صحیحین میں انہیں سے مروی ہے کہ جنت کے خزانوں میں سے یہ ایک خزانہ ہے اور ترمذی میں مذکور ہے کہ یہ جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے اور ایک روایت میں ہے کہ "لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" کے ساتھ ہر بار ایک فرشتہ اترتا ہے اور صحت مندی لاتا ہے۔ اور مشائخ عظام فرماتے ہیں کہ اس کلمہ کے عمل سے بڑھ کر کوئی چیز مددگار نہیں ہے۔

آیۃ الکرسی اور خواتیم سورۃ بقر کا عمل:۔ حدیث شریف میں ہے کہ جو کوئی مصیبت و سختی کے وقت آیۃ الکرسی اور سورۃ بقر کی آخری آیتیں پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس کی فریاد رسی کرے گا۔

جامع دعا:۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بلاشبہ اور یقیناً میں اس کلمہ کو جانتا ہوں کہ نہیں کہتا اسے ہر مصیبت زدہ مگر یہ کہ اس کلمہ کی بدولت حق تعالیٰ اس سے اسے نجات عطا فرما دیتا ہے۔ وہ کلمہ میرے بھائی حضرت یونس علیہ السلام کا ہے کہ انہوں نے تاریکیوں میں ندا کی تھی کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اور ترمذی میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی مرد مسلمان ایسا نہیں جو اس دعاء کو کسی ضرورت میں پڑھے مگر یہ کہ حق تعالیٰ اسے ضرور مستجاب فرماتا ہے:۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

ایک اور روایت میں یہ دعا آئی ہے کہ:۔

اَسْئَلُكَ تَمَامَ الْعَافِيَةِ وَاَسْئَلُكَ دَوَامَ الْعَافِيَةِ وَاَسْئَلُكَ الشُّكْرَ عَلَى الْعَافِيَةِ وَاَسْئَلُكَ الْغِنٰى عَنِ النَّاسِ وَلَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ ۔

دعائے فقر۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اس نے کہا یارسول اللہ دنیا نے پیٹھ پھیرلی ہے اور مجھ سے دنیا روگرداں ہوگئی ہے فرمایا تجھ سے "صلوٰۃ ملائکہ" یعنی فرشتوں کی دعا اور وہ تسبیح خلائق جس کی بدولت انہیں رزق دیا جاتا ہے کہاں گئی؟ پھر فرمایا طلوع فجر کے وقت اس دعا کو سو مرتبہ پڑھو۔ "سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ وَبِحَمْدِہٖ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ" تو تیرے پاس دنیا پست و ذلیل ہو کر آئے گی۔ پھر وہ شخص چلا گیا اور عرصہ تک نہیں آیا۔ پھر وہ آیا اور اس نے کہا یارسول اللہ میرے پاس دنیا اتنی وافر آئی کہ میں نہیں جانتا کہ اسے کہاں رکھوں۔ سلسلہ "کبرویہ" میں دعا نماز سنت فجر اور نماز فرض فجر کے درمیان پڑھتے ہیں اور اگر اس کے ساتھ ایک تسبیح "لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔" کی بھی پڑھیں جیسا کہ حدیث میں آیا ہے تو تمام گناہوں کی مغفرت کا موجب ہوگا اور یہ وسعت رزق کا سبب ہے اس لئے کہ استغفار اس کا باعث ہے کیونکہ معاصی تنگیٔ رزق اور حزن و غم کا موجب ہیں جیسا کہ گزر چکا ہے۔

کیمیائے مشائخ۔ اس ضمن میں ایک وظیفہ ہے جسے "کیمیائے مشائخ" کہتے ہیں یہ بہت مجرب ہے وہ یہ کہ نماز جمعہ سے سلام پھیرنے کے بعد اور تشہد میں جس طرح پاؤں رکھے ہیں اس کے بدلنے سے پہلے سات مرتبہ سورۂ فاتحہ، سات مرتبہ قل ہو اللہ احد، سات مرتبہ قل اعوذ برب الفلق، سات مرتبہ قل اعوذ برب الناس پڑھے۔ یہ تعداد اگلے پچھلے گناہوں کی مغفرت کیلئے وجود میں آئی ہے۔ اور مشائخ کرام اس کے بعد اس دعا کو جو حدیث میں آئی ہے سات مرتبہ پڑھتے ہیں۔ اَللّٰهُمَّ يَا غَنِيُّ يَا حَمِيْدُ يَا مُبْدِئُ يَا مُعِيْدُ يَا رَحِيْمُ يَا وَدُوْدُ اَغْنِنِيْ بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَبِطَاعَتِكَ عَنْ مَعْصِيَتِكَ وَبِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ

آگ بجھانے کی دعا۔ طبرانی اور ابن عساکر میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اِذَا رَاَیْتُمُ الْحَرِیْقَ فَکَبِّرُوْا جب تم آگ لگی دیکھو تو تکبیریں کہو (یعنی اذانیں دو) "فَاِنَّ التَّکْبِیْرَ تُطْفِئُہٗ" کیونکہ تکبیر اسے بجھا دے گی اور تکبیر کے ذریعہ آگ کو بجھانا مجرب ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ آگ شیطانی مادہ ہے کہ اسے آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور اس میں فساد عام ہے جو کہ شیطانی عمل سے مناسبت رکھتا ہے اور آگ اپنی طبیعت میں علو فساد کو چاہتی ہے۔ اور شیطان نے بھی اسی کا دعویٰ کیا تھا اور چاہا تھا کہ بنی آدم کو ہلاک کرے۔ لہٰذا آگ اور شیطان دونوں زمین میں فساد چاہتے ہیں اور حق تبارک و تعالیٰ کی کبریائی کے آگے کوئی چیز نہیں ٹھہرتی۔ چنانچہ جب مسلمان تکبیر کہتا ہے تو حق تعالیٰ خود آگ کو بجھاتا ہے اور اس عمل کے ساتھ تجربہ بھی شامل ہے۔

مرگی کی دعا۔ کہتے ہیں کہ مرگی کا مرض دو قسم سے ہوتا ہے ایک ارواح خبیثہ کے تصرف سے دوسرا اخلاط ردیئہ سے۔ اس دوسری قسم سے اطباء بحث کرتے ہیں لیکن ارواحِ خبیثہ سے مرگی کا علاج دعاؤں سے ہوتا ہے۔ یہ دشمن سے جنگ کرنا ہے۔ لڑنے والے کو چاہئے کہ اس کے ہتھیار صحیح اور بازو قوی ہوں۔ یہاں تک کہ بعض معالجین اس کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ: "اُخْرُجْ مِنْہُ مَا یَقُوْلُ بِسْمِ اللّٰہِ وَمَا یَقُوْلُ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ" اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمایا کرتے کہ "اُخْرُجْ عَدُوَّ اللّٰہِ اَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ" اور بعض معالجین آیۃ الکرسی پڑھنے اور مرگی کے مریض کو آیۃ الکرسی اور معوذتین کے بکثرت پڑھنے کی تاکید کرتے اور بعض پڑھتے ہیں: "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ۔" الخ یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم کھلانا اس کے دفعیہ میں یہ مجرب ہے۔

درد سر کی دعا۔ حمیدی "طب" میں بروایت یونس بن یعقوب عبداللہ سے صداع یعنی درد سر کا رقیہ نقل کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم درد سر میں اپنے اس ارشاد سے تعوذ فرماتے تھے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الْكَبِيْرِ وَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ مِنْ كُلِّ عِرْقٍ نَعَّارٍ وَّمِنْ شَرِّ حَرِّ النَّارِ۔

دعائے درد دنداں: بیہقی عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دانتوں کے درد کی شکایت کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک ان کے اس رخسار پر جس میں درد تھا رکھ کر سات مرتبہ یہ پڑھا۔ "اَللّٰهُمَّ اَذْهِبْ عَنْهُ مَا يَجِدُ وَاشْفِهٖ بِدَعْوَةِ نَبِيِّكَ الْمَكِيْنِ الْمُبَارَكِ عِنْدَكَ" دست مبارک اٹھانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ان کا درد دور فرمادیا۔ اور حمیدی روایت کرتے ہیں کہ سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس درد دنداں کی شکایت کرتی ہوئی آئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے داہنے دست مبارک کی انگشتِ شہادت اس دانت پر رکھ کر جس میں درد تھا پڑھا۔

بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ اَسْئَلُكَ بِعِزِّكَ وَجَلَالِكَ وَقُدْرَتِكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ فَاِنَّ مَرْيَمَ لَمْ تَلِدْ غَيْرَ عِيْسٰى مِنْ رُّوْحِكَ وَكَلِمَتِكَ اَنْ تَكْشِفَ مَا تَلْقٰى فَاطِمَةُ بِنْتُ خَدِيْجَةَ مِنَ الضُّرِّ كُلِّهٖ۔

چنانچہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اپنے درد سے آرام ملا۔

مواہب میں منقول ہے کہ ایک عجیب وغریب بات لوگوں میں محب طبری امام مقام خلیل مکی کے بارے میں مشہور و معروف ہے اور میں نے انہیں بارہا دیکھا ہے کہ جس کے دانتوں میں درد ہوتا وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھتے۔ اس سے اس کا اور اس کی ماں کا نام پوچھتے اور دریافت کرتے کہ کتنی مدت کیلئے چاہتا ہے کہ اس کا دانت درد نہ کرے مطلب یہ کہ وہ پوچھتے کتنے سالوں کے لئے درد کو باندھوں تو وہ شخص پانچ یا سات سال یا نو سال مثلاً طاق عدد میں کہتا تو وہ ہاتھ اٹھانے نہ پاتے درد جاتا اور مذکورہ مدت تک درد نہ ہوتا۔ یہ بات ان کے بارے میں مشہور و معروف ہے (انتہی) لیکن کسی خاص دعا کا ذکر نہ کیا۔ ظاہر ہے کہ یہی دعائے ماثورہ ہوگی یا ان کی اپنی توجہ خاص اور دعا ہوگی (واللہ اعلم بحقیقۃ الحال)

صاحب مواہب فرماتے ہیں کہ وہ دعا جس کا تجربہ کیا جاچکا ہے یہ دعا ہے جسے درد کی جانب رخسار پر ہاتھ سے لکھے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۗ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝

یا اگر چاہے تو یہ لکھے۔

وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۗ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

پتھری اور حبس بول کی دعا: ۔ نسائی نے ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ان کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ اس کے باپ کا پیشاب بند ہوگیا ہے اور اسے پتھری کا مرض ہے۔ اس پر حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے وہ دعا جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی بتائی۔

رَبُّنَا اللّٰهُ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ تَقَدَّسَ اسْمُكَ اَمْرُكَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ كَمَا رَحْمَتُكَ فِي السَّمَآءِ فَاجْعَلْ رَحْمَتَكَ فِي الْاَرْضِ وَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَخَطَايَانَا اَنْتَ رَبُّ الطَّيِّبِيْنَ اَنْزِلْ شِفَاءً مِّنْ شِفَاءِكَ وَرَحْمَةً مِّنْ رَّحْمَتِكَ عَلٰى هٰذَا الْوَجْعِ فَيَبْرَءُ۔

اور اسے حکم دیا کہ اس دعا کو پڑھے اس نے اسے پڑھا اور وہ تندرست ہوگیا۔ یہ دعا ابوداؤد کی حدیث میں ہر مرض و شکایت کیلئے بھی مروی ہے۔

تپ یعنی بخار کی دعا: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے

یہاں تشریف لائے تو وہ بخار میں مبتلا تھیں اور بخار کو برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بخار کو برا نہ کہو وہ حکم الٰہی کا تابع ہے۔ لیکن اگر تم چاہتی ہو تو میں تمہیں وہ کلمات سکھا دوں کہ جب تم پڑھو گی تو اللہ تعالیٰ اسے تم سے دور فرما دے گا۔ انہوں نے کہا مجھے سکھا دیجئے۔ فرمایا پڑھو:۔

اَللّٰھُمَّ ارْحَمْ جِلْدِیَ الرَّقِیْقَ وَ عَظْمِیَ الدَّقِیْقَ مِنْ شِدَّۃِ الْحَرِیْقِ یَا اُمَّ مِلْدَمٍ اِنْ کُنْتِ اٰمَنْتِ بِاللّٰہِ الْعَظِیْمِ فَلَا تَصْدَعِی الرَّأْسَ وَلَا تُنْتِنِی الْفَمَ وَلَا تَأْکُلِی اللَّحْمَ وَلَا تَشْرَبِی الدَّمَ وَتَحَوَّلِی عَنِّیْ اِلٰی مَنِ اتَّخَذَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں کہ میں نے ان کلمات کو پڑھا میرا بخار جاتا رہا صاحب مواہب لدنیہ فرماتے ہیں کہ یہ دعا مجرب ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے شیخ کے ہاتھوں سے لکھا دیکھا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

اَللّٰھُمَّ ارْحَمْ عَظْمِیَ الدَّقِیْقَ وَجِلْدِیَ الرَّقِیْقَ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ فَوْرَۃِ الْحَرِیْقِ یَا اُمَّ مِلْدَمٍ اِنْ کُنْتِ اٰمَنْتِ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا تَأْکُلِی اللَّحْمَ وَلَا تَشْرَبِی الدَّمَ وَلَا تَفُوْرِیْ عَلَی الْفَمِ انْتَقِلِیْ اِلٰی مَنْ زَعَمَ اَنَّ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ۔ فَاِنِّیْ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔

صاحب "الہدیٰ" بیان کرتے ہیں کہ باری کے بخار کے لئے تین پتلے کاغذ پر لکھے "بِسْمِ اللّٰہِ فَرَّتْ، بِسْمِ اللّٰہِ مَرَّتْ، بِسْمِ اللّٰہِ قَلَّتْ" اور روزانہ ایک ایک پرچہ پانی سے نگل لے اور کتاب "قران" میں ہے کہ شفا کی غرض سے اس کا پینا سلف سے معمول ہے اور ابن الحاج سے مدخل میں مذکور ہے کہ شیخ ابو محمد مرجانی ہمیشہ بخار وغیرہ کے لئے کاغذ کے پرزوں پر اس دعا کو لکھ کر دروازہ کی دہلیز پر رکھ دیتے تو جو کوئی بخار وغیرہ کا مریض آتا وہ اس میں سے لے کر مریض کو کھلا دیتے مریض بحکم الٰہی شفایاب ہو جاتا وہ یہ دعا لکھا کرتے تھے:۔

اَزَلِیٌّ لَمْ یَزَلْ وَلَا یَزَالُ یُزِیْلُ الزَّوَالَ وَھُوَ لَا یَزَالُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا ھُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ۔

خراج وخارش کی دعا۔ ۔ صاحب زاد المعانی فرماتے ہیں کہ کھجلی وخارش کیلئے اپنے بدن پر یہ لکھے۔

وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ یَنْسِفُھَا رَبِّیْ نَسْفًا ۝ فَیَذَرُھَا قَاعًا صَفْصَفًا ۝ لَّا تَرٰی فِیْھَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ۝

یہ مجرب ہے۔

دعائے عسر ولادت۔ ۔ عسر ولادت کے لئے دعائیں تو بہت ہیں مگر مجرب دعا یہ ہے جسے عبداللہ بن امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے روایت کیا گیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد ماجد کو دیکھا ہے کہ جب کسی عورت پر بچہ کی ولادت دشوار ہوتی تو وہ سفید پیالہ یا کسی پاکیزہ چیز پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث لکھ کر دیتے:۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ الْحَکِیْمُ الْکَرِیْمُ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَرَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کَاَنَّھُمْ یَوْمَ یَرَوْنَ مَا یُوْعَدُوْنَ لَمْ یَلْبَثُوْا اِلَّا سَاعَۃً مِّنْ نَّھَارٍ کَاَنَّھُمْ یَوْمَ یَرَوْنَھَا لَمْ یَلْبَثُوْا اِلَّا عَشِیَّۃً اَوْ ضُحٰھَا۔

خلال کہتے ہیں کہ ہمیں ابو بکر مروزی نے بتایا کہ امام احمد رحمہ اللہ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا اے ابو عبداللہ، ایک عورت کے لئے کچھ لکھ دیجئے اس پر دو دن سے ولادت کی دشواری اور سختی ہے آپ نے فرمایا اس سے کہو کہ کشادہ پیالہ اور زعفران لائے۔ خلال کہتے ہیں کہ میں نے بہت سوں کیلئے لکھتے دیکھا ہے۔ مدخل میں ہے کہ انہوں نے نئے پیالہ پر لکھا:۔

اُخْرُجْ اَیُّھَا الْوَلَدُ مِنْ بَطْنٍ ضَیِّقٍ اِلٰی سَعَۃِ ھٰذِہِ الدُّنْیَا اُخْرُجْ بِقُدْرَۃِ الَّذِیْ جَعَلَکَ فِیْ قَرَارٍ

تَمْكِيْنٍ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ الخ وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۔

اور اسے دھو کر پلانے اور کچھ چھینٹے منہ پر مارنے کا حکم فرمایا۔ شیخ مرجانی کہتے ہیں کہ میں نے اس دعاء کو کئی بزرگوں سے لیا ہے اور جس کو بھی میں نے یہ لکھ کر دیا ہے وہ اسی وقت بفضل خدا چھٹکارا پاگئی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا گزر ایسی عورت پر ہوا جس کا بچہ رحم میں مڑ گیا تھا۔ اس عورت نے کہا اے کلمۃ اللہ میرے لئے دعا فرمایئے کہ حق تعالیٰ مجھے اس دشواری سے نجات دے جس میں میں مبتلا ہوں اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعا کی:۔ "یَا خَالِقَ النَّفْسِ وَیَا مُخَلِّصَ النَّفْسِ مِنَ النَّفْسِ وَیَا مُخْرِجَ النَّفْسِ مِنَ النَّفْسِ خَلِّصْهَا ـــــــ" اس عورت نے اسی وقت بچہ تولد کر دیا اور کھڑی ہوگئی۔ شیخ مرجانی کہتے ہیں کہ جب کوئی عورت ولادت دشواری میں مبتلا ہو تو اس کیلئے اسے لکھ کر دیدے۔

نکسیر کی دعا:۔ نکسیر کی یوں تو بہت دعائیں ہیں مگر مجرب دعا یہ ہے کہ نکسیر والے کی پیشانی پر لکھے کہ۔

وَقِيْلَ يٰاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۔

نکسیر کے خون سے اس کی کتابت جائز نہیں ہے جیسا کہ بعض جاہل کرتے ہیں اس لئے کہ خون نجس ہے اس وجہ سے کلام خدا لکھنا جائز نہیں

ہر درد و بلا کی دعا:۔ حضرت ابان بن عثمان اپنے والد رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں۔ فرمایا کہ میں نے نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم سے سنا ہے کہ جو کوئی تین مرتبہ شام کے وقت "بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ" پڑھے تو صبح تک کوئی ناگہانی بلا و مصیبت نہ پہنچے گی۔ اور جو اسے صبح کے وقت پڑھے تو شام تک اسے کوئی ناگہانی بلا و مصیبت نہ پہنچے گی۔ راوی کہتا ہے کہ ابان ابن عثمان رضی اللہ عنہ پر فالج گرا تو اس شخص نے جس نے ان سے یہ حدیث سنی تھی بطریق تعجب وانکار ان کی جانب سوچنے لگا اس پر انہوں نے فرمایا میری طرف کیا سوچ رہے ہو۔ خدا کی قسم نہ میں نے اپنے والد عثمان پر جھوٹ باندھا ہے اور نہ عثمان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھا لیکن جس دن مجھ پر یہ فالج گرا ہے اس دن میں نے معصیت و نافرمانی کی تھی یعنی میں اسے پڑھنا بھول گیا تھا۔ اسے ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

ذکر لاحول ولا قوۃ الا باللہ:۔ وہ دعا جس سے ستر بلاؤں سے عافیت ملتی ہے وہ حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص:۔ "بِسْمِ اللّٰهِ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔" دس مرتبہ پڑھے وہ گناہوں سے ایسا پاک وصاف ہو جاتا ہے جیسا کہ آج ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو اور دنیا کی ستر بلاؤں سے مثلاً جنون و جذام و برص وریح وغیرہ سے عافیت دی جاتی ہے۔ ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔" کو زیادہ سے زیادہ پڑھو اس لئے کہ یہ جنت کا خزانہ ہے۔ حضرت مکحول فرماتے ہیں کہ "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا مَنْجَا مِنَ اللّٰهِ اِلَّا اِلَيْهِ۔" کو جو کوئی پڑھے اللہ تعالیٰ اس سے ضرر کے سات دروازے جس میں سے ایک دروازہ محتاجی و فقر کا ہے دور کر دیتا ہے۔ طبرانی میں بروایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کوئی:۔ "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" کہے تو یہ ننانوے مرض کی دوا ہے۔ اور کم سے کم مرض غم والم ہے۔ ایک اور حدیث میں حضرت ابو موسیٰ سے مروی ہے کہ جو کوئی "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" کو روزانہ سو مرتبہ پڑھے اسے کبھی بھی محتاجی نہ پہنچے گی۔ نیز مروی ہے کہ جس پر روزی تنگ ہو اسے چاہئے کہ:۔ "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" کا ورد زیادہ سے زیادہ کرے۔

سیدنا امام جعفر صادق بن امام محمد باقر رضی اللہ عنہما سے بروایت از آب وجد از علی ابن طالب رضی اللہ عنہم اجمعین مروی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو شخص روزانہ دن رات "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ الْمَلِکُ الْحَقُّ الْمُبِیْنُ" پڑھے وہ فقر وانس اور وحشتِ قبر سے امان میں رہے گا اور اس پر تونگری کا دروازہ کھل جائے گا۔ اور جنت کا دروازہ بھی۔ اس روایت کے بعض راوی کہتے ہیں کہ اگر اس دعا کے حصول کے لئے چین وختن تک سفر کرنا پڑے تو یہ زیادہ نہ ہوگا۔ اس کا عبدالحق نے کتاب "الطب النبوی" میں ذکر کیا ہے۔

دعا بوقتِ طعام:۔ امام بخاری اپنی تاریخ میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جو شخص کھانا سامنے آنے کے بعد: "بِسْمِ اللّٰہِ خَیْرِ الْاَسْمَاءِ فِی الْاَرْضِ وَالسَّمَاءِ لَا یَضُرُّ مَعَ اسْمِہٖ دَاءٌ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ فِیْہِ رَحْمَۃً وَّشِفَاءً۔" پڑھے اسے کوئی چیز ضرر نہ پہنچائے گی۔

ام الصبیان کی دعا: امیر المومنین سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے بچہ پیدا ہو تو بچے کے داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہے بچے کو ام الصبیان کا مرض نہ ہوگا۔ اسے اندلسی نے روایت کیا اور عبدالحق نے "الطب النبوی" میں ذکر کیا اور ام الصبیان ایک ریحی مرض ہے جو بچوں کو لاحق ہوتا ہے اور بسا اوقات ریح صعود کر کے دل و دماغ کو گھیر لیتی ہے اور بچہ اینٹھنے لگتا ہے۔ اس کے کان میں اذان واقامت کہنے کی حکمت یہ ہے کہ بچے کے کان میں جو سب سے پہلی آواز پڑے وہ کلمہ شہادت اور حق تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کی آواز ہو۔ گویا کہ یہ اس کیلئے دنیا میں داخل ہوتے وقت شعار اسلام کی تلقین ہے۔ جس طرح کہ دنیا سے نکلتے وقت یعنی بوقت موت کلمہ توحید کی تلقین کی جاتی ہے۔ نیز کلمات اذان سے شیطان بھاگتا ہے۔

دعائے حفیظ رمضان:۔ یہ ہے کہ:

لَآ اِلٰہَ اِلَّا الَّذِیْ بِاللّٰہِ اِنَّکَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ بِاللّٰہِ مُحِیْطٌ بِہٖ عِلْمُکَ کَیْعَلَمُوْنَ وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰہُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ

صاحب مواہب کہتے ہیں کہ ہمارے شیخ نے فرمایا کہ یہ دعا، بلادِ یمن و مکہ، مصر و مغرب اور تمام شہروں میں مشہور ہے۔ وہ اسے "حفیظ رمضان" کہتے ہیں۔ اس کی تاثیر یہ بتاتے ہیں کہ یہ غرق، حرق، سرق اور تمام آفتوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ اسے رمضان کے آخری جمعہ کے دن لکھتے ہیں اور عام لوگ اسے اس وقت لکھتے ہیں جب کہ خطیب منبر پر خطبہ جمعہ دے رہا ہو۔ اور بعض لوگ نماز عصر کے بعد لکھتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ یہ بدعت ہے اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ اگرچہ بہت سے اکابر کے کلام میں یہ واقع ہوا ہے بلکہ بعض کا کلام تو خبردار کرتا ہے کہ یہ ضعیف حدیث میں سے ہے اور حافظ ابن حجر اسے بہت زیادہ منکر کہتے تھے۔ خصوصاً اس وقت جبکہ منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا جا رہا ہو۔ اس وقت اگر کسی کو لکھتا دیکھتے تو فرماتے تَبًّحَکَ اللّٰہُ مَا ھٰذِہِ الْبِدْعَۃُ۔ خدا تجھے روسیاہ کرے یہ کیسی بدعت ہے۔

طب نبوی بادویہ طبیہ

وصل: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم طبی دواؤں کے ذریعہ بھی اکثر مرضوں میں علاج کرتے تھے۔ ظاہر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو طب وحی کے ذریعہ حاصل ہوئی تھی اگرچہ بعض مواقع میں قیاس واجتہاد اور تجربہ بھی ہوگا یہ کوئی بعید نہیں ہے۔ لیکن ادویہ روحانیہ پر انحصار فرمانا اس بنا پر تھا کہ وہ اتم واعلیٰ اور اخص واکمل ہیں۔ لیکن ایک حدیث شہد کے ساتھ دستوں کے علاج میں

آئی ہے جس میں بہت کم بحث ہے اسے یہاں نقل کرتا ہوں۔

واضح رہنا چاہئے کہ بخاری و مسلم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اس نے کہا میرا بھائی اپنے پیٹ کی شکایت کرتا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ اس کا پیٹ جاری ہے یعنی دست آرہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے شہد پلانے کا حکم فرمایا۔ اسے شہد پلایا گیا اس سے دست اور زیادہ آنے لگے۔ اس پر فرمایا خدا نے سچ فرمایا ہے تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹ بولتا ہے۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ تین بار اسے شہد پلانے کا حکم فرمایا ہے وہ چوتھی بار آیا اس پر بھی یہی فرمایا کہ اسے شہد پلاؤ۔ اس کے دست اور زیادہ ہو گئے اور امام احمد کی روایت میں ہے کہ چوتھی مرتبہ پھر شہد پلانے کا حکم فرمایا چنانچہ اسے پلایا گیا پھر وہ اچھا ہو گیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چوتھی مرتبہ میں فرمایا اللہ سچا ہے اور تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے۔ اور اہل حجاز کذب کا اطلاق خطا کے مقام میں کرتے ہیں۔ اور "کَذَبَ سَمْعُکَ" یعنی تیرے کان نے جھوٹ سنا۔ بولتے ہیں۔ مطلب یہ کہ تجھ سے غلطی ہوئی اور جو کچھ کہا گیا اس کی حقیقت تک تیری رسائی نہ ہوئی۔ لہٰذا پیٹ کے جھوٹا ہونے کے معنی یہ نہیں کہ وہ قبول شفا کی صلاحیت نہیں رکھتا بلکہ اس سے اس میں غلطی ہو رہی ہے کذا قیل۔ امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کی روشنی میں جان لیا تھا کہ اسے شہد سے نفع حاصل ہو گا۔ اور جب فوری طور پر ظاہر نہ ہوا تو گویا وہ قائم مقام جھوٹ کے جاری تھا۔ اس بنا پر اس پر لفظ کذب کا اطلاق کیا گیا۔ (انتہی)

بعض ملحدین اس جگہ اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شہد مسہل ہے تو کس طرح اس کیلئے بتایا جا سکتا ہے جسے خود اسہال ہوں تو اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ یہ بات اس قائل کے جہل سے صادر ہوئی ہے اور اس آیت کے حکم کی مصداق ہے کہ: "بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ" "بلکہ وہ اس پر جھوٹ باندھتے ہیں جس کا ان کے علم نے احاطہ نہیں کیا۔ اس لئے کہ اطباء کا اتفاق ہے کہ ایک مرض کا علاج، باختلافِ عمر، عادت، زمانہ، غذائے مالوف، تدبیر اور طبعی قوت کے مختلف ہوتا ہے اور اسہال کبھی غیر مرغوب غذا کے کھانے سے لاحق ہوتا ہے۔ اور بد ہضمی پیدا کر دیتا ہے اور اس میں اطباء کا اتفاق ہے کہ اس کا علاج، بد ہضمی کے اثرات کے ازالہ میں ہے لہٰذا اگر اسہال کی ضرورت لاحق ہو تو اس کی اس سے مدد و اعانت کی جاتی ہے۔ جب تک کہ بیمار میں قوت ہے گویا کہ اس مرد کو جو دست لاحق تھے وہ بد ہضمی کے تھے۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جمع شدہ فضلات کے اخراج کے لئے اسے شہد پلانے کا حکم فرمایا اور اس کے معدے سے ان لیسدار اخلاط کو باہر نکالا جو قبول و ہضم غذا میں مانع تھا۔ چونکہ معدے میں ریشے اور خانے ہوتے ہیں جب اس میں لیسدار مادہ چپک جاتا ہے تو معدے کو فاسد کر دیتا ہے۔ اور اس میں جو غذا ہوتی ہے یہ اسے خراب کر دیتا ہے لہٰذا اس کیلئے ایسی دوا کا استعمال ضروری ہے جو معدے کو اس سے پاک و صاف کر دے۔ لہٰذا اس خصوصیت میں شہد سے زیادہ کوئی اور چیز زیادہ نفع بخش نہیں ہے۔ خاص کر اس وقت جب کہ شہد میں گرم پانی ملا کر بار بار پلایا جائے۔ اور شہد کو بار بار پلانے میں ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ دوا ایسی ہونی چاہئے کہ اس کی کیت اور مقدار مریض کے حال کے موافق ہو یہاں تک کہ اگر دوا کم ہو تو کلی طور پر مرض کو زائل نہ کرے گا اور اگر زیادہ ہو تو قوتوں کو زائل کر دے گا۔ اور مرض کو بڑھا کر دیگر نقصانات پیدا کر دے گا۔ اور جب ہر مرتبہ اتنا شہد نہ دیا گیا جو مرض کا مقابلہ کر سکتا ہو تو لامحالہ اسہال میں زیادتی ہوتی گئی اور بار بار شہد کے پلانے کا حکم دیا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی حدو مقدار کو پہنچ گیا تو اس وقت یقینی طور پر فرمایا۔ "صَدَقَ اللّٰهُ وَكَذَبَ بَطْنُ اَخِيْكَ۔" اللہ سچا ہے تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے یہ مادہ فاسدہ کی کثرت سے تعبیر ہے اور جب آخری مرتبہ اتنی مقدار پہنچ گئی جو مادہ کے اخراج اور دفع مرض میں کافی ووافی تھی تو اس کا نفع ظاہر ہو گیا۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ "كَذَبَ بَطْنُ اَخِيْكَ" سے اسی طرف اشارہ ہے کہ دوا نافع ہے اور بقائے مرض، شفا

میں تصور دواکی بناپر نہیں ہے بلکہ مادہ فاسدہ کی کثرت کی بناپر ہے تو اس بناپر استفراغ کیلئے بار بار شہد پلانے کا حکم فرمایا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ شہد رگوں کی جانب بہت جلد رواں ہوتا ہے اور ان کو زیادہ غذا پہنچا دیتا ہے۔ پیشاب کو کھول کر لاتا ہے جس سے قبض پیدا ہو جاتا ہے۔ کبھی معدے میں جب یہ باقی رہ جاتا ہے تو معدے میں ہیجان پیدا کر کے آمادہ کر دیتا ہے کہ وہ طعام یعنی فضلہ کو پھینک دے۔ اس طرح دست لے آتا ہے۔ لہٰذا شہد کی تعریف مطلقاً دست آور سے کرنا منکر کی عقل کا تصور ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ مریضِ اسہال کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا شہد بتانا چار باتوں پر تھا اول یہ کہ آیہ کریمہ کو شفا میں عموم پر محمول فرمایا اور یہ اشارہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں ہے کہ "صَدَقَ اللّٰہُ" یعنی اللہ نے سچ فرمایا۔ مطلب یہ کہ آیۂ کریمہ میں جو "فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ" (شہد میں لوگوں کے لئے شفا ہے) فرمایا وہ ہر مرض کیلئے ہے۔ لہٰذا جب ان کو اس کی تنبیہہ فرمائی اور اپنے قول سے انہیں اس کی حکمت کی طرف تلقین فرمائی تو وہ تندرست ہو گیا بحکم الٰہی۔ دوسرا یہ کہ چونکہ وہ تمام مرضوں میں شہد سے علاج کرتے تھے بنابریں ان کی عادت کے مطابق شہد کا استعمال بتایا۔ تیسرا یہ کہ اسہال ہیضہ سے تھا جیسا کہ گزرا۔ چوتھا یہ کہ ممکن ہے کہ پینے سے پہلے شہد کو پکا کر دینے کا حکم فرمایا ہو۔ اس لئے کہ پکا ہوا شہد بلغم کو باندھتا ہے اور قبض کرتا ہے تو ممکن ہے کہ انہوں نے پہلے بے پکائے دیا ہو۔ دوسرا اور چوتھا قول ضعیف ہے اور قول اول کی تائید حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ کرتی ہے کہ:۔ "عَلَیْکُمْ بِالشِّفَآئَیْنِ الْعُسَلُ وَالْقُرْاٰنُ" شہد اور قرآن سے شفا کو لازم جانو۔ اسے ابن ماجہ و حاکم نے مرفوعاً اور ابن ابی شیبہ و حاکم نے موقوفاً روایت کیا ہے۔ اس کے تمام راوی صحیح ہیں۔

حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ فرمایا جب آشکارا ہو جائے اور ایک روایت میں ہے کہ جب تم میں سے کوئی شفا کو طلب کرے تو اسے چاہئے کہ اپنی بیوی کے مہر کی رقم سے کچھ اس سے مانگے اور اس سے شہد خریدے اور کتاب اللہ سے کسی آیت شفا کو پیالہ میں لکھے اور بارش کے پانی سے اسے دھوئے اور شہد اس میں ملائے۔ اللہ تعالیٰ اسے شفا دے گا۔ بعض علماء اس حدیث میں فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔ "نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ۔" (ہم نے قرآن میں وہ نازل فرمایا جو شفا ہے) اور فرمایا:۔ "وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا۔" (ہم نے آسمان سے برکت والا پانی اتارا) دوسری جگہ فرمایا:۔ "مَآءً طَهُوْرًا" (پاک کرنے والا پانی اتارا) اور فرمایا:۔ "فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا۔" (اپنی بیوی خوش دلی سے اپنے مہر سے تمہیں کچھ دے تو اسے کھاؤ۔ اور شہد کے بارے میں فرمایا۔ "فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ۔" (شہد میں لوگوں کیلئے شفا ہے) لہٰذا جب شفا کی یہ تمام باتیں اور اسباب جمع ہو جائیں تو بفضل خدا اس کا حصول ضرور ہو گا۔ اور وہی شفا دینے والا ہے:

اَللّٰهُمَّ اشْفِنَا شِفَآءً عَاجِلًا بِحَقِّ الْقُرْاٰنِ الْعَظِیْمِ وَ بِبَرَكَةِ نَبِیِّكَ الْكَرِیْمِ۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلَیْهِ۔

ذکر تعبیر رؤیا یعنی خواب

وصل: تعبیر کے معنی تفسیر کے ہیں "عبرتُ الرؤیا" (خواب کی تعبیر دی) تخفیف و تشدید دونوں سے مروی ہے۔ اور تشدید کے ساتھ مبالغہ کیلئے ہے اور "رؤیا" بضم راء و سکون ہمزہ وہ چیز ہے جو شخص خواب میں دیکھے۔ رؤیا کی حقیقت کا بیان بر طریق متکلمین و حکماء مشکوٰۃ شریف کی شرح میں کر دیا گیا ہے اس جگہ محدثین کے طریقہ پر جو کچھ مواہب لدنیہ میں بیان کیا گیا ہے اسے ذکر کیا جاتا ہے۔

قاضی ابو بکر بن العربی جو کہ اعاظم علماء مالکیہ سے ہیں فرماتے ہیں کہ رؤیا یعنی خواب وہ ادراک ہے جسے حق تبارک و تعالیٰ بندے کے دل میں کسی فرشتے یا کسی شیطان کے ہاتھ سے اس کی حقیقتوں کے ساتھ یا اس کی تعبیرات کے ساتھ ظاہر فرماتا ہے۔

حاکم و عقیلی روایت کرتے ہیں کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے ملاقات کی اور کہا اے ابو

الحسن ایک شخص خواب دیکھتا ہے تو اس کا کچھ حصہ تو صادق ہوتا ہے اور کچھ حصہ کاذب نکلتا ہے؟ فرمایا ہاں! میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ ہر مرد و عورت جب خوب گہری نیند سو جاتا ہے تو اس کی روح عرش کی جانب پرواز کر جاتی ہے تو اس عرش سے وہ رؤیا ظاہر ہوتی ہے۔ اور جو روح عرش سے نیچے رہ جاتی ہے وہ جھوٹی ہوتی ہے۔ اور ذہبی اس حدیث کو صحیح نہیں گردانتے۔

ابن قیم ایک حدیث لاتے ہیں کہ مسلمان کی رؤیا، وہ کلام ہے جسے حق تبارک و تعالیٰ اس سے فرماتا ہے اور حکیم ترمذی فرماتے ہیں کہ بعض مفسرین اس آیتِ کریمہ میں کہ

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ کسی انسان کے لئے زیبا نہیں کہ اللہ اس سے کلام فرمائے مگر بطور وحی یا پردے کے پیچھے سے۔

فرماتے ہیں کہ: "من وراء حجاب" سے مراد، خواب ورؤیا ہے اور انبیاء علیہم السلام کی رؤیا دوسروں کے مقابلہ میں وحی ہوتی ہے اور وحی ہمیشہ بغیر خلل و حجاب کے آتی ہے۔ اس لئے کہ وہ خدا کی نگہبانی و عصمت میں ہے بخلاف انبیاء کے سوا دوسروں کے خواب کے، کبھی اسے غیر نبی کے لئے شیطان بنا دیتا ہے۔

بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ مرد صالح کا خواب حسن نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔ اور کہتے ہیں کہ رؤیائے صالحین کی اکثریت مراد ہے۔ ورنہ مرد صالح تو بسا اوقات اضغاث یعنی پریشان خوابوں کو بھی دیکھتا ہے لیکن یہ نادر ہے بایں وجہ کہ صلحا پر شیطان کا تسلط بہت کم ہے۔ بخلاف غیر صلحا کے کہ اس میں صدق نادر ہے بایں وجہ کہ ان پر شیطان کا تسلط بہت غالب ہے۔

اس جگہ یہ مشکل بیان کرتے ہیں کہ رؤیا یعنی خواب نبوت کا حصہ ہے اس کے کیا معنی ہیں حالانکہ نبوت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر منقطع ہو چکی؟ تو اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اگر خواب ورویا نبی یعنی سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا ہے تو وہ حقیقتہً اجزائے نبوت کا جزو ہے اور اگر غیر نبی نے دیکھا ہے تو بر سبیل مجاز باعتبار تشبیہہ رویائے نبوت وہ افادۂ علم میں اجزائے نبوت کا جزو ہے اور بعض کہتے ہیں جزو سے مراد علم نبوت کا جزو ہے کیونکہ نبوت اگرچہ منقطع ہو چکی ہے مگر اس کا علم باقی ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ کیا ہر شخص خواب کی تعبیر دے سکتا ہے؟ فرمایا کیا نبوت سے کھیلا جاتا ہے؟ اس کے بعد فرمایا خواب نبوت کا جزو ہے۔ اس سے مراد وہی مشابہت ہے جو رؤیائے نبوی سے۔ بربنائے اطلاع بر بعض غیوب ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ جزوِ شئی، وصف کل کو جو کہ نبوت ہے مستلزم نہیں ہے۔ مثلاً کوئی شخص بآواز بلند اشہد ان لا الہٰ الا اللہ کہتا ہے تو اسے مؤذن نہیں کہیں گے۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے بعد سلسلۂ مبشرات باقی نہیں رہے گا مگر رؤیا یعنی خواب۔

مسلم و ابو داؤد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرض میں جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے کاشانۂ اقدس کا پردہ اٹھا کر سر مبارک نکالا۔ اس وقت آپ کے سر مبارک پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور لوگ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں صف بستہ کھڑے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے لوگو! مبشرات نبوت باقی نہیں رہیں گی البتہ رویائے صالحہ رہیں گے جسے مسلمان دیکھے گا یا اسے دکھایا جائے گا۔ اور مبشرات کی تعبیر باعتبار غالب ہے ورنہ بعض رؤیا ڈراؤنے بھی ہوتے ہیں اور صادق بھی جسے حق تبارک و تعالیٰ مسلمان کیلئے بربنائے رفق و مہربانی دکھاتا ہے اور اسے پہلے سے اس چیز کے لئے آمادہ کرتا ہے جو آگے ہونے والا ہے۔

قاضی ابو بکر بن العربی فرماتے ہیں کہ کوئی اسے حقیقتہً اجزاء نبوت نہیں جانتا مگر فرشتہ یا نبی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

اس سے جو کچھ مراد لیا ہے اسی قدر ہے کہ رؤیا، فی الجملہ اجزائے نبوت کا ایک جزو ہے اس لئے کہ اس میں من وجہ یک گونہ غیوبات میں سے کسی غیب پر اطلاع ہے لیکن تفصیلی نسبت درجہ نبوت اور اس کی معرفت کے ساتھ مخصوص ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عالم کیلئے لازم ہے ہر چیز کو مکمل اور تفصیلی طور پر جانے اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے ہر عالم کیلئے واقفیت کی اس کے نزدیک ایک حد رکھی ہے لہٰذا ان میں سے کچھ کو تو وہ مکمل اور تفصیلی طور پر جان لیتا ہے اور کچھ کو مختصراً جان لیتا ہے (نہ کہ مکمل و تفصیلی طور پر) رؤیا یعنی خواب اسی قبیل سے ہے اور حدیث میں بھی روایتیں مختلف آئی ہیں۔ بعض میں پینتالیسواں حصہ ہے اور بعض میں سترواں حصہ۔ اور بعض میں چھترواں اور بعض میں چھبیسواں اور بعض میں چوبیسواں۔ اس بنا پر ان کی صحت پر وثوق نہ رہا۔ لیکن مشہور چھیالیسواں ہے۔ اور بعض عدد کیلئے روایت مشہور جو کہ چھیالیسواں ہے خاص مناسبت ظاہر کرتی ہے۔

کہتے ہیں کہ حق تبارک وتعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چھ مہینے خواب میں وحی فرمائی اس کے بعد باقی تمام مدتِ حیات بیداری میں وحی فرمائی۔ مکمل دور نبوت تئیس سال ہے۔ اور ان چھ مہینوں کی نسبت تئیس سال سے چھیالیسواں حصہ ہے یہ وجہ مناسب و معقول ہے اگر ثابت ہو جائے کہ ابتداء میں خواب میں وحی کی مدت چھ مہینے ہے۔

خطابی فرماتے ہیں کہ اہلِ علم نے اس عدد کی تاویل میں چند قول کہے ہیں جو کہ ایک بھی پایۂ ثبوت تک نہ پہنچ سکا۔ اور نہ ہم نے ہی اس بارے میں کوئی حدیث یا اثر سنی اور نہ مدعی نے ہی اس باب میں کوئی چیز بیان کی۔ محض گمان سے ہی کچھ کہا ہے:۔ "وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا۔" اور گمان حق سے کچھ بھی بے نیاز نہیں کرتا۔ اور ہم پر یہ بھی لازم نہیں کہ جس کا علم مخفی رکھا گیا ہو اسے ہم تعداد رکعات، ایام صیام اور رمی جمار وغیرہ کی مانند جانیں۔ نیز تعداد بتانے میں اس مناسبت پر جو کہ دیگر روایتوں میں آئی ہیں جاری نہیں ہے لہٰذا اولیٰ بلکہ واجب ہے کہ علم کو شارع علیہ السلام پر تفویض کر دیں۔ (واللہ اعلم)۔

سچے خواب کا وقت: ایک اور بات بھی جان لینی چاہئے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ "اَصْدَقُ الرُّؤْیَا بِالْاَسْحَارِ۔" سب سے سچا خواب صبح صادق کے وقت دیکھنا ہے، اسے ترمذی اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس وقت زمانہ متقارب ہو جائے تو مسلم کے خواب جھوٹ نہیں ہوتے۔ اور جو تم میں راست گو ہے اس کا خواب سب سے سچا ہے۔ اقتراب زمان میں دو قول ہیں اس کے ایک معنی یہ ہیں کہ زمانہ شب اور زمانہ نہار جب متقارب ہو جائیں۔ یہ وقت ایام ربیع میں برابر ہوتا ہے کہ دن اور رات برابر ہوتے ہیں اور یہ وقت طبائع اربعہ کے اعتدال کا ہے ان لوگوں کا یہی مفہوم ہے اور ظاہر یہ ہے کہ ایام خریف کو بھی کہتے ہیں کہ یہ وقت تحویل میزان ہے اور لیل و نہار کے اوقات میں برابری کا وقت ہے۔ تعبیر گویوں کا بھی یہی مذہب ہے کہ سب سے سچا خواب لیل و نہار کے اعتدال کے وقت کا ہے۔ اس جگہ یہ بحث کی گئی ہے کہ اس وجہ پر مسلم کی قید لگانے کا کیا فائدہ ہے اس لئے کہ اس وقت میں اعتدال طبائع، مسلم کے ساتھ مخصوص نہیں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ کافر کا حال دائرہ اعتبار سے خارج ہے اور اس کے خواب پر صدق کا اطلاق ممنوع ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ اقتراب زمان سے مراد قرب قیام قیامت اس کی مدت کی انتہا ہے اور اس کی تائید ترمذی کی یہ حدیث کرتی ہے کہ:۔

" فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ لَا تَکْذِبُ رُؤْیَا الْمُؤْمِنِ " آخر زمانے میں مسلمان کے خواب جھوٹے نہ ہوں گے۔

اور اس مسکین نے (یعنی صاحب مدارج النبوۃ نے) اپنے بعض مشائخ سے سنا ہے کہ اقتراب زمان سے مراد موت ہے اور بعض کہتے ہیں کہ زمانہ مذکور سے مراد امام مہدی علی نبینا و علیہ السلام کا ہے۔ کیونکہ ان کے زمانے میں عدل و انصاف، امن و امان اور خیر و رزق عام ہو گا اس لئے کہ وہ زمانہ باعتبار وجود لذت اور خوشی و مسرت کے مختصر ہو گا اور بعض کہتے ہیں کہ اس زمانہ کے لوگ مراد ہیں جو

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ دجال کے ہلاک کر دینے کے بعد باقی رہیں گے اور وہ اپنے احوال میں اس امت کے تمام لوگوں میں صدر اول کے بعد بہترین اور سب سے زیادہ راست گو ہوں گے۔ اسی بناء پر اس حدیث کے آخر میں فرمایا:۔ "وَاَصْدَقُکُمْ رُؤْیًا اَصْدَقُکُمْ حَدِیْثًا" اس کا خواب زیادہ سچا ہے جو تم میں سب سے زیادہ راست گو ہے۔ صدق رؤیا میں راست گفتاری کی شرط کی وجہ ظاہر ہے اس لئے کہ جو سچ بولتا ہے اس کا دل روشن ہو جاتا ہے اور اس کا ادراک قوی ہو جاتا ہے اور صحیح طور پر اس کے خیالات و معنی منقش ہوتے ہیں اور جو بیداری کی حالت میں صحیح و سالم ہے اس کا خواب بھی ایسا ہی ہو گا بخلاف جھوٹے اور ملی جلی باتیں کرنے والے کے۔ کیونکہ اس کا دل تاریک وفاسد ہے تو اس کا خواب بھی ہمیشہ جھوٹا اور پریشان ہوتا ہو گا۔ اور کبھی صادق، غیر صحیح اور کاذب صحیح بھی دیکھ لیتا ہے لیکن اکثر و غالب وہی ہے جو کہا گیا ہے۔

نیز حدیث شریف میں ہے کہ جب تم میں سے کوئی خواب میں ایسی چیز دیکھے جو اسے محبوب و پسند ہے تو وہ خدا کی جانب سے ہے اس پر لازم ہے کہ حمد و شکر الٰہی بجالائے اور اس کی تحدیث کرے یعنی لوگوں کو بتائے اور اگر خواب میں ایسی چیز دیکھی ہو جو اسے ناپسند و ناگوار ہے تو وہ شیطان کی طرف سے ہوگی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ حق تبارک و تعالیٰ سے اس کے شر و فساد سے پناہ مانگے اور اس کا ذکر کسی سے نہ کرے اور کسی کو ضرر نہ پہنچائے۔ (رواہ البخاری)

مسلم کی روایت میں ہے کہ خوابِ بد شیطان سے ہے اسے کسی کو نہ بتائے اور بائیں جانب تین مرتبہ تھو تکارے اور استعاذہ کرے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ایک پہلو سے دوسری پہلو کی طرف پھر جائے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ نماز پڑھے اور کسی کو نہ بتائے مگر حبیب لبیب سے کہہ سکتا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ نصیحت کرنے والے عالم سے کہے اور آیۃ الکرسی پڑھے اور ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ خواب پریشاں خیالی ہے مطلب یہ کہ نا قابل اعتبار ہے اور واقع نہیں ہوتا جب تک کہ تعبیر نہ لی جائے اور جب تعبیر لے لی جاتی ہے تو واقع ہو جاتا ہے۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ سب سے پہلے جو خواب کی تعبیر دی جائے وہی پیش آتا ہے۔ یہ حدیث ضعیف ہے باوجود اس کے لوگوں کی عادت ہے کہ تعبیر دینے والے سے پوچھتے ہیں۔ اگر تعبیر صحیح مل گئی تو فبہا ورنہ کبھی دوسرے سے پوچھتے ہیں۔ کذا قالوا۔ اور تعبیر دینے والے کو چاہئے بھلائی کی تعبیر دے۔ اور جہاں تک ہو خیر پر محمول کرے۔

معبرین کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اس نے عرض کیا کہ میرا شوہر غائب ہے اور میں حاملہ ہوں میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ گھر کا ستون شکستہ ہے اور میں نے بھینگی آنکھ والا بچہ دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعبیر دی کہ انشاء اللہ تیرا شوہر صحیح و سالم واپس آئے گا اور تو خوبصورت و اچھی خصلت کا بچہ جنے گی۔ یہ عورت پھر دوسری بار آئی اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف فرما نہ تھے میں نے اس سے خواب کا قصہ معلوم کیا تو اس نے اپنا خواب بیان کیا۔ میں نے اس کے خواب کی تعبیر یہ دی کہ اگر تیرا یہ خواب صحیح ہے تو تیرا شوہر مر جائے گا۔ اور تو بدکار بچہ جنے گی تو وہ عورت بیٹھ کر رونے پیٹنے لگی اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور فرمایا اے عائشہ (رضی اللہ عنہا) ایسا نہ کر و جب تم کسی مسلمان کو اس کے خواب کی تعبیر دو تو اسے خیر پر محمول کرو اور اچھی تعبیر دو اس لئے کہ جیسی تعبیر دی جاتی ہے ایسا ہی خواب واقع ہوتا ہے۔

یہ بھی روایت میں ہے کہ معبر لوگوں کو چاہئے کہ وہ تعبیر دینے سے پہلے کہے:۔ "خَیْرٌ لَنَا وَشَرٌّ لِاَعْدَائِنَا۔" (ہمارے لئے بہتری ہو اور ہمارے دشمنوں کیلئے برائی ہو) اس کے بعد وہ تعبیر دے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔

آدابِ معبرین: اہلِ علم کہتے ہیں کہ تعبیر دینے والوں کے آداب میں سے ہے کہ نہ تو طلوع آفتاب کے وقت تعبیر دیتے ہیں

نہ زوال و غروب آفتاب کے وقت اور نہ رات میں ایسا ہی صاحب مواہب نے بیان کیا ہے نہ تو اس کی کوئی وجہ ظاہر کی ہے اور نہ اس ضمن میں کوئی حدیث نقل کی ہے اگر کہیں کہ یہ وہ اوقات ہیں جن میں نماز مکروہ ہے تو استواء یعنی نصف النہار کا بھی ذکر کرنا چاہئے۔ مگر وقت زوال سے اس طرف اشارہ کر دیا ہے۔ لیکن رات میں منع کرنے کی وجہ کیا ہے؟ حالانکہ یہ حدیث صحیح میں یقیناً ثابت شدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز فجر ادا فرما چکتے تو رخ انور پھیر کر صحابہ سے دریافت فرماتے کہ کیا تم میں سے کوئی ہے جس نے آج رات خواب دیکھا ہو؟ اس کے بعد حضور سے وہ حضرات جنہوں نے خواب دیکھا ہوتا عرض کرتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں تعبیر ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ بخاری نے اپنی کتاب میں مستقل باب بعنوان "تعبیر رؤیا بعد صلوٰۃ الصبح" باندھا ہے لیکن یہ طلوع آفتاب سے پہلے ہے۔ اور وقت طلوع میں تعبیر کی ممانعت دلیل پر موقوف ہے۔ اور یہ دلیل کہ ان وقتوں میں نماز مکروہ ہے ظاہر نہیں ہے اور مواہب کی عبارت میں اس طرف اشارہ بھی موجود ہے اور یہ جو بعض کہتے ہیں کہ آفتاب جب خوب بلند ہو جائے اس وقت اور عصر سے قبل غروب آفتاب تک تعبیر دینا مستحب ہے۔ اس پر حدیث مذکور رد کرتی ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا رخ انور پھیر کر صحابہ سے خواب دیکھنے کے بارے میں سوال کرنا اس کے بارے میں اہلِ علم کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کی بشارت کے منتظر تھے اور چاہتے تھے کہ کہیں سے ظاہر ہو جائے تو معلوم نہیں انہوں نے یہ مطلب کہاں سے اخذ کیا۔ حالانکہ اس سوال کرنے کا ظاہر مطلب و مقصد یہ ہے کہ صحابۂ کرام کے احوال کو جانیں کہ ہر ایک کا سلوک کہاں تک پہنچا ہے۔ اور اس کی تدبیر کیا ہونی چاہئے۔ مشائخ کرام کا جو یہ معمول ہے کہ وہ اپنے مریدوں سے واقعات و معاملات پوچھتے ہیں۔ اور ان کا علاج کرتے ہیں تو وہ اسی سنت کے اتباع میں ہے۔ (واللہ اعلم)

بعض اہلِ علم کہتے ہیں کہ خواب کی تعبیر نماز صبح کے وقت دینا اولیٰ و اقرب ہے بہ نسبت دیگر وقتوں کے باعتبار خواب کی یادداشت کے یا بایں سبب کہ خواب دیکھنے کے زمانے سے یہ قریب وقت ہے کیونکہ بسا اوقات خواب میں نسیان عارض ہو جاتا ہے۔ اور یہ وجہ بھی ہے کہ معبر کا ذہن اس وقت حاضر ہوتا ہے کیونکہ یہ وقت پاکیزہ ہوا اور نورانیت قلب کا ہوتا ہے اور امور معاش میں فکر کرنے کی اس وقت مشغولیت کم ہوتی ہے۔

خواب دیکھنے والے کے آداب: خواب دیکھنے والے کے آداب میں سے یہ ہے کہ وہ راست گو ہو اور باوضو داہنے پہلو پر سوئے جیسا کہ سونے میں سنت ہے۔ اور سونے سے پہلے سورۂ والشمس، واللیل، والتین اور سورۂ اخلاص و معوذتین پڑھے اور یہ دعا مانگے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ سَیِّئِ الْاَحْلَامِ وَاَسْتَجِیْرُبِکَ مِنْ تَلَاعُبِ الشَّیْطَانِ فِی الْیَقْظَةِ وَالْمَنَامِ

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ رُؤْیَا صَالِحَةً صَادِقَةً نَافِعَةً حَافِظَةً غَیْرَ مَنْسِیَّةٍ اَللّٰھُمَّ اَرِنِیْ فِیْ مَنَامِیْ مَا اُحِبُّ۔

اور چاہئے کہ خواب دشمن و جاہل سے بیان نہ کرے تاکہ وہ جہالت کی وجہ سے یا دشمنی کی بناء پر بھلائی کے سوا علاوہ دوسری جانب محمول کر دے

تمام رؤیا دو قسم میں منحصر ہیں۔ ایک اضغاث احلام یعنی وہ خواب جو پراگندہ اور جھوٹے ہوں جس طرح بیداری میں خیالات فاسدہ و پریشان پیدا ہوتے ہیں یہی حال خواب کا ہے۔ "ضغث کے لغوی معنی خس و خاشاک اور پراگندگی کے ہیں اور صراح میں ضغث کے معنی ایک مٹھا گھاس کا جس میں خشک و تر گھاس ہو اور "احلام" کے معنی خوابہائے شوریدہ کے ہیں۔ اور "ضغث الحدیث" کے معنی بات میں آمیزش کرنے کے ہیں اور "احلام" حلم کی جمع ہے۔ جو کہ بالغ آدمی خواب دیکھتا ہے۔ رؤیا کی یہ قسم نامعتبر ہے یہ کوئی تعبیر نہیں رکھتا اور بسا اوقات اس قسم کا خواب شیطان کے دکھانے سے ہوتا ہے تاکہ وہ مسلمان کے خواب کو اندوہگیں کر کے اسے غمزدہ کرے۔ مثلاً یہ کہ کوئی دیکھے کہ اس کا سر کٹا ہوا ہے یا کوئی اس کا درپئے آزار ہے یا مردہ ہے یا کسی ہولناک جگہ پر پڑا ہوا ہے جہاں سے

اسے خلاصی نہیں ملتی (وغیرہ)

مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک اعرابی نے آکر کہا "یارسول اللہ" میں نے خواب میں دیکھا کہ میرا سر کٹا ہوا ہے اور میں اس کے درپے جارہا ہوں اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے منع فرمایا کہ خواب میں تجھ سے شیطان نے جو مذاق کیا ہے اسے کسی سے نہ کہنا۔ یہ خواب ایسا ہی ہے جیسے کوئی دیکھے کہ فرشتہ اسے کسی فعل حرام کرنے کا حکم دے رہا ہے یا اس کی مانند ایسی بات کہہ رہا ہے جو اس کی طاقت سے باہر ہے یا وہ چیز جو بیداری کی حالت میں دل میں خیال کر رہا تھا اور اسے محال جان رہا تھا اسے وہ خواب میں دیکھتا ہے یا وہ چیز جو اس کے مزاج پر اخلاط اربعہ میں سے غالب ہے مثلاً بلغم یا صفرا یا خون یا سودا، اسے وہ خواب میں دیکھتا ہے جیسے بلغمی مزاج پانی کو دیکھے یا صفراوی مزاج آگ یا زرد رنگ کو دیکھے یا دموی مزاج، سرخ رنگ کو دیکھے یا سوداوی مزاج، سیاہ چیز کو دیکھے وغیرہ۔ تو یہ تمام خواب نامعتبر ہیں۔

خواب کی دوسری قسم رویائے صادقہ ہے مثلاً انبیاء علیہم السلام کے رؤیا یا صلحائے امت کے خواب اور کبھی بر سبیل ندرت ان کے غیر کو بھی اس کا اتفاق پڑ جاتا ہے۔ اس جگہ دو عبارتیں ہیں ایک رویائے صادقہ دوسرے رویائے صالحہ اور حسنہ اور ظاہر ہے کہ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں لیکن بعض ان میں فرق کرتے ہیں۔ یعنی صادقہ وہ ہے جو سچا ہو اور صالحہ و حسنہ وہ ہے جو مقصود کے موافق حسب دل خواہ ہو یہ انبیاء و صلحاء کے خوابوں میں سے امور آخرت کی نسبتوں میں ایک ہوگا۔ لیکن امور دنیا کی نسبتوں میں حسب ظاہر دلخواہ نہ پڑے گی۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روز احد خواب دیکھا کہ گائیں ذبح کر رہے ہیں اور جب اپنی شمشیر پر نظر ڈالی تو ٹوٹی پڑی تھی تو حضور نے ذبح بقرہ کی تعبیر وہ کی جو اس روز صحابہ کرام کو پہنچی اور ٹوٹی ہوئی شمشیر کی تعبیر یہ فرمائی کہ ایک شخص آپ کے اہل بیت کا شہید ہوا یعنی حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ بعد ازاں عاقبت متقیوں کے لئے ہے اور فتح و نصرت ساری مخلوق پر۔

تمام لوگ تین قسموں کے ہیں ایک مستور الحال ان پر صدق و کذب دونوں برابر ہے دوم فساق و فجار ان پر اضغاث یعنی پراگندہ خیالی جھوٹے خواب غالب ہیں۔ اور ان پر صدق نادر ہے۔ اور سوم کفار ان پر تو صدق غایت درجہ نادر ہے اور بعض کافروں سے سچا خواب بھی رونما ہوا ہے جیسے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ جیل خانہ میں دو قیدی ساتھیوں کا خواب اور ان کے بادشاہ کا خواب وغیرہ ذالک۔

حدیث میں آیا ہے کہ: "اَصْدَقُ الرُّؤیَا بِالْاَسْحَارِ۔" سب سے زیادہ سچا خواب صبح کا ہے۔ بعض اہل علم کہتے ہیں کہ رات کے پہلے پہر کی خواب کی تاویل دیر میں پڑتی ہے اور نصف ثانی کا خواب متفاوت الاجزاء ہوتا ہے۔ خوابوں میں سب سے جلدی اور سرعت سے رونما ہونے والا خواب صبح کے وقت کا ہوتا ہے۔ خصوصاً طلوع فجر کے وقت کا خواب۔ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تاویل میں جلد تر ہونے والا خواب قیلولہ کا خواب ہے اور محمد بن سیرین نقل کرتے ہیں کہ کہا دن کا خواب رات کے خواب کی مانند ہے۔ اور عورتوں کے خواب کا حکم مردوں کی مانند ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ عورت جب خواب میں ایسی چیز دیکھے جو اس کے اہل سے نہ ہو تو وہ خواب اس کے شوہر کا ہے۔ یہی حال غلام کے خواب کا ہے کہ اس کے آقا کیلئے۔ اسی طرح بچوں کا خواب ماں باپ کے لئے ہے۔ (واللہ اعلم)

رویائے نبوی اور تعبیرات نبوی

وصل: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رؤیا و تعبیر بکثرت مروی ہیں۔ ان میں سے ایک دودھ کا دیکھنا اور اس کی تعبیر علم سے

دیتا ہے۔ بخاری میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے سنا ہے کہ میں حالت نوم میں تھا کہ میرے پاس دودھ کا پیالہ لایا گیا میں نے اس میں سے اتنا پیا کہ ناخنوں سے اس کی سیرابی نمودار ہو رہی تھی اور ایک روایت میں ہے کہ میں نے اتنا پیا کہ میں اسے اپنے جسم کے رگ و ریشے میں گردش کرتا دیکھ رہا تھا پھر اس میں جو کچھ باقی رہا اسے میں نے عمر رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ نے اس کی تعبیر و تاویل کیا کی؟ فرمایا میں نے علم مراد لیا۔

شیخ ابن ابی جمرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دودھ سے یہ تعبیر کرنا اس بنا پر ہے جو شب معراج میں اول امر پر جو چیز ظاہر ہوئی تھی جس وقت کہ آپ کے پاس شراب کا پیالہ اور دودھ کا پیالہ لایا گیا تھا تاکہ وہ ان میں سے جو چاہیں پسند فرمائیں آپ نے دودھ کو پسند فرمایا تھا۔ اس پر جبریل علیہ السلام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ نے فطرت کو اختیار فرمایا یعنی دین کو۔ اور بعض مرفوع حدیثوں میں دودھ کی تعبیر فطرت سے آئی ہے۔ اور بعض روایتوں میں علم سے۔ اور دودھ کو علم سے تعبیر دینے کی وجہ اس کا کثرت نفع ہے اور یہ کہ بدن کی اصلاح کا سبب ہے۔ لہٰذا علم ارواح کی غذا میں بدن کی غذا اور اس کی اصلاح میں دودھ کی مانند ہے۔ اور کہتے ہیں کہ اس جہان میں علم کی مثال دودھ ہے اور الحمد للہ اس مسکین نے (صاحب مدارج نے) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ میں بعض خوابوں میں اس سعادت و بشارت سے بہرہ مندی پائی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ میں نے دودھ سے زیادہ لطیف و شیریں خوش ذائقہ تازہ دودھ پیا ہے اور میں نے اس سب کو پی لیا ہے امیدوار ہے کہ علم دین کے حصے سے مشرف و محظوظ ہو گا۔ ایک اور مرتبہ یہ دیکھا کہ کانسی کے بڑے برتن میں بہت سفید و شیریں لطیف و نظیف دودھ ہے۔ میں نے اسے پی لیا ہے۔ والحمد للہ علی ذالک۔

ان میں سے ایک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قمیص دیکھنا بھی ہے اس کی تعبیر آپ نے دین سے لی تھی۔ بخاری نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں سو رہا تھا میں نے دیکھا کہ میرے حضور لوگ پیش کئے گئے۔ ان کے جسموں پر ایسی قمیصیں تھیں کہ بعض کے تو چھاتیوں تک تھی اور بعض اس سے "دُون" اور میرے آگے عمر رضی اللہ عنہ گزرے تو ان کی قمیص گھسٹ رہی تھی یعنی اتنی لمبی تھی کہ زمین تک پہنچ گئی تھی۔ لفظ "دُون" کے دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اتنے چھوٹے تھے کہ حلق سے چسپاں ہوں گے اور دوسرا یہ کہ اس سے نیچے ہوں گے چنانچہ ناف تک پہنچے ہوں گے۔ اور دراز تر پہلے سے ہوں گے۔ اس احتمال کی تائید وہ روایت کرتی ہے جسے حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں بیان کیا ہے ان میں کچھ لوگوں کی قمیصیں ناف تک تھیں اور کچھ لوگوں کی آدھی پنڈلی تک اور قمیص سے دین کے ساتھ تعبیر کرنا اس بنا پر ہے کہ قمیص دنیا میں ستر کو چھپاتی ہے۔ اور دین آخرت میں پردہ پوشی کرتا اور ہر مکروہ سے باز رکھتا ہے اور بنیاد اس باب میں حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ:۔ "لِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ" تقوے کا لباس یہ بہتر ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ وجہ یہ ہے کہ دین جہالت کی شرمگاہ کو چھپاتا ہے جس طرح کہ قمیص بدن کے ستر کو چھپاتی ہے اور جس کی قمیص سینہ تک ہے وہ کفر سے دل کو ڈھانپتا ہے اگرچہ معاصی کا ارتکاب کرتا ہے۔ اور جن کی اس سے کچھ نیچے ہے اور ان کی شرمگاہ ننگی ہے اور ان کے پاؤں کھلے ہوئے ہیں وہ گناہ کی طرف چلتے ہیں۔ اور جن کی قمیص گھسٹتی ہے اور ان کے جسموں سے زیادہ ہے وہ عملِ صالح میں کامل ہیں اور لوگوں سے مراد یا تو تمام مسلمان ہیں یا مخصوص امت مرحومہ بلکہ ان میں سے بھی بعض لوگ اور "دین" سے مراد عمل اور اس کے مقتضیات ہیں۔ یعنی امر کو بجالانے نہی سے اجتناب کرنے کی خواہش رکھنا۔ اس ضمن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقام بہت بلند و بالا تھا۔ اور اس حدیث سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اہلِ دین فضیلت میں کم و زیادہ اور دین میں قوی و کمزور ہیں۔ یہ ایسی باتیں ہیں جن کا خواب میں دیکھنا محمود ہے۔ یہ باتیں بیداری میں بھی رونما ہوتی ہیں اور خبر میں جو یہ کہا گیا کہ قمیص گھسٹتی تھی تو یہ شرعاً مذموم ہے۔ اس لئے کہ تطویل میں وعید وارد ہے۔ اور نیند کی حالت شرعی تکلیف سے باہر

ہے۔ اور یہ اس امر کے مشابہ ہے جو معراج کے ضمن میں ہے کہ قلب شریف کو سونے کے طشت میں غسل دیا گیا۔ اور ان میں سے ایک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب میں اپنے دستِ مبارک میں دو کنگنوں کو پہنتے دیکھنا اور اس کی تعبیر دو کذابوں سے کرنا بھی ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں حالت خواب میں تھا کہ یکایک مجھے زمین کے خزانے دیئے گئے یہ قیصر و کسریٰ کے خزانوں کی طرف کنایہ ہے جنہیں آپ کی امت پر فتح کیا گیا۔ اور یہ بھی احتمال رکھتا ہے کہ سونے چاندی کے معادن ہوں۔ فرمایا اس کے بعد جب میرے دونوں ہاتھوں میں دو سونے کے کنگن پہنائے گئے تو مجھے یہ گراں اور ناگوار معلوم ہوا اور اس نے مجھے غمگین کر دیا پھر میری طرف وحی کی گئی کہ میں ان کنگنوں پر پھونک ماروں۔ چنانچہ جب میں نے ان پر پھونک ماری تو وہ جاتے رہے۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ اڑ گئے۔ میں نے ان کنگنوں کی تعبیر و تاویل یہ کی کہ میں دو کذابوں کے درمیان ہوں۔ ایک کذاب کوہ صفا کے درمیان ہے دوسرا کذاب یمامہ کے نزدیک۔ جو نبوت کا دعویٰ کر رہے ہیں ان میں سے ایک اسود عنسی تھا جس نے یمن میں دعویٰ نبوت کیا اور وہ فیروز دیلمی کے ہاتھوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے ہی مارا گیا۔ اور آپ کی طرف قبل رحلتِ مرض وفات میں اس کی وحی فرمائی گئی۔ اور آپ نے اس کے مارے جانے کی خبر دی۔ اور فرمایا:۔ "قَتَلَهُ الْعَبْدُ الصَّالِحُ فَيْرُوزُ دَيْلَمِي" یعنی اسے مرد صالح فیروز دیلمی نے قتل کر دیا اور فرمایا "فَازَ فَيْرُوزُ" یعنی فیروز کامیاب ہو گئے اور دوسرا کذاب "مسیلمہ کذاب" تھا جس نے یمامہ میں دعویٰ نبوت کیا۔ یمامہ حجاز کا ایک شہر ہے۔ یہ کذاب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے خلافت کے زمانے میں مارا گیا۔

دو کذابوں اور دو کنگنوں کی تاویل میں اہلِ علم کہتے ہیں کہ کسی چیز کو اس کی جگہ کے برخلاف رکھنے کو کذب کہتے ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دونوں کلائیوں میں دو سونے کے کنگن دیکھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس عادیہ میں سے نہ تھے۔ اس لئے کہ یہ عورتوں کا زیور ہے اور وہ جوان لوگوں سے ظاہر ہوا کہ انہوں نے ایسی چیز کا دعویٰ کیا جس کے وہ اہل ولائق نہ تھے۔ اور یہ بات بھی ہے کہ سونا مردوں کیلئے ممنوع ہے اس کا پہننا کذب پر دلیل ہے۔ نیز ذہب (سونا) ذہاب سے بنا ہے جس کے معنی جانے کے ہیں تو جان لیا کہ یہ وہ چیز ہے جو جانے والی اور زائل ہونے والی ہے۔ اور یہ بات حکم الٰہی سے اور متاکد و مضبوط ہو گئی کہ حق تبارک وتعالیٰ نے آپ کو اس پر پھونک مارنے کا حکم فرمایا تو وہ چلی گئیں یا اڑ گئیں تو معلوم ہو گیا کہ آپ کیلئے وہ باقی رہنے والی چیز نہیں ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وحی سے کلام فرمانا کہ وہ آئی ہے ان کو اپنی جگہ سے دور کرتا ہے۔

قرطبی کہتے ہیں کہ اس رؤیا کی تعبیر میں مناسب تاویل یہ ہے کہ اہلِ صفا اور اہلِ یمامہ نے اسلام قبول کر لیا تھا اور وہ اسلام کے مددگار بن گئے تھے۔ پھر جب ان میں دو کذاب ظاہر ہوئے اور ان دونوں نے ان شہروں کے رہنے والوں پر اپنے مزیّن کلام اور باطل دعووں سے اثر اندازی کی تو وہاں کے اکثر شہری دھوکے میں آ گئے تو گویا دین میں وہ بمنزلہ دو شہروں کے ہو گئے اور دو کنگن بمنزلہ دو کذابوں کے بن گئے اور ان کنگنوں کا سونے کے ہونے میں اشارہ ہے۔ انہوں نے اپنے کلاموں کو آراستہ کیا اور "زخرف" سونے کا نام ہے (انتہیٰ)۔

اور بعض اہلِ علم دو کنگنوں اور دو کذابوں کی تاویل و تعبیر میں کہتے ہیں کہ ہاتھ میں کنگن ہونا ہاتھ کو باندھ دینے کے مشابہ ہے جیسا کہ پاؤں میں ہوتا ہے۔ بندش ہاتھ کو عمل و تصرف کے نفع سے روکتی ہے گویا کہ دو کذابوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں دست مبارک کو گرفت میں لے لیا اور دونوں ہاتھوں کو عمل و تصرف کیلئے آزاد نہ چھوڑا (کذا ذکرا لطیبی)

ان میں سے ایک کالے رنگ کی عورت کو ژولیدہ بالوں کے ساتھ مدینہ منورہ سے نکلتے دیکھنا بھی ہے۔ اس کی مدینہ طیبہ سے

جحفہ کی طرف وبا کے منتقل ہو جانے کی تعبیر دی گئی۔ بخاری نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے سیاہ رنگ کی ژولیدہ بالوں والی عورت کو مدینہ سے باہر نکلتے اور مہتغہ میں ٹھہرتے دیکھا ہے۔ مہتغہ جحفہ کا نام ہے، جو مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان ایک موضع ہے جس میں یہودی رہا کرتے تھے تو میں نے اس کی یہ تاویل کی کہ مدینہ طیبہ سے وبا جحفہ کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ کیونکہ مدینہ منورہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدوم مبارک سے پہلے وبا و بخار بہت زیادہ تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے وہاں سے نکال کر کافروں کی بستیوں میں بھیج دیا۔

وبا کو کالے رنگ کی عورت سے تشبیہ دینے میں اہلِ علم یہ کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ سوداء (بمعنی سیاہ) سے لفظ "سوء" بمعنی برائی اور داء (یعنی بیماری و درد) کو نکالا۔ پھر تاویل فرمائی کہ میں نے اس چیز کو نکال باہر کیا جس میں یہ دونوں لفظ اس کے نام میں جمع تھے یعنی لفظ "سوداء" سے لفظ مرکب "سوء داء" (بری بیماری) بنا۔

اور ثوران، سوداء کے سرِ لفظ سے تاویل کرتے ہیں یعنی سو جس کے معنی بدی کے ہیں جو برائی و شر کو ابھارتا ہے۔ آپ نے اسے نکال پھینکا۔ اور قیروانی کہتے ہیں کہ ہر وہ چیز جس کا منہ کالا ہو وہ اس کے منہ کو مکروہ و مذموم کر دیتا ہے اور کہتے ہیں کہ ثوران راس کی تعبیر بخار کے ساتھ کی گئی ہے اس لئے کہ وہ بدنوں کو جوش میں لاتا اور لرزہ پیدا کرتا ہے۔ خصوصاً تپ سوداوی کہ وہ تو بہت ہی وحشت لاتا ہے۔

اور انہیں میں سے ایک تلوار کا دیکھنا بھی ہے کہ آپ اسے گھمارہے ہیں اور وہ کبھی کند ہو جاتی اور پھر اپنے حال پر آجاتی ہے۔ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ میں تلوار کو گھما رہا ہوں وہ کند ہو جاتی ہے پھر میں گھماتا ہوں تو دوبارہ پہلے سے بہتر حالت پر آجاتی ہے۔ آپ نے اس کی یہ تعبیر فرمائی کہ حق تعالیٰ فتح اور مسلمانوں کا اجتماع لایا ہے۔

اس تعبیر میں اہلِ علم فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار کو صحابہ سے تعبیر فرمائی۔ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام زور و غلبہ انہیں کے ساتھ تھا اور تلوار گھمانے کو انہیں حکم جہاد و حرب دیئے جانے سے تعبیر فرمائی اور تلوار کے کند ہونے کو ان پر ہزیمت کے واقع ہونے سے تعبیر فرمایا۔ اور دوبارہ گھمانے اور اپنی اصلی حالت سے بہتر ہو جانے کو ان کے اجتماع، فتح حاصل ہونے اور ان کی جمعیت و طاقت بننے پر محمول فرمایا۔ یہ خواب غزوۂ احد کے موقع کا ہے۔

مواہب میں ایک اور صاف مضمون کی حدیث بیان کی گئی ہے جو حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے خواب دیکھا کہ میں مکہ مکرمہ سے ایسی زمین کی طرف ہجرت کر رہا ہوں جس میں کھجوروں کے باغات ہیں تو میں نے خیال کیا کہ یہ زمین یا تو یمامہ ہوگی یا ہجر، کیونکہ ان بستیوں میں نخلستان بہت ہیں اس کے بعد بتلایا گیا کہ وہ یثرب یعنی مدینہ منورہ ہے اور امام احمد کی روایت ہے، جو ان کے سوا حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس میں بھی ایسا ہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے دیکھا کہ میں "ورع حصینہ" میں آیا ہوں اور گائیں ذبح کئے جانے کو ان شخصوں سے تعبیر کیا جو روزِ احد شہید ہوئے (رضی اللہ عنہم اجمعین) اور حق تعالیٰ کا فتح و ثواب اور صدق لانے کو روز بدر سے فتح مکہ تک جہاد و قتال پر صبر کرنے سے تعبیر کیا۔

مشکوٰۃ شریف میں ہجرت کا ذکر اور مقام ہجرت کو مخفی رکھے جانے اور شہر یثرب متعین ہونے اور تلوار گھمانے اس کے کند ہونے پھر اپنی اصلی حالت پر آجانے کو ایک حدیث میں جمع کیا گیا ہے لیکن گائیں ذبح کئے جانے کا ذکر اس حدیث میں مذکور نہیں ہے۔

انہیں میں سے ایک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب میں کنواں دیکھنا اور اس سے پانی نکالنا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک کنویں کے سرے پر کھڑا ہوں۔ اس کنویں

پر ایک ڈول ہے۔ میں نے اس سے اتنا پانی نکالا جتنا خدا نے چاہا۔ اس کے بعد ابن ابی قحافہ رضی اللہ عنہما آئے انہوں نے اس کنویں سے ایک دو ڈول پانی کے کھینچے۔ ایک روایت میں ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ آئے اور انہوں نے میرے ہاتھ سے ڈول لے لیا تا کہ میں آرام لے لوں۔ اس کے بعد میں نے ان سے زیادہ عجیب نہ دیکھا کہ وہ ان کی مانند عمل کر سکے اور اتنے بڑے ڈول کو پانی سے بھر کر نکال سکے۔ ان کے پانی کے ڈول کے نکالنے میں خاص قسم کا ضعف ہے۔ خدا انہیں معاف فرمائے اس کے بعد عمر رضی اللہ عنہ آئے تو میں نے ان جیسا بہادر قوی و توانا شخص کسی کو نہ دیکھا کہ کوئی ان کی مانند پانی نہ نکال سکے۔ ابن خطاب نے اتنا پانی نکالا کہ تمام لوگ سیراب ہو گئے۔

اس حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تعریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ "عبقری" استعمال فرمایا ہے عبقری، قوم میں سردار، بزرگ اور قوی و توانا ہوتا ہے اسے کہتے ہیں۔ عبقر دراصل پریوں کی زمین کو کہتے ہیں اور اہلِ عرب ہر اس چیز کو خواہ وہ آدمی ہو یا کپڑا، فرش ہو یا کچھ اور جب وہ انتہائی مضبوط اور حسن و لطافت میں اعلیٰ ہو تو اسے عبقری سے نسبت دیتے ہیں۔ (کذا فی الصراح)

اور قاموس میں ہے کہ:۔

اَلْعَبْقَرُ مَوْضِعٌ كَثِيْرُ الْجِنِّ، اَلْعَبْقَرِيُّ الْكَامِلُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَالسَّيِّدُ وَالَّذِيْ لَيْسَ فَوْقَهٗ شَيْءٌ وَالشَّدِيْدُ۔

یعنی عبقر اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں جنات زیادہ ہوں اور عبقری اسے کہتے ہیں جو ہر شئی میں کامل ہو اور سردار کو اور اس شخص کو جس سے زیادہ قوی تر نہ ہو اور شدید کو بھی کہتے ہیں۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ انہوں نے ڈول کھینچا یہاں تک کہ تمام لوگ سیراب ہو گئے اور حوض بھر گئے اور پانی بہنے لگا۔

مواہب میں صاحب مواہب کہتے ہیں کہ نووی نے فرمایا ہے کہ یہ ان کی ایک مثال ہے جو کچھ ان دونوں خلفاء سے امر دین میں ظاہر ہوا اور آثارِ صالحہ رونما ہوئے اور ان سے خلائق کو جو نفع حاصل ہوا حقیقت میں یہ سب سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی ماخوذ ہے۔ اس لئے کہ صاحبِ امر آپ ہی ہیں لہٰذا سب سے اکمل و اتم امر دین قائم ہوا۔ اور دین کے قاعدوں کو برقرار کیا۔ اور ملت کی بنیادوں کو مضبوط بنایا۔ (صلی اللہ علیہ و آلہ واتباعہ وسلم)

پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ اور جانشین ہوئے اور آپ نے مرتدین سے جہاد کیا اور ان کی جڑوں کو کاٹ کر پھینک دیا۔ اور ان میں سے کسی ایک کو باقی نہ رکھا۔ ان کے بعد حضرت عمر بن خطاب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو ان کے مبارک و بزرگ تر زمانے میں اسلام کا دائرہ کشادہ ہوا۔ اسی بنا پر امر دین اسلام کو اس کنویں سے تشبیہ دی جس میں پانی ہے۔ کیونکہ ان کی زندگی اور ان کے کاموں کی درستگی اسی سے وابستہ ہے۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے ارشاد میں یہ فرمانا کہ "ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے ڈول لے لیا تا کہ وہ مجھے آرام پہنچائیں۔" اس میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی طرف اشارہ ہے جو بعد از رحلت واقع ہوئی۔ اس لئے کہ دنیاوی کدو کاوش سے موت راحت ہے۔ تدبیر امت اور ان کے احوال کی درستگی کا قیام عمل میں آیا۔

اور یہ فرمانا کہ ان کے پانی نکالنے میں ضعف ہے اس میں ان کی ولایت کی مدت مختصر ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صرف دو سال چند ماہ خلافت کی ان کے بعد حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی ولایت شروع ہوئی۔ چونکہ ان کی خلافت طویل رہی اس لئے لوگوں کو ان سے نفع حاصل ہونے کا خوب موقع ملا۔ اور سرحدات اسلام میں بڑی وسعت ہوئی اور بکثرت ممالک و بلاد کی فتوحات ہوئیں اور دفتری نظام قائم فرمایا۔ ان کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں ضعف کا

اشارہ نہیں ہے بلکہ تحسین وادائے شکر فرمایا۔ اور انہیں تعبیرات کے سلسلے میں ایک روایت ہے جسے مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ فرماتے ہیں میں نے آج رات خواب میں دیکھا کہ عقبہ بن رافع رضی اللہ عنہ کے گھر سے ایک طشت ابن طاب کی کھجوروں کا لا کر صحابہ کے آگے رکھا گیا۔ حضرت عقبہ بن رافع رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں یہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے خالہ زاد بھائی ہیں۔ ابن طاب کی کھجور تروتازہ کھجوروں کی ایک قسم ہے۔ ابن طاب ایک شخص تھا یہ اس کی طرف منسوب ہے یا تو اس نے اسے بویا ہوگا یا وہ اسے پسند رکھتا ہوگا۔ اس بنا پر اسے تمر ابن طاب کہا جانے لگا۔ صبح کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعبیرات ارشاد فرمائی کہ دنیا و آخرت میں اس کی عافیت بخیر ہوگی۔ اس معنی کو ان کے نام کے لفظ عقبہ سے لیا۔ اور جامع الاصول میں مسلم کی حدیث سے منقول ہے کہ ان کی رفعت وعافیت درست ہے اور رفعت کو لفظ رافع سے اخذ فرمایا۔ اور وہ دین جسے انہوں نے اختیار کیا وہ حق تعالیٰ کو ان کی جانب سے شیریں وخوش آیا۔ اس مفہوم کو لفظ "رطب ابن طاب" یعنی "ابن طاب کی تروتازہ" کھجوروں سے اخذ فرمایا۔

یہ تمام وہ خواب ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود دیکھا اور خود ہی تعبیر لی۔ لیکن یہ بات پوشیدہ نہ رہنی چاہئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعبیریں محض استنباطی اور مناسبتی نہیں ہیں جیسا کہ ذکر کیا گیا۔ اور نہ اہل تعبیر کی مانند کوئی مناسبت رکھتی ہیں جیسی ان کی روش ہے بلکہ یہ سب وحی والہام کے ذریعہ ہوتا رہا ہے۔ اگر ان میں کسی مناسبت کی رعایت پائی جاتی ہے تو کوئی بعید نہیں جیسا کہ اسی حدیث میں "رطب ابن طاب" کے دیکھنے سے ان کے ناموں سے معنی ماخوذ کر کے تعبیر بتائی گئی اہل علم فرماتے ہیں کہ آپ کی عادتِ شریفہ تھی کہ ناموں سے معانی اخذ کر کے تفاول ظاہر کرتے تھے جیسا کہ بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ وہ ہجرت کے وقت مدینہ کے راستے میں سامنے آئے۔ میں نے ان سے پوچھا تمہارا نام کیا ہے؟ انہوں نے کہا "بریدہ" فرمایا "بَرُدَ اَمْرُنَا" ہمارا معاملہ ٹھنڈا ہے پھر دریافت فرمایا تمہاری نسبت کس سے ہے انہوں نے کہا "اسلمی" فرمایا "سَلِمَ اَمْرُنَا" ہمارا معاملہ درست وسالم ہے۔ پھر دریافت فرمایا کون اسلمی؟ انہوں نے کہا از بنی سہم یعنی سہم کی اولاد سے (سہم کے معنی تیر کے ہیں) فرمایا:۔ "اَصَبْتَ سَہْمَکَ" تم اپنے تیر پر ٹھیک پہنچے۔ وغیر ذالک۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شمشیر کی تعبیر مومنین سے فرمائی حالانکہ معبرین کے نزدیک شمشیر کی اور بھی تعبیریں ہیں۔ مثلاً اولاد، بھائی، بیوی، زبان اور ولادت وغیرہ جیسا کہ قرطبی نے بیان کیا ہے۔ (واللہ اعلم)

رؤیائے صحابہ اور تعبیرات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

وصل: پہلے مضمون میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بذات خود دیکھے ہوئے خواب تھے لیکن وہ خواب جنہیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے دیکھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعبیر بیان فرمائی وہ بھی بہت کثرت سے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ نماز فجر کے بعد صحابہ کرام کی جانب رخ انور پھیر کر فرماتے تم میں سے جس نے آج رات کوئی خواب دیکھا ہو اسے میرے سامنے بیان کیا جائے تاکہ میں اسے اس کی تعبیر دوں۔ اگر کوئی کچھ بیان نہ کرتا تو بذات خود جو دیکھا ہوتا بیان فرماتے۔ چنانچہ حسبِ معمول ایک صبح دریافت فرمایا تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ سب نے کہا ہم میں سے کسی نے کوئی خواب نہیں دیکھا۔ فرمایا لیکن میں نے آج رات دیکھا کہ میرے پاس دو شخص آئے ہیں اور دونوں میرا ہاتھ پکڑ کر ارضِ مقدس کی طرف لے چلے۔ یکایک میری نظر ایک شخص پر پڑتی ہے جو بیٹھا ہوا اور ایک اور شخص کھڑا ہوا اس کے ہاتھ میں

آہنی گرز ہے وہ اپنے آہنی گرز کو بغل سے نکالتا ہے اور بیٹھے ہوئے شخص کے رخسار پر مارتا ہے وہ گرز اس کی گدی تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن جب وہ گرز اٹھالیتا ہے تو وہ رخسار پھر صحیح و سالم ہو جاتا ہے۔ پھر وہ دوبارہ گرز مارتا ہے ہر بار ایسا ہی ہوتا ہے میں نے اپنے ان دونوں ہمراہیوں سے پوچھا یہ کیا ہے انہوں نے کہا چلئے یعنی اسے نہ پوچھئے اور چیزیں بھی دیکھنی ہیں۔ پھر ہم چل دیئے پھر ہم ایک شخص پر گزرے جو پہلو پر سور ہا تھا۔ اور دوسرا شخص کھڑا ہے اس کے ہاتھ میں پتھر ہے جس سے وہ اس کے سر کو کچل رہا ہے تو جب وہ پتھر مارتا ہے تو وہ سر میں گھس جاتا ہے پھر جب وہ پتھر اٹھاتا ہے تو اس کا سر پہلے کی مانند ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اور اپنے حال پر آجاتا ہے۔ وہ پھر سر کو کچلتا ہے۔ میں نے دریافت کیا یہ کیا ہے انہوں نے کہا آگے چلئے تو ہم آگے چلے یہاں تک کہ ایک تنور کی مانند سوراخ پر پہنچے جس کا دہانہ تنگ ہے اور اس کا پیٹ کشادہ ہے اس میں مرد و عورتیں ہیں۔ جو ننگے ہیں اور ان کے نیچے آگ جل رہی ہے۔ جب آگ بھڑک جاتی ہے تو وہ مرد اور عورتیں اس پر چلنے ہیں۔ یہاں تک کہ قریب نکلنے کے ہو جاتے ہیں۔ اور جب آگ سرد پڑنے لگتی ہے تو اسے پھر بھڑکا دیتے ہیں۔ میں نے کہا یہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا آگے چلئے تو ہم چلے یہاں تک کہ ایک نہر پر آئے جو خون کی ہے۔ اس میں مرد نہر کے درمیان کھڑے ہیں اور نہر کے کناروں پر کچھ لوگ ہیں ان کے آگے پتھر پڑے ہوئے ہیں۔ جو کوئی نہر میں سے اپنا منہ نکالتا اور کنارہ کی طرف بڑھتا اور وہاں سے نکلنا چاہتا ہے تو کنارے پر کھڑے ہوئے لوگ اس کے منہ پر پتھر مارتے تو وہ اسی جگہ پلٹ جاتا جہاں وہ تھا۔ اسی طرح جو بھی نکلنے کا ارادہ کرتا اس کے منہ پر پتھر مارا جاتا تو وہ پلٹ جاتا جہاں وہ تھا۔ میں نے کہا یہ کیا ہے انہوں نے کہا آگے چلئے ہم چلے یہاں تک کہ ہم ایک مرغزار سبزے پر پہنچے جہاں ایک بہت بڑا درخت ہے اور اس کی جڑ میں ایک بوڑھا شخص بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے قریب کئی بچے ہیں۔ وہاں ایک مرد درخت کے قریب ہے۔ وہ اپنے آگے آگ جلا رہا ہے۔ پھر وہ دونوں مجھے اس درخت کے اوپر لے گئے اور ایک مکان میں داخل کیا جو اس درخت میں تھا۔ میں نے اس سے بہتر گھر کبھی نہیں دیکھا۔ اس میں بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں اور بچے ہیں۔ پھر مجھے وہاں سے لے جا کر اس کے اوپر کے مکان میں لے گئے وہ گھر پہلے گھر سے بڑا، بہتر اور خوشتر تھا اس میں بھی بوڑھے اور جوان لوگ ہیں۔ پھر میں نے ان دونوں ہمراہیوں سے کہا کہ آج کی رات تم نے بہت پھرایا اب مجھے وہ بتاؤ جو کچھ کہ میں نے دیکھا۔ انہوں نے کہا ہم بتاتے ہیں۔ انہوں نے بتانا شروع کیا کہ وہ مرد جس کے رخساروں کو پارہ پارہ کیا جاتا تھا وہ دروغ گو ہے جھوٹی باتیں بناتا تھا اور وہ اس سے نقل ہو کر سارے جہاں میں پھیل جاتی تھیں تو اس کے ساتھ جو کچھ کیا جاتا آپ نے دیکھا ہے وہ قیامت تک یوں ہی ہوتا رہے گا۔ اور وہ شخص جس کا سر کچلتے آپ نے دیکھا ہے یہ وہ شخص ہے جسے حق تعالیٰ نے قرآن سکھایا اور وہ رات میں قرآن سے غافل ہو کر سوتا رہا اور قرآن کو نہ پڑھا اور نہ رات کی نماز کیلئے اٹھا۔ وہ دن میں قرآن پڑھتا لیکن اس پر عمل نہیں کرتا تھا تو جو کچھ آپ نے دیکھا وہ قیامت تک یوں ہی ہوتا رہے گا اور جن لوگوں کو آپ نے تنور میں پڑے دیکھا وہ زنا کار ہیں۔ اور جن لوگوں کو آپ نے خون کی نہر میں غوطہ زن دیکھا وہ سود خوار ہیں اور وہ بوڑھا شخص جس کو آپ نے ایک بڑے درخت کے نیچے بیٹھا دیکھا وہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ ہیں اور جو بچے ان کے گرد تھے وہ ان کی اولاد ہیں اور وہ شخص جس کو آگ بھڑکاتے دیکھا وہ مالک ہے۔ اور جہنم کا داروغہ ہے۔ اور وہ مکان جو آپ نے پہلے دیکھا وہ عام مسلمانوں کی جگہ ہے اور وہ مکان جو اس کے اوپر دیکھا وہ شہداء کی جگہ ہے اور ہم جبریل (علیہ السلام) و میکائیل (علیہ السلام) ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے کہا آپ اپنا سر اٹھایئے میں نے اپنا سر اٹھایا تو دیکھتا ہوں کہ کوئی چیز ابر کی مانند ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ابر کی مانند سفید ہے جس سے ترشح ہو رہا ہے انہوں نے کہا یہ آپ کا مکان ہے میں نے کہا تو مجھے چھوڑ دو کہ میں اپنی منزل پر چلا جاؤں تو انہوں نے کہا ابھی آپکی دنیاوی عمر باقی ہے وہ ختم نہیں ہوئی ہے جب آپ کی عمر پوری ہو جائے گی تو آپ اپنی منزل میں تشریف لے آئیں گے اسے بخاری نے روایت کیا اور بخاری کی دوسری روایت میں کچھ

زیادتی ہے یہ دونوں روایتیں مشکوٰۃ میں مذکور ہیں۔

بہ سلسلہ تعبیرات عجیب وغریب یہ روایت ہے کہ زرارہ بن عمرابن نخعی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نخع کے وفد میں آئے تو انہوں نے کہا یارسول اللہ آتے ہوئے راستے میں میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا کہ میری گدھی نے جسے میں قبیلہ میں چھوڑ کر آیا ہوں اس نے بکری کا بچہ دیا ہے جس کے دورنگ ہیں سیاہ وسفید، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تیری کوئی باندی ہے جسے گھر میں چھوڑ کر آیا ہے اور وہ حاملہ ہو چکی ہے۔ عرض کیا ہاں! گھر میں ایک باندی ہے جس پر میرا گمان ہے کہ وہ حاملہ ہو گئی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یقیناً وہ باندی اس بچے کو جنے گی جو تیرا لڑکا ہے زرارہ رضی اللہ عنہ نے کہا پھر سفید وسیاہ رنگ کے بچے کو جننے کا کیا مطلب ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے قریب ہو۔ میں آپ سے قریب ہو گیا۔ فرمایا کیا تیرے بدن پر برص کا داغ ہے۔ جسے تو لوگوں سے چھپاتا ہے۔ میں نے کہا ہاں! قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا۔ اس برص کے نشان کو میرے سوا کسی نے نہیں دیکھا ہے اور نہ کوئی اسے جانتا ہے۔ فرمایا اس بچہ کے بدن میں یہ سیاہی و سفیدی تیرے برص کے اثر سے ہے اور اس میں نمودار ہو گیا۔

اس کے بعد زرارہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے خواب میں نعمان بن المنذر کو دیکھا۔ یہ نعمان بن المنذر کسریٰ کے زمانے میں عرب کے بادشاہوں میں ایک بادشاہ تھا میں نے دیکھا کہ اس کے کانوں میں دو بالیاں ہیں اور دونوں بازوؤں پر بازو بند اور کنگن ہیں۔ حالانکہ یہ عورتوں کے زیوروں میں سے ہے فرمایا یہ ملک عرب ہے جو زیب وزینت اور پوشش و آرائش میں اپنی سابقہ حالت پر عود کرے گا۔ اس کے بعد زرارہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا میں نے ایک خواب اور دیکھا ہے وہ یہ کہ ایک بوڑھا ہے جس کے بال سفید و سیاہ ملے جلے ہیں۔ اور وہ زمین سے نکل رہا ہے۔ فرمایا یہ دنیا کی تشبیہہ ہے۔ اس کے بعد ایک اور خواب یہ پیش کیا کہ میں نے ایک آگ دیکھی جو زمین سے نکلی ہے اور وہ آگ میرے اور میرے لڑکے کے درمیان حائل ہو گئی اور اس کا نام عمرو ہے اور میں نے دیکھا کہ وہ آگ کہہ رہی ہے لظی، لظی، لظی، آگ کی لپٹ کو کہتے ہیں اور لظی دوزخ کا بھی نام ہے۔ وہ آگ کہتی ہے کہ میں بینا اور نابینا سب کو کھاتی ہوں۔ میں تم کو اور تمہارے متعلقین کو اور تمہارے مال کو کھاؤں گی۔ فرمایا وہ آگ ایک فتنہ ہے جو آخر زمانہ میں ہوگی۔ زرارہ رضی اللہ عنہ نے کہا وہ فتنہ کیا ہے اور وہ کون لوگ ہیں یارسول اللہ! فرمایا وہ اپنے امام کو اچانک ہلاک کر دیں گے۔ اس کے بعد شک وشبہہ اور اختلاف میں پڑ جائیں گے۔ اور وہ سر کی ہڈیوں کی مانند اشتباک کئے ہوئے نکلیں گے یہ ہرج ومرج سے کنایہ ہے کہ وہ باہم دست وگریبان ہو کر فساد کریں گے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دست ہائے مبارک کی انگلیوں کو باہم پیوست واشتباک کر کے دکھایا اور فرمایا اس وقت فتنہ پرداز یہ گمان کرے گا کہ وہ نیکی کا کام کر رہا ہے۔ مطلب یہ کہ بدیاں مشتبہ ہو جائیں گی۔ وہ انہیں نیکیاں گمان کریں گے اور اس وقت مسلمان کا خون، مسلمان کیلئے شیریں پانی سے زیادہ خوش ذائقہ ہو جائے گا۔ اس سے مراد قتل و غارت گری کی گرم بازاری ہے۔

صاحب مواہب فرماتے ہیں کہ زرارہ رضی اللہ عنہ کے خوابوں کی جو مشکوٰۃ نبوت سے تعبیرات دی گئیں ان پر غور کرنا چاہئے کہ یہ کس طرح حق کی شیرنی سے مملو اور صدق کی چادر سے لپٹی ہوئی اور انوار وحی سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔ اس عبارت سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ تعبیرات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم محض اخذِ مناسبت ومشابہت اور ظن وتخمین سے نہیں ہیں اگر اس روش سے بھی ہوں تب بھی تخلف اور خلاف واقع کا احتمال نہیں رکھتیں۔

کنگنوں کی تعبیر میں آپ نے فرمادیا کہ اس کی تعبیر یہ ہے کہ ملک عرب اپنی زینت و آرائش کی طرف لوٹے گا اور یہ پہلے گزر چکا ہے

کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنگنوں کو اپنے ہاتھ میں پہنے دیکھا تو آپ نے ناگواری اور کراہیت محسوس کی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نعمان بن المنذر کسریٰ کی جانب سے عرب کا بادشاہ تھا۔ اور شاہان کسریٰ والیان ملک کو کنگن پہناتے اور زیورات سے سجاتے تھے اور کنگن نعمان کا لباس تھا اس کیلئے وہ منکر و مکروہ نہ تھا اور نہ غیر محل میں عرفاً اسے مقام دیا گیا۔ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہر امتی کے لئے سونے کے لباس کو ممنوع قرار دیا ہے یہ تو ایسا مقام تھا جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غمگین بنا دیا۔ کیونکہ یہ آپ کے لباس میں سے نہ تھا۔ اسی بنا پر اس سے "کسی چیز کے غیر محل میں رکھنے" کی مانند استدلال فرمایا۔ لیکن بالآخر اس کے چلے جانے اور اڑ جانے کو پسند فرمایا۔

صحیحین میں حضرت قیس بن عباد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں مدینہ کی مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک حلقہ میں بیٹھا ہوا تھا جس میں سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم بھی تھے۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ گزرے ایک اور روایت میں یہ ہے کہ ایک شخص داخل ہوا جس کے چہرے پر خشوع کے آثار تھے تو وہ جماعت جو بیٹھی ہوئی تھی اس نے کہا کہ یہ شخص اہل جنت میں سے ہے پھر عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے دو رکعت نماز ادا کی اور جلدی سے باہر چلے گئے۔ میں نے ان کے پیچھے پیچھے جا کر ان سے کہا کہ جس وقت آپ مسجد میں داخل ہوئے تھے تو اس جماعت کے لوگوں نے یہ کہا کہ یہ شخص اہل جنت میں سے ہے تو انہوں نے فرمایا کہ کسی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ایسی بات کہے جس کا اسے علم نہیں اور ایک روایت میں ہے کہ فرمایا کسی کو نہیں چاہئے کہ وہ ایسی چیز کہے جس کا اس کے پاس علم نہیں ہے ان کی یہ بات ازراہ تواضع اور عجب و غرور کے خوف سے ہے اور اس ڈر سے کہ انگلیوں سے کوئی ان کی طرف اشارہ نہ کرنے لگے مطلب یہ کہ میں نہیں جانتا کہ ان کو اس بات کا کہاں سے علم ہو گیا جو اس مفہوم و منطلب کی ایک چیز ہے وہ یہ کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک خواب دیکھا تھا کہ ایک سبز مرغزار ہے جو کشادہ اور فراخ ہے اس میں ایک آہنی ستون ہے جس کا نچلا حصہ زمین میں ہے اور بالائی حصہ آسمان میں اس کے اوپر ایک "عروہ" ہے۔ عروہ اس مضبوط رسی کو کہتے ہی جس کے ذریعہ بڑے ڈول سے پانی کھینچا جاتا ہے اور یہ کسی چیز کے مضبوط پکڑے رہنے سے استعارہ ہے پھر مجھ سے کہا گیا کہ اوپر چڑھ آؤ۔ میں نے عرض کیا مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ چڑھ سکوں پھر میرے لئے ایک خدمتگار ظاہر ہوا اس نے پیچھے سے میرے کپڑوں کو پکڑا اور میں ستون کے بالائی حصہ پر پہنچ گیا اور عروہ کو پکڑ لیا اور مجھ سے کہا گیا کہ عروہ کو مضبوط پکڑے رہنا پھر میں بیدار ہو گیا حالانکہ عروہ میرے ہاتھ میں تھا۔ اس کے بعد میں نے اپنے خواب کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پیش کیا۔ آپ نے فرمایا وہ مرغزار اسلام ہے اور وہ ستون اسلام کے ارکان ہیں اور وہ عروہ، عروۂ وثقیٰ ہے اور تم اس حال میں رحلت کرو گے کہ تم عروۂ وثقیٰ کو مضبوط تھامے ہو گے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اللہ تعالیٰ کے اس قول سے تلمیح ہے فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى تو جو کوئی شیطان کا انکار کرے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے تو اسی نے عروۂ وثقیٰ کو مضبوط تھاما۔"

دوسری روایت میں مذکور ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص میرے پاس آیا اس نے کہا اٹھ اور میرا ہاتھ پکڑ لے۔ پھر میں اس کے ساتھ چل دیا ایک راستہ جانب شمال سامنے آیا میں نے چاہا کہ اس راہ پر ہو لوں تو اس نے مجھ سے کہا مت چل۔ یہ راہ اصحاب شمال کی ہے اور تو ان میں سے نہیں ہے۔ آگے پھر ایک راہ داہنی جانب آئی اس وقت اس نے کہا اس راہ کو پکڑ لو پھر مجھ سے ایک پہاڑ ملا اس نے کہا اس پر چڑھ جا۔ میں نے اس پر چڑھنا چاہا لیکن جب بھی ارادہ کرتا نیچے گر جاتا۔ میں چڑھ نہ سکا۔ جب میں نے اپنا خواب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تو فرمایا یہ عرصات محشر ہے اور وہ پہاڑ شہادت کی منزل ہے۔ تم منزل شہادت

نہ پاسکو گے۔

علماء کہتے ہیں یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی نشانیوں اور غیبی خبروں میں سے ہے اس لئے کہ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے شہید ہو کر انتقال نہیں فرمایا اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی امارت کے ابتدائی عہد میں اپنے بستر پر مدینہ طیبہ میں انتقال فرمایا۔

صاحب مواہب لدنیہ فرماتے ہیں کہ تعبیرات نبوی ﷺ میں سے یہ ایک حصہ بطور نمونہ ہے ورنہ جو لطیف تعبیریں اور عجیب و غریب تاویلیں منقول ہیں وہ تو کئی جلدوں میں بھی سما نہیں سکتیں۔ اور جب تم غور و فکر کرو گے تو جان لوگے کہ ہر وہ کرامت جو آپ کی امت کے کسی فرد کو عطا کی گئی خواہ وہ علمی ہو یا عملی وہ سب نبی کریم ﷺ کے ہی معجزات کے اثرات اور تصدیق کی برکات میں سے ہے اور آپ کے طریقہ ہدایت سے ہدایت یافتہ ہونے کے ثمرات میں سے ہے اور از روئے صدق و صواب و عجب عجائب و بحر حباب! ایسی کرامتوں سے زمین بھری ہوئی ہے۔ اگر تم صرف امام محمد بن سیرین کے واقعات ہی کو جمع کرلو کہ جو کچھ انہیں عطا فرمایا گیا ہے اور انہوں نے جو لطیف تعبیرات دی ہیں اور وہ مشہور و معروف ہیں اور ان سے لوگوں کے کان بھرے ہوئے ہیں انہیں اپنے سامنے رکھو تو جو کچھ حضور ﷺ کو علوم و معارف دیئے گئے ہیں جن کو نہ تو عبارتوں سے احاطہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ان اشارات کی کنہ و حقیقت کو پہنچا جاسکتا ہے۔ حالانکہ ابن سیرین ایک امتی ہیں۔ اور فن تعبیر میں جو کچھ ان سے منقول ہے وہ خود حد و شمار سے باہر ہے تو حضور اکرم ﷺ کا کتنا بلند مقام ہوگا کوئی کیا اندازہ لگا سکتا ہے۔ "زاده الله فضلا وشرفا ومداد او افاض علينا سحايب علومه ومعارفه و تعطف علينا بعواطفه

استفسارِ رؤیا کو ترک فرمانے کا سبب

وصل: بخاری و ترمذی نے حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابۂ کرام سے بکثرت دریافت فرمایا کرتے تھے کیا تم میں سے کسی نے خواب دیکھا ہے تو ان میں سے جس نے خواب دیکھا ہوتا عرض کرتا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تعبیر دیدیا کرتے تھے۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے استفسار فرمانا ترک کر دیا اگر کوئی خود خواب بیان کرتا تو تعبیر دے دیتے۔ استفسار فرمانے کی حکمت تو پہلے بتائی جاچکی ہے لیکن اہلِ نقل ترکِ استفسار کے سبب میں اختلاف رکھتے ہیں۔ بعض کے نزدیک حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے جو ترمذی و ابو داؤد نے روایت کی ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استفسار فرمایا کہ تم میں سے کسی نے خواب دیکھا ہے؟ تو ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے دیکھا کہ آسمان سے ایک ترازو اتری ہے پھر آپ کو اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو وزن کیا گیا تو آپ راجح رہے۔ پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کا وزن کیا گیا تو ابو بکر رضی اللہ عنہ راجح رہے۔ پھر عمر رضی اللہ عنہ و عثمان رضی اللہ عنہ کا وزن کیا گیا تو عمر رضی اللہ عنہ راجح رہے اس کے بعد ترازو اٹھالی گئی۔ خواب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اندوہگیں ہوگئے۔ ہم نے آپ کے چہرۂ انور میں ناگواری کے آثار دیکھے (انتہی)۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے خواب کے بارے میں استفسار نہ فرمایا۔

اہلِ علم اس خواب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ناگواری کے بارے میں کہتے ہیں کہ ستر عواقب اور اخفاء مراتب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ایثار و اختیار ہے چونکہ یہ خواب بعض کی بعض پر فضیلت کو ظاہر کرنے والا منازل و مراتب کو کھولنے والا تھا تو آپ نے خوف فرمایا کہ کہیں وہ چیز پے در پے اور مسلسل رونما نہ ہونے لگے جن کا انکشاف ممنوع ہے۔ اور خلق کے احوال چھپانے میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے حکمتِ بالغہ اور مشیت نافذ ہے۔ (کذا فی المواہب)۔ مطلب یہ کہ تم نے تفاوت مراتب کے سلسلے میں جو کچھ دیکھا

اگرچہ حق ہے۔ لیکن اس کا انکشاف کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ کیونکہ کشف و اظہار سے اشاعت ہو جاتی ہے۔ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بعض صحابہ کو بعض پر خصوصاً ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو فضیلت و ترجیح دیا کرتے لیکن اس خواب کا ظاہری مقصد ان کی خلافت میں دخل دینا اور ان کی ترجیح و تنقیص تھی۔ اس لئے مشکوۃ میں آخر حدیث میں لایا گیا کہ فرمایا۔ " خِلَافَۃُ نُبُوَّۃٍ ثُمَّ یُؤْتِیْ اَحَدًا الْمُلْکَ مَنْ یَّشَاءُ " یہ نبوت کی خلافت و قائم مقامی ہے۔ اس کے بعد کوئی بادشاہ آئے گا جسے خدا چاہے۔ شرح السنہ میں لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میزان اٹھ جانے سے یہ سمجھا کہ خلافت اس طرف چلی گئی جہاں طلب ملک مثاب نہیں ہے۔ اور خلاف و نزاع جس کی حد ہے۔ اور خلافت حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر منتہی و منقضی ہو جاتی ہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا غایت مرجوں ہونا دلالت کرتا ہے کہ ان کی خلافت میں منازعت برپا ہوگی۔ اور یہ انتشار حضرت علی مرتضٰی کے زمانہ میں داخل ہو جاتا ہے اس کے باوجود یہ خلافت ان کے زمانے تک ہے لیکن حضرت عثمان و علی رضی اللہ عنہما کے بعد "ملک عضوض" ہے۔ ان کے بعد خلافت نہ رہی۔ **کذا قال فی مجمع البحار واللہ اعلم۔**

بعض کہتے ہیں کہ اس خواب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ناگواری اور کراہت کی وجہ یہ تھی (واللہ اعلم) کہ میزان کا اٹھ جانا آئندہ زمانہ میں بعد از عمر رضی اللہ عنہ امر دین کے رتبہ کی کمی ہو جانے پر دلالت رکھتی ہے اس لئے کہ وزن تول کی رعایت اشیائے متقاربہ میں ہوتی ہے۔ اور جب متباعد ہو جائیں تو موازنت نہیں ہوتی۔ ایسا ہی حدیث کی شرح میں کہا گیا ہے۔ (واللہ اعلم)

ابن قتیبہ نقل کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا استفسار رؤیا کو ترک فرما دینے کی وجہ ابن رمل کی حدیث ہے۔ ابن رمل بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کریمہ تھی کہ بعد نماز فجر دو زانو کی حالت میں ہی رہتے ہوئے "سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ تَوَّابًا" ستر مرتبہ پڑھتے اور فرماتے یہ ستر مرتبہ پڑھنا برابر ہے اس بشارت کے جس میں سات سو مرتبہ پڑھنے کی خبر دی گئی ہے۔ کسی کو بھی معلوم نہیں کہ ایک دن میں سات سو سے زیادہ گناہ بندے سے سرزد ہوتے ہیں۔ اس کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اپنا رخ مبارک لوگوں کی جانب پھیر کر فرماتے تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ ابن رمل بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ایک دن میں نے خواب دیکھا تھا فرمایا۔ " خَیْرٌ تَلَقَّاہُ وَشَرٌّ تَوَقَّاہُ وَخَیْرٌ لَّنَا وَشَرٌّ لِّاَعْدَائِنَا وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ " اب تم اپنا خواب بیان کرو۔ میں نے بیان کیا کہ تمام لوگ نرم فراخ شاہراہ پر چل رہے ہیں اور چلتے چلتے ایک عظیم چراگاہ پر پہنچے وہ ایسی چراگاہ ہے کہ اس جیسی کسی آنکھ نے نہ دیکھی ہوگی وہ چراگاہ ایسی درخشاں ہے گویا کہ اس سے تروتازگی ٹپکی پڑتی ہے جیسے پانی ٹپکتا ہے اسی چراگاہ میں قسم قسم کے پھول بوٹے ہیں میں انہیں دیکھ کر خوش ہو رہا ہوں اور وہ لوگ بھی خوش ہو رہے ہیں۔ جو یہاں مجھ سے پہلے آئے تھے۔ اور اس خوشی و انبساط میں سب اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے اور اس کے حسن و خوبی پر حیرت و تعجب کرنے لگے۔ اس کے بعد ان لوگوں نے جو پہلے آئے ہوئے تھے راہ منزل اختیار کی۔ اور داہنے بائیں راستوں میں گم نہ ہوئے، سیدھی شاہراہ پر چل دیئے، اس کے بعد دوسرا قافلہ آیا۔ یہ تعداد میں پہلے سے زیادہ تھا۔ چراگاہ کی حسن و خوبی پر اس نے بھی حیرت و تعجب کیا اور تکبیر بلند کی اس کے بعد یہ بھی اپنی منزل کی طرف چل دیئے لیکن ان میں کے کچھ لوگوں نے اپنے گھوڑوں کو چرایا اور چلتے وقت چارے کے گٹھر باندھ کر لے چلے اور اسے خراب و خستہ کر کے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد اس سے بھی بڑا قافلہ آیا ان میں لوگ اس سے بھی زیادہ تھے جب اس کی حسن و خوبی کو دیکھا تو تعجب کرنے اور تکبیر بلند کرنے لگے اور کہنے لگے یہ بہترین منزل ہے۔ مطلب یہ کہ اس جگہ قیام پذیر ہونا اور اسے اپنی منزل بنا لینا اچھا ہے تو وہ مائل ہو گئے۔ اور چراگاہ کے ہر طرف پھرنے لگے پھر جب میں نے یہ دیکھا تو میں نے اپنی راہ لی اور وہاں نہ ٹھہرا یہاں تک کہ میں چراگاہ کے آخر تک آگیا اس وقت اچانک آپ پر یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)

نظر پڑی دیکھا کہ ایک منبر ہے۔ جس کی سات سیڑھیاں ہیں۔ اور آپ سب سے اونچی سیڑھی پر تشریف فرما ہیں۔ اور آپ کی داہنی جانب گندم گوں اونچی ناک والا شخص ہے جب بات کرتا ہے تو بلند ہو جاتا ہے قریب ہے کہ درازی میں لوگوں سے اونچا ہو جائے۔ اور آپ کے بائیں جانب میانہ قد فربہ جسم اور اس کے چہرے پر سرخ خال ہیں ایک شخص ہے جب وہ بات کرتا ہے تو آپ عزت واحترام کے ساتھ غور سے اس کی بات سماعت فرماتے ہیں اور اس کی تعظیم بجالاتے ہیں۔ اور آپ کے منبر کے آگے ایک بوڑھا بزرگ ہے گویا آپ اس کی اقتداء اور اس کی پیروی فرما رہے ہیں۔ اور اس کے آگے ایک اونٹنی ہے جو لاغر اور بڑی عمر کی ہے گویا اسے یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ہانک رہے ہیں اور چلا رہے ہیں۔ اس خواب کو بیان کرنے والے ابن رمل ہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سنا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رخ انور کا رنگ تھوڑی دیر متغیر رہا اس کے بعد آپ اس حالت سے باہر آگئے گویا اس وقت آپ پر وحی ہوئی جس سے آپ کا حال متغیر ہو گیا تھا۔ پھر جب کشادہ رو ہوئے تو اس خواب کی تعبیر شروع فرمائی اور فرمایا وہ جو تم نے راہ نرم و فراخ اور شاہراہ دیکھی ہے وہ صراط مستقیم یعنی راہ راست ہے جس پر تم چل رہے ہو اور وہ چراگاہ جو تم نے دیکھی ہے وہ دنیا ہے وہ صراط اور اس کا حسن و تروتازگی اس کی عیش عشرت ہے جسے اس کے ساتھ ہمیں بخشا گیا ہے اور نہ ہم اسے چاہتے ہیں اور نہ وہ ہمیں چاہتی ہے۔ لیکن وہ دوسرا اور تیسرا قافلہ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا "فَاِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔" یہ ایک کلمہ ہے جسے مصیبت کے وقت پڑھتے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ وہ قافلے دنیا کی شہوات میں پڑ گئے اور دنیاوی زندگی کے ساز و سامان سے انتفاع و لذت میں آلودہ ہو کر افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئے۔ جس طرح کہ بادشاہ و امراء کا حال ہے۔ لیکن تم اے ابن رمل رضی اللہ عنہ! راہِ راست اور خیر و فلاح پر ہو۔ اور ہمیشہ رہو گے یہاں تک کہ تم مجھ سے ملو جیسا کہ بیان کیا کہ میں یارسول اللہ آپ کے ساتھ ہوں۔ اب رہا سات سیڑھیوں والا منبر جسے تم نے دیکھا ہے وہ دنیا ہے کیونکہ دنیا کی عمر سات ہزار سال ہے اور میں آخری ہزار سال میں ہوں جس کی سیڑھی سب سے اونچی ہے۔ اور وہ مرد دراز گندم گوں جسے تم نے دیکھا ہے وہ موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ میں ان کی اس بنا پر عزت کرتا ہوں کہ انہیں حق تعالیٰ سے بے لاگ کلام کرنے کی فضیلت حاصل ہے اور وہ مرد میانہ قد فربہ جسم سرخ خال والے عیسیٰ علیہ السلام ہیں ان کی اس بنا پر عزت کرتا ہوں کہ خدا کے نزدیک ان کا مرتبہ زیادہ ہے۔ اور وہ ضعیف العمر شخص جس کو تم نے دیکھا کہ ہم ان کی اقتداء و اتباع کر رہے ہیں وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں اور وہ اونٹنی لاغر و کہنہ سال جسے تم نے دیکھا کہ میں ہانک رہا ہوں وہ قیامت ہے اور مجھ پر اور میری امت پر قائم ہوگی۔ اور میرے بعد نہ کوئی امت ہے اور نہ کوئی نبی۔ ابن رمل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس خواب کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے خواب کے بارے میں استفسار نہ فرمایا۔ بجز اس شخص کے جو خود ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے خواب بیان کر دے اس کی آپ تعبیر دے دیا کرتے تھے۔ اسے ابن قتیبہ طبرانی اور بیہقی نے "الدلائل" میں روایت کیا ہے۔ اور اس کی سند ضعیف ہے (واللہ اعلم)

باب ہفتم

در اسماء نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

اعظم کرامات اور جامع ترین فضائل و کمالات میں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ کے اسماء گرامی ہیں جو محامدِ اخلاق، محاسنِ افعال اور جامع جمال و جلال پر مبنی ہیں واضح رہنا چاہئے کہ حق تعالیٰ عزاسمہ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء گرامی قرآن کریم اور دیگر آسمانی کتابوں میں اور انبیاء ورسل علیہم السلام کی زبانوں پر بکثرت بیان فرمائے ہیں۔ اسماء کی کثرت مسمّیٰ کی عظمت و بزرگی پر دلالت کرتی ہے اس لئے کہ اسماء صفات وانفعال سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ اور ہر اسم کسی صفت و فعل سے ہی بنا ہے۔

سب سے زیادہ مشہور واعظم اسماء میں اسم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے جس طرح کہ اسم "اللہ" کہ وہ اسم ذات باری تعالیٰ ہے باقی اسماء صفات ہیں اور انہیں پر محمول ہیں اور حق سبحانہ وتعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک آپ کے دادا حضرت عبدالمطلب جن کو "شیبۃ الحمد" کہتے ہیں کی زبان مبارک پر رکھا۔ لوگوں نے عبدالمطلب سے دریافت کیا کہ کیوں آپ نے اپنے فرزند کا نام محمد رکھا؟ حالانکہ یہ نام آپ کے اجداد اور آپ کے خاندان میں کسی کا نہ تھا۔ جواب میں فرمایا کہ اس بنا پر کہ میں امید رکھتا ہوں کہ سارا جہان اس کی تعریف و ستائش کرے۔

اور منقول ہے کہ حضرت عبدالمطلب نے خواب میں دیکھا تھا کہ گویا ان کی پشت سے چاندی کی ایک زنجیر نکلی ہے جس کا ایک سرا آسمان میں ہے اور دوسرا مشرق و مغرب میں اس کے بعد دیکھا کہ وہ زنجیر ایک درخت بن گیا ہے جس کے ہر پتے پر نور ہے اور مشرق و مغرب کے لوگ اس سے معلق ہیں۔ اس زمانے کے تعبیر گویوں نے تعبیر دی کہ ان کے صلب سے ایک بچہ پیدا ہوگا جس کی مشرق و مغرب والے پیروی کریں گے۔ اور آسمان و زمین کے لوگ اس کی حمد و ستائش کریں گے۔ اس بنا پر "محمد صلی اللہ علیہ وسلم" نام رکھا یا وہ گفتگو ہے جو حضرت عبدالمطلب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ سیدہ آمنہ رضی اللہ عنہا سے فرمائی۔ آپ نے فرمایا مجھے خواب میں بتایا گیا ہے کہ اے آمنہ! تم اس مولود کی حاملہ ہوئی ہو جو اس امت کا سردار ہے جب تم سے وہ تولد ہو تو اس کا نام محمد رکھنا (صلی اللہ علیہ وسلم)

اہلِ علم بیان کرتے ہیں کہ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی نشانیوں میں سے ہے کہ آپ سے پہلے کسی کا نام محمد نہ رکھا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حق تبارک وتعالیٰ نے اس نام معظم کی حفاظت و صیانت اپنے ذمہ لے لی تھی تاکہ اس نام مبارک میں کسی کے ساتھ اشتراک واشتباہ نہ رہے۔ لیکن جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور عالم تاب کا زمانہ قریب آیا تو آپ کے قریبی زمانہ کے اہل کتاب کو بشارتیں دیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم شریف انہیں بتایا۔ بعض قبیلہ کے لوگوں نے اپنے بچوں کا یہ نام اس امید پر رکھا کہ شاید یہی وہ ہو جائے۔ (وَاللّٰهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ)

شیخین کی حدیث میں حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اِنَّ لِیْ خَمْسَةَ اَسْمَاءٍ اَنَا مُحَمَّدٌ وَّاَنَا اَحْمَدُ وَاَنَا الْمَاحِیُ الَّذِیْ يَمْحُو اللّٰهُ بِیَ الْكُفْرَ وَاَنَا الْحَاشِرُ الَّذِیْ يُحْشَرُ النَّاسُ عَلٰى قَدَمِیْ وَاَنَا الْعَاقِبُ۔

بلاشبہ میرے پانچ نام ہیں۔ میں محمد ہوں، اور میں احمد ہوں اور میں ماحی ہوں کہ محو کرے گا اللہ تعالیٰ میرے ذریعہ کفر کو۔ مطلب یہ کہ مکہ مکرمہ اور بلاد عرب سے جو روئے زمین کا مرکزی نقطہ ہے وہاں کفر مٹائے گا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ فرمایا گیا کہ

انہیں آپ کی امت کے ملک واختیار میں دیا جائے گا۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ محو ظہور وغلبہ کے معنی میں عام ہے۔ جیسا کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: "لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ" تا کہ آپ کو تمام دینوں پر غالب کرے اور حقیقت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی ایک نبی سے ایسا کفر نہ مٹا جتنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ کفر کا محو واستیصال ہوا۔ حالانکہ آپ کی بعثت ایسی حالت میں ہوئی کہ تمام اہل زمین کافر تھے۔ کوئی بت پرستی میں، کوئی ستارہ پرستی اور آگ پرستی میں۔ کوئی یہودی و نصرانی تھا اور کوئی ایسا دہریہ تھا کہ حق تبارک وتعالیٰ کو جانتا تک نہ تھا۔ اور مبدء ومعاد کے قائل ہی نہ تھے اور فلاسفہ (عقل پرست) جو انبیاء کو جانتے ہی نہ تھے۔ وہ ان باتوں کے نہ تو قائل تھے اور نہ ان باتوں کے مقرو معتقد تھے لہٰذا حق تبارک وتعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ان سب کو مٹایا۔ یہاں تک کہ آپ کے دین حق کو تمام ادیان باطلہ پر ظاہر وغالب فرمایا۔ اور اسے جہان کی اس جگہ تک پہنچایا جس جگہ سورج طلوع وغروب ہوتا ہے۔ اور جہان میں دن ورات کی گردش ہے حتیٰ کہ برصغیر ہندو پاکستان اور ترکستان میں جہاں کبھی دین اسلام نہ پہنچا تھا اگرچہ مدت حیات میں باوجود عرب میں گنجائش اوقات کے جو کہ حضور سید الابرار صلی اللہ علیہ وسلم کے جائے ولادت اور مقام بعثت کے قریب ترین شہر تھے ان میں اظہار نہ ہوا اور دین کے اتمام واکمال کے قواعد وقوانین اور شرع متین کے احکام واوامر کی خود تمہید وتاسیس نہ ہوئی لیکن آپ کے بعد آپ کے اصحاب واتباع نے دین کو آفاق و اکناف عالم میں پہنچادیا۔ اور یہ روز بروز ترقی وتزاید میں ہے اور اگر مسلمانوں کے سینوں اور جو آپ کے گرویدہ ہوئے ان کے دلوں سے کفر فنا ہو کر انقیاد واطاعت کی ایک رمق پیدا ہو جائے تب بھی مراد حاصل ہے اور اس اسم کا اطلاق کافی ہے۔ اس کے معنی کے مطابق تقریر ہے جو قاضی عیاض رحمہ اللہ اس حدیث کی تفسیر میں نقل کرتے ہیں کہ ماحی وہ ہے جن کے ذریعہ برائیاں مٹیں اور اس کا اتباع کیا جائے۔ غایت یہ کہ اس اسم کا اطلاق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص نہ ہو گا مگر باعتبار آپ کے غلبہ اور آپ کے تمام وکمال کے۔ (واللہ اعلم)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ "وَأَنَا الْحَاشِرُ الَّذِي يُحْشَرُ النَّاسُ عَلَى قَدَمِي" اور میرا نام حاشر ہے کیونکہ میرے قدم پر لوگ اٹھائے جائیں گے اور گھیر کر لائے جائیں گے۔ اس عبارت کا ظاہر مفہوم یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے مبعوث ومحشور ہوں گے اور تمام لوگ آپ کے قدم پر یعنی آپ کے بعد آپ کی نظر میں اور آپ کے سامنے اٹھائے جائیں گے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ "ھو اول من تنشق الارض" آپ پہلے ہیں جن کیلئے زمین پھٹے گی۔ گویا آپ کے نقش قدم پر لوگوں کو اٹھایا جائے گا۔ اور عرصات محشر میں وہ آپ کی جانب پناہ لیں گے۔ اور اہل علم یہ بھی کہتے ہیں کہ معنی یہ ہیں کہ لوگ میری زبان، میرے عہد اور میری رسالت پر اٹھائے جائیں گے مطلب یہ کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے یہاں تک کہ آپ ہی کے عہد وزمانہ میں لوگ محشور ہوں گے تو یہ مضمون خاتم النبیین یعنی آخری نبی ہونے پر مشتمل ہے۔ "کذا قال القاضی" اور مواہب لدنیہ میں کہا گیا ہے کہ لوگوں پر آپ کی بعثت مقدم ہے۔ پھر لوگ آپ کے سامنے اور آپ کے گرد قیامت میں جمع ہوں گے۔ یہ مفہوم اس معنی پر مبنی ہے کہ حشر بعثت کے مغایر ہے۔ بعثت قبر سے اٹھایا جانا ہے اور حشر، عرصات محشر میں پراگندگی کے بعد آپ کے گرد جمع ہونا ہے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد "وَأَنَا الْعَاقِبُ" اور میرا نام عاقب ہے۔ عاقب بعد میں آنے والے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ آپ خاتم النبیین یعنی آخری نبی ہیں۔ اگرچہ بعض حضرات نے بعض وجوہ سے حاشر کے معنی خاتم الانبیاء لئے ہیں لیکن لفظ عاقب اسی معنی کیلئے ہے اور خاتم اسی معنی کو مستلزم ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "لِي خَمْسَةُ أَسْمَاءٍ" میرے پانچ نام ہیں۔ ان کے معنی یہ ہیں کہ گزشتہ کتابوں میں اور پچھلی امتوں کے علماء میں یہ موجود ومذکور ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ لفظ خمسہ راوی حدیث

کے الفاظ ہیں اور یہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لفظ نہیں ہیں مگر درست یہی ہے کہ یہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لفظ ہیں اور ممکن ہے کہ اسماء سے باخبر کرنا اور اس بارے میں وحی کا آنا بتدریج ہوا ہے اور بعض حدیثوں میں چھ نام آئے ہیں پانچ تو یہی اور چھٹا اسم خاتم۔ نقاش روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قرآن کریم میں میرے نام سات ہیں۔ محمد، احمد، یٰسٓ، طٰہٰ، المدثر اور المزمل (صاحب مدارج رحمہ اللہ نے ساتواں نام نہیں لکھا) طٰہٰ کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یا طاہر اور یا ہادی ہے اور یٰسٓ کی تفسیر میں یا سید نقل کرتے ہیں اور اسے اسلمی، واسطی اور جعفر بن محمد سے روایت کرتے ہیں۔ اور بعض حدیثوں میں دس نام آئے ہیں پانچ تو پہلی حدیث کے اور بقیہ میں فرمایا۔ "اَنَا رَسُوْلُ الرَّحْمَةِ وَرَسُوْلُ الرَّاحَةِ وَرَسُوْلُ الْمَلَاحِمِ" ملاحم، ملحمہ کی جمع ہے۔ جس کے معنی حرب یا شدت حرب اور اس جہاد کے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے راہِ خدا میں کیا اور کسی اور نے ایسا جہاد نہ کیا تھا اور فرمایا "وَاَنَا الْمُقَفِّیْ" بکسر فا وفتح فا جو قفا سے ماخوذ ہے جس کے معنی عاقب یعنی آخری کے ہیں۔ اور بعض فتح فا کے ساتھ قفاوت سے لیتے ہیں جس کے معنی کرم ولطف کے ہیں اور قفی، کریم لطیف کو کہتے ہیں۔ مقتفی، بزیادتی تا بعد از قاف بھی آیا ہے اور فرمایا "وَاَنَا الْقَیِّمُ" اور میں جامع وکامل ہوں۔ صاحب شفا فرماتے ہیں کہ گمان یہ ہے کہ یہ نام "قثم" بضم قاف اور فتح ثاء ہے۔ کیونکہ حربی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فرشتے نے آکر عرض کیا "اَنْتَ قُثَمٌ" آپ قثم یعنی جمع فرمانے والے ہیں اور کہا کہ "اَلْقُثُوْمُ الرَّجُلُ الْجَامِعُ لِلْخَیْرِ۔" "قثوم" اس شخص پر بولا جاتا ہے جو جزو کا جامع ہو۔ اور یہ وہ نام ہے جسے اہلِ بیت نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانتے ہیں۔ لیکن قیم بھی اسی معنی کے قریب ہے اور انبیاء علیہم السلام کی کتابوں میں آیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا "خداوندا ہم پر اسے مبعوث فرما جو محمدؐ مقیم سنت ہے لہٰذا قیم بمعنی قائم کرنے والے کے ہو سکتا ہے۔

اور "نبی الملحمہ ونبی الرحمۃ والراحتہ والرحمۃ۔" بھی نام آئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ" (نہیں بھیجا ہم نے آپکو مگر رحمت سارے جہانوں کیلئے) اور حق تعالیٰ نے فرمایا "بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ" (آپ مسلمانوں کے ساتھ مہربان ورحیم ہیں) یہ آپ کی امت مرحومہ کی صفت میں واقع ہوا ہے۔ اور حق تعالیٰ نے ان کی شان میں فرمایا "وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ اَیْ یَرْحَمُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا۔" آپ کی امت صبر کی وصیت کرتی ہے اور ایک دوسرے پر مہربانی کرتی ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی صفت میں فرمایا "اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ مِنْ عِبَادِهِ الرُّحَمَاءَ" اور بیشک اللہ اپنے بندوں میں سے رحم وشفقت کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔ اور فرمایا "اَلرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ وَارْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ" رحم کرنے والے وہ ہیں جن پر رحمٰن رحم فرماتا ہے تو تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا۔ لہٰذا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کے ساتھ رحمت کی صفت خاص ہے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام "نبی التوبہ" بھی آیا ہے کیونکہ آپ کے دستِ مبارک پر خلقتِ کثیرہ نے توبہ کی اور حق تعالیٰ نے آپ کی برکت سے امت پر اور حضرت آدم صفی اللہ علیہ صلوات اللہ وسلامہ کی توبہ قبول فرمائی۔ اہلِ علم فرماتے ہیں کہ ان کلمات سے مراد جو حق تعالیٰ نے خود آدم علیہ السلام کو تلقین فرمائے اور ان کی توبہ کا سبب بنایا یہ ہے کہ "الٰہی بحرمت محمد وآلہ"

بلاشبہ قرآن کریم میں آپ کے اسماء والقاب میں نور، سراج منیر (روشن آفتاب) منذر، نذیر، مبشر، بشیر، شاہد، شہید، الحق، المبین، خاتم النبیین والامیین، العزیز، الحریص، الرؤف، الرحیم، قدم صدق، خدا کے اس ارشاد میں کہ۔

وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ اور رَحْمَةٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ اَلْعُرْوَةُ الْوُثْقٰی۔ اَلصِّرَاطُ الْمُسْتَقِیْمُ ۝ طٰهٰ یٰسٓ اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ اَلْکَرِیْمُ، اَلنَّبِیُّ الْاُمِّیُّ اَلْحَقُّ اور اَلْبُرْهَانُ۔

آیا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف کثیرہ اور خصائص جلیلہ کتب سابقہ اور احادیث مبارکہ میں مذکور ہیں چنانچہ مصطفیٰ، مجتبیٰ، ابو القاسم، شفیع، متقی، مصلح، طاہر، مہیمن ، صادق، مصدوق، ہادی، سید ولد آدم، سید المرسلین، امام المتقین، رسول رب العالمین، قائد الغرا لمحجلین ، حبیب اللہ، خلیل الرحمٰن، صاحب الحوض المورود، صاحب الشفاعۃ، صاحب المقام المحمود، صاحب الوسیلۃ والفضیلہ ،والدرجۃ الرفیعۃ، صاحب التاج والمعراج، صاحب اللواء، صاحب القضیب ، الراکب، البراق، الناقہ، النجیب، صاحب الحجۃ، السلطان، الخاتم، العلامہ، صاحب الہراوۃ اور صاحب النعلین وغیرہ اسماء وصفات احادیث کریمہ میں مذکور ہیں۔ اور کتب سابقہ میں المتوکل، المختار، مقیم السنۃ، القدس اور روح القدس ہے اور اسی معنی میں "فارقلیط" انجیل میں آیا ہے اور کہتے ہیں کہ فارقلیط وہ ہے جو حق وباطل کے مابین فرق کرے اور کتب سابقہ میں آپ کے اسماء میں "ماذماذ" اس کے معنی طیب ہیں اور حمطایا بمعنی حامی الحرم اور آپ کا اسم شریف بزبان سریانی مشفح اور المحنا ہے اور توریت میں آپ کا اسم شریف احید ہے اس کے معنی صاحب القضیب اور صاحب السیف ہے اور انجیل کی تفسیر میں یا "چوبی" آیا ہے۔ چونکہ آپ کے دست مبارک میں تلوار یا عصا رہتا تھا اور اسے خلفائے عباسیہ اپنے ہاتھوں میں رکھتے رہے۔ اور "ہراوت" بمعنی عصا آیا ہے۔ صاحب شفا کہتے ہیں کہ میرا گمان ہے خدا بہتر جانتا ہے کہ اس سے وہ عصا مراد ہے جو حدیث حوض میں آیا ہے کہ فرمایا یمن والوں کیلئے اپنے عصا سے لوگوں کو روکوں گا تاکہ وہ آگے نہ بڑھیں۔ اور تاج سے مراد عمامہ ہے جو آپ سے پہلے اہل عرب کے سوا نہ تھا اور حدیث میں آیا ہے کہ "اَلْعَمَائِمُ تِیجَانُ الْعَرَبِ" عمامے عرب کے تاج ہیں یہ وہ اسماء ہیں جو الشفا میں مذکور ہیں قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ آپ کے القاب وخصائص کتب سابقہ میں تو بہت ہیں لیکن جتنا نفع کیلئے مفید تھا اتنا ہم نے انہیں بیان کر دیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت ابو القاسم مشہور ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب فرزند رسول، حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے تو جبریل علیہ السلام نے حاضر ہو کر عرض کیا السلام علیک یا ابا ابراہیم انتہیٰ بعض "ابو الارامل اور "ابو المومنین" بھی بتاتے ہیں نیز اگر "ابو الیتامیٰ" بھی کہا جائے تو اس کی گنجائش ہے جیسا کہ حضرت ابو طالب کے شعر میں آیا ہے۔ مصرعہ "ثِمَالُ الْیَتَامٰی عِصْمَۃٌ لِلْاَرَامِلِ" صاحب مواہب لدنیہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء وصفات قرآن کریم میں بہت آئے ہیں۔ جن کو بعض نے شمار بھی کیا ہے۔ اور بعض عدد مخصوص تک پہنچاتے ہیں چنانچہ وہ ننانوے تک موافق اسماء و صفات الٰہی پہنچاتے ہیں۔ یہ تصریح کتاب "مستوفی" میں مذکور ہے کہ اگر کتب سابقہ اور قرآن وحدیث میں جستجو اور تلاش کیا جائے تو تین سو تک نام پہنچتے ہیں۔ میں نے قاضی ابو بکر بن العربی کی کتاب "احکام القرآن" میں دیکھا ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ بعض صوفیاء کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہزار نام ہیں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی ہزار نام ہیں اور آپ کے اوصاف جدا جدا ہیں اور ہر وصف سے ایک نام بنتا ہے۔ بعض صفات آپ کے ساتھ مختص اور آپ پر غالب ہیں اور بعض مشترک اور جب آپ کی صفات کے ہر وصف کو ایک نام دیں تو آپ کے اوصاف اس عدد تک پہنچ جائیں گے بلکہ اس سے بھی بڑھ جائیں گے۔

عظیم تر اور مشہور تر اسم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم : وصل ۔ صاحب مواہب لدنیہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء شریفہ چار سو سے زیادہ شمار کرائے ہیں۔ اور ان کا ذکر حروف تہجی پر کیا ہے جیسا کہ آئے گا۔ اور سب سے زیادہ مشہور واعظم، اسم مبارک احمد و محمد ہیں جو کہ بمنزلہ اسم ذات ہیں اور دیگر اسماء صفاتی ہیں اور یہ دونوں نام بھی حقیقت میں ایک اسم ہے جو حمد سے مشتق اور مبالغہ کے معنی میں مقید ہے۔ پہلا نام باعتبار کیفیت ہے اور دوسرا نام باعتبار کمیت۔ تو آپ حق تعالیٰ کی حمد، افضل محامد سے کرتے ہیں اور دنیا و آخرت میں کثرت محامد سے آپ کی حمد و ستائش کی گئی۔ اور آپ احمد الحامدین (حمد کرنے والوں میں سب سے

زیادہ حمد کرنے والے) اور احمد المحمودین (تمام تعریف کئے ہوؤں میں سب سے زیادہ تعریف کردہ) وافضل من حمد (جو بھی حمد کرے ان سب سے برتر حمد کرنے والے) ہیں۔ اور روزِ قیامت آپ کے ساتھ لواء الحمد ہوگا تاکہ آپ پر کمالِ حمد تمام ہو جائے اور حامدیت و محمودیت کی صفت سے عرصات محشر میں مشہور کئے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ آپ کو مقام محمود پر فائز فرمائے گا۔ جیسا کہ اپنے ارشاد میں وعدہ فرمایا ہے کہ "عَسٰى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا۔" اور باب شفاعت کھولتے وقت اگلے پچھلے سب ہی آپ کی حمد کریں گے اور حق تعالیٰ اس وقت آپ کو ایسی حمد کی تعلیم فرمائے گا جس کی کسی اور کو تعلیم نہ فرمائی گئی اور حق تبارک و تعالیٰ نے آپ کی امت کا نام " حمادون " (بہت زیادہ حمد بجالانے والے) رکھا۔ لہٰذا سزاوار ہے کہ آپ کا اسم گرامی احمد و محمد رکھا جائے۔ اس تقریر سے ظاہر ہے کہ احمد بمعنی حامد تر، اسم تفضیل برائے فاعل ہے جیسا کہ استعمال میں یہ معنی بہت زیادہ ہیں اور ممکن ہے کہ بمعنی محمود تر ہو۔ جو مفعول کیلئے مشتق ہے اس بنا پر یہاں بیان محمودیت مقصود ہوگا خواہ بلحاظِ کمال ہو خواہ باعتبارِ کثرت ہو۔

بعض کہتے ہیں کہ پچھلوں میں نام احمد مشہور ہے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسی نام سے یاد کرتے تھے اور کتب سابقہ میں یہی مذکور ہے اور قرآن کریم میں نام محمد بیان کیا گیا۔ اور حق یہ ہے کہ دونوں ہی نام پرانے ہیں۔ لیکن حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام نے کثرت تعظیم کے لحاظ سے نام احمد سے یاد کیا کیونکہ یہ صیغہ تفضیل کا ہے۔ اور حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ حضور کی مدح میں کہتے ہیں کہ اشعار۔

اَغَرُّ عَلَيْهِ لِلنُّبُوَّةِ خَاتَمٌ ۔۔۔ مِنَ اللهِ مِنْ نُوْرٍ يَلُوْحُ وَيَشْهَدُ

وَضَمَّ الْاِلٰهُ اِسْمَ النَّبِيِّ اِلٰى اِسْمِهٖ ۔۔۔ اِذْ قَالَ فِي الْخَمْسِ الْمُؤَذِّنُ اَشْهَدُ

وَشَقَّ لَهٗ مِنْ اِسْمِهٖ لِيُجِلَّهٗ ۔۔۔ فَذُو الْعَرْشِ مَحْمُوْدٌ وَهٰذَا مُحَمَّدٌ

بخاری نے تاریخ صغیر میں علی بن زید کی سند سے آخری شعر کو ابو طالب سے منسوب کیا ہے۔ اور بعض روایتوں میں مذکور ہے کہ حق تبارک و تعالیٰ نے آپ کو اس اسم شریف کے ساتھ تخلیق عالم سے ہزار سال پہلے موسوم فرمایا اور ابن عساکر کعب الاحبار سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام نے حضرت شیث علیہ السلام سے فرمایا "اے فرزند تم میرے بعد خلیفہ اور جانشین ہو۔ تم عماد تقویٰ اور عروۂ وثقیٰ کو تھامے رہنا اور جب بھی تم خدا کا ذکر کرو تو ساتھ ہی اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کرنا اس لئے کہ میں نے اس نام مبارک کو ساق عرش پر لکھا دیکھا ہے حالانکہ میں روح اور مٹی میں تھا اس کے بعد میں نے تمام آسمانوں کی سیر کی۔ وہاں میں نے کوئی جگہ ایسی نہ دیکھی جہاں اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ لکھا ہو۔ بلاشبہ میرے رب نے مجھے جنت میں ٹھہرایا اور میں نے جنت کا کوئی محل اور کوئی دریچہ ایسا نہ دیکھا جس پر اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ لکھا ہو اور میں نے حور العین کی پیشانیوں پر اور طوبیٰ کے درخت کے پتوں پر اور سدرۃ المنتہیٰ کے ہر پتہ پر اور اطراف حجابات پر اور فرشتوں کی آنکھوں پر نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم لکھا دیکھا ہے۔ لہٰذا اے فرزند ذکر محمد صلی اللہ علیہ وسلم بہت زیادہ کرنا۔ اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ آدم علیہ السلام اپنی مصیبت کے وقت پڑھتے "اَللّٰهُمَّ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ اِغْفِرْ لِيْ خَطِيْئَتِيْ ۔" اور ایک روایت میں آیا ہے کہ تقبل توبتی، خداوندا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے میری مغفرت فرما دے۔ اور میری توبہ قبول فرمالے۔ حق تعالیٰ نے ان سے فرمایا تم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کہاں سے پہچانا؟ عرض کیا میں نے جنت میں ہر جگہ لکھا دیکھا کہ۔ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" ایک روایت میں ہے کہ لکھا ہوا ہے کہ وہ میرا بندہ اور میرا رسول ہے تو میں نے جان لیا کہ وہ تیرے نزدیک ساری مخلوق سے افضل و اکرم ہے اس کے بعد حق تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور بعض کے نزدیک یہ حق تعالیٰ کا ارشاد۔ "فَتَلَقّٰى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ" کی تفسیر و تاویل ہے۔

کتاب الشفا میں عجیب و غریب لکھا ہے کہ عالم سفلیات یعنی نچلی دنیا بھی ثبوت اسم شریف پر دلالت رکھتی ہے مثلاً ایک قدیم و پرانے پتھر پر (مُحَمَّدٌ تَقِیٌّ مُصْلِحٌ اَمِیْنٌ ۔) لکھا ہوا پایا گیا اور منقول ہے کہ ایک پتھر پر عبرانی خط میں لکھا ہوا پایا گیا۔ "بِاسْمِکَ اللّٰھُمَّ جَاءَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کَتَبَہٗ مُوْسیٰ اِبْنُ عِمْرَانَ ۔ " اسے ابن ظفر نے "الیسر" میں معمراز زہری سے ذکر کیا اور خراسان کے ایک شہر میں مشاہدہ کیا گیا ہے کہ ایک بچہ پیدا ہوا جس کے ایک پہلو پر "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" لکھا ہوا ہے۔ اور بلادِ ہند میں ایک پھول کی پتی ہے جس پر بخط سفید لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ " لکھا ہوا ہے۔

اور علامہ ابن مرزوق عبداللہ بن صوحان سے نقل کرتے ہیں انہوں نے بیان کیا کہ ہم بحر ہند میں سفر کر رہے تھے کہ ہم پر تیز ہوائیں چلنے لگیں اور سمندر میں موجیں اٹھنے لگیں تو ہم نے اپنی کشتی ایک جزیرے میں لنگر انداز کر دی وہاں ہم نے ایک گلاب کا پھول دیکھا جس کی تیز بھینی بھینی خوشبو تھی۔ اس پر بخط سفید لکھا ہوا تھا "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ " اور ایک اور سفید پھول دیکھا جس پر بخط زرد یکھا لکھا ہوا تھا "بَرَاءَۃٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اِلٰی جَنّٰتِ النَّعِیْمِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ۔ " اور تاریخ ابن العزیم میں علی بن عبداللہ ہاشمی شرقی سے منقول ہے کہ ہند کے ایک دیہات میں تیز خوشبو کا ایک بڑا پھول پایا گیا جس پر بخط سفید "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ، ابو بکر صدیق، عمر الفاروق لکھا ہوا تھا۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میرے دل میں شک گزرا اور خیال ہوا کہ یہ کسی کی کاریگری ہے اس کے بعد ایک اور پھول کی طرف متوجہ ہوا جو ابھی نہ کھلا تھا اور نہ پھیلا تھا۔ تو اس میں بھی میں نے اسی خط میں لکھا دیکھا میں نے اس شہر میں چیزیں بڑی ارزاں اور سستی دیکھیں۔ وہاں کے لوگ پتھروں کو پوجتے تھے اور اللہ عزوجل کو جانتے تک نہ تھے۔

ابو عبداللہ مالک بیان کرتے ہیں کہ میں بلادِ ہند گیا اور میں نے ایک شہر کی سیر کی جسے نمیلہ بنون یا تمیلہ بتاکہتے ہیں وہاں میں نے ایک بہت بڑا درخت دیکھا جس کے پھل بادام کی مانند ہیں اور اس کا چھلکا ہے یعنی پھل پر پوست ہے۔ پھر جب پھول کو توڑا گیا اور اس میں سے گری نکالی گئی اور اسے چیرا گیا تو بیچ میں ایک سبز پتہ نکلا۔ جس پر سرخ لکھا ہوا تھا لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ " اہل ہند اس سے برکت حاصل کرتے ہیں اور اس کے ذریعہ خشک سالی میں بارش مانگتے ہیں۔ اس کو ابو البقائن صافی نے اپنی کتاب "منسک" میں بیان کیا ہے۔

اور روضۃ الریاحین میں یافعی بعض علماء سے اس کی مانند نقل کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے یہ بات ابو یعقوب صیاد نے سنائی کہ میں نہر ابلہ میں شکار کر رہا تھا تو میں نے ایک مچھلی ایسی پکڑی جس کے داہنے پہلو پر لا الٰہ الا اللہ اور بائیں پہلو پر محمد رسول اللہ لکھا ہوا ہے۔ جب میں نے یہ دیکھا تو تعظیم و احترام کی خاطر پانی میں ہی اسے دفن کر دیا۔

بعض لوگ قصیدہ بردہ شریف کی شرح میں ابن مرزوق سے نقل کر کے بیان کرتے ہیں کہ مچھلی لائی گئی جس کے ایک کان کی جلد پر لا الٰہ الا اللہ اور دوسرے پر محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا اور ایک جماعت سے منقول ہے کہ انہوں نے زرد رنگ کا خربوزہ پایا جس پر سفید لکیریں تھیں۔ اور ہر لکیر پر عربی میں اس کی ایک جانب اللہ اور دوسری جانب "احمد" خوب واضح لکھا ہوا تھا۔ جس میں کوئی عقلمند تحریر شناس شک نہیں کر سکتا تھا اور کہتے ہیں کہ "۸۰۹ھ میں انگور کا ایک دانہ پایا گیا۔ جس پر بخطِ ظاہر برنگ سیاہ "محمد" لکھا ہوا تھا۔

اور ابن ظفر بن سیاف کی کتاب "بطن مفہوم" میں کسی سے منقول ہے کہ انہوں نے ایک بڑے درخت کو دیکھا جس کے پتے بڑے اور خوشبودار تھے۔ اور ہر پتہ پر پیدائشی طور پر سرخی و سفیدی سے خوب روشن اور واضح خط میں قدرت الٰہی سے تین سطریں لکھی ہوئی تھیں۔ پہلی سطر میں لا الٰہ الا اللہ دوسری سطر میں محمد رسول اللہ اور تیسری سطر میں "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ " لکھا تھا۔

اسماء باری تعالیٰ سے حضور کو مشرف فرمانا

وصل: اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے حبیب سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسماء حسنیٰ اور صفات علیٰ سے موسوم و مشرف فرمایا۔
قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے بہت سے نبیوں کو اپنے اسماء حسنیٰ میں سے بکثرت اسماء ان کی تخلیق میں کرامت فرمائے جیسے کہ حضرت اسحٰق و اسمٰعیل علیہما السلام کو علیم و حلیم فرمایا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حلیم کہا اور حضرت نوح علیہ السلام کو شکور اور حضرت عیسیٰ و یحییٰ علیہما السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کریم و قوی اور حضرت یوسف علیہ السلام کو حفیظ و علیم اور حضرت ایوب علیہ السلام کو صابر جو بمعنی صبور ہے اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو صادق الوعد فرمایا۔ اور ان سب پر قرآن کریم ان کے ذکر کے مواقع میں ناطق و شاہد ہے۔ اور سید عالم احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثنا کو اپنے بہت سے ناموں سے فضیلت بخشی جن کو بتعلیم الٰہی ہم تیس کے قریب تحریر کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ اس سے زیادہ پر بھی انشراح صدر فرمائے۔ (انتہیٰ)
واضح رہنا چاہیے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم رب العزت و علا کے تمام اسماء و صفات کے کمالات کے جامع اور تمام اخلاق الٰہی عزاسمہ سے متخلق و متصف ہیں۔ جیسا کہ بعض عرفاء نے ان کی تفصیل بیان کی ہے اور قاضی عیاض رحمہ اللہ کا مذکورہ تعداد کے ذکر کرنے کا مقصد وہ ہے جن کا کتاب مجید اور احادیث صحیحہ میں ذکر ہے جیسا کہ ان کا سیاق کلام بتا رہا ہے۔
اسماء حسنیٰ میں سے ایک نام "حمید" ہے اس کے معنی محمود ہیں اس لئے کہ حق تعالیٰ نے اپنی ذات اقدس کی خود حمد فرمائی اور بکثرت آیات کلام مجید میں ہیں اور دلائل اس کے کمال پر علی الاطلاق جانوں اور جہانوں میں دلالت کرتی ہیں اور ساری مخلوق نے اس کی حمد کی ہے اور ممکن ہے کہ حمید بمعنی حامد ہو کیونکہ وہ اپنی ذات اور اعمال طاعات کی تعریف فرمانے والا ہے۔ لہٰذا حق تعالیٰ حامد بھی ہے اور محمود بھی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی "محمد" رکھا۔ جو بمعنی احمد و محمود ہے۔ اور اسی کے ہم معنی حامد و محمود ہیں۔ بلاشبہ حضرت داؤد علیہ السلام کی کتاب زبور میں واقع ہوا ہے۔ وقد سبق بیان معنی ہذا الاسم الشریف۔ اسماء الٰہی میں سے "الرؤف الرحیم" ہے۔ حق تعالیٰ نے خود ان ناموں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف فرمائی فرمایا۔ "وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔" یہ دونوں نام ہم معنی ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ غایت درجہ رحمت کو رافت کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "رَءُوْفٌ بِالْمُطِيْعِيْنَ رَحِيْمٌ بِالْمُذْنِبِيْنَ" فرمانبرداروں کے ساتھ رؤف اور گنہگاروں کے ساتھ رحیم ہیں۔ اور اسماء الٰہی میں سے "الحق المبین" ہے نام حق موجود و ثابت ہے کہ اس کا امر متحقق ہے اور مبین یہ ہے کہ اس کی الوہیت کا حکم اور اس کی حقانیت کی دلیل واضح و آشکارا ہے۔ بان اور ابان ایک ہی معنی میں آتا ہے۔ مبین کے معنی ہیں بندوں کیلئے امر دین کو ظاہر کرنے والا اور ان کے مبداء و معاد کو ظاہر کرنے والا بھی کہنا جائز ہے۔ حق تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی نام رکھا اور فرمایا "يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ" اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے حق تشریف لے آیا اور فرمایا "فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ" بلاشبہ کفار نے حق کو جھٹلایا جب وہ ان میں تشریف لائے اور فرمایا "حَتّٰى جَاءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ" یہاں تک کہ تمہارے پاس حق تشریف لے آیا اور یہ رسول ظاہر فرمانے والا ہے۔ اور فرمایا "اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ وَالْمُرَادُ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" میں کھلا ڈرانے والا ہوں۔ نذیر و مبین سے مراد حضور ﷺ ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ قرآن مراد ہے۔ اس جگہ حق کے معنی باطل کی ضد ہے مطلب یہ کہ حضور ﷺ کی صداقت متحقق ہے اور آپ کا امر رسالت خوب ظاہر ہے۔ خدا اور نبی دونوں مبین ہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے آپ پر نازل فرمایا "لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ" تاکہ تو خوب ظاہر کرے لوگوں پر وہ جو ان کی طرف نازل ہوا ہے۔ بعض اہل اشارات ارشاد باری تعالیٰ "وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ" (اور جو کچھ آسمان و زمین اور ان کے درمیان ہے ہم نے نہیں پیدا فرمایا مگر حق کے ساتھ) کی تفسیر

میں کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ پیدا فرمایا۔ یہ تفسیر حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی اس حدیث پر مبنی ہے کہ فرمایا۔
اوّل ماخلق اللہ روح محمدؐ ثم خلق منه العرش والكرسی والسماء والارض وجميع الموجودات۔ اوراسماء الٰہی تعالیٰ نور است ومعنیٰ او النور و خالق النور یامنور السموت والارض بالانوار ومنور قلوب العارفین بالھدایة والاسرار (اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے روح محمد ﷺ کو پیدا فرمایا۔ پھر اس سے عرش، کرسی، آسمان، زمین اور تمام موجودات پیدا فرمائیں۔) اور اسماء الٰہی میں سے نور ایک اسم ہے۔ نور کے معنیٰ ہیں نور والا، نور کو پیدا کرنے والا، آسمان و زمین کو انوار سے منور کرنے والا اور عارفوں کے دلوں کو ہدایت و اسرار سے منور فرمانے والا۔ اور حضور اکرم ﷺ کو بھی نور فرمایا اور ارشاد باری تعالیٰ ہے "قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ" بیشک تمہارے پاس اللہ کی جانب سے نور اور کتاب روشن آئی۔ اور حضور ﷺ کی شان میں فرمایا "وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا" آپ نورانی آفتاب ہیں۔ اور حضور کا نور نام رکھنا اس بنا پر ہے کہ احکام الٰہی کی وضاحت، اس کی نبوت کا اظہار اور مسلمانوں اور عارفوں کے دلوں کو نورانیت مرحمت فرمانا اس چیز سے ہے جو آپ دین حق لے کر تشریف لائے اور اسماء الٰہی میں سے ایک نام "الشہید" ہے۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ اس کے معنیٰ "عالم" جاننے والے کو بتاتے ہیں اور ایک قول میں اس کے معنیٰ لوگوں پر گواہ ہونے کے کئے گئے ہیں اور حضور اکرم ﷺ کو بھی شاہد اور شہید فرمایا گیا ہے ارشاد ہے "اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا" (بھیجا ہم نے آپ کو شاہد بنا کر) یعنی جاننے والا اور امت کی حالت اور ان کی تصدیق و تکذیب اور نجات و ہلاکت کو حاضر ہو کر دیکھنے والا۔ ارشاد ہے "وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا" یہ رسول تم پر گواہ ہیں۔ چنانچہ جب تمام امتیں اپنے نبیوں کی رسالت کا انکار کریں گی تو امت محمد یہ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ان پر گواہی دے گی اور حضور ﷺ کی شہادت دیا کریں گی امت کے لئے حدیث میں مذکور ہے۔

اور اسماء الٰہی میں سے ایک نام "الکریم" ہے۔ اس کے معنیٰ کثیر الخیر، کثیر الفضل اور کثیر العفو کے ہیں۔ ایسا ہی قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔ اور حدیث میں اسماء الٰہی کے ضمن میں "اکرم" بھی آیا ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی کریم رکھا گیا ہے۔ ارشاد باری ہے "اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ" بے شک یہ رسول کریم کا پڑھا ہوا ہے۔ اس سے مراد سید عالم محمد رسول اللہ ﷺ ہیں نہ کہ جبریل علیہ السلام چونکہ اس کے بعد ارشاد ہے "وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ۔ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ۔ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ۔ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ" یہ شاعر کا کہا ہوا نہیں ہے بہت کم ہے جو تم ایمان لاتے ہو اور نہ یہ کاہن کی باتیں ہیں بہت کم ہے جو تم غور کرتے ہو "مَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ" اور "لَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ" اس کا واضح قرینہ ہے اس لئے کہ کفار جبریل علیہ السلام کو ایسا نہ کہتے تھے۔ لہٰذا متعین ہو گیا کہ رسول کریم سے مراد حضور ﷺ ہیں نہ کہ جبریل علیہ السلام، اور یہ سورۃ الحاقہ میں ہے اور سورۂ تکویر میں جو یہ آیت ہے اس سے جبریل علیہ السلام ہی مراد ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس جگہ بھی حضور ﷺ ہی مراد ہیں کیونکہ آپ پر یہ صفات صادق آتی ہیں۔ اور صواب یہی ہے کہ یہ آیت تکویر محتمل ہے۔ واللہ اعلم

اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا "اَنَا اَكْرَمُ اَوْلَادِ اٰدَمَ" میں اولاد آدم میں سب سے زیادہ مکرم ہوں۔ اس اسم کے معانی حضور ﷺ کے حق میں صحیح ہیں (یہ اللہ تعالیٰ کا نام بھی ہے، "وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ") اہل علم کہتے ہیں کہ جب کسی کی "کرم" کے ساتھ تعریف کرتے ہیں تو اس کی تمام صفات خیر کی تعریف ہو جاتی ہے اور حضور اکرم ﷺ ظاہری، باطنی ذاتی اور صفاتی محور پر صفات کرم کے ساتھ متصف ہیں۔

اور اسماء الٰہی میں سے ایک نام "العظیم" ہے اس کے معنیٰ جلیل الشان ہیں۔ اور ہر وہ چیز جو اس کے سوا ہے کمتر ہے۔ اور یہ نام اپنے حبیب ﷺ کو بھی دیا گیا۔ فرمایا "وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ" یقیناً آپ کی خو بو بہت بلند ہے۔ اور توریت میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے پہلے سفر کے ضمن میں واقع ہوا ہے کہ "سَيَلِدُ عَظِيْمًا لِاُمَّةٍ عَظِيْمَةٍ" ایک عظیم امت کیلئے وہ ایک عظیم ہستی کو جنے گی

لہٰذا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس عظیم اور آپ کی خوبو بھی عظیم ہے اور جب کسی کی صفت عظیم ہو تو اس کی ذات بھی عظیم ہوگی۔ آپ کے اخلاقِ شریفہ کے باب میں اس کی کچھ بحث گزر چکی ہے۔

اسماء الٰہی میں سے ایک نام "الجبار" ہے اور جبار کے معنی مصلح، قاہر، برتر، عظیم الشان اور متکبر کے آتے ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور کے چالیسویں باب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اور فرمایا "تَقَلَّدْ اَیُّہَا الْجَبَّارُ سَیْفَکَ فَاِنَّ نَامُوْسَکَ وَشَرِیْعَتَکَ مَقْرُوْنَۃٌ بِھَیْبَتِکَ" "اے جبار! اپنی تلوار کو گردن میں اس لئے آویزاں کر رکھ کہ آپ کی ناموس اور آپ کی شریعت ہیبت کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ پہلے اس کا تذکرہ کتب سابقہ کے ضمن میں گزر چکا ہے۔ اور اس کے معنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں صادق ہیں۔ اس بنا پر کہ آپ نے ہدایت و تعلیم سے اپنی امت کی اصلاح فرمائی۔ اور اپنے قہر سے اعداء دین کو مغلوب فرمایا اور آپ کا علوِ مرتبت اور عظیم منزلت تمام افراد بشر کے مقابلے میں عظیم کبرو بڑائی کو شامل ہے باوجودیکہ قرآن کریم میں جبرو تکبر کی آپ سے نفی کی گئی ہے کیونکہ یہ آپ کے حال و مقام کے لائق نہیں فرمایا "وَمَآ اَنْتَ عَلَیْھِمْ بِجَبَّارٍ" اسماء الٰہی میں سے ایک نام "اَلْخَبِیْرُ" ہے اس کے معنی کنہ شے کے باخبر اور اس کی حقیقت کے جاننے والے کے ہیں۔ اس تقدیر پر یہ علیم کے معنی میں ہوگا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ خبیر بمعنی مخبر یعنی خبر دینے والے کے ہیں اور حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم دونوں معنی میں خبیر ہیں۔ اس لئے کہ حق تبارک و تعالیٰ نے کائنات اور اپنی معرفت کا عظیم علم جو کچھ آپ کو مرحمت فرمایا ان تمام علوم سے آپ باخبر و مطلع ہیں اور آپ نے اپنی امت کو ان تمام خبروں کا علم دیا جن کے بتانے اور خبر دینے کی اجازت حق تبارک و تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی۔ لہٰذا آپ خبیر بمعنی مطلع اور خبر دیئے ہوئے اور خبیر بمعنی مخبر یعنی خبر دینے والے دونوں ہیں۔ نام خبیر سے آپ کو موسوم فرمانا اس آیتِ کریمہ میں ہے کہ "فَاسْئَلْ بِہٖ خَبِیْرًا" اسے تم خبیر سے معلوم کرو اور خبیر سے یہاں مراد ایک تفسیری قول کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اسماء الٰہی میں سے ایک نام "الفتاح" ہے اس کے معنی بندوں کے درمیان حاکم ہونا اور رزق و رحمت کے دروازوں کو کھولنے والے کے ہیں اور مخلوق پر کارہائے بستہ کو کھولنے والے اور ان کے قلوب و بصائر کو معرفت حق کے لئے کھولنے والے کے بھی ہیں۔ اور ناصر و مددگار کے معنی میں بھی آیا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے "اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَکُمُ الْفَتْحُ اَیْ تَسْتَنْصِرُوْا فَقَدْ جَآءَکُمُ النَّصْرُ" "اگر تم مدد مانگو تو بے شک تمہارے پاس مدد آگئی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کا نام فاتح رکھا۔ شب معراج کی حدیث میں ہے جو ابو عالیہ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے کہ "وَجَعَلْتُکَ فَاتِحًا وَّخَاتِمًا" اور ہم نے بنایا تم کو فاتح اور خاتم۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود شکر نعمت حق کی ادائیگی میں فرمایا۔ "وَرَفَعَ لِیْ ذِکْرِیْ وَجَعَلَنِیْ فَاتِحًا وَّخَاتِمًا" اور میرے ذکر کو رفعت بخشی۔ اور مجھے فاتح و خاتم بنایا۔ لہٰذا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امت کیلئے فاتح ابواب رحمت ہیں۔ اور معرفتِ حق اور ایمان بخدا کیلئے ان کے قلوب و بصائر کے فاتح اور ناصرِ حق اور دین و ایمان کے نصرت دہندہ ہیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اسماء الٰہی میں سے ایک نام "الشکور" ہے اس کے معنی ہیں عملِ قلیل پر جزائے کثیر و وافر دینا اور بعض کہتے ہیں فرماں برداری پر تعریف و توصیف کرنا۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود شکور سے اپنی توصیف فرمائی ہے اور فرمایا "اَفَلَآ اَکُوْنُ عَبْدًا شَکُوْرًا۔" کیا میں شکر گذار بندہ نہ بنوں۔ مطلب یہ کہ میں حق تبارک و تعالیٰ کی نعمتوں کا معترف اور اس کی قدر و قیمت کا جاننے والا ہوں اس پر حمد و شکر بجالانے والا ہوں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ شکور سے اپنی توصیف فرمانا خدا کے اذن اور اس کے حکم سے ہے۔

اسماء الٰہی میں سے "العلیم، علّام اور عالم الغیب والشہادۃ ہے۔ اور حق تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف علم کے ساتھ فرمائی ہے۔ اور آپ کو اس میں فضیلت و خیریت کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے چنانچہ ارشاد باری ہے "وَعَلَّمَکَ مَالَمْ

تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا اے حبیب! جو کچھ تم نہ جانتے تھے وہ سب تمہیں بتایا اور اللہ کا فضل تم پر بہت بڑا ہے اور فرمایا "وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ" وہ تمہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔ "وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ" اور سکھایا تم کو وہ سب کچھ جو تم نہ جانتے تھے۔

اسماءالٰہی میں سے الاول اور الاخر ہیں۔ الاول کے معنی سابق در وجود اور آخر کا معنی باقی بعد از فنائے مخلوق اور حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے نہ اول ہے اور نہ آخر۔ اور حضور اکرم ﷺ تخلیق عالم میں اول انبیاء ہیں اور بعثت میں ان سب کے آخر۔ اس کی طرف حق تعالیٰ نے اس آیۂ کریمہ میں اشارہ فرمایا کہ "وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ۔" اور جب ہم نے نبیوں سے ان کا عہد لیا تم سے بھی اور نوح و ابراہیم سے بھی اس لئے کہ حق تعالیٰ نے آپ کے ذکر کو حضرت نوح و ابراہیم علیہما السلام پر مقدم فرمایا۔ "نَحْنُ الْاٰخِرُوْنَ السَّابِقُوْنَ" ہم پچھلوں میں اولیت رکھتے ہیں اور امورِ کثیرہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولیت ثابت ہے اور فرمایا "اَنَا اَوَّلُ مَنْ تَنْشَقُّ عَنْهُ الْاَرْضُ" میں اول ہوں جس کیلئے زمین شق ہوگی "وَاَوَّلُ مَنْ يَّدْخُلُ الْجَنَّةَ وَاَوَّلُ شَافِعٍ وَّاَوَّلُ مُشَفَّعٍ" میں سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گا اور اول شافع اور اول مقبول الشفاعۃ ہوں۔

اسماءالٰہی میں سے القوی اور ذوالقوۃ المتین ہیں ان کے معنی قادر کے ہیں اور حق تعالیٰ نے ان اوصاف کے ساتھ آپ کی تعریف فرمائی ہے۔ فرمایا "ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ" قوت والا صاحب عرش کے قریب قیام فرمانے والا۔ مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ جبریل ہیں۔ یا اسے دونوں کیلئے مشترک گردانتے ہیں کیونکہ یہ صفت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

اسماءالٰہی میں سے ایک نام "صادق" ہے اور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف صادق و مصدوق سے آئی ہے۔

اسماءالٰہی میں سے "ولی اور مولیٰ" ہیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا "اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ" اللہ اور اس کا رسول تمہارا ولی ہے۔ اور حضور نے فرمایا "اَنَا وَلِيُّ كُلِّ مُؤْمِنٍ" میں ہر مسلمان کا ولی ہوں اور فرمایا "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ" میں جس کا مولا ہوں اس کے مولا علی ہیں۔ اس جگہ مراد محبت کرنے والا اور مدد کرنے والا ہے۔ اور اسماءالٰہی میں ایک نام "عفو" ہے اس کے معنی معاف کرنے والے اور تقصیر و گناہ سے درگزر کرنے والے کے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو عفو و درگذر فرمانے کا حکم قرآن و توریت میں دیا ہے فرمایا۔ "خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ" عفو کو لازم کرو اور نیکی کا حکم دو اور فرمایا "فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ" ان کو معاف کرو اور درگذر کرو۔ توریت و انجیل میں آپ کی صفت میں ہے۔ "لَيْسَ بِفَظٍّ وَّلَا غَلِيْظٍ وَّلٰكِنْ يَّعْفُوْ وَيَصْفَحُ" وہ نہ تند خو ہیں اور نہ بد مزاج بلکہ معاف فرماتے اور درگزر کرتے ہیں۔

اسماءالٰہی میں سے ایک نام الہادی ہے۔ اس کے معنی ہیں بندوں میں سے جو مانگے اسے توفیق دینے والا۔ اور ہدایت بمعنی راہ دکھانا ہے۔ ارشاد باری ہے "وَاللّٰهُ يَدْعُوْۤا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ" اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔ اور صراط مستقیم کی راہ دکھاتا ہے جسے چاہے اور فرمایا "وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ" بلاشبہ یقیناً آپ صراط مستقیم کی راہ دکھاتے ہیں۔ اور فرمایا "وَدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ" اس کے حکم سے اللہ کی طرف بلانے والے لیکن پہلے معنی حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں اور دوسرے معنی حق تعالیٰ اور اس کے نبی کے درمیان مشترک ہیں۔

اسماءالٰہی میں سے "المؤمن المہیمن" ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ دونوں اسم کے ایک ہی معنی ہیں لہٰذا مومن کے معنی حق تعالیٰ کیلئے اپنے ان وعدوں کا پورا کرنا ہے جو اپنے بندوں سے کئے اور اپنے قول کی تصدیق کرنا ہے کہ وہ حق ہے۔ اور مومن و رسولوں کی تصدیق

کرتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اپنی ذات کی یکتائی اور اپنی الوہیت کے امین کے ہیں۔ اور یہ مومن کا صیغہ تصغیر ہے گویا ہمزہ کو ہاء سے بدل دیا گیا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ مہیمن کے معنی شاہد و حافظ کے ہیں۔ اور یہ کہ جو دوسروں کو خوف سے محفوظ رکھے اور حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم بھی امین، مہیمن اور مومن ہیں۔ حق تعالیٰ نے آپ کا نام امین رکھا اور فرمایا "مطاع ثم امین" اور حضور قبل از نبوت اور بعد از نبوت صفت امین سے مشہور و معروف تھے اور آپ کا نام آپ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آپ کی مدح میں ایک شعر میں مہیمن لیا اور حق تعالیٰ نے فرمایا "وَيُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ" مطلب یہ کہ تصدیق فرماتا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اَنَا اَمَنَةٌ لِاَصْحَابِيْ۔" میں اپنے صحابہ کی جائے پناہ ہوں۔

صاحب مواہب کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے فرمایا "وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ۔" اور ہم نے آپ کی طرف کتاب نازل کی جو اگلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان پر محافظ و گواہ مجاہد سے منقول ہے کہ اس جگہ مہیمن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں گویا فرمایا "جَعَلْنَاكَ يَا مُحَمَّدُ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ" یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو ہم نے اس پر نگہبان بنایا۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

اسماء الٰہی میں سے ایک نام "مقدس" ہے۔ اس کے معنی ہر عیب و نقص اور سمت و جہاتِ حدوث سے پاک و منزہ ہیں اور انبیاء علیہم السلام کی کتابوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء مبارک میں مقدس بمعنی گناہوں سے پاک و صاف واقع ہوا ہے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا "لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ" یا یہ کہ عادات ذمیمہ اور صفات دنیہ سے مقدس ہیں یہاں تک کہ آپ کی اتباع سے لوگ مقدس و مطہر ہو گئے جیسا کہ فرمایا۔ "وَيُزَكِّيْهِمْ" لوگوں کو پاک و صاف فرماتے ہیں۔

اسماء الٰہی میں سے ایک نام العزیز ہے اس کے معنی یا تو کسی کا اس پر غالب آنا محال ہے یا یہ کہ "اس کا کوئی نظیر نہیں" یا یہ کہ وہ دوسروں کو عزت دیتا ہے۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے اسی معنی کو حق تعالیٰ کے ارشاد سے استدلال کیا ہے کہ "وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ" مطلب یہ کہ جب یہ مسلم ہے کہ خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے عزت ہے اور خدا عزیز اور معز ہے تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم بھی عزیز و معز ہوئے۔ صاحب مواہب فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کیلئے بھی عزت ثابت کی گئی اور اسی کے بعد فرمایا "وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ" (اور مسلمانوں کیلئے عزت ہے) اس لحاظ سے یہ صفت اور یہ نام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔ اور قاضی عیاض رحمہ اللہ کی غرض اثبات اختصاص ہے۔ اور تعجب ہے کہ یہ نکتہ ان کے انداز بیان سے کیسے پوشیدہ رہ گیا۔ (انتہیٰ) اور میں (صاحب مدارج) بتوفیق الٰہی کہتا ہوں کہ مسلمانوں کیلئے اس کا اثبات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و طفیل میں ہے نہ کہ اصالۃً اور مستقلاً لہٰذا یہ اختصاص کے منافی نہیں ہے۔ نیز قاضی عیاض کی غرض اثبات اختصاص نہیں ہے اور وہ بلاشبہ ثبوت کے ساتھ اس کے قائل ہیں کہ بعض حق تعالیٰ کے اسماء صفات مشترک ہیں اور بعض دوسرے نبیوں میں بھی ہیں۔ جیسے حضرت نوح علیہ السلام کے لئے شکور اور حضرت اسمٰعیل و ابراہیم علیہما السلام کیلئے علیم و حلیم اور حضرت یوسف و موسیٰ علیہما السلام کیلئے حفیظ و علیم اور کریم۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور حضور اکرم ﷺ کے نام عزیز کا اثبات اگر اس آیت سے کریں کہ "لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ" اور عزیز پر وقف کریں جیسا کہ ایک قرات میں ہے تو یہ واضح اور بے تکلف ہے اور قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے اپنے آپ کو بشارت اور نذرات کے ساتھ موصوف فرمایا چنانچہ فرمایا "يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ" (ان کا رب ان کو بشارت دیتا ہے) اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى اور اللہ تمہیں یحییٰ کی بشارت دیتا ہے اور فرمایا "يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ" (تمہیں اپنے کلمہ کی بشارت دیتا ہے) اور حضور اکرم ﷺ کے نام پر بھی مبشر، بشیر اور نذیر رکھے

اور یہ ظاہر ہے اور بعض مفسرین کے نزدیک طٰہٰ اور یٰسٓ حق تعالیٰ کے اسماء میں سے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء میں ان ناموں کے ہونے کا قول مشہور ہے کیونکہ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے بیان کر کے استنباط فرمایا ہے۔ اور یہ محقق ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اوصافِ الٰہی کے ساتھ متصف اور اخلاقِ الٰہی کے ساتھ متخلق ہیں اور یہ بات بعض اکمل اولیاء کو بھی آپ کے اتباع میں حاصل ہے اور قاضی عیاض نے اثبات تسمیہ کا قصد کیا ہے اور وہ جو آپ کا ذکر کتاب و سنت اور کتب مقدسہ میں ہے ان کا بیان کرنا مقصود ہے وہ پیچھے گزر چکا ہے۔ اس بحث کا تتمہ جو اسماء حسنیٰ کی شرح میں لکھا ہوا ہے وہیں تلاش کریں۔ (واللہ اعلم)

تنبیہ: قاضی عیاض رحمہ اللہ اس کلام کے بیان کرنے کے بعد ایک نکتہ پر تنبیہ فرماتے ہیں اور اسے اپنے کلام کا ضمیمہ بنا کر فرماتے ہیں کہ آگاہ ہو اور جانو کہ میں نے جو کچھ بیان کیا ہے اور اس فصل کو جس انداز سے بیان کیا اور جس پر میں نے اس باب کو قائم کیا ہے اب میں اس سے ہر ضعیف الوہم اور سقیم الفہم کے اشکال و اشتباہ کو دور کرتا ہوں اور ان تشبیہ کے وسوسوں سے اسے چھٹکارا دلاتا ہوں۔ جو اسے شبہ وغیرہ میں ڈالتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر بندہ یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ عزاسمہ اپنی عظمت و کبریائی میں مخلوقات میں کسی چیز سے مشابہ نہیں ہے۔ اور اپنے اسماء حسنیٰ اور صفات عُلیٰ میں کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں ہے اور شریعت میں جن صفتوں کا خالق اور مخلوق میں اطلاق کیا گیا ہے۔ ان میں تشابہ اور تماثل حقیقی معنی میں نہیں ہیں اس لئے کہ خالق کی صفاتِ قدیم، مخلوق کی صفات کے برخلاف ہیں۔ کیونکہ مخلوق کی صفات حادث ہیں۔ اور یہ کہ مخلوق کی صفات اعراض و اغراض سے جدا نہیں۔ اور حق تعالیٰ اس سے منزہ و پاک ہے۔ اس مقصد میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد از بس کافی ہے کہ "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" (کوئی شئی اس کی مثل نہیں) اور حق تعالیٰ ان علماء عارفین اور محققین توحید کو جزائے خیر دے۔ جنہوں نے کہا کہ حق تعالیٰ کی ذات میں نہ کوئی ذات مشابہ ہے اور نہ اس کی صفات میں کسی کی صفات مماثل ہیں۔ اس نکتہ میں مزید اضافہ کرنے کا ہمارا مقصد یہ ہے کہ بندہ اعتقاد رکھے کہ اس کی ذات کی مانند کوئی ذات ہے اور نہ اس کی صفات کے مانند کوئی صفت ہے۔ اور نہ اس کے نام کی مانند کوئی نام ہے۔ اور نہ اس کے فعل کی مانند کوئی فعل ہے مگر صرف اتنا کہ لفظ کی لفظ کے ساتھ ظاہری موافقت ہے۔ حق تعالیٰ کی ذات قدیم برتر و منزہ ہے اس سے کہ اسکی صفت حادث ہو۔ اسی طرح یہ بھی محال ہے کہ کسی حادث ذات کیلئے کوئی قدیمی صفت ہو۔ یہ سب اعتقاد اہل حق سنت و جماعت کا مذہب ہے۔ (رضی اللہ عنہم) بلاشبہ امام ابوالقاسم قشیری رضی اللہ عنہ نے اس ذیلی قول کی تحقیق و تفسیر فرمائی ہے۔ اور اس پر اور زیادہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ نقل اعتقادی تمام مسائل توحید پر مشتمل ہے کس طرح اس کی ذات مقدسہ کو ذوات محدثہ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے اس کی ذات اپنے وجود میں سب سے مستغنی ہے۔ اور کس طرح سے اس کے فعل کو مخلوق کے افعال سے مشابہت دی جا سکتی ہے حالانکہ حق تعالیٰ کے افعال جلب کمال یا دفع نقص کے بغیر حاصل ہوئے۔ نہ اعراض و اغراض کی موجودگی ہے اور نہ مباشرت و معالجہ کا ظہور ہے۔ برخلاف افعال مخلوق کے۔ وہ ان وجوہ سے باہر نہیں۔ مشائخ عظام فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے بارے میں تمہارے اوہام جو بھی خیال باندھیں اور تمہاری عقلیں جو بھی تصور کریں وہ سب تمہاری مانند محدث ہیں۔ امام ابوالمعالی جوینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جو شخص جس تصوری وجود سے مطمئن و سکون پائے اور ان کی فکر جہاں تک بھی پرواز کرے وہ سب مشبہ ہے اور جو اس کے نفی محض سے مطمئن ہو وہ معطلہ ہے اور جو شخص کسی تصوری وجود سے ماوراء جانے اور ادراک حقیقت سے اپنے عجز کا اعتراف کرے وہی موحد ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا کتنا اچھا قول ہے کہ حقیقۃُ التوحید ان تعلم ان قدرتہ معانی فی الاشیاء بلا علاج و صنعہ بہا بلا مزاج یعنی توحید کی حقیقت یہ ہے کہ اس کی قدرت کو ایسا جانے بغیر ذریعہ کے اشیاء میں معانی ہیں۔ اور بغیر آلات و اسباب کے اس نے انہیں بنایا ہے۔ "وَعِلَّةُ كُلِّ شَيْءٍ صُنْعُهُ وَلَا عِلَّةَ بِصُنْعِهِ۔"

ہر چیز کی علت اور سبب حق تعالیٰ کا فعل اور اس کی کاریگری ہے اور اپنی صنعت سے اسے کوئی غرض و علت نہیں ہے۔ اور وہ جو تمہاری عقل تصور باندھے تو اللہ اس کے خلاف ہے۔ اور جو صورت تمہارا وہم و خیال بنائے وہ اس کے برخلاف ہے۔ یہ کلام عمدہ یقینی اور محقق ہے اور فضیلت آخری قول کو ہے یعنی جو حضرت ذوالنون مصری نے کہا ہے کہ "مَاتَصَوَّرَ فِي وَهْمِكَ فَاللّٰهُ بِخِلَافِهِ" یعنی تمہارے وہم میں جو تصور آئے تو وہ اس کے برخلاف ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" کی تفسیر ہے۔ اور وہ پہلا قول کہ "عِلَّتُهُ كُلِّ شَيْئٍ صُنْعُهُ وَلَا عِلَّةَ بِصُنْعِهِ" (ہر شئی کی علت و سبب اس کی کاریگری ہے اور اسے اپنی صنعت سے کوئی علت و غرض نہیں) یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد "لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ" (جو وہ فعل کرتا ہے کوئی اس سے پوچھنے والا نہیں اور ساری مخلوق جواب دہ ہے) کی تفسیر ہے اور تیسرا قول حق تعالیٰ کے ارشاد کی تفسیر ہے کہ فرمایا "اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْئٍ اِذَآ اَرَدْنَاهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ" کسی چیز کیلئے ہمارا فرمانا یہ ہے کہ جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہو جا، تو وہ ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اور تم سب کو توحید اور اثبات تنزیہہ پر ہمیشہ قائم رکھے اور ہر گمراہی و بیدینی اور تعطیل و تشبیہہ سے اپنی رحمت و کرم سے دور اور محفوظ رکھے۔ آمین۔ اس فصل میں قاضی عیاض رحمہ اللہ کے کلام کا یہ ترجمہ ہے اور یہ کلام اصل اصول دین ہے (انتہیٰ)۔ مشکوٰۃ میں اسماء باری تعالیٰ کے ضمن میں مشائخ عظام کے کلام کو اس سے زیادہ نقل کیا گیا ہے۔ (واللہ اعلم)

چار سو سے زیادہ اسماء سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

وصل: صاحب مواہب لدنیہ نے کتاب و سنت اور کتبِ سماویہ سے چار سو سے زائد اسماء شریفہ بترتیب حروف تہجی بیان کئے ہیں ہم بھی ان کا ذکر کر کے برکت حاصل کرتے ہیں اگرچہ طویل ہیں اور بعض اسماء مکرر بھی ہیں لیکن اس جگہ ذوق و حلاوت کا معاملہ ہے۔ طول و تکرار نظر میں نہیں ہے۔ مشتاق کو چاہئے کہ مونسِ جان اور وردِ زبانِ خود بنائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد رسول اللہ، الآمر باللہ، الابطحی، اتقی الناس الاجود، اجود الناس، الاحد، الاحسن، احسن الناس، احمد، احید، الآخذ بالحجزات، اٰخذ الصدقات، الآخر، الاخشیٰ للہ، اذن خیر، ارجح الناس عقلا، ارحم الناس بالعیال، الازہر، الاسلم، اسلم الناس، اشجع الناس، الاصدق فی اللہ، اطیب الناس ریحا، الاغر باللہ، اکثر الناس تبعًا، الاکرم، اکرم الناس، اکرم ولد آدم، المص، امام الخیر، امام الناس، امام المتقین، امام النبیین، الامام، الآمر، الآمن، امنۃ اصحابہ، الامین، الامی، انعم اللہ، اول شافع، اول المسلمین، اول المشفع، اولیٰ للمسلمین، اول من تنشق الارض۔ (ب) البار، الباسط، الباطن، البر، البرہان، بشر، بشریٰ، البشیر البصیر البلیغ، بالغ البیان، البینہ (ت) التالی، التذکرہ، المتقی، التنزیل، التہامی (ث) اثنین، (ج) الجبار، الجد، اجود، الجامع، جوامع الکلم (ح) حاتم، حزب اللہ، الحاشر، الحافظ، الحاکم بما اراہ اللہ الحامد، حامل، دار الحمد، الحامد لامتہ عن النار، الحبیب، حزب اللہ، الحفی، الحفیظ، الحق، الحکیم، الحلیم، حماد، حمطایا، یاحمیاطا، حمعسق، الحمید، الحنیف، (خ) خاتم النبیین، خاتم المرسلین، الخاتم، الخازن کمال اللہ، الخاشع، الخاضع، الخالص، خطیب الانبیاء والامم، خطیب الوافدین علی اللہ، الخلیل، خلیل الرحمٰن، الخلیفہ، خیر الانبیا، خیر البریہ، خیر خلق اللہ، خیر العالمین، خیر الناس، خیر ہذہ الامہ، (د) دار الحکمہ، الداعی الی اللہ، دعوۃ ابراہیم، دعوۃ النبیین، دلیل الخیرات، (ذ) ذخیرۃ اللہ، الذاکر، الذکر، ذکر اللہ، ذوالحوض المورود، ذوالخلق العظیم، ذوالصراط المستقیم، ذوالقوۃ، ذوفضل، ذوالمعجزات، ذوالمقام المحمود، ذوالوسیلہ (ر) الراضع، الرضی، الرافع، راکب البراق، الراہب، راکب البعیر، راکب الجمل، راکب الناقہ، رکب النجیب، الرحمۃ، رحمۃ الامتہ، رحمۃ للعلمین، رحمۃ

مهداة، الرحیم، الرسول، الراحة، رسول الرحمة، رسول الله، رسول الملاحم، الرشید، الرفیع، رافع المراتب، رفیع الدرجات، الرقیب، روح الحق، روح القدس، رؤف، رکن المتواضعین، (ز) الزاہد، زعیم الانبیاء، الزکی، زین العباد، الزمزمی، زین من وافی القیامہ (س) السابق، السابق بالخیرات، سابق العرب، الساجد، سبیل الله، السراج المنیر، السعید، سعد الله، سعد الخلائق، السیح، السلام، السید، سید ولد آدم، سید المرسلین، سید الناس، سید الکونین، سید الثقلین، سیف الله المسلول، سید الفریقین، (ش) الشارع، الشافع، الشفیع، الشاکر، الشاہد، الشکار، الشکور، الشمس، الشہید، (ص) الصابر، الصاحب، صاحب الآیات، صاحب المعجزات، صاحب البرہان، صاحب البیان، صاحب التاج، صاحب الجہاد، صاحب الحجہ، صاحب الحطیم، صاحب الحوض المورود، صاحب الخاتم، صاحب الخیر، صاحب الدرجة الرفیعہ، صاحب الرداء، صاحب الازواج الطاہرات، صاحب السجود لرب المحمود، صاحب البرایا، صاحب السلطان، صاحب السیف، صاحب الشرع، صاحب الشفاعة الکبریٰ، صاحب العطایا، صاحب العلامات الباہرات، صاحب العلو والدرجات، صاحب الفضیلہ ، صاحب الفرح، صاحب النقیب، صاحب القضیب الاصغر، صاحب قول لا الٰہ الا الله، صاحب القدم، صاحب الکوثر، صاحب اللواء، صاحب المحشر، صاحب المقام المحمود، صاحب المنبر، صاحب المحراب، صاحب النعلین، صاحب الہراوہ، صاحب الوسیلہ، صاحب المدینہ، صاحب المظہر المشہور، صاحب المعراج، صاحب المغفر، صاحب النعیم، الصادع بماامر، الصادق، الصبور، الصدق، صراط الله، صراط الذین انعمت علیہم، الصراط المستقیم، الصفوح عن الزلات، الصفوة، الصفی الصالح (ض) الضارب بالجام المشلوم، الضحاک الضحوک (ط) طالب، الطاہر، الطیب، طٰس، طٰسم، طٰہٰ، الطیب، (ظ) الظاہر، المظفور، (ع) العابد، العائذ، العادل، العظیم، العافی، العاقب، العالم، علم الایمان، علم الیقین، العالم بالحق، العامل، عبدالله، العبد الکریم، عبدالجبار، عبدالحمید، عبدالمجید، عبدالوہاب، عبدالغفار، عبدالغیاث، عبدالخالق، عبدالرحیم، عبدالرزاق، عبدالسلام، عبدالقادر، عبدالقدوس، عبدالقہار، عبدالمہیمن، العدل، العربی، العروة الوثقیٰ، العزیز، العطوف، العفو، العلیم، العلی، عین الغر، (غ) الغالب، الغفور، الغنی، الغنی بالله، الغیث، الغوث، الغیاث، (ف) الفاتح، الفایح، الفار قلیط، الفاروق، فاروق، الفتاح، الفخر، الفرط، الفصیح، فضل الله، فاتح النور (ق) القاسم، القاضی، القانت، قاید الخیر، قاید الغر المحجلین، القایل، القایم، القتال، القتول، قثم، القثوم، قدم الصدق، القرشی، القریب، القمر، القیم، وکنیتہ ابو القاسم، لانہ یقسم الجنة بین اہلہا (ک) کافة للناس، الکفیل، الکامل فی جمیع امورہ، الکریم، کہیعص ، (ل) اللسان (م) الماجد، ماذون، الماحی، المامول، المسانح، المبارک، المبتہل ، البر، المبشر، مبشر البائسین، المبعوث بالحق، المبلغ، المبین، المتین، المبل المتوبص، المخصوص، المترحم، المتضرع، المتقی، المتلو علیہ، المجتہد ، المتوکل، المتثبت ، مجاب، محبیب، المجتبیٰ، المجیر، المحرض، المحرم، المحفوظ، المحلل، محمد، المحمود، المخبر، المختار، المخصوص بالشرف، المخصوص بالعز، المخصوص بالمجد، المخلص، المدثر، المدنی، مدینة العلم، المذکر، المذکور، المرتضیٰ، المزمل، المرتل، المرنحی، المرسوم، المترفع الدرجات، المر، المردة، المزکی، المزمل، المسیح، المسعود، المستغفر، المستغنی، المستقیم، المسلم، المسلم، المتبادر، المشفع، المشفوع، المسلح، المشہود، المسیر، المصباح، المصارع، المصافح، مصحح، الحسنات، المصدوق، المصطفیٰ، المصلح، المصلی علیہ المصاع، المطہر، المطاع، المطیع، المظفر، المعز، المعصوم، المعقب، المعلم معلم امة، المعلم المعلن المعلی المفتاح، مفتاح، الجنة، المفضال، المفضل، المقدس، المقری، المقسط، المقصوص علیہ، المقفی، مفخل، العشیرات، مقیم السنة بعد الفرة، المکرم، المکتفی المکی، المکین، المکی، الملاحی، القرآن، المنوح، المنادی، المنصر، المنجی، المنذر، المعزول علیہ، المخبا، المتصف، المنصور، النیب، المہر، المومن، المولیٰ، الجوامع الکلم، الموحی الیہ، مودد، الموصل، الموقر، المولیٰ،

المويد، المومن، الموسر، المهاجر، المهتدی، المهدی، المهیمن، المبشر (ن) النابذ، الناجذ الناس، الناسخ، الناشر، الناصح، الناطق، الناهی، نبی الاحمر، نبی الاسود، نبی التوبتہ، نبی الحرمین، نبی الراحتہ، نبی الرحمتہ، الصالح، نبی اللہ، نبی المرحمۃ نبی الملحمۃ، بی الملاحم، النبی، المنجم، النجم الثاقب، نجی اللہ، النذیر، الغیب، نصیح، ناصح، النغمۃ، نعمۃ اللہ، النقیب، النقی، النور، النور الذی لا یطفأ (ہ) الهادی، ہدی، ہدیتہ اللہ، الہاشمی، (و) الوجیہہ، الواسطۃ الواسع الواصل، الواضح، الواعد، الواعظ، الورع، الوسیلہ، الوافی، الوفی، الولی، ولی الفضل، (ی) یثربی، یٰس، صلی اللہ علیہ وسلم وعلیٰ وآلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین۔

کعب احبار سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک اہلِ جنت میں عبدالکریم اور اہل نار میں عبدالجبار، اہل عرش میں عبدالحمید اور فرشتوں میں عبدالمجید نبیوں میں عبدالوہاب شیاطین میں عبدالقہار اور حق کے نزدیک عبدالرحیم، پہاڑوں میں عبدالخالق، خشکی میں عبدالقادر، تری میں عبدالمہیمن، مچھلیوں میں عبدالقدوس، حشرات الارض میں عبدالغیاث، وحشیوں میں عبدالرزاق، درندوں میں عبدالسلام، چوپایوں میں عبدالمؤمن، پرندوں میں عبدالغفار، توریت میں موذ موذ، انجیل میں طاب طاب، صحیفوں میں عاقب، زبور میں فاروق اور اللہ کے نزدیک طٰہٰ ویٰس اور مسلمانوں میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور کہا آپ کی کنیت ابو القاسم ہے کیونکہ آپ جنت کو اہلِ جنت میں تقسیم فرماتے ہیں اور ایسا ہی حسین بن محمد والدامعالی سے کتاب "سوق العروس وانس النفوس" میں منقول ہے۔

آگاہ رہنا چاہئے کہ کسی کا اس میں اختلاف نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اجمل الخلائق، اکرم بشر، سید ولد آدم اور افضل الانبیاء ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو دو قسموں پر تقسیم فرمایا۔ اور مجھے ان دونوں میں بہتر میں رکھا۔ اور یہ دو گروہ وہ ہیں جن کے بارے میں فرمایا "اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ۔" اور میں اصحاب یمین اور اصحاب شمال میں سے بہترین میں رہا اس کے بعد ان دونوں قسموں کو تین پر تقسیم فرمایا۔ "اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَۃِ، اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَۃِ" اور "اَلسَّابِقُوْنَ" تو میں سابقون میں سے ہوں پھر ان قسموں کو قبیلوں میں تقسیم فرمایا تو مجھے اس قبیلہ میں رکھا جو بہترین قبیلہ تھا۔ اور یہ اللہ کے اس قول میں ہے۔ "وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔" تو اولاد آدم کے اتقی میں ہوں اور اللہ عزوجل کے نزدیک اکرم ہوں ولا فخر، اس کے بعد ان قبیلوں کو خاندانوں میں تقسیم کیا تو مجھے بہترین خاندان میں رکھا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے "لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَکُمْ تَطْهِیْرًا۔"

ایک اور حدیث میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزندوں میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو منتخب فرمایا۔ اور اولادِ اسمٰعیل میں سے بنی کنانہ کو اور بنی کنانہ سے قریش کو اور قریش سے بنی ہاشم اور بنی ہاشم سے مجھ کو برگزیدہ فرمایا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ فرمایا اپنے رب کے نزدیک اولاد آدم میں میں مکرم ہوں اور یہ فخریہ نہیں ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے۔ کہ میں اولین و آخرین سب میں مکرم ہوں اور یہ فخریہ نہیں ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جبریل نے حاضر ہو کر کہا میں نے زمین کے مشارق و مغارب کو چھان ڈالا ہے۔ میں نے کسی کو نہ دیکھا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے فاضل تر ہو اور کسی باپ کے فرزندوں کو نہ دیکھا کہ فرزندان ہاشم سے فاضل تر ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو مجھے حضرت آدم علیہ السلام کے صلب میں رکھ کر زمین پر اتارا۔ مطلب یہ کہ جب وہ زمین پر اتارے گئے تو میں ان کی صلب میں تھا اور مجھے حضرت نوح علیہ السلام کے صلب میں کشتی میں رکھا پھر مجھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صلب میں منتقل فرمایا اس

کے بعد مجھے اصلاب کریمہ سے ارحام طاہرہ کی طرف منتقل کیا جاتا رہا یہاں تک کہ میں اپنے والدین کریمین سے باہر آیا۔ اور میرے آباؤاجداد کبھی زنا پر مجتمع نہ ہوئے۔ اور اس مفہوم کی طرف حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں اپنے اس قصیدہ میں اشارہ فرمایا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں انتہائی فصیح و بلیغ کہا ہے۔ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت عباس رضی اللہ عنہ انتہائی غصہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ گویا انہوں نے کافروں سے کوئی ایسی بات سنی تھی جو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت طعن و تشنیع میں کہہ رہے تھے اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا اے عباس رضی اللہ عنہ کس بات نے تم کو غصہ دلایا انہوں نے جو کچھ سنا تھا عرض کیا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوگئے۔ اور منبر پر تشریف لائے اور ان لوگوں سے فرمایا جو وہاں موجود تھے۔ میں کون ہوں۔ سب نے عرض کیا آپ اللہ کے رسول ہیں۔ فرمایا میں محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہوں۔ بلاشک وشبہہ حق تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو مجھے بہترین خلق میں رکھا۔ اور خلق کو دو فرقوں میں یعنی عرب و عجم میں تقسیم کیا تو مجھے بہترین فرقہ یعنی عرب میں برگزیدہ فرمایا۔ اور ان کو قبائل میں تقسیم کیا تو مجھے بہترین قبیلہ میں گردانا اور جب ان کو گھروں میں خاندانوں میں تقسیم فرمایا تو مجھے بہترین گھر میں رکھا۔ لہٰذا از روئے ذات میں بہترین خلق ہوں اور از روئے نسب ان سب میں بہتر ہوں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حق تعالیٰ نے بندوں کے دلوں کی طرف نظر ڈالی تو قلب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان میں پسند فرمایا۔ پھر آپ کو اپنے لئے برگزیدہ فرما کر اپنی رسالت سے سرفراز فرمایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمان والوں اور تمام انبیاء علیہم السلام پر فضیلت دی۔ لوگوں نے پوچھا آسمان والوں پر فضیلت کس طرح ہے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان والوں سے فرمایا "مَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّىٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ۔" ان میں سے جو یہ کہے گا کہ میرے سوا کوئی معبود ہے تو اسے ہم جہنم کی سزا دیں گے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا "اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ۔" گویا کہ تمام آسمان والے معرض خوف عقاب و عتاب میں ہیں۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مغفور و مامون ہیں۔ پھر ان سب لوگوں نے کہا انبیاء علیہم السلام پر آپ کو فضیلت کیسے حاصل ہے۔ فرمایا حق تعالیٰ نے تمام نبیوں کیلئے فرمایا "وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ" ہم نے ہر ایک رسول کو اسکی قوم کی زبان میں بھیجا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا۔ "وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ" اور آپ کو تمام لوگوں کی طرف رسول بنایا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات و کرامات کچھ تو وہ ہیں جن کے انوار و آثار اس عالم میں ظاہر و روشن ہیں اور کچھ وہ ہیں جن کا ظہور آخرت میں روزِ قیامت ہوگا۔ وہ درحقیقت اسی دن ظاہر ہوگا۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم محبوبِ الٰہی سرورِ کائنات اور مظہر فیوض نامتناہی باری تعالیٰ جل وعلا ہیں اور یہ کہ حق تعالیٰ کی جانب سے خلیفہ رب العالمین اور نائب مالک یوم الدین ہیں اور اس دن جو مقام آپ کا ہوگا اور کسی کا نہ ہوگا۔ اور جو عزت و منزلت آپ کی ہوگی کسی کی نہ ہوگی۔ اور بحکم رب العالمین وہ دن آپ ہی کا دن اور حکم آپ ہی کا حکم ہوگا۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى۔" اور یقیناً آخرت آپ کیلئے پہلی سے بہتر ہے اور بہت جلد آپ کا رب اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔

ابواب سابقہ میں جو باتیں مذکور ہوئیں چونکہ وہ قسم اول یعنی اس جہاں سے متعلق تھیں اب ہم کچھ قسم ثانی یعنی آخرت سے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و کمالات بیان کرتے ہیں۔ (وباللہ التوفیق)

باب ہشتم

عالمِ آخرت کے مخصوص درجات اور فضائل وکمالات

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور اکرم سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم **کو** جس طرح ابتدائے آفرینش خلائق میں فضیلت دی اور تخلیق عالم کا آپ کو **مبداو منشاء قرار** دیا اور عالم ارواح میں اول الانبیا علیہم السلام بنایا اور روز الست ساری مخلوق سے پہلے آپ نے جواب الست دے کر اقرار ربوبیت باری تعالیٰ کیا اسی طرح اللہ تعالیٰ نے معاد و آخر کار میں آپ پر فضل وکمال کی مہر ثبت فرمائی تو آپ ہی وہ اول شخص ہیں جن کیلئے اللہ تبارک وتعالیٰ زمین کو شق فرمائے گا اور آپ قبر انور سے اٹھیں گے اور عرصات محشر میں آپ ہی اول شفاعت کرنے والے اور مقبول الشفاعت ہوں گے۔ اور آپ ہی سب سے پہلے جمالِ رب العالمین کی زیارت سے مشرف ہوں گے اور ساری مخلوق اس وقت محجوب اور در پردہ ہوگی۔ اور آپ ہی وہ پہلے نبی ہیں جن کی امت کے بارے میں حکم دیا جائے گا اور آپ ہی سب سے پہلے اپنی امت کے ساتھ صراط سے گزریں گے اور آپ ہی سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے اور داخلۂ جنت میں آپ کی امت تمام امتوں سے مقدم ہوگی۔ اور حق تعالیٰ آپ کو لطیف تحائف اور نفیس ظروف عطا فرمائے گا جو حد عدو شمار سے خارج ہیں۔

حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگوں میں سب سے پہلا شخص میں ہوں جب وہ قبروں سے اٹھائے جائیں گے اور میں ان کا خطیب ہوں گا جب کہ وہ بارگاہِ رب العزت میں حاضر ہوں گے۔ اور میں بشارت دینے والا ہوں گا جب کہ وہ ناامید ہوں گے۔ لواء حمد (حمد کا جھنڈا) میرے ہاتھ میں ہوگا اور اپنے پروردگار کے نزدیک میں اولادِ آدم میں سب سے زیادہ مکرم ہوں۔ یہ فخریہ نہیں ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ میں ان کا قائد ہوں گا جب کہ وہ در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہوں گے اور میں ان کا خطیب ہوں گا جب کہ وہ خاموش ہو جائیں گے۔ اور میں ان کا شفیع ہوں گا جبکہ وہ روک دیئے جائیں گے۔ اور لواء کرم میرے ہاتھ میں ہے اور میرے گرد ہزار ایسے خادم حلقہ باندھے ہوں گے گویا وہ مروارید ناسفتہ ہیں۔ ایک روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا مجھے حلہ بہشتی پہنایا جائے گا اس کے بعد میں جنت کی داہنی جانب کھڑا ہوں گا اس مقام میں میرے سوا کوئی مخلوق ایسی نہیں جو کھڑی ہو اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ فرمایا میں روزِ قیامت بہترین اولادِ آدم ہوں گا۔ اور میرے ہاتھ میں لواء حمد ہوگا۔ اور یہ فخریہ نہیں اس دن تمام بنی آدم ہوں یا ان کے سوا سب میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ فرمایا میں روزِ قیامت لواء حمد اٹھائے ہوئے ہوں گا۔ سب سے پہلے میں ہی جنت کی زنجیر کھٹکھٹاؤں گا۔ پھر وہ میرے لئے کھولی جائے گی اور میں اپنے فقراء مومنین کے ساتھ داخل ہوں گا۔ میں اکرم اولین و آخرین ہوں اور یہ فخریہ نہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں بہترین بنی آدم ہوں روزِ قیامت۔ اور تم مجھے اس حال میں پاؤ گے کہ اللہ تعالیٰ تمام اولین و آخرین کو جمع فرمائے گا اس کے بعد حدیثِ شفاعت بیان کی جو آگے آ رہی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا میں امید رکھتا ہوں کہ میں تمام نبیوں سے از روئے اجر روزِ قیامت عظیم ترین ہوں گا۔ دوسری حدیث میں ہے کہ فرمایا کیا تم خوش نہیں ہو کہ تم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام جلوہ فرما ہوں۔ اس کے بعد فرمایا روزِ قیامت وہ میری امت میں داخل ہوں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کہیں گے تم میری دعا ہو اور تم میری اولاد میں ہو اب مجھے تم اپنی امت میں داخل کر لو اور عیسیٰ علیہ السلام کہیں گے تمام انبیاء علاتی بھائی ہیں کیونکہ ان کے باپ ایک ہیں اور مائیں متعدد ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام کہیں گے تم

میرے بھائی ہو۔ میرے اور آپ کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے اوروں سے میں آپ سے زیادہ قریب ہوں اور یہ بھی فرمایا کہ روزِ قیامت میں اولادِ آدم کا سردار ہوں حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیاو آخرت میں ان کے سردار ہیں۔ روزِ قیامت کی تخصیص اس بنا پر ہے کہ اس دن اس کے آثار کا ظہور زیادہ ہوگا۔ اور اس بنا پر بھی کہ اس روز آپ نفع خلائق میں منفرد و یگانہ ہوں گے۔ جس وقت کہ تمام لوگ مجتمع ہوکر آپ کے پاس آئیں گے اور آپ کی پناہ لیں گے اس وقت آپ کے سوا ان کا کوئی سید و سردار نہ ہوگا۔ سید اسے کہتے ہیں جس کے آگے اپنی ضروریات و حوائج کو پیش کیا جائے اس وقت آپ تمام بشر اور انسانوں میں منفرد ہوں گے۔ اس لئے کہ کوئی ایک بھی آپ کا مزاحم نہ ہوگا۔ اور نہ کوئی اس کا ادعا کر سکے گا۔ یہ انفرادیت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مانند ہوگی کہ اس دن حق تعالیٰ فرمائے گا "لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ" (آج کس کی بادشاہت ہے، اللہ ہی واحد قہار کی ہے) حالانکہ دنیاو آخرت میں بادشاہت اللہ تعالیٰ جل جلالہ ہی کی ہے لیکن آخرت میں مدعیوں کے وہ دعوے فنا ہوجائیں گے جو دنیا میں باعتبار ظاہر ادعا کرتے تھے ایسے ہی حضور اکرم سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت میں تمام لوگ آپ کی پناہ چاہیں گے تو آپ آخرت میں بلا دعوے شرکت غیرے ان سب کے سید و سردار ہوں گے۔ اسے صاحب الشفاء نے بیان کیا ہے۔

مواہب لدنیہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے پہلے میرے لئے زمین کھلے گی اس کے بعد ابو بکر رضی اللہ عنہ کیلئے اس کے بعد عمر کیلئے رضی اللہ عنہ۔ پھر میں اہلِ بقیع پر آؤں گا تو وہ قبروں سے اٹھیں گے۔ اس کے بعد اہل مکہ کی خاطر انتظار کروں گا۔ یہاں تک کہ دونوں حرموں کے درمیان کے لوگ محشور ہوں۔ ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے اور حکیم ترمذی کی "نوادر الاصول" میں ابو حاتم کی روایت از ابن عمر رضی اللہ عنہما مذکور ہے کہ ایک دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کاشانہ اقدس سے اس شان سے تشریف لائے کہ آپ کی داہنی جانب حضرت ابو بکر اور بائیں جانب حضرت عمر رضی اللہ عنہما تھے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسی شان کے ساتھ میں قیامت میں اٹھایا جاؤں گا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم براق پر سوار حشر میں تشریف لائیں گے اور تمام انبیاء دابہ پر ہوں گے۔ اور حضرت صالح علیہ السلام اپنی اونٹنی پر محشور ہوں گے اور حضرت خاتون جنت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دونوں صاحبزادے یعنی حضرت امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما میرے دونوں ناقہ عصباء اور قصواء پر محشور ہوں گے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ جنتی ناقہ پر حشر کئے جائیں گے۔

طوافِ فرشتگان بر قبرِ حضور: کعب احبار کی حدیث میں ہے کہ روزانہ صبح طلوعِ آفتاب سے قبل ستر ہزار فرشتے آسمان سے اترتے ہیں اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی قبرِ انور کا طواف کرتے ہیں۔ وہ بازوؤں کو جنبش دیکر آپ پر درود و سلام عرض کرتے ہیں اور شام کے وقت آسمان پر چڑھ جاتے ہیں پھر اور ستر ہزار فرشتے اترتے ہیں روزانہ اسی طرح ہوتا رہے گا۔ یہاں تک کہ جس دن زمین کھولی جائے گی اور میں باہر آؤں گا تو ستر ہزار فرشتوں کا جھرمٹ مجھے گھیرے ہوگا اور مجھے وہ اس شان سے بارگاہِ رب العزت میں لے جائیں گے جیسے دلہن کو براتی دولہا کے گھر لے جاتے ہیں۔

جامع الاصول میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں ہی سب سے اول ہوں جس کے لئے زمین شق ہوگی پھر حلہ بہشتی مجھے زیب تن کرایا جائے گا۔ ظاہر روایت یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے اولیت انشقاق ارض اور کسوتِ حلہ دونوں میں ثابت ہے اور یہ جو دوسری روایت میں آیا ہے کہ "مخلوق میں سب سے پہلے جسے حلہ پہنایا جائے گا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں اور بیہقی نے اور زیادہ نقل کیا ہے کہ خلق میں سب سے پہلے جسے حلہ پہنایا جائے گا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں کہ ان کو جنتی

حلہ پہنایا جائے گا۔ پھر کرسی لائی جائے گی اور عرش کی داہنی جانب رکھی جائے گی اس کے بعد مجھے حلہ بہشتی پہنایا جائے گا۔ قبل اس کے کہ کسی بشر کو حلہ بہشتی تقسیم کئے جائیں اور مجھے عرش کی داہنی جانب کرسی پر بٹھایا جائے گا۔ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کو پہلے حلہ بہشتی پہنانے کی تخصیص سے لازم نہیں آتا کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہوں گے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قبر انور سے اپنے ہی لباس میں جلوہ افروز ہوں اور تعظیم و تکریم کی غرض سے ان برہنوں کے مقابلہ میں جو قبروں سے برہنہ نکلیں گے آپ کو حلہ بہشتی ان سے پہلے پہنایا جائے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو برہنگی کی وجہ سے سب سے پہلے پہنایا جائے گا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولیت، حلہ کے پہنانے میں بقیہ خلائق سے ہوگی۔ اور حلیمی نے یہ جواب دیا جیسا کہ ظاہر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پہلے حلہ پہنایا جائے گا اور ان کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنایا جائے گا تو معلوم ہونا چاہئے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حلّہ ان سے اعلیٰ، انفس، اور مجلّٰی ہوگا اور اس کی نفاست کی خبر حدیث میں دی گئی ہے۔

لیکن یہ جو اولیت کا فقدان نظر آرہا ہے اس بارے میں بندۂ مسکین یعنی صاحب مدارج رحمہ اللہ کہتا ہے اللہ تعالیٰ انہیں مقام تمکین میں ثابت قدم رکھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کیلئے حلہ پہنانے میں تقدیم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ابوت کی رعایت سے ہے کیونکہ آباء اس قسم کے امور میں اولاد پر مقدم و سابق ہوتے ہیں۔ اور یہ امور حسیہ میں جزئی فضیلت ہے۔ اور دیگر فضائل معنویہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی فضیلت حاصل ہے۔ لہٰذا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کرسی پر بٹھایا جائے گا نہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو۔

اور بعض کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کیلئے حلہ پہنانے کی تقدیم نمرود کا آپ کو عریاں کرنے کے بدلے میں ہے۔ جس وقت کہ آپ کو آگ میں ڈالا گیا تھا۔ کذا قیل واللہ اعلم۔ "اور مشہور یہ ہے کہ لوگوں کا حشر ننگے پاؤں، ننگے بدن اور ننگے سر ہوگا۔ جیسا کہ بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے۔ اور حق تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ "کَمَا بَدَأْنَا اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُہٗ"۔ " جیسا ہم نے پہلی مرتبہ پیدا فرمایا۔ اسی طرح دوبارہ انہیں اٹھائیں گے۔ اس ارشاد کا اشارہ بھی اسی طرف ہے لیکن ابو داؤد اور ابن حبان نے روایت کی ہے کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے اپنے انتقال کے وقت نئے کپڑے طلب فرمائے۔ اور پہنے اس کے بعد انہوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ فرماتے تھے میت کو ان کپڑوں میں اٹھایا جائے گا جن میں وہ مرتا ہے اور صاحب مواہب لدنیہ حارث بن ابی اسامہ اور احمد منیع سے روایت کرتے ہیں کہ مردے اپنے کفنوں میں اٹھائے جائیں گے۔ اور انہیں میں ایک دوسرے سے ملاقات کریں گے۔

ان حدیثوں کے اور بخاری کی حدیث کے درمیان جمع و تطبیق میں کہا گیا ہے کہ بعض مردے ننگے اٹھیں گے اور بعض کفن کے لباس وغیرہ میں، اور بعض کہتے ہیں کہ مراد سیآت اعمال یعنی بدیاں ہیں جن پر انہیں اٹھایا جائے گا اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ تاویل کو نہ پا سکے اور انہوں نے ظاہر حدیث پر عمل فرمایا۔ اور بعض اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ہیں جو اہل ظواہر میں سے تھے۔ اور وہ تاویلات کو نہیں پاتے تھے۔ جیسے کہ عدی بن حاتم نے روزے میں "سفید و سیاہ ڈورے" کی تاویل کو نہ پایا۔ تورپشتی نے یہی کہا ہے ان حدیثوں پر مزید بحث مشکوٰۃ شریف کی شرح میں کی گئی ہے۔ (واللہ اعلم)

لواء الحمد۔ (تنبیہہ) ۔ الطیبی فرماتے ہیں کہ "لواء الحمد" سے مراد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد اور مقام محمود میں انفرادیت اور شہرت ہے جیسا کہ شفاعت کے ضمن میں معلوم ہوتا ہے اور اہل عرب شہرت کے مواضع پر لواء کو وضع کرتے ہیں جیسا کہ مروی ہے: "لِکُلِّ غَادِرٍ لِوَآءٌ" (ہر غدار کیلئے جھنڈا ہے) اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک میں جھنڈا

ہی ہو اور اس کا نام "لواء الحمد" ہو۔

صاحب مواہب لدنیہ طبرانی سے "ریاض النضرۃ" میں ایک حدیث لاتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی مرتضٰی سے فرمایا اے علی! تم نہیں جانتے کہ میں وہ پہلا شخص ہوں گا جو روزِ قیامت خطبہ دے گا تو میں عرش کی داہنی جانب اس کے سایہ میں کھڑا ہوں گا اور مجھے جنتی حلہ پہنایا جائے گا آگاہ اور خبردار ہو کہ میری امت سب سے پہلی امت ہوگی جس کا روزِ قیامت حساب کیا جائے گا اس کے بعد میں تمہیں بشارت دیتا ہوں کہ تم وہ پہلے شخص ہو کہ تمہیں بلایا جائے گا اور تمہیں لوگوں کا جھنڈا سپرد کیا جائے گا۔ جس کا نام لواء حمد ہے۔ کیونکہ آدم اور تمام خلق کسی سایہ کی متلاشی ہوگی۔ وہاں میرے جھنڈے کا سایہ ہوگا۔ اور میرے لوائے مبارک کی درازی ایک ہزار چھ سو سال کی مسافت کے برابر ہوگی۔ اس کا سنان یاقوت احمر کا اور اس کا قبضہ سفید چاندی کا اور اس کا ڈنڈا سبز مروارید کا ہوگا۔ اس کی زلفیں تین نور کی ہوں گی ایک زلف مشرق میں دوسری مغرب میں تیسری دنیا کے درمیان میں اور ان میں تین سطریں تحریر ہوں گی ایک پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، دوسرے پر الحمد للہ رب العالمین، تیسرے پر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اور ہر سطر کی درازی ہزار سال کے برابر اور اس کی پہنائی بھی ہزار سال کے برابر، تو اے علی رضی اللہ عنہ اسے میں تمہارے سپرد کروں گا۔ اور امام حسن رضی اللہ عنہ تمہارے داہنی جانب اور امام حسین رضی اللہ عنہ تمہارے بائیں کھڑے ہوں گے۔ یہاں تک کہ تم میرے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان عرش کے سایہ میں کھڑے ہوگے۔ اور تمہیں جنت کا جوڑا پہنایا جائے گا۔ ابن سبع نے خصائص میں روایت کیا ہے کہ عبد اللہ بن سلام نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے "لواء حمد" کی توصیف میں دریافت کیا کہ وہ کیسا ہوگا؟ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کی درازی ایک ہزار چھ سو برس کی مسافت ہے۔ (آخر حدیث تک)

صاحب مواہب لدنیہ فرماتے ہیں کہ حافظ قطب الدین حلبی نے کہا ہے کہ محب بن البہائم نقل کرتے ہیں کہ یہ حدیث موضوع ہے اور اس حدیث میں وضع کے آثار ہیں واللہ اعلم بحقیقۃ لواء الحمد۔ بندۂ مسکین عفی اللہ عنہ (صاحب مدارج) کہتا ہے کہ ان کا قول "واللہ اعلم بحقیقۃ لواء الحمد" حق ہے لیکن حدیثوں میں تعبیر حقائق، ان صورتوں کے امثال کے واقع ہے جس طرح کہ لوح و قلم میں واقع ہوا ہے کہ وہ زبرجد کا ہے یا یاقوت کا۔ اور حاملینِ عرش کے بارے میں ہے کہ ایک کان کی لو سے دوسرے کان کی لو تک دو سو سال کی مسافت ہے اور ایک روایت میں سات سو سال ہے اسی طرح کی بہت سی مثالیں ہیں اور ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں جو درجہ صحت اور پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہیں اور وہ شارع علیہ السلام سے منقول ہیں اور وہ جوان سے مراد لیا جاتا ہے اگر وہ واقعی ان کی صحیح تاویل مروی ہے تب بھی ہم ایمان لاتے ہیں اور عقلِ کوتاہ اندیش کے حکم استحالہ واستبعاد کو ترک کر دیتے ہیں اور ایسے امور کی حقیقت کو حق تعالٰی پر تفویض کر دیتے ہیں اور اگر محدثین نے ان کی سندوں میں کلام کیا ہے وہ دوسری بات ہے اور اگر ان کے معانی میں استبعاد و استحالہ ظاہر کریں تو کمالِ قدرتِ قادر اس کا جواب دیتی ہے۔ (واللہ اعلم)

صاحب مواہب لدنیہ فرماتے ہیں کہ عرب کے عرف میں جھنڈوں کی حفاظت کی جاتی ہے مگر یہ جھنڈا لشکر کے سپہ سالار اور رئیس و سردار کے پاس ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ اس کی اجازت سے کسی دوسرے کے پاس بھی ہو اور اہلِ عرب جھنڈے کا اتباع کرتے اور اس کی جنبش پر حرکت کرتے اور جس جانب وہ جھکے اس کی طرف جھک جاتے ہیں۔ اور اہل عرب جنگوں میں جھنڈے کی طرف نگاہ نہیں رکھتے بلکہ جو جھنڈا اٹھائے ہوتا ہے اسے قتال سے نہیں روکتے بلکہ اس کے ساتھ مل کر شدید قتال کرتے لہٰذا ہر شخص پر لازم نہیں تھا کہ جھنڈے کی حفاظت کرتا۔ جس طرح کہ روز خیبر علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ کو جھنڈا دیا گیا اور فرمایا کہ کل میں اس شخص کو جھنڈا دوں گا جو خدا اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دوست رکھتا ہے اور خدا اور اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اسے دوست

رکھتے ہیں ایسا ہی صاحب مواہب نے کہا ہے اور غزوۂ موتہ میں ہے کہ پہلے حضرت جعفر بن ابی طالب نے جھنڈا پکڑا اور قتال کیا وہ شہید ہوئے تو ان کے بعد عبداللہ بن رواحہ نے جھنڈا اٹھایا انہوں نے جنگ کی پھر وہ بھی شہید ہوگئے تو ان کے بعد خالد بن ولید نے جھنڈا اٹھایا اور قتال کیا۔ اور فتح پائی (کما قال) تو معلوم ہوا کہ جھنڈا رئیس لشکر اور سردار فوج کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم بحقیقۃ الحال)

حوضِ کوثر۔ وصل:۔ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حوض کوثر کے ساتھ خصوصی فضیلت بخشی۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے حوض کی درازی ایک ماہ کی مسافت ہے۔ اور اتنی ہی اس کی چوڑائی ہے اور اس کا پانی شہد سے زیادہ شیریں ہے اور وہ موتی اور یاقوت پر بہتا ہے اور دودھ سے زیادہ سفید ہے اور ایک روایت میں ہے کہ چاندی سے زیادہ سفید ہے اور بعض روایتوں میں برف سے زیادہ سفید آیا ہے۔ اس کی خوشبو مشک نافہ سے زیادہ تیز ہے۔ اور اس کے پیالے آسمان کے ستاروں کی مانند ہیں۔ اور گرداگرد موتیوں کے قبے ہیں اور مسافت حوض کی تحدید میں احادیث میں متعدد جگہ ذکر پایا جاتا ہے۔ ہر جماعت نے اپنے شہروں میں متعارف مسافتوں سے علامتیں بتائی ہیں۔ اور ظاہر یہ ہے کہ ان سب کی مسافت یا تو یکساں ہے یا قریب قریب ہے۔ اور اگر کہیں فرق بھی نظر آتا ہے تو ان کا مقصود بعد مسافت کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے اور ایک تخمینہ اور قریبی اندازہ بتانا ہوتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ قلیل مسافت کے ذکر میں کثیر مسافت کے ساتھ منافات اور مدافعت نہیں ہے یہ طریقہ انداز شارح کرمانی کا ہے۔ وہ متعدد مقامات میں ایسی ہی توجیہہ کرتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ابتداء میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قلیل مسافت کی خبر دی تھی بعد ازاں کثیر مسافت بیان فرمائی اور حق تعالیٰ نے آپ کو بتدریج تھوڑی تھوڑی وسعت کی تفصیل بیان فرمائی لہٰذا مسافتِ طویلہ پر اعتماد کرنا چاہئے۔ اور بعض یہ گمان رکھتے ہیں کہ یہ اختلاف بجہت اضطراب رواۃ ہے جو روایت میں ہے حالانکہ ایسا نہیں (واللہ اعلم)

حدیث پاک میں ہے کہ حوض کوثر کی چوڑائی اس کے طول کی مانند ہے اور اس کی گہرائی ستر ہزار فرسخ کی ہے اور حدیث میں ہے جو بھی اس کا پانی پئے گا وہ کبھی پیاسا نہ ہوگا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کلام کا ظاہری پہلو یہ ہے کہ اس میں سے پانی بعد از حساب اور بعد از نجات نار پینا ہوگا اس لئے کہ جس کا یہ حال ہوگا وہ کبھی پیاسا نہ ہوگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسے آگ کا عذاب نہ دیا جائے گا اس لئے کہ تشنگی اور حرارت و حرقت، دخول نار کے ساتھ لازم ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ اس پر اتنا ہی عذاب کیا جائے کہ اسے پیاس نہ لگے اور بعض کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دو حوض ہیں، ایک موقف یعنی عرصاتِ محشر میں اور دوسرا جنت میں۔ اور ان دونوں کو کوثر کہتے ہیں اس بنا پر کہ اس سے مدد کی گئی ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ہر نبی کے لئے اس کے فضل و مرتبہ کے مطابق ایک ایک حوض ہے۔ اور اگر یہ روایت ثابت ہو جائے تو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وہ حوض مختص ہے۔ جس کا پانی ان کے حوضوں میں بہتا ہوگا اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حوض کی مانند کوئی اور حوض منقول نہیں ہے اور آپ پر سورۂ الکوثر میں اس کی احسان مندی واقع ہے کہ "اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ" (بیشک ہم نے آپ کو کوثر عطا فرمایا) اور مشہور یہی ہے کہ حوض حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور قرطبی سے منقول ہے کہ ہر مکلف پر اس کا علم اور اس کی تصدیق واجب ہے اس لئے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حوض کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے جو کہ احادیث صحیحہ اور مشہورہ میں ثابت شدہ ہے کیونکہ ان تمام روایات سے علم قطعی حاصل ہوتا ہے اور تیس سے زیادہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے وہ مروی ہے اور ان میں سے بیس تو بخاری و مسلم میں مذکور ہیں اور بقیہ ان کے ماسوا مجموعہ احادیث میں ہیں اور اتنے ہی تابعین نے صحابہ سے یہ روایتیں لی ہیں۔ اور تابعین سے تبع تابعین نے۔ یہاں تک کہ سلف و خلف کا اس پر اجماع واقع ہے۔

اور مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ میرے پاس میری امت میرے حوض پر مجتمع ہوکر آئے گی اور میں اوروں کو اس سے روکتا ہوں گا۔ اہل علم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے حوض سے روکنے کی حکمت میں کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہر امت کیلئے اپنے نبی کا حوض ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ روکنا از روئے انصاف اور اپنے بھائیوں یعنی نبیوں کی رعایت میں ہوگا نہ کہ جھڑکنے اور بخل سے روکنے کی وجہ سے اور بجائے خود وہ جگہ امن کی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود اجود الاجودین اور رحمۃ للعالمین ہیں اور یہ امکان بھی ہے کہ آپ انہیں روکیں جو اس کے پینے کے مستحق نہ ہوں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے حوض کے چار کنارے ہیں ایک کنارہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سپرد ہوگا دوسرا حضرت فاروق عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے اور تیسرا حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے اور چوتھا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سپرد ہوگا لہٰذا جو محبّ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتا ہے وہ اسے پانی نہیں پلائیں گے اور جو محبّ علی رضی اللہ عنہ ہے اور وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ وغیرہ سے بغض رکھتا ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اسے پانی نہیں پلائیں گے اسے ابو سعید نے شرف النبوۃ میں اور الغیلانی نے روایت کیا ہے۔ ایسا ہی مواہب میں منقول ہے اور مشہور یہ ہے کہ ساقی کوثر حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ ہوں گے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے دشمنی رکھے گا میں اسے اس کا پانی ہرگز نہیں پلاؤں گا۔ (واللہ اعلم)۔

فضیلتِ شفاعت اور مقام محمود۔ وصل۔ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شفاعت اور مقام محمود سے فضیلت مرحمت فرمائی۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا۔" (عنقریب آپ کا رب آپ کو مقام محمود پر کھڑا فرمائے گا) اور لفظ "عسٰی" خواہش دلانے کیلئے ہے۔ اور کسی کو کسی چیز کی طمع پیدا کرنے کیلئے ہے۔ اور اسے اس سے محروم رکھنا نقص اور باعثِ شرم ہے۔ اور حق سبحانہ وتعالیٰ اس سے زیادہ کریم ہے کہ وہ کسی کو طمع دے اور کسی کو امیدوار بنائے پھر اسے نہ دے اور محروم رکھے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے کسی نے "مقام محمود" کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا وہ مقام شفاعت ہے اور عرش کی داہنی جانب اس جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کھڑا ہونا ہے جہاں آپ کے سوا کوئی نہیں کھڑا ہوگا آپ پر اولین و آخرین رشک و غبطہ کریں گے۔ اسی کی مانند کعب احبار اور حسن بصری سے مروی ہے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ یہ وہ مقام ہے جہاں میں اپنی امت کی شفاعت کروں گا اور فرمایا کہ مجھے اختیار دیا گیا کہ یا تو اپنی نصف امت کو بغیر حساب و کتاب جنت میں داخل کروں یا شفاعت کو اختیار کروں تو ان دونوں میں سے میں نے شفاعت کو اختیار کیا اس لئے کہ یہ اعم و اشمل ہے اور فرمایا کیا تم یہ گمان رکھتے ہو کہ شفاعت متقیوں کیلئے ہوگی؟ نہیں بلکہ گناہ گاروں اور خطا کاروں کیلئے بھی ہوگی اور یہ شفاعت عذاب کو دور کرنے کیلئے ہے۔ لیکن متقیوں کے درجات کی بلندی کیلئے بھی شفاعت ہوگی۔

صاحب مواہب لدنیہ واحدی سے نقل کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ مقام محمود مقام شفاعت ہے۔ جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں فرمایا "هُوَ الْمَقَامُ الَّذِیْ اَشْفَعُ فِیْهِ لِاُمَّتِیْ۔" یہ وہ مقام ہے جہاں میں اپنی امت کی شفاعت کروں گا۔ اور ابن الخطیب امام فخرالدین رازی سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ لفظ محمود اپنے معنی کی طرف مشعر ہے اس لئے کہ انسان اس وقت محمود ہوتا ہے جب کہ کوئی تعریف کرنے والا اس کی تعریف کرے۔ اور تعریف نہیں ہوتی مگر انعام پر اور مقام شفاعت ایسا مقام ہے کہ جہاں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ مخلوق پر عظیم ترین نعمتیں پہنچیں گی تو ساری مخلوق

آپ کی حمد کرے گی اور ثنا کریگی۔ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تبلیغ احکام اور تعلیم شرائع کے سبب محمود ہیں لیکن اس نرالے مقام میں حمد کامل اور نفع عظیم حاصل ہوگا۔ اس لئے کہ عتاب و عذاب سے چھڑانا اور سعی فرمانا زیادتی اجر و ثواب میں سعی کرنے سے اعظم ہے۔ اور دفع ضرر میں ان کی حاجتوں کو پورا کرنا حصول نفع میں ضرورتوں کو پورا کرنے سے زیادہ بلند و بالا ہے۔ (انتہی)۔

مخفی نہ رہنا چاہئے کہ حمد کی تعریف یہ مشہور ہے کہ حمد یا تو انعام و اکرام پر ہوگی یا اس کے بغیر۔ اور وہ حمد جو انعام و اکرام پر ہو وہ شکر ہے کیونکہ واضح بات ہے کہ انعام دینے والے منعم کی تعظیم انعام نعم کی حیثیت سے ہوتی ہے اور حمد کا ایک فرد شکر ہے۔ امام رازی کی مراد اس جگہ یہی حمد ہے یا وہ حمد جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے ہوگی۔ وہ انعام کے ساتھ مخصوص ہے۔ لیکن وہ جو زبان سے ہو۔ اور اگر حمد شکر کے مترادف و ہم معنی ہو تو امام کے نزدیک اس کی صورت بھی یہی ہے۔ اس لئے کہ وہ صاحب اصطلاح ہیں۔ انہیں حق ہے کہ جو چاہے اصطلاح رکھیں لیکن یہ جو آیا ہے کہ الحمد راس الشکر (حمد شکر کا سر ہے) تو اس سے وہ حمد مدلول ہے جس کا ایک فرد شکر ہے اور وہ دیگر افراد سے بالاتر ہے لہٰذا اس جگہ یہ بات نکلی کہ حمد اور شکر کے درمیان عام خاص من وجہ کی نسبت ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان فضل و کمال اور عظمت و جلال کے مقامات میں محمود اور مثنیٰ علیہ ہیں۔ جن کو حق تعالیٰ نے عطا فرمایا۔ اور آپ کیلئے اس دن کو مخصوص فرمایا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ مجھے عرش کی داہنی جانب کھڑا فرمائے گا اور ایک روایت میں عرش پر اور ایک روایت میں کرسی پر ہے اور جنت کی کنجی آپ کے سپرد فرمائے گا اور آپ کے ہاتھ میں لواء حمد دیگا۔ اور شفاعت ان کمالات میں کا ایک جزو ہے جس سے ساری مخلوق کو عظیم نفع پہنچے گا۔ لہٰذا اگر مقام محمود سے روز قیامت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کھڑا ہونا اور آپ کا علو درجہ اور مخلوق کو فائدہ اور نفع پہنچانا جو کہ شفاعت وغیرہ میں شامل ہے مراد لیا جائے تب بھی درست ہوگا اور مجاہد سے ایک غریب روایت ہے کہ حق تعالیٰ سبحانہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ساتھ عرش پر بٹھائے گا۔ اور مقام محمود سے یہی مقام مراد ہے۔ واحدی کہتے ہیں کہ یہ قول ردی موحش اور قطیع ہے۔ از روئے لفظ بھی اور از روئے معنی بھی لیکن از روئے لفظ اس بنا پر کہ بعث کے معنی اٹھانا اور بھیجنا ہے۔ اور یہ اجلاس یعنی بٹھانے کی ضد ہے۔ اور آیۂ کریمہ میں "مقاماً محموداً" فرمایا گیا ہے نہ کہ "مقعداً محموداً۔" اور از روئے معنی اس بنا پر کہ رب العزت جل و علا پر جلوس کا اطلاق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کے ساتھ جلوس میں معیت، مکان وحدانیت اور جہت کو مستلزم ہے۔

بندۂ مسکین (صاحب مدارج) ثبتہ اللہ فی مقام الصدق والیقین کہتا ہے کہ مخفی نہ رہنا چاہئے کہ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو متشابہات میں سے ہوگی اور بایں تاویل ماؤل ہوگی جو (استویٰ علی العرش" میں تاویل کی جاتی ہے۔ یا جس طرح کہ آیاتِ کریمہ "عِنْدَ رَبِّکَ" اور عِنْدَ مَلِیْکٍ مُّقْتَدِرٍ" وغیرہ آیتوں میں عند کے معنی میں کہتے ہیں کہ یہ درجہ رتبہ اور مرتبہ کی حیثیت سے ہے نہ کہ مکان میں۔ اور شیخ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ مجاہد کے قولٌ یُجْلِسُہٗ رَبُّہٗ مَعَہٗ عَلَی الْعَرْشِ" (بٹھائے گا آپ کو آپ کا رب اپنے ساتھ عرش پر) میں فرماتے ہیں کہ یہ نہ برینائے نقل مدفوع ہے اور نہ از جہت نظر۔ ان کا اشارہ اسی طرف ہے جس کا ذکر ابھی کیا گیا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ فرمایا حق تعالیٰ روز قیامت کرسی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بٹھائے گا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو پروردگار عالم ہوگا۔ یہ روایت بھی پچھلی روایت کی مانند انہیں معنی پر محمول ہوگی۔ حاصل کلام یہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ مقام عطا فرمائے گا جو کسی کو آپ کے سوا حاصل نہیں ہے۔ اور روز قیامت حکم خدا ہی کا ہوگا۔ اور اس کی نیابت و خلافت خاص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوگی۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

حدیثِ شفاعت: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت فرمانے کے بارے میں حضرت انس، حضرت ابو ہریرہ اور دیگر

صحابہ کرام علیہم الرضوان کی حدیثیں مشہور ہیں۔ اور کتب ستہ وغیرہا میں مذکور ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں تمام آدمیوں کا سردار ہوں روز قیامت۔ تم معلوم کرو گے کہ یہ سرداری کیسی ہے تو حق تعالیٰ اولین و آخرین کو روز قیامت جمع فرمائے گا۔ پھر انہیں ایسا غم والم اور شدت و سختی پہنچے گی جس کو برداشت کرنے کی ان میں طاقت نہ ہوگی۔ ناچار آپس میں کہیں گے تم نہیں دیکھ رہے کہ کتنی سختی و شدت میں تم سب مبتلا رہے ہو کیوں نہیں ایسے کو تلاش کرتے جو بارگاہ رب العزت میں تمہاری سفارش اور شفاعت کرے۔ پھر وہ ایک دوسرے سے کہیں گے کہ آدم علیہ السلام تم سب کے باپ ہیں ان سے ملو۔ وہ سب مجتمع ہو کر آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور عرض کریں گے اے آدم تم ہم سب آدمیوں کے باپ ہو اللہ تعالیٰ نے تم کو اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا اور اپنی جانب سے تم میں روح ڈالی۔ اور تمام فرشتوں سے تمہیں سجدہ کرایا۔ اور اپنی جنت میں تمہیں ٹھہرایا اور ہر چیز کے اسماء تعلیم فرمائے۔ اب بارگاہِ رب العزت میں ہماری شفاعت فرمایئے کیا نہیں دیکھ رہے کہ ہم کس حال میں ہیں اور ہم کس سختی و مصیبت میں مبتلا ہیں۔ آپ ہمیں اس مصیبت سے چھٹکارا دلایئے۔ اس پر حضرت آدم علیہ السلام فرمائیں گے بلاشبہ ہمارے رب نے آج ایسے غضب کا اظہار فرمایا ہے کہ اس جیسا پہلے غضب کا اظہار نہ فرمایا تھا اور نہ اس کے بعد کبھی فرمائے گا مگر حق تعالیٰ نے مجھے درخت کے پھل کھانے کی ممانعت فرمائی تھی مگر مجھے زلّت ہوئی نفسی نفسی (مجھے اپنی ہی فکر ہے مجھے اپنی ہی فکر ہے) جاؤ میرے سوا کسی اور سے فریاد کرو اور نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ پھر وہ سب نوح علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور عرض کریں گے آپ پہلے رسول ہیں جن کو حق تعالیٰ نے زمین پر بھیجا اور حق تعالیٰ نے آپ کا نام "عبد شکور" رکھا۔ کیا آپ ہمارا حال ملاحظہ فرما نہیں فرما رہے کہ ہم کس حال کو پہنچ گئے ہیں اور کیا آپ نہیں دیکھ رہے کہ ہم کو کتنی شدت و سختی در پیش ہے۔ آپ کیوں اپنے رب تعالیٰ کے حضور ہماری شفاعت نہیں فرماتے۔ اس پر حضرت نوح علیہ السلام فرمائیں گے میرے رب نے آج وہ قہر و غضب فرمایا ہے کہ ایسا نہ کبھی پہلے کیا اور نہ آئندہ کرے گا۔ نفسی، نفسی، پھر حضرت نوح علیہ السلام اپنی اس گفتگو کو یاد کریں گے جو انہوں نے اپنے بیٹے کی نجات کیلئے نادانستگی میں حق تعالیٰ سے کی تھی اور ایک روایت میں ہے کہ وہ اپنی اس دعا کو یاد کریں گے جو اپنی امت کے غرق کر دیئے جانے کیلئے کی تھی کہیں گے کہ تم حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ وہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئیں گے۔ اور عرض کریں گے آپ اہل زمین میں اللہ کے نبی اور اس کے خلیل ہیں۔ اپنے رب کے حضور ہماری شفاعت فرمایئے۔ آپ نہیں ملاحظہ فرما رہے کہ ہم کس سختی میں پڑے ہیں اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام فرمائیں گے کہ میرے رب نے آج وہ غضب فرمایا کہ اس جیسا نہ پہلے کبھی کیا اور نہ آئندہ کرے گا۔ مگر بات یہ ہے کہ مجھ سے (ظاہری شکل میں) تین دروغ سرزد ہوئے۔ پھر وہ اسے یاد کر کے فرمائیں گے نفسی نفسی۔ جاؤ میرے سوا کسی اور کو تلاش کرو۔ بہتر ہے کہ تم موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ کیونکہ وہ کلیم اللہ ہیں اللہ نے ان سے بے واسطہ کلام فرمایا ہے۔ اور قریب کر کے طویل گفتگو فرمائی ہے پھر وہ سب بارگاہِ موسوی میں حاضر ہو کر عرض کریں گے اے موسیٰ علیہ السلام آپ خدا کے رسول ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی رسالت اور اپنے کلام سے سرفراز فرمایا ہے کیا آپ ملاحظہ نہیں فرما رہے کہ ہم کتنی سختی میں مبتلا ہیں اپنے رب کے حضور ہماری شفاعت فرمایئے۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے میرے رب نے آج وہ غضب فرمایا ہے کہ ایسا نہ پہلے کیا اور نہ کرے گا۔ میں شفاعت کرنے کا اہل نہیں کیونکہ میں نے ایک ایسی جان ہلاک کی ہے جس کا مجھے حکم نہ دیا گیا تھا۔ نفسی نفسی۔ میرے سوا کسی اور کے پاس جاؤ۔ تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ کیونکہ وہ اللہ کی روح اور اس کے کلمہ ہیں تو وہ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور عرض کریں گے "اے عیسیٰ آپ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں جسے آپ کی والدہ کی جانب القا فرمایا اور آپ نے مہد میں لوگوں سے گفتگو فرمائی۔ آپ ملاحظہ نہیں فرما رہے کہ ہم کس مصیبت

میں پڑے ہوئے ہیں اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے میرے رب نے آج وہ غضب فرمایا ہے کہ ایسا نہ پہلے کیا اور نہ کرے گا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خطبہ کا ذکر نہیں۔ مگر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ وہ فرمائیں گے (لوگوں نے مجھے اللہ کے سوا خدا بنا رکھا تھا) میری اس پر گرفت ہو تو میں شفاعت کرنے کا اہل نہیں نفسی نفسی۔ جاؤ تم حضور اکرم سید عالم احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں۔ اور ان کا دامن مضبوطی سے تھام لو۔ وہی ایک ہستی مقدس ایسی ہے جو ہر قسم کے اگلے پچھلے زلات سے مغفور ہے۔ اس وقت سب آئیں گے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کریں گے کہ ملاحظہ فرمائیے کہ ہم کس حالت کو پہنچ گئے ہیں اپنے رب کے حضور ہماری شفاعت فرمائیے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے ہاں ہاں یہ کام میرا ہے۔ میں ہی اس کام کو کروں گا۔ اس کے بعد انہیں جنت میں لے جاؤں گا۔ ایک روایت میں ہے کہ میں زیر عرش بارگاہِ رب العزت میں حاضر ہوں گا۔ اور اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوں گا اس وقت اللہ تعالیٰ میری زبان پر ایسی حمد و ثنا جاری فرمائے گا جو مجھ سے پہلے کبھی کسی نے نہ کی ہوگی۔ اس کے بعد فرمایا جائے گا۔ "یَا مُحَمَّدُ اِرْفَعْ رَأْسَکَ سَلْ تُعْطَہْ وَ اشْفَعْ تُشَفَّعْ" اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنا سر مبارک اٹھائیے۔ مانگئے جو چاہیں گے دیا جائے گا۔ شفاعت فرمائیے آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ اس کے بعد اپنا سر مبارک اٹھاؤں گا اور عرض کروں گا یارب! امتی امتی اے میرے رب میری امت میری امت پھر فرمایا جائے گا اپنی امت کے ہر اس شخص کو جس پر کوئی حساب کتاب نہیں ہے جنت کے سیدھے راستے سے داخل کر دو اور جنت کے دیگر دروازوں سے اور لوگ داخل ہوں گے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور سے ارشاد فرمایا جائے گا کہ ہر اس امتی کو جس کے دل میں دانہ گندم یا جو کے برابر ایمان ہے نکال کر جنت میں لے جاؤ تو میں جاؤں گا اور ایسا ہی کروں گا۔ اس کے بعد پھر بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہو کر حمد بجالاؤں گا اور ویسی ہی حمد کروں گا جیسی کہ پہلے مذکور ہوئی فرمایا جائے گا جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہے اسے بھی لے جاؤ تو میں ایسا ہی کروں گا۔ اس کے بعد پھر بارگاہ الٰہی میں حاضر ہوں گا اور ویسی ہی حمد کروں گا جیسی کہ پہلے گزری۔ فرمایا جائے گا جس کے دل میں رائی کے دانے سے بھی کم ذرہ برابر ایمان ہے لے جاؤ تو میں ایسا ہی کروں گا اس کے بعد پھر بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہوں گا اور ویسی ہی حمد کروں گا جیسی کہ پہلے گزری۔ فرمایا جائے گا جس کے دل میں رائی کے دانہ سے بھی کم ذرہ برابر ایمان ہے لے جاؤ۔ چوتھی مرتبہ جب حاضر ہوں گا تو عرض کروں گا اے رب مجھے اجازت دیجئے ہر اس شخص کی جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا ہے حق تعالیٰ کہے گا نہیں یہ کام آپ کا نہیں ہے یہ کام میرا ہے میں خود اپنے سے شفاعت کروں گا۔ قسم ہے مجھے اپنے عزت و جلال اور عظمت و کبریائی کی، میں ہر اس شخص کو جہنم سے نکالوں گا جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا ہے اس کے بعد جہنم میں وہی لوگ رہ جائیں گے جس کا ذکر قرآن نے کیا ہے۔ یعنی جن پر دائمی جہنم واجب ہے۔

یہ حدیث متعدد روایتوں سے باختلاف الفاظ و عبارات اور طول و اختصار مروی ہے اور اس باب میں حدیثیں بکثرت ہیں اور ان سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت محشر میں لوگوں کے اول وقوف سے داخلۂ نار کے ساتھ دفعِ عذاب کیلئے اور بعد از داخلۂ جنت، رفع درجات کیلئے بھی شامل و واقع ہے۔

تنبیہ: کچھ لوگ یہ اعتراض پیدا کرتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کے قول میں ہے کہ "آپ زمین والوں میں سب سے پہلے رسول ہیں" حالانکہ ان سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نبی و مرسل ہیں اسی طرح حضرت شیث اور ادریس علیہما السلام بھی حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے گزرے ہیں تو اس اعتراض کے جواب میں کہا گیا ہے کہ ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ حضرات انبیاء علیہم السلام نبی تھے رسول نہ تھے۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت میں اولیت "زمین والوں سے" مقید

ہے۔ اور یہ مذکورہ انبیاء مرسل باہل ارض نہ تھے اور حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت ان کے فرزندوں کی طرف تھی کہ وہ سب موحد رہیں اور یہ کہ انہیں اپنی شریعت کی تعلیم دیں۔ یہی حال حضرت شیث اور حضرت ادریس علیہما السلام کا ہے اور حضرت نوح علیہ السلام کی رسالت کفار کے ساتھ تھی کہ وہ انہیں توحید کی دعوت دیں۔

مقاماتِ شفاعت۔ (فائدہ) ۔ اہلِ علم بیان کرتے ہیں کہ شفاعت کے پانچ مقامات ہیں اول یہ کہ اہلِ موقف کو شدت وقوت سے اور اس مقام میں رکے رہنے سے اور سورج کی گرمی اور پسینے سے اور انتظار حساب و کتاب سے راحت و نجات دلانے کیلئے ہے اور دوسرا مقام سوال و حساب سے معاف کرانے میں۔ اور بے حساب جنت میں داخل کرانے میں ہے۔ اور تیسرا مقام ان لوگوں کے لئے ہے جن کا حساب کیا گیا ہو اور وہ مستحق عذاب قرار پا گئے ہوں انہیں اس عذاب سے نجات دلانے کیلئے ہے اور چوتھا مقام ان لوگوں کیلئے ہے جو جہنم میں داخل ہو چکے ہوں پھر انہیں وہاں سے نکالا جائے اور پانچواں مقام ان لوگوں کے درجات کی بلندی کیلئے ہے جو جنت میں داخل ہو گئے ہیں۔ ان ابواب میں ہر ایک کیلئے حدیثیں واقع ہیں۔ (واللہ اعلم)

کچھ لوگ چھٹی جائے شفاعت کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا جناب ابو طالب کیلئے تخفیف عذاب کیلئے شفاعت کریں گے اور کچھ لوگ ساتویں جائے شفاعت کا بھی ذکر کرتے ہیں وہ مدینہ والوں کیلئے ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ جو کوئی مدینہ کی بلاؤں یعنی وہاں کی سختیوں اور شدتوں کو ثابت قدمی سے برداشت کرتا ہے تو میں روز قیامت اس کا گواہ اور شفیع ہوں گا اور شیخ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ایسی شفاعتوں کے متعلقین پہلی پانچ قسموں سے باہر نہیں ہیں۔ اگر ان کو جدا شمار کریں تو مزید دیگر اقسام بھی پیدا ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر انور کی زیارت کرے۔ ایک اور شفاعت ان کیلئے ہوگی جو مؤذن کے کلمات کا جواب دے اور اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجیں۔ ایک اور شفاعت تجاوز از تقصیر صلحاء میں ہوگی۔ ایک اور شفاعت اس کیلئے ہوگی جس کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں اور اسے جنت میں داخل کریں گے اور سات سو خدا کی رحمت سے داخل ہوں گے اور ظالم نفس اور اصحابِ اعراف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے داخل ہوں گے اور اصحابِ اعراف کے بارے میں ارجح قول یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں گی۔ (واللہ اعلم)

وصل: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ روزِ قیامت میری شفاعت فرمایئے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا انشاء اللہ کروں گا۔ پھر میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کو کہاں تلاش کروں فرمایا مجھے صراط کے قریب تلاش کرو۔ عرض کیا اگر حضور وہاں تشریف فرما نہ ہوں اور حضور کو نہ پاؤں تو، فرمایا پھر مجھے میزان پر دیکھنا عرض کیا اگر وہاں بھی نہ پاؤں تو فرمایا پھر مجھے حوض پر تلاش کرنا۔ میں ان تین جگہوں کے علاوہ کہیں نہ جاؤں گا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ تمام مقامات اور آخرت کی تمام جگہوں میں موجود کھڑے ہوں گے۔ اور امت کی امداد و اعانت اور شفاعت فرمائیں گے اور ہر خطرے اور ہر شدت سے رہائی اور خلاصی دلائیں گے۔

ذکر مسافتِ صراط۔ لیکن صراط کے بارے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جہنم کی پشت پر صراط بچھائی جائے گی اور اس پر سے گذرنے والوں میں سب سے پہلے میں اور میری امت ہوگی اس پر سے گزرتے وقت رسولوں کی دعا یہ ہے کہ "اَللّٰھُمَّ سَلِّمْ سَلِّمْ" اے رب سلامت رکھ سلامت رکھ۔ اور دوسری حدیث میں آیا ہے کہ تمہارا نبی صراط پر کھڑا "رَبِّ سَلِّمْ سَلِّمْ" کہہ رہا ہوگا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا امت کی سلامتی کیلئے ہوگی اور دوسرے رسولوں کی بھی اسی طرح۔ اور ممکن ہے کہ مقربانِ بارگاہ بھی حق تعالیٰ کی شان بے نیازی کے ڈر اور خوف سے سلامتی کی دعائیں کر

رہے ہوں گے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ فرشتے بھی صراط کے دونوں جانب کھڑے "یارب سلم سلم" کی دعائیں مانگ رہے ہوں گے۔ اور یہ ان کی عادت کے بموجب ہے کہ وہ ہمیشہ ہی مسلمانوں کیلئے دعاو استغفار کرتے ہیں۔

فضیل بن عیاض کی حدیث میں ہے کہ صراط کی مسافت پندرہ ہزار سال کے برابر ہے۔ پانچ ہزار چڑھائی میں پانچ ہزار اترائی میں اور پانچ ہزار برابر و ہموار۔ اور کوئی گزرنے والا ایسا نہ ہو گا جو خوفِ خدا سے لرزتا کانپتا نہ ہو۔

اور مشہور ہے کہ صراط تلوار سے تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ صراط بعضوں کے لئے تلوار سے تیز اور بال سے باریک ہوگی اور بعضوں کیلئے ہموار و کشادہ میدان کی مانند ہوگی۔ اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ کہتے ہیں کہ وقوف محشر کی طوالت بعضوں پر تو پچاس ہزار سال کے برابر ہوگی اور بعض پر نماز کی دو رکعتوں کے برابر اور یہ تفاوتِ اعمال اور انوار ایمان کی بنا پر ہے۔

حدیث پاک میں ہے کہ جب میرے امتی صراط پر لرزنے لگیں گے اور تھک کر رہ جائیں گے تو فریاد کریں گے "وَامُحَمَّدَاہ" "یَارَسُوْلَ اللہِ مدد فرمایئے۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی شفقت میں بلند آواز سے پکاریں گے اور بارگاہِ الٰہی میں عرض کریں گے "رَبِّ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ" اے رب میری امت کو بچا میری امت کو بچا۔ آج کے دن میں نہ اپنے لئے کچھ مانگتا ہوں اور نہ اپنی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا کیلئے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا امت کے بارے میں اور ان کے چھڑانے کے سلسلے میں حد درجہ اہتمام اور مبالغہ ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس حدیث سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے ساتھ اتحاد اور کمال محبت کا علم ہو جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ جو بہت صدقہ دے گا وہ صراط پر سے گذر جائے گا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جس کا گھر مسجد ہے حق تعالیٰ اس کا ضامن ہے وہ اسے پل صراط پر سے رحمت و کرم کے ساتھ گزارے گا۔

میزان کی کیفیت : میزان پر ہی سوال و حساب کا مدار ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جنت عرش کے داہنی جانب اور جہنم اس کے بائیں جانب رکھی جائے گی اس کے بعد میزان لائی جائے گی۔ اور نیکیوں کے پلڑے کو جنت کے مقابل اور بدیوں کے پلڑے کو جہنم کے مقابل رکھا جائے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب چاہیں گے کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا جائے تو ندا ہوگی کہاں ہیں محمد علیہ السلام اور ان کی امت اور ایک روایت میں ہے کہاں ہیں امتِ امیہ اور ان کے نبی علیہ السلام، اس وقت میں کھڑا ہوں گا اور میری امت میری پیروی کرے گی ان کے اعضاء وضو چمکتے دمکتے ہوں گے۔ ہمارے راستے سے دیگر امتوں کو ایک طرف کیا جائے گا اور جب لوگ اس امت کے درجہ و فضیلت کو دیکھیں گے تو وہ تعجب سے کہیں گے کہ قریب ہے کہ یہ امت سب کی سب نبی ہو جاتی۔ یہ بات پایۂ صحت کو پہنچ چکی ہے کہ پہلے جس چیز کا فیصلہ کیا جائے گا وہ خون کے قضیے اور مقدمے ہوں گے (رواہ البخاری)۔ اور یہ بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ سب سے پہلا سوال نماز کے بارے میں ہو گا۔ ان دونوں حدیثوں میں اولیت کی تطبیق اس طرح ہے کہ عبادات میں اول پرسش نماز کی ہوگی اور معاملات میں پہلی پرسش خون کی ہوگی۔ اور نسائی کی حدیث میں ہے کہ سب سے پہلے جس چیز کا حساب کیا جائے گا وہ بندے کی نماز ہے۔ اور لوگوں میں جس چیز کا سب سے پہلے فیصلہ کیا جائے گا وہ خون ہے اور اس حدیث کے مضمون میں تطبیق و توجیہہ کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ انجام پر نظر وجہ مذکور کے ساتھ راجح ہو کر واقع ہوا ہے۔ اس لئے کہ نماز میں سوال و حساب بندہ کی ذات کی طرف منسوب ہے۔ اور خون میں لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنا ہے اگرچہ نماز میں بھی کوئی فیصلہ ہو گا لیکن یہ فیصلہ بندہ کی ذات سے ہے اور بندوں کے مابین ایک دوسرے سے نہیں ہے۔

مروی ہے کہ بندہ کے قدم چار چیزوں میں ہی لڑکھڑاتے ہیں اور انہیں چاروں پر اس سے سوال و حساب ہو گا اول چیز اس کی عمر ہے کہ اس نے اپنی عمر کس کام میں صرف کی ہے اور دوسرا اس کا علم کہ اس نے علم پر کیا عمل کیا ہے؟ تیسرا مال کہ اس نے مال کہاں سے حاصل کیا اور کس جگہ خرچ کیا۔ چوتھا اس کا جسم کہ جسمانی کیا گناہ کیے ہیں؟ (رواہ الترمذی) ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ نیز حدیث میں ہے کہ روزِ قیامت آدمی کے تین دفتر و دیوان لائے جائیں گے۔ ایک دفتر میں اس کا عمل لکھا ہو گا اور دوسرے میں اس کے گناہ لکھے ہوں گے۔ تیسرے میں وہ نعمتیں لکھی ہوں گی جو حق تعالیٰ نے اس پر انعام فرمائی ہیں۔ قرطبی فرماتے ہیں کہ صراط پر سے کوئی بندہ اس وقت تک نہ گزر جائے گا جب تک کہ اس سے سات مرحلہ میں سوال نہ پوچھ لئے جائیں۔ پہلے مرحلہ پر کلمہ شہادت "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پر ایمان کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ اگر وہ اخلاص کے ساتھ ایمان لایا ہے تو گزر جائے گا اس کے بعد دوسرے مرحلے پر نماز کے بارے میں سوال ہو گا اگر اس نے اہتمام کے ساتھ ادا کی ہے تو گزر جائے گا تیسرے مرحلے پر ماہِ رمضان کے روزے سے چوتھے مرحلے پر زکوٰۃ سے پانچویں پر حج و عمرہ سے چھٹے پر غسل و وضو یعنی طہارت سے اور ساتویں مرحلے پر لوگوں پر ظلم و زیادتی پر یعنی حقوق العباد سے سوال کیا جائے گا۔ یہ مرحلہ دشوار اور سخت تر ہے۔ اہلِ علم فرماتے ہیں کہ بالفرض اگر اس کے پاس ستر نبیوں کے برابر اجر و ثواب ہے اور اس پر نصف دانہ کے برابر حق العباد ہے تو وہ اس وقت نہ گزرے گا جب تک کہ حق والے کو راضی نہ کرلے۔ کہتے ہیں کہ ایک حبہ حق العباد میں اس سے ستر مقبول شدہ نمازیں حق والے کو دلائی جائیں گی اور روزِ قیامت بندے کو حقوق العباد کے برابر کوئی پریشانی اور لاچاری پیش نہیں آئے گی۔ اعاذنا اللہ من ذالک۔ لہٰذا کبھی تو یہ ہو گا کہ حق تعالیٰ کی رحمت مقتضی ہو گی کہ صاحبِ حق کو راضی کرے اور اس بندے کو اس جنجال سے نکالے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ بندہ کا آخری کلام کلام طیبہ ہو۔ جیسا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ فرمایا "مَنْ کَانَ اٰخِرُ کَلَامِہٖ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ۔" جس کا آخری کلام لا الٰہ الا اللہ ہے وہ جنت میں داخل ہو گا۔ اس باب میں نطاقہ کی حدیث مشہور ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کسی بھائی کی حاجت و ضرورت کو پورا کرے میں روز قیامت اس کے میزان پر کھڑا ہوں گا۔ اگر نیکیاں غالب رہیں تو فبہا ورنہ اس کی شفاعت کروں گا۔

مشائخ عظام کی خبروں میں ہے کہ کسی نے کسی سے خواب میں پوچھا کہ حق تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا اس نے کہا میرے اعمال تولے گئے تو نیکیوں پر بدیوں کا پلڑا بھاری رہا اس وقت یکایک ایک تھیلی نیکیوں کے پلڑے میں آ پڑی تو وہ بھاری ہو گیا پھر میں نے اس تھیلی کو کھول کر دیکھا تو اس میں وہ ایک مٹھی خاک تھی جو میں نے ایک مسلمان کی قبر میں ڈالی تھی۔

مواہب لدنیہ میں عجیب و غریب حکایتیں لکھی ہیں کہ ایک بندے کے دونوں پلڑے برابر ہوں گے تو اس سے کہا جائے گا کہ تو نہ جنت کا مستحق ہے نہ جہنم کا۔ پھر ایک فرشتہ ایک کاغذ کا ٹکڑا لائے گا جس پر اُف یعنی باپ کی نافرمانی لکھی ہو گی اسے پلڑے میں رکھ دے گا اس پر نیکیوں پر بدیوں کا پلڑا بھاری ہو جائے گا۔

یہ باپ کی نافرمانی کے کلمہ کی بنا پر ہو گا۔ اس بندے کو جہنم کی جانب لے جانے کا حکم ہو گا تو وہ بندہ درخواست کرے گا کہ مجھے بارگاہِ الٰہی میں حاضر کرو حکم ہو گا لے آؤ۔ پھر حق تعالیٰ فرمائے گا اے باپ کے نافرمان بندے تو نے دوبارہ میرے حضور حاضر ہونے کی کیوں درخواست کی۔ وہ بندہ عرض کرے گا خداوندا میں اپنے باپ کا نافرمان تھا مگر میں نے دیکھا کہ وہ دوزخ کی جانب میری طرح لے جایا جا رہا ہے تو میں تجھ سے درخواست کروں گا کہ میرے باپ کو نجات اور رہائی دے دے اور اس کے بدلے میرا عذاب دونا کر دے۔

اس پر حق تعالیٰ تبسم فرمائے گا جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے اور فرمائے گا اے بندے تونے دنیا میں باپ کی نافرمانی کی اور آخرت میں تو اس پر مہربانی کرتا ہے تو تو اپنے باپ کا ہاتھ پکڑ لے اور دونوں جنت میں چلے جاؤ۔

ایک حکایت یہ بھی لکھی ہے کہ ایک شخص کے دونوں میزان کے پلڑے برابر ہوں گے حق تعالیٰ اس سے فرمائے گا لوگوں کے پاس جاؤ اور کسی سے ایک نیکی مانگ کر لاؤ تاکہ تجھے جنت میں داخل کروں تو وہ جس سے بھی ایک نیکی کی درخواست کرے گا وہ یہی کہے گا کہ تجھ سے بھی زیادہ محتاج ہوں۔ پھر ایک بندے سے ملے گا تو وہ بندہ اس سے کہے گا میں بارگاہِ الٰہی سے آرہا ہوں۔ میرے نامہ اعمال میں صرف ایک ہی نیکی نکلی ہے اور مجھے یقین نہیں کہ یہ نیکی کچھ فائدہ دے سکے میں وہ نیکی تجھے ہبہ کرتا ہوں۔ اسے لے جا شاید تجھے فائدہ دے دے تو وہ شخص اس نیکی کو لے کر خوشی خوشی بارگاہ الٰہی میں آئے گا۔ حق تعالیٰ فرمائے گا تونے کیا کیا اور تیرا کیا حال ہے حالانکہ حق تعالیٰ اس کے حال کو خوب جانتا ہے تو وہ شخص عرض کرے گا اے رب! میرا یہ حال ہے اور اس طرح مجھے نیکی میسر آگئی ہے اس پر حق تعالیٰ اس بندے کو جس نے اسے نیکی ہبہ کی تھی بلائے گا اور فرمائے گا اے بندے میرا کرم اور بخشش تجھ سے زیادہ وسیع ہے تو اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ لے۔ اور تم دونوں جنت میں داخل ہو جاؤ۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ آخرت کی ترازو کے پلڑے کا وزنی ہونا دنیا کے ترازو کے برعکس ہے۔ کیونکہ دنیا کی ترازو کا وزنی پلڑا نیچے ہوتا ہے اور آخرت کی ترازو کا وزنی پلڑا اونچا ہوتا ہے۔ یہ بات ندرت سے خالی نہیں۔ وہ علماء اس آیۂ کریمہ سے استدلال و استشہاد کرتے ہیں کہ فرمایا "اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ" نیکی کی باتیں حق تعالیٰ یا اوپر کی جانب چڑھتی ہیں اور نیک عمل کو اٹھایا جاتا ہے۔ اور یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ اس دعوے کا اثبات محض آیۂ کریمہ سے اس باب میں کسی چیز کے واقع ہوئے بغیر مشکل ہے ہاں اگر اس آیت کریمہ کی تائید میں کوئی چیز اشارہ کرنے والی ہو تو ممکن ہے اور یہ جو بعض کہتے ہیں کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے اس قول کے متصادم اور منافی ہے کہ فرمایا "فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُہٗ فَھُوَ فِیْ عِیْشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ۔" لیکن وہ جن کے ترازو بھاری ہیں تو وہ رضا کی زندگی میں ہیں تو یہ بھی محل بحث ہے اس لئے کہ ممکن ہے کہ ثقلت سے مراد ترجیح ہو اور ترجیح اس جگہ صعود سے ہے۔ ہاں مقصود یہ ہے کہ ثقیل مائل بہ سفل ہوتی ہے اور ممکن ہے کہ مقتضائے ثقل و خفت وہاں اس جہان کے برعکس ہو۔ (واللہ اعلم)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قیامت میں صاحب میزان جبریل علیہ السلام ہوں گے اور وہی اس دن اعمال کا وزن کریں گے۔ (رواہ ابن جریر فی تفسیرہ) اور یہ میزان اور ہر احوال حساب و سوال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہو گا۔ اور خلاصی و رہائی سب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور رعایت سے ہوگی۔ لیکن حوض پر آنا اور پانی پینا ظاہر یہ ہے کہ شدت وقوف سوال و حساب کے خاتمہ اور صراط پر سے گزر جانے اور ہول و دہشت اور آفتوں سے نجات پالینے کے بعد ہو گا۔ جیسا کہ فرمایا "مَنْ شَرِبَ مِنْہُ لَا یَظْمَأُ اَبَدًا۔" جس نے اس کا پانی پیا وہ کبھی پیاسا نہ ہو گا۔ اس کے بعد جنت کا داخلہ ہے اور سب سے پہلے جنت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوں گے۔ جیسا کہ فرمایا "اَنَا اَوَّلُ مَنْ قَرَعَ بَابَ الْجَنَّۃِ۔" میں سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا۔ اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنت میں داخل ہو جائیں گے تو خازن جنت کے دروازوں کو کھول کر خدمت میں کھڑا ہو جائے گا جس طرح کہ بادشاہوں کے سامنے خدام کھڑے ہوتے ہیں اور عرض کرے گا مجھے حکم تھا آپ سے پہلے کسی کیلئے جنت کا دروازہ نہ کھولوں۔ اور نہ آپ کے بعد کسی اور کی خدمت کیلئے کھڑا ہوں۔

مروی ہے کہ جب مسلمان جنت کے دروازے پر آئیں گے تو مشورہ کریں گے کہ داخلہ کیلئے کس سے پہلے اجازت لینی چاہئے۔ تو وہ حضرت آدم پھر حضرت نوح پھر حضرت ابراہیم پھر حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام کے پاس اسی ترتیب و روش پر آئیں گے جس

طرح کہ عرصات محشر میں شفاعت کے طلب میں حاضر ہوئے تھے تاکہ ہر جگہ اور ہر بشر پر سید السادات فخر موجودات علیہ التحیۃ والتسلیمات کی فضیلت و بزرگی ظاہر ہو جائے۔

حضرت عمر بن خطاب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمام انبیاء علیہم السلام پر اس وقت تک جنت میں داخل ہونا حرام ہے جب تک کہ میں داخل نہ ہو جاؤں۔ اور تمام امتوں پر اس وقت تک داخلہ حرام ہے جب تک کہ میری امت داخل نہ ہو جائے۔ مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبریل علیہ السلام آئے تو انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر جنت کی سیر کرائی کہ یہ میری امت کے داخلہ کا دروازہ ہے۔ اس پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا اے کاش کہ میں آپ کے ساتھ ہوتا تو اس دروازہ کو دیکھتا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابو بکر (رضی اللہ عنہ)! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تم ہی وہ شخص ہو جو میری امت میں سب سے پہلے داخل ہوگے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کیلئے ایک دروازہ مخصوص ہے جس سے وہ داخل ہوں گے۔ مثلاً نمازیوں کیلئے باب الصلوٰۃ، مجاہدوں کیلئے باب الجہاد روزہ داروں کیلئے وہ دروازہ جسے باب الریان کہتے ہیں اور جس دروازے سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوں گے اس دروازہ کا نام باب الرحمۃ اور باب التوبہ بتاتے ہیں لیکن ایک عورت کے بارے میں آیا ہے کہ وہ مجھ سے داخلہ میں سبقت کرے گی تو میں اسے کہوں گا کیا کرتی ہے اور تو ایسا کیوں کرتی ہے؟ وہ کہے گی میں نے صبر کیا اور یتیموں پر بیٹھی رہی ہوں یعنی بیوہ ہوں اور دوسرا شوہر میں نے نہیں کیا اسے ابویعلیٰ نے روایت کیا اور اس کے راویوں میں کوئی خلل نہیں ہے۔ المنذری کہتے ہیں کہ انشاء اللہ اس کی سند حسن ہے۔ سبقت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ داخل ہونے میں مجھ سے پیش قدمی کرے گی۔ یا یہ کہ میرے پیچھے ہی داخل ہوگی اور اس نے میری اس حدیث کی گواہی دی کہ "أَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيمِ فِي الْجَنَّةِ هٰكَذَا وَأَشَارَ بِإِصْبَعَيْهِ السَّبَّابَةِ وَالْوُسْطٰى" (رواہ البخاری) میں اور یتیم کا بوجھ اٹھانے والا جنت میں ایسے ہوں گے اور اپنی انگشت شہادت اور درمیانی انگلی سے اشارہ فرمایا۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اس حدیث کو سنے اور اس پر عمل کرے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان تھی کہ اپنی قوم کی اسی انداز سے تربیت فرماتے اپنے دین کی باتیں سمجھاتے اور تعلیم دیتے اور انہیں خوب اچھا سلیقہ سکھاتے تھے۔

ذکر مقام وسیلہ فضیلہ اور حد درجہ رفیعہ۔ اب رہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت میں وسیلہ فضیلہ اور درجہ رفیعہ کا مقام جیسا کہ اذان کی دعا کے سلسلے میں حدیث میں آیا ہے کہ اَللّٰهُمَّ اٰتِ مُحَمَّدَنِ الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَالدَّرَجَةَ الرَّفِيْعَةَ۔ اے خدا حضور کو وسیلہ، فضیلہ اور درجہ رفیعہ عطا فرما۔ تو۔

مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم مؤذن کی آواز سنو تو تم وہی کہو جو وہ کہتا ہے اور مجھ پر درود بھیجو۔ جو کوئی مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے حق تعالیٰ اس پر دس مرتبہ رحمتیں نازل فرماتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے میرے لئے "وسیلہ" کو مانگو۔ کیونکہ جنت میں یہ وہ مقام ہے جہاں کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ اور نہ کسی کو زیب دیتا ہے خدا کے بندوں میں سے۔ بجز ایک بندے کے۔ اور میں امید رکھتا ہوں کہ وہ بندہ میں ہی ہوں۔ لہٰذا جو کوئی میرے لئے وسیلہ کی دعا مانگتا ہے تو اس کیلئے شفاعت اترتی ہے۔

اہل علم کہتے ہیں کہ وسیلہ جنت میں ایک اعلیٰ منزلت کا نام ہے اور وہ منزلت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ہے۔ اور وہی مقام جنت میں حضور کی سکونت کا ہے۔ یہ عرش سے بہت قریب ہے۔ اور کہتے ہیں کہ خدا تک پہنچنے کیلئے وسیلہ ایک ذریعہ ہے۔ "إِذَا تَقَرَّبَ تَوَسَّلْتَ إِلَى اللّٰهِ تَقَرَّبْتَ اللّٰهَ" جب وہ قربت حاصل ہو گئی تو اللہ تک پہنچ گئے۔ اور اس کی نزدیکی حاصل ہو گئی۔ اور "منزلہ علیا" پر بھی

بولا جاتا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ اور یہ بھی معنیٰ اول کی طرف راجع ہے اس لئے کہ خدا تک رسائی جناب باری تعالیٰ سے قرب کی منزل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ایسی عبادت ہے جو جنت میں اس سے قریب کرتی ہے۔ اور جب یہ بات مسلم ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی عبودیت کے اعتبار سے اعظم خلق ہیں اور ساری مخلوق سے عرفان باری تعالیٰ میں عارف تر ہیں اور خشیت میں ان سے بڑھ کر اور محبت الٰہی میں سب سے زیادہ محبوب ہیں تو آپ کی منزل یقیناً تمام منازل میں اقرب اور عظیم تر ہوگی اور جنت میں آپ کا درجہ اعلیٰ ہوگا۔ (کذا قالوا)

بندۂ مسکین (صاحب مدارج النبوۃ) خصہ اللہ بمزید العلم والیقین کہتا ہے کہ لغت میں وسیلہ کے معنی سبب اور ہاتھ پھیلانے کے ہیں۔ اور وسل کسی چیز کے ذریعہ نزدیک ہونے کے ہیں۔ مقولہ ہے کہ "وَسَّلَ اِلَی اللہِ وَ تَوَسَّلَ اِذَا تَقَرَّبَ اِلَیْہِ بِعَمَلٍ" اللہ کے نزدیک ہو، جب آدمی نیک اعمال کے ذریعہ مقرب بارگاہ ہو۔ (کذا فی الصراح) لہٰذا ظاہر ہے کہ اس سے مراد سبب اور ہاتھ پھیلانا ہوگا۔ کیونکہ حضور ﷺ اس سے وسیلہ کرتے اور بارگاہ عزت میں قربت مانگتے۔ اور باب شفاعت کھولنے کی خواہش کرتے ہیں۔ جیسا کہ سیاق حدیث اشارہ کر رہی ہے اور حدیث شفاعت میں معلوم ہو گیا کہ حضور ﷺ جنت میں داخل ہوں گے۔ ایک روایت میں ہے کہ عرش کے نیچے اور ایک روایت میں ہے کہ رب تعالیٰ کے سامنے۔

اور امت کو وسیلہ کی دعا مانگنے کا حکم فرمانا بھی اس لئے ہے کہ اس دعا اور سوال کے کرنے والے ثواب جزیل، قرب رب جلیل، زیادتی ایمان، رضائے حق، اور شفاعت رسول حاصل کریں اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ منزلت اسباب کے ساتھ مقدر فرمائی ہے اور امت کا حضور رضی اللہ عنہ کیلئے وسیلہ کی دعا مانگنا دیگر اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے۔ کیونکہ آپ کے دست مبارک پر جو ہدایت وایمان حاصل ہوا ہے یہ اس کے مقابلے میں ایک شئی ہے۔ ایسا ہی صاحب مواہب نے کہا ہے مگر حق پہلی ہی بات ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے جو کمالات رکھے ہیں اور جن کا وعدہ فرمایا ہے وہ امت کی دعاء وسوال پر موقوف ومسبب نہیں ہیں اور ان کی اس دعا کا فائدہ بھی انہیں کو پہنچے گا۔ جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجنے پر انہیں ایک کے بدلے دس رحمتیں ملتی ہیں۔ یہی صورت حال وسیلہ میں ہے۔ لیکن "طلب فضیلت" تو یہ تمام مخلوق پر زائد مرتبہ ہے اور ممکن ہے کہ یہ بھی ایک منزلت ہو یا وسیلہ ایک درجہ ہے۔ یہی حال "درجہ رفیعہ" کے بیان کا ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا کے نزدیک وسیلہ ایک درجہ ہے جس کے اوپر کوئی درجہ نہیں ہے تو تم میرے لئے وسیلہ کی دعا مانگو۔ امام احمد نے اسے مسند میں روایت کیا ہے اور ابن مردویہ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے اور وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا جس وقت تم خدا سے دعا مانگو تو میرے لئے وسیلہ کی دعا مانگنا۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ اس میں آپ کے ساتھ کون کون ہوگا۔ فرمایا علی، فاطمہ، حسن و حسین رضی اللہ عنہم۔ ابی حاتم سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے مسجد کوفہ کے منبر پر خطبہ میں فرمایا اے لوگو! جنت دو موتی ہیں ایک سفید اور ایک زرد اور مقام محمود سفید موتی کا ہے اس کے ستر ہزار دریچے ہیں۔ اور ان میں سے ہر دریچہ تین میل کا ہے اور اس کا نام وسیلہ ہے۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل بیت کیلئے ہے اور دوسرا زرد رنگ کا محل ہے وہ ابراہیم علیہ السلام اور ان کے اہل بیت کیلئے ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آیۂ کریمہ "وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی" کی تفسیر میں مروی ہے کہ فرمایا جنت میں ہزار محل ہیں اور ہر محل اور اس کی تمام چیزیں ازواج وخدام آپ کو عطا ہوں گی اسے ابن جریر نے روایت کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس

رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرمایا کہ صحابہ کرام کی ایک جماعت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کاشانۂ اقدس سے باہر تشریف لائے جب ان کے قریب ہوئے توان کو طرح طرح کی باتیں کرتے سنا وہ تعجب سے کہہ رہے تھے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق سے خلیل کو چنا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا دوسرے نے کہا اس سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو منتخب کر کے کلیم بنایا اور ان سے کلام فرمایا۔ تیسرے نے کہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح اللہ فرمایا چوتھے نے کہا حضرت آدم علیہ السلام کو صفی اللہ کہا۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سلام سے نوازا اور فرمایا میں نے تم سب کی باتیں سنی ہیں تم اس پر تعجب کرتے ہو کہ حق تعالیٰ نے ابراہیم کو خلیل بنایا اسی طرح موسیٰ کو کلیم اللہ اور عیسیٰ کو روح اللہ اسی طرح آدم کو صفی اللہ بنایا۔ صلوات اللہ علیہم۔ یہ سب درست ہے تو تم جان لو اور باخبر ہو جاؤ کہ مجھے حبیب اللہ بنایا اور یہ فخریہ نہیں۔ میں روز قیامت لواء الحمد اٹھاؤں گا یہ فخریہ نہیں اور میں اول شافع اور اول مشفع ہوں یہ فخریہ نہیں اور میں اولین و آخرین میں سب سے زیادہ مکرم و محترم ہوں یہ فخریہ نہیں۔ (رواہ الترمذی)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خلت حضرت ابراہیم کی صفت ہے اور ان کے ساتھ مخصوص ہے اور محبت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت ہے اور یہ آپ کے ساتھ خاص ہے لیکن دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خلت کے ساتھ بھی موصوف ہیں اور آپ کی خلت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خلت سے بوجہ اتم اکمل و افضل ہے تو محبت مزید و علاوہ ہوگی۔

ایک حدیث تو یہ ہے کہ:

لَوْكُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيْلًا غَيْرَ رَبِّيْ لَاتَّخَذْتُ اَبَابَكْرٍ خَلِيْلًا۔ اگر میں اپنے رب کے سوا کسی کو خلیل بناتا تو یقیناً ابو بکر کو اپنا خلیل بناتا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی آپ کا خلیل ہے اور بجز خدا کے کوئی آپ کا خلیل نہیں۔ خلیل میں دونوں جانب نسبت جاری ہوتی ہے جب کہ اللہ تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیل ہے تو آپ بھی حق تعالیٰ کے خلیل ہوئے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

دوسری حدیث یہ ہے کہ فرمایا اِنَّ صَاحِبَكُمْ خَلِيْلُ اللّٰهِ تمہارا آقا خلیل اللہ ہے۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی سند سے ہے کہ فرمایا۔

وَقَدِ اتَّخَذَ اللّٰهُ صَاحِبَكُمْ خَلِيْلًا۔ بلاشبہ اللہ نے تمہارے آقا کو خلیل بنایا۔

اور وہ جو ان سے پہلی حدیث میں فرمایا ہے کہ "انا حبیب اللہ" (میں حبیب اللہ ہوں) اس میں مرتبہ اعلیٰ کی طرف اشارہ ہے۔ جیسا کہ کہتے ہیں کہ خلیل کے معنی محب کے ہیں اور حبیب وہ محبّ ہے جو محبوبیت کے مرتبہ تک فائز ہو۔ اور جب مقام بلند کے حامل ہیں تو بدرجہ اولیٰ مقام ادنیٰ کے حامل ہوں گے۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا حق تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا بلاشبہ میں نے تمہیں خلیل بنایا اور میں نے توریت میں لکھا کہ محمد تم حبیب الرحمٰن ہو۔ (صلی اللہ علیہ وسلم۔)

قاضی ابو الفضل عیاض مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خلت کی تعبیر میں اختلاف علماء ہے اور اس کا اصل اشتقاق خل ہے اور خلیل وہ ہے جو یکسو ہو کر خدا کی طرف ہو جائے۔ مطلب یہ کہ خدا کی طرف یکسوئی اور اس کی محبت میں کوئی خلل و نقصان نہ ہو۔ اور بعض کہتے ہیں کہ خلیل وہ ہے جو اس کے ساتھ مختص ہو اور اس قول کو بہت سے حضرات نے اختیار کیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ خلت کی اصل استصفاء اور اخلاص ہے اور حضرت ابراہیم کو خلیل اللہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ خدا کیلئے خالص تھے اور خدا کے لئے ہی محبت کرتے اور خدا کیلئے ہی دشمنی کرتے تھے۔ اور خدا کی خلت ان کیلئے اپنی نصرت اور بعد والوں کیلئے ان کو امام بنانا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ خلیل کی

اصل فقر احتیاج اور انقطاع ہے اور یہ خلت بفتح خاء سے بنا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس سے اس لئے موسوم کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی تمام حاجتوں کو خدا پر چھوڑ دیا تھا جس وقت کہ جبریل علیہ السلام آئے در آنحالیکہ وہ منجنیق میں تھے تاکہ انہیں آگ میں ڈالا جائے اس وقت جبریل علیہ السلام نے کہا تھا۔ "هَلْ لَكَ حَاجَةٌ فَقَالَ أَمَّا إِلَيْكَ فَلَا۔" کیا تمہیں کوئی حاجت ہے فرمایا لیکن تم سے نہیں۔ ابو بکر بن فورک کہتے ہیں کہ صفائے مودت جو کہ موجب اختصاص اور انکشافات اسرار ہے اس کا نام خلت ہے اور بعض کہتے ہیں کہ خلت کی اصل محبت ہے اس کے معنی مہربانی و شفقت کرنا اور درجہ کو بلند کرنا ہے بلاشبہ حق تعالیٰ نے اسے اپنی کتاب میں خود فرمایا ہے کہ۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ أَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَأَحِبّٰٓؤُهٗ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ یہود و نصاریٰ نے کہا ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں تم فرما دو تو پھر وہ تمہیں کس لئے تمہارے گناہوں پر عذاب کرتا ہے۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کیلئے واجب قرار دیا کہ آپ کی لغزشوں پر مواخذہ نہ کیا جائیگا اور بُنوّت سے یعنی اپنا ہونے اور بیٹا کہلانے سے محبت زیادہ قوی ہے اس لئے کہ بنوت میں کبھی دشمنی بھی ہوتی ہے جیسا کہ فرمایا "إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ" بلاشبہ تمہاری کچھ بیبیاں اور تمہاری اولاد تمہاری دشمن ہیں اور یہ صحیح نہیں کہ محبت کے ساتھ عداوت ہو لہٰذا حضرت ابراہیم اور حضور اکرم علیہما السلام کا یہ نام رکھنا خدا کی طرف مکمل یکسوئی اور اپنی حاجتوں کو اس کی طرف تفویض کرنے اور ماسوی اللہ سے روگرداں ہونے کی بنا پر ہے۔ اور ان کے اسباب و وسائط کو باضافہ اختصاص باری تعالیٰ پھیرا اور انہیں خفی لطائف سے نوازا اور ان پر اسرار الٰہیہ اور مکنون غیبیہ کا انکشاف کرایا اور ان کے باطنی احوال کو معرفت حق سے لبریز کیا اور ان کے قلوب کو اپنے ماسوا سے پاک و صاف فرمایا یہاں تک کہ ان کے دل میں ماسوائے حق دخل انداز ہوتا ہی نہیں۔ ان کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب یہی ہے کہ اگر میں خدا کے سوا کسی کو خلیل بناتا تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خلیل بناتا لیکن اسلامی اخوت باقی ہے ان سب کا قاضی عیاض نے ذکر کیا ہے۔ اور انہوں نے خلت کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے درمیان مشترک قرار دیا۔ نبوت اور رسالت کی مشترک فضیلت ہونے کے باوجود لامحالہ وہ صفات جو خلت کے معنی میں مذکور ہوئیں اور ان کا اثبات ان دونوں میں کیا ان میں ہمارے آقا سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم میں عظیم تر، قوی تر اور کامل تر ہوں گے۔ اور اس کے لوازم و خواص تمام انبیاء و مرسلین صلوات اللہ علیہم کے درمیان مشترک ہیں۔ لیکن " فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ "(ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔)

اس کے بعد قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ علمائے اربابِ قلوب اختلاف رکھتے ہیں کہ درجۂ خلت ارفع ہے یا درجۂ محبت۔ اور بعض دونوں کو برابر قرار دیتے ہیں اس بنا پر کہ جو خلیل ہے وہ حبیب ہے اور جو حبیب ہے وہ خلیل ہے۔ لیکن اس کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلت سے اور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو محبت سے مخصوص قرار دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ذکر موسوم کرنے میں ہے نہ کہ حقیقت میں۔ حالانکہ اگر خلیل کا اطلاق حضور پر بھی ہو تو تخصیص کہاں رہی۔

اور بعض کہتے ہیں کہ درجۂ خلت ارفع و اتم ہے اس کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کرتے ہیں کہ فرمایا "لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيلًا غَيْرَ رَبِّي الْحَدِيث۔" تو آپ نے غیر کو خلیل نہ بنایا باوجودیکہ محبت کا اطلاق سیدہ فاطمہ اور ان کے فرزندوں یا حضرت اسامہ اور ان کے سوا دیگر حضرات کی طرف ہوا ہے۔

اکثر علماء نے محبت کو خلت سے افضل قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ حضرت خلیل علیہ السلام کے درجہ سے افضل و اعلیٰ ہے۔ اور محبت کی اصل کسی چیز کی طرف مائل ہونا اور محبت کی موافقت کرنا ہے لیکن اس کا یہ مفہوم انسانوں کیلئے

توضیح ہے کہ وہ اس کی طرف مائل ہو جائے اور اس کی خوشنودی میں پیروی کرے۔ لیکن خالق جل شانہ اغراض سے پاک و منزہ ہے لہٰذا حق تعالیٰ کی بندوں کیلئے محبت اس کو نیک بختیوں پر قائم رکھنے اور گناہوں سے بچانے اور اسبابِ قرب مہیا کرنے اور اسے توفیق دینے اور رحمت کا افاضہ فرمانے میں ہے اور اس کی انتہا بندے کے دل سے عجب و تکبر کو دور کرنا ہے۔ تاکہ وہ اپنے قلب و نظر اور اپنی بصیرت سے اس کی طرف دیکھے تو وہ ایسا ہو گا جیسا کہ حدیث میں آیا ہے "فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِيْ يَسْمَعُ بِهِ وَبَصَرَهُ الَّذِيْ يُبْصِرُ بِهِ وَلِسَانَهُ الَّذِيْ يَنْطِقُ بِهِ الْحَدِيْث" پھر جب میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کے وہ کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی وہ آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کی وہ زبان ہو جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے اس معنی و مفہوم کے سوا حق تعالیٰ کیلئے کچھ اور سمجھنا اس کی شان کے لائق نہیں ہے۔ غیر کی طرف مائل ہونا اس کی پیروی کرنا اور غیر سے غرض وابستہ کرنا حق تعالیٰ اس سے پاک و منزہ ہے۔ اللہ عزوجل کیلئے سلامتی قلب اور اعمال و حرکات میں اخلاص ہونا چاہئے۔ جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا خلق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان میں کہ "كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنَ" حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق قرآن کے مطابق تھے۔ آپ اس کی رضا پر راضی اور اس کی ناراضگی پر ناراض تھے۔

اس جگہ بعض حضرات اپنے کلام میں اس طرح تعبیر کرتے ہیں کہ

قَدْ تَخَلَّلْتُ مَسْلَكَ الرُّوْحِ مِنِّيْ هٰذَا سُمِّيَ الْخَلِيْلُ خَلِيْلًا فَإِذَا مَا نَطَقْتُ كُنْتَ حَدِيْثِيْ وَإِذَا مَا سَكَتُّ كُنْتَ خَلِيْلًا

مطلب یہ کہ تیرے لئے ہی خاموش رہتا ہوں، تیرے لئے بولتا ہوں، تیرے لئے قیام کرتا ہوں۔ تیرے لئے ہی سفر کرتا ہوں اور تیری تلاش میں رہتا ہوں۔ خلت و محبت کی خصوصیت، دونوں ہمارے سردار سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہیں اس پر اخبار صحیحہ اور آثار صریحہ منشرہ و مشتہرہ کی دلالت موجود ہے اس باب میں حق سبحانہ وتعالیٰ کا یہ ارشاد کافی ہے کہ:

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ — فرمادو اگر تم اللہ کی محبت چاہتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تمہیں محبوب بنالے گا۔

باب نہم
در حقوق و واجباتِ نبوت

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق اور آپ کی تصدیق و ایمان لانے کے وجوب اور امر و نواہی میں آپ کی اطاعت اور ہر وہ امر جو خدا کی جانب سے لائے، اس پر ایمان لانا، سنت کی پیروی اور آپ کی سیرت کی اقتداء بدعت اور تغیر سنت سے اجتناب اور محبت، مناصحت یعنی خیر خواہی رعایت ادب، آپ پر صلوٰۃ و سلام کے وجوب و حکم کے بیان میں یہ باب ہے۔ اور یہ تمام امور ابواب سابقہ کا نتیجہ اور ثمرہ ہیں چونکہ ثبوت نبوت اور صحتِ رسالت کے ضمن میں جو کچھ گزرا جب وہ ثابت و مقرر ہے تو واجب ہے کہ ان پر ایمان لائیں اور اس کی تصدیق کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا" (تو ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا) اور فرمایا: "اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔" (بیشک ہم نے آپ کو گواہی دینے والا، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بھیجا تاکہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ) اور فرمایا "قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ۔" (فرمادو اے لوگو میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں تو اللہ اور اس کے رسول نبی امی پر ایمان لاؤ۔)

ان آیاتِ کریمہ سے حضور احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء پر ایمان لانا واجب و متعین ہے اور اس وقت تک ایمان کی حقیقت نہ تو مکمل ہوگی نہ اسلام صحیح ہوگا اور نہ ایمان و اسلام کا حصول درست ہوگا جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور آپ کی رسالت کی شہادت کا اقرار نہ کیا جائے۔

اور یہ جو بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ

(یہاں تک کہ کہے لا الٰہ الا اللہ یا جو کہے لا الٰہ الا اللہ) تو یہ پہلے اور اعظم جز پر اکتفا کیا گیا ہے یا یہ لفظ کلمہ اسلام میں بطور عَلَم و نام ہے جیسا کہ پوچھنے والے کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ کیا پڑھ رہے ہو تو وہ کہے الحمد للہ رب العالمین یا کہے کہ الم ذالک الکتاب پڑھ رہا ہوں اس کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ: "اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَيُؤْمِنُوْا بِيْ وَبِمَا جِئْتُ بِهٖ (الحدیث)۔" (مجھے لوگوں سے اس وقت تک قتال جاری رکھنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک وہ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت نہ دیں اور مجھ پر اور اس پر جو میں لایا ایمان نہ لائیں) یہ بات ظاہر ہے اور محتاج بیان نہیں ہے۔

جاننا چاہئے کہ جمہور میں مشہور یہ ہے کہ ایمان کی حقیقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اور جو کچھ آپ خدا کی طرف سے لائے سب کی تصدیق اور اس تصدیق کے مطابق زبان سے شہادت دینا اور اقرار کرنا کہ آپ خدا کے رسول ہیں اور جب دل سے تصدیق اور زبان سے شہادت جمع ہو جائے تو ایمان مکمل ہو جاتا ہے جیسا کہ حدیث مذکور میں جو عبداللہ بن عمر سے مروی ہے اس سے ظاہر ہو گیا کہ مجھے اس وقت تک قتال کرتے رہنے کا حکم ہے جب تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت نہ دیں۔ مراد یہ ہے کہ دل سے تصدیق کریں اور زبان سے گواہی دیں لیکن وجود شہادت اور اس کے بیان کفایت کو ظاہر میں حکم ایمان کے اہتمام کیلئے شہادت کی تخصیص کرتے ہیں جیسا کہ دوسری حدیث میں فرمایا ہے کہ: "فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَائَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّهَا وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ۔" جب انہوں نے شہادت کا قرار کر لیا تو انہوں نے مجھ سے اپنی جانوں اور مالوں کو بچا لیا مگر جو اس کا حق ہے اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔

اور جبریل علیہ السلام کی حدیث کا مقصد بھی یہی ہے کہ ایمان کے دو جز ہیں ایک شہادت یعنی زبانی اقرار دوسری تصدیق یعنی دل سے

ماننا۔ لیکن تصدیق کی تعبیر ایمان سے کی ہے کیونکہ لغوی معنی میں دونوں ایک ہی ہیں مگر شریعت میں تصدیق قلبی اور شہادت لسانی کے مجموعے کا نام ایمان ہے رہی یہ بات کہ لفظ شہادت بھی درکار ہے یا نہیں بلکہ زبانی اقرار دل کی موافقت کے ساتھ جو شہادت کے معنی ہیں کافی ہے۔ لہٰذا اس پر اجماع ہے کہ جو اخلاص کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا قائل ہے وہ بغیر لفظ شہادت کے مومن ہے۔ اگرچہ اس لفظ کے ساتھ بولنا اولیٰ اور افضل ہے۔ اس مقام کی تفصیل اس طرح ہے کہ اس میں چار حالتیں ہیں ایک یہ کہ تصدیق زبانی اقرار کے ساتھ جمع ہو یہ حالت محمود تام اور کامل ہے۔ دوسرے یہ کہ زبانی اقرار بغیر تصدیق قلبی کے ہو۔ یہ مردود ہے اس میں بالکل ایمان نہیں ہے باتفاق ایسی حالت کو اقسام کفر میں اقبح، اشنع اور اخبث قرار دیتے ہیں اور ایسے شخص کی جگہ جہنم کا سب سے نچلا درجہ ہے تیسری حالت یہ ہے کہ تصدیق قلبی بغیر زبانی شہادت و اقرار کے ہے اس کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ دل سے تصدیق کرتا ہے مگر زبان سے اقرار کرنے کی مہلت نہ ملی اور جان دیدی۔ اس صورت میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ وہ اپنے سابقہ اقرار کفر پر ہی مرا۔ ایسا اس لئے کہتے ہیں چونکہ تصدیق و اقرار کے مجموعے کا نام ایمان ہے اور اس جگہ اقرار پایا نہیں گیا لہٰذا اس کی موت کفر کی حالت پر ہے اور بعض کہتے ہیں کہ وہ جنت کا مستحق ہے اس بنا پر کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "يَخْرُجُ مِنَ النَّارِ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنَ الْإِيمَانِ۔" وہ جہنم سے نکال لیا جائے گا جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ دل میں ایمان کا ہی ذکر فرمایا ہے اور ایک اور جگہ یہ بھی فرمایا۔ "هَلَّا شَقَقْتَ قَلْبَهُ" کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا؟ اور یہ کہ حق تعالیٰ نے فرمایا "وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ" اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا... لہٰذا ایمان کی جگہ دل کو قرار دیا تو ایسی حالت کا شخص بغیر گناہ کے اور بغیر کوتاہی و تقصیر کے اپنے دل سے مومن ہے۔ کیونکہ ترک شہادت اس کے اختیار سے نہیں ہے اور اہل انصاف کے نزدیک اس شخص کی حالت محل اختلاف نہیں ہے اور اگر گونگا ہے اور بحکم طبیعت اختیار پر قدرت نہ رکھتا ہو تو وہاں اسے معذور گردانے میں سب کا اتفاق ہے۔ اور ایسا فرق و امتیاز جو ان دونوں صورتوں میں مفید ہو ظاہر نہیں ہے اور اگر ان لوگوں کو اس مقام میں بھی کھڑا کریں اور وجود ایمان کے قائل نہ ہوں تو کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ لیکن یہ قول اہل حق کے خلاف ہے اور چوتھی حالت یہ ہے کہ دل سے تصدیق کرے اور مہلت و فرصت بھی پائے اور زبانی اقرار و شہادت کے لازم ہونے کا علم بھی رکھتا ہو اور زبان نہ کھولے اور اپنی عمر میں شہادت نہ دے اگرچہ ایک بار ہی ہو تو اس جگہ بھی علماء کا اختلاف ہے۔ ایک جماعت کہتی ہے وہ مومن ہے اس لئے کہ وہ تصدیق کنندہ ہے۔ اور شہادت یعنی زبانی اقرار از قسم اعمال ہے تو وہ اس کے ترک پر گنہگار ہو گا جیسا کہ مذہب حق کی رو سے کسی عمل کے نہ کرنے سے گنہگار ہوتا ہے۔ یہ جماعت کہتی ہے کہ ایمان کی حقیقت یہی تصدیق قلبی ہے اور اقرار احکام ایمان کے اجزاء کی شرط ہے نہ وہ ایمان کا جزو ہے اور نہ اس کے صحت کی شرط۔ اور اس کی عاقبت بعدم خبر تصدیق کی بنا پر کوئی حکم نہیں کریں گے۔ لیکن وجود تصدیق کی بنا پر وہ واقع میں مومن ہے اور عمل داخل ایمان نہیں ہے خواہ زبان کا عمل ہو خواہ ارکان و اعضاء کے اعمال۔ مگر یہ خوب جان لینا چاہئے کہ یہ اس تقدیر پر ہو گا جب کوئی چیز تصدیق کے منافی اس سے سرزد نہ ہو اور اگر منافی ایمان کوئی چیز ہے تو یہ صورت نہ ہو گی اس لئے کہ تصدیق کا تحقق معدوم ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ایسی حالت کا شخص مومن نہیں ہے جب تک کہ تصدیق قلبی کے ساتھ شہادت لسانی یعنی زبانی اقرار شامل نہ ہو اس لئے کہ شہادت انتہاء عقد اور التزام ایمان ہے جو کہ عقیدہ کے ساتھ پیوست ہے۔ اور فرصت و مہلت کے باوجود محض تصدیق سے ایمان مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ شہادت نہ دے۔ اور زبان دل کی ترجمان ہے زبان کے فعل اور دیگر اعضاء کے افعال کے درمیان فرق ہے۔ ہاں عدم قدرت کی حالت دوسری ہے علماء کہتے ہیں کہ صحیح یہی قول ہے ایسا ہی الشفاء میں ہے۔ (واللہ اعلم)

اس جگہ ایک قسم اور ہے وہ یہ کہ تصدیق و اقرار رکھتا ہے لیکن کوئی ایسی چیز اس میں موجود ہے جسے شارع علیہ السلام نے شعار و علامتِ کفر قرار دیا ہے مثلاً زنار باندھنا یا بت کو سجدہ کرنا وغیرہ۔ اگر اس قسم کا شعار و علامتِ کفر جو شارع علیہ السلام سے بدلیل قطعی ثابت ہے اس میں موجود ہے اور یقین کے ساتھ اس کا ارتکاب اس سے پایا جاتا ہے تو از جہت حکم شرع وہ کافر ہے۔ اور بعض مصنفین کے کلام میں واقع ہے کہ بحکم ظاہر وہ کافر ہے۔ اسے بعض کافر شرعی کہتے ہیں اور بعض کافر حکمی کہتے ہیں لیکن یہ بات پایہ ثبوت تک نہیں پہنچتی۔ اس لئے کہ جب شارع علیہ السلام نے ظاہری کفر کا حکم دیا ہے نہ کہ کفر حقیقی کا۔

تنبیہ : فقہاء کی جماعت خصوصاً فقہائے احناف "رحمہم اللہ" بعض افعال و کلمات پر حکم کفر دیتے ہیں مثلاً کوئی غیر خدا کی قسم کھائے اور کہے ماں، باپ یا کسی اور کی قسم یا کہے کہ یہ سخت گناہ ہے یا کہے کہ یہ چیز خدا کے لئے دے دے۔ اس قسم کی اور بھی مثالیں ہیں جو کتب فقہ میں لکھی ہوئی ہیں اس میں حق و صحیح بات یہ ہے کہ وہ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ یہ باتیں مظنۂ کفر اور موہم کفر ہیں۔ ورنہ اس سے کفرِ حقیقی لازم نہیں آتا ہاں اگر وہ متوہم و مظنون معنی ہی کا التزام کرتا ہے تو اہل قبلہ کی مانند کافر ہو جائے گا ان کا مذہب یہ ہے کہ کفر لازم آجاتا ہے اگر ان کا التزام کرے اور تاویل کرے۔ اور اگر کسی دلیل و حجت اور شبہ کی بنا پر وہ اس کی تاویل کریں اور اس کی حقانیت کا دعویٰ کریں تو کافر نہ ہوں گے لہٰذا اہل قبلہ کی تکفیر سے روکنے کی وجہ اسی احتمال پر مبنی ہے ہاں اگر ثابت ہو جائے کہ وہ افعال و اقوال از قبیلِ شعار و علاماتِ کفر ہیں تو حکم کفر اس بنیاد پر ہو گا نہ کہ لزوم کفر کی وجہ سے (واللہ اعلم بالصواب)

ایمان میں کمی بیشی کا مسئلہ: ایمان و اسلام اور اس میں کمی و بیشی ہونے کے بارے میں بڑی بحثیں ہیں۔ اور اس سلسلے میں فقہاء کے اقوال کتابوں میں موجود ہیں۔ اس مسئلہ کی تحقیق یہ ہے کہ ایمان میں کمی و بیشی متصور و معقول نہیں ہے۔ اور محض تصدیق اس کے قابل نہیں اس لئے کہ کمی و زیادتی تو عدد و گنتی میں ہوتی ہے۔ ہاں تصدیق میں کمال و نقصان بر بنائے اختلاف صفات اور تباین حالات جو یقینی قوت اور اعتقادی پختگی اور وضوح معرفت میں ہوتی ہے اس میں ہمیشگی، خوگری اور حضورِ قلب جاری ہے لیکن زیادتی و کمی نہیں۔ اور اس قول کے بطلان کے بیان میں اس پر تنبیہ کرنا واجب ہے کیونکہ بعض لوگوں نے جو یہ مشہور کر رکھا ہے کہ محدثین کے نزدیک تصدیق بالجنان یعنی دل سے ماننا اور اقرار باللسان یعنی زبان سے شہادت دینا اور عمل بالارکان یعنی اعضاء سے عمل کرنا ان سب کے مجموعے کا نام ایمان ہے اور ہر وہ شخص جسے محدثین کے کلام کی خبر نہیں ہے۔ وہ یہی سمجھتا ہے حالانکہ یہ غلط ہے کیونکہ ان لوگوں کی مراد ایمان کامل سے ہے جیسی کہ اس کی تصریح بخاری وغیرہ نے کی ہے۔ اور شارحین مجموعہ احادیث نے اس کی تحقیق کی ہے۔ یہ جھوٹی اور باطل شہرت پہلے زمانوں سے پھیلی ہوئی ہے جیسا کہ قاضی عضد نے "مواقف" میں کہا کہ "ایمان کی حقیقت میں اختلاف کیا گیا ہے۔ اور اسلاف و محدثین کا مذہب یہ ہے کہ: "اَلْاِیْمَانُ تَصْدِیْقٌ بِالْجَنَانِ وَاِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَعَمَلٌ بِالْاَرْکَانِ۔" تصدیق قلبی اور زبانی اقرار اور عمل بالاعضاء ایمان ہے۔ اور سلف سے یہی قول مشہور و معروف ہے۔ حالانکہ ان کی مراد بھی ایمان کامل سے ہے جیسا کہ اہل سنت و جماعت کا مذہب ہے حاشا کہ مذہب اہل سنت و جماعت مذہب سلف کے برخلاف ہے۔ اور محدثین کا مذہب اہل سنت و جماعت کے مذہب کے برخلاف ہے (دونوں باتیں غلط و باطل ہیں) پھر کیا ضرورت لاحق ہوئی کہ ایسی بات کہی گئی؟ باوجود علماء کی تصریح و تحقیق اور اطلاق سلف کے؟ تو یہ ایمان کامل کی تحصیل پر ترغیب و تحریص کیلئے ہے۔ اس بحث کی مزید تحقیق وضاحت دلائل و اعلام کے ذریعہ دوسری جگہ کی گئی ہے۔

وجوبِ طاعت و اتباعِ سنت و اقتدائے سیرت۔ وصل:۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب ایمان لانا واجب ہو گیا تو طاعت و اتباع بھی لازم آگئی اور اکثر طاعت کا اطلاق فرائض و واجبات، عبادات اوامر و نواہی پر آتا ہے اور اتباع و اقتداء کا اطلاق سنن و

آداب اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوتا ہے۔ اسی لئے صاحب کتاب الشفاء نے ان دونوں مطالب کے ذکر و بیان کیلئے دو فصلیں مرتب کی ہیں اور اگر ان دونوں کا ایک ہی فصل میں ذکر کرتے تب بھی درست ہوتا جیسا کہ صاحب مواہب لدنیہ نے کیا ہے۔

اب رہا وجوب طاعت کا مسئلہ تو حق تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ "یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ" اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اور فرماتا ہے "وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ" اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم رحمت کے مستحق بنو اور فرماتا ہے "وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔" اور ہم کسی رسول کو نہیں بھیجتے مگر یہ کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے اور فرمایا: "مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ" جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ گویا حق تعالیٰ نے اطاعتِ رسول کو اپنی اطاعت قرار دیا۔ اور رسول کی اطاعت کو اپنی اطاعت کے ساتھ شامل فرمایا اور اس پر اجر و ثواب کا وعدہ اور اس کے ترک و مخالفت پر عذاب و عقاب کی وعید کی۔ اور ان کے حکم کی بجا آوری اور مخالفت سے اجتناب کو واجب قرار دیا۔ مطلب یہ کہ جو رسول کی اطاعت ان کی رسالت اور احکام الٰہی کی تبلیغ کی حیثیت سے کرے۔ درحقیقت وہ طاعت نہیں کرتا مگر حق تعالیٰ کی۔ اور آیات اس پر دلیل ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام امر و نواہی اور اقوال و افعال میں معصوم ہیں۔ اس لئے کہ اگر کسی چیز میں خطا کریں اور وہ حق کے موافق نہ ہو تو ان کی طاعت خدا کی طاعت نہ ہوگی۔

سہل بن عبداللہ تستری رحمہ اللہ سے شرائع اسلام کے بارے میں کسی نے پوچھا فرمایا "وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔" (یہ رسول جو تمہیں دیں لازم کر لو اور جس سے روکیں باز رہو۔ علماء فرماتے ہیں کہ "اَطِیْعُوا اللّٰهَ فِیْ فَرَائِضِهٖ وَالرَّسُوْلَ فِیْ سُنَنِهٖ۔" فرائض میں اللہ کی اور سنت میں رسول کی اطاعت کرو ایک قول یہ ہے کہ "اَطِیْعُوا اللّٰهَ فِیْمَا شَرَعَ عَلَیْكُمْ وَالرَّسُوْلَ فِیْمَا بَلَّغَكُمْ۔" جو تم پر مشروع ہوا اور اس میں اللہ کی اطاعت کرو اور تمہیں تبلیغ فرمائی اس میں رسول کی اطاعت کرو۔ علماء فرماتے ہیں کہ خدا کی اطاعت اس کی ربوبیت کی شہادت میں ہے اور رسول کی اطاعت ان کی نبوت کی شہادت میں ہے اور یہ طاعت دلیل محبت ہے اور محبت معیت کی مورث ہے جیسا کہ معیت کی فضیلت میں آئے گا۔

حق تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے: "قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ۔" فرمادو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اللہ تمہیں محبوب بنالے گا۔ اور تمہارے گناہوں کو تم سے مٹا دے گا۔ اس آیت کریمہ کا آیت "المحبۃ" نام رکھتے ہیں۔

مفسرین کہتے ہیں کہ ایک گروہ نے خدا کی محبت کا دعویٰ کیا اس پر حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اے میرے حبیب! فرمادو اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری متابعت کرو اور میری طاعت بجالاؤ کیونکہ یہی خدا کی طاعت ہے اور یہی خدا سے محبت رکھنے کی دلیل ہے اب اگر تم میری متابعت کروگے تو تم خدا سے محبت کرنے والے ہوگے بلکہ اس کے محبوب ہو جاؤ گے اور میرے مقام حبیب کے تم بھی وارث بن جاؤ گے۔ ممکن ہے اس کے معنی یہ ہوں کہ اگر تم چاہتے ہو کہ خدا تم کو دوست بنالے تو میری متابعت کرو۔ خدا تمہیں دوست بنالے گا۔ غرضیکہ خدا کی محبت اتباع رسول خدا کے ساتھ مشروط ہے اور مشروط بغیر شرط کے وجود میں نہیں آتی ہے پھر یہ کہ اتباع مورث محبت اور سبب محبت ہے۔ لہٰذا اتباع بھی شرط محبت ہے کہ اس کا انتفاء اس کے انتفاء کو مستلزم ہے اور سبب محبت بھی ہے کہ اس کا وجود اس کے وجود کو مستلزم ہے لامحالہ یہ محبت، متابعت کا معلول و مسبب ہے اس کے بعد ایک اور چیز موجود ہوتی ہے جس کا نام محبت ہے جو اس کی شرط ہے اور اس پر مقدم ہے لہٰذا مقام ثانی مقام اول سے بلند تر اور بزرگ تر ہے کیونکہ فرمایا "یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ" (اللہ تمہیں محبوب بنالے گا) تو یہ اسی طرف اشارہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔" تو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول نبی امی پر اور اس رسول کا اتباع کرو تاکہ تم صراطِ مستقیم کی ہدایت پاؤ جو کہ سب سے قریب تر راستہ ہے۔ گویا ہدایت پانے کو دو چیزوں کے ساتھ تابع کیا ایک رسول پر ایمان دوسرا رسول کا اتباع۔

تنبیہ : - ہر اس شخص کو خبردار کیا جاتا ہے جو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تصدیق تو کرتا ہے مگر ان کی شریعت کی التزام کے ساتھ اتباع و پیروی نہیں کرتا وہ گمراہی و ضلالت میں ہے اگرچہ اصل ایمان ہی کیوں نہ رکھتا ہو لہٰذا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کی متابعت ہم پر واجب ہے۔ بجز اس کے جس کی کوئی دلیل تخصیص کرتی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ" اللہ تعالیٰ اپنی ذات کی قسم یاد کر کے فرماتا ہے قسم ہے تمہارے رب کی اے حبیب میرے صلی اللہ علیہ وسلم وہ لوگ ایماندار نہیں ہوں گے جب تک کہ ان چیزوں میں جس میں وہ مختلف و مختلط ہیں ان میں آپ کا فیصلہ نہ مانیں: "ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ۔" اس کے بعد جو کچھ آپ نے فیصلہ دیا اس کے بارے میں وہ اپنے دل میں تنگی اور شک و شبہ نہ رکھیں۔ "وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۔" اور ظاہر و باطن کے ساتھ آپ کے آگے منقاد ہو جائیں اور مان لیں۔ یہ اطاعت، تبعیت اور انقیاد کے اعلیٰ مرتبہ کی طرف اشارہ ہے کہ وہ حکم رسول کے آگے ظاہر و باطن میں راضی ہوں خواہ خواہشات نفس کے موافق ہو یا اس کے مخالف اور وہ یقین سے جانیں کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے سب سے زیادہ حق ہے اس کے بعد ان کے باطن میں خدشہ اور خلجان نہ رہے اس کو مقام رضا و تسلیم کہتے ہیں۔ کیونکہ حق تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے: "إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ" جب کہا اس سے اس کے رب نے گردن رکھ تو اس نے کہا میں نے رب العالمین کے لئے گردن رکھی۔ اس کا اشارہ بھی اسی طرف ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحتوں میں سے ہے کہ فرمایا: "عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ۔" تم پر لازم ہے کہ میری سنت اور خلفائے راشدین مہدیین کی سنت کو مضبوط و محکم پکڑو اور اپنے آپ کو محدثاتِ امور سے بچاؤ اس لئے کہ ہر محدث بدعت ہے اور ہر بدعت ضلالت ہے اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اتنا زیادہ ہے کہ ہر ضلالت جہنم میں ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی چیز کو اختیار فرماتے تو اس میں رخصت پر عمل فرماتے۔ ایک جماعت اس سے بچتی اور اس سے دوری تلاش کرتی کہ وہ رخصت پر عمل کرے جب اس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا اس قوم کا کیا حال ہے کہ وہ اس سے بچتی ہے جسے میں اختیار کرتا ہوں۔ قسم ہے مجھے خدائے ذوالجلال کی میں ان میں سب سے زیادہ خدا کو اور اس کی رضا کو جاننے والا ہوں اور از روئے خوف و خشیت حق تعالیٰ ان میں بہت زیادہ سخت ہوں۔ مطلب یہ کہ باوجود اس علم و خشیت کے میں رخصت پر عمل کرتا ہوں۔ تو خوب جان لو کہ حق یہی ہے۔ اور مقتضائے حکمت بھی یہی ہے اس میں مصلحتیں ہیں جن سے دین و دنیا کے کام کی صلاح متضمن ہے۔ جیسا کہ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ خدا پسند فرماتا ہے کہ اس کی رخصتوں پر عمل کیا جائے جس طرح کہ وہ پسند کرتا ہے کہ اس کی عزیمتوں پر عمل کیا جائے اگرچہ عزیمت پر عمل افضل و ارفع ہے۔ لیکن کبھی کبھی رخصت پر عمل بھی محبوب و مرغوب پڑتا ہے اور بملاحظہ ترفیہ و ترخیص و تیسیر الٰہی حکمِ عزیمت لیا جاتا ہے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ:

وَاللّٰهِ إِنِّي لَأَخْشَاكُمْ بِاللّٰهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ لٰكِنِّي أَصُومُ وَأُفْطِرُ وَأُصَلِّي وَأَرْقُدُ وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي

خدا کی قسم میں تم سب سے زیادہ خشیتِ الٰہی رکھتا ہوں اور تم سے زیادہ تقوائے الٰہی موجود ہے۔ لیکن میں روزہ رکھتا ہوں، افطار کرتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں، شب باشی کرتا ہوں اور بیویوں سے نکاح کرتا ہوں جو میری سنت سے روگردانی کرے وہ مجھ سے نہیں ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری سنت کے مطابق تھوڑا عمل کرنا بدعت میں عمل کثیر سے بہتر ہے۔ اور فرمایا کہ جس نے میری سنت کو زندہ کیا بلاشبہ اس نے مجھے زندگی دی اور جو میری زندگی چاہے تو وہ میرے ساتھ ہوگا۔

بدعت کی بحث۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جس نے فسادِ امت کے وقت میری سنت کو مضبوط تھاما تو اس کیلئے سو شہیدوں کا ثواب ہو گا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ سنت کو مضبوط تھامنا بدعت کی ایجاد سے بہتر ہے۔ یعنی اگرچہ بدعت حسنہ ہے۔ مثلاً آداب خلا و قیلولہ وغیرہ کو زندہ کرنا۔ جیسا کہ سنت میں واقع ہوا ہے۔ مسافر خانے اور مدرسے بنانے سے بہتر ہے اور اس کے کرنے والے کو اقامتِ سنت کی برکت سے قرب و وصال کا اعلیٰ مقام ملے گا اور اسے رضائے حق حاصل ہوگی اور وہ بدعت جو سنت کو بدل دے وہ مردود و مذموم ہے اور یہ مسلمہ قاعدہ ہے لیکن وہ جو ایسی نہ ہو بلکہ سنت کو تقویت دینے والی اور رواج دینے والی ہو اسے بدعت حسنہ کہتے ہیں۔ یہ مصلحت و حکمت کی رعایت کی بنا پر جائز ہے۔

بدعت کے انواع۔ علماء فرماتے ہیں کہ بعض بدعتیں ایسی ہیں جن کا کرنا واجب ہے۔ مثلاً صرف و نحو اور علوم الٰہیہ جو کہ زمانۂ نبوت میں نہ تھا اور بعض بدعتیں مستحب ہیں جیسے مسافر خانے مدارس اور بھلائی کے مقامات بنانا بعض ان میں مباح ہیں جیسے پیٹ بھر کے کھانا اور وغیرہ باقی سب مکروہ و حرام ہیں اور اقامت سنت اگرچہ قلیل و صغیر ہے بدعت سے اگرچہ کثیر و کبیر ہے اور ان میں مصلحت و منفعت بھی ہے اس سے ارفع و اعلیٰ ہے۔

حکایت بر اتباعِ سنت۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کے پاس ان کے ایک حاکم و گورنر نے اپنے علاقہ کے احوال اور چوروں کی کثرت پر خط لکھا اور دریافت کیا کہ ان چوروں کو محض گمان پر پکڑیں یا کسی دلیل و شواہد پر گرفت کریں جیسا کہ سنت ہے اس پر حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ نے لکھا کہ انھیں ان مبینہ دلیل و شواہد سے پکڑیں جن پر سنت جاری ہے اگر وہ اصلاح پذیر نہ ہوں گے تو حق تعالیٰ ان کی اصلاح فرمائے گا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کو دیکھ کر فرمایا "خدا کی قسم میں جانتا ہوں تو ایک پتھر ہے نہ نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان۔ اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے نہ دیکھا ہوتا تو تجھے میں ہرگز بوسہ نہ دیتا۔ اس کے بعد اسے بوسہ دیا۔"

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا گیا کہ جہاں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی کو پھرایا تھا اس جگہ وہ بھی اپنی اونٹنی کو پھراتے تھے۔ لوگوں نے اس کا ان سے سبب پوچھا فرمایا میں نہیں جانتا مگر اس جگہ میں نے رسول اللہ کو ایسا کرتے دیکھا ہے میں بھی کرتا ہوں۔

نیز حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ انہوں نے ایک جگہ وضو کیا وہاں ایک درخت تھا وہ اس کے گرد پھرے اور لوٹے سے اس کی جڑ میں پانی ڈالتے رہے لوگوں نے وجہ پوچھی تو فرمایا میں نے اس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا کرتے دیکھا ہے میں بھی کرتا ہوں اور ارشاد باری تعالیٰ "وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ۔" کی تفسیر میں آیا ہے کہ عمل صالح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء سے ہے۔

حضرت سہل تستری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمارے مذہب کے اصول تین چیزیں ہیں ایک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاق و افعال میں اقتداء دوسرے حلال روزی تیسرے تمام اعمال میں اخلاص کی نیت۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ فرمایا میں ایک روز ایک جماعت کے ساتھ تھا وہ سب برہنہ ہو کر پانی میں داخل ہو گئے مگر میں نے حدیث پر عمل کیا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھے اسے چاہئے کہ حمام میں برہنہ نہ جائے تہبند باندھ کر نہائے چنانچہ میں برہنہ نہ ہوا۔ اسی رات میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے اے احمد تمہیں بشارت ہو کہ حق تعالیٰ نے اس سنت پر عمل کرنے کی وجہ تمہیں بخش دیا اور تمہیں امام بنا دیا کہ ایک جماعت تمہاری پیروی کرے گی۔

عورت ایسے حسن و جمال کی دیکھی نہ گئی کہتے ہیں کہ یہ پانی کے چھینٹے مارنا ازروئے مزاح وہزل تھا۔ تعالیٰ اللہ جب آپ کے مزاح وہزل کا یہ حال ہے تو عزم وکوشش اور قصد وارادہ کی کیا تاثیر ہوگی۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اور حضرت حنظلہ بن جذیم رضی اللہ عنہ کے سر پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک رکھا اور برکت کی دعا فرمائی تو ان کا یہ حال تھا کہ وہ لوگ جن کے چہرے متورم ہوتے آتے یا ان بکریوں کو لایا جاتا جن کے تھن متورم ہو جاتے تو حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ اس مقام سے مس کراتے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دست مبارک رکھا تھا۔ اور اسی وقت ان کا ورم جاتا رہتا۔

ایک اور بچے کے سر پر دست مبارک پھیرا۔ اس کے سر میں گنج تھا وہ اسی وقت ٹھیک ہو گیا اور اس کے بال برابر ہو گئے اور دوسرے بچے جو بیمار و دیوانہ لائے جاتے اور کوئی بچہ بھی کہ جسے دیوانگی اور آسیب ہوتا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سینے پر دست مباک مارتے تو اس کی دیوانگی اور آسیب جاتا رہتا۔

اور عتبہ بن فرقد رضی اللہ عنہ ایک شخص تھا جس کی بیویاں تھیں اور وہ سب ایک دوسرے سے بڑھ کر خوشبوئیں ملا کرتی تھیں لیکن عتبہ رضی اللہ عنہ کی خوشبو ان سب پر غالب رہتی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عارضۂ نملہ کی وجہ سے اس کے شکم اور پشت پر اپنا دستِ مبارک پھیرا تھا۔

اور آپ کے دستِ مبارک کے عظیم ترین معجزات میں "روز حنین" ایک مٹھی خاک لے کر کفار کے چہروں پر پھینکنا اور ان شریروں کی آنکھوں میں ڈالنا ہے اور کفار کے غلبہ پانے کے بعد اس معجزے کی وجہ سے ان کو ہزیمت اٹھانا اور بھاگ کھڑا ہونا پڑا۔ اور اس سے اسلام کو کامیابی کی راہ نصیب ہوئی۔

اور حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سواری کرنے کے بعد آپ کی برکت سے اس میں تیزی وسبک رفتاری پیدا ہو گئی باوجودیکہ آپ کی سواری سے پہلے وہ گھوڑا انتہائی تنگ گام اور سست رفتار تھا۔ پھر وہ ایسا ہوا کہ چلنے اور مقابلہ کرنے میں کوئی گھوڑا اس کی مماثل نہ تھا۔

اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے اونٹ میں تیزی اور سبکی کا بعد سستی وماندگی کے پیدا ہونا بایں وجہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے سبز ٹہنی کھلائی تھی۔ پھر اس کی یہ حالت ہوئی کہ لگام سے اس روکا نہ جا سکتا تھا۔

اسی طرح حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے سست رفتار دراز گوش (گدھے) پر سوار ہونا پھر واپسی کے وقت ترکی گھوڑے کی مانند اس میں تندی وتیزی کا پیدا ہونا ہے اور کوئی جانور اس کی رفتار کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔

اور حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ گھوڑے کی پشت پر بیٹھ نہیں سکتے تھے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینہ پر دستِ مبارک مارا تو وہ عرب میں سب سے بڑھ کر گھوڑ سوار اور جم کر بیٹھنے والے بن گئے۔

انہیں برکتوں میں سے یہ ہے کہ عکاشہ رضی اللہ عنہ کو بدر میں ان کی تلوار ٹوٹ جانے کے بعد درخت کی ٹہنی دے دی گئی اور وہ ٹہنی شمشیر براں بن گئی۔ پھر اس سے عکاشہ ہمیشہ ہر مواقف ومشاہد میں قتال کرتے رہے یہاں تک کہ وہ مرتدین سے جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ انہوں نے اس تلوار کا نام "عون" یعنی مدد رکھا تھا۔ اسی طرح جب روز احد عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو کھجور کی ٹہنی دی گئی تو وہ اس سے ان لوگوں کو قتل کرتے رہے جن کے ہاتھوں میں تلوار تھی۔

اور قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کو اندھیری رات میں کھجور کی ٹہنی دینا اور اس کا راستہ میں روشن ہو جانا اور انہیں یہ خبر دینا کہ جب تم گھر پہنچو گے تو اس میں سیاہی دیکھو گے تو اس سے سیاہی کو جھاڑ دینا کیونکہ وہ شیطان ہے۔ چنانچہ جب وہ گھر پہنچے تو اس سیاہی کو جھاڑ

یہ آیۂ کریمہ بنی تمیم کے وفد یا کسی اور کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے در اقدس پر کھڑے ہو کر پکارا تھا کہ۔ "یَا مُحَمَّدُ اُخْرُجْ عَلَیْنَا" اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارے پاس باہر آیئے اس پر حق تعالیٰ نے ان کی مذمت فرمائی اور فرمایا۔ "اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ" ان میں سے بہت سے عقل سے محروم ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب حضرت عمر اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہما کے درمیان کسی اختلاف پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس شریف میں دونوں کی آوازیں کچھ بلند ہو گئی تھیں اور بعض کہتے ہیں کہ ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ یہ بہرے تھے اور ان کی آواز بھی اونچی تھی۔ اس آیت کے نزول کے بعد وہ اپنے گھر میں بیٹھ رہے تاکہ ان کے عمل اکارت نہ ہوں لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا اور انہیں شہادت اور جنت کی بشارت دی۔ تو وہ روز یمامہ شہید ہوئے۔ یہ حکایت اپنی جگہ انشاء اللہ آئے گی۔

منقول ہے کہ جب آیۂ کریمہ نازل ہوئی تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ خدا کی قسم یا رسول اللہ! آئندہ میں ایسے ہی بات کیا کروں گا جیسے سرگوشی میں کی جاتی ہے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح آہستہ سے بات کرتے تھے یہاں تک کہ بعض وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی بات سمجھا بھی نہ کرتے جب تک کہ دوبارہ استفہام نہ فرماتے اس پر حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ۝ بیشک جو لوگ رسول اللہ کے پاس اپنی آوازوں کو خوب پست کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن سے اللہ نے ان کے دلوں میں تقویٰ کا امتحان لیا ان کیلئے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔

خلیفۂ وقت سے امام مالک کا مناظرہ۔ منقول ہے کہ خلیفہ زمانہ ابو جعفر امیر المومنین نے امام مالک رحمہ اللہ سے مسجد نبوی میں مناظرہ کیا۔ امام مالک رحمہ اللہ نے اس سے فرمایا اے امیر المومنین اپنی آواز کو مسجد میں پست کرو اس لئے کہ حق تعالیٰ نے ایک جماعت کو ادب سکھاتے ہوئے فرمایا۔ "لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ" اپنی آوازوں کو بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اونچی نہ کرو۔ اور ایک جماعت کی مدح و تعریف میں فرمایا۔ "اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ" بے شک جو لوگ اپنی آوازوں کو خوب پست کرتے ہیں (آخر آیت تک) اور ایک گروہ کی مذمت و برائی میں ارشاد فرمایا۔ "اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ۔" جو لوگ حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں...... یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و حرمت بعد وفات بھی ایسی ہی ہے جیسی آپ کی حیات شریفہ میں تھی۔ اس پر خلیفہ رونے لگا اور خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد ابو جعفر خلیفہ نے کہا اے ابو عبد اللہ! میں اپنے چہرہ کو دعا میں قبلہ سے پھیروں یا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ اس پر امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیوں منہ پھیرتے ہو۔ حالانکہ وہ تمہارے وسیلہ ہیں اور تمہارے والد حضرت آدم صفی اللہ علیہ السلام کے روز قیامت وسیلہ ہیں۔ جاؤ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر آپ سے شفاعت مانگو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ" اور اگر وہ اپنی جانوں پر ظلم کر لیں تو وہ بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہو کر مغفرت مانگیں......

جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز مبارک پر اپنی آواز اونچی کرنے کا نتیجہ حبوط و ضیاع اعمال ہیں تو تم کیا گمان رکھتے ہو کہ وہ سنن و احکام جو آپ خدا کے پاس سے لائے اس پر اپنے افکار و خیالات کے تفوق کا کیسا نتیجہ اور ثمرہ بر آمد ہو گا جیسا کہ ارباب عقول اور فلسفیوں کی عادت ہے (اعاذنا اللہ تعالیٰ من ذالک)

آداب نبوی میں سے ایک یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ اقوال میں اپنی رائے سے اعتراض اور شک و شبہہ نہ

کرو۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے اپنی رائے پر اعتراض اور شک وشبہہ کرو اور قیاس سے نص کا مقابلہ نہ کرو۔ بلکہ قیاس کو نص کے مطابق بناؤ اور قیاس کے صحیح ہونے کی شرط ہی یہ ہے کہ وہ نص کے مقابلہ میں نہ ہو۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام مبارک کی حقیقت کو اپنے مخالفانہ خیال سے ردوبدل اور تغیرو تحریف نہ کرو جیسا کہ منطق وفلسفہ والے کرتے ہیں اور اسے وہ معقول کہتے ہیں اور نہ آپ کے کلام میں شک وشبہہ ڈالو۔ اور جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا اور احکام لے کر آئے وہ ان معقولیوں کے موافق ہونے پر موقوف نہیں رکھا گیا تو اس کے ماننے میں عدم موافقت کو دخل نہ دو۔ کیونکہ یہ بے ادبی وجرات کا موجب ہے البتہ متشابہات کی تاویل اور محکمات سے اس کی تطبیق ان شرائط کے ساتھ جو ان کے مقامات میں مسلم ومقرر ہیں ممکن ہے لیکن جہاں استحالہ خالص استبعاد اور خلاف عادت ہو وہاں نہیں۔ ان میں سلف کا مذہب تسلیم وتفویض ہی ہے۔ اور یہ روش تفسیر وحدیث میں مثلاً بیضاوی وغیرہ میں بکثرت ہے ان کے ذکر کی حاجت نہیں۔ (تاب اللہ علیہم وغفرلہم ونسال اللہ العافیۃ)

آدابِ نبوت میں سے ایک یہ ہے کہ جس طرح تحکیم وتسلیم، خشوع وخضوع، تذلل وانکساری اور توکل واعتماد توحید مرسل یعنی بارگاہِ الٰہی میں واجب ہے اسی طرح توحید رسول اور آپ کی تعظیم میں بھی لازم ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ اس جگہ دو توحید ہیں جن کے بغیر کسی بندے کو خدا کے عذاب سے نجات اور اس کی رضا میں کامیابی نہیں ہے ان میں سے ایک توحید مرسل ہے جو حق تعالیٰ کی ربوبیت میں ہے۔ اور دوسری توحید رسول ہے۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت وپیروی میں ہے تو لازم ہے کہ کسی غیر سے محاکمہ نہ کرائے اور کسی غیر کے حکم پر راضی نہ ہو۔ ایسا ہی مواہب لدنیہ میں مدارج السالکین سے منقول ہے۔

آداب نبوت میں سے ایک یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارنے کو یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء کو اپنے میں سے ایک دوسرے کو پکارنے یا دعا کرنے کی مانند نہ بنایا جائے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا "لَا تَجْعَلُوْا دُعَاءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا۔" (الآیہ) رسول کے پکارنے یا رسول کی دعا کو آپس میں ایک دوسرے کی دعاء کے مانند نہ بناؤ۔ مفسرین کے اس آیہ کریمہ کی تفسیر میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ آپ کو آپ کے نام مبارک سے نہ پکارو۔ جیسے کہ تم ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔ بلکہ یا نبی اللہ یا رسول اللہ عظمت وتوقیر کے ساتھ کہو۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارنے کے طریقے کو باہم ایک دوسرے کے پکارنے کی مانند نہ بناؤ کہ اگر چاہا جواب دے دیا اگر نہ چاہا تو جواب نہ دیا بلکہ جب وہ تمہیں بلائیں تو یقیناً تمہیں جواب دینا چاہیے۔ تم پر اس کا ماننا واجب ہے۔ اس میں تخلف کی گنجائش نہیں ہے جیسا کہ آیہ کریمہ کا مضمون ہے کہ "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ" اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے بلانے کو قبول کر کے حاضر ہو جاؤ جب رسول تمہیں اس چیز کیلئے بلائیں جو تمہیں زندگی بخشے۔ اس تقدیر پر مصدر مضاف یعنی لفظ دعا بمعنی فاعل ہے۔ ممکن ہے یہ بات ابن معلّی کے بارے میں ہو کہ وہ نماز میں مشغول تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بلایا انہوں نے جواب نہ دیا۔ اور بعد کو معذرت چاہی کہ نماز میں تھا اس لئے جواب نہ دے سکا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے خدا کا یہ فرمان نہیں سنا کہ "اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ۔" اور حضور کے خصائص شریف کے ضمن میں گزر چکا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک نبی کے بلانے پر حاضر ہونے سے نماز باطل نہیں ہوتی۔

وجوبِ محبت اور تمام مخلوق سے محبوب تر ماننا۔ وصل: جاننا چاہیے کہ محبت اہل ایمان کے دلوں کی زندگی اور ارواح کی غذا ہے۔ اور مقاماتِ رضا اور احوالِ محبت میں یہ مقام سب سے بلند اور افضل ترین ہے۔ اور جو شخص اور جو وقت بغیر محبت کے ہوتا ہے وہ گویا بے روح رہ جاتا ہے۔ محبت کے معنی اور اس کی حقیقت کے کشف وبیان میں اہل محبت کی تعبیریں مختلف ہیں۔ درحقیقت اختلاف تعبیرات، اختلاف احوال پر موقوف ہیں اور اکثر محبت کے نتائج وثمرات پر مشتمل ہیں نہ کہ اس کی حقیقت پر۔

۹ مواہب لدنیہ میں بعض محققین سے منقول ہے کہ محبت کی حقیقت اہل معرفت کے نزدیک ایک معلوماتی کیفیت ہے جس کی لفظوں میں تعریف و تحدید نہیں کی جاسکتی۔ اور نہ ہر کوئی اسے جان سکتا ہے جب تک کہ بطریق وجدان اس پروارد و قائم نہ ہو کیونکہ اس کی تعبیر لفظوں سے ممکن نہیں ہے اور جتنی زیادہ وضاحت کی جاتی ہے اتنا ہی وہ خفی ہوتا جاتا ہے لہٰذا اس کی تعریف و تحدید اس کا وجود ہے۔ انتہیٰ یہ کلام ذوق و محبت اور وجدان میں ہے ورنہ بحسب وضع، اس کے معنی جھکنے اور کسی ایسی چیز کی طرف دل کے مائل ہونے کے ہیں، جو اسے مرغوب و موافق ہو۔ اور محبت کے مراتب و درجات، آثار و ثمرات اور شواہد و علامات ہوتے ہیں جن کا اشارہ اہلِ علم کے کلام میں موجود ہے۔

چنانچہ بعض کہتے ہیں کہ تمام احوال میں محبوب کی موافقت کرنے کا نام محبت ہے۔ اور یہ موافقت ایثار، بخشش اور اس کی طاعت میں ہے یہ نفسانی خواہشات اور ارادۂ قلبی کی بنا پر ہے اور بعض کہتے ہیں کہ محبوب کی خوبیوں میں گم ہونے اور اس کی ذات و صفات میں فنا ہونے کا نام محبت ہے اور یہ احکام، محبت میں فنا ہو جانے میں ہے۔ اور یہ بات اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ خود کو اس میں فنا نہ کر دیا جائے۔ اور اس سے مکمل طور پر محبت نہ ہو جائے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اپنی طرف سے جتنا زیادہ کیا جائے اسے کم تصور کرنا۔ اور محبوب کی طرف سے کتنا ہی کم ہو اسے بہت جاننے کا نام محبت ہے۔ سچی محبت کرنے والا اگر اپنی ہر اس چیز کو جس پر وہ قدرت رکھتا ہے محبوب پر نچھاور کر دے تو وہ اسے بھی کم سمجھتا ہے اور شرمندہ رہتا ہے اور اگر محبوب کی طرف سے تھوڑی سی چیز بھی میسر آتی ہے تو وہ اسے بہت سمجھتا ہے۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ محبت یہ ہے کہ محبوب پر اپنی ہر چیز کو قربان کر دیا جائے اور اپنے لئے اپنی کوئی چیز باقی نہ رہے اور کہتے ہیں کہ دل سے محبوب کے سوا سب کچھ فنا کر دینے کا نام محبت ہے اور یہی کمال محبت کا اقتضاء ہے تاکہ دل میں غیر کے آنے اور غیر کی محبت رہنے کی جگہ ہی باقی نہ رہے۔ کیونکہ دل محبت کے داخل ہونے اور وہاں اثر انداز ہونے کی جگہ ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ محبت محبوب کی اور اس کے دیدار کے شوق میں دل کے سفر کرنے کا نام ہے۔ محبوب کا ذکر ہمیشہ زبان پر رہتا ہے "مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا اَکْثَرَ ذِکْرَہٗ" جو چیز زیادہ محبوب ہوگی اس کا ذکر زیادہ ہوگا۔

یہ تمام معنی دراصل محبت کے آثار و علامات کے ہیں ورنہ حقیقت میں کسی ایسی چیز کی جانب دل کے میلان کا نام محبت ہے جو اس کے موافق ہو یا اس کے ظاہری حواس کے ذریعہ لذت و ذوق حاصل کرنے کے لئے مرغوب ہو۔ جس طرح خوبصورت تصویروں، اچھی آوازوں، لذیذ کھانوں اور خوشبودار چیزوں سے محبت رکھنا وغیرہ۔ اور حواس باطنہ یعنی عقل و دل کے ادراک سے برگزیدہ، معانیِ باطنہ سے محبت کرنا جیسے صالحین، علماء اور ان چیزوں سے محبت رکھنا جو سیرت جمیلہ اور افعال حسنہ کے ضمن میں مامور و معروف ہیں۔ اس لئے کہ انسانی طبیعت فطرۃً اس قسم کی چیزوں کی طرف میلان و شفقت رکھتی ہے۔ خواہ یہ محبت انعام و احسان کی بنا پر ہی ہو۔ بلاشبہ انسان کی طبیعت میں پیدائشی طور پر یہ بات رکھی گئی ہے کہ جو اس پر احسان کرے وہ اس سے محبت و چاہت رکھے۔ غرض کہ محبت کا سبب حسن ہو یا احسان یہ سب اسباب سید السادات، منبع البرکات علیہ افضل الصلوات و اکمل التسلیمات میں ثابت و موجود ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام معانی کے جامع ہیں جو موجب محبت ہیں۔ لیکن حسن و جمال بصورت ظاہر اور فضل و کمال و اخلاق سیرت باطن ان سب میں سے کچھ کا تذکرہ ابواب سابقہ میں گزر چکا ہے وہی اس ضمن میں کافی ہے۔

اب رہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا امت پر انعام و احسان فرمانا تو لطف و کرم، رحمت و شفقت، تعلیم کتاب و حکمت، صراط مستقیم کی ہدایت اور نار جحیم سے رستگاری میں سے ہر ایک انعام و احسان، قدر و منزلت میں کتنا اعظم و اجل ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ

وسلم کی طرف سے جتنے احسانات واکرامات تمام مسلمانوں پر ہوئے ہیں کون ہے جو اس افضال واکرام میں ازروئے منفعت وافادات اعم واشمل ہے۔ اور اس صاحبِ فضل عظیم کی جانب سے کتنا بڑا انعام تمام مسلمانوں پر ہے کہ ہدایت کی طرف آپ ان کے وسیلہ و ذریعہ ہیں اور ان کی فلاح و کرامت کے داعی ہیں اور پروردگارِ عالم کے حضور ان کے شفیع و گواہ ہیں اور موجب بقائے دائم اور نعیم سرمدیوم القرار ہیں تو ثابت ہو گیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حقیقۃً بھی مستوجب محبت ہیں اور شرعاً و فطرۃً بھی چونکہ یہ انسان کی عادت ہے کہ جو ایک یا دو مرتبہ اس پر احسان کرتا ہے اور کوئی فانی نعمت اسے دیتا ہے تو وہ اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے اور اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ لیکن وہ ذات کریم جو اسے نجات بخشے اور اس سے ہلاکت ومضرت کو دور کرے تو وہ اس سے کیوں نہ محبت کرے گا۔ کیونکہ اس ذات کریم نے ایسی نعمتیں عطا فرمائی ہیں جو ابدی و سرمدی ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بلاؤں سے اسے محفوظ فرماتا ہے اور چونکہ انسان کی خصلت ہے کہ وہ حسین وجمیل صورت اور پسندیدہ سیرت کو محبوب رکھتا ہے تو وہ کیوں نہ اس ذات سے محبت کرے جو حسن و جمال کے تمام انواع کا جامع اور فضل وکمال کے تمام اقسام پر حاوی اپنی جانوں، اپنے مالوں اور اپنی اولاد واقرباء سے کہیں زیادہ وافر واکثر ہے اور جو بھی اخلاص کے ساتھ ایمان صحیح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر لایا ہے اس کا وجدان آپ کی محبت سے خالی نہیں ہوا ہے۔ لیکن یہ بات جدا ہے کہ کسی میں محبت کا بہت زیادہ وافر حصہ پایا جاتا ہے اور کسی میں کمتر۔ تو اس کا مدار ترکِ شہوات اور عدم احتجاب غفلت پر ہے۔ اس سے خدا ہمیں پناہ میں رکھے۔ اور اس میں شک وشبہہ نہیں کہ اس معنی میں صحابہ کرام کا حصہ اتم واکمل ہے۔ اس لئے کہ یہ معرفت کا ثمرہ ہے اور ان کی معرفت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عیاں ہے۔ جیسا کہ احادیث و آثار سے منقول و معلوم ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَهَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ

تم فرماؤ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور تمہاری کمائی کے مال اور وہ سودا جس کے نقصان کا تمہیں ڈر ہے اور تمہارے مکان جنہیں تم پسند کرتے ہو یہ چیزیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں لڑنے سے زیادہ پیاری ہوں تو......

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ الخ" تم میں سے کوئی اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والد، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں ایک روایت میں "من اہلہ ومالہ" آیا ہے اور ایک روایت میں من نفسہ آیا ہے۔ مطلب یہ کہ اس کی بیوی اس کے مال اور اس کی جان سے میں زیادہ پیارا ہوں۔ یہ محبت کا کامل اتم مرتبہ ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! آپ مجھے میری ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں مگر اپنی جان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم میں سے کوئی ایماندار نہیں جس کے نزدیک میں اس کی جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہوں۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی آپ میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ فرمایا ہاں اے عمر رضی اللہ عنہ! اب مومن ومخلص بنے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سینے پر دست اقدس رکھ کر تصرف فرمایا۔ اس کے بعد وہ معنی و مفہوم کو پہنچے۔ حضرت سہل تستری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس نے اپنے تمام احوال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولایت نہ دیکھی اور خود کو حضور صلی اللہ

علیہ وسلم کی ملکیت نہ جانا اس نے سنت کی چاشنی نہ چکھی۔ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تم میں مومن اس وقت تک ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ میں اس کی جان سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔ (الحدیث) اور بعض فرماتے ہیں کہ جب تک کہ اپنی تمام خواہشوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا پر قربان نہ کروگے۔ اگرچہ تم موت کے منہ میں پڑے ہو تو بھی مومن نہیں ہو سکتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ محبت بجز اعتقاد عظمت کہیں موجود نہیں۔ اس لئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تو پہلے ہی قطعی طور پر حاصل تھی۔

صاحب مواہب لدنیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اول مرتبہ میں توقف کرنا اور اپنی جان کا استثنا کرنا اس بناء پر تھا کہ انسان کی اپنی جان سے محبت طبعی ہے۔ اور جہت اختیاری، بتوسط اسباب و موجبات علم، بمنافع و مصالح و فوائد ہوتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مراد لینا اختیاری محبت میں تھا۔ اس لئے کہ طبیعتوں میں تبدیلی اور جبلت میں تغیر کی کوئی راہ نہیں ہے اس بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا پہلا جواب بحکم طبع تھا۔ بعد ازاں غور و فکر کر کے اور استدلال سے پہچاننے کے بعد تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے نزدیک اپنی جان سے زیادہ محبوب ہونے چاہئیں۔ اس بنا پر کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی تو دنیا و آخرت کی ہلاکتوں سے نجات دلانے کے ذریعہ و سبب ہیں تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی جو ان کے اختیار کا تقاضا تھا۔ اسی لحاظ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب انہیں یہ حاصل ہوا کہ اے عمر رضی اللہ عنہ! اب تم ایماندار ہوئے۔ مطلب یہ کہ اب تم نے حقیقت حال کو پہچانا اور واجب کے مطابق تم نے جواب دیا۔ انتہٰی۔

اور اس مسکین (صاحب مدارج النبوۃ) کے نزدیک یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا پہلی مرتبہ کا کہنا تخلیقی حکم سے تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے کے بعد جو انہیں حاصل ہوا یہاں تک کہ انہوں نے کہا کہ "آپ میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں تو یہ محبت طبعی تھی اور صاحبِ مواہب کا یہ قول کہ "طبیعتوں کا تبدل اور جبلتوں کا تغیر ممکن نہیں ہے۔" یہ کلیہ نہیں ہے بسا اوقات طبائع اور غرائز ریاضتوں اور مجاہدوں سے تغیر پذیر ہو جاتے ہیں اور حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمت و تصرف سے صحابہ کرام کے نفوس نے تہذیب پائی اور ظلمت کو نورانیت سے بدلا گیا۔ خصوصاً وہ مقام جو مستعد و قابل ہے جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نفس تھا۔ یہ ہے وہ جس کی تائید دوسری حدیث میں مذکور ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے استفسار فرمایا کہ کیا حال ہے کیا میرے سوا کسی اور سے محبت رکھتے ہوا اے عمر (رضی اللہ عنہ)! عرض کیا "ہاں یارسول اللہ! (ﷺ) میری محبت میرے اہل و مال اور اولاد و جان کے درمیان مشترک ہے۔" اس کے بعد حضور ﷺ نے اپنا دست مبارک ان کے سینہ پر رکھا اور فرمایا "اب کیا حال ہے اے عمر (رضی اللہ عنہ)! عرض کیا "اہل و مال اور اولاد کی محبت تو جاتی رہی بجز محبت نفس کے کہ ہنوز باقی ہے۔" پھر دوسری مرتبہ دست مبارک سینہ پر رکھا۔ تو حضرت عمر نے کہا سب کی محبت جاتی رہی بجز آپ کی محبت کے یارسول اللہ۔" نیز ظاہر یہ ہے کہ محبتِ اختیاری حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لئے استدلال سے ہوگی۔ اس کے ظہور کے بنا پر اور ان کا اس سے مطلوب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس مرتبہ اعلیٰ کی تمنا و طلب ہوگی جو محبت جبلی ہے۔ معلوم ہوا کہ غلبۂ محبت اس جگہ تک پہنچتا ہے جہاں تک طبیعت سرایت کرتی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے: "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ اِلَيَّ مِنْ اَهْلِيْ وَمَالِيْ وَنَفْسِيْ وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ اِلَى الْعَطْشَانِ" اے خدا! اپنی محبت کو مجھ میں اپنے اہل و مال اور اپنی جان سے زیادہ محبوب بنادے اور پیاسے کو ٹھنڈا پانی جس طرح محبوب ہوتا ہے اس سے محبوب کردے۔" ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ محبتِ نفس میں اختیار کا شائبہ ہے لیکن پیاسے کی ٹھنڈے پانی سے محبت میں اختیار کو بالکل دخل نہیں۔

حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اموال و اولاد، ماں باپ اور

پیاسے کو ٹھنڈے پانی سے زیادہ محبوب تھے۔

معیت و محبوبیت ۔ وصل: محبت کی سب سے بڑی جزاء اور اس کا ثواب محبوب کے ساتھ معیت کا ثبوت ہے۔ یہ معیت معنوی اور روحانی ہے۔ اگرچہ جسمانی مفارقت و جدائی درمیان میں ہو۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے عرض کیا یارسول اللہ قیامت کب ہوگی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تونے قیامت کیلئے کتنے اعمال کی تیاری کر رکھی ہے؟ مطلب یہ کہ قیامت کے بارے میں کیوں پوچھتے ہو عمل کرو تاکہ روز قیامت تمہارے کام آئے۔ اس نے عرض کیا "میں نے قیامت کیلئے نماز روزہ اور صدقہ وغیرہ اعمال کی کثرت تو کی نہیں ہے البتہ میں خدا کو اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَنْتَ مَعَ مَنْ اَحْبَبْتَ" تو اس کے ساتھ ہوگا جس سے تو محبت رکھتا ہے۔

حضرت صفوان بن قدامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کی اور بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یارسول اللہ مجھے اپنا دست مبارک دیجئے تاکہ میں آپ کی بیعت کروں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک مجھے دیا میں نے عرض کیا "یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اُحِبُّکَ قَالَ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ" یارسول اللہ میں آپ کو محبوب رکھتا ہوں فرمایا آدمی جس سے محبت رکھتا ہے اسی کے ساتھ ہوگا۔ ان لفظوں کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت انس اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے اور امیرالمومنین علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امام حسن و امام حسین رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں کو پکڑ کر فرمایا جو ان دونوں اور ان دونوں کے ماں باپ کو محبوب رکھتا ہے تو وہ روز قیامت میرے ساتھ میرے درجہ میں ہوگا۔ اس میں انتہائی مبالغہ ہے کہ فرمایا میرے درجے میں ہوگا۔ مانا کہ مراد انتہائی قرب و معیت ہے بہ نسبت دوسروں کے۔ کیونکہ اس جگہ مطلق معیت پر اکتفا کیا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص بارگاہ نبوت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا یارسول اللہ آپ میرے نزدیک میرے اہل و مال اور اولاد و جان سے زیادہ محبوب ہیں جب آپ کی یاد مجھے ستاتی ہے تو صبر نہیں آتا۔ جب تک کہ حاضر ہوکر آپ کے جمال مبارک کو نہ دیکھ لوں۔ اور میں جب اپنی موت کو اور آپ کے رحلت فرمائے جانے کو یاد کرتا ہوں اور یہ سوچتا ہوں کہ جب آپ جنت میں داخل ہوں گے تو آپ کو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مقام اعلیٰ و گرامی تر پر فائز کیا جائے گا۔ اور اگر میں جنت میں گیا بھی تو وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کیسے میسر آئے گی۔ اس پر حق تعالیٰ نے یہ آیہ کریمہ نازل فرمائی: "وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ" (اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرتے ہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن نبیوں اور صدیقوں پر اللہ نے انعام فرمایا) اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو بلایا اور یہ آیت سنا کر مژدہ دیا۔ بعض مفسرین اس قصہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہتے ہیں ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سخت محبت تھی جب ان سے صبر نہ ہوا تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس حال میں آئے کہ ان کا رنگ و روپ اڑا ہوا تھا۔ حالت شکستہ و پراگندہ تھی۔ چہرے سے اندوہ و غم نمایاں تھا اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ تمہارا تو رنگ ہی فق ہے۔ عرض کیا "یارسول اللہ!" نہ تو مجھے کوئی بیماری ہے اور نہ درد وغیرہ ہے۔ بجز اس کے کہ میں جب جمال جہاں آرا کو نہیں دیکھتا تو متوحش و پریشان ہو جاتا ہوں اور شدید وحشت طاری ہو جاتی ہے اور جب تک میں حاضر ہوکر جمال جہاں تاب سے فیض یاب نہیں ہو جاتا سکون نہیں پاتا۔ اس سے پہلے میں آخرت کے بارے میں سوچ رہا تھا اور ڈر رہا تھا کہ میں وہاں آپ کی کہاں زیارت کر سکوں گا اس لئے کہ آپ کو تو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مقام اعلیٰ پر لے جایا جائے گا۔ اور اگر میں جنت میں

داخل بھی کیا گیا تو میری جگہ آپ کے درجہ رفیعہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ نیچی ہوگی اور اگر داخل نہ ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی بھی نہ دیکھ سکوں گا۔ اس پر یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی اور بعض تفسیروں میں علی الا جمال عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے شان میں بھی مذکور ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ بارگاہِ نبوی میں ایک شخص بیٹھا ہوا جمال مبارک پر نظر جمائے دیکھ رہا تھا۔ وہ ادھر ادھر نظریں اٹھاتا ہی نہ تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تیرا کیا حال ہے؟ اس نے کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں آپ کے جمال مبارک سے بہرہ مند ہو رہا ہوں اور آپ کے دیدار سے لذت ذوق حاصل کر رہا ہوں۔ البتہ مجھے اس کا غم ہے کہ روز قیامت میں حق تعالیٰ مجھے یہ دیدار نصیب فرمائے گا یا نہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَنْ اَحَبَّنِیْ کَانَ مَعِیْ فِی الْجَنَّۃِ۔" جو مجھ سے محبت رکھتا ہے وہ جنت میں میرے ساتھ ہو گا۔

آگاہ رہو کہ معیت سے مراد درجہ میں برابری نہیں ہوگی۔ اگرچہ بعض حدیثوں میں "کَانَ فِیْ دَرَجَتِیْ" (میرے درجہ میں ہو گا) بھی واقع ہوا ہے تو اس سے مراد جنت میں وہ حیثیت ہے جہاں سے جمال مبارک کا دیدار ہو سکے اور حجابات دور ہوں۔ اگرچہ فاصلے میں دوری ہو اور جب حجاب اٹھ جائے تو دوری ختم ہو جاتی ہے اور مشاہدہ و معیت معنوی سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے۔ اور اربابِ محبت کو مشاہدہ ہو گا اور ان کا غم و اندوہ فقدان رؤیت و مشاہدہ سے ہے اور یہی مطلب معیت کا ہے ورنہ معیت قلبی تو ہمیشہ بغیر مشاہدہ بصری حاصل ہے جیسا کہ بعض غزوات میں فرمایا کہ مدینہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو تمہارے ساتھ سفر میں نہیں ہیں اور نہ وہ کسی منزل میں اترے ہیں مگر یہ کہ وہ تمہارے ساتھ ہیں۔ ان کو عذر و مجبوری نے روک رکھا ہے تو معیت معنوی روح سے ہے نہ کہ قلب و قالب کے محض دیکھنے سے۔ اسی وجہ سے نجاشی بادشاہ حبشہ لوگوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب ترین تھے اور عبداللہ بن ابی راس المنافقین مدینہ میں ہی رہنے کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ابعد خلق تھا۔ باوجودیکہ اس کا گھر مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے متصل تھا۔ لیکن محبان و مشتاقانِ جمال معیت قلبی کے باوجود صحبت بصری کی بھی تمنا رکھتے تھے تاکہ دل اور آنکھ دونوں محظوظ و بہرہ مند ہوں۔

بندۂ مسکین (صاحب مدارج النبوۃ) نور اللہ قلبہ بنور الیقین کہتا ہے کہ ممکن ہے کہ جب مشتاقانِ جمال مبارک نے قیامت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے علو درجہ کی بنا پر جو آپ کو وہاں حاصل ہو گا رویتِ بصری سے محرومی کی شکایت کی تو انہیں اس کی بشارت دی گئی کہ دنیا میں جس طرح فرق مراتب اور تفاوت درجات کے باوجود قلبی و بصری رویت حاصل ہے اسی طرح اس عالم میں بھی بصر و بصیرت متحد ہوں گے اور میری معیت حاصل ہوگی۔ کیونکہ درمیان میں کوئی حجاب حائل نہ ہو گا۔ (واللہ اعلم)

بیانِ رؤیت۔ وصل:۔ اب بعض وہ باتیں بیان کی جاتی ہیں جو محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے شوق لقا کے ضمن میں سلف و آئمہ سے آثار و اخبار میں مروی ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت میں مجھ سے بہت زیادہ محبت کرنے والے وہ لوگ ہیں جو بعد میں آنے والے ہیں ان میں کا ہر ایک مجھے محبوب جانے گا کہ کاش مجھے ایک نظر جمالِ مبارک پر ڈالنے کا موقع ملتا اور اس کے مقابلے میں مجھ سے میرا تمام مال و منال لے لیا جاتا اور مجھے دیدار حاصل ہو جاتا۔ مطلب یہ کہ وہ اپنا تمام مال قربان کر دیتا اور نثار ہو جاتا۔ یہ دیدار شریف کی تمنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اظہارِ محبت ہے کہ اگر اس طرح بھی دیدار میسر آتا تو کر گذرتے۔ اس مفہوم و مطلب پر بطریق فرق و تقدیر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں آپ کے دیدار کی تمنا مراد ہوتی ہے۔ مگر اس مسکین یعنی صاحب مدارج کے خیال میں آتا ہے کہ مراد آپ کے بعد

خواب میں آپ کا دیدار ہوگا جیسا کہ تمام صلحائے امت کو ہوتا ہے۔ یا بیداری میں جیسا کہ کامل ترین اولیائے کرام کو ہوتا ہے۔ نیز بعید از قیاس نہیں ہے کہ کچھ مشتاقانِ جمال اور طالبانِ دیدار حبیب صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ہوں گے کہ اگر تمام مال و منال خرچ کر کے حاصل ہو جائے یہ اگر چہ خواب میں ہی ہو تو غنیمت جانتے ہوں گے۔

ابن اسحاق سے مروی ہے کہ وہ انصاری عورت جس کے باپ، بھائی اور شوہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں سب شہید ہو گئے تھے اس عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال پوچھا کہ کیا حال ہے لوگوں نے کہا بخیریت ہیں۔ اس نے کہا الحمد للہ میں انہیں کو محبوب رکھتی ہوں۔ مجھے بتاؤ کہاں تشریف فرما ہیں تا کہ جمال مبارک کو دیکھوں۔ جب اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو کہنے لگی۔ ”کُلُّ مُصِیْبَۃٍ بَعْدَکَ قَلِیْلٌ“ مطلب یہ کہ آپ زندہ و سلامت ہیں تو ہر مصیبت آسان ہے۔

اور بعض روایتوں میں اس طرح مروی ہے کہ روز احد جب یہ شور برپا ہوا کہ دشمنانِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کشتہ ہو گئے اور بہت سے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی شہید ہو گئے تو مدینہ کی عورتیں نالہ و فریاد کرتی ہوئی نکل کھڑی ہوئیں۔ ایک انصاری عورت بھی سامنے آئی جس کے باپ، بھائی، شوہر اور بیٹے سب شہید ہو چکے تھے۔ لوگ اس کے بھائی، باپ، شوہر اور بیٹے کی لاشیں اس کے سامنے لائے مگر اس عورت نے ان کی طرف کچھ التفات نہ کیا اگر چہ لوگ اس سے کہہ رہے تھے کہ یہ لاش تیرے بھائی کی ہے یہ تیرے باپ کی ہے یہ تیرے شوہر کی ہے یہ تیرے بیٹے کی ہے۔ مگر وہ یہی پوچھتی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہاں ہیں۔ لوگوں نے کہا آگے ہیں تو وہ بے اختیار ہو کر آگے بڑھی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ کر آپ کا دامن اقدس پکڑ کر کہنے لگی یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ مجھے کوئی اندیشہ و فکر نہیں۔ جب کہ آپ سلامت ہیں اب کسی کے مرنے کا غم نہیں۔

جب مکہ والے حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ کو حرم سے شہید کرنے کیلئے نکلے تو اس وقت ابو سفیان بن حرب نے اس سے کہا اے زید! میں تجھے قسم دیتا ہوں کہ کیا تم دل سے یہ چاہتے ہو کہ اس وقت تمہاری جگہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوتے کہ ہم انہیں شہید کرتے اور تم اپنے اہل و عیال میں رہتے اس پر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے خدا کی قسم ہے مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت بھی محبت ہے اور میں دل سے چاہتا ہوں کہ اپنی جگہ رہیں اور نہیں چاہتا کہ ان کے دستِ مبارک میں کانٹا بھی چبھے اور میں اپنے گھر خوش رہوں۔ ابو سفیان نے کہا ”میں نے کسی شخص کو ایسی محبت رکھنے والا نہیں دیکھا۔ جتنا کہ اصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے محبت و وارفتگی رکھتے ہیں۔“ (رضوان اللہ علیہم اجمعین)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک عورت ہجرت کر کے بارگاہِ رسالت میں آئی اور اس نے عرض کیا خدا کی قسم ہے میں نہ تو اپنے شوہر کی عداوت ا[illegible] اس کی نفرت سے ہجرت کر کے نکلی ہوں اور نہ ایک زمین سے دوسری زمین کی طرف آئی ہوں۔ بجز اس کے کہ میں خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتی ہوں۔ اور جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے انتقال کا وقت آیا تو ان کی بیوی گریہ و زاری کرنے لگیں اور ایک روایت میں ہے کہ غم و افسوس کرنے لگیں۔ اس پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ کتنی خوشی و مسرت کا مقام ہے کہ میں کل صبح اپنے آقا سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب و احباب سے ملاقات کروں گا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

در غربتِ مرگ بیم تنہائی نیست　　　یاران عزیزان طرب بیشتر اند

عبدہ بنت خالد بن معدان سے منقول ہے۔ وہ کہتی ہے کہ خالد جب بھی گھر میں سونے کیلئے لیٹتے تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور [illegible] کے اصحاب مہاجرین و انصار سے شوق ملاقات کا اظہار کرتے اور ان کا نام لے لے کر یاد کرتے اور کہتے کہ وہ ہماری اصل و نسل

ہیں ان کی طرف میرا دل کھینچ رہا ہے اور ان سے ملاقات کی تمنا طویل ہوگئی ہے اے خدا! میری جان جلد قبض فرما پھر وہ روتے اور آہ و زاری کرتے رہتے اور یہی کلمات ان کی زبان پر جاری رہتے یہاں تک کہ نیند غلبہ کرلیتی۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ عرض کرتے تھے کہ قسم ہے اس خدا کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا۔ یقیناً۔ ابو طالب کا اسلام میری آنکھوں کو زیادہ ٹھنڈک اور روشنی پہنچاتا بہ نسبت ان کے اسلام کے (یعنی ابو قحافہ رضی اللہ عنہ کے جو کہ میرے والد ہیں) اس لئے کہ ابو طالب کے اسلام سے آپ کی آنکھوں کو ٹھنڈک ہوتی۔

اسی طرح حضرت عمر بن خطاب نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کہا تمہارا اسلام لانا مجھے اپنے باپ خطاب کے اسلام لانے سے زیادہ محبوب ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک تمہارا اسلام لانا زیادہ محبوب ہے۔

زید بن اسلم سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایک رات مخلوق خدا کی پاسبانی کیلئے نکلے تو دیکھا کہ ایک گھر میں چراغ روشن ہے اور ایک بوڑھی عورت اون بن رہی ہے اور کہتی جاتی ہے۔

علیٰ محمد صَلوٰۃ الابرار صلی علیہ الطیبون الاخیار، قَدْ کُنْتَ قوّمًا بکاءً بالاسحار، یالیت شعری والمنایا اطوار، ھل تجمعنی وحبیبی الدار

اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کرتی ہے اور آپ کے لقاو دیدار کے شوق کا اظہار کرتی ہے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیٹھ گئے اور فرمانے لگے اپنے ان کلمات کو دوبارہ کہو۔ تو اس نے حزن و غم اور اندوہ گیں آواز میں ان کو پھر دہرایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ زار و قطار رونے لگے۔ یہ حکایت طویل ہے۔

مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا پاؤں سن ہوگیا تو کسی نے ان سے کہا جو تمہیں سب سے زیادہ محبوب ہو اسے یاد کرو تاکہ اس آفت سے چھٹکارا ملے تو انہوں نے فریاد کی اور کہا "یا محمداہ" ان کا پاؤں اسی وقت ٹھیک ہوگیا۔

مروی ہے کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما کے پاس ایک عورت آئی اور التجا کی کہ میرے لئے قبر انور صلی اللہ علیہ وسلم کا دروازہ کھول دیجئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے قبر شریف کا دروازہ کھول دیا۔ وہ قبر انور کو دیکھ کر اتنا روئی کہ جان دے دی۔

اور زید بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ "صاحب الاذان" کے بارے میں ہے کہ وہ اپنے باغ میں کام کر رہے تھے کہ ان کے لڑکے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر دی وہ روتے ہوئے دعا کرنے لگے کہ اے خدا میری آنکھ کی روشنی لے لے تاکہ میں اپنے محبوب کے بعد کسی کو نہ دیکھ سکوں۔ چنانچہ ان کی بصارت جاتی رہی اس قسم کی دعا بعض دیگر اصحاب کے بارے میں ماثور و منقول ہے۔

علاماتِ محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ وصل: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنے کی علامتیں اور نشانیاں بہت ہیں۔ لیکن سب سے اعلیٰ و اعظم علامت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع و پیروی اور سنتوں پر عمل، ہدایت پر سلوک اور آپ کی سیرت پر چلنا اور حدود شریعت پر قائم رہنا اور آپ کے احکام ملت سے تجاوز نہ کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ۔ " (فرمادو اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اللہ تمہیں اپنا محبوب بنالے گا) گویا اپنی متابعت کو خدا سے محبت کی علامت و دلیل قرار دیا۔ اور خدا کی محبت اور رسول کی محبت دونوں ایک ہی ہیں دونوں لازم و ملزوم ہیں رسالہ قشیری میں ابو سعید حرار سے منقول ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ اپنی محبت میں خدا کی محبت سے باز رہنے میں مجھے معذور تصور فرمائیے۔ مطلب یہ کہ آپ کے ساتھ میری محبت اتنی شدید ہے کہ میں آپکے علاوہ کسی اور طرف توجہ نہیں کر سکتا نہ تو آپ کے غیر کی یاد ہے اور نہ آپ کے غیر کے ذکر میں مشغول ہوں

لیکن چونکہ حق تعالیٰ کی محبت اصل ومقدم ہے۔ اور آپ نے ایسا فرمایا بھی ہے مگر میں آپ کی محبت کے اقتضاء میں اتنی فرصت ہی نہیں پاتا اور نہ کسی اور کی محبت کی گنجائش ہے۔ جیسا کہ میری محبت کا اقتضاء ہے میں اسی کو کما حقہ ادا نہیں کر سکتا تو کسی اور سے کیسے محبت کروں۔ اگر چہ بظاہر یہ کلمہ بے تمیزی کا ہے۔ اور ان کے سُکر کا حال ہے۔ اور جمع وا جمال کے مرتبہ میں ہے کیونکہ اس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا خوب فرمایا۔ "یَا مُبَارَکُ مَنْ اَحَبَّ اللّٰہَ فَقَدْ اَحَبَّنِیْ۔" اے مبارک! جو خدا سے محبت رکھتا ہے بلاشبہ وہی مجھ سے محبت رکھتا ہے۔ مطلب یہ کہ خدا کی محبت اور میری محبت ایک ہے دونوں لازم وملزوم ہیں۔ لیکن بر بنائے غلبہ سکر اور حقیقت حال پر اطلاع میں عدم تمیز کی وجہ سے بظاہر نظر بصیرت پر جاتی ہے یہ ہے اشتباہ کا سبب۔ اور بعض کوتاہ بین لوگ ایسے ہیں جو شہود و حق کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے جدا اور مفارق تصور کرتے ہیں۔ اور وہ اس کے ہر گوشہ سے واقف نہیں ہوتے۔ اس مضمون کو علیحدہ رسالہ میں بیان کیا ہے۔ بعض مدعیوں نے اس سے زیادہ کھل کر بات کی ہے اور ممکن ہے کہ اس کلام نے حضرت ابو سعید کو تعجب میں ڈال دیا ہو کہ یہ جو تم کہہ رہے ہو بے معنی اور پراز خطا ونقص ہے اس خیال سے باز آجاؤ! ایسی بات زبان پر نہ لاؤ لیکن چونکہ ابو سعید، صادقان راہ، خاصان درگاہ اور محبان آگاہ میں سے ہیں اس لئے ان کو "یا مبارک" کہہ کر خطاب فرمایا گیا۔ اور معذور رکھا۔ اور نرمی وملائمت سے منع فرمایا۔ اور وہ سختی وشدت جو حقیقت حال سے متوقع تھی نہ فرمائی اسی کی مانند ایک واقعہ حضرت رابعہ بصریہ سے متعلق بھی بیان کیا جاتا ہے۔ (وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِحَقِیْقَۃِ الْحَالِ) اسے بھی اسی طرح جیسا کہ ابھی کہا گیا محمول کیا جائے گا۔

در حقیقت محبت، علتِ متابعت اور اس کا باعث ہے لہٰذا متابعت دلیل وعلامتِ محبت ہے۔ اور علماء فرماتے ہیں کہ محبت، مطالعۂ نعمت سے ابھرتی ہے اور نعمت پر جتنی اطلاع حاصل ہوگی اتنی ہی قوت سے محبت پیدا ہوگی۔ اور یہ بملاحظہ احسان اور بمشاہدہ حسن وقدر بھی پیدا ہوتی ہے اور متابعت سے حاصل ہوتی ہے اس لئے کہ محبت بالذات اتفاق واتحاد کی مقتضی ہے اور جب متابعت، محبت کو ابھارنے والی ہے تو طاعات وعبادات میں کوئی بوجھ اور مشقت معلوم نہیں ہوگی بلکہ غذائے قلب، نعیم روح، سرور خاطر اور آنکھوں کی ٹھنڈک معلوم ہوگی اور جسمانی لذتوں سے یہ عظیم تر معلوم ہوں گی۔ خصوصاً اس وقت جبکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت کا تصور بھی شامل ہو جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ: "مَنْ اَحْیٰی سُنَّتِیْ فَقَدْ اَحْیَانِیْ وَمَنْ اَحْیَانِیْ کَانَ مَعِیْ فِی الْجَنَّۃِ۔" جس نے میری سنت کو زندہ کیا بلاشبہ اس نے مجھے زندہ کیا اور جس نے مجھے زندہ کیا وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ حقیقت میں محبت ایک نور ہے اور معصیت ظلمت وتاریکی اور نور ظلمت وتاریکی کو زائل کرنے والا۔

علماء فرماتے ہیں کہ متابعت حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی مقام افضل نہیں ہے لیکن واضح رہنا چاہئے کہ انواع محبت میں متابعت، بہت قوی واکمل نوع ہے۔ جو بھی متابعت کی صفت سے متصف ہے وہ کامل المحبۃ اور عالی مرتبت ہے اور جو بعض امور میں مخالف ہے ناقص المحبۃ ہے اور مقام ودرجہ میں بھی کم ہے لیکن اسم محبت اور اس کی صفات کی اصلیت سے باہر نہیں ہے اس کی دلیل یہ واقعہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص پر شراب پینے کے سلسلے میں حد جاری فرمائی تھی اور اس سے دوسری مرتبہ بھی شراب پینے کا فعل سرزد ہو گیا تھا جس پر لوگوں نے اس پر لعنت وملامت کی تھی اس پر آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ: "لَا تَلْعَنُوْہُ فَاِنَّہٗ یُحِبُّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ" اس پر لعنت نہ بھیجو کیونکہ یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے۔ دراصل یہ شخص بدوؤں میں سے تھا اس کا نام زاہر تھا یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ککڑی وسبزی وغیرہ لا کر پیش کیا کرتا تھا اور حضور بھی شہر کی چیزیں، کپڑا گھی وغیرہ عطا فرمایا کرتے تھے۔ اور فرمایا کرتے زاہر یہ ہماری دوستی کا نشان ہے کیونکہ ہم شہری ہیں اور بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ

شراب پینے والے کا نام عبداللہ تھا اور جس کا خمار لقب تھا اور زاہر وہ دوسرا شخص تھا۔ (واللہ اعلم)

اس ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل محبت اسی میلان اور کشش کا نام ہے اگرچہ متابعت میں کسی قسم کی خطاو غلطی سرزد ہوجائے نیز یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ مرتکب گناہ کبیرہ کافر نہیں ہے جیسا کہ اہلِ سنت و جماعت کا مذہب ہے۔ بایں ہمہ واضح رہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا دائمی ثبات، عاصی کے دل میں اس امر پر مشروط و مفید ہے کہ وہ اس معصیت سے شرمسار ہو اور اس پر حد شرعی نافذ ہوچکی ہو تو وہ گناہ کا کفارہ بن جاتا ہے اس کے برخلاف کہ نہ تو وہ شرمسار ہوا اور نہ اس پر حد جاری ہوئی تو خطرہ ہے کہ تکرارِ گناہ اور اس پر طبعی طور پر اصرار، کہیں اس سے ایمان کو سلب نہ کرلے اور دل پر مہر نہ لگادے العیاذ باللہ تعالیٰ علاماتِ محبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں سے آپ کے ذکر شریف کی کثرت بھی ہے اس لئے کہ کثرت ذکر، لوازم محبت میں سے ہے "مَنْ اَحَبَّ شَيْئًا اَكْثَرَ ذِكْرَهٗ" (جس سے زیادہ محبت ہوتی ہے اس کا ذکر آدمی کثرت سے کرتا ہے) اور بعض محبت کی تعریف دائمی ذکر محبوب سے کرتے ہیں اور یہ سعادت، خدمت علم دین اور علم سیر کی کتابوں کے مطالعہ سے حاصل ہوتی ہے اور اصحابِ علم حدیث کو خاص قسم کی نسبت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مخصوص لگاؤ ہوتا ہے جو کسی اور کو حاصل نہیں ہے اس لئے کہ ان کی زبانوں پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال وصفات کا ذکر شریف ہمیشہ رہتا ہے اور وہ اسے وردِ جان بنائے رکھتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کی صفات کی معرفت اور آپ کے احوال تعینی وتشخصی کی شناخت انہیں کو حاصل ہوتی ہے اور ہمیشہ جمال مبارک کی شبیہہ و تصویر، ملحوظ نظر اور ان کے نصب العین میں رہتی ہے۔ اور آپ کی خیالی شبیہہ وتصویر اتصال باطنی میں قوی و متصل ہوتی ہے اور جب آپ کے اسم گرامی کا ذکر ہوتا ہے تو اس کی لذت ان کے دلوں میں سرایت کئے ہوئے ہوتی ہے اور نام والے کی عظمت دل میں مشاہدہ کرتی اور مستحضر ہوتی ہے۔ اور یہ ہمیشہ حاضر درگاہ رہتے ہیں۔ ان حضرات کی اس باب میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشارکت و مشابہت ہے۔ کیونکہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال، اقوال اور افعال کی خبر رکھتے ہیں اور وہ مصاحبت و مجالست اور مکالمت کے ساتھ مخصوص ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ان کی صحبت معنوی ہے اور یہ صحبت ظاہری وصوری سے دور ہیں۔ اور فوائد عظمیٰ میں سے ایک فائدہ یہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر انور کی زیارت کرنے والے اور خطہ پاک کی جہاں یہ قبرِ انور شریف واقع ہے حاضری دینے والے کو حاصل ہوتا ہے۔ جب وہ ان کے ذکر شریف میں شب و روز گزارتے ہیں جو کہ متخلق باخلاق اللہ ہیں تو اس ارشاد کے مصداق بن جاتے ہیں کہ: "فَاذْكُرُوْنِيْ اَذْكُرْكُمْ" (تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا) اور ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی یاد فرماتے ہیں۔ اور درود وسلام جو اقرب وسائل ہے اس علم شریف کا جز ہے ایک بزرگ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ مجھے تحصیل وخدمت علم حدیث پر سب سے زیادہ ابھارنے والا اور سب سے قوی برانگیختہ کرنے والا، یہ لفظ ہے کہ "قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ تعالى عليه وسلم"

اور علاماتِ محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر شریف کے وقت آپ کی تعظیم و توقیر بجالانا اور آپ کے اسم مبارک کے سننے پر اظہار خشوع وخضوع اور انکساری کرنا بھی ہے جو جس سے محبت کا دعویٰ کرتا ہے وہ اس کے سامنے عاجزی کرتا ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد یہ حال تھا کہ جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے تو رونے لگتے اور خشوع کا اظہار کرتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غایت تعظیم اور آپ کی ہیبت وجلال سے ان کے جسموں کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے۔ یہی حال تابعین اور ان کے بعد والوں کا تھا۔ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔)

ابو ابراہیم یحییٰ فرماتے ہیں کہ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرے۔ یا اس کے سامنے ذکر کیا

جائے تو وہ خشوع و خضوع کا اظہار کر کے اور بدن کو ساکن کر کے جنبش تک نہ دے۔ اور خود پر ہیبت و جلال طاری کرے گویا کہ اگر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو ہوتا اور اس وقت جیسا ادب فرض تھا وہی ادب ادا کرتا اس وقت بھی ویسا ہی ادب کرے۔ ابو ایوب سختیانی کا یہ حال تھا کہ جب ان کے سامنے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جاتا تو اتنا روتے کہ لوگوں کو ان کی حالت پر رحم آجاتا۔ اور جعفر بن محمد باوجودیکہ کثیر المزاح اور ہنس مکھ تھے مگر جب ان کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آتا تو ان کا رنگ زرد پڑ جاتا۔ اور عبدالرحمٰن بن القاسم رضی اللہ عنہما کا یہ حال تھا کہ جب ان کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جاتا تو ان کا رنگ دگرگوں ہو جاتا اور ان کی کمر دوہری ہو جاتی۔ یہاں تک کہ ہم نشینوں پر دشواری پیدا ہو جاتی۔ ایک مرتبہ لوگوں نے ان سے دریافت کیا آپ کا یہ کیا حال ہو جاتا ہے؟ فرمایا اگر تم وہ دیکھتے جو میں نے دیکھا ہے تو تم اس کا انکار نہ کرتے۔ بلاشبہ میں نے محمد بن المنکدر رضی اللہ عنہ کو جو سید القراء تھے دیکھا ہے کہ ہم قریب نہ ہوئے تھے کہ ہم ان سے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھیں کہ ان پر اتنا گریہ طاری ہو گیا کہ ہم ان کی حالت پر رحم کھانے لگے۔ بلاشبہ جب ان کے سامنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جاتا تو ہم ان کے چہرے کی طرف دیکھتے گویا اس سے خون کھینچ لیا گیا ہے اور ہیبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ان کی زبان ان کے منہ میں ہوتی۔ اور عامر بن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کا یہ حال تھا کہ جب ان کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جاتا تو وہ رونے لگتے۔ یہاں تک کہ ان کی آنکھوں میں آنسو تک باقی نہ رہتے۔ اور زہری رحمۃ اللہ علیہ بڑے با اخلاق اور مجلسی زندگی رکھنے والے شخص تھے مگر جب ان کے سامنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جاتا تو وہ ایسے ہو جاتے گویا ان کو نہ تم جانتے اور نہ وہ تم کو جانتے ہیں۔

اور صفوان بن سلیم بڑے عابد و زاہد لوگوں میں سے تھے جب ان کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جاتا تو اتنا روتے کہ لوگ اٹھ کر ان کے پاس سے چلے جاتے اور ان کو اپنی جگہ پر چھوڑ جاتے۔

اور قتادہ رضی اللہ عنہ کا یہ حال تھا کہ جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی سنتے تو ان پر لرزہ طاری ہو جاتا اور رونے لگتے اور عبدالرحمٰن بن مہدی کا یہ حال تھا کہ جب حدیث پڑھی جاتی تو لوگوں کو خاموش رہنے کا حکم دیتے اور فرماتے۔ "لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ۔" اور فرماتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی قرأت کے وقت خاموش رہنا، اسی طرح فرض ہے جس طرح کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام فرمانے کے دوران خاموش رہنا اور سننا فرض ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی سنتے وقت آپ پر درود بھیجنے کے سلسلے میں مفصل بحث ہے جو انشاء اللہ متعلقہ باب میں آئے گی۔

اور علاماتِ محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے لقائے حبیب میں کثرت شوق بھی ہے۔ اس لئے کہ ہر طالب و محبّ، لقائے حبیب کو دوست رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اَلْمَحَبَّةُ هِيَ الشَّوْقُ اِلَى الْحَبِيْبِ محبت یہ شوق ہے حبیب کی لقا کا۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ حال تھا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شوق بے چین کرتا اور سوزش محبت انہیں مضطرب کرتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا قصد کرتے اور جمال جہاں آرا سے شفا کے متمنی ہوتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم نشینی سے لذت و سرور حاصل کرتے اور آپ پر نظریں جمائے رہتے تھے۔ اشعریوں کی حدیث میں آیا ہے کہ مدینہ منورہ میں قدم رنجہ فرمانے کے وقت لوگ رجز گا رہے تھے اور کہہ رہے تھے: "غَدًا نَلْقَى الْاَحِبَّةَ مُحَمَّدًا وَ صَحْبَهٗ۔" اور بعض آثار و احادیث میں حضرت بلال، حضرت عمار، حضرت خالد، اور معدان رضی اللہ عنہم وغیرہ کے اقوال بیان ہوئے جو اس باب کے مناسب ہیں۔

علاماتِ محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہر اس شخص سے محبت رکھنا بھی ہے جو آپ سے تعلق رکھتا ہے وہ اہل بیت میں سے ہو یا صحابہ میں سے، مہاجرین میں سے ہو یا انصار میں سے (رضی اللہ عنہم اجمعین) اور ہر اس شخص سے عداوت رکھنا بھی ہے جو ان سے دشمنی رکھے اور انہیں گالیاں دے گویا کہ جو انہیں دوست رکھے ان کو دوست جانے اور جو انہیں دشمن جانے ان سے دشمنی رکھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما کے بارے میں فرمایا۔ خداوندا! جو ان سے محبت رکھتا ہے تو بھی اسے دوست رکھ۔ اور فرمایا جو کوئی ان سے محبت رکھتا ہے بلاشبہ وہ مجھ سے محبت رکھتا ہے اور جو مجھ سے محبت رکھتا ہے یقیناً وہ خدا سے محبت رکھتا ہے اور جو کوئی ان سے دشمنی رکھتا ہے وہ مجھ سے دشمنی رکھتا ہے اور اسے خدا دشمن جانتا ہے۔

اور حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے بارے میں فرمایا وہ میرے گوشت کا ٹکڑا ہے جو چیز انہیں غضب میں لاتی ہے وہ مجھے غضب میں لاتی ہے۔

اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا اے عائشہ رضی اللہ عنہا! ان سے محبت رکھو کیونکہ میں بھی ان سے محبت رکھتا ہوں۔

اور صحابہ کرام کے بارے میں فرمایا "انہیں نشانہ نہ بناؤ اور جو کوئی ان سے محبت رکھتا ہے وہ مجھ سے محبت رکھنے کی بنا پر ان سے محبت کرتا ہے اور جو ان سے دشمنی رکھتا ہے وہ مجھ سے دشمنی رکھنے کی بنا پر ان سے دشمنی رکھتا ہے اور جو کوئی انہیں ایذا دیتا ہے بلاشبہ وہ مجھے ایذا دیتا ہے اور جو مجھے ایذا پہنچاتا ہے وہ خدا کو ایذا دیتا ہے اور جو خدا کو ایذا دے قریب ہے کہ وہ خدا کی پکڑ اور عذاب میں آئے۔"

اور فرمایا ایمان کی علامت، انصار سے محبت رکھنا ہے اور نفاق کی علامت ان سے دشمنی رکھنا ہے۔ اور فرمایا جو عرب سے محبت رکھتا ہے وہ بلاشبہ مجھ سے محبت رکھنے کی وجہ سے ان سے محبت رکھتا ہے۔ اور جو ان سے دشمنی رکھتا ہے وہ مجھ سے دشمنی رکھنے کی بنا پر انہیں دشمن رکھتا ہے۔

علامات محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے امت پر مہربانی و شفقت، التزام نصیحت، اقامتِ مصالح میں کوشش، ایصال منافع اور ان سے ضرر و نقصان رساں چیزوں کو دفع کرنا بھی ہے در حقیقت جو کسی سے محبت رکھتا ہے وہ اس کی ہر اس چیز سے محبت رکھتا ہے جس سے وہ محبت رکھے اور یہ سلف کی خصلت و سیرت تھی۔ حتیٰ کہ دعاؤں میں بھی اور اپنی خواہشوں میں بھی۔ چنانچہ جب حضرت انس رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کدو کو پسند فرماتے ہیں تو وہ ہمیشہ کدو سے محبت رکھنے لگے۔ اور حسن بن علی اور عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہم اور سلمٰی رضی اللہ عنہا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خادمہ تھیں ان کے پاس آتے اور ان سے خواہش ظاہر کرتے کہ وہ کھانا تیار کرو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھا (آخر حدیث تک)

علاماتِ محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے علماء صلحاء اور متبعین سنت کے ساتھ محبت رکھنا اور جاہلوں، فاسقوں، اور اہل بدعت سے بغض رکھنا بھی ہے اور ہر وہ شخص جو مخالف شریعت ہو اسے ناگوار جاننا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَادُّوْنَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ۔" وہ لوگ جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں ان کے دلوں میں اس قوم کی محبت نہ پائی جائے گی جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی رکھتے ہیں اگرچہ وہ ان کے باپ ہی کیوں نہ ہوں اور یہ اصحابِ نبی رضی اللہ عنہم کی جماعت ہے جنہوں نے اپنے باپ، بیٹوں، بھائیوں اور دوستوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کی خواہش میں مار دیا۔ عبداللہ بن ابی جو منافقوں کا رئیس و سردار تھا اس کے بیٹے عبداللہ نے جو مخلصوں میں سے تھے اپنے منافق باپ کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا اگر حضور چاہیں تو میں اپنے باپ کا سر اتار کر لے آؤں جب کہ اس منافق نے یہ کہا تھا کہ:

"لَئِن رَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ" کہتے ہیں ہم مدینہ پھر کر گئے تو ضرور جو بڑی عزت والا ہے وہ اس میں سے نکال دے گا اسے جو نہایت ذلت والا ہے (معاذ اللہ) اور اس نے "اعز" یعنی عزت دار سے خود کو مراد لیا تھا۔ اور "اذل" سے اصحاب رسول ﷺ کو۔ اور جب یہ مدینہ لوٹا تو اس منافق کا بیٹا یعنی عبداللہ رضی اللہ عنہ اپنی تلوار سونت کر شہر کے دروازے پر آکر کھڑے ہو گئے اور اپنے باپ سے کہا اب تو اپنی زبان سے کہہ کر: "أَنَا أَذَلُّ النَّاسِ وَأَصْحَابُ مُحَمَّدٍ أَعَزُّ النَّاسِ" میں لوگوں میں سب سے زیادہ ذلیل ہوں اور اصحاب رسول ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ عزت دار ہیں۔ ورنہ میں تیری گردن اڑا دوں گا اس پر اس نے اپنی زبان سے مذکورہ الفاظ ادا کئے اور اس کا اقرار کیا تب انہوں نے چھوڑا۔ حویصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور محیصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ دو بھائی تھے ان میں سے چھوٹا بھائی ایمان لے آیا تھا اور حضور اکرم ﷺ نے اس کو اس یہودی کے قتل کرنے پر مقرر فرمایا تھا جو مفسدوں میں سے تھا تو اس کے بڑے بھائی نے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا کیا تم اس آدمی کو مار ڈالو گے جس کی نعمتوں کے آثار ہمارے پیٹ کی چربیوں میں ہیں۔ اس نے کہا "کیا ہوا اگر حضور ﷺ فرمائیں کہ میں تجھے مار ڈالوں تو اسی وقت میں تجھے قتل کر دوں گا۔ پھر وہ بھائی اپنے گھر آیا اور انصاف سے سوچنے اور کہنے لگا عجیب دین ہے جسے تو نے اختیار کیا ہے اس سے تیری اتنی محبت ہے اس کے بعد وہ بھی مسلمان ہو گیا۔

علامات محبت رسول ﷺ میں سے قرآن کریم سے محبت رکھنا بھی ہے۔ کیونکہ حضور اکرم ﷺ قرآن خدا کی طرف سے لائے۔ اور آپ مہدی و ہادی اور قرآنی تعلیمات سے موصوف ہیں چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا: "كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ" حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق قرآن ہے اس کی تلاوت کرنا، اس پر عمل کرنا، اس کو سمجھنا، اس میں غور و خوض کرنا اور اس کے حدود کو قائم کرنا علاماتِ محبت میں سے ہے۔ حضرت سہل تستری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خدا سے محبت کی نشانی قرآن سے محبت رکھنا ہے اور قرآن سے محبت، نبی سے محبت کی علامت ہے اور نبی سے محبت کرنے کی علامت سنت سے محبت رکھنا ہے۔ اور سنت سے محبت، آخرت سے محبت رکھنا ہے اور آخرت سے محبت دنیا سے بغض رکھنا ہے اور دنیا سے بغض رکھنے کی علامت یہ ہے کہ دنیا میں کوئی ذخیرہ نہ کرے بجز اس توشہ کے جو آخرت میں کام آئے۔

امیر المومنین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر قلوب انسانی پاک و صاف ہوں تو وہ قرآن سے کبھی سیر نہ ہوں گے اور کیونکر سیر ہو سکتے ہیں کہ وہ ان کے محبوب کا کلام ہے اور یہی اس کا غایت مقصود ہے۔ یہ کیفیت ان دلوں کی ہے، جو پاک ہیں اور نورِ ایمان سے منور ہیں۔ بیت ۔

جمال شاہد قرآں نقاب آنگاہ بکشاید   کہ دارالملک ایماں رابیابد خالی از غوغا

درحقیقت خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا معیار و مصداق قرآن و حدیث ہے۔ اس لئے کہ محبوب کا کلام محبوب ہوتا ہے اور حیف افسوس ہے کہ کلام اللہ کی محبت سے زیادہ لہو و لعب اور گانے باجے سے محبت رکھی جائے۔ حالانکہ یہ فسادِ قلب اور خرابی باطن کا نشان ہے۔

بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ من حیث القرآن، علامتِ ذوقِ قرآن یہ ہے کہ حسن صوت اور اس کا دل دونوں برابر ہوں اور وہ لوگ جو بغیر آواز کے لطف نہیں لیتے یا آواز سے زیادہ لطف لیتے ہیں درحقیقت وہ آواز سے لطف اٹھاتے ہیں نہ کہ قرآن سے۔ یہ بات مبالغہ سے خالی نہیں ہے ورنہ صوت حسن، قرآن کی زینت اور اس کا لہجہ ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ: "زَيِّنُوا الْقُرْآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ وَمَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ فَلَيْسَ مِنَّا۔" قرآن کو اپنی آوازوں سے زینت دو اور جو قرآن عمدہ لہجے سے نہیں پڑھتا وہ ہم میں سے نہیں۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا سماعِ قرآن کے وقت یہ حال ہوتا تھا کہ: "اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ" رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو نازل ہوا جب وہ اسے سنتے تو تم ان کی آنکھوں کو دیکھتے کہ وہ آنسو بہاتی ہیں جسے انہوں نے حق کی جانب سے سمجھا اور صحابہ کرام میں بکثرت ایسے صاحبِ حسنِ صوت تھے جو دل سے قرار لے جاتے اور سینہ سے روح کھینچ لیتے۔ اور ایمان میں افزونی پیدا کرتے تھے۔ خصوصاً حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما وغیرہما۔

زیادتیٔ ایمان اور اس کی تقویت کیلئے قرآن کو صوت حسن سے سننے سے بالاتر کوئی چیز نہیں ہے خصوصاً اہل عرب کا صوت حسن۔ ایک رات حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ قرآن پڑھ رہے تھے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک گوشہ میں ان کی آواز پر کان لگائے لذت حاصل کر رہے تھے اور محظوظ ہو رہے تھے۔ جب صبح ہوئی تو ان سے فرمایا رات کیا خوب قرآن پڑھ رہے تھے میں سن رہا تھا۔ انہوں نے کہا آہ! اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سماعت فرما رہے ہیں تو میں اپنی آواز کو اس سے زیادہ آراستہ بناتا۔ بیت۔

رجائے یار گویا گوش بر آواز من دارد　　دلم راشادی رو دادہ ازنا لیدنم امشب

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔ میرے سامنے قرآن کا کچھ حصہ تلاوت کرو۔ عرض کیا یارسول اللہ میں آپ کے سامنے تلاوت کروں حالانکہ آپ پر تو قرآن نازل ہوا ہے فرمایا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے سے غیر سے سنوں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے تلاوت قرآن کی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور آپ کا سینۂ اطہر جوش مارنے لگا۔ بالکل اسی طرح جس طرح دیگ میں جوش آتا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو کبھی کبھی درد کا دورہ پڑا کرتا تھا اور راستہ میں شدت درد سے زمین پر لوٹنے لگتے تھے پھر وہ دو ایک دن گھر میں آرام کرتے لوگ انہیں بیمار سمجھ کر ان کی عیادت کیلئے آتے تھے جب صحابہ کرام کا اجتماع ہوتا اور ان میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بھی ہوتے تو کہتے اے ابو موسیٰ (رضی اللہ عنہ) کچھ خدا کا ذکر ہمیں بھی سناؤ تو ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ قرآن کی تلاوت کرتے اور وہ سب اسے سنتے۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین)

امام احمد اور دیگر محدثین روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن حضرت داؤد علیہ السلام سے فرمائے گا کہ میری حمد اس آواز میں کرو جو دنیا میں کرتے تھے، حضرت داؤد علیہ السلام عرض کریں گے میں کس طرح تیرے حضور اے رب اپنی اس آواز سے حمد کروں۔ حق تعالیٰ فرمائے گا میں تمہارے اندر وہی سوز و گداز پیدا کرتا ہوں جیسا پہلے تھا۔ اس کے بعد داؤد علیہ السلام ساق عرش پر کھڑے ہو کر حمد کریں گے جب اہلِ بہشت اس آواز کو سنیں گے تو وہ جنت کی نعمتوں کو فراموش کر کے اس آواز کی طرف متوجہ ہو جائیں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کلام خدا کو سنیں گے جو حضرت داؤد پر نازل ہوا اور زبور میں ان سے خطاب فرمایا۔ اس پر جب ربِ کریم کی وجہ کریم کا اضافہ ہو اور سبحانہ وتعالیٰ کی رویت بھی سامنے ہو تو وہ سب کچھ فراموش کر کے اس کی جانب مستغرق ہو جائیں گے۔

اس سلسلے میں شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ سماع قرآن ہے اس سماع میں دو اہلِ ایمان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف تو اشعار کے پڑھنے میں ہے جو موسیقی کے طرز میں گائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ تو اسے وصال و قرب کا ذریعہ جانتا ہے اور دوسرا گروہ اسے فسق سے ملاتا ہے۔ دونوں جانب افراط و تفریط ہے انتہی۔ یہ جو کچھ محبتِ قرآن کے سلسلے میں بیان کیا گیا ہے وہ تلاوت محبت اور اس کی تعظیم کی حیثیت سے ہے۔ اور اتباع و عمل کی حیثیت ان سب سے بلند ہے کیونکہ دینِ اسلام اور

بوت نبوت و رسالت کا مدار قرآن پر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔ " یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَکُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا۔ " اے لوگو بے شک تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس برہان تشریف لے آیا۔ اور ہم نے تمہاری طرف نور مبین نازل فرمایا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کمال محبت کی علامت، دنیا میں زہد وایثار، فقر اور قرآن کے ساتھ متصف ہونا ہے۔ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ فقر جس کی طرف دوستی بڑھاتا ہے وہ اس گھوڑے سے تیز تر ہے جو اوپر سے نیچے اترے۔ ایک شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آیا اور اس نے کہا یارسول اللہ میں آپ سے محبت رکھتا ہوں۔ فرمایا ہوش کر اور سوچ سمجھ کر کہہ کہ کیا کہہ رہا ہے اس نے پھر عرض کیا میں آپ سے محبت رکھتا ہوں۔ فرمایا اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو خود کو فقر کے لئے آمادہ کرلو۔ ایک اور شخص آیا اس نے کہا کہ میں خدا سے محبت رکھتا ہو۔ فرمایا تو بلا و مصائب کیلئے تیار ہو جا۔ شیخ اجل و اکرم عبدالوہاب متقی قادری شاذلی رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب ہمارے مرشد نے انابت وارادت کا ہاتھ تھاما تو فرمایا کہو۔ "اَلْفَقْرُ اَفْضَلُ مِنَ الْغِنَآءِ " تونگری سے فقر افضل ہے۔ انہوں نے ہم سے سب سے پہلے فقر کی افضلیت کا اقرار کرایا اس کے بعد انہوں نے مرید کیا۔ اس مقام سے بعض ان مدعیان و متصوفان زمانہ کا گمان باطل ہو جاتا ہے جو یہ دعویٰ کرتے اور کہتے ہیں کہ ہمیں تمام اتباع کے مراتب حاصل ہوگئے ہیں باوجودیکہ وہ گرفتار دنیا ہوئے ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں کے بارے میں حق سبحانہ وتعالیٰ کا یہ ارشاد درست ہے کہ " فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْکِتٰبَ یَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰی وَیَقُوْلُوْنَ سَیُغْفَرُ لَنَا۔ " تو کچھ لوگ بعد میں آنے والے ایسے آئے جو کتاب کے وارث بنے اور ذلیل دنیا کا مال لیتے رہے اور کہتے رہے ہمیں خدا بخش دے گا۔ " تَابَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَعَلَیْنَا ۔ اِنْشَآءَ اللّٰهُ تَعَالٰی "

وجوب مناصحت و خیر خواہی : وصل :۔ واضح رہنا چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر خواہی، اخلاص اور ادائے حقوق ظاہر و خفی، ہر حالت میں واجبات دین و اسلام میں سے ہے۔ حدیث صحیح ہے کہ : "اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَةُ " دین سراپا نصیحت و خیر خواہی ہے۔ صحابہ کرام نے دریافت کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس کیلئے نصیحت و خیر خواہی ہے فرمایا اللہ اور اس کے رسول، قرآن اور عام و خاص مسلمانوں کیلئے۔ ایک روایت میں ائمہ مسلمین اور عام مسلمان آیا ہے یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے اور تمام دینی علوم اس اجمال کے احاطہ میں مندرج ہیں۔

جَوَامِعُ الْکَلِمِ۔ اس حدیث کو کہتے ہیں جو لفظوں کی کمی میں انتہائی مختصر و موجز ہو اور معانی میں کثرت و وسعت کی جامع و حاوی ہو۔ یہ قسم کلام محمدی میں اعظم و اشرف اور دلائل و شواہد میں آپ کا کمال ہے چنانچہ ارشاد فرمایا : "اُوْتِیْتُ جَوَامِعَ الْکَلِمِ وَاخْتُصِرَ لِیَ الْکَلَامُ۔ " مجھے جوامع الکلم دیا گیا۔ اور میرے کلام کو مختصر کیا گیا۔ اس حسن و خوبی کا اظہار اور حسن و جمال کے دقائق کی جنسوں کا بیان حدو شمار سے باہر ہے۔ یہ کلام بدیع المثال ہے اور اس کلام کی جلالت اور اسرار و حقائق کے انواع و اقسام احاطہ فہم و عقل سے خارج ہیں۔

نصیحت کے لغوی معنی خالص و صاف ہونے کے ہیں اور عسل ناصح ایسے شہد کو کہتے ہیں جو موم وغیرہ سے پاک و صاف کرلیا گیا ہو اس جگہ صفا و خلوص مراد ہے جو ادائے حقوق اور منصوح لہ کیلئے ارادۂ خیر میں ہو۔ لہٰذا نصیحتُ اللہ سے مراد حق تعالیٰ کے ساتھ وحدانیت اور ہر اس وصف کے ساتھ جو اس کے لائق ہے اور ذات و صفات باری تعالیٰ کی تقدیس و تنزیہ ہر اس چیز سے جو اس کے کمال کے لائق نہیں صحتِ اعتقاد ہے۔ اور شریعت کے اوامر و نواہی کو بجالانا اور اس کے احکام کو ماننا اور جہاد سے دین کی مدد کرنا اور ایسے اسباب مہیا کرنا جو دین و ملت کی تقویت و بقا کا موجب ہیں جیسے علم و عمل اور عبادت میں اخلاص برتنا اور نصیحت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے کہ حیاتِ ظاہری اور حیاتِ باطنی دونوں حالتوں میں آپ کی حمایت، نصرت، خدمت، احیاء سنت، مخالفوں کو اس سے باز رکھنا

اور ان سے مدافعت کرنا، اخلاقِ کریمہ کی مانند اخلاق سنوارنا اور آدابِ جمیلہ کی مانند عادت و خصلت بنانا۔

اسحاق یحییٰ فرماتے ہیں کہ نصیحت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب ہر اس چیز کی تصدیق کرنا ہے جو آپ دین میں خدا کی طرف سے لائے اور سنت کو مضبوط تھامنا اور اس کی اشاعت کرنا اس پر لوگوں کو عمل کرنے کی ترغیب و تلقین کرنا اور خدا اور اس کے رسول اور اس کی کتاب کی طرف دعوت دینا اور اس پر کمربستہ رہنا اور عمل کرنا۔ ابو بکر آجری فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نصح و خیر خواہی آپ کی حیات میں بھی ہے اور بعد وفات بھی۔ اور آپ کی حیات میں صحابہ کرام کی خیر خواہی آپ کیلئے مدد، غزوات میں شرکت، محبّت احباب اور دشمنانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت سے تھی اور آپ کی فرماں برداری کرنے طاعات بجالانے اور جان و مال کے قربان کرنے میں تھی اور بعد وفات، عظمت و بزرگی کا لحاظ رکھنا، شدت سے آپ کی محبت پر قائم رہنا اور تعلیم سنت اور تفقہ فی الدین پر مداومت و مواظبت کرنا، اہلِ بیت و اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنا اور جو سنت سے برگشتہ ہے اور اس پر معترض ہے اس سے مجانبت و بغض رکھنا اور آپ کی امت پر شفقت کرنا اور اخلاق و سیرت اور آدابِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے جاننے میں جستجو و کوشش کرنا اور اس پر قائم رہنا ہے۔

نصیحتِ رسول اللہ کے زمرے میں آپ کی محبت، تعظیم، آداب اور ہر عیب و معصیت سے جو مقام نبوت و رسالت کے لائق نہیں ہیں ان سے آپ کی عزت و جلالت کو پاک جاننا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کو ملحوظ رکھنے میں قاعدہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ عز و علا کے مرتبۂ الوہیت و صفات قدس کے بعد جو کمال اور خوبی ہے وہ آپ کیلئے ثابت ہے اور آپ سے محبت رکھنے کا ضابطہ یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو آپ سے نسبت رکھتی ہے جیسے علماء، صلحا، شہر و امصار، خصوصاً اہلِ بیت و قرابت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان سب سے مودت و اکرام کیا جائے۔

عمرو بن لیث خراسان کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا جو پہلوان، غریب پرور اور صاحبِ دولتِ کثیر تھا لوگوں نے اسے خواب میں دیکھا اور پوچھا اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ اس نے کہا خدا نے مجھے بخش دیا۔ لوگوں نے پوچھا کس بنا پر بخشش ہوئی؟ اس نے کہا ایک دن میں ایک پہاڑ کی بلندی پر اپنے لشکر کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا اور میں ان کی کثرت و زیادتی پر مسرور تھا۔ اس وقت میں نے تمنا کی کاش کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری میسر آتی اور میں آپ کی نصرت و اعانت کرتا پھر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس بنا پر حق تعالیٰ نے مجھے بخش دیا۔ اور بعض حکایتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کی جگہ اور کی نصرت آئی ہے کہ اس نے کہا اے کاش میں اس روز موجود ہوتا جس دن امام حسین اور اہل بیتِ نبوت رضی اللہ عنہم میدان جنگ میں تھے۔ اور یزیدی لشکر انہیں مخذول و مقہور کر رہا تھا (واللہ اعلم)۔ لیکن نصیحت کتاب اللہ یہ ہے کہ قرآن پاک پر ایمان لائے اور جو کچھ اس میں ہے اس پر عمل کرے۔ اس کی آیتوں میں غور و خوض کرے اس کے معانی کو سمجھے ان علوم کو حاصل کرے جو اس کے متعلق ہیں۔ اور اس کی تلاوت ہمیشہ طہارت کی رعایت کے ساتھ حسن صوت، حضورِ قلب اور اس کی عظمت کے ساتھ کرے اور اس کے سمجھنے اور غور کرنے کی کوشش کرے اور اہلِ زیغ و ضلالت کی تاویلات اور ملحدوں اور زندیقوں کے مطاعن سے دور رہے۔

نیز کتاب اللہ کے حقوق کے لوازمات سے یہ ہے کہ اس میں شک و شبہ اور اعتراض نہ لائے۔ اور ایسی تفسیر جو بے سند غیر منقول از سلف اور خلافِ شرع ہوا پنی خواہش سے نہ کرے جیسا کہ بعض جاہل لوگ اور اس زمانے کے ابو الفضول لوگ کرتے ہیں اور اس کا تفسیر قرآن نام رکھتے ہیں اور اتنا نہیں جانتے کہ: "مَنْ فَسَّرَ الْقُرْآنَ بِرَأْيِهٖ فَقَدْ كَفَرَ" جس نے اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر کی وہ کافر ہو گیا (نعوذ باللہ من ذلک)

لیکن عام مسلمانوں کیلئے نصیحت یہ ہے کہ ان کے حقوق کی رعایت کرے۔ مصالح میں ان کی رہنمائی کرے۔ اور دین و دنیا کے معاملات میں قول و فعل سے مدد کرے، اور غافلوں کو تنبیہہ کرے، جاہلوں کو راہ دکھائے محتاجوں کی دستگیری کرے، عیبوں کی پردہ پوشی کرے، مضرتوں کو دور کرے ان کو نفع پہنچائے ان کے جان و مال، عزت آبرو کی حفاظت کرے۔ اور مسلمانوں کو ذلت اور حقارت کی نظر سے نہ دیکھے۔ اپنی زبان کو ان کی ایذار سانی سے محفوظ رکھے۔ نیکیوں کی تلقین کرے اور برائیوں سے بچائے اور عام لوگوں کی نصیحت میں سے یہ ہے کہ ان کی عقلوں کے مطابق کلام کرے۔ دقائق و حقائق کا ذکر نہ کرے۔ اسرار کا انکشاف نہ کرے۔ اور علماء کے اقوال اور ان کے اختلافات کو غیر علماء پر اظہار کا بھی یہی حکم ہے۔

لیکن خواص مسلمانوں کیلئے نصیحت کرنا یہ ہے (اکثر خواص سے مراد، امراء و سلاطین لیتے ہیں کیونکہ وہ لوگوں پر حاکم ہوتے ہیں) کہ ایک روایت میں آیا ہے کہ مسلمان حاکموں کی اطاعت ان کی مدد و اعانت کے حق میں کی جائے۔ اور انہیں احسن طریقہ سے نرمی و آشتی کے ساتھ نیکی کی تلقین کریں اور انہیں خدا کے خوف سے ڈرائیں۔ اور مسلمانوں کے وہ امور جن سے وہ غافل ہیں اور ان سے پوشیدہ ہیں ان سے انہیں خبردار کیا جائے۔ اور ان پر خروج و بغاوت نہ کی جائے اور لوگوں میں انہیں رسوا نہ کیا جائے اور نہ لوگوں کے دلوں کو فساد پر آمادہ کیا جائے اور رعیت کے احوال کی اصلاح اور لوگوں کی مہموں کے انتظام میں جو وہ امور انجام دیں اس میں ترغیب دی جائے۔ اور ان کی طرف سے جو سختی و شدت اور ظلم پہنچے اس پر صبر و تحمل کیا جائے۔ اور ان کیلئے دعائے خیر کی جائے۔

بعض علماء صوفیہ اور مشائخ ہجم رحمہم اللہ خواص کی تین قسمیں کرتے ہیں ایک امراء اور اولی الامر ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ مرد اپنے گھر میں امیر ہے اور استاد شاگردوں پر امیر ہے۔ باپ اولاد پر امیر ہے حاکم و سردار رعایا اور ماتحتوں پر امیر ہے دوسرے علماء ہیں علماء کی تعظیم اور ان کی تصدیق واجب ہے۔ جب تک کہ وہ دین کے موافق نقل کریں۔ اور کتاب و سنت سے تمسک کریں لیکن ان چیزوں کی تصدیق ممنوع ہے۔ جو وہ دین کی مخالفت، ہوائے نفس، محبتِ دنیا، حیلہ سازی اور فتنہ اندوزی میں کریں اور تیسرے اہلِ خصوص سے مراد مشائخ طریقت ہیں جو علم و تحقیق کے ساتھ عمل، ورع، اتباع سنت توجہ تام بجناب حق انقطاع از غیر حق سبحانہ وتعالیٰ، ترک دنیا، تجرید ماسوی اللہ اور شریعت و طریقت میں کامل دسترس کے بعد حقیقت کے انوار و اسرار حاصل کر کے کمال کی نعمت سے آراستہ و پیراستہ اور ممتاز ہو گئے ہیں۔ ایسے محققین و متمکنین جو ظاہر و باطن اور شریعت و حقیقت کے جامع ہیں وہ ایسے احوال باطن اور اسرارِ حقیقت کی خبریں دیں جو ظاہر شریعت کے مخالف و مباین نہ پڑیں تو ان کی تصدیق کرنا چاہئے۔ اس باب میں ضابطہ یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو بلاشبہ مخالفِ مقتضائے علم و حکم شریعت ہو اس کا انکار واجب ہے اور جس چیز میں شبہ ہو اس میں توقف لازم ہے۔ اور کسی ایسے قابل و عالم سے مروی ہو جو علم میں امام ہے اور تقویٰ اور ورع میں عمل مستقیم کا حامل ہے تو اس کے قول کی توجیہہ و تاویل مناسب ہے اور اگر اس کے رد میں کوئی شرعی مصلحت ہو کہ کہیں کم علم اور ناقص علم کے لوگ خود گمراہ ہو کر دوسروں کو گمراہی میں مبتلا کرنے کے باعث نہ ہو جائیں تو اس کا رد کرنا جائز ہے۔

واضح رہنا چاہئے کہ عصمت انبیاء علیہم السلام کا خاصہ ہے اور خطا ہر اس پر جائز ہے جو انبیاء کے سوا ہیں کیونکہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جو اعاظم صحابہ کے زمرۂ علماء میں سے ہیں وہ اپنی رحلت کے وقت فرماتے تھے کہ جو کچھ دین و شریعت کے خلاف ہے ان سب کا رد و انکار کرو۔ فرماتے ہیں: "کائناً من کان" جو کوئی بھی ہو اور جو کچھ بھی کہے (واللہ الموفق)

تنبیہہ:۔ مناصحتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ضمن میں جو یہ کہا گیا ہے کہ محبت کے ثمرات اور اس کی علامتوں میں سے یہ ایک علامت ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے وجوبِ مناصحتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک باب علیحدہ اللہ

تعالی کے اس ارشاد کے تحت ذکر کیا ہے کہ فرمایا "اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ" جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی خیر خواہی کریں۔ اور حضور کا ارشاد کہ "اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ ۔" دین سراپا نصیحت و خیر خواہی ہے تو ہم نے بھی ان کی تبعیت و پیروی کی ہے۔ اور اس کی تکرار کا بحکم۔ "ھُوَالْمِسْکُ مَاکَرَّرْتَہٗ یَتَضَوَّعُ" (یہ مشک ہے جتنی مرتبہ کھولو گے خوشبو پھیلے گی) اندیشہ نہیں کیا اورا جمال حدیث کی شرح کا ذوق بھی اسی کا مقتضی تھا۔

در حقیقت نصیحتِ خدا و کتاب و خواص و عام مسلمین کے ضمن میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے وہ سب تعظیم و محبت اور نصیحتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو شامل اور آپ کے حقوق کا بیان ہے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

صحابہ کرام کا تعظیم و توقیر بجالانا۔ وصل: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کس طرح کرتے تھے اس ضمن میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی طویل حدیث بیان کی گئی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات مذکور ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبوب کوئی ایک بھی نہ تھا اور نہ میری آنکھ میں آپ سے زیادہ کوئی بزرگ و عظیم تر تھا اور میرا حال یہ تھا کہ میری طاقت اتنی نہ تھی کہ میں آپ کو آنکھ بھر کر دیکھ سکوں۔ اور نہ آپ سے آنکھیں سیر ہوتی تھیں اگر کوئی مجھ سے کہے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصف بیان کروں تو مجھ میں اتنی قدرت نہیں اس لئے کہ میں آپ کے سامنے اپنی آنکھیں اوپر نہیں اٹھا سکتا تھا۔

ترمذی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں ہماری حالت یہ تھی کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لاتے تو اصحاب مہاجرین و انصار کے حلقے میں جلوہ گر ہوتے ان میں حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے درمیان نشست فرماتے مگر ان میں سے کسی میں تاب و تواں نہ ہوتی کہ آپ کی طرف نظر بھر کر دیکھ سکے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و کبریائی اور غایت و جلال کا عالم تھا۔ البتہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما آپ کی طرف دیکھتے اور متبسم ہوتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف ملاحظہ فرماتے اور تبسم فرماتے یہ ان کی باہمی انس و محبت کا عالم تھا۔ (صلی اللہ علیہ وسلم و رضی اللہ عنہم)

حضرت اسامہ بن شریک رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ بیکس پناہ میں حاضر ہوا تو آپ کے صحابہ آپ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے اور ان کا حال یہ تھا گویا کہ ان کے سر پر پرندے بیٹھے ہیں۔ مطلب یہ کہ انتہائی سکون و قرار میں تھے جنبش تک نہ کرتے اور نہ سر اٹھاتے تھے اس لئے کہ جس کے سر پر پرندہ بیٹھا ہو اگر وہ حرکت کرے اور سر اٹھائے سر پر بیٹھا ہوا پرندہ اڑ جائے۔

اور اس حدیث میں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصف مبارک بیان کیا گیا ہے مذکور ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کلام فرماتے تو ہم نشین صحابہ کرام سروں کو جھکا دیتے اور خاموش ہو جاتے گویا کہ ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔

عروہ بن مسعود کہتے ہیں کہ جس وقت ان کو سال حدیبیہ میں قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا اور صحابہ کرام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اور احترام کرتے دیکھا اور یہ دیکھا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم وضو فرماتے ہیں تو آب وضو لینے میں جلدی کرتے اور ایک دوسرے سے سبقت کرتے ہیں۔ اور قریب ہوتا ہے کہ باہمی خون خرابہ ہو جائے مگر پانی زمین پر گرنے نہیں دیتے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا آبِ دہن مبارک یا آبِ بینی شریف یا آبِ حلق مبارک جدا ہونے نہیں پاتا کہ آگے بڑھ کر اپنی ہتھیلیوں میں لے لیتے اور اپنے چہروں اور جسموں پر مل لیتے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جو موئے مبارک جدا ہوتا اسے جلدی سے حاصل کر لیتے اور تبرک بنا کر اس کی حفاظت کرتے اور جب کوئی حکم فرماتے تو امتثال امر میں شتابی کرتے، جب بات کرتے تو اپنی آوازوں کو پست کر لیتے اور کسی کو یارا نہ ہوتا کہ نگاہ اٹھائے اور آپ کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھے۔ یہ غایت تعظیم اور اجلال کی وجہ

سے تھا۔ جب عروہ لوٹ کر قریش کی طرف گئے تو ان کو دیکھتے ہی کہنے لگے اے گروہ قریش! میں نے قیصر و کسریٰ اور نجاشی کو ان کی بادشاہی کے زمانے میں دیکھا ہے مگر قسم ہے خدا کی میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا جیسا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے اصحاب میں ہیں ایک اور روایت میں ہے کہ کہا میں نے کسی بادشاہ کے ہم نشینوں کو کبھی ایسی تعظیم کرتے نہیں دیکھا جیسا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ان کے اصحاب تعظیم کرتے ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ جس وقت سر مبارک سے قینچی سے بال تراشے جاتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد صحابہ جمع ہو جاتے اور بالوں کو ہاتھوں میں لیتے رہتے اور ایک بھی بال گرنے نہیں دیتے تھے بعد میں ان موئے مبارک کو حضور ﷺ اپنے صحابہ کرام میں تقسیم فرما دیتے۔ باب الحج کے مقام میں انشاء اللہ اس کی تفصیل آئے گی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتہائی آداب میں سے ایک یہ ہے کہ جب صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو قریش کی جانب دعوتِ اسلام اور صلح کے ابتدائی قواعد و ضوابط طے کرنے کیلئے بھیجا تو قریش نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اجازت دی کہ وہ بیت الحرام کا طواف کر لیں مگر حضرت عثمان نے انکار فرمایا اور فرمایا میں اس وقت تک طواف خانہ کعبہ نہیں کر سکتا جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے اس کا طواف نہ فرمالیں۔ معلوم ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کی رعایت کو طواف سے عظیم تر جانا اور حق و صواب بھی یہی ہونا چاہئے کہ کوئی عمل اور کوئی عبادت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کی رعایت کے برابر نہیں ہے۔

حدیث پاک میں ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کسی بدو کے آنے کو پسند کرتے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایسی بات پوچھے جو ان کے دین میں فائدہ پہنچائے کیونکہ خود ان میں اتنی تاب و تواں نہ ہوتی کہ آپ کے ہیبت و جلال کی بنا پر کچھ دریافت کر سکیں اور قیلہ کی حدیث میں مذکورہ ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم ﷺ کو "قرفصی" کی وضع پر (اکڑوں بیٹھنا) بیٹھے دیکھا تو میں لرزہ براندام ہو کر آپ کی ہیبت و جلال میں گر پڑا۔ (آخر حدیث تک)

حضرت مغیرہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے کو ناخنوں سے بجاتے تھے تاکہ کھٹکھٹانے کی آواز سخت و شدید نہ ہو جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت شریف میں تشویش لاحق نہ ہو۔ حضرت براء ابن عازب فرماتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک سوال پوچھنا چاہتا تھا یہاں تک کہ کئی سال گزر گئے مگر دریافت کرنے کی ہمت نہیں ہوئی باوجودیکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں میں بڑے خوش اخلاق اور صحابہ کرام کے ساتھ بڑی ہی مہربانی و شفقت کا سلوک فرماتے خصوصاً فقراء و مساکین کے ساتھ جیسا کہ اخلاق شریف کے باب میں گزر چکا ہے۔

تعظیم در روایۃ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ وصل: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و حدیث کی روایت کی تعظیم میں حضرت عمرو بن میمون فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس ایک سال تک برابر آتا جاتا رہا مگر ان سے نے کسی وقت بھی بے تعظیمی سے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے نہیں سنا اور جب کہ ایک دن بے خیالی میں ان کی زبان پر یہ جاری ہو گیا تو وہ اتنے شرمندہ ہوئے کہ ان کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ اور وہ پسینہ پسینہ ہو گئے۔ اور ایک اور روایت میں یہ ہے کہ ان کا چہرہ گرد آلود جیسا ہو گیا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اور ایسی ہچکی بندھی کہ گردن کی رگیں سوج گئیں۔

حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ ایک روز ابو حازم کے پاس گئے اس وقت وہ حدیث بیان کر رہے تھے تو حضرت مالک ادھر سے گزر گئے اور فرمایا میں نے وہاں بیٹھنے کی جگہ نہ پائی اور میں اسے مکروہ سمجھتا ہوں کہ کھڑے کھڑے حدیث (رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم) کو حاصل کروں۔ حالانکہ میں کھڑا ہو سکتا تھا۔
اور حضرت مالک نے فرمایا ایک شخص حضرت ابن المسیب کے پاس آیا۔ اور اس نے ان سے ایک حدیث دریافت کی تو وہ لیک پہلو پر لیٹے ہوئے تھے فوراً اٹھ گئے اور حدیث بیان کی۔ اس شخص نے کہا مجھے اچھا نہیں معلوم ہوا کہ آپ تکلیف اٹھائیں اور اٹھ کر بیٹھیں۔ انہوں نے فرمایا میں اسے مکروہ جانتا ہوں کہ پہلو پر لیٹے لیٹے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کروں۔
محمد بن سیرین سے مروی ہے کہ وہ تبسم کناں تھے لیکن جب ان کے سامنے حدیث مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بیان کی گئی تو فوراً متواضع ہو کر سر جھکا دیا۔
حضرت ابو مصعب بیان کرتے ہیں کہ حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا دستور تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارک جب بیان کرتے تو پہلے وضو کر لیتے۔
بروایت مالک از جعفر بن محمد منقول ہے کہ حضرت مصعب بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ جب حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیان کرنے کا عزم فرماتے تو پہلے وضو کرتے اس کے بعد حدیث مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کیلئے ایک خاص لباس تیار کر رکھا تھا اسے پہنتے اس کے بعد حدیث بیان کرتے تھے۔ اس اہتمام کے بارے میں ان سے پوچھا گیا تو فرمایا یہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے۔ مطلب یہ کہ اسے آسان بات نہ جاننا چاہیے اس کی تعظیم کرنی چاہیے۔
حضرت مطرف فرماتے ہیں کہ جب لوگ حضرت امام مالک رحمہ اللہ کے پاس آتے تو پہلے ان کی باندی باہر آتی اور پوچھتی تم شیخ سے حدیث پوچھنا چاہتے ہو یا مسائل شرعیہ؟ اگر لوگ کہتے کہ ہمیں مسائل دریافت کرنے ہیں تو امام مالک فوراً باہر تشریف لاتے اور ان کو مسائل کا جواب عنایت فرما دیتے اگر وہ لوگ کہتے کہ ہمیں حدیث معلوم کرنی ہے تو پہلے غسل خانہ تشریف لے جاتے غسل کرتے بدن پر خوشبو ملتے اور نئے کپڑے پہنتے اور اپنا جبہ جو سیاہ یا سبز ہوتا زیب تن کرتے اور عمامہ سر پر رکھتے ایک تخت بچھایا جاتا۔ پھر باہر تشریف لاتے تخت پر خشوع و خضوع کے ساتھ بیٹھتے بخور جلایا جاتا اور جب تک حدیث کے بیان سے فارغ نہ ہوتے اس ہیئت کے ساتھ بیٹھے رہتے۔ یہ حدیث مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کرنے کیلئے خاص اہتمام تھا۔ اور راہ چلتے یا کھڑے کھڑے یا عجلت میں حدیث بیان کرنے کو مکروہ جانتے تھے۔ اور سلف صالحین بے وضو حدیث بیان کرنے کو مکروہ جانتے تھے اور حضرت اعمش سے منقول ہے کہ جب وضو نہ ہوتا تو تیمم کرتے۔ حضرت قتادہ بیان کرتے ہیں کہ امام مالک ہمارے سامنے حدیث بیان کر رہے تھے تو ان کو بچھو نے سولہ مرتبہ ڈنگ مارا اور امام مالک رحمہ اللہ کا رنگ متغیر ہو گیا۔ چہرہ زرد پڑ گیا۔ مگر حدیث کو درمیان میں قطع نہیں فرمایا۔ جب بیان حدیث سے فارغ ہو گئے اور سب لوگ چلے گئے تو میں نے ان سے عرض کیا اے ابو عبد اللہ میں نے آج آپ کا عجیب حال دیکھا ہے؟ فرمایا ہاں میں حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اجلال و تعظیم کی بنا پر صبر کرتا رہا۔
ابن مہدی بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں امام مالک رحمہ اللہ کے ساتھ وادی عمیق تک گیا۔ مدینہ طیبہ میں ایک وادی کا نام عمیق ہے۔ شعروں میں اس کا تذکرہ بہت آیا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وادی کو مقدس فرمایا ہے تو میں نے اس وادی کے بارے میں امام مالک رحمہ اللہ سے حدیث پوچھی تو انہوں نے مجھے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ میری نظر میں تم ایسے سوال کرنے سے زیادہ بزرگ تھے کہ تم مجھے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سوال کرتے حالانکہ ہم راستہ میں چل رہے ہوں۔ جریر عبد الحمید قاضی جو قاضی شہر تھا اس نے امام مالک رحمہ اللہ سے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم دریافت کی اس وقت آپ کھڑے تھے اس پر آپ نے اسے قید خانہ بھیجنے کا حکم فرمایا لوگوں نے عرض کیا یہ قاضی شہر ہے فرمایا قاضی زیادہ مستحق ہے کہ اسے آداب سکھائے جائیں۔

ہشام بن عمار نے امام مالک رحمہ اللہ سے ان کے کھڑے ہونے کی حالت میں حدیث کے بارے میں سوال کیا۔ آپ نے اس پر بیس کوڑے لگوائے بعدازاں اس پر شفقت فرمائی۔ اور اس سے بیس حدیثیں روایت فرمائیں اس پر ہشام نے کہا میں پسند کرتا ہوں کاش کہ بیس سے زیادہ کوڑے لگوائے جاتے تاکہ زیادہ حدیثیں سننے کا موقع میسر آتا۔ عبداللہ بن صالح فرماتے ہیں کہ امام مالک رحمہ اللہ اور حضرت لیث دونوں حدیث کی کتابت طہارت وضو کے ساتھ کرتے تھے۔ اور مشہور ہے کہ امام بخاری ہر حدیث کی کتابت کیلئے اپنی صحیح میں غسل کرتے اور دوگانہ ادا کرتے تھے۔ یہی طریقہ تراجم کتاب الٰہی کے لکھنے میں اختیار کیا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ آبِ زمزم سے غسل کرتے اور مقام ابراہیم علیہ السلام میں دوگانہ ادا کرتے تھے۔ (واللہ اعلم)

اہل بیت و ازواج نبوی کی تعظیم و توقیر۔ وصل: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر کے ضمن میں آپ کے اہلِ بیت جو کہ جگر گوشہ ہیں اور ازواج مطہرات جو ام المومنین ہیں کی تعظیم و توقیر اور ان کا ادب و احترام بھی کرنا ہے۔ جیسا کہ خاص طور پر ان حضراتِ قدس کیلئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ترغیب دی ہے اور جس پر سلف صالحین عمل پیرا رہے ہیں۔ چونکہ حق تعالیٰ عزاسمہ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ماسوا ہر چیز سے برگزیدہ فرمایا ہے اور عمومی فضیلت سے آپ کو مخصوص فرمایا ہے تو آپ کی برکت سے یہ فضیلت ہر اس شخص کو شامل ہے جو نسب، نسبت، صحبت، قربت قریب یا بعید سے آپ کے ساتھ منتسب ہے۔ حقیقت میں ہر اس شخص سے محبت لازمی ہے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتا ہے۔ چنانچہ اہلِ بیت اطہار سے محبت، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنے کی بنا پر ہے۔ جس طرح کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت، اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنے کی وجہ سے ہے۔ یہی حال ان سے بغض و عداوت رکھنے میں ہے (العیاذ باللہ) قاعدہ ہے کہ جو شخص جس سے محبت رکھتا ہے وہ ہر اس چیز سے محبت رکھتا ہے جو محبوب سے نسبت و علاقہ رکھے۔ اور ہر اس شے سے دشمنی و بیزاری ہوتی ہے جو محبوب سے بیگانہ یا اس کا مخالف ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ

اور جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اس کی محبت ان لوگوں سے نہ پائی جائے جو اللہ اور اس کے رسول کے دشمن ہیں۔

لہٰذا اہلِ بیتِ اطہار، اصحاب کرام، اور اولاد و ازواج سے محبت متعین شدہ واجبات میں سے ہے اور ان کا بغض ہلاکت خیز سوانح میں سے ہے۔ محبت و بغض کے کمال میں ایک چیز ایسی ہے کہ جو ان کے متعلقات میں سرایت کرتی ہے۔

حق تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا

اے نبی کے گھر والو! اللہ چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی دور فرمائے اور تمہیں خوب پاک و ستھرا کرے۔

اور ازواجِ مطہرات کے بارے میں فرماتا ہے: "وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ۔" اور نبی کی بیبیاں مسلمانوں کی مائیں ہیں۔

اہل بیت کی تفسیر میں چند اقوال و اطلاق ہیں کبھی ان لوگوں پر اہلِ بیت کا اطلاق ہوتا ہے جن پر صدقہ حرام ہے وہ آلِ علی، آلِ جعفر، آلِ عقیل اور آلِ عباس رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں۔ اور کبھی اس میں اولادِ رسول اور ازواجِ مطہرات بھی شامل ہوتے ہیں۔ اور کبھی مخصوص سیدہ فاطمہ، امام حسن و حسین اور علی رضی اللہ عنہم مراد ہوتے ہیں۔ اس بنا پر کہ ان میں فضیلت بکثرت ہیں۔ سلام اللہ علیہم اجمعین۔

اہلِ بیت کے اطلاق میں ان تفسیری اقوال کے درمیان تطبیق اس طرح ہے کہ "بیت" کی تین صورتیں ہیں۔ ایک بیت نسب،

دوم بیت سکنی، سوم بیت ولادت، لہٰذا حضرت عبدالمطلب کی اولاد، اہلِ بیت نسب ہیں۔ اور ازواجِ مطہرات، اہلِ بیت سکنی ہیں اور اولاد کرام بیت ولادت ہیں۔ اور سیدنا علی مرتضٰی اگرچہ اولاد سے ہیں لیکن سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وساطت سے اہلِ بیت ولادت سے ملحق ہیں۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ میں تم میں دو چیزیں ایسی چھوڑ رہا ہوں کہ اگر تم نے اسے لازم رکھا اور اسے مضبوط تھامے رکھا تو گمراہ نہ ہوگے۔ ایک خدا کی کتاب دوسری میری عترت، تو اب غور کرو کہ ان دونوں سے تم کس طرح خلاف ورزی کر سکتے ہو۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچاننا آتش دوزخ سے نجات کا ذریعہ ہے اور آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنا صراط سے گذارتا ہے۔ اور آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت، عذاب الٰہی سے امان ہے اور پہچاننے سے مراد ان کی منزلت اور مرتبہ کو پہچاننا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے انہیں کیا قرب حاصل ہے؟ اور جب ان کی اس نسبت کو جسے حق تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے پہچان لیا تو معلوم ہو جائے گا کہ کس طرح ان کی خلاف ورزی سے گمراہی لازم آتی ہے۔ اور ان کے احترام و پیروی سے گمراہی و عذاب سے نجات ملتی ہے۔ عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ جس وقت یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی: "اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ۔" تو اس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے یہاں تشریف فرما تھے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ فاطمہ، حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا اور انہیں ایک چادر شریف میں ڈھانپ کر بارگاہ الٰہی میں عرض کیا "اے خدا!" یہ ہیں میرے اہلِ بیت! اور حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پس پشت مبارک کھڑے تھے ایک روایت میں ہے کہ حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو گود میں لیا اور ایک ہاتھ سے علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ کو اور دوسرے ہاتھ سے سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو پکڑ کر اپنے سے ملا لیا اور کہا اے خدا یہ میرے اہلِ بیت ہیں ان کو رجس یعنی ناپاکی سے دور کر کے انہیں خوب پاک و ستھرا بنا۔

مفسرین کا اس میں اختلاف ہے کہ آیۂ کریمہ میں اہلِ بیت سے کون مراد ہیں اکثر اس پر ہیں کہ اس سے مراد سیدہ فاطمہ، حسن و حسین اور علی مرتضٰی سلام اللہ علیہم ہیں جیسا کہ اکثر روایتیں اس پر دلالت کرتی ہیں لیکن تقاضائے انصاف یہ ہے کہ اس میں ازواجِ مطہرات بھی داخل ہیں اس بنا پر کہ آیۂ کریمہ کا سیاق و سباق اور اس کا نزول انہیں ازواجِ مطہرات کے ضمن میں ہے جس طرح کہ ارشاد باری تعالیٰ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ شامل ہیں ارشاد باری ہے: "رَحْمَتُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الْبَیْتِ۔" اور جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہمارے اہلِ بیت میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی دشمنی نہیں رکھے گا مگر وہی جسے حق تعالیٰ جہنم میں داخل کرے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ان چاروں تن پاک کو بلانا اور آغوش میں لے کر چادر شریف اڑھانا پھر یہ دعا مانگنی کہ: "اَللّٰھُمَّ اِنَّ ھٰٓؤُلَاءِ اَھْلُ بَیْتِیْ۔" اے خدا یہ ہیں میرے اہلِ بیت۔ اس میں ازواجِ مطہرات کے دخول، ناپاکی سے دور کرنے کی فضیلت اور پاکی و صفائی میں ان کی شمولیت میں کوئی منافات یا تعارض نہیں ہے۔ نیز جریر کی روایت جو سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے اس میں وہ فرماتی ہیں میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی آپ کی اہل میں سے ہوں؟ فرمایا تم بھی میری اہل میں سے ہو اور ایک روایت میں ہے کہ تم بھلائی پر ہو۔"

اسی طرح آیۂ کریمہ "قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی" فرما دو میں تم سے اس پر اجر نہیں مانگتا مگر قرابت داروں میں محبت۔ اس آیت کی تفسیر میں بھی اختلاف ہے چنانچہ مروی ہے کہ جب یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے دریافت کیا "مَنْ اَھْلُ قَرَابَتِکَ" آپ کی قرابت والے کون ہیں؟ فرمایا، علی، فاطمہ اور ان کے دونوں فرزند رضی اللہ عنہم ہیں۔ لیکن درست یہی ہے کہ اس

میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام قرابت دار حضرات شامل ہیں۔ اور ان میں یہ چاروں تن عمدہ ہیں اور باقی سب ان کے تحت ہیں۔
امام فخرالدین رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں صحابہ کرام کا مکمل حصہ ہے کیونکہ انہیں معنوی قرابت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بدرجہ اتم حاصل ہے۔ (رضوان اللہ علیہم اجمعین)
حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی شان میں فرمایا "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهُ وَعَادِ مَنْ عَادَاهُ۔" میں جس کا مولا ہوں علی بھی اس کے مولیٰ ہیں، اے خدا! جو علی سے محبت رکھے تو بھی اس سے محبت فرما اور جو ان سے عداوت رکھے تو بھی اسے دشمن قرار دے۔ اور ان کی شان میں ان سے فرمایا۔ "لَا يُحِبُّكَ اِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا يُبْغِضُكَ اِلَّا مُنَافِقٌ۔" اے علی (رضی اللہ عنہ) تم سے مسلمان ہی محبت رکھے گا اور منافق ہی تم سے بغض رکھے گا۔ اور فرمایا۔ "اَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى۔" تم میرے دربار میں ویسے ہو جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دربار میں ہارون علیہ السلام ایک روایت میں ہے فرمایا: "اما ترضی ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ" کیا تم اسے پسند نہیں کرتے کہ میرے دربار میں تم بمنزلہ ہارون کے ہو جیسے وہ موسیٰ (علیہما السلام) کے دربار میں تھے اور یہ تشبیہ مبہم ہے۔ اور اس طرح حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ: "الا انہ لا نبی بعدی" مگر یہ کہ میرے بعد نبوت نہیں ہے اس میں بیان فرمادیا کہ نبوت میں شمولیت نہیں ہے بلکہ بغیر نبوت کے قرب واختصاص ہے اور وہ خلافت ہے اور حضرت ہارون علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ ان کی حیات میں ہوئے نہ کہ بعد وفات۔ اس لئے کہ حضرت ہارون علیہ السلام کا انتقال حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے ہوا اور اس پر دلیل حضور علیہ السلام کا یہ فرمان ہے کہ جس وقت آپ غزوۂ تبوک میں تشریف لے جارہے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے اہل وعیال پر خلیفہ بنایا تھا جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو بنایا تھا۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هَارُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ" اور جب موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے فرمایا۔ تم میرے خلیفہ ہو میری قوم پر۔ اور بلاشبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امام جماعت، حضرت ابن ام مکتوم اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما کو بنایا اور حضور کے ارشاد "من کنت مولاہ" میں مولیٰ سے مراد، ولاء اسلام یعنی اسلامی محبت ہے نہ کہ ولایت حکمی، علماء فرماتے ہیں کہ لغت میں مولیٰ ـــــ کسی جگہ والی اور حاکم کے معنی میں نہیں آیا۔ اور سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے بارے میں ارشاد فرمایا۔ "فَاطِمَةُ بِضْعَةٌ مِّنِّيْ يُؤْذِيْنِيْ مَا اٰذَاهَا وَيُنْصِبُنِيْ مَنْ اَنْصَبَهَا۔" فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے جس سے انہیں اذیت ہے اس سے مجھے اذیت ہوتی ہے۔ اور جس سے وہ خوش ہوں اس سے مجھے خوشی ہوتی ہے۔
حضرت ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ "اَحَبُّ النِّسَاءِ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاطِمَةُ وَاَحَبُّ الرِّجَالِ زَوْجُهَا عَلِيٌّ" (رواہ الترمذی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک عورتوں میں سب سے زیادہ پیاری فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں اور مردوں میں سب سے زیادہ پیارے ان کے شوہر علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کا اظہار میں انتہائی انصاف ہے اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ان کے بارے میں پوچھا جاتا تو وہ بھی یہی فرماتیں کہ "كَانَ اَحَبَّ الرِّجَالِ اَبُوْبَكْرٍ وَاَحَبَّ النِّسَاءِ عَائِشَةُ۔" مردوں میں سب سے پیارے ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عورتوں میں سب سے پیاری عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ اور یہ بھی صحیح ہے اس لئے کہ وجوہ محبت متعدد و مختلف ہیں۔
اور حضرت امام حسن وحسین رضی اللہ عنہما کی شان میں فرمایا۔ "اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اُحِبُّهُمَا فَاَحِبَّهُمَا وَاَحِبَّ مَنْ يُّحِبُّهُمَا" اے خدا میں ان دونوں کو محبوب رکھتا ہوں تو بھی انہیں محبوب رکھ اور اسے بھی محبوب رکھ جو انہیں محبوب رکھے۔
حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ نے امام حسن رضی اللہ عنہ

کا دہن مبارک کھول کر اپنی زبان مبارک ان کے منہ میں رکھی اور فرمایا کہ اے خدا میں ان کو محبوب رکھتا ہوں تو اے خدا تو بھی اسے دوست رکھ اور جو انہیں دوست رکھتا ہے اسے بھی دوست رکھ۔ تین مرتبہ یہ دعا مانگی اور فرمایا جو مجھ سے محبت رکھتا ہے وہ ان دونوں سے بھی محبت رکھے گا۔ اور ان کی والدہ ماجدہ سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا میرے ساتھ میرے درجہ میں قیامت کے دن ہو گی اور حضور ﷺ امام حسن رضی اللہ عنہ کو زبان مبارک چسایا کرتے اور بڑی شفقت فرمایا کرتے تھے۔ اور یہ دونوں امامین کریمین رسول اللہ ﷺ سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے تھے۔ اگرچہ ان کے سوا حضرات میں بھی مشابہت ثابت ہے جیسے حضرت جعفر بن ابی طالب اور ان کے فرزند حضرت عبداللہ بن جعفر اور قثم بن العباس اور سفیان بن الحارث بن عبدالمطلب وغیرہم رضی اللہ عنہم میں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقارب واخوان تھے بھی مشابہت موجود ہے اور کابس بن ربیعہ ایک شخص تھا جو بصرے کا رہنے والا تھا۔ یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہت رکھتا تھا۔ جب وہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے محل میں آئے تو وہ اپنے تخت پر کھڑے ہو گئے تعظیم کی اور ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اور مرغاب کا علاقہ انہیں عطا فرمایا۔

مواہب لدنیہ میں منقول ہے کہ اہلِ بیت نبوت میں سے ایک شخص تھے جن کا نام یحییٰ بن القاسم بن محمد بن جعفر بن محمد بن علی بن حسین بن علی رضی اللہ عنہم تھا اور وہ شبیہہ رسول سے ملقب و مشہور تھے کیونکہ مہر نبوت کے مقام پر ان کے کبوتر کے ایک انڈے کے برابر نشان تھا۔ اور وہ مہر نبوۃ کے مشابہ تھا۔ ان کا یہ حال تھا کہ جب وہ غسل کے لئے حمام میں داخل ہوتے اور لوگ انہیں دیکھتے تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجنے لگتے اور ان کے پاس لوگوں کا ہجوم ہو جاتا اور تبرکاً اسے بوسہ دیتے اور مشابہت سے مراد، بعض امور میں مشابہت ہو گی ورنہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پورے حسن و جمال میں کوئی شریک نہ تھا ان کے ماسوا اور بھی حدیثیں ہیں ۔

مُنَزَّہٌ عَنْ شَرِیْکٍ فِیْ مَحَاسِنِہٖ   فَجَوْھَرُ الْحُسْنِ فِیْہِ غَیْرُ مُنْقَسِمٖ

اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا "قسم ہے اس ذات کی جس کے دستِ قدرت میں میری زندگی ہے کسی آدمی کے دل میں اس وقت تک ایمان داخل نہ ہو گا۔ جب تک کہ خدا اور رسول کی محبت کی بنا پر تم سے محبت نہ رکھے اور فرمایا: "مَنْ اٰذٰی عَمِّیْ فَقَدْ اٰذَانِیْ وَاِنَّمَا عَمُّ الرَّجُلِ صِنْوُ اَبِیْہِ۔" جس نے میرے چچا کو اذیت دی بلاشبہ اس نے مجھے ایذا دی اور اس میں کوئی شک وشبہہ نہیں کہ چچا باپ کا قائم مقام ہوتا ہے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا اے چچا اولاد کے پاس آؤ۔ پھر ان کو جمع فرمایا اور اپنی سرخ وسیاہ دھاری والی چادر شریف اڑھا کر دعا مانگی: "اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِلْعَبَّاسِ وَوُلْدِہٖ مَغْفِرَۃً ظَاھِرَۃً وَّبَاطِنَۃً لَّا تُغَادِرُ ذَنْبًا اَللّٰھُمَّ احْفَظْہُ فِیْ وَلَدِہٖ۔" (رواہ الترمذی) اے خدا! عباس (رضی اللہ عنہ) اور ان کی اولاد کو بخش دے ایسی ظاہری و باطنی مغفرت سے جو کوئی گناہ باقی نہ چھوڑے۔ اے خدا ان کو ان کی اولاد میں باقی رکھ۔ کہتے ہیں کہ یہ چھ افراد تھے۔ فضل، عبداللہ، عبیداللہ، قثم معبد، عبدالرحمٰن اور فرمایا: "ہٰذَا عَمِّیْ وَصِنْوُ اَبِیْ وَھٰؤُلَاءِ اَھْلُ بَیْتِیْ وَعِتْرَتِیْ فَاسْتُرْھُمْ مِّنَ النَّارِ کَسَتْرِیْ اِیَّاھُمْ" یہ میرے چچا اور میرے باپ کی طرح محترم ہیں اور یہ سب میری اہل بیت اور میری عترت ہیں اے خدا ان کو آگ سے ایسا محفوظ کر کے ڈھانپ لے جس طرح میں نے ان سب کو ڈھانپا ہے۔ اس پر گھر کے ہر در و دیوار نے آمین آمین کہی اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "اِرْقَبُوْا مُحَمَّدًا فِیْ اَھْلِ بَیْتِہٖ" اور فرمایا خدا کی قسم رسول خدا ﷺ کے تمام قرابت دار، اپنے قرابت داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرنے میں میرے نزدیک زیادہ محبوب ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں مجھے ایذا نہ دو۔ اسی طرح سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے فرمایا میری محبت کے ساتھ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی محبت رکھو اور حضرت ابو بکر صدیق

رضی اللہ عنہ حضرت امام حسن بن علی مرتضٰی رضی اللہ عنہما کو اپنے کاندھے پر اٹھا کر فرماتے یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہیں۔ علی رضی اللہ عنہ سے انہیں مشابہت نہیں ہے اور حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ اس پر ہنسا کرتے تھے۔

منقول ہے کہ حضرت عبداللہ بن حسن بن سیدنا علی مرتضٰی رضی اللہ عنہم جن کو عبداللہ محض کہتے ہیں وہ بیان کرتے ہیں کہ میں اپنی کسی ضرورت سے حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اس پر انہوں نے فرمایا جب آپ کو کوئی ضرورت درپیش ہو کسی کو بھیج دیا کریں۔ اور ایک رقعہ لکھ دیا کریں کیونکہ میں خدا سے شرم کرتا ہوں کہ آپ کسی ضرورت سے خود یہاں تشریف لایا کریں۔

شعبی سے مروی ہے کہ حضرت زید بن ثابت انصاری کاتب وحی رضی اللہ عنہ نے اپنی والدہ کی نماز جنازہ پڑھائی اس کے بعد ان کی سواری کیلئے اونٹ پیش کیا گیا۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اونٹ کی نکیل پکڑی اس پر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے فرزند میری رکاب چھوڑ دیجئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہمیں یہی حکم دیا گیا ہے کہ ہم عالموں کی قدر ومنزلت کریں۔ پھر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اتر کر ان کے دستِ مبارک کو بوسہ دیا اور کہا ہمیں یہی حکم دیا گیا ہے کہ ہم ایک اہل بیت رسول کی تعظیم وتوقیر کریں۔ اور ایک روایت میں ہے اپنے شرفاء کی۔ اوزاعی بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے پاس بنت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم اپنے غلاموں کے ساتھ ہاتھ تھامے ہوئے آئیں تو حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ فوراً کھڑے ہوگئے اور ان کی طرف بڑھے اور اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنی مجلس کے قریب بٹھایا اور خود مؤدب ان کے ساتھ بیٹھ گئے اور ان کی حاجت پوری فرمائی۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جس وقت اپنے فرزند حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کیلئے تین ہزار درہم کا گزارہ مقرر فرمایا تو حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کیلئے تین ہزار پانچ سو درہم مقرر فرمائے۔ اس پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے والد ماجد سے کہا کس بنا پر آپ نے ان کو مجھ پر فضیلت دی۔ حالانکہ بخدا انہوں نے کسی جہاد میں مجھ سے سبقت نہیں کی ہے۔ حضرت امیرالمومنین سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے فرزند سے فرمایا کہ اسامہ رضی اللہ عنہ کے والد حضرت زید رضی اللہ عنہ، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک تیرے باپ سے زیادہ محبوب تھے۔ اور اسامہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک تجھ سے زیادہ محبوب تھے۔ اس بنا پر میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب کو اپنے محبوب پر فضیلت دی اور ایثار کیا۔

منقول ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ کو جب جعفر بن سلیمان نے زدوکوب کیا اور اس کی جانب سے انہیں جو تکلیف پہنچی اس سے وہ بے ہوش ہوگئے۔ اور لوگ بے ہوشی میں اٹھا کر لے آئے۔ جب انہیں ہوش آیا تو فرمایا کہ میں تمہیں گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ جو کچھ زدوکوب سے مجھے اذیت پہنچی ہے میں اسے معاف کرتا ہوں جب لوگوں نے معاف فرمانے کی وجہ پوچھی تو فرمایا میں ڈرتا ہوں کہ جب میں مروں اور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کروں تو میں شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض قرابت دار عذاب میں مبتلا ہوں۔ علماء بیان کرتے ہیں کہ جب خلیفہ وقت منصور نے امام مالک رحمہ اللہ پر زیادتی کا جعفر سے قصاص مانگا تو امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا اللہ سے پناہ مانگتا ہوں خدا کی قسم میرے جسم سے کوڑا اٹھنے نہ پاتا تھا کہ میں اسے معاف کر دیتا تھا۔ اس بنا پر کہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت ہے۔

ابوبکر بن عیاش جو کہ علمائے اعلام امت میں سے ہیں فرمایا کرتے کہ اگر میرے پاس کسی ضرورت سے حضرت ابوبکر وعمر اور علی رضی اللہ عنہم تشریف لائیں تو میں سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ضرورت پوری کروں اس کے بعد حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی۔ کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت ہے۔ اگر میں آسمان سے زمین پر گروں تو

میرے نزدیک حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مقدم ہونے سے مجھے یہ زیادہ محبوب ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ازواجِ مطہرات کی خدمت بجالاتے اور انہیں تحفے اور عطایا بھیجا کرتے تھے کیونکہ یہ ان کی خوشنودی اور رضا کا موجب ہوتا تھا اور سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے فرزند سے فرمایا کرتیں کہ اللہ تیرے والد ماجد کو جنت کے سلسبیل سے سیراب فرمائے۔

حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کی زیارت کیا کرتے تھے کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باندی تھیں۔

اور جب حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کیلئے اپنی چادر شریف بچھاتے اور ان کی ضرورت پوری فرمایا کرتے تھے۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی تو وہ حضرت ابو بکر پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آتیں اور وہ دونوں اسی طرح پیش آتے جس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول شریف تھا۔

صحابہ کرام کی تعظیم و توقیر: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر اور ادب و حقوق کے سلسلے میں صحابہ کرام کی عزت و عظمت ان کے حق و احسان کی معرفت اور اس کی ادائیگی اور ان کا اتباع و اقتدا کرنا ہے۔ اور ان کے افعال و اعمال اور ان کے آداب و اخلاق کی روشوں اور سنتوں پر عمل کرنا اس حد تک جہاں تک عقل و خرد کی تاب نہیں اور ان کی اچھے پیرایہ میں تعریف کرنا، ان کے ادب کا لحاظ رکھنا اور انہیں دعا و استغفار سے یاد کرنا ہر ایک صحابی کا حق ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے ہر صحابی کی یہ تعریف فرمائی ہے کہ وہ ان سے راضی ہوا ہے، ہر صحابی رسول اس کا مستحق ہے کہ اس کی تعریف کی جائے۔ اور استغفار کیا جائے۔ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہ کیلئے استغفار کریں مگر کچھ لوگوں کا حال یہ ہے کہ دشنام طرازی کرتے ہیں۔ (رواہ مسلم) لہٰذا صحابہ کرام پر سب و طعن کرنا اگرچہ ادلۂ قطعیہ کے مخالف ہے جیسے کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان باندھنا تو یہ کفر ہے ورنہ بدعت و فسق ہے۔ (کذا قال فی المواہب) اسی طرح صحابہ کرام کے باہمی تنازعات و مناقشات اور گزرے ہوئے واقعات کے اظہار و بیان سے پہلو تہی کرنا اور زبان کو روکنا بھی ہے۔ اور مورخین کی بے ہنگم خبروں اور جاہلوں کی روایتوں اور غالی شیعوں اور بے دین و گمراہ رافضیوں اور مبتدعین کی باتوں سے اعراض و اجتناب کرنا چاہئے کیونکہ بدلگام لوگ ان کے جن عیبوں، برائیوں اور خطاؤں کو بیان کرتے ہیں ان میں اکثر و بیشتر جھوٹ اور افتراء پر مبنی ہیں۔ اور صحابہ کرام کے بارے میں جو ان کے مشاجرات اور محاربات تاریخوں میں پائے جاتے ہیں ان کو جستجو و تلاش کر کے انہیں احسن طریقوں سے بہتر و صواب محل پر محمول کرنا (جس کے وہ مستحق ہیں) ہر مسلمان پر لازم ہے۔ اور ان کے کسی عیب و برائی کو بھی کبھی زبان پر نہ لانا چاہئے بلکہ ان کی نیکیوں، خوبیوں، سیرتوں اور فضائل و محامد ہی کو بیان کرنا چاہئے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہو اس سے اغماض و سکوت کرنا چاہئے اس بنا پر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی صحبت یقینی ہے اور اس کے ماسوا جو کچھ ہے وہ ظنی اور خیالی ہے۔ اس خصوص میں حق تعالیٰ کا ان کو اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے سرفراز فرمانا کافی ہے۔ اور اگر ان میں سے کسی سے اہلِ بیت اطہار وغیرہ کے حقوق میں کوئی کوتاہی یا غلطی واقع ہوئی ہے تو بھی یہ امید ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے در گزر کر دیئے جائیں گے۔ اہل سنت و جماعت کا اس باب میں یہی مذہب اور طریق حق ہے۔ کتب عقائد میں مذکور ہے کہ "لَا تَذْكُرُوْا اَحَدًا مِّنْهُمْ اِلَّا بِخَيْرٍ۔" تم ان میں سے کسی کو خیر کے سوا یاد نہ کرو اور حدیثوں میں صحابہ کرام

کے جو عمومی وخصوصی فضائل مذکور ہیں اس باب میں وہی کافی ہیں۔ (رطب ویابس تاریخ کے پیچھے نہ لگنا چاہئے)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں حق تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر بہت سخت اور آپس میں بہت مہربان ہیں۔

حق تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الخ — سب سے پہلے ایمان میں سبقت کرنے والے مہاجرین وانصار ہیں۔......

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ الخ — بلاشک وشبہ اللہ ان مسلمانوں سے راضی ہوگیا جب وہ آپ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔

اور فرمان باری ہے:

رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ الخ — وہ مرد سچے ہیں جنھوں نے اللہ کے عہد کو پورا کر کے دکھایا۔.

حق تعالیٰ فرماتا ہے:

يَوْمَ لَا يُخْزِى اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ الخ — جس دن اللہ نبی کو اور ان کے ایماندار ساتھیوں کو رسوا نہ کرے گا......

نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم فرماتے ہیں:

اَصْحَابِىْ كَالنُّجُوْمِ بِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ۔ — میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے جن کی بھی پیروی کروگے راہ یاب ہو جاؤ گے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: مَثَلُ اَصْحَابِىْ كَمَثَلِ الْمِلْحِ لَا يَصْلُحُ الطَّعَامُ اِلَّا بِهٖ میرے صحابہ نمک کی مانند ہیں نمک کے بغیر کھانا درست نہیں ہوتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِىْ اَصْحَابِىْ لَا تَتَّخِذُوْهُمْ غَرَضًا مِّنْ بَعْدِىْ فَمَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّىْ اَحَبَّهُمْ وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِىْ اَبْغَضَهُمْ (الحدیث)

خبردار خبردار میرے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈرو، میرے بعد انہیں اپنی اغراض کا نشانہ نہ بناؤ تو جو کوئی ان سے محبت رکھے گا وہ مجھ سے محبت رکھنے کی وجہ سے محبت کرے گا اور جو کوئی ان سے بغض وعداوت رکھے گا وہ مجھ سے بغض وعداوت رکھنے کی وجہ سے ان سے بغض رکھے گا۔ (آخر حدیث تک) اور فرمایا لَا تَسُبُّوْا اَصْحَابِىْ فَلَوْ اَنْفَقَ اَحَدُكُمْ مِثْلَ اُحُدٍ ذَهَبًا لَمْ يَبْلُغْ مُدَّ اَحَدِهِمْ وَلَا نَصِيْفَهٗ میرے صحابہ کو برا نہ کہو اگر تم احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرو تو وہ ان کے ایک مد جو کی برابری نہ کرے گا۔ اور فرمایا مَنْ سَبَّ اَصْحَابِىْ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ میرے صحابہ کو جو گالی دے گا اس پر اللہ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے اور فرمایا:

"اِذَا ذُكِرَ اَصْحَابِىْ فَاَمْسِكُوْا۔" جب تم میرے صحابہ کا ذکر کرو تو زبان قابو میں رکھو۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ:

اِنَّ اللّٰهَ اخْتَارَ اَصْحَابِىْ عَلٰى جَمِيْعِ الْعٰلَمِيْنَ سِوَى النَّبِيِّيْنَ وَالْمُرْسَلِيْنَ وَاخْتَارَ لِىْ مِنْهُمْ اَرْبَعَةً اَبَا بَكْرٍ وَّعُمَرَ وَعُثْمَانَ وَعَلِيًّا فَجَعَلَهُمْ خَيْرَ اَصْحَابِىْ وَاَصْحَابِىْ كُلُّهُمْ خَيْرٌ۔

یقیناً اللہ تعالیٰ نے انبیاء و مرسلین کے بعد میرے صحابہ کو سارے جہان والوں پر برگزیدگی عطا فرمائی اور ان میں سے میرے لئے چار کو منتخب فرمایا۔ یعنی حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر بن خطاب فاروق اعظم، حضرت عثمان بن عفان ذوالنورین، اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم کو۔ پھر ان چاروں کو میرے صحابہ میں افضل کیا۔ حالانکہ میرے تمام صحابہ صاحب فضیلت و صاحب خیر ہیں۔ (رضی اللہ عنہم اجمعین)

اس حدیث میں ان چاروں کے ذکر اور دوسری حدیثوں میں ان چاروں کے علاوہ دس اور صحابہ کے ذکر کی ترتیب ہے۔ ان کے درمیان ترتیب مراتب و مدارج کے ثبوت کی روشن دلیل ہے اور یہ گمان کرنا کہ راویوں نے اپنے اعتقاد کے بموجب ان کا ذکر کیا ہے اور حدیثوں میں تغیر و تبدل کیا ہے گمان فاسد ہے اور محدثین کے حالات کے یہ خیال لائق نہیں ہے ہاں بعض حدیثوں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ذکر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ذکر سے مقدم آیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَنْ اَحَبَّ عُمَرَ فَقَدْ اَحَبَّنِیْ وَمَنْ اَبْغَضَ عُمَرَ فَقَدْ اَبْغَضَنِیْ"۔ "جس نے حضرت عمر سے محبت کی بلاشبہ اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے حضرت عمر سے بغض و عداوت رکھی یقیناً اس نے مجھ سے بغض و عداوت رکھی۔

غرضیکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فضائل و مناقب میں احادیث کریمہ بکثرت ہیں۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو صحابہ کرام سے بغض رکھتا ہے اور انہیں سب و شتم کرتا ہے وہ مسلمانوں کے زمرے میں نہ تو داخل ہے اور نہ ان کی غنیمت کا حق دار ہے۔ امام مالک نے یہ مسئلہ سورۂ حشر کی اس آیت سے استنباط فرمایا: "وَالَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ الخ" اور امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں جو شخص کسی صحابی رسول سے غضبناک ہو کر جوش و غضب و غصہ میں آتا ہے وہ کافر ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے: "لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْکُفَّارَ"۔ "یقیناً صحابہ کرام سے کافر لوگ ہی غیظ و غضب کا اظہار کرتے ہیں۔

علمائے کرام فرماتے ہیں کہ سورۂ فتح کی آخری آیتوں میں تمام مسلمانوں کی تقسیم تین طبقوں پر فرمائی گئی ہے ایک مہاجرین، دوسرے انصار تیسرے وہ مسلمان جو ان کے بعد ہیں۔ اور ان تینوں طبقوں کی تعریف و توصیف بھی اس آیت میں داخل ہے کہ وہ دعا مانگتے ہیں: "رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا"۔ "اے ہمارے رب ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ایمان میں ہم سے سبقت لئے ہوئے ہیں اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کی جو ایمان لائے ہیں کدورت نہ ڈال۔ اور شیعہ، روافض ان قسموں میں سے کسی قسم میں بھی داخل نہیں ہیں۔

اور حضرت عمر بن خطاب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں حضرت امام محمد باقر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ عراق کے کچھ لوگوں نے ان کے پاس آکر حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو برا کہنا شروع کر دیا اور ان کے خلاف کچھ نازیبا کلمات زبان پر لائے اس کے بعد انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی برا کہنا شروع کر دیا اس پر حضرت امام محمد باقر رضی اللہ عنہ نے فرمایا بدبختو! مجھے بتاؤ کیا تم مہاجروں میں سے ہو؟ کیونکہ حق تعالیٰ ان کے متعلق ارشاد فرماتا ہے: "لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ"۔ "اس آیت کو یہاں تک پڑھا کہ: "اُولٰٓئِکَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ"۔ "ان فقراء مہاجرین کے لئے جن کو ان کے گھروں سے نکالا گیا...... یہی سچے لوگ ہیں۔" عراقی لوگ کہنے لگے ہمیں تسلیم ہے کہ ہم مہاجرین میں سے نہیں ہیں۔ اس کے بعد امام محمد باقر نے فرمایا تو کیا تم جماعت انصار میں سے ہو کیونکہ حق تعالیٰ نے ان کی شان میں فرمایا: "وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ"۔ "اس آیت کو یہاں تک پڑھا کہ: "اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ"۔ "وہ لوگ جنہوں نے مہاجرین کو گھروں میں ٹھہرایا اور وہ پہلے سے ایماندار ہیں

......یہی لوگ فلاح پائے ہوئے ہیں۔ اس پر عراقی لوگوں نے کہا ہم جماعت انصار میں سے بھی نہیں ہیں۔ اس کے بعد امام محمد باقر نے فرمایا میں گواہی دیتا ہوں کہ تم اس جماعت میں سے بھی نہیں جن کے بارے میں حق تعالیٰ نے فرمایا: "وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ۔" (اور وہ لوگ جو ان کے بعد آئے وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں بخش دے اور ان کو بھی جو ہمارے بھائی ہیں اور ایمان میں ہم سے سبقت لئے ہوئے ہیں) اس کے بعد امام محمد باقر نے فرمایا میرے سامنے سے اٹھ جاؤ۔ حق تعالیٰ نے تمہیں کسی ایک جماعت میں بھی نہیں بنایا تم نے اسلام کی صورت کو اپنا لباس بنایا ہے۔ لیکن معنی میں اہلِ اسلام میں سے تم نہیں ہو۔ انتہی۔

اور حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دو خوبیاں ایسی ہیں جن میں یہ ہوں گی نجات پا جائے گا وہ ہے صدق اور اصحاب محمد ﷺ سے محبت، رضی اللہ عنہم اور ایوب سختیانی فرماتے ہیں کہ جو ابو بکر رضی اللہ عنہ سے محبت رکھتا ہے یقیناً وہ دین اسلام پر قائم ہے اور جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے محبت رکھتا ہے یقیناً اس نے راستہ کو روشن کر لیا ہے اور جس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے محبت کی یقیناً وہ نور خدا سے منور ہو گیا اور جس نے سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے محبت کی بلاشبہ اس نے "عروہ وثقیٰ" کو تھام لیا اور جس نے صحابہ کرام کو بھلائی اور خیر کے ساتھ یاد کیا تو وہ بلاشبہ نفاق سے بچ گیا اور جس کسی نے ان میں سے کسی ایک کے ساتھ بغض رکھا وہ مبتدع، منافق اور سنت اور طریقہ سلف کا مخالف ہے اور مجھے خطرہ ہے کہ اس کا کوئی عمل بھی آسمان پر صعود نہ کرے گا تاآنکہ وہ ان سب سے محبت کرے اور اپنے دل کو ان سے سالم و محفوظ رکھے۔

حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع سے واپس مدینہ منورہ تشریف لائے تو منبر پر تشریف فرما ہو کر خطبہ دیا کہ۔

يَآاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَاضٍ عَنْ اَبِيْ بَكْرٍ فَاعْرِفُوْا لَهٗ ذٰلِكَ يَآاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَاضٍ عَنْ عُمَرَ وَعَنْ عَلِيٍّ وَّعَنْ عُثْمَانَ وَعَنْ طَلْحَةَ وَالزُّبَيْرِ وَالسَّعِيْدِ وَعَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ اِعْرِفُوْا لَهُمْ ذٰلِكَ۔

اے لوگو میں ابو بکر صدیق سے راضی ہوں تو تم اسے خوب جان لو، اے لوگو! میں عمر سے، علی سے، عثمان، سے اور طلحہ، زبیر، سعید، عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم سے راضی ہوں تو تم اسے خوب جان لو۔ یہ حدیث عشرہ مبشرہ کی حدیث کی مانند ہے کیونکہ اس میں ان حضرات کو اپنی رضامندی کی پختہ بشارت دی گئی ہے لیکن اس میں حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کا ذکر نہیں ہے اور حضرت امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی مجلس شوریٰ میں فرمایا کہ یہ وہ حضرات ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب اس عالم سے تشریف لے گئے تو حال یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سب حضرات سے راضی گئے اور فرمایا:

اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ اللهَ غَفَرَ لِاَهْلِ بَدْرٍ وَّالْحُدَيْبِيَةِ اَيُّهَا النَّاسُ اِحْفَظُوْنِيْ فِيْ اَصْحَابِيْ وَاَصْهَارِيْ وَاَحِبَّائِيْ لَا يُطَالِبَنَّكُمْ اَحَدٌ مِّنْهُمْ بِمَظْلِمَةٍ فَاِنَّهَا مَظْلِمَةٌ لَا تُوْهَبُ فِي الْقِيٰمَةِ غَدًا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے بدر و حدیبیہ والوں کو بخش دیا ہے فرمایا اے لوگو! میرے اصحاب، سسر و داماد اور محبوبوں کے بارے میں حفاظت رکھو اس لئے کہ جو ان کے بارے میں میرے حقوق کی حفاظت کرے گا یقیناً وہ دنیا و آخرت میں حق تعالیٰ کے حقوق کی حفاظت کرے گا اور جو ان کے بارے میں میری حفاظت کرے گا حق تعالیٰ اس سے در گزر فرما کر صراط پر سے گزار دے گا اور جو انہیں چھوڑ دے گا اور ان سے علیحدگی اختیار کرلے گا قریب ہے کہ حق تعالیٰ اسے گرفت میں لے کر عذاب میں مبتلا کر دے۔ اور فرمایا جو میرے صحابہ کے بارے میں حفاظت کرے گا وہ میرے حوض پر میرے پاس آئے گا اور جو میری

میرے صحابہ کے بارے میں حفاظت نہ کرے گا وہ میرے حوض پر میرے پاس نہیں آئے گا۔ اور وہ مجھے نہ دیکھ سکے گا مگر بہت دور سے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آدھی رات کے وقت جنت البقیع تشریف لے جاتے اور وہاں صحابہ کے لئے دعاواستغفار فرمایا کرتے تھے۔ اور اس کیلئے حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا تھا۔ اور ہمیں صحابہ کرام سے محبت ومودت کرنے اور ان کے طریقۂ حسنہ کو اختیار کرنے کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی صحابی ایسا نہیں ہے جسے روزِ قیامت شفاعت کرنے کا حق نہ دیا گیا ہو۔ اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ حضرت مغیرہ بن نوفل رضی اللہ عنہ سے روزِ قیامت شفاعت کرنے کی استدعا کیا کرتے تھے۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لایا جو آپ کے صحابہ کرام کی تعظیم وتوقیر نہیں کرتا اور انہیں عزیز نہیں رکھتا اور نہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی قدر ومنزلت کرتا ہے۔

منقول ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شخص کا جنازہ لایا گیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی اور فرمایا یہ شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغض وعداوت رکھتا تھا اس پر حق تعالیٰ بھی اس سے برأت کا اظہار فرماتا ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فضائل ومناقب کے باب میں بکثرت روایات واحادیث موجود ہیں اور طول طویل تفصیلات مذکور ہیں خصوصاً مشکوٰۃ کی شرح میں ہم نے کچھ تو وہاں سے اور کچھ دیگر اہلِ سنت و جماعت کی کتابوں سے فریقین کے تعصب سے قطع نظر کر کے نقل کر دی ہیں (وباللہ التوفیق وھواعلم)

متعلقاتِ نبوت یعنی اماکن ومقاماتِ مقدسہ وغیرہ کی تعظیم وتوقیر۔ وصل: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم وتوقیر میں یہ بھی ہے کہ ہر وہ چیز جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق رکھے خواہ وہ اماکن متبرکہ ہوں یا مقاماتِ مقدسہ یا وہ چیز جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ اقدس سے چھو گئی ہو یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی معرفت کرائی ہو ان سب کی تعظیم وتوقیر ہر مسلمان کیلئے لازم وضروری ہے۔

منقول ہے کہ حضرت ابو مخدورہ رضی اللہ عنہ کی پیشانی کے بال اتنے لمبے تھے کہ جب بیٹھتے تو ان کے بال زمین تک پہنچ جاتے تھے لوگوں نے ان سے پوچھا ان بالوں کو اتنا لمبا کیوں کر رکھا ہے انہیں ترشواتے کیوں نہیں؟ جواب میں فرمایا میں انہیں اس بنا پر نہیں ترشواتا کہ ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ مبارک اس سے مس کر گیا تھا۔ میں تبرکاً ان کی حفاظت کرتا ہوں۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی ٹوپی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک کے چند بال تبرکاً رکھے ہوئے تھے، ایک جنگ میں میدان کارزار میں ان کی یہ ٹوپی سر سے اتر کر گر پڑی تو انہوں نے اس کے حاصل کرنے کا عزم صمیم کر لیا۔ اور شدت کے ساتھ جنگ کی اس جنگ میں بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔ اس پر بہت سے صحابہ کرام نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ پر اعتراض کیا۔ انہوں نے فرمایا میں نے یہ جنگ محض ٹوپی حاصل کرنے کیلئے شدت کے ساتھ نہیں لڑی بلکہ ان موئے ہائے مبارک کیلئے لڑی ہے جو اس ٹوپی میں سلے ہوئے تھے اور میں نے اس کی حفاظت کیلئے یہ شدت اختیار کی ہے تاکہ وہ مشرکوں کے ہاتھوں میں پڑ کر ضائع نہ ہو جائیں اور مجھ سے یہ تبرک جاتا رہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا گیا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست گاہ پر اپنے ہاتھوں کو پھیرتے پھر ان ہاتھوں کو اپنے چہرے پر ملتے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ میں اپنی سواری کے جانور پر سوار نہ ہوتے اور فرماتے کہ میں خدا سے شرم رکھتا ہوں کہ اس زمین

کو گھوڑوں کے سموں سے روندوں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرماہیں اور اس زمینِ مقدسہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مبارک قدم رکھے ہیں۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ نے اپنے تمام گھوڑے امام شافعی رحمہ اللہ کے حوالے کر دیئے۔ اس پر امام شافعی نے کہا اپنے لئے بھی ایک گھوڑا روک لیجئے تو انہیں بھی یہی مذکورہ بالا جواب دیا۔

احمد بن فضلویہ زاہد سے منقول ہے کہ یہ بزرگ بڑے غازیوں اور تیراندازوں میں سے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے کبھی اپنی کمان کو اپنے ہاتھ سے بغیر وضو نہیں چھوا۔ جب سے میں نے یہ سنا کہ اس کمان کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک میں لیا تھا۔

امام مالک رحمہ اللہ نے اس شخص کو قید کرنے اور اس پر تین درے مارنے کا فتویٰ دیا جس نے یہ کہا تھا کہ مدینہ طیبہ کی مٹی خراب ہے۔ باوجودیکہ وہ شخص لوگوں میں بڑی قدر و منزلت والا شخص تھا اور کیا تعجب ہے کہ اس شخص کی گردن اڑا دینے کا حکم دیا جائے جو معاذ اللہ یہ کہے کہ وہ مٹی جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرماہیں خراب اور غیر خوشبودار ہے۔ حالانکہ اس شہر مقدس کے ناموں میں طابہ اور طیبہ ہے اس وجہ سے یہ شہر مقدس شرک کی نجاست سے پاک ہے۔ اور یہ مقام طبائع سلیمہ کے موافق ہے اور اس وجہ سے بھی کہ اسکی خوشبو پاکیزہ بلکہ تمام امور میں طیب ہے۔ اور کہتے ہیں کہ اس مقام مقدس، شہر مطہر کے رہنے والے، مٹی اور درو دیوار اور پاکیزہ فضاؤں سے ایک خاص قسم کی خوشبو محسوس کرتے ہیں۔ جسے کسی خاص خوشبو سے تشبیہہ نہیں دی جا سکتی اور نہ اسے زبان بیان کر سکتی ہے اور ممکن ہے کہ کسی کی سونگھنے والی ناک نے ایسی خوشبو کہیں اور سونگھی بھی نہ ہو اور اسے بعض صادقانِ راہ اور مشتاقانِ حبیب نے پایا بھی ہو ابو عبداللہ عطار فرماتے ہیں بیت ۔

بِطِيْبِ رَسُوْلِ اللهِ طَابَ نَسِيْمُهَا　　فَمَا الْمِسْكُ وَالْكَافُوْرُ وَالصَّنْدَلُ الرَّطْبُ

اور اشبیلی جو کہ علمائے صاحبِ وجدان میں سے ہیں فرماتے ہیں کہ مدینہ طیبہ کی مٹی میں خاص قسم کی خوشبو ہے جو کسی مشک و عنبر میں بھی نہیں ہے۔ اس پر کسی نے کہا یہ بات تو تیری عجیب و غریب اور نادر ہے حالانکہ در حقیقت یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ بیت

دراں زمیں کہ نسیمے وزد طرۂ دوست　　چہ جائے دم زدن نافہائے تا تاریست

منقول ہے کہ جہجاہ غفاری نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عصائے مبارک کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے لے کر چاہا کہ اپنے زانو پر رکھ کر اسے توڑے اس پر لوگوں نے اس سے باز رہنے کیلئے شور مچایا۔ اس کے بعد اس کے زانو میں پھوڑا نکلا پھر وہ زانو کاٹا گیا بالآخر اسی سال وہ مر گیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص میرے منبر پر جھوٹی قسم اٹھائے اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے اور فرمایا قبر شریف اور منبر کے درمیان جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری ہے اور باقی فضائل و کمالات اور مناقب و صفات اس شہر مقدس مدینہ طیبہ اور اس کے اماکن و مواضع مقدسہ اور وہاں کے رہنے والوں کی تعظیم اور وہاں کی اقامت وغیرہ کے آداب کا تذکرہ ہماری کتاب "جذب القلوب الی دیار المحبوب" میں مذکور ہے وہاں ملاحظہ کریں۔

وجوبِ صلوٰۃ و سلام اور اس کی فضیلت۔ وصل: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام عرض کرنے کے حکم اور اس کے وجوب و فضیلت اور اس کے بیان صفت و کیفیت اور اس کے مقامات وغیرہ کے ذکر میں یہ باب ہے۔

واضح رہنا چاہئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام عرض کرنے کے وجوب کے ضمن میں یہ آیۂ کریمہ اس کی اصل و بنیاد ہے۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۝ بیشک اللہ اور اس کے فرشتے نبی کریم پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں اے ایمان والو تم بھی ان پر خوب درود و سلام بھیجو۔

آگاہ رہنا چاہئے کہ اس آیۂ کریمہ میں حق تعالیٰ نے صلوٰۃ علی النبی کی نسبت اپنی ذات کریم اور اپنے فرشتوں کی طرف فرمائی ہے۔ اور مسلمانوں کو حضور پر صلوٰۃ و سلام عرض کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ صلوٰۃ کے معنی میں علمائے کرام کے مختلف و متعدد اقوال ہیں۔ چنانچہ ابوالعالیہؒ جو کہ تابعین میں سے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حق تعالیٰ کا صلوٰۃ بھیجنے کے یہ معنی لئے ہیں کہ حق تعالیٰ کا فرشتوں کے سامنے اپنے نبی کی ثنا کرنا اور اس کی بزرگی بیان فرمانا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر فرشتوں کا صلوٰۃ بھیجنا، تو اس کے معنی فرشتوں کا دعا کرنا اور بارگاہِ الٰہی میں عزت و عظمت کے اضافہ کی درخواست کرنا ہے اور یہی معنی مسلمانوں سے ہیں کہ انہیں اس کا حکم فرمایا گیا، اس سے مراد زیادتی و برکت کو طلب کرنا ہے۔ اور مقاتل کہتے ہیں کہ صلوٰۃِ اللہ کے معنی اس کی مغفرت اور صلوٰۃِ ملائکہ کے معنی استغفار ہیں۔ اور ضحاک کہتے ہیں کہ صلوٰۃِ اللہ کے معنی اس کی رحمت اور ان کی ایک روایت میں مغفرت کے ہیں اور صلوٰۃِ ملائکہ کے معنی دعا یعنی دعائے مغفرت و رحمت کے ہیں۔ اور فرشتوں کا اپنا کام ہی مسلمانوں کیلئے استغفار کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔" (فرشتے استغفار کرتے ہیں مسلمانوں کیلئے) اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار میں بیٹھنے والوں کے باب میں مروی ہے کہ ان کیلئے فرشتے دعا کرتے ہیں کہ: "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُمْ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْهُمْ ۔" اور مبرد نے کہا صلوٰۃِ خدا، رحمتِ الٰہی ہے اور صلوٰۃِ ملائکہ ان کی وہ رقت ہے جو طلبِ رحمت کے باعث ہوتی ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ صلوٰۃِ خدا مخلوق پر خاص بھی ہوتی ہے اور عام بھی۔ لہٰذا انبیاء علیہم السلام کی صلوٰۃِ خدا، ان کی ثنا و تعظیم ہے۔ جو ہر ایک کے حال کے لائق ہے۔ خصوصاً سید انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ان سب میں اخص و افضل ہوگی۔ اور عام لوگوں پر رحمت عام ہے جیسا کہ حق تعالیٰ نے اپنے ارشاد میں اس کی طرف اشارہ فرمایا۔ "رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ۔" (میری رحمت ہر شئی پر وسیع ہے) اور یہیں سے اس صلوٰۃ کے درمیان فرق ظاہر ہو جاتا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمت خداوندی ہے اور جو دیگر مسلمانوں پر رحمت الٰہی ہے۔ کیونکہ فرمایا: "اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ۔" اور فرمایا: "هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ" اور ظاہر ہے کہ یہ آپ کے حال شریف کے لائق ہی اعلیٰ و اتم اور اکمل ہوگا۔

کہتے ہیں کہ اس آیتِ کریمہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تکریم ہے کہ حضرت حق رب العزت اور ساری مخلوق آپ کی تعظیم و ثنا اور دعا کرتی ہے اور اسی بنا پر صلوٰۃ بر مومنین میں فرمایا: "لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔" تاکہ اللہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی جانب لے جائے۔

حلیمی فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ علی النبی کے معنی آپ کی تعظیم ہے اور ہمارے قول "اللھم صل علیٰ سیدنا" کے معنی "عظم محمداً" یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں آپ کے ذکر کی بلندی کے ساتھ اور آپ کی شریعت کے غلبہ اور دین کی اشاعت کے ساتھ اور آخرت میں امت کو ثواب دے کر ان کی شفاعت قبول کر کے اور معزز مقام محمود پر فائز کر کے آپ کی بڑائی فرما اور بر تقدیر مراد بقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "ادعوا ربکم بالصلوٰۃ علیہ" اپنے رب سے تم آپ پر صلوٰۃ بھیج کر دعا مانگو۔

اور آپ کے آل و ازواج اور ذریتِ پاک پر درود بھیجنا بطریق تبع و طفیل ہے اور غیر نبی پر صلوٰۃ کے جواز میں اختلاف ہے مگر ان کی تبعیت کے ساتھ جائز ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ امت کا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام پیش کرنے کا مقصود، تقرب الی اللہ اور حکم رب تعالیٰ کا بجالانا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو حقوق ہم پر لازم ہیں اسے ادا کرنا ہے۔

شیخ عزالدین عبدالسلام اپنی کتاب مسمّٰی " بہ شجرۃ المعارف " میں فرماتے ہیں کہ ہماری طرف سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں صلوٰۃ وسلام عرض کرنا بارگاہِ رب العزت میں ہماری سفارش وشفاعت کرنا نہیں ہے اس لئے کہ ہم جیسے امتی کی سفارش آپ جیسے نبیوں کیلئے نہیں ہوتی ہے لیکن حق تعالیٰ نے ہمیں حقوق بجالانے اور شکر گزاری کرنے کا حکم ہراس شخص کیلئے دیا ہے جو احسان کرے۔ بالخصوص اس عظیم احسان وعطاکی بناپر جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم پر فرمایا ہے۔ چونکہ ہم کماحقہ اس کا بدل اداکرنے سے عاجز تھے اس بناپر حق تعالیٰ نے ہمیں ارشاد فرمایا کہ چونکہ ہم بدل کرنے سے عاجز ہیں لہٰذا بارگاہِ عزت میں ہی دعا کرتے ہیں کہ وہی حضور کی عظمت و کبریائی کے لائق اور اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عزت وکرامت کے مطابق جواس کی بارگاہ میں ہے رحمت وبرکت اور تعظیم نازل فرمائے۔

قاضی ابو بکر بن العربی فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام بھیجنے کا فائدہ دراصل صلوٰۃ وسلام بھیجنے والے کیلئے ہی ہے۔ بایں سبب کہ صلوٰۃ وسلام عرض کرنا مضبوطیٔ عقیدت خلوصِ نیت اظہارِ محبت، مداومتِ اطاعت معرفتِ حق، وساطت، اور اس واسطہ کے احترام پر دلالت کرتا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ سے ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے دعا کرنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے فیض اور خیروبرکت کی استدعا کرنا درحقیقت مخلوق کیلئے دعا کرنا ہے اور یہ اس پانی کے حکم میں ہے جو پرنالہ سے بہایا جاتا ہے اور زمین میں سما جاتا ہے پھر وہ بخارات بن کر اوپر چڑھتا ہے۔ اور بارش بن کر سب کو فیض پہنچاتا ہے۔ لہٰذا یہ دعا ساری مخلوق کو شامل ہے۔

فائدہ: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام عرض کرنے کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا یہ فرض ہے یا مستحب؟ مذہب مختار یہ ہے کہ یہ فرض ہے اس لئے ظاہرامر وحکم وجوب کیلئے ہے لیکن فی الجملہ اگرچہ عمر میں ایک ہی مرتبہ ہو۔ جیسے کہ آپ کی نبوت ورسالت کی شہادت دینا۔ لہٰذا واجب ایسی چیز ہے جو کسی حرج کے بغیر ساقط ہو جائے اور اس میں کسی معین عدد کی تخصیص نہ ہو۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ وسلام کی کثرت کرنا بغیر تخصیص وتقیید کسی گنتی وشمار کے واجب ہے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ نے ہر مسلمان پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجنا فرض قرار دیا ہے اور اس کیلئے کسی خاص دعا کا تعین کرنا نہیں فرمایا ہے لہٰذا واجب یہ ہے کہ بکثرت صلوٰۃ وسلام بھیجی جائے اور کسی وقت اس سے غافل نہ رہے۔ تیسرا مذہب یہ ہے کہ جب بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نامِ نامی اسمِ گرامی لیا جائے اور آپ کا تذکرہ کیا جائے ہر بار صلوٰۃ وسلام عرض کرنا واجب ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ مختار یہی مذہب ہے اور مواہب لدنیہ میں کہا گیا ہے کہ اسی مذہب کے قائل، امام طحاوی، جماعتِ حنفیہ، حلیمی اور جماعتِ شافعیہ ہیں اور قاضی ابو بکر ابن العربی مالکی فرماتے ہیں کہ اسی میں زیادہ احتیاط ہے۔ اور ایسا ہی زمخشری نے بھی کہا ہے۔ یہ تمام حضرات اور یہ تمام جماعتیں اس حدیث سے استدلال کرتی ہیں کہ فرمایا: "مَنْ ذُکِرْتُ عِنْدَہٗ فَلَمْ یُصَلِّ عَلَیَّ فَمَاتَ دَخَلَ النَّارَ اَخْرَجَہٗ ابْنُ حَبَّانَ عَنْ حدیث ابی ھریرۃ۔" جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر صلوٰۃ وسلام نہ بھیجے اور اسی حال میں مر جائے تو اسے جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ اور ترمذی میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اتنا زیادہ ہے کہ: "رَغِمَ اَنْفُ مَنْ ذُکِرْتُ عِنْدَہٗ فَلَمْ یُصَلِّ عَلَیَّ۔" یعنی ناک کے بل گھسیٹا جائے گا۔ وہ شخص جس کے سامنے میرا ذکر ہو اور وہ مجھ پر درود وسلام نہ بھیجے۔ اسے حاکم نے صحیح کہا ہے۔ اور انہوں نے اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے کہ فرمایا: "شَقِیَ عَبْدٌ ذُکِرْتُ عِنْدَہٗ فَلَمْ یُصَلِّ عَلَیَّ اَخْرَجَہُ الطَّبْرَانِیُّ مِنْ حَدِیْثِ جَابِرٍ" یعنی وہ بندہ بدنصیب ہے جس کے سامنے میرا ذکر ہو اور وہ مجھ پر درود وسلام نہ بھیجے۔ یہ استدلال اس لئے ہے کہ ترک پر وعید فرمانا وجوب کی علامتوں میں سے ہے۔

نیز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجنے کے حکم کا فائدہ آپ کے احسان کے بدلے اور اس کے مکافات میں ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا احسان مستمر اور دائمی ہے لہٰذا جب بھی ذکر کیا جائے تو یہ حکم اس پر موکد ولازم ہوگا۔ نیز ان حضرات کا استدلال اس آیہ کریمہ سے بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا: "لَا تَجْعَلُوْا دُعَاءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ۔" رسول کے پکارنے کو آپس کے ایک دوسرے کے پکارنے کی مانند نہ بناؤ۔ لہٰذا اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارا جائے یا آپ کا ذکر کیا جائے اور آپ پر صلوٰۃ وسلام نہ بھیجا جائے تو لوگوں کے ساتھ پکارنے اور یاد کرنے میں برابری ہو جاتی ہے اور وہ حضرات جو ہر بار ذکر پر صلوٰۃ وسلام بھیجنے کے وجوب کے قائل نہیں ہیں کئی طرح پر اس کا جواب دیتے ہیں ایک یہ کہ ایسا قول کسی صحابی اور تابعین سے منقول نہیں ہوا ہے۔ لہٰذا یہ قول اختراعی ہے اور اگر اسے اپنے عموم پر رکھا جائے تو مؤذن اور اذان کے سننے والے پر واجب ہو جاتا ہے اسی طرح تلاوت قرآن کرنے والے پر لازم آتا ہے کہ جب بھی وہ کسی آیت پر پہنچے جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر شریف ہے تو صلوٰۃ وسلام عرض کرے اور کسی کو اسلام میں داخل کرتے وقت لازم ہو جاتا ہے۔ جس وقت کہ وہ شہادت کا تلفظ کرے حالانکہ نہ ایسا آیا ہے اور نہ ایسا منقول ہے۔ نیز اس میں مشقت اور حرج بھی ہے اور شریعت مطہرہ کی وضع کے برخلاف سختی بھی ہے۔ نیز حق تعالیٰ کی حمد وثنا جب بھی اس کا ذکر ہو واجب نہیں ہے حالانکہ یہ وجوب میں زیادہ حق رکھتا ہے اور کوئی اس کا قائل بھی نہیں ہے۔ صاحب مواہب لدنیہ فرماتے ہیں کہ فقہ حنفیہ کی کتاب قدوری میں وجوب صلوٰۃ وسلام کو علی الاطلاق ذکر کیا ہے یعنی جب بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آئے صلوٰۃ وسلام عرض کرنا واجب ہے۔ حالانکہ یہ پہلے سے اجماع شدہ مسئلہ کے خلاف ہے اس لئے کہ کسی صحابی سے ایسی نقل محفوظ نہیں ہے کہ وہ جب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے وقت "یارسول اللہ" کہیں تو صلوٰۃ وسلام بھی عرض کریں اور اگر ایسا ہو بھی تو دیگر عبادتوں میں اسے جاری نہیں کیا جا سکتا۔ اور مذکورہ حدیثوں کا یہ جواب دیتے ہیں کہ وہ حدیثیں مبالغہ اور تاکید کے طریقے پر ان لوگوں کیلئے وارد ہیں جن کی عادت وخصلت صلوٰۃ وسلام نہ بھیجنے پر پڑ گئی ہے اور وہ اس کے خوگر بن گئے ہیں خلاصہ جوابات یہ ہے کہ ایک مجلس میں بار بار ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہر بار درود وسلام بھیجنا واجب نہیں ہے اور بعض اس کے قائل ہیں کہ ہر مجلس میں ایک بار کہنا واجب ہے۔ اگرچہ ذکر شریف بار بار ہوتا رہا ہے اسے زمخشری نے بیان کیا اور بعض کہتے ہیں کہ دعا میں واجب ہے اور اکثر کا مذہب یہ ہے کہ مستحب ہے اور امر بھی استحبابی ہے نہ کہ وجوبی۔

بندۂ مسکین (صاحب مدارج النبوۃ) ثبتہ اللہ علی طریق الحق والیقین ورحمۃ اللہ علیہ کہتا ہے کہ اگر وہ کہتے کہ ایک بار فرض ہے اور بکثرت واجب ہے اور ہر بار مستحب ہے تو بھی ایک صورت ہوتی اور محبت کی شان کے لائق بھی ہوتی کیونکہ زیادتی محبت کا اقتضاء ہے کہ مستحب بھی بمنزلہ واجب کے ہوتا ہے اور اس میں از خود کوتاہی کرنے پر راضی نہیں ہوتا اور یہ طالب سے عجیب ہے کہ صلوٰۃ وسلام کے فوائد پر مطلع ہوتے ہوئے اس میں کوشش بلیغ نہ کرے۔

بعض کہتے ہیں کہ نماز میں بغیر تعین محل واجب ہے یہ قول امام ابو جعفر محمد باقر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اور بعض کہتے ہیں کہ تشہد میں واجب ہے یہ قول شعبی اور اسحاق بن راہویہ کا ہے۔ اور عاشر کا قول یہ ہے کہ یہ آخر نماز میں تشہد کے بعد سلام سے پہلے واجب ہے۔ اور یہ قول امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے، اور وہ اس سے استدلال کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجنا فرض قرار دیا ہے اور نماز سے زیادہ اولیٰ مقام اس کے لئے کوئی اور نہیں ہے اور حدیثوں میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام بھیجنے کا ذکر تشہد میں آیا ہے لہٰذا جائز نہیں ہے کہ تشہد کو تو واجب کہوں اور صلوٰۃ ودرود کو واجب نہ کہوں۔ امام شافعی کے اس قول کو دیگر حضرات نے تسلیم نہیں کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ سلف میں سے کسی نے ان کے اس قول کی موافقت نہیں کی ہے اور نہ اس

بارے میں کوئی سنت ہی وارد ہے جس کا اتباع کیا جائے اور ان سے پہلے کے تمام علماء کا اس پر اجماع ہے کہ نماز میں درود واجب نہیں ہے۔ اور بعض شوافع نے بھی مثلاً خطابی وغیرہ نے اسے تسلیم نہیں کیا اور اس قول کو ان کی جانب سے بعید بتایا ہے اور ان حدیثوں کو جن سے بعضوں نے اس پر استدلال کیا ہے اور ضعیف گردانا ہے۔ تشہد کے سلسلے میں یہ کہنا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تشہد کو اس طرح سکھایا جس طرح قرآن کی سورتیں لکھائیں اس میں درود کا ذکر نہیں ہے۔ صاحب مواہب لدنیہ مذہب امام شافعی رحمہ اللہ کی توجیہہ اور اس کے نظائر میں مبسوط کلام اور طویل بیان لائے ہیں جسے دوسری جگہ نقل کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

تشہد میں درود کی کیفیت: واضح رہنا چاہیے کہ تشہد میں درود پڑھنے کی کیفیت میں بکثرت حدیثیں مروی ہیں جن میں مختلف صیغے منقول ومروی ہیں اور اگر یہ صیغہ پڑھیں کہ۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی سَیِّدِنَا اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا اِبْرَاهِیْمَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی سَیِّدِنَا اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا اِبْرَاهِیْمَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

تو یہ کافی ہے اور میں نے اسے بعض مشائخ سے سنا ہے اور اگر پہلے درود میں کہے۔ "وَصَلِّ عَلَیْنَا مَعَهُمْ" اور دوسرے درود میں کہے: "وَبَارِكْ عَلَیْنَا مَعَهُمْ"۔ جیسا کہ بعض حدیثوں میں آیا ہے تو بہتر ہے اور "کما صلیت" اور "کما بارکت" کی تشبیہ میں اہل عرب کے قاعدہ کے بموجب کہ وہ اتم واقوی سے تشبیہہ دیتے ہیں، اعتراض بیان کرتے ہیں تو اس کا کئی طرح سے جواب دیا گیا ہے ان میں سے ایک جواب یہ ہے کہ مشبہ بہ کا خوب مشہور ہونا کافی ہے اور زیادہ قوی جواب یہ ہے کہ ماسبق میں جو اتم واکمل صلوٰۃ گزرا ہے اس سے تشبیہہ دینا ہے۔ اس کے ماسوا اور بھی وجوہات مذکور ہیں اور اکثر توجیہات وہ ہیں جو غور وفکر سے تعلق رکھتی ہیں ان کو ہم نے جدا رسالہ میں ذکر کر دیا ہے وہیں ملاحظہ کریں اور افضل صلوٰۃ میں علماء کا اختلاف ہے اکثر کا مذہب یہی ہے کہ وہ صیغہ جو نماز میں پڑھا جاتا ہے وہی افضل ہے کیونکہ نماز کی حالت سب سے افضل ہے۔ یہاں تک کہ اپنی قسم میں کوئی نذر مانے کہ میں سب سے افضل درود پڑھوں گا اور وہ اس صیغہ سے درود پڑھے تو وہ اپنی قسم سے عہدہ بر آ ہو جائے گا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ وہ صیغہ افضل ہے جو مقدار میں زیادہ اور کیفیت میں افضل ہونے پر مشتمل ہو اور بعض کہتے ہیں کہ یہ صیغہ پڑھے "اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ کَمَا هُوَ اَهْلُهٗ وَمُسْتَحِقُّهٗ"۔ اس قسم کے بہت سے درود کے صیغے جس قدر کہ معلوم ہو سکے۔ "رسالت صلوٰتیہ" میں ذکر کر دیے گئے ہیں وباللہ التوفیق۔

مقاماتِ درود وسلام: وصل: وہ مقامات جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا وارد ہے۔ ایک مقام نماز میں آخری تشہد ہے جیسا کہ گزرا اور یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک فرض ہے اور بعض دیگر ائمہ کرام اور جمہور کے نزدیک بعد تشہد قبل از دعا یہ مستحب ہے اور پہلے تشہد میں اس کے واجب ہونے پر دو قول ہیں۔ ظاہر تر قول ممانعت کا ہے اس بنا پر کہ اس میں تخفیف مقصود ہے اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پہلے تشہد میں اتنی جلدی اٹھ جاتے گویا جس طرح گرم پتھر پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور پہلے تشہد میں آل پر درود بھیجنے کے استحباب میں دو قول ہیں۔ اور آخری تشہد میں اس کے وجوب میں بھی دو روایتیں ہیں۔ اور قول اصح یہ ہے کہ سنتِ تابعہ ہے۔ یعنی نبی کے اتباع میں ان کے بعد آل پر درود بھیجنا ہے۔ یہ سب اقوال شوافع کے ہیں۔ لیکن احناف کے نزدیک نماز کے آخری تشہد میں درود بھیجنا ہے۔ اور یہ سنت ہے۔ اور اگر پہلے تشہد میں بھول کر پڑھ لیا تو سجدہ واجب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ قیام جو فرض ہے اس میں تاخیر لازم آتی ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ اگر: "اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ"۔ کی مقدار میں پڑھا ہے تو سجدۂ سہو واجب نہیں ہوتا اور کم سے کم مقدار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کی "اَللّٰهُمَّ

صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ " کہنا ہے اور کم سے کم آل پر درود بھیجنے کی مقدار " وَاٰلِہٖ " ہے اور کفایہ میں اعادہ علٰی کے ساتھ ہے یعنی وَعَلٰی اٰلِہٖ۔ اور فضالہ بن عبیدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کے بارے میں سنا کہ اس نے نماز میں دعا تو مانگی مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود نہ پڑھا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس شخص نے جلد بازی کی۔ پھر اس کو بلایا اور اسے اور دوسروں کو بتایا کہ جب تم میں کوئی نماز ادا کرے تو اسے لازم ہے کہ (تشہد کرے) حمد الٰہی سے ابتدا کرے اور ایک روایت میں ہے کہ تمجید و ثنائے الٰہی سے شروع کرے۔ پھر چاہئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے۔ پھر جو خواہش ہو اس کی دعا کرے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا دعا اور نماز زمین و آسمان کے درمیان معلق رہتی ہے اور ان میں سے کوئی چیز اوپر نہیں جاتی جب تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود نہ بھیجا جائے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اس حدیث کے مثل مروی ہے یہ حدیث دعائے نماز میں واقع ہوئی ہے۔ اور دعائے مطلق خواہ نماز میں ہو یا خارج نماز میں، یہ بھی صلوٰۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مقام ہے۔ اور دعا کے ارکان و آداب میں سب سے قوی ہے۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب تم میں سے کوئی چاہے کہ حق تعالیٰ سے کچھ مانگے اور دعا و سوال کرے تو اس کو چاہئے کہ پہلے خدا کی شان کے لائق حمد و ثنا کرے اس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے پھر سوال کرے اس لئے کہ بلاشبہ یہ طریقہ حاجت برآری اور حصول مراد کیلئے احق اور سب سے بہتر ہے۔

فائدہ: دعاء کے اول میں، درمیان اور اس کے آخر میں درود بھیجنا چاہئے۔ جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مروی ہے۔ ابن عطا فرماتے ہیں کہ دعا کے ارکان، بازو، اسباب اور اوقات ہیں۔ اگر ارکان موافق ہوں تو دعا قوی ہو جاتی ہے اور اگر بازو موافق ہوں تو دعا آسمان کی طرف جلد پرواز کر جاتی ہے۔ اور اگر اوقات موافق ہوں تو دعا جلد مقبول ہوتی ہے اور اگر اسباب موافق ہوں تو دعا مقصود تک جلد پہنچ جاتی ہے۔ دعا کے ارکان، حضور قلب، گڑگڑانا، عاجزی سے آنکھیں بند کرنا اور جناب حق تعالیٰ سے تعلق خاطر اور ماسویٰ سے قطع تعلق ہیں۔ اور دعا کے بازو صدق، دعا کے اوقات وقت سحر اور اس کے اسباب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا ہے۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ جس دعا کے اول و آخر میں درود شریف ہے وہ دعا کبھی رد نہیں ہوتی۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ ہر دعا آسمان کے نیچے معلق رہتی ہے جب مجھ پر درود بھیجا جاتا ہے تب وہ آسمان پر چڑھتی ہے اور سب سے زیادہ موکدہ بعد از دعائے قنوت ہے۔ اس حدیث کی سند حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا امام حسن بن علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما کو قنوت کی تعلیم فرمانے والی حدیث ہے۔ جس کے شروع میں "اَللّٰهُمَّ اهْدِنِیْ فِیْمَنْ هَدَیْتَ" اور اس کے آخر میں: "وَصَلَّی اللّٰهُ عَلَی النَّبِیِّ مُحَمَّدٍ" مروی ہے یہ دعائے قنوت امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ہے۔ جس کا ذکر باب الصلوٰۃ میں آئے گا۔

مقاماتِ صلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے خطبہ جمعہ ہے جسے خطیب اپنے خطبہ کا جزبنائے۔ اس لئے کہ خطبہ عبادت ہے اور ذکر خدائے عزو جل اس میں شرط ہے۔ لہٰذا واجب ہے کہ ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہو جیسا کہ اذان و نماز میں ہوتا ہے۔ درود شریف کے بغیر خطبہ جمعہ صحیح نہیں ہے یہ مذہب امام شافعی اور امام احمد کا ہے اور مقامات صلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے مؤذن کی دعوت کا جواب دیتے وقت ہے۔ جیسا کہ امام احمد کی حدیث میں بروایت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب موذن کا اعلان سنو تو جو وہ کہے وہی کہہ کر جواب دو اس کے بعد مجھ پر درود بھیجو۔ اس لئے کہ جو مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے حق تعالیٰ اس پر دس مرتبہ رحمتیں نازل فرماتا ہے۔ اس کے بعد میرے لئے وسیلہ کی دعا مانگو (آخر حدیث تک) مزید ذکر باب الاذان میں آئے گا۔ اور بعض کتابوں میں مسجد سے نکلتے ہوئے اور اذان و اقامت کے جواب کے وقت اور تکبیرات عیدین کے درمیان بھی آیا ہے۔ اسے مواہب لدنیہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔

مسجد میں داخل ہونے اور اس سے نکلنے کے وقت کی روایت کو سیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مسجد میں داخل ہوتے تو خود پر درود بھیجتے تھے۔ اور اس کے بعد کہتے۔ "اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ وَافْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِکَ ۔" اسی طرح جب مسجد سے نکلتے تو خود پر درود بھیجتے اور اس کے بعد کہتے۔ "اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ وَافْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ فَضْلِکَ " اسی کی مانند حضرت ابو بکر بن عمرو بن حزم سے بھی مروی ہے۔ اور ابو اسحٰق شیبانی فرماتے ہیں کہ جو کوئی مسجد میں داخل ہوا سے چاہئے کہ درود بھیجے اور ترحم کرے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آل پر برکات وسلام بھیجے اور عمر بن دینار رحمۃ اللہ علیہ آیہ کریمہ "فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِکُمْ ۔" (جب تم گھروں میں جاؤ تو اپنے گھر والوں کو سلام کرو) کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ اگر گھر میں کوئی موجود نہ ہو تو "اَلسَّلَامُ عَلَی النَّبِیِّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ ۔" کہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس آیت میں بیوت سے مراد مسجدیں ہیں اور حضرت نخعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر مسجد میں کوئی شخص موجود نہ ہو تو "اَلسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ ۔" کہے اور اگر گھر میں کوئی نہ ہو تو۔ "اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ ۔" کہے۔

حضرت علقمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ میں جب مسجد میں داخل ہوتا ہوں تو "اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ وَصَلَّی اللّٰہُ وَمَلَائِکَتُہٗ عَلٰی مُحَمَّدٍ ۔" کہتا ہوں۔ اسی کی مانند حضرت کعب سے مسجد میں داخل ہوتے اور مسجد سے نکلتے وقت کے سلسلے میں مروی ہے اور نماز جنازہ میں درود پڑھنے کا ذکر نہیں کیا گیا۔ صاحب مواہب فرماتے ہیں کہ پہلی تکبیر کے بعد نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھے۔ اور دوسری تکبیر کے بعد درود بھیجے۔ اور تیسری تکبیر کے بعد میت کیلئے دعا کرے اور چوتھی تکبیر کے بعد۔ "اَللّٰھُمَّ لَا تَحْرِمْنَا اَجْرَہٗ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَہٗ ۔" کہے یہ اس حدیث میں ہے جسے امام شافعی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ یہ امام شافعی کے مذہب میں ہوگا۔ لیکن ہمارے مذہب میں نماز جنازہ کے اندر قرأۃ سورۂ فاتحہ نہیں ہے اور کہتے ہیں کہ ایک روایت کے بموجب بر طریق دعا ہے نہ کہ بر طریق قرأت اس کے باوجود درود بھیجنا ہمارے مذہب میں بھی ہے اور نمازِ جنازہ میں دوسری تکبیر کے بعد ہی ہے۔

مقامات صلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے بوقت احرام حج و عمرہ تلبیہ میں اور صفا و مروہ پر ہے۔ جیسا کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ فرمایا جب مکہ میں داخل ہو تو خانہ کعبہ کا سات بار طواف کرو اور مقام ابراہیم کے پاس دو رکعتیں پڑھو اس کے بعد کوہِ صفا پر آؤ اس پر چڑھو اور خانہ کعبہ کی طرف منہ کرکے تکبیر کہو اور درمیان میں حق تعالیٰ کی حمد وثنا کرو۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام بھیجو اور اپنے لئے دعائے خیر کرو اسی طرح مروہ پر آکر یوں کہو جیسا کہ رسالہ مناسک میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور مقاماتِ صلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے خوف وکمزوری سے محفوظ رہنے کیلئے اجتماع وتفرق کا وقت ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ترمذی میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی شخص ایسے لوگوں کے اجتماع میں نہ بیٹھے جہاں خدا کا ذکر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام نہ بھیجا جاتا ہو۔ کیونکہ یہ لوگ قیامت کے دن مقام حسرت وافسوس میں ہوں گے اگر خدا چاہے انہیں بخش دے اور اگر چاہے تو ان پر عذاب فرمائے۔

ایک اور حدیث میں یہ ہے کہ نہیں ہے کوئی اجتماع کہ وہ بیٹھیں اور پھر اٹھ جائیں اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود نہ بھیجیں مگر یہ کہ ان پر حسرت ہوگی۔ جب وہ جنت میں اس درود کا اجر وثواب دیکھیں گے۔

اور مقاماتِ صلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے صبح وشام کا وقت بھی ہے۔ طبرانی میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ۔ "مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ حِیْنَ یُصْبِحُ عَشْرًا وَحِیْنَ یُمْسِیْ عَشْرًا اَدْرَکَتْہُ شَفَاعَتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ ۔" جس نے مجھ پر صبح کے وقت دس مرتبہ درود بھیجا اور شام کے وقت دس مرتبہ درود بھیجا وہ قیامت میں میری شفاعت پائے گا اور ایک مقام درود پڑھنے کا

وضو کرتے وقت بھی ہے ابن ماجہ میں حضرت سہل بن سعد سے مروی ہے کہ فرمایا "لَا وُضُوْءَ لِمَنْ لَّمْ يُصَلِّ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" اس کا وضو کامل نہیں ہے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود نہ بھیجا۔ ظاہر مطلب یہ ہے کہ وضو کے درمیان میں درود بھیجے اور بعض کتابوں میں کہا گیا ہے کہ "عَقِيْبَ الطَّهَارَةِ حَتَّى التَّيَمُّمِ وَتَكَلُّمِ بِالشَّهَادَتَيْنِ" یعنی طہارت کے بعد درود بھیجے یہاں تک کہ تیمم اور دونوں شہادتوں کے ادا کرتے وقت بھی۔ اور اعضاء وضو کے دھوتے وقت بھی آیا ہے اور کاتب حروف یعنی صاحب مدارج النبوۃ کا عمل ایسا ہی واقع ہوا ہے کہ تکلم بشہادتین کرتا ہے اور درود بھیجتا ہے اور اعضاء وضو میں ماثورہ دعاؤں کے پڑھنے کے بعد کرتا ہے۔ ایک مقام درود پڑھنے کا، کان کے بجتے وقت کا بھی ہے۔ حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ فرمایا تم میں سے کسی کا کان بجے تو مجھے یاد کرے اور مجھ پر درود بھیجے اور کہے۔ "ذَكَرَهُ اللّٰهُ بِخَيْرٍ مَّنْ ذَكَرَنِيْ بِخَيْرٍ" یعنی اللہ تعالیٰ اسے بھلائی کے ساتھ یاد کرتا ہے جو مجھے بھلائی کے ساتھ یاد کرے۔ اور اس بنا پر ہے کہ علماء فرماتے ہیں کہ کان کا بجنا اس پر دلیل ہے کہ اسے کسی نے بھلائی کے ساتھ یاد کیا ہے۔

اور ایک مقام درود بھیجنے کا، بھول جانے کے وقت بھی ہے۔ مطلب یہ کہ جب وہ کسی بات کو بھول جائے یا کسی چیز کو بھول جائے تو اگر وہ درود بھیجے تو اسے وہ بات یا وہ چیز یاد آ جائے گی۔ یہ عمل بات کے بھول جانے میں بکثرت آزمایا ہوا اور تجربہ شدہ ہے۔ اس حدیث کی سند میں "ابو موسیٰ مدینی کی ضعیف حدیث ہے۔ جو کہ حضرت انس سے مرفوعاً مروی ہے کہ۔ "اِذَا نَسِيْتُمْ شَيْئًا فَصَلُّوْا عَلَيَّ تَذْكُرُوْهُ اِنْشَاءَ اللّٰهُ" جب تم کچھ بھول جاؤ تو مجھ پر درود بھیجو انشاء اللہ یاد آ جائے گا۔ ایک مقام، درود بھیجنے کا، پیاس کا وقت بھی ہے۔ جیسا کہ ایک جماعت اس طرف گئی ہے اور ایک جماعت نے اس پر اختلاف کیا ہے۔ یہ منکر جماعت کہتی ہے کہ یہ مقام خاص ذکر خدا کا ہے جس طرح کہ دیگر مواقع میں مثلاً کھانے پینے اور جماع کرنے کے وقت میں۔ اور مشکوٰۃ میں ترمذی سے بروایت نافع مروی ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس چھینک لی اس کے بعد کہا۔ "وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ۔" اس پر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں بھی "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ۔" کہتا ہوں لیکن رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعلیم نہیں فرمائی ہے۔ یعنی ان لفظوں سے ہمیں نہیں سکھایا ہے مگر یہ کہ ہم کہیں "الحمد للہ علیٰ کل حال" مطلب یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کی فضیلت میں کسے کلام ہے۔ لیکن جس محل میں شارع علیہ السلام نے جیسا فرمایا ہے ویسا ہی کرنا چاہئے۔ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر چیز کیلئے ایک محل متعین فرما دیا ہے اس لئے اس جگہ ایسا کہنا اور کرنا چاہئے جس طرح حالت رکوع میں قرأت قرآن کی ممانعت فرمائی ہے۔ کذا فی المواہب۔

کتاب الشفا میں مذکور ہے کہ ابن حبیب رحمہ اللہ نے جانور کے ذبح کرنے میں درود بھیجنے کو مکروہ جانا ہے اور حضرت سمنون مالکی نے تعجب کے وقت میں درود بھیجنے کو مکروہ رکھا ہے۔

فائدہ۔ کہا گیا ہے کہ اجتناب اور طلب ثواب کے طریقہ کے سوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود نہ بھیجنا چاہئے۔ اصبغ نے ابن القاسم سے نقل کیا ہے کہ کہا گیا ہے دو جگہ ایسی ہیں جہاں ذکر خدائے عزوجل کے سوا کوئی اور ذکر نہ ہونا چاہئے۔ ایک بوقت ذبح دوسرے چھینک کے وقت۔ لہٰذا ان جگہوں میں ذکر اللہ کے بعد ذکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ کہنا چاہئے۔ اور اشہب نے کہا کہ یہ لائق سزاوار نہیں ہے کہ صلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں سنت وعادت بنا لیا جائے۔ اور میں کہتا ہوں کہ بعض لوگوں کی عادت ہے کہ اذان کے آخر میں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ دیتے ہیں بظاہر اسکا حکم بھی یہی ہے۔

اور مقاماتِ صلوٰۃ علی النبی میں سے مواجہ شریف میں یعنی قبر انور کے سامنے صلوٰۃ و سلام عرض کرنا بھی ہے۔ کیونکہ یہ صلوٰۃ و سلام

میں اولیٰ واقرب مقام ہے۔ ابو داؤد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب بھی کوئی مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو حق تعالیٰ میری روح کو مجھ پر لوٹاتا ہے اور میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔ اس حدیث میں حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت سے کلام ہے جیسا کہ "تاریخ مدینہ" وغیرہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ ابن عساکر سے مروی ہے کہ "مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ عِنْدَ قَبْرِیْ سَمِعْتُہٗ ۔" (جو مجھ پر میری قبر کے پاس درود و سلام عرض کرتا ہے میں اسے خود سنتا ہوں) اور سب سے زیادہ مشہور وظاہر تر مقام، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجنے کیلئے آپ کے ذکر شریف یا آپ کا اسم گرامی سننے یا اس کے لکھنے کا وقت ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے "رَغِمَ اَنْفُ رَجُلٍ ذُکِرْتُ عِنْدَہٗ فَلَمْ یُصَلِّ عَلَیَّ" یعنی اس شخص کی ناک گرد آلود ہو جس کے سامنے میرا ذکر ہو اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے۔ ایک حدیث میں ہے "اَلْبَخِیْلُ کُلَّ الْبَخِیْلِ ۔" وہ تمام بخیلوں میں بدترین بخیل ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مقاماتِ صلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے جو کچھ گزر چکا ہے ان سب پر امت کا عمل ثابت ہے۔ اور کسی ایک رسالہ میں بھی ان کا انکار موجود نہیں ہے۔ اور وہ جو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ساتھ لکھا جاتا ہے تو وہ صدر اول میں نہ تھا یہ بنی ہاشم کی حکومت کے دور میں ایجاد ہوا اس کے بعد یہ عمل تمام روئے زمین پر پھیل گیا۔ اور بعض تو ختم بھی درود پر کرتے ہیں گویا رسالہ کی ابتدا اور اس کا خاتمہ درود کے ساتھ کر کے اس دعا کے حکم میں کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ اول و آخر میں درود شریف ہو۔

ایک حدیث میں مروی ہے کہ جو کوئی اپنی کتاب میں مجھ پر درود لکھے گا تو جب تک اس کتاب میں میرا نام برقرار و باقی ہے ہمیشہ فرشتے اس کیلئے استغفار کرتے رہیں گے۔ یہ جتنے درود شریف پڑھنے کے مقامات لکھے گئے ہیں وہ سب کتاب الشفا اور مواہب لدنیہ میں مذکور ہیں۔ اور رسالہ "فاکہی" میں ہیں جو کہ زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں لکھی ہوئی ہے۔ اس میں اس سے زیادہ مقامات بیان کئے گئے ہیں ان کو بھی ہم مختصراً کچھ بیان کرتے ہیں تاکہ اوقات میں ایک قسم کا استیعاب و شمول حاصل ہو جائے۔ اور یہ فقیر ہر نماز کے بعد درود پڑھتا ہے کیونکہ مجھے مشائخ عالیہ قادریہ سے اجازت ہے کہ بعد ہر نماز فرض یا نفل میں تین مرتبہ درود پڑھوں۔ وباللہ التوفیق۔

فائدہ۔ رات کی نماز کیلئے سونے سے اٹھنے کے بعد وضو کر کے بعد نماز تہجد، جمعہ کے دن اور جمعہ کی رات خصوصاً بعد نماز جمعہ، جمعرات کے دن، سنیچر کے دن اور اتوار کے دن وغیرہ اوقات میں درود پڑھنا احادیث میں آیا ہے اور وقتِ سحر کعبہ معظمہ دیکھنے کے وقت، حجر اسود کو بوسہ دیتے وقت، طواف کعبہ والتزام کے وقت، حج کے وقوف کی جگہوں میں آثارِ نبویہ کے مشاہدہ کے وقت، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام اور ٹھہرنے کے مقامات میں مثلاً مسجد قبا، وادی بدر، جبلِ احد اور مساجدِ نبویہ وغیرہ میں حاضری کے وقت، خرید و فروخت کے وقت، وصیت لکھتے وقت، ارادۂ سفر، سواری پر چڑھنے، منزل پر ٹھہرنے کے وقت، بازار جاتے وقت، بازار میں پہنچنے کے بعد، مشغولیت غفلت طاری ہونے کے وقت، دعوت میں حاضر ہونے کے وقت، دعوت سے فارغ ہو کر چلنے کے وقت، گھر سے نکلتے وقت، گھر میں داخل ہوتے وقت، کسی حاجت کے پیش آنے کے وقت، خوف و احتیاج کے وقت، جانور بھاگ جانے اور غلام کے بھاگ جانے بلکہ ہر چیز کے گم ہو جانے کے وقت، غم و شدت کے وقت، طاعون و خوف اور غرق سے بچنے کے وقت، پاؤں کے سن ہو جانے کے وقت اور مولی کھانے کے وقت تاکہ اس کی ڈکار میں بو نہ آئے۔ اس باب میں ایک حدیث بھی منقول ہے۔ اور برتن سے پانی پیتے وقت، گدھے کے آواز کے وقت مگر اس وقت میں درود کے ساتھ شیطان لعین سے استعاذہ بھی مروی ہے تاکہ دفع شر اور حصول خیر دونوں واقع ہوں اور کسی گناہ میں مبتلا ہونے کے بعد تاکہ اس کا کفارہ ہو جائے اور مسلمان بھائی سے ملاقات اور اس سے مصافحہ کے وقت اور اس اجتماع و جلسہ میں جو خدا اور شعائر اسلام کیلئے ہو، ختم قرآن کے وقت، حفظ قرآن کی دعا کے وقت، غیر

منہی عنہ کلام کے شروع کرتے وقت، علم دین کی تعلیم کی ابتداء کے وقت، خصوصاً درس حدیث کے وقت، نشر علم، وعظ، قرات حدیث کے ابتداء اور آخر میں اور کسی چیز کے اچھا لگنے کے وقت درود بھیجنا چاہئے۔ اور بعض علماء مقام حیرت و تعجب میں درود بھیجنے کو مکروہ جانتے ہیں جس طرح کسی امر محترم کے مشاہدہ کے وقت تسبیح و تہلیل مکروہ ہے۔

فائدہ:۔ مناسب ہے بلکہ افضل ہے کہ سلام کے بھیجنے یا لکھتے وقت صلوٰۃ بھی ساتھ ملالی جائے۔ اور امام نووی صلوٰۃ کو بغیر سلام کے ملائے مکروہ بتاتے ہیں اس لئے کہ حق تعالیٰ نے دونوں کا حکم فرمایا ہے۔ فتح الباری میں کہا گیا ہے کہ تنہا صلوٰۃ بھیجنا اور سلام بالکل نہ بھیجنا مکروہ ہے لیکن اگر ایک مرتبہ سلام بھیجے اور دوسری مرتبہ صلوٰۃ بھیجے بغیر کسی وقفہ یا خلل کے تو مضائقہ نہیں ہے۔ کذافی المواہب۔

امام محمد جوینی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ اس جگہ سلام بمعنی صلوٰۃ ہے۔ لہٰذا غائب میں استعمال نہیں کیا گیا ہے (بلکہ بصیغہ حاضر "سلموا" فرمایا گیا) اور تنہا غائب کے صیغہ کے ساتھ غیر انبیاء علیہم السلام کیلئے نہ استعمال کیا جائے۔ مطلب یہ کہ کسی غیر نبی کو علیہ السلام نہ کہا جائے۔ لیکن حاضر و مخاطب کیلئے استعمال کیا جائے اور اس طرح کہا جائے سلام علیک یا السلام علیک، اور رموز و کنایہ یا مخفف جیسا کہ عام لوگوں میں رائج ہے اس پر راضی نہ ہو۔ کیونکہ یہ بہت ہی شنیع اور قبیح فعل ہے (جیسا کہ عام طور پر صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے صلعم یا صلی اور علیہ السلام کے لئے "یا رضی اللہ عنہ کیلئے" وغیرہ مہمل الفاظ بولتے اور لکھتے ہیں۔ بلاشبہ یہ درود شریف کی اہانت اور استخفاف ہے اس سے بچنا فرض ہے۔ مترجم غفرلہ)

تنبیہہ:۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام اوقات میں درود و سلام بھیجنا مستحب و مستحسن ہے خصوصاً جمعہ کے دن اور جمعہ کی رات میں۔ کیونکہ یہ ہفتہ میں سب سے افضل دن اور رات ہے۔ یوم جمعہ میں اس کی کثرت کا حکم حدیث پاک میں آیا ہے کہ خاص طور پر اس دن بارگاہِ نبوت ورسالت میں صلوٰۃ و سلام پیش کیا جاتا اور قبول فرمایا جاتا ہے قبولیت کی بشارت دی گئی ہے۔ حدیث صحیح میں ہے کہ: أَكْثِرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ عَلَيَّ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَلَيْلَةَ الْجُمُعَةِ جمعہ کے دن اور جمعہ کی رات میں مجھ پر بکثرت درود بھیجو۔ اور بعض طرق سے اس طرح ہے کہ "أَكْثِرُوا الصَّلٰوةَ عَلَيَّ فِي اللَّيْلَةِ الزَّهْرَاءِ وَيَوْمِ الْأَزْهَرِ لَيْلَةِ الْجُمُعَةِ وَيَوْمِ الْجُمُعَةِ ۔" مجھ پر روشن ترین رات میں بکثرت درود بھیجو۔ اور روشن ترین رات یعنی یوم الازہر، وہ جمعہ کا دن اور جمعہ کی رات ہے۔ اس ضمن میں حدیثیں بکثرت مروی ہیں اور اس دن ورات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں صلوٰۃ و سلام پیش کیا جاتا ہے۔ اگرچہ آپ کی امت کا صلوٰۃ و سلام ہمیشہ ہی پیش کیا جاتا ہے۔ اور حق تعالیٰ نے ملائکہ سیاحین یعنی گشت کرنے والے فرشتوں کو پیدا فرما کر مقرر کیا ہے کہ امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا درود و سلام بارگاہِ نبوت میں پہنچائیں لیکن اس دن ورات میں یقینی طور پر درود و سلام مقام وصول اور محل قبول کو فائز ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: "مِنْ أَفْضَلِ أَيَّامِكُمْ يَوْمُ الْجُمُعَةِ فِيهِ خُلِقَ آدَمُ وَفِيهِ قُبِضَ وَفِيهِ النَّفْخَةُ وَفِيهِ الصَّعْقَةُ فَأَكْثِرُوا عَلَيَّ مِنَ الصَّلٰوةِ فِيهِ۔" تمہارے دنوں میں سب سے بہتر دن روز جمعہ ہے۔ اسی دن حضرت آدم علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اور اسی دن ان کی روح قبض کی گئی اور اسی دن صور پھونکا جائے گا۔ اور اسی دن قیامت ہونی ہے لہٰذا مجھ پر اس دن درود کی کثرت کرو۔ کیونکہ تمہارا درود میرے حضور پیش کیا جاتا ہے۔ روز جمعہ درود کی کثرت کرنے کی تخصیص میں حکمت یہی فضیلت جمعہ ہے کیونکہ یہ موجب وصول و قبول اور حصولِ رضائے سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور یہی دنیا و آخرت میں سعادت کا موجب ہے جیسا کہ ظاہر حدیث کا بیان ہے۔

صاحبِ مواہب لدنیہ ابن قیم سے نقل کرتے ہیں ان میں ایک مناسبت کی وجہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سید الانام ہیں اور روز جمعہ سید الایام ہے لہٰذا یہ دن درود بھیجنے میں خاص مناسبت اور اضافت رکھتا ہے۔ جو اس کے علاوہ کسی اور دن میں نہیں ہے۔

اور ایک حکمت یہ بھی ہے کہ امت مرحومہ کو دنیاو آخرت میں جو کچھ ملا ہے اور جو نعمت حاصل ہوئی ہے وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ اقدس سے ہی ملی ہے اور سب سے بڑی وہ کرامت جو امت کو حاصل ہوتی ہے وہ جمعہ کے دن ہی ملتی ہے۔ اور آخرت میں حور و قصور، جنت و کرامت اور حق تعالیٰ و تقدس کا جو دیدار حاصل ہو گا وہ بھی اسی روزِ جمعہ میں حاصل ہو گا۔ اور آخرت میں اس دن کا نام "یوم المزید" ہے کیونکہ حق تعالیٰ اس دن اہلِ جنت پر مزید نعمتیں اور اپنے مقدس دیدار سے مشرف و سرفراز فرمائے گا۔ جیسا کہ باب الجمعہ میں انشاء اللہ ذکر ہو گا۔ اور یہ کہ جمعہ کا دن دنیا میں امت کیلئے عید کا دن ہے اور آخرت میں روز مزید ہے۔ اور یہ وہ دن ہے جس میں عالم کی مخلوق جمع ہوئی ہے اور حق تعالیٰ نے اس دن تمام مخلوق کی ضرورتوں، حاجتوں اور مطلبوں کو شفقت و مہربانی سے پورا فرمایا ہے۔ اور اس دن کسی مانگنے والے کے سوال کو رد نہیں فرماتا۔ اور اس کی ہر دعا قبول فرماتا ہے اور یہ تمام باتیں امت کو حاصل نہیں ہوتیں اور نہ وہ اس کی معرفت کر سکیں گے مگر سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت و سبب اور آپ کے دستِ اقدس کے ذریعہ سے۔ لہٰذا شکر اور نعمت کی حق شناسی کم از کم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کی ادائیگی میں سے ادنیٰ ذریعہ یہی ہے کہ اس دن آپ پر زیادہ سے زیادہ درود و سلام بھیجا جائے (واللہ اعلم)

فضائل و نتائج درود و سلام۔ وصل:۔ حضور اکرم سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجنے کے فضائل و برکات اور اس کے نتائج و ثمرات بیان سے باہر ہیں گویا یہ دنیا و آخرت کی تمام برکتوں اور بھلائیوں کو شامل ہے اور یہ امتثال امر الٰہی اور فعل باری تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کے عمل کی موافقت پر متضمن ہے جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا: إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا بیشک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں اے ایمان والو! تم بھی ان پر خوب صلوٰۃ و سلام بھیجو اور حدیث شریف میں ہے "مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ وَاحِدَةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ عَشْرًا" جو مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے حق تعالیٰ اس پر دس مرتبہ رحمتیں نازل فرماتا ہے۔ وہ کتنا خوش نصیب اور عظیم المرتبت ہے جس پر حق تعالیٰ، رحمت اور برکت نازل فرمائے۔

اس جگہ ایک اعتراض یہ لاتے ہیں کہ یہ کیسے جائز ہو گا کہ حضور پر تو بندہ ایک مرتبہ صلوٰۃ بھیجے اور اس پر دس مرتبہ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک کا عدد جو حدیث میں آیا ہے وہ بندے کا فعل ہے اس حکم کے تحت کہ "مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا" (جو ایک نیکی لائے اس کا بدلہ دس گنا ہے) حق تعالیٰ ایک کا بدلہ دس گنا عطا فرماتا ہے۔ اس سے کہاں لازم آتا ہے کہ حق تعالیٰ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ بھیجتا ہے وہ بھی ایک ہی ہو۔ وہ مالک ہے جتنی مقدار میں چاہے حضور پر صلوٰۃ بھیجے۔ چونکہ بندہ صلوٰۃ و سلام اور دعا کرنے پر مامور ہے اور وہ کہتا ہے کہ اے خدا! میں تیرے اس حکم کو بجالانے میں عاجز و مجبور ہوں تو ہی اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ نازل فرما جیسا کہ تیرے جلال اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال کے لائق ہے۔ لہٰذا حق تعالیٰ اپنی کمالِ رحمت و مہربانی سے جو لائق ہے بھیجتا ہے۔ اور اس کے نزدیک اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی جیسی عزت اور درجہ ہے اسی کی مناسبت سے بھیجتا ہے یہ بات بالکل ظاہر ہے۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ایک ہی درود اس دس کے مقابلہ میں جو بندہ پر نازل فرمائے یہ سو ہزار درجہ کامل تر ہو اس لئے کہ مقدار کی کمی، کیفیت کی زیادتی کے منافی نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک گوہر سو ہزار پیسوں کے مقابلے میں ہوتا ہے۔

حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن اس حال میں باہر تشریف لائے کہ آپ کی آنکھوں سے خوشی و مسرت نمایاں تھی اور آپ کا چہرہ منور پر مسرت تھا۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آج آپ کے رخِ انور میں خوشی و مسرت کی لہر تاباں ہے کیا سبب ہے؟ فرمایا جبریل علیہ السلام آئے اور انہوں نے کہا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ کو یہ پر مسرت نہیں بنا تا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے جو بندہ بھی آپ کی امت کا آپ پر ایک مرتبہ بھی درود بھیجتا ہے میں

اس پر دس مرتبہ صلوٰۃ و سلام بھیجتا ہوں اور ایک روایت میں مطلق آیا ہے کہ جو بندہ صلوٰۃ و سلام آپ پر بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر صلوٰۃ و سلام بھیجتا ہے۔ گویا مقصود اس جگہ بیان مطلق ہے۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو بندہ مجھ پر صلوٰۃ و سلام بھیجتا ہے حق تعالیٰ اس پر اس وقت تک صلوٰۃ و سلام بھیجتا ہے جب تک کہ وہ مجھ پر بھیجتا رہے لہٰذا بندے کو اختیار ہے کہ کم بھیجے یا زیادہ بھیجے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حق تعالیٰ اور اس کے فرشتے اس پر ستر گنا صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔ لہٰذا بندہ کم کرے یا زیادہ۔

بندۂ مسکین (صاحب مدارج النبوۃ) خصہ اللہ بمزید الیقین ورحمہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ ستر میں بھی یہ منحصر نہیں ہوگا اس لئے کہ مراتب میں اضافہ بہت ہے۔ سات سو تک بلکہ اس سے زیادہ آیا ہے اور یہ اضافہ تقویٰ محبت اور اخلاص کی مقدار پر ہے اور کمی و بیشی کے درمیان اختیار دینے میں ایک قسم کی تہدید اور تنبیہہ ہے اس لئے کہ مخبر بہ میں وجود خیر کو بتا دینے کے بعد اس کے حاصل کرنے میں کمی و کوتاہی پر ڈرانے کو متضمن ہوتا ہے۔

ترمذی میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں چاہتا ہوں کہ آپ پر درود بھیجوں تو اپنے لئے دعا کرنے کے مقابلے میں آپ کیلئے کتنی مقدار میں بھیجوں فرمایا جتنا چاہو۔ میں نے عرض کیا چوتھائی؟ فرمایا جتنا چاہو اگر زیادہ کرو تو تمہارے لئے اور بہتر ہے عرض کیا نصف؟ فرمایا جتنا چاہو اگر زیادہ کرو تو تمہارے لئے اور زیادہ بہتر ہے عرض کیا دو تہائی؟ فرمایا جتنا چاہو اور اگر زیادہ کرو تو تمہارے لئے اور بہتر ہے۔ عرض کیا پھر تو میں اپنی تمام دعا کے بدلے آپ پر درود ہی بھیجوں گا۔ فرمایا۔ "اِذًا تُکْفٰی ھَمُّکَ وَیُکَفَّرُ لَکَ ذَنْبُکَ" تب تو تم نے اپنی ہمت پوری کر لی اور گناہوں کو معاف کرا لیا۔

ایک اور حدیث میں مروی ہے کہ جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرمائے گا اور اس کے دس گناہ مٹا کر اس کے دس درجے بلند فرمائے گا۔ یہ دس گناہوں کا مٹانا اور دس درجہ بلند کرنا عمل درود کے اجر و ثواب کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ دیگر اعمال میں مزیت و اضافہ نہیں ہے کیونکہ ایک کا بدلہ دس گنا تو ملے گا لیکن ان میں گناہوں کا مٹانا اور درجات کا بڑھانا نہیں ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کہے کہ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاَنْزِلْہُ الْمَنْزِلَ الْمُقَرَّبَ وَفِیْ رِوَایَۃٍ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَکَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَجَبَتْ لَہٗ شَفَاعَتِیْ اے خدا ہمارے محمد مصطفیٰ پر صلوٰۃ نازل فرما اور انہیں مقام قرب پر فائز فرما جو تیرے نزدیک قیامت میں ہے۔ تو اس کیلئے میری شفاعت واجب ہو گئی۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت کے دن مجھ سے زیادہ قریب وہ لوگ ہوں گے جو مجھ پر درود بھیجتے ہیں۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ روزِ قیامت اس کی سختی و دہشت اور شر و فتن سے وہی لوگ نجات پانے والے تم میں سے زیادہ ہوں گے جو مجھ پر درود بھیجتے ہیں۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا گناہوں کے دھونے اور اس سے پاک کرنے میں آگ کو سرد پانی سے بجھانے سے زیادہ موثر و کار آمد ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام پیش کرنا غلاموں کے آزاد کرنے سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ اس جگہ ایک نکتہ یہ ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا، درود بھیجنے والے پر رحمت کے نزول کو واجب کرنے کا حکم رکھتا ہے تو ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے میں جتنی بھی کیت و مقدار اور کیفیت میں مبالغہ کیا جائے گا اتنا ہی اس پر رب العزت کی بارگاہ سے فیضان و نزول رحمت زیادہ ہوگا۔ لیکن اس نوعیت کے مطابق ہوگا جتنا اس کے حال کے لائق و مناسب ہے۔ کما لا یخفیٰ ۔ غرضکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجنا منبع انوار و برکات اور مفتاح تمام ابوابِ خیرات و سعادات ہے اور اہلِ سلوک اس باب میں

بہت زیادہ شغف رکھنے کی بنا پر فتحِ عظیم کے مستوجب اور مواہب ربانیہ کے مستحق ہوئے ہیں۔ بعض مشائخ کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ جب ایسا شیخ کامل اور مرشدِ اکمل موجود نہ ہو جو اس کی تربیت کر سکے تو اسے چاہئے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کو لازم کر لے یہ ایسا طریقہ ہے جس سے طالب واصل بحق ہو جاتا ہے اور یہی درود وسلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف توجہ کرنے سے احسن طریقہ سے آدابِ نبوی اور اخلاقِ جمیلہ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تربیت کر دے گا۔ اور کمالات کے بلند تر مقامات اور قربِ الٰہی کے منازل پر اسے فائز کریں گے۔ اور سید الکائنات افضل الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب سے سرفراز بنائیں گے۔

بعض مشائخ وصیت کرتے ہیں کہ سورۂ اخلاص قل ہو اللہ احد کو پڑھے اور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر بکثرت درود بھیجے۔ اور فرماتے ہیں کہ "قل ہو اللہ احد" کی قرأت خدائے واحد کی معرفت کراتی ہے۔ اور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کی کثرت، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ومعیت سے سرفراز کرتی ہے اور جو کوئی سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر بکثرت درود بھیجے گا یقیناً اسے خواب وبیداری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوگی۔ جیسا کہ شیخ امام، علی متقی نے "الحکم الکبیر" میں شیخ احمد بن موسیٰ المشروع سے نقل فرمایا ہے۔

بعض متاخرین مشائخ شاذلیہ قدست اسرار ہم فرماتے ہیں کہ طریقِ سلوک، تحصیلِ معرفت اور قربِ الٰہی کے حصول کیلئے جس وقت کہ اولیائے کرام کا وجود مفقود ہو اور جس زمانہ میں وہ موجود نہ ہوں اس وقت ظاہر شریعت پر بالالتزام عمل کرنا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک اور آپ پر کثرت درود کو ہمیشہ لازم کرلینا مرشد متصرف کا کام دے گا کثرت درود سے باطن میں ایک نور پیدا ہو جاتا ہے جس سے منازلِ سلوک طے پا جاتے ہیں۔ اور براہِ راست حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے فیضان واعانت اور امداد حاصل ہو جاتی ہے۔

اور بعض مشائخ ذکر پر درود کو توسل واستمداد کی حیثیت سے ترجیح اور فضیلت دیتے ہیں۔ اگرچہ ذکر بذات خود اشرف وافضل ہے۔ اور طریقہ شاذلیہ کا خلاصہ (یہ حقیقت میں طریقۂ قادریہ کی شاخ ہے) بارگاہِ نبوت سے استفاضہ ہے اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سپردگی کو لازم کرنے اور آپ سے دائمی حضوری کے ذریعہ اور وسیلے سے ہے۔

شیخ اجل واکرم قطب الوقت عبدالوہاب متقی رحمۃ اللہ علیہ ونفعنا ببرکاتہ، وبرکاتِ علومہ فرماتے ہیں کہ درود شریف پڑھتے وقت یہ جاننا چاہئے کہ دریائے فضل ورحمت کے کون کون سے دریاؤں میں شناوری کر رہا ہے اور کہاں کہاں غوطہ زن ہے۔ اللہم جب کہتے ہیں تو دریائے رحمتِ الٰہی میں داخل ہو جاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ بندہ جب اللہم کہتا ہے تو گویا وہ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء الٰہی کو یاد کر لیتا ہے اور جب "صَلِّ علیٰ سیدنا محمد" کہتا ہے تو وہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دریائے فضل وکرم میں غوطہ زن ہو جاتا ہے۔ اور جب اس کے ساتھ "وعلی آلہ واصحابہ" کہتا ہے تو ان کے فضائل وکمالات میں غرق ہو جاتا ہے اور جب بندہ ان لامتناہی دریاؤں میں شناوری کرتا اور غوطہ زن ہوتا ہے تو پھر محروم ومایوس نکلنے کی کیا صورت ہے۔

جس وقت اس فقیر کو (یعنی شیخ محقق شاہ عبدالحق دہلوی رحمہ اللہ کو) حضرت شیخ اجل عبدالوہاب متقی رحمہ اللہ نے مدینہ منورہ کے سفر کیلئے رخصت فرمایا تو ارشاد فرمایا کہ تم یاد رکھو کہ اس سفر میں بعد ادائے فرائض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور پر صلوٰۃ وسلام بھیجنے سے بلند تر کوئی عبادت نہیں ہے جب ان سے اس کی تعداد دریافت کی گئی تو فرمایا یہاں کوئی تعداد معین نہیں ہے۔ جتنا ہو سکے پڑھو۔ اسی سے رطب اللسان رہو اور اسی کے رنگ میں رنگ جاؤ۔ ایسے وقت کے علاوہ وہ طالب کو تلقین فرمایا کرتے تھے کہ روزانہ حضور

صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کو ہزار مرتبہ سے کم نہ مقرر کرنا چاہئے اگر اتنا نہ ہو سکے تو پانچ سو مرتبہ لازمی ہو گویا کہ ہر نماز کے بعد ایک سو مرتبہ اور اپنے لئے تین سو سے کم ہرگز تجویز نہ کرتے تھے اور سونے سے پہلے بھی یقیناً وقت کو خالی نہ رکھنا چاہئے۔ اور صلوٰۃ وسلام کے فوائد عظیمہ اور مطالب جلیلہ میں سے ایک یہ ہے کہ امت کی رسائی بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں ہو جاتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو حق تعالیٰ میری روح کو میری طرف لوٹا دیتا ہے اور میں اسے سلام کا جواب دیتا ہوں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو میری قبر انور کے سامنے مجھ پر درود بھیجتا ہے میں اسے خود سنتا ہوں اور جو دور سے مجھ پر درود بھیجتا ہے تو وہ میرے حضور پہنچایا جاتا ہے۔ یعنی فرشتے لے کر حاضر ہوتے ہیں اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بلاشک وشبہہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر پھرنے والے فرشتوں کو مقرر فرمایا ہے جو میری امت کا سلام میرے حضور لاکر پیش کرتے ہیں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اس کا نام اور اس کے باپ کا نام بھی لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یا رسول اللہ فلاں بن فلاں مثلاً کمترین بندگان عبدالحق بن سیف الدین دہلوی حضور کی بارگاہ میں سلام عرض کرتا ہے اس کے بعد فرشتے سلام عرض کرتے ہیں ؎

لَكَ الْبِشَارَةُ فَاخْلَعْ مَا عَلَيْكَ ذُكِرْتَ ثَمَّهْ عَلٰى مَا فِيْكَ مِنْ عِوَجٍ

بیت جاں میدہم در آرزو اے قاصد آخر باز گو در مجلس آن نازنیں حرفے کہ ازما میرود

اور اعظم فوائد درود وسلام میں سے ایک یہ ہے کہ دل میں محاسن نبویہ مستحضر ہو جاتے ہیں اور آنکھوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خیالی صورت متمثل ہو جاتی ہے کیونکہ یہ کثرت درود میں بصفت توجہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم لازم ہے۔ ؎

لَوْ شُقَّ عَنْ قَلْبِيْ تَرٰى وَسْطَهٗ ذِكْرُكَ فِيْ سَطْرٍ وَالتَّوْحِيْدُ فِيْ سَطْرٍ

مطلب یہ کہ اگر آپ میرے دل کو چیر کر دیکھیں تو اس میں ایک سطر آپ کے ذکر کی ہوگی اور ایک سطر توحید الٰہی کی ہوگی۔

اور اعظم فوائد درود وسلام میں یہ ہے کہ اس کا ثواب دس غلاموں کے آزاد کرانے اور دس جہادوں میں شریک ہونے کے برابر ہے۔ اور یہ کہ دعا قبول ہوتی ہے اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت آپ کی شہادت اور حصولِ قرب میسر آتا ہے اور بابِ جنت کو کھلوانے کیلئے اپنے دستِ مبارک کو تکلیف دینا اور سب سے پہلے قیامت میں آپ کے ساتھ متصل دوسروں سے پہلے داخل ہونا اور اس دن تمام شدتوں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا متکفل ہونا اور تمام مہمات وقضایا میں کفایت فرمانا اور تمام حوائج ومغفرتِ گناہاں میں کوشش فرمانا اور تمام کوتاہیوں اور غلطیوں کو محو فرمانا یہ سب درود شریف کی ہی برکتیں ہیں۔ اور بعض کا قول ہے کہ اس کے فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ فرائض میں جو کوتاہیاں ہوئی ہیں ان کا کفارہ بن جاتا ہے اور صدقہ کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس سے افضل واعلیٰ ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم

اور تکلیفوں کا دور ہونا، بیماریوں سے شفا پانا، خوف وخطر اور بھوک کا جاتا رہنا، تہمتوں سے براٗت وپاک کرنا، دشمنوں پر فتح پانا، رضائے الٰہی اور اس کی محبت کا حاصل ہونا، اس کی صلوٰۃ کا خدائے عزوجل کی صلوٰۃ اور اس کے فرشتوں سے مل جانا، مال میں زیادتی وپاکیزگی کا پیدا ہونا، طہارتِ ذات، صفائے قلب اور فارغ البالی کا ہونا اور تمام امور میں برکتوں کا حاصل ہونا حتیٰ کہ اسباب واموال اور اولاد در اولاد چار پشتوں تک میں برکتیں فائز ہوتی ہیں یہ سب درود کے فوائد ہیں صلی اللہ علیہ وسلم۔

فائدہ:۔ اور قیامت کی ہولناکیوں سے نجات پانا، سکرات موت میں آسانی پیدا ہونا، دنیا کی ہلاکتوں سے چھٹکارا پانا، زمانہ کی تنگیوں سے خلاصی پانا، بھولی ہوئی چیزوں کا یاد آجانا، فقر واحتیاج کا جاتا رہنا، بخل وجفا کی برائیوں سے محفوظ رہنا، ناک گرد آلود ہونے

کی بد دعا سے بچنا۔ مجلس کا پاکیزہ و معطر ہو جانا، رحمتوں کا چھا جانا، صراط سے گزرتے وقت ایک نور کا تاباں ہونا اور اس حال میں ثابت قدم اور برقرار رہنا اور پلک جھپکتے میں صراط سے گذر جانا، برخلافِ حال تارک درود کے، مسلمانوں کی محبت دل میں جاگزیں ہونا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت دل میں خوب مستحکم ہونا، روز قیامت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سے مصافحہ کرنا، خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال کا دیدار کرنا، ملائکہ کی محبت اور ان کا مرحبا کہنا۔ اس کے درود کی کتابت سونے کے قلم سے چاندی کے کاغذ پر ہونا، فرشتوں کا اس کے خیر کی زیادتی کی دعا کرنا اور استغفار کرنا یہ سب اعظم فوائد درود و سلام کے ہیں۔ اور سب سے اہم اور بڑی بات تو یہ ہے کہ جواب سلام کے حصول کا شرف حاصل ہوتا ہے کیونکہ یہ سنت مستمرہ بلکہ لازم کردہ فرض ہے۔ اس سے بڑی سعادت اور کونسی ہوگی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سلامتی و خیر کی دعا اس کے شامل حال ہوگی۔ اگر تمام عمر میں یہ سعادت ایک مرتبہ بھی ہاتھ آجائے تو ہزار ہا کرامتوں کا موجب اور بیشمار برکتوں کا باعث ہے۔ بیت

بہر سلام مکن رنجہ درجواب آں لب   کہ صد سلام مرابس یکے جواب ازتو

اور بکثرت ایسے حضرات ہیں جو اپنا سلام پیش کرنے سے پہلے انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام پایا ہے کیونکہ آپ کی عادتِ کریمہ تھی کہ: "كَانَ يُبَادِرُ بِالسَّلَامِ" یعنی آپ سلام کرنے میں پہل فرماتے تھے۔ اور ایسے بھی حضرات ہیں جو اپنے سلام کے بعد جوابِ سلام سے مشرف ہوئے اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے از خود بھی سلام سے نوازا۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

فائدہ: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کے فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ دونوں فرشتے یعنی کراماً کاتبین تین دن تک اس کے گناہ لکھنے سے رکے رہتے ہیں (تاکہ وہ اس سے توبہ کرسکے) اور لوگوں کو اس کی عیب جوئی سے باز رکھتے ہیں اور روز قیامت درود پڑھنے والا عرش کے سایہ کے نیچے ہوگا۔ اور درود اس کے نیک اعمال کے پلڑے کو وزنی کردے گا اور پیاس سے محفوظ رہے گا۔ اور جنت میں کثیر بیبیاں ملیں گی۔ اور دنیا و آخرت کے معاملات میں رشد و ہدایت میسر آئے گی۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا ذکرِ الٰہی کو بھی شامل ہے اور اس کی نعمتوں کے شکر اور معرفت حق کو بھی متضمن ہے۔ اور درود کی بدولت بیکراں اور وافر نعمتیں ملتی ہیں۔ ان سب کو فاکہی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ "آدابِ زیارت" میں لکھا ہے اور "جذب القلوب" (راحت القلوب) میں وہیں سے نقل کیا گیا ہے۔ اور اس کتاب میں بھی وہیں سے منقول ہے۔ ان کے ماسوا دیگر فوائد و حکایات بھی مذکور ہیں جن کی اس جگہ گنجائش نہیں ہے۔ ان میں سے ایک حکایت یہ ہے جسے شیخ احمد بن ابو بکر محمد رواد صوفی محدث نے اپنی کتاب میں شیخ مجد الدین فیروز آبادی سے ان اسناد کے ساتھ جو شیخ مذکور کو ملی ہیں روایت کیا ہے۔ اس جگہ بیان کیا جاتا ہے۔ اس امید پر کہ طالب حق اسے اپنا ورد بنائے۔ وہ حکایت یہ ہے کہ ایک دن حضرت شبلی قدس سرہ حضرت ابو بکر مجاہد کے پاس گئے یہ اپنے زمانہ کے امام اور علمائے وقت میں سے تھے۔ حضرت ابو بکر نے کھڑے ہو کر ان کا اعزاز و اکرام کیا اور معانقہ کرکے ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا۔ حاضرین کہنے لگے یاسیدی! شبلی کا آپ ایسا احترام و اعزاز فرما رہے ہیں حالانکہ آپ اور بغداد کے تمام لوگ انہیں مجنون کہتے ہیں۔ فرمایا میں نے یہ اعزاز اپنی طرف سے نہیں کیا ہے لیکن میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں جیسا فرماتے دیکھا ہے ویسا ہی کیا ہے۔ کیونکہ حضرت شبلی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں جب آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے معانقہ فرمایا اور دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اس پر میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ شبلی سے یہ سلوک فرما رہے ہیں؟ فرمایا ہاں یہ شبلی بعد نماز اس آیت کو پڑھتے ہیں۔ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ الاٰیۃ اس کے بعد وہ مجھ پر درود بھیجتے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ کو درود شریف پڑھنے سے پہلے پڑھنا حرمین شریفین کے ان حضرات کے درمیان رائج ہے جو میلاد شریف کی محفلیں منعقد کرتے اور ذکرِ میلاد بیان کرتے ہیں۔ اس آیۂ کریمہ کے بعد وہ حضرات آیۂ کریمہ: اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ الٰخ پڑھتے ہیں پھر اس حکمِ الٰہی کی بجا آوری میں "اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَسَلِّمْ۔" پڑھتے ہیں۔

ترکِ عادتِ درود پر وعید و مذمت۔ وصل:۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کے فضائل و فوائد اور اس کے عامل کی مدح و تعریف احادیث میں آئی ہیں۔ لامحالہ اسی قدر اس کے تارک کی قباحت و مذمت اور اس پر عقاب و مضرت بھی ثابت ہوگی اس لئے کہ ہر وہ عمل جس کا ثواب اور فضیلت بلند تر اور کامل تر ہوتا ہی اس کا ترک قبیح تر و مذموم تر ہوگا۔ اور اس پر عقاب شدید تر اور قوی تر ہوگا۔

امیر المومنین سیدنا علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اِنَّ الْبَخِیْلَ کُلَّ الْبَخِیْلِ۔" بے شک یہ تمام بخیلوں میں بدتر بخیل ہے اور ایک روایت میں ہے کہ: "اَلْبَخِیْلُ مَنْ ذُکِرْتُ عِنْدَہٗ فَلَمْ یُصَلِّ عَلَیَّ۔" وہ شخص بہت بخیل ہے جس کے آگے میرا ذکر ہو اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے۔ بخیل عرفِ عام میں اسے کہتے ہیں کہ جو مال کو خرچ کرنے اور اس کے استعمال کرنے میں خست برتے۔ لیکن سب سے سخت تر اور بدترین وہ بخیل ہے جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے۔ اور وہ میری محبت میں اور نعمتوں کے شکر میں اپنا اتنا سا وقت خرچ نہ کرے۔ اور زبان کو استعمال میں نہ لائے۔ کیونکہ اس کا اجر و ثواب، مال کے خرچ کرنے اور غلام کے آزاد کرنے سے زیادہ عظیم اور وافر تر ہے اور اس سے زیادہ آسان ہے۔

حضرت امام جعفر صادق اپنے والد بزرگوار امام محمد باقر: "سَلَامُ اللّٰہِ عَلَیْہِمَا وَصَلِّ عَلٰی اٰبَائِہِمَا الْعِظَامِ وَاَوْلَادِہِمَا الْکِرَامِ۔" سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کے آگے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے بلاشبہ یقیناً اس نے جنت کی راہ بھلا دی۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ابو القاسم سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے مجھ پر درود بھیجنے کو فراموش کر دیا اس نے جنت کی راہ فراموش کر دی۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس وقت میرا ذکر کسی کے سامنے کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے تو بلاشبہ اس نے مجھ پر ظلم و جفا کیا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک مجلس بیٹھی پھر وہ اٹھ گئی اور اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود نہ بھیجا گویا وہ مجلس ایسی ہے جیسے کسی مردار سے زیادہ گندی مجلس میں بیٹھے پھر وہ متفرق ہوگئے۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ منہا)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک گروہ نے مجلس جمائی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اس میں درود نہ بھیجا گیا مگر یہ کہ روزِ قیامت اہلِ مجلس پر حسرت و محرومی ہوگی۔ اگرچہ وہ جنت میں داخل ہوں۔ یعنی اگرچہ بحکم ایمان اور اعمالِ صالحہ جنت میں داخلہ مل جائے اور وہ ایمان و عمل کا ثواب بھی پالیں لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کے ثوابِ عظیم کے فوت ہونے کی بنا پر حسرت کریں گے کہ کیوں نہ انہوں نے یہ ثوابِ عظیم حاصل کیا ایک اور حدیث میں اللہ تعالیٰ کا ذکر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود دونوں آئے ہیں۔

ایک حدیث مبارک میں ہے کہ وہ شخص رسوا ہے جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔ اور وہ شخص رسوا ہے جسے ماہ مبارک رمضان کا ملا اور وہ اسے بخشوائے بغیر گذر گیا۔ مطلب یہ کہ رمضان کو پائے تو ایسے کام کرے جس سے اس کی

مغفرت ہو کیونکہ ان ایام کا وجود غنیمت ہے اور یہ مغفرت کا موسم ہے اور فرمایا اسے رسوائی ہو جس نے ماں باپ دونوں کو پایا ان میں سے کسی ایک کو پایا اور وہ اسے جنت میں داخل نہ کرا سکے۔ مطلب یہ کہ اسے چاہئے کہ ماں باپ کی خدمت کرے۔ اور انہیں راضی رکھے خصوصاً جب کہ وہ بوڑھے ہوں تاکہ جنت میں داخل ہونے کا مستحق بنے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور منبر شریف پر چڑھتے ہوئے فرمایا، آمین پھر تشریف لے گئے اور فرمایا آمین۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ وقت آمین فرمانے کا کون سا تھا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جبریل نے آکر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس کے سامنے آپ کا نام لیا جائے اور وہ آپ پر درود نہ بھیجے اور مر جائے تو اسے جہنم میں حق تعالیٰ داخل کرے گا۔ اور اپنی بارگاہِ قرب و رحمت سے اسے دور رکھے گا تو آپ آمین کہئے۔ اس پر میں نے آمین کہا اس طرح جبریل علیہ السلام نے اس شخص کے بارے میں کہا جس نے رمضان پایا اور اس کے ماں باپ کی وجہ سے اس کی کوئی نیکی قبول نہ کی گئی۔

حدیث مبارک میں ہے کہ جو کسی مجلس میں بیٹھے اور درود بھیجے تو جو کچھ اس سے اس مجلس میں گناہ واقع ہو گا اسے بخش دیا جائے گا۔

تنبیہہ : یہ گمان نہ کرنا چاہئے کہ مجلس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر سے مراد یہی آپ کا نام لینا ہے بلکہ یہ بہت عام ہے اور نام مبارک کے ذکر سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و احوال شریفہ وغیرہ سب کو شامل ہے۔ اگرچہ صراحت کے ساتھ آپ کے نامِ نامی کا ذکر نہ کیا جائے۔ اگرچہ علماء نے اسم شریف کے ذکر کا مسئلہ وضع کیا ہے یہ بات بالکل ظاہر واضح ہے (وباللہ التوفیق)

اختلافِ صلوٰۃ بر غیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ علمائے کرام، سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیائے کرام علیہم السلام کے سوا پر لفظ صلوٰۃ کے استعمال و اطلاق میں اختلاف کرتے ہیں ان علماء کی تمام بحث و کلام سے تین قول مستفاد ہوتے ہیں۔ چنانچہ علماء کی ایک جماعت کا مذہب تو یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور پر لفظ صلوٰۃ کا اطلاق جائز نہیں ہے۔ کتاب الشفاء میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ فرمایا صلوٰۃ بر غیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جائز نہیں ہے۔ اور مواہب لدنیہ میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ثابت شدہ ہے۔ ابن ابی شیبہ نے از طریق عثمان از عکرمہ از ابن عباس رضی اللہ عنہم روایت کیا ہے کہ حضرت عباس نے فرمایا میں نہیں جانتا کہ کوئی ایک بھی صلوٰۃ کا سزاوار اور مستحق ہے بجز سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر استعمال کرنے کے۔ اور اس کی سند صحیح ہے۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ سے بھی منقول ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی ایک نبی پر صلوٰۃ بھیجنا جائز نہیں ہے۔ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے بھی ایسا ہی منقول ہے لیکن علماء فرماتے ہیں کہ مشہور یہ ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب یہ نہیں ہے بلکہ وہ مبسوط میں فرماتے ہیں کہ غیر انبیاء علیہم السلام پر صلوٰۃ کو مکروہ جانتا ہوں اور فرماتے ہیں کہ نہ ہمیں حق ہے اور نہ ہم سزاوار ہیں کہ جس چیز کا ہمیں حکم دیا گیا ہے اس سے ہم تجاوز و تعدی کریں اور یہ اس باب میں دوسرا قول ہے کہ لفظ صلوٰۃ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص نہیں ہے اس لئے کہ حدیث مبارک میں ہے کہ فرمایا: "صَلُّوا عَلَى الْأَنْبِيَاءِ قَبْلِي فَإِنَّ اللّٰهَ بَعَثَهُمْ كَمَا بَعَثَنِي۔" مجھ سے پہلے نبیوں پر درود بھیجو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسا ہی مبعوث فرمایا ہے جس طرح مجھے مبعوث فرمایا۔ لہٰذا صلوٰۃ نبیوں کے ساتھ مخصوص ہے اور ان کے سوا پر جائز نہیں ہے اور حضرت ابو سفیان ثوری رحمہ اللہ سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک اور روایت میں مروی ہے کہ فرمایا "لَا يَنْبَغِي الصَّلٰوةُ عَلٰى اَحَدٍ اِلَّا النَّبِيِّيْنَ" کسی

کو حق نہیں کہ نبیوں کے سوا کسی اور پر درود بھیجے۔

علماء کی دوسری جماعت کہتی ہے کہ صلوٰۃ کے معنی ترحم کے یعنی اللہ عزوجل سے رحمت مانگنے اور دعا کرنے کے ہیں کہ وہ اپنے بندہ پر رحمت فرمائے۔ اور یہ مطلق ہے مگر یہ کہ اس کے اطلاق کی ممانعت کسی حدیث صحیح یا اجماع قطعی سے ثابت شدہ نہیں ہے۔ بلاشبہ حق تعالیٰ نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ وہ خدا جو اپنے فرشتوں سمیت تم پر صلوٰۃ بھیجتا ہے۔

اور صبر کرنے والوں کی مدح میں ارشاد فرمایا: "اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ۔" یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی جانب سے صلوٰۃ و رحمت ہے اور صدقہ دینے والوں کی شان میں فرمایا۔ "خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ" مسلمانوں سے ان کے صدقے کا مال لیجئے اور انہیں پاک و ستھرا ان کے ذریعہ بنائیے۔ اور ان پر صلوٰۃ بھیجئے۔ اور نبی کریم ﷺ، صدقہ دینے والوں پر جب کہ وہ صدقہ کا مال لے کر حاضر ہوتے تو صلوٰۃ بھیجتے تھے چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ: "اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى آلِ اَبِيْ اَوْفٰى وَصَلِّ عَلٰى فُلَانٍ وَعَلٰى فُلَانٍ" اے خدا ابو اوفی کی آل پر صلوٰۃ بھیج اور فلاں پر اور فلاں پر ایک اور حدیث میں ہے کہ "اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ" اے خدا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ پر صلوٰۃ بھیج۔ اور حضور فرمایا کرتے تھے کہ وہ خوب صدقہ لاتے ہیں۔ ایک اور حدیث وہ بھی ہے جس میں حضور ﷺ نے صلوٰۃ بھیجنے کی تعلیم و تلقین فرمائی ہے کہ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَزْوَاجِهٖ وذریتہ بھی واقع ہوا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہ پر صلوٰۃ بھیجتے تھے اور اسے امام مالک نے مؤطا میں ذکر کیا ہے۔ اور ابن وہب، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا ہم اپنے ان ساتھیوں کے لئے جو غائب تھے اس طرح دعا کرتے ہیں: "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ مِنْكَ عَلٰى فُلَانٍ صَلٰوةَ قَوْمِ الْاَبْرَارِ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ بِاللَّيْلِ وَيَصُوْمُوْنَ بِالنَّهَارِ۔" اے خدا اپنی جانب سے فلاں پر ان نیکوکاروں کی مانند صلوٰۃ بھیج جو رات کو قیام کرتے اور دن کو روزہ رکھتے ہیں۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ علمائے محققین نے جو کچھ کہا اور مواہب لدنیہ میں جو کچھ بیان کیا ہے اور جمہور علماء کا جو مسلک مختار ہے اور جس پر کثیر فقہاء و متکلمین متفق ہیں یہ ہے کہ غیر نبی پر تنہا مستقلاً صلوٰۃ بھیجنا جائز نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایسی چیز ہے جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے اور ان کی تعظیم و توقیر میں اسے شعار و علامت مقرر کیا گیا ہے۔ لہٰذا یوں نہ کہا جائے مثلاً ابوبکر صلی اللہ علیہ وسلم یا علی صلی اللہ علیہ وسلم۔ اگرچہ یہ معنی کے اعتبار سے صحیح ہے جس طرح کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ تنزیہہ و تقدیس مخصوص ہے۔ لہٰذا یوں نہ کہا جائے کہ "قَالَ مُحَمَّدٌ عَزَّ وَجَلَّ" اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم معنی میں عزیز و جلیل ہیں۔ اسی طرح نبی کریم اور تمام انبیاء علیہم السلام کے ساتھ صلوٰۃ و سلام کی تخصیص واجب ہے۔ اس میں ان کے ساتھ کسی اور کو شریک اور مقرر نہ کیا جائے اور وہ جو قرآن و حدیث میں لفظ صلوٰۃ واقع ہوا ہے وہ دعا کے معنی پر محمول ہے نہ کہ بروجہ شعار و علامت۔ لہٰذا جائز نہیں ہے مثلاً آل ابی اوفی یا ان کے سوا کسی اور کیلئے، کہ اسے ان کا شعار بنایا جائے اور جس جگہ بھی ان کا ذکر آئے تو ان پر صلوٰۃ بھیجی جائے۔ اور انبیاء علیہم السلام کے ماسوا، ائمہ و علماء وغیرہ کو غفران و رضوان سے ذکر کیا جائے۔ جیسا کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کے ارشاد میں ہے کہ: "رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ۔" اے ہمارے رب ہمیں بخش دے، اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان میں سبقت رکھتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔" اللہ ان سے راضی ہوا وہ اللہ سے راضی ہوئے۔

علماء کرام فرماتے ہیں کہ صدر اول میں یہ روش رائج و معروف نہ تھی بلکہ اسے کچھ اہل بدعت نے بعد میں ایجاد کیا اور انہوں نے بعض اپنے اماموں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک و مساوی قرار دیا لہٰذا ان کے طریقہ سے اجتناب و احتراز واجب ہے۔

اور آل و ازواج اور ذریت کا ذکر بروجہ تبعیت و اضافت ہے۔ نہ بر طریق استبداء و اصالت۔ بطور تبعیت و اضافت ذکر کرنے میں کوئی اختلاف و کلام نہیں ہے۔ بلاشک و شبہہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "لَا تَجْعَلُوْا دُعَاءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا۔" (رسول کی دعا کو اپنے درمیان ایک دوسرے کی دعا کی مانند نہ بناؤ) لہٰذا واجب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے دعا، عام لوگوں کی دعا کے مخالف ہو اور یہی بحث سلام میں ہے۔

اور شیخ ابو محمد جوینی جو کہ امام الحرمین کے والد ہیں فرماتے ہیں کہ سلام، صلوات کے معنی میں ہے لہٰذا غائب میں اسے استعمال نہیں کیا جائے گا اور تنہا غیر نبی میں مستعمل نہ ہو گا۔ لیکن حاضر کے صیغہ کے ساتھ سلام سے خطاب کیا جا سکتا ہے۔ اور اس طرح کہا جائے کہ سلام علیکم و علیکم السلام۔ اور فرمایا کہ یہ مسئلہ اجماعی ہے اور فرمایا یہ طریقۂ احتیاط اور آداب نبوت کی رعایت میں اسلم و اقرب ہے۔ مواہب لدنیہ میں فرماتے ہیں کہ غیر نبی پر صلوٰۃ و سلام کے اطلاق سے منع کرنے والے علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ آیا یہ حرام ہے یا مکروہ تنزیہی یا خلافِ اولیٰ کے باب سے ہے گویا حکم میں تین قول ہیں جسے امام نووی نے کتاب اذکار میں نقل کیا ہے اور کہا کہ صحیح یہ ہے کہ یہ مکروہ بکراہت تنزیہی ہے اس لئے کہ یہ اہلِ بدعت کا شعار ہے۔ (واللہ اعلم)

تنبیہہ : معلوم ہوا کہ یہ بحث صدر اول میں نہ تھی۔ بلکہ تمام مسلمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام کے ساتھ مامور تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم سے کہ فرمایا: "صَلُّوْا عَلَى الْأَنْبِيَاءِ قَبْلِيْ فَإِنَّ اللّٰهَ بَعَثَهُمْ كَمَا بَعَثَنِيْ۔" (مجھ سے پہلے نبیوں پر صلوٰۃ و سلام بھیجو کیونکہ اللہ نے انہیں ایسا ہی مبعوث فرمایا ہے جس طرح مجھے مبعوث فرمایا) وہ مسلمان دیگر انبیاء علیہم السلام پر بھی بھیجتے تھے۔ اور اس مسئلہ میں شیعہ (خواہ رافضی ہو یا تفضیلی) مخالف جا پڑے ہیں کہ وہ اہلِ بیت نبوت پر اصالۃً صلوٰۃ و سلام بھیجنے لگے ہیں ورنہ بروجہ تبعیت بلا خلاف جائز ہے۔ اور متقدمین کی کتابوں میں سلام کی نسبت اہلِ بیت کے ساتھ اس معنی میں جس میں ازواجِ مطہرات علیہن السلام بھی شامل ہوں، دیکھا گیا ہے۔ (واللہ اعلم)

اور متاخرین میں بعض دیگر اصطلاحات پیدا ہو گئی ہیں۔ ممالک عرب میں رضی اللہ عنہ اور رحمۃ اللہ علیہ تمام مشائخ کیلئے کہا جاتا ہے۔ اور صاحب ہدایہ اپنے لئے خود فرماتے ہیں کہ قال رضی اللہ عنہ اور صوفیہ کے طریقے میں قدس سرہ العزیز یا قدس سرہ ان اختلافات الفاظ کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ جو اس باب میں ہے۔ اس کی دو عبارتیں ہیں۔ ایک تو وہ جو بعض قدس اللہ روحہ لکھتے ہیں۔ اور دوسرے بعض صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا کلمہ لکھتے ہیں۔ اور یہ مشہور نحوی قاعدہ کے بموجب جو اعادۂ حرف جار میں ہے اس کے موافق نہیں ہے۔ اور بعض لوگ انبیاء علیہم السلام پر درود بھیجنے کی غرض سے: "عَلٰى نَبِيِّنَا وَعَلَيْهِ وَعَلَيْهِمْ۔" کا اضافہ کرتے ہیں تاکہ ان پر صلوٰۃ تبعیت و طفیل کے طور پر واقع ہو اور یہی اکثر ممالک عرب میں متعارف و مروج ہے اور جو حکم سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کے سلسلے میں ہے وہی حکم تمام انبیاء علیہم السلام کیلئے ہے۔ اور اکثر عجمیوں کے کلام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ علیہ السلام بہت واقع ہے لیکن اولیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے۔ اور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ غایت مختصر اور درست و سلامت واقع ہوا ہے۔

باب دہم

انواعِ عبادات نبوی کے بیان میں

مقصودِ آفرینش عبادت رب ہے۔ اس میں شک وشبہ نہیں کہ جہان کی تخلیق و آفرینش کا مقصود عبادت ہے۔ کیونکہ حق تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ" ہم نے جن وانسان کو اسی لئے پیدا فرمایا کہ وہ میری عبادت کریں اور حق تعالیٰ سے قرب و حصول کیلئے سیدھا راستہ عبادت ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے "إِنَّ اللّٰهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ" "بیشک اللہ میرا اور تمہارا رب ہے۔ تو اس کی عبادت کرو یہی سیدھا راستہ ہے اور فرمایا:

وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ ۝

ہم جانتے ہیں کہ ان کی باتوں سے آپ کا سینہ تنگ ہوتا ہے تو آپ اپنے رب کی حمد کیجئے اور سجدہ کرنے والوں میں ہو جایئے۔ اور اپنے رب کی عبادت کیجئے یہاں تک کہ یقینی امر آپ کے پاس آجائے۔

اس آیہ کریمہ میں یقین سے مراد موت ہے اس بنا پر کہ وہ ضیق صدر، تنگ دلی اور حزن وغم کے زوال کے سبب میں امر یقینی ہے اور عبادت سے اس کا زوال اس بنا پر ہے کہ جب انسان عبادت میں مشغول ہو جاتا ہے تو اس پر عالم ربوبیت کی شعاعیں منکشف ہوتی ہیں اور جب اسے یہ انکشاف حاصل ہو جاتا ہے تو اس کی نظر میں ساری دنیا چیونٹی سے زیادہ حقیر و ذلیل ہو جاتی ہے اور دل پر سے اس کے وجود کا مٹانا آسان ہو جاتا ہے اس کے بعد وہ اس کے ناپید ہونے پر پریشان نہیں ہوتا۔ اور اس کے خیالات پراگندہ نہیں ہوتے۔ لہٰذا حزن وغم بھی زائل ہو جاتا ہے۔ اور جب بندے پر مکروہات وشدائد نازل ہوں اور اس سے بھاگ کر مولیٰ کی طاعت کی طرف آئے گویا وہ کہتا ہے مجھ پر تیری عبادت واجب ہے خواہ تو مجھے بھلائی عطا فرمائے یا مکروہات میں ڈالے اس پر وہ مکروہ کو بھلا دیتا ہے۔ اور اس کی امیدوں کو کشادہ کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ۔" تو اس کی عبادت کرو اور اس کی عبادت میں قائم رہو۔

اور اس میں اس فرقہ کا رد ہے جو کہتا ہے کہ جب بندہ کو حق تعالیٰ کی محبت وقرب حاصل ہو گیا تو اس کے اعمال ظاہرہ ساقط ہو گئے۔ اور اس سے ہر عمل ظاہری چھٹکارا پا گیا اور شرعی تکلیف اس سے جاتی رہی۔ اور جب بندہ بارگاہ حق کی طرف مسافر ہے اور اس کی مسافت ختم نہیں ہوئی ہے تو جب تک وہ قید حیات میں ہے راستہ کے توشہ کا محتاج ہے۔ اور اسی کو عبادت سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ اس سے مستغنی نہیں ہے خواہ وہ کتنا ہی مقرب ہو جائے اور اس کی عبادت کتنی ہی زیادہ اور عظیم ہو جائے۔ ایک شخص حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کی مجلس میں کہہ رہا تھا اور وہ عمل کے ساقط ہونے پر غور کر رہا تھا تو حضرت جنید رحمہ اللہ نے فرمایا ہم اس بات کو زنا اور شراب پینے سے زیادہ بدتر جانتے ہیں۔

علماء کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قبل بعثت عبادت کرنے کے بارے میں اختلاف ہے آیا آپ کسی سابقہ شریعت کے مطابق عبادت کرتے تھے؟ اس میں جمہور کا مذہب یہ ہے کہ شرائع سابقہ میں سے کسی چیز کی آپ پیروی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ آپ کے دل میں عبادت کی جو شکل وصورت آتی کرتے اور اس پر عقل کو اس کا تابع بناتے۔ بعض علماء اس مسئلہ میں توقف کرتے ہیں نیز اس میں بھی اختلاف ہے کہ عبادت ذکر کے ساتھ تھی یا فکر کے ساتھ۔ اس میں مختار یہ ہے کہ ذکر کے ساتھ تھی اور اگر ذکر وفکر

دونوں ہوں تو ممکن ہے کہ ذکر کی نورانیت سے فکر صاف ہوجاتا علو حقائق منکشف ہوجاتے ہوں (واللہ اعلم) جیسا کہ مولانا رومی مثنوی میں فرماتے ہیں۔

این ہمہ گفتیم وباقی فکر کن۔ فکر گر جامد بود رو ذکر کن!

اور ذکر کا مرتبہ بلند ہے کیونکہ بے واسطہ ذات حق سے اتصال حاصل ہو کر فیوضات کا ورود ہوتا ہے اور فکر کا نفس اور ان معلومات سے تعلق ہے جو منہ میں مودع ہے اور اسے خاص طریقہ پر ترتیب دینے سے مجہول حاصل ہوجاتا ہے۔

اور بعض علماء اس کے قائل ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں پر عمل کرتے خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت پر عمل فرماتے تھے اور وہ اس سے استدلال فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اقتداء واتباع کا بعثت کے بعد مامور بنایا گیا تھا چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے: "اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ ہَدَی اللّٰہُ فَبِہُدٰہُمُ اقْتَدِہْ۔" یہ وہ حضرات ہیں جن کو اللہ نے ہدایت فرمائی تو ان کی ہدایت کی تم پیروی کرو۔ اور حق سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا "ثُمَّ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّۃَ اِبْرٰہِیْمَ۔" پھر ہم نے تمہاری طرف وحی فرمائی کہ ملتِ ابراہیمی کی پیروی کرو۔ لہٰذا اگر قبل از بعثت اس کے عامل ہوں تو کیا تعجب ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ "فبھدٰ اھم" سے مراد ایمان باللہ، توحید اور باہمی متفق علیہ اصول دین ہیں نہ کہ فروع وشرائع، کیونکہ یہ مختلف ہیں۔ اور بجائے خود ان کا اتباع بر بنائے اختلاف شرائع ممکن نہیں ہے۔ اور ان میں منسوخ بھی ہیں اور نسخ کے بعد ان میں ہدایت نہیں رہتی لہٰذا اس پر اس سے استدلال درست نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم شرائع انبیاء سابق علی نبینا وعلیہم السلام پر عبادت کرتے تھے تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ جب بعد از بعثت متعبد ہیں تو قبل از بعثت بھی ہوں گے۔ ہاں اس کا احتمال ہے کہ ان میں سے کسی ایک کی شریعت پر عبادت کرتے ہوں اور اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت پر ہو تو اولیٰ وانسب ہے اور بعض کہتے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر تھی کیونکہ وہ اقرب زمانہ تھے۔ (واللہ اعلم)

اس جگہ ایک نکتہ یہ متوہم ہوتا ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، انبیاء علیہم السلام کے متبع اور مقتدی ہوں گے تو آپ کی فضیلت ان پر کیسے ہوگی تو اس توہم کا ازالہ اس طرح کرتے ہیں کہ جب آپ سب کے مقتدی ومتبع ہوں گے تو ان سب کے کمالات بھی آپ میں جمع ہوں گے۔ لہٰذا آپ سب میں کامل تر ہوئے۔ فافہمؒ وباللہ التوفیق۔

صاحب مواہب لدنیہ نے عبادتوں کے مقاصد کو سات نوع پر ترتیب دیا ہے ہم نے بھی اتنے ہی نوع مرتب کیے ہیں۔ نوع اول طہارت، دوم نماز، سوم زکوٰۃ، چہارم روزہ۔ پنجم حج، ششم دعا۔ ہفتم تلاوت۔

نوع اول در طہارت

اس نوع میں چند فصلیں ہیں۔ فصلِ اول:۔ پہلی فصل وضو، مسواک، آب وضو کی مقدار اور وضاحت یعنی حسن ونظافت کے بیان میں ہے۔ وضو، واؤ کے پیش سے مصدر ہے اور واؤ کے زبر سے وضو کے پانی کو کہتے ہیں اور مصدر کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ دونوں طرح مستعمل ہیں کبھی بمعنی مصدر آتا ہے اور کبھی آب وضو آتا ہے۔ کذافی القاموس، بعض علماء وجوب وضو میں اختلاف کرتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کا وجوب حق تعالیٰ کے اس ارشاد سے مدینہ منورہ میں ہوا "اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْہَکُمْ۔" (جب تم نماز کا ارادہ کرو تو اپنے چہرے کو دھوؤ (آخر تک) یہ آیۂ کریمہ سورۂ مائدہ میں ہے جو کہ مدنی ہے لیکن حدیثوں میں آیا ہے کہ جبریل علیہ السلام نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدائے وحی میں نماز اور وضو کا طریقہ سکھا دیا تھا۔

نیز حدیث میں ہے کہ سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس روتی ہوئی آئیں اور کہنے لگیں کہ قریش نے آپ کے قتل کا عہد اٹھایا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وضو کیلئے پانی لاؤ۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا یہ مکہ کا واقعہ ہے۔ ابن عبدالبر نقل کرتے ہیں کہ مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ غسل جنابت مکہ مکرمہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض کیا گیا جس طرح کہ نماز فرض کی گئی۔ اور نماز کبھی بھی بغیر وضو نہیں ادا کی گئی اور ابن عبدالبر یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس سے کوئی عالم بھی ناواقف نہیں ہے۔ شیخ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ یہ رد اس شخص کا کیا گیا ہے جو وضو کے وجود کا قبل ہجرت منکر ہے نہ کہ اس شخص کا جو قبل ہجرت اس کے وجوب کا منکر ہے۔(انتہی)۔ اس کلام کا حاصل یہ ہے کہ وضو کا وجوب اس آیہ کریمہ سے ہوا۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قبل ہجرت وضو مستحب تھا نہ کہ واجب۔ لیکن اس تقدیر پر یہ لازم آتا ہے کہ بے وضو نماز جائز ہے۔ حالانکہ یہ خلاف اجماع ہے۔ اور ممکن ہے کہ کہا گیا ہو کہ آیہ کریمہ کا نزول وضو کے وجوب اور قیام نماز کیلئے ہے اور تم لوگ جو بے وضو اور ناپاک ہوا ایسا خیال نہ کرنا جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کیونکہ ابتداء میں مطلقاً قیام نماز کے وقت وضو فرض تھا جو آخر میں منسوخ ہوا۔ اور حدث یعنی بے وضو ہونے کے وجود کے ساتھ مقید فرمایا۔ لیکن سورۂ مائدہ کے احکام نسخ میں کلام ہے۔ فتدبر

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نماز کیلئے وضو کیا اور بعض اوقات ایک ہی وضو سے چند فریضے گذارے ہیں۔ مسلم میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کیلئے وضو کرتے تھے اور روز فتح مکہ ایک وضو سے چند نمازیں ادا فرمائیں۔ ایک روایت کے مطابق پانچ نمازیں ایک وضو سے ادا فرمائیں اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آج آپ نے ایسا عمل کیا ہے جو کبھی آپ نے نہیں فرمایا؟ "ارشاد فرمایا" اے عمر رضی اللہ عنہ میں نے قصداً ایسا کیا ہے بیانِ جواز کیلئے تاکہ لوگ جان لیں کہ ہر نماز کیلئے نیا وضو کرنا فرض نہیں ہے۔ بخاری، ابو داؤد اور ترمذی، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کیلئے نیا وضو، کرتے تھے اس پر حضرت انس رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ آپ کیا کرتے ہیں؟ فرمایا ایک وضو ہمیں اس وقت تک کفایت کرتا ہے جب تک کہ میں محدث یعنی بے وضو نہ ہوں اور اس جگہ علماء فرماتے ہیں کہ ہر نماز کیلئے نیا وضو، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے نہیں ہے۔ چنانچہ امام احمد و ابو داؤد کی روایت میں حضرت عبداللہ بن حنظلہ غسیل ملائکہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے لئے وضو کرنے پر مامور ہوئے تھے خواہ طاہر ہوں یا غیر طاہر۔ اور جب آپ پر شاق ہوا تو ہر نماز کیلئے مسواک کا حکم دیا گیا اور آپ سے نیا وضو کرنے کا حکم اٹھا لیا گیا مگر جبکہ حدث لاحق ہو چکا ہو۔

مسواک۔ مسواک، سواک سے بنا ہے جس کے معنی مَلنے اور منہ کو مَلنے کے ہیں اور سواک سین کے زیر سے، بمعنی دانتوں کی لکڑی، اسی سے مسواک بنا ہے۔ اور مسواک کی فضیلت و استحباب میں بکثرت احادیث مروی ہیں۔ فرمایا اگر امت پر دشوار ہونے کا خوف نہ ہوتا تو میں ان پر ہر نماز کے لئے مسواک کو واجب قرار دیتا۔ اور فرمایا مسواک کرنا منہ کی پاکیزگی کا ذریعہ اور موجب رضائے حق و سبحانہ وتعالیٰ وتقدس ہے اور فرمایا جب بھی جبریل علیہ السلام آئے تو انہوں نے مجھے مسواک کرنے کا حکم سنایا۔ بلاشبہہ میں ڈرا کہ میں اپنے منہ کو گھسوں اور پست کروں اور ایک روایت میں ہے کہ لثہ کو لثہ سے رگڑوں۔ لثہ، لام کے زیر اور ثاء مثلثہ مخففہ، دانتوں کی جڑ کے گوشت کو کہتے ہیں جسے مسوڑھے کہا جاتا ہے اور حضرت عبداللہ بن حنظلہ کی مذکورہ بالا حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسواک کرنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر واجب تھا لیکن اس حدیث کی صحت میں کلام ہے اور خصائص دلیل صحیح سے ہی ثابت ہوتے ہیں۔

طبرانی اور بیہقی، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین چیزیں

ہیں جو مجھ پر تو فرض ہیں لیکن امتی کیلئے سنت ہیں۔ وتر، مسواک اور قیام لیل (نماز تہجد) ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے مسواک کا حکم دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ میں ڈرا کہ کہیں مجھ پر فرض نہ کر دیا گیا ہو۔ یہ حدیث عدم وجوب میں صریح ہے۔ لیکن اس سے پہلی حدیث میں وجوب واقع ہوا ہے۔ لیکن امت پرا جماع یہ ہے کہ یہ واجب نہیں ہے بلکہ سنت موکدہ ہے وضو کے وقت باتفاق اور امام شافعی کے نزدیک بوقت نماز اور خواب سے اٹھنے کے بعد۔ جیسا کہ صحیحین میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کے وقت خواب سے اٹھتے تو مسواک کو ملتے اور دہن مبارک کو پاکیزہ تر بناتے تھے اور ظاہر ہے کہ قیام لیل سے مراد، نماز (تہجد) کیلئے قیام کرنا ہے۔ لہٰذا مسواک سے مراد، نماز کے وضو کیلئے ہے اور وضو کا تعلق خواب سے اٹھنے کے وقت سے ہے نہ کہ نماز شب کیلئے یہ علیحدہ سنت ہے۔

اور قرأت قرآن اور سونے کا ارادہ کرتے وقت بھی مسواک کرتے تھے اور تغیر فم کے وقت خواہ تغیر منہ کی بو کا ہو یا دانتوں کی بدنگت کا تغیر۔ اور گھر میں داخل ہونے کے وقت بھی مسواک کرتے تھے۔ چنانچہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا شانہ اقدس میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلا جو کام کرتے وہ مسواک کرنا ہوتا تھا اور ظاہر ہے کہ ایسا وضو اور نماز کے وقت بھی کرتے تھے۔ (کذا قیل) اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسواک میں خوب مبالغہ کرتے تھے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسواک کرتے تھے چنانچہ آپ کے دہن مبارک سے اُع اُع کی مانند آواز نکلتی تھی گویا کہ قے کرتے ہیں۔ اور ایک روایت میں غین سے یعنی اُغ اُغ آیا ہے اور نسائی کی روایت میں اعا اعا آیا ہے اور ابو داؤد کی روایت میں آہ آہ اور بعض روایتوں میں اُخ اُخ آیا ہے۔

مستحب ہے کہ مسواک، درختِ اراک کی ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اسی سے کرتے اور اسی سے کرنے کا حکم بھی فرماتے تھے اور انگلی سے مسواک کرنا بھی کافی ہے۔ خواہ اپنی انگلی سے ہو یا دوسرے کی انگلی سے اور اگر سخت و درشت کپڑے سے ہو تب بھی کافی ہے۔ اور شوافع جو ہر نماز کیلئے کرتے ہیں زیادہ تر ایسے ہی کپڑے سے کرتے ہیں۔

ابو نعیم اور بیہقی روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دانتوں کے عرض پر مسواک کرتے تھے اور مواہب لدنیہ میں کہا گیا ہے کہ مسواک داہنے ہاتھ سے کرنی چاہئے یا بائیں ہاتھ سے۔ کون سا مستحب و اولیٰ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ چونکہ حدیث میں ہے کہ سواری پر چڑھنے اور جوتا پہننے اور طہارت کرنے اور مسواک کرنے میں داہنی جانب کو اختیار کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ داہنے ہاتھ ہی سے مسواک کرنی مستحب ہے۔ کیونکہ مسواک کرنا یا تو تطہیر و تطییب کی قبیل سے ہوگا یا گندگی و آلائش وغیرہ کے دور کرنے کے قبیل سے۔ اگر ہم کہیں کہ اول قبیل سے ہے تو یہی مستحب ہوگا یعنی داہنے ہاتھ سے۔ اور اگر دوسرے قبیل سے کہیں تو بائیں ہاتھ سے مستحب ہوگا۔ اس لئے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا داہنا دستِ مبارک، طہارت کرنے اور کھانے کیلئے اور بایاں دست مبارک، بیت الخلاء میں استنجا کرنے اور ناپاکی دور کرنے کے لئے تھا۔ اسے ابو داؤد نے باسناد صحیح روایت کیا ہے۔

بعض شراح حدیث نے کہا ہے کہ مسواک میں تیمن سے مراد یہ ہے کہ ابتدا داہنی جانب سے کرے جیسا کہ چلنے اور جوتے پہننے میں ہے۔ لہٰذا اس سے داہنے ہاتھ سے مسواک کرنے پر استدلال کرنا درست نہ ہوگا پھر داہنے ہاتھ سے مسواک کرنے میں نقل درکار ہے۔ اور کہتے ہیں کہ ظاہر ہے کہ یہ از باب ازالہ اذی یعنی تکلیف دور کرنے کے قبیل سے ہے جیسا کہ ناک صاف کرنا۔ لہٰذا بائیں ہاتھ سے ہو۔

امام مالک رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ مسجدوں میں مسواک نہ کرنی چاہئے اس لئے کہ یہ ناپاکی دور کرنے کی قبیل سے ہے۔ یہ

ساری گفتگو مواہب میں ہے۔
مخفی نہ رہنا چاہئے کہ مسواک کرنے میں مشہور و معروف داہنے ہاتھ سے کرنا ہے اور بایاں ہاتھ جو ناپاکی کے دور کرنے کیلئے متعین ہے اس سے اس تقدیر پر ہو گا جب بغیر کسی چوب مسواک یا کپڑے وغیرہ کے ہاتھ سے مسواک کی جائے۔ جیسا کہ ناک وغیرہ صاف کرنے میں ہے۔ اور مسجدوں میں مسواک کرنے کو مکروہ قرار دینا اس تقدیر پر ہے جب کہ کوئی چیز منہ سے نکال کر پھینکی جائے۔ ہاں اگر مسواک ہاتھ کے ساتھ ہے تو یہ کلام اس میں جاری ہے اور اگر لکڑی وغیرہ سے ہو تو داہنی جانب سے ابتدا کا استحباب، بہ ہر تقدیر اپنے حال پر ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض حضرات نے بائیں ہاتھ سے مسواک کرنے کو اختیار کیا ہے۔ (واللہ اعلم)
پانی کی مقدار۔ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل اور وضو میں، پانی کی مقدار کے بارے میں علماء فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم غسل ایک صاع پانی سے کرتے جو کہ پانچ مد کے برابر ہے۔ اور وضو ایک مد پانی سے کرتے تھے اور ایک حدیث میں ہے کہ وضو دو رطل پانی سے کرتے۔ بلاشبہ ہمارے ملک کی زبان میں صاع اور رطل کی مقدار کی تحقیق وضاحت و توضیح سے خالی نہیں ہے اور شرح سفر السعادات کے اس باب میں اور صدقۂ فطر کے باب میں اس کے بیان کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی ہے۔
بایں ہمہ علماء فرماتے ہیں کہ ان حدیثوں سے مراد، تعین و تحدید نہیں ہے۔
فائدہ۔ چنانچہ اگر اس مقدار مذکورہ سے کم یا زیادہ پانی ہو تب بھی جائز ہے۔ اصل قاعدہ یہ ہے کہ جتنا پانی بھی مقصود بر آری میں کفایت کرے کام میں لائے۔ جب تک کہ پانی چپڑنے اور حد اسراف تک نہ پہنچے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آبِ وضو کی کمی اور اس کے کم بہانے میں مبالغہ فرماتے تھے اور امت کو وضو میں اسراف اور زیادہ پانی بہانے سے منع فرماتے اور تنبیہہ فرمایا کرتے تھے اور فرماتے میری امت میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہوں گے جو وضو میں تعدی اور حد سے تجاوز کریں گے اور پانی بہانے میں بہت اسراف کریں گے اور فرماتے کہ وضو کیلئے ایک شیطان ہے جس کا نام "ولہان" ہے جو آدمی کو وضو میں اور پانی کے اسراف میں وسوسے ڈالتا ہے۔ لہٰذا اس کے وسوسوں سے بچو۔ اور اس کے وسوسوں سے بچنے اور اسے دفع کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ براہِ تغافل مارو اور دلوں سے بکوشش اسے دور کرو اور اس کے وسوسوں کی پیروی نہ کرو۔ نیز رخصت پر عمل کرو۔ اور اگر شیطان بہت مزاحمت کرے تو کہو یہ جو تو عمل کرتا ہے ناقص اور نادرست ہے درگاہِ حق میں اس کی پذیرائی نہیں ہے۔ اور اس کے گمان پر کہو دور ہو جا میرے پاس سے۔ میں اس سے زیادہ ہرگز نہیں کروں گا۔ اور میرا مولا یعنی اللہ تعالیٰ و تقدس کریم ہے۔ وہ اتنا ہی قبول فرما لے گا اور اس کا فضل و کرم بہت وسیع ہے۔ یہی صورت نماز اور دیگر مواقع عبادات وغیرہ میں وسوسوں کا ہے اور اصل وسوسہ اس میں کمی و ناقص رہنے کا خیال پیدا کرنا ہے۔ اور جب شیطان ان راہوں میں دخل انداز ہو تو چاہئے کہ استعاذہ اور لاحول ولاقوۃ الا باللہ کہے یہ اس کے ازالہ اور دفعیہ میں انتہائی موثر ہے جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے۔ مسند امام احمد اور ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے تو دیکھا کہ وہ وضو کر رہے تھے فرمایا۔ "لَاتُسْرِفْ بِالْمَاءِ" پانی میں اسراف نہ کرو اور ایک روایت میں ہے کہ "مَا ھٰذَا السَّرَفُ یَاسَعْدُ" اے سعد (رضی اللہ عنہ) یہ کیا اسراف ہے؟ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا "ھَلْ فِی الْمَاءِ اِسْرَافٌ" کیا پانی میں بھی اسراف ہے؟ کیونکہ پانی میں کوئی چیز کم یاب اور عزیز الوجود نہیں ہے؟ اسراف کیسے ہو گا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "نَعَمْ وَاِنْ کُنْتَ عَلٰی نَھْرٍ جَارٍ" ہاں پانی میں بھی اسراف ہے اگرچہ تم نہر جاری پر ہو اور یہ منع و تحذیر اور تنبیہہ میں مبالغہ ہے کہ پانی میں ہرگز کسی جگہ اسراف نہ کیا جائے۔ غالباً۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو بطریق دفع وسواس میں یہ ارشاد ہے کہ کوئی چیز حضور

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی محسوس فرمائی ہوگی۔ یہاں تک کہ اس کے دفع کرنے میں اتنا مبالغہ ظاہر فرمایا اور مسائل فقہ میں مذکور ہے کہ اگر وضو کرنے والا نہر کے کنارے پر ہو تو پانی کے بہانے میں وہاں اسراف نہیں ہے اس لئے کہ جتنا پانی بہائے گا وہ لوٹ کر نہر میں ہی چلا جائے گا۔ بجز اس صورت کے اگر غسالہ نہر کے باہر بہایا جائے۔

نہر جاری اور غیر جاری کے درمیان فرق یہ ہے کہ وضو میں آبِ مستعمل باتفاق پاک کرنے والا نہیں ہے اور اکثر کے نزدیک تو آبِ مستعمل خود بھی پاک نہیں ہے۔ لہٰذا آبِ مستعمل کو کسی اور جگہ بھی استعمال نہیں کر سکتے۔ اس لئے ضرورت سے زیادہ پانی استعمال کرنا ضائع ہوگا اور نہر جاری میں جب کہ غسالہ اسی میں ڈالا جائے تو ضائع کرنا نہ ہوگا۔ اور یہ بھی بات ہے کہ نہر جاری میں آبِ مستعمل نہیں رہتا لیکن اس جگہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مبالغہ فرمایا کہ حد سے تجاوز مناسب نہیں ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ اگر زیادہ پانی بہانے میں، پانی میں اسراف نہ بھی ہو تو عمر میں اسراف اور وقت کو ضائع کرنا تو باقی ہے۔ اور اسی مفہوم کے قریب قریب وہ بات ہے، جو بعض علماء فرماتے ہیں کہ حدیث میں اسراف سے مراد، گناہ ہے یا نہیں۔ اگرچہ جاری نہر میں کثرت سے پانی بہانے میں اسراف اور پانی کا ضائع کرنا نہیں ہے لیکن مقدارِ شرع سے تجاوز کرنے میں تو ایک گناہ ہے (واللہ اعلم)

وصل: ۔ کبھی کبھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اعضاء وضو کو ایک مرتبہ سے زیادہ نہیں دھوتے تھے اور یہ تعلیم امت کی بنا پر تھا کیونکہ اتنی مقدار کافی ہے اور مقدارِ فرض پر انحصار فرمانا اس لئے ہے کہ اس سے کم پر وضو درست نہیں ہے جیسا کہ فرمایا "ہٰذَا وُضُوْءٌ لَا یَقْبَلُ اللّٰہُ الصَّلٰوۃَ اِلَّا بِہٖ۔" یہ وضو ہے اس کے بغیر اللہ نماز کو قبول نہیں فرماتا۔ ابو داؤد میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ فرمایا "کیا میں تمہیں بتاؤں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وضو کیا تھا؟ اس کے بعد انہوں نے اعضاء وضو کو ایک ایک مرتبہ دھویا اور کبھی وضو کو طہارت میں مبالغہ کیلئے دو مرتبہ دھویا اور اسے نور علیٰ نور فرمایا۔ اور ثواب میں زیادتی اور اجر کو بڑھانے کا سبب قرار دیا ہے جیسا کہ رزین کی حدیث میں عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کے راوی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو میں ہر عضو کو دو دو مرتبہ دھویا اور فرمایا "نور علی نور" اور کبھی تین مرتبہ دھویا اور یہ طہارت کے مرتبہ میں آخری حد ہے۔ اور "اسباغ وضو" جو کہ حدیثوں میں آیا ہے اکثر علماء کے نزدیک یہی ہے۔ اور اس باب میں صحیح و حسن حدیثیں بلاشبہ بکثرت مروی ہے چونکہ عزیمت و فضیلت اس میں ہے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اکثر حالتوں میں ایسا ہی کرتے تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین تین مرتبہ اعضاء وضو کو دھوتے تھے اور فرمایا: "ہٰذَا وُضُوْئِیْ وَوُضُوْءُ الْاَنْبِیَاءِ مِنْ قَبْلِیْ" یہ میرا وضو ہے اور مجھ سے پہلے کے تمام نبیوں کا وضو ہے ایک اور روایت میں ہے کہ: "وَوُضُوْءُ اِبْرَاہِیْمَ خَلِیْلِ الرَّحْمٰنِ" اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا وضو ہے۔ اور کبھی کسی عضو کو تین مرتبہ اور کسی عضو کو دو مرتبہ دھوتے جیسا کہ بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان سے کہا گیا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مانند وضو کر کے ہمیں دکھائیں تو انہوں نے پانی منگایا اور اس سے اپنے دونوں ہاتھوں پر پانی ڈالا اور تین مرتبہ دونوں ہاتھوں کو دھویا پھر ہاتھ سے پانی نکال کر ایک ہاتھ سے کلی کی اور ناک میں تین تین مرتبہ پانی ڈالا اور اس کے بعد برتن میں ہاتھ ڈال کر پانی نکالا اور اپنے چہرے کو تین مرتبہ دھویا۔ پھر دونوں ہاتھوں کو دو دو مرتبہ دھویا اور اپنے سر کا آگے اور پیچھے سے مسح کیا اور اپنے دونوں پاؤں کو دھویا۔ اسی کی مانند موطا، نسائی اور ترمذی میں مروی ہے۔

نیز اسی طرح مروی ہے کہ پاؤں کے دھونے میں کوئی گنتی مذکور نہیں ہوئی اور نسائی کی ایک روایت میں ہے کہ دونوں پاؤں کو دو دو

مرتبہ دھویا۔ اور بعض حدیثوں میں مطلقاً اعضاء دھونا آیا ہے اس میں عدد کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک مرتبہ دھویا ہوگا۔ یا اس مقام میں راوی کا مقصود اصل دھونے کا بیان ہو اور عدد کے بیان میں خاموش رہا ہو اور کسی حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وضو میں تین سے زیادہ مرتبہ دھونے کی ممانعت آئی ہے۔ اور فرمایا کہ جو شخص تین بار سے زیادہ دھوئے یا اس سے کم کرے تو اس نے برا کیا اور ظلم کیا لیکن اس میں مشکل یہ ہے کہ اس حدیث کا ظاہر، تین سے کمی کی مذمت میں ہے۔ اور جواب میں کہتے ہیں کہ یہ حکم نسبتی ہے اور برائی میں متعلق کمی سے ہے اور ظلم زیادتی سے اور نسائی کی روایت میں نقص یعنی کمی کا ذکر نہیں ہے اس میں اتنا ہی ہے کہ جس نے تین سے زیادہ بار دھویا اس نے برا کیا تعدی کی اور ظلم کیا۔ یہی زیادہ صحیح ہے اور ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں روایت کرتے ہوئے کمی کے ذکر میں کلام کیا اور اسے راوی کی غلطی بتایا ہے اس لئے کہ اس کا ظاہر تین سے کمی کی مذمت میں ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس میں ایک کلمہ مقدر ہے اور مراد، من واحدۃ ہے اور بعض روایتوں میں صراحت سے ہے: "مَنْ نَقَصَ مِنْ وَّاحِدَةٍ اَوْزَادَ عَلٰی ثَلَاثٍ فَقَدْ اَخْطَأَ" جس نے ایک سے کم کیا اور تین سے زیادہ کیا بلاشبہ اس نے غلطی کی۔

امام شافعی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ فرمایا میں پسند نہیں کرتا کہ متوضی تین بار سے زیادہ دھوئے اور اگر کسی نے زیادہ کیا تو اسے مکروہ بھی نہیں جانتا۔ اہلِ علم فرماتے ہیں کہ ان کی اس سے مراد یہ ہے کہ میں اسے حرام نہیں جانتا اور اصح یہ ہے کہ امام شافعی کے نزدیک مکروہ بکراہت تنزیہہ ہے اور دارمی نے شوافع کی ایک جماعت سے نقل کیا کہ تین پر زیادتی سے وضو کو باطل قرار دیتے تھے جس طرح کہ نماز میں رکعت زیادہ ہو جانے کی صورت میں ہے اور یہ قیاس فاسد ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ فرمایا تین پر زیادتی جائز نہیں ہے اور ابن المبارک فرماتے ہیں کہ بے خوف نہیں ہوں کہ یہ گناہ ہو اور شمسی فتاویٰ ظہیریہ میں بیان کرتے ہیں کہ جو ایک مرتبہ دھونے پر اکتفا کرتا ہے وہ گنہگار ہے اور بعض کے نزدیک سنتِ مشہورہ کے تارک ہونے کی وجہ سے گنہگار اور بعض گنہگار نہیں بتاتے کیونکہ وہ مامور بہ کو تو لا رہا ہے اور اس میں صحیح حدیث وارد ہے۔ اور امام محمد رحمہ اللہ (کاتب مذہب حنفیہ) اپنی موطا میں فرماتے ہیں کہ تین بار دھونا افضل ہے۔ اور دو بار کافی ہے اور ایک بار اگر مکمل اور درست طریق پر ہو تو بھی کافی ہے اور فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول بھی یہی ہے۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ایک ہی چلو سے کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا اور کبھی دو چلو سے اور کبھی تین چلو سے۔ جیسا کہ دیگر اعضاء کے دھونے میں ہے۔ آپ ایک چلو کے پانی سے آدھا کلی کیلئے لیتے اور آدھے سے استنشاق یعنی ناک میں پانی لیتے۔ اور تینوں مرتبوں میں اسی طرح دونوں کو ملاتے اور کلی اور ناک میں پانی لینے کو ایک چلو سے جمع کرنے کا مذہب امام شافعی کا ہے اور وہ صور متعددہ پر متصور ہے اور صحیح یہی ہے کہ ایک چلو سے کلی کرے اور پھر دوسرے چلو سے ناک میں پانی لے پھر ایک چلو سے کلی کرے۔ اور دوسرے سے ناک میں پانی لے اسی طرح تین بار کرے۔

صاحب سفر السعادۃ فرماتے ہیں کہ کسی صحیح حدیث میں اس کی فضیلت نہیں وارد ہوئی ہے کہ کلی سے فارغ ہوتے کے بعد ایک بار یا دو بار یا تین بار نئے پانی سے ناک میں پانی ڈالا گیا ہو۔ (انتہیٰ)۔ لیکن ہم حدیث کی عبارتیں مختلف پاتے ہیں۔ اور اکثر حدیثوں میں ایسا ہی واقع ہوا ہے کہ پہلے دونوں ہاتھ پہنچے تک دھوئے جائیں۔ اس کے بعد کلی کی جائے اور ناک میں پانی ڈالا جائے۔ پھر چہرے کو دھویا جائے پھر دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک دھویا جائے۔ حدیثوں میں یہ عبارتیں بہت ہیں اور ان کا ظاہر، کلی اور ناک میں پانی ڈالنے میں ملانے پر دلالت کرتا ہے اگرچہ یہ قطعی نہیں ہے۔

اور بعض میں ہے کہ دونوں ہاتھ دھوئے پھر مضمضہ اور استنشاق کرے۔ پھر چہرے کو دھوئے اور یہ تفصیل میں ظاہر ہے۔

جیسا کہ اول وصل میں ظاہر ہے۔ بلکہ تفصیل میں اس کا ظہور، وصل میں اس کے ظہور سے ظاہر ہے۔ مشکوٰۃ میں ایک روایت بخاری و مسلم سے ہے کہ مضمضہ اور استنشاق، تین مرتبہ تین چلو سے فرمایا۔ یہ بھی دو وجہ پر محتمل ہے۔ از روئے فصل بھی اور از روئے وصل بھی لیکن بعض روایتوں میں صراحت سے آیا ہے کہ مضمضہ اور استنشاق ایک چلو سے کیا۔ امام شافعی کا مذہب اس وجہ پر ہے جو مذکور ہوا اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب مضمضہ اور استنشاق میں بر وجہ مذکور فصل میں ہے اس لئے کہ منہ اور ناک دونوں جدا جدا عضو ہیں۔ لہٰذا دھونے میں بھی جدا جدا طریقہ ہوگا۔ جیسا کہ تمام اعضاء میں ہے۔ در حقیقت یہ وجہ فصل کی حدیث کو ترجیح دینے کیلئے اپنے قیاس کی موافقت سے ہے جیسا کہ اصول فقہ میں قاعدہ مقرر ہے نہ یہ کہ نص کے مقابلے میں تعلیل کرنا ہے۔ جیسا کہ مخالف خیال کرتے ہیں۔ ہماری دلیل (یعنی مذہب احناب کی) وہ حدیث ہے جو طبرانی میں ابو داؤد سے مروی ہے۔ چنانچہ شمنی روایت کرتے ہیں کہ طلحہ بن مطرف جو کہ اعلام ائمہ اور ثقاتِ تابعین میں سے ہیں اپنے والد اور وہ انکے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا پھر تین بار مضمسفہ کیا پھر تین بار استنشاق کیا۔ اور ہر بار نئے پانی کو لیا اور شافعیہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث از روئے سند ضعیف ہے اس لئے کہ جدِ طلحہ مجہول ہے اور ان کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحبت پایہ ثبوت سے متصل نہیں ہے (انتہی) اور جامع الاصول میں کہتے ہیں کہ طلحہ بن مطرف، اعلام تابعین اور ان میں ثقہ ترین میں سے ہیں اور ان کے دادا کعب بن عمرو یا عمرو بن کعب ہیں۔ اور شمنی شرح نقایہ میں فرماتے ہیں کہ بیہقی کتاب معرفت میں روایت کرتے ہیں کہ عبد الرحمٰن بن مہدی، اکابر ائمہ محدثین میں سے ہیں۔ اور مشائخ کے درجہ میں امام احمد بن حنبل کہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضرت طلحہ کے دادا عمرو بن کعب کو صحبتِ رسول حاصل رہی ہے اور وہ اپنی مسند میں یحیٰ بن معین سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا، محدثین کہتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور طلحہ کے گھر والے کہتے ہیں کہ ان کو صحبت نہیں ملی ہے۔ (انتہی) اور جب محدثین تصریح کرتے ہیں کہ انہیں صحبت حاصل ہے تو مدعا ثابت ہو گیا اور ان کے گھر والوں کی عدم واقفیت اس میں حارج نہیں ہے اور ابن سعد "طبقات" میں ایک حدیث باب مسح میں طلحہ کے دادا سے ان لفظوں سے روایت کرتے ہیں کہ: "رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْسَحُ هٰكَذَا" (میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح مسح کرتے دیکھا ہے) لہٰذا ان کی صحبت ثابت ہے۔ ایسا ہی شیخ ابن الہمام فرماتے ہیں اور شمنی فتاویٰ ظہیریہ میں نقل کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک بھی مضمسفہ و استنشاق میں وصل جائز ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک بھی مضمسفہ و استنشاق نئے پانیوں سے جائز ہے اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے اور جامع ترمذی میں فرماتے ہیں کہ شافعی رحمہ اللہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ مضمسفہ و استنشاق میں جمع و وصل کو مکروہ نہیں جانتے ہیں۔ اور مضمسفہ و استنشاق وضو میں تین اماموں کے نزدیک سنت ہے اور امام احمد کے نزدیک فرض ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم داہنے ہاتھ سے ناک میں پانی ڈالتے اور بائیں ہاتھ سے ناک صاف کیا کرتے تھے۔

سر کا مسح: لیکن سر کے مسح کی مقدار میں اختلاف ہے۔ امام شافعی اور ان کے پیروکار کا وجوب مسح میں مذہب یہ ہے کہ کم سے کم اتنی چیز واجب ہے جس پر مسح کا اطلاق ہو سکے اگرچہ ایک ہی بال ہو ایک اور روایت میں تین بال ہیں۔ امام مالک اور ان کے مقلدین کا مذہب یہ ہے کہ پورے سر کا مسح کرنا واجب ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک چوتھائی سر کا مسح فرض ہے اور پورے سر کا مسح سنت ہے۔ ان مذاہب کے دلائل اپنی جگہ مذکور ہیں اور سفر السعادت میں بقدر وسعت، مسح کے گھیرنے میں غلطی ہوئی ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ مسئلہ مسح میں انصاف، امام مالک کے ساتھ ہے۔ میں نے ایسا ہی اپنے شیخ علی بن جار اللہ مفتی حرم شریف رحمہ اللہ سے سنا ہے (واللہ اعلم) پورے سر کا مسح سنت ہے۔ مسح کی کیفیت یہ ہے کہ سر کے اگلے حصے سے دونوں ہاتھوں کو پچھلے سر تک لے

جائے پھر پچھلے سر سے دونوں ہاتھوں کو وہاں تک واپس لائے جہاں سے مسح شروع کیا گیا تھا۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک مسح سر ایک مرتبہ سنت ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک پورے سر کا مسح تین مرتبہ جدید پانیوں سے سنت ہے اور امام اعظم رحمہ اللہ کی بھی ایک شاذ روایت ہے لیکن ایک ہی پانی سے تین مرتبہ مسح کرنا چاہئے اور ہدایہ میں ہے کہ امام اعظم سے یہی مشروع و مروی ہے اور بعض شروح ہدایہ میں ہے کہ امام اعظم کی روایت حسن ہے کہ اگر ایک پانی سے تین مرتبہ مسح کیا جائے تو مسنون ہوگا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مروی ہے کہ آپ مسح میں تکرار نہیں کرتے تھے اور مسح کی اکثر حدیثوں میں، مطلق بغیر تقیید عدد آیا ہے اور ایک مرتبہ کے ساتھ مقید بھی آیا ہے اور کچھ حدیثوں سے صحت کے ساتھ جو معلوم ہوا ہے یہی ہے اور بعض حدیثوں میں دو مرتبہ بھی آیا ہے۔
اس روایت کا مطلب یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں کو سر کے اگلے حصے سے پچھلے حصے تک لے جائے پھر پچھلے سر سے اگلے حصہ تک واپس لائے۔ نیز ان حدیثوں کو ضعیف کا نام دیتے ہیں۔ لیکن تین مرتبہ مسح کرنے کے بارے میں کوئی صحیح حدیث مروی نہیں ہے مگر یہ کہ وضو فرمایا، ایک ایک بار اور دو دو بار اور تین تین بار، اور وضو دھونے اور مسح کرنے دونوں ہی کو شامل ہے۔

اور امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کا تین مرتبہ مسح کرنے کا قول، مسح کو دھونے پر دلیل و قیاس کرنے پر مبنی ہے۔ اور اس کا جواب یہ ہے کہ تین تین مرتبہ دھونا محتمل ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے اور عدم تکرار مسح میں جو حدیثیں ہیں وہ روایات صحیحہ سے مروی ہیں اور تین تین بار اعضائے مغسولہ کے ساتھ مخصوص ہے اور مسح کی بنیاد تخفیف پر ہے۔ لہٰذا دھونے پر مسح کا قیاس، قیاس مع الفارق ہے۔ کیونکہ تم دیکھتے ہو کہ مبالغہ اور کامل تر ہونے پر اسباغ ہے یعنی پانی بہانا ہے۔ شیخ ابن حجر شرح بخاری میں فرماتے ہیں کہ صحیحین کے اصول پر کسی سند میں مسح کی تعداد مذکور نہیں ہے اور اکثر علماء کا یہی مذہب ہے۔ مگر شافعی ہیں کہ وہ مسح میں تین بار کو مستحب جانتے ہیں۔

ابو داؤد میں کہا گیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حدیثیں جو صحاح میں ہیں وہ سب مسح کے ایک مرتبہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور ابو عبیدہ مبالغہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں سلف میں ایسے کسی ایک سے بھی واقف نہیں جس نے مسح میں تین بار کو مستحب رکھا ہو بجز ابراہیم تیمی کے۔ لیکن اس قول میں نظر و کلام ہے۔ اس لئے کہ ابن ابی شیبہ اور ابن المنذر حضرت انس اور عطاء وغیرہ رضی اللہ عنہم سے اسے نقل کر چکے ہیں۔ اور ابن خزیمہ وغیرہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حدیث میں تین بار کو صحیح ظاہر کر چکے ہیں۔(انتہیٰ)۔ جامع الاصول اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں مذکور ہے کہ مسح سر، تین مرتبہ کیا گیا۔ اور شیخ ابن الہمام، بیہقی سے نقل کر کے کہتے ہیں کہ بوجوہ غریبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے تکرار مسح روایت کیا گیا ہے۔ لیکن یہ احادیث صحیحہ کے مخالف ہونے کی بناء پر اہلِ علم کے نزدیک حجت نہیں ہے۔(انتہیٰ)۔

ترمذی میں وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: "ثُمَّ مَسَحَ عَلٰی رَاْسِهٖ ثَلٰثًا وَّمَسَحَ عَلٰی اُذُنَيْهِ ثَلٰثًا۔" پھر اپنے سر پر تین بار مسح فرمایا اور اپنے دونوں کانوں پر تین بار مسح کیا۔ اس ضمن میں جو کچھ مذکور ہے اگر صحت کو پہنچ جائے تو ایک پانی کے ساتھ تکرار پر محمول ہے نہ کہ جدا جدا پانی کے ساتھ (کما قال فی الہدایہ)

مسح گوش: اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ظاہر و باطن گوشہائے مبارک کا مسح کرتے مطلب یہ کہ کان کے بیرونی حصے کا بھی مسح کرتے اور اندرونی حصے کا بھی مسح کرتے اور کان کے سوراخ میں انگلیوں کے سرے کو داخل کر کے مسح ہوتا اور کان کا مسح، تینوں اماموں کے نزدیک جدید پانی سے ہے اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک بروایت از امام احمد رحمہ اللہ بقیہ آب سر سے ہے۔ اور اکثر حدیثوں میں سر اور کانوں کا مسح، بغیر آب جدید کے بیان کے آیا ہے اور ان کا ظاہر سیاق، آب سر سے اس کے مسح کرنے میں ہے لیکن یہ جو روایت کیا گیا ہے کہ کانوں کے مسح کیلئے جدید پانی لیا تو یہ اس پر محمول ہے کہ پورے سر کا مسح کرنے کے بعد ہاتھوں میں تری نہ

رہی ہوگی۔ یہ حدیثوں کے درمیان تطبیق کی بنا پر ہے۔ غرضیکہ آب سر سے کانوں کا مسح کرنا تو یہ اکثر و مشہور ہے اور بکثرت صحابہ عظام سے بطرق کثیرہ مروی ہے جیسا کہ شیخ ابن الہمام نے فرمایا۔

پاؤں کا دھونا۔ اب رہا وضو میں پاؤں کے دھونے کا مسئلہ، تو اکثر روایتیں بغیر ذکر تعداد کے مطلق، مروی ہیں۔ اب اس کا ملنا اور پاک و صاف کرنا، تو اس بارے میں بعض حضرات تین بار دھونے کے قائل نہیں ہیں جیسا کہ شرح ابن الہمام میں ہے اور نسائی کی ایک روایت میں ہے کہ دونوں پاؤں کو دو مرتبہ دھویا اور بعض روایتوں میں تین بار بھی آیا ہے اور بعض روایتوں میں پہلے دائیں پاؤں کو تین مرتبہ پھر بائیں پاؤں کو تین مرتبہ آیا ہے ظاہر ہے کہ یہ کسی خاص وقت اور خاص طریقہ سے واقع ہوا ہوگا۔ (واللہ اعلم)

داڑھی میں خلال کرنا۔ داڑھی کے خلال کرنے میں حضرت عثمان اور حضرت عمار رضی اللہ عنہما سے حدیث مروی ہے اور محدثین کو ان کی صحت و ثبوت میں اختلاف ہے مگر ترجیح جانب ثبوت میں ہے اور یہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک سنت ہے اور امام احمد کے نزدیک مذہب معروف کی بنا پر بھی ہے۔ اور بعض ائمہ مذاہب کے نزدیک یہ واجب بر بنائے حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم جب وضو فرماتے تو ہاتھ میں پانی لے کر انگلیوں کے گھائیوں میں داخل کرتے پھر اپنی داڑھی شریف کا خلال فرماتے اور فرماتے کہ "میرے رب نے مجھے اسکا حکم دیا ہے۔

خلال کرنے کی کیفیت یہ ہے کہ اپنی انگلیوں کو داڑھی کے نچلے حصہ سے اوپر کی جانب داخل کرتے ایسا ہی شمنی نے کہا ہے اور ظاہر حدیث یہ ہے کہ جدید پانی سے ہو۔ اور بعض کہتے ہیں کہ چہرے کے پانی کے ساتھ ہے۔ خلال چہرے کو دھوتے وقت کرنا چاہئے لیکن امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو چہرے کے دھوتے وقت خلال کرے اور چاہے تو سر کے مسح کے وقت خلال کرے اور ابو داؤد کے نزدیک، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب وضو فرماتے تو اپنے دونوں رخساروں کو ملتے پھر اپنی انگشتہائے مبارک داڑھی شریف کے نیچے حصہ سے داخل فرماتے۔

ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کا خلال: لیکن ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کا خلال کبھی کبھی کرتے جیسا کہ سفر السعادات میں ہے اور یہ بھی امام اعظم ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک سنت ہے۔ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک صرف پاؤں کی انگلیوں کا خلال سنت ہے اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے خلال میں دو روایتیں ہیں زیادہ مشہور سنت ہیں۔ اور ایک روایت کے بموجب نہیں ہیں۔ اس لئے کہ ان کا کھلا ہونا خلال سے بے نیاز ہے اور امام مالک رحمہ اللہ پاؤں کی انگلیوں میں خلال کرنے کو مخصوص رکھتے ہیں اور وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر اسے ترک کر دے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن خلال کرنا نفس کی پاکی کیلئے ہے۔ اور پاؤں کی انگلیوں کا خلال چھنگلیوں سے کرے اور کہتے ہیں کہ یہ اس لئے ہے کہ اصاغر کے ساتھ خدمت شروع کرنا زیادہ مناسب ہے اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ بائیں ہاتھ کی چھنگلیہ سے، داہنے پاؤں کی چھنگلیہ سے خلال شروع کرے اور بائیں پاؤں کی چھنگلیہ پر ختم کرے اور یہ داہنے جانب سے شروع کرنے کی رعایت سے ہے اور ہاتھوں کی انگلیوں میں خلال کرنا اس طرح ہے کہ ہر ایک انگلی دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل کرے اور شیخ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں میں اس کیفیت کے ساتھ عمل کرنے کی تعلیم دینے کی حقیقت معلوم نہیں ہے۔

انگوٹھی کو حرکت دینا۔ اب رہا انگلی میں انگوٹھی کو حرکت دینا، تو یہ ایک ضعیف حدیث میں آیا ہے اور مذہب حنفی میں اسے بھی وضو کے مستحبات و سنن میں شمار کیا ہے اور ابن الہمام "زاد الفقہ" میں فرماتے ہیں کہ انگشتری کا حرکت دینا اگر کھلی اور فراخ ہو تو سنت ہے اور اگر تنگ ہو اور اس کے نیچے پانی نہ پہنچے تو اس کا گھمانا اور حرکت دینا واجب ہے۔

گردن کا مسح: گردن کا مسح کرنے میں ایک حدیث ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص سر کے مسح کے ساتھ گردن پر مسح کرے، حق تعالیٰ روزِ قیامت اس کی گردن کو طوق سے محفوظ رکھے گا، اس حدیث کو مسند الفردوس میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا ہے ایک اور روایت بھی ہے جسے شمنی نے بیان کیا ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے اور یہ مذہب حنفی میں مستحب ہے۔ اور بعض شوافع نے بھی ایسا ہی اختیار کیا ہے اور شیخ ابن الہمام اس کے استحباب کے اثبات کیلئے ترمذی میں وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی لائے ہیں کہ: "مَسَحَ عَلٰی رَأْسِهٖ ثَلٰثًا وَّمَسَحَ اُذُنَيْهِ ثَلٰثًا وَّظَاهِرَ رَقَبَتِهٖ۔" اور ایک اور حدیث کعب بن عمر یمامی سے بروایت ابو داؤد ہے کہ "اَنَّهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَسَحَ رَقَبَتَهٗ مَعَ الرَّأْسِ۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سر کے ساتھ گردن کا بھی مسح فرمایا اور ابن الہمام نے فرمایا کہ بعضوں کے نزدیک بدعت ہے اور ہدایہ میں اسے سنن و مستحبات میں ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن حلقوم کا مسح بالاتفاق بدعت ہے اور وضو میں پانی بہانا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست اقدس پر سفر و حضر میں ثابت شدہ ہے اور اس باب میں احادیث صحیحہ مروی ہیں یہ اس پر دلیل ہے کہ وضو میں دوسرے شخص سے اپنے ہاتھ پر پانی ڈالنے میں مدد لینا بے کراہت جائز ہے اور دوسرے سے پانی منگوانا تو بطریق اولیٰ جائز ہو گا لیکن اس سے ہمیشہ ہی دوسرے سے مدد لینا لازم نہیں آتا اور یہ جو بعض لوگ کرتے ہیں کہ پاؤں دھوتے وقت اپنے ہاتھ میں دوسرے سے برتن لے لیتے ہیں اس کی کوئی اصل نہیں ہے مگر یہ کہ اگر اس بات کا لحاظ رکھنا مقصود ہو کہ دوسرے سے زیادہ پانی نہ بہہ جائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی رومال نہ تھا جس سے وضو کے بعد اعضاء کو خشک کیا جاتا ہے۔ بلکہ اعضاء کو اپنے حال پر خشک ہونے کیلئے چھوڑ دیتے۔ البتہ کپڑے کے کنارے سے چہرۂ مبارک کا مسح کرنا بھی آیا ہے۔

فائدہ۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بدن مبارک کو خشک کرنے کیلئے رومال تھا جس سے وضو کرنے کے بعد پانی کو خشک فرماتے تھے لیکن یہ ضعیف ہے اور بعضوں نے کہا کہ یہ حدیث اور کپڑے کے کنارہ سے چہرہ انور خشک کرنے کی حدیث دونوں ضعیف ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ دونوں حدیثیں جامع ترمذی میں مذکور ہیں اور وہ بھی ضعیف قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس ضمن میں کوئی چیز صحت کو نہیں پہنچی ہے اور صحابہ و تابعین اور اہلِ علم کی ایک جماعت فرماتی ہے کہ اس باب میں رخصت دی گئی ہے اور بعض مکروہ جانتے ہیں اور وہ اعضاء کو خشک ہونے کیلئے اپنے حال پر چھوڑتے ہیں۔ کیونکہ یہ نورانیت اور میزان عمل کو بھاری کرنے کا موجب ہے۔ اور یہ قول سعید بن المسیب اور زہری سے روایت کیا گیا ہے اور کتب حنفیہ میں مذکور ہے کہ اگر تنزہ اور تکبر کا قصد نہ ہو تو کراہیت نہیں ہے اور بعض شروح و مشکوٰۃ میں ازہار سے منقول ہے کہ کپڑے وغیرہ سے خشک نہ کرنا مستحب ہے اس لئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا اور اگر خشک کرے تو قول اصح پر مکروہ بھی نہیں ہے اور بعض کے نزدیک مکروہ ہے۔

اذکارِ وضو۔ اور وہ حدیثیں جو اذکارِ وضو میں وارد ہیں۔ ان میں سے کچھ بھی درجۂ صحت تک نہیں پہنچی ہیں بلکہ محدثین ان کے موضوع ہونے کا حکم دیتے ہیں۔ لیکن جس قدر صحیح ہیں وہ یہ ہیں کہ ابتدائے وضو میں بسم اللہ کہنا چاہئے اور سلف سے یہ قول منقول ہے کہ "بِسْمِ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی دِيْنِ الْاِسْلَامِ۔" اور شیخ ابن الہمام دونوں کلمۂ شہادت کو ہر عضو کے دھوتے وقت مستحبات میں سے شمار کرتے ہیں اور بعض علماء ہر عضو کو دھوتے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کو مستحب قرار دیتے ہیں اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک ان کے مقلدین کی جماعت کے اختیار کر لینے کے بموجب ابتدائے وضو میں تسمیہ واجب ہے اور صحت وضو کی شرط ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (لَا صَلٰوةَ لِمَنْ لَّا وُضُوْءَ لَهٗ وَلَا وُضُوْءَ لِمَنْ لَّمْ يُسَمِّ" (رواہ احمد ابو داؤد) "وَالْحَاكِمُ

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَۃَ ۔ " جس کا وضو نہیں اس کی نماز نہیں اور جس نے بسم اللہ نہ کہا اس کا وضو نہیں ۔ اور وضو کے آخر میں کہے کہ : "اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ۔" صحیح حدیث میں ہے کہ جس نے وضو کے بعد اس کلمہ کو کہا اس پر جنت کے آٹھوں دروازے کھل جائیں گے اور کہا جائے گا کہ جس دروازے سے چاہے داخل ہو جا، اور بعض حدیثوں میں دونوں کلمات شہادت کے بعد "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِیْنَ" بھی آیا ہے اور بعض میں "سُبْحَانَکَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِکَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ ۔" آیا ہے اور حدیث میں آیا ہے کہ اسے ایک کاغذ کے پرزے پر لکھا جائے گا اور اس پر مہر کر دیا جائے گا پھر وہ روز قیامت سے پہلے کبھی نہ کھولا جائے گا۔ لیکن سورہ اِنَّا اَنْزَلْنَا ۔ کا پڑھنا جیسا کہ لوگوں میں مشہور ہے "سنن المہدیٰ" میں اس کیلئے اثر ضعیف نقل کیا گیا اور ثابت شدہ نہیں کہا گیا ہے۔ (واللہ اعلم)

فائدہ: ۔ شیخ ابن الہمام شرح ہدایہ میں مستحبات وضو کو جمع کر کے لکھتے ہیں کہ پانی میں ترکِ اسراف، اور اس میں کمی ترکِ کلام ناس، دوسرے سے مدد لینا، موضع استنجا کو کپڑے سے پونچھنا، وضو کے پانی میں اپنی پھونک نہ مارنا، استنجے کے بعد ستر کو ڈھانپنے میں جلدی کرنا، استنجے کی حالت میں اس انگشتری کو اتارنا جس میں نام خدا عزاسمہ یا نام رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہو، مٹی کا لوٹا ہونا، لوٹے کو بائیں جانب رکھنا، اگر ایسا برتن ہو جو ڈھکا ہو تو اسے داہنی جانب رکھنا۔ دھوتے وقت لوٹے کے دستہ پر ہاتھ رکھنا نہ کہ لوٹے کے منہ پر، وقت سے پہلے وضو کر لینا، ہر عضو کے دھوتے وقت ذکر شہادتین کرنا، وضو میں قبلہ رو بیٹھنا، تمام افعال میں بے فکر نہ ہونا، آنکھ کے سلوٹوں سے باخبر ہونا، ان کا مسح کرنا، ان کا دھونا، ان سے غافل نہ ہونا، انگشتری کے نیچے کی جگہ کا خیال رکھنا، ہر عضو کے وقت دعا پڑھنا، پانی کا چہرے پر زور سے نہ مارنا، دھوئے ہوئے عضو پر ہاتھ پھیرنا، اعضاء کے دھونے میں اطمینان و سکون برتنا، اعضا کو ہاتھ سے ملنا، خصوصاً سردی کے موسم میں، چہرے کے حدود، دونوں ہاتھوں اور پاؤں کے حدود سے تجاوز کرنا، ان کے دھونے میں خوب یقین کرنا، طویل غرارہ کرنا، اس دعا کا پڑھنا کہ۔

سُبْحَانَکَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِکَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِیْنَ۔

کھڑے ہو کر قبلہ رو ہو کر وضو کا بچا ہوا پانی پینا، اگر بیٹھ کر پیے تو بھی جائز ہے، وضو کے بعد دو رکعت پڑھنا، آئندہ نماز کی تیاری کیلئے برتن میں پانی بھر کر رکھنا، قطروں سے کپڑوں کو بچانا، ناک میں پانی ڈالتے وقت ناک کو بائیں ہاتھ سے صاف کرنا۔ کیونکہ داہنے ہاتھ سے ناک صاف کرنا مکروہ ہے۔ یہ سب آداب وضو میں سے ہیں، ایسے ہی پانی میں تھوکنا مکروہ ہے۔ اور اعضاء کو تین بار سے زیادہ دھونا اور دھوپ میں گرم شدہ پانی سے وضو کرنا مکروہ ہے اور اگر کسی عضو میں شک کرے تو فارغ ہونے سے پہلے اس شک کا ازالہ کرے اور اگر پہلے ہی شک نہیں تو نہیں اور اگر وضو کے بعد شک کیا تو مطلقاً اعادہ نہ کرے۔

موزوں پر مسح کرنا۔ وصل: ۔ جاننا چاہئے کہ ائمہ حدیث کی کتابوں میں خصوصاً صحاح ستہ وغیرہ میں بروایت متعددہ و طرق مختلفہ مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سفر و حضر میں موزہ پر مسح کرتے تھے اور حفاظ حدیث کی ایک جماعت نے تصریح کی ہے کہ موزوں پر مسح کرنے کی حدیث تواتر کے ساتھ ثابت ہوئی ہے جس میں شک و شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور بعض علماء نے اس کے راویوں کو جمع کیا ہے جو اسّی سے متجاوز ہیں اور ان میں عشرہ مبشرہ بھی داخل ہیں۔ اور سلف کے تمام لوگ اس کے قائل ہیں مگر امام مالک رحمہ اللہ کی منقولہ ایک روایت کے بموجب وہ مقیم کیلئے اس کے قائل نہیں۔ حالانکہ اس میں روایت صحیحہ مطلقاً اس کے جواز کی صراحت کر رہی ہیں اور مالکیوں کے نزدیک مشہور و مسلم دو قول ہیں ایک قول مطلقاً جواز کا اور دوسرا قول مسافر کیلئے نہ کہ مقیم کیلئے۔

جو کچھ مدوّن شدہ ہے اس کا مقتضا یہی ہے اور اسی پر ابن حاجب نے جزم ویقین کیا ہے۔ اور بعض علماء کہتے ہیں کہ حالت اقامت میں موزہ پر مسح کرنے میں امام مالک کا توقف خاص اپنی ذات کیلئے ہے۔ ورنہ ان کا فتویٰ اس کے جواز پر تھا اسی کی مانند ابو ایوب انصاری صحابی سے منقول ہے۔ بظاہر ان کی مراد یہ ہے کہ وہ حالتِ اقامت میں مسح نہیں کرتے تھے۔ اور مشقت کے نہ پائے جانے کی بنا پر، عزیمت کو اس حال میں اختیار فرماتے تھے نہ یہ کہ وہ اس کے جواز کے ہی قائل نہ تھے۔ (واللہ اعلم)

سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے علماء روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا میں نے اس وقت تک موزوں پر مسح کرنے کا حکم نہیں دیا جب تک کہ میں نے روزِ روشن کی مانند اس میں آثار واخبار نہ دیکھ لیں۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام میں سینتیس صحابی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے موزوں پر مسح کرنے کی حدیث روایت کرتے ہیں۔ ایک روایت میں فرمایا کہ چالیس صحابی سے مرفوعاً حدیثیں مروی ہیں۔ لیکن آیۂ کریمہ میں وَاَرْجُلَکُمْ کی ایک قرأت لام کے زیر کے ساتھ ہے اور اسے مسح پر محمول کرتے ہیں اور لام کے زبر کے ساتھ دھونے پر محمول کرتے ہیں یہ تاویل ضعف سے خالی نہیں۔ اس لئے کہ موزوں پر مسح کعبین یعنی ٹخنوں کے ساتھ باتفاق مغیّاً نہیں ہے۔

امام حسن بصری فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ستر صحابہ کرام نے مجھ سے موزوں پر مسح کرنے کی حدیث روایت کی ہے اور ہدایہ میں ہے کہ مسح خفین میں احادیث واخبار مستفیض ومشہور ہیں۔ اور جو اس پر عقیدہ نہ رکھے وہ بدعتی ہے اور امام کرخی فرماتے ہیں کہ میں اس کے کفر سے ڈرتا ہوں جو مسح خفین پر اعتقاد نہ رکھے امام اعظم سے بھی اسی کے مثل مروی ہے اور اہلِ سنت و جماعت کے عقائد میں ہے کہ: "وَتَرَی الْمَسْحَ عَلَی الْخُفَّیْنِ۔" (موزوں پر مسح کا اعتقاد رکھو) اور مسح خفین کو علامات اہلِ سنت و جماعت میں سے جانتے ہیں۔

مدتِ مسح خفین: صحیح حدیثوں میں ثابت ہوا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سفر وحضر میں موزہ پر مسح کرتے تھے۔ حضر یعنی حالت اقامت کی مدت شبانہ روز اور سفر کی حالت میں مدت تین شبانہ روز ہے جیسا کہ مسلم میں سیدنا علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ سے ان لفظوں کے ساتھ حدیث مروی ہے کہ: "جَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْمَسْحَ عَلَی الْخُفَّیْنِ ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ وَلَیَالِیْھِنَّ لِلْمُسَافِرِ وَیَوْمًا وَلَیْلَۃً لِلْمُقِیْمِ ۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موزوں پر مسح کی مدت مسافر کیلئے تین شبانہ روز اور مقیم کیلئے ایک شبانہ روز مقرر فرمائی ہے۔ اور موزہ پر مسح، اس کے ظاہر پر یعنی پاؤں کی پشت پر کیا جیسا کہ احادیث صحیحہ میں وارد ہے اور سنن ابو داؤد میں سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے بطرق متعددہ مروی ہے کہ فرمایا اگر دین کا کاروبار عقل کے حکم پر ہوتا تو پاؤں کے اوپر کے حصہ پر مسح کرنے کی بجائے نچلے حصہ پر مسح ہوتا لیکن بلاشبہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ نے ظاہر موزہ پر مسح فرمایا۔

صاحب سفر السعادۃ کہتے ہیں کہ موزہ کے نچلے حصہ میں مسح کرنا ایک ضعیف روایت میں آیا ہے چنانچہ ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غزوۂ تبوک میں وضو کرا رہے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے موزے کے اوپر اور نچلے حصے میں مسح فرمایا یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ اور اکثر طرق میں مغیرہ رضی اللہ عنہ سے مطلق واقع ہوا ہے یعنی بغیر ذکر اوپر اور نیچے کے حصے کے موزہ پر مسح فرمانا اور ترمذی کی بعض سندوں میں اور ابو داؤد واحمد میں دونوں کے ظاہر پر بھی آیا ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمتہ اللہ کے نزدیک مسح ظاہر موزہ پر ہے اور امام احمد رحمتہ اللہ کے مذہب میں بھی یہی ہے اور امام شافعی وامام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک ظاہر موزہ پر فرض اور نچلے حصے پر سنت ہے۔

جاننا چاہئے کہ مسح افضل ہے یا پاؤں کا دھونا۔ ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ دھونا افضل ہے۔ اس لئے کہ دھونا عزیمت ہے

اور مسح رخصت۔ اور عزیمت پر عمل کرنا رخصت پر عمل کرنے سے افضل ہے۔ لہٰذا اگر پاؤں سے موزہ اتار کر دھوئیں تو افضل ہے اور اس پر اجر و ثواب ہے صاحب ہدایہ کے نزدیک بھی یہی مختار ہے۔ اور ایک جماعت کہتی ہے کہ اظہارِ سنت اور رد اہل بدعت جو اس کے منکر ہیں جیسے خوارج و روافض وغیرہ کی بنا پر مسح افضل ہے اور اس جماعت کے نزدیک اگر پاؤں کھلے ہوں تو موزہ پہنیں اور مسح کریں اور صواب یہ ہے کہ مسح کرنا اور دھونا دونوں مشروع اور برابر ہیں اور کوئی ایک دوسرے سے افضل و ارجح نہیں ہے۔ صاحب سفر السعادۃ کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے موزوں پر مسح کرنے اور پائے اقدس کو دھونے میں کوئی زحمت نہ تھی۔ بلکہ اگر وضو کرتے وقت پائے اقدس مکشوف ہوتے تو دھوتے تھے اور مسح کرنے کیلئے موزہ نہ پہنتے تھے۔ اور اگر موزہ پہنے ہوئے ہوتے تو مسح کرتے اور موزہ نہ اتارتے اور فرمایا کہ احسن اقوال یہی ہے کیونکہ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ کریمہ کے موافق ہے۔

تیمم: وصل: - تیمم، کتاب و سنت اور اجماع امت سے ثابت ہے اور یہ اس امت کی خصوصیات میں سے ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس زمین پر چاہتے نماز ادا کرتے تھے۔ خواہ پتھر ہو یا مٹی یا ریت، تیمم کرتے اور مٹی اور ریت وغیرہ میں فرق و امتیاز نہ فرماتے اور امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ، تیمم کو مٹی کے ساتھ مخصوص رکھتے ہیں اور اس کے سواسے درست نہیں جانتے۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ مٹی اور ریت کے سوا درست نہیں ہے امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ مٹی، ریت، پتھر اور ہر وہ چیز جو جنس ارض سے ہو اس پر تیمم جائز ہے۔ جنس ارض سے ان کی مراد یہ ہے کہ آگ سے پکائی نہ گئی ہو اور اسے خاکستر نہ بنایا گیا ہو اور وہ پتھر جس پر قطعاً گرد و غبار نہ ہو، امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک تیمم درست ہے اور ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ارض آیا ہے اور حضرت حذیفہ کی حدیث میں تربت، تراب یعنی مٹی آیا ہے۔ ہمارے نزدیک تیمم کا حکم، وضو کی مانند ہے اور ایک تیمم سے چند نمازیں ادا کی جاسکتی ہیں جس طرح کہ وضو سے ہوتی ہیں۔ کتاب و سنت کا ظاہر اسی کے موافق ہے اور امام شافعی کے نزدیک تیمم، ایک ضروری طہارت ہے جو دفع حرج کیلئے ہے جس طرح عذر والے کیلئے طہارت ہوتی ہے۔

صاحب سفر السعادۃ فرماتے ہیں کہ کسی حدیث صحیح میں میں ایسا نہیں پاتا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ایک فریضہ کی ادائیگی کیلئے جدید تیمم کیا ہو۔

تیمم کی مشروعیت کی ابتدا یہ ہے کہ ایک غزوہ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار گم ہو گیا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس کی تلاش کیلئے مقرر فرما کر قیام فرمالیا۔ اس وقت نماز کا وقت آگیا اور صحابہ کے پاس پانی نہ تھا کہ جس سے وہ وضو کر سکتے۔ اس وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی صاحبزادی، زوجہ رسول سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر اظہار ناراضگی کیا کہ تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو روک رکھا ہے اور مسلمان پانی کے بغیر ہیں اس وقت تیمم کی آیت نازل ہوئی اور اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے کہا "اے ابو بکر رضی اللہ عنہ! تمہاری بدولت مسلمانوں پر کیسی کیسی برکتیں نازل ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی برکتیں نازل فرمائے اے عائشہ! میں نہیں دیکھتا کہ کوئی معاملہ تمہاری طرف سے ایسا در پیش ہو جو اگرچہ بظاہر ناگوار و مکروہ معلوم ہوتا ہو مگر یہ کہ حق تعالیٰ اس میں مسلمانوں کیلئے فراخی اور کشادگی فرمادیتا ہے۔ پھر کچھ دیر کے بعد ان کا ہار کجاوے کے نیچے سے مل گیا اور حکمت الٰہی نے اس کا اقتضاء کیا کہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اسے پوشیدہ فرمادیا۔

تیمم کی کیفیت میں اختلاف ہے کیونکہ تیمم کی دو ضربیں ہیں یعنی دو مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنا۔ ایک بار چہرے کیلئے اور ایک بار کہنیوں تک دونوں ہاتھوں کیلئے۔ یہ امام اعظم ابو حنیفہ اور امام مالک و امام شافعی اور بعض اصحاب امام احمد رحمہم اللہ کا مذہب ہے اور علی مرتضیٰ، ابن عمر، حسن بصری، شعبی، سالم بن عبداللہ بن عمر اور ابو سفیان ثوری رضی اللہ عنہم کا قول اور بعض کا مذہب یہ ہے کہ

تیمم ایک مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنا اور چہرے پر اور دونوں ہاتھ پر ملنا ہے۔ اور بعض روایتوں میں ہاتھوں پر چہرے کے ذکر کی تقدیم کی ہے اور بعض میں اس کے برعکس۔ اور بعض میں ہاتھوں کی تقدیم چہرے پر ہے اور یہ مذہب مشہور امام احمد کا اور امام شافعی کا قدیم قول ہے مگر محفوظ و مختار ان کے مذہب میں پہلا ہی ہے۔ یہ مکحول، اوزاعی، اسحاق، ابن جریر، ابن المنذر اور ابن خزیمہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے اور امام مالک اور محدثین سے منقول مذہب ثانی کے ترجیح میں اصرار ہے۔ اور شیخ ابن حجر صحیح بخاری میں اس مذہب کی حدیثوں کو ترجیح ظاہر کرتے ہیں اور بعض مذہب اول کی حدیثوں کی وہ تضعیف دکھاتے ہیں مگر حق یہی ہے کہ تیمم کی حدیث دو ضربوں ہی کی صحیح ہے۔ ایک ضربہ چہرے کیلئے اور دوسرا ضربہ کہنیوں تک دونوں ہاتھوں کیلئے۔ اس مقام میں کلام بہت ہے جو شرح سفر السعادۃ میں مذکور ہے۔ غرض کہ احتیاط مذہب اول ہی میں ہے۔

بیان غسل شریف: ۔ وصل: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل یعنی نہانے کے بیان میں ہے۔ غسل غین کے زبر سے بمعنی دھونا اور غین کے پیش اور سین کے سکون سے غسل کا نام ہے اور غین کے زیر سے وہ چیز جس سے سر دھویا جائے جیسے گل خطمی وغیرہ۔ اغسال کے معنی نہلانے کے ہیں اور غسول بفتح غین، نہانے والے کے غسل کا پانی ہے۔ اسی طرح جائے غسل کو مغسل بکسر سین جہاں مردے کو نہلایا جائے اور غسالہ اس پانی کو کہتے ہیں جس سے ہاتھ منہ دھویا گیا ہو۔ یعنی آبِ مستعمل، جس سے غسل کیا گیا ہو اور بدن دھویا گیا ہو، یہ اس لفظ کے لغوی معانی ہیں۔ اور شریعت میں حقیقتِ اغتسال، تمام اعضاء کو دھونا اور ان پر پانی بہانا ہے۔ اور ہاتھ سے جسم کو ملنے کے وجوب میں اختلاف کیا گیا ہے۔ اکثر علماء کے نزدیک ہاتھ سے ملنا واجب نہیں ہے اور ہمارے مذہب میں بھی یہی ہے۔ اور امام مالک اور شوافع میں سے مزنی سے اس کا وجوب نقل کیا گیا ہے۔ اور دو جماع کے درمیان غسل کے عدمِ وجوب پر اجماع کیا گیا ہے لیکن وضو مستحب ہے لیکن امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک مستحب نہیں ہے اور اصحاب ظواہر اس بنیاد پر واجب قرار دیتے ہیں کہ حدیث میں آیا ہے کہ اِذَا اَتٰی اَحَدُکُمْ اَھْلَہٗ ثُمَّ اَرَادَ اَنْ یَّعُوْدَ فَلْیَتَوَضَّأْ بَیْنَھُمَا وُضُوْءً یعنی جب تم میں سے کوئی اپنی بی بی کے پاس آئے اور پھر دوبارہ آنا چاہے تو درمیان میں وضو کرے۔ بعض اس وضو کو لغوی معنی پر محمول کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے مراد، شرمگاہوں کا دھونا ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی غسل کے ساتھ کبھی اپنی ازواج پر دورہ فرماتے اور کبھی جدا جدا غسل سے۔ اور فرماتے ھٰذَا اَزْکٰی وَاَطْیَبُ وَاَطْھَرُ۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب جنبی ہوتے اور خواب استراحت فرمانے کا ارادہ کرتے تو وضوء نماز کی مانند وضو کرتے اور خواب فرماتے۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ یہ نیند کی طہارت ہے اس شخص کیلئے جو جنبی ہو اور سونے کا ارادہ کرے تو وہ وضو کر کے طہارت کے ساتھ نیند میں جائے۔ (انتہی)۔ اور بعض تیمم کو بھی وضو کا قائم مقام رکھتے ہیں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک حدیث بھی روایت کرتے ہیں۔ (واللہ اعلم)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غسل سے پہلے، شروع میں وضو کرتے اور اس میں سر کے مسح کے بارے میں دو روایتیں ہیں لیکن افضل یہی ہے کہ وضو کامل کرے۔ جیسا کہ غیر حالت غسل میں کیا جاتا ہے اور امام مالک کے نزدیک غسل کے وضو میں مسح نہ کرے۔ بلکہ اس میں سر کا غسل کافی ہے اور دونوں پاؤں پہلے دھولے اور اس کی تاخیر میں بھی دو روایتیں ہیں اکثر کے نزدیک یہی ہے کہ تاخیر کرے اور بعض روایتوں میں آیا ہے کہ تقدیم کرے اور علماء فرماتے ہیں کہ یہ تاخیر اس صورت میں ہو جب کہ غسل کی جگہ پاک وصاف نہ ہو اور تقدیم فرمانا، لطافت اور آپ کی عادتِ شریفہ کی تقدیر پر تھی کہ وضو کے بعد انگلیوں میں پانی ڈالتے اور اس سے بالوں کی جڑوں میں خلال کرتے اس کے بعد چار پانی دونوں ہاتھوں پر ڈالتے اس کے بعد تمام بدن پر پانی بہاتے تھے۔ بالوں کی جڑوں میں

خلال کرنے سے مراد، سر کے بال ہیں جیساکہ حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے اور بعض داڑھی کے بال بھی مراد لیتے ہیں۔ یا اس بنا پر کہ "بالوں کی جڑیں مطلق آیا ہے، اس سے داڑھی اور سر کے بال دونوں قیاس کرتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ داڑھی میں خلال کرنا واجب نہیں ہے مگر یہ کہ بالوں میں کوئی چیز ملی ہو جو کہ بالوں کی جڑوں میں پانی پہنچنے میں مانع آتی ہو۔

غسل کے بعد وضو کرنا کوئی چیز نہیں ہے بلکہ خلافِ سنت ہے۔ اور کاتب الحروف یعنی صاحب مدارج النبوۃ، کبھی اعضا کے دھونے میں شرمگاہ کے چھو جانے کی وجہ سے امام شافعی کے مذہب کی رعایت پر احتیاطاً بعد غسل وضو کر لیتا ہے۔ اگر یہ احتمال نہ ہو تو کوئی حاجت نہیں ہے۔

غسل کے بعد رومال و تولیہ وغیرہ سے بدن کو خشک کرنے میں اختلاف ہے اور حدیث میمونہ میں مروی ہے کہ سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غسل فرمانے کے بعد رومال پیش کرتیں تاکہ اس سے بدن مبارک خشک فرمالیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم رومال نہ لیتے۔ اس سے خشک کرنے کی کراہت لازم نہیں آتی کیونکہ ممکن ہے کہ رومال نہ لینا کسی اور وجہ سے ہو۔ جو کپڑے سے متعلق ہے مثلاً وہ ریشم کا ہو یا میلا ہو یا تواضع فرمائی ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ گرمیوں میں مکروہ ہے اور سردیوں میں مباح ہے۔ اور ہاتھ سے پانی نچوڑنا مکروہ نہیں ہے اس کی مکمل بحث وضو کے ضمن میں بھی گزر چکی ہے۔

نوعِ دوم، در نماز حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

جاننا چاہیے کہ نماز، تمام عبادتوں میں افضل و اشرف اور اتم و اکمل عبادات ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ" نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک رکھی گئی ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خانہ دل میں جو خوشی و مسرت اور آنکھوں کی روشنی اور خوش دلی نماز میں رکھتے اور جو ذوق و مشاہدہ اس وقت میں پاتے وہ کسی عبادت اور کسی وقت میں نہ پاتے اور "قرۃ العین" مقصود اور غیب سے نور پانے میں فرحت و سرور سے کنایہ ہے۔ قرۃ، قر بفتح قاف سے بنا ہے جس کے معنی قرار و ثبات کے ہیں۔ اس لئے کہ نظارہ محبوب ہے آنکھ کو جتنا قرار و سکون ملتا ہے کسی اور چیز سے حاصل نہیں ہوتا۔ اور حالت سرور و خوش حالی میں اپنی جگہ ساکن رہتی ہے۔ اور غیر محبوب پر نظر ڈالنے سے نظر پراگندہ اور متلاشی محبوب رہتی ہے اور حزن و خوف کی حالت میں لرزاں و سرگرداں ہوتی ہے: "تدور اعینهم کالذی یغشی علیه من الموت" یعنی ان کی آنکھیں بھٹکتی ہیں گویا کہ اس شخص کی طرح جس پر موت کا غلبہ ہے۔ اس مفہوم کی دلیل ہے "یا" قر بضم قاف سے بنا ہے جس کے معنی ٹھنڈک کے ہیں اور محبّ کی لغت میں آنکھوں کی ٹھنڈک، محبوب کے مشاہدہ سے ہوتی ہے اور اعداء کے دیکھنے میں گرمی و سوزش ہوتی ہے۔ اسی بنا پر فرزند کو قرۃ العین کہتے ہیں۔

علماء فرماتے ہیں کہ "اَلصَّلٰوةُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِ۔" (مومن کی معراج نماز ہے) اس جگہ مومن سے مراد سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک ہے اور ہر مومن کو آپ کے اتباع کے طفیل میں اس کے ایمان و یقین کے اندازہ کے مطابق اس مقام سے حصہ حاصل ہے اور التحیات کی مشروعیت میں اس مقام کے حصول کی طرف ایک اشارہ اور دلالت موجود ہے۔ اور نماز میں ظاہر و باطن اور قلب و جوارح سب کے سب بدرگاہِ قرب و عزت حق سبحانہ وتعالیٰ، متوجہ و مشغول ہیں۔ اور حق تبارک وتعالیٰ نے ہر نمازی کیلئے ایک رکعت میں وہ تمام عبادتیں جمع فرمادی ہیں جو تمام فرشتوں میں جدا جدا بنائی گئی ہیں۔ چنانچہ مروی ہے کہ حق تعالیٰ نے کچھ فرشتے ایسے پیدا فرمائے ہیں، جو ہمیشہ رکوع میں مشغول رہتے ہیں اور جب سے انہیں پیدا فرمایا گیا ہے وہ رکوع سے سر اٹھاتے ہی نہیں روزِ قیامت تک بلکہ ابد تک۔ اسی طرح سجود، قیام، قرأت اور قعود کی حالت ہے اور یہ سب نماز کی ایک رکعت میں جمع فرمائے ہیں اور یہ ایسا

مجموعہ عبادات ہے جو کسی اور عبادت میں جمع نہیں ہے۔ طہارت، صحت، استقبال قبلہ، استفتاح یعنی تکبیر تحریمہ، تکبیرات، قرأت، قیام، رکوع، سجود، تسبیح، دعا، توجہ حضور قلب، اور خشوع و خضوع وغیرہ ہر ایک ان میں سے مستقل عبادت ہے۔ اور کس خوبی سے ان سب کو ایک ہی طریقہ عبادت میں جمع فرمایا ہے اور اس جامعیت کے ساتھ یہ کتنی عجیب خوبی ہے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نماز کے مشابہ ہے جس کی حقیقت جمیع شیونات اور تمام برکات و کمالات کی جامع ہے اور اسی تعلق و مناسبت سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "قرۃ العین" فرمایا اور رب العزت جلّ وعلا نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: "اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ" (اے محبوب جو آپ پر کتاب کی وحی کی گئی ہے اسے پڑھئے اور نماز قائم کیجئے) اور فرمایا: "وَاْمُرْ اَھْلَکَ بِالصَّلٰوۃِ وَاصْطَبِرْ عَلَیْھَا ۔" (اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیجئے اور اس پر صبر چاہیں) اور ارشاد باری میں: "وَاصْطَبِرْ عَلَیْھَا ۔" میں اس پر ایک اشارہ ہے کہ نماز میں ایک ایسی تکلیف ہے، جو نفوس بشریہ پر شاق ہے۔ اس لئے کہ وہ بندوں کی لذتوں، شہوتوں اور مشغولیتوں کے وقتوں میں آتی ہے تو وہ ان تمام سے کنارہ کش ہو کر حق تعالٰی کی طلب میں آتا ہے۔ اور بارگاہ حق میں قیام کرتا ہے اور ماسوی اللہ سے فراغت حاصل کرتا ہے۔ اسی لئے حق تعالٰی نے فرمایا: "اِسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ" صبر و نماز سے استعانت کرو اور صبر و نماز ملا کر فرمانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ نماز کئی قسموں کے صبر کی متمنی ہے ایک اوقات نماز کی نگہداشت اور حفاظت پر صبر، ایک واجبات و مسنونات اور مستحبات پر صبر، ایک غفلتوں اور توجہات سے نماز میں دل کو باز رکھنے پر صبر ہے اسی بنا پر فرمایا: وَاِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ " بلاشبہ نماز بڑی عظیم شئی ہے مگر خشوع کرنے والوں پر آسان ہے۔

اور نماز کی فرضیت معراج شریف کی رات ہوئی۔ سب سے پہلے پچاس نمازوں کا حکم ہوا تھا اس کے بعد پچاس سے پانچ ہوئیں۔ فرمان باری ہوا یہ پانچ ہی پچاس کے حکم میں ہیں۔ کیونکہ میرے حکم میں تبدیلی نہیں ہوتی اور ان پانچ نمازوں کے اوقات کا تعین، سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج شریف سے واپسی کے بعد ہوا۔ مواہب میں محمد بن اسحاق سے منقول ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج کے بعد جب صبح فرمائی تو جبریل علیہ السلام نے آکر نماز پنج گانہ کے اوقات بتائے اور بعضوں کا خیال ہے کہ ہجرت کے بعد ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ہجرت سے پہلے جبریل علیہ السلام کے بیان کرنے سے ہے۔ اور ہجرت کے بعد خود حضور ﷺ نے ارشاد فرمائے بہر تقدیر جبریل علیہ السلام ظہر کے وقت میں دو دن برابر آئے اس پر حضور ﷺ نے اذان دینے کا حکم فرمایا کہ: "اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃٌ" پکاریں۔ پھر جب صحابہ جمع ہو گئے تو جبریل علیہ السلام نے ظہر کے شروع وقت میں امامت کی اور نماز ظہر ادا کرائی۔ وقت زوال کے فوراً بعد کا تھا اس کے بعد امامت کی اور نماز عصر ادا کی یہ وقت آدمی کی مثل سایہ ہو جانے کے بعد تھا۔ پھر مغرب ادا کی اور یہ وقت غروب آفتاب کے فوراً بعد تھا اور غروب شفق کے بعد عشاء کی نماز ادا کی۔ پھر نماز فجر ادا کی۔ جب کہ طلوع صبح صادق ہو چکی تھی۔ دوسرے دن جبریل علیہ السلام آئے امامت کی اور ظہر کی نماز ادا کی۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ سایہ ایک مثل کے قریب پہنچ گیا تھا اور نماز عصر ادا کی جب کہ سایہ دو مثل سے متجاوز ہو گیا تھا اور مغرب کی نماز ادا کی جب کہ آفتاب غروب ہو گیا تھا۔ نماز مغرب دونوں دن ایک وقت میں گزاری اور عشاء کی نماز تہائی رات یا نصف رات کے وقت گزاری۔

اس میں راوی کا شک ہے اور نماز فجر ادا کی جب کہ وقت دراز ہو چکا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ روشنی پھیلنے کے بعد (قبل طلوع آفتاب) ادا کی۔ اس کے بعد جبریل علیہ السلام نے کہا "اے حبیب خدا! یہ ان انبیاء کا وقت ہے جو آپ سے پہلے گزرے اور نماز کے اوقات ان دونوں وقتوں کے درمیان ہیں۔

مخفی نہ رہنا چاہئے کہ تعجیل صلوٰۃ کی فضیلت اور اس میں جلدی کرنے میں جبکہ وقت داخل ہو جائے۔ اور اس میں سستی نہ کرنی چاہئے اور اخیر وقت تک تاخیر کرنے میں کلام نہیں ہے لیکن یہ ان نمازوں کے سوا میں ہو گا۔ جن میں تاخیر مستحب ہے جیسے کہ اسفارِ فجر یعنی دن کے خوب روشن ہو جانے کے بعد اور ظہر کو ٹھنڈا کر کے اور تاخیرِ نماز عشاء وغیرہ میں تکمیل نماز اور تیمم ثواب کیلئے تاخیر ہے اور شوافع مطلقاً اول وقت میں نماز ادا کرتے ہیں اور تمام نمازوں میں اول اوقات ہی ان میں متعارف ہیں اور اسی کو وہ افضل جانتے ہیں۔ اور بغیر فرق و امتیاز کے کہ جن کی رعایت واجب ہے وہ سنت شمار کرتے ہیں۔ مثلاً گرمیوں میں ظہر کو ٹھنڈا کر کے پڑھنا کیونکہ حدیثوں میں اس کا حکم واقع ہوا ہے۔ اور اس میں تاکید و مبالغہ فرمایا گیا ہے مگر شوافع کے نزدیک رخصت ہے۔ اور بعض شوافع ٹھنڈا کرنے کو زوال آفتاب پر محمول کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ تاویل انتہائی بعید ہے۔ کیونکہ زوال بجائے خود اول وقت ہے البتہ ظہر کی فوقیت، ایک مثل کے پہنچنے تک احوط ہے۔ جیساکہ امامین کا مذہب ہے اور بعض کے نزدیک امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مفتیٰ بہ قول بھی یہی ہے اور عصر کو شوافع ایسے وقت میں نہیں گزارتے کہ چوتھائی دن باقی رہے۔ اسی طرح وہ اسفار کو طلوع فجر پر محمول کرتے ہیں اس میں بھی معقولیت نہیں ہے جیساکہ ظہر کے ٹھنڈا کرنے میں کہا گیا ہے اور کسی حد تک عشاء کی تاخیر میں مبالغہ وارد ہے کیونکہ وہ تعجیل کے بالکل قائل نہیں ہیں لیکن نماز مغرب میں اول وقت کی جلدی میں سب متفق ہیں اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے اور نماز عصر کو اس وقت تک کہ آفتاب بلند، روشن اور تاباں ہے ادا کرنا چاہئے نہ یہ کہ چوتھائی دن میں، کہ سایہ تین گنا ہو اور جن حدیثوں سے وہ تمسک کرتے ہیں اور اپنے مذہب پر استدلال کرتے ہیں وہ اس پر دلالت نہیں کرتیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عصر ادا فرمائی اور نماز پڑھنے کے بعد ایک شخص مدینہ سے چل کر اپنی منزل تک جائے جس کا مقام مدینہ کی آبادی کے آخری کنارے پر ہو اور آفتاب ہنوز اپنی تمازت میں باقی ہو۔ گویا یہ آفتاب کی حرارت، اس کی رنگت کی صفائی اور تغیر زردی سے کنایہ ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ وقت تین گنا سایہ ہو جانے پر نہیں ہوتا۔ یہ بات محل بحث ہے ایک اور حدیث میں بھی ایسا ہی مضمون آیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عصر ایسے وقت میں پڑھی کہ آفتاب بلند روشن تھا پھر جانے والا مدینہ کی آبادی کے آخری کنارہ تک گیا اور آفتاب بلند رہا۔ یعنی بالائے افق تھا اور غروب نہ ہوا تھا (فافہم)۔ بعض کے نزدیک مدینہ کی آبادی کے آخری کنارے کی مسافت چار میل یا اس کے قریب ہے اس حدیث میں پہلی حدیث کے مقابلے میں کسی قدر مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن یہ معلوم نہیں کہ مدینہ کے کون سے آخری کنارے تک گیا آیا چار میل کی مسافت پر یا اس سے کم کی مسافت پر، اور یہ کہ سوار گیا یا پیدل گیا۔ نیز آہستہ گیا یا تیز دوڑتا ہوا گیا اور وہ شخص قوی تھا یا کمزور تھا۔ تین چار میل، تین چار گھڑی میں بے تکلف جا سکتا ہے یا نہیں جیساکہ ان کے مذہب میں ہے کہ چوتھائی دن میں نماز گزاری اور سایہ تین گنا مثل ہوتا تھا ایک اور حدیث میں ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نمازِ عصر گزاری اور اس کے بعد اونٹ کو ذبح کیا اس کے ٹکڑے بنائے پھر اسے پکایا اور غروب آفتاب سے پہلے پکا ہوا گوشت ہم سب نے کھایا۔ اس حدیث سے ایک قسم کی تعجیل کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے جو کہ ائمہ کے مذہب کے نزدیک ہے اور ممکن ہے کہ بعض اوقات، تعلیم و تقرر وقت کیلئے ایسا کیا گیا ہو۔ یہ دوام و استمرار پر اس کی دلالت مسلم نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کا وقوع بعض مواضع میں، اصل و دوام و استمرار کی صورت نہیں رکھتی۔

محقق مذہب حنفیہ شیخ کمال الدین بن الہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر نمازِ عصر کو تغیر آفتاب سے پہلے ادا کریں تو ممکن ہے کہ باقی وقت میں غروب آفتاب تک اس قسم کے کام کر سکیں۔ جیساکہ ماہر باورچیوں سے مشاہدہ میں آتا ہے کہ اپنے سرداروں کے سفروں میں کھانا پکانے میں مستعدی دکھاتے ہیں۔ اس معنی میں یہ مستبعد نہیں ہے مطلب یہ کہ ایک جماعت کثیرہ ہے جس میں سے کچھ لوگوں نے اونٹ ذبح کیا اور کچھ لوگوں نے ٹکڑے کئے اور کچھ لوگوں نے پکانے کا سامان فراہم کیا۔ آگ وغیرہ جلائی تو اس صورت

میں کہ ہر شخص اپنا اپنا کام کرے، ایک اونٹ کا پکا لینا کوئی دشوار نہیں ہے۔ البتہ اتنے وقت میں ایک ہاتھ سے یہ کام انجام نہیں پا سکتے۔ اور ان کا حق تبارک و تعالیٰ کے ارشاد سے استدلال کرنا کہ: "وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ" "اپنے رب کی مغفرت کی طرف جلدی کرو تو یہ مسارعت و جلدی ایسے طریقہ پر چاہئے جو حق کے موافق ہو اور مقام میں چاہیے جہاں تاخیر مستحب نہ ہو۔ جیسے کہ ظہر کا ٹھنڈا کرنا موسم گرما میں، فجر کو روشن کرنا اور عشاء میں تاخیر کرنا کہ یہ سب مستحب ہیں۔ احادیث صحیحہ میں ان میں مبالغہ وارد ہوا ہے اور ہمارے مذہب کے علماء فرماتے ہیں کہ عصر میں تاخیر کثرت نوافل کی بنا پر ہے کیونکہ نماز عصر کے بعد نوافل پڑھنا مکروہ ہے اور اول وقت میں نماز عصر پڑھنے سے بکثرت نوافل پڑھنا افضل ہے "کذا قال السفناقی فی المبسوطین" غرضیکہ ہمارے مذہب میں نماز عصر میں اس حد تک تاخیر کرنا مستحب ہے کہ آفتاب متغیر نہ ہو اور وہ بلند و روشن اور تاباں رہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث اسی پر دلالت کرتی ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ عصر ایسے وقت میں ادا فرماتے کہ آفتاب سفید و صاف ہوتا۔ ان کا مقصود نماز عصر میں اس حد تک تاخیر ہے کہ آفتاب میں تغیر نہ ہو اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز عصر ایسے وقت میں ادا فرماتے کہ آفتاب زندہ ہوتا اس میں کسی آدمی کے گھر لوٹنے کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ تعجیل واقع ہوئی ہے تو بعض اوقات میں ہوئی ہے۔ شیخ ابن الہمام تاخیر عصر میں حدیثیں بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک ان حدیثوں میں اور ان حدیثوں میں جن میں تعجیل کا ذکر ہے کوئی تعارض و منافات نہیں ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ عصر کو عصر اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ وقت میں اعتصار کیا گیا ہے یعنی اس میں وقت کو نچوڑا جاتا ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ فرمایا عصر میں افضل، غیر روز میں تعجیل پر ہے۔ تاخیر عصر کے دلائل میں سے ایک وہ حدیث ہے جسے بخاری نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ تمہاری حالت اور تمہاری مثال بمقابلہ ان لوگوں کے جو تم سے پہلے یہود و نصاریٰ میں سے گزرے ہیں اس شخص کی مثال کی مانند ہے جس نے تین مزدور لئے اور ہر ایک کی اجرت ایک ایک درہم مقرر کی۔ ایک نے صبح سے دوپہر تک کام کیا اسے بھی ایک درہم ملے گا دوسرے نے دوپہر سے نماز عصر تک کام کیا اسے بھی ایک درہم دیا جائے گا۔ اور تیسرے نے نماز عصر سے مغرب تک کام کیا اسے بھی ایک درہم دیا جائے گا۔ جب تینوں مزدوروں کو ان کی مقررہ اجرت دینے کا وقت آیا تو وہ دونوں مزدور جن میں سے ایک نے صبح سے دوپہر تک اور دوسرے نے دوپہر سے عصر تک کام کیا تھا کہنے لگے کہ کیا وجہ ہے کہ ہمارا کام زیادہ ہے اور اجرت اس تیسرے مزدور سے بہت کم ہے۔ اور وہ مزدور جس کا کام کم ہے اس کی اجرت ہم سے زیادہ ہے۔ آقا کہتا ہے کہ میں نے جو کچھ تم سے مقرر کیا تھا وہ میں نے تم کو دے دیا۔ باقی میرا فضل ہے میں جسے چاہوں دوں۔ تم کو کیا سروکار۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پہلے مزدور کی مثال یہودیوں کی ہے کہ ان کی عمریں سب سے زیادہ ہیں اور ان کے عمل ان سب سے زیادہ ہیں اور دوسرے مزدور کی مثال نصاریٰ کی ہے اور تیسرے مزدور کی مثال تمہاری ہے کیونکہ تمہاری عمریں بھی بہت کم ہیں اور عمل بھی بہت کم ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ صبح سے دوپہر تک اور دوپہر سے عصر تک زمانہ و فاصلہ بمقابلہ زمانہ عصر و مغرب بہت زیادہ ہے۔ اور آیاتِ قرآنیہ مثلاً "فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا" (تو اپنے رب کی حمد طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب آفتاب سے پہلے کرو) اور "وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا" (اور اپنے رب کا ذکر صبح و شام کرو) ان میں نماز فجر اور نماز عصر کی جانب ہی اشارہ مراد لیتے ہیں اور مقصود سے ہی سروکار رکھنا چاہئے۔ یہ اوقات نماز کے مقام میں مزید بحث اور اس میں تعجیل و تاخیر کی تفصیلات مشکوٰۃ شریف کی شرح میں اس سے زیادہ مذکور ہے۔ اس کتاب میں اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ (واللہ اعلم)

ذکرِ اذان

تنبیہ : پہلے امامت جبریل علیہ السلام کے ذکر میں گذر چکا ہے کہ "اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃٌ" سے ندا کی گئی۔ تو یہ اذان کی مشروعیت سے پہلے کا ذکر ہے۔ کیونکہ اذان مدینہ طیبہ میں ۱ھ میں شروع ہوئی اور بعض کہتے ہیں کہ ۲ھ میں ہوئی۔ اور مشہور یہ ہے کہ تعیین وقت کے سلسلے میں جس میں سب نماز کیلئے جمع ہوجائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باہم مسلمانوں سے مشورہ کیا کہ کیا صورت اختیار کی جائے۔ کسی نے کہا کہ ناقوس بجانا چاہئے۔ جس طرح کہ نصاریٰ نماز کیلئے بجاتے ہیں کسی نے کہا کہ یہودیوں کی طرح قرن یعنی سینگ پھونکنا چاہئے۔ کسی نے کہا کسی بلند جگہ پر آگ روشن کرنی چاہئے سب نے ان چیزوں کو ناپسند کیا اس پر عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے جن کو صاحب الاذان کہتے ہیں خواب میں دیکھا کہ ایک مرد آسمان سے نیچے آیا اس کے ہاتھ میں ناقوس ہے عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا اے بندۂ خدا اس ناقوس کو بیچتے ہو؟ اس نے کہا تم اس کا کیا کروگے۔ انہوں نے کہا میں اس سے نماز کیلئے لوگوں کو بلاؤں گا اس نے کہا میں تم کو اس سے بہتر چیز سکھاتا ہوں تو اس نے اللہ اکبر اللہ اکبر آخر اذان تک مخصوص کیفیت کے ساتھ سکھایا۔ اسی طرح اقامت بھی سکھائی۔ جب انہوں نے صبح کی تو اپنا خواب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اِنَّھَا لَرُؤْیَا حَقٌّ اِنْشَآءَ اللہُ" یقیناً انشاء اللہ یہ خواب حق ہے جاؤ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بتاؤ کیونکہ ان کی آواز بلند تر، نرم تر اور شیریں تر ہے۔ اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے اذان سنی تو دوڑتے ہوئے اور اپنی چادر گھسیٹتے ہوئے آئے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے بھی وہی کچھ دیکھا ہے جو عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے بیان کیا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ" اگر ایسا ہی ہے تو ان دونوں خوابوں میں یا تمہارے خواب کی موافقت پر اللہ تعالیٰ ہی کو حمد ہے کہ اس نے اپنی طرف سے الہام فرمایا اور صدق وصواب کا راستہ دکھایا۔ بعض روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی یہی خواب دیکھا تھا۔ امام غزالی نے فرمایا کہ دس صحابہ نے دیکھا تھا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ چودہ صحابہ نے دیکھا تھا جن میں سے سات صحابی انصار میں سے تھے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ بارگاہِ رسالت میں آئے تو جواب دینے میں تاخیر فرمائی کیونکہ اس سے قبل اس کی وحی آرہی تھی اور امیر المومنین سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی حدیث میں ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معراج میں تشریف لے گئے اور سراپردۂ عزت میں حاضری ہوئی جو کہ کبریائے حق کا محل خاص تھا وہاں ایک فرشتہ نمودار ہوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السّلام سے دریافت کیا یہ فرشتہ کون ہے؟ جبریل علیہ السّلام نے عرض کیا کہ قسم ہے اس خدائے ذوالجلال کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ میں بارگاہِ رب العزت میں سب سے زیادہ مقرب بندہ ہوں میں نے اس فرشتہ کو اس ساعت سے پہلے جب سے کہ مجھے پیدا کیا گیا ہے نہیں دیکھا۔ پھر اس فرشتے نے کہا "اللہ اکبر اللہ اکبر" پردۂ جلال کے پیچھے سے آواز آئی، میرے بندے تونے سچ کہا میں اکبر ہوں اس کے بعد اذان کے بقیہ کلمات کو بیان کیا۔ تحقیق یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شبِ معراج میں اذان کے کلمات کو سنا لیکن حکم نہ ہوا کہ ان کلماتِ اذان کو نماز کیلئے کہا جائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں بغیر اذان کے نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ مدینہ طیبہ میں رونق افروز ہوئے اور یہاں اس باب میں صحابہ کے ساتھ مشورہ کیا۔ بعض صحابہ نے اذان کو خواب میں سنا اس پر وحی آئی کہ ان کلمات کو جو آسمان پر سنا تھا زمین پر اذان کا طریقہ اختیار کرو۔ (واللہ اعلم)

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس خود اذان دی ہے یا نہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ

ایک مرتبہ حضور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں تھے آپ اور آپکے صحابہ رضی اللہ عنہم سب سوار تھے اوپر بارش تھی اور نیچے کیچڑ۔ اور کیچڑ کی وجہ سے سواری سے نیچے اترنا دشوار تھا اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان کہی۔ اور سب نے سواریوں پر ہی نماز ادا کی اور بعض کہتے ہیں کہ اس جگہ اذان کہنے سے مراد، بر طریق مجاز اذان کا حکم دینا ہے۔ اور مسند امام احمد اور دار قطنی کی روایت میں اس کی صراحت بھی آئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان کہنے کا حکم فرمایا اور ہدایہ میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو دیکھا ہے کہ آپ نے مغرب کے وقت اذان کہی اور اس کے بعد بیٹھے۔

شمس الائمہ سرخسی سے نہایہ میں منقول ہے کہ وہ امام ابو یوسف کے قول کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس میں اشارہ کو ابو حنیفہ بہ نفس نفیس خود اذان و اقامت کہا کرتے تھے اور سفناقی کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ امامت بھی خود ہی کرتے تھے اور فرماتے ہیں کہ احسن یہ ہے کہ امام، اذان و اقامت کو اپنے سوا دوسرے کے سپرد کرے۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس، خود امامت کے ساتھ اذان و اقامت کو جمع نہ فرماتے تھے۔ اور شمس الائمہ فرماتے ہیں کہ یہ معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں خاص ہے۔ لیکن ہمارے حق میں امام کا اپنے آپ اذان دینا اولیٰ ہے۔ اس لئے کہ موذن لوگوں کو خدا کی طرف بلاتا ہے۔ لہٰذا جس کا درجہ بلند و اعلیٰ ہے وہ اذان کیلئے اولیٰ ہے اور فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض اوقات خود اذان کہی ہے جیسا کہ عقبہ بن عامر سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک سفر میں، میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا جب سورج ڈھل گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان کہی اور اقامت کہی اور ظہر کی نماز ادا فرمائی۔ یہ کلام نہایہ کا ہے۔

مخفی نہ رہنا چاہئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مستمرہ وہی ہے جو معلوم ہے اور اذان و اقامت کیلئے ان کا قول کہ ایک مرتبہ سفر میں کہی، علماء کہتے ہیں کہ یہ بھی مؤل ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے ان کا وقوع دائمی نہ تھا اور وہ جو منقول ہے وہ بھی نماز مغرب میں ہی ہے جو ایک بار ایسا واقع ہوا تھا اور ایک روایت میں ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ بسا اوقات امام ابو یوسف رحمہ اللہ کو امام بناتے تھے مگر اس جگہ خود بنے ہوں اور کیا یہ صورت ممکن ہے کہ آپ جیسے امام اجل ہمیشہ یا اکثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مستمرہ کے برخلاف عمل کرتے ہوں گے چنانچہ صاحب نہایہ نے جو بیان کیا ہے وہ ضعیف ہے اس لئے اس سے یہ لازم آتا ہے کہ یہ عادتِ کریمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمیشہ رہی ہے۔ کیونکہ اصل داعی الی اللہ آپ ہی ہیں۔ اور اس پر آپ ہمیشہ ہی عمل کرتے ہوں؟ ہاں بیان جواز کیلئے ان سب کو جمع کرنے میں یعنی اذان، اقامت اور امامت میں کلام نہیں ہے۔

اگرچہ بعض دیگر سنن میں ہے کہ امام اور قوم "حی علی الصلوٰۃ" کے وقت کھڑے ہوں، "قد قامت الصلوٰۃ" کے وقت امام نیت باندھے۔ ان سے ان حدیثوں پر عمل فوت ہوتا ہے اس بنا پر علماء کا اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک مکروہ ہے اور بعض کے نزدیک خلاف اولیٰ اور بعض کہتے ہیں کہ مستحب ہے اور اس قول کی امام نووی نے شوافع سے اور شمس الائمہ جو حنفی المذہب ہیں ان سے تصحیح کی ہے حالانکہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے درجۂ صحت کے ساتھ مروی ہے کہ فرمایا اگر خلافت کے ساتھ اذان کہنا جمع ہوتا تو میں ہی اذان کہتا۔ (کذا فی فتح الباری)

اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اذان کہنے کا قصہ جو نذکور ہوا مرتبہ صحت کو پہنچ جائے تو اذان و اقامت کے درمیان جمع بے کراہت ہے اگر ان کو بھی بیان جواز پر محمول نہ رکھیں اور علماء فرماتے ہیں کہ شارع علیہ السلام سے اصل جواز کے بیان کیلئے فعل مکروہ کا صدور بھی جائز ہے۔ (واللہ اعلم)

افتتاحِ صلوٰۃ (تکبیرِ تحریمہ) وصل:۔ احادیث میں مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کیلئے کھڑے

ہوتے تو "اللہ اکبر" کہتے اور اس تکبیر سے پہلے نیت، زبان و لفظ سے نہیں ہے۔ محدثین کہتے ہیں کہ زبان سے نیت کہنی بدعت ہے اور اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکروہ جانا ہے۔ اور نہ آپ کے کسی صحابی سے منقول ہے۔

مواہب میں ابن قیم سے نقل کیا گیا ہے وہ کہتے ہیں کہ زبان اور لفظوں سے نیت کرنا بدعت ہے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ کسی صحیح سند سے، نہ ضعیف، نہ مسند، نہ مرسل سے اور نہ کسی صحابی کے عمل سے کوئی روایت مروی ہے۔ اور نہ کسی تابعی نے اسے مستحب قرار دیا ہے اور نہ ائمہ اربعہ نے (انتہیٰ) اور فقہاء بھی لفظوں کے ذریعہ نیت کرنے میں اختلاف رکھتے ہیں بعض کے نزدیک بدعت ہے۔ اس لئے کہ یہ فعل منقول نہیں ہے اور بعض مستحب کہتے ہیں اس لئے کہ یہ استحضار نیت قلبی پر مدد کرتی ہے اور عبادت لسانی و قلبی کے درمیان اجتماعیت کا موجب ہے اور قواعدِ شرع اور ضرورت عقل سے معلوم ہوگیا ہے کہ اگر دل زبان کے ساتھ جمع ہوجائے تو اتم واکمل ہوتا ہے اور یہ بات نیت و تلبیہ و رکوع و سجود کی تسبیحات پر قیاس کرنیں فاسد ہے۔ اور قیاس نص کے مقابلے میں ہے۔ (کمالا یخفیٰ)

اور تکبیر تحریمہ کے ساتھ دونوں ہاتھ اٹھاتے۔ اکثر حدیثوں میں ایسا ہی واقع ہوا ہے اور مذہب امام ابو یوسف اور مختار جماعت فقہاء حنفیہ مثلاً طحاوی و قاضیخاں وغیرہ یہی ہے اور کہتے ہیں کہ تکبیر کے ساتھ ہاتھ اٹھانا سنت ہے لہٰذا اس کے ساتھ متصل ہے اور بعض حدیثوں میں ہاتھ اٹھانے سے تکبیر میں تاخیر کرنا بھی آیا ہے مذہب امام ابو حنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ یہی ہے اور اسی پر عام مشائخ عظام ہیں۔ ہدایہ میں اسی کو اصح کہا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہاتھ اٹھانے میں غیر حق جل وعلاً سے کبریائی کی نفی ہے۔ اور تکبیر میں حق سبحانہ وتعالیٰ کی کبریائی کا اثبات ہے اور اثبات پر نفی مقدم ہوتی ہے۔ جیسا کہ "لا الٰہ الا اللہ" میں ہے اور ابن الہمام شرح میں تیسرا قول بھی نقل کرتے ہیں وہ رفع یدین پر تکبیر کی تقدیم ہے۔ اور وہ ایک حدیث بھی بیہقی سے سنن کبریٰ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی اس کی موافقت میں لاتے ہیں لہٰذا یہ سب تین قول ہوئے اور جائز ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سب فعل اوقات متعددہ میں صادر ہوئے ہوں (واللہ اعلم) اور ہاتھوں کو اٹھانے میں اکثر کانوں کے برابر ہوتے اور کبھی کندھوں کے محاذ میں۔ پہلا طریقہ مذہب امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ ہے اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے مروی ہے۔ یہ حضرات وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے تمسک کرتے ہیں جو مسلم و ابو داؤد میں روایت کی گئی ہے۔ اور دوسرا طریقہ مذہب امام شافعی، امام مالک رحمہما اللہ کا ہے اور امام احمد سے بھی مروی ہے اور یہ بھی حدیثوں میں واقع ہوا ہے اور ابو حمید ساعدی کی حدیث میں بھی آیا ہے جسے انہوں نے جماعتِ صحابہ میں کہا ہے کہ میں تم سب سے زیادہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا حافظ ہوں۔ ممکن ہے کہ بعض اوقات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا ہو۔

تکبیرِ تحریمہ کہنے کے بعد داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر بالائے ناف سینے کے نیچے رکھنا شوافع کا مذہب ہے اور ناف کے نیچے رکھنا امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے اور بعض اصحابِ شوافع کا بھی یہی مذہب ہے۔ (کذافی المواہب) اور ہدایہ میں ہے کہ امام شافعی کا مذہب سینہ کے اوپر ہاتھ رکھنا ہے اور امام احمد کا مذہب، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کے مذہب کے موافق کہا گیا ہے۔ اور ان کی ایک روایت میں اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے سینہ پر رکھے یا زیر ناف۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ علماء کے نزدیک اس باب میں حکم وسیع ہے۔ مطلب یہ کہ جو کچھ کرے جائز ہے۔

ہاتھ باندھنے کے بعد دعائے استفتاح یعنی ثنا پڑھے "سبحانک اللھم وبحمدک (الی آخرہ)" اور ادعیہ استفتاح بہت ہیں جیسے: "اِنِّی وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" وغیرہ۔ اور شوافع ان سب کو یا ان میں سے بعض کو تمام فرض و نفل نماز میں پڑھتے ہیں اور

احناف کے نزدیک یہ دعائیں نوافل اور رات کی نمازوں کے ساتھ مخصوص ہیں اور فرض میں صرف سبحانک اللھم الخ ہی ہے اور امام ابو یوسف کے نزدیک ثنا اور توجہ دونوں مروی ہیں۔ ثنا سے مراد، سبحانک اللھم الخ اور توجہ سے مراد اِنِّی وَجَّھْتُ وَجْھِی الخ ہے۔ اور امام طحاوی کے نزدیک بھی یہی مختار ہے۔ لیکن کہا گیا ہے کہ نماز پڑھنے والا مختار ہے کہ چاہے ثنا کے بعد توجہ پڑھے یا اس سے پہلے۔ یہ بھی امام یوسف رحمہ اللہ سے ہی مروی ہے اور مشہور ثنا سے توجہ کی تاخیر ہے اور جو لوگ نماز شروع کرنے سے پہلے نیت میں اِنِّی وَجَّھْتُ الخ پڑھتے ہیں یہ سنت کے موافق نہیں ہے۔

اور سبحانک اللھم الخ کی اسناد میں کلام ہے اور طیبی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن، مشہور ہے اور مسلم میں سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے اسے روایت کیا گیا ہے اور اسے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے مجتہدین صحابہ نے اختیار کیا ہے اور بکثرت علماء تابعین وغیرہم اس کے قائل ہیں اور امام ابو حنیفہ جیسے علماء نے اسے اختیار کیا ہے۔ اس حدیث کو کیونکر طعن وضعف کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے اور اجلہ علماء حدیث اس کے عامل و قائل ہیں۔ جیسے سفیان ثوری، امام احمد اور اسحاق وغیرہم رضی اللہ عنہم۔ اور طعن کی حقیقت امام ترمذی کی ایجاد ہے جسے وہ اپنی سند میں لائے ہیں نہ کہ اس حدیث کی تمام سندوں میں اور یہ کیونکر ممکن ہے جب کہ اعاظم ائمہ کبار اس حدیث کو اختیار کرتے اور اس پر اپنا مذہب رکھتے ہیں۔

دعائے استفتاح یعنی ثنا کے بعد استعاذہ کرتے اور فرماتے "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔" استعاذہ قرأت قرآن سے پہلے مسنون ہے خواہ نماز میں ہو یا نماز کے باہر اور عامہ سلف سے جیسے سفیان ثوری اور عطاؒ وغیرہ، ان سے اس کا وجوب بھی مروی ہے اور یہ ظاہر حکم کی بناء پر ہے کہ فرمایا: "اِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ۔" اور شاطبیہ کی ایک شرح میں ہے جسے جبیر بن مطعم سے روایت کیا گیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی پڑھا کرتے اور فرماتے کہ مجھے جبریل علیہ السلام نے ایسا ہی بتایا ہے۔ ابو سعید رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی لفظ اعوذ باللہ آیا ہے ایسا ہی ابن الہمام نے شرح میں بیان کیا ہے۔ ہدایہ میں کہتے ہیں کہ "اَسْتَعِیْذُ بِاللّٰہِ۔" کہنا اولیٰ ہے تاکہ لفظ قرآن سے موافقت ہو جائے۔ (جب تم قرآن پڑھو تو اللہ سے استعاذہ کرو) اور فقہاء کے درمیان اور قراء کے درمیان اختلاف ہے کہ اعوذ باللہ افضل ہے یا "اَسْتَعِیْذُ بِاللّٰہِ"۔

استعاذہ کے بعد "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" پڑھتے۔ اور نماز کے اول میں تسمیہ پڑھنا بالا جماع ہے۔ اگرچہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک تسمیہ نہ تو سورہ فاتحہ کا جزو ہے اور نہ کسی اور سورۃ کا۔ لیکن اول صلوٰۃ میں پڑھتے تو یہ ان کے نزدیک تعوذ کی مانند مفتاح صلوٰۃ ہے۔ اور ایک روایت میں ہر رکعت کے اول میں ہے۔ یہ قول صاحبین رحمہما اللہ کا ہے۔ اس لئے کہ تسمیہ قرآن کی تلاوت شروع کرنے کیلئے ہے اور ہر رکعت قرأت میں مستقل ہے۔ یہ بر بنائے احتیاط اور باعتبار اختلاف علماء ہے۔ کیونکہ بعض کے نزدیک تسمیہ فاتحہ کا جزو ہے، سورۂ فاتحہ اور کسی اور سورۃ کے درمیان تسمیہ لازم نہیں ہے مگر امام محمد کے نزدیک یہ مخاف کی صورت میں ہے۔

واضح رہنا چاہئے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا پڑھنا متفق علیہ ہے۔ البتہ اس کے جہر اور اخفا میں اختلاف ہے۔ اور امام ابو حنیفہ، امام ابو سفیان ثوری اور امام احمد رحہم اللہ اس کے اخفاؤ اسرار کے قائل ہیں۔ اور حضرت عمر، علی، ابن مسعود، عمار بن یاسر اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم سے یہی مروی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے اور حضرت ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی ہے میں نے ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا کہ انہوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو جہر سے پڑھا ہو۔ اسے امام احمد، نسائی، ابن خزیمہ اور دار قطنی نے روایت کیا اور جامع الاصول میں حضرت انس کی حدیث کو تسمیہ میں عدم جہر کے باب میں، کتب ستہ سے روایت کیا ہے اور دار قطنی فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ

وسلم سے کوئی حدیث صحیح سند سے مروی نہیں ہے۔ لیکن بعض صحابہ کرام سے جو روایتیں مروی ہیں ان میں سے کچھ تو صحیح ہیں اور کچھ ضعیف۔ امام احمد نے صراحت کی ہے مدینہ طیبہ کے بعض ائمہ بر بنائے بیان سنت، تسمیہ کو جہر سے پڑھتے تھے، لیکن بعض شراح حدیث فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جہر کے سلسلے میں جو کچھ مروی ہے تو یہ تعلیم امت کیلئے تھا جیسا کہ بعض اوقات نماز ظہر میں بعض سورت کو جہر فرماتے تاکہ جان لیں کہ فلاں سورت پڑھی ہے۔ یہ تعلیم امت کیلئے تھا۔ (کماقیل)

صاحب "سفرا لسعادة" فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات بسم اللہ کو جہر سے پڑھتے اور بعض اوقات اخفا کرتے تھے اور ترمذی نے اپنی جامع میں دو باب باندھے ہیں ایک بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ترک جہر میں ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس پر اکثر صحابہ کرام کے اہلِ علم کا عمل ہے جیسے حضرت ابو بکر، عمر، عثمان اور علی مرتضٰی وغیرہم رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد تابعین میں سے بھی اس کے قائل ہیں جیسے سفیان ثوری، عبداللہ بن مبارک، احمد اور اسحٰق وغیرہم رضی اللہ عنہم۔ اور فرماتے ہیں کہ نمازی، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو جہر سے نہ پڑھے اور اسے زیر لب آہستہ سے کہے اور دوسرا باب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے جہر میں لاتے ہیں اور اس باب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث لاتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو جہر سے پڑھتے تھے اور ترمذی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند قوی نہیں ہے اور اس کے قائل چند صحابہ ہیں جیسے حضرت ابو ہریرہ، ابن عمر، اور ابن عباس وغیرہم رضی اللہ عنہم۔ چند تابعین بھی اس کے قائل ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب بھی یہی ہے۔(انتہیٰ)

اور حاکم نے فرمایا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث صحیح ہے اور حاکم نے اس کی تصحیح بغیر علت و سبب کے کی ہے اور جہر میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی صحیح ہے اور کہتے ہیں کہ یہ دونوں حدیثیں جہر میں امثلِ احادیث ہیں اور شیخ ابن الہمام، عبدالبر سے نقل کر کے فرماتے ہیں کہ شعبی ، نخعی ، اوزاعی، قتادہ، عمر بن عبدالعزیز، اعمش، زہری، مجاہد، حماد اور ابو عبید رحمہم اللہ کا مذہب بھی ترک جہر ہے اور بعض حفاظ حدیث کہتے ہیں کہ جہر میں کوئی حدیث صریح نہیں ہے مگر یہ کہ ان کی سندوں میں محدثین کے نزدیک کلام ہے اسی بنا پر ارباب مسانید مشہورہ نے اعراض کیا ہے۔ اور اس بارے میں کچھ بھی حدیثیں روایت نہیں کی ہیں۔ باوجودیکہ ان کی کتابیں احادیث ضعیفہ پر بھی مشتمل ہیں اور ابن تمنہ نے کہا کہ ہمیں دار قطنی سے معلوم ہوا ہے وہ کہتے ہیں کہ جہر تسمیہ کے سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث صحیح مروی نہیں ہوئی ہے غرضیکہ اس باب میں جس قدر حدیثیں مروی ہوئی ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر اور اوضح وارجح وہی ہیں جیسا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے اور یہ جو بعض لوگوں میں مشہور ہوا ہے کہ جہر ارجح ہے اور امیر المومنین سیدنا علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ کا مذہب جہر تھا صحیح نہیں ہے اور اپنی جگہ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ان کا مذہب اور دیگر خلفاء ثلٰثہ کا مذہب ترک جہر ہے۔ (رضی اللہ عنہم)

اس کے بعد سورۂ فاتحہ پڑھتے اور سورۂ فاتحہ کے آخر میں آمین کہتے۔ جہری نماز میں جہر سے اور سری نماز میں آہستہ کہنے میں احادیث مروی ہیں۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کا یہی مذہب ہے لیکن امام مالک کے مذہب میں قدرے اختلاف ہے اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب میں مطلقاً اخفاء یعنی آہستہ کہنا ہے۔

جامع ترمذی میں باآواز بلند آمین کہنے اور باآواز پست آمین کہنے دونوں ہی کے بارے میں حدیثیں مروی ہیں لیکن ان میں جہر کی حدیث کو ترجیح دیتے ہیں اور بخاری سے بھی ایسا ہی منقول ہے اور کہتے ہیں کہ صحابہ و تابعین کے اکثر علماء کا عمل اسی پر ہے۔(انتہیٰ)

سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ امام چار چیزوں میں اخفا کرے ، یعنی آہستہ سے کہے۔ تعوذ۔ بسم اللہ، آمین، اور سبحانک اللہم وبحمدک الخ اور حضرت ابن مسعود سے ایسا ہی مروی ہے اور علامہ سیوطی "جمع الجوامع" میں بروایت ابو وائل

روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کو جہر سے کہتے تھے اور نہ تعوذ کو اور نہ آمین کو۔ اور شیخ ابن الہمام، ابو وائل سے اخفا اور جہر میں دونوں روایتیں نقل کر کے فرماتے ہیں کہ دونوں حدیثیں معلول و مجروح ہیں اور مدار حضرت ابن مسعود کی حدیث پر ہے۔

واضح رہنا چاہئے کہ بعض روایتوں میں " مدصوتہ" آیا ہے۔ اس میں آمین کے ہمزہ کے مد کا بھی احتمال ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ قرینہ روایت کے بموجب، رفع صوت یعنی بآواز کہنا مراد ہے کیونکہ دوسری روایت میں " رفع صوتہ " آیا ہے اور بعض روایتوں میں " یرتج بہا المسجد " (اس سے مسجد گونج اٹھتی) آیا ہے " رتج " دو جیموں کے ساتھ بمعنی جنبیدن ولرزیدن آتا ہے۔

اور آمین الف کے مد اور تخفیف میم سے ہے اور الف کے قصر سے بھی جائز ہے اور بعض کے نزدیک مد الف کو تشدید میم کے ساتھ ادا کرنا غلط و خطا ہے مگر مفسد نماز نہیں ہے اس لئے کہ قرآن کا کلمہ ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا " آمین البیت الحرام " اگرچہ اس معنی میں نہیں ہے اور بعض کے نزدیک خطا نہیں ہے اور اگر خطا بھی ہو تو اس لفظ کے معنی ہیں " قاصدین الاجابتہ " قبولیت کی آرزو رکھنے والے۔ ایسا ہی شیخ ابن الہمام نے حلوائی سے نقل کر کے بیان کیا ہے اور شیخ ابو عبدالرحمن سلمی صوفی کے کلام میں بھی اسی معنی کے ساتھ کہا گیا ہے۔ اور بعض فقہاء نے اسے خطا کہنے میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور ظاہر ہے کہ خطا کہنے والا خطا کار ہے۔ اور سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی سورۃ ملا کر پڑھتے اور صبح کی نماز میں قرأت کو ساٹھ آیتوں سے سو آیتوں تک دراز کرتے اور کبھی سورۂ قاف پڑھتے اور کبھی سورۂ روم پڑھتے اور کبھی قرأت میں تخفیف کرتے اور سفر میں " معوذتین " پڑھتے اور جمعہ کے دن نماز فجر میں سورۂ " الم تنزیل السجدہ " پہلی رکعت میں اور " هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ " دوسری رکعت میں پڑھتے۔ اور شوافع اس عمل پر مواظبت و مداومت عجیب رکھتے ہیں۔ اور کبھی اس کے خلاف کوئی عمل وجود میں نہیں لاتے اور احناف کے نزدیک کسی وقت کے ساتھ کسی سورت کو معین کر دینا مکروہ جانتے ہیں اور شیخ ابن الہمام، طحاوی اور اسبیجابی نقل کرتے ہیں کہ یہ کراہت اس تقدیر پر ہے کہ اسے لازم جانے اور ان کے سوا کو مکروہ سمجھے لیکن اگر بحکم فرمان باری تعالیٰ۔ " فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ۔ " (تو قرآن سے جو آسان ہو پڑھو) انہیں پڑھے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت سے تبرک کی بنا پر پڑھے تو کوئی کراہت نہیں ہے لیکن شرط یہ ہے کہ کبھی کبھی ان کے سوا بھی پڑھے تاکہ کوئی جاہل یہ گمان نہ کرے کہ یہ جائز نہیں ہے۔

صاحب محیط بھی نقل کر کے کہتے ہیں کہ جمعہ کے دن فجر میں ان کی قرأت مستحب ہے بشرطیکہ کبھی کبھی ان کے سوا بھی پڑھے تاکہ کوئی جاہل گمان نہ کرے کہ ان کے سوا جائز نہیں ہے اور شیخ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ اس عبارت میں کوئی ڈر نہیں ہے اس علم کے بعد۔ کیونکہ کلام تو مداومت میں ہے۔ (انتہی) اور ظاہر یہ ہے کہ احناف کے نزدیک اس میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مداومت ثابت شدہ نہیں ہے۔ اگرچہ طبرانی ابن عباس کی حدیث میں " کل جمعۃ " زیادہ لائے ہیں اور بعض روایتوں میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے بھی ہم اسے دیکھتے ہیں (واللہ اعلم)

اور نماز جمعہ میں سورۂ جمعہ اور سورۂ منافقون پڑھتے اور کبھی " سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى " اور غاشیہ پڑھتے اور شب جمعہ میں سورۂ جمعہ کی قرأت بھی مروی ہے۔ علامہ سیوطی نے سورۂ منافقون کا بھی ذکر کیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں باعتبار مصلحت و حکمت جو بھی وقت کا اقتضاء ہوتا طویل یا قصیر سورتوں میں سے جو چاہتے پڑھتے۔ جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں آیا ہے اور یہ جو مشہور و معمول اور جس پر اکثر فقہاء کا عمل ہے کہ فجر و ظہر میں " طوال مفصل " پڑھتے اور عصر و عشاء میں اوساط اور مغرب میں قصار، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اکثر احوال اسی نہج پر تھا۔ اس باب میں اخبار و آثار بکثرت ہیں۔

ہدایہ میں کہتے ہیں کہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے نام ایک خط اس باب میں اصل و بنیاد ہے۔ یقیناً جو کچھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لکھا ہو گا سنت کے مطابق اور اس کے موافق ہی ہو گا۔ اور اس کے برخلاف جو روایتیں مذکور ہیں وہ بھی صحیح ہیں لا محالہ یہ اکثر احوال کے حکم میں ہے۔ (واللہ اعلم)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب قرأت سے فارغ ہوتے تو تکبیر کہتے ہوئے رکوع میں جاتے۔ اور یہ تکبیر یا تو قیام کی حالت میں ہے یا جھکنے کے ساتھ تکبیر ہے۔ اسی طرح جب رکوع سے سر اٹھاتے اور حدیث میں ہے کہ "كَانَ يُكَبِّرُ فِي كُلِّ خَفْضٍ وَرَفْعٍ" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں جب بھی سر مبارک جھکاتے اور سر مبارک اٹھاتے تو تکبیر کہتے۔ امام شافعی اور امام احمد وغیرہ کے نزدیک یہ تکبیر رفع یدین کے ساتھ ہے۔ اور ہمارے نزدیک بغیر رفع یدین کے۔ اور یہ اختلاف، احناف اور ان کے ماسوا کے درمیان عجیب ہے اور شوافع، حدیث رفع کی صحت میں بھرپور مبالغہ کرتے ہیں۔ "صاحب سفر السعادۃ" کہتے ہیں کہ یہ حدیث کثرت روایات کے اعتبار سے تواتر کی مانند ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے اس باب میں چار سو صحیح حدیثیں مروی ہیں جنہیں عشرہ مبشرہ نے بھی روایت کیا ہے۔ اور ترمذی نے اپنی عادت کے مطابق جو وہ اختلاف احادیث اور اعمال علماء کے باب میں رکھتے ہیں اس جگہ بھی دو باب قائم کیے ہیں پہلا باب رفع یدین میں ہے اس باب میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث نقل کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ جب آپ نماز شروع فرماتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھاتے اور اپنے کندھوں کے مقابل لاتے۔ اور جب رکوع کرتے اور رکوع سے سر مبارک اٹھاتے۔ اور بعض روایتوں میں ہے کہ "وَكَانَ لَا يَرْفَعُ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ۔" (اور حضور دونوں سجدہ کے درمیان ہاتھوں کو نہ اٹھاتے تھے) اور انہوں نے صحابہ کرام سے متعدد سندوں کا اشارہ کر کے بکثرت صحابہ و تابعین کے مجتہدین وغیرہ کے عمل کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ جیسے اوزاعی، عبداللہ، شافعی، احمد اور اسحاق وغیرہ رحمہم اللہ۔ اور اس حدیث کی صحت بیان کر کے اسکی ترجیح کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اور ترمذی نے دوسرا باب "مَنْ لَمْ يَرَ لِرَفْعِ إِلَّا عِنْدَ الْإِفْتِتَاحِ۔" (جس نے تحریمہ کے بعد رفع یدین کو درست نہیں سمجھا) کا باندھا ہے۔ اس باب میں علقمہ کی حدیث جو حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے بیان کی کہ انہوں نے اپنے رفیقوں سے فرمایا میں نے تمہارے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی ہے۔ پھر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، نے بھی نماز پڑھی تو انہوں نے تکبیر تحریمہ کے سوا کہیں ہاتھ نہ اٹھایا۔

ترمذی فرماتے ہیں کہ اس باب میں حضرت براء بن عازب سے بھی مروی ہے اور کہا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن ہے اور بکثرت صحابہ و تابعین کے اہل علم اس کے قائلین اور سفیان ثوری اور اہل کوفہ کا قول یہی ہے۔ امام محمد اپنی موطا میں امام مالک سے بروایت زہری از سالم بن عبداللہ بن عمر، وہ اپنے والد سے مروی لائے ہیں اور فرمایا کہ سنت یہ ہے کہ ہر جھکنے اور اٹھنے میں تکبیر کہے۔ لیکن بجز تکبیر تحریمہ کے کہیں ہاتھ نہ اٹھائے اور یہ قول امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ہے اور اس میں بکثرت روایات مروی ہیں اس کے بعد از عاصم بن کلیب جرمی اپنے والد سے جو تابعین میں سے ہیں اور حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ملاقی ہیں روایت کرتے ہیں اس سلسلے میں متعدد روایتیں نقل کی ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تکبیر اولیٰ کے سوا کسی جگہ نماز میں ہاتھوں کو نہ اٹھاتے اور حضرت عبدالعزیز بن حکیم سے منقول ہے کہ فرمایا کہ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا ہے کہ وہ اول تکبیر افتتاح میں ہاتھوں کو اٹھاتے اور اس کے ماسوا میں ہاتھ نہ اٹھاتے تھے اور ابو سفیان ثوری نے ابن مسعود کی حدیث کو بھی نقل کیا ہے۔ (انتہیٰ)

مشکوٰۃ الآثار سے طحاوی نقل فرماتے ہیں کہ مجاہد نے روایت کر کے کہا کہ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی ہے وہ تکبیر اول کے سوا اپنے ہاتھوں کو نہ اٹھاتے تھے اور اسود سے منقول ہے کہ فرمایا میں نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو تکبیر اولیٰ

کے سوا ہاتھوں کو اٹھاتے نہیں دیکھا اور جب کہ حضرت عمر اور حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا دور بہت نزدیکی اور قرب کا ہے۔ ان کے بعد حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو بھی لوگوں نے دیکھا کہ ایسا ہی کرتے تھے اس کے برخلاف جو کچھ نقل کرتے ہیں اولیٰ واحق یہ ہے کہ وہ مقبول نہ ہو گا۔

حضرت ابن الہمام شرح میں، ابراہیم، علقمہ اور عبداللہ رضی اللہ عنھم سے نقل کرتے ہیں کہ فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنھما کے ساتھ نماز پڑھی ہے وہ افتتاح صلوٰۃ کے وقت کے سوا اپنے ہاتھوں کو نہیں اٹھاتے تھے۔ اور نہایہ شرح ہدایہ میں فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے کہ ایک شخص کو دیکھا کہ وہ بیت الحرام میں نماز پڑھ رہا ہے اور اپنے ہاتھوں کو وہ رکوع میں جاتے اور رکوع سے اٹھاتے وقت اٹھا رہا ہے اس پر حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا ایسا نہ کرو۔ یہ وہ عمل ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا پھر اس کے بعد اسے چھوڑ دیا۔ مطلب یہ کہ یہ حکم ابتدائے زمانہ میں تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رفع یدین کرتے تھے تو ہم بھی کرتے تھے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے چھوڑ دیا تو ہم نے بھی چھوڑ دیا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنھما سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا عشرہ مبشرہ افتتاح نماز کے وقت کے سوا ہاتھوں کو نہیں اٹھاتے تھے اب معلوم ہو گیا ہو گا کہ اخبار و آثار، رفع اور عدم رفع دونوں جانب میں ثابت ہیں لہٰذا اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ ہم کہیں رفع اور عدمِ رفع اختلاف اوقات کے ساتھ دونوں تھے یا ابتدا میں رفع تھا جو آخر میں منسوخ ہو گیا۔

شیخ کمال الدین ابن الہمام فرماتے ہیں کہ نماز میں ابتدائی زمانے میں اس قسم کے اقوال وافعال تھے جن میں رفع مباح تھا جو بعد میں منسوخ ہو گیا۔ لہٰذا بعید نہیں ہے کہ یہ بھی انہیں قبیل سے ہو جس میں نسخ شامل ہے خصوصاً ایسے ناقابلِ رد ثبوت کے ساتھ جو اس کے برخلاف موجود ہیں اس قبیل سے ہے جس میں خشوع و سکون ہے جو نماز میں باجماع مطلوب و مقصود ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے حماد سے اور وہ ابراہیم سے نقل کرتے ہیں کہ ان کے سامنے وائل بن حجر کی روایت ذکر کی گئی کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رکوع و سجود کے وقت رفع یدین کرتے دیکھا ہے۔ اس پر ابراہیم رحمہ اللہ نے فرمایا ممکن ہے کہ انہوں نے صرف اسی دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز ادا کی ہو کیا وہ حضرت عبداللہ اور دیگر اصحاب سے زیادہ عالم ہیں یا یہ کہ انہوں نے تو یاد رکھا اور دیگر اصحاب نے یاد نہ رکھا۔ بلاشبہ ایک جماعتِ کثیرہ نے جن کا کوئی حدو شمار نہیں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں کو ابتدائے نماز کے سوا نہیں اٹھاتے تھے اور وہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں اور یہ کہ حضرت عبداللہ، شرائع اسلام اور اس کے حدود کے عالم ہیں۔ احوال نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں سب کا ان پر اتفاق ہے یہ سفر و حضر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحبت میں رہے اور حضور کی اقتداء میں اتنی نمازیں انہوں نے پڑھی ہیں جن کی کوئی گنتی و شمار نہیں ہے لہٰذا تعارف کے وقت ان کے قول کو لینا اس شخص کے مقابلے میں جو تنہا ہو اولیٰ ہے۔ لہٰذا آخر میں دونوں فعلوں کے مسنون ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں واللہ اعلم۔ شرح سفر السعادۃ میں اس سے زیادہ بحث کی گئی ہے تو تم وہاں دیکھو۔

رکوع میں دونوں ہتھیلیوں کو گھٹنوں پر خوب جماتے۔ اور انگلیوں کو کھول کر رکھتے۔ علماء فرماتے ہیں کہ نماز میں انگلیوں کی تین حالتیں ہیں۔ ایک رکوع کی حالت میں کھول کر رکھنا۔ دوسرے سجدے کی حالت میں انگلیوں کو ملا کے رکھنا اور تیسرے تمام حالتوں میں انگلیوں کو اپنے حال پر چھوڑنا۔ خواہ قیام کی حالت ہو خواہ تشہد کی حالت اور بازوؤں کو پہلو سے دور کرتے، پشت کو سیدھا رکھتے اور سر کو اس کے برابر نہ نیچا کرتے اور نہ اٹھاتے اور تین بار سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ، کہتے۔ یہ کم سے کم ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ تین بار کمال نماز

کیلئے ہے اگر اس سے زیادہ کیے تو افضل ہے۔ تین کے بعد وتر کرے یعنی پانچ یا سات یا نو۔ اور فرماتے ہیں کہ غایت کمال میں کوئی عدد نہیں ہے۔ اور بعض نے دس تک کہا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اتنا نہ ہو کہ بعض سہو کا گمان کرنے لگیں اور بعض نے قریب بقدر قیام کہا ہے۔ یہ تمام اقوال اکیلے نمازی کیلئے ہیں اور امام کے لئے مقتدیوں کی رعایت لازم ہے کیونکہ جماعت میں بوڑھے بھی ہوتے ہیں اور کمزور بھی اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے بہت سے حضرات کے پیچھے نمازیں پڑھی ہیں ان میں سب سے زیادہ مشابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سے اس جوان کی نماز ہے یعنی عمر بن عبدالعزیز کی۔ اور اندازہ لگایا کہ ان کا رکوع و سجود دس تسبیحات کے برابر تھا اگرچہ دس سے کم کہتے ہوں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سجدے اسی اندازے پر کرتے۔ آپ جب سجدہ میں جاتے تو ہاتھوں سے پہلے گھٹنوں کو زمین پر رکھتے اس کے بعد ہاتھوں کو رکھتے بعد ازاں پیشانی و بنی شریف رکھتے۔ بعض کے نزدیک پہلے بنی شریف اس کے بعد پیشانی مبارک رکھتے کیونکہ یہ اقرب ہے۔ امام ابو حنیفہ، شافعی اور امام احمد کا مذہب یہی ہے کہ گھٹنوں کو پہلے رکھتے اور امام مالک اور اوزاعی کے مذہب میں گھٹنوں سے پہلے ہاتھوں کو زمین پر رکھنا ہے امام احمد کی بھی ایک روایت ایسی ہی ہے اور سات عضو کے ساتھ سجدہ فرماتے۔ چہرہ، دونوں ہاتھ دونوں گھٹنے دونوں قدم اور پیشانی اور بنی شریف دونوں سے کرتے۔ صرف پیشانی اور ناک پر اکتفا میں چند قول ہیں۔ احناف کے نزدیک دونوں سے ہے اور دونوں قدم اٹھ جانے سے سجدہ میں نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ اور ایک قدم اٹھنے سے مکروہ۔ (کذافی الشرح ابن الہمام) اور سجدے میں ہاتھوں کو پہلو سے دور رکھتے اس طرح کہ حضور کے دونوں بغل شریف کی سفیدی ظاہر ہو جاتی۔ بازوؤں اور پیٹ کو رانوں سے بھی دور رکھتے اتنا کہ بکری کا بچہ اس کے درمیان سے گزر جاتا۔ اور سجدے میں سر مبارک کو دونوں ہتھیلیوں کے درمیان رکھتے اور قومہ و جلسہ بھی رکوع و سجود کے مقدار فرماتے۔ کبھی اسے طویل فرماتے کہ لوگوں کو وہم ہو جاتا کہ نماز بھول گئے ہیں اور صحیحین میں ہے کہ قیام، رکوع، اعتدال سجدہ اور جلسہ قریب قریب برابر و یکساں ہوتے تھے۔ اور یہ اس پر محمول ہے کہ جب قیام طویل ہوتا تو رکوع و قومہ اور سجدہ و جلسہ بھی سب طویل ہوتے۔ اور جب قیام خفیف ہوتا تو یہ سب خفیف ہوتے۔ یہ نہیں کہ سب بمقدار قیام ہوتے۔ اس حدیث کی پہلی تاویل کی گئی ہے اور یہ باعتبار عادت و اکثر احوال پر ہے۔ ورنہ بعض اوقات جیسے نماز خسوف و کسوف میں اور کبھی نماز تہجد میں رکوع و سجود اور جلسہ و قومہ قیام کے برابر ہوتے تھے اور رکوع و سجود اور جلسہ و قومہ کے اعتدال و اطمینان کے باب میں احادیث بکثرت موجود ہیں۔ اور کم سے کم یہ ہے کہ صلب یعنی ریڑھ کی ہڈیاں سیدھی ہو جائیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ چوری میں سب سے بدترین چوری نماز میں ہے۔ صحابہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ نماز میں چوری کیسے ہوگی۔ فرمایا اس طرح کہ رکوع و سجود کو پورا نہ کرے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز پڑھ رہا ہے اور رکوع و سجود کو پورا نہیں کرتا ہے جب وہ شخص نماز سے فارغ ہوا تو حذیفہ نے اسے اپنے پاس بلایا اور فرمایا تو نے جو یہ نماز ادا کی ہے تو تو نے نماز کی حقیقت ادا نہیں کی، اگر تو اس حال میں مرجائے تو تو غیر فطرت پر مرے گا۔ مطلب یہ کہ اس دین کے سوا پر مرے گا جس دین پر حق تبارک و تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا فرمایا ہے۔

امام شافعی، امام احمد، امام ابو یوسف رحمہم اللہ کے نزدیک رکوع و سجود اور رکوع و سجود کے درمیان قیام اور دونوں سجدوں کے درمیان جلسہ سب میں تعدیل و اطمینان فرض ہے اور بقول مشہور امام احمد کے نزدیک ایک تسبیح کی برابر رکوع و سجود بھی واجب اور ایک روایت میں فرض ہے اور ایک روایت میں سنت۔ امام اعظم ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک رکوع و سجود میں اطمینان، کرخی کی روایت کردہ ظاہر قول کے بموجب واجب ہے اور یہ وجوب دونوں سجدوں کے درمیان میں بھی شامل ہے۔ اور

جرجانی کی روایت کردہ قول کے بموجب سنت ہے لیکن قومہ و جلسہ میں اطمینان بہر طور سنت ہے۔ اور مالکی علماء بھی اسی کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رکوع کی حقیقت انحناء یعنی جھکنا ہے اور سجدے کی حقیقت زمین پر پیشانی رکھنا ہے۔ اور ان دونوں کے مفہوم میں ایسا اجمال نہیں ہے جو بیان کا محتاج ہو للذا فرضیت کم سے کم کے ساتھ متعلق ہے اور زیادہ، تکمیل و تتمیم کے باب سے متعلق ہے۔ کیونکہ اس کے ترک سے نماز ناقص و نا تمام رہتی ہے۔ اور اس کا فاعل گنہگار ہوتا ہے اور شمنی بعض ائمہ مذاہب سے نقل کرتے ہیں کہ جو رکوع و سجود میں اعتدال کو ترک کرتا ہے اس پر اعادۂ نماز لازم ہو جاتا ہے۔ اور شرح ابن الہمام میں منقول ہے کہ امام محمد رحمہ اللہ سے ترکِ طمانیت کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا میں ڈرتا ہوں کہ جائز نہ ہو اور سرخسی سے مروی ہے کہ جو اعتدال کو ترک کرے اس پر نماز کا اعادہ لازم ہے اور بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ اعادہ لازم ہے اور فرض ثانی سے واقع ہے اور یہ اول سے عدم سقوط کو لازم ہونے کا تقاضا کرتا ہے اور یہ لازم ترکِ رکن ہے نہ کہ واجب (انتہیٰ) یہ گفتگو رکوع و سجود میں تعدیل و اطمینان کے سلسلے میں ہے لیکن قومہ و جلسہ میں علماء فرماتے ہیں کہ ایک رکن سے دوسرے رکن کی طرف منتقل ہونا مقصود بذاتہ نہ تھا للذا رکوع سے سر اٹھانا واجب نہ ہوگا اس لئے کہ اس سے سجدہ کی طرف منتقل ہونا بغیر سر اٹھائے ممکن ہے۔ بخلاف سر اٹھا کر دوسرے سجدہ کی طرف جانا۔ اس لئے کہ دوسرا سجدہ بغیر سر اٹھائے ممکن نہیں۔ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی ایک روایت کے بموجب رکوع سے سر اٹھانا فرض ہے لیکن سیدھا کھڑا ہونا فرض نہیں ہے اور ائمہ کا تمسک و استدلال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل مبارک سے ہے جو اس باب میں ایک نہج اور ایک طور پر مستمر و دائم تھا اور یہ حدیث بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک اعرابی مسجد میں داخل ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کے ایک گوشہ میں جلوہ افروز تھے اس اعرابی نے دو رکعت نماز ادا کی اور رکوع و سجود کو پورا ادا نہ کیا اس کے بعد وہ بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوا اور سلام عرض کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دے کر فرمایا دوبارہ نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز ادا نہیں کی۔ وہ شخص گیا اور نماز پڑھی پھر حاضر ہو کر سلام عرض کیا فرمایا دوبارہ نماز پڑھو تم نے نماز ادا نہیں کی۔ تیسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ اس پر اس شخص نے عرض کیا قسم ہے اس خدائے ذوالجلال کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ میں اس سے بہتر نماز ادا نہیں کر سکتا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے سکھایئے کہ کس طرح نماز ادا کروں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو، استقبال قبلہ، قیام اور قرات بیان کرنے کے بعد فرمایا رکوع اس طرح کرو کہ تم سکون و قرار پالو پھر اپنا سر اٹھا کر سیدھے کھڑے ہو جاؤ اور اسی طرح سجدے کیلئے فرمایا۔ امام ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ اس شخص کو اعادۂ نماز کا حکم فرمانا اس کراہت و نقصان کی بنا پر تھا جو اس سے سرزد ہوا نہ کہ بربنائے بطلان و فساد، اگر تعدیل فرض ہوتی تو ہر دفعہ اسے نہ چھوڑتے کہ دوبارہ اس نماز کو ادا کرے اور اسے برقرار رکھ کر اسے آخر تک یہ تعلیم نہ فرماتے۔ اور ابو داؤد و ترمذی اور نسائی کی حدیث کے آخر میں واقع ہے کہ۔ "فَاِذَا فَعَلْتَ ہٰذَا فَقَدْ تَمَّتْ صَلٰوتُکَ وَاَمَّا اَنْقَصْتَ مِنْ ہٰذَا فَاِنَّمَا اَنْقَصْتَ مِنْ صَلٰوتِکَ۔" جب تم نے ایسا کر لیا تو تم نے اپنی نماز پوری پالی۔ لیکن اگر تم نے اس سے کم کیا تو تم نے اپنی نماز کو ناقص بنا لیا للذا اس کا نماز نام رکھنا اور اس کی تعریف نقصان سے فرمانی اسی صورت میں ہے کہ تعدیل و اطمینان مفقود ہوا اور یہ عدم فرضیت پر دلالت کرتا ہے ورنہ فرماتے: "لَذَھَبَ وَبُطِلَ مُثْلاً" (واللہ اعلم)۔

دعاہائے ماثورہ در سجدہ۔ جاننا چاہئے کہ نماز شروع کرنے کے سلسلہ میں جیسا کہ گزرا اور رکوع و سجود اور قومہ و جلسہ میں بیان ہوا۔ سجدے میں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دعائیں ماثورہ ہیں چنانچہ فرمایا سجدے کی حالت میں دعائیں خوب کوشش کرو۔ اس لئے کہ لائق ہے کہ ساجدوں کی دعائیں مستجاب ہوں نیز مروی ہے کہ سجدے کی حالت میں بندہ خدا سے بہت قریب ہوتا ہے۔ دعا کی دو قسمیں ہیں ایک دعائے ثناء و تمجید، دوسرے دعائے طلب و سوال۔ علماء فرماتے ہیں کہ حضرتِ رب کریم و وہاب میں مدح و

ثنا کرنا متضمن سوال و طلب ہے اس ارشاد کے بموجب فرمایا: "مَنْ شَغَلَهُ ذِكْرِي عَنْ مَسْئَلَتِي أَعْطَيْتُهُ أَفْضَلَ مَا أُعْطِي السَّائِلِينَ۔"
جو شخص اپنے لئے مانگنے کے برعکس میرے ذکر میں مشغول رہے میں اسے مانگنے والوں سے زیادہ اور افضل دیتا ہوں اور یہی دعا کا حاصل و مقصود ہے۔ اور اس باب میں دعاہائے ماثورہ دونوں قسموں کو شامل ہیں۔ اور اس جگہ سے معلوم ہوگیا کہ احناف جو نماز میں اذکار پر انحصار رکھتے ہیں اور صراحت سے دعا کرنے کو منع کرتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے نیز دعا کرنے کے حکم بجالانے سے وہ فارغ و خارج نہیں ہیں اور حقیقت و جامعیت یہ ہے کہ نوافل میں صراحت سے دعا کرنے سے بھی حکم پورا ہوجاتا ہے۔ اور فرائض میں تسبیحات و اذکار پر انحصار کرنے سے بھی۔ اور بعض حدیثوں سے بھی نوافل اور رات کی نماز کے ساتھ تخصیص سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ بعض احناف نے ان زیادہ دعاؤں کو حرام اور غیر مفسد رکھا ہے۔ تعجب ہے کہ باوجود احادیث صحیحہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل وارد ہونے کے اس پر حرام کا اطلاق کرتے ہیں اور معلوم نہیں ہوتا کہ مطلق نماز میں حرام رکھتے ہیں۔ خواہ فرائض و نوافل ہی ہوں اور یہ بہت ہی بعید ہے۔ جب تک کہ وہ مخصوص فرائض کے ساتھ نہ رکھیں۔ اور یہ اس تقدیر پر ہے کہ نوافل کے ساتھ حرمت معلوم و مروی ہو اور فرائض میں تو قطعاً مروی نہیں ہے غرضیکہ یہ مقام تردد کا مقام ہے۔ (واللہ اعلم)

اور جب دوسرے سجدے سے سر اٹھائے اور دوسری رکعت کیلئے اٹھے تو اس میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ زمین پر بیٹھے اور دونوں ہاتھ زمین پر رکھے پھر کھڑا ہو اسے جلسہ استراحت کہتے ہیں اس جلسے کے حکم میں بھی علماء کا اختلاف ہے بعضے اسے سنت پر محمول کرتے ہیں جیسے کہ امام شافعی کا مذہب ہے وہ کہتے ہیں کہ سنت یہ ہے کہ دوسرے سجدے کے بعد زمین پر خفیف نشست سے بیٹھے پھر فوراً کھڑا ہوجائے۔ اور بعضے اسے ضرورت و حاجت پر محمول کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ بیٹھنا عذر و حاجت کی بنا پر تھا جو کبر سنی وغیرہ سے تھا۔ یہی امام ابو حنیفہ اور امام مالک کا مذہب ہے۔ اور امام احمد کے مذہب میں یہی مختار ہے اور یہ سب کہتے ہیں کہ یہ سنت نہیں ہے۔ اور امام شافعی کا تمسک اس حدیث سے ہے جو بخاری و ترمذی اور نسائی میں مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ پہلی اور تیسری رکعت میں جب تک زمین پر بیٹھے نہیں کھڑے نہ ہوئے اور شمنی روایت کرتے ہیں کہ ابن ابی، نعمان بن ابی عباس سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے بکثرت اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پایا ہے کہ جب وہ اپنے سر مبارک کو دوسرے سجدے سے پہلی اور تیسری رکعت میں اٹھاتے تو اسی طرح سیدھے کھڑے ہوجاتے بغیر اس کے کہ وہ بیٹھیں۔

اور ابن مسعود، علی مرتضی، عمر، ابن عمر، ابن عباس اور ابن زبیر رضی اللہ عنھم سے بھی اسی طرح روایت کیا گیا ہے۔ اور یہ تمام اصحاب رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں اکابر صحابہ اور اتباع حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں سخت تر اور عامل تر بمقابلہ مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کے ہیں کیونکہ مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ، احترام اور صحبتِ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ان کے ہم پلہ نہیں۔ لہٰذا ان حضرات کی تقدیم واجب ہے۔ اور ابو داؤد، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہوتے وقت ہاتھوں سے ٹیک لگا کر کھڑے ہونے سے منع فرمایا۔ اور وائل کی حدیث میں ہے کہ جب کھڑے ہوتے تو رانوں پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے۔ ان حدیثوں میں جمع و توفیق کی یہ صورت ہے کہ مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کی حدیث کو کبر سنی اور کمزوری پر محمول کیا جائے اور اسی پر جمہور ائمہ ہیں، اور جاننا چاہئے کہ اس جگہ جو ذکر کیا گیا ہے وہ جلسہ استراحت میں اختلاف تھا لیکن کھڑے ہوتے وقت رانوں پر ٹیک لگانا یا زمین پر ٹیک لگانا بغیر جلسہ استراحت کے سنت ہے امام ابو حنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک سنت یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھے اور اسی سے ٹیک لگاتے ہوئے کھڑا ہوجائے اور یہ اس حدیث کی بناء پر ہے جو ابو داؤد نے وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گھٹنوں اور رانوں پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے دیکھا ہے

نیز ابو داؤد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہوتے وقت زمین پر ہاتھ سے ٹیک لگاکر کھڑے ہونے سے منع فرمایا۔ اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک جلسہ استراحت نہیں ہے۔ لیکن کھڑے ہوتے وقت زمین پر ٹیک لگاتے ہیں اور ہمارے نزدیک بھی بحکم ضرورت، زیادتی مشقت، کبر سنی اور کمزوری کے وقت اس سے ٹیک لگانا جائز ہے۔

تشہد میں بیٹھنا۔ وصل:۔ اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشہد میں بیٹھتے تو بایاں پاؤں بچھاتے اس پر بیٹھتے اور داہنا پاؤں کھڑا رکھتے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب یہی ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب بھی قعدہ اولیٰ میں یہی ہے اسے وہ افتراش کہتے ہیں اور دوسرے قعدہ کو "تورک" کہتے ہیں۔ امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ ہر وہ تشہد جس کے بعد دوسرا تشہد نہ ہو خواہ ایک ہی تشہد ہو جیسا کہ نماز فجر میں ہے خواہ دو تشہد ہوں جیسے کہ نماز فجر کے سوا میں تورک کرتے ہیں اس کی صورت یہ ہے جیسا کہ فقہ شافعی کی مشہور کتاب "حاوی" میں بیان کیا گیا ہے کہ دونوں پاؤں کو داہنی جانب نکال کر اپنی عادت پر ڈال دے اور زمین پر سرین کے ذریعہ بیٹھے ان کی دلیل ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے جس میں انہوں نے جماعتِ صحابہ سے کہا کہ میں تم سب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کو زیادہ جاننے والا ہوں اور امام مالک کے نزدیک دونوں تشہد میں تورک ہے اور امام احمد کے نزدیک جس نماز میں دو تشہد ہیں اس میں آخری تشہد میں تورک کرتے ہیں۔ اس لئے کہ نمازی پہلے تشہد میں حرکت کیلئے مستعد و آمادہ ہے اور حرکت و قیام ہیئت افتراش میں زیادہ آسان ہے۔ اور جلسہ اخیرہ کے بعد کوئی عمل نہیں ہے تو تورک، وہ ہیئت ہے جو سکون و استقرار میں زیادہ مناسب ہے۔ اس مسئلہ میں ان چاروں اماموں کے چار مختلف اقوال ہیں۔

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی حجت یہ ہے کہ علماء فرماتے ہیں کہ مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں اور دیگر حدیثوں میں بھی افتراش کا طریقہ مطلقاً آیا ہے۔ کیونکہ تشہد میں سنت یہی ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بغیر تقیید اور بغیر تشہد اولیٰ یا اخیرہ کی قید کے یوں ہی بیٹھا کرتے تھے اور بعض حدیثوں میں جو آخری تشہد میں تورک کا طریقہ مذکور ہے تو اسے حالت عذر یا کبر سنی یا ان میں طویل دعاؤں پر محمول کرتے ہیں۔ اس لئے کہ تورک کے طریقہ میں مشقت بہت کم ہے اور ممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف وقتوں میں ہر ایک طریقہ وجود میں آیا ہو۔ جیسے کہ اس کی مثال اعمال سنن و نوافل میں واقع ہوئی ہے۔

اور ایک صحابی فرماتے ہیں کہ: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَ فِیْ كُلِّ اَمْرٍ سَعَةً" اللہ تعالیٰ ہی تعریف کا مستحق ہے جس نے ہر حکم میں وسعت و گنجائش رکھی۔

اور جب تشہد پڑھتے تو دونوں ہاتھوں کو دونوں رانوں پر رکھتے اور داہنے ہاتھ میں عقد و اشارہ کرتے۔ شافعیوں کے نزدیک عقد، ترپن کے عدد پر ہے اس کی صورت یہ ہے کہ مسبحہ کے سوا تمام انگلیوں کا قبض کرے۔ اور مسبحہ کو کھلا چھوڑ دے۔ اور انگوٹھے کے کنارے کو مسبحہ کے نیچے ہتھیلی کی طرف رکھے علمائے شافعیہ نے ترپن کے عدد کی یہی تشریح کی ہے۔ ان کی سند حضرت ابن عمر کی وہ حدیث ہے جو مسلم میں مروی ہے اور احناف کے نزدیک نوے کا عدد ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ خنصر اور بنصر کو قبض کرے اور مسبحہ کو کھلا چھوڑے۔ اور انگوٹھے کو وسطی سے حلقہ بنائے اور یہ حدیث بھی مسلم میں عبد اللہ بن زبیر سے مروی ہے۔ اور مذہب احمد اور شافعی کے قدیم قول میں بھی مختار ہے اور امام مالک کے نزدیک داہنے ہاتھ کی تمام انگلیوں کا قبض کرنا ہے۔ اور مسبحہ کو چھوڑے رکھنا اور اس سے حرکت کرنا ہے۔

شوافع کے نزدیک حلقہ بنانے کی ایک اور صورت بھی ہے وہ یہ کہ انملہ وسطی کو ابہام کے دونوں گرہوں کے درمیان رکھے۔ اور انگشت مسبحہ کو کلمۂ شہادت میں اٹھائے اور اشارہ کا وقت، بعض کے نزدیک الا اللہ کا تلفظ ہے اور آگے بعض کے نزدیک اس کے تمام

ہوتے وقت تلفظ کلمہ اللہ کے ہے اور مشہور یہ ہے کہ نفی کے وقت یعنی لا الہ کے وقت انگلی اٹھائے اور اثبات کے وقت یعنی الا اللہ پر رکھ دے۔ اور چاہئے کہ اشارہ اوپر کی جانب کرے تاکہ جہت کا موہم نہ ہو اور جاننا چاہئے کہ داہنے ہاتھ کی انگلیوں کا مذکورہ کیفیت پر باندھنا اور مسبحہ سے اشارہ کرنا صحیح حدیثوں میں آیا ہے۔ اور جامع الاصول میں کتب ستہ سے اس باب میں بکثرت حدیثیں مروی ہیں اور بعض حدیثوں میں عقد کا ذکر اشارہ کرنے کے ساتھ ہے۔ اور بعض میں صرف اشارہ کرنا ہے۔ یہی مذہب محدثین اور فقہائے مجتہدین اور کثیر صحابہ و تابعین رحمہم اللہ کا ہے اور علماء فرماتے ہیں کہ حق یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ اور صاحبین رحمہم اللہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ اور متقدمین علمائے حنفیہ اس کی تصریح کرتے ہیں لیکن متاخرین علمائے احناف کے درمیان اختلاف رونما ہوا ہے اور ہم اگر تمام حدیثوں کو ذکر کریں تو بات طول پکڑ جائے۔ بحمد اللہ جو ان کے مقامات ہیں وہاں علمائے مذہب کے کلام کو لائیں گے تاکہ سود مند ہو۔

اور شمنی کہتے ہیں کہ امام ابو یوسف نے اپنی "امالی" میں ذکر کیا ہے کہ خنصر اور اس سے متصل انگلی کو باندھے اور وسطی و ابہام سے حلقہ بنائے اور مسبحہ سے اشارہ کرے۔ اور امام محمد رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشارہ کرتے تھے اور جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہم بھی کرتے ہیں۔ یہی قول امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا ہے۔ نیز شمنی، "ظہیریہ" سے نقل کرتے ہیں کہ جب نمازی تشہد کو شروع کرے اور اشہد ان لا الٰہ الا اللہ پر پہنچے تو کیا داہنے ہاتھ کی مسبحہ سے اشارہ کرے یا نہیں۔ اس میں علماء اختلاف کرتے ہیں پھر کس طرح اشارہ کے وقت حکایت کرے۔ فقیہہ ابو جعفر سے یہ ہے کہ خنصر و بنصر کو باندھے اور وسطی و ابہام سے حلقہ بنائے اور مسبحہ سے اشارہ کرے۔ اور "منتہی المفتی" میں مذکور ہے کہ اشارہ کرنا مکروہ ہے۔ (انتہیٰ)

کفایہ سے ہدایہ کے حواشی میں لکھتے ہیں کہ محیط میں مذکور ہے بعض کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے نزدیک تشہد میں داہنے ہاتھ کی مسبحہ کو اٹھانا سنت سے ہے۔ اسی طرح امام ابو یوسف سے مروی ہے اور علامہ نجم الدین ظاہر کہتے ہیں کہ جب ہمارے تمام اصحاب سے اشارہ کرنے کے سنت ہونے میں روایتیں متفق ہیں۔ اور اہل کوفہ اور اہلِ مدینہ سے بھی ایسا ہی مروی ہے اور اس میں بکثرت اخبار و آثار بھی مروی ہیں تو یقیناً اس پر عمل کرنا اولیٰ ہوگا۔ (انتہیٰ) اور شرح وقایہ میں کہا گیا ہے کہ عقد و اشارہ ہمارے اصحاب سے آیا ہے۔ (انتہیٰ) اور یہ بات ندرت سے خالی نہیں جو ہدایہ میں بسط اصابع اور نفی عقد کے باب میں کہتے ہیں کہ یہ وائل بن حجر کی حدیث میں مروی ہے حالانکہ کتب احادیث میں ابو داؤد، نسائی، دارمی، ابو یعلی اور عبدالرزاق وائل سے متعدد روایتوں کے ساتھ ابہام و وسطی سے حلقہ بنا کر اشارہ کرنا روایت کرتے ہیں اور شیخ امام اجل علی متقی رحمہ اللہ نے اس باب میں ایک رسالہ مرتب کیا ہے جس میں مذہب حنفی کی فقہی روایتوں اور ان کے اختلافات کو ذکر کر کے احادیث صحیحہ بیان فرمائی ہیں اور عقد و اشارہ کو راجح قرار دیا ہے اور اس رسالہ کو مشکوٰۃ کی شرح اور سفر السعادۃ کی شرح میں ہم نے ترجمہ کیا ہے۔ (وباللہ التوفیق)

خطاب "اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ" کے بارے میں دو سوال کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ نماز میں بشر کو خطاب کرنا ممنوع اور مفسد نماز ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے ہے اور درحقیقت نماز میں یہ دعا ہے اگرچہ بصیغہ خطاب ہے اور دراصل یہ معراج کا قصہ ہے جیسا وہاں واقع ہوا۔ ویسا ہی یہاں برقرار رکھا گیا۔ اور اس تقریر سے دوسرے سوال کا جواب بھی حاصل ہو گیا۔ جو یہ دوسرا سوال کرتے ہیں کہ غیبت سے خطاب کی طرف پھرنے میں کیا حکمت ہے۔ کیونکہ مقتضائے سیاق لفظ غیب کا ہے۔ چنانچہ اس طرح کہا جاتا کہ "اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالسَّلَامُ عَلَی النَّبِیِّ وَالسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ۔" مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جس طرح منقول ہوا اور جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو تعلیم دی اسی کو محفوظ و برقرار رکھا گیا ہے۔

صاحبِ مواہب لدنیہ، اہلِ معرفت کے طریقہ پر فرماتے ہیں کہ نمازی جب ملکوت کے دروازے التحیات کے ذریعہ کھلواتے ہیں تو انہیں حرم عزت الٰہی تبارک وتعالیٰ میں داخل ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی جاتی ہے پھر جب ان کی دیدۂ بصیرت روشن ہو جاتی ہے اور آگاہ ہو جاتے ہیں اور نبیِ رحمت کی وساطت اور آپ کی متابعت کی برکت سے داخل بارگاہِ قدس ہو جاتے ہیں۔ اس وقت حبیب خدا کو حرم حبیب میں موجود پاتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مواجہ ہو کر آپ پر عرض کرتے ہیں "اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ۔" (انتہیٰ)

بعض اربابِ تحقیق فرماتے ہیں کہ یہ خطاب، تمام ذرات و موجودات میں حقیقتہ محمدیہ کے سرایت کئے ہوئے ہونے کے اعتبار سے ہے اور بندے کے باطن میں حاضر و موجود ہونے کی وجہ سے ہے۔ بندے کو اس حالت کا انکشاف نماز میں ہوتا ہے کیونکہ نماز کی حالت میں ہونا افضل حالات اور اقرب مقامات ہے۔

اور کرمانی شرح بخاری میں فرماتے ہیں کہ یہ خطاب، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ حیات اور موجودگی میں تھا لیکن بعد وفاتِ صحابہ کرام اس طرح سلام عرض کرتے تھے کہ "اَلسَّلَامُ عَلَی النَّبِیِّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ"

بعض روایتوں میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے تشہد میں اس طرح پڑھتے "اشھدان لا الٰہ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنِّی رَسُوْلُ اللّٰہِ۔" رافعی جو ائمہ شوافع میں سے ہیں وہ اس روایت کو بیان کرتے ہیں لیکن ان کی روایت مصرح نہیں ہے ہاں یہ صحیح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کسی معجزے کے ظہور کے وقت فرماتے "اَشْھَدُ اَنِّی رَسُوْلُ اللّٰہِ" صحیح بخاری میں باب معجزات النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں مروی ہے کہ ایک سفر میں صحابہ کرام کا زاد راہ کم ہو گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب چیزوں کو جمع کر کے ایک طشت میں رکھا اور برکت کی دعا فرمائی اس کے بعد تمام لشکر نے اس کے ایک گوشے سے اپنے اپنے برتن بھر لئے اور یہ معجزہ غزوۂ تبوک میں بھی ہوا تھا اس وقت ستر ہزار افراد تھے اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنِّی رَسُوْلُ اللّٰہِ۔"

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیْنَ۔" میں امت کے لئے تنبیہہ ہے کہ وہ زیور اصلاح سے آراستہ ہوں تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سلام سے اور تمام مخلوق کے سلام سے مشرف و محظوظ ہوں اور کوئی اس فضلِ عظیم سے محروم نہ رہے اس جگہ لازم آتا ہے کہ نماز میں جس طرح خدائے عزوجل کا حق ہے اسی طرح تمام مسلمانوں کا حق ہے اور جو نماز کو ترک کرتا ہے گویا وہ حق خدائے عزوجل کے ساتھ تمام مسلمانوں کے حقوق کو بھی ادا نہیں کرتا جو مسلمان گزر گئے اور جو قیامت تک آئیں گے۔ اس بنا پر "اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیْنَ۔" کا قول واجب ہے۔

اور آخری تشہد میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا، امام شافعی کے نزدیک واجب ہے۔ اور امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ کے نزدیک سنت ہے جیسا کہ پہلے اپنے مقام میں بیان گزر چکا ہے۔

طبرانی، ابن ماجہ اور دار قطنی حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس شخص کی نماز ہی نہیں جو اپنے نبی پر درود نہ بھیجے۔

دار قطنی ابو مسعود انصاری سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص نماز پڑھے اور وہ نماز میں مجھ پر اور میرے اہلِ بیت پر درود نہ بھیجے تو اس کی نماز قبول نہیں کی جائے گی درود کے کلمات اور اس کے صیغوں میں متعدد روایتیں مروی ہیں لیکن اس قدر کہنا کافی ہے کہ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا اِبْرٰھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی سَیِّدِنَا اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا اِبْرٰھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

جیسا کہ میں نے بعض مشائخ سے سنا ہے اور ابن مسعود کی حدیث کے آخر میں "فی العالمین انک حمید مجید۔" آیا ہے۔ اگر اسے بھی کہے تو بہتر ہے۔ اور بعض روایتوں میں "وارحم وترحم کمار حمت وترحمت۔" آیا ہے۔ قاضی ابو بکر ابن العربی مالکی اور صید آلاتی شافعی نے اس کی صحت کا انکار کیا ہے اور اسے از قبیل بدعت قرار دیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو درود کی کیفیت وحی سے تعلیم فرمائی۔ لہٰذا اس پر اضافہ کرنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر استدراک ہے۔ (معاذ اللہ)

اور مواہب میں احناف کی کتاب "ذخیرہ" سے منقول ہے کہ مکروہ ہے کیونکہ یہ موہم نقص ہے اس لئے کہ "رحمت اور ترحم" کسی ایسی چیز کو غالب کرنے میں بولتے ہیں جس پر ملامت و سرزنش کی جاتی ہے اور ابن عبدالبر جو کہ مشاہیر محدثین سے ہیں اس پر جزم کے ساتھ کہتے ہیں کہ کسی کی روایت ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جاتا تو کہتا رحمہ اللہ، اس لئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "من صلّی علیّ" (جو مجھ پر صلوٰۃ بھیجے) اور "من ترحم علیّ" نہیں فرمایا اور ترحم کے صیغہ کی کوئی دعا نہیں ہے اگرچہ صلوٰۃ کے معنی رحمت کے ہیں لیکن صلوٰۃ کے لفظ کو آپ کی عظمت کیلئے مخصوص گردانا گیا ہے لہٰذا اس سے کسی اور لفظ کی طرف عدول نہیں کیا جائے گا۔ اور قاضی عیاض رحمہ اللہ نے جمہور علماء سے اس کا جواز نقل کیا ہے۔ اور قرطبی کہتے ہیں کہ یہی صحیح ہے کیونکہ اس بارے میں احادیث مروی ہیں اور خود تشہد میں آیا ہے "السّلام علیک ایّھا النّبیّ ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔" اور حق یہ ہے کہ خاص اس لفظ کا انکار درست ہے کہ کہے "اللّھم ارحم وترحم الیٰ آخرہ۔" نہ یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رحمت کی نسبت اور اس کا اطلاق (واللہ اعلم)

درود پڑھنے کے بعد دعا کرتے۔ اس جگہ مشہور دعا یہ ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْیَا وَفِتْنَةِ الْمَمَاتِ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْمَاْثَمِ وَالْمَغْرَمِ۔

اور حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کی حدیث میں: "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ جَھَنَّمَ۔" بھی آیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس دعا کی اسی طرح تعلیم دیتے جس طرح قرآن کی سورۃ کی تعلیم دیتے تھے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ مجھے کوئی دعا بتایئے جسے میں اپنی نماز میں پڑھوں فرمایا اسے پڑھو:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا کَثِیْرًا وَّلَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْ لِیْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِیْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ۔

امیر المومنین سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشہد اور سلام پھیرنے کے درمیان یہ دعا پڑھتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَآ اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ وَمَا اَسْرَفْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّیْ اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ۔

اور دوسری حدیث میں یہ دعا بعد فراغِ سلام آئی ہے۔ اور ممکن ہے کہ دونوں جگہ یعنی سلام سے پہلے اور سلام کے بعد بھی پڑھتے

ہوں۔ یہ دعائیں اور اس قسم کی دیگر دعاؤں میں جس میں طلب مغفرت ذنوب اور عذاب قبر، عذاب جہنم اور فتنہ دجال وغیرہ سے استعاذہ ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہونے اور ان کے وقوع پذیر ہونے میں اعتراض کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مغفور و معصوم ہیں پھر طلب مغفرت اور استعاذہ کے کیا معنی ہیں؟ جواب میں کہتے ہیں کہ مقصود تعلیم امت ہے یا امت کیلئے سوال کرنا ہے۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ: "اَعُوْذُ بِکَ لِاُمَّتِیْ" یعنی اپنی امت کیلئے تجھ سے استعاذہ کرتا ہوں۔ یا یہ بطریق تواضع، اظہارِ عبودیت، التزام خوفِ الٰہی، اعظام شان باری اور اس کی طرف افتقار و احتیاج ہے اور اسی اسلوب پر تمام مقربانِ بارگاہ صمدیت کا حال ہے کہ وہ ہمیشہ استعاذہ کرتے رہتے ہیں۔ اور عظمتِ الٰہی اور ہیبت درگاہ لاابالی عزوعلا کے تصور میں استغفار کا اظہار کرتے ہیں۔ اور جب وہ عظمت و ہیبت الٰہی کو دیکھتے ہیں یا کسی ایسی چیز کو اپنے مناسب حال پاتے ہیں جسے وہ اپنے لئے داخل تقصیرات خیال کرتے ہیں اس کا نام گناہ رکھتے ہیں اور استعاذہ و استغفار کرتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سیدرسل صلی اللہ علیہ وسلم تمام پاکوں میں پاکتر اور تمام معصوموں میں معصوم تر ہیں اور جو کچھ کائنات میں موجود ہے اور جو کچھ نابود ہوا سب ہی کا وجود آپ کے طفیل و صدقہ میں ہے اور ساری مخلوق کی بخشش آپ کے صدقہ میں ہے اور خود مغفور بھی ہیں۔ جب آپ خود ایسی دعا مانگیں اور عمل کریں تو دوسرے حضرات کیا کچھ دعامیں کہتے ہوں گے اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم استغفار کے ساتھ مامور من اللہ ہیں حق تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: "وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِکَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ۔" اور استغفار، آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک کے تمام عارفوں، نبیوں، ولیوں اور صالحوں کا عمل رہا ہے شاعر نے ایک حرف بزبان مجاز کہا ہے اس قیاس پر حقیقت میں بھی تصور کر سکتے ہیں بیت۔

دیدم کہ خاطرش زمن آزار می کشد　　　کردم از و قبول گناہ نبودہ را

اس شعر میں آزار خاطر، دعویٰ ہستی کے توہم سے کنایہ ہے کہ اس سے اپنے وجود کو پاک رکھنا چاہئے اور ذنبک اسی سے کنایہ ہے اور غفر کے معنی ڈھانپنے کے ہیں۔ کسی عارف نے کیا خوب کیا ہے۔

ازخدا خواہند سر ذات خود در ذات او　　　ایں بود ساعت بساعت سر استغفارِ شاں

یہ فنافی اللہ سے کنایہ ہے۔ بات اس جگہ اس اصطلاح علم و زبان اور وقت سے باہر نکل گئی جو اس کتاب کے وضع و ترتیب سے متعلق ہے اور جو اس روش پر جاتا ہے اس کی بات طویل ہو جاتی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشہد کے بعد داہنے اور بائیں جانب سلام دیتے۔ چنانچہ آپ کے رخسار ہائے مبارک کی سفیدی دیکھی جاتی آپ فرماتے "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ۔" اور اس میں فرشتوں اور قوم کو مخاطب قرار دیتے اور جماعت میں داہنی جانب کھڑے ہونے کی فضیلت کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کیونکہ معارج قرب سے نزول اور مشہد انوار و نور سے رجوع کے بعد جو کہ نماز ہے پہلی نظر اسی جانب کے لوگوں پر پڑتی ہے اور دو سلام کرنا بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دائمی عادت تھی۔ جسے مشاہیر و عظماء صحابہ میں سے پندرہ حضرات نے روایت کیا ہے اور یہی مذہب امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور دیگر ائمہ کا ہے۔ لیکن امام مالک کے نزدیک، متقابل وجہ ایک سلام ہے رحمہم اللہ علیہم اجمعین اور وہ حدیث جو اس باب میں روایت کی گئی ہے صحیح نہیں ہے اور اگر بعض وقت ہو بھی تو رات کی نماز میں ہوگی چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں جگانے کیلئے ایک سلام کرتے محدثین کہتے ہیں کہ یہ حدیث "معلل" ہے اور اگر "معلل" نہ ہو تو یہ عبارت اس میں صریح نہیں ہے کہ دوسرا سلام نہ کہتے تھے۔ اس میں یہ حدیث خاموش ہے۔ اور ممکن ہے کہ دوسرا سلام بھی ہو مگر اس میں آواز کی بلندی اتنی ہو جس سے اہل بیت کو جگانا مقصود ہو اور اس جگہ امام احمد سے منقول وہ وجہ بھی ظاہر ہو گئی کہ وہ ایک سلام کی تاویل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بلند آواز سے

اعلام وخبردار کرنے کیلئے ایک سلام کہتے اور دوسرا سلام آہستہ فرماتے۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ مقابل وجہ سے مراد یہ ہے کہ سلام کی ابتدا جانب قبلہ سے کرتے اس کے بعد داہنی اور بائیں جانب توجہ والتفات فرماتے کیونکہ اس میں رفع صوت نہ فرماتے۔ اور ایک سلام کے بارے میں سہل بن سعد سے بھی ایک حدیث مروی ہے جو کہ محدثین کے نزدیک مطعون ہے اور امام شافعی سے اہلِ علم نقل کرتے ہیں کہ نمازی کو اختیار ہے چاہے ایک سلام کہے چاہے دو سلام کہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں التفات نہ فرماتے اور صحابہ کرام کو بھی اس سے منع فرماتے۔ خصوصاً نماز فرض میں التفات کے معنی گردن پھیر کر داہنے یا بائیں جانب دیکھنا، لہٰذا گوشہ چشم سے دیکھنا التفات نہیں نہ یہ مکروہ ہے۔ (کذافی النہایہ) اور ابن الہمام شرح میں فرماتے ہیں کہ اس حد تک التفات کرنا مکروہ ہے کہ گردن کو اتنا گھمائے کہ مواجہ قبلہ سے باہر ہو جائے۔ اس کے ساتھ اگر اپنے تمام بدن کو پھیر دے تو اس کی نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ لہٰذا التفات کی ایک قسم مفسد ہے اور ایک قسم مکروہ، جیسا کہ عمل کثیر مفسد ہے۔ اور عمل قلیل مکروہ (انتہیٰ)۔

اور شمنی فرماتے ہیں کہ سینہ کو گھمائے بغیر گردن گھمانا مکروہ ہے اور اگر سینہ گھمائے تو نماز باطل ہو جاتی ہے اور اگر گوشۂ چشم یعنی کنکھیوں سے دیکھے تو مکروہ نہیں، ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ فرمایا، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں گوشۂ چشم سے داہنے بائیں ملاحظہ فرماتے اور علماء فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز میں گوشۂ چشم سے ملاحظہ فرمانا مقتدیوں کے احوال پر مطلع ہونے کے قصد سے تھا یا اس تعلیم امت کی غرض سے کہ یہ مبطل نماز نہیں ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ جب بندہ نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو حق تبارک وتعالیٰ اپنے وجہ کریم سے اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور جب بندہ التفات کرتا ہے اور غیر کی جانب توجہ کرتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتا ہے ابن آدم جس جانب تو دیکھ رہا ہے وہ مجھ سے بہتر نہیں ہے تو اپنے رخ کو میری طرف لا۔ اور جب بندہ دوبارہ التفات کرتا ہے تو حق تعالیٰ پھر ایسا ہی فرماتا ہے اور جب تیسری مرتبہ بندہ غیر کی طرف ملتفت ہوتا ہے تو حق تعالیٰ اپنے وجہ کریم کو اس سے پھیر لیتا ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ "لَاصَلٰوۃَ لِمُلْتَفِتٍ" التفات کرنے والے کی نماز ہی نہیں۔ لیکن اس قدر ثابت شدہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دشمن کی جانب ایک راہ پر مقرر فرمایا وہ شخص تمام رات گھوڑے پر سوار ہو کر پاسبانی کرتا رہا اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مشغول ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی حالت میں اس راہ پر نظر ڈالی۔ جس راہ پر اس شخص کو مقرر فرمایا تھا اور اس گھاٹی کی طرف التفات فرمایا اور یہ قضیہ بر سبیل ندرت اور نفلی نماز میں تھا خواہ وہ سنت فجر ہی ہو جیسا کہ بعض کہتے ہیں اور اگر فرض بھی ہو کہ وہ نماز فجر ہے جیسا کہ "جامع الاصول" سے مفہوم نکلتا ہے تو یہ برائے مہم اور مصلحت اسلام تھا کیونکہ محافظت، نگہبانی اور سلامتی اور ان کی جمعیت کیلئے ہے۔ لہٰذا یہ تداخل عبادات کے باب سے ہے کہ نماز بھی عبادت ہے اور مصلحت مذکورہ کی خاطر اس شخص کی طرف التفات فرمانا بھی دوسری عبادت ہے اور وہ جہاد اور اس کی تدبیر ہے اور نماز خوف بھی اسی قبیل سے ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے تھے "اِنِّیْ لَاُجَہِّزُ جَیْشِیْ وَاَنَافِی الصَّلٰوۃِ" یقیناً میں نماز میں ہوتے ہوئے اپنے لشکر کی تیاری کرتا، اور بخاری نے اپنی صحیح میں اس کے لئے ایک باب باندھا ہے جس کا عنوان ہے: "تَفَکُّرُالرَّجُلِ فِی الصَّلٰوۃِ۔" اور اس عنوان کے تحت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کو لائے ہیں اور اس باب میں اس حدیث کو لائے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ سلام کے بعد نہایت تیزی سے اٹھے اور کاشانۂ اقدس میں تشریف لے گئے پھر باہر تشریف لائے اور فرمایا گھر میں تھوڑا سا سونا تھا جو نماز میں یاد آیا لہٰذا میں نے مکروہ جانا کہ وہ رات بھر گھر میں

رہے۔ میں نے اسے تقسیم کر دینے کا حکم دے دیا۔ یہ سب امور تداخل عبادات کے قبیل سے ہیں اور علماء فرماتے ہیں کہ خیالات، انسانی جبلت و خصلت ہے اور اس جگہ سے معلوم ہو گیا کہ وہ ردی خیالات مذموم ہیں جو عبادات وطاعات کے قبیل سے نہ ہوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی بچہ کے رونے کی آواز سننے سے نماز کو خفیف فرما دیتے۔ تاکہ اس کی ماں نماز کو توڑ کر یا خشوع زائل کر کے فتنہ میں نہ پڑ جائے۔ اور کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں کسی بچہ کے ساتھ متعلق ہو جاتے اور اسے اٹھا لیتے اور اپنے مبارک کندھوں پر بٹھا لیتے اور کبھی امام حسن یا امام حسین رضی اللہ عنہما آتے اور وہ سجدے میں آپ کی پشت مبارک پر بیٹھ جاتے اور ان کی خاطر سجدے کو طویل فرما دیتے۔ اور توجہ خاطر ان کی جانب ان کے حال کی رعایت کے مطابق فرماتے اور کبھی نماز میں ہوتے اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا آتیں اور دروازہ بند ہوتا تو چند قدم مبارک رکھ کر ان کیلئے دروازہ کھول دیتے۔ کاشانۂ اقدس جانب قبلہ تھا۔ اس قسم کی بکثرت مثالیں احادیثِ کریمہ میں مروی ہیں۔

عملِ کثیر کی تعریف: تمام علماء کا عملِ کثیر کی تعریف میں اختلاف ہے۔ مختار یہ ہے کہ جس کام میں دونوں ہاتھ محتاج ہوں وہ عملِ کثیر ہے اس سے مراد یہ ہے کہ عادۃً وہ کام دو ہاتھوں کے بغیر نہ ہو۔ اس تعریف کے بموجب اگر بالفرض ایک ہی ہاتھ سے ایسا کام کرے تب بھی مفسد ہے مثلاً عمامہ باندھنا، قمیص پہننا اور ازار باندھنا وغیرہ اور وہ کام جس میں ایک ہی ہاتھ کی ضرورت ہے اگر اتفاقاً اسے دو ہاتھ سے کر لے تو عملِ قلیل ہے یہ مفسد نہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ایسا کام جسے دیکھنے والا، فاعل کو غیر نمازی خیال کرے تو وہ فعلِ کثیر ہے اور بعض کہتے ہیں کہ فعلِ کثیر وہ ہے جسے نمازی کثیر جانے۔ اور بعض کے نزدیک مختار یہ ہے کہ پے در پے تین بار فعل، کثیر ہے اور اس سے کم قلیل۔ اور اگر کوئی شخص نماز کی حالت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام عرض کرتا تو حضور دستِ مبارک کے اشارے سے سلام کا جواب مرحمت فرماتے۔ اس طریقہ پر کہ دستِ مبارک اس طرح اٹھاتے کہ اس کی پشت اوپر ہی رہتی۔ اور کبھی انگلی کے اشارے پر ہی اکتفا فرماتے اور یہ دونوں طریقے حدیث میں صراحت سے واقع ہوئے ہیں اور کبھی سر مبارک سے اشارہ فرماتے۔ نیز ہم نے دو سلام میں اور اس کے سوا میں اور جواب سلام کیلئے سر کے اشارہ کرنے میں کوئی صریح حدیث نہیں پائی بجز اس روایت کے جو ترمذی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے واقع ہوئی ہے کہ "كَانَ يَرُدُّ اِشَارَةً" (آپ اشارے سے سلام کا جواب دیتے) اس کو بھی سر کے اشارے یا مطلق اشارے پر محمول کرتے ہیں۔ لیکن "جامع الاصول" میں مروی روایتوں کے سیاق کلام سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ دستِ مبارک کے ساتھ ارشاد فرمانا ہے اور بعض شارحین حدیث نے سر سے اشارہ فرمانے کا بھی ذکر کیا ہے مگر کسی حدیث کو بیان نہیں کیا۔ لامحالہ اس خصوص میں کوئی حدیث وہ نہ پاتے ہوں گے۔ (واللہ اعلم)

اب رہا جواب سلام کے علاوہ نماز میں اشارہ فرمانا، تو صلوٰۃِ کسوف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مشغول تھے اور لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد کھڑے تھے ان میں سے ایک نے پوچھا کہ یہ کیا حال ہے اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جواب کے قصد سے آسمان کی طرف سر مبارک سے اشارہ فرمایا (رواہ مسلم) اور دوسری حدیثوں میں جواب سلام، کے سوا میں ہاتھ سے اشارہ فرمانا بھی آیا ہے۔ چنانچہ بیٹھنے اور صبر کرنے کیلئے زمین کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کسی کام کے لئے بھیجا جب واپس آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں تھے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے زمین کی طرف اشارہ فرمایا مطلب یہ کہ بیٹھ جاؤ۔

ایک مرتبہ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے باندی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا تاکہ وہ ان دو رکعت نماز کی حقیقت حال دریافت کرے جو حضور بعد نماز عصر پڑھتے تھے۔ جب باندی آئی تو حضور نماز میں تھے۔ آپ نے باندی کو اشارہ کیا کہ صبر

کرے۔ اس نے صبر کیا۔ یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز تمام فرمائی اور جواب میں فرمایا یہ دو رکعت ظہر کی وہ سنتیں ہیں جن کو میں وفود کے اجتماع کے سبب ادا نہ کر سکا تھا۔ پھر میں نے انہیں قضا کیا تھا۔

اور اوائلِ اسلام میں حضور حالتِ نماز میں سلام کا جواب دیتے تھے اس کے بعد وہ منسوخ ہو گیا اور بخاری و مسلم اور ابو داؤد و نسائی میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ ہم نماز کی حالت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام عرض کرتے تو ہمیں سلام کا جواب عنایت فرماتے تھے جب ہم بعد ہجرت نجاشی شاہ حبش کے یہاں سے واپس آئے تو ہم نے حضور پر نماز کی حالت میں سلام عرض کیا۔ تو آپ نے سلام کا جواب مرحمت نہیں فرمایا اس پر ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! پہلے ہم سلام عرض کرتے تو آپ جواب مرحمت فرماتے تھے فرمایا: "اِنَّ فِی الصَّلٰوۃِ لَشُغُلًا ۔" بعض روایتوں میں ہے کہ فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے حکم میں جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اب حکم فرمایا کہ نماز میں بجز ذکر باری تعالیٰ کے کچھ کلام نہ کرے۔ بعد فراغ نماز حضور صلی اللہ علیہ وسلم سلام کا جواب مرحمت فرماتے اور یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں اس قدر تضرع فرماتے گویا کہ آپ کے شکم اطہر سے ایسی آواز بر آمد ہوتی جیسے دیگ میں جوش کی آواز آتی۔ مطلب یہ کہ اندر اندر آپ ایسا گریہ فرماتے جیسے دیگ میں جوش آتا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ آپ کے سینے سے ایسی آواز معلوم ہوتی جیسے چکی کی آواز۔ یہ رونے کے سبب ہوتا۔

فقہ حنفی میں مذکور ہے کہ اگر آہ و بکا میں آواز بالکل نہ ہو تو مفسد نماز نہیں ہے اور اگر آواز ہو تو اگر کسی درد دنیاوی مصیبت کے سبب ہو تو مفسد ہے اور اگر امر آخرت کے خوف سے ہو اور اس کی امید و رغبت اور ہیبت میں ہو تو مفسد نہیں، بلکہ زیادتی حضور و خشوع پر دلالت کرتی ہے جیسا کہ مُطرف کی حدیث میں ان کے والد سے مروی ہے۔ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ امرِ آخرت کے سبب آواز سے رونے میں اگر اس کے ضبط کی طاقت رکھتا ہے تو مفسد نماز ہے اور ضبط کی طاقت نہیں رکھتا تو مفسد نہیں۔ ایسا ہی شمنی نے بیان کیا ہے "اور کبھی ضرورت سے کھنکارتے اور بے ضرورت نہیں" اسی بنا پر فقہاء بے ضرورت کھنکارنے کو مفسدِ نماز قرار دیتے ہیں اور اگر عذر سے ہے تو مفسد نہیں اور عذر و مجبوری یہ ہے کہ مضطرو بے قرار ہو اور اجتناب و احتراز کی طاقت اس میں نہ رہی ہو۔ اور طبع کے ابھارنے یا علت مرض سے ہو۔ لہٰذا یہ چھینک اور ڈکار کے حکم میں ہو گا۔ اور اگر آواز کو اچھا بنانے کیلئے کرے تو بھی مفسد نہیں ہے اور اگر مقتدی اپنے امام کو ہدایت و تنبیہہ کے لئے کھنکارے تو آیا امام اسے قبول کرے یا نہیں اور اس کی مانند نماز میں ہے یا نہیں تو جواب یہ ہے کہ یہ بات نماز کو فاسد نہیں کرتی۔ ایسا ہی شمنی نے بیان کیا ہے اور نیز فرماتے ہیں کہ تنحنح یعنی کھنکارنے سے مراد یہ ہے کہ اس سے حروف پیدا ہوں اور ہدایہ میں ایسا ہی ہے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں اپنی چشم مبارک کھلی رکھا کرتے بند نہ کرتے۔ صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک پردہ رنگین و منقش بنا کر قبلہ کی جانب ایک دریچہ پر لٹکایا تھا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا اس پردہ کو اتار لو کیونکہ اس کے نقوش و تصاویر نماز میں خلل انداز ہوتے ہیں۔ تصاویر سے مراد یا تو نقوش ہیں یا یہ حرمت تصاویر سے پہلے کا واقعہ ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ دریچہ پر پردہ اس لئے لٹکایا تھا کہ طاقچہ میں ان کی گڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اور اس سے انہوں نے اس کو پوشیدہ کیا تھا اور نہ دیوار پر پردہ لٹکانے کی ممانعت واقع ہے۔ ایسا ہی ابہری نے شرح مشکوٰۃ میں کہا ہے اور مجمع البحار میں ہے کہ دلہن کے گوشہ کی مانند اسے مزین و منقش کر رکھا تھا۔ (واللہ اعلم)

اور بخاری و مسلم میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کامدار لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ جب نماز میں اس پر نظر پڑتی تھی تو خلل واقع ہوتا تھا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس لباس کو جسمِ اطہر سے اتار دیا اور فرمایا اسے

ابو جہم رضی اللہ عنہ کو دے دو کیونکہ انہوں نے ہی اسے پیش کیا تھا اور اس کی کملی میرے لئے لے آؤ کیونکہ اس لباس کے نقوش و کام نے مجھے نماز میں اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا اور مقامِ خشوع و خضوع اور حضورِ قلب کی بلندی سے فروتر لے آیا در حقیقت یہ ارشاد تعلیمِ امت کیلئے تھا۔ (واللہ اعلم)

نیز ایک حدیث شریف میں ہے کہ سلام کا جواب دستِ مبارک کے اشارہ سے دیتے۔ یہ بھی اس پر دلیل ہے کہ نماز میں چشم ہائے مبارک کھلی رکھتے تھے بند نہ رکھتے تھے۔ (کذا قالوا) مخفی نہ رہنا چاہئے کہ یہ حدیثیں دلالت نہیں کرتیں مگر یہ کہ چشم ہائے مبارک ہمیشہ اور ہمہ وقت بند نہ رکھتے تھے۔ اور اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ آپ چشم ہائے مبارک کو دائم و مستمر کشادہ ہی رکھتے لہٰذا اگر مقصود یہ ہو کہ پوری نماز میں آنکھیں بند نہ ہوتیں تو یہ دلائل مکمل ہیں۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ مقصود، کشادگی چشم میں اثبات دوام ہے کہ کبھی بند نہ فرماتے۔ (واللہ اعلم)

اور نماز کی حالت میں آنکھیں بند رکھنے میں کراہت پر فقہاء کا اختلاف ہے اور ہمارے نزدیک مکروہ ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ حق یہ ہے کہ اگر کسی کو نماز میں آنکھیں کھلی رکھنے سے تفرقہ و پریشانی لاحق ہوتی ہو مثلاً جانب قبلہ کوئی ایسی چیز ہو جس سے حضورِ قلب میں خلل واقع ہوتا ہو تو آنکھیں بند رکھنا مکروہ نہیں ہے بلکہ استحباب کے زیادہ قریب ہوگا۔ یہ حکم دلائل کے عموم پر نظر کر کے ہے کیونکہ حضور و برقرار رکھنے کی ترغیب میں احادیث واقع ہیں اور صراحت سے آنکھیں بند رکھنے کی ممانعت میں کوئی حدیث واقع نہیں ہے (واللہ اعلم)

بعد نماز ذکر و دعا۔ وصل:۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد اذکار و دعائیں پڑھا کرتے تھے۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز سے فارغ ہوتے یعنی سلام کرتے تو تین بار استغفار کرتے اور دعا مانگتے: اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَاذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اتنی دیر بیٹھے رہتے جب تک آپ یہ دعا پڑھتے۔ "اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَاذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ۔" ان دونوں حدیثوں کو مسلم نے روایت کیا ہے اور بخاری میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ جب آپ سلام کرتے تو تھوڑی دیر اپنی جگہ ٹھہرے رہتے تھے۔ ہم گمان کرتے ہیں کہ یہ ٹھہرنا اس لئے تھا کہ مسجد سے عورتیں پہلے نکل جائیں تاکہ مردوں سے ان کا اختلاط نہ ہو۔

اس نفی سے مراد کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اس ہیئت پر جس میں سلام سے پہلے تھے زیادہ دیر نہ بیٹھتے تھے مگر اسی قدر اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی داہنی جانب اور کبھی بائیں جانب اور کبھی صحابہ کی طرف رخ انور کر کے پھر جاتے تھے۔ اور دعا و ذکر فرماتے تھے۔ علماء فرماتے ہیں کہ صحابہ کی جانب رخ انور کرنا اس وقت ہوتا جب آپ قرآنی آیت یا کوئی نازل شدہ حکم بیان فرماتے۔

اور نماز کے بعد ادعیہ اور اذکار ان کتب احادیث میں بکثرت مذکور ہیں جو اس ضمن میں مرتب کی گئی ہیں۔ جیسے جزری کی "حصن حصین" اور امام نووی کی "الاذکار" وغیرہ کتابیں۔ یہ لازم نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سب دعاؤں کو ہمیشہ ہی پڑھا کرتے تھے بلکہ ان میں سے جو چاہا پڑھا کبھی کل اور کبھی بعض کو۔ جتنا بھی اجر و فضیلت اور اتباع سنت کیلئے ضروری ہوتا اس مفہوم کی تصریح امام محی الدین نووی نے دعاؤں کے شروع میں اور ان کے سوا مقامات میں فرمائی ہے اور ظاہر ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل شریف بھی اسی نہج پر تھا نہ یہ کہ تمام دعاؤں کو اور تمام اوقات میں لازماً پڑھتے۔ اسی بنا پر بعض کتابوں میں کچھ ایسی دعائیں ہیں جو دوسری کتابوں میں نہیں ہیں۔ اور صحابہ کرام نے ان میں سے جس دعا کو سنا وہ اسی پر عمل کرنے لگے اور اسی کی روایت کرنے لگے۔ اسی طرح تمام اعمال، نوافل اور مستحبات میں یہی صورت حال ہے۔ اور ان میں اختلاف کا موجب بھی یہی صورت حال

ہے۔ نیز علماء فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مستحبات کو یاد دلانے اور ان کے پڑھنے میں رغبت وشوق پیدا کرنے اور اذکار و دعوات میں ترغیب دینے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ان کا وجوب لازم نہیں آتا۔ (واللہ اعلم)

اب ہم اس جگہ بعض ایسے اذکار اور دعاؤں کو بیان کرتے ہیں جن میں کوئی نکتہ اور بات مذکور ہے ان میں پہلی دعائے استغفار ہے جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تین مرتبہ ان لفظوں سے پڑھتے۔ "اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ۔" اور مسلم و ترمذی میں مطلقاً آیا ہے کہ جب سلام پھیرتے تو تین بار استغفار کرتے، اوزاعی سے جو کہ امام اہل شام ہیں پوچھا گیا کہ استغفار کی کیفیت کیا ہے فرمایا۔ فرماتے "اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ، اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ، اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ" اور بعض نادان لوگ اس میں اِستحالہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نماز کے بعد استغفار کرنا اس امر کا وہم پیدا کرتا ہے کہ نماز بھی گناہوں کے زمرے میں سے ہے جیسا کہ اس گمراہ فرقہ سے جسے مہدویہ کہتے ہیں منقول ہے۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ جو کوئی نماز کے بعد کلمہ توحید پڑھتا ہے وہ کافر ہو جاتا ہے اور ان غلطیوں کا صدور، جو نماز میں درپیش آئیں نماز خود ہی استحباب استغفار میں کافی ہے حالانکہ سنت صحیحہ کے وارد ہونے کے بعد ایسی باتیں ساقط الاعتبار ہیں۔

نماز کے بعد پڑھتے۔ "اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْکَ السَّلَامُ تَبَارَکْتَ یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ۔" اسے مسلم نے روایت کیا اور بعض روایت میں "منک السلام" کے بعد "والیک یرجع السلام" بھی زیادہ آیا ہے اور مشائخ کے وردوں میں اس سے بھی زیادہ ہے وہ کہتے ہیں: فَحَیِّنَا بِالسَّلَامِ وَاَدْخِلْنَا دَارَ السَّلَامِ۔ اور صحیح روایتوں میں یہ مروی نہیں مگر اسی قدر جتنا گزرا۔ جیسا کہ شیخ ابن حجر مکی نے شرح مشکوۃ میں بیان کیا ہے۔

اور پڑھتے۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اَللّٰھُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا یَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْکَ الْجَدُّ۔

دونوں جگہ الجد، جیم کے زبر سے ہے جس کے معنی بخت وغنا کے ہیں یا اس کے معنی آباء واجداد کے ہیں مطلب یہ کہ خدا کے حضور غنا و نسب کام نہیں آئیں گے۔ وہاں عمل درکار ہوگا اور بعض جیم کے زیر سے بھی پڑھتے ہیں۔ مطلب یہ کہ کام، فضل و رحمت سے نکلے گا کوشش و محنت، علت و سبب سے نہیں۔ علماء فرماتے ہیں کہ زیر کے ساتھ پڑھنا ضعیف ہے اور مختار زبر ہے اور پڑھتے:

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَلَا نَعْبُدُ اِلَّا اِیَّاہُ وَلَہُ النِّعْمَۃُ وَلَہُ الْفَضْلُ وَلَہُ الثَّنَآءُ الْحَسَنُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ ۰

امام نووی فرماتے ہیں کہ سلام کے بعد تمام انواع ذکر پر مروی شدہ استغفار کو مقدم رکھنا چاہئے اس کے بعد "اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ" اس کے بعد "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ قَدِیْرٌ" تک پڑھنا چاہئے۔ جیسا کہ حدیث میں ہمارے شیخ الشیوخ، شیخ ابن حجر مکی نے شرح مشکوۃ میں بیان کیا ہے اور مسلم کی حدیث میں ہے کہ اس ذکر کو بلند آواز سے پڑھتے تھے اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ ذکر و دعا کے تمام اقسام میں افضل، اخفاء، یعنی آہستہ سے پڑھنا ہے خواہ امام ہو یا منفرد اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جہر فرمانا تعلیم امت کیلئے تھا اور اگر کسی جگہ امام جہر و اعلان میں مصلحت دیکھے اور تعلیم و اعلام مقصود ہو تو درست ہے بلکہ مستحسن ہے۔

اور ہر نماز کے بعد معوذتین پڑھنا بھی آیا ہے اور یہ حدیث حد درجہ صحیح ہے اور معوذات، واؤ کے زیر سے، مراد معوذتین یعنی قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ہے۔ یہ اقل قلیل مذہب کے بموجب دونوں کو جمع کرنا ہے۔ کیونکہ بعض حضرات سورۂ اخلاص بلکہ سورہ قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکَافِرُوْنَ کو بھی داخل کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اس میں شرک سے برأت ہے اور یہ استعاذہ کے معنی میں

ہے۔ یا وہ آیتیں مراد ہیں جو متضمن معنی استعاذہ، تفویض اور توکل کو شامل ہیں۔ معوذتین بھی انہیں میں شامل ہیں جیسے قول باری تعالیٰ "قُلْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ. یا جیسے اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَرَبِّكُمْ. یا جیسے : وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔" وغیرہ یا کلماتِ معوذہ مراد ہیں اور ایک روایت میں معوذتین بھی آیا ہے۔

ہر نماز کے بعد دس مرتبہ "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ" پڑھنا بھی آیا ہے اس میں فضل عظیم ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو نصیحت فرمائی کہ ہر نماز کے بعد "اَللّٰهُمَّ اَعِنِّيْ عَلٰى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ۔" پڑھو اور فرمایا اے معاذ رضی اللہ عنہ! بخدا میں یہ تمہارے لئے پسند کرتا ہوں لہٰذا تم ہر نماز کے بعد اس کا پڑھنا نہ چھوڑنا۔ یہ حدیث علماء کے درمیان معروف ہے اور "وَاللّٰهِ اِنِّيْ لَاُحِبُّكَ" کے ساتھ مسلسل ہے۔ اور یہ فقیر بھی علماء کے طریقہ پر اس کی برکت سے مشرف ہوتا ہے اور نمازِ فجر و نمازِ مغرب کے بعد مشہور وردوں میں سے ایک ورد یہ مروی ہے کہ کلام کرنے سے پہلے اور ایک روایت میں ہے کہ بعد کے دوگانہ کیلئے اٹھنے سے پہلے نشست بدلے بغیر دس مرتبہ پڑھے "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔" یہ ورد نیکیوں کو قائم رکھنے، بدیوں کو مٹانے اور درجات کی بلندی کے لئے عظیم تاثیر رکھتا ہے۔

اور بعد فرائض کے مشہور ترین ورد ذکر معقبات (بکسر و تشدید قاف) ہے یہ وہ کلمات ہیں جو یکے بعد دیگرے مسلسل آتے ہیں وہ یہ کہ "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ سُبْحَانَ اللّٰهِ" ۳۳ بار اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۳۳ بار وَاللّٰهُ اَكْبَرُ ۳۳ بار اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" ایک مرتبہ پڑھ کر سو کی تسبیح مکمل کرے اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور مسلم کی دوسری روایت میں ہے کہ اللہ اکبر ۳۴ مرتبہ پڑھ کر سو کی تسبیح مکمل کرے۔ دیگر روایتوں میں سُبْحَانَ اللّٰهِ ۲۵ مرتبہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۲۵ مرتبہ اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۲۵ مرتبہ ہے۔ جامع الاصول، نسائی اور مشکوۃ میں امام احمد سے اور دارمی میں بھی زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صحابہ کو حکم دیا گیا کہ وہ ہر نماز کے بعد ۳۳ بار تسبیح، ۳۳ بار تحمید اور ۳۳ بار تکبیر پڑھیں۔

ایک انصاری نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص اس سے کہتا ہے کیا تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ ہر نماز کے بعد ۳۳ بار تسبیح ۳۳ بار تحمید اور ۳۳ بار تکبیر پڑھا کرو انہوں نے کہا ہاں! اس نے کہا اگر ہر ایک کو ۲۵۔ ۲۵ بار پڑھیں اور ۲۵ بار تہلیل کو بھی داخل کریں تو بہتر ہوگا جب اس انصاری نے صبح کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا خواب بیان کیا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جیسا اس شخص نے کہا ہے ویسا ہی کرو۔ چونکہ جب اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم بھی شامل ہو گیا تو اب یہ سنت ہو گیا اور بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ "سُبْحَانَ اللّٰهِ دس بار اور اَللّٰهُ اَكْبَرُ دس بار پڑھے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ "سُبْحَانَ اللّٰهِ" گیارہ مرتبہ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ گیارہ مرتبہ اور "اَللّٰهُ اَكْبَرُ" گیار مرتبہ پڑھے یہ سب ۳۳ مرتبہ ہو جاتے ہیں اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ وہی تفسیر ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی بعض روایتوں میں ہے کہ "تُسَبِّحُوْنَ وَ تَحْمَدُوْنَ وَ تُكَبِّرُوْنَ" اور ہر نماز میں ۳۳ بار پڑھے اور یہ تفسیر وہمی ہے اس لئے کہ اس سے مراد ہر کلمہ ۳۳ بار کہنا ہے اور دیگر حدیثوں میں منصوص علیہ ہے۔

بخاری و مسلم میں ان معقبات کے ثواب میں حدیثیں مروی ہیں کہ جو کوئی انہیں نماز کے بعد پڑھے تو حق تعالیٰ اس کے گناہوں کو بخش دے گا اگرچہ گناہ پہاڑ کی مانند ہوں۔ اسی کے ساتھ مروی ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بارگاہِ نبوت میں فقراء مہاجرین نے آکر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم سے مسلمانانِ اہلِ ثروت و غنا، درجات کی بلندی اور اقامتِ جنت میں سبقت لے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کس طرح عرض کرنے لگے وہ نمازیں پڑھتے ہیں جیسے ہم پڑھتے ہیں وہ روزے

رکھتے ہیں جیسے ہم روزہ رکھتے ہیں اور وہ صدقہ و خیرات کرتے اور غلام آزاد کرتے ہیں اور ہم کر نہیں سکتے۔ فرمایا میں تمہیں ایسی چیز بتاتا ہوں اگر تم اسے کرو گے تو کوئی بھی تمہارے نصیب تک نہیں پہنچ سکے گا " تُسَبِّحُوْنَ وَ تَحْمَدُوْنَ وَ تُکَبِّرُوْنَ دُبُرَ کُلِّ صَلٰوۃٍ ثَلَاثًا وَّثَلٰثِیْنَ مَرَّۃً " یعنی ہر نماز کے بعد تسبیح، تحمید اور اللہ اکبر ۳۳۔ ۳۳ بار پڑھا کرو اس کے بعد اہلِ ثروت و غنا بھی اس حدیث کو سن کر اس پر عمل کرنے لگے تو دوبارہ پھر فقراء مہاجرین بارگاہِ نبوت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارے وہ رفقاء جو تونگر ہیں وہ بھی اسے سن کر اس پر عمل کرنے لگے ہیں اور ہمارے برابر ہی ان کے عمل ہو گئے ہیں اب ہم کیا کریں؟ فرمایا کیا ہو سکتا ہے "ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ" یہ خدا کا فضل ہے وہ جسے چاہے دے۔ اس حدیث سے شکر گزار تونگر کی فضیلت، عبادت گزار فقیر پر لازم آتی ہے۔ یہ مبحث اپنے مقام میں تحقیق کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے اور بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ جب فقراء شکستہ دل اور غمگین ہوئے تو فرمایا غم نہ کرو اور اندوہگیں نہ ہو کیونکہ تم تونگروں سے پانچ سو برس پہلے جنت میں داخل ہو گے اور یہ حدیث، اس حدیث کا حصہ ہے جو مشکوۃ میں ابو داؤد سے بروایت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ مروی ہے اور یہ فقرا اور سبک باری کی جزاء ہے جو کہ صرف فقراء کو حاصل ہے کیونکہ وہ موقف میں حساب و کتاب اور دنیاوی نعمتوں پر سوال و جواب کیلئے نہ روکے جائیں گے اور دخولِ جنت میں فقراء کی سابقیت، تونگروں کے اعمال پر کثرتِ ثواب اور رفعتِ درجات میں منافات نہیں رکھتی۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ سابقیت، فقراء مہاجرین کے ساتھ مخصوص ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے اور بعض حدیثوں میں مطلق فقراء کے لئے آیا ہے (واللہ اعلم)

اور یہ وظیفہ سونے سے پہلے پڑھنے میں بھی آیا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنی صاحبزادی سیدہ فاطمۃ الزہراؓ اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما کو سکھایا۔ مسند امام احمد میں بروایت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ثابت ہے کہ سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاشانہ اقدس میں اس غرض سے آئیں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک باندی حاصل کریں جو خدمت کرے۔ منقول ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مبارک ہاتھ چکی پیسنے اور پانی کھینچنے سے سرخ ہو گئے تھے اور ان کے چہرۂ مبارک کا رنگ جھاڑو دینے کے غبار سے اور کھانا پکانے کے دھوئیں سے متغیر ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب وہ آئیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر میں موجود نہ پایا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو پوچھا میری صاحبزادی فاطمہ رضی اللہ عنہا کیوں آئی تھیں؟ بتایا گیا کہ باندی مانگنے کیلئے آئی تھیں اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود، سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے گئے اور ان کے سرہانے بیٹھ کر فرمایا اے فاطمہ رضی اللہ عنہا تم باندی چاہتی ہو حالانکہ اس وقت کوئی باندی موجود نہیں ہے۔ اور جب کہیں سے آئے تو بتاتا ہم تمہیں عنایت فرما دیں گے۔ اس کے بعد فرمایا اے فاطمہ دنیاوی محنت و مشقت بہت آسان ہے جس طرح بھی گزرے۔ اے فاطمہ رضی اللہ عنہا! حق تعالیٰ کی بندی اور تقویٰ اختیار کرو اور اپنے شوہر کی خدمت گزاری کرو میں تمہیں ایک ایسی چیز بتاتا ہوں جو خادم سے بہتر ہے۔ وہ یہ کہ سونے سے پہلے ۳۳ مرتبہ خدا کی تسبیح کرو اور ۳۳ مرتبہ اس کی حمد کرو۔ اور ۳۴ مرتبہ "اللہ اکبر" کہو اسے بخاری، مسلم، ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور بعض روایتوں میں ہے کہ ان میں سے ایک "لاعلی التعین" ہے۔ مطلب یہ کہ ۳۴ مرتبہ نہیں بلکہ ان گنت بار پڑھے اور صحیحین کی دوسری روایت میں حضرت علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو مخاطب کر کے یہ وظیفہ بتایا اس کے بعد حضرت علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما نے اس ورد کو کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب سے میں نے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ مجھ سے کبھی فوت نہ ہوا اور نہ صفین کی رات میں حتیٰ کہ رات کے پچھلے پہر یہ مجھے یاد آیا تو میں نے اسی وقت پڑھا اور دوسرا اور دیہ تعلیم فرمایا

کہ جب نماز فجر ادا کر چکو تو۔ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ۔" کو دس مرتبہ پڑھو اور بعد مغرب بھی دس مرتبہ پڑھو جیسا کہ گزرا۔

اور مشہور وردوں میں ایک یہ ہے کہ نماز فرض کے بعد آیۃ الکرسی پڑھے جیسا کہ سنن نسائی میں مروی ہے اور طبرانی اس میں "قل ہو اللہ احد" بھی زیادہ کرتے ہیں اور اس حدیث کے ورد کو دیگر حفاظ حدیث کی جماعت نے بھی بیان کیا ہے اور اس کی تصحیح کی ہے اور ابن الجوزی، جیسا کہ ان کی عادت ہے کہ بے تحقیق حدیث کو موضوع کہنے میں سبقت اور زیادتی کرتے ہیں اسے بھی موضوعات میں بیان کیا ہے اس بنا پر حفاظ حدیث، ان کی مذمت کرتے ہیں۔

معجم طبرانی میں ہے کہ۔ "مَنْ قَرَأَ اٰیَۃَ الْکُرْسِیِّ فِیْ دُبُرِ الصَّلٰوۃِ الْمَکْتُوْبَۃِ کَانَ فِیْ ذِمَّۃِ اللّٰہِ اِلَی الْاُخْرٰی۔" جو کوئی نماز فرض کے بعد آیۃ الکرسی کو پڑھے گا وہ دوسری نماز تک خدا کی پناہ اور اس کے عہد امان میں رہے گا اس حدیث کو صحابہ کرام کی ایک جماعت روایت کرتی ہے اس میں امیر المومنین علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ بھی ہیں۔ مشکوٰۃ میں علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ سے ایسا ہی منقول ہے کہ فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس چوبی منبر پر یہ فرماتے سنا ہے کہ جو کوئی فرض نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھے گا اسے جنت میں داخل ہونے سے موت کے سوا کوئی چیز مانع نہ ہوگی۔ مطلب یہ کہ دخول جنت کے لئے موت شرط ہے کیونکہ بغیر موت کے جنت میں داخلہ ممکن نہیں اور جو کوئی اسے سوتے وقت پڑھے گا حق تعالیٰ اس کے گھر کو اور اس کے ہمسایہ کے گھر کو اور اس کے ارد گرد کے گھروں کو ان کے رہنے والوں کو اپنے امان میں رکھے گا۔ اسے بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کر کے اس کی سند کو ضعیف کہا۔ نیز امیر المومنین علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ فرمایا آیات قرآنی کی سردار "اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔" ہے۔ بخاری میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے آیۃ الکرسی کی فضیلت میں "اس میں صَدَقَ وَھُوَ کَذُوْبٌ مذکور ہوا" معروف ہے۔

تنبیہہ: واضح رہنا چاہئے کہ نماز کے بعد دعائیں پڑھنے کے ضمن میں جو متعدد چیزیں حدیثوں میں آئی ہیں جیسے مذکورہ دعائیں، آیۃ الکرسی اور معقبات وغیرہ اور انہیں جو بغیر فصل کے نماز کے متصل ہی ملانے کا حکم آیا ہے تو حقیقی اتصال تو محال ہے بلکہ عدم فصل سے مراد ان چیزوں کا نہ ہونا ہے جن کو عرف عام میں مشغولیت کہا جاتا ہے جو اعراض، نسیان اور ذکر دعا کے علاوہ کسی اور چیز میں مشغول ہونے کے ضمن میں شمار ہوتے ہیں۔ اور اگر خاموشی عرف میں حد کثرت کو نہ پہنچے تو مضائقہ نہیں ہے۔ لہٰذا نماز سے فارغ ہونے کے بعد جو کچھ بھی وجہ مذکور پر پڑھے تو نماز کے بعد ہی کہلائے گا اب رہا یہ کہ سنت مؤکدہ کا فرض کے بعد پڑھنا کیا فرض اور اذکار وادعیہ مذکورہ کے درمیان موجب فصل اور عدم بعدیت ہے یا نہیں۔ یہ بھی اس جگہ محل نظر ہے ظاہر یہ ہے کہ یہ فصل نہیں ہوگا خصوصاً اس قول کے بموجب کہ جن میں ایسی سنتیں ہیں جن کو فرض کے ساتھ ملا کر جلدی سے اٹھ کر سنتوں کے ساتھ پڑھنا ہے بعد فرض ادا کی جاتی ہیں۔ اور ابن الہمام نے شرح میں تصریح فرمائی ہے کہ یہ جو حدیثوں میں آیا ہے کہ بعض وہ دعائیں اور اذکار جو نمازوں کے فوراً بعد پڑھے یہ اس کا متقاضی نہیں ہے کہ ان کو فرض سے ملائے۔ بلکہ ان کا مقام ان سنتوں کے بعد بغیر کسی مشغولیت کے ہے۔ جو فرض کے تابع ہیں۔ اور جو سنتیں فرض کے تابع نہیں ہیں اور جن میں فرض کے بعد سنت کے ملانے کی اولویت میں علماء کا اختلاف ہے وہاں فرض سے ملا کر پڑھنا کافی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ متصل بہ فرض سنتوں کیلئے کھڑا ہونا مسنون ہے۔ ان کے درمیان کی سنن و نوافل سے مشغولیت نہیں ہونی چاہئے۔ یہ قول اس حدیث کے مخالف ہے۔ جو وصل کی مخالفت میں مروی ہے۔ اور یہ حدیث ابو داؤد میں ابی رمثہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک ایسا شخص کھڑا ہوا جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تکبیر اولیٰ پائی تھی تاکہ وہ سنت کو ادا کرے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا کندھا پکڑ کر جھنجھوڑا اور فرمایا بیٹھ جا اس لئے کہ

اہلِ کتاب اسی بنا پر ہلاک ہوئے ہیں کہ انہوں نے اپنی نمازوں میں فصل نہ رکھا اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ لہٰذا بعض دعاؤں اور اذکار کے ذریعہ فصل مختار ہے۔ لیکن اولیٰ یہ ہے کہ کسی مختصر دعا اور ذکر سے فصل دے۔ اور جو اذکار و دعائیں طویل ہیں انہیں سنتوں کے بعد پڑھے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی ایسے ذکر کے ساتھ فصل جن کو مسجدوں میں ہمیشہ کرتے رہے ہوں جیسے آیۃ الکرسی اور تسبیحات وغیرہ کا پڑھنا ثابت نہیں ہے۔ (کبھی کبھی پڑھنا اور معنی ہے یہ گفتگو مواظبت و دوام پر ہے) اور حلوائی کہتے ہیں کہ فرائض و سنن کے بعد ان کے پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اولویت مذکورہ میں یہ منافات نہیں رکھتیں اس لئے کہ مشہور، اس عبارت اولویت میں اس کا خلاف ہے۔ اور ''خلاصہ'' میں کہا گیا ہے کہ جب امام، ظہر یا مغرب یا عشاء میں سلام پھیرے کیونکہ ان فرائض کے بعد سنتیں ہیں تو بیٹھ کر تاخیر کرنا مکروہ ہے۔ اسے لازم ہے کہ سنت کیلئے کھڑا ہو جائے۔ اور سنتوں کو فرض کی جگہ میں کھڑے ہو کر نہ پڑھے بلکہ داہنے یا بائیں یا آگے یا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو اور اگر چاہے تو اپنے گھر سنتوں کے پڑھنے کیلئے لوٹ آئے کیونکہ یہ افضل ہے اور وہ نمازیں جن کے بعد سنتیں نہیں ہیں وہاں اپنی جگہ قبلہ رو ہو کر بیٹھے رہنا مکروہ نہیں ہے یا چلا جائے یا قوم کی طرف منہ کر کے بیٹھ جائے اگر کوئی مانع نہ ہو اور سنت میں یہ سب برابر ہیں لیکن سنتوں کے پڑھنے کیلئے اپنے گھر کی طرف لوٹنا افضل ہے یہ سب ابن الہمام نے شرح میں بیان فرمائی ہیں اور یہ جو آیا ہے کہ مغرب کی سنتوں میں تعجیل کرے تو یہ حکم: ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔'' کے دس مرتبہ پڑھنے میں منافات نہیں رکھتا، جیسا کہ کہا گیا ہے کہ یہ مقدار تعجیل کے منافی نہیں ہے اور اگر تعجیل میں بہت ہی رعایت مقصود ہے تو اسے سنتوں کے بعد پڑھے کیونکہ فرض سے اتنی بعدیت منافی نہیں ہے جیسا کہ گزرا اور جو لوگ مغرب کی سنتوں میں آیۃ الکرسی پڑھتے ہیں یہ مخالف سنت ہے کیونکہ ''قُلْ یٰٓاَیُّہَا الْکٰفِرُوْنَ'' اور ''قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ'' پڑھنا سنت ہے۔

سجدۂ سہو۔ وصل:۔ خبردار رہنا چاہئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سہو و نسیان ان اقوال میں جو احکام و تبلیغ سے متعلق ہیں، باتفاق جائز نہیں ہے لیکن افعال میں خواہ نماز میں ہو یا غیر نماز میں اختلاف ہے۔ اہلِ حق کے نزدیک مختار اس کے جائز ہونے میں ہے۔ درحقیقت یہ سہو و نسیان، حق تعالیٰ عزاسمہ کی حکمت بالغہ سے متعلق ہے کہ اس کی بدولت امت کو گوناگوں تشریع احکام اور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کی سعادت نصیب ہوتی ہے اور محض تشریع ہی اس کی حکمت نہیں ہے اس لئے کہ اس کے بغیر بھی تشریع احکام ممکن ہے مثلاً فرما دیتے کہ ''جو سہو کرے اس پر سجدۂ سہو لازم ہے۔'' جیسا کہ شک کی صورت میں آئے گا۔ لیکن یہ نکتہ، اقتداء کی سعادت حاصل ہونے کے ساتھ مکمل ہوتا ہے۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے بھلا دیا گیا تاکہ بھلائی میں سنت بناؤں۔ اور اس کی جزا اور ثواب مشروع ہو جائے۔

صاحب سفر السعادۃ فرماتے ہیں کہ پانچ مقامات ایسے ہیں جہاں تمام عمر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں سہو سے متصف فرمایا گیا۔ ان کے سوا کہیں ثابت نہیں ہے۔ اول سہو ظہر کی نماز میں ہوا کہ اول تشہد میں بیٹھے اور کھڑے ہوئے جب نماز پوری کر لی تو دو سجدے کئے اس کے بعد سلام پھیرا۔ دوسرا مقام ایک اور موقعہ کا ہے کہ ظہر کی نماز میں دوسری رکعت کے بعد قعدہ فرمایا اور سلام پھیرا۔ اور بات کی پھر یاد آیا تو نماز کو پورا کیا اور سلام پھیر کر دو سجدے کئے اس کے بعد سلام پھیرا۔ اس حدیث میں سلام کے بعد سجدۂ سہو ہے۔ اس کو حدیث ذوالیدین'' کہتے ہیں کہ یہ ایک صحابی کا نام ہے انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا نماز میں خود کمی فرمائی یا بھول گئے تھے فرمایا ان میں سے کچھ نہ تھا۔ اس حدیث میں دو اعتراض ہیں ایک یہ کہ یہ اخبار بر خلاف واقع ہے۔ حالانکہ اخبار و اقوال میں عدم جواز سہو پر سب متفق ہیں البتہ اختلاف افعال میں ہے۔ دوسرا

اعتراض یہ ہے کہ بات کرنا اور دیگر افعال بجالانا نماز کے منافی ہے اور حدیث میں ہے کہ نماز پوری کی از سر نو تو نہیں پڑھی۔ پہلے اعتراض کا جواب تو یہ ہے کہ فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب یہ ہے کہ میرے اعتقاد میں ایسا ہی ہے نہ کہ نفس الامر میں اور یہ خبر بلاشبہہ صادق ہے یا یہ عدم شعور سے کنایہ ہے۔ گویا کہ آپ نے فرمایا "میں شعور نہیں رکھتا" یہ خبر بھی صادق ہے۔ (جواب کا مفہوم یہ ہے کہ بظاہر تمہیں سہو معلوم ہو رہا ہے حالانکہ حقیقت اور نفس الامر میں یہ سہو نہیں ہے بلکہ حکمت رب سے متعلق ہے اس نے مجھ سے ایسا کرایا تاکہ سجدۂ سہو کی مشروعیت معلوم ہو جائے۔ یہی میرا اعتقاد ہے۔ بلاشبہہ یہ خبر دینا سچی بات ہے یا یہ صورت ہے کہ یہ میرے اپنے شعور و قصد سے متعلق نہیں ہے بلکہ رب تعالیٰ نے مجھے بھلایا ہے تاکہ میرے عمل کی بدولت تمہیں سہو کی صورت میں میری اتباع و اقتداء کا اجر و ثواب ملے۔ اس میں مزید غور کرو گے تو اور بھی حکمتیں مل جائیں گی انشاء اللہ (مترجم غفرلہ)

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ بطریقِ سہو، بات کرنا اور منافی نماز عمل کرنا، مفسدِ نماز نہیں ہے۔ اور منعِ جواز بنا اور عدم استئیناف نہیں کرتا۔

مخفی نہ رہنا چاہئے کہ احناف کا مذہب یہ ہے کہ نسیان عذر نہیں ہے۔ نماز میں جاری نہیں ہوتا۔ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ یہ قضیہ نماز میں نسخ کلام سے پہلے کا ہے۔ اور تحقیق یہ ہے کہ یہ اس کے بعد کا واقعہ ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ گفتگو، سب اشاروں سے تھی نہ کہ زبان سے اور یہ بات تو بہت ہی بعید ہے نیز کہتے ہیں کہ چونکہ یہ قضیہ برخلاف قیاس تھا لہٰذا اپنے مورد پر خاص رہے گا۔ اور بحرالرائق شرح کنزالدقائق میں ہے کہ اس اعتراض کے جواب میں ہم نے امام شافعی کا کوئی قول نہیں پایا۔ اور امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ قصداً بات کرنا اور بھول کر بات کرنا دونوں نماز کو باطل کرنے والی ہیں۔ مگر یہ کہ امام نماز کی درستگی کیلئے کوئی کلام کرے۔ جیسا کہ راوی نے گمان کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پوری کر لی ہے اس کے بعد معلوم ہوا کہ نماز پوری نہ ہوئی تھی تو پوری فرمائی۔ تو یہ بات کرنا بھی ذوالیدین راوی حدیث کا ہے۔ نہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ اس حدیث میں کلام طویل ہے اور شیخ ابن حجر نے شرح بخاری میں اس کا تفصیلاً بیان کیا ہے۔

نسیان کا تیسرا موقع یہ ہے کہ ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی اور باہر تشریف لے آئے ایک رکعت باقی رہ گئی تھی۔ جب مسجد سے باہر تشریف لے آئے تو طلحہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے باہر آئے اور عرض کیا یارسول اللہ! ایک رکعت آپ نے فراموش کر دی ہے اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے اور بلال کو کہا کہ اقامت کرے۔ اور ایک رکعت جو فراموش کی تھی ادا کی اور سلام پھیرا اور باہر تشریف لے آئے اس حدیث میں سجدہ سہو، مسکوت عنہ ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے اقتضاء کا مقام نہ کیا ہو اور امام شافعی کے نزدیک سجدۂ سہو واجب نہیں ہے بلکہ سنت ہے اور شمنی کہتے ہیں کہ بعض احناف کے نزدیک بھی سنت ہے اور ابن الہمام نے شرح میں بعض احناف سے نقل کیا ہے کہ کہا گیا ہے کہ عامہ اصحاب احناف کے نزدیک سنت ہے (واللہ اعلم)

اور نسیان کا چوتھا موقعہ یہ ہے کہ نماز ظہر ادا کی اور ایک رکعت زیادہ کر دی۔ صحابہ نے عرض کیا نماز میں ایک رکعت زیادہ ہو گئی ہے فرمایا کیسے؟ عرض کیا پانچ رکعتیں پڑھی ہیں اس وقت دو سجدے سہو کے کئے اور سلام پھیرا اور اسی پر اختصار کیا۔ اس حدیث کے آخر میں ہے کہ: "اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ اَنْسٰی کَمَا تَنْسَوْنَ۔" (الحدیث) اور مذہب حنفیہ میں تفصیل اس صورت میں فقہ میں مذکور ہے۔

اور نسیان کا پانچواں موقع یہ ہے کہ نمازِ عصر کی تین رکعتیں پڑھیں اور کاشانہ اقدس میں تشریف لے گئے۔ صحابہ نے بعد میں بتایا تو مسجد میں واپس تشریف لائے اور ایک رکعت ادا کر کے سلام پھیرا اور سلام کے بعد دو سجدے کئے پھر دوبارہ سلام پھیرا۔ یہی وہ پانچ

مقامات ہیں جہاں سہو فرمایا ہے۔ مجتہدین کرام نے انہیں پانچ مقامات سے مسائل کا استنباط فرمایا ہے۔

اور داؤد ظاہری جو کہ امام اہل ظواہر ہیں، اصحاب ظواہر ایک جماعت ہے جو ظواہر نصوص پر عمل کرتے ہیں اور غیر منصوص کو ان پر قیاس نہیں کرتے اور وہ قیاس اور اجتہاد کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان پانچ مقامات کے سوا کہیں سجدۂ سہو نہ کرے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدۂ سہو کیا ہے۔ اگر ان کے سوا کسی اور جگہ سہو لاحق ہو جائے تو سجدۂ سہو نہ کرے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مواقع میں سلام سے پہلے سجدۂ سہو کیا ہے اور بعض مواقع میں سلام کے بعد۔ جیسا کہ سیاق احادیث سے معلوم ہوا اور امام شافعی تمام جگہ سلام سے پہلے سجدۂ سہو کرتے ہیں اور اس باب میں وارد شدہ حدیثوں کو ترجیح دیتے ہیں یا وہ ان کی ناسخیت کا دعویٰ کرتے ہیں اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تمام جگہ سلام کے بعد سجدۂ سہو کا حکم دیتے ہیں اور مذکورہ حدیثوں کے ماسوا کو ترجیح دیتے ہیں اور کتب ستہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد سلام سجدۂ سہو فرمایا۔ یا وہ حدیث جو ابو داؤد، ابن ماجہ، مسند امام احمد اور مسند عبدالرزاق میں ثوبان سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لِكُلِّ سَهْوٍ سَجْدَتَانِ بَعْدَ مَا يُسَلِّمُ" ہر سہو کیلئے سلام کے بعد دو سجدے ہیں اور قول، فعل سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔ جیسا کہ اصول فقہ میں مسلمہ قاعدہ ہے خصوصاً دو فعلوں میں تعارض ہو یا قیاس کے ساتھ ہو جیسا کہ فقہاء کا مذہب ہے کہ دو حدیثوں میں تعارض کے وقت قیاس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس لئے کہ سہو کے سجدے مکرر نہیں ہوتے لہٰذا سلام سے کرنا چاہئے۔ تاکہ اگر سلام سے بھی سہو واقع ہو تو خبردار کیا جا سکے۔ (کذا قال الشمنی)

نیز منقول ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن مسعود، عمار بن یاسر، ابن عباس، اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین کا یہی قول ہے۔ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی بھی نماز میں شک واقع نہ ہوا کہ ادائیگی میں تردد واقع ہوا ہو کہ کتنی رکعتیں پڑھی ہیں۔ کیونکہ شک میں کسی جانب یقین و جزم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن سہو و نسیان میں ایک جانب جزم و یقین ہوتا ہے اگرچہ اختلاف واقع ہے لیکن اس کو لازم قرار نہیں دیتے۔ البتہ وہ جو واقع اور نفس الامر ہوا سے یاد دلاتے ہیں۔ اور شک و تردد کی صورت میں تحیر و پراگندگی ہے۔ اور یہ بھی بعض اوقات غلبۂ استغراق اور توجہ کی بنا پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وجود میں آیا ہے لیکن شک تو کسی وقت میں بھی وجود میں نہیں آیا۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ شک شیطان کی جانب سے ہے تو وہ بندے پر تلبیس و تخلیط کرتا ہے اور اسے التباس و اشتباہ میں ڈالتا ہے۔ یہاں تک کہ بندہ شک کرنے لگتا ہے کہ کتنی پڑھی ہیں اگرچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں کبھی شک و تردد واقع نہیں ہوا لیکن تعلیم امت کیلئے اس کا حکم امت کو بتاتے ہوئے فرمایا کہ اگر کوئی شک میں پڑ جائے اور یاد نہ آئے کہ تین رکعتیں پڑھی ہیں یا چار، تو یقین پر بنا کرے اور شک کا اعتبار نہ کرے اور بمقتضائے شک و تردد اس صورت میں تین رکعت کو قرار دے کیونکہ تین پر تو اسے یقین حاصل ہے اگرچہ چار ہی گزاری ہوں اور سجدۂ سہو کرے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شک کی صورت میں تحری کرے اور جس جانب ظن غالب ہو اس پر بنا کرے خواہ اقل پر ہو یا اکثر پر۔ اگر ظن غالب کسی جانب واقع نہ ہو تو یقین پر بنا کرے۔ کچھ لوگ اس حکم پر امام اجل پر زبان طعن دراز کرتے ہیں کہ انہوں نے حدیث کے خلاف کہا ہے کہ بنا بر عقل کے حاکم ہیں حالانکہ یہ لوگ اتنا نہیں جانتے کہ شریعت بنا بر ظن غالب کا ایک اصول مقرر ہے کہ حدیث میں اسے طے کیا ہے جیسا کہ اشتباہ قبلہ وغیرہ کی شکل میں ہے۔ نیز بخاری و مسلم میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اِذَا شَكَّ اَحَدُكُمْ فَلْيَتَحَرَّ الصَّوَابَ وَلْيُتِمَّ عَلَيْهِ۔" جیسا کہ شمنی نے بیان کیا۔ اور "جامع الاصول"

میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بروایت نسائی نقل کرتے ہیں کہ: "وَهُمَ فِي صَلَاتِهِ، فَلْيَتَحَرَّ الصَّوَابَ ثُمَّ يَسْجُدُ سَجْدَتَيْنِ بَعْدَ يَفْرُغُ وَهُوَ جَالِسٌ۔" اور ترمذی فرماتے ہیں کہ بعض اہل علم شک کی صورت میں فرماتے ہیں کہ نماز کو از سرنو پڑھے۔(انتہی)

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر پہلی مرتبہ شک میں مبتلا ہوا ہے یعنی اس کی یہ عادت نہیں ہے تو نماز کا اعادہ کرے یعنی از سرنو پڑھے ورنہ تحری کرے اور اگر تحری سے بھی ایک جانب غلبہ ظن حاصل نہ ہو تو عقل پر بنا کرے۔ اور امام محمد رحمہ اللہ اپنی موطا میں فرماتے ہیں کہ تحری کے باب میں غالب ظن کی روایتیں بکثرت ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر ایسا نہ کرے تو دیگر سہو و شک سے نجات دشوار ہوگا اور کثرت شک کی صورت میں اعادہ کرنا اور اس کا اعتبار کرنا عظیم حرج ہے۔ اور امام شافعی، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم مطلق ہے خواہ ظن غالب ایک جانب ہو یا دونوں جانب برابر ہو یقین پر بنا کرے۔ شرح مشکوٰۃ میں اس کی مزید تحقیق کی گئی ہے۔ فتدبر۔

سجدۂ تلاوت۔ وصل۔ سجدۂ تلاوت کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ چنانچہ ہمارے ائمہ کے نزدیک واجب ہے اور امام شافعی کے نزدیک سنت، وہ کہتے ہیں کہ نہ کرنے سے کرنا افضل ہے اور امام احمد کے نزدیک ایک روایت کے مطابق اگر نماز میں ہو تو واجب ہے اور نماز کے سوا واجب نہیں ہے۔ اس میں دلائل و حجج وہ آیات و احادیث ہیں جو سجدۂ تلاوت نہ کرنے کی مذمت میں واقع ہیں۔ اور اس کی ادا میں تاکید و مبالغہ مروی ہے۔ نیز کہتے ہیں کہ سجدہ نماز کا جزو ہے۔ اور تخفیف کی بنا پر اس پر اختصار کیا گیا ہے لہٰذا یہ ایسا ہی فرض ہے جیسا کہ نماز جنازہ میں قیام میں ہے۔ لیکن چونکہ اس کے دلائل قطعی نہ تھے اس لئے ہم وجوب کے قائل ہوئے اور دیگر ائمہ کا استدلال اس حدیث سے ہے جو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ والنجم کی تلاوت فرماتے اور سجدہ نہ کرتے اس کا جواب یہ ہے کہ سجدہ تلاوت کو فی الفور ادا کرنا واجب نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ دوسرے وقت میں کرتے ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وقت مکروہ میں قرأت واقع ہوئی ہو یا یہ کہ بیان جواز تاخیر کیلئے سجدہ نہ کیا ہو یا یہ کہ یہ والنجم کے سجدہ کے ساتھ مخصوص ہو کیونکہ اس میں اختلاف ہے۔ (واللہ اعلم)

اور سجدۂ تلاوت میں طہارت شرط ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف منقول نہیں ہے مگر وہ روایت جو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بغیر وضو کے کرتے تھے تو اس کی موافقت میں کوئی ایک بھی عالم نہیں ہے بجز شعبی کے اور بیہقی نے بروایت نافع از ابن عمر رضی اللہ عنہما نقل کیا کہ فرمایا کوئی شخص بغیر طہارت کے سجدہ نہ کرے۔ اور ان دونوں روایتوں کی جمع و تطبیق میں یہ ہے اول روایت سے مراد طہارت کبریٰ ہے اور دوسری سے حالت اختیاری ہے اور اول بوقت ضرورت ہے۔ نیز کہتے ہیں کبھی شعبی راستے میں جارہے ہوتے تو سجدہ کا اشارہ بغیر وضو اور بغیر استقبال قبلہ کرتے اور گزر جاتے اور بعض سلف اس طرف بھی گئے ہیں کہ سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہے مگر اسی پر جو بالقصد سنے۔ راہ چلتے پر نہیں۔ مطلب یہ کہ اگر اتفاقاً بغیر قصد کے راہ چلتے کانوں میں آیتِ سجدہ کی آواز پڑ جائے تو سجدہ واجب نہیں ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اگر تلاوت کرنے والا خود سجدہ نہ کرے تو سننے والے پر بھی واجب نہیں ہوتا۔ گویا کہ تلاوت کرنے والا امام کا حکم رکھتا ہے سننے والے کی نسبت سے۔ اسے امام مالک سے بھی روایت کیا گیا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ وجوب اس تقدیر پر ہے جب کہ تلاوت کرنے والا، قرأت کا قصد کرے۔ اور قصہ و حکایت کے قصد پر وجوب نہیں ہے۔ جیسا کہ قصہ خواں لوگ کہتے ہیں اور ہمارا اور جمہور ائمہ کا مذہب یہ ہے کہ بشرائط صلوٰۃ مطلقاً قاری و سامع دونوں پر واجب ہے اور یہی مختار ہے۔ اور ہمارے نزدیک سجدے سے پہلے اور سجدے کے بعد تکبیر کہنا ہے اور یہ دونوں تکبیریں مستحب ہیں واجب نہیں ہیں اور ایک شخص نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایسا ہی نقل کیا ہے اور بعض کے نزدیک سلام بھی ہے۔ لیکن تشہد کسی کے نزدیک نہیں

ہے اور اگر کھڑے ہو کر سجدے میں جائے تو اولیٰ و افضل ہے۔ اس سجدے میں وہی تسبیح ہے جو نماز کے سجدے میں ہے یعنی "سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی" اس لئے کہ نماز افضل احوال اور ارفع مقام محال ہے تو اس کے سجدے کی تسبیح بھی افضل و ارفع ہے۔ اور اگر سجدۂ تلاوت نماز میں واقع ہو تو بلاشبہہ یہی تسبیح ہے۔ کیونکہ احناف کے نزدیک نماز کے سجدے میں کوئی خاص دعا نہیں کرتے۔ یہی اولیٰ ہو گا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے سَجَدَ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ خَلَقَهٗ وَصَوَّرَهٗ وَشَقَّ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ بِحَوْلِهٖ وَقُوَّتِهٖ (سجدہ ہے اس ذات کریم کو جس نے بندے کو پیدا فرمایا صورت بخشی اور سماعت و بصارت دی اسی کی قوت و طاقت سے) اور ترمذی و نسائی اور ابو داؤد کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسے رات میں سجود قرآن میں پڑھتے اور کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس دعا کو پڑھے رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ اور بعض کے نزدیک یہ دعا ہے سُبْحَانَ رَبِّنَا اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا اسے سجدہ کرنے والوں سے سجدۂ قرآن میں حکایت کیا گیا ہے کہ وہ سجدۂ تلاوت کے وقت پڑھتے تھے اور بسا اوقات سجدہ میں اس دعا کو پڑھتے اور فرماتے اَللّٰهُمَّ احْطُطْ عَنِّیْ بِهَا وِزْرًا وَاكْتُبْ بِهَا اَجْرًا وَاجْعَلْهَا لِیْ عِنْدَكَ ذُخْرًا وَتَقَبَّلْهَا مِنِّیْ كَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ عَبْدِكَ دَاوٗدَ ترمذی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اس نے کہا کہ آج رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک درخت کے نیچے نماز پڑھ رہا ہوں اور جب میں نے سجدہ کیا تو درخت نے بھی سجدہ کیا اور یہ دعا پڑھی۔ حضرت ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی آیت سجدہ پڑھی اور سجدہ کیا اور سجدے میں اس دعا کو پڑھا جو اس شخص نے سنائی تھی کہ درخت نے پڑھی۔ ترمذی اسے نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔

اور بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ والنجم کو پڑھا اور سجدہ کیا کیونکہ سورۂ والنجم کی آخری آیت میں سجدہ ہے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام مسلمانوں، کافروں اور جن و انس نے سجدہ کیا اس سے مراد وہی جن و انس ہوں گے جو اس وقت مجلس میں موجود ہوں گے۔ یہ بطریق تکریر و تاکید ہے۔ یا یہ کہ روئے زمین کے تمام انسان و جنات مراد ہیں (واللہ اعلم)

اہل علم فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سجدہ کرنا امتثال حکم الٰہی کی بنا پر تھا اور سجدے کے ذریعہ حق تعالیٰ کی ان عظیم نعمتوں کی شکر گزاری مقصود تھی جو اول سورۃ میں گنائی گئی ہیں اور مسلمانوں کا سجدہ کرنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت، امتثال امر اور شکر بجالانے میں تھا اور مشرکوں کا سجدہ کرنا ان اسمائے الٰہی کے سننے کے بموجب تھا جو لات و عزیٰ کی مذمت میں اس سورۃ میں مذکور ہیں یا بر بنائے ظہور و سطوت، قہر کبریائی اور جبروتِ الٰہی تعالیٰ شانہٗ اور عزت و عظمت، صدق و حقانیت سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار کی تابانی و دمک سے تھا۔ چنانچہ ان کے اختیار کی تاب و طاقت باطل ہو گئی۔ اور اثر جحود و انکار و استکبار، محو و مضمحل ہو گئے مگر ان میں سے جو اشقی و اطغیٰ قوم تھے وہ مٹھی میں خاک لے کر اپنے سر اور چہروں پر مارنے لگے۔ اور کہنے لگے یہی کافی ہے اور وہ جو اس ضمن میں ہے کہ اشقیائے قریش میں سے ایک شخص جہنم رسید ہوا۔ وہ زندیقوں اور ان کے مفتریوں کا وضع کردہ ہے جسے ان ارباب سیر و تواریخ نے جو عجیب و غریب اور من گھڑت قصوں کے بیان کرنے کے عادی ہیں نقل کیا ہے اور علماء محدثین ان کے وضع اور من گھڑت ہونے کا حکم دیتے ہیں اور ان کا رد و بطلان کرتے ہیں وہ قصہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسماء لات و عزیٰ کے ذکر کے وقت ان کی تعریف میں کلمے کہے اور کہا کہ "تِلْكَ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰی" اور یہ سہواً آپ کی زبان پر جاری ہوا یا شیطان نے آپ کی آواز کے مشابہ بلند آواز سے اپنی طرف سے گھڑ کر کہا۔ اور مشرکوں نے اسے سنا تو ان کا سجدہ کرنا اسی کی بنا پر تھا اور کہنے لگے اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمارے معبودوں کی تعریف کی ہے اب ہمارا ان سے کوئی جھگڑا باقی نہ رہا۔ اور یہ تو ہم جانتے

ہی ہیں کہ پیدا کرنے والا، زندگی دینے والا، مارنے والا، جاننے والا، ہمیشہ سے موجود رہنے والا اور رزق دینے والا ایک ہی ہے۔ یہ اصنام تو ہمارے شفیع ہیں اور بس اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود اب ان کی شفاعت کا اثبات و اقرار کر لیا ہے اس کے بعد جبریل علیہ السلام آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شیطان کے القاء کی خبر دی اس پر آپ غمگین ہوئے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کی تسلی کے لئے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ

تو یہ قصہ عقلاً اور نقلاً باطل و موضوع اور من گھڑت ہے نیز اس آیۂ کریمہ کی تفسیر دوسری ہے۔ جس میں اس قصہ کا نام و نشان اور ذکر تک نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)۔

سجدۂ شکر۔ وصل:۔ جاننا چاہیے کہ نماز کے علاوہ خارج کے سجدۂ مفردہ میں علماء کا اختلاف ہے کیا یہ جائز و مسنون اور عبادت و موجب تقربِ بارگاہِ الٰہی ہے یا نہیں۔ بعض کے نزدیک یہ بدعت و حرام اور بے اصل ہے۔ اس کیلئے شریعت میں کوئی بنیاد نہیں ہے اور بعض کے نزدیک جائز و مسنون ہے۔ اور بعض علمائے احناف کے نزدیک جائز مع الکراہت ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ خارج نماز میں سجدے کی کئی قسمیں ہیں ایک سجدۂ سہو ہے اور یہ خود سجدۂ نماز کے حکم میں ہے اور دوسرا سجدۂ تلاوت ہے اس میں کوئی خلاف نہیں ہے۔ تیسرا سجدۂ مناجات ہے جو نماز کے بعد ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بحث زیادہ تر اسی سجدے کے بارے میں ہے۔ کیونکہ یہ بھی مکروہ ہے چوتھا سجدۂ شکر ہے جو حصولِ نعمت اور بلاؤں کے دور ہو جانے پر کیا جاتا ہے اس میں اختلاف ہے۔ امام شافعی کے نزدیک سنت ہے۔ اور امام احمد و امام ابو یوسف کا قول بھی یہی ہے۔ اس ضمن میں احادیث و آثار بکثرت ہیں جیسا کہ مذکور ہوا اور امام اعظم ابو حنیفہ اور امام مالک کے نزدیک سنت نہیں ہے بلکہ مکروہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حق تبارک و تعالیٰ کی نعمتیں غیر متناہی اور ان گنت ہیں۔ اور بندہ ان کے شکر کی ادائیگی میں عاجز ہے لہٰذا اس کا مکلف بنانا اگرچہ بطریق سنت و استحباب ہو تکلیف مالایطاق ہوگی اور کہتے ہیں کہ سجود سے مراد جو شکر نعمت کے ضمن میں احادیث میں واقع ہیں نماز ہے جسے سجدے سے تعبیر فرمایا ہے۔ یا یہ منسوخ ہے اور جو حضرات سجدۂ شکر کے قائل ہیں وہ اس سے وہ نعمت عظیمہ مراد لیتے ہیں جو کبھی کبھی ظہور پذیر ہوتی ہیں اور سنت میں بھی ایسا ہی واقع ہوا ہے نہ کہ ہر نعمت پر۔ اور کہتے ہیں کہ سجدہ سے نماز مراد لینا ظاہر کے خلاف ہے اور چونکہ بعض خلفائے راشدین سے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ سجدہ کا فعل ماثور ہے لہٰذا نسخ کا قول درست نہ ہوگا اور ایک قسم اور ہے جسے "سجدۂ تحیت" کہتے ہیں اور بعض روایات فقہ میں اس میں رخصت واقع ہوئی ہے۔ تو اس میں مسلک مختار کراہت و حرمت ہے۔ اور مسند امام احمد، جامع ترمذی اور سنن ابو داؤد میں سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی چیز اچھی معلوم ہوتی تو چہرۂ انور کو زمین پر رکھ کر سجدہ کرتے اور یہ حق تعالیٰ کی شکر گذاری میں ہوتا۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی ایسا ہی مروی ہے اور بیہقی باسناد صحیحہ روایت کرتے ہیں کہ جب امیر المومنین علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کا خط یمن سے پہنچا جس میں مرقوم تھا کہ ہمدان کا قبیلہ اسلام لے آیا ہے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وقت سجدۂ شکر ادا کیا اور اس قبیلہ کیلئے دعا فرمائی اور فرمایا "اَلسَّلَامُ عَلٰى هَمْدَانَ، اَلسَّلَامُ عَلٰى هَمْدَانَ" حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ کی یہ بشارت ملی کہ جو کوئی آپ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا تو حق تعالیٰ اس پر دس مرتبہ صلوٰۃ نازل فرمائے گا اور جو آپ پر ایک مرتبہ سلام بھیجے گا۔ حق تعالیٰ اس پر سلام دس مرتبہ بھیجے گا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وقت اس نعمت کے شکر میں دو سجدے کئے جو بہت طویل تھے گویا

کہ دیکھنے والوں کو خیال گزرا کہ آپ کی روح مبارک آسمان پر چلی گئی اور جسم اطہر کو چھوڑ گئی ہے اور ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے شخص کو دیکھا جو چھوٹے قد کا، بہت حقیر و کمزور ضعیف الحرکت اور ناقص الخلقت تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ شکر ادا کیا اس قسم کی بکثرت حدیثیں مروی ہیں اور صحیح بخاری میں بھی ہے کہ روز بدر جب ابو جہل لعین کا سر لائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا اور فرمایا "مَاتَ فِرْعَوْنُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ۔" اس امت کا فرعون مارا گیا ایک اور روایت میں ہے کہ دو رکعتیں پڑھیں یہ حدیث، سجدے سے نماز کی تاویل کی صحت میں نظیر ہے۔ جیسا کہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک تاویل کرتے ہیں۔

اور آثار صحابہ میں منقول ہے کہ جب کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کو حق تعالیٰ کی جانب سے توبہ کی بشارت انہیں پہنچی۔ تو سجدۂ شکر کیا اور وہ اکابر صحابہ اور شعرائے اسلام میں سے ہیں اور یہ ان تین افراد میں سے ایک ہیں جنہوں نے غزوۂ تبوک سے تخلف کیا تھا اور حق تبارک و تعالیٰ کی جانب سے رحمت و کرم کے ساتھ ان پر رجوع و توبہ کی قبولیت نازل ہوئی تھی۔ جیسا کہ قرآن عظیم میں منطوق ہے کہ: وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ یہ قصہ طول طویل ہے اور احسن القصص میں سے ہے اور اسے ہم نے سفر السعادۃ کی شرح میں بیان کیا ہے وہاں دیکھنا چاہیے۔

امیر المومنین سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب مسیلمہ کذاب کے قتل کی خبر سنی تو سجدۂ شکر کیا اس کا قصہ مشہور ہے اور امیر المومنین علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے جب ذوالثدیہ کو جو کہ خوارج رؤسا میں سے تھا مقتولوں کے درمیان مرا ہوا دیکھا تو سجدۂ شکر کیا اور اس کا قصہ اور خوارج کا حال بھی کتب احادیث اور سیر کی کتابوں میں مذکور ہے ان میں سے مختصر سا تذکرہ شرح سفر السعادۃ اور شرح مشکوٰۃ میں بھی کیا گیا ہے۔

نماز جمعہ: وصل:۔ جمعہ، بزبان مشہور، جیم کے پیش اور میم کے سکون اور پیش سے ہے۔ اور سیوطی نے میم کے زبر سے بھی ذکر کیا ہے اور زجاج سے اس کے زیر سے بھی نقل کیا گیا ہے اور قرآن کریم میں قرائت شعبہ کے بموجب میم کے پیش سے ہے اور سکون شواذ میں سے ہے۔ زمانہ جاہلیت میں اس دن کو عروبہ بفتح عین وضم را و باموحدہ کہتے تھے۔ اور جمعہ اسلامی نام ہے اس بنا پر کہ اس دن نماز کیلئے اجتماع ہوتا ہے۔ (کذا قیل)۔ اور تحقیق یہ ہے کہ عروبہ، جاہلیت میں اس کا قدیم نام ہے۔ نیز جاہلیت سے اسے جمعہ کے ساتھ بدل دیا گیا کیونکہ اس دن میں اجتماع آفرینش ہے یا اس بنا پر کہ اس میں آدم علیہ السلام کی پیدائش تمام ہوئی اور روح و جسم کو جمع کیا گیا اسی طرح ہفتہ کے تمام دنوں کو بدل دیا گیا۔

فائدہ:۔ قدیم زمانہ میں ہفتہ کے نام یہ تھے۔ اول، اہون، جبار، دبار، مونس، عروبہ، شیار۔ جمعہ کا دن زمانہ جاہلیت میں بھی شرافت و بزرگی رکھتا تھا اور اسلام میں دیگر امتیازی خصائص و فضائل کے ساتھ موسوم ہوا۔ اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے پہلے والوں کو جمعہ کے دن سے گمراہ رکھا۔ اس سے مراد یہود ونصاریٰ ہیں۔ کیونکہ یہودیوں کیلئے سبت یعنی شنبہ کا دن اور نصاریٰ کے لئے یک شنبہ یعنی اتوار تھا اس کے بعد اللہ تعالیٰ ہمیں لایا اور مسلمانوں کو پیدا فرمایا تو ہمیں روز جمعہ کی راہ دکھائی اور یہود و نصاریٰ کے روز جمعہ سے گمراہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انہیں اس دن عبادت کرنے اور اس دن عبادت کے ذریعہ شکر و نعمت بجالانے کے لئے مجتمع ہونے کا حکم دیا تو انہوں نے مخالفت کی اور تمرد و سرکشی کا مظاہرہ کیا اور انکار کی زبان کھولی اور اس کے بدلے شنبہ کو یہودی چاہنے لگے اور یہ سبب بتانے لگے کہ یہ دن انتہائے آفرینش کا ہے اور صانع کا آفرینش کی مشغولیت سے فارغ ہونے کا دن ہے۔ لہٰذا مخلوق کو بھی چاہئے کہ مشاغل سے یکسو ہو کر عبادت میں مصروف ہو اور نصاریٰ باتیں بنانے لگے کہ اتوار، آفرینش کی ابتداء کا دن ہے۔ لہٰذا یہ دن تعظیم شکر و نعمت اور قبولیت عبادت کیلئے زیادہ سزاوار ہے۔ اور اکثر اس کے قائل ہیں کہ جمعہ کا دن ان پر متعین کر کے فرض نہیں

کیا گیا تھا بلکہ انہیں کسی ایک دن کے اختیار کر لینے اور عبادت کے لئے مخصوص کر لینے کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنے فکر و اجتہاد سے کام لے کر تلاش کریں کہ یہ دن کون سا ہونا چاہئے۔ لہٰذا یہود نے شنبہ کو اور نصاریٰ نے اتوار کو مذکورہ علت و سبب کے تحت دریافت کیا۔ اسی قیاس کے بموجب مسلمانوں کو جمعہ کے دن کی ہدایت دینے اور راہ دکھانے کے بارے میں بھی دو قول کہے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمانوں پر جمعہ کا دن فرض کیا گیا اور ا٢ ، کا انہیں حکم دیا گیا چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ — اے ایمان والو جب جمعہ کی نماز کیلئے اذان ہو تو اللہ کے ذکر کی طرف سعی کرو......

تو حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی اور گمراہ نہ رکھا۔ اور تمرد و سرکشی میں انہوں نے زبانِ انکار نہ کھولی اور اسباب و علل کے لحاظ سے غور و فکر اور اجتہاد کرنے میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی رہنمائی فرمائی۔ اور اصابت فکر عنایت فرمائی۔ اہل علم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عبادت کیلئے پیدا فرمایا اور جب ان کی تخلیق جمعہ کے دن ہے تو اولیٰ اور انسب ہے کہ یہی دن عبادت کیلئے بھی ہو۔ نیز حق تعالیٰ نے باقی دنوں میں ان چیزوں کو پیدا فرمایا جن سے وہ منتفع ہوں اور جمعہ کے دن خود ان کی ذات کو پیدا کیا للذا نعمتِ وجود کا شکر، بہ نسبت ان نعمتوں کے جو ان کی ذات سے خارج ہیں اولیٰ و افضل ہے اور ظاہر اس جگہ پہلے معنی ہیں۔ بلکہ یہود و نصاریٰ کے باب میں بھی۔ لیکن ابن حجر شرح صحیح بخاری میں فرماتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں انصار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری اور آپ پر قرآن نازل ہونے سے پہلے جمع ہوئے اور کہنے لگے کہ جب کہ یہود و نصاریٰ کا ایک ایک دن خاص ہے جس میں وہ ہر ہفتہ جمع ہوتے ہیں تو ہم بھی عبادت کیلئے ایک دن خاص کرتے ہیں تاکہ ہم اس دن جمع ہو کر حق تبارک و تعالیٰ کا ذکر کریں۔ نماز پڑھیں اور شکر و عبادت کے آداب بجالائیں تو اس کے لئے انہوں نے یوم عروبہ کو جو قدیمی نام روزِ جمعہ کا ہے متعین کیا۔ اگرچہ یہ ان خصوصیات کے ساتھ نہ تھا جو نماز کے بارے میں قرآن کریم میں خصوصیات نازل ہوئیں مقصود میں اتنا ہی کافی ہے فتدبر۔

اوس بن اوس کی حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے تمام دنوں میں سب سے بہتر دن جمعہ کا ہے۔ اور یہ حدیث بتاتی ہے کہ افاضل ایام بہت ہیں۔ مثلاً یوم عرفہ، یوم عیدین وغیرہ۔ اور روز جمعہ بھی ان دنوں میں سے ایک دن ہے۔ علماء کا اختلاف ہے کہ روزِ جمعہ اور روزِ عرفہ میں کون سا دن افضل ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ہفتہ کے دنوں میں روزِ جمعہ افضل ہے اور سال کے دنوں میں روزِ عرفہ، یہ بات بغیر غور و فکر کے حاصل نہیں ہوتی۔

اسی طرح شبِ قدر اور شبِ جمعہ میں علماء اختلاف رکھتے ہیں امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جمعہ افضل ہے اس لئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صلب حضرت عبداللہ سے رحم آمنہ رضی اللہ عنہا میں جمعہ کی رات ہی تشریف لائے اور ایام "منیٰ" میں تھے۔ جیسا کہ ولادتِ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں انشاء اللہ آئے گا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ تمام دنوں کا سردار یوم جمعہ ہے اسی دن خلقِ عالم جمع ہوئی اور اسی دن حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور جمعہ کے دن ہی انہیں جنت میں داخل کیا گیا اور جمعہ کے دن ہی انہیں جنت سے زمین پر لایا گیا اور جمعہ کے دن ہی حضرت آدم نے وفات پائی اور اسی دن قیامت قائم ہوگی اسی دن صور پھونکا جائے گا۔ اسی دن مخلوق بیہوش ہوگی۔ ان واقعات کے بیان کرنے کا مقصد اس دن میں امورِ عظیمہ کے واقع ہونے کا تذکرہ ہے یا اس بنا پر کہ حضرت آدم علیہ السلام کا جنت سے باہر آنا اور ان کا اس عالم میں تشریف لانا بیشمار حکمتوں پر مبنی ہے۔ جن کا احاطہ دائرہ امکان سے باہر ہے۔

خصائصِ یومِ جمعہ: روزِ جمعہ کے خصائص بہت ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس دن میں ایک گھڑی ایسی ہے کہ اس گھڑی

میں بندہ خدا سے جو مانگے گا پائے گا صحابہ و تابعین اور بعد کے علماء کے درمیان اس گھڑی کے بارے میں دو مختلف قول ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ گھڑی سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کرامت نشان کے خصوصیات میں سے تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ مرفوع ہو گئی یہ قول مردود ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جمعہ کے دن وہ گھڑی جس میں دعا مقبول ہوتی تھی اٹھالی گئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو ایسا کہتا ہے جھوٹ ہے وہ گھڑی اب بھی روزِ جمعہ میں موجود ہے۔ یہ دوسرا قول ہے اور یہی صحیح ہے۔ مطلب یہ کہ جس طرح سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارکہ میں وہ گھڑی تھی اب بھی وہ گھڑی باقی ہے۔ نیز اس قول میں بھی دو رائے ہیں۔ ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ اس گھڑی کو روزِ جمعہ میں پوشیدہ اور مخفی رکھا گیا ہے جس طرح کہ شبِ قدر کو اخیر عشرۂ رمضان المبارک میں رکھا گیا ہے۔ اور اکثر اس کے قائل ہیں کہ یہ گھڑی متعین ہے اس میں تیس سے زیادہ اقوال ہیں جسے شیخ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح بخاری میں ہر ایک قائل کے نام کے ساتھ ان کے قول کا ذکر کیا ہے اور اس کے دلائل بیان کئے ہیں اور ان کی تصحیح، تضعیف، رفع اور توقف کو بیان کر کے باہم تطبیق ظاہر کی ہے۔ اور ہم نے شرح سفر السعادۃ میں ان سب کو نقل کر دیا ہے ان میں سب سے زیادہ راجح دو قول ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ وہ گھڑی، منبر پر امام کے بیٹھنے سے نماز کے مکمل ہونے تک ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس دن کی آخری گھڑی ہے (یعنی نماز عصر کے بعد غروب آفتاب تک) اس کے بعد دونوں قوموں کے درمیان ترجیح میں بھی علماء کے دو قول ہیں اکثر دوسرے قول کو ترجیح دیتے ہیں اور اس قول کی تقویت و تائید میں احادیثِ کریمہ سے استدلال کرتے ہیں۔ صاحب سفر السعادۃ فرماتے ہیں کہ سنن سعید بن منصور میں باسناد صحیح، ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ صحابہ کرام کی ایک جماعت مجتمع ہوئی اور اس گھڑی کی تعیین میں بحث کرنے لگی۔ اور جب یہ مجلس برخاست ہوئی تو کسی ایک نے اس میں اختلاف نہ کیا کہ وہ گھڑی جمعہ کے دن کی آخری ساعت ہے۔

اور سیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ انہوں نے اپنے خادم کو مقرر کیا کہ روزِ جمعہ کی آخری گھڑی کا خیال رکھے اور آخر ساعت کی انہیں خبر دے اور جب انہیں باخبر کیا گیا تو وہ دعا میں مشغول ہو گئیں ایک اور روایت میں غروبِ آفتاب کا وقت آیا ہے۔ (واللہ اعلم)

خصائصِ روزِ جمعہ میں سے ایک یہ ہے کہ اس دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا مقام اجابت و قبول کو پہنچتا ہے۔ ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس دن ایک نماز ایسی ہے جو اسلام کے اعظم فرائض سے ہے اور اس میں سستی و کاہلی کرنا دلوں پر مہر کرنے اور منافقوں کے زمرے میں لکھے جانے کا موجب ہے۔ (العیاذ باللہ) اور اس دن میں غسل کرنا سنتِ مؤکدہ ہے۔ اور ایک جماعت کے نزدیک واجب ہے۔ خوشبو ملنا، مسواک کرنا اور عمدہ لباس پہننا دوسرے دنوں کے مقابلہ میں زیادہ مستحب ہے اور اس دن مسجد کو خوشبو سے معطر کرنا مستحب ہے اور علماء کی ایک جماعت کے نزدیک روزِ جمعہ، نصف النہار کے وقت میں نماز نافلہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے۔ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وقتِ استواء یعنی نصف النہار کے وقت نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے مگر جمعہ کے دن نہیں اور فرمایا جہنم کو اس وقت میں دہکایا جاتا ہے مگر جمعہ کے دن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بکثرت فساق و فجار، جمعہ کے دن اور اس کی رات میں ارتکاب معاصی سے مجتنب رہتے ہیں اس بنا پر کہ اس دن آثارِ رحمت کا ظہور ہے اور یہ دن اور تمام دنوں کے مقابلہ میں زیادہ عبادت اور تضرع و زاری کرنے کے لئے پسند کیا گیا ہے۔ جس طرح تمام مہینوں پر رمضان کو شرف حاصل ہے اس دن قبولیت کی گھڑی، رمضان المبارک میں شب قدر کی مانند ہے اور جمعہ کا دن مسلمانوں کیلئے عید کا دن ہے جو ہر ہفتہ بار بار آتی ہے حدیث مرفوع میں ہے کہ

يَوْمُ الْجُمُعَةِ سَيِّدُ الْأَيَّامِ وَأَعْظَمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ يَوْمِ الْأَضْحٰى وَيَوْمِ الْفِطْرِ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جمعہ کا دن تمام دنوں کا سردار ہے اور اللہ کے نزدیک یہ عید قرباں اور عید الفطر سے زیادہ اعظم وافضل ہے۔

اور جو کوئی نماز جمعہ کیلئے پیدل جائے اس کا ثواب سال بھر کے نماز وروزہ کے برابر ہے اور یہ دن کفارۂ سیئات کا دن ہے اور آسمان وزمین، پہاڑ ودریا اور ساری مخلوق، جمعہ کے دن اس علم کی بنا پر ڈرتے ہیں جسے حق تعالیٰ نے انہیں بخشا ہے کہ اس دن میں قیامت قائم ہوگی مگر جنات وانس کے دلوں پر قیامِ تکلیف اور ایمان بالغیب کی وجہ سے پردے ڈال دیئے گئے ہیں۔ اس دن، مومنوں کی روحیں اپنی قبروں کے قریب ہوتی ہیں اور وہ اپنی قبر پر آنے والوں کو اور دنوں سے زیادہ پہچانتی ہیں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ ان کی شناخت بہ نسبت آخر دن کے اول دن میں زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا اس دن زیارت قبور زیادہ مستحب ہے۔ اور حرمین شریفین میں لوگوں کی عادت یہی ہے۔ اور اکثر علماء کے نزدیک خاص جمعہ کے دن روزہ رکھنا مکروہ ہے کیونکہ یہ دن ہماری عید کا ہے۔ اور عید کے دن روزہ مکروہ ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک مکروہ نہیں ہے اور یہ دن وعظ وتذکیر کیلئے بطریق وجوب در خطبہ، مسلمانوں کے اجتماع کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور عید کے دن خطبہ سنت ہے (اور جمعہ کا خطبہ واجب ہے) اور منقول ہے کہ شب جمعہ میں ارواح مومنین جمع ہوتی ہیں اسے ابن قیم نے "کتاب الہدیٰ" میں بیان کیا ہے۔ جس طرح کہ خاص جمعہ کی رات میں قیام کرنا مکروہ ہے۔ (یہ کراہت اس صورت میں ہے جب کہ ہفتہ کے اور دنوں اور راتوں میں روزہ وقیام نہ کرے اگر اور دنوں میں بھی کرتا ہے تو کوئی کراہت نہیں ہے۔ مترجم) اس بارے میں علمائے کرام نے جو وجوہات بیان کی ہیں وہ نامکمل ونا تمام ہیں اس مسکین کے نزدیک (یعنی صاحب مدارج النبوت کے نزدیک) ظاہر یہ ہے کہ یہ اشارہ ہے کہ طالب کو چاہئے کہ ہمیشہ طاعت وعبادت میں مشغول رہے اور بعض اوقات کو مخصوص کر لینا اگرچہ وہ متبرک ہوں کوئی چیز نہیں ہے۔

اور روز جمعہ وشبِ جمعہ میں موت آنے کی فضیلت میں احادیث وآثار مروی ہیں کہ مرنے والا عذاب قبر سے محفوظ رہتا ہے۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے "جمع الجوامع" میں مسند احمد وبیہقی سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَمُوْتُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ اَوْ لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ اِلَّا وَقَاهُ اللّٰهُ فِتْنَةَ الْقَبْرِ۔" کوئی مرنے والا مسلمان ایسا نہیں ہے جو جمعہ کے دن یا اس کی رات میں مرے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے عذاب قبر سے محفوظ رکھے گا اور اسی طرح شیرازی نے "القاب" میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اور ابو نعیم رضی اللہ عنہ نے "حلیہ" میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جو کوئی روزِ جمعہ یا اس کی رات میں مرے اسے عذابِ قبر سے نجات حاصل ہو جاتی ہے اور قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے ہاتھ پر شہیدوں کی مہر ہوگی نیز مروی ہے کہ روزِ جمعہ چھ ہزار مسلمان اور شبِ جمعہ تین ہزار مسلمان بخشے جاتے ہیں اور ایک روایت میں ہے کہ تمام لوگ بخشے جاتے ہیں اور جمعہ کے دن مسجد کے دروازے پر فرشتے دفتر لے کر بیٹھتے ہیں اور آنے والوں کو بالترتیب لکھتے ہیں یعنی جو پہلے آیا اسے پہلے لکھتے ہیں اور جو بعد میں آیا اسے بعد میں لکھتے ہیں اور جب امام خطبہ کیلئے منبر پر آتا ہے تو فرشتے دفتر لپیٹ کر مسجد میں داخل ہو جاتے ہیں اور وہ فرشتے اس میں جمعہ کے دن دو رکعت نماز کا اجر وثواب، غیر جمعہ میں ادا کردہ ہزار رکعت سے زیادہ بڑھا کر اور ایک تسبیح کو ہزار تسبیح سے زیادہ لکھتے ہیں۔ اور مروی ہے کہ جب حق تبارک وتعالیٰ روزِ قیامت تمام دنوں کو ایک خاص ہیئت وصورت پر اٹھائے گا تو روزِ جمعہ کو اہل جمعہ کیلئے روشن وتاباں اٹھائے گا۔ اور ان کیلئے روزِ جمعہ روشنی بن کر مشعل راہ بنے گا۔ اور وہ اس کی روشنی میں چلیں گے۔ اور ان کی رنگت، صفا وسفیدی میں مثل برف کے ہوگی۔ اور ان کی خوشبو، بوئے مشک کی مانند ہوگی اور وہ کافوری پہاڑوں میں بیٹھیں گے۔ اور ان کی طرف جنات وانسان دیکھیں گے اور حیرت وتعجب میں ان کی آنکھیں تک نہ جھپکیں گی یہاں تک کہ وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے اور ان سے کوئی نہ

ملے گا مگر وہ موذن جس نے خدا کیلئے اذان کہی ہوگی۔

اور اذان جمعہ کے وقت خرید و فروخت کی حرمت و کراہت اور بعد از نماز جمعہ بیع شراء کا استحباب، بھی جمعہ کے خصائص میں سے ہے۔ اور جمعہ کے دن نماز فجر میں سورۂ الٓمٓ السجدہ اور سورۂ "ہل اتی علی الانسان" کا پڑھنا اور نماز جمعہ میں سورۂ جمعہ اور سورۂ منافقون یا سبح اسم ربک الاعلیٰ اور سورۂ غاشیہ پڑھنا اور نماز مغرب میں سورۂ قل یا ایہا الکافرون اور قل ہو اللہ احد کا پڑھنا اور نماز عشاء میں سورۂ جمعہ اور سورۂ منافقون کا پڑھنا بھی مسنون ہے اور شوافع ان پر التزام رکھتے ہیں اور ہرگز ان کے خلاف نہیں کرتے۔ لیکن احناف تعیین سورۃ کو مکروہ جانتے ہیں اور ہرگز نہیں پڑھتے۔ محقق حنفیہ، شیخ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ ایسا نہ کرنا چاہئے۔ کبھی کبھی انہیں بر بنائے صحت احادیث جو کہ اس بارے میں وارد ہیں پڑھنا چاہئے۔ اور فرماتے ہیں کہ مقتضائے دلیل کراہت، ایہام تفضیل اور ہجران باقی اور ان کا عدم جواز وغیرہ، عدم مداومت ہے نہ کہ مداوت عدم۔

بندۂ مسکین عبدالحق بن سیف الدین (صاحب مدارج النبوۃ رحمتہ اللہ علیہ) کہتا ہے کہ یہ ظاہر ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی دائمی نہ ہوا ہوگا کہ اس کے خلاف کبھی عمل نہ کیا ہو۔ جیسا کہ نوافل میں آپ کی عادت شریفہ ہے۔ اگر ہو بھی تو اکثری ہوگی۔ لہٰذا احناف کا طریقہ یہ ہے کہ اگر پڑھیں تو جمعاً بین الحدیث والمذہب کبھی کبھی ترک بھی کر دیا کریں۔ (واللہ اعلم)

اور شب جمعہ اور روز جمعہ میں سورۂ کہف کے پڑھنے کے فضائل، متعدد طریقوں اور سندوں سے مروی ہیں اور رسول کریم علیہ السلام نے فرمایا جو کوئی روز جمعہ سورۂ کہف کو پڑھتا ہے تو روز قیامت اس کے لئے ایک نور زیر قدم سے آسمان تک روشن ہوگا اور ایک روایت میں ہے کہ اس کیلئے بیت العتیق سے نور روشن ہوگا اور اس کے ہر صغیرہ گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ جو دو جمعوں کے درمیان ہونگے۔ اگرچہ حدیثیں بظاہر گناہوں کی بخشش میں عام ہیں یعنی صغیرہ اور کبیرہ دونوں کو شامل ہیں لیکن علماء ان کو صغائر کی بخشش سے تخصیص کرتے ہیں۔ واللہ اعلم

فضیلت یوم جمعہ در روز آخرت ۔ وصل بخلاصہ کلام یہ ہے کہ جمعہ کا دن، دنیا و آخرت میں بڑی عظمت و شرافت والا دن ہے لیکن دنیاوی عظمت و شرافت تو معلوم ہوگئی مگر آخرت میں اس کی عظمت و شرافت میں ایک ایسی حدیث ہے جو فوائد شریفہ اور حقائق عظیمہ پر مشتمل وارد شدہ ہے۔ کیونکہ وہ حدیث ان لوگوں کی کیفیت پر دلالت کرتی ہے جو جمعہ کے دن نماز جمعہ کیلئے حاضر ہوتے ہیں۔ اور انہیں انوار شہود اور عظمت و جلال حق سبحانہ وتعالیٰ سے ایک پرتو حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ ایک نمونہ ہے اس چیز کا جو انہیں روز آخرت، قرب پروردگار اور دیدار حق سبحانہ وتعالیٰ حاصل ہوگا اور اس حدیث کو امام شافعی اور دیگر آئمہ حدیث نے روایت کیا ہے وہ یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاس جبریل علیہ السلام، اس حال میں آئے کہ ان کے پاس ایک سفید آئینہ ہے اور اس میں ایک سیاہ نقطہ تھا۔ میں نے کہا اے جبریل علیہ السلام یہ سفید آئینہ کیسا ہے اور اس میں سیاہ نقطہ کیسا ہے۔ جبریل علیہ السلام نے کہا یہ آئینہ تمام دنوں سے روز جمعہ کی مثال ہے جو صفا و نورانیت کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور اس میں جو نقطہ ہے یہ وہ گھڑی ہے جو روز جمعہ میں ہے۔ اور یہ تمام اجزاء میں باعتبار اس کے امتیاز کے ہے کیونکہ سفیدی پر سیاہی خوب روشن واضح ہوتی ہے۔ اسی لئے کتابت یعنی تحریر کیلئے تمام رنگوں میں سیاہی کو اختیار کیا گیا ہے۔ اور جبریل علیہ السلام نے کہا روز جمعہ کا نام "یوم المزید" ہے میں نے دریافت کیا "یوم المزید" کا کیا مطلب ہے۔ اور جمعہ کا یوم المزید کس لئے نام رکھا گیا ہے۔ جبریل علیہ السلام نے کہا فردوس میں جو کہ جنت کے درجوں میں اعلیٰ درجہ ہے۔ ایک کشادہ میدان پیدا کیا گیا ہے۔ جس کے طول و عرض کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اس میں مشک کے ٹیلے ہیں جن کی سربلندیاں آسمانوں تک پہنچی ہوئی ہیں اور جب جمعہ کا دن آتا ہے تو حق تعالیٰ اپنے فرشتوں میں سے جس قدر فرشتوں کو چاہے وہاں بھیجتا ہے اور اس کشادہ میدان کے گرد نور کے منبر ہیں اور ان منبروں پر انبیاء کرام جلوہ افروز

ہیں اور ان نوری منبروں کے گرد سونے سے مرصع، یاقوت وزبرجد کے اور منبر ہیں جن پر شہداء وصدیقین، ان نوری منبروں کے پیچھے بیٹھے ہیں۔ اس کے بعد حق تعالیٰ ان مشکوں کو ان کے لباسوں، چادروں اور بالوں میں بساتا ہے پھر حق تعالیٰ فرماتا ہے میں تمہارا رب ہوں، میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کر دیا اور تمہیں جنت میں لے آیا اب تم مانگو جو مانگنا چاہو میں تمہیں عطا فرماؤں گا وہ عرض کریں گے اے رب ہم تیری ہی رضا چاہتے ہیں اس پر حق تعالیٰ فرمائے گا اگر میں تم سے راضی نہ ہوتا تو تمہیں اپنے محل یعنی جنت میں نہ ٹھہراتا تم مجھ سے اس سے بالاتر چیز اور اس سے زیادہ مانگو اور میرے پاس ہر چیز میں بلند چیز ہے کیونکہ میری نعمتیں اور میر درجاتِ فضل بے نہایت و بے اندازہ ۔ اور آج کا دن یوم مزید ہے اس پر سب یک زبان ہو کر عرض کریں گے اے رب! اب ہمیں وجہ کریم کا جلوہ دکھا تاکہ ہم دیدار کریں اور چشم سر سے عیاں طور پر دیکھیں کیونکہ تمام مقاصد و مطالب کی نہایت و منتہا یہی ہے اس سے بالاتر اور کوئی مطلوب نہیں ہے۔ اس کے بعد کسی سوال کی گنجائش نہیں اور موسیٰ علیہ السلام کا یہ سوال کرنا کہ "رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ" (اے رب مجھے اپنا جلوہ دکھا تاکہ میں تیری طرف نظر کرو) ان کا مقصد یہی تھا اور یہ قبل از وقت سوال تھا۔ لامحالہ انہیں "لَنْ تَرٰىنِیْ" (تم ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے) کے زخم سے دوچار ہونا تھا اور جب اس سوال کا وقت آیا تو بصد تلطف مہربانی، خود بر سوال لایا۔ اور عطا فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ حصولِ سوال میں اصل اصول، وقت ہے اور جو کوئی قبل از وقت مانگے اور پیش از وقت چاہے وہ محروم و بے قرار رہے گا۔

وَسَحَابُ الْخَیْرِ لَهٗ مَطَرٌ فَاِذَا جَاءَ الْاِبَّانُ یَجِیْئُ

اس کے بعد حق تبارک وتعالیٰ ان پر تجلی فرمائے گا اور خود کو بے حجاب دکھائے گا پھر ان کو نظر جمال و جلال حق سبحانہ تعالیٰ سے کوئی چیز ڈھانپ لے گی۔ کیونکہ اگر اس پر حق تبارک وتعالیٰ کی یہ تقدیر حاصل نہ ہوتی کہ ان کو نہ جلائے اور وہ جنت میں باقی رہیں اس لئے کہ وہ جگہ فنا و زوال کی نہیں ہے تو یقیناً وہ سب جل کر خاکستر ہو جاتے پھر جب وہ سب دیدارِ باری تعالیٰ سے مشرف اور اس کے نورِ جمال سے منور ہو جائیں گے تو حق تعالیٰ ان سے فرمائے گا اب تم سب اپنی اپنی منزلوں میں جاؤ یہ ارشاد بھی بندوں پر لطف و مہربانی میں سے ہے اس لئے کہ ہمیشہ بارگاہِ رب العزت میں ہونا اور نوارِ ذات کریم میں مستغرق ہونا ان کی تاب وتواں سے باہر ہے تو وہ سب اپنی اپنی منزلوں میں چلے جائیں گے اور اپنے اپنے حال پر آجائیں گے اور پردہ ہائے صفات میں جو کہ اس کی رؤیت کا مقام و محل ہے اور وہ جنت کی نعمتیں ہیں مشاہدہ کریں گے اور دوسری تجلی کے لئے مستعد و مستحق ہوں گے۔ دونوں صورتوں میں مشہود ایک ہی ہے یعنی ذاتِ باری تبارک وتعالیٰ۔ البتہ شہود کی کیفیت میں فرق و تفاوت ہے اس کے بعد وہ اپنی منزلوں میں آجائیں گے حالانکہ ان میں سے ہر ایک کو اس مقام سے بلند تر مقام دیا گیا ہو گا۔ جو وقت تجلی سے پہلے انہیں حاصل تھا۔ مطلب یہ کہ جنت میں ان کے حسن و جمال اور نورانیت کو دوبالا کر دیا جائے گا کیونکہ وہ جمال صفات ہے اور یہ جمال نورِ ذات ہے پھر وہ اپنے حال پر آتے ہیں حالانکہ یہ مرد، عورتوں سے اور یہ عورتیں مردوں سے پوشیدہ ہوں گے اور ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھ سکیں گے۔ اس بنا پر کہ ان کو نور ذات حق نے جو کہ ان پر تاباں ہوا تھا ان کے نوروں پر ڈھانپا ہوا ہو گا ان حضرات کو اپنے حال پر آتے آتے ایک زمانہ گزر جائے گا۔ پھر کہیں وہ اس غلبہ سے رجوع ہو کر اپنی ان صورتوں پر آئیں گے جو اس سے پہلے ان کی تھی ایک دوسرے کو دیکھیں گے اور پہچانیں گے ان کی عورتیں ان سے کہیں گی تمہاری صورتیں ہمارے سامنے بدل گئی تھیں اور وہ اگلی صورت اور ہیئت نہ رہی تھی اور اب تو اور ہی صورت ہو گئی ہے۔ مطلب یہ کہ ایسا حسن و جمال تم پہلے تو نہ رکھتے تھے اب یہ کہاں سے تمہیں حاصل ہو گیا۔ وہ مرد کہیں گے یہ حسن و جمال اس بنا پر ہے کہ حق تبارک وتعالیٰ نے اپنے جمال سے ہم پر تجلی فرمائی تھی اور ہم نے، جس طرح اس نے چاہا دیدار باری تعالیٰ کیا۔

اس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں قسم ہے ذات باری تعالیٰ کی بلاشبہہ کسی نے نہ اس ذات باری تعالیٰ کا احاطہ کیا ہے اور نہ اس کا ادراک کیا اور نہ اس کی کنہ ذات تک پہنچ سکتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ جل جلالہ نے اپنے عظمت وجلال کو جس طرح چاہا ان کو دکھایا اور فرمایا۔ ذات باری تعالیٰ پر نظر کرنے کے معنی یہی ہیں۔ یہاں سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ مرئی ومنظور، نورِ عظمت وجلال ہے جو ذات حق تعالیٰ وتقدس سے ظاہر ہوا نہ کہ ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ اور عظمت وجلال، صفات ہیں اور مشاہدہ صفات، دنیا میں بھی تھا اس لئے کہ ہم کہتے ہیں کہ احاطہ کی نفی کی گئی ہے نہ کہ رؤیت کی۔ اور دنیا میں عظمت وجلال کا مشاہدہ دل کے ساتھ تھا نہ کہ بچشم سر۔

غرضیکہ بندہ وہ کچھ دیکھے گا جس کو حقیقت وعرفان کہہ سکیں کہ وہ حق ہے اور دیکھی ہوئی چیز کا احاطہ وادراک اور ہے اور اگر ان معنی میں کسی کو دنیا میں حاصل تھا تو فرق یہ ہے کہ وہ دل سے تھا نہ کہ بچشم۔ مثلاً عقلاً کہتے ہیں کہ جو کچھ جسم، رنگت، صورت اور چمک دمک دیکھی گئی ہے جسم کی کنہ حقیقت نہیں ہے یہ سب جسم کے صفات ہیں۔ عرف میں ایسا ہونے کے باوجود یہی کہتے ہیں کہ جسم کو دیکھا۔

بہرصورت اعتقاد رکھنا چاہئے کہ مسلمان حق تبارک وتعالیٰ کو آخرت میں دیکھے گا اور اس دیدار کو ان کی آنکھوں میں ظاہر کرے گا۔ جس طرح کہ دنیا میں دیدۂ دل کو ظاہر ہوا کرتا ہے۔ اس معنی کا اعتقاد کرکے خاموش رہے۔ اتنا ہی کافی ہے۔ (واللہ اعلم)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمانوں کو یہ کیفیت ہر جمعہ کو حاصل ہوگی۔ اور ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ میں دو حصے زیادہ ہوگی اور مسلمان جمعہ کو اس بنا پر محبوب رکھتا ہے کہ ان کا رب ان کو خیر وبرکت اور اپنے فضل وکرامت سے مخصوص فرماتا ہے اور وہ چونکہ خود نہیں چاہتے اور اس سے کچھ نہیں مانگتے ان سے حق تعالیٰ خود فرمائے گا جو چاہو مانگو میں تمہیں دوں گا۔ یقیناً ہمیشہ ان کا یہی حال رہے گا۔ تو یہ ہیں "یوم المزید" کے معنی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝ تو کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک میں سے کیا چھپا رکھا ہے بدلہ ہے ان کے اعمال کا۔

خطبہ جمعہ۔ وصل:۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ کیلئے منبر شریف پر تشریف لاتے تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ آپ کے سامنے اذان شروع کر دیتے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اقدس میں صرف یہی اذان تھی اور اسی طرح حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں رہی۔ جب دورِ خلافتِ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ آیا اور لوگوں کی کثرت اور ان کا اژدھام بڑھا تو دوسری اذان کا، اس اذان سے پہلے جو خطیب کے سامنے ہوتی ہے حکم دیا اور یہ اذان زوراء پر جو کہ مدینہ طیبہ کے بازار میں مسجد کے باہر ایک مقام کا نام ہے دی جاتی ہے۔ اور بعض روایتوں میں آیا ہے کہ اس اذان کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ظاہر فرمایا۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ظاہر فرمایا اور وہ جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تھا اعلام تھا بغیر لفظ اذان کے اور اس اذان کو بھی اذان ثانی کہتے ہیں باعتبار حدوث اور پہلی کو اول، باعتبار وجود، اور تیسری بھی کہتے ہیں باعتبار تسمیۂ اقامت باذان۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ۔ "بَيْنَ كُلِّ اَذَانَيْنِ صَلٰوةٌ" یہ اسی اعتبار سے ہے حدیث مبارک میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ اقدس میں دو اذانیں تھیں۔

اور بعض کے نزدیک وجوب سعی اور خرید وفروخت کے حرام ہونے میں معتبر یہی اذان ہے جو منبر پر خطیب کے بیٹھنے کے بعد ہوتی ہے چونکہ یہ اذان اپنی اصالت اور اپنے وجود میں زمانہ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں تھی لہٰذا حق سبحانہ وتعالیٰ کے ارشاد۔ "اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ۔" سے مراد یہی اذان ہے لیکن علماء اس کو اصح قرار دیتے ہیں کہ معتبر اذانِ اول ہے جو بعد میں رائج ہوئی بشرطیکہ وہ اذان بعد زوال کہی گئی ہو جو کہ اس کا وقت ہے اس لئے کہ اس سے مقصود خبردار کرنا ہے جو بعد زوال ہی حاصل ہوتا ہے۔

اور خطبہ کے وقت کی اذان، قوم کو تنبیہہ کرنے کیلئے ہے کہ امام خطبہ کیلئے نکل آیا ہے۔ لہٰذا سکوت و خاموشی کو لازم کرو اور نماز کو ترک کر دیں۔

لیکن وہ دوسری اذان جسے بعض ملکوں میں سنت جمعہ کیلئے کہتے ہیں تو یہ نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اقدس میں تھی اور نہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں اور نہ ان کے بعد کے زمانے میں اور اکثر بلاد اسلامیہ میں اس پر عمل بھی نہیں ہے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ اس اذان کو کس نے ایجاد کیا اور کب سے رائج ہے لہٰذا چاہئے کہ اذان اول کے بعد سنتیں ادا کریں۔ اور اگر چاہیں تو بقصد اعلام، الصلوٰۃ الصلوٰۃ کہیں جیسا کہ بعض علماء سے دیکھنے میں آیا ہے۔

بعض کتابوں میں واقع ہے کہ اذانِ اول، بنی امیہ کی ایجادات میں سے ہے۔ غالباً یہ اس اعتبار سے ہوگا کہ بعض محققین نے کہا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس اذان کو مقام زوراء پر کہنے کا حکم دیا ہے۔ اور ہشام بن عبدالملک نے اسے مسجد میں منتقل کیا ہے۔ (واللہ اعلم) ہر تقدیر پر اسے خلفائے راشدین نے قائم کیا ہے اسے بدعت نہ کہنا چاہئے اور اگر بعض اسلاف نے اس پر بدعت کا اطلاق کیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ زمانہ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم میں نہ تھا اس سے ان کی مذمت و برائی کرنا مقصود نہ ہوگا۔ جس طرح کہ امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے جماعت تراویح کے بارے میں یہی مروی ہے کہ کہا۔ "نِعْمَتِ الْبِدْعَۃُ ہٰذِہٖ۔" (یہ کتنی اچھی بدعت ہے) اور ہر بدعت حسنہ کا حکم یہی ہے۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فعل پر سکوتی اجماع تھا کیونکہ کسی ایک سے اس پر انکار منقول نہیں ہے۔ (فتدبر)

اور جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دیتے تو حاضرین کے شوق کی زیادتی اور خطبہ کے سننے میں مبالغہ کرنے کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز مبارک اس حد تک بلند ہو جاتی کہ ابتدا ہی بہ نسبت آپ کی آنکھیں سرخ اور عظمت و جلال کے انوار کتابانیوں سے مجلّٰی ہو جاتیں اور تبلیغ کی چمک دمک کا ظہور اور انذار میں آپ کا جوش اس حد تک سخت ہو جاتا کہ گویا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لشکر کو ڈراتے دھمکاتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ " صَبَّحَکُمْ وَمَسَّاکُمْ۔ " کہ تمہاری صبح و شام ہونے والی ہے اور لشکر کو ڈرانا اس وقت کہا جاتا ہے جب کہ لشکر کو کسی قوم کی خبر سے ڈرایا جاتا ہے کہ فلاں قوم کا لشکر ان پر حملہ کرنا ہی چاہتا ہے اور خبردار کیا جاتا ہے کہ صبح کے وقت تم پر حملہ کرکے تاخت و تاراج کرنے والا ہے یا بوقت شام حملہ آور ہوتا ہے اور شبخون مارتا ہے۔

اس کے بعد فرماتے۔

اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ خَیْرَ الْحَدِیْثِ کِتَابُ اللّٰہِ وَخَیْرَ الْھَدْیِ ھَدْیُ مُحَمَّدٍ وَّشَرَّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُھَا وَکُلُّ مُحْدَثَۃٍ بِدْعَۃٌ وَّکُلُّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ۔ رواہ مسلم۔

اور بعض حدیثوں میں اتنا زیادہ ہے کہ: "وَکُلُّ ضَلَالَۃٍ فِی النَّارِ" اور اما بعد کا کلمہ، خطبہ میں حمد و ثناء کے بعد کہنا مسنون ہے۔ بخاری میں اس کیلئے ایک باب باندھا ہے۔ اور فتح الباری میں ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ سب سے پہلے اس کلمہ کو کس نے ادا کیا۔ طبرانی میں ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث منقول ہے کہ داؤد علیہ السلام نے کہا اور شعبی سے مرفوع حدیث میں ہے کہ فصل خطاب وہ ہے جو داؤد علیہ السلام کو دیا گیا ہے۔ اور فرمایا: "وَاٰتَیْنٰہُ الْحِکْمَۃَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ" (اور ہم نے اس کو حکمت عطا فرمائی اور قول فیصل) اور یہ کلمہ ہے۔ اور بعض کہتے ہیں سب سے پہلے جس نے خطبہ دیا وہ معرب بن قحطان ہے۔ ایک قول میں کعب بن لوئی اور ایک قول میں سحبان بن وائل اور ایک قول میں قیس بن ساعدہ ہے۔ لیکن پہلا قول اشبہ و اثبت ہے اور ان اقوال کی جمع و تطبیق میں کہا گیا کہ پہلا قول، اولیت حقیقی میں ہے اور باقی لوگوں میں اولیت اضافی ہے۔

خطبہ دینے میں کمان یا عصا پر ٹیک لگاتے اور تلوار و نیزہ ہاتھ میں نہ پکڑتے اور بعض کہتے ہیں کہ میدان جنگ میں خطبہ دیتے تو کمان اور تلوار پر ٹیک لگاتے اور خطبہ جمعہ میں عصا پر۔ اور بعض روایات فقہیہ حنفیہ میں ہے کہ تلوار یا عصا پر ٹیک لگانا مکروہ ہے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ مکروہ نہیں ہے کیونکہ سنت میں وارد ہوا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ہر اس شہر میں جس کو غلبہ و جنگ سے فتح فرمایا ہے جیسے مکہ معظمہ وغیرہ وہاں ہتھیاروں پر ٹیک لگاتے تھے اور جہاں صلح کے ساتھ ہے جیسے مدینہ منورہ میں تو وہاں عصا پر ٹیک لگاتے تھے اسی بنا پر شوافع حرم مکہ میں تلوار سے ٹیک لگاتے ہیں کیونکہ ان کے قول کے بموجب اس کی فتح بطریق غلبہ ہے اور احناف عصا سے ٹیک لگاتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک فتح صلح سے ہے جیسا کہ اپنی جگہ انشاء اللہ ہم بیان کریں گے۔

صاحب سفرالسعادۃ میں فرماتے ہیں کہ کمان یا عصا پر ٹیک لگانا منبر شریف بنائے جانے سے پہلے تھا لیکن منبر بن جانے کے بعد محفوظ نہیں ہے کہ کس چیز سے ٹیک لگاتے تھے نہ کمان سے اور نہ عصا وغیرہ سے۔ (واللہ اعلم)

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ کو مختصر کہتے۔ مطلب یہ کہ نماز کی نسبت سے خطبہ مختصر کرتے اور نماز بہ نسبت خطبہ کے طویل فرماتے۔ ورنہ مسلم و ترمذی میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز معتدل ہوتی تھی نہ طویل نہ مختصر۔ اور ابو داؤد کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ درمیانہ ہوتا تھا۔ اور فرماتے کہ آدمی کا نماز کو دراز کرنا اور اپنے خطبہ کو مختصر کرنا اس کی سمجھ اور دانشوری کی نشانی ہے مانا کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وعظ و نصیحت میں ایک حرف کافی ہے خصوصاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے، کیونکہ آپ مصدر جوامع الکلم اور مظہرِ غرائب حکم ہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ طاعت و عبادت میں کوشش کرے۔ اور اپنے آپ کو آراستہ و پیراستہ کرنے میں مشغول رہے تا کہ "لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ" (وہ بات کیوں کہتے ہو جس پر تم عمل نہیں کرتے) کا مصداق نہ بنے اور فرماتے ہیں کہ کردار یعنی عمل کی ضرورت ہے نہ کہ گفتار کی۔ لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے افعالِ کریمہ تعلیم امت کیلئے تھے۔ اور آپ تعلیم کو قول سے مؤکد بناتے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" یا "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ" یا "سُبْحَانَ اللہِ" کی مقدار فرض خطبہ میں کافی ہے۔ اور اس سے زیادہ سنت و مستحب ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم میں ہے کہ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللہِ" (تو دوڑو ذکر الٰہی کی طرف) اس سے مراد خطبۂ جمعہ ہے اور اس مقدار پر ذکر الٰہی صادق ہے۔ نیز امیر المومنین حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کا فعل "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" کہنا تھا اور خطبہ ختم فرمادیتے۔ اس پر یہ دلیل کافی ہے جیسا کہ ہدایہ میں ہے۔

ابن الہمام اپنی شرح میں فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ قصہ کتبِ احادیث میں مذکور نہیں ہے البتہ بعض فقہ کی کتابوں میں ہے۔

اور جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد شریف میں داخل ہوتے تو حاضرین کو سلام فرماتے اور جب منبر شریف پر تشریف فرما ہوتے تو چہرہ انور لوگوں کے سامنے کرتے اور دوسری مرتبہ پھر سلام کرتے اس کے بعد منبر پر بیٹھتے اور اگر خطبہ کے دوران کوئی ضرورت لاحق ہوتی یا کوئی سائل سوال کرتا تو خطبہ کو قطع کر کے ضرورت پوری کرتے یا سائل کا جواب مرحمت فرماتے اس کے بعد خطبہ کو مکمل فرماتے۔ جب آپ ملاحظہ فرماتے کہ امام حسن و حسین رضی اللہ عنہما گرتے پڑتے آرہے ہیں تو منبر شریف سے اتر کر ان کو اٹھا لیتے۔ اسی طرح ایک سائل آیا اس نے دینِ اسلام کے بارے میں پوچھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم منبر سے اتر کر کرسی پر تشریف فرما ہوئے اور اسے تعلیم فرمائی۔ اس کے بعد پھر منبر پر تشریف لے گئے اور خطبہ کو تمام فرمایا اور اگر کسی محتاج و فقیر کو لوگوں کے مجمع میں ملاحظہ فرماتے تو حاضرین کو صدقہ و خیرات دینے کی ترغیب دیتے۔ اور اسے کچھ عطا فرماتے مثلاً کپڑا اور روپے وغیرہ۔ مانا کہ علماء نے

ان باتوں کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں شمار کیا ہے۔ (واللہ اعلم)

اور جب تمام جماعت حاضر ہوتی تو اگر گھر میں تشریف فرما ہوتے تو خطبہ کیلئے حجرہ شریف سے باہر تشریف لاتے اور اگر مسجد میں ہوتے تو صف سے نکل کر منبر پر تشریف لاتے اس وقت آپ تنہا ہوتے اور کوئی خادم آپ کے آگے نہ ہوتا۔ جیسا کہ آج لوگوں میں رائج ومتعارف ہے اور حرمین شریفین وغیرہما میں جمعہ یا خطبۂ عیدین کیلئے جماعتِ کثیرہ کے ساتھ شان وشوکت سے نکلتے ہیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے کوئی ہٹو بچو کہنے والا نہ ہوتا تھا۔

صاحب سفر السعادۃ فرماتے ہیں کہ چادر، رومال اور سیاہ کپڑے وغیرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عادی لباس نہ تھا۔ لیکن مشکوۃ میں مسلم سے بروایت حضرت عمرو بن حریث مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس حال میں خطبہ دیتے کہ آپ کے سر مبارک پر سیاہ عمامہ ہوتا اور اس کا شملہ اپنے دونوں کندھوں کے درمیان چھوڑا ہوتا اور جمعہ کے دن سیاہ لباس مستحب ہے لیکن احناف کے نزدیک تمام اوقات میں۔ اور یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ کے وقت خاموش رہنے اور اس کے سننے کا حکم فرماتے۔ اور فرماتے جو اس حال میں بات کرے کہ امام خطبہ دے رہا ہو تو بات کرنے والے کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔ یہ یہود کے مذہب پر تعریض ہے کیونکہ یہ آیتِ کریمہ: "كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا" یہودیوں کے شان میں نازل ہوئی ان کا ظاہر حال یہ تھا کہ وہ خطبہ کے دوران باتیں کرتے تھے اور یہ مثال عالم بے عمل کی ہے کہ وہ کتابوں کے اٹھانے کی مشقت تو برداشت کرتا ہے مگر اس سے فائدہ اور نفع نہیں اٹھاتا نیز فرمایا جو کوئی اپنے ساتھی سے خطبہ کے وقت یہ کہے کہ بیٹھ جاؤ یا خاموش ہو جاؤ تو یقیناً اس نے لغو کہا اس لئے کہ خاموش رہنے کو کہنا بھی بات کرنے میں شمار کیا جائے گا۔ خاموش رہنے کیلئے ہاتھ سے اشارہ کرنا چاہئے۔ اور جس نے لغو کہا اس کا جمعہ نہیں ہے اور نہ بروجہ کمال اس کا ثواب اور لغو کلام میں غیر مشروع وعبث ہے۔ اور صراح میں لغو کے معنی بیہودہ بکنے کے ہیں اور یہ خاموش رہنا اکثر علماء کے نزدیک واجب ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ انہیں میں سے ہیں اور امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب بھی یہی ہے اور بعض کے نزدیک مستحب ہے اور امام شافعی انہیں میں سے ہیں اور مواہب لدنیہ میں ہے کہ امام شافعی سے دو قول ہیں اور امام احمد سے بھی دو روایتیں ہیں اور کہتے ہیں کہ ابن عبد البر نے خاموشی کے وجوب پر اجماع نقل کیا ہے مگر بہت کم تابعین سے۔

اور سلام کا جواب دینے اور چھینک کا جواب دینے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض مکروہ جانتے ہیں اور بعض رخصت دیتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ امام کا خطبہ کیلئے نکلنے کے وقت سے نماز شروع کرنے کے وقت تک نماز اور کلام دونوں حرام ہیں اور اگر نماز میں ہے اور امام نے خطبہ شروع کر دیا تو نماز کو دو رکعت پر ختم کر دے۔ اور صاحبین کے نزدیک امام کے نکلنے کے بعد خطبہ شروع کرنے سے پہلے اور خطبہ ختم کر کے منبر سے اتر جانے کے بعد تکبیر نماز سے پہلے بات کرنے میں مضائقہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ ان اوقات میں سننا نہیں ہے۔ بخلاف نماز کے کہ اس میں درازی ہے کیونکہ اس کا قطع کرنا شروع خطبہ کے وقت ممکن نہیں ہے۔ اور کہتے ہیں کہ یہ قطع نفلی نماز میں ہے۔ ورنہ فوت شدہ قضا نمازوں میں خطبہ کے وقت میں جاری رکھنا بلا کراہت درست ہے۔

نیز اس میں بھی اختلاف ہے کہ دور بیٹھا ہو اور خطبہ کی آواز سن رہا ہو تو خاموش رہے یا نہیں۔ مختار خاموشی ہے اور بعض متاخرین فرماتے ہیں کہ خطبہ کے وقت دور بیٹھنا یا بادشاہوں کی تعریفیں بیان ہوتے وقت، ذکر وتسبیح میں مشغول ہونا بہتر ہے۔ اور شرح ابن الہمام میں ہے کہ خطبہ کے وقت کلام کرنا حرام ہے۔ اگرچہ امر بالمعروف اور تسبیح وتہلیل ہو۔ کھانا پینا اور لکھنا حرام ہے۔ سلام کا جواب دینا اور چھینک کا جواب دینا مکروہ ہے۔ اور امام ابو یوسف کی ایک روایت میں مکروہ نہیں ہے اس لئے کہ فرض ہے اور اس کا جواب یہ ہے ـــــ اگر سلام میں اذن ہو۔ اور اس بنا پر بھی کہ سلام کا جواب ہر وقت میں ممکن ہے بخلاف خطبہ کے۔ اور دل میں درود

بھیجے تاکہ سماع خطبہ سے باز نہ رہے۔ (وہوالصواب) اور چھینک کے وقت حمد بھی دل میں کہے اور منکرات سے باز رہنے کی تلقین، آنکھ اور ہاتھ کے اشارے سے مکروہ نہیں ہے۔ (وہوالصحیح) اور کتاب پر نظر کرنے اور قلم سے اس کی درستگی کرنے کے بارے میں امام ابو یوسف سے ایک روایت عدم کراہت میں مروی ہے۔(انتہی)۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز جمعہ میں پہلی رکعت میں سورۂ جمعہ اور دوسری رکعت میں سورۂ منافقون پڑھتے تھے اور کبھی "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى" اور "هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ" پڑھتے تھے اور دونوں عیدوں میں بھی یہی پڑھتے تھے۔ اور اگر عید روزِ جمعہ واقع ہوتی تو دونوں نمازوں میں یہی دونوں سورتیں پڑھتے۔

نمازِ تہجد۔ وصل:۔ تہجد، ہجود سے ہے۔ ہجود کے معنی نوم یعنی نیند کے ہیں اور تہجد کے معنی ترک نوم یعنی سونے کو چھوڑنا جس طرح کہ تاثم کے معنی اثم کو ترک کرنا اور تحنیث کے معنی ترک خبث کرنا ہے اور اس جگہ ترک نوم کے معنی استیقاظ یعنی بیداری کے ہیں اس لئے کہ نمازِ تہجد سونے اور اس سے بیدار ہونے کے بعد ہوتی ہے۔ اور اس میں اختلاف ہے کہ قیام لیل جس کے معنی نمازِ تہجد کے ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض تھی یا سنت۔ ہر ایک گروہ کی دلیل یہی آیۂ کریمہ " فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ " ہے تو وہ گروہ جو اسے سنت کہتا ہے وہ نافلہ کو نفل سے مانتے ہیں جس کے معنی فرض پر زیادتی کے ہیں۔ اور جو فرض کہتا ہے وہ نافلہ کو بمعنی زیادہ کہتے ہیں۔ جس کے لغوی معنی نفل ہے یعنی فرائض پر زائد فریضہ۔ اور اگر نافلہ بمعنی تطوع ہوتا تو " نافلۃ لک " جو مفید اختصاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہے نہ فرمایا جاتا اس لئے کہ نفل و تطوع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص نہیں ہے اور بعض کہتے ہیں کہ مراد درجات کی زیادتی ہے۔ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں تطوع ہے کیونکہ آپ مغفور مطلق اور معصوم ہیں۔ بجز رفع درجات کے کچھ اور مراد نہیں۔ اور یہ خصوصیت آپ ہی کیلئے ہے اور آپ کے سوا دوسروں کے حق میں کفارۂ ذنوب بھی ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی بھی حالت میں "قیام لیل" کو ترک نہ فرماتے اور سفر و حضر میں اس کی محافظت فرماتے۔ اور اگر کبھی کسی مرض یا غلبہ نوم کے سبب قیام شب فوت ہو جاتا تو دن چڑھنے کے بعد زوال آفتاب سے پہلے اس کے بدلے بارہ رکعتیں ادا فرماتے اور یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وجوبِ تہجد پر بظاہر دلالت کرتا ہے۔ اور آپ اتنا قیام فرماتے کہ آپ کے پائے مبارک ورم کر جاتے اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ آپ کے قدم ہائے مبارک میں شگاف پڑ جاتے۔ اور بعض مفسرین حق تبارک و تعالیٰ کے ارشاد "أَن لَّن تُحْصُوهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ۔" کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ قیام لیل واجب ہے اس تفسیر کے ساتھ جس کے حفظ اوقات میں، قرآن کریم میں ہے کہ تہائی شب یا نصف شب یا دو تہائی شب۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک سال تک قیام کیا اس کے بعد یہ آیت منسوخ کر دی گئی اور اس میں اختلاف ہے کہ نسخ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل ہیں یا امت کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کا حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر باقی ہے۔ (واللہ اعلم)

اہلِ علم فرماتے ہیں کہ نمازِ تہجد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شب میں تیرہ رکعتیں تھیں۔ پانچ دو دو اور تین رکعت وتر کے یا ایک رکعت وتر کا۔ ہمارے مذہب میں وتر کی تین رکعتیں ہیں۔ اور امام شافعی کے نزدیک ایک رکعت وتر ہے لیکن اس طرح کہ اس سے پہلے دو رکعت پڑھے اور سلام پھیر کر ایک رکعت وتر کی پڑھے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے وتر کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ اکثر و اقوی احادیث ایک رکعت کی ہیں اور میں اسی کا قائل ہوں اور فرمایا دو رکعت پر سلام پھیرے اور اگر سلام نہ پھیرے تو وتر کی تین رکعتیں پڑھے تو میں امید رکھتا ہوں کہ کوئی نقصان نہیں کرے گا۔

اور کاتب الحروف نے شرح سفرالسعادۃ میں وتر کی تین رکعتوں کا اسی تقویت کے ساتھ اثبات کیا ہے کہ اگر ایک رکعت پر زیادتی نہ ہوگی تو تین سے کم بھی نہ ہوں گی۔ (واللہ اعلم) اور جو ایک رکعت وتر کے قائل ہیں وہ اس طرح ادا کرتے ہیں کہ پہلے دو رکعت ادا کرتے ہیں اور سلام پھیر دیتے ہیں اور جو تین رکعت وتر کے قائل ہیں وہ سلام نہیں پھیرتے۔ اور حدیث شریف میں ایک رکعت پڑھنے کی ممانعت آئی ہے۔ اور شوافع اسے رکعتِ مفردہ مستقلہ بغیر ملائے دو رکعت پر محمول کرتے ہیں۔

بعض علمائے حدیث فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازِ شب گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہ ہوتی اور تیرہ رکعت کی روایت بھی صحیح ہے۔ لیکن مراد دو رکعت سنت فجر ہے یعنی نمازِ شب کی تو گیارہ ہی رکعتیں ہیں مگر دو رکعت سنتِ فجر محسوب کر کے تیرہ رکعتیں شمار کرتے ہیں اور صحیح یہ ہے کہ سنتِ فجر کو خارج کر کے تیرہ رکعتیں ہیں اور نو اور سات اور پانچ کی بھی وتر شامل کر کے روایتیں ہیں۔ اور کبھی تمام شب کی نمازوں پر وتر کا اطلاق بھی آیا ہے اس حکم کے تحت کہ: "اِنَّ اللّٰہَ وِتْرٌ یُحِبُّ الْوِتْرَ۔" اللہ تعالیٰ طاق ہے اور طاق کو پسند کرتا ہے اس کی خاص فضیلت بھی ثابت ہے۔ اور دن کی نماز میں بھی مغرب کو شامل کر کے وتر کا اطلاق کیا گیا ہے۔ کیونکہ فرمایا: "صَلٰوۃُ الْمَغْرِبِ وِتْرُ النَّہَارِ۔" مغرب کی نماز دن کا وتر ہے۔ حضور نمازِ شب کو کھڑے ہو کر ادا کرتے اور ان میں قرأت کو طویل فرمایا کرتے۔ مثلاً سورۂ بقرہ، سورہ آل عمران، سورۂ نساء، سورۂ مائدہ یا سورۂ انعام وغیرہ اور طویل سورتیں پڑھا کرتے تھے اور رکوع و سجود اور قومہ کو بھی قرات کے اندازے پر طویل فرماتے اور بعض راتوں میں تو نماز میں ایک ہی آیت بار بار پڑھ کر گزار دیتے وہ آیت یہ ہے "اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ" (اگر تو ان کو عذاب دے تو تیرے بندے ہیں اور اگر تو انہیں بخش دے تو تو ہی غالب و حکمت والا ہے) اور ہر آخری دو گانہ کو پہلے سے ہلکا کرتے اور آخر عمر شریف میں بیٹھ کر بھی دو گانے پڑھے ہیں۔ اور جب بیٹھ کر پڑھتے تو رکوع و سجود بھی بیٹھ کر ادا کرتے اور کبھی بیٹھ کر پڑھ رہے ہوتے اور جب قرأت کا حصہ ختم کے قریب ہوتا تو اٹھ کر کھڑے ہو کر پڑھتے اور رکوع کرتے اور سجدہ میں چلے جاتے اور دوسری رکعت میں بھی ایسا ہی کرتے۔ یا دوسری رکعت کو مکمل ہی بیٹھ کر پڑھتے یا کھڑے ہو کر گذارتے۔ ترمذی میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی بیٹھ کر نماز نفل پڑھتے نہ دیکھا مگر قبل از وفات چند برسوں میں اور صحیحین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ فرمایا جب آخر عمر شریف میں گرانی رونما ہوئی تو اکثر اپنی نمازیں بیٹھ کر ادا فرماتے۔

ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جلوس کی ہیئت جب کہ آپ بیٹھ کر نماز ادا کرتے تو چہار زانو ہوتی اور حفاظ حدیث نے اس روایت پر طعن کیا ہے اور فقہاء کرام کا اس کے استحباب اور جواز و کراہیت میں اختلاف ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک بیٹھنے کی ہیئت، تشہد میں بیٹھنے کی مانند ہے۔ ایک اور روایت میں احتباء اور تربع بھی آیا ہے نیز امام ابو یوسف سے احتباء اور امام محمد سے تربع کی بھی روایت ہے اور تشہد کی ہیئت پر بیٹھنے کی افضلیت میں اتفاق ہے اور جب بیٹھ کر ادا کرتے تو چھوٹی سورت کو پڑھتے اور اتنی ترتیل کرتے یہاں تک قرأت طویل ہو جاتی۔ اور اسی کے مطابق سجدہ دراز فرماتے۔ یہ روایت اس پر دلیل ہے کہ اگر کوئی بیٹھ کر نماز پڑھے تو قرأت، رکوع و سجود اور تمام ارکانِ نماز مکمل طور پر بجا لائے تاکہ ترک قیام کی تلافی اور جبر نقصان ہو سکے۔ نہ ایسا کہ جیسا بعض نادان لوگ کرتے ہیں۔ اور ان کی عادت ہے کہ اتنی جلد بازی کرتے ہیں کہ کوئی رکن مکمل ادا نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ خود پر لازم کردہ گنتی و شمار کو پورا کر لیں۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ شب کو ہلکی دو رکعت سے شروع فرماتے اس کے بعد بتدریج طویل فرماتے جاتے۔ اور کیفیتِ قیام اور تعداد و کمیت رکعات میں متعدد روایتیں آئی ہیں اور عبادت کرنے والوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ ان اقسام و انواع میں ہمیشگی

کرے اور ان میں سے ہر ایک فعل کو اوقاتِ مختلفہ میں عمل میں لائے۔ یہی طریقہ سلوک اور اتباعِ سنت میں داخل وانسب ہے۔ اور یہ تمام طریقے اور انواع احادیثِ صحاح میں مذکور اور سفرا لسعادۃ اور اس کی شرح میں مسطور و مصرح ہیں۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وتر کو کبھی اول شب میں ادا فرماتے اور کبھی آخر شب میں اور اکثر آخر شب میں ادا کرتے۔ جامع الاصول میں ترمذی سے حدیث مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وتر آخر عمر شریف میں جب کہ آپ نے اس جہان سے کوچ فرمایا سحر کے وقت تمام ہوا۔ اور ترمذی میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو خوف رکھتا ہے کہ آخر شب میں نہ اٹھ سکے گا اسے چاہئے کہ اول شب میں (بعد نماز عشاء) ادا کرے اور سو جائے اور جو امید رکھتا ہے کہ آخر شب میں اٹھ جائے گا تو یقیناً آخر شب میں نماز مشہود و محظور ہے اور یہ افضل ہے۔

اور بعض اصفیاء سے سنا گیا ہے کہ آخر شب میں وتر ادا کرنا، قرب بارگاہ رب العزت جل علا میں بہت بلند مقام رکھتا ہے اور حدیث میں آیا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے وتر اول شب میں پڑھے اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے آخر شب میں۔ پس رسول اکرم نے حضرت ابو بکر کے بارے میں فرمایا "اَخَذَ ہٰذَا بِالْحَذَرِ" یعنی انہوں نے یہ طریقہ نہ جاگنے کے خوف وڈر سے اختیار کیا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا: "اَخَذَ ہٰذَا بِالْقُوَّۃِ" یعنی انہوں نے یہ طریقہ جاگنے پر قدرت وطاقت رکھنے کی بنا پر اختیار کیا

خلاصہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا غالب واکثر احوال یہ تھا کہ آپ وتر کو آخر شب میں طلوع صبح صادق سے پہلے ادا فرماتے۔ اور بعض اوقات اول شب یا درمیان شب میں ادا کرتے اور اس کے بعد تہجد کے لئے اٹھتے تو وتر کا اعادہ نہ فرماتے۔ ترمذی میں حدیث ہے کہ فرمایا "لَاوِتْرَانِ فِیْ لَیْلَۃٍ" ایک رات میں دو وتر نہیں ہیں۔

شیخ ابن الہمام شرح ہدایہ میں فرماتے ہیں کہ جس نے اول شب میں وتر پڑھ لیا اب اگر وہ تہجد کے لئے اٹھے تو وتر کا اعادہ نہ کرے ان کی دلیل یہی حدیث ہے۔ اور یہ وجہ بھی ہے کہ اگر دو وتر گذارے تو لامحالہ ان میں سے ایک نفل ہو گا اور نفل میں وتر، شریعت میں وارد نہیں ہے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم وتر کے بعد دو رکعت ہلکی گزارتے اور اس میں: "اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ" اور "قُلْ یٰٓاَیُّہَا الْکٰفِرُوْنَ" پڑھتے۔ امام مالک ان دو رکعتوں کے منکر ہیں اور امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں اسے کرتا بھی نہیں اور نہ اس سے منع ہی کرتا ہوں۔ اور علماء فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بیانِ جواز کیلئے عمل کر کے بتایا اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے دو رکعتیں سنتِ فجر کی مراد ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ دو رکعتیں وتر کی ہیں اور ایک حدیث میں مروی ہے کہ وتر کے بعد ان دو رکعتوں کا ادا کرنا قیام لیل کے قائم مقام ہوتا ہے۔ یہ اس تقدیر پر ہو گا کہ کسی نے وتر کو اول شب میں ادا کر لیا ہو گا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز وتر کی اول رکعت میں "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی" اور دوسری رکعت میں "قُلْ یٰٓاَیُّہَا الْکٰفِرُوْنَ" اور تیسری رکعت میں "قُلْ ہُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ" پڑھتے۔ اور بعض روایتوں میں تیسری رکعت میں "قُلْ ہُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ" اور معوذتین بھی آیا ہے مگر مختار اول ہی ہے۔ ایسا ہی شیخ ابن الہمام نے فرمایا اور یہ جو معروف ہے کہ اول رکعت میں "اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ" پڑھتے۔ یہ نہ کسی حدیث میں مروی ہے اور نہ کسی اثر میں اور فرماتے ہیں کہ بعض فقہی روایتوں میں آیا ہے۔

اور جب وتر سے سلام پھیرتے تو تین مرتبہ "سُبْحَانَ الْمَلِکِ الْقُدُّوْسِ" پڑھتے اور تیسری مرتبہ میں آواز کو بلند فرماتے۔ اور حروف کو کھینچ کر پڑھتے۔ اس کے بعد فرماتے۔ رَبُّ الْمَلٰٓئِکَۃِ وَالرُّوْحِ۔

سنتِ فجر۔ وصل:۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دو رکعت سنت فجر پڑھنے کے بعد داہنے پہلو سے زمین پر ایک لحظہ آرام

فرماتے۔ بخاری و مسلم میں سیدتنا عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دو رکعت سنتِ فجر پڑھ چکتے تو اگر میں جاگتی ہوتی تو مجھ سے باتیں فرماتے ورنہ لیٹ جاتے اس وقت تک جب تک کہ نماز کی اطلاع عرض کی جاتی اور بخاری نے داہنے پہلو پر لیٹنے کا اضافہ کیا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سنت فجر کے بعد باتیں کیا کرتے تھے۔ اور ترمذی نے مستقل ایک باب "تکلم بعد از رکعتین فجر" کے لئے باندھا ہے اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب فجر کی دو رکعت سنتِ فجر کی ادا کر چکتے تو اگر ضرورت ہوتی تو مجھ سے باتیں فرماتے ورنہ نماز کیلئے باہر تشریف لے جاتے اور کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن وصحیح ہے۔ اور کہا کہ بعض اہل علم اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے تابعین رضی اللہ عنہم نے طلوع فجر کے بعد سے فراغ نمازِ فجر تک بات کرنے کو مکروہ جانا ہے مگر مکروہ نہیں جواز جنسِ ذکرِ الٰہی ہو یا کوئی ایسی بات جس کے بغیر چارہ نہ ہو۔ فرمایا کہ یہی قول امام احمد و اسحٰق کا ہے انتہی۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام فرمانا اس قبیل سے تھا جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا فرمانا ہے کہ فَإِنْ كَانَتْ لَهُ إِلَيَّ حَاجَتَهُ كَلَّمَنِيْ (اور آپ کو مجھ سے بات کرنی ضروری ہوتی تو کرتے) یہ کلمہ اس قول کی نظیر و دلیل ہے۔ اور اگر بالفرض کلام از جنسِ ذکرِ الٰہی اور ضروری نہ ہو تب بھی سنت کو باطل کرنے والی اور اس کا اعادہ کرنے کی موجب نہیں ہے۔ مگر بربنائے کراہت تکلم اس وقت میں، احتیاطاً اور تکمیلاً اعادہ کرے۔

ایک مرتبہ مکہ معظمہ میں شیخ علی بن قاضی جار اللہ جو کہ مفتی شہر مکہ اور بہترین فقیہہ تھے ان سے کسی نے کہا کہ ہمارے شہروں کے لوگ سنت فجر کے بعد بات کرنے کو مبطل سنت جانتے ہیں اس پر انہوں نے فرمایا: سُبْحَانَ اللّٰهِ اَلتَّكَلُّمُ خَارِجَ الصَّلٰوةِ يُبْطِلُ الصَّلٰوةَ یعنی خارج نماز بات کرنے سے نماز باطل ہو جائے تعجب ہے۔ اور بعض اہل ظواہر، سنتِ فجر کے بعد لیٹنے کو فرض جانتے ہیں۔ یہ اس حدیث کے بموجب ہے جو جامع ترمذی میں مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمُ الرَّكْعَتَيْنِ قَبْلَ صَلٰوةِ الصُّبْحِ فَلْيَضْطَجِعْ عَلٰى جَنْبِهِ الْاَيْمَنِ۔

جب تم میں سے کوئی سنتِ فجر کی دو رکعتیں پڑھ چکے تو نمازِ فجر سے پہلے چاہئے کہ داہنی جانب سے زمین پر لیٹ جائے اور بعض مبالغہ کرتے ہیں اور صحتِ فرض کیلئے شرط قرار دیتے ہیں۔ اور علماء کی ایک جماعت اس کی کراہت کی قائل ہے اور اسے بدعت شمار کرتے ہیں اور یہ دونوں قول بعید ہیں لیکن فرضیت کا بعید ہونا اس بنا پر کہ بعض حدیثوں میں لیٹنے کا ذکر نہیں ہے اور بدعت کا بعید ہونا اس بنا پر ہے کہ یہ حدیثِ صحیح سے ثابت ہے۔ اور جمہور علماء درمیانی راہ اختیار کر کے اس کے استحباب کا حکم دیتے ہیں۔ اور امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر استراحت کیلئے ہو تو محمود ہے اور ہمارے امام اعظم رحمہ اللہ کا قول بھی یہی ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مبارک بغرض استراحت تھا نہ کہ بطریق تعبد۔

اب رہا دائیں پہلو سے لیٹنا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ لیٹنے میں یہی تھی۔ کیونکہ یہ گہری نیند نہ لانے میں زیادہ موثر اور قیام کیلئے جاگنے میں زیادہ آسان ہے جیسا کہ اس کے مقام میں ظاہر ہو چکا ہے۔

قیام در شبِ برائت۔ ۔ اب رہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نصفِ ماہ شعبان کی رات میں قیام فرمانا جسے ہمارے شہروں میں عام طور سے شبِ برائت کہتے ہیں تو یہ حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت شدہ ہے۔ کیونکہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات میں قیام فرمایا۔ اور سجدہ کو اتنا دراز فرمایا کہ میں گمان کرنے لگی کہ شاید آپ کی روح مبارک پرواز کر گئی ہے چنانچہ جب میں نے یہ حال دیکھا تو میں کھڑی ہوئی اور آپ کے پاس پہنچ کر آپ کے انگوٹھے کو ہلایا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے جنبش فرمائی اور اپنے سرِ اقدس کو سجود سے اٹھایا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا اے حمیرا! (یہ محبت کا خطاب ہے) تم گمان کرنے لگیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے حق کی خیانت کی ہے اور میں نے تمہاری عہد شکنی کی ہے؟ میں نے عرض کیا نہیں یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات نہیں بلکہ میں نے آپ کے سجدے کی درازی سے یہ گمان کیا کہ شاید آپ کی روح مبارک پرواز کر گئی ہے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم نہیں جانتیں کہ یہ کون سی رات ہے؟ میں نے عرض کیا خدا اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی زیادہ جانتے ہیں فرمایا یہ رات نصف شعبان کی رات ہے اس رات حق تعالیٰ اپنے بندوں پر توجہ فرماتا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ وقت غروب آفتاب سے طلوع فجر تک۔ مطلب یہ کہ اور راتوں سے زیادہ اس رات میں توجہ فرماتا ہے۔ کیونکہ عام راتوں میں سحری کا وقت ہے مگر اس رات میں تمام رات ہے تو حق تعالیٰ مغفرت مانگنے والوں کی مغفرت فرماتا ہے اور طالبانِ رحمت پر رحمت فرماتا ہے اور تاخیر فرماتا ہے اور نہیں بخشتا ان لوگوں کو جو حسد و کینہ رکھتے ہیں۔ یعنی مسلمانوں کے ساتھ ناحق دشمنی اور کینہ رکھتے ہیں۔ نیز سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہی ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے اور جلد ہی اٹھ کر واپس تشریف لے گئے حالانکہ یہ رات میری باری کی تھی تو میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چل دی۔ میں نے دیکھا کہ حضور بقیع شریف میں سر مبارک کو آسمان کی جانب اٹھائے کھڑے ہیں۔ اور دعا مانگ رہے ہیں پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ملاحظہ فرمایا تو فرمایا اے عائشہ (رضی اللہ عنہا) تم ڈریں کہ شاید خدا اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تم پر ظلم کیا ہے اس پر میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے گمان کیا کہ شاید آپ کسی اور بی بی کے پاس تشریف لے گئے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ رات نصف شعبان کی ہے۔ اس رات حق تعالیٰ آسمان دنیا پر نزولِ اجلال فرماتا ہے اور بنی کلب کے بکریوں کی بالوں کی گنتی سے زیادہ لوگوں کی مغفرت فرماتا ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ سب ہی بخشے جاتے ہیں بجز مشرک، چغل خور، قاطع رحم، دکھ دینے والے، ماں باپ کے نافرمان، شرابی اور حسد و کینہ رکھنے والے کے اور اس رات میں ارزاق و آجال لکھے جاتے ہیں۔ اور حجاج کو لکھا جاتا ہے۔

نصف شعبان کی رات کی فضیلت میں حدیثیں بکثرت وارد ہیں۔ یہ رات تمام راتوں میں لیلۃ القدر کے بعد افضل ہے۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ چار راتوں میں رحمت کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔ شبِ عیدالاضحیٰ، شبِ عیدالفطر، شبِ نصف شعبان اور شبِ عرفہ، اذانِ فجر تک۔

اور شبِ نصف شعبان میں عبادت کرنا اور اس کے دن میں روزے رکھنا صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ اور اہل شام کے تابعین میں سے حضرت خالد بن معدان، نعمان بن عامر اور مکحول وغیرہ اس رات میں خوب عبادت کرنے کی کوشش کرتے۔ عمدہ کپڑے پہنتے عود و عنبر سلگاتے، سرمہ لگاتے اور مسجد میں قیام کرتے تھے۔ انہیں سے لوگ اس رات کی عظمت لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس باب میں ان کو اسرائیلی آثار پہنچے ہیں لیکن علماء حجاز و مدینہ اس میں ان کی موافقت نہیں کرتے اور مساجد میں اجتماع کو بدعت قرار دیتے ہیں اور اوزاعی جو کہ امام اہلِ شام ہیں تنہا نماز پڑھنے کو مکروہ جانتے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے، بجز قیام، طول سجدہ اور اہلِ بقیع کیلئے استغفار کے اور کچھ صحت کو نہیں پہنچتا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے وہ کہتی ہیں کہ نصف شعبان کی رات تھی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف فرما تھے جب آدھی رات ہوئی تو میں نے اپنے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پایا۔ اس وقت میرے دل میں وہ بات آئی جو عام عورتوں کو غیرت کی قسم سے لاحق ہوتی ہے۔ میں نے چادر اوڑھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جستجو میں ان کی ازواج کے حجروں

میں گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پایا جب لوٹ کر اپنے حجرے میں آنے لگی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد میں زمین پر سفید کپڑے کی مانند سجدہ ریز دیکھا آپ یہ دعا پڑھ رہے تھے۔

سَجَدَلَكَ خَيَالِىْ وَسَوَادِىْ وَاٰمَنَ بِكَ فُؤَادِىْ فَهٰذِهٖ يَدِىْ وَمَا جَنَيْتُ بِهَا عَلٰى نَفْسِىْ يَا عَظِيْمُ تُرْجٰى لِكُلِّ عَظِيْمٍ اِغْفِرِ الذُّنُوْبَ الْعَظِيْمَ، سَجَدَ وَجْهِىَ لِلَّذِىْ خَلَقَهٗ وَصَوَّرَهٗ وَشَقَّ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ۔

اے رب میرے خیال اور میرے سواد نے تجھے سجدہ کیا۔ اور میرا دل تجھ پر وارفتہ ہے تو میرا یہ ہاتھ وہ ہے جس نے اپنی جان پر سب کچھ کیا ہے اے عظیم! میں ہر امرِ عظیم کا امیدوار ہوں بخش دے تمام عظیم گناہ، سجدہ کیا میرے اس چہرے نے جسے اس نے پیدا کیا اور اسے بنایا اور اس کی آنکھ اور کان کھولے۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدے سے سر مبارک اٹھایا اور اس کے بعد دوسرا سجدہ کیا اور پڑھا۔

اَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَاَعُوْذُ بِعَفْوِكَ مِنْ عِقَابِكَ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْكَ لَا اُحْصِىْ ثَنَاءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ اَقُوْلُ كَمَا قَالَ اَخِىْ دَاوٗدُ اِغْفِرْ وَجْهِىْ فِى التُّرَابِ لِسَيِّدِىْ وَحَقٌّ لَّهٗ اَنْ يُّسْجَدَ۔

اے رب تیری رضا کے ساتھ تیری ناراضگی سے پناہ مانگتا ہوں اور تیری بخشش کے ساتھ تیرے غضب سے پناہ مانگتا ہوں اور تیرے ساتھ تجھ سے پناہ مانگتا ہوں میں تیری ثنا کو نہیں گھیر سکتا جیسی کہ تو نے اپنی تعریف فرمائی میں وہی کہتا ہوں جو میرے بھائی داؤد نے کہا۔ مجھے بخش دے در آں حالیکہ میرا منہ زمین پر ہے اپنے مالک کیلئے وہی سجدے کا مستحق ہے۔

اس کے بعد سجدے سے سر مبارک اٹھایا اور دعا مانگی۔

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِىْ قَلْبًا تَقِيًّا مِّنَ الشِّرْكِ نَقِيًّا لَا فَاجِرًا وَّلَا شَقِيًّا۔

اے خدا مجھے پرہیزگار دل عطا فرما اور وہ شرک سے بچنے والا ہو جو نہ فاجر ہو نہ شقی۔

اس کے بعد نماز مکمل فرما کر میرے پاس شب خوابی کے لباس میں تشریف لائے اور میرے ہانپنے کو ملاحظہ فرمایا۔ فرمایا اے حمیرا! یہ ہانپنا کیسا ہے۔ اس پر میں نے اپنا تمام حال بتایا اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے زانوؤں کو سہلاتے ہوئے فرمایا، افسوس ہے ان زانوؤں پر کہ اس نے کیسی مشقت اٹھائی اور راہ خطا اٹھائی اے حمیرا! یہ رات نصف شعبان کی ہے۔ اس رات حق تعالیٰ نیچے والے آسمان کی طرف نزول اجلال فرماتا ہے اور اپنے بندوں کو بخشتا ہے مگر جو مشرک ہو یا کینہ پرور ہو۔

اور مشائخ کے وظائف کی کتابوں میں اس رات میں سو رکعتیں مکمل ہیں اور ہر رکعت میں دس دس بار "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ" یہ محدثین کے نزدیک پایہ صحت کو نہیں پہنچا ہے۔ شیخ ابوالحسن بکری رحمۃ اللہ علیہ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے نقل کرتے ہیں کہ فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شب نصف شعبان میں ۱۴ رکعتیں پڑھتے دیکھا ہے اور سلام کے بعد چودہ مرتبہ فاتحۃ الکتاب، چودہ مرتبہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، چودہ مرتبہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ اور ایک مرتبہ آیۃ الکرسی پڑھی اس کے بعد آیہ کریمہ "لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ" پڑھی۔ اس پر میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس عمل کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا۔ جو ایسا کرے گا اسے بیس حج مبرور اور بیس سال کے مقبول روزوں کے ثواب کا اجر ملے گا اور صبح ہو تو روزہ رکھے اسے دو سال کے روزوں کا ثواب ملے گا۔

محدثین کے نزدیک اس حدیث میں کلام ہے اور بیہقی سے منقول ہے کہ فرمایا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حدیث مرفوع ہے۔ (واللہ اعلم)

اور یہ جو ہمارے شہروں میں رواج ہے کہ چراغاں وغیرہ کرتے ہیں یہ سب نامشروع ہیں اور یہ ہندوؤں کی دیوالی کی مانند ہے یہ مجوسیوں کی رسم ہے۔

اب رہا رمضان المبارک میں قیام شب جسے تراویح کہتے ہیں تو اس کا بیان انشاء اللہ روزے کے باب میں آئے گا۔ اور تحقیق یہ ہے کہ رمضان المبارک میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز آپ کی عادتِ شریفہ ہی کے مطابق تھی۔ اور وہ گیارہ رکعتیں تھیں جسے تہجد میں پڑھا کرتے تھے جیسا کہ معلوم ہوا۔

چاشت کی نماز۔ وصل:۔ صلوٰۃ ضحیٰ یعنی چاشت کی نماز۔ ضحو، ضحوہ اور ضحیہ بروزن عشیہ دن کے چڑھنے کو کہتے ہیں اور ضحیٰ اس سے بلند وفوق ہے اور اس کے معنی شعاعِ آفتاب کے بھی آئے ہیں اور ضحاء بفتح ومد کے معنی وہ وقت ہے جب آفتاب چوتھائی آسمان پر بلند ہو جائے۔ جاننا چاہئے کہ دن کے ابتدائی حصے میں لوگوں میں دو نفلی نمازیں مشہور و معروف ہیں ایک بالکل شروع میں طلوع آفتاب کے بعد، ایک نیزے سے بڑھ کر دو نیزے تک ہے اس کو صلوٰۃ الاشراق یعنی اشراق کی نماز کہتے ہیں اور دوسری نفلی نماز، اس کے بعد چوتھائی آسمان پر آفتاب پہنچنے سے نصف النہار تک ہے اسے صلوٰۃ الضحیٰ یعنی چاشت کی نماز کہتے ہیں اور اکثر حدیثوں میں صلوٰۃ الضحیٰ کا نام دونوں نمازوں اور دونوں وقتوں میں آیا ہے۔ اور بعض میں صلوٰۃ الاشراق بھی آیا ہے۔ چنانچہ علامہ سیوطی رحمتہ اللہ علیہ طبرانی سے نقل کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یَا اُمَّ ھَانِیٍٔ ھٰذِہٖ صَلٰوۃُ الْاِشْرَاقِ" (اے ام ہانی یہ نماز اشراق ہے) اور تفسیر بیضاوی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز چاشت ادا کر کے فرمایا یہ نماز اشراق ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے روز چاشت کے وقت ام ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف فرما تھے۔

شیخ اجل علی متقی نے علامہ سیوطی کی کتاب مواہب جمع الجوامع میں جس کا نام جامع کبیر ہے نمازِ اشراق کیلئے مستقل عنوان مقرر کر کے اس حدیث کو نقل کیا کہ جو نمازِ فجر کو جماعت سے گزارے تو اس کے بعد ذکر الٰہی میں طلوع آفتاب تک وہیں بیٹھا رہے اور دو رکعت اشراق کی ادا کرے تو اس کا ثواب حج وعمرے کے برابر پورا پورا پائے گا۔ اور نمازِ چاشت جدا ہے اور یہ پایہ صحت کو پہنچا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں وقت میں جدا جدا نماز ادا فرمائی ہے اور امت کو اسکی ترغیب دیتے ہوئے اس بنا پر گمان کیا گیا کہ اس کے دو وقت ہیں اور دو نمازیں ہیں۔ اور بعضے ضحوۂ صغریٰ اور ضحوۂ کبریٰ بھی نام رکھتے ہیں۔ (واللہ اعلم)

اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ علماء کا اختلاف نمازِ چاشت میں ہے بعض اثبات کرتے ہیں۔ اور بعض نفی کرتے ہیں اور بعض سنت کہتے ہیں اور بعض بدعت اور بعض اِس جانب کی روایتوں کو ترجیح دیتے ہیں اور بعض اس جانب کی۔ ظاہر ہے کہ یہ اختلاف آخری نماز میں ہے جسے نماز چاشت کہتے ہیں۔ پہلی نماز میں نہیں ہے جسے نمازِ اشراق کہتے ہیں اس لئے کہ اسے بعض سنن موکدہ میں شمار کرتے ہیں۔

تعدادِ رکعات میں احادیث مختلف مروی ہیں۔ بعض روایتوں میں دو ہیں بعض میں چار، بعض میں چھ بعض میں آٹھ، بعض میں دس اور بعض میں بارہ۔ ہر ایک میں عظیم ثواب بیان کیا گیا ہے۔

مواہب لدنیہ میں ہے کہ شیخ ولی الدین عراق نے کہا کہ نمازِ چاشت، احادیث صحیحہ، کثیرہ اور مشہورہ میں وارد ہوئی ہے یہاں تک کہ محمد بن جریر فرماتے ہیں کہ اس بارے میں احادیث، تواتر معنوی کی حد تک پہنچ گئی ہیں۔ اور قاضی ابو بکر ابن العربی مالکی فرماتے ہیں کہ نماز چاشت، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیاء سابقین علیہم السلام کی نماز ہے جس کی خبر اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو یہ دی ہے کہ: "اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَہٗ یُسَبِّحْنَ بِالْعَشِیِّ وَالْاِشْرَاقِ" ہم نے ان کے ساتھ پہاڑوں کو مسخر فرمایا جو صبح وشام تسبیح کرتے ہیں تو حق تعالیٰ نے اس تسبیح کو دین مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں نماز عصر اور نمازِ اشراق کی صورت میں باقی رکھا۔ اور ایک

حدیث میں آیا ہے کہ داؤد علیہ السلام کی اکثر نماز چاشت کی تھی۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ نمازِ چاشت ایسی نماز ہے جس کی محافظت حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کرتے تھے۔

بندۂ مسکین (صاحب مدارج) خصہ اللہ بمزید الصدق والیقین کہتا ہے کہ چونکہ یہ عنایت الٰہی ہے کہ اس نے بندوں کیلئے آسانی رکھی۔ اور جب عام مسلمانوں کی ضروریات اور ان کے ان مشاغل کو ملاحظہ فرمایا جو فجر و ظہر کے مابین انہیں لاحق ہوتے ہیں تو رخصت و تخفیف فرمائی اور وہ بندگان خاص جو حق تعالیٰ کی عبادت کیلئے فارغ و مستعد ہیں ان کیلئے بھی اس خالی وقت میں طریقہ عبادت رکھ دیا کہ وہ مشغول عبادت ہوں اور یہ حق تعالیٰ کی جانب سے ندب واستحباب کی صورت میں ہے نہ کہ وجوب و فرض قرار دے کر۔ اس میں اس نے رخصت و تخفیف فرمائی اور یہ استحباب و فضیلت، نماز چاشت میں، علماء مذہب اور مشائخ عظام کی اکثریت کے قول پر ہے۔ اس لئے کہ ثابت کرنے والی روایتیں نفی کرنے والی خبروں پر مقدم ہوتی ہیں اور انہیں کو ترجیح ہوتی ہے کیونکہ ثابت کرنے والی چیز میں علم کی نفی کرنے والی چیز سے پوشیدہ ہے۔ جیسا کہ اصول فقہ کے علم میں مسلم و مقرر ہے اور علماء کی ایک جماعت اس کی کراہیت کی قائل ہے وہ کہتے ہیں کہ اسے پڑھنا بدعت ہے۔ کیونکہ یہ حضور اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے بعد ایجاد ہوئی ہے۔ اور یہ علماء کی جماعت اس کے بدعت ہونے پر ان احادیث و آثار سے استدلال کرتے ہیں جو اس کی نفی میں وارد ہوئی ہیں جیسا کہ بخاری میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مورق عجلی جو طبقہ ثالث کے اکابر تابعین سے ہیں کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمر سے کہا کہ کیا آپ چاشت کی نماز پڑھتے ہیں؟ فرمایا نہیں میں نے کہا کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پڑھی ہے فرمایا نہیں۔ میں نے کہا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پڑھی ہے؟ فرمایا نہیں۔ میں نے کہا کیا نبی کریم ﷺ نے پڑھی ہے؟ فرمایا نہیں میرے خیال میں۔ مطلب یہ کہ میرا خیال نہیں کہ حضور ﷺ نے پڑھی ہو یعنی میرا گمان ہے کہ حضور ﷺ نے نہیں پڑھی۔ اگرچہ جزم و یقین نہیں رکھتا۔ اور ابو بکر ثقفی جو اکابر صحابہ میں سے ہیں مروی ہے کہ انہوں نے ایک جماعت کو دیکھا جو نماز چاشت پڑھ رہی تھی انہوں نے کہا۔ "اِنَّکُمْ لَتُصَلُّوْنَ صَلٰوۃً مَّا صَلَّتْھَا رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہ علیہ وسلم وَلَا عَامَّۃَ الصَّحَابَۃِ رِضْوَانُ اللہِ عَلَیْھِمْ اَجْمَعِیْنَ

یقیناً تم وہ نماز پڑھ رہے ہو جسے نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا اور نہ اکثر صحابہ نے اور سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز چاشت نہیں پڑھی۔ اور ایک روایت میں ہے نہ سفر میں نہ حضر میں۔ اور میں اسے پڑھتی ہوں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے چھوڑ دیا تھا حالانکہ آپ اسے محبوب رکھتے تھے اس خطرہ کی بنا پر کہ وہ ہم پر فرض قرار نہ دے دی جائے۔ اور ہم پر لازم نہ ہو جائے۔ اور قیس بن عبید، جو کہ صحابہ میں سے ہیں فرماتے ہیں کہ ایک سال برابر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آتا جاتا رہا لیکن کبھی میں نے ان کو نماز چاشت پڑھتے نہیں دیکھا۔ اور مسروق فرماتے ہیں کہ ہم حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے سامنے قرآن پڑھا کرتے تھے اور ان کے چلے جانے کے بعد اپنی جگہ بیٹھا رہا کرتے تھے۔ اس کے بعد میں اٹھتا اور نماز چاشت پڑھا کرتا۔ پھر جب ہمارا یہ قصہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو سنایا گیا تو فرمایا بندگان خدا ایسی چیز کی تکلیف اٹھاتے ہیں جس کی خدا نے انہیں تکلیف نہیں دی ہے اگر وہ اس نماز کے پڑھنے والوں میں سے ہیں تو انہیں اپنے گھروں میں پڑھنا چاہئے۔

مجاہد سے منقول ہے انہوں نے کہا کہ میں اور عروہ بن زبیر مسجد نبوی میں آئے۔ میں نے دیکھا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ، مسجد نبوی میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں اور لوگ مسجد میں چاشت کی نماز پڑھ رہے ہیں۔ اس کے بعد ہم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے اس قوم کی نماز کے بارے میں پوچھا کہ کیا یہ سنت ہے یا بدعت؟ فرمایا بدعت ہے، لیکن یہ ایسی

اچھی بدعت ہے جسے مسلمانوں نے نماز چاشت سے بہتر وافضل کوئی اور بدعت ایجاد نہ کی۔

یہ وہ اخبار و آثار ہیں جو نماز چاشت کی نفی میں مروی ہیں ان کے سوا اور بھی ہیں لیکن، ان آثار و اخبار اور احادیث سابقہ کے درمیان جمع و تطبیق میں فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز چاشت کی مداومت نہیں کی ہے۔ اگرچہ امت کو اسکی مداومت و محافظت کی ترغیب و تحریص فرمائی ہے یہ اس بناپر کہ ان پر فرض نہ ہو جائے اور مشقت میں نہ پڑ جائیں۔ پھر انجام کار وہ اس سے عہدہ بر آنہ ہوسکیں۔ جیساکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کی تصریح فرمائی ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کے پڑھنے میں کوئی شبہ نہیں ہے جیساکہ احادیث صحیحہ اس پر ناطق ہیں۔ لہٰذا جس نے نفی کی ہے یاتو اس نے روایت کی نفی کی ہے یا نفی دوام مراد لی ہے۔ لہٰذا جس جگہ "مَاکَانَ یُصَلِّیْ" (حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں پڑھی) یا "مَا سَبَّحَ رَسُوْلُ اللّٰہِ" (رسول اللہ نے یہ نماز نہ پڑھی) وارد ہوا ہے اس سے مراد "مَادَامَ عَلَیْھَا" یعنی ہمیشہ اس پر مداومت نہیں کی مراد لی ہوگی۔ یہی احتمال ہے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے نہ پڑھنے اور قیس بن عبید کا ایک سال تک نہ پڑھتے دیکھنے میں۔ اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ چونکہ ابن مسعود، فقہ اور علم میں مشغول رہتے تھے اور چونکہ علم میں مشغول ہونا نفلی عبادت سے افضل ہے اس لئے وہ نماز چاشت کی فضیلت و استحباب کے باوجود اس پر، علم میں مشغولیت کو ترجیح دیتے تھے (واللہ اعلم) اور ممکن ہے کہ اس باب میں وارد شدہ اخبار میں عدم وثوق کی بناپر نفی ہو۔ جیساکہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کا قول "لااخالہ" یعنی میرا خیال ہے کہ نہیں۔ چونکہ انہوں نے حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو اسے پڑھتے نہ دیکھا تھا اس لئے ان دونوں کے بارے میں خبر دینے میں وثوق کا اظہار فرمایا۔ اور جب لوگوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑھنے کی بابت سنا تو وہ وثوق ناپید ہو گیا۔ اور توقف کیا اور عدم وثوق کی خبر دی۔ جو لوگ اسے بدعت کہتے ہیں وہ ان لوگوں کے مجتمع ہونے اور مسجد میں علی الاعلان پڑھنے کی بناپر ہے۔ مطلب یہ کہ نماز حد ذات میں تو مشروع ہے لیکن اس کا ایسا اجتماع واظہار جیساکہ فرائض میں ہے بدعت ہے اس لئے کہ نوافل میں سنت اور اس کی فضیلت، چھپانے اور گھر میں پڑھنے میں ہے جیساکہ معلوم ہو چکا ہے۔ غرضیکہ اس کی مشروعیت کی نفی میں کوئی خبر اور اثر معلوم نہ ہوا بلکہ نفی ایک مخصوص صفت کی ہے جو کہ علی الاعلان یا مداومت یا اجتماع میں ہے کیونکہ ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے جب ایک قوم کو چاشت کی نماز پڑھتے دیکھا تو ان کی نفی کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر یہ ضروری ہی پڑھنا ہے تو اپنے گھروں میں پڑھیں اور مسروق نے بھی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایسا ہی نقل کیا ہے۔ جیساکہ گزر چکا ہے۔

علماء کی ایک اور جماعت، روایتوں کی تطبیق و توفیق کے قصد سے کہتی ہے کہ مستحب ہے کہ اسے کبھی کبھی پڑھ لیا جائے۔ اور بعض دنوں میں اسے چھوڑ دینا چاہئے۔ یہ جماعت، حضرت عبداللہ بن شقیق (جو مشاہیر تابعین سے ہیں) کی حدیث سے استدلال کرتی ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ چاشت پڑھی ہے فرمایا نہیں پڑھی مگر کبھی کبھی سفر سے واپسی کے بعد اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے انہوں نے بیان کیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چاشت کی نماز پڑھا کرتے تھے یہاں تک کہ ہمیں گمان ہوا کہ اب اسے ترک نہ فرمائیں اور جب ترک فرماتے تھے تو ہم خیال کرتے تھے کہ اب کبھی اسے پڑھیں گے ہی نہیں۔ اور اکثر نوافل و تطوعات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ کریمہ ایسی ہی تھی اور اسلاف صحابہ و تابعین کی عادت بھی اس نماز کے پڑھنے میں ایسی تھی۔ چنانچہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی عادت یہ تھی کہ چاشت کی نماز ایک دن پڑھتے تو دو دن اسے ترک کرتے اور منصور بن معمر سلمی نے فرمایا کہ سلف صحابہ و تابعین کی عادت تھی کہ وہ نمازِ چاشت کی ایسی مداومت اور محافظت کو مکروہ جانتے تھے جس طرح کہ نماز

فرض کی مداومت کی جاتی ہے تو وہ حضرات، کبھی پڑھتے اور کبھی چھوڑ دیتے تھے۔ اور نفلی عبادتوں کے قیام خصوصاً نماز و روزہ وغیرہ میں بھی علمائے سلف کی عادت ایسی ہی تھی تاکہ علم میں مشغولیت اور دیگر صفات حسنہ میں مانع نہ ہو۔ بخلاف آخر زمانہ کے عابدوں اور زاہدوں کے۔ کہ ان کا ان نفلی عبادتوں سے تعلق و تعبد اس حد تک ہے کہ ان کے کچھ لوگ علم و معرفت کی نسبت میں قاصر و نابلد ہیں اور وہ بہت سی ایسی نیکیوں اور خوبیوں کو چھوڑے ہوئے ہیں جو ان نفلی عبادتوں سے زیادہ اہم و مقصود ہیں۔ "ہٰذَا الَیْسَ بِشَیْءٍ وَ بِاللّٰہِ التَّوْفِیْقُ"

صاحب سفر السعادۃ فرماتے ہیں کہ نمازِ چاشت کی مداومت و محافظت کرنا بھی مستحب ہے لیکن اس پر مسجدوں میں اجتماع اچھا نہیں ہے بلکہ اولیٰ یہ ہے کہ تنہا گھر میں پڑھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ فرمایا اگر میرے لئے میرے ماں باپ بھی زندہ کر دیئے جائیں تو میں چاشت کی نماز کو نہ چھوڑوں گی۔ مطلب یہ کہ وہ لذت و سرور جو ماں باپ کے زندہ ہونے سے حاصل ہو گا وہ لذت و سرور جو اس نماز میں پاتی ہوں ہرگز برابری نہ کرے گا۔

تنبیہ . نمازِ چاشت کی تعداد اور کعات میں مختلف عدد مروی ہوئے ہیں تو یہ باعتبار اختلاف ایام و احوال اور بسبب نشاط و کسل یا اہتمام مہمات دیگر کی وجہ سے ہوں گی۔ اکثر علماء چودہ رکعت کو اختیار کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کی تمام حدیثیں صحیح ہیں اور دیگر تعداد کی حدیثیں یا تو ان میں سے کچھ صحیح ہیں یا کچھ ضعیف ہیں (واللہ اعلم) اور اس نماز کی قرات میں مشائخ کے اوراد میں سورۂ شمس، سورۂ والضحیٰ، سورۂ واللیل اذا یغشی اور سورۂ الم نشرح، مرقوم ہے اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد یہ دعا سو مرتبہ پڑھنا بھی ماثور ہے: "رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ وَتُبْ عَلَیَّ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ۔" اور یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔

نمازِ عید. وصل. - جاننا چاہئے کہ روزِ عید کو اس وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ عود کر کے اور اپنے وقت میں بار بار لوٹ کے آتا ہے لیکن یہ مثال عام ہے جو دیگر موسموں پر بھی صادق آتی ہے۔ اسی بنا پر اس پر بعض نے کچھ دیگر قیود کا بھی اضافہ کیا ہے۔ اور کہا کہ یہ فرحت و سرور کے ساتھ عود کرتا ہے۔ اور عید الفطر کا یہ فرحت و سرور، نعمتِ صیام کے مکمل ہونے پر شکرانہ ہے۔ اور عید الاضحیٰ میں نعمتِ حج کا پورا ہونا ہے کیونکہ وقوف عرفہ اس کا بہترین رکن ہے۔ اور وہ مکمل کا حکم رکھتا ہے اور جمعہ جو کہ ہر ہفتہ کی عید ہے یہ ہفتہ بھر کی تمام نمازوں کی تکمیل پر شکرانہ ہے۔ لہٰذا اسلام کے تمام ارکان کی تکمیل میں بطور شکرانہ ایک دن عید کا مقرر کیا گیا ہے۔ جو اہل اسلام کیلئے فرحت و سرور کے اجتماع کا باعث ہے۔ عید منانے اور شکرانہ ادا کرنے کا حکم اس آیت میں ہے کہ: لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ اگر تم نے شکران نعمت کیا تو تمہیں اور زیادہ دیں گے" اور اس عید و شکرانہ کو بھی طاعت و عبادت بنا دیا۔

اور زکوٰۃ، چونکہ اس کی ادائیگی کا کوئی وقت معین نہ تھا اور اتفاقی و اجتماعی صورت اس میں نہ تھی لہٰذا اس کے شکرانہ اور عید کی فرحت و سرور سے لطف اٹھانے کا وہی وقت رکھ دیا جب حاجت مند، فقراء اور مساکین کو دے کر سرور و فرحت حاصل ہوتا ہے۔ وہی وقت اس کی عید کا ہے۔ اور یہی کافی ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ عید کو بطور نیک فالی کے سال آئندہ لوٹ کر آنے کی وجہ سے کہا ہے۔ مطلب یہ کہ اس کو بقا ہے اور سال آئندہ پھر آئے گا۔ جس طرح ابتداء میں قافلہ کے نکلتے وقت بطورِ تفاؤل کے کہتے ہیں کہ خیریت و سلامتی کے ساتھ لوٹ کر آؤ۔ ہدایہ کے بعض حواشی میں ہے کہ اس کو عید اس بنا پر کہتے ہیں کہ پروردگارِ عالم نے اس دن میں بندوں کے ساتھ فرحت و سرور اور اپنے فضل و کرم کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس توجیہہ سے عید کا وعد سے ماخوذ ہونا لازم آتا ہے۔ اور یہ بعید ہے۔ کیونکہ "عیدٌ اجوف" یعنی معتل عین ہے۔ اور "وعد" مثال ہے یعنی معتل فاء ہے۔ البتہ یہ اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جب کہ اس کے قلب کے قائل ہوں جیسا کہ جذب

اور جبنہ میں قلب ہے۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ کریمہ تھی کہ نمازِ عید، عید گاہ میں ادا فرماتے اور عید گاہ مدینہ منورہ کے باہر جانبِ غرب، مصری دروازے کے باہر ہے۔ اور اسی جانب سے مکہ کے قافلے مدینہ منورہ میں داخل ہوتے ہیں۔ اس عید گاہ اور مسجد نبوی شریف کے درمیان ہزار گز کا فاصلہ ہے (کذافی تاریخ المدینہ) یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازِ عید کیلئے میدان میں نکلنا مسجد میں نماز عید گزارنے سے افضل ہے۔ اس لئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم باوجود اس فضل وشرف کے جو آپ کی مسجد شریف کو حاصل ہے نمازِ عید کیلئے عید گاہ (میدان) میں باہر تشریف لے جاتے تھے لہٰذا دیگر بلاد وامصار میں تو یہ بطریق اولیٰ ہے۔ اسی پر شہروں میں عمل ہے اور بعض شہروں میں جو مسجد میں نماز عید پڑھتے ہیں یہ خلافِ سنت ہے مگر یہ کہ کوئی عذر لاحق ہو تو ٹھیک ہے جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ بارش کی وجہ سے ایسا کیا اور یہ صرف ایک مرتبہ ہوا۔ مکہ مکرمہ کے حضرات تو پہلے سے ہی اس کے عادی ہیں اور مسجد حرام میں عید ادا کرتے ہیں وہ شہر کے باہر نہیں نکلتے اور اب تو مدینہ منورہ کے حضرات بھی مسجد نبوی میں عید کی نماز پڑھتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت وشرف سے مفارقت گوارا نہیں کرتے۔ اس وقت مسجد نبوی شریف کی وسعت بھی بہت کافی ہے اور یہ اہلِ شہر کی آبادی سے زیادہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مدینہ منورہ کی آبادی زیادہ تھی اور مسجد نبوی کی وسعت کم۔

ابن الہمام اپنی شرح میں فرماتے ہیں کہ سنت یہ ہے کہ امام شہر کے نوجوانوں، صحت مندوں کو لے کر عید گاہ جائے اور شہر میں کمزوروں اور ناتوانوں کیلئے اپنا قائم مقام امام بنائے۔ اس لئے کہ نمازِ عید ایک شہر میں دو جگہ پڑھنا باتفاق جائز ہے اور امام محمد کے نزدیک تین جگہ بھی جائز ہے اگرچہ امام کسی کو اپنا قائم مقام نہ بنائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن خوبصورت اور عمدہ لباس زیب تن فرماتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک حلہ فاخرہ تھا جو عید وجمعہ کے موقع پر عزت وشعائر اسلام کے لئے زیب تن فرمایا کرتے تھے۔ حلہ جوڑے کو کہتے ہیں جس میں ازار وچادر دونوں شامل ہیں نہ یہ کہ وہ ریشمی وغیرہ کپڑوں کیلئے ہی بولا جائے۔ جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی سبز وسرخ دھاری دار چادر شریف اوڑھتے یہ چادر یمن کی ہوتی اور جسے ”بردِ یمانی“ کہا جاتا ہے وہ یہی چادر ہے۔ اور عید کیلئے زیب وزینت کرنا مستحب ہے مگر لباس مشروع کے ساتھ ہو۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ کریمہ یہ تھی کہ روزِ عید، عید گاہ جانے سے پہلے چند کھجوریں افطار فرماتے ان کی تعداد طاق ہوتی یعنی تین، پانچ، سات وغیرہ۔ اہلِ علم فرماتے ہیں کہ کھجوروں کے کھانے میں استحباب کی حکمت اس کی وہ شیرینی ہے جو نگاہوں کو تقویت دیتی ہے۔ کیونکہ روزہ بینائی کو کمزور کرتا ہے اور شیرینی مزاجِ ایمان کے موافق ہے کیونکہ ”اَلْمُؤْمِنُ حُلْوٌ“ اگر خواب میں کوئی میٹھی چیز دیکھے تو اسکی تعبیر یہ ہے کہ وہ لذتِ ایمان پائے گا اور شیرینی دل کو نرم بناتی ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ شیریں چیز کے ساتھ افطار افضل ہے۔ رہا گنتی میں طاق کی رعایت رکھنا تو یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سب چیزوں میں عادتِ کریمہ تھی اور فرمایا: ”اِنَّ اللّٰہَ وِتْرٌ یُحِبُّ الْوِتْرَ“ بے شک اللہ اکیلا ہے وہ طاق کو پسند کرتا ہے۔

عید الاضحیٰ کے دن نماز سے واپس آنے سے پہلے کچھ نہ کھاتے چنانچہ حدیث میں ہے کہ عید الفطر کو بغیر کچھ کھائے نہ نکلتے اور عید الاضحیٰ کو بغیر کچھ کھائے نکلتے جب تک کہ نمازِ عید نہ پڑھ لیتے۔ اہلِ علم نمازِ عید الفطر سے پہلے کھانے کی حکمت میں فرماتے ہیں کہ روزے کے وجوب کے بعد، چونکہ فطر واجب ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تعجیل فطر کو پسند فرماتے۔ تاکہ حکم الٰہی کو بسرعت بجا لایا جائے ورنہ اگر محض حکم بجالانا ہی مقصد ہوتا تو خوب سیر ہو کر کھاتے۔ بعض کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دونوں عیدوں میں کھانا صدقہ نکالنے کی مشروعیت کے وقت میں تھا جو ہر ایک پر لازم ومخصوص ہے اور چونکہ صدقہ فطر کا نکالنا عید گاہ جانے

سے پہلے ہوتا ہے اس لئے صدقہ نکالتے وقت چند دانے کھالئے اور عید گاہ تشریف لے گئے۔ اور عید الاضحیٰ میں صدقہ کا اخراج چونکہ بعد از ذبح تھا اور اس کا وقت نماز کے بعد ہے اس لئے نماز کے بعد ذبح کرتے اس کے بعد صدقہ فرماتے اور اس کے بعد کھاتے۔

غسل در روزِ عیدین: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دونوں عیدوں میں غسل کرنے کے سلسلے میں دو حدیثیں مروی ہیں ایک فاکہ بن سعد سے جن کی صحبت، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحت کو پہنچی ہوئی ہے اور یہ درجہ شہرت کو پہنچ گئی ہے اور بجز اس حدیث کے اور کسی طرح ان کی صحابیت جانی پہچانی نہیں گئی وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ کریمہ تھی کہ روزِ عید الفطر، یوم النحر، یوم عرفہ میں غسل فرمایا کرتے تھے۔ دوسری حدیث زیاد بن عیاض اشعری سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک قوم سے کہا کہ جس فعل کو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھا ہے اسے تم بھی کرتے ہو مگر تم لوگ دونوں عیدوں میں غسل نہیں کرتے لیکن محدثین دونوں حدیثوں کو ضعیف بتاتے ہیں اور میں نے ان دونوں حدیثوں کے سوا کوئی اور حدیث کسی کتاب میں بالکل نہیں پائی اور نہ کتب ستہ میں کچھ منقول ہے۔ بجز حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے فعل کے جس کو جامع الاصول میں موطا سے نقل کیا گیا ہے۔ چنانچہ مروی ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما عید گاہ جانے سے پہلے غسل کرتے تھے اور حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا سنت کی پیروی میں خوب مبالغہ کرنا اس کا مقتضی ہے کہ حدیث اس باب میں صحیح ہو۔ (کذا قالوا) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما تمام راستہ باآواز بلند تکبیر کہتے تھے اور یہ حکم یعنی تکبیر کا بلند آواز سے کہنا راستہ میں عید الاضحیٰ کی نماز میں تو متفق علیہ ہے اور عید الفطر میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا اختلاف ہے لیکن آہستہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عید گاہ تک پاپیادہ تشریف لے جاتے اور اس پر عمل کرنا سنت ہے اور اکثر اہلِ علم کے نزدیک مستحب ہے کہ عید گاہ پاپیادہ جائے۔ سواری وغیرہ سے نہ جائے مگر کسی عذر سے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے زہری سے روایت پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ عید میں نہ جنازہ میں کبھی سوار ہو کر تشریف نہ لے جاتے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ عید الفطر میں تاخیر فرماتے اور نمازِ عید الاضحیٰ کو جلد تر پڑھتے۔ غالباً عید الفطر میں اس تاخیر کی حکمت یہ ہوگی کہ چونکہ صدقہ فطر بھی ادا کر چکتے اور کچھ طعام بھی ملاحظہ فرمالیا ہوتا اور کوئی امر و مہم بھی درپیش نہ ہوتی اس لئے اجتماع کی زیادتی کی خاطر تاخیر فرماتے ہوں گے بخلاف عید الاضحیٰ کے۔ (واللہ اعلم)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب عید گاہ پہنچ جاتے تو فوراً نماز شروع کر دیتے۔ نہ اذان ہوتی نہ اقامت اور نہ الصلوٰۃ جامعۃ، وغیرہ کی ندا۔

تکبیراتِ عید میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں اختلاف ہے اور مذہب حنفیہ میں مختار یہ ہے کہ تین تکبیریں رکعتِ اول میں قرأت سے پہلے اور تین تکبیریں دوسری رکعت میں قرأت کے بعد ہیں اور ہمارے مشائخ و اساتذہ فرماتے ہیں کہ چونکہ تکبیرات عید کے سلسلہ میں روایتیں مختلف مروی ہیں تو ہم نے بھی کم سے کم کو اختیار کیا ہے اس لئے کہ تکبیرات اور رفع یدین نمازِ عید میں خلاف معہود شرع ہے بنابریں کم سے کم کو لینا اولیٰ ہو گا۔ (کذا فی الہدایہ)

حضو[ر ا]کرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عید گاہ میں منبر نہ تھا۔ سب سے پہلے جس نے عید گاہ میں منبر کا رواج دیا وہ مروان بن الحکم ہے جب کہ وہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ان کی جانب سے امیرِ مدینہ تھا اور ایک روایت میں ہے کہ امیر المومنین سیدنا عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اس کی بنا پڑی یہ کثیر بن الصلت سے مروی ہے جس کا گھر عید گاہ کے قریب تھا۔

[حضو]ر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ عید خطبہ سے پہلے پڑھتے اور جب نماز سے فارغ ہوتے تو کھڑے ہو کر خطبہ شروع فرماتے۔ تمام

اصحابِ کتب کااس روایت پر اتفاق ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ عید الا ضحیٰ اور عید الفطر خطبہ سے پہلے پڑھتے اور حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی آپ کے بعد ایسا ہی کرتے رہے ترمذی نے کہا اسی پر تمام اہلِ علم صحابہ کرام کا عمل ہے اور کہا گیا ہے کہ سب سے پہلے جس نے نماز سے پہلے خطبہ دیا وہ مروان تھا جب کہ وہ امیرِ مدینہ تھا۔ فتح الباری میں منقول ہے کہ علماء کا اختلاف ہے کہ جس نے سب سے پہلے خطبہ دیا کون ہے۔ مشہور یہ ہے کہ مروان تھا۔ جیسا کہ صحیح میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے پہلے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے بھی کیا تھا اور اپنے اوائل خلافت میں آپ پہلے نماز پڑھتے پھر خطبہ دیتے تھے۔ اور آخر زمانہ میں جب دیکھا کہ لوگ نماز میں پہنچ سکتے تو اس مصلحت کے پیش نظر خطبہ کو نماز پر مقدم فرمایا اور یہ مصلحت مروان کی اس علت کے بر خلاف ہے جس کی بنا پر اس نے خطبہ مقدم کیا تھا وہ یہ کہ لوگ نماز کے انتظار میں بیٹھے رہیں۔ اور اس کا خطبہ سن لیں اور اس کا خطبہ ان لوگوں کی مذمت و برائی میں ہوتا جس کے وہ لائق نہیں تھے۔ اور ان لوگوں کی تعریف و مدح پر ہوتا جس کے وہ مستحق نہ تھے جیسا کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس کی صراحت مذکور ہے کہ مروان نے کہا میں نے خطبہ کو اس لئے مقدم کیا ہے کہ لوگ خطبہ کے سننے کا انتظار نہیں کرتے تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایسی تقدیم کبھی کبھی فرمائی ہو۔ اور مروان نے چونکہ اس پر ہمیشگی اختیار کر رکھی تھی اس لئے مروان کے اس فعل کی شہرت ہو گئی۔ اور عبد الرزاق ابن جریج سے نقل کرتے ہیں کہ سب سے پہلے جس نے خطبہ کو نماز پر مقدم کیا وہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تھے۔ (واللہ اعلم)

ابن الہمام، فتح القدیر شرح ہدایہ میں فرماتے ہیں کہ حنانہ کا منبر بنانے میں علماء اختلاف کرتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ مکروہ ہے۔ اور خواہر زادہ نے کہا کہ حسن ہے اور ہمارے زمانے میں حضرت امام ابو حنیفہ سے "لابأس بہ" یعنی کوئی حرج نہیں مروی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس راہ سے عید گاہ تشریف لے جاتے اس راہ سے واپس تشریف نہ لاتے بلکہ دوسرے راستے سے واپس تشریف لاتے۔ علماء نے اس میں کئی نکتے ظاہر فرمائے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ یا تمام ہی نکتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشِ نظر اور متصور ہوں (واللہ اعلم) حق یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال میں جو اسرار و معانی پنہاں ہیں ان تک مخلوق کی رسائی دشوار ہے اور ان کو پانا محال ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ راہ کی تبدیلی اس بنا پر تھی تاکہ مقامات مختلفہ، اماکن متعددہ اور مواضع متفرقہ اور وہاں کے رہنے والے انسان و جنات اور فرشتے طاعات و نیکیوں پر گواہ بن جائیں یا یہ وجہ ہو کہ دونوں راستے کے لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کر سکیں اور اس عمل کے ثواب و بزرگی سے مشرف ہو سکیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلام کے جواب دینے میں جو خیر و برکت اور خوش نصیبی مضمر ہے اس سے دونوں راستوں کے لوگ متمتع اور بہرور ہو سکیں۔ یا یہ وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکتیں دونوں راستوں اور وہاں کے رہنے والوں کو حاصل ہو سکیں اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کی فضیلت و برکت اور شرف حضوری میں برابر کے شریک ہو جائیں۔ یا یہ وجہ ہو کہ دونوں راستے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طیب و طاہر جانفزا خوشبو کو سونگھیں یا یہ وجہ ہو کہ دونوں راستوں کے رہنے والوں کی ضرورتیں، تعلیم و ارشاد فرما کر، صدقات و خیرات عطا فرما کر اور اپنے جہاں فزا جمال کے مشاہدے سے سرور مرحمت فرما کر ان کی خواہشیں پوری فرمائیں۔ یا یہ وجہ ہے کہ دونوں راستوں میں شعائر و شرائع اسلام کا اظہار حاصل ہو اور دونوں راستوں کو ذکر الٰہی اور اس کی برکتیں ان کو شامل ہو جائیں یا یہ وجہ ہے کہ اہل کفر و نفاق کو مشاہدہ عزت اسلام اور رفعت اعلام دین کے ذریعہ بحکم لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ اور قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ - (الآیات) سے انہیں غمناک واندوہ گیں بنائیں۔ ور لشکر اسلام کی کثرت اور اس کی عزت سے ان کے دلوں میں رعب ڈالا جائے نیز علماء فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ۔ کا

عید گاہ تشریف لے جانا داہنی جانب تھا اور اگر واپسی بھی اسی راستے سے ہوتی تو یہ بائیں جانب واقع ہوتا اس بنا پر واپسی کے لئے دوسری راہ اختیار فرماتے۔ تاکہ وہ بھی داہنی جانب واقع ہو جائے اس کی تفصیل یہ ہے کہ مدینہ طیبہ میں سمتِ قبلہ جانب جنوب ہے اور عید گاہ جانب غرب ہے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ عید گاہ تشریف لے جانا داہنی جانب سے تھا اور منزل شریف عید گاہ میں تشریف فرما ہونے کے وقت جانب شمال ہوتی لہٰذا اگر اس راہ سے واپسی اختیار فرماتے جس راہ سے تشریف لے گئے تھے تو واپسی جانب شمال سے واقع ہوتی۔ اور یہ جو صاحب مواہب لدنیہ نے کہا ہے کہ یہ دلیل کی محتاج ہے لہٰذا ساقط ہے اس لئے کہ ظاہر ہے کہ شروع میں داہنی جانب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا ہو گا نیز یہ معانی جسے علماء نے بیان کیا ہے۔ بر سبیل ہیں اور ابتداء میں داہنی جانب کو اختیار فرمانا خود محتمل ہے اور لوگوں میں مشہور وجہ یہ ہے کہ راستہ کی تبدیلی کو اختیار فرمانا اعداء دین کے مکر سے خوف کی بنا پر تھا تاکہ وہ ہلاکت کی گھات میں نہ بیٹھیں۔ حالانکہ یہ وجہ خود محل نظر ہے اس لئے کہ اگر یہی وجہ ہوتی تو بار بار یہ روش اختیار نہ فرماتے۔ اور اپنی عادتِ کریمہ نہ بناتے تاکہ دشمنان دین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ کریمہ سے واقف ہو کر دوسری راہ میں گھات لگا کر نہ بیٹھیں۔ اس نظریہ کا یہ جواب دیتے ہیں کہ جداگانہ راستہ کی ہمیشہ عادت بنا لینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرا راستہ کوئی خاص معین فرما لیا ہے یا یہ وجہ ہے کہ زندہ اور وفات پائے ہوئے اقارب سے ملاقات اور صلہ رحمی کے لئے دوسرا راستہ اختیار فرماتے یا یہ وجہ ہے کہ تخفیفِ اژدھام اور ہجوم خلائق کی بنا پر یہ عادت تھی یا یہ وجہ ہے کہ تشریف لے جاتے وقت فقراء کو صدقہ عطا فرماتے تھے اور واپسی کے بعد کچھ باقی نہ رہتا تھا اس لئے واپسی پر ایسا دوسرا راستہ اختیار فرماتے تھے جہاں فقیروں اور سائلوں کا ہجوم نہ ہو تاکہ سائلوں کو جھڑکنا اور منع کرنا لازم نہ آئے اس وجہ کو صاحب مواہب لدنیہ نے کمزور اور بعید قرار دیا ہے اور معاملہ ایسا نہیں ہے جیسا کہ بیان کیا گیا ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ راستوں کی یہ تبدیلی بر طریق تفاؤل اختیار فرماتے تھے مطلب یہ کہ جس طرح کہ پہلے راستہ میں مغفرت و رضا اور مقام قرب و وصال میں ترقی کی جانب ایک حالت تھی یہ حالت دوسرے راستہ بھی برقرار رہے یہ وجہ باریکی و خفا سے خالی نہیں ہے۔ یا یہ وجہ ہو کہ عید گاہ کی جانب جاتے وقت راستہ طول و طویل ہوتا تھا۔ اور واپسی میں ایسا نہ ہوتا تھا کہ جاتے وقت قدموں کی زیادتی سے جو کہ عبادت کیلئے جانا تھا اس سے زیادتی ثواب کا حصول مقصود تھا لیکن جب منزل شریف کی جانب واپسی ہوتی تو جلدی سرعت دکھاتے کیونکہ اس میں عبادت کا مقصد شامل نہ تھا علماء اس وجہ میں اس امر سے کلام کرتے ہیں کہ واپسی کے وقت میں قدموں کی زیادتی پر اجر و ثواب بھی ثابت ہے جیسا کہ حج و غزوہ میں ثابت ہو چکا ہے اگر اس وجہ کے برعکس کہیں تو کوئی صورت ممکن تھی۔ یعنی یہ کہا جاتا کہ شاید جاتے وقت راستہ مختصر اور تھوڑا تھا اور چاہتے تھے کہ طاعت میں جلدی کا اظہار فرمائیں اور اول وقت کی فضیلت پائیں۔ بخلاف واپسی کے وقت کے، کہ اگر دیر سے بھی منزل شریف پر پہنچیں تو کوئی چیز فوت نہیں ہوتی، غرضیکہ ان تمام وجوہات کی بنیاد احتمال پر ہے اور ابن حمزہ نے کہا ہے کہ راستہ میں تبدیلی کی وجہ، حضرت یعقوب علیہ السلام کے قول مبارک کی موافقت ہے جو انہوں نے اپنے گیارہ فرزندوں سے فرمایا تھا۔ "لَا تَدْخُلُوْا مِنْ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ" آلایہ (تم سب ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا) حالانکہ انہوں نے بدنظری سے بچنے کیلئے نصیحت فرمائی تھی (واللہ اعلم بحقیقتہ الحال) میں نے نماز عید سے پہلے اور نماز عید کے بعد نوافل پڑھنے کے بارے میں شرح سفر السعادۃ میں ذکر کر دیا ہے۔ چونکہ اس جگہ مقصود اصلی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و افعال کا ذکر کرنا ہے۔ اس لئے اس سے اس جگہ تعرض نہیں کیا گیا۔

نماز استسقاء . وصل: ۔ صاحب مواہب لدنیہ فرماتے ہیں کہ نمازِ استسقاء کے سنت ہونے میں کسی عالم نے اختلاف نہیں کیا ہے مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے ان حدیثوں سے جن میں نماز کا ذکر نہیں آیا ہے اس کے خلاف سنت ہونے پر استدلال کیا ہے۔ اور علماء جمہور ان حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں جو صحیحین وغیرہما میں ثابت ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے استسقاء میں دو رکعتیں پڑھیں اور وہ حدیثیں جن میں نماز کا ذکر نہیں ہے ان میں سے کچھ تو راوی کے نسیان پر محمول ہیں اور کچھ ان میں سے خطبہ جمعہ سے متعلق ہیں کیونکہ اس کے بعد نماز جمعہ ہے لہٰذا اسی پر اکتفا کیا گیا۔ اور اگر استسقاء کے لئے نماز ہی نہ پڑھی تو یہ دعا کے ساتھ، بیان جواز استسقاء کے لئے ہے اور اصل جواز میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے اور مقررہ قاعدہ کے بموجب، ثابت کرنے والی حدیثیں مقدم ہیں۔ کیونکہ قول مثبت، نافی پر مقدم ہوتا ہے یہ سب شوافع کا کلام ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک استسقاء میں کوئی مسنون نماز نہیں ہے اور ارشاد باری تعالیٰ کے بموجب یہی دعا و استغفار کا نام استسقاء ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ اپنے بخشنے والے رب سے تم استغفار کرو وہی آسمان سے تم پر موسلا دھار بارش برساتا ہے۔

نیز جن حدیثوں میں استسقاء کی وجوہات مذکور ہیں ان میں نماز کا ذکر نہیں ہے۔ بجز اس ایک وجہ کے، کہ حضور ﷺ نماز پڑھنے کھلی جگہ (میدان) میں تشریف لے گئے اور دو رکعت پڑھ کر خطبہ دیا۔ اور یہ حدیث اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ یا تو پایہ صحت ہی کو نہیں پہنچتی یا یہ حضرت رسالت پناہ ﷺ کے ساتھ مخصوص ہے۔ نیز سنت وہ ہوتی ہے جسے حضور ﷺ نے کبھی کبھی ترک کرنے کے ساتھ اس پر ہمیشگی فرمائی ہو حالانکہ اس جگہ ترک صلوٰۃ اکثر ہے اور یہ فعل ایک مرتبہ کے سوا ہے ہی نہیں اور یہ روایت تو صحت کو پہنچ چکی ہے کہ امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے استسقاء کی اور وہ بھی دعاء و استغفار سے آگے نہ تھی اور اگر استسقاء میں کوئی مسنون نماز ہوتی تو اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عدم علم یا عموم بلوی باوجود قرب عہد بزمان نبوت یا ان سے باوجود علم کے اس کا ترک کرنا کوئی اور صورت نہیں رکھتا اور علماء فرماتے ہیں کہ استسقاء میں کسی نماز کے نہ ہونے سے امام اعظم رحمہ اللہ کی مراد یہ ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز، ان تمام خصوصیات کے ساتھ جو نماز عید میں ہیں مسنون نہیں ہے ورنہ اگر ہر ایک جدا جدا اور تنہا تنہا نماز پڑھے گریہ وزاری کرے اور دعاء واستغفار میں گڑگڑائے تو درست ہے۔ اور حسن و محمود ہے۔

غرضیکہ باب استسقاء میں احادیث مرویہ میں سے ہر ایک کسی نہ کسی اضطراب سے خالی نہیں ہے اور ہر اس حدیث کی سند جو ان خصوصیات و کیفیات پر مشتمل ہے بغیر ضعف کے نہیں ہے لہٰذا امام اعظم رحمہ اللہ نے اس کے مغز اور مقصود کو اختیار فرمایا اور وہ دعاء و استغفار ہے اور نماز کو بھی جائز رکھا اور جماعت، خطبہ اور اس قسم کی دیگر باتیں، یقینی نہ ہونے کی وجہ سے اختیار نہ فرمائیں۔ (واللہ اعلم)

صاحبین اور ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک استسقاء میں جماعت کے ساتھ نماز اور خطبہ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ قول امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ امام اعظم رحمہ اللہ کے مسلک پر ہیں۔ اور اب فتویٰ مذہب حنفیہ میں بھی صاحبین کے مذہب کے عمل پر ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم استسقاء کی دعا میں بہت تضرع و ابتہال فرماتے اور اپنے دست ہائے مبارک کو مبالغہ کے ساتھ اٹھاتے یہاں تک کہ آپ کے بغل ہائے شریف کی سفیدی ظاہر ہو جاتی اور آپ کے دست ہائے مبارک، سر مبارک سے اونچے اٹھ جاتے، علماء فرماتے ہیں کہ چونکہ واقعہ بہت دشوار تر ہے اور سوال و طلب بھی قوی تر ہے اس لئے دست ہائے مبارک بھی بلند تر ہیں۔

صاحبِ مشکوٰۃ مسلم سے حدیث نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استسقاء یعنی بارانِ رحمت کی دعا کی اور اپنے

دونوں ہاتھوں کی پشت کو آسمان کی طرف پھیلایا۔ مطلب یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے استسقاء میں دونوں ہاتھ اس طرح اٹھائے کہ دونوں ہتھیلیوں کا باطنی رخ، زمین کی جانب تھا اور اس کا ظاہر آسمان کی طرف اور یہ کیفیت اس کے برعکس تھی جو عام طور پر دعا کرتے وقت ہوتی تھی۔ ابو داؤد کی روایت میں بھی ایسا ہی ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ جب دعا کسی مطلب کیلئے ہو اور کسی نعمت کی قسم کا سوال ہو تو مستحب یہ ہے کہ ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو آسمان کی طرف کرے اور جب فتنہ و بلا کے دفع کرنے کیلئے دعا ہو تو ہاتھوں کی پشت کو آسمان کی طرف کرے اس میں اشارہ ہے کہ غضب، فتنہ و بلا کے جوش کو ٹھنڈا کرے اور پیدا شدہ قوت و غلبہ کو پست و فروتر کرے۔

طیبی نے کہا کہ حالت کے بدلنے میں نیک فالی بھی ہے مثلاً چادر کو بدلنے میں جو استسقاء میں منقول و مروی ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ یہ چادر کا الٹنا پلٹنا تغیر حالت اور بارش کے نہ ہونے کی تبدیلی کے لئے تفاؤل ہے۔ اور تنگی کو فراخی سے اور خشک سالی کو باران رحمت سے بدلنے کی جانب نیک فالی ہے اور بعض فرماتے ہیں کہ بلکہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کردہ حکم کا بجالانا ہے اور حکم دیا گیا ہو گا کہ ایسا کرو تا کہ حالت بدل جائے اور محض نیک فالی ہی نہ رہے اس لئے کہ تفاؤل کی شرط یہ ہے کہ قصد و اختیار سے نہ ہو بلکہ خارج میں کسی چیز سے ہو نہ کہ محض قصد و اختیار سے اس شخص کے واقع ہو اور بالکل بجا تفاؤل لیتے ہیں۔ (کذا قیل)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی استسقاء چند مرتبہ ہوئی۔ ایک مرتبہ اس قحط کے وقت جو کہ آپ کے زمانہ مبارک میں لاحق ہوا تھا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن خطبہ میں مصروف تھے۔ اس وقت ایک اعرابی نے کھڑے ہو کر فریاد کی یارسول اللہ۔ "هَلَكَ الْمَالُ وَجَاعَ الْعِيَالُ فَادْعُ لَنَا" (مال تباہ ہو گیا۔ گھر والے بھوک سے بلکنے لگے ہمارے لئے دعا فرمایئے)۔

اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی: "اَللّٰهُمَّ اَغِثْنَا اَللّٰهُمَّ اَغِثْنَا اَللّٰهُمَّ اسْقِنَا" (اے خدا ہم پر بارش فرما، اے خدا ہمیں سیراب فرما۔) تو پہاڑوں کی مانند بادل اٹھے اور برسنے لگے پھر جب دوسرا جمعہ آیا تو اسی اعرابی نے فریاد کی اور کہا یارسول اللہ! تَهَدَّمَ الْبِنَاءُ وَغَرِقَ الْمَالُ (مکانات منہدم ہو گئے اور مال ڈوب گئے) اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست ہائے مبارک کو اٹھایا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ بنی آدم کی زود رنجی پر تبسم فرمایا اور دعا فرمائی اَللّٰهُمَّ حَوَالَيْنَا وَلَا عَلَيْنَا اَللّٰهُمَّ عَلَى الْاٰكَامِ الظِّرَابِ وَبُطُوْنِ الْاَوْدِيَةِ (اے خدا ہمارے گرداگرد بارش فرما ہم پر نہیں۔ اے خدا ہمارے باڑوں پر کھیتوں پر اور جنگلوں پر) اور جس طرف بھی انگشتہائے مبارک کا اشارہ فرماتے جاتے بادل کھلتا جاتا اور ایک روایت میں ہے کہ مدینہ منورہ کے اوپر سے ابر کھل گیا اور گرداگرد برستا رہا اور مدینہ منورہ میں ایک قطرہ تک نہ برسا۔

دوسری مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم، تواضع و خشوع اور کامل نگونساری کے ساتھ نماز پڑھنے کی جگہ میدان میں تشریف لائے یہاں منبر رکھا گیا اور خطبہ دیا اس خطبہ کا اتنا حصہ محفوظ ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ، اَللّٰهُمَّ اَنْتَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ تَفْعَلُ مَا تُرِيْدُ ، اَللّٰهُمَّ اَنْتَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْغَنِيُّ ، وَنَحْنُ الْفُقَرَاءُ اَنْزِلْ عَلَيْنَا الْغَيْثَ وَاجْعَلْ مَا اَنْزَلْتَ لَنَا قُوَّةً وَّبَلَاغًا اِلٰى حِيْنٍ۔

آپ نے دعا مانگی اور منبر شریف سے اتر آئے اور بغیر اذان و اقامت کے دو رکعت نماز پڑھی۔ اور قرات جہر سے فرمائی۔ پہلی رکعت میں بعد سورۂ فاتحہ کے "سبح اسم ربک الاعلی" اور دوسری رکعت میں: "هل اتک حدیث الغاشیۃ" پڑھی جیسا کہ عید اور جمعہ کے روز پڑھتے تھے۔ پس اللہ تعالی نے بادل کو کڑک اور برق کے ساتھ بھیجا اور خوب بارش ہوئی۔ یہاں تک کہ مسجد شریف میں آتے آتے سیل رواں ہو گیا۔

اور جب حضور اکرم ﷺ نے لوگوں کو بھاگتے، دوڑتے اور کونوں میں چھپتے ملاحظہ فرمایا تو تبسم فرمایا اور ارشاد فرمایا: "واشھد ان اللہ علی کل شئ قدیر وانی عبدہ ورسولہ" اور یہی وہ حدیث ہے جس کو ائمہ کرام استقساء میں دلیل کے طور پر لاتے ہیں۔ اور تیسری مرتبہ حضور اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ میں منبر شریف پر جمعہ کے علاوہ دعائے استقاء فرمائی۔ جیسا کہ بیہقی دلائل النبوۃ میں نقل کرتے ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک سے واپس تشریف لائے تو بنی فزارہ کا ایک وفد حاضر ہوا اور اس نے قحط کی شکایت کی اور عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اپنے رب سے دعا مانگئے تاکہ ہم پر وہ بارش فرمائے اور آپ کو اپنے رب کے حضور ہماری شفاعت کرنی چاہیے۔ اور حق تعالیٰ کو بھی آپ کی شفاعت قبول کرنی چاہئے اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ویلکم" افسوس ہے تم پر، سب حق تعالیٰ کی شکایت کرتے ہو کون ہے کہ اس کی پروردگار شفاعت قبول کرے۔ "لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ۔" اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی برتر و عظمت والا ہے۔ پھر فرمایا تمہاری اس فریاد و زاری اور خوف پر حق تعالیٰ خندہ فرماتا ہے۔ ان میں سے ایک اعرابی کھڑا ہوا اس نے کہا ہمارا رب خندہ فرماتا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں خندہ فرماتا ہے۔ اس اعرابی نے کہا اب تو ہم اپنے رب سے مانگنے میں ہرگز کوتاہی نہ کریں گے کیونکہ وہ ہمارے مانگنے پر خندہ فرماتا اور ہمارے حال پر خوش ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اعرابی کی بات پر تبسم فرمایا اس کے بعد منبر شریف پر تشریف لائے اور دعا کیلئے دست ہائے مبارک اٹھائے اور بارش کی دعا کی یہاں تک کہ پورے ایک ہفتہ بارش ہوئی (الحدیث) اس دعائے استقاء میں نماز محفوظ و مروی نہیں ہے بلکہ محض خطبہ اور دعا ہے۔

اور چوتھی مرتبہ مسجد مدینہ مطہرہ میں تشریف رکھ کر استقاء فرمائی نہ قیام فرمایا نہ دعا کیلئے منبر شریف پر قدم رنجہ ہوئے۔ اس مرتبہ کی دعا میں سے صرف اتنا محفوظ ہے اَللّٰھُمَّ اَسْقِنَا غَیْثًا مُّرِیْعًا طَبَقًا عَاجِلًا غَیْرَ رَائِثٍ نَافِعًا غَیْرَ ضَارٍّ اے خدا ہم کو سیراب فرما۔ بہتے ہوئے مینہ سے بغیر دیر کے اپنی مرضی کے موافق جو نفع رساں ہو ضرر رساں نہ ہو۔

اور پانچویں مرتبہ مدینہ منورہ کے اس مکان میں جسے "احجار الزیت" کہتے ہیں۔ اس مکان میں کھڑے ہو کر استقاء فرمائی اور دست ہائے مبارک کو چہرۂ انور کے مقابل یہاں تک اٹھایا کہ سر مبارک سے اونچے ہو گئے۔ یہ واقعہ اس غزوہ کا ہے کہ مشرکوں نے پانی پر قبضہ کرنے میں سبقت کی تھی۔ اور پانی کے کنارے پڑاؤ ڈالا تھا اور مسلمانوں کا لشکر بغیر پانی کے رہ گیا تھا اور سب پر پیاس غالب آچکی تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے اپنا حال عرض کیا اور منافق جو اکثر یہودیوں میں سے تھے مشرکوں سے کہنے لگے کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نبی ہوتے تو اپنی قوم کیلئے پانی طلب کرتے (استقاء فرماتے) جس طرح کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کیلئے استقاء کیا تھا اور پتھر پر عصا مار کر بارہ چشمے نکالے تھے اور ہر چشمہ ہر ایک کیلئے جدا نکالا تھا کیونکہ ان کے لشکر میں بارہ فرقے تھے۔ جیسا کہ قرآن میں بھی مذکور ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ملی تو فرمایا وہ ایسی بات کہتے ہیں تو تم غمزدہ نہ ہو حق تعالیٰ یقیناً تم کو پانی عطا فرمائے گا۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کیلئے ہاتھوں کو اٹھایا اور دعا مانگی اسی وقت ایسا ابر نمودار ہوا کہ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا اور خوب زور کی بارش ہوئی اور بڑے بڑے جنگل پانی سے بھر گئے۔ یہی چند مواقع ہیں جو استقاء میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مذکور و مشہور ہیں۔ بخاری و مسلم اور ترمذی میں باختلاف الفاظ مروی ہے کہ جب قریش نے اسلام لانے میں دیر کی اور تمرد و سرکشی اختیار کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف دعا کی اور ایک روایت میں ہے کہ "سِنِیْنَ کَسِنِیِّ یُوْسُفَ" یعنی ان کو حضرت یوسف علیہ السلام کے قحط کی مانند قحط میں مبتلا کر۔ تو ان کو قحط نے پکڑ لیا۔ اور وہ اس میں ہلاک ہونے لگے اور مرداروں، کھالوں اور ہڈیوں کو کھانے لگے۔ وہ آسمان میں دھوئیں کی مانند کوئی چیز دوڑتی

دیکھتے تھے۔ اس پر ابوسفیان آئے اور کہنے لگے اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ تو صلہ رحمی کا حکم کرنے تشریف لائے ہیں یہ قوم ہلاک ہوئی جاتی ہے تو خدا سے بارش کی دعا مانگئے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی اور بارش ہوئی۔ قحط دور ہوا۔ اس قصہ کی تفصیل سورۂ حم الدخان کی تفسیر میں اس آیۂ کریمہ کے تحت ہے کہ "یَوْمَ تَاْتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ" تو وہ قحط حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے دور کر دیا گیا تھا۔

علماء فرماتے ہیں کہ قریش کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بد دعا کی ابتدا اس روز سے ہوئی جب کہ ان بدبختوں نے نماز کی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پشتِ اطہر پر اونٹ کی اوجھڑی رکھ دی: "لَعَنَ اللّٰہُ عَلَی الْکَافِرِیْنَ وَالْمُنَافِقِیْنَ" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ مکہ مکرمہ کا ہے۔ اور علماء فرماتے ہیں کہ جناب ابو طالب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف میں اس قصہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے قول میں کہا تھا۔ "وَاَبْیَضُ یُسْتَسْقَی الْغَمَامُ بِوَجْھِہٖ۔" ورنہ وہ تمام وجوہات جو پہلے مذکور ہوئیں وہ سب مدینہ منورہ سے متعلق ہیں۔ اور اس وقت ابو طالب موجود نہ تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ ابو طالب کے قول میں جو اشارہ ہے وہ اس زمانہ کی طرف ہے۔ جب حضرت عبدالمطلب کے زمانے میں قحط پڑا تھا اور انہوں نے قریش کیلئے استسقاء کیا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس زمانے میں صغیر السن تھے۔

مخفی نہ رہنا چاہئے کہ ابو طالب کا قول "یستسقی الغمام بوجھہ" وقوع استسقاء کا طالب نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ حضور اکرم ﷺ کی شان عالی اور آپ کی عادت شریفہ اس کی مقتضی ہے کہ اگر استسقاء کریں تو پانی مرحمت فرمایا جائے گا۔ اور یہ آسمان سے پانی دینا حق تعالیٰ کا کام ہے کہ خلق کو اپنے حبیب کی دعا سے دیتا ہے اور زمین سے پانی دینا یہ آنحضرت ﷺ کا الگ معجزہ ہے۔ تو اس سے پتہ چل گیا کہ آپ کا تصرف اللہ تعالیٰ کی رضاء و تائید سے زمین و آسمان کو شامل ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کا تصرف تمام کھانوں اور مشروبات دنیا و آخرت کے تمام حسی و روحانی رزق اور ظاہری و باطنی تمام نعمتیں، حضور ﷺ ہی کے واسطے اور طفیل سے ہیں مصرع آخر اے باد صبا اینہمہ آوردۂ تست

بیت۔ شکر فیض تو چمن چوں کند اے بر بہار کہ اگر خار و گر گل ہمہ پروردۂ تست

اور شیخ العالم، عارف باللہ محمد بکری رحمہ اللہ پڑھا کرتے تھے۔ نظم

مَا اَرْسَلَ الرَّحْمٰنُ اَوْ یُرْسِلُ مِنْ رَحْمَۃٍ یَصْعَدُ اَوْ یَنْزِلُ
فِیْ مَلَکُوْتِ اللّٰہِ اَوْ مُلْکِہٖ مِنْ کُلِّ مَا یَخْتَصُّ اَوْ یَشْمِلُ
اِلَّا وَطٰہٰ الْمُصْطَفٰی عَبْدُہٗ نَبِیُّہٗ الْمُخْتَارُ الْمُرْسَلُ
وَاسِطٌ فِیْھَا وَاَصْلٌ لَھَا یَعْلَمُ ھٰذَا کُلُّ مَنْ یَّعْقِلُ

گہن میں نماز۔ وصل:۔ صلوٰۃ کسوف کے بیان میں۔ جاننا چاہئے کہ لغت میں چاند گہن کے لئے خسوف اور سورج گہن کے لئے کسوف مشہور ہے لیکن حدیث کی روایتوں میں دونوں جگہ کاف سے مروی ہے اور کہیں کہیں دونوں جگہ خاء سے بھی ہے۔ اور جماعت محدثین خاء سے چاند میں اور کاف سے سورج میں گہن لگنے کو استعمال کرتی ہے۔ اور جس قدر حدیثیں اس بارے میں مروی ہیں وہ سب سورج گہن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل مبارک کی خبر دیتی ہیں۔ بجز اس حدیث کے جسے شیخ ابن حجر نے اپنی مشکوٰۃ کی شرح میں چاند گہن پر محمول کیا ہے اور اس امر کی خبر جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں واقع ہے یہ ہے کہ: اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اٰیَتَانِ مِنْ اٰیَاتِ اللّٰہِ فَاِذَا رَاَیْتُمْ ذٰلِکَ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ سورج اور چاند خدا کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں جب تم اس نشانی کو دیکھو تو خدا کا ذکر کرو۔

اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے: "فَادْعُوا اللّٰهَ وَكَبِّرُوْا وَصَلُّوْا وَتَصَدَّقُوْا" تو اللہ سے دعا مانگو، کبریائی بیان کرو، نماز پڑھو اور صدقہ دو۔

لیکن ان دونوں حدیثوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل نہیں معلوم ہوسکا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کسوف میں درازی فرمائی اور معمول سے زیادہ قیام ورکوع اور سجود کو طویل کیا اور قرات سورۂ بقر کے انداز پر فرمائی اور اسی کے مطابق رکوع وسجود بھی کیا اور حدیث میں ہے کہ ہر رکعت میں دو رکوع کئے۔ اور ایک روایت میں تین چار اور پانچ بھی ہے رکوع کو طویل فرماتے پھر سر مبارک اٹھاتے پھر رکوع فرماتے اسی طرح تین چار مرتبہ کیا اور امام شافعی کے نزدیک یہ نماز دو رکوع اور خطبہ کے ساتھ ہے اور اسی طرح امام احمد رحمہ اللہ کے مشہور قول پر ہے۔ اور اکثر صحابہ کے نزدیک بغیر جماعت کے ایک رکوع اور بغیر خطبہ کے معمول کے مطابق نماز ہے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ناطق ہے۔ جو ہمارا مذہب ہے۔ اور ہدایہ میں کہا گیا ہے کہ مردوں پر حال زیادہ روشن ہے۔ کیونکہ وہ اگلی صف میں کھڑے ہوتے ہیں اور عورتیں وبچے پچھلی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ شیخ ابن الہمام ایسی احادیث کو روایات صحیحہ اور حسنہ کیساتھ لائے ہیں جو مذہب حنفی کو ثابت کرنے والی ہیں اور تعدد رکوع والی حدیثوں پر جرح کی ہے کیونکہ ان کے راویوں میں اضطراب بیان کیا گیا ہے۔ بعض نے دو رکوع روایت کئے۔ اور بعض نے تین اور چار اور بعض نے پانچ۔ اس لئے لازم ہے کہ اس طریقہ پر نماز پڑھی جائے جو معمول کے مطابق موافق ہے۔ اور جیساکہ راویوں نے مطلق بیان کیا ہے چنانچہ فرمایا: "فَإِذَا كَانَ كَذٰلِكَ فَصَلُّوْا۔ (پھر جب ایسا ہو تو نماز پڑھو) اور اسی اضطراب کی وجہ سے بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ اس اضطراب کا سبب وہ اشتباہ ہے جو کثرت اژدحام کی بناء پر پچھلی صفوں میں ہونے کی وجہ سے رونما ہوا۔ اور ظاہر یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اقدس میں ایک ہی مرتبہ گہن واقع ہوا تھا اور کسی نے بھی کئی مرتبہ گہن واقع ہونے کی روایت نہیں کی ہے۔ دس سال کی مدت میں اسکا تعدد وقوع بعید از قیاس اور خلافِ عادت ہے اور حدیثوں میں یہ جو آیا ہے کہ اس کا وقوع حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند جلیل حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت ہوا تھا حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ حضرت ماریہ قبطیہ سے ۸ ہجری میں پیدا ہوئے تھے۔ اور ۱۰ ہجری میں ایام رضاعت میں ہی انتقال فرماگئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ان کی موت کے سبب سورج میں گہن پڑا تھا۔ چونکہ لوگوں میں مشہور تھا کہ کسی عظیم حادثہ کے سبب گہن واقع ہوتا ہے۔ چنانچہ صاحبزادہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ایک عظیم حادثہ تھی اسی بنا پر گہن ہوا۔ چنانچہ فرمایا سورج وچاند خدا کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں جو قدرت الٰہی اور اس کی صنعت کمال پر دلالت کرتی ہیں۔ حالانکہ کسوف وخسوف بجائے خود حق تعالیٰ کے کمال قدرت وسلطنت پر دلالت کرتے ہیں اور اہلِ بصیرت کیلئے موجب عبرت ونصیحت ہیں کہ جس طرح حق تعالیٰ ایک گھڑی میں ان کی نورانیت وتابانیوں کو سلب کرکے تاریک وسیاہ بنا دیتا ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ قادر ہے۔ (العیاذ باللہ) کہ وہ لوگوں کے علم وایمان کے نور کی روشنی کو سلب کرکے تاریک وسیاہ کردے۔

اور روایتوں میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ فرزند رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات دسویں محرم (عاشورہ) یا دسویں ربیع الاول کو ہوئی تھی۔ اس میں منجموں کے اس قول کا رد ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ سورج گہن ہمیشہ مہینے کے آخری تین دنوں میں واقع ہوتا ہے البتہ عادۃً ایسا ہو تو ممکن ہے مگر یہ گہن خلاف عادت تھا اور اگر وہ یہ کہیں کہ ان تین دنوں کے سوا میں محال ہے تو ان کی یہ بات باطل ہے: وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۝

حالتِ خوف کی نماز۔ وصل:۔ خوف کے وقت نماز پڑھنا۔ کتاب وسنت سے ثابت ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں حق

تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ (الآیۃ) اور جب تم ان میں ہو تو ان کو نماز کیلئے کھڑا کرو اور ایک جماعت اٹھتی ہے...... (ایک آیت میں یہ ہے) اور جب تم زمنی سفر میں ہو تو (دَ آیتہ) وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِى الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ تمہارے لئے مضائقہ نہیں کہ تم نماز میں قصر کرو۔

اور اکثر حضرات کا مذہب یہ ہے کہ چار رکعت والی نماز کو دو رکعت سے قصر کریں۔ اور بعض حضرات اس آیت کو خوف کی نماز پر محمول کرتے ہیں اس میں بھی افعال و کیفیات کے ترک سے قصر کرنا وارد ہے جس طرح کہ سفر میں عدد و کمیت میں قصر کرنا آیا ہے۔ بعض دونوں کو شامل قرار دیتے ہیں۔ امام ابو یوسف کی ایک روایت کے بموجب اور حسن بن زیاد احناف سے اور مزنی شوافع سے یہ قول نقل کرتے ہیں کہ یہ نماز زمانہ نبوت کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کی فضیلت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پڑھنے کی بنا پر ہے اور آیۂ کریمہ وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ۔ کا ظاہر مفہوم بھی یہی ہے۔ اور جمہور ائمہ کے نزدیک مختار، بعد از زمانہ نبوت میں اس کا جواز ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔ کے بعد صحابہ کرام میں سے حضرت علی مرتضیٰ، ابو موسیٰ اشعری اور حذیفہ بن الیمان وغیرہم رضی اللہ عنہم نے قائم فرمائی اور "اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ" اس امر کے ساتھ قید اتفاقی ہے کہ: "كُنْتَ اَنْتَ" اَوْ "مَنْ يَّقُوْمُ مَقَامَكَ" ہے۔ مطلب یہ کہ آپ بذات خود تشریف فرما ہوں یا آپ کے قائم مقام کوئی اور امام موجود ہو جیساکہ آیۂ کریمہ "خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ" سے ثابت ہے یعنی صدقہ کے اموال یا تو آپ خود لیں یا آپ کے نائبین لیتے رہیں اور نماز خوف کو اپنی کیفیات کے ساتھ پڑھنا غایت درجہ مؤکدہ اور اس نماز کی محافظت ایسی شدید واقع ہے کہ جس میں کسی عذر کی گنجائش نہیں ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز خوف، مصلحت وقت کے موافق اور سامنے دشمن کی موجودگی کے وقت، متعدد وجوہات پر صحیح و ثابت شدہ ہے۔ اور ہر ایک امام نے ان وجوہات میں سے کوئی ایک وجہ اختیار کی ہے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ان وجوہات میں سے وہ وجہ مختار ہے جسے تمام کتب ستہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور اگر ہم اسی کو بیان کریں تو بعید نہ ہو گا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نجد کی جانب جہاد میں تھے تو ہم روبرو ہو کر صف باندھ کر آپ کے سامنے کھڑے ہو گئے اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھانے کیلئے کھڑے ہوئے اور ہماری امامت فرمائی۔ اس وقت صحابہ کی ایک جماعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز میں شریک تھی اور دوسری جماعت دشمنوں کے خلاف نگہداشت کے طور پر کھڑی رہی پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھی صحابہ کے ساتھ رکوع کیا۔ اور دو سجدے کئے۔ اس کے بعد پہلی جماعت، دوسری جماعت کی جگہ جا کر کھڑی ہو گئی۔ اور دوسری جماعت ان کی جگہ آ گئی۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ ایک رکوع اور دو سجدے کئے اور سلام پھیر دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے اس کے بعد ان دونوں جماعتوں نے اپنی اپنی وہ رکعت جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیچھے نہ پڑھی تھی ادا کی۔

یہ ترجمہ بخاری کے لفظ کا ہے۔ اور باقی دیگر کتب ستہ میں بھی باختلاف الفاظ و عبارات ایسا ہی مروی ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ یہ طریقہ لفظ قرآن کے زیادہ موافق ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں اس کی تصریح نہیں ہے کہ کون سی نماز تھی لیکن سفر میں تھے اس بنا پر دو رکعتیں پڑھیں لیکن مذہب حنفی زیادہ عام ہے۔ خواہ سفر میں ہو یا حضر میں۔ نماز خوف جائز ہے۔ لہٰذا فرماتے ہیں کہ دو رکعت والی نماز خواہ حضر میں ہو یا قصر میں۔ امام ہر ایک جماعت کے ساتھ ایک ایک رکعت پڑھے اور چار رکعت والی نمازوں میں (حالت حضر میں) ہر جماعت کو دو رکعتیں امام پڑھائے گا۔ اور مغرب میں پہلی جماعت کو دو اور دوسری

جماعت کو ایک رکعت پڑھائے گا۔ امام احمد و شافعی رحمہما اللہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ بربنائے عموم ارشاد باری تعالیٰ "وَاِذَا کُنْتَ فِیْہِمْ" جیسا کہ کہتے ہیں اور ممکن ہے کہ حضر میں اس کا اثبات قیاس کے ذریعہ ہو (واللہ اعلم) امام مالک کے نزدیک سفر کے ساتھ مخصوص ہے۔

اور دیگر وجوہات بھی حدیث کی کتابوں میں متعدد اسناد اور صحیح روایات کے ساتھ مذکور ہیں۔ چونکہ ان کی تفصیل سے ہماری غرض متعلق نہیں ہے اور یہ بھی ہے کہ ان اسباب کی وجہ سے آخر زمانے میں نماز خوف کا وجود بہت ہی نادر ہو گا۔ ہم اسی قدر پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور یہ بھی اس تقدیر پر ہے جب کہ اس طرح نماز ادا کرنے کی قدرت ہو۔ اور اگر خوف زیادہ ہے اور قدرت کا دائرہ تنگ ہو تو جس طریقہ سے بھی ممکن ہو نماز پڑھے خواہ پیدل خواہ سوار ہوکر، خواہ اشارے کے ساتھ رکوع و سجود کرے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی مذکورہ حدیث کی بعض سندوں میں اس معنی و مفہوم کی تصریح بھی واقع ہوئی ہے۔ اگر میدان کارزار اس حد تک گرم ہو کہ نماز پڑھنا کسی صورت میں بھی ممکن نہ ہو تو قضا کرے۔ جیسا کہ غزوہ خندق میں واقع ہوا ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "حَبَسُوْنَا عَنْ صَلٰوۃِ الْوُسْطٰی صَلٰوۃِ الْعَصْرِ مَلَأَ اللّٰہُ بُیُوْتَہُمْ وَقُبُوْرَہُمْ نَارًا" ان کافروں نے ہمیں نماز عصر پڑھنے سے روکے رکھا۔ اللہ تعالیٰ ان کے گھروں اور ان کی قبروں کو آگ سے بھرے۔ یہ بد دعا دنیا و آخرت میں عذاب الٰہی کیلئے ہے (اللہ اکبر)۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احد میں کیسی سختی و مشقت اٹھائی، دندان مبارک شہید ہوا چہرۂ انور لہولہان ہوا مگر اس وقت کافروں کیلئے دعائے بد نہ فرمائی بلکہ یہ فرمایا: "اَللّٰہُمَّ اغْفِرْ لَہُمْ فَاِنَّہُمْ لَا یَعْرِفُوْنِیْ" اے خدا انہیں معاف فرما دے۔ کیونکہ یہ مجھے پہچانتے نہیں۔ کیونکہ اس مقام میں اپنی ذات شریف کے حق کا معاملہ تھا اور اس جگہ خدا کے اور دین کے حق میں معاملہ تھا۔ (مطلب یہ کہ غزوۂ احد میں اپنی ذات شریف کے حق کیلئے درگزر کی دعا مانگی اور غزوۂ خندق میں نماز عصر کے فوت ہونے پر حق خدا اور حق دین کے بارے میں دعائے بد فرمائی۔ (مترجم)

اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ کافر کہنے لگے کہ اگر ہم مسلمانوں کی نماز پر ٹوٹ پڑتے تو ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مسلمانوں کی ایک نماز ایسی ہے جسے وہ مال و اولاد سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں اور وہ نماز عصر ہے۔ لہٰذا اس وقت مسلمانوں پر حملہ کرنا چاہئے۔ پھر حضرت جبریل علیہ السلام آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز خوف پڑھی۔

سفر میں عبادت۔ وصل:۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر میں عبادت کرنا، سفر کے آداب اور سواری پر چڑھنے اور سواری سے اترنے اور منزل پر قیام فرمانے اور وطن کی طرف لوٹنے کے بارے میں جو دعائیں اور ذکر و اذکار مروی ہیں وہ حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں ان میں سے اس جگہ صرف دو مسئلے بیان کئے جاتے ہیں ایک قصر دوسرا جمع۔ لیکن قصر کا مسئلہ جو چار رکعت والی نماز کو دو رکعت کر کے ادا کرنا ہے یہ مسئلہ تمام علماء امت کے درمیان متفق علیہ ہے کسی کا اس میں اختلاف نہیں ہے۔ لیکن مذہب حنفی میں قصر عزیمت ہے اور چار رکعت درست نہیں ہے اگر چار رکعت پڑھے اور وہ پہلے تشہد میں بیٹھا ہے تو جائز ہو جاتی ہے۔ اگر نہیں بیٹھا ہے تو فاسد ہو جاتی ہے۔ امام مالک کے مذہب میں بھی یہی ہے لیکن امام شافعی کے نزدیک رخصت ہے اور چار پڑھنی بھی جائز ہے حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چار رکعتی نماز سفر میں پوری پڑھی ہو۔ اور وہ حدیث جو ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قصر بھی کرتے اور پوری نماز بھی پڑھتے اور افطار بھی کرتے اور روزہ بھی رکھتے۔ یہ روایت صحت کو شامل نہیں ہے اور صحابہ عظام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے

بھی چار رکعتیں نہیں پڑھیں مگر امیر المومنین حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے آخری دنوں میں موسم حج میں چار پڑھیں اور علماء اس کی متعدد تاویلیں کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا مذہب بھی یہی ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ کریمہ تھی کہ سفر میں نماز فرض پر اکتفا فرماتے۔ اور یہ محفوظ نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی دو رکعت سنت اور چار وتر کے سوا سفر میں فرض سے پہلے یا فرض کے بعد سنتیں پڑھی ہوں اور ظہر کے فرض کے بعد سنت پڑھنا بھی مروی ہے اور جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے کہ سفر میں نماز سنت کو پڑھتے تھے۔ مگر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ادا نہ کرتے۔ اگرچہ بعض روایتوں سے ان کا پڑھنا بھی آیا ہے۔ نیز مروی ہے کہ جو سنت پڑھتا اسے منع نہ کرتے اور بعض کہتے ہیں کہ سنن رواتب میں اختلاف ہے لیکن تطوع غیر راتبہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رات کی نماز (تہجد) کو ترک نہ فرماتے اگرچہ سفر میں ہوتے۔ اور کبھی تہجد کو سواری کی پیٹھ پر اشارہ سے پڑھتے۔ اور وتر بھی پڑھتے۔ اور سواری کی پشت پر نوافل کو اشارے سے پڑھنا جائز ہے۔ خواہ سواری کسی طرف کو جا رہی ہو بشرطیکہ تکبیر تحریمہ کے وقت استقبال قبلہ کیا ہو۔

ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تنگ راستے میں سفر کر رہے تھے اوپر سے بارش تھی اور نیچے کیچڑ اور دلدل تھی۔ سب سواری پر سوار تھے۔ نماز کا وقت آ گیا اذان واقامت کہی گئی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سواری کو سب سے آگے بڑھا کر صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ جماعت کر کے اشارے سے نماز پڑھی اور سجود کو رکوع سے زیادہ نیچا کیا اور یہ ان مقامات میں سے ایک مقام ہے جہاں علماء کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس خود اذان کہی اور بعض کہتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ اذان کہنے کا حکم دیا اور بعض میں صراحت سے بھی آیا ہے کہ: "فَاَمَرَ الْمُؤَذِّنَ فَاَذَّنَ" پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے موذن کو حکم دیا اور اس نے اذان کہی۔

لیکن جمع، یعنی دو نمازوں کو اکٹھا کر کے پڑھنے کے مسئلے کی صورت یہ ہے کہ جب زوال آفتاب سے پہلے کوچ کرنا واقع ہوتا تو ظہر کو تاخیر کر دیتے۔ یہاں تک کہ عصر کے وقت میں اقامت فرماتے تو ظہر و عصر کے درمیان جمع فرما دیتے اسے جمع تاخیر کہتے ہیں اور اگر سفر شروع کرنے سے پہلے ظہر کا وقت داخل ہو جاتا تو اس صورت میں کبھی ظہر پڑھ کر سوار ہوتے بعد ازاں جب وقت عصر آتا تو اتر کر نماز عصر ادا کرتے اس صورت میں جمع واقع نہیں ہوتا اور بعض اوقات ظہر کو عصر سے ملا دیتے اور دونوں کو ایک ساتھ پڑھتے اور اس وقت سوار ہوتے اس کا "جمع تقدیم" نام رکھتے ہیں اور مغرب و عشاء میں ایسا ہی ہوتا۔ یعنی اگر قبل از غروب کوچ واقع ہوتا اور نماز مغرب کا وقت راہ میں آتا تو نماز مغرب میں تاخیر کرتے۔ یہاں تک کہ نزول کے وقت مغرب و عشاء ملا کر پڑھتے یہ جمع تاخیر ہے اور اگر کوچ سے پہلے مغرب کا وقت ہو جاتا تو مغرب و عشاء دونوں کو جمع کر کے پڑھتے اور سوار ہو جاتے یہ جمع تقدیم ہے۔

جاننا چاہئے کہ احادیث میں "جمع بین الصلوٰتین" واقع ہوا ہے اور بعض حدیثوں میں مطلق ہے اور بعض میں مقید بحالت روانگی اور سفر ہے اور بعض میں قطع مسافت کو جلد تر کرنے کی قید ہے۔ اور یہی وہ محل ہے جس میں ان علماء کا اختلاف ہے جو جمع کے جواز کے قائل ہیں۔ بعض علی الاطلاق قائل ہیں۔ اور امام شافعی انہیں میں سے ہیں۔ اور بعض حالت روانگی اور سفر میں مخصوص قرار دیتے ہیں نہ کہ نزول کی حالت میں اور کہتے ہیں کہ سفر میں جمع کی عادت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دائمی نہ تھی بلکہ جب سفر رواں دواں ہوتا تو جمع کرتے لیکن حالتِ نزول و قرار میں جمع مروی نہیں ہے اور بعض قطع مسافت میں جلدی کی صورت کے ساتھ مخصوص گردانتے ہیں۔ فتح الباری میں ہے کہ امام مالک سے مشہور یہی ہے۔ نیز بعض حالت عذر، زائد سفر کے ساتھ مخصوص قرار

دیتے ہیں۔ اور بعض جمع تاخیر کو جائز قرار دیتے ہیں اور جمع تقدیم کو ناجائز اور یہ امام احمد سے مروی ہے نیز ان کے نزدیک بھی یہ بحالت سیر ہے مگر ان کے مذہب میں مشہور مطلقاً جواز ہے اور فتح الباری میں ہے کہ امام مالک سے بھی جمع تاخیر کا جواز مروی ہے نہ کہ جمع تقدیم۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک مطلقاً جائز نہیں ہے۔ ان کے قول کی وجہ یہ ہے کہ اوقات نماز کی تعیین قطعی ہے اور تواتر کے ساتھ ثابت ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وقت سے نماز کو تاخیر کرنا اور اس پر اسے مقدم کرنا کبائر میں سے شمار کرتے ہیں۔ امام محمد رحمہ اللہ اپنی "مئوطا" میں نقل کرتے ہیں کہ ہمیں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت پہنچی ہے کہ انہوں نے ہر طرف کے اپنے حکام کو خط لکھا اور انہیں منع فرمایا کہ وہ جمع بین الصلوٰتین ایک وقت میں نہ کریں اور ان کو خبردار کیا کہ ایک وقت میں جمع بین الصلوٰتین کبائر میں سے ہے امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ خبر ہمیں ثقہ علماء سے پہنچی ہے کہ انہوں نے علاء ابن الحارث اور انہوں نے مکحول سے روایت کی ہے اور چونکہ تعیین اوقات قطعی اور متواتر ہے لہٰذا خبر واحد اس کے معارض نہیں ہو سکتی۔ بخلاف سفر میں افطار وقصر کے۔ کہ یہ نص قرآنی سے ثابت ہوئی ہیں۔

بخاری ومسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی نہیں دیکھا کہ آپ نے اپنے غیر وقت میں کوئی نماز پڑھی ہو مگر مغرب وعشا کی دو نمازیں جن کو مزدلفہ میں جمع فرمایا۔ اور احادیث میں عرفات میں ظہر وعصر کی جمع بھی مروی ہے اور یہ جمع بر بنائے مناسک حج تھی نہ کہ سفر۔ نیز رسول اللہ ﷺ سے وقوع فعل دائمی نہ تھا بلکہ اس کی تصریح غزوۂ تبوک کی احادیث میں آچکی ہے اور اس میں یہ بھی ثابت نہیں ہے کہ آپ وہاں یہ عمل روزانہ کرتے ہوں اور تحقیق یہ ہے کہ کلمہ "کان" دوام واستمرار پر دلالت نہیں کرتا۔ جس طرح کہ اس بات کو اس کے مقام پر بیان کیا ہے۔

اور جامع الاصول میں بروایت ابو داؤد از ابن عمر رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ کہا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی سفر میں مغرب وعشا کو ملا کر نہیں پڑھا مگر ایک مرتبہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ انہوں نے کبھی دو نمازوں کو ملا کر نہیں پڑھا مگر اس ایک رات میں جب کہ انہیں کسی جگہ سے ان کی زوجہ کے انتقال کی خبر پہنچی تو وہاں چلے گئے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ایک یا دو مرتبہ کے سوا ایسا کبھی نہیں کیا۔ ترمذی سے منقول ہے کہ سالم بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے لوگوں نے پوچھا کہ کیا عبداللہ رضی اللہ عنہ سفر میں کسی رات نماز کو ملا کر پڑھتے تھے کہا نہیں مگر مزدلفہ میں۔

جمع تقدیم کی حدیثیں، صحاح میں بہت ہی کم ہیں اور صحیح بخاری کی روایتوں میں اختلاف ہے اسی لئے بکثرت ائمہ کرام اس کے قائل نہیں ہیں۔ لہٰذا اب بعض وقتوں میں جمع تاخیر پر عمل کرنا باقی رہا۔ تو اسی کی تاویل یہ ہے کہ "جمع بین الصلوٰتین" سے مراد یہ ہے کہ پہلی نماز کو اتنا موخر کیا جائے کہ اسے اس کے آخری وقت میں پڑھا جائے اور بعض اسے "جمع صوری" کا نام دیتے ہیں کیونکہ یہ ظاہراً صورت میں تو جمع ہے مگر حقیقت ومعنی میں جمع نہیں ہے۔ اور یہی وہ صورت ہے جس پر احناف سفر میں جمع کے اطلاق کی صورت بناتے ہیں جس کا بیان استحاضہ کے باب میں حمنہ بنت جحش کی حدیث میں آیا ہے۔ اگرچہ لفظ حدیث میں، بعض روایتوں میں ایسا ہے کہ ظہر وعصر کے درمیان، ایک وقت میں جمع کرتے تھے اور عصر کے وقت میں ادا کرتے تھے تو یہ ان دلائل کے بموجب جن کا ہم نے ذکر کیا ہے اسی پر محمول ہے بلاشبہ ابوداؤد میں امیر المومنین علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ آپ جب غروب آفتاب کے بعد سفر کرتے ہوتے اور قافلہ رواں دواں ہوتا تو جس وقت اندھیرا خوب پھیل جاتا تو نزول فرماتے اور نماز مغرب ادا کرتے پھر رات کا کھانا طلب فرماتے اور کھاتے اس کے بعد عشا کی نماز پڑھتے اور سفر شروع کر دیتے۔ فرماتے ہیں کہ ایسا ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے اور امام محمد اپنی "مئوطا" میں فرماتے ہیں کہ ہمیں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے خبر پہنچی ہے کہ وہ مغرب کو

اپنے وقت میں پڑھتے کیونکہ وہ غروب شفق کے پہلے تک تاخیر کرتے تھے برخلاف امام مالک کی روایت کے وہ فرماتے ہیں: "حَتّٰی غَابَ الشَّفَقُ" یہاں تک کہ شفق غروب ہو جاتی۔

جامع الاصول میں ابو داؤد سے بروایت نافع اور عبدبن واقدی، مروی ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے مؤذن نے کہا الصلوٰۃ۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا چلتے رہو یہاں تک کہ غروب شفق سے پہلے اترے اور نماز مغرب ادا کی۔ اس کے بعد انتظار کیا یہاں تک کہ شفق غائب ہو گئی پھر عشاکی نماز پڑھی اس کے بعد فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سفر میں جب جلدی ہوتی تو ایسا ہی حکم فرماتے۔ جیساکہ میں نے کیا ہے اور نسائی کی ایک روایت میں ہے کہ. "حَتّٰی اِذَا کَانَ اٰخِرُ الشَّفَقِ" یہ وہ روایتیں ہیں جو جمع میں اس طریقہ پر جو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے دلیل و نظیر ہیں اور ان کا ظاہر یہ دکھارہی ہیں کہ عدم جمع و جمع در وقت واحد، و جمع بمعنی تاخیر تا آخر وقت و تعجیل در اول کی تمام روایتیں مروی ہیں اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے عدم جمع کو لیاہے یا جمع بمعنی تاخیر کو محافظت وقت کیلئے احتیاطاً اختیار کیا ہے۔

شیخ ابن حجر فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ بعض شوافع کہتے ہیں کہ ترک جمع افضل ہے امام مالک سے ایک روایت میں ہے کہ جمع مکروہ ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل مبارک، محض جواز کے لئے تھا (واللہ اعلم)

تنبیہہ : یہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے مسافروں کیلئے جمع بین الصلوٰتین میں تھا لیکن مقیم کیلئے جمع کرنے کے بارے میں ترمذی فرماتے ہیں کہ بعض تابعین، مریض کیلئے جمع بین الصلوٰتین کے قائل ہیں اور ان میں امام احمد و اسحٰق بھی ہیں۔ اور بعض بارش میں بھی جمع کے قائل ہیں اس کے قائل امام شافعی و احمد اور اسحٰق ہیں اور امام شافعی مریض کیلئے جمع کے قائل نہیں ہیں۔ یہ عبارت ترمذی کی ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ جو بغیر عذر کے دو نمازوں کو ملاتا ہے بلاشبہ وہ گناہ کبیرہ کے دروازوں میں سے ایک دروازہ میں داخل ہوتا ہے اور جمہور امت کے نزدیک اسی پر عمل ہے کہ وہ دو نمازوں کو جمع نہیں کرتے مگر سفر اور عرفات میں (انتہیٰ)۔

نمازِ جنازہ : وصل : ۔ نماز جنازہ کے مسائل، کتاب الجنائز اور احادیث میں وارد ہیں اور اس کے مقدمات و آداب بہت ہیں جو مرض کی فضیلت اور اس کے ثواب اور اس مرض میں عیادت یعنی بیمار پرسی کرنے کے ثواب اور اس کے آداب سب کو شامل ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیمار پرسی (عیادت) کیلئے کوئی دن معین نہ فرماتے تھے۔ جیساکہ عام لوگوں کا خیال ہے کہ سنیچر اور منگل کے دن عیادت کرنا مبارک نہیں ہے۔ مواہب لدنیہ میں ہے کہ سنیچر کے دن عیادت کو چھوڑنا مخالف سنت ہے اور کہا کہ یہ بدعت ہے جسے ایک یہودی طبیب نے ایجاد کیا تھا اور بعد میں لوگوں میں مشہور ہو گیا اور اس ایجاد کی وجہ یہ ہے کہ ایک بادشاہ بیمار ہوا۔ اور اس طبیب کو اپنے علاج کیلئے ہمہ وقت حاضر رہنے کا حکم دیا اور حکم دیا کہ جب یہ باہر جائے اس کی گردن ماردی جائے اس پر اس یہودی نے چاہا کہ جمعہ کے دن کی رخصت مانگے اور ہفتہ کے دن اپنے یہودی دین کے لئے چھٹکارا مل جائے۔ چنانچہ اس نے عرضی گزاری کہ ہفتہ کے دن بیمار کے پاس نہ رہنا چاہئے کیونکہ اس میں بیمار کی ہلاکت کا خوف ہے اس پر بادشاہ نے اپنی جان کے خوف سے اسے رخصت دے دی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دردِ چشم کی وجہ سے بھی عیادت کرتے۔ امام احمد اور ابوداؤد زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میری آنکھ کی تکلیف میں عیادت فرمائی۔ اور کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے اور اس حدیث میں اس کیلئے ثبوت ہے جو آشوبِ چشم میں عیادت کرنے کو مسنون و مستحب ہونے کا قائل نہ ہو۔ اس باب میں ایک اور حدیث بیہقی

وطبرانی سے بھی نقل کرتے ہیں کہ تین چیزیں ہیں جن میں عیادت نہیں ہوتی۔ ایک آنکھ کی تکلیف۔ دوسرے پھوڑے پھنسی۔ تیسرے درد دندان اور یہ حدیث ضعیف ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میت پر ایسے امور سے احسان فرماتے جو اس کیلئے قبر اور قیامت میں سود مند و نافع ہو جائے اور اس کے اقارب اور گھر والوں کے ساتھ تعزیت، طعام، پرسش احوال اور تجہیز و تکفین میں مدد کے ساتھ احسان فرماتے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت کے ساتھ نماز جنازہ پڑھتے اس کے لئے استغفار فرماتے اور اس کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ مدفن تک جنازہ کے ساتھ جاتے اور قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر اس کیلئے دعا فرماتے۔ اور کلمہ ایمان پر ثابت رہنے کی تلقین فرماتے اور منکر و نکیر کے سوال و جواب سکھاتے۔ اور اس کی قبر پر مٹی وغیرہ ڈال کر تیار کرتے اور حصول رُوح و راحت کے بموجب اور رحمت و مغفرت کے نزول کی خاطر سلام و دعا سے مخصوص فرماتے۔ ایک عرصہ تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ عادت رہی کہ جب کسی کے انتقال کا وقت قریب آتا اور سکرات کا عالم طاری ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بلاتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حضوری میں وہ جان قربان کرے اس کے بعد تجہیز و تکفین فرماتے نماز پڑھتے اور قبر تک جنازہ کے ساتھ مشایعت فرماتے۔ اور جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے دیکھا کہ اس میں بڑی مشقت و دشواری ہے تو انہوں نے اس میں اختصار سے کام لیا۔ چنانچہ جب کوئی انتقال کر جاتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دیتے تاکہ تجہیز و تکفین اور نماز و دفن میں تشریف فرما ہوں اس کے بعد جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے دیکھا کہ یہ بھی مشقت سے خالی نہیں ہے تو میت کی تجہیز و تکفین کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا انتظار کرتے تاکہ نماز پڑھائیں اور نادر اوقات میں مثلاً رات ہوتی یا کوئی اور مانع ہوتا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نماز کیلئے بھی خبر نہ دیتے۔ اور خود ہی نماز پڑھا دیتے۔ اور دفن کر دیتے۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جاتے اور اس کی قبر پر نماز پڑھتے۔ ابتدائی زمانہ میں ایسا تھا کہ جب میت کو لایا جاتا تو دریافت فرماتے کہ اس پر کوئی قرض کا بار ہے یا نہیں اور کچھ مال چھوڑا ہے جس سے بار قرض اتارا جا سکے یا نہیں۔ اگر وہ کہتے کہ کچھ مال چھوڑا ہے یا کسی نے اپنے ذمہ قرض کو لے لیا ہے تو پڑھاتے ورنہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو فرماتے کہ اپنے ساتھی کی نماز تم ہی پڑھاؤ اور خود نہ پڑھاتے اور جب حق تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے شہروں کو فتح فرمایا اور اموال میں وسعت بخشی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بار قرض کے بارے میں سوال کرنا چھوڑ دیا۔ اور فرماتے جس کسی نے مال چھوڑا ہے وہ اس کے اہل و عیال کا ہے اور جس نے قرض چھوڑا ہے یا اہل و عیال چھوڑے ہیں وہ میرے ذمہ کرم پر ہے۔

نمازِ جنازہ میں کبھی چار، کبھی پانچ کبھی چھ تکبیریں فرماتے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل بھی مختلف مروی ہے اور جو حضرات چار سے زیادہ تکبیر کہنے سے منع کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ثابت شدہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آخری نماز جنازہ پڑھائی اس میں چار تکبیریں تھیں اور یہی مقرر و متعین ہو گیا۔ اس باب میں اخبار و آثار چار تکبیروں کی ہی مستفیض و مشہور ہیں اور یہی روایات کثیرہ اور طرق متعددہ سے ثابت ہو چکا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کی جب نماز جنازہ گزاری تو انہوں نے چار تکبیریں کہیں۔ اور کہا: "ہٰذا سُنَّتُکُمْ یَابَنِیْ اٰدَمَ" اے بنی آدم یہ تمہارے لئے تمہاری سنت ہے اسے حاکم نے مستدرک میں اور ابو نعیم نے حلیہ میں روایت کیا ہے اور دو سلام کے ساتھ نماز جنازہ سے باہر نکلتے۔ اور یہی مذہب امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہم اللہ کا ہے۔ اور کبھی ایک سلام پر اختصار فرماتے اور یہ امام مالک و امام احمد کے مذہب میں ہے ایک روایت میں ان سے دو سلام ہیں اور "جمع الجوامع" میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا

عمل منقول ہے کہ وہ ایک سلام پھیرتے اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم بھی ایسا ہی کرتے اور ہر تکبیر کے وقت ہاتھوں کو اٹھاتے یہ امام شافعی واحمد کا مذہب ہے۔ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عمر وابن عباس وزید بن ثابت اور امام مالک رحمہم اللہ سے تین قول مروی ہیں۔ رفع در کل وعدم رفع در کل اور در اول رفع ودر بواقی عدم رفع اور امام ابو اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب بھی یہی ہے کیونکہ ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث اور دیگر مختلف حدیثیں اس باب میں مروی ہیں۔ اور ممکن ہے کبھی اس طرح ہوا ہو اور کبھی اس طرح صاحب سفر السعادۃ فرماتے ہیں کہ تکبیرات نماز جنازہ میں رفع یدین کے بارے میں کوئی چیز صحیح مروی نہیں ہوئی۔ (واللہ اعلم)

پہلی تکبیر کے بعد قرأۃ فاتحہ الکتاب بھی مروی ہے۔ شیخ ابن الہام شرح ہدایہ میں فرماتے ہیں کہ نماز جنازہ میں قرأت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثبوت کو نہیں پہنچی ہے لیکن بخاری ومسلم، ابو داؤد وترمذی اور نسائی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث مروی ہے اور اس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول وعمل مروی ہوا ہے۔ اور بعض روایتوں مین قرأت فاتحہ الکتاب اور کسی سورۃ کا جہر سے پڑھنا ان سے ماثور ہوا ہے اور کہتے ہیں کہ جہر بقصد تعلیم تھی تاکہ لوگ جان لیں یہ سنت ہے۔ جیسا کہ اس معنی کی تصریح حدیث میں بھی آتی ہے۔ اور مذہب شافعی واحمد اور اسحق یہی ہے لیکن مذہب امام ابو حنیفہ اور امام مالک وثوری اس کے برخلاف ہے۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی اس بارے میں اختلاف مروی ہے۔

امام طحاوی فرماتے ہیں کہ سورہ فاتحہ کا نماز جنازہ میں پڑھنا بطریق ثنا ودعا تھی نہ کہ قرأت کی صورت میں اور شمنی کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ثنا کی نیت سے پڑھنا مراد ہو تو ہمارے نزدیک بھی جائز ہے اور فتح الباری کے کلام سے مستفاد ہوتا ہے کہ قرأت فاتحہ کے قائلین مشروعیت کے قائل ہیں نہ کہ وجوب کے۔ لیکن کرمانی کہتے ہیں کہ واجب ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کے کلام میں جو سنت ہونا واقع ہوا ہے اس سے مراد طریقہ مسلوکہ در دین ہے اور کہا گیا کہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک واجب نہیں ہے اور وہ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نمازہ جنازہ میں دعا پڑھنا محفوظ ہے یہ ہے کہ

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ وَارْحَمْہُ وَعَافِہٖ وَاعْفُ عَنْہُ وَاَکْرِمْ نُزُلَہٗ وَوَسِّعْ مَدْخَلَہٗ وَاغْسِلْہُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرْدِ وَنَقِّہٖ مِنَ الْخَطَایَا کَمَا نَقَّیْتَ الثَّوْبَ الْاَبْیَضَ مِنَ الدَّنَسِ وَاَبْدِلْہُ دَارًا خَیْرًا مِّنْ دَارِہٖ وَاَھْلًا خَیْرًا مِّنْ اَھْلِہٖ وَزَوْجًا خَیْرًا مِّنْ زَوْجِہٖ وَاَدْخِلْہُ الْجَنَّۃَ وَاَعِذْہُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ عَذَابِ النَّارِ۔

اس حدیث کو مسلم وترمذی اور نسائی نے حضرت عوف بن مالک سے روایت کیا ہے کہ کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں یہ دعا پڑھی اور میں نے اسے یاد کر لیا ہے۔ اور حضرت عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے اس دعا کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز جنازہ میں پڑھتے سنا تو میں نے آرزو کی کہ کاش یہ میرا جنازہ ہوتا۔

اور اب اس دعا کا پڑھنا رائج ومتعارف ہے۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا وَمَیِّتِنَا وَصَغِیْرِنَا وَکَبِیْرِنَا وَذَکَرِنَا وَاُنْثَانَا وَشَاھِدِنَا وَغَائِبِنَا اَللّٰھُمَّ مَنْ اَحْیَیْتَہٗ مِنَّا فَاَحْیِہٖ عَلَی الْاِسْلَامِ وَمَنْ تَوَفَّیْتَہٗ مِنَّا فَتَوَفَّہٗ عَلَی الْاِیْمَانِ اَللّٰھُمَّ لَا تَحْرِمْنَا اَجْرَہٗ وَلَا تُضِلَّنَا بَعْدَہٗ

اور ایک روایت میں وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَہٗ ہے اور بعض روایتوں میں اتنا زیادہ ہے: اَللّٰھُمَّ اِنْ کَانَ مُحْسِنًا فَزِدْ فِیْ اِحْسَانِہٖ وَاِنْ کَانَ مُسِیْئًا فَتَجَاوَزْ عَنْ سَیِّئَاتِہٖ اسے موطا میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ نابالغ لڑکوں کی نماز جنازہ میں اتنا اور

بڑھاتے ہیں: اَللّٰھُمَّ اجْعَلْہُ لَنَا فَرَطًا وَّ ذُخْرًا وَّ اجْعَلْہُ لَنَا شَافِعًا وَّ مُشَفَّعًا۔
اور جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نمازِ جنازہ فوت ہوجاتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبر پر نماز ادا کرتے ایک مرتبہ ایک دن رات کے بعد اور ایک مرتبہ دن کے بعد بلکہ ایک ماہ کے بعد آیا ہے۔ حدیث میں ایسا ہی آیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ جب تک میت پھولے پھٹے نہیں جائز ہے۔ اور اس کا اندازہ تین دن کا کرتے ہیں اور بعض کے نزدیک اس وقت تک جائز ہے۔ جب تک کہ میت گل سڑ نہ جائے۔ اور ایسا ایک ماہ سے زیادہ کا بھی احتمال رکھتا ہے اس مسئلہ میں فقہاء اختلاف رکھتے ہیں۔ بعض اسے خصائصِ نبوت میں شمار کرتے ہیں کیونکہ حدیث میں ہے کہ فرمایا قبر تاریکی سے لبریز ہے اور میری نماز اسے روشن بنانے والی ہے۔
اور حق وصواب یہ ہے کہ یہ عام ہے اور بعض کہتے ہیں کہ جس کی نماز جنازہ نہ پڑھی گئی ہو اور بغیر نماز کے دفن کر دیا گیا ہو تو درست ہے ورنہ نہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنازہ کے ساتھ پاپیادہ تشریف لے جاتے۔ ترمذی وابوداؤد، حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا ہم ایک جنازہ میں گئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سواروں کی ایک جماعت دیکھی جو ہمراہ جارہی تھی۔ فرمایا یہ لوگ شرم نہیں رکھتے کہ حق تعالیٰ کے فرشتے تو پیدل جارہے ہیں اور یہ سواری کی پشت پر سوار ہیں۔
ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک گھوڑا سواری کیلئے پیش کیا گیا تاکہ سوار ہوں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سواری سے انکار فرمادیا مگر واپسی پر سواری سے تشریف لائے۔
اور جب تک جنازہ کندھوں سے اتارا نہ جاتا نہ بیٹھتے۔ فرماتے اِذَا اَتَیْتُمُ الْجَنَازَۃَ فَلَا تَجْلِسُوْا حَتّٰی تُوْضَعَ جب جنازہ آئے تو جب تک اٹھایا ہوا ہے نہ بیٹھو اور ایک روایت میں ہے کہ جب تک لحد میں نہ رکھا جائے نہ بیٹھو۔
نیز اس میں اختلاف ہے کہ جنازہ کے آگے چلنا مستحب ہے یا پیچھے چلنا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جنازہ کے پیچھے چلنا مستحب ہے اور یہی مذہب اوزاعی کا بھی ہے اس لئے کہ یہ موت کی یاد اس میں غور وفکر کرنے اور عبرت حاصل کرنے کیلئے زیادہ موثر ہے نووی اور دیگر جماعتیں کہتی ہیں کہ دونوں برابر ہیں۔ امام مالک وشافعی اور احمد رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ جنازے کے آگے چلنا افضل ہے اس لئے کہ قوم شفیع ہے اور شفیع عادت میں مقدم ہوتا ہے۔ ترمذی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما جنازہ کے آگے چلا کرتے تھے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ وہ جنازہ کے پیچھے چلا کرتے تھے۔ ایک اور حدیث میں یہ ہے کہ سوار سب سے پیچھے چلے اور پیدل کو اختیار ہے جس طرح چاہے چلے۔ آگے پیچھے داہنے بائیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غائبانہ نمازِ جنازہ نہیں پڑھتے تھے لیکن یہ صحیح ہے کہ شاہ حبشہ نجاشی کے جنازہ کی نماز پڑھی حالانکہ حبش میں انتقال ہوا تھا اور آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا تمہارے ایک بھائی کا انتقال ہو گیا ہے اس کی نماز جنازہ پڑھو تو نماز پڑھنے کی جگہ میدان میں تشریف لائے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ نماز پڑھی اور چار تکبیریں کہیں اور معاویہ لیثی پر بھی نماز پڑھی ہے۔ جس وقت آپ غزوۂ تبوک میں تھے اور معاویہ لیثی مدینہ میں۔ تو جبریل علیہ السلام آئے خبر دی اور کہا کیا آپ پسند فرماتے ہیں کہ آپ کے لئے زمین لپیٹی جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان پر نماز پڑھیں فرمایا ہاں۔ اس پر جبریل علیہ السلام نے اپنے پر مار کے درمیان سے پہاڑ، ٹیلے، درخت وغیرہ تمام حجابات اٹھا دیئے اور ایک روایت میں ہے کہ اس کے جنازے کو اٹھا کر بارگاہ رسالت میں پیش کر دیا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی اور فرشتوں کی دو صفیں آپ کے پیچھے تھیں اور ہر صف ستر ہزار فرشتوں کی تھی۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا انہیں یہ مرتبہ کس عمل کی بدولت ملا جبریل علیہ السلام نے کہا یہ "قل ہو اللہ احد" کو محبوب رکھتا تھا اور اٹھتے بیٹھتے آتے جاتے ہر وقت اسے پڑھتا رہتا تھا۔

غائب پر نمازِ جنازہ پڑھنے میں فقہاء اختلاف رکھتے ہیں امام شافعی واحمد فرماتے ہیں کہ غائب پر نماز جنازہ مطلقاً سنت ہے اور امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہم اللہ مطلقاً منع کرتے ہیں اور بعض اس طرح تفصیل بیان کرتے ہیں کہ میت اگر ایسے شہر میں ہے جہاں کوئی نماز پڑھنے والا نہیں ہے تو نماز غائبانہ پڑھیں اور اگر نماز پڑھنے والے ہیں تو فرض ساقط ہو جاتا ہے اب اس نماز غائبانہ کی حاجت و ضرورت نہیں اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا جواز اسی دن میں ہے جس دن وہ مرا ہے یا اس کے دوسرے روز، مگر اس کا طول طویل زمانہ تک جواز نہیں ہے۔

اور احناف اور مولکیہ جو مطلقاً منع کے قائل ہیں نجاشی کے قصہ کا جواب یہ دیتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے نجاشی کا جنازہ عیاں کر دیا گیا تھا اور درمیان سے تمام حجابات اٹھا دیئے گئے تھے۔ یا جنازے ہی کو لا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے رکھ دیا گیا ہوگا۔ اور تمام مسافت کو دور کر دیا گیا ہوگا۔ اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نماز پڑھی تو اسے ملاحظہ فرما رہے تھے مگر صحابہ رضی اللہ عنہم اس جنازہ کو نہیں دیکھ رہے تھے تو یہ ایسی صورت بن گئی کہ امام تو جنازہ کو دیکھتا ہے اور مقتدی و قوم جنازہ کو نہیں دیکھ رہے ہوتے۔ اس صورت میں بھی بالاتفاق جائز ہے نیز لیثی کے جنازے میں بھی ایسی صورت واقع ہوئی ہوگی اور بعض کہتے ہیں کہ یہ محض نجاشی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور یہ معاویہ لیثی رضی اللہ عنہ کے قصہ سے خصوصیت جاتی رہی۔ اور یہ بھی مروی ہے کہ جعفر بن ابی طالب اور زید بن حارثہ اور عبداللہ بن ارواحہ رضی اللہ عنہم کی نمازِ جنازہ پڑھی جو کہ غزوۂ موتہ میں شہید ہوئے تھے۔

افادہ: امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک جنازۂ غائب پر مطلقاً نماز جائز نہیں ہے اور ائمہ حنفیہ کا اس کے عدم جواز پر اجماع واتفاق ہے۔ اس کی علت ایک تو یہ ہے کہ مرنے والا شخص اگر بلاد اسلام میں فوت ہوا ہے تو یقیناً وہاں کے اہلِ اسلام نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھی ہوگی اور دوسری جگہ اس کے بعد ہی خبر پہنچے گی اس طرح نمازِ جنازہ کی تکرار لازم آئے گی حالانکہ کسی میت پر دو دفعہ نماز پڑھنا جائز نہیں۔ البتہ اگر ولی آئے تو یہ اس کا حق ہے۔ کوئی اور شخص اس کا حق ساقط نہیں کر سکتا۔ جب ولی نے نماز ادا کر لی تو اگر دوبارہ پڑھیں تو نفل ہوگی اور یہ نماز بطور نفل جائز نہیں ہے چنانچہ ہدایہ، کافی شرح وافی للامام الاجل ابی البرکات النسفی، جوہرہ نیرہ، درر شرح ملتقی الابحر، مستخلص الحقائق، شرح کنز للاتقانی، کبیر علی امینہ میں ہے "اَلْفَرْضُ يَتَأَدّٰى بِالْاَوَّلِ وَالتَّنَفُّلُ بِهَا غَيْرُ مَشْرُوْعٍ" اور تبیین میں اتنا زیادہ ہے "وَلِهٰذَا لَا يُصَلِّيْ عَلَيْهِ مَنْ صَلّٰى عَلَيْهِ مَرَّةً" فرض تو پہلی نماز سے ادا ہو جاتا ہے اور یہ نماز نفلی طور پر جائز نہیں ہے اور علامہ شرنبلالی مراقی الفلاح میں فرماتے ہیں کہ "اَلتَّنَفُّلُ بِصَلٰوةِ الْجَنَازَةِ غَيْرُ مَشْرُوْعٍ" دوسری علت یہ ہے کہ غائب کی نماز جنازہ اس

بنا پر بھی ناجائز ہے کہ فتح القدیر، حلیہ، غنیہ، شلبیہ، بحرالرائق وغیرہ کتب فقہیہ حنفیہ میں ارکان نماز جنازہ کے سلسلے میں ہے کہ:
"وَشَرْطُ صِحَّتِهَا اِسْلَامُ الْمَيِّتِ وَطَهَارَتُهُ وَوَضْعُهُ اَمَامَ الْمُصَلِّيْ فَلِهٰذَا الْقَيْدِ لَا تَجُوْزُ عَلٰى غَائِبٍ۔" یعنی نماز جنازہ کے صحت کی شرط یہ ہے کہ میت مسلمان ہو، جنازہ نمازی کے آگے زمین پر رکھا ہو۔ اس شرط کے سبب کسی غائب کی نماز جنازہ جائز نہیں ہے۔ اس لئے ہمارے علماء نے فرمایا کہ مطلقاً کسی غائب پر نماز جنازہ جائز نہیں ہے چونکہ متن تنویر الابصار میں ہے۔ جنازہ کا نمازی کے سامنے حاضر ہونا صحت نماز جنازہ کی شرط ہے۔ غائب چونکہ جنازہ نمازی کے آگے نہیں ہوتا للذا کسی غائب پر نماز جنازہ صحیح نہیں۔ مفصل تصریحات فقہ حنفیہ کی کتابوں میں ملاحظہ فرمائیں۔(از مترجم)

اور قبر کو اونچا نہ بناتے اور اسے اینٹ پتھر وغیرہ سے پختہ تعمیر نہ کرتے اور اسے قلعی یا سخت مٹی سے نہ لیپتے۔ قبر کے اوپر کوئی عمارت وقبہ نہ بناتے اور یہ سب بدعت ومکروہ ہے ایسا ہی سفر السعادۃ میں ہے۔ مطالب المومنین میں کہا گیا ہے کہ سلف مباح جانتے ہیں کہ مشہور علماء ومشائخ کی قبروں پر قبے تعمیر کئے جائیں تاکہ لوگ زیارتیں کریں اور ان میں استراحت کریں اور اس کے سایہ میں بیٹھیں۔ اسے مفاتیح شرح مصابیح سے نقل کیا گیا ہے اور کہا کہ میں نے بخارہ میں ایسی قبروں کو دیکھا ہے جن کو تراشی ہوئی اینٹوں سے بنایا گیا ہے اور اسے اسمٰعیل زاہد نے جو کہ مشاہیر فقہاء میں سے ہیں جائز رکھا ہے۔ (انتہٰی)

اور بعض اہل علم جن میں سے حضرت حسن بصری بھی ہیں قبروں کو گوندھی مٹی سے بنانے کی اجازت دیتے ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ بھی اسی پر ہیں۔ اور قبروں پر چلنے اور اس پر بیٹھنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ چنانچہ مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبرستان میں ایک شخص کو جوتے پہنے چلتے ملاحظہ کیا تو فرمایا اپنی جوتیوں کو اتار دو۔

مسلم، ترمذی اور ابو داؤد، ابوالمنہاج اسدی سے روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے سیدنا علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ میں تمہیں اس اجازت کے ساتھ بھیجتا ہوں جس اجازت کے ساتھ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا تھا۔ فرمایا جاؤ کسی تصویر کو مٹائے بغیر نہ چھوڑنا اور کسی اونچی قبر کو پست کئے بغیر نہ چھوڑنا اور قبر اتنی اونچی اور بلند ہونی چاہئے کہ وہ زمین سے ممتاز رہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر انور اور آپ کے دونوں صحابہ وخلفاء رضی اللہ عنہما کی قبریں بھی زمین کے برابر ہیں۔ اور سرخ سنگریزے اس پر چسپاں ہیں۔ نیز حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فرزند حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی قبر پر پانی چھڑکا اور اس پر چند سنگریزے رکھے۔ اور صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جب حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو دفن کیا (یہ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں مہاجرین میں سب سے پہلے انتقال فرمانے والے ہیں) تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بھاری پتھر اٹھایا اور ان کی قبر پر رکھ دیا۔

حدیث صحیح میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہودیوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا اور ان عورتوں پر خدا کی لعنت ہو جو قبروں کی زیارت کو جاتی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ منع ولعنت ابتدائے عہد میں تھا اور رخصت کے بعد عورتیں بھی داخل ہیں اور ان کیلئے یہ ممانعت ان کی کم صبری اور بکثرت رونے پیٹنے کی وجہ سے ہے۔

قبروں پر چراغ جلانا بھی ممنوع ہے مگر یہ کہ اس کی روشنی میں کام کیا جائے یا اس کے قریب چلنے والے آتے جاتے ہوں۔ اور قبر کے مواجہ میں نماز پڑھنا مکروہ ہے اور بعض قبرستان میں بھی مکروہ جانتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ کریمہ یہ تھی کہ گزرے ہوؤں کی زیارت اس لئے کرتے تھے کہ آپ دعا وترحم اور استغفار فرمائیں اور حدیث صحیح میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل بقیع کی زیارت کرنے کا حکم فرمایا تاکہ ان کیلئے دعا واستغفار کریں۔ اور یہ حکم شب برائت یعنی نصف شعبان کی رات میں ہوا تھا جیسا کہ گزر چکا ہے۔ اور ایسی زیارت جو معنی وغرض کیلئے

ہواور اس میں کسی بدعت و کراہت کے ارتکاب کی راہ نہ ہو تو یہ زیارت مسنون و مستحب ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی اپنے والدین کی یا ان میں سے کسی ایک کی ہر جمعہ کے دن زیارت کرے گا حق تعالیٰ اس کو بخش دے گا اور اسے نیک بخت لکھے گا۔ اور والدین کیلئے استغفار و صدقہ و خیرات کرنے کے سلسلے میں بھی یہی حکم ہے۔

اور فرمایا جب قبرستان کو دیکھو تو کہو۔ "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الدِّیَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَاِنَّا اِنْشَاءَ اللّٰہُ بِکُمْ لَاحِقُوْنَ۔ " نیز حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ کے قبرستان کی طرف تشریف لائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی جانب رخ انور کر کے فرمایا۔ "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا اَھْلَ الْقُبُوْرِ یَغْفِرُ اللّٰہُ لَنَا وَلَکُمْ اَنْتُمْ سَلَفُنَا وَنَحْنُ بِالْاَثَرِ۔ " نیز اخبار و آثار میں ہے کہ آیۃ الکرسی گیارہ بار سورۂ اخلاص، معوذتین، سورۂ یٰس اور سورۂ تبارک پڑھے۔ اور یہ عادت شریفہ نہ تھی کہ میت کیلئے جمع ہوتے اور ختم وغیرہ پڑھتے نہ قبر پر اور نہ کسی اور جگہ، یہ سب بدعت (حسنہ) ہیں۔ ہاں اہل میت کی تعزیت کیلئے جمع ہونا اور صبر و تسلی کی انہیں تلقین کرنا سنت و مستحب ہے لیکن یہ اجتماعات خصوصاً تیسرے روز اور دیگر رسومات وغیرہ اور بغیر وصیت کے یتیموں کے اموال کو خرچ کرنا وغیرہ بدعت ہے۔ اور بعض حرام ہیں۔ تعزیت کی حد تین دن ہے اس کے بعد مکروہ ہے۔ اور بعض سات دن تک بھی جائز رکھتے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ حاضر میت کی تعزیت تین دن اور غائب میت کی تعزیت ایک دن ہے۔ ایک مرتبہ کے بعد نہ کرے جیسا کہ امام اعظم رحمہ اللہ سے روایت کیا گیا ہے۔ اور قبر کے سرہانے قرآن کریم پڑھنے میں اختلاف ہے مگر یہ کہ بوقت زیارت پڑھا جائے۔ لیکن قبر کے گرداگرد جو بیٹھتے ہیں اور اس کے سرہانے پڑھتے ہیں یہ مکروہ ہے اور شیخ ابن الہمام شرح ہدایہ میں فرماتے ہیں کہ قاریوں کے بٹھانے میں تاکہ قبر کے پاس پڑھیں اس میں اختلاف ہے لیکن مختار عدم کراہت ہے (واللہ اعلم)

اور یہ معروف نہ تھا کہ اہلِ میت ان لوگوں کے لئے جو تعزیت کیلئے آئیں کھانا کھلائیں۔ اور بعض کتب فقہ میں ہے کہ اگر تہائی مال تک ان لوگوں پر خرچ کریں جو دور سے آئے ہیں اور زیادہ عرصے تک ٹھہریں تو جائز ہے اور ان لوگوں پر جو اقربائے میت اور اس کے ہمسائے ہیں خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ اہل میت کیلئے کھانا بھیجیں کیونکہ مصیبت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے وہ معذور ہوتے ہیں اور انہیں کھانا پکانے اور اس کا انتظام کرنے کی فرصت نہیں ہوتی جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ جعفر رضی اللہ عنہ کے گھر والوں کیلئے کھانا تیار کرو کیونکہ ایسی مصیبت درپیش ہے جس کی وجہ سے وہ معذور و مجبور ہیں۔ اور اس کھانے کو غیر اہل میت کے کھلانے میں اختلاف ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ جو لوگ میت کی تجہیز و تکفین اور اس کے دفن میں مصروف ہوں ان کو بھی کھلانا جائز ہے۔

سنن رواتب و مؤکدہ: اس جگہ سنن رواتب سے مراد وہ غیر فرائض نمازیں ہیں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دن رات میں بطریق عبادت ادا فرماتے تھے زیادہ تر ان میں سے مؤکدہ اور غیر مؤکدہ ہیں اس لئے کہ عصر سے پہلے کی چار رکعتوں کو رواتب میں تو ذکر کرتے ہیں لیکن ان کو مؤکدات میں شمار نہیں کرتے اس کے باوجود بعض علماء ان پر اطلاق مواظبت، بر رواتب کرتے ہیں لہٰذا یا تو مواظبت کو تاکید کے زیادہ عام معنی پر محمول کرتے ہیں یا عصر کی چار رکعتوں کو بھی مؤکدات میں سے جانتے ہیں۔ اگرچہ دیگر مؤکدات میں اسے کمتر خیال کرتے ہوں اور تمام مؤکدات ایک مرتبہ میں نہیں جیسا کہ معلوم ہوا لیکن یہ بات مشہور کے خلاف ہے اور رواتب میں دوام کے معنی معتبر ہیں۔ اور یہ رتوب سے ماخوذ ہے جس کے معنی دوام و ثبوت کے ہیں۔

لیکن ظہر کی سنتیں رواتب میں ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے دو رکعت فرض ظہر سے پہلے اور دو رکعت اس کے بعد مروی ہے۔ اور یہی مذہب شافعی کا ہے اور امیر المومنین سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے سنن رواتب میں چار رکعت، فرض ظہر سے پہلے

اور دو رکعت اس کے بعد مروی ہے اسی پر اکثر اہل علم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے تابعین کا عمل ہے اور یہی قول سفیان ثوری، ابن مبارک اور اسحٰق کا ہے۔ اور یہی مذہب امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث سے ہے وہ فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی چار رکعت کو فرض ظہر سے پہلے ترک نہیں فرمایا لہٰذا یہ اس بنا پر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چار رکعت سنت کو گھر میں ادا فرماتے۔ اور جب مسجد میں گزارتے تو دو رکعت پڑھتے اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض روایتوں میں ایسا آیا ہے۔ یا یہ کہ کبھی چار پڑھتے اور کبھی دو۔ اس لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے جو دیکھا اسے بیان کر دیا۔ دونوں حدیثیں صحیح ہیں۔ اور ان میں سے کوئی مطعون نہیں ہے۔ نیز حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زوال کے بعد چار رکعت پڑھ کر فرماتے اس وقت آسمان کے دروازے کھلتے ہیں۔ اور میں پسند کرتا ہوں کہ اس وقت میں میرا عمل صالح صعود کرے لہٰذا بعض علماء ظہر کے قبل کی سنتوں کو اسی پر محمول کرتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ ایک مستقل نماز ہے جو ظہر کی سنتوں کے سوا ہے جسے آپ زوال کے فوراً بعد پڑھتے تھے اور اسے صلوٰۃ فی الزوال کہتے ہیں۔ اکثر حالتوں میں اسے گھر میں ہی پڑھتے تھے اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ زوال کے بعد آٹھ رکعت پڑھتے اور فرماتے کہ یہ آٹھ رکعت قیام لیل کی آٹھ رکعت کی برابری کرتی ہیں۔ اور یہ دو وقت یعنی وقت زوال اور وقت تہجد، نزول رحمت کے وقت ہیں اس لئے کہ رحمت کے دروازے بعد از زوال کھلتے ہیں۔ یہ وقت آدھے دن کے بعد ہے۔ اور رات میں نزول رحمت کا وقت آدھی رات کے بعد ہے۔ اس طرح دونوں وقتوں کے درمیان مناسبت ظاہر ہوئی اور ایک وقت کی نماز، فضل میں دوسرے وقت کی عدیل و ہم پلہ ہے اور چونکہ نزول رحمت، وقت سحر میں زیادہ مشہور و ظاہر تھا تو وقت زوال کی نماز کو اس کا عدیل بنایا اور اس کے ساتھ مشابہت دی۔

امیر المومنین سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ زوال کے بعد ظہر سے پہلے کی چار رکعتوں کو نماز سحر کی مانند شمار کیا جاتا ہے اور ہر ایک شے حق تعالیٰ کیلئے اس وقت سجدہ کرتی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اس آیت کریمہ کو پڑھا یَتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِلّٰهِ یعنی اللہ کے سجدے کیلئے داہنے اور بائیں سائے ڈھلتے ہیں۔

شیخ ابن الہمام، سنن سعید بن منصور سے حضرت براء بن عازب کی روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے نماز ظہر سے پہلے چار رکعت پڑھی گویا اس نے تہجد کی چار رکعت شب میں پڑھی اور جس نے اس کی مانند بعد نماز عشا گزاری گویا کہ اس نے شب قدر میں پڑھی اور نماز ظہر کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم دو رکعت ادا فرماتے یہ دو رکعتیں سفر و حضر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فوت نہ ہوئیں۔ بس ایک مرتبہ مال کی تقسیم میں انہماک اور مصروفیت کی وجہ سے فوت ہوئی تھیں پھر اس کی قضا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد عصر فرمائی جیسا کہ بخاری میں آیا ہے اور مشکل یہ ہے کہ حدیث صحیح میں یہ بھی آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بعد نماز عصر ہمیشہ اس جہان سے تشریف لے جانے کے وقت تک دو رکعت پڑھتے تھے اور مروی ہے کہ دو نمازیں ایسی تھیں جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر و حضر میں ترک نہیں فرمایا ایک فرض فجر سے پہلے دو رکعت، دوسری بعد نماز عصر دو رکعت۔ ان نمازوں کو ہمیشہ پڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ رب العزت سے ملاقی ہوئے اور اس باب میں بطرق متعددہ احادیث مروی ہیں اور ان میں سب سے زیادہ صریح عصر کی سنتیں ہیں اب اس کے سوا خلاصی کی کوئی صورت ممکن نہیں کہ کہا جائے کہ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے تھیں۔ اور دوسروں کے حق میں مکروہ جیسا کہ ابو داؤد کی روایت میں آیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بعد عصر دو رکعت پڑھا کرتے اور دوسروں کو اس سے منع فرمایا کرتے۔ اور صوم وصال رکھا کرتے اور دوسروں کو اس سے منع فرمایا کرتے

تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ ان دو رکعتوں کو اپنے کاشانہ اقدس میں ادا کرتے اور تخفیف امت کی خاطر مسجد میں ادا نہ فرماتے تھے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کی سہولت و آسانی بہت محبوب تھی۔

ظہر کے بعد بھی چار رکعتیں مروی ہیں۔ مسند امام احمد اور سنن نسائی و ترمذی میں مروی ہے کہ جس نے ظہر سے پہلے کی چار رکعت اور اس کے بعد کی چار رکعت کی محافظت کی حق تعالیٰ اس پر آتش دوزخ حرام فرمائے گا۔ اور شیخ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ اس زمانے کے علماء اختلاف کرتے ہیں کہ یہ چار رکعتیں ان دو راتبہ رکعتوں کے ماسوا ہیں یا انہیں میں سے ہیں اور دوسری تقدیر کی صورت میں آیا ہے کہ ان کو ایک سلام سے ادا کر سکتا ہے یا نہیں۔ میرے نزدیک واضح ہے کہ اگر کوئی ظہر کے بعد کی چار رکعتوں کو ایک سلام سے گزارے یا دو سلام سے تو عدد مذکور حاصل ہو جاتا ہے خواہ اسے راتبہ شمار کیا جائے یا نہیں۔ اس لئے کہ حدیث کا مفاد یہ ہے کہ ظہر کے بعد چار رکعتیں پڑھی جائیں اور ان کے راتبہ ہونے کیلئے یہ صادق ہے انتہی۔

بندۂ مسکین عفا اللہ عنہ صاحب مدارج رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ یہ چار رکعتیں ظہر کے بعد دو رکعت کے ماسوا ہیں جیسا کہ عشاء کے بعد ہیں اور اس پر مشائخ کا عمل ہے کہ ایک سلام سے پڑھی جائیں۔ (واللہ اعلم)

رہیں عصر کی سنتیں، تو امیر المومنین سیدنا حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے فرمایا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عصر سے پہلے دو رکعت پڑھا کرتے تھے۔ (رواہ ابو داؤد) نیز انہیں سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عصر سے پہلے چار رکعت پڑھتے تھے اور ان کے درمیان مقرب فرشتوں اور مسلمان فرماں برداروں پر سلام بھیج کر فصل فرماتے تھے اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحمت کرے جس نے عصر سے پہلے چار رکعتیں پڑھیں اس حدیث کو مسند احمد و ترمذی اور ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ اور ابن خزیمہ اور ابن حبان اپنی اپنی صحیح میں روایت کرتے ہیں۔ روایتوں میں ان اختلافات کی وجہ سے مذہب حنفی میں اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے چار رکعت پڑھے چاہے دو رکعت۔ دونوں حدیثوں کو جمع کرنے کی خاطر۔ لیکن چار افضل ہے جیسا کہ اصول فقہ کی کتابوں میں محقق ہے۔

لیکن مغرب کی سنتیں، تو اس کے بعد دو رکعتیں ہیں۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا میں نے جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے اس کو بتمامہ بیان نہیں کر سکتا۔ صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ مغرب کے بعد کی دو رکعتوں میں اور فجر سے پہلے کی دو رکعتوں میں "قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ" پڑھا کرتے تھے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا اور کبھی قرأت کو طوالت دے دیتے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کے بعد کی دو رکعتوں میں قرات کو اتنا طول دیا کہ مسجد کے تمام لوگ چلے گئے اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ اور عشاء کی سنتوں میں بھی دو رکعت بعد فرض عشاء ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر تشریف لا کر ہمیشہ چار رکعت یا چھ رکعت کے بغیر عشاء نہ پڑھتے۔ اسے ابو داؤد نے روایت کیا اور یہ دو رکعتیں، ظہر کے بعد کی چار رکعتوں کی مانند ہیں۔ جو دو رکعتوں کے ساتھ چھ ہو جاتی ہیں۔ اور مسلم کی حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کو لوگوں کے ساتھ پڑھتے اس کے بعد میرے گھر میں تشریف لا کر دو رکعت پڑھتے۔ لیکن عشاء سے پہلے چار رکعت کا پڑھنا احادیث میں نظر نہیں آتا۔ اور اہل حرمین کا عمل ان کے نہ پڑھنے پر ہے۔ اور کتب فقہ میں اسے مستحب قرار دیا ہے (واللہ اعلم)

سفر السعادۃ میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام سنن درواتب کو گھر میں پڑھا کرتے۔ نیز آپ ایسا کرنے کی ترغیب دیتے اور فرماتے مجھے اس کی نماز زیادہ محبوب ہے جو فرض نماز کے بعد اپنے گھر جا کر نماز پڑھے بالخصوص مغرب کی دو رکعت سنت اسے کبھی بھی

مسجد میں نہ ادا فرمایا۔

گھر میں ان سنتوں کو پڑھنے کی ترغیب دینا اور اس کی تاکید فرمانے کی وجہ سے بعض علماء کہتے ہیں کہ اگر کسی نے ان سنتوں کو مسجد میں پڑھا تو وہ اس سنت کے مسنون طریقہ پر واقع نہ ہونے کی بنا پر اس کے ثواب کا مستحق نہ ہوگا۔ اور امام مروزی فرماتے ہیں کہ سنت کی مخالفت کی وجہ سے گناہگار ہوتا ہے۔ اور حکم، حکم ہی ہے۔ کیونکہ فرمایا: "اِجْعَلُوْهَا فِيْ بُيُوْتِكُمْ" انہیں گھروں میں پڑھو اور ہمارے اکثر علماء کے نزدیک وہ مستحق ثواب ہوگا۔ لیکن مخالفت فعل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے اولیٰ ہی افضل ہے۔ اور حکم استحباب کیلئے ہے نہ کہ وجوب کے لئے اور ان دو رکعتوں کے ادا کرنے کیلئے جلدی کھڑے ہو جاتے۔ اور فرماتے ہیں کہ فرشتے اس انتظار میں رہتے کہ اسے بھی ساتھ لے جائیں اور فرمایا۔ "مَنْ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْمَغْرِبِ قَبْلَ اَنْ يَتَكَلَّمَ رُفِعَتْ صَلٰوتُهٗ فِيْ عِلِّيِّيْنَ" جس نے مغرب کے بعد بات کرنے سے پہلے دو رکعتیں پڑھیں تو اسکی نماز علیین میں اٹھائی جاتی ہے۔ سنت فجر کی اس حد تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محافظت و تاکید کی تھی کہ سفر میں بھی اس پر مواظبت فرماتے اور یہ مروی نہیں ہے کہ سنت فجر کے سوا کوئی اور سنن رواتب پڑھی ہوں اور بعض روایتوں میں دو رکعت سنت ظہر کے بارے میں بھی ہے اور بعض کے نزدیک سنت فجر واجب ہے۔ جس طرح کہ وتر واجب ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ سنت فجر ابتدائی عمل ہے اور وتر آخری عمل، لامحالہ ان کی رعایت و اہتمام دونوں میں معروف ہوئی ہیں بغیر عذر کے ان کو بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں ہے۔

سنتوں میں سب سے زیادہ قوی سنت فجر ہے۔ اس کے بعد سنت مغرب۔ اس کے بعد ظہر کی سنت اس کے بعد عشاء کے بعد کی سنت، اس کے بعد قبل ظہر کی سنت۔ بعض کہتے ہیں قبل از ظہر کی سنتیں بعد از ظہر کی سنتوں کی مانند ہیں مرتبہ میں اور ان کا مرتبہ بعد از سنت فجر ہے۔ اسے شمنی نے بیان کیا۔

تنبیہہ: عام لوگوں میں متعارف ہے کہ ظہر کے بعد کی سنتوں کے بعد اور مغرب و عشاء کے بعد کی دو رکعت سنتوں کے بعد، دو رکعت نفل پڑھتے ہیں اس کی وجہ معلوم نہیں ہوتی مگر ظہر و عشا میں چونکہ ان کے بعد چار رکعتیں مروی ہیں اور بعض روایتوں میں سنت کے ساتھ اور بعض میں بغیر سنت کے۔ تو کاش کہ چار رکعت گزاریں تاکہ چھ سنت کے ساتھ شامل ہو جائے لیکن ان کو بیٹھ کر پڑھنا ندرت و غرابت سے خالی نہیں ہے جیسا کہ عام لوگ بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔

نوع سوم در زکوٰۃ

زکوٰۃ کے لغوی معنی نمو، افزونی اور طہارت و پاکی کے ہیں: "زَكَى الزَّرْعُ اِذَا نَمَا" (کھیتی کو جب بڑھتی ہے تو چھانٹتے ہیں) کا مقولہ مشہور ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "تُزَكِّيْهِمْ اَيْ تُطَهِّرُهُمْ" اور شریعت میں زکوٰۃ کے معنی، مال پر سال کے گزر جانے کے بعد حاجتِ اصلیہ کے سوا، صاحب نصاب کو ادائے حق کے وجوب کے ہیں اور نفس مال واجب پر بھی بولا جاتا ہے اور زکوٰۃ، مال کی زیادتی اور اس کے اچھے اور پاک ہونے کا موجب ہوتی ہے اور صاحبِ مال کے اجر میں زیادتی اور اسے برائی و گناہ کے میل سے پاک و صاف کرنے کا سبب اور باعث ہوتی ہے اور بعض نے زکوٰۃ کو تزکیہ سے ماخوذ مانا ہے۔ جس کے معنی مشاہدہ کرنے کے ہیں۔ کیونکہ یہ صاحب زکوٰۃ کا تزکیہ کرتی ہے اور اس کے صحت ایمان کی شہادت دیتی ہے زکوٰۃ کو صدقہ بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ صاحب صدقہ کے دعویٔ ایمان کی صحت میں اس کے صدق پر دلیل ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ زکوٰۃ کا وجوب ہجرت کے بعد ۲ ہجری میں وجوب صوم رمضان سے پہلے یا اس کے بعد ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کریمہ زکوٰۃ اور دیگر صدقات میں مثلاً عشر وغیرہ میں فقراء کی مراعات تھی۔ چنانچہ

نصیحت فرماتے اور ترغیب دیتے کہ اسے دیانت وامانت، ذوق وشوق اور بغیر محنت ومشقت کے مستحقین کو پہنچایا جائے اور انہیں بغیر احسان جتلائے دے۔ اور خود کو مستحق ستائش بنائے بغیر دینا چاہئے اور قریبی خاندان کی عورتیں اس کی زیادہ مستحق ہیں کیونکہ مردوں کی بہ نسبت ان کی ضرورتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ اور عاملوں اور مال زکوٰۃ وصول کرنے والوں کو بھی نصیحت فرمائی ہے کہ وہ صاحبان مال پر حد سے تجاوز اور ظلم وزیادتی نہ کریں اور کھرے مال کا انتخاب اور مقدار فرض سے زیادہ کا مطالبہ نہ کریں۔ اور ہدیئے اور ضیافتیں قبول نہ کریں اور مال کی کثرت، سال گزر جانے کی شرط جو کہ نرمی وآسانی کی دلیل ہے اس وجہ سے ہے کہ یہ حضور اکرم ﷺ کی رعایت، حکمت اور آپ کے انصاف کا تقاضا ہے کیونکہ زکوٰۃ کو ان چار قسموں پر واجب قرار دیا ہے جو لوگوں میں بیشتر اور ان میں ان کی حاجتیں بہت زیادہ ہیں اور ان کا رواج ان میں بکثرت ہے تاکہ انہیں زکوٰۃ دینے میں آسانی ہو اور آسانی کے ساتھ لے کر مستحقین اپنی ضرورتیں پوری کر سکیں۔ مال کی پہلی قسم، کھیتی اور پھل ہیں مثلاً کھجور اور انگور ومنقے وغیرہ۔ ترکاریوں اور سبزیوں پر نہیں ہے کیونکہ یہ تھوڑے زمانہ میں خراب ہو جاتی ہیں۔ دوسری قسم مال کی، جانور اور چوپائے ہیں جیسے اونٹ، گائے، بھینس اور بکری وغیرہ اور تیسری قسم مال کی، سونا چاندی ہے کیونکہ اہل جہاں کی تجارت اور معاشی زندگی ان کو ثمنیت اور ان کے سکے وغیرہ سے وابستہ ہے۔ اور چوتھی قسم، مال تجارت ہے خواہ کسی قسم کا ہو۔ مثلاً کپڑے، برتن، بچھونے اور تمام ساز وسامان وغیرہ اور ان تمام اموال کی قسموں میں زکوٰۃ ہر سال ایک مرتبہ مقرر فرمائی ہے۔ اور کھیتوں اور پھلوں کی زکوٰۃ ان کے کاٹنے اور توڑنے کے وقت مقرر فرمائی۔ جب وہ اپنے تمام وکمال کو پہنچ جائیں کیونکہ یہی وقت غلہ کے حاصل ہونے کا ہے اور اس میں بھی حد درجہ عدل وانصاف کی رعایت ہے۔ سال بھر نرخوں میں جو اختلاف اور قیمتوں میں تغیر وتبدل ہوتا ہے اور یقینی طور پر مال میں کمی وبیشی ہوتی رہتی ہے ان تمام مرحلوں کے بعد جو منفعت حاصل ہو اور مال میں کثرت ہو اس پر زکوٰۃ ہے اور غلے اور پھلوں کی کٹائی وتوڑنے کا وقت جو کہ اس کے کمال کا وقت ہے۔ ادائیگی زکوٰۃ میں سب سے زیادہ آسان وقت ہے اور مستحقین کی رعایت بھی مقصود ہے کہ مبادا کھیتی اور پھلوں کے کاٹنے اور توڑنے میں دیر ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ کی ادائیگی میں سستی راہ پائے اور ادا کرنے میں دشواری ہو۔ اور صاحب مال کی رعایت انصاف میں سے یہ ہے کہ صاحب مال کو حصول مال میں جیسی محنت ومشقت یا سہولت وآسانی برداشت کرنی پڑتی ہے اسی اندازے کے مطابق مقدار واجب میں تفاوت رکھا ہے۔ اسی وجہ سے وہ مال جو بغیر محنت ومشقت اور کدوکاوش کے حاصل ہوتا ہے۔ جیسے دفینہ یا کانی معدنیات وغیرہ جو خود بخود پیدا ہوتے ہیں ان میں زکوٰۃ کا پانچواں حصہ مقرر فرمایا ہے۔ اور اسے سال گزرنے پر موقوف نہ رکھا۔

اور وہ مال جس کے حصول میں کسی قدر مشقت ومحنت ہے اگرچہ زیادہ مشقت نہیں ہے مثلاً کھیتی اور پھل جو کہ بارش کے پانی سے حاصل ہوتا ہے ان میں عشر واجب فرمایا اور جو محنت ومشقت کی زیادتی کے محتاج ہوں جیسے وہ کھیتی اور پھل جن کو رہٹ اور ڈول سے سیراب کیا جاتا ہے اور اونٹ وغیرہ سے پانی نکالا جاتا ہے۔ ان میں نصف عشر مقرر فرمایا اور جو اموال اس کے محتاج ہیں کہ ان کیلئے ہمیشہ سفروں کی مشقتیں اور دریاؤں کے عبور اور عالم کے دور دراز علاقوں میں جانے کی ضرورت پڑتی ہے تو ان میں چالیسواں حصہ مقرر فرمایا لازمی ہے کہ ان اعداد کی تقرری میں بھی اسرار ہوں گے جسے بجز شارع علیہ السلام کے علم کے دوسرا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا اور ہر مال کی قسم میں بحسب مصلحت حال اور ایسی حکمت کے جس کو علم شارع کے سوا کوئی نہیں جان سکتا، ہر ایک کیلئے ایک نصاب مقرر فرمایا۔ نصاب کے لغوی معنی اصل ومرجع کے آتے ہیں اور ہر چیز کا نصاب وہ ہوتا ہے جب وہ چیز اپنے مرتبہ کمال کو پہنچ کر تمام ہو جائے اور وہ خاص اثر وحکمت جو اس پر مرتب کیا گیا ہے پورا ہو جائے۔ نصاب زکوٰۃ، مال کا ایک اندازہ اور تخمینہ ہے کہ جب اس حد پر پہنچ جائے تو شرع شریف میں زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے۔

چنانچہ سونے چاندی کا نصاب یہ ہے کہ چاندی جب ساڑھے باون تولہ کو پہنچ جائے اور سونا جب ساڑھے سات تولہ کو پہنچ جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے۔ اور غلے اور پھلوں میں نصاب پانچ وسق ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ آٹھ سو من شرعی وزن ہے۔ اور ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے۔ (اور ایک صاع ہمارے ملک میں تین سو اکیاون تولہ کا ہوتا ہے۔ مترجم)

اور گوسفند میں چالیس، گائے بھینس میں تیس اور اونٹ میں پانچ عدد نصاب ہے۔ اور مقدار نصاب زکوٰۃ کی تعیین میں اصل و مدار، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب یعنی فرض قرار دینا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین کا اس پر عمل ہے اور ان کے بعد اس پر امت کا اجماع ہے اور یہ مقادیر و اعداد، منتہی بعلم شارع اور وحی آسمانی ہے ان کے تمام مسائل و تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہیں اس جگہ اتنے پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے اور جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی مال زکوٰۃ لاتا تو حضور بحکم نص قرآنی اس کیلئے دعائے خیر فرماتے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے۔ "خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ" آپ ان کے صدقہ کا مال لے کر انہیں پاک و ستھرا بنائیں اور ان کیلئے دعائے خیر فرمائیں۔ صلوٰۃ کے اس جگہ معنی دعا کے ہیں اور دعا میں بھی لفظ صلوٰۃ کو مستعمل کریں تو لفظ منصوص سے زیادہ موافق و انسب ہو گا۔ چنانچہ فرمایا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى اٰلِ اَبِىْ اَوْفٰى اور اسی قبیل سے وہ دعا ہے جو بعض حدیثوں میں مذکور ہوئی ہے کہ فرمایا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ کیونکہ وہ صدقہ کو بروجہ مطلوب و مرغوب لاتے تھے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ کوئی اپنے صدقہ کو واپس لے اور فرمایا صدقہ کو واپس لینے والا اس کتے کے حکم میں ہے جو اپنی قے کو کھاتا ہے اور یہ کراہت بر تقدیر ملک اختیاری ہے۔ مثلاً بیع و ہبہ۔ لیکن اگر میراث سے پہنچے تو کراہت نہیں ہے۔ اس لئے کہ وراثت کی ملکیت میں اختیار کو کوئی دخل نہیں ہے۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صدقے کے اونٹوں کو اپنے دست مبارک سے داغ دیتے۔ اور غالباً یہ داغ کان پر دیتے تھے اور جانوروں کے داغنے کے بارے میں بھی علماء کا اختلاف ہے صحیح یہ ہے کہ اگر اس میں کوئی مصلحت ہو جیسے علامت قرار دینا یا تمیز پیدا کرنا تاکہ مخلط نہ ہو جائیں تو جائز ہے اور جانوروں کے داغنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صدقہ کے اونٹوں کو داغ دینا حجت ہے لیکن ضروری ہے کہ داغ چہرے پر نہ دے۔ کیونکہ اس سے منع کیا گیا ہے۔ اور انسان کو بغرض علاج داغ دینے میں بھی یک گونہ اختلاف ہے اور صحیح حرمت و کراہت ہے مگر بقول طبیبِ حاذق جب اس میں ہی علاج منحصر ہو اس وقت یہ حکم نہیں ہے۔ لیکن ایسا دشوار ہے اس مسئلہ کی تحقیق اپنے مقام میں کی گئی ہے۔

اور صدقہ فطر ہر مسلمان مرد و عورت، آزاد و غلام اور چھوٹے بڑے پر واجب ہے غلام اور بچے پر واجب ہونے کا مطلب، آقا اور باپ پر واجب ہونا ہے اور امام مالک کے مذہب میں صدقہ فطر کے واجب ہونے کی شرط یہ ہے کہ صاحبِ نصاب ہو اور حاجتِ اصلی سے یعنی کپڑے مکان اور خادم و قرض سے زائد ہو، اور صدقہ فطر نصف صاع گندم ہے یا ایک صاع جو ہے جو گندم کا دوگنا ہے۔ اور افضل یہ ہے کہ نماز عید پڑھنے سے پہلے صدقہ فطر ادا کر دے اور یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی۔ اور روز عید سے پہلے بھی دینا جائز ہے اور ہمارے نزدیک مدت کی کمی بیشی میں کوئی فرق نہیں ہے اور بعض ایک دو روز تک جائز کہتے ہیں۔ —— رمضان کے آخری عشرہ سے مقدم نہ کرے اور جوازِ تاخیر میں بھی کئی قول ہیں۔

صدقات نافلہ۔ وصل: پہلے جزو میں صدقات واجبہ کا ذکر تھا اب صدقاتِ نافلہ کو بیان کیا جاتا ہے اگرچہ وجوبی حکم ان کے ساتھ متعین نہیں ہے اور اس کے ترک پر وعید بھی نہیں فرمائی گئی ہے مگر ان کو از حد پسند و محبوب قرار دیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو دینے سے اتنا خوش ہوتے تھے جتنا اسے لینے والا خوش ہوتا ہے اور راہ خدا میں جس قدر بھی خرچ فرماتے اسے زیادہ نہ شمار فرماتے

اور آپ سے جو کچھ کوئی مانگتا آپ اسے عطا فرمادیتے انکار نہ فرماتے۔ فرزدق شاعر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں کیا خوب شعر کہا ہے۔

مَا قَالَ لَا قَطُّ اِلَّا فِیْ تَشَہُّدِہٖ لَوْلَا التَّشَہُّدُ کَانَتْ لَاءُہٗ نَعَمٖ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی لایعنی "نہیں" نہ فرمایا بجز اپنی تشہد کے۔ اگر تشہد نہ ہوتا تو آپ کی لا، نعم یعنی ہاں ہوتی۔ اس مقام میں بڑی تفصیل و تحقیق ہے جو اخلاق شریف کی بیان میں گزر چکی ہے وہاں ملاحظہ کرنا چاہئے۔ اور آپ کی عطاو بخشش قسم قسم کی تھی اور طرح طرح سے انعام و احسان فرماتے کبھی کسی کو کچھ عطا فرماتے اور کبھی ہبہ فرماتے یا اپنے اس حق اور قرض کو جو کسی پر ہوتا اسے معاف فرمادیتے اور کبھی مال خریدتے اور اس کی قیمت عطا فرماتے پھر وہی مال اسے عنایت فرمادیتے اور کبھی مال خریدتے اس کی قیمت اسے زیادہ مرحمت فرمادیتے اور کبھی قرض لیتے اور اس سے زیادہ عنایت فرمادیتے اور کبھی ہدیہ قبول فرماتے اور اس سے زیادہ انعام و اکرام فرماتے۔ غرض کہ جس طرح بھی مخلوق کو نفع پہنچایا جاسکتا ان پر احسان و نفع فرماتے۔ اور جو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں زیادہ قریب رہا اس میں احسان و کرم کی صفت غالب ہو جاتی۔ اگر بخیل و کنجوس، آپ کے حال مبارک کا مشاہدہ کرتا تو اس میں جود و سخا کی صفت اثر کر جاتی۔ غرض کہ سخاوت و سماحت اور جود و کرم، میں بے تعلقی دنیا اور اس کے مال و منال میں تمام افراد انسانی سے فائق تھی۔ اور جہان میں کوئی آپ کا مثل و ہمسر نہ تھا اسی وجہ سے آپ ہمیشہ بلند حوصلہ، خوش دل، خوش مزاج اور شاداں رہا کرتے اس لئے کہ ہر قسم کا انقباض، غم، تنگی و ترشی اور بد خلقی ظلمات نفس اور اس کی صفات رذیلہ بخل سے ہے اور بخل و کنجوسی، دنیا اور ماسوی اللہ سے علاقہ جوڑتا ہے اور شرح صدر، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صفات کریمہ اور خواص عظیمہ میں سے ہے ان صفات میں کوئی فرد بشر آپ کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ مگر بعض وہ کامل اولیاء کرام جنہیں آپ کے اتباع کے طفیل یہ خوبی میسر آئی۔

نوع چہارم در صوم

صوم کی تعریف، کھانے پینے اور جماع سے باز رہنا ہے۔ اور کامل روزہ وہ ہے جس میں اعضاء و جوارح معاصی اور حرکات شنیعہ سے باز رہیں۔ بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ پانچ چیزیں روزے کو توڑتی ہیں: جھوٹ، غیبت، یہ مفسد روزہ ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر غیبت سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے تو ہم میں کون ہے جس کا روزہ سالم و باقی رہتا ہو گا۔ علماء کا اختلاف ہے کہ روزہ افضل ہے یا نماز۔ جمہور کا مذہب یہ ہے کہ نماز افضل ہے اس بنا پر کہ حدیث میں آیا ہے کہ: "اِعْمَلُوْا اَنَّ خَیْرَ اَعْمَالِکُمُ الصَّلٰوۃُ" جان لو کہ بلاشبہ تمہارا سب سے بہتر عمل نماز ہے اسے ابو داؤد وغیرہ نے روایت کیا۔ یہ جو نسائی میں ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کیا مجھے ایسا عمل بتائیے جس کو میں آپ سے حاصل کروں فرمایا تم خود پر روزہ لازم کرلو کیونکہ اس کے برابر کوئی عمل نہیں ہے۔ غالباً اس سے مراد، نفی مماثلت در وجہ مخصوص ہو گی۔ کیونکہ روزے کے فوائد و ثمرات میں سے کہ روزہ دار کے حال کے مناسب ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم) صحیح بخاری میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا ایک اور روایت میں ہے کہ بنی آدم کا ہر عمل اسی کیلئے ہے اور روزہ میرے لئے ہے اور یہ جو فرمایا کہ میں ہی اس کی جزا دوں گا تو یہ روزے کی کثرت ثواب اور اس کی جزائے وافر کی طرف اشارہ ہے اور موطا میں ہے کہ ابن آدم کی ہر نیکی کی جزا دس سے سات سو گنا تک ہے مگر روزہ تو وہ میرے لئے ہے اور میں اس کو اتنی جزا دوں گا جس کی قدر و قیمت میرے سوا کوئی نہ جان سکے گا۔ اور میں اس پر کسی کو خبردار نہیں کروں گا۔ کیونکہ میں اسے فرشتوں کی وساطت کے بغیر عنایت فرماؤں گا اور یہ

جو فرمایا کہ روزہ میرے لئے ہے۔ حالانکہ ساری عبادتیں حق تعالیٰ جل شانہ کیلئے ہی ہیں تو اس سے مقصود، اس کی شرافت و بزرگی کی زیادتی اور اس کی کرامت ہے۔

نیز فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی غیر کیلئے روزے سے عبادت نہیں کی گئی ہے اور کسی کافر نے کسی زمانہ میں اپنے معبودانِ باطل کی پرستش روزے سے نہیں کی۔ اگرچہ نماز سجدہ اور مال کے بھینٹ کی شکل میں ان کی پرستش کی جاتی ہے دور دراز علاقے سے ان بتوں کی زیارت کے لئے آتے ہیں اور ان کے چاروں طرف گھوم کر اس کی تعظیم کرتے ہیں، نیز روزے میں اس ریاکاری کی جو شرکِ اصغر ہے کی بھی راہ نہیں ہے یعنی وہ ایک مجرد و خالص عمل ہے اگر وہ کہے کہ میں روزے دار ہوں (حالانکہ وہ روزے دار نہ ہو) تو یہ اپنے قول میں ریاکاری ہوگی نہ کہ نفس فعل میں۔ نیز روزے دار کے اپنے نفس کیلئے بھی اس میں کوئی لذت نہیں ہے۔ جیسا کہ بخاری کی حدیث میں آیا ہے کہ بندہ میرے لئے کھانے پینے اور اپنی نفسانی خواہشات کو چھوڑتا ہے۔ اسی بنا پر وہ فرماتا ہے کہ روزہ میرے لئے ہے۔ اور میں ہی اس کی جزا دوں گا اور شہوت یعنی نفسانی خواہش سے مراد یا تو جماع ہے (جیسی کہ بعض حدیثوں میں اس کی تصریح وارد ہے) یا ہر قسم کی نفسانی خواہشیں مراد ہیں۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ اپنے تمام اعضاء و جوارح کو معاصی سے روکے۔

بعض محققین فرماتے ہیں کہ کھانے پینے سے بچنا ربوبیت کی صفات میں سے ہیں۔ اور جب بندے نے بارگاہ رب العزت میں اس صفت کے ذریعہ تقرب کی تلاش کی جو اس کی صفت ہے تو حق تعالیٰ نے اس بندے کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ تمام عبادتوں میں عبادت صیام کی عظیم شان ہے۔ خصوصاً رمضان کے روزے کیونکہ یہ فرض ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یوں تو ہمیشہ ہی ساری مخلوق سے بہت زیادہ بخشش و سخاوت فرمانے کی عادت کریمہ تھی مگر خاص کر رمضان مبارک میں سب سے زیادہ تھی۔ مطلب یہ کہ آپ کی سخاوت و بخشش تمام لوگوں پر ہمہ وقت ہی زیادہ تھی مگر رمضان مبارک کے دن اور رات میں خیرات و صدقات بہت ہی زیادہ فرماتے اور ذکر، نماز، اعتکاف اور تلاوت سے دن رات کی ہر گھڑی کو معمور و لبریز رکھتے جب کہ یہ ماہ مبارک عظیم ہے اور برکات و کرامات کا منبع ہے اور نعم الٰہیہ و فیوضات ربانیہ، بندوں پر بہت اجل و اعظم ہیں تو اس کا شکرانہ بھی انواع عبادات میں بہت زیادہ اکثر و اوفر فرماتے۔ اور چونکہ حضرت واہب البرکات جل و علا کی بخشش اس ماہ کئی گنا ہوتی تو حضور سید کائنات علیہ التحیۃ والتسلیمات جو مظہر انوار صفات اور محل آثار کمالات حق سبحانہ و تعالیٰ ہیں آپ کا جود و سخا بھی اتنا ہی متکاثر و وافر ہوتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کی ہر رات میں جبریل علیہ السلام سے ملاقات کرتے تھے اور جبریل علیہ السلام سے ملاقات کے وقت خیر و احسان کی تیز تر ہوائیں اتنی چلتیں کہ وہ سب کو ہی پہنچتیں اور شامل حال بنتیں اور حضور جبریل علیہ السلام کو قرآن کریم سناتے اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سناتے اسی طرح باہم دور کرتے جس طرح کہ حفاظ ایک دوسرے کے ساتھ دور کرتے ہیں ان سب باتوں میں آدمی کیلئے تنبیہہ ہے کہ اسے چاہئے کہ ان برگزیدہ دنوں میں اور خیر و برکت کی گھڑیوں میں نیک آدمیوں کی صحبت حاصل کرنے کی (جہاں تک ممکن ہو) کوشش کرے اور نیک اعمال کرنے اور شر و فساد اور گناہ و معصیت سے بچنے میں پوری پوری کوشش کرے۔ وباللہ التوفیق۔

رمضان مبارک کے روزوں کی فرضیت ۲ ہجری میں ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ماہ رمضان میں روزے رکھا کرتے تھے اور نزول قرآن کی ابتداء ماہ رمضان میں ہوئی اسی طرح اس کا نزول آسمان دنیا کی طرف یکبارگی ماہ رمضان میں ہوا۔ علماء کہتے ہیں کہ صحف ابراہیم علیہ السلام کا نزول رمضان کی پہلی رات میں ہوا۔ اور توریت کا نزول رمضان کی چھٹی رات میں ہوا اور انجیل کا نزول رمضان کی تیرھویں رات میں ہوا۔ اور قرآن کریم کا نزول چوبیسویں رات میں ہوا۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غروب آفتاب کے یقین ہوجانے پر افطار میں جلدی فرماتے۔ اور سحری تناول فرمانے میں تاخیر کرتے اور صحابہ کو بھی اس تعجیل و تاخیر کا شوق دلاتے اور تعریف فرماتے تھے اور چند کھجوروں سے افطار فرماتے۔ اگر کھجوریں نہ ہوتیں تو چند گھونٹ پانی پیتے اور فرمایا "نِعْمَ سَحُوْرُ الْمُؤْمِنِ التَّمْرُ۔" مسلمان کی بہترین سحری کھجور ہے۔ اور افطار کے وقت پڑھتے "اَللّٰھُمَّ لَکَ صُمْتُ وَعَلٰی رِزْقِکَ اَفْطَرْتُ فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ" اور یہ کلمات بھی پڑھتے۔ "ذَھَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَثَبَتَ الْاَجْرُ۔" یعنی پیاس گئی۔ رگیں تر ہوئیں اور اجر ثابت ہوا۔ افطار کے وقت دعا پڑھنا مستحب ہے۔ اور روزے دار کو فحش کلامی اور غیبت کرنے اور لڑنے جھگڑنے اور مخالف کو جواب دینے سے منع فرماتے۔

اگر رمضان میں سفر کرتے تو کبھی افطار کرتے اور کبھی روزے رکھتے اور دوسروں کو بھی سفر میں روزہ و افطار کا اختیار دیتے۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ سفر میں روزہ افضل ہے یا افطار۔ امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور اکثر ائمہ رحمہم اللہ کا مذہب یہ ہے کہ سفر میں اس شخص کا روزہ افضل ہے جو طاقت رکھتا ہے۔ اور مشقت نہ بڑھاتا ہو۔ اور کوئی ضرر بھی لاحق نہ ہو اگر ضرر کرے تو افطار اولیٰ ہے۔ اگر رمضان کی راتوں میں غسل کی حاجت ہوتی تو رات میں ہی غسل فرمالیتے۔ اور بعض راتوں میں تاخیر بھی کرتے اور صبح صادق کے بعد غسل فرماتے۔ علماء فرماتے ہیں کہ رات میں غسل کرنا افضل و اولیٰ ہے۔ اور رمضان کے دنوں میں پچھنے لگواتے، مسواک کرتے، کلی کرتے اور ناک میں پانی چڑھانے میں مبالغہ نہ کرتے۔ رمضان میں مسواک اور سرمہ لگانے کی ممانعت میں کوئی حدیث صحیح نہیں ہے اور امام ابو حنیفہ کا مذہب بھی اس کے جواز میں ہے۔ اور نفلی روزے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اتنے پے در پے مسلسل رکھتے کہ لوگوں کو گمان ہوتا کہ اب افطار کریں گے ہی نہیں اور کبھی افطار کرتے تو لوگوں کو گمان ہوتا کہ کبھی روزہ رکھیں گے ہی نہیں کیونکہ کوئی مہینہ روزہ سے خالی نہ گزرتا۔ اور ایام بیض (چاندنی راتوں) میں روزہ رکھنے کا خوب اہتمام فرماتے حتیٰ کہ سفر میں بھی نہ چھوڑتے اور دائمی روزے سے منع فرماتے اور صائم الدہر کے بارے میں فرمایا: "لَاصَامَ وَلَا اَفْطَرَ" نہ وہ روزے سے ہے اور نہ افطار سے۔ پیر اور جمعرات کے دن بھی روزے رکھتے اور عشرۂ ذوالحجہ کے نو روزے رکھتے اور فرماتے کہ عشرہ ذی الحجہ سے بہتر روزہ رکھنے کیلئے اور کوئی دن افضل نہیں ہے۔ البتہ عاشورہ یعنی محرم کی دسویں کا روزہ ضرور رکھتے۔ اور آخر عمر شریف میں فرمایا اگر باقی رہا تو آئندہ نویں محرم کا بھی روزہ رکھوں گا اور روزہ عرفہ یعنی نویں ذوالحجہ کو اگر حج میں ہوتے تو افطار فرماتے۔ صاحب سفرالسعادۃ کہتے ہیں کہ وہ تین مہینے جس میں عوام روزے رکھتے ہیں کوئی خاص چیز نہیں ہے اور ماہ شوال کے چھ روزوں کے بارے میں فرمایا کہ یہ چھ روزے رمضان کے ساتھ صیام دہر کے برابر ہیں اور تمام رمضانوں میں صرف آخری عشرہ میں اعتکاف فرماتے۔ صرف ایک رمضان میں آپ سے اعتکاف فوت ہوا۔ اور ماہ شوال میں قضا فرمائی۔ اور ایک مرتبہ اول عشرہ میں اعتکاف فرمایا اور ایک مرتبہ درمیانی عشرہ میں اور ایک مرتبہ عشرہ اخیر میں اور جب یہ معلوم ہوا کہ شب قدر آخری عشرہ میں ہے تو اس کے بعد آخر عمر شریف تک عشرہ اخیرہ میں ہی اعتکاف فرمایا اور اعتکاف کیلئے مسجد میں خیمہ لگایا، اور کبھی تخت بچھایا جاتا اور اس پر فرش بچھایا جاتا اور ہر سال دس دن معتکف رہتے۔ اور آخری سال میں بیس دن اعتکاف فرمایا اور چالیس روزہ اعتکاف مروی نہیں ہوا اور ہر سال جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ ایک مرتبہ قرآن کا دور فرماتے اور آخری سال دو مرتبہ کیا اس کا تذکرہ "وفات" کے ضمن میں انشاء اللہ آئے گا۔

صوم وصال: وصل: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان مبارک کی بعض راتوں میں وصال فرماتے یعنی پے در پے روزے رکھتے۔ بغیر اس کے کہ کچھ کھائیں یا پئیں اور افطار کریں۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رحمت و شفقت اور دور اندیشی کی خاطر اس سے منع فرماتے اور ناپسند کرتے جیسا کہ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے صوم وصال سے منع فرمایا تو صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب آپ صوم وصال رکھتے ہیں تو ہمیں کیوں منع فرماتے ہیں باوجودیکہ ہم حضور کی متابعت کی تمنا رکھتے ہیں فرمایا: "لَسْتُ کَاَحَدِکُمْ" میں تم میں سے کسی کی مانند نہیں۔ اور ایک روایت میں آیا ہے کہ: "اَیُّکُمْ مِثْلِی" تم میں سے کون میری مثل ہے۔ "اِنِّیْ اَبِیْتُ عِنْدَ رَبِّیْ" میں اپنے رب کے حضور شب باشی کرتا ہوں کیونکہ وہ میرا پالنے والا اور تربیت فرمانے والا ہے۔ "یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِیْ" وہ مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ وہ کھلانے والا اور پلانے والا ہے۔ جو کھلاتا اور پلاتا ہے۔

علماء کے اس کھانے پینے کے بارے میں کئی قول ہیں ایک یہ کہ یہی محسوس کھانا پینا مراد ہے یعنی حضور کے لئے ہر شب جنت سے کھانا پینا آتا ہے تاکہ حضور کھائیں اور پئیں۔ اور یہ خدا کی جانب سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر خاص اکرام تھا۔ اور یہ نہ صوم وصال کے منافی ہے اور نہ بطلان صوم کا موجب ہے اس لئے کہ جو چیز شرعاً افطار کا موجب ہے وہ عام دنیاوی چیزیں ہیں۔ لیکن جو چیز بطریق معجزہ اور خارق عادت جنت سے پروردگار کی جانب سے آئی وہ موجب افطار اور بطلان صوم نہیں بناتی اور یہ درحقیقت اجر و ثواب کی جنس سے ہے۔ نہ کہ اعمال کی قبیل سے اور بعض علماء کہتے ہیں کہ اس کھانے پینے سے مراد قوت ہے گویا فرماتے ہیں کہ مجھے حق تعالیٰ کھانے پینے کی قوت مرحمت فرماتا ہے اور ایسی چیز افاضہ فرماتا ہے جو کھانے پینے کے قائم مقام ہوتی ہے جس کی بدولت طاعت وعبادت کی قوت پاتا ہوں اور کسی قسم کا فتور یا عارضہ لاحق نہیں ہوتا اور اس میں کوئی استحالہ نہیں ہے اور محققین کے نزدیک مختار یہ ہے کہ غذائے روحانی مراد ہے جو از قسم ذوق ولذت مناجات اور فیضان معارف ولطائف الٰہی ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر اور آپ کی روح پر فتوح پر وارد و نازل ہوتا ہے۔ جس سے احوال شریف کو ایسی خوشی ومسرت اور شادمانی حاصل ہوتی ہے کہ وہ اس کی وجہ سے غذائے جسمانی سے مستغنی ہو جاتا ہے۔ اور یہ بات مجازی محبتوں اور ظاہری خوشیوں سے بھی تجربے میں آتی رہتی ہے کہ غذائی احتیاج ہی لاحق نہیں ہوتی اور اس کی یاد تک نہیں آتی تو جو محبت حقیقی اور مسرتِ معنوی سے تعلق رکھتی ہو اس کا کیا اندازہ۔ (واللہ اعلم بحقیقۃ الحال)

امتی کیلئے صوم وصال کا مسئلہ: فرع ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دوسروں کیلئے صوم وصال کے جواز و حرمت اور کراہت میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ ہر اس شخص کیلئے جائز ہے جو اس کی قدرت رکھے اور یہ صوم دوام کی مانند ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ پندرہ دن تک صوم وصال رکھتے تھے۔ اور ابراہیم قلمی تابعی سے منقول ہے کہ وہ چالیس دن تک ایک یا چند دانے انگور کے کھاتے تھے۔ پھر یہ کہ عوارف میں منقول ہے کہ بعض ریاضت و مجاہدہ کرنے والے "طی اربعین" یعنی چالیس روزہ کاٹتے ہیں گویا کہ چالیس دن ان کیلئے ایک دن کا حکم رکھتا ہے۔

منقول ہے کہ بعض اصحاب نبوی رضی اللہ عنہم نے مخالفت کے بعد بھی صوم وصال رکھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے برقرار رکھا اس سے معلوم ہوا کہ مخالفت، رحمت وشفقت اور تخفیف کی بنا پر تھی نہ کہ حرام قرار دینے کیلئے جیسا کہ شروع کلام میں اس کی جانب اشارہ گزرا اور اکثر کا مذہب یہی ہے کہ جائز نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کا مذہب یہی ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ نے صراحت سے مکروہ قرار دیا ہے اور ان کے شاگردوں کا کراہت تحریمی اور کراہت تنزیہی میں اختلاف ہے اور اول صحیح تر ہے۔

امام احمد واسحٰق بن راہویہ فرماتے ہیں کہ سحر تک جائز ہے جیسا کہ حضرت ابو سعید خدری کی حدیث بخاری میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وصال نہ کرو اگر کوئی تم میں سے چاہتا ہے تو وہ سحر تک وصال کرے۔ اور یہ تاخیر افطار کے معنی میں ہے نہ کہ وصال کے لئے۔ اور یہ بھی اس تقدیر پر ہے کہ مشقت اور تعذیب نفس کا باعث نہ ہو ورنہ داخل قربت وعبادت نہیں ہے اور گزشتہ حدیث کا

ظاہر مطلب یہ ہے کہ وصال، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے اگرچہ جمہور کا مذہب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا پر حرام ہے کیونکہ حضور کے ارشاد میں ممانعت عام ہے فرمایا: "لَاتُوَاصِلُوْا" صوم وصال نہ کرو اور رحمت وشفقت، تحریم کے منافی نہیں ہے۔ اس کی علت یہ ہے کہ حرمت بربنائے رحمت ہے اور وہ اہل سلوک جو ریاضت ومجاہدے کے ذریعہ نفس کو مارتے ہیں وہ ایک ہتھیلی پانی سے افطار کرتے ہیں تاکہ وصال کی حقیقت بھی پوری ہوجائے۔ (واللہ اعلم)

نوع پنجم در حج وعمرہ

حج کے لغوی معنی قصد وارادے کے ہیں اور شریعت مطہرہ میں مخصوص شکل میں بیت اللہ کی طرف قصد کرنے کا نام ہے۔ اور لفظ حج بفتح حاء اور بکسر حاء دونوں سے ہے۔ اور آیہ کریمہ: "وَلِلّٰهِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ۔" میں دونوں قرائتیں آئی ہیں۔ اور عمرہ کے لغوی معنی زیادتی کے ہیں اور عمرہ حج پر اضافہ ہے اور اس کے معنی عمارت اور عورت سے زفاف کرنے کے بھی آتے ہیں۔ اور عمرہ میں مسجد حرام پر تعمیر وتعظیم ہے۔ اور یہ موجب عمارت، بنائے محبت ووداد ہے اور شریعت میں افعال مخصوصہ کا نام ہے جو طواف اور سعی ہے اس میں وقوف عرفہ نہیں ہے کیونکہ یہ حج کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور حج کے ساتھ عمرے کی نسبت ایسی ہے جیسی نماز فرض کے ساتھ نماز نفل کی ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد ایک حج کیا جسے حجتہ الوداع اور حجتہ الاسلام کہتے ہیں۔ اور لوگوں کو تعلیم احکام ومسائل فرمائی اور فرمایا شاید تم مجھے آئندہ سال نہ پاؤ اور ان کو سفر آخرت کی بنا پر رخصت فرمایا اور خطبہ دیا۔ اور فرمایا کہ وہ وقت قریب ہے جب تم اپنے رب کے حضور حاضر ہوگے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی پرسش فرمائے گا۔ آگاہ وخبردار ہوجاؤ میرے بعد گمراہ نہ ہونا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ پھر کفر کی طرف نہ لوٹ جانا کیونکہ تم میں سے کچھ لوگ ایک دوسرے کو قتل کریں گے۔ اور آگاہ وخبردار ہوجاؤ میں نے تم کو تمہارے رب کے احکام پہنچادیئے ہیں۔ اور فرمایا خداوندا تو گواہ رہ۔ تمہیں لازم ہے کہ یہ حاضرین غائب کو احکام پہنچائیں اور جس کو یہ احکام پہنچائے جائیں وہ پہنچانے والے سے زیادہ یاد رکھنے والا اور زیادہ جاننے والا ہے۔ اور فرمایا حج کے مناسک ومسائل سیکھ لو شاید کہ میں دوسری بار حج نہ کروں۔ اور فرمایا اپنے رب کی عبادت کرو۔ پنجگانہ نمازیں پڑھو، ماہ رمضان کے روزے رکھو اور اپنے اولی الامر کی اطاعت کرو تاکہ حق تعالیٰ تمہیں جنت میں داخل کرے۔ یہ ہجرت کا دسواں سال تھا۔ لیکن ہجرت سے پہلے بعض کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو حج کئے اور بعض کہتے ہیں تین اور بعض اس سے زیادہ کہتے ہیں قول محقق یہ ہے کہ کوئی عدد معین ومحفوظ نہیں ہے۔ اور حج کی فرضیت جمہور کے نزدیک ہجرت کے آٹھویں سال میں ہوئی ہے اور تحقیق یہ ہے کہ نویں سال میں ہے اور اسی سال اسباب سفر کی تیاری میں مشغول ہوئے لیکن غزوات کی بنا پر اس سال آپ کو تشریف لے جانا میسر نہ آیا اور بارگاہ نبوت میں مسلسل وفود کے آنے کی وجہ سے احکام کی تعلیم نہ فرماسکے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، کو امیر الحجاج بنا کر مکہ مکرمہ بھیج دیا اور ان کے پیچھے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو سورۂ برات کا حکم، مشرکوں پر سنانے کیلئے بھیجا۔ جب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ پہنچے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا تم "امیر ہو یا مامور" فرمایا "نہیں" مامور ہوں اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو سورۂ برات کا حکم لے کر خاص طور سے بھیجنا اس وجہ سے ہوا کہ اس سورۃ میں مشرکوں کے نقض عہد اور عقد عہد کا ذکر ہے کہ نقض عہد کا ذمہ دار خود وہ شخص ہوگا یا اس کے گھر والے ہوں گے۔

لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمرے کی تعداد چار بتاتے ہیں۔ پہلا عمرہ حدیبیہ کا ہے جو ہجرت کے چھٹے سال بقصد عمرہ نکلے تھے اور جب حدیبیہ کے مقام پر پہنچے جو مکہ مکرمہ سے ایک منزل کے فاصلے پر ہے تو یہاں تمام مشرکین جنگ کیلئے نکل کھڑے ہوئے اور

مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے باز رکھا۔ چونکہ فتح کی میعاد ابھی پوری نہ ہوئی تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بحکم الٰہی صلح کر کے احرام سے باہر آگئے۔ اور مدینہ منورہ واپس تشریف لے آئے اور قرار پایا کہ سال آئندہ تشریف لائیں۔ اور عمرہ بجالائیں۔

اور دوسرا عمرہ ۷ ہجری میں قرار داد صلح کے بموجب ہے۔ آپ مکہ مکرمہ تشریف لائے عمرہ کیا اور تین دن کے بعد مدینہ منورہ واپس تشریف لے آئے۔

اور تیسرا عمرہ ۸ ہجری میں ہوا جو فتح مکہ کا سال ہے آپ نے حنین کی غنیمتوں کی تقسیم کے بعد جعرانہ سے جو مکہ سے ایک منزل کے فاصلے پر ہے شباشب آئے اور عمرہ کیا اور اسی رات جعرانہ واپس تشریف لے آئے۔

اور چوتھا عمرہ دسویں سال اس حج کے ساتھ ہے جسے حجتہ الوداع کہتے ہیں اس کی تفصیل غزوات کے بیان میں انشاء اللہ آئے گی۔

بعض علماء تین عمرے کہتے ہیں کیونکہ حدیبیہ میں حقیقتاً عمرہ نہ ہوا تھا اس لئے کہ مکہ مکرمہ میں داخلہ نہ ہوا تھا اور حدیبیہ میں ہی احرام کھول کر مدینہ منورہ واپس تشریف لے آئے تھے۔ لیکن جمہور علماء اسے عمرہ کا حکم دیتے ہیں۔

اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کا ارادہ فرمایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس کی خبر دی تو سب کے سب حج کیلئے تیاری کرنے لگے اور یہ خبر جب شہروں اور دیہاتوں میں پہنچی تو اطراف و جوانب سے لوگ مدینہ منورہ پہنچنے شروع ہو گئے اور سب ہی مسلمان یا تو مدینہ منورہ آگئے یا مکہ کی راہ میں ہر طرف سے آ آکر ملنے لگے۔ اور حجاج کی اتنی تعداد ہو گئی جو حد حصر و حساب سے باہر ہو گئی۔ یہاں تک کہ لوگ کہتے ہیں کہ آگے پیچھے، داہنے بائیں جس طرف بھی نظر اٹھائی جاتی آدمی ہی نظر آتے تھے کتنے پیادہ تھے اور کتنے سوار، ان کی تعداد معلوم ہی نہیں ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار تھے۔ غرضیکہ ذوالحجہ میں احرام باندھ کر نکلے مکہ پہنچے اور حج ادا کیا اس کے احکام واحوال کتب احادیث میں مسطور ہیں۔

ابو داؤد اور ابن ماجہ میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ کی رات میں اپنی امت کی بخشش کی دعا مانگی تو جواب آیا میں نے بخش دیا مگر ظالموں کو نہیں کیونکہ انہیں ضرور مظلوم کی حمایت میں پکڑوں گا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کیا اے رب تو قادر ہے کہ اگر چاہے تو مظلوم کو جنت میں داخل کر دے اور ظالم کو اس وقت بخش دے، اس دعا کا جواب نہیں آیا۔ اور جب مزدلفہ میں صبح فرمائی تو اس دعا کو دوبارہ مانگا جواب آیا میں نے قبول فرمایا جو کچھ آپ چاہتے ہیں اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا۔ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ماں باپ آپ پر قربان ہوں اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خندہ و فرحاں رکھے یہ گھڑی تو کوئی خاص تبسم کی نہ تھی؟ فرمایا دشمن خدا ابلیس نے جب جانا کہ حق تعالیٰ نے میری دعاء کو قبول فرما لیا اور میری امت کو بخش دیا تو وہ سر پر خاک ڈال کر واویلا کرتا چیختا چلاتا بھاگ کھڑا ہوا اس پر مجھے اس کا جزع و فزع دیکھ کر ہنسی آگئی۔

علماء فرماتے ہیں کہ اس جگہ امت سے مراد، مقام عرفات میں ٹھہرنے والے ہیں اور اسی بنا پر علماء کہتے ہیں کہ حج سے حقوق العباد کا کفارہ بھی ہو جاتا ہے۔ اور طبرانی کہتے ہیں کہ یہ ان ظالموں پر محمول ہے جو ظلم سے توبہ کر کے حق عباد ادا کرنے سے لاچار رہے۔ اور بیہقی بھی اسی روایت کی مانند ابو داؤد وابن ماجہ سے نقل کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس کی نظیریں بکثرت ہیں۔ اگر صحیح ہیں تو حجت ہے ورنہ حق تعالیٰ کا یہ قول کافی ہے کہ یَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِکَ " (شرک کے سوا سب بخش دے گا) تو ظلم بھی ما دون شرک ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ حج سے حقوق اللہ تو بخش دیئے جاتے ہیں لیکن حقوق العباد میں اختلاف ہے مگر فضل خدا وسیع ہے اور ظاہر حدیث عام ہے۔

ترمذی میں صحیح حدیث ہے کہ: " مَنْ حَجَّ وَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ خَرَجَ مِنْ ذُنُوبِهِ كَيَوْمَ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ " جس نے حج کیا اور بدی و فسق نہ کیا تو وہ گناہوں سے ایسا جانکلتا ہے جیسے آج ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔ کہا گیا ہے کہ یہ حقوق اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں حقوق العباد

کو شامل نہیں۔ اور کہا گیا کہ حقوق اللہ سے متعلق تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں مگر خاص حقوق اللہ ساقط نہیں ہوتے لہٰذا جس پر کوئی نماز یا کفارہ وغیرہ ہے چونکہ یہ حقوق اللہ سے ہے اس لئے ساقط نہیں ہوتے اس لئے کہ یہ حقوق اللہ سے تعلق رکھتے ہیں نہ کہ گناہوں سے۔ اور گناہ نماز کی تاخیر ہے لہٰذا تاخیر و مخالفت کا گناہ حج سے ساقط ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ حج مخالفت کے گناہ کو ساقط کرتا ہے نہ کہ حقوق کو۔

ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ جو یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ حج ان چیزوں کو ساقط کر دیتا ہے جو اس پر واجب ہیں مثلاً نماز وغیرہ تو اس سے توبہ کرائی جائے ورنہ قتل کر دیا جائے۔ اور حقوق العباد تو حج سے بالا جماع ثابت ہیں ساقط ہی نہیں ہوتے۔ ایسا ہی مواہب لدنیہ نے نقل کیا ہے۔ یہ بات ندرت سے خالی نہیں۔ (واللہ اعلم)

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (حجتہ الوداع میں) اپنے دست مبارک سے تریسٹھ اونٹ ذبح فرمائے اور تریسٹھ کا عدد، آپ کی عمر مبارک کے سال کا عدد تھا۔

ابو داؤد میں ہے کہ پانچ چھ اونٹ خود قریب ہوتے اور ہجوم کر کے آتے تاکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پہلے انہیں ذبح فرمائیں اور ہر اونٹ قریب ہونے کی کوشش کرتا اور دوسروں کو دھکا دیتا۔ تاکہ اسے پہلے ذبح فرمائیں۔ امیر المومنین حضرت علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریباً سینتیس اونٹ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذبح فرمائے جن میں سے تین اونٹ خود ان کے تھے یہ تمام اونٹ اپنے اور دوسروں کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ لائے تھے یہ سو اونٹ ذبح فرمائے۔

اور مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج کی جانب سے گائے ذبح فرمائی اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جانب سے ایک اونٹ ذبح فرمایا۔ اس کے بعد "حلاق" کو بلایا جن کا نام معمر بن عبداللہ تھا اور انہیں داہنی جانب سے حلق یعنی سر مونڈنے کا اشارہ فرمایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان موئے مبارک کو صحابہ رضی اللہ عنہم میں تقسیم فرمایا جو ایک یا دو بال مبارک حصے میں آئے اور بائیں جانب کے تمام موئے ہائے مبارک، حضرت ابو طلحہ انصاری کو عطا فرمائے اس کے بعد ناخن مبارک کو ترشوایا اسے بھی صحابہ رضی اللہ عنہم میں تقسیم فرما دیا۔ اور اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم نے حلق کرایا اور کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم نے قصر یعنی بال ترشوائے اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی اَللّٰھُمَّ ارْحَمِ الْمُحَلِّقِیْنَ (اے خدا! سر منڈانے والوں پر رحم فرما) اور آخر میں عرض کرنے پر اضافہ فرمایا "وَالْمُقَصِّرِیْنَ" (اور بال ترشوانے والوں پر)

اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہ زمزم پر تشریف لائے تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد نے (چونکہ چاہ زمزم انکی تحویل میں تھا) پانی کھینچا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عبدالمطلب کی اولاد پانی نکالو کیونکہ یہ نیک عمل ہے اگر اس کا خطرہ نہ ہوتا کہ لوگ تم پر غلبہ کریں گے تو میں خود اتر کر چاہ سے پانی نکالتا اور پانی پلانے میں تمہاری مدد و اعانت کرتا کیونکہ پانی پلانے میں فضل و برکت اور بزرگی ہے۔ مطلب یہ کہ اگر میں خود اس کو کروں تو میرے بعد میری امت پر سنت ہو جائے گا اور تمام لوگ میرے اتباع کے ارادے سے اختیار کر لیں گے اور تم پر غالب آجائیں گے اور تمہاری نوبت نہ آئے گی۔ اور یہ منصب تمہارے ہاتھ سے چلا جائے گا۔ تو انہوں نے ایک ڈول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر نوش فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کھڑے ہو کر پانی پینا یا تبیان جواز کے لئے تھا یا ضرورت و حاجت کی وجہ سے تھا۔ کیونکہ ہجوم کی زیادتی سے بیٹھنے کی جگہ نہ تھی یا کوئی اور ضرورت و حاجت ہوگی۔ (واللہ اعلم)

بعض کہتے ہیں کہ کھڑے ہو کر پینا آب زم زم اور آب وضو کے سا— خاص ہے جیسا کہ عادت شریفہ کے باب میں آئے گا۔

چاہ زم زم کے نام کی وجہ یہ ہے کہ اس کا پانی بہت زیادہ ہے اور زمزم یا زمازم، شیر پانی کو کہتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ لفظ کسی

چیز سے مشتق نہیں ہے۔ بلکہ شروع ہی سے اس کا یہی نام ہے سب سے پہلے جس نے زمزم کو نمودار کیا وہ جبریل علیہ السلام تھے۔ جس وقت حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پیاسے ہوئے اور زمین پر اپنا قدم مبارک مارا تو اس جگہ چشمہ نمودار ہو گیا اور مشکیزہ بھرنے کیلئے پانی کو احاطہ میں لے لیا تاکہ پھیلے نہیں۔ اگر اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو چشمہ جاری ہو جاتا جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس جگہ کنواں بنایا اور جب قبیلہ جرہم نے مکہ مکرمہ میں سکونت اختیار کی تو انہوں نے اسے پاٹ دیا یہاں تک کہ اس کا کوئی نشان تک نہ چھوڑا۔ بعد ازاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا حضرت عبدالمطلب کو جب حق تعالیٰ نے اس کرامت کے ساتھ مخصوص فرمایا تو خواب میں یہ کنواں دکھایا تو انہوں نے عام الفیل میں اسے کھودا۔ ایک روایت میں ہے کہ عام الفیل سے پہلے۔ اس کے بعد ابو طالب نے اسے تعمیر کیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود بہ نفس نفیس پتھر لاتے تھے جیسا کہ تاریخ مکہ میں مذکور ہے اور اس کے فضل وخواص میں اخبار و آثار بکثرت ہیں جیسا کہ احادیث میں وارد ہیں۔

جاننا چاہئے کہ ذبح میں جو تقرب و عبادت مقصود ہے وہ تین ہیں۔ ایک ہدی یعنی حج کی قربانی، جسے حرم میں جانور ساتھ لے جاکر یا بھیج کر ذبح کرتے ہیں۔ دوسرا اضحیہ یعنی روز عید اضحیٰ قربانی دی جاتی ہے۔ تیسرا عقیقہ جو نو مولود بچہ کیلئے ذبح کرتے ہیں۔

اور عقیقہ، امام مالک و امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کے نزدیک اور مذہب مشہور میں سنت ہے اور ان کی ایک روایت میں واجب ہے اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک سنت نہیں ہے۔ امام محمد رحمہ اللہ موطا میں فرماتے ہیں کہ ہمیں ایسی روایت پہنچی ہے کہ عقیقہ، جاہلیت کی رسوم میں سے تھا ابتدائے اسلام میں یہی رائج رہا۔ اس کے بعد اضحیہ یعنی بقر عید کی قربانی نے ہر اس ذبح کو منسوخ کر دیا۔ جو اس سے پہلے تھا اور ماہ رمضان نے ہر اس روزے کو منسوخ کر دیا جو اس سے پہلے تھے اور غسل جنابت نے ہر اس غسل کو منسوخ کر دیا جو اس سے پہلے تھے۔ اور زکوٰۃ نے ہر اس صدقہ کو منسوخ کر دیا جو اس سے پہلے تھے۔ ہمیں ایسی ہی خبر ملی ہے۔ (انتہیٰ)

جاننا چاہئے کہ مسلم، ابوداؤد اور ترمذی و نسائی نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا کہ وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم ماہ ذی الحجہ کو دیکھو اور کوئی تم میں سے قربانی کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ اپنے جسم سے بال اور ناخن کو قربانی کے وقت تک دور نہ کرے اور بعض علمائے مذہب اور امام احمد کا مذہب اسی پر ہے کہ یہ نہی اور ممانعت بر سبیل تحریم ہے اور بعض کا مذہب یہ ہے کہ یہ بر طریق کراہت ہے۔ جامع الاصول میں مسلم بن عمار لیثی سے نقل کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ ہم روز اضحیٰ کے قریب حمام میں تھے اور موئے زیر ناف دور کرنا چاہتے تھے کہ بعض لوگوں نے کہا اس سے تم منع کئے گئے ہو پھر جب ہم سعید بن المسیب سے ملے تو ان سے میں نے اس بات کا تذکرہ کیا فرمایا اے بھتیجے یہ ایک حدیث ہے جسے لوگوں نے فراموش کر رکھا ہے اور اسے چھوڑ رکھا ہے۔ مجھ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم ماہ ذی الحجہ کو دیکھ لو تو...... الحدیث

مخفی نہ رہنا چاہئے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے جو معلوم ہوتا ہے یہی کہ بالوں اور ناخنوں کو نہ ترشوائے نہ یہ کہ احرام والوں کی مانند چیزیں لازم کرلے۔ لہٰذا صاحب سفر السعادۃ کا یہ قول جو انہوں نے کہا کہ بالوں اور ناخنوں میں کچھ دور نہ کرے اور اسی روز احرام والوں کی مانند صورت بنالے۔ یہ محل نظر ہے (واللہ اعلم)

نوع ششم در عبادات و اذکار، دعوات و استغفار و قراءت

ذکرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم: ۔ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر فرمانے کے بارے میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حق تعالیٰ کا ذکر ہر لمحہ اور تمام اوقات میں کرتے تھے اور ہمیشہ یاد الٰہی میں

مشغول رہتے تھے اور کوئی چیز آپ کو ذکر الٰہی سے باز نہ رکھتی تھی اور آپ کی ہربات، یاد حق، حمد وثنا، توحید و تمجید تسبیح و تقدیس اور تکبیر و تہلیل میں ہوتی تھی اور اسماء وصفت الٰہی، وعد، وعید، امرونہی، احکام شرع کی تعلیم، ذکر جنت و نار، اور ترغیب و ترہیب کا بیان، یہ سب ذکر حق تھا اور خاموشی کے وقت اللہ تعالیٰ ہی کی یاد، قلب اطہر میں رہتی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر سانس اور آپ کے قلب و زبان اور آپ کا اٹھنا، بیٹھنا، کھڑا ہونا، لیٹنا، چلنا، کھانا پینا، سونگھنا، آنا جانا، سفر وا قامت۔ پیدل و سواری، غرضیکہ کسی حالت میں ذکر حق سے جدا نہ تھا اور ذکر کے معنی یاد کرنے کے ہیں اور نسیان جس کے معنی فراموش کے ہیں۔ اس کی ضد ہے۔ جو بھی صورت یاد کرنے کی ہوتی خواہ دل میں یا زبان سے ہر فعل میں یا شان میں ذکر الٰہی ہوتا۔ لازمی ہے کہ اگر زبان دل کے ساتھ موافقت کرے تو یہ افضل واتم واکمل ہوگا۔ اور یہ جو بعض فقہاء کے کلام میں آیا ہے کہ جو زبان پر نہ ہو وہ ذکر نہیں ہوتا۔ اور نہ اس کا اعتبار ہے ان کی مراد وہ ذکر لسانی ہے جس کا زبان سے ذکر کرنا شریعت نے واجب قرار دیا ہے جیسے تسبیحات واذ کار جو نماز میں واقع ہیں اور وہ اذ کار و اوراد جو بعد نماز وارد ہیں نہ کہ مطلق ذکر۔ قاموس میں ذکر کو نسیان کی ضد بتایا گیا ہے لہٰذا یہ ذکر قلبی کو بھی بلاشبہ شامل ہے۔ اور فعل قلب پر ثواب کا مترتب نہ ہونا اور اس کا اعتبار نہ کرنا باطل ہے اور اسے ان چیزوں پر قیاس کرنا جسے شرع نے بغیر زبانی اقرار کے معتبر قرار نہیں دیا ہے بغیر دلیل شرعی اور نص شارع کے صحیح نہیں ہے۔

دن و رات کے اعمال و اشغال، وقت تہجد سے سونے کے وقت تک مختلف اوقات ولمحات اور حالات واوضاع اور اطوار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعائیں وغیرہ پڑھا کرتے تھے۔ وہ تمام کتب احادیث میں مذکور و مسطور ہیں اور ادعیہ ماثورہ جو تمام مقاصد و مطالب اور حاجات کو شامل و حاوی ہیں اور ہر خاص مقصد و مطلب کیلئے بھی جداگانہ بیان فرمانے سے نہیں چھوڑی ہیں۔ اور دعا کی فضیلت میں اور اس کی ترغیب و تحریص میں اس قدر آیات واحادیث اور آثار مروی ہیں جن کا کوئی حد و شمار ہی نہیں اس خصوص میں حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہی کافی ہے کہ فرمایا: "اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ۔" دعا مانگو میں قبول کروں گا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ۔" دعا عبادت کا مغز ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ: "مَنْ لَّمْ يَسْئَلِ اللّٰهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ۔" جو بندہ اس سے دعا نہیں کرتا وہ اس پر غضب فرماتا ہے۔ اور دعا میں توجہ واخلاص ہے کیونکہ بندہ ہر طرف سے منہ پھیر کر جناب باری تعالیٰ سے لو لگاتا ہے اور دعا حق تعالیٰ کے لئے حمد و شکر ہے اور اس کے کمالات کا اثبات ہے خواہ صراحت سے ہو یا ضمن سے۔ اور توحید و رغبت و مناجات و تضرع و تذلل اور استعانت و استغاثت، یہ تمام باتیں عبادتوں کا خلاصہ اور مغز ہیں اور اسی وجہ سے وارد ہوا کہ: "اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ۔"

ابو القاسم قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کا اس میں اختلاف ہے کہ دعا افضل ہے یا سکوت و رضا۔ بعض کا خیال ہے کہ دعا افضل ہے کیونکہ دعا فی نفسہٖ عبادت ہے اور عبادت کرنا اور اس پر قیام کرنا اس کے نہ کرنے سے افضل و اولیٰ ہے۔ اور یہ کہ حق تعالیٰ کا حق ہے اگر وہ بندے کے حق میں اسے قبول نہ فرمائے اور اس کی خواہش کے مطابق دعا کا اثر مرتب نہ ہو تو کوئی نقصان و حرج نہیں۔ اس لئے کہ بندہ پر جو حق تعالیٰ کا حق تھا وہ اس نے ادا کر دیا اس لئے کہ دعا کا مقصود، اظہار فقر و احتیاج اور بندگی ہے اور یہ اس سے حاصل ہوتا ہے۔ ابو حازم اعرجی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک دعا سے محروم ہونا اس کی قبولیت سے محروم ہونے سے زیادہ سخت ہے۔ امیر المومنین سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں دعا مانگتا ہوں اور اس کی قبولیت کا امیدوار رہتا ہوں بلکہ

جب دعا کو ختم کرتا ہوں تو میں یقین رکھتا ہوں کہ قبولیت بھی اس کے ساتھ ہی شامل ہے۔ اور بعض کا خیال ہے کہ حکم وتقدیر کی محرومی کے تحت سکوت و خاموشی زیادہ اتم اور خدا کے فرمان پر رضاو تسلیم کو اختیار کرنا اولیٰ ہے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کا یہ حال ہے کہ بارگاہ ایزدی کا اتنا ادب ملحوظ رکھتے ہیں کہ طلب و سوال میں زبان تک نہیں کھولتے۔ اور ہمہ وقت ذکر الٰہی میں مشغول رہتے ہیں۔ اور وہ اسی میں مستغرق رہتے ہیں اور جو کچھ حق تعالیٰ کی جانب سے ظہور میں آتا ہے وہ اس پر راضی رہتے ہیں۔ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب تعالیٰ کی جانب سے حکایت کرتے ہوئے فرمایا مَنْ شَغَلَ ذِكْرِيْ عَنْ مَسْئَلَتِيْ اَعْطَيْتُهٗ اَفْضَلَ مَا اُعْطِي السَّائِلِيْنَ جو میری یاد میں اپنے لئے سوال کرنے سے مستغنی رہے میں اسے مانگنے والے سے افضل دیتا ہوں۔

اور بعض کا خیال ہے کہ زبان کو دعا میں مشغول رکھے اور دل کو مقام رضا پر قائم رکھے۔ تاکہ اس میں دونوں خوبیاں جمع ہو سکیں۔ اور اس حال کے صحت کی علامت یہ ہے کہ دعا بحکم عبودیت و تذلل اور امتثال امر الٰہی میں ہو اور کسی خواہش کے ارادے اور حصول مقصد کی تمنا کے بغیر ہو۔ اور قبولیت کی تاخیر سے ناراضگی کا اظہار نہ کرے۔ اور اپنے رب کریم پر تہمت نہ رکھے۔ کیونکہ قبول فرمانا اور نہ قبول فرمانا دونوں اس کے حضور برابر ہیں۔

امام قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اوقات مختلف ہیں۔ بعض حالتوں میں سکوت سے دعا بہتر ہوتی ہے اور وقت کا ادب اسی میں ہوتا ہے اور بعض حالتوں میں دعا سے سکوت افضل ہوتا ہے اور اس میں ادب یہی ہوتا ہے اور اس بات کی شناسائی بھی وقت میں ہی ظاہر ہوتی ہے اس لئے کہ علم بھی وقت میں ہی حاصل ہوتا ہے اور اگر اپنا دل دعا کی جانب اشارہ کرے تو دعا اولیٰ ہوتی ہے۔ اور اگر سکوت کی جانب اشارہ کرے تو سکوت اولیٰ۔ نیز اگر علم، وقت میں غالب ہو تو دعا اولیٰ ہے۔ اس لئے کہ اس کا ہونا عبادت ہے اور اگر غالب، معرفت و حال ہے تو سکوت و سکون اولیٰ ہے۔ نیز جو کچھ مسلمانوں کے نصیب میں ہے بامر الٰہی اس میں دعا حق ہے اور جہاں نفس کی لذت اور خواہش ہو وہاں سکوت احسن و بہتر ہے۔ (انتہٰی)

بندۂ مسکین خصہ اللہ بمزید الیقین (صاحب مدارج) کہتا ہے کہ دعا کبھی بزبان قال ہوتی ہے جیسا کہ زبان سے اپنی حاجت کا مانگنا اور کبھی بزبان حال کہ بندے کی حالت خود عرض کناں ہوتی ہے اور کبھی بزبان تعرض ہوتی ہے جیسے حق تبارک وتعالیٰ کی مدح و ثنا اس کی صفات کرم واحسان اور جود وعطا سے کرے اور یہ بھی دعا ہی ہے اس لئے کہ حضرت کریم کی مدح و ثنا کرنا ہی دعا و سوال کا عرض کرنا ہے۔

اور سکوت کا دعا سے فائق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں خالص تسلیم و رضا ہے اور بعض عرفاء نے دعا، استعداد کی زبان سے بھی مانگی ہے۔ اور یہ بزبان حال کی دعا سے فائق ہے اور یہ سکوت میں بھی حاصل ہے۔ (فافہم)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کے آداب و شرائط بیان فرمائے ہیں جو کتابوں میں مذکور ہیں۔ ان میں سے کچھ عمدہ ترین آداب یہ ہیں کہ حلال روزی، راست گو، دعا میں گڑگڑانا قبولیت کیلئے جلدی نہ کرنا، شروع میں خدا کی حمد و ثنا کرنا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام پڑھنا، آپ کے آل و اصحاب پر بھی سلام بھیجنا وغیرہ ہیں۔ دعا کے آداب میں سے ایک یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں کو کھول کر چہرہ کے مقابل اٹھانا۔ ایک روایت میں ہے کہ کندھے کے محاذ میں رکھنا ہے یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں ہاتھ جدا جدا ہوں۔ اور کھلے ہوئے ہوں جس طرح کہ چلو بنا کر پانی پیتے ہیں اسی طرح مواہب میں مذکور ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب دعا کرتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو ملا کر ان کے بطون کو چہرے کے مقابل کرتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک کو اتنا بلند کیا کہ بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی (یہ دعائے استسقاء میں ہے)۔ علماء فرماتے ہیں ہرچند کہ یہ اس صورت میں زیادہ ہاتھوں کو بلند فرمانا ہے جب کہ معاملہ نہایت سخت و

دشوار ہو جاتا ہے۔ اور ختم دعا کے بعد ہاتھوں کو چہرے پر ملنا بھی آداب دعا میں سے ہے جب کہ حالت نماز کے سوا میں ہو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت کیلئے دعا مانگی اور وہ سب کیلئے مقبول ہوئی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام دعاؤں کا یہی حال تھا۔ بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر نبی کیلئے ایک دعاء مستجاب ہے۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ اپنی اس دعا کو اپنی امت کی شفاعت کیلئے محفوظ کر کے آخرت کیلئے اٹھا رکھوں۔ بظاہر یہ مشکل ہے اس لئے کہ ہر نبی سے اور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے شمار مقبول دعائیں واقع ہوئی ہیں اور اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر نبی کے لئے صرف ایک ہی مقبول دعا ہوتی ہے۔ اس اشکال کا علماء یہ جواب دیتے ہیں کہ مقبول دعا کا مطلب یہ ہے کہ اس کی مقبولیت کو قطعی اور یقینی طور پر ذکر کر دیا گیا ہو اور ان کے ماسوا ان کی جتنی دعائیں ہیں وہ قبولیت کی امید کے درجہ میں ہیں۔ اور بعض علماء یہ جواب دیتے ہیں کہ ان کی تمام دعاؤں میں افضل دعا ایک ہی ہے۔ اگرچہ ان کیلئے اور بھی دعائیں ہوں اور بعض کہتے ہیں کہ ہر نبی کیلئے ایک دعائے عام ہے جو ان کی امت کے حق میں مستجاب ہے خواہ امت کی ہلاکت میں ہو یا ان کی نجات میں، لیکن مخصوص دعائیں تو کچھ مقبول ہیں اور کچھ نامقبول۔ یا یہ مراد ہے کہ ہر نبی کیلئے ایک دعا ہے خواہ امت کے بارے میں ہو جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے مانگی۔ "رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا۔" اے میرے رب روئے زمین پر کسی کافر کو بستا نہ چھوڑ یا نبی کی وہ دعا جو اپنی ذات خاص کیلئے ہو جیسا کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے مانگی۔ "فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا يَّرِثُنِیْ۔" تو میرے لئے اپنی طرف سے ایسا ولی دے جو میرا وارث ہو۔ یا جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے مانگی۔ "رَبِّ هَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ۔" اے میرے رب مجھے ایسی حکومت عطا فرما جو میرے بعد کسی کے لئے سزاوار نہ ہو۔

کرمانی نے شرح بخاری میں سوال کیا ہے کہ کیا نبی کے حق میں یہ جائز ہے کہ اس کی دعا مقبول نہ ہو اس کا جواب دیا کہ ہر نبی کی ایک دعا ضرور مقبول و مستجاب ہے اور باقی دعائیں مشیت باری تعالیٰ میں ہیں۔ علامہ عینی حنفی شارح بخاری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ یہ سوال اچھا معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اس میں ایک قسم کی شناعت ہے اور ہم شک نہیں رکھتے کہ انبیاء علیہم السلام کی تمام دعائیں مقبول و مستجاب ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "ہر نبی کی ایک خاص دعا ہوتی ہے اس سے حصر مراد نہیں ہے۔" انتہی۔

بعض محققین فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے زیادہ معزز و مکرم ہیں کہ آپ اپنے رب سے کوئی دعا مانگیں اور وہ اسے قبول نہ فرمائے اور ایسی کوئی دعا منقول نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی دعا مانگی ہو اور وہ قبول نہ ہوئی ہو۔ مگر یہ کہ اس میں کوئی کامل مصلحت ہو جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ میں نے امت کیلئے تین دعائیں مانگیں۔ ایک یہ کہ میری امت کو زمین میں نہ دھنسایا جائے دوسری یہ کہ ان کو قحط سے ہلاک نہ کیا جائے۔ تیسرے یہ کہ ان میں آپس میں خونریزی واقع نہ ہو تو پہلی دو دعاؤں کو تو شرف قبول حاصل ہوا۔ اور تیسری دعاء سے منع کر دیا گیا۔ یہ احتمال رکھتا ہے کہ منع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے آپ سے فرمایا ہو گا کہ آپ ایسی دعا نہ کریں یہ مطلب نہیں کہ دعا کرنے کے بعد قبولیت سے منع کر دیا گیا۔ اگرچہ یہ بات اس عبارت میں غیر متعارف ہے۔ (واللہ اعلم)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خادم خاص حضرت انس رضی اللہ عنہ کیلئے دعا فرمائی جب کہ ان کی والدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا ان کو لے کر آئیں۔ اور دعا کی درخواست کرتے ہوئے عرض کیا یا رسول اللہ اپنے خادم انس کیلئے دعا فرمایئے۔ حضرت انس جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو وہ آٹھ یا نو سال کے تھے۔ اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سال خدمت کی اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کیلئے دعا مانگی اور فرمایا: "اَللّٰهُمَّ بَارِكْ فِیْ مَالِهٖ وَوَلَدِهٖ وَاَطِلْ حَيَاتَهٗ"

اغْفِرْلَہٗ۔ " اے خدا اس کے مال و اولاد میں برکت دے۔ اور اس کی عمر میں درازی کر دے اور اسے بخش دے۔ اور ایک روایت میں ہے: "وَاَدْخِلْہُ الْجَنَّۃَ۔ " اور اسے جنت میں داخل فرما دے تو ان کی عمر ایک سو سال سے متجاوز ہوئی۔ تین سال یا سات سال اور کم سے کم جو روایت کی گئی ہے وہ ننانوے سال ہے۔ اور ان کی کھجوروں کے باغوں میں سال میں دو مرتبہ پھل لگا کرتے تھے۔ ترمذی نے ابو العالیہ سے روایت کی ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا ایک باغ ایسا تھا جس میں سال میں دو مرتبہ پھل آتے تھے اور ان میں ایسی خوشبو آتی تھی جو مشک نافہ سے فائق تھی۔ اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں اور ان کی اولاد پوتے پر پوتے یہ سب سنو سے متجاوز تھے۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ میری بیٹی امینہ نے جو کہ میری آخری صلبی اولاد ہے اس نے میری اولاد میں سے ایک سو دو کو دفن کیا ہے۔ اور ایک روایت میں ایک سو بیس ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے تین دعاؤں کو تو پا لیا ہے یعنی کثرت مال و اولاد اور طول حیات کو اب چوتھی دعا کا امیدوار ہوں۔ وہ انشاء اللہ تعالیٰ جنت کا داخلہ ہے۔

اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مالک بن ربیعہ سلولی کیلئے دعا فرمائی کہ ان کی اولاد میں برکت دی جائے تو ان کے سترلڑکے پیدا ہوئے اسے ابن عساکر نے روایت کیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس کسی کو بھیجا تو اس نے آکر عرض کیا وہ آشوب چشم میں مبتلا ہیں پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آنکھوں میں لعاب دہن لگایا اس وقت ان کا درد جاتا رہا اور یہ دعا فرمائی: "اَللّٰھُمَّ اَذْھِبْ عَنْہُ الْحَرَّ وَالْبَرْدَ" اے خدا ان سے گرمی و سردی کو دور رکھ تو وہ نہ گرمی پاتے نہ سردی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو انہوں نے عرض کیا میں قضا جانتا نہیں کہ کس طرح مقدمات کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک ان کے سینے پر رکھ کر دعا فرمائی "اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَلْبَہٗ وَسَدِّدْ لِسَانَہٗ" اے خدا ان کے دل کی ہدایت فرما اور ان کی زبان کو سیدھا چلا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں خدا کی قسم مجھے دو شخصوں کے درمیان فیصلہ کرنے میں کبھی شک و تردد نہ ہوا اسے ابو داؤد وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ایک بیماری میں عیادت کرتے ہوئے دعا کی: "اَللّٰھُمَّ اشْفِہٖ اَللّٰھُمَّ عَافِہٖ۔ " اے خدا! انہیں شفا دے اور عافیت دے اس کے بعد فرمایا کھڑے ہو جاؤ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد درد نے کبھی عود نہ کیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا جناب ابو طالب بیمار ہوئے تو انہوں نے کہا اے میرے بھتیجے اپنے رب سے میرے لئے دعا کیجئے کیونکہ آپ نے میری بیمار پرسی کی ہے کہ وہ مجھے صحت دے پھر حضور نے دعا فرمائی: "اَللّٰھُمَّ اشْفِ عَمِّیْ" اے خدا میرے چچا کو شفا دے تو ابو طالب فوراً کھڑے ہو گئے گویا کہ ان کے بندھے پاؤں کھول دیئے گئے۔ پھر ابو طالب نے کہا اے بھتیجے آپ جس رب کی عبادت کرتے ہیں وہ آپ کو دیتا ہے اور جو آپ چاہتے اور جو دعا مانگتے ہیں اسے قبول فرماتا ہے اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے میرے چچا اگر تم بھی اس رب کی عبادت کرو اور اس کی اطاعت کرو تو وہ تمہیں بھی جو چاہو گے دے گا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کیلئے دعا فرمائی: "اَللّٰھُمَّ فَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ اَللّٰھُمَّ اَعْطِہِ الْحِکْمَۃَ وَعَلِّمْہُ التَّاوِیْلَ۔ " اے رب انہیں دین کی سمجھ دے۔ اے خدا! حکمت عطا فرما اور انہیں تفسیر کا علم سکھا۔ اسے بیہقی اور ابو نعیم نے روایت کیا۔ بخاری میں ہے۔ "اَللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ الْکِتٰبَ" اے خدا! انہیں قرآن کا علم سکھا۔ اسی دعا کا ثمرہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما "حبر الامۃ" بحر علم، رئیس المفسرین، ترجمان القرآن جیسے بلند درجہ صاحب مقام رفیع ہوئے۔ (رضی اللہ عنہ)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نابغہ جعدی کی بتیسی بہت پسند آئی تو آپ نے ان کیلئے دعا فرمائی۔ خدا ان کے دانتوں کو نہ گرائے تو ان کی عمر سو سال سے متجاوز ہوئی۔ ایک روایت میں ہے ایک سو سے کچھ اوپر ہوئی مگر ان کا ایک دانت نہ گرا اور تمام لوگوں

سے ان کے دانتوں کی آب وتاب اور خوبصورتی زیادہ تھی۔ ایک روایت میں ایسا آیا ہے کہ جب کوئی دانت گرتا تو دوسرا دانت اس کی جگہ نمودار ہو جاتا تھا۔

ایک مرتبہ عمرو بن اخطب نے حضور کو پیالے میں پانی پلایا انہوں نے دیکھا کہ پانی میں بال پڑا ہے، بال نکال کر پھینک دیا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی "اَللّٰھُمَّ جَمِّلْهُ" اے خدا انہیں صاحب جمال بنا اور انہیں خوبصورتی عطا فرما تو ان کی عمر ننانوے سال کی ہوئی مگر ان کے سر اور داڑھی کا ایک بال سفید نہ ہوا۔ ظاہر تعلق اور پانی کے پیالہ سے بال نکالنے سے مناسبت حسن و جمال اور جوانی ہے۔ اور اسی حسن و جمال کی ان کیلئے دعا مانگی۔ اکثر جوانی کے حسن و جمال سے داڑھی کی سیاہی مراد لیتے ہیں۔ اول کتاب میں حلیہ شریف اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے ہائے مبارک میں سفیدی نہ ہونے کے ضمن میں بحث لکھی جا چکی ہے۔

بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ایک یہودی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی مبارک سے کوئی چیز نکالی جو داڑھی مبارک میں تھی مثلاً تنکا وغیرہ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اَللّٰھُمَّ جَمِّلْهُ" تو اس یہودی کے داڑھی کے بال باوجودیکہ سفید تھے سیاہ ہو گئے۔ نیز مروی ہے کہ ایک یہودی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے اونٹنی کا دودھ دوہا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی۔ "اَللّٰھُمَّ جَمِّلْهُ" تو اس کے بال سیاہ ہو گئے اور وہ نوے سال تک زندہ رہا مگر بوڑھا نہ ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر وبیگانے لوگ بھی حضور کے دسترخوان نعمت وبرکت سے محروم نہ رہتے تھے تو مسلمانوں اور محبت کرنے والوں کا کیا اندازہ۔

نیز اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بزرگوں کی خدمت ورضاجوئی میں خاص تاثیر ہے اور کافروں پر بھی خیر وبرکت کا افاضہ ہوتا ہے اگرچہ اخروی خیر وبرکت سے محروم، مایوس رہیں مگر دنیا میں محروم نہیں رہتے۔ اگرچہ اونٹنی کے دودھ دوہنے اور حسن و جمال کی دعا دینے میں کوئی معنوی ومناسبت ظاہری نہیں ہے لیکن اتفاق ایسا ہی پڑا۔ ممکن ہے وہ یہودی ظاہری حسن و جمال رکھتا ہو۔ اس پر مزید زیادتی کیلئے دعا فرمائی ہو (واللہ اعلم)

ایک اور شخص کیلئے فرمایا۔ "اَللّٰھُمَّ مَتِّعْهُ بِشَبَابِهٖ" اے خدا اسے جوانی نصیب فرما۔ اس پر اسی سال گزر گئے مگر ایک بال سفید نہ نکلا۔

مروی ہے کہ ایک دن حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا اس حال میں آئیں کہ ان کے چہرۂ انور پر بھوک کی زردی پھیلی ہوئی تھی جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف نظر اٹھائی تو اپنا دست مبارک ان کے سینے پر رکھ کر دعا کی۔ اے خدا بھوکوں کو سیر فرما۔ اے خدا فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھوکا نہ رکھ فوراً۔ ان کے چہرے پر سرخی دوڑ آئی۔ سیدہ زہرہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں اس کے بعد میں کبھی بھوکی نہ رہی اسے ابن یعقوب اسفرائی نے "دلائل الاعجاز" میں بیان کیا ہے۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عروہ بن ابی الجعد بارقی کیلئے دعا فرمائی کہ۔ "اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لَهٗ فِیْ صَفْقَتِهٖ" ۔ "اے خدا ان کی خرید وفروخت میں برکت دے تو وہ جو چیز خریدتے اس میں انہیں نفع ہوتا اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے اموال میں غنا وبرکت کی دعا فرمائی تو وہ تونگری کے اس مقام پر پہنچے کہ وہ خود فرماتے ہیں اگر میں پتھر کو بھی اٹھاتا تھا تو امید رکھتا تھا کہ اس کے نیچے سونا چاندی ہوگا۔ اور قبیلۂ مُضر پر قحط کی دعا کی تو وہ قحط میں ایسے مبتلا ہوئے کہ کھالیں اور مردار کھانے لگے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کا قصہ جو عتبہ بن ابو لہب پر فرمائی کہ۔ "اَللّٰھُمَّ سَلِّطْ عَلَيْهِ کَلْبًا مِّنْ کِلَابِکَ۔" اے خدا اس پر اپنے کتوں میں سے کوئی کتا مسلط کر دے۔

مشہور ہے ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بائیں ہاتھ سے کھایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے داہنے ہاتھ سے کھانے کا حکم فرمایا۔ اس نے کہا میں نہیں کر سکتا۔ فرمایا کبھی تو نہ کر سکے گا تو وہ کبھی اس کے بعد اپنے داہنے ہاتھ کو منہ تک نہ اٹھا سکا۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھجور کے درخت کے آگے نماز پڑھ رہے تھے تو ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان

سے گزرا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے ہماری نماز کو قطع کیا اللہ تعالیٰ اس کے قدموں کو قطع کرے۔ تو وہ شخص بیٹھ گیا اور کبھی کھڑا نہ ہو سکا ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بلایا انہوں نے آنے میں دیر لگائی لوگوں نے کہا وہ کھانا کھا رہے ہیں فرمایا اللہ اس کے پیٹ کو کبھی سیر نہ کرے تو معاویہ رضی اللہ عنہ اس کے بعد کبھی شکم سیر نہ ہوئے۔ یہ وہ باتیں ہیں جنہیں علماء نے بیان کیا ہے اور یہ سب آپ کے دریائے معجزات کا ایک قطرہ ہے ان کے ماسوا بے شمار مثالیں ہیں۔ اور دعا کی اجابت و قبولیت تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین اور پیروؤں میں سے اولیاء و صلحاء امت کو بھی حاصل ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا کیفیت ہوگی؟ حق یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام دعائیں مقبول و مستجاب ہیں جیسا کہ کہا گیا۔

اب رہا استغفار فرمانا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر گھڑی استغفار کرتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ کُلَّ یَوْمٍ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً۔" بلاشبہ میں اللہ تعالیٰ سے روزانہ ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔ ایک روایت میں ستر مرتبہ سے زیادہ ہے اور ایک روایت میں سو مرتبہ ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ کثرت استغفار اور اس میں مبالغہ مراد ہے نہ کہ یہ مخصوص عدد (واللہ اعلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے وہ فرماتے ہیں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مجلس میں کھڑے ہونے سے پہلے سو مرتبہ اسے پڑھتے گنا کرتے تھے۔ "اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ۔" ایک روایت میں ہے "اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الْعَظِیْمَ۔" الخ اور ایک روایت میں ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے یہ ہے کہ ہم گنا کرتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مجلس میں اسے سو مرتبہ پڑھتے تھے "رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَتُبْ عَلَیَّ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ۔" بخاری میں شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سید الاستغفار" یہ ہے کہ پڑھے:

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ خَلَقْتَنِیْ وَاَنَا عَبْدُكَ وَاَنَا عَلٰی عَھْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ اَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَیَّ وَاَبُوْءُ بِذَنْبِیْ فَاغْفِرْلِیْ فَاِنَّہٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّآ اَنْتَ۔

اور ایک روایت میں اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ الخ آیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اسے دن میں یقین کامل کے ساتھ پڑھے اور شام ہونے سے پہلے مر جائے تو وہ جنت میں جائے گا اور جو اسے رات میں کہے صبح ہونے سے پہلے مر جائے تو جنت میں جائے گا۔

علماء فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استغفار کرنا امت کی تعلیم و تشریع کے لئے ہے۔ تاکہ وہ ہمیشہ استغفار کرنے اور توبہ کرنے والے رہیں۔ ورنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو معصوم و مغفور ہیں آپ کو استغفار و توبہ کی کیا ضرورت ہے۔ یا یہ استغفار امت کیلئے فرماتے تھے (واللہ اعلم)

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّہٗ لَیُغَانُ عَلٰی قَلْبِیْ وَاِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ (الحدیث) بلاشبہ بعض اوقات میرا دل در پردہ ہوتا ہے تو میں خدا سے استغفار کرتا ہوں۔ یغان غین سے ماخوذ ہے غین اس رقیق و لطیف پردے کو کہتے ہیں جو آفتاب پر آجاتا ہے اور اس غین و در پردہ کی حقیقت پانے سے علماء و عرفا عاجز و حیران ہیں۔ اکثر کا یہ خیال ہے کہ یہ غین ایک پردۂ رقیق و لطیف ہے جو بحکم بشریت لوگوں سے ملنے جلنے، دین و ملت کے امور کا اہتمام کرنے، مخلوق کو دعوت دینے اور احکام شریعت بیان کرنے سے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدۂ شہود پر مشاہدہ وحدت سے یک گونہ فرق و غفلت طاری ہوتا ہے نور وحدت کے ظہور و ذکر کی آگ سے جو اشتغال و اضمحلال رونما ہوتا ہے اس حالت کے پیش آنے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم استغفار کرتے تھے۔

"حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّاٰتُ الْمُقَرَّبِیْنَ" نیکو کاروں کی نیکیاں مقربین کی بدیاں ہوتی ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر لحہ مقام قرب میں ترقی در ترقی تھا۔ اور تجلیات حق کے رنگ میں آپ کے مشاہدات کی حدو نہایت نہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر آن نور جلال کا پردہ دکھائی دیتا تھا اور نورانی تجلی پر اور نورانی تجلی کا اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ آگے کے مقام کے منکشف ہوجانے کے بعد پہلے مقام کے توقف پر استغفار کرتے تھے کہ کیوں اس وقت تک اسی مقام میں توقف ہے۔ آپ اسے اپنی خطا جانتے ہیں۔ بعض صوفیاء اسے کہتے ہیں "غَیْنُ الْاَنْوَارِ لَاغَیْنُ الْاَغْیَارِ" انوار کا پردہ ہوتا تھا نہ کہ غیریت کا پردہ طیبی مشکوٰۃ میں شیخ الوقت شیخ شہاب الدین سہروردی سے نقل کرکے فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح اقدس ہمیشہ مقام ترقی وشوق اور رفیق اعلیٰ سے ملنے اور عالم ملکوت سے ملحق ہونے میں جوان کا مقام اصلی ہے رہتی تھی۔ اور قلب روح کے تابع اور نفس قلب کے تابع ہوتا ہے۔ اور شک نہیں ہے قلب کی حرکت ور فتار، نفس کی حرکت سے زیادہ تیز اور قائم ہے تو لامحالہ نفس مقام قرب اور حریم عزت کے عروج میں روح اور قلب کی مصاحبت ورفاقت سے جدا ہوجاتا ہے جو علاقہ عنصری سے انقطاع کا موجب ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور اس کی غیر متناہی رحمت ومہربانی ہے کہ خلق کی تکمیل وارشاد کیلئے آپ کے عنصر شریف کی بقاء کا اقتضا فرماتی ہے۔ اور جلد ہی یہ غین اور اس پردہ کو قلب شریف کی حرکت کم کرنے کیلئے ڈالتی تھی تاکہ بالکلیہ قلب، روح کی طرف چلا نہ جائے۔ اور عالم قدس سے نہ مل جائے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کمال شوق اور جہان میں جذب ہونے کی وجہ سے قلب کی حرکت کے کم ہونے کے باعث استغفار کرتے تھے۔ باوجود اس بات کے کہ اس میں حکمت ومصلحت ہے۔ اور تکمیل امت کی خواہش کمال درجہ ہے مگر ترقی کیلئے استغفار اور عذر خواہی کرتے تھے۔

اصمعی سے جو علم لغت کے بڑے عالم ہیں لوگوں نے غین کے بارے میں پوچھا کہ یہ کیا ہے اور اس سے کیا مراد ہے فرمایا سائل اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غین کے سوا، کے بارے میں پوچھتا تو اس کا جواب جو کچھ میں جانتا دے دیتا۔ لیکن قلب مصطفیٰ اور اس کے احوال وصفات کے بارے میں دم مارنے کی سکت نہیں ہے۔ مجھے اصمعی کی یہ بات بہت اچھی معلوم ہوئی اللہ تعالیٰ نے اس کو قلب مصطفوی کے ادب واحترام کی توفیق مرحمت فرمائی جس کو سوا خدا کے کوئی نہیں جان سکتا۔ اور جو بھی جو کچھ کہتا ہے اپنی معرفت وقیاس کے مطابق کہتا ہے۔ اور آپ کا مقام ان سب سے بلند وارفع ہے جو کوئی مقام کی خبر دیتا ہے۔ اور حقیقت حال کا انکشاف کرتا ہے وہ متشابہات کی تاویل کے درپے ہوتا ہے۔ حالانکہ متشابہات کا علم اور اس کی تاویل بجز خدا کے کوئی نہیں جانتا۔

قرأتِ نبوی ، وصل: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرات ترتیل وتفسیر کے ساتھ ایک ایک حرف صاف ہوتی تھی۔ حروف مد میں مد کرتے اور آیت کے سرے پر وقف کرتے تھے۔ چنانچہ پڑھتے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔" اور وقف فرماتے اس کے بعد پڑھتے۔ "اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" وقف کرتے اس کے بعد پڑھتے "مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" اور وقف کرتے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اسے وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں۔ اہل فن قرأت کے وقف میں کچھ قاعدے ہیں، جو باعتبار تمام کلام اور اس کے مابعد سے عدم تعلق اور مابعد کا ماقبل سے انقطاع تعلق، تقسیم کرتے ہیں اسی بناپر وقف کو وقف تام، وقف حسن اور وقف کافی نام رکھتے ہیں۔ جیسا کہ تجوید کی کتابوں میں مذکور ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سورت کو ترتیل سے پڑھتے حتیٰ کہ وہ سورت اس سورت سے بھی بڑھ جاتی۔ جو سورۃ دراز تر ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش آوازی اور خوش قرائت سے زیادہ کوئی دوسرا نہ تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قرأت میں تغنی یعنی لحن صوت کا بھی لحاظ فرماتے۔ اور بسا اوقات اس سے آواز کو بلند فرماتے۔ جیسا کہ فتح مکہ کے روز، سورۂ انا فتحنا کی قرائت میں آواز کی خوش اسلوبی کا لحاظ فرمایا۔ عبداللہ بن مغفل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ترجیع کو تین الف سے

تعبیر کیا ہے۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ترجیع کا عمل یعنی آواز کو بڑھا بڑھا کر پڑھنا آپ کا اختیاری عمل تھا نہ کہ بطریق اضطرار اور اونٹنی کی جنبش سے۔ جیسا کہ لوگ خیال کرتے ہیں۔ اگر اونٹنی کی جنبش سے ہوتا تو عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ اسے بیان نہ کرتے۔ اور اس کی خبر نہ دیتے تاکہ لوگ اس میں آپ کی پیروی کرتے۔ اور ترجیع کو فعلِ رسول کی طرف نسبت نہ کرتے۔ اور یہ نہ کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترجیع فرمائی جیسا کہ ظاہر ہے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "زَيِّنُوا الْقُرْآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ" یعنی اپنی خوش آوازی سے قرآن کو آرائش دو فرمایا: "لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ" یعنی وہ ہم میں سے نہیں جس نے قرآن کو خوش آوازی سے نہ پڑھا اور فرمایا حق تعالیٰ کسی چیز کو ایسا نہیں سنتا۔ اور متوجہ نہیں ہوتا جیسا کہ نبی کی خوش آوازی سے پڑھنے کو سنتا ہے اور متوجہ ہوتا ہے یعنی وہ قرآن کو خوش آوازی اور جہر سے پڑھتا ہے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لِكُلِّ شَيْءٍ حِلْيَةٌ وَحِلْيَةُ الْقُرْآنِ حُسْنُ الصَّوْتِ۔" یعنی ہر چیز کی ایک زیبائش ہے اور قرآن کی زیبائش خوش آوازی ہے۔ مروی ہے کہ ایک رات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی قرائت توجہ سے سماعت فرمائی کیونکہ وہ حد درجہ خوش آواز اور خوش خواں تھے۔ ان کی مدح میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "أُعْطِيَ مِزْمَارًا مِنْ مَزَامِيرِ آلِ دَاوُدَ" یعنی آل داؤد کے لحنوں میں سے ایک لحن انہیں عطا کیا گیا ہے۔ جب دن ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنے سماعت فرمانے کی خبر دی، حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا افسوس، اگر میں جانتا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ سن رہے ہیں تو میں اس سے زیادہ تحسین و تزئین کے ساتھ پڑھتا۔

علماء نے تغنی بالقرآن کے مسئلہ میں اختلاف کیا ہے بعض نے مطلقاً جائز رکھا ہے یعنی اگرچہ مد میں زیادتی اور حرکات میں اشباع وغیرہ لازم آئے اگرچہ وہ علم موسیقی کے قوانین پر ہو اور بعض مطلقاً منع کرتے ہیں اور حق جو دائرہ انصاف کا مرکز ہے یہ ہے کہ خوش آوازی اور تغنی دو وجہ پر ہے ایک یہ کہ طبیعت اسے چاہے، تکلف، بناوٹ، اور تعلیم کے بغیر ادا کرے۔ بلکہ جب اسے اس کی طبیعت پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اسے خوش آوازی، خوش الحانی کے ساتھ ادا کرے تو یہ جائز ہے۔ اگرچہ تزئین و تحسین کی زیادتی کے ساتھ ادا کرے۔ جیسا کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر میں جانتا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سن رہے ہیں تو اور زیادہ تزئین و تحسین یعنی آراستہ اور سنوار کے پڑھتا۔ اور جس پر خوشی، بیخودی اور شوق کا غلبہ ہو وہ اپنے نفس کا مالک نہ رہے اور قرأت میں خوش آوازی، آراستگی اور تزئین صوت میں اختیار نہ رہے، وہ مطبوع ہے۔ یعنی طبعی صفت ہے۔ منطبع نہیں یعنی اس میں بناوٹ نہیں ہے۔ صوت عرب اور لحن عرب سے یہی مراد ہے اور یہ ایک قسم کی تغنی ہے جسے صحابہ رضی اللہ عنہم کرتے اور سنتے تھے یہ تغنی محمود ہے کیونکہ اس سے پڑھنے والے اور سننے والے دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ علم موسیقی کی صنعتوں میں سے کوئی صنعت ہو وہ از قسم طبائع نہ ہو اور تصنع بناوٹ اور تکلف سے حاصل ہوتا ہو۔ جیسا کہ طرح طرح کے مرکب وغیر مرکب موسیقی کے سر ہیں جو مخصوص تھاپ اور اختراعی آوازوں کے قواعد و اصول سے بنتے ہیں۔ اور یہ بغیر تعلیم و تکلف کے حاصل نہیں ہوتا تو اس قسم کو علمائے سلف مکروہ جانتے ہیں اور اس وجہ سے قرات کرنے سے منع کرتے ہیں۔ اور جسے اسلاف کے احوال کا علم ہے وہ بخوبی جانتا ہے کہ اسلاف موسیقی کے سروں سے بیزار تھے کیونکہ اس کی تمام باتوں میں تکلف اور بناوٹ ہوتی ہے یہ حضرات اس طریقے پر قرآن پڑھنے سے بیزار و مجتنب ہیں اور اسے جائز نہیں رکھتے بلکہ سوز و گداز، خوش آوازی اور خوش خوانی سے پڑھنے کو پسند کرتے ہیں۔ اور یہ ایسی بات ہے جو سب طبیعتوں میں موجود ہے۔ اور شارع علیہ السلام نے اس کی ممانعت نہیں فرمائی۔ بلکہ اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

اور لوگوں سے اس طرح پڑھوایا ہے اور خبر دی ہے کہ حق تعالیٰ ایسے پڑھنے کو خوب سنتا ہے۔ اور فرمایا جو خوش آوازی سے قرآن نہیں پڑھتا وہ ہم میں سے نہیں۔

ابن ابی شیبہ، عقبہ بن عامر سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا قرآن کو سکھاؤ اور اسے خوش آوازی سے پڑھو اور حدیث کو لکھو۔ یہ سب مواہب لدنیہ میں مذکور ہے۔

حکایت بیان کرتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام جب چاہتے کہ بنی اسرائیل سے کلام فرمائیں اور انہیں زبور سنائیں تو سات دن بھوکے رہتے اور اپنی ازواج پر تشریف نہ لاتے اس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام سے فرماتے کہ اطراف و جوانب، دشت و جبل ہر جگہ اعلان کر دو کہ داؤد فلاں دن اجلاس کریں گے اور کلام کریں گے اس کے بعد منبر نکال کر میدان میں بچھایا جاتا اس پر حضرت داؤد علیہ السلام تشریف فرما ہوتے ان کے پیچھے حضرت سلیمان علیہ السلام کھڑے رہتے۔ جن و انس، وحش و طیور اور حشرات الارض جمع ہو کر چاروں طرف بیٹھ جاتے۔ کنواری اور پردہ نشین عورتیں آتیں۔ ذکر کو سنتیں اس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام حمد و ثنائے الٰہی سے ابتدا فرماتے اور زبور کی تلاوت کرتے اس پر سننے والوں کی ایک جماعت مر جاتی۔ اس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام گنہگاروں کی طرف متوجہ ہو کر نصیحت شروع فرماتے۔ اس پر بھی ایک جماعت سننے والوں کی مر جاتی۔ اس کے بعد جب کثیر تعداد مرنے والوں کی ہو جاتی تو حضرت سلیمان علیہ السلام عرض کرتے اے اللہ کے نبی لوگوں کی موتیں بہت کثرت سے ہو گئی ہیں۔ اور سننے والوں کے جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں تو حضرت داؤد علیہ السلام چہرے کے بل گر پڑتے اور بیہوش ہو جاتے اور وہ انہیں اٹھا کر گھر لاتے۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام لوگوں میں اعلان فرماتے کہ جس کا خویش و اقارب اور دوست ہے وہ لاشوں کو تلاش کر کے نکال کے لے جائے تو عورتیں تختوں کو لے کر آتیں اور اپنے شوہروں، فرزندوں اور بھائیوں کو اٹھا کر بستی میں لے جاتیں۔ اور جب حضرت داؤد علیہ السلام دوسرے دن ہوش میں آتے تو حضرت سلیمان علیہ السلام سے دریافت فرماتے کہ بنی اسرائیل کے لوگوں کا کیا حال ہے؟ عرض کرتے اے اللہ کے نبی (علیہ السلام) فلاں فلاں مر گیا ہے اور سب کے نام گناتے۔ اس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھوں کو سر اور منہ پر مار کر مناجات کرتے، اے خدا تو کیا داؤد سے ناراض ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ اسے موت سے ہمکنار نہیں کیا۔ جو تیرے خوف اور شوق میں مر گئے ہیں تو حضرت داؤد علیہ السلام کا دوسری مجلس تک یہی حال رہتا۔ اور وہ ہمیشہ اسی حال پر قائم رہے۔ جب تک کہ اللہ عزوجل نے چاہا۔

کوئی یہ گمان نہ کرے کہ بنی اسرائیل کا حال، اس امت کے حال سے اکمل و اعلیٰ تھا۔ لیکن غنا اور مزمار میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا حال بہت کافی ہے۔ جو کہ ان کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ آل داؤد کے مزامیر میں سے ایک مزمار دیا گیا ہے۔ لیکن خوف و شوق سے مرنا تو اس کا جواب دو طرح پر ہے۔ ایک یہ کہ ہم کہتے ہیں کہ اس امت کو وہ قوت عطا فرمائی گئی ہے جو ہر اس حالت کو جو درپیش ہو برداشت کر لیتی ہے۔ اور اس کی قوت جسمانیہ فنا نہیں ہوتی۔ بلکہ تائیدات الٰہیہ سے قوت روحانیہ پیدا ہوتی ہے۔ یہ اس امت کی قوت کی زیادت اور اس پر قائم رہنے کی بنا پر ہے کہ سماع موعظ کا حال اور عدم کا حال برابر ہے۔ بلکہ پے در پے احوال ذکر و اطوار سے یقین ہی بڑھتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے: "لَوْ كُشِفَ الْغِطَاءُ مَا ازْدَدْتُ يَقِيْنًا" اگر حجابات اٹھا دیئے جائیں تو یقین ہی زیادہ ہو۔ یا جس طرح کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا حال ہے کہ باوجود یکہ وہ اصحاب مزامیر اور اس کے اخص خواص تھے امت سے افضل ہیں۔ موت کا انہیں اتفاق نہ ہوا جس طرح کہ دوسروں کو موت کا اتفاق پڑا۔ یہ نہ تھا مگر اس بنا پر کہ ان کا حال تمکین و قوت اور اس ربانی قوت کی بنا پر جو ان کی مدد کر رہی تھی لیکن حضرت داؤد علیہ السلام کا نہ

مرنے پر توجہ فرماتا اور اس سے ان کا معذرت خواہ ہونا تو یہ تواضع وانکسار اور امت پر ان کی شفقت میں سے ہے نہ یہ کہ اپنے کسی امتی کے مرتبہ سے کمتر ہونے میں ہے۔ (معاذ اللہ) اور اس قوت الٰہیہ اور قلب کے متحمل ہونے کی جانب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اشارہ فرمایا ہے کہ ایک دن ایک شخص کو قرآن کریم سننے کے وقت روتے اور بے چین و بے خود ہوتے دیکھا تو فرمایا ہم بھی ایسے ہی تھے لیکن اب ہمارا دل سخت ہو گیا ہے انہوں نے قوت و تحمل کو بر بنائے تواضع انکسار، قسوۃ و سختی سے تعبیر فرمایا حالانکہ ان کا مرتبہ محفوظ ان کی منزلت بہت بلند اور وہ ہر برائی سے مرفوع ہیں۔

منقول ہے کہ حضرت سہل تستری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن کسی سے قرآن کریم سنا تو ان کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اور بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔ بعد کو لوگوں نے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ پہلے تو کبھی ایسا حال نہ تھا۔ فرمایا حال کی کمزوری ہے۔ لوگوں نے کہا اگر یہ کمزوری ہے تو قوت پھر کیا ہے؟ فرمایا، قوت ہے کہ سب جذب کرے اور اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ اور قائم رہے۔

اور دوسرا طریقہ اس کے جواب کا یہ ہے کہ اس امت میں بھی بہت سے اگلے پچھلے لوگ، سماع قرآن کی مجلس میں خوف و شوق میں مرے ہیں۔ اور ذوق و شوق میں اس جہاں سے چل بسے ہیں۔ مواہب لدنیہ میں لکھا ہے کہ ابو اسحٰق ثعلبی نے ایسے حضرات کے اسماء میں کئی جلدیں لکھی ہیں اور کتاب "نفحات الانس" میں بھی ان حضرات کا ذکر ہے جو سماع قرآن کی مجلس میں جان، جان آفریں کے سپرد کر چکے ہیں۔

مسئلہ سماع۔ وصل: اب جب کہ قرآن کو خوش آوازی سے پڑھنے کی بات چل نکلی ہے تو اگر مجملاً مسئلہ سماع کا بھی اشارہ کر دیا جائے تو بعید نہ ہو گا۔ واضح رہنا چاہئے کہ اس مسئلہ میں قدیم و جدید اور قول و فعل میں بہت اختلاف ہے۔ بعض اباحت پر قائم ہیں۔ اور بعض شک و تردد میں ہیں اور کہتے ہیں نہ ہم اسے کرتے ہیں اور نہ انکار کرتے ہیں۔ جاننا چاہئے کہ سماع کا مشار الیہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۔ جو بات کو سنتے اور اس پر خوب پیروی کرتے ہیں۔ ارشاد باری ہے: "وَاِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْیُنَهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ " اور جب سنتے ہیں جو رسول پر نازل ہوا تو دیکھئے کہ عرفان حق سے ان کی آنکھیں ابل پڑتی ہیں۔ عوارف میں کہتے ہیں کہ یہ وہ سماع ہے جس کی حقانیت پر سب کا اتفاق ہے اور کسی کا اس میں اختلاف نہیں ہے۔ یہ سماع اپنے رب سے رحمت کے حصول کا موجب ہے۔ البتہ اختلاف، اشعار و قصائد کو بالحان مطربہ موسیقیہ کے سماع میں ہے اور اس میں کثرت اقوال اور تباین احوال ہے۔ بعض اسے ممنوع قرار دیتے ہیں اور فسق و فجور کے ساتھ ملاتے ہیں اور بعض اسے جائز اور اسے حق واضح شمار کرتے ہیں اور دونوں گروہ میں افراط و تفریط ہے (انتہی کلام العوارف)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس مسئلہ میں تین راہیں ہیں۔ ایک مذہب فقہاء کا ہے یہ حضرات اس کا شدت و سختی کے ساتھ انکار کرتے ہیں۔ اور مسلک تعصب و عناد کی راہ پر گامزن ہیں۔ اور اس فعل کو ذنوب و کبائر کے ساتھ ملاتے ہیں۔ اور کفر و زندقہ اور الحاد سے اسے اعتقاد کرتے ہیں۔ اور یہ افراط و زیادتی ہے اور طریقہ اعتدال و انصاف سے خروج ہے انہیں اس پر اتنی جرات نہ کرنی چاہئے۔ خصوصاً اختلافی مقامات میں۔ ہاں اس پر علماء مذہب کے جو حرمت و کراہت پر دلائل ہیں اسے نقل کیا جا سکتا ہے۔ اور دوسرا مذہب محدثین کا ہے۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ اس کی حرمت میں حدیث صحیح اور نص صریح کوئی ثابت نہیں ہے بلکہ اس ضمن میں جتنی حدیثیں مروی ہیں وہ یا تو موضوع ہیں یا مطعون۔ اسی طرح آیات قرآنیہ میں ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین نے ایسی تفسیریں کی ہیں جو حرمت غنا پر دلالت کرتی ہیں لیکن ان کی تاویلیں اور محمولات اور بھی ہیں جن کو ان کے سوا دیگر مفسرین و علماء نے بیان کیا ہے لہٰذا جب حرمت ثابت نہ ہو تو حل و اباحت ثابت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد دلیل ہے کہ "وَاُحِلَّ لَكُمُ الطَّیِّبٰتُ " تمہارے لئے طیبات حلال

بنائی گئیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ دلیل قطعی سے نہ ان کی حرمت ثابت ہوتی ہے اور نہ ان کی اباحت، للٰذا مسئلہ مبنی بر اصل اشیاء میں جو خطر یا اباحت ہے قرار پائے گا۔

اور تیسرا مذہب، سادات صوفیائے کرام کا ہے۔ اس مسئلہ میں ان کا مذہب مختلف اور افعال مجتنب مروی ہیں۔ بعض اجتناب کرتے ہیں اور بعض اس میں شغف رکھتے ہیں اور چاہئے کہ ان کا انکار اشد اور ان کا اجتناب و تشدید اقوی ہو اس لئے کہ ان کا مذہب، عزیمت کو اختیار کرنا اور تمام اوقات و احوال میں اقوال و افعال میں احتیاط کرنا ہے لیکن ان میں سے کچھ حضرات شغف و ثوق سکر محبت، صحو حال اور وجد و ہیجان وغیرہ میں اتنے مغلوب ہیں کہ ان کا حکم فریفتہ و دلدادہ اور مدہوشی کا حکم رکھتا ہے۔ اور نغمات کا نفوس میں اثر انداز ہونے میں شک و شبہ نہیں ہے کہ یہ دلوں کو طرب انگیز کرتا اور باطن میں سرایت کرتا ہے۔ اس کا مشاہدہ ظاہر و عیاں ہے حتیٰ کہ جانوروں میں نادانوں میں اور بچوں میں بھی اس کا اثر دیکھا گیا ہے۔ اور جو ان میں سے متمکن و متحمل اور بساط حکم و آداب پر ثابت قدم رہنے والے ہیں ان کے نہ قدم ڈگمگائے ہیں اور نہ اہل شوق کی مانند متلون، مترعج اور غلبہ وجد و عزام سے منقشعر ہیں۔

بعض عرفاء فرماتے ہیں کہ سماع ان لوگوں کیلئے ہے جو تجلیات صفات کے اہل اور ارباب وجد میں سے ہیں جن پر احوال مختلفہ اور صفات متباینہ کا گزر ہوتا رہتا ہے لیکن جن پر ذات کی تجلی ہوتی ہے ان کا مقام سب سے بلند و ارفع ہے۔

اس جماعت اہل طریقت نے سماع کے آداب و شرائط کی تحقیق کی ہے جو طالب اتباع کے لئے کافی ہیں اور وہ احکام و معارف کے درمیان جامع ہیں۔ ان کو کتاب ”عوارف“ میں ملاحظہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس میں ایک باب ردوانکار میں، ایک باب قبول وایثار میں ایک باب سماع سے ترفع و استغناء میں اور ایک باب ذکر آداب و اعتناہیں باندھا ہے۔ (واللہ اعلم)

صاحب کتاب ”الامتاع باحکام السماع“ فرماتے ہیں کہ سماع کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم وہ ہے جو عام طور پر رائج ہے۔ اور اسے دلوں کی خوشی، کاموں کی آسانی، بوجھوں کے اٹھانے اور حج کی مسافت کو طے کرنے میں استعمال کرتے ہیں اس میں خانہ کعبہ اور زمزم شریف کے اوصاف بیان کرتے ہیں۔ رزمیہ اشعار پڑھتے ہیں جس میں مقام جنگ جہاد اور اس کی تعریف و توصیف ہوتی ہے جیسے حداء، نصب وغیرہ یا بچوں کو بہلانے کیلئے عورتوں کا گنگنانا وغیرہ یہ سب مباح ہیں۔ اگر ان میں فواحش و محرمات کا ذکر نہیں ہے بلکہ مندوب و مستحب ہے کیونکہ اعمال مرفوع پر موجب نشاط ہے دوسری قسم وہ ابتحال و گانا ہے جسے فنکار فن موسیقی کے تحت گاتے اور اشعار میں گدازگی اختیار کرتے ہیں اور آوازوں میں ایسا اتار چڑھاؤ کرتے ہیں جس سے نفس میں ہیجان و سرور آتا اور دلوں کو خوشی و مسرت سے گرماتا ہے، یہ قسم علماء کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ ایک گروہ مباح رکھتا ہے اور ایک گروہ حرام قرار دیتا ہے۔ اور ایک گروہ مکروہ بتاتا ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ امام مالک، امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور امام احمد رحمہم اللہ سے زیادہ مشہور واصح قول کراہت میں ہے۔ اگرچہ حرام کا اطلاق بھی ہے۔ چنانچہ قاضی ابو الطیب، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے حرمت کا قول نقل فرماتے ہیں۔ اور شیخ شہاب الدین سہروردی عوارف میں فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ غنا کو ذنوب و معصیت سے شمار کرتے ہیں۔ اسی طرح قاضی ابو الطیب اس کی حرمت، عامر شعبی، سفیان ثوری، حماد، نخعی اور فاکہی رحمہم اللہ سے اس سند کے ساتھ جو ان کی ہے نقل کرتے ہیں۔ حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ کسی نے ان سے گانے کے بارے میں مسئلہ پوچھا تو فرمایا یہ اس ہوا کی مانند ہے جو ایک کان سے داخل ہو کر دوسرے کان سے نکل جاتی ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ یہ اس کے اباحت کی جانب اشارہ ہے۔ اور اہل کوفہ، اہل مدینہ اور اہل عراق سے اس کی حرمت نقل کی گئی ہے۔ اور ایک جماعت اس کی اباحت کی طرف گئی ہے اس میں انہوں نے قول کو مطلق رکھا اور مرد، عورت اور لڑکوں کے درمیان تفصیل نہیں کرتے ان سب کو برابری دیتے ہیں لیکن اس میں واقع ہونے اور فتنہ سے محفوظ رہنے کی شرط لگاتے ہیں اور بعض قلیل و کثیر اور مرد و عورت کے درمیان فرق

کرتے ہیں اور اباحت کے قائل حضرات کہتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کثیرہ جس میں عشرہ مبشرہ کے بھی کچھ حضرات ہیں اور تابعین وتبع تابعین واتباع تبع اور دیگر علماء محدثین وعلماء دین کا جم غفیر جو صاحبان زہد وتقویٰ اور ارباب علم وعبادت ہیں ان سے غنا اور اس کا سماع مروی ہے اور انہوں نے ان سے اس باب میں اتنی روایات وحکایات بیان کی ہیں جو بہت کافی ہیں۔ اور بلاشبہ پتہ چل جاتا ہے کہ یہ اس میں ائمہ دین اور اکابر اہل یقین اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما کا سماع غنا میں مشغول ہونا مستفیض و مشہور ہے اور ان کو جن فقہاء وحفاظ اور ارباب تواریخ نے دیکھا ہے اسے نقل کیا ہے اور ابن عبدالبر "استیعاب" میں فرماتے ہیں کہ ان کے سماع میں کوئی قباحت نہیں دیکھتا اور ان کے زمانہ میں ان کے چچا حضرت علی مرتضیٰ بن ابی طالب رضی اللہ عنہ امیرالمومنین تھے اور وہ جمیلہ کے گھر جاتے جو بہترین گانے والی تھیں اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ ان کے سوا کسی کیلئے اپنے گھر میں نہیں غنا کروں گی تو وہ ان کے لئے گاتی اور اس نے چاہا کہ ان کے گھر میں آکر ان کو سنائے اور اپنی قسم کا کفارہ دے دے تو انہوں نے اس سے منع فرما دیا۔ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن جعفر کے ہمسایہ بتاتے ہیں کہ وہ گاتی تھیں اور ان کیلئے بربط بجائی جاتی تھی۔

منقول ہے کہ حضرت سعید بن المسیب جو کہ افضل تابعین تھے اور تقویٰ اور پرہیزگاری میں ضرب المثل تھے غنا سنتے اور اس کے سماع سے لطف اندوز ہوتے تھے اسی طرح حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر اور قاضی شریح رضی اللہ عنہم جلالت شان اور کبر سنی کے باوجود باندیوں سے غنا سنا کرتے تھے اور حضرت سعید بن جبیر جو کہ اعاظم تابعین سے تھے باندیوں سے سنتے تھے جو گاتی اور دف بجاتی تھیں اسی طرح عبدالملک بن جریج جو کہ علماء وحفاظ اور فقہاء وعباد میں سے تھے جن کی عدالت وجلالت پر اجماع ہے۔ وہ غنا کو سنتے اور قواعد موسیقی سے واقف تھے اور ابراہیم بن سعد وہ شخص تھے جو فقہ اور روایت میں امام عصر تھے وہ طلبا کو حدیث اس وقت تک نہ سناتے جب تک کہ انہیں غنا نہ سنواتے اور انہوں نے ہارون رشید کی محفل میں غنا کی حلت کا فتویٰ دیا۔ ان سے لوگوں نے امام مالک کا احوال دریافت کیا تو فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے کہ یربوع کے قبیلے میں ان کی دعوت تھی اور اس قبیلہ کے لوگوں کے پاس بربط وغیرہ ساز تھے جو گاتے اور اس سے کرتب دکھاتے تھے۔ اور امام مالک کے پاس چوکور دف تھا جسے بجایا جاتا۔ اور گایا جاتا تھا۔ (واللہ اعلم)

صاحب تذکرہ نے حکایت نقل کی ہے کہ لوگوں نے امام ابو حنیفہ اور سفیان ثوری رحمہما اللہ سے غنا کا مسئلہ پوچھا تو دونوں نے فرمایا غنا نہ کبائر میں سے ہے نہ صغائر میں سے۔ منقول ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ایک ہمسایہ تھا جو ہمیشہ رات کو اٹھ کر گاتا بجاتا تھا اور امام اس کے غنا پر کان دھرتے تھے ایک رات اس کی آواز نہ سنی تو اس کے گھر والوں سے پوچھا کیا بات ہے آج رات اس کی آواز نہیں آرہی تھی۔ بتایا کہ آج رات وہ باہر نکلا تو سپاہیوں نے پکڑ کر جیل میں ڈال دیا اس کے بعد امام صاحب نے اپنا عمامہ باندھا امیر کے پاس تشریف لے گئے اور اس کے چھڑانے کی سفارش فرمائی۔ امیر نے پوچھا اس کا نام کیا ہے؟ فرمایا عمر ہے اس پر امیر نے عمر نام کے تمام قیدیوں کو چھوڑ دیا۔ امام صاحب نے اس شخص سے فرمایا رات کو تو جو کچھ کرتا ہے کرنا۔ چونکہ امام صاحب کا اس کے غنا پر کان رکھنا اور اسے منع نہ فرمانا ان کے نزدیک غنا اور اس کے سماع کے مباح ہونے پر دلالت ہے اور اس کے برعکس حکم کو اس غنا پر محمول کرتے ہیں جو فحش کلامی پر مبنی ہے۔ اور یہ آپ کے قول وفعل کی جمع تطبیق میں ہے حالانکہ اس کی حرمت نہیں پائی جاتی مگر ان کے فعل کے اقتضاء سے نہ کہ ان کے قول کے نص سے۔ جیسا کہ دعوت ولیمہ میں مروی ہے کہ ایک دن امام ابو یوسف کے سامنے غنا کا مسئلہ بیان کیا گیا تو انہوں نے امام صاحب کے پڑوسی کے غنا کا قصہ بیان کیا۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ وہ اکثر ہارون رشید کی محفل میں ہوتے تھے اور اس کی مجلس میں غنا ہوتا تھا تو آپ سنتے اور اثر پذیر ہوتے تھے۔ امام مالک رحمہ اللہ سے غنا کا مسئلہ پوچھا گیا تو فرمایا اپنے شہروں میں میں نے علماء کو پایا ہے جو اس کے منکر نہیں ہیں اور وہ اس میں بیٹھتے ہیں اور فرمایا اس کا منکر وہی ہے جو اندھا،

جاہل اور عراقی ہے جس کی طبیعت مردہ ہے اسی طرح امام غزالی نے اُن سے نقل فرمایا ہے۔ اور امام قشیری، استاد ابو المنصور اور قفال وغیرہ سے اس کی اباحت کی حکایت کی گئی ہے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ سے یہ جو مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا اسے فاسق و فاجر ہی سنتے ہیں تو اس غنا پر محمول ہے جس میں فحش کلامی اور منکر باتیں ہوں یہ ان کے قول و فعل میں جمع و تطبیق میں ہے۔ لیکن امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ فرمان جسے امام غزالی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ان کے مذہب میں غنا حرام نہیں ہے۔ میں نے بھی اس قول کو ان کی کتابوں میں بہت تلاش کیا مگر اس کی حرمت میں ان کی کوئی نص نہ دیکھی۔ اور استاد ابو المنصور بغدادی فرماتے ہیں کہ ان کے مذہب میں سماع کی اباحت ہے اس شرط کے ساتھ کہ مرد، مرد سے یا باندی سے یا بیوی سے یا اس عورت سے جس پر نظر ڈالنا حلال ہے اس کی آواز سے یا تو اپنے گھر میں سنے یا اپنے مخصوص دوستوں کے گھر میں سنے اور سرِراہ اسے نہ سنے اور کوئی خلاف شرع، منکر چیز کو سماع میں شامل نہ کرے اور اس کے سبب نماز کے اوقات کو ضائع نہ کرے۔

ابو منصور بغدادی، یونس بن عبد الاعلیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے انہیں ایسی مجلس میں شریک ہونے کیلئے بلایا جس میں ایک شخص گا رہا تھا جب گانا ختم ہوا تو امام شافعی رحمہ اللہ نے پوچھا کیا تمہیں پسند آیا میں نے کہا نہیں۔ فرمایا اگر تم ٹھیک کہتے ہو تو تمہاری حس صحیح نہیں ہے مطلب یہ کہ غنا کو پسند کرنا سلامتی حس و طبع کی علامت ہے اور اسے ناپسند کرنا طبیعت کی کجی اور حس کی کمی کا نشان ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دلیل شرعی اس کی حرمت یا کراہت میں نہیں ہے اگر ہوتی تو طبیعت کو اسے پسند کرنا کیا کام دیتا ہے۔ اس لئے کہ طبیعت میں نغمہ کی تاثیر سے کسی کو کلام نہیں ہے۔ یہ تاثیر تو جانوروں میں بھی ہوتی ہے، چہ جائیکہ آدمی۔ امام شافعی سے منقول ہے کہ "اَلْغِنَاءُ لَھْوٌ مَکْرُوْہٌ یُشْبِہُ الْبَاطِلَ" غنا ایک کھیل ہے جو مکروہ ہے اور باطل کے مشابہ ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ ممکن ہے مکروہ سے مراد یہ ہے کہ اس کا ترک اولیٰ ہے۔ کیونکہ اس کا اطلاق اس معنی میں بھی آتا ہے اور امام غزالی فرماتے ہیں کہ یہ قول حرمت و کراہت پر دلالت نہیں کرتا۔ بلکہ اگر صرف باطل ہی فرماتے تب بھی اس پر دلالت نہ ہوتی۔ اس لئے کہ باطل کے معنی یہ ہیں کہ جس میں فائدہ نہ ہو۔ اور مباح نہ ہو۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ وہ روایتیں جن کے الفاظ غنا کی تغلیظ پر دلالت رکھتے ہیں وہ ان پر محمول ہیں جو فحش یا منکر کلام پر مبنی ہیں۔ لہٰذا حرمت کسی عارضہ کی بنا پر ہے نہ اس معنی میں کہ غنا اپنی ذات سے حرام ہے۔ خلاصہ بحث یہ ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے قول و فعل سے تحقیق کے ساتھ وہ چیز صحت کو پہنچتی ہے جو اس کے مباح ہونے میں صریح ہے اور حرمت میں کوئی نص نہیں ہے۔

لیکن امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے صحت کے ساتھ مروی ہے کہ انہوں نے اپنے فرزند حضرت صالح کے یہاں گانا سنا ہے۔ چنانچہ ابو العباس فرغانی روایت کرتے ہیں کہ میں نے صالح بن امام احمد رحمہ اللہ سے سنا ہے انہوں نے بیان کیا کہ میں سماع کو پسند کرتا تھا اور میرے والد ناخوش جانتے تھے تو میں نے ابن حنادہ سے وعدہ لیا کہ ایک رات تم میرے یہاں رہو۔ تو وہ میرے ہاں رہا۔ جب میں نے اطمینان کر لیا کہ میرے والد سو گئے ہیں تو ابن حنادہ نے گانا شروع کیا اتنے میں میں نے چھت پر چلنے کی آواز سنی تو میں نے چھت پر جا کر دیکھا کہ میرے والد چھت پر چادر لپیٹے گانا سن رہے ہیں اور آہستہ آہستہ ٹہل رہے ہیں۔ گویا کہ وجد کی کیفیت میں ہیں۔ اسی قصہ کی مانند عبد اللہ بن امام احمد بن حنبل سے بھی منقول ہے ایسے دلالت کرتا ہے کہ ان کے نزدیک سماع مباح ہے اور اس کے برعکس جو ان کا قول منقول ہے وہ غنائے مذموم پر محمول ہے جو فحش و منکر پر مبنی ہے۔ اور امام احمد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ انہوں نے قوالی کو اپنے فرزند صالح کے پاس سنا اور انکار نہ کیا اس پر ان کے صاحبزادے نے عرض کیا اے پدر بزرگوار! کیا آپ اس کا انکار نہ فرماتے اور مکروہ نہ جانتے تھے فرمایا مجھے ایسی خبر دی گئی ہے کہ اس کے ساتھ منکرات کا استعمال کرتے ہیں۔

حضرت داؤد طائی رحمہ اللہ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ سماع میں تشریف لاتے تو ان کی کمر سماع میں سیدھی ہو جاتی تھی باوجودیکہ کبر سنی کے باعث ان کی کمر جھک گئی تھی۔ یہ حضرت داؤد طائی رحمہ اللہ بڑے عالم، فقیہہ، حنفی اور امام اعظم رحمہ اللہ کے شاگرد خاص تھے۔

فقیہہ وعالم ناصر الدین ابوالمنیر اسکندری اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں کہ اگر سماع اپنے شرائط کے ساتھ اپنے محل اور اپنے اہل میں ہو تو صحیح ہے اور اس قول کو ابو بکر خلال صاحب جامع اور ان کے مصاحب عبدالعزیز رحمہما اللہ نے جو کہ دونوں حنبلی ہیں اختیار کیا ہے اور کتاب "مستوعب" کے مصنف نے حنبلیوں کی ایک جماعت سے سماع کو نقل کیا ہے جن میں سے حضرت صالح اور حضرت عبداللہ امام احمد کے صاحبزادے بھی ہیں اور اسے حافظ ابوالفضل مقدسی وغیرہ، ظاہریہ نے اختیار کیا ہے۔ اور اسے ابو محمد ابن حزم نے اپنی تصانیف میں بیان کیا ہے۔ اور ان کا اس ضمن میں ایک رسالہ ہے۔ اور ابن طاہر نے اپنی تصنیف میں صحابہ و تابعین کا اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ اور اپنی روایتوں کے راویوں کو مضبوط کیا ہے اور شیخ تاج الدین عبدالرحمٰن فراوی شافعی دمشق کے شیخ و مفتی نے نقل کیا ہے۔ کہ ابن قتیبہ سماع پر اہل حرمین کا اجماع نقل کرتے ہیں اور ابن قتیبہ نے اکثر اہل عراق سے نقل کیا ہے اور ابن طاہر اپنی سند سے روایت کرتے ہیں۔ کہ جب تم اہل مدینہ کو کسی چیز پر اجماع کرتے دیکھو تو جان لو کہ یہ سنت ہے۔ یونس بن عبدالاعلیٰ بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام شافعی سے اہل مدینہ کے سماع کی اباحت کے بارے میں پوچھا تو فرمایا میں حجاز کے کسی ایسے عالم سے واقف نہیں جس نے سماع کو مکروہ جانا ہو۔ البتہ انہیں جانتا ہوں جنہوں نے اس کی تعریفیں کی ہیں۔

اور ابو یعلیٰ حنبلی نے بیان کیا ہے کہ یوسف بن یعقوب ماجشون اور ان کے دیگر بھائیوں نے سماع کی اجازت دی ہے اور یحییٰ معین نے جو کہ اعاظم علمائے حدیث سے ہیں فرمایا کہ ہم یوسف ماجشون کے پاس آتے تو وہ ہمیں گھر میں حدیث سنایا کرتے اور ان کے ہمسائے کے دوسرے گھر سے گانے باجے کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔ یہ وہ ثقہ علماء و محدثین ہیں جن کی حدیثیں صحاح میں شامل ہیں اور عبدالعزیز بن سلمہ ماجشون جو کہ مفتی اہل مدینہ تھے فرماتے ہیں کہ ان سے ائمہ محدثین نے روایتیں لی ہیں اور ان سے تخریج کرنے کے بعد حدیثوں کو بخاری و مسلم میں شامل کیا ہے۔ یہ حضرات بربط کی اجازت دیتے تھے صاحب نہایہ نے شرح ہدایہ میں احناف سے حرمت کا قول نقل کرنے کے بعد بیان کیا ہے کہ بعض احناف اس وقت میں غنا کی اباحت کے قائل ہیں۔ جب کہ استعارات حاصل کرنے اور نظم کے قوافی درست کرنے اور زبان کو فصیح بنانے کیلئے گنگنایا جائے اور کہا کہ اس میں کوئی حرج نہیں اور بعض احناف کہتے ہیں کہ اگر تنہا ہو اور وحشت کو دور کرنے کیلئے اپنے آپ میں گنگنائے تو اس میں مضائقہ نہیں۔ اسے شمس الائمہ سرخسی نے اخذ کیا ہے اور اس سے استدلال کرتے ہیں کہ انس بن مالک رحمہ اللہ اپنے گھر میں ہوتے تھے تو اسے بطریق کھیل کے نہ کرتے تھے اور فرماتے ہیں کہ جو مطلقاً کراہت کا قائل ہے وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کو مباح اشعار پر محمول کرتے ہیں اور صاحب بدائع نے حنیفہ سے جو چیز شمس الائمہ سے ذکر کی ہے اس کی تعلیل اس سے کی گئی ہے کہ غنا کا سماع دل کو نرم کرتا ہے اور صاحب ذخیرہ نے احناف سے نقل کیا ہے کہ بعض احناف عرسوں میں سماع کو کوئی مضائقہ نہیں بتاتے۔ اور بعض نے عیدین اور تمام مباح خوشی کے اوقات میں کوئی مضائقہ نہیں کیا ہے۔ اسے علمائے متقین میں سے شیخ الاسلام ابو محمد بن عبدالسلام اور ان کے مصاحب شیخ محمد بن دقیق العید نے اختیار کیا ہے۔

صاحب کتاب "امتاع" فرماتے ہیں کہ بلاشبہ صوفیائے کرام میں بکثرت فقہاء و محدثین اور علوم شرعیہ کے انواع کی معرفت رکھنے والے ہوئے ہیں جیسے استاد ابوالقاسم قشیری، شیخ ابو طالب مکی اور شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہم اللہ۔ یہ تمام حضرات اپنے رسائل و تصانیف میں وہ چیزیں بیان کرتے ہیں جو سماع کی اباحت پر قول و فعل سے دلالت کرتے ہیں اور حضرت جنید بغدادی رحمہ

اللہ ایسے فقیہہ تھے جو مذہب ابو ثور پر فتویٰ دیتے تھے اور ان سے امام قشیری اور شیخ سہروردی وغیرہ رحمہما اللہ نقل کرتے ہیں کہ حضرت جنید رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ صوفیائے کرام کی جماعت پر رحمت الٰہی کا نزول تین وقتوں میں ہوتا ہے ایک کھانے کے وقت اس لئے کہ وہ نہیں کھاتے مگر فاقہ کے وقت، دوسرے ہم نشینی اور مکالمت کے وقت، اس لئے کہ یہ حضرات صدیقین انبیاء و مرسلین کے مقامات میں ان کے قائم مقام ہو کر کلام فرماتے ہیں اور تیسرے سماع کے وقت اس لئے کہ یہ حضرات اس وقت حق تعالیٰ کے وجد و شہود میں ہوتے ہیں۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے علماء کی جماعت نے اس باب میں بہت زیادہ حکایتیں نقل کی ہیں جن کا ذکر ان حضرات نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔

مسئلہ سماع میں نصیحت ، وصل: جاننا چاہئے کہ صاحب کتاب "امتاع" نے سماع کے بارے میں تین قول ذکر کئے ہیں۔ حرمت، کراہت اور اباحت۔ اس کے بعد ہر مذہب کے دلائل بیان کرنے کے بعد مذہب اباحت کو ترجیح دیتے ہیں۔ جیسا کہ ان کا مدعا ہے اور حرمت و کراہت کے استدلات اور تمسکات کا جواب دیا ہے۔ اور مذہب اباحت کے اثبات میں کلام کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اور اسے کتاب و سنت، اجماع اور قیاس سے ثابت کیا ہے اور قیاس کی بنیاد یہ ہے کہ چونکہ سنت صحیحہ میں تغنی بالقرآن کا جواز ثابت ہے تو شعروں میں بھی جائز ہو گا اور اجماع سے اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ چونکہ قرآن میں تغنی یعنی خوش آوازی سے سوز و گداز اور شوق بڑھتا ہے۔ اور خشوع و خضوع کو خوب پیدا کرتا ہے تو یہ بات اشعار میں بھی ہے کیونکہ یہ طاعات و مناجات اور دنیا میں زہد اور آخرت کے شوق کو خوب اضافہ کرتا ہے اور محبت الٰہی عز اسمہ اور متابعت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادتی کا موجب ہے تو یہ بھی جائز ہو گا اور بعض اہل عرب کی حدی، نصب اور نشید وغیرہ کی قسموں پر قیاس کر کے کہتے ہیں کہ چونکہ یہ تمام اقسام باتفاق جائز و مباح ہیں تو یہ بھی جائز ہے۔ یہ سب بحثیں اسی تقدیر و صورت میں رونما ہو رہی ہیں کہ غنا کی حرمت و کراہت پر کوئی قطعی نص ثابت نہیں ہے۔ ورنہ نص کے مقابلے میں قیاس کرنا لازم آتا ہے۔ اور اباحت کے قائلین کہتے ہیں کہ اس جانب یعنی حرمت و کراہت پر کوئی نص نہیں پائی جاتی۔ اگر کوئی نص پائی بھی جاتی ہے تو وہ مرتبۂ صحت کو نہیں پہنچتی۔ اور کاتب الحروف کا اباحت کے قائلین کے اقوال کے نقل کرنے کا مقصد یہ ہے تاکہ معلوم ہو جائے یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے اور ایک جانب جزم کرنا اور اس کی ترجیح دینا اور اس میں تعصب دکھانا طریقہ اختلاف کے مناسب نہیں ہے۔ اگر کسی کو اس میں وقت کی اصلاح نظر آتی ہے تو توقف کرے۔ اور احتیاط و ملاحظہ کی روش اختیار کرے اور خلاف و نزاع کے بھنور میں نہ پڑے۔ اور اس میں اپنے حال کی سلامتی دیکھے اور اس میں احتیاط و تقویٰ نظر آئے تو مبارک ہے لیکن چاہئے کہ قال و حال کی زبان کو بزرگان دین پر طعن و تشنیع اور تضلیل و تفسیق سے آلودہ نہ کرے اور ان کے حالات میں پڑے بھی نہیں باوجودیکہ دلائل متعارض ہیں اور طریقے متبائن ہیں اور دوسری جانب بھی علماء و فقہا اور عرفا موجود ہیں تو کسی ایک جانب کو ترجیح دینے اور دوسرے کو مرجوح کرنے سے باز رہے اور انصاف کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ بیت ۔

صحبت و عافیت است گرچہ خوش افتاد اے دل جانب عشق عزیز است فرو مگزارش

اور اباحت کے قائلوں کو مناسب نہیں ہے کہ تعصب برتیں اور علماء کے اقوال کے منکر ہو جائیں خصوصاً. وہ حضرات جو دیانت و نصیحت کے طریقے کے مالک ہیں: "وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ۔" اور ہر ایک کیلئے ایک رخ ہے جسے وہ اختیار کرتا ہے تو تم بھلائی میں سبقت کرو۔ دونوں گروہوں کو چاہئے کہ تمیز و تفصیل کے طریقہ کی رعایت کو ہاتھ سے نہ چھوڑیں ۔ تمام کاموں میں توقف و احتیاط محمود ہے اور ہر جگہ افراط و تفریط مذموم و برا ہے و باللہ التوفیق و منہ العصمتہ ۔

ساز و مزامیر: اسی طرح صاحب کتاب "امتاع" نے ساز و مزامیر میں بھی بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ چاروں ائمہ کے

مذاہب میں مزامیر حرام ہیں ۔ اس کے باوجود بعض علماء شوافع اور اصحابِ ظواہر اور امام غزالی وغیرہ سے اس کے خلاف نقل کر کے آلات و مزامیر کے اقسام کا ذکر کیا ہے۔ لیکن دف مختلف فیہ ہے۔ بعض نے مطلقاً مباح کہا اور بعض نے مطلقاً حرام رکھا ہے اور بعض نے جھانجہ دار اور بغیر جھانجہ سے تفریق کی اور درست بات یہ ہے کہ نکاح میں یہ مباح ہے اور بعض بوقت اعلان دف کو مستحب قرار دیتے ہیں اور شبابۃ یعنی بانسری میں بھی اختلاف مذکور ہے اور مزامیر میں سے عود ہے جسے بربط بھی کہتے ہیں اور اس میں بہت سے تار ہوتے ہیں۔ جس سے آواز میں اتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔ اس میں اختلاف ذکر کیا گیا ہے اور فرماتے ہیں کہ مذاہب رابعہ میں معروف یہ ہے کہ ان کا بجانا اور سننا دونوں حرام ہیں اور علماء کی ایک جماعت اس کے جواز کی طرف گئی ہے۔ اور وہ حضرت عبداللہ بن جعفر اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا سننا بیان کرتے ہیں وہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما کے پاس گئے تو ان کے آگے باندی کو بربط بجاتے دیکھا اس پر حضرت عبداللہ بن جعفر نے حضرت عبداللہ بن عمر سے کہا آپ اس میں کوئی مضائقہ دیکھتے ہیں۔ فرمایا اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اور علماء حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت امیر معاویہ بن ابو سفیان، حضرت عمرو بن العاص اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہم اور غیر صحابہ سے عبدالرحمٰن بن حسان، خارجہ بن زید جو کہ فقہاء سبعہ مدینہ میں سے ہیں اس کا سننا نقل کرتے ہیں۔ استاد ابو منصور نے زہری ، سعید بن المسیب عطا ابن ابی رباح، شعبی اور عبداللہ بن ابی العتیق وغیرہ فقہاء مدینہ منورہ سے نقل کیا ہے۔ اور خلیلی، عبدالعزیز ماجشون سے نقل کرتے ہیں کہ وہ عود یعنی بربط کی اجازت دیتے تھے اور ابن سمعانی نے طاؤس سے نقل کیا ہے اور ابراہیم بن سعد سے مروی ہے کہ وہ خلیفہ رشید کے پاس پہنچے انہوں نے کہا عود لاؤ۔ اس پر رشید نے کہا عود جلانے کی یا عود باجے کی۔ فرمایا عود باجے کی۔ پھر رشید نے عود یعنی بربط منگایا اور اسے ابراہیم بن سعد نے بجایا اور غنا اور عود کے مباح ہونے کا فتویٰ دیا۔ اور فاکہی نے تاریخ مکہ میں باسناد خود نقل کیا کہ موسیٰ بن الغرہ الجمحی سے منقول ہے کہ انہوں نے عطا بن ابی رباح کو بلایا جب وہ آئے تو وہاں کچھ لوگوں کو بربط بجاتے اور گاتے پایا اس پر لوگوں نے انہیں آتے دیکھ کر گانا باجا بند کر دیا انہوں نے فرمایا میں نہیں بیٹھوں گا جب تک بربط نہ بجاؤ اور جو گا رہے تھے نہ گاؤ تو وہ بیٹھے اور لطف اندوز ہوئے۔

صاحب "امتاع" نے اس عود و بربط کو اصل قرار دے کر تمام آلات و مزامیر کو بھی اس پر قیاس کر کے نقل کیا۔ اور فرمایا کہ حرمت کے قائلوں کے درمیان اس میں اختلاف ہے کہ یہ باجا گناہ کبیرہ ہے یا صغیرہ متاخرین شوافع کا مذہب یہ ہے کہ یہ صغیرہ ہے۔ یہ چند کلمے کتاب مذکور سے نقل کئے گئے "والعہدۃ علیہ" اس نقل کرنے سے مقصد و غرض یہی ہے اگر کبھی اس جماعت صوفیا سے کوئی ایسی چیز منقول ہو جائے تو تشدید و تجہیل، تشنیع و تفسیق اور تضلیل میں مبالغہ نہ دکھانا چاہئے اور قوم کے عیوب و لغزشوں کے چھپانے کا شیوہ اور اپنا شعار بنانا چاہئے۔ اور عوام کی حفاظت میں مشغول رہنا چاہئے۔ ان کی اس میں پیروی نہ کریں۔ "فَالْحَقُّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ وَعِلْمُہٗ اَحْکَمُ۔" اس ضعیف نے اس مسئلہ میں متعدد جگہوں میں بحث کی ہے۔ اور ہر جگہ تفصیل و تردید اور توسط کے طریقہ کو ملحوظ رکھا ہے یا قدرے حرمت و کراہت کی جانب میلان کیا ہے لیکن اس کتاب میں اقوال کے نقل میں اباحت کی جانب غلبہ ہو گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرا رخ ذہنوں میں مشہور و مقرر ہو چکا ہے اس کے نقل کی حاجت نہ تھی۔ ہماری نیت یہی ہے جو کسی نے کہا ہے شعر۔

عیب می چوں ہمہ گفتی ہنرش نیز بگو   نفی حکمت مکن از بہر دل عامی چند

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ وَالْعَاقِبَۃُ بِالْخَیْرِ۔

جاننا چاہئے کہ ہر زمانہ میں ابتدائے حال سے لے کر آج تک جو بھی تغنی و سماع کی اباحت کی جانب قول و فعل سے گیا ہے۔ اور جس نے اس کا انکار و استبعاد کیا اور اس کی طرف توجہ دی ہے اس نے ان تمام حکایتوں اور روایتوں کو جو اس باب میں مروی ہیں واضح کیا ہے۔

مشکوٰۃ میں مروی ہے کہ ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ جن کو بدری بھی کہتے ہیں یا تو اس سبب سے کہ وہ غزوۂ بدر میں حاضر ہوئے یا اس سبب سے کہ ان کا مسکن بدر میں تھا وہ اور ایک اور صحابی ساتھ بیٹھتے تھے اور وہ گاتے تھے یہ سنتے تھے۔ ایک اور شخص جو موجود تھا اسے ان کا گانا سننا گراں گزرا اس نے اعتراض کیا اور کہا "اے صاحبیٔ رسول اللہ انتما" مطلب یہ کہ تم دونوں رسول اللہ کے صحابی ہو اور گانا سن رہے ہو تو انہوں نے فرمایا اگر تم چاہتے ہو تو تم بھی سنو اور ہمارے ساتھ بیٹھ جاؤ اور سنو ورنہ چلے جاؤ۔ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی ہے کہ ہم سنیں، اور یہ شادی کا موقع تھا اس میں باتفاق تغنی مباح ہے اور اس سے بالاتر حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ تھے وہ تو اس میں بہت ہی شغف رکھتے تھے۔ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی اس میں ان کے ساتھ شریک و موافق تھے اور ان دونوں میں باہمی بہت محبت و دوستی تھی۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی زوجہ نے حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ پر اعتراض کیا اور ان کو برا کہا اور کہا کہ ان کا تو یہ حال ہے تم کس بنا پر ان کے معتقد ہوگئے ہو۔ دوسرے دن حضرت عبداللہ بن جعفر امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کے گھر آئے تو انہوں نے کثرت کے ساتھ نماز پڑھی۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی زوجہ سے کہا اب انہیں دیکھو کہ یہ کیا کر رہے ہیں اس کے بعد ان کی زوجہ نے زبان اعتراض بند کر لی۔

اس حقیقت حال اور منشاء اختلاف سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گانا سننا اور آلات و مزامیر کا بجانا زمانہ قدیم میں بے قید لوگوں، فاسقوں اور شراب خوروں اور لہو لعب میں مشغول لوگوں کا کام تھا۔ اسی بنا پر حدیث صحیح میں آیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے بھیجا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ میں معازف یعنی آلات و مزامیر کو جو کھیل کود میں بجتے ہیں مٹاؤں اور شراب پینے اور زنا کرنے سے روکوں۔

دراصل غنا کا نام ہی لہو ہے اور اس کا ذکر ملاہی میں کرتے ہیں۔ ان ملاہی کے محو و فنا ہونے اور ان ممنوعات و منکرات کے رفع و ازالہ ہو جانے کے بعد جو عام رسم و عادت تھی نہ رہی تو مسلمان و صلحاء اور پارسا حضرات اس سے محظوظ ہوئے اور فسق و منکرات کی آمیزش اور فساق و فجار سے اختلاط کے بغیر اس سے لطف اندوز ہوئے۔ اور جب دوسری جماعت نے دیکھا کہ یہ تو بے قید فاسقوں کی عادت و علامت ہے۔ اور ان کی حالت کے مشابہ ہے تو اس خوف سے کہ کہیں اس کا سرا ان سے نہ مل جائے بچنے لگے اور ڈرانے لگے۔ اور شارع علیہ السلام نے بھی اگر اس کے پیش نظر ڈرایا اور وعید صادر فرمائی ہو تو بعید نہیں۔ اور یہ جو محدثین فرماتے ہیں کہ شارع علیہ السلام کی ممانعت ثبوت تک نہیں پہنچتی۔ اور اس باب میں کوئی صحیح حدیث نہیں ملی۔ اسے برقرار رکھتے ہوئے بات یہ ہے کہ دائرہ صحت، ان کی اصطلاح کے بموجب بہت تنگ ہے۔ اور ان کی مراد یہ ہوگی کہ اس کی مطلقاً ممانعت اور اس کی حرمت فی نفسہٖ غنا میں ثابت نہیں ہے جس طرح کہ شراب اور زنا وغیرہ میں فی نفسہٖ حرمت ہے۔ اور یہ جو اہل ظواہر کہتے ہیں کہ کوئی حدیث وارد نہیں ہوئی ہے تو یہ مکابرہ سے خالی نہیں اس کی مثال ان برتنوں اور پیالوں کے قضیہ کی سی ہے جن کا نام حنتم، مزفت، نقیر اور دباء ہے۔ جسے وہ اباحت خمر کے وقت استعمال کرتے تھے۔ اور ان میں شراب پیتے تھے ان کا استعمال بھی کچھ عرصے تک حرام رہا۔ تاکہ ان کے آثار کا قطعی طور پر قلع قمع ہو جائے۔ جب شراب کی حرمت رچ بس گئی اور ثابت و مقرر ہو گئی اور اس کی علامتوں اور نشانیوں کے قلع قمع کرنے کی حاجت نہ رہی تو ان برتنوں سے ممانعت اٹھالی گئی۔ اس کے باوجود علماء و ائمہ دین کے دو فرقے ہو گئے۔ ایک جماعت تو ان کی ممانعت پر قائم رہی اور دوسری جماعت اس کے جواز کی جانب آگئی جیسا کہ اس کے مقام میں بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس میں بھی دو فرقے ہو گئے۔ ایک فرقہ تو قدیم عادت کے پیش نظر کہ یہ فساق و فجار کا کام تھا ممانعت اور احتیاط کی روش کو اختیار کرنے میں ثابت قدم رہا ہے۔ اور دوسرا فرقہ اس کی حقیقت حال اور معنی کے پیش نظر اس سے ملحق رہا ہے کیونکہ اگر اس میں فسق و فجور اور ممانعت شرعی کی آمیزش ہے تو حرام ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو مباح ہے۔ (واللہ اعلم وعلمہ احکم)

اس کے بعد ان حضرات کے درمیان تعصب وتشدد درونما ہو گیا۔ مانعین افراط سے کام لیتے ہوئے ان کے مرتکبین کو مطلقاً فسق وکفر اور زندقہ سے منسوب کرنے لگے اور اسے مباح جاننے والے اس کو خاص طاعت اور محض عبادت قرار دینے لگے۔ اور ہر وقت خود بھی اس میں مشغول رہنے لگے۔ اور دوسروں کو بھی مشغول رکھنے لگے۔ اور مجمع اور معرکہ بنانے لگے۔ اور یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کو اہل وناہل قرار دینے لگے اور انصاف کا رشتہ جس کے معنی "نصف لی ونصف لک" ہے ہاتھ سے چھوڑ دیا اور طریقہ ادب کو جس کی حقیقت ہر چیز کی حدوں کو محفوظ رکھنا ہے ملحوظ نہ رکھا۔ ایک منشائے اختلاف یہ ہے کہ ایک گروہ نے باطن میں نغمے کے تصرف وتاثیر پر نظر رکھی اور وہ بے خود ہو گئے۔ اور دوسرے گروہ کو فقہی جواز وعدم جواز نظر آیا تو وہ اپنی جگہ قائم رہا۔

شیخ ابن العربی فرماتے ہیں کہ بالذات نغمہ کی تاثیر، روح حیوانی پر ہوتی ہے۔ اور حرکت واضطراب میں لانا اس کا کام ہے۔ اور روح انسانی اس سے منزہ وپاک ہے۔ کیونکہ وہ معانی کا محل ورود ہے اور سکون وتوانائی اس کی صفت ہے۔ لیکن اس جگہ کسی کو یہ بات کہنے کا کہاں حق ہے۔ ہاں نغمہ کی تاثیر بالذات، روح حیوانی پر ہوگی لیکن اگر اتصال وہمسائیگی کے واسطہ سے جو روح حیوانی اور روح انسانی میں ہے یہ حالت اس میں سرایت کر جائے تو کون مانع ہے۔

شیخ ابن العربی فرماتے ہیں کہ باطن میں قرآن کی تاثیر کی علامت ہے کہ غنا اور بغیر غنا کے یکساں ہو اور وہ جو نغمہ سے اثر نمودار ہوتا ہے تو وہ قرآن کی تاثیر نہیں ہے بلکہ یہ نغمہ کی تاثیر ہے نہ کہ قرآن کی۔ یہ بات تکلف سے خالی نہیں ہے۔ نغمہ قرآن کا زیور اور اس کی زینت ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ "زَیِّنُوا الْقُرْاٰنَ بِاَصْوَاتِکُمْ" اپنی خوش آوازی سے قرآن کو زینت دو۔ اور نغمہ اور بغیر نغمے کے دونوں حالتوں میں یکساں ہونا دائرہ امکان سے خارج ہے۔ مگر وہ شخص جسے مجرد ذات وصفات الٰہی مکشوف ومشہود ہے۔ اس میں یہ تاثیر ممکن ہے۔

فائدہ: صاحب "امتاع" فرماتے ہیں کہ علماء کا اختلاف ہے کہ عرب میں سب سے پہلے کس نے نغمہ گایا۔ اس پر ابو ہلال عسکری کہتے ہیں کہ اکثر اہلِ علم کا خیال ہے کہ اس کا نام "طویس" ہے یہ اس طرح شروع ہوا کہ جب ابن زبیر کعبہ کی تعمیر کرا رہے تھے تو فارس وروم کے لوگ خوش آوازی سے گاتے جاتے تھے۔ اور جب عرب کے گانے والوں نے اسے سنا تو انہوں نے اس کو عربی میں منتقل کر لیا سب سے پہلے جس نے پہل کی وہ طویس تھا اور طویس کو "میشوم" بھی کہتے ہیں جس کے معنی نامبارک کے ہیں۔ یہ اس بنا پر کہ اس کی پیدائش اس دن ہوئی جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے وفات کے دن اس کا دودھ چھوٹا تھا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وفات کے دن وہ بالغ ہوا تھا اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی وفات کے دن اس نے نکاح کیا اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی وفات کے دن اس کے لڑکا پیدا ہوا۔ اور کہتے ہیں کہ اس غنائے موسیقی کی نقل سے پہلے عرب میں غنا از قسم حسن صوت تھا۔ مثلاً نصب ونشیدِ اعراب، حدی اور رکبانی وغیرہ یہ تمام قسمیں مباح ہیں اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ اور جو لوگ حرمت کے قائل ہیں وہ گانے کو غنائے موسیقی پر محمول کرتے ہیں۔ اور وہ جو صحابہ کرام، تابعین وغیرہ اسلاف سے جو اخبار وآثار مروی ہیں اور جو ان کے سیاق سے ظاہر ہوتا ہے انہیں غنائے موسیقی پر محمول نہیں کرتے۔ بلکہ قدیم اہلِ عرب کی خوش آوازی میں سے نصب، نشید حدی وغیرہ پر حمل کرتے ہیں البتہ بعض صحابہ میں سے جیسے عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ وغیرہ کا باندی سے غنائے موسیقی سننا مروی ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بعض گانے والیوں سے بھی سنتے تھے۔ حقیقت میں ایسے تمام گانوں کی صورتیں ایک ہی ہیں جو صوت حسن کی طرف راجع ہیں۔ اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے (قواعد موسیقی کے زمرے میں نہیں ہیں) البتہ قرات قرآن میں فرق کرتے ہیں کیونکہ غنائے موسیقی میں تمطیط وتغییر یعنی مدوجزر بہت ہے۔ لیکن غنا وسماع اس اعتبار سے کہ اس میں سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اور اصحاب وتابعین کا اقتضاء ہے۔ اس تقرب وتعبد کے طریقے

پر اس کا اجتماع کر رہے ہیں۔ اس میں خلجان اور اشتباہ باقی ہے۔ اس کا جواب یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا محل و مقام دوسروں کے اوضاع و مشارب سے برتر و اعلیٰ اور مختلف ہے۔ دوسروں میں کہیں تورع و اتقا غالب ہے اور دامن احتیاط ملحوظ خاطر ہے۔ اور طاعت و عبادات میں ذوق و شوق اور اس کی جمعیت میں مستغرق ہیں۔ اور کہیں سکر و مستی نے غلبہ کر رکھا ہے۔ اور ان کا ذوق و شوق سماع میں پڑ گیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ یہ ایسا معاملہ ہے۔ جو مختلف فیہ ہے اور مختلف فیہ معاملہ میں ایک دوسرے پر عیب جوئی اور نکتہ چینی نہیں ہونی چاہئے۔ ہر ایک کو اپنے اپنے حال میں رہنا چاہئے: "فَرَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ أَهْدَىٰ سَبِيلًا" تو تمہارا رب ہی خوب جانتا ہے کہ کون شریعت میں زیادہ ہدایت یافتہ ہے۔

وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَاِلَیْہِ الْمَرْجِعُ وَالْمَآبُ صَلَّی اللّٰہُ وَسَلَّمَ عَلٰی سَیِّدِ الْخَلْقِ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ ھُدَاۃِ طَرِیْقِ الْحَقِّ وَمُحْیِیْ عُلُوْمِ الدِّیْنِ اٰمِیْن۔

باب یازدہم

کھانے، پینے، پہننے، نکاح کرنے اور سونے میں عبادت شریف

نوع اول در طعام و آب: جاننا چاہئے کہ کھانا پینا ضروریات زندگی میں سے ہے اور قوت وطاقت کا قیام اور عبادات میں صدور حرکات اس کے بغیر محال عادی کے قسم سے ہے۔ لہٰذا عبادت گزاروں پر لازم ہے کہ بقدر احتیاج ان کا استعمال کریں اور حرص وطمع سے اجتناب کریں۔ اور ان کی شہوتوں میں مبتلا نہ ہوں۔ مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تا عمر شریف شکم سیری نہ فرمائی۔ عطاؒ فرماتے ہیں کہ شکم سیری ایسی بدعت ہے جو قرن اول کے بعد ظاہر ہوئی اسے امام نووی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اور حاکم نے مقدام بن معدی کرب کی اس حدیث کی صحت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابن آدم نے اپنے پیٹ سے بدتر کسی برتن کو نہیں بھرا ہے۔ حالانکہ اسے اتنے لقمے کافی تھے کہ جس سے اس کی ریڑھ کی ہڈی کھڑی رہ سکے۔ اگر وہ زیادہ ہی کھانا چاہتا ہے تو پیٹ کے برتن کے تین حصے کرے۔ ایک حصہ کھانے کیلئے اور ایک حصہ پانی کیلئے اور ایک حصہ سانس کیلئے بنائے۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ اگر بقراط اس تقسیم کو سنتا تو حیرت و تعجب کرتا۔ صحیح حدیث میں ہے کہ مسلمان ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے۔ اہل تشریح کہتے ہیں کہ آدمی کی سات آنتیں ہیں ایک معدہ اور تین اس کے قرب کی آنتیں جن کو بواب، صایم اور رقیق کہتے ہیں۔ اور تین اور ہیں جن کو اعوذ، قولون اور مستقیم کہتے ہیں اور مستقیم پیخانہ کی آنت ہے۔ اور اس کے قریب دبر یعنی مقعد ہے۔ اور یہ غلیظ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان فرمانے کا مقصد، مسلمان کی کم خوری اور کافر کی بسیار خوری ہے۔ اور بسیار خوری کی جانب مبالغہ فرمانا ہے۔ حقیقتہً آنتوں کی گنتی مراد نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ مسلمان جب کھاتا ہے تو عبادت کے اسباب کی حفاظت کرتا ہے۔ اور وہ جانتا ہے کہ کھانے سے بھوک کو مارنا اور عبادت پر مدد کرنا ہے نہ کہ تن پروری۔ وہ قدر ضرورت سے زیادہ نہیں کھاتا۔ رہا کافر! تو اس کا مقصود و مطلوب بدن پروری اور نفسانی شہوت کی تکمیل ہے۔ اس کی حالت مسلمان کے برخلاف ہے لیکن واضح رہنا چاہئے کہ یہ بات ہر مسلمان اور ہر کافر میں نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی مسلمان اپنی عادت کے موافق یا کسی طبعی عارضہ سے یا اپنے کسی مرض کے باعث بسیار خوری کرتا ہو اور کافر کم خور ہو خواہ وہ ضعف معدہ کی وجہ سے یا اطباء کے اصول صحت کی وجہ سے یا راہبوں کے طریقہ پر ریاضت کی وجہ سے ہو۔ علماء فرماتے ہیں جس کی فکری قوت زیادہ ہوتی ہے اس کی غذا کم ہوتی ہے اور اس کا دل نرم ہوتا ہے۔ اور جس کی فکری قوت کم ہوتی ہے اس کی غذا زیادہ ہوتی ہے اور وہ سخت دل ہوتا ہے۔ نیز فرماتے ہیں کہ جس کا معدہ کھانے سے بھرا رہتا ہے اس میں حکمت و دانائی پیدا نہیں ہوتی اور جس کا معدہ کھانے سے کم پر ہے اس کا پینا بھی کم ہے اور اس کا سونا بھی کم ہے۔ اور جس کا سونا کم ہے اس کی عمر میں برکت ہے اور جس کا سونا بہت زیادہ ہے اس کی عمر میں بے برکتی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا میں شکم سیر لوگ، آخرت میں بھوک والے ہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی شکم سیری نہ فرمائی۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل و عیال میں تشریف فرما ہوتے تو آپ ان سے نہ کھانا طلب فرماتے اور نہ خواہش کا اظہار فرماتے۔ اگر وہ کھانا پیش کر دیتے تو نوش فرمالیتے۔ اور جو کچھ بھی پیش کرتے قبول فرمالیتے۔ اور جو پلاتے پی لیتے۔ علماء فرماتے ہیں کہ پیٹ کا نہ بھرنا اور شکم سیری کی نفی فرمانا یہ اس شکم سیری پر محمول ہے جس سے گرانی لاحق ہو۔ جو بسا اوقات عبادت سے روک دیتی ہے۔ اور کاہل اور سست بنادیتی ہے۔ اور نیند غالب کر دیتی ہے۔ ایسی شکم سیری مکروہ ہے۔ اور کبھی ایسی تحریم پر منتہی ہوتی ہے جس پر فساد و بطلان مرتب ہوتا

ہے اور عادۃً شکم سیری مکروہ نہیں ہے۔ غرضیکہ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو صحیح مسلم میں مروی ہے کہ بھوک کی حالت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ باہر تشریف لائے اور ایک انصاری کے گھر تشریف لے گئے۔ اس نے بکری ذبح کی اور سب نے کھایا اس میں ہے کہ خوب شکم سیر ہوگئے۔ (الحدیث) شیخ محی الدین نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں شکم سیری کا جواز ہے۔ اور دیگر احادیث جو اس کی کراہت میں ہیں وہ مداومت پر محمول ہیں۔ (انتہیٰ) اور جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے شکم سیری ثابت ہے تو دوسروں کے لئے بھی بلاشبہ درست ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں نے کبھی مسلسل تین دن پیٹ بھر کر کھانا نہ کھایا یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے اسے شیخین نے روایت کیا ہے اس حدیث کے دو مفہوم ہیں ایک یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیری مسلسل تین دن تک نہ تھی۔ اگر تھی تو اس سے کم تر میں تھی۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ تین روز تک بھوکے رہتے اور کسی دن سیری نہ ہوتی۔ ظاہر یہ ہے کہ مراد دوسرا مفہوم ہے۔ (واللہ اعلم) جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل وعیال کو مسلسل راتیں گزر جاتیں مگر رات کے کھانے کو کچھ نہ ہوتا۔ حالانکہ جو کی روٹی غذا تھی۔ اسے ترمذی نے روایت کیا۔ اور صحیح کہا ہے۔ مسلم میں ہے کہ آلِ محمد دو روز تک گندم سے شکم سیر نہ ہوتے مگر یہ کہ ان دو دنوں میں ایک دن کھجور کی غذا ہوتی تھی۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے اس حال میں تشریف لے گئے کہ آپ کا شکم اطہر ایک دن میں دو کھانوں سے نہ بھرا اگر کھجور سے سیر ہوئے تو جو کی روٹی سے سیر نہ ہوئے اور اگر جو کی روٹی سے سیر ہوئے تو کھجوروں سے شکم سیری نہ فرمائی۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ قسم ہے خدا کی آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک صاع کھانے سے شام نہ ہوئی۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نو گھر تھے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات رزق الٰہی کو کم سمجھنے میں نہیں فرمائی بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ امت اس میں آپ کی پیروی کرے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے دنیا کی تین چیزیں پسند آتی ہیں ایک خوشبو، دوسرے ازواج، تیسرے طعام، تو اول دو چیزیں یعنی خوشبو اور ازواج تو موجود تھیں لیکن تیسری چیز طعام نہ تھا۔

ترمذی، شمائل میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ کو "وقل" میں سے اتنی چیز نہ ہوتی کہ اس سے آپ شکم سیر ہوتے "وقل" ایک قسم کا ایسا کھانا جس میں گھٹیا کھجوروں کے ساتھ دوسری اجناس ملی ہوتی ہیں اور یہ فقراء کی خوراک ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اہلِ بیت ہیں جہاں ایک ایک مہینے تک گھر میں آگ نہ جلتی تھی اور ہمیں سوائے کھجور و پانی کے کوئی غذا میسر نہ ہوتی تھی ایک روایت میں ہے ہمیں دو ماہ اس حال میں گزر جاتے۔ ہمارے بعض انصاری ہمسایہ دودھ بھیج دیا کرتے اسی کو ہم سب پی لیا کرتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بلاشبہ راہِ خدا میں مجھے اتنی بلا ومشقت پہنچی ہے کہ اتنی کسی کو نہ پہنچی ہوگی اور دین خدا میں مجھے اتنی ایذائیں پہنچائی گئی ہیں کہ اتنی کسی کو نہ پہنچی ہوں گی اور یقیناً مجھے اور بلال کو دن رات گزر جاتے مگر اتنا کھانا نہ ہوتا جسے کوئی ذی روح کھا سکتا مگر اتنا جسے بلال کی بغل چھپا لیتی۔ مطلب یہ کہ اتنی کم مقدار میں ہوتی جو بلال رضی اللہ عنہ کی بغل میں چھپ جاتی اسے ترمذی نے روایت کیا اور صحیح کہا ہے۔

اور بعض غزوات میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ حال تھا کہ وہ درختوں کے پتے کھاتے یہاں تک کہ ان کے گلے زخمی ہو جاتے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چپاتیاں اور میدہ کی روٹیاں کبھی نہ دیکھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چھانی بھی نہ تھی۔ صاحب مواہب فرماتے ہیں کہ میں نے کتابوں میں بہت تلاش کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوراک کی روٹیاں چھوٹی ہوتی تھیں یا بڑی۔ لیکن میں نے اس بارے میں کوئی صحیح روایت نہیں پائی۔ بعض روایتوں میں اتنا حکم واقع ہوا ہے کہ چھوٹی روٹی بناؤ کیونکہ یہ برکت کا موجب ہے۔ ان کی سندیں ضعیف ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سالن سرکہ ہوتا اور فرماتے ہیں کہ: ''نِعْمَ الْإِدَامُ الْخَلُّ ۔'' سرکہ بہترین سالن ہے۔

جاننا چاہئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی یہ تنگی اور معیشت میں کمی جو مذکور ہوئی دائمی نہ تھی اور سب کو نہ تھی اور اگر تھی بھی تو احتیاج و افلاس اور نہ پانے کی وجہ سے نہ تھی بلکہ کبھی جود و ایثار کی وجہ سے نہ ہوتا اور کبھی شکم سیری کو برا جاننے کی وجہ سے۔ اور ایک ماہ مسلسل نہ کھانا ریاضت کے اختیار کرنے کی وجہ سے تھا۔ یہ ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں حال تھا۔ اور جب ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ میں رونق افروز ہوئے تو اہلِ مدینہ نے مکانات، عطیات، اموال، باغات اور کھیتیاں انہیں نذر کیں۔ اور صاحبِ ثروت صحابہ کرام مثلاً حضرت ابو بکر، عمر، عثمان، طلحہ، سعد بن ابی وقاص وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین یہ سب حضرات اپنا جان و مال حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان کرتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مال پیش کرنے کا حکم فرمایا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے تمام مال اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نصف مال پیش کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جیش عسرت میں اغنیاء صحابہ کو مدد دینے کی ترغیب دی اور انہیں ابھارا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہزار اونٹ مع ساز و سامان کے پیش کئے۔ اور یہ ثابت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک سال تک کھانے کا انتظام اپنے گھر والوں کیلئے رکھا کرتے تھے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ حج کے موقع پر سو اونٹ لے کر چلے اور ان کی قربانی دی۔ اور مساکین کو کھانا کھلایا اور بحرین سے آئے ہوئے ایک لاکھ درہم اسی گھڑی تقسیم فرمائے اور ہوازن اور حنین میں اونٹ بکری اور سونا چاندی کی اتنی زیادہ بخشش فرمائی جو احاطہ قیاس سے باہر ہے۔ جس کی تفصیل و احوال اس کے مقام میں آئے گی۔ مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وسعت و کشادگی کے امکان کے باوجود، فقر کو اختیار فرمایا جیسا کہ ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے ارشاد فرمایا کہ بطحا اور مکہ کی پہاڑیاں میرے لئے سونے کی کر دی جائیں مگر میں نے عرض کیا نہیں اے رب! شکم سیر ہوتا ہوں تو تیرا شکر بجالاتا ہوں اور بھوکا رہتا ہوں تو تیری ثنا کرتا ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور جبریل علیہ السلام کوہ صفا پر تشریف فرما تھے تو ایک ہولناک آواز سنی جس سے خوف معلوم ہوا۔ فرمایا جبریل علیہ السلام یہ دہشت ناک آواز کیسی ہے۔ کیا قیامت قائم ہو گئی ہے۔ جبریل علیہ السلام نے عرض کیا قیامت نہیں ہے لیکن آپ کے رب نے حضرت اسرافیل علیہ السلام کو حکم دیا ہے کہ اتر کر زمین کی کنجیاں آپ کے حضور پیش کرے اس کے بعد اسرافیل علیہ السلام آئے اور عرض کیا اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم فرمایا کہ میں حضور ﷺ سے عرض کروں کہ تہامہ کے پہاڑ آپ کے ہمراہ کر دوں۔ اور انہیں زمرد، یاقوت اور سونے چاندی کا بنا دوں۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جبریل علیہ السلام نے عرض کیا کہ آپ کا رب فرماتا ہے کہ آپ کی تمام قدر و منزلت اور اس ثواب کے باوجود جو آپ کو حاصل ہے اور جبریل علیہ السلام نے عرض کیا آپ نبی سلطان ہونا چاہتے ہیں یا نبی بندہ۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ اس وقت آپ کا ایک غلام موجود تھا اس نے کہا یا رسول اللہ اسے (سلطنت کو) اختیار فرمایئے تا کہ کچھ دن تو آسائش سے گزاریں اس پر جبریل علیہ السلام نے حضور ﷺ کو اشارہ کیا کہ تواضع اختیار فرمایئے اور بندگی پسند کیجئے۔ علماء راضی نہیں ہیں کہ حضور ﷺ کو فقر و احتیاج

سے موصوف کریں اور زہد ضروری کے ساتھ تعریف کریں۔

صاحب مواہب لدنیہ حلیمی سے در "شعب الایمان" نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم یہ ہے کہ آپ کو تمام صفتوں سے یاد کرسکتے ہیں لیکن ان اوصاف سے جو ضعیف و مساکین کی صفتیں ہیں ان سے تعریف نہ کی جائے۔ اور یہ نہ کہا جائے کہ آپ فقیر تھے یا آپ مفلس تھے اور بعض علماء نے تو آپ کے حق میں زہد کے اطلاق سے بھی منع کیا ہے۔

صاحب "نثر الدرر" محمد بن واسع سے حکایت کرتے ہیں کہ ان کے سامنے کہا گیا کہ فلاں زاہد ہے انہوں نے پوچھا دنیاوی مال کتنا رکھتا ہے۔ جس میں وہ زہد کرتا ہے۔ اسے قاضی عیاض رحمہ اللہ نے شفا میں نقل کیا ہے اور شیخ تقی الدین سبکی نے "السیف المسلول" میں نقل کیا ہے کہ فقہائے اندلس نے متفقہ طور پر اس شخص کے قتل کرنے اور سولی چڑھانے کا فتویٰ دیا جس نے مناظرہ کے دوران، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا استخفاف کیا اور آپ کو یتیم کہہ کر نام لیا اور کہا کہ آپ کا زہد ضروری تھا۔ اور قصد و اختیار سے نہ تھا اگر اچھے کھانوں پر قدرت پاتے تو کھاتے۔ (انتہیٰ)

نیز منقول ہے کہ ایک مصری شخص نے دوسرے سے بطریق طعن و استخفاف کہا تو کون ہے تیرا باپ تو بکریاں چراتا تھا اس نے کہا اگر میرا باپ بکریاں چراتا تھا تو نبی نے بھی بکریاں چرائی ہیں۔" اس پر بعض علماء نے تعزیر کا حکم دیا اور بعض نے اس کے قتل کا حکم دیا کیونکہ اس نے اپنی ذات سے عیب و عار کو اٹھانے کیلئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا استخفاف کیا ہے ہاں اگر بطریق مسئلہ یا بیان حکم کے کہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بکریاں چرائی ہیں تو درست ہے۔

نیز صاحب مواہب، بدر الدین زرکشی سے نقل کرتے ہیں کہ بعض فقہائے متاخرین کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مال سے کبھی بھی فقیر نہ تھے لیکن آپ کا حال فقراء کے حال کے مشابہ تھا۔ بلکہ تمام لوگوں سے کہیں زیادہ غنی تھے۔ اللہ تعالیٰ دنیاوی امور میں آپ کی اور آپ کے اہل و عیال کی کفایت فرماتا تھا اور آپ اپنی دعا میں فرمایا کرتے۔ "اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مِسْكِيْنًا ۔" "اے خدا مجھے مسکینی کی زندگی عطا فرما۔ اس سے مراد دل کی تسکین و طمانیت ہے نہ کہ وہ مسکینی جو دنیاوی مال کے نہ ہونے سے اور نہ رکھنے سے ہوتی ہے اور وہ جو آپ کے کفایت کے ضمن میں آیا ہے اور جو اس کے برخلاف اعتقاد رکھے اس کے انکار میں شدت کرتے تھے۔ (انتہی)

اور یہ جو لوگوں میں مشہور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَلْفَقْرُ فَخْرِيْ وَبِهٖ اَفْتَخِرُ ۔" (فقر میرا فخر ہے اور میں اس پر فخر کرتا ہوں) شیخ الاسلام حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث موضوع ہے۔ (فتدبر، واللہ اعلم)

فائدہ: حدیثوں میں آیا ہے اور مشہور ہوچکا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھوک کے وقت شکم مبارک پر پتھر باندھے ہیں۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی پتھر باندھنا روایت کیا گیا ہے۔ حضرت ابن جبیر سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھوک معلوم ہوئی آپ نے پتھر کو شکم اطہر پر رکھ کر فرمایا خبردار ہو۔ بہت سے طمع کرنے والے اور نعمتوں والے دنیا میں ایسے ہیں جو آخرت میں بھوکے اور ننگے ہوں گے۔ اور آگاہ رہو بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے نفس کی بڑائی کرتے اور خود کو بزرگ بناتے اور تکبر کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ نفس ان کی اہانت کرنے والا ہوتا ہے اور بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو نفس کو ذلیل کرنے والے اور اس کو جھکانے والے ہیں حالانکہ وہ نفس ان کی عزت کرنے والا ہوتا ہے اسے ابن ابی الدنیا نے روایت کیا۔

حضرت انس، حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھوک کی شکایت کی اور ہم میں سے ہر ایک نے اپنا پتھر کھول کر دکھایا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے شکم اطہر پر دو پتھر دکھائے۔ ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث کو میں نہیں جانتا۔ البتہ اس مفہوم میں حضرت

جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جو غزوۂ خندق کے دن کی ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کدال لئے کھڑے دیکھا حالانکہ آپ کے شکم اطہر پر پتھر بندھا ہوا تھا۔ صاحب قصیدہ بردہ شریف فرماتے ہیں۔

وَشَدَّ مِنْ سَغَبٍ اَحْشَاءَهٗ وَطَوٰی   تَحْتَ الْحِجَارَةِ كَشْحًا مُتْرَفَ الْاَدَمِ

صاحب مواہب کہتے ہیں کہ ابو حاتم بن حبان نے ان حدیثوں کا انکار کیا ہے جو بطن شریف پر بھوک سے پتھر باندھنے میں ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ حدیث باطل ہے اور انہوں نے صوم وصال کی حدیث سے تمسک واستدلال کیا ہے کہ فرمایا: "يُطْعِمُنِيْ رَبِّيْ وَيَسْقِيْنِيْ" میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کو کھاتا پلاتا ہے۔ جب صوم وصال رکھتے ہیں تو آپ بھوک میں پتھر باندھنے کے کیوں محتاج ہوں گے۔ اور کہا کہ بھوک میں پتھر باندھنا نہ کوئی فائدہ پہنچاتا ہے نہ اثر رکھتا ہے۔

ابن حبان فرماتے ہیں کہ لفظ حجز زاء سے ہے اور حجز کے معنی اس پلکے کے ہیں جسے بھوک کے وقت مضبوط کر کے باندھتے ہیں جس طرح کمزوری میں کمر کو باندھتے ہیں (انتہٰی)

صاحب مواہب فرماتے ہیں کہ درست یہ ہے کہ حدیثیں صحیح ہیں اور اس کا باندھنا بھوک کی بعض تکلیفوں سے تسکین پہنچاتا ہے۔ اس لئے کہ بھوک کی تکلیف، معدے کی حرارتِ غریزی کی شدت سے ہے اور جب معدہ کھانے سے بھر جاتا ہے تو وہ حرارت کو کھانے کی طرف مشغول کر دیتا ہے اور جب معدے میں کھانا نہ ہو تو حرارت، جسم کی رطوبات حاصل کر کے جلاتی اور اسے کھاتی ہے تو انسان اس حرارت سے درد و تکلیف محسوس کرتا ہے۔ اور جب کوئی چیز پیٹ پر لپیٹ لی جائے تو معدے کی حرارت کسی قدر دب جاتی ہے۔ اور تکلیف کو کم کر دیتی ہے اور تسکین پہنچاتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھوک سے تکلیف اٹھانا اجر کو اس سے مزید بڑھانے کیلئے ہے جو حفظِ قوت، نضارتِ جسم اور رنگت کے نکھار کو زیادہ کرنے کے مقابلہ میں ہے جیسا کہ خوش حال اور اہل تنعم رکھتے ہیں اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا عجیب معجزہ ہے کہ اہل دنیا تو جسم کے رنگ روپ اور اس کے نکھار کو مرغوب ولذیذ کھانوں کے کھانے سے اور نرم ونازک لباس کے پہننے سے اور گدیلے فرشوں پر بیٹھنے سے حاصل کرتے ہیں مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس چیز کو نان جویں کی خوراک اور کھردرے کپڑوں کے لباس اور سخت و درشت بستر سے حاصل فرماتے تھے اور آپ کے حسن و جمال اور لطافت و نظافت کی کوئی حد و غایت ہی نہیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم وعلی آلہ علی قدر حسنہ و جمالہ و حسب فضلہ و کمالہ۔

بعض کہتے ہیں کہ اہلِ عرب کی عموماً اور اہلِ مدینہ کی خصوصاً عادت تھی کہ جب ان کے بطون یعنی خالی پیٹ ہوتے اور ان کے شکم اندر دھنس جاتے تو تکلیف کی تسکین وتخفیف کیلئے اس پر پتھر باندھتے تھے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی باندھا تاکہ آپ کے صحابہ (رضی اللہ عنہم) جان لیں اور معلوم ہو جائے کہ آپ کے پاس کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے بھوک کو ختم کر سکیں اس لئے اس حال سے اظہار فرماتے تھے۔ صاحب مواہب فرماتے ہیں کہ صواب و درست یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل اپنے اختیار اور حصول ثواب کیلئے تھا نہ کہ محض حال کے بتانے اور اظہار کرنے کے لئے (واللہ اعلم)

بندۂ مسکین نور اللہ قلبہ بنور الیقین (صاحب مدارج رحمہ اللہ) کہتا ہے کہ ابن حبان کا یہ کہنا کہ رب تعالیٰ اپنے حبیب کو صوم وصال میں کھلاتا پلاتا تھا تو بھوک کی درد و تکلیف کی تسکین کے لئے پتھر باندھنے سے کیا فائدہ۔ یہ اس بات میں داخل ہو سکتا ہے کہ وہ فرمان صوم وصال کے ساتھ خاص ہے۔ کیونکہ یہ حالت ذوق وشوق کی ہے۔ اور دائمی نہیں ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال مختلف تھے کبھی ایسا اور کبھی ویسا اور حق تعالیٰ کی حکمتیں تصرف و تحویل میں اپنے حبیب کے ساتھ ایسی خاص ہیں جو عقل وقیاس میں نہیں سما سکتیں۔ ہاں اگر ان حدیثوں کی سندوں میں کلام کریں تو بات دوسری ہے (واللہ اعلم)

غذائے مبارک۔ وصل: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ریاضت نفس، طعام کی جانب عدم التفات اور قضائے شہوت اور اس کی مقتضیات کو پورا نہ کرنے کے باوجود حبس نفس میں کسی مخصوص غذاؤں کا تکلف نہ فرماتے تھے اور تکلف کی روش اختیار نہ کرتے اور امت پر وسعت ملحوظ خاطر رکھنے اور رہبانیت کی راہوں کو مسدود کرنے کی وجہ سے اہل مدینہ کی عادت کے موافق تناول فرماتے تھے اور جو کچھ موجود ہوتا، گوشت، ترکاری، پھل اور کھجور وغیرہ میں سے جو کچھ آ تا تو نوش فرماتے تھے۔ نیز علماء فرماتے ہیں کہ کسی مخصوص غذا کو خاص کر لینا طبیعت کیلئے مضر ہے۔ اگرچہ وہ غذا کتنی ہی بہترین اور بھوک بڑھانے والی ہو اسی بنا پر شیرینی اور شہد کو نوش فرماتے اور انہیں پسند کرتے تھے۔ اسے بخاری و ترمذی نے روایت کیا ہے۔ "حلو" ہر وہ میٹھی چیز جو کھائی جائے اسے کہتے ہیں۔

خطابی کہتے ہیں کہ حلو اس مٹھائی کو کہتے ہیں جو کاریگری سے بنائی گئی ہو (اسی وجہ سے مٹھائی بنانے والے کو حلوائی کہتے ہیں) لہٰذا شہد کو حلوہ نہ کہیں گے اور کبھی پھلوں پر بھی بولا جاتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کو پسند فرمانا، کثرت خواہش، شدت میلان اور طبیعت کا اس کو چاہنے کے معنی میں نہ تھا بلکہ اگر موجود ہوتا تو شوق کے ساتھ مزہ بدلنے کی حد تک نوش فرماتے۔ تاکہ اس سے لوگوں کو معلوم ہو جائے اور انہیں پتہ چل جائے کہ آپ اسے پسند فرماتے ہیں۔

صاحب مواہب لدنیہ نے ثعالبی سے فقہ کی لغت میں نقل کیا ہے کہ وہ حلوہ (شیرینی) جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پسند فرماتے تھے اس کا نام "مجیع" (بفتح میم و کسر جیم) تھا یہ ایک قسم کی کھجور تھی جسے دودھ کے خمیر سے بناتے تھے۔ نیز مروی ہے کہ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کا ایک قافلہ آیا جس کے ساتھ شہد اور آٹا تھا اور ایک روایت میں ہے کہ آٹا، میدہ، گھی اور شہد تھا تو آپ ان میں سے تھوڑا تھوڑا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کیلئے برکت کی دعا فرمائی اور دیگچی منگائی اور آگ پر رکھی اور حلوہ تیار کر کے صحابہ سے فرمایا اسے کھاؤ یہ وہ چیز ہے جسے اہل فارس "حیص" کہتے ہیں۔ نیز مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم شکر کو پسند فرماتے اور اسے صدقہ دیتے تھے۔ طحاوی میں ایک حدیث مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک انصاری شخص کی شادی میں تشریف لائے اس کے بعد باندیاں بادام و شکر کے طباق لائیں تو لوگوں نے اپنے ہاتھوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کی بنا پر اس میں ڈالنے سے باز رکھا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم اسے لوٹتے نہیں۔ صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہی نے تو لوٹنے کی ممانعت فرمائی ہے فرمایا شادی میں اسے منع نہیں فرماتا اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم قوم کی جانب اسے اچھالتے تھے اور قوم اسے لوٹتی تھی۔ امام طحاوی اس حدیث کو لٹانے کے مکروہ نہ ہونے پر حجت میں لائے ہیں۔ جیسا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا اس جانب مذہب ہے اور انہوں نے اس حدیث سے ان صحیح حدیثوں پر جو لوٹنے اور لٹانے کی ممانعت میں وارد ہیں حکم فرمایا ہے لیکن بیہقی نے اس حدیث کو ثابت نہ گردانا اور اس بنا پر امام طحاوی پر لوٹنے کے قائل ہونے میں تشنیع کی۔ بندۂ مسکین خصہ اللہ بمزید الیقین (صاحب مدارج رحمہ اللہ) کہتا ہے کہ بلا شبہ حج کی قربانی میں لوٹنے کا حکم وارد ہوا ہے یہ بھی امام صاحب کے قول کی موافقت میں ایک حجت و دلیل ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بکری کے گوشت کو تناول فرمایا اور گائے کے گوشت کو خصوصی طور سے تناول فرمانا معلوم نہیں ہوا۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات کی جانب سے ایک گائے ذبح فرمائی۔ ظاہر ہے کہ اسے آپ نے بھی تناول فرمایا ہوگا۔ (واللہ اعلم)

گوشت کی تعریف۔ گوشت کی تعریف میں متعدد حدیثیں وارد ہوئی ہیں مثلاً۔ "اَللَّحْمُ سَیِّدُ الطَّعَامِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ۔" جنتیوں کیلئے گوشت کھانے کا سردار ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے: "سَیِّدُ الطَّعَامِ اَھْلِ الدُّنْیَا وَالْآخِرَۃِ" دنیا اور آخرت والوں کیلئے گوشت کھانے کا

سردار ہے۔ اس حدیث کو ابن ماجہ اور ابن ابی الدنیا نے روایت کیا ہے اور اس کی سند ضعیف ہے لیکن اس کی شاہد وہ حدیث ہے جسے علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ نے بیان فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "دنیاوی کھانے کا سردار گوشت ہے اس کے بعد چاول۔" اسے ابو نعیم نے "الطب النبوی" میں نقل کیا ہے اور اس کے کھانے سے ستر قوتیں بڑھتی ہیں اسے زہری نے کہا ایسا ہی مواہب میں ہے۔

نیز علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ گوشت کھانا، خون کو صاف کرتا اور خصلت کو اچھا بناتا ہے اور جو شخص اسے چالیس دن تک نہ کھائے اس کی خصلت بری ہو جاتی ہے۔ (کذا فی المواہب۔) جس طرح کہ مسلسل اتنی مدت تک نہ کھانے میں یہ خاصیت واقع ہوئی ہے اسی طرح مسلسل اتنی مدت تک کھانے میں قساوت قلب اور سختی طبع کی تاثیر بھی وارد ہوئی ہے۔

نیز بعض آثار میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک کھانوں میں پسندیدہ تر گوشت تھا فرمایا کرتے گوشت کھانا سماعت کو زیادہ کرتا ہے اور دنیا میں گوشت تمام کھانوں میں بہترین ہے اگر میں اپنے رب سے چاہوں کہ وہ گوشت کھلائے تو وہ روزانہ ضرور مجھے گوشت کھلائے۔

امام شافعی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ گوشت کھانا عقل کو بڑھاتا ہے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دست کا گوشت بہت پسند تھا نیز اسی بنا پر ایک یہودیہ نے زہر آلود دست بھیجی تھی۔

ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دست کے گوشت کی پسندیدگی اس وجہ سے تھی کہ نہ تو روزانہ گوشت ہوتا تھا اور نہ روزانہ نوش فرماتے تھے البتہ کبھی کبھی تناول فرماتے تھے تو دست کا گوشت جلدی پک جاتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے تناول فرمانے میں جلدی کرتے تھے۔

ترمذی کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اَطْیَبُ اللَّحْمِ لَحْمُ الظَّہْرِ" بہترین گوشت پیٹھ کا گوشت ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ دست کے گوشت کی پسندیدگی اس وجہ سے تھی کہ وہ مواضع نجاست سے بہت دور ہے اس توجیہہ کی تائید میں وہ روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم گردوں کو ناپسند فرماتے تھے کیونکہ وہ پیشاب کی جگہ سے قریب ہے لیکن حافظ عراقی نے کہا ہے کہ اس کی سند ضعیف ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم گوشت کو نہش فرماتے۔ یعنی ہڈی سے گوشت کو دانتوں سے چھڑا کر تناول فرماتے اور نہش، سین معجمہ اور مہملہ دونوں سے آیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ معجمہ کے ساتھ، تمام دانتوں سے کھانا اور مہملہ کے ساتھ، دانتوں کے سروں سے کھانا اور گوشت کو چھری سے کاٹ کر بھی تناول فرماتے بخاری کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دست مبارک میں چھری لے کر بکری کے شانہ سے گوشت چھیل کر تناول فرمایا۔ پھر نماز کیلئے ندا کی گئی تو دست مبارک سے اس چھری کو چھوڑ دیا جس سے چھیل رہے تھے اور نماز کیلئے کھڑے ہو گئے۔ وضو نہ کیا۔ (یعنی دست مبارک نہ دھوئے) اور حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گوشت کو چھری سے نہ کاٹو کیونکہ یہ عجمیوں کا کام ہے اور اسے دانتوں سے کھاؤ کیونکہ یہ بہت ہاضم اور زیادہ دل پسند ہے۔ ابو داؤد فرماتے ہیں کہ یہ حدیث قوی نہیں ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے کہا ہے کہ اس حدیث کی شاہد، صفوان بن امیہ کی مروی حدیث ہے جسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔ بعض روایتوں میں نہش کا حکم آیا ہے بغیر قطع کی ممانعت کی صراحت کے۔ علماء ان میں اس طرح تطبیق کرتے ہیں کہ نہش یعنی دانتوں سے کاٹنا چھوٹی ہڈی سے ہے اور قطع یعنی چھری سے کاٹنا بڑی ہڈی سے ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گوشت کو بھنا ہوا تناول فرمایا ہے۔ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں نے بھنا ہوا بازو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا آپ نے اس میں سے تناول فرمایا۔ اس کے بعد بغیر وضو کئے نماز کیلئے کھڑے ہو گئے۔ (یعنی دست مبارک نہ دھوئے) یہ حدیث صحیح ہے اسے ترمذی نے روایت کیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قدید کو

یعنی خشک شدہ گوشت کو تناول فرمایا جیسا کہ سنن میں مروی ہے کہ ایک صحابی نے بیان کیا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے بکری ذبح کی اور ہم مسافر تھے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس گوشت کی اصلاح کرو تو میں اس میں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گوشت تناول کراتا رہا یہاں تک کہ ہم مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ گوشت کی اصلاح سے مراد قدید بنانا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھنا ہوا جگر تناول فرمایا ہے۔ اور مرغی کا گوشت تناول فرمایا ہے۔ اسے بخاری و مسلم اور ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حمار وحشی کا گوشت تناول فرمایا ہے اسے گورخر اور نیل گائے بھی کہتے ہیں۔ شیخین نے اسے روایت کیا ہے اور اونٹ کا گوشت تو سفر و حضر میں تناول کیا ہے۔ خرگوش کا گوشت بھی تناول کیا ہے اور بحری دواب یعنی دریائی جانور تناول کئے ہیں اسے مسلم نے روایت کیا ائمہ کرام کی دریائی جانوروں کے کھانے میں تفصیل ہے۔ بعض کے نزدیک تو مطلقاً جائز ہے اور بعض کے نزدیک غیر انسان بحری و خنزیر بحری۔ لیکن ہمارے مذہب میں بجز مچھلی کے کچھ جائز نہیں ہے۔

ثرید۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ثرید تناول فرمایا ہے فارسی میں ثرید کو اشکنہ کہتے ہیں۔ ثرید۔ روٹی کو توڑ کر گوشت کے شوربے میں اور کبھی گوشت کے ساتھ بھی تیار کرتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ "فَضْلُ عَائِشَۃَ عَلَی النِّسَاءِ کَفَضْلِ الثَّرِیْدِ عَلٰی سَائِرِ الطَّعَامِ۔" عورتوں پر عائشہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت ایسی ہے جیسی تمام کھانوں پر ثرید کی فضیلت۔ اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک تمام کھانوں میں پسندیدہ ثرید خبز اور ثرید حیس تھا۔ ثرید خبز تو روٹی اور شوربے سے بنایا جاتا ہے اور ثرید حیس کھجور، گھی اور روٹی سے بنایا جاتا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گھی اور مکھن سے روٹی تر کر کے تناول فرمائی ہے۔ اور روغن زیتون چپڑ کر بھی روٹی تناول فرمائی ہے اور ہریسہ تناول فرمانے میں بہت سی حدیثیں مروی ہیں۔ جسے محدثین وضع کے ساتھ منسوب کرتے ہیں۔ طبرانی نے اوسط میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جبریل علیہ السلام نے مجھے اتنا ہریسہ کھلایا کہ میری کمر قیام کیلئے قوی و مضبوط ہو گئی۔ کہا گیا ہے کہ اس حدیث کی سند میں محمد بن حجاج لحمی ہے اس نے اس حدیث کو وضع کیا ہے۔

کدو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کدو کو تناول فرمایا۔ اور اسے پسند فرمایا ہے۔ اگر کسی سالن میں پکا ہوتا تو پیالے کے کناروں سے تلاش فرما کر اسے نوش فرماتے یہ اسے پسند کرنے کی بنا پر ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب سے میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل کو دیکھا ہے مجھے کدو سے محبت ہوئی ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ مستحب ہے کہ کدو سے محبت رکھیں اور ہر اس چیز سے محبت رکھیں جسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سلق یعنی چقندر کو جو کی روٹی کے ساتھ تناول فرمایا ہے۔ چقندر ایک مشہور ترکاری ہے اسے ترمذی نے شمائل میں اس طرح روایت کیا ہے کہ ایک دن امام حسن بن علی، عبد اللہ بن عباس اور عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہم سلمٰی رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خادمہ تھیں انہوں نے کہا اے سلمٰی رضی اللہ عنہا ہمارے لئے وہ کھانا تیار کرو جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت پسند تھا۔ سلمٰی رضی اللہ عنہا نے کہا اے صاحبزادو آج میں تمہیں اس کھانے سے خوش نہیں کر سکتی۔ مطلب یہ کہ تم لذیذ و مرغوب کھانے کھاتے ہو یہ کھانا تمہیں کیا خوش کرے گا۔ انہوں نے کہا کہ ہاں ہمیں اچھا معلوم ہو گا ہمارے لئے تیار کرو۔ اسکے بعد ٹکڑے آش جو کےلے کے اسے دیگچی میں ڈال کر اوپر سے کچھ زیتون کا تیل اور مرچ اور دیگر ضروری چیزیں ڈال کر تیار کر دیا اور دیگچی ان کے سامنے رکھ کر کہا یہ وہ کھانا ہے جسے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم رغبت سے تناول فرماتے اور پسند فرماتے تھے۔

لپٹا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خزیرہ یعنی لپٹے کو بھی نوش فرمایا ہے۔ جسے آٹے سے پتلا کر کے بنایا جاتا ہے ایسا ہی طبری نے کہا

ہے۔ اور جوہری کہتے ہیں کہ گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے بہت سا پانی ڈال کر پکایا جاتا ہے۔ جب پک کر نرم وملائم ہو جاتا ہے تو آٹا ڈال کر تیار کرتے ہیں۔ اگر گوشت نہ ہو تو اسے عصید کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ آٹے کو گھول کر چھانتے ہیں تاکہ بھوسی نکل جائے پھر پکاتے ہیں۔ خزیرہ خاء کے ساتھ وہ ہے جو بھوسی سے بنایا جاتا ہے۔ اور حزیرہ حاء کے ساتھ وہ ہے جو دودھ سے بنایا جاتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ میرے پاس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ چاشت کے وقت خوب دن چڑھے تشریف لائے تو میں نے خزیرہ کو ان کیلئے تیار کیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اقط یعنی پنیر کو نوش فرمایا جسے دودھ سے مسکہ نکال کر جماتے ہیں جو ترش اور سخت ہوتا ہے پھر پگھلا کر کھانوں اور سالنوں میں ڈالتے ہیں۔

پھل: اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خشک کھجور، تر کھجور اور گدری کھجور تناول فرمائی ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کَباث کو نوش فرمایا ہے۔ کباث اراک کا پھل ہے جو پکا ہو۔ اور اراک مسواک کے درخت کو کہتے ہیں جسے ہندی میں پیلو کہتے ہیں اور کھجور کے گودے کو بہت پسند فرماتے تھے جو کھجور کے درخت سے گوند کی مانند نکلتا ہے۔ اسے شحمۃ النخل کہتے ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبن نوش فرمایا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ تبوک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جبن لایا گیا۔ تو آپ نے چھری منگا کر بسم اللہ کہہ کر اسے کاٹا اور ابو داؤد نے روایت کیا اور بعض فقہاء نے اس میں کلام کیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خربوزے کو کھجور سے نوش فرمایا۔ اور خربوزہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پسندیدہ پھلوں میں سے تھا۔ خربوزے کی تعریف میں کئی حدیثیں آئی ہیں۔ اور اس میں رسالے لکھے گئے ہیں۔ مگر محدثین ان پر وضع کا حکم دیتے ہیں (واللہ اعلم) اور عجیب بات یہ ہے کہ محمد بن اسلم خربوزہ کو نہ کھاتے تھے۔ اس لئے کہ منقول نہیں ہوا ہے کہ اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح نوش فرماتے تھے۔ ایک روایت میں ککڑی نوش کرنا کھجور کے ساتھ اس طرح آیا ہے کہ ایک دست مبارک میں ککڑی تھی اور دوسرے دست مبارک میں کھجور تھی کبھی اسے نوش فرماتے اور کبھی اسے۔ اسی طرح خربوزے اور کھجور کو۔ کیونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ کھجور اور خربوزہ ملا کر نوش کرتے اس کے دو احتمال ہیں۔ یا تو دونوں کو منہ میں رکھ کر چباتے تھے۔ یا کبھی اسے اور کبھی اسے اور نادر حدیثوں میں سے ایک حدیث یہ ہے جسے ابن ماجہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔ فرماتی ہیں میری والدہ میرے موٹاپے کا علاج کرتی تھیں اور میری والدہ اس میں جلدی کرتی تھیں تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مجھے بھیجا جائے مگر کوئی علاج درست نہ بیٹھتا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے کھجور اور ککڑی ملا کر کھائی تو میرا موٹاپا ٹھیک ہو گیا ایسا ہی مواہب نے بیان کیا ہے۔ جاننا چاہئے کہ شارحین طب نبویان حدیث کا خیال ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سے مقصد یعنی ککڑی اور تر کھجور کو ملا کر نوش کرنے سے تر کھجور کی گرمی مارنا تھی نہ کہ ککڑی کی برودت کو کم کرنا اور اسے اعتدال پر لانا یہ طبی اصول سے تھا جیسا کہ ابی امامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔ جو بروایت ہشام آئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ککڑی کو تر کھجور کے ساتھ اس لئے نوش فرماتے تھے کہ ککڑی کی برودت کو کھجور کی گرمی سے اور کھجور کی گرمی کو ککڑی کی برودت سے اعتدال پر لائیں۔ کہتے ہیں کہ ترکیب اطعمہ اور ادویہ میں یہ ایک بڑی اصل و قاعدہ ہے حتیٰ کہ کہتے ہیں کہ بطیخ کو تر کھجور سے ملا کر کھانے سے مراد، بطیخ اخضر یعنی ککڑی ہے جو سرد ہے نہ کہ بطیخ اصفر۔ یعنی خربوزہ جو گرم ہے۔ جواب میں یہ بھی کہا گیا ہے بطیخ اصفر (خربوزہ) بمقابلہ تر کھجور کے یک گونہ سرد ہے اگرچہ شیرینی کی وجہ سے قدرے حرارت ہے۔ اس مسکین کا خیال ہے کھجور اور بطیخ کو ملانے سے ایک دوسرے کی حرارت و برودت کو توڑنے اور معتدل بنانے کی جو علت بیان کی ہے جب کہ قوم کہتی ہے تو یہ ایک تکلف ہے ظاہر یہ ہے کہ یہ ملانا اتفاقی امر تھا۔ ممکن ہے کہ خربوزہ میٹھا نہ ہو اور ککڑی تو بالکل ہی میٹھی نہیں ہوتی ملا کر نوش فرمایا تاکہ شیریں ہو جائے۔ اسی طرح یہ بھی کہتے ہیں کہ جو سرد اور خشک ہے اور کھجور گرم و تر۔

لہٰذا دونوں کو ملا کر کھانا بنانا جو کی سردی اور کھجور کی گرمی مارنا ہے اور یہ اچھی تدبیر تعدیل ہے (واللہ اعلم بحقیقۃ الحال)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کو مکھن کے ساتھ نوش فرمایا اور اسے پسند فرمایا آج بھی یہ غذا ہمارے شہروں میں رائج اور بازاروں میں فروخت ہوتی ہے۔ اور کھجور کے سرے پر مکھن رکھتے ہیں اکثر تر کھجور ساتھ کھاتے ہیں تاکہ مکھن کی چکناہٹ تر کھجور کی عفونت کو مار دے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم روٹی کو سالن کے ساتھ نوش فرماتے جو بھی موجود ہوتا کبھی گوشت کا سالن کبھی ترکاری کا۔ کبھی کھجور کا اور مروی ہے کہ کھجور اور جو کی روٹی کے ٹکڑے کو زبان پر رکھ کر فرمایا۔ "نانخورش" یہ ہے۔ اور کبھی سرکہ سے نوش کرتے اور فرماتے "نِعْمَ الْاُدُمُ الْخَلُّ۔" سرکہ بہترین سالن ہے۔ اسے مسلم، خطابی اور قاضی عیاض رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس ارشاد سے مراد کھانے کی چیزوں میں میانہ روی اور لذیذ کھانوں سے اجتناب کرنے کی تلقین ہے۔ مطلب یہ کہ روٹی کے ساتھ سالن، سرکہ وغیرہ ہوتا تھا اور بآسانی دستیاب ہو جاتا ہے۔ نادار الوجود نہیں ہے اور شہوت و رغبت نہ کو۔ کیونکہ یہ دین کو فاسد کرتا اور بدن کو بیمار بنایا ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ تعریف خاص سرکہ کیلئے ہے کیونکہ اس میں منافع بکثرت ہیں رہا کھانے پینے میں میانہ روی اور شہوت کے ترک کرنا تو یہ دوسری حدیثوں اور دیگر قواعد سے ظاہر ہے۔

ابن قیم کہتے ہیں کہ سرکہ کی یہ تعریف وقتی اقتضائے حال کے بموجب ہے اس سے دیگر سالنوں پر فضیلت دینا مقصود نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض حضرات خیال کرتے ہیں۔ اس حدیث کی شان وقوع یہ ہے کہ ایک دن حضور ﷺ گھر تشریف لائے اور پس و پیش خشک روٹی لا کر پیش کی اس پر حضور ﷺ نے فرمایا تمہارے پاس سالن نہیں ہے۔ انہوں نے کہا ہمارے پاس سالن تو نہیں ہے البتہ سرکہ ہے فرمایا "نعم الادام الخل" سرکہ بہترین سالن ہے۔ مقصود یہ ہے کہ سالن کے ساتھ روٹی کھانا حفظ صحت کے اسباب میں سے ہے۔ کیونکہ یہ روٹی کی اصلاح کرتا ہے اور اسے نرم بناتا ہے۔ جو حفظ صحت کیلئے ہے بخلاف ان دونوں میں سے کسی ایک پر اکتفا کرنا۔ اس میں سرکہ کی فضیلت، دودھ، گوشت، شہد اور شوربے پر نہیں ہے اور اگر دودھ یا گوشت موجود ہوتا تو اور زیادہ تعریف فرماتے لہٰذا حضور ﷺ کا فرمانا ان کی خاطر اور ان کے دلوں کو خوش کرنے کیلئے ہے۔ دیگر سالنوں پر اسے فضیلت دینے کیلئے نہیں ہے۔ اور حضور ﷺ اپنے شہر مبارک کی ترکاریوں اور پھلوں کو پکنے کے بعد تناول فرماتے اور ان سے اجتناب نہ فرماتے تھے۔ صاحب مواہب لدنیہ فرماتے ہیں کہ یہ حفظ صحت کے اسباب میں بہت بڑی چیز ہے اس لئے کہ حق تعالیٰ نے اپنی حکمت سے ہر بستی میں ایسے پھل پیدا فرمائے ہیں جس سے ان کے وقت میں وہاں کے رہنے والوں کو نفع پہنچتا ہے۔ اس بنا پر اسباب صحت اور اپنی عافیت کے لحاظ سے انہیں کھاتے ہیں۔ اور بہت سی دواؤں کے استعمال سے بے نیاز رہتے ہیں بہت کم لوگ ہیں جو بیماری و کمزوری کے خوف سے اپنے شہروں کے پھلوں سے بچتے اور پرہیز کرتے ہوں مگر یہ کہ کوئی بہت ہی زیادہ بیمار اور بہت ہی کمزور و ناتواں ہو اور ان کی صحت و قوت اس کی متحمل نہ ہو لہٰذا جو کوئی ان کو ان کی فصل میں کھائے گا وہ بہت سی بیماریوں کیلئے نافع، دوا رہے گا۔ (انتہیٰ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انگور کے خوشے تناول کرتے دیکھا ہے۔ یہ اس طرح کہ خوشہ منہ میں رکھ کر اس کے دانے توڑتے اور تنکوں کو باہر خالی کر کے کھینچ لیتے۔ اور متعارف یہ ہے کہ ہاتھ سے دانے توڑ کر منہ میں ڈالتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اس حدیث کی کوئی اصل نہیں ہے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیاز کو تناول نہیں فرمایا اور نہ امت کو اس سے منع فرمایا۔ اور فرمایا جو پیاز کھاتا ہے اسے چاہئے کہ مسجد میں نہ آئے۔ اسی پر دیگر اجتماعات کو بھی قیاس کیا گیا ہے ابو داؤد نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آخری کھانا تناول فرمایا ہے اس میں پیاز تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ اثبات اور تاکید جواز کیلئے تناول فرمایا ہے یا پکی ہوئی

تھی۔ اور اس کی بو دور کر دی گئی تھی۔ کراہت تو کچی پیاز کے کھانے میں ہے کیونکہ اس سے بو آتی ہے ابتدائے ہجرت کے وقت جتنے عرصے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مکان میں رہے وہ جب ایسا کھانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے جس میں پیاز کی بو ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود تناول نہ فرماتے دیگر صحابہ کو بھیج دیتے۔ لہسن کا بھی یہی حکم ہے بلکہ اس کا حکم اس سے زیادہ ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ لہسن، پیاز اور گندنے کے حکم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں علماء اختلاف رکھتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر حرام تھا لیکن اصح یہ ہے کہ مکروہ تھا کراہت تنزیہی کے ساتھ نہ کہ کراہت تحریمی کے ساتھ۔ اس عموم قول کی بنا پر کہ حضور ﷺ نے صحابہ کے پوچھنے پر کہ یہ حرام ہے؟ فرمایا نہیں اور جو حضور ﷺ کیلئے حرمت کے قائل ہیں کہتے ہیں کہ "نہیں" فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ تم پر حرام نہیں ہے۔ واللہ اعلم

صاحب مواہب فرماتے ہیں کہ محبت صادق میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موافقت میں لہسن و پیاز کے نہ کھانے اور اسے مکروہ جاننے میں واجب ہے اور ہر اس چیز کو مکروہ جاننے میں جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکروہ جانا۔ اس لئے کہ یہ محب صادق کے اوصاف میں سے ہے کہ جس چیز کو محبوب پسند کرے وہ محبوب ہو اور جس چیز کو محبوب مکروہ جانے وہ مکروہ انہوں نے جو کچھ فرمایا سچ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحمتیں نازل فرمائے۔

بسا اوقات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عنایت و مہربانی کی خاطر، ر ت و اباحت کو اختیار فرماتے کیونکہ خدا کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ انہیں رخصت عطا فرمائے جس طرح کہ وہ پسند فرماتا ہے کہ انہیں عزیمتیں دے۔ اس بنا پر ان کا صدور واقع ہو جاتا ہے۔ وہ چیزیں اور ہیں جن کے بارے میں حق تعالیٰ نے فرمایا عفا اللہ۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کسی دور جگہ میں تھے۔ تو انہیں بھوک لگی۔ ان حضرات نے اپنے آپ کو ایک باغ میں پانی سینچنے کی مزدوری میں ایک شخص کو دے دیا۔ اس شخص نے روٹی اور گندنا آپ کو پیش کیا۔ حضور ﷺ نے روٹی خود تناول فرمائی اور گندنا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ کذا فی تاریخ مدینہ۔

کھانے کا مسنون طریقہ۔ وصل:۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ کریمہ تھی کہ آپ تین انگلیوں سے یعنی انگوٹھا، کلمہ کی انگلی اور بیچ کی انگلی سے کھانا تناول فرماتے تھے اسے ترمذی نے شمائل میں روایت کیا ہے اس لئے کہ ایک انگلی یا دو انگلی سے کھانا متکبروں کا کھانا ہے اور اس طرح کھانے میں لذت بھی معلوم نہیں دیتی۔ اور اس سے معدہ سیر نہیں ہوتا مگر طویل زمانے کے بعد۔ اور پانچوں انگلیوں سے کھانا حرص و طمع کی علامت ہے۔ صاحب مواہب ایک حدیث مرسل لاتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچوں انگلیوں سے کھایا ہے۔ یہ حدیث ماسبق حدیث کے ساتھ اس طرح جمع ہو سکتی ہے کہ اکثر اوقات تین انگلیوں سے تناول فرماتے۔ اور بعض اوقات پانچوں سے اور کھانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم انگلیاں چاٹ لیا کرتے تھے۔ اس سے پہلے کہ رومال سے پونچھیں اور بعض روایتوں میں چاٹنے اور برتن صاف کرنے کا حکم آیا ہے۔ مروی ہے کہ برتن کو پونچھنے کی بنا پر وہ برتن اس کیلئے استغفار کرتا ہے اور چاٹنے کی علت میں یہ آیا ہے کہ یہ بات نہیں جانی جا سکتی کہ کھانے کے کون سے جزو میں برکت ہے اور سب انگلیوں سے چاٹنا شرط نہیں ہے۔ ایک ایک انگلی کو زبان پر رکھ کر یا ہونٹوں پر رکھ کر چاٹنا کافی ہے۔ بعض اوقات حضور صلی اللہ علیہ وسلم انگلیوں کو بچوں یا خادموں کو چٹایا کرتے تھے اور کھانے کے درمیان انگلیوں کو چاٹنا مکروہ ہے اور کھانے کے دوران جو چیز دسترخوان یا پیالہ سے گر جائے اسے اٹھا کر کھا لینا بھی ثواب ہے۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ اس میں محتاجی، برص اور کوڑھ سے حفاظت ہے۔

اور جو اسے کھاتا ہے اسکی اولاد حماقت سے محروم رہتی ہے اور انہیں عافیت دی جاتی ہے۔ دیلمی نے عباسی خلیفہ رشید سے اپنے آباء میں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ فرمایا جو دستر خوان پر گری ہوئی چیز اٹھا کر کھاتا ہے اس کی اولاد حسین و جمیل پیدا ہوتی ہے اور اس سے محتاجی دور کر دی جاتی ہے۔ متکبروں سے ان باتوں کی پیروی ظہور میں نہیں آتی اور وہ اسے مکروہ جانتے ہیں۔ اگر وہ حقیقت سے غور کریں تو اس میں کوئی کراہت کی وجہ نہیں ہے۔ اسی کھانے ہی کے تو اجزاء ہیں۔ جسے انہوں نے انگلیوں سے کھایا ہے تو انگلیوں اور پیالوں کو چاٹنا کیوں برا معلوم ہوتا ہے آخر اسی کھانے کا یہ حصہ ہے خصوصاً اس وقت جب کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے عمل مبارک کو بھی سن لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اس بات سے گھن کھاتا اور برا جانتا ہے جس کی نسبت سرور عالم ﷺ سے ہے تو اس پر سخت چیز لازم آتی ہے۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

صاحب مواہب ایک بزرگ سے نقل کرتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ ایک شخص کلی کرتا ہے اور اپنے منہ میں انگلیاں ڈالتا ہے اور انگلیوں سے دانتوں کو ملتا ہے اس سے کوئی بھی گھن نہیں کھاتا۔ اور حضور اکرم ﷺ ٹیک لگا کر کھانا تناول نہ فرماتے آپ فرماتے ہیں میں بندہ ہوں اور بندوں کی مانند بیٹھتا ہوں۔ اور ایسے ہی کھاتا ہوں جیسے بندے کھاتے ہیں۔ ٹیک لگانے کی تفسیر میں اختلاف کیا گیا ہے۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ جو محققین شراح حدیث میں سے ہیں شفاء میں فرماتے ہیں کہ اتکاء یعنی ٹیک لگانے سے مراد جم کر بیٹھنا اور کھاتے وقت چوکڑی مار کے سرین پر بیٹھا ہے۔ یہ اس بیٹھنے کی مانند ہے جو کسی چیز کو اپنے نیچے رکھ کر ٹیک لگا کر بیٹھے۔ اس ہیئت پر بیٹھنے والا کھانا زیادہ کھاتا ہے۔ اور اس طرح اظہار تکبر کرتا ہے۔ اور حضور ﷺ کی نشست اس قسم کی تھی کہ گویا گھٹنوں کے بل ابھی کھڑے ہو جائیں گے، بطریق اقعا۔ کہا گیا ہے کہ حدیث کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کسی جانب جھک کر ٹیک لگائی جائے۔ جیسا کہ محققین کے نزدیک ہے۔ (انتہیٰ)

"اقعاءٗ" سے مراد یہ ہے کہ سرین کو زمین کی جانب کرے۔ اور پنڈلیوں کو کھڑا کرے اور پیٹھ کے بل سیدھا رہے۔ یہی وہ نشست ہے جسے نماز میں منع فرمایا گیا ہے۔ صاحب مواہب کہتے ہیں کہ اسی معنی کو نقل کیا گیا ہے جس کی تفسیر قاضی عیاض رحمہ اللہ نے کی ہے اور اتکاء کی تفسیر میں یہی بات، اکمال میں خطابی سے جو ائمہ شراح حدیث سے اور معتمد علیہ ہیں منقول ہے۔ اور خطابی فرماتے ہیں کہ اتکاء کی ایک جانب جھکنے کی جنہوں نے تفسیر کی ہے اس کی مخالفت کی گئی ہے۔ خطابی فرماتے ہیں کہ عوام کا خیال ہے کہ متکی وہ ہوتا ہے جو ایک جانب جھک کر کھانا کھاتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ متکی وہ ہے جو چیز اس کے نیچے بچھی ہوئی ہو اس پر جم کر بیٹھے۔ (انتہیٰ) ابن جوزی کے نزدیک اتکاء کے معنی یہی ہیں کہ ایک جانب جھک کر بیٹھے۔ اور بعضوں نے کہا ہے کہ اتکاء کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز سے ٹیک لگائی جائے۔ خواہ دیوار سے یا تکیہ وغیرہ سے۔ اور بعضوں نے کہا بائیں ہاتھ سے ٹیک لگانا مراد ہے۔ اور بعض حدیثوں میں اس کی صراحت سے ممانعت بھی آئی ہے۔ ابن اثیر نے نہایہ میں کہا ہے کہ جس نے اتکاء کے معنی ایک جانب جھکنے کے لئے ہیں اس نے فن طب کے موافق تاویل کی ہے ابن قیم نے کہا کہ ٹیک لگا کر کھانا، کھانے والے کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اس لئے کہ طعام کیلئے اس کے راستے سے گزرنے میں یہ ہیئت مانع ہوتی ہے۔ اور بسرعت معدے میں کھانا نہیں پہنچتا۔ اور معدہ میں گردش کرتا ہے اور مستحکم نہیں رہتا۔ اور بسہولت غذا معدے میں نہیں جاتی۔ لیکن کسی چیز سے ٹیک لگانا یہ متکبروں اور فرعونوں کی نشست ہے۔ جو طریقہ عبودیت کے خلاف ہے۔ اسی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اٰکُلُ کَمَا یَاکُلُ الْعَبْدُ" بعض کہتے ہیں کہ ٹیک لگا کر کھانے کی ممانعت، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے مگر حق یہ ہے کہ یہ عام ہے ہاں اگر مجبوری ہو اور اس سے ادب کی رعایت ممکن نہ ہو تو یہ دوسری بات ہے۔ اَلضَّرُوْرَاتُ تُبِیْحُ الْمَحْذُوْرَاتِ۔

صاحب سفر السعادۃ لکھتے ہیں کہ اتکاء کی پانچ صورتیں ہیں۔ یہ سب ہیئتیں جن کا ذکر ہوا انہوں نے شمار کیں۔ صاحب مواہب

کہتے ہیں کہ جب ثابت ہو گیا کہ ٹیک لگانا مکروہ ہے یا خلاف اولیٰ۔ تو کھانے کے وقت اس ہیئت پر بیٹھنا مستحب ہوا، جو یہ ہے کہ دونوں رانوں کو کھڑا کرے۔ اور دونوں قدموں کی پشت پر نشست کرے۔ یا اس طرح کہ داہنے پاؤں کو کھڑا کرے اور بائیں پاؤں پر بیٹھے۔ اور ابن قیم نے بیان کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تواضع وادب کی خاطر بائیں قدم کے اندر کی جانب کو داہنے قدم کی پشت پر رکھتے تھے۔ یہ ہیئت کھانا کھانے کی دوسری نشستوں سے زیادہ مفید ونافع ہے۔ اس لئے کہ تمام اعضا اپنی اس طبعی حالت پر برقرار رہتے ہیں جس پر حق تعالیٰ نے انہیں پیدا فرمایا ہے۔ اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دست مبارک کو کھانے کی جانب بڑھاتے تو بسم اللہ کہتے۔ اور افضل یہ ہے کہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کہے۔ اور اگر محض بسم اللہ کہے تو کافی ہے اور سنت کا مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔
اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھانے کے بعد حمد الٰہی کہتے۔ حمد کے کلمات متعدد ماثور ہیں۔ اتنا پڑھنا ہی کافی ہے کہ کہے۔ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔" اور یہ دعا بھی صحت کے ساتھ پہنچی ہے کہ فرمایا۔ "اَللّٰھُمَّ اَطْعَمْتَ وَسَقَیْتَ وَاَغْنَیْتَ وَاَقْنَیْتَ وَ ہَدَیْتَ وَاَحْیَیْتَ فَلَکَ الْحَمْدُ عَلٰی مَا اَعْطَیْتَ۔" اور داہنے ہاتھ سے تناول فرماتے۔ اور اس کا حکم دیتے اور فرمایا: "یَاغُلَامُ سَمِّ اللّٰہَ وَکُلْ بِیَمِیْنِکَ وَمِمَّا یَلِیْکَ۔" اے لڑکے اللہ کا نام لے اور داہنے ہاتھ سے کھا اور جو تیرے قریب ہے اس طرف سے کھا۔
اور بعض شوافع نے اس حکم کو مستحب پر محمول کیا ہے اور صواب یہ ہے کہ اس کے ترک پر وعید وارد ہونے کی وجہ سے واجب ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اپنے بائیں ہاتھ سے کھا رہا ہے تو فرمایا داہنے ہاتھ سے کھا اس نے کہا میں کھا نہیں سکتا۔ فرمایا کبھی نہ کھا سکے گا۔ اس کے بعد وہ کبھی اپنے داہنے ہاتھ کو منہ تک لا ہی نہ سکا اور جو حضرات مستحب ہونے پر استدلال کرتے ہیں وہ اس قرینہ سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "وکل ممایلیک" (جو تیرے قریب ہے اس سے کھا) اور یہ واجب نہیں ہے تو اس کا جواب وہ حضرات جو وجوب کے قائل ہیں یہ دیتے ہیں کہ اس کا ترک، ممانعت کے معلوم ہونے کے بعد گناہ ومعصیت ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اگر کھانا ایک ہی ہو تو اپنے قریب سے کھائے اور اگر متعدد کھانے ہوں مثلاً فواکہ وغیرہ تو جائز ہے اور ایک حدیث بھی اس ضمن میں روایت کرتے ہیں مگر وہ حدیث ضعیف ہے (کذا قیل) اگر کوئی یہ کہے کہ پہلے گزر چکا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیالوں کے کناروں سے کدو کے قتلوں کو تلاش فرماتے تھے۔ تو یہ حدیث اپنے قریب سے کھانے کی حدیث سے معارض ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ممانعت اس تقدیر پر ہے کہ اگر ساتھی راضی نہ ہوں اور کون ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے راضی نہ ہو اور بعض کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تنہا تناول فرما رہے تھے۔ مگر ظاہر یہ ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ شامل تھے (واللہ اعلم) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھانے سے پہلے دست ہائے مبارک کو دھویا کرتے اور بعد طعام بھی۔ اور فرمایا "بَرَکَۃُ الطَّعَامِ فِی الْوُضُوْءِ قَبْلَہٗ وَالْوُضُوْءُ بَعْدَہٗ۔" کھانے سے پہلے بھی وضو ہے اور کھانے کے بعد بھی وضو۔
ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھانا لایا گیا۔ اس پر صحابہ نے عرض کیا۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے پانی نہ لائیں کہ وضو فرمائیں۔ فرمایا میں مامور نہیں ہوں کہ وضو کروں مگر اس وقت جب کہ نماز کیلئے کھڑا ہوں۔ اس جگہ وضو سے مراد، وضوء شرعی ہے جو نماز کیلئے ہے۔ اور جن حدیثوں میں ہاتھ دھونے کو وضو کہا گیا ہے وہ لغوی معنی میں ہے۔ جس کے معنی نظافت و پاکیزگی کے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم گرم کھانا نوش نہ فرماتے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھانے کا ایک پیالہ لایا گیا۔ جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی اس پر آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہمیں آگ کھانے کا حکم نہیں فرمایا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم گرم کھانے اور داغ دینے کو مکروہ جانتے اور فرماتے ٹھنڈا کر کے کھانا کھاؤ کیونکہ اس میں برکت ہے اور گرم کھانے میں برکت نہیں ہے اور حضرت

اسماء رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گرم کھانالایا جاتا تو آپ اسے اس وقت تک ڈھانپ کے رکھے رہتے جب تک کہ اس کا جوش نہ ختم ہو جاتا۔ اور فرمایا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ سرد کھانے میں عظیم برکت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک لکڑی کا پیالہ تھا۔ جس پر لوہے کی چادر منڈھی ہوئی تھی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پیالے میں پانی نبیذ اور شہد وغیرہ تمام مشروبات پلائے ہیں۔ اور بخاری میں عاصم احول کی حدیث ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پیالہ کو حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پاس دیکھا ہے میں نے اس میں پانی پیا ہے۔ وہ کچھ شکستہ ہو گیا تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اس پر چاندی کا خول چڑھا دیا تھا۔ اور وہ پیالہ چوڑا اور اچھی لکڑی کا تھا۔ علماء بیان کرتے ہیں کہ وہ پیالہ جھاؤ کی لکڑی کا تھا اور اس کا رنگ زردی مائل تھا اور ابن سیرین کہتے ہیں کہ اس پر لوہے کا حلقہ چڑھا ہوا تھا پھر حضرت انس رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ اس حلقے کے بجائے سونے یا چاندی کا حلقہ چڑھائیں تو حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے انہیں اس سے باز رکھا۔ اور کہا کہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے رکھا ہے اسی طرح رہنے دو۔ اور امام ابو عبداللہ بخاری روایت کرتے ہیں کہ میں نے اس پیالے کو بصرہ میں دیکھا ہے۔ اور میں نے اس میں پانی پیا ہے اسے نضر بن انس کی اولاد سے آٹھ ہزار درہم میں خریدا گیا (کذا فی المواہب) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی خوان پر کھانا نہ کھایا اور نہ چپاتیاں کھائیں لیکن سفرہ پر نوش کیا اور وہ سفرہ چمڑے یا پتے کا ہوتا تھا اور آج بھی حرمین شریفین میں خرمے کے پتے کے سفرے رائج ہیں۔ مواہب میں کتاب ہدیٰ سے نقل کیا گیا ہے کہ بعض طبیبوں نے کہا ہے کہ جو چاہتا ہے کہ صحت محفوظ رہے تو رات کے کھانے کے بعد سو قدم کی تعداد میں ٹہلا کرے۔ اور کھانے کے فوراً بعد نہ سو جائے۔ کیونکہ یہ مضر ہے۔ اور کھانے کے بعد نماز پڑھنا ہضم میں آسانی پیدا کرتا ہے۔

پانی پینا۔ وصل:۔ اب رہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پینے کی کیفیت، تو بلاشبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آب شیریں و سرد کو پسند فرماتے تھے۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین آپ کے لئے بیر سُقیا سے پانی لاتے تھے۔ بیر سُقیا مدینہ سے دو منزل کے فاصلے پر ہے۔ اور چھتیس میل کی مسافت ہے۔ اور ٹھنڈا و شیریں پانی طلب کرنا زہد کے منافی نہیں ہے اور نہ ترفہ مذموم میں داخل ہے۔ اور ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ حالانکہ سید الزاہدین صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا ہے۔ لیکن پانی کو مشک و گلاب سے خوشبودار بنانا ترفہ اور تنعم میں داخل ہے۔ اور یہ مذموم ہے اور امام مالک رحمہ اللہ سے اس کی کراہت منقول ہے کہ انہوں نے اپنے شاگرد سے فرمایا اے فرزند من! پانی کو ٹھنڈا کر کے پیو۔ کیونکہ ٹھنڈے پانی سے دل کی گہرائیوں سے شکر ادا ہوتا ہے۔ شاگرد نے عرض کیا اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جس نے پانی کو دیوار پر ٹھنڈا ہونے کیلئے رکھا اور پھر اس پر دھوپ آگئی۔ اور اسے نہ اٹھایا اور گرم ہو گیا اور اسی گرم پانی کو پی لیا اور کہا کہ اے بھائی میں اپنے نفس کی لذت کیلئے نہیں چاہتا۔ فرمایا وہ شخص صاحب حال ہے اس کی پیروی نہیں چاہئے۔ کہتے ہیں کہ اس شخص سے مراد، حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شہد میں پانی ملا کر نوش فرمایا اور علی الصباح نوش جان فرماتے۔ اور جب اس پر کچھ گھڑی گزر جاتی اور بھوک معلوم ہوتی تو جو کچھ کھانے کی قسم سے موجود ہوتا تناول فرماتے صاحب مواہب ابن قیم سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا اس میں حفظ صحت ہے اس پر فاضل طبیبوں کے سوا کسی کو دسترس نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ شہد کا شربت یا شہد کو ناشتے میں چاٹنا بلغم کو چھانٹتا اور معدے کے حمولات کو دھوتا اور اس کی لزوجت سے پاک و صاف کرتا اور اس کے فضلات کو دور کرتا اور اعتدال کے ساتھ معدے کو گرم کرتا ہے۔ اور جوڑوں کو کھولتا ہے اور ٹھنڈا پانی، سرد تر ہے جو گرمی کو کاٹتا اور صحت کی حفاظت کرتا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں آیا ہے کہ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم سرد و شیریں پانی کو پسند

فرماتے تھے۔ اس سے مراد یہی شہد ملا شربت ہے یا کھجور و منقیٰ کا نقیع یعنی تر کردہ شربت یا نبیذ ہے اس میں عظیم نفع ہے اور قوتوں کو زیادہ کرتا ہے۔

نقیع و نبیذ بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ کھجور یا منقیٰ کو کوٹ کر پانی میں ڈال کر رکھ دیتے ہیں تاکہ پانی شیریں ہو جائے۔ اگر اسے دو روز رکھے رہیں تاکہ شیرینی سے لب چپکنے لگیں تو اسے نبیذ کہتے ہیں اور اگر فوراً بنا کر پی لیں تو اسے نقیع کہتے ہیں۔ اس سے تیز کرنا مکروہ ہے۔ اور اگر کف یا جھاگ اٹھ آئے تو حرام و خمر ہے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم دودھ کو پسند فرماتے تھے آپ نے فرمایا کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو کھانے اور پینے دونوں کا کام دے بجز دودھ کے۔ کھانے کے بعد دعا کرتے۔ "زِدْنَا خَيْرًا مِّنْهُ" (اس سے ہماری بھلائی زیادہ کر) اور دودھ پینے کے بعد فرماتے "زِدْنَا مِنْهُ" (اس سے ہمیں زیادہ کر) نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین چیزیں ایسی ہیں اگر کوئی دے تو منع نہ کرنا چاہئے۔ دودھ، تکیہ اور خوشبودار تیل۔ ایک اور حدیث میں تیل کی جگہ طیب یعنی خوشبو آیا ہے یہ اس سے زیادہ معروف ہے۔ اور آپ کبھی خالص دودھ نوش فرماتے اور کبھی سرد پانی ملا لیتے۔ یعنی "لسی" اس لئے کہ دوہتے وقت دودھ گرم ہوتا ہے اور ان ممالک میں گرمی غالب ہے تو دودھ کی گرمی کو پانی کی سردی سے مارتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ٹھنڈا دودھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج لطیف کے مناسب و موافق تر آتا ہو۔

بخاری میں حضرت جابر سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک انصاری کے باغ میں تشریف لے گئے۔ آپ کے ساتھ ایک صحابی تھے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ وہ انصاری اپنے باغ میں پانی دے رہا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انصاری سے فرمایا اگر تمہارے پاس پرانے مشکیزہ میں رات کا بھرا ہوا ٹھنڈا پانی ہو تو لاؤ ورنہ اس کیاری سے پانی پیتا ہوں۔ اس انصاری نے عرض کیا ہاں میرے پاس باسی پانی ہے جو پرانے مشکیزہ میں ہے پھر اس نے پیالے میں پانی لیا اور اپنے جھونپڑے میں جا کر بکری کا دودھ دوہ کر اس میں ملایا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پانی کو نوش فرمایا۔ جاننا چاہئے کہ اس حدیث میں لفظ کرع آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں پانی میں منہ ڈال کر پینا۔ جیسے کہ چوپائے پیتے ہیں۔ لیکن شراح حدیث فرماتے ہیں کہ اس جگہ مراد یہ ہے کہ ہاتھوں سے پانی پینا نہ کہ منہ ڈال کر۔ گویا کرع کی حقیقت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام رفیع، درجہ بلند کے مناسبت پر محمول کرنا بعید جانا۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے تکلفی سے یہ بعید نہ تھا۔ ممکن ہے کہ اس طرح پانی پینے میں کوئی ذوق پاتے ہوں (واللہ اعلم)

یہ فقیر یعنی شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ ایک مرتبہ ایک بزرگ زمانہ، صالح کی صحبت میں تھا۔ جو علم حدیث کے جاننے والے تھے۔ (رحمتہ اللہ علیہ) باغ میں اسی طرح پانی کیاریوں میں بہہ رہا تھا۔ اس عزیز نے کرع کیا۔ یعنی منہ سے پانی پیا۔ اس وقت تو حقیقت حال منکشف نہ ہوئی۔ لیکن جب مجھے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث معلوم ہوئی تو جانا کہ اس عزیز کا وہ فعل اس حدیث کے اتباع میں تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھانے کے بعد پانی نوش نہ فرماتے کیونکہ مفسد ہضم ہے۔ جب تک کہ کھانا ہاضمہ کے قریب نہ ہو پانی نہ پینا چاہئے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ تھی کہ پانی بیٹھ کر نوش فرماتے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔ اور مسلم میں ہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہیں چاہئے کہ کوئی کھڑے ہو کر پانی نہ پئے۔ اگر بھول کر پی لیا ہے تو قے کر دے اور پانی کو پیٹ سے خارج کر دے۔ بخاری و مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ

میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آبِ زمزم کا ڈول لایا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کھڑے ہو کر نوش فرمایا۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے وضو فرمایا پھر کھڑے ہو کر بقیہ آبِ وضو کو نوش فرمایا۔ اور فرمایا لوگ کھڑے ہو کر پانی پینے کو مکروہ جانتے ہیں حالانکہ میں نے اللہ کے نبی کو ایسا کرتے دیکھا ہے جیسا کہ میں نے کیا۔ اور یہ سب حدیثیں صحیح ہیں ان میں جمع و تطبیق اس طرح ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینا مکروہ تنزیہی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مبارک بیان جواز کیلئے تھا۔ اور شارع علیہ السلام کو جائز ہے کہ بیان جواز کیلئے فعل مکروہ کو اختیار کریں۔ کیونکہ یہ آپ پر واجب ہے۔ اور اس کی نسبت آپ کی جانب مکروہ نہیں ہے اور قے کرنے کا حکم ندب و استحباب پر محمول ہے۔ لہٰذا جو کھڑے ہو کر پئے اسے مستحب ہے کہ اس صحیح و صریح حدیث کے بموجب قے کر دے۔ خواہ بھول کر پئے یا قصداً اور حدیث میں نسیان یعنی بھولنے کی تخصیص، اس طرف اشارہ ہے کہ مومن سے جس چیز کا ترک کرنا افضل و اولیٰ ہے اس سے قصداً کیسے واقع ہو گا۔ (کذا قالوا) اور مالکیوں کا مذہب یہ ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ وہ حضرت جبیر بن معطم رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ حضرت جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کھڑے ہو کر پانی پیتے دیکھا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے حضرت عمر حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ یہ تمام حضرات کھڑے ہو کر پانی پیتے تھے۔ اور شیخ عبدالحق جو ائمہ حدیث میں سے ہیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کا جواب دیتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ کھڑے ہو کر پانی پینا آبِ وضو اور آبِ زمزم کے ساتھ خاص ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ممکن ہے یہ ممانعت خاص اس شخص کیلئے ہو جو اپنے ساتھیوں کیلئے پانی لایا اور ان کے پلانے سے پہلے خود پینے میں جلدی کی اور اس نے اس قاعدہ و اصول کی خلاف ورزی کی کہ: "سَاقِی الْقَوْمِ اٰخِرُهُمْ شُرْبًا۔" قوم کو پانی پلانے والا اپنے پینے میں ان سب کے بعد ہے اس وجہ پر حمل کرنا محض احتمال ہے۔ اور حدیث کی عبارت اس طرف دلالت نہیں کرتی۔

اور آبِ وضو کو کھڑے ہو کر پینے میں یہ بات ہے کہ یہ حدیثیں اصل جواز پر دلالت کرتی ہیں اور وہ حدیثیں جس میں ممانعت ہے استحباب میں ہیں۔ بشرط اس قاعدے کہ بیٹھ کر پینا افضل و اولیٰ ہے۔ اور شراح حدیث کے بعض کلام سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ کھڑے ہو کر پینے کی ممانعت قواعد طبیہ پر مبنی ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی رعایت فرماتے ہوئے ایسا ارشاد فرمایا۔ مقتضائے کلام یہ ہے کہ اس کو اپنی عادت نہ بنائے اگر کبھی پی لے تو ممنوع نہ ہو گا۔ (واللہ اعلم)

امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے دیکھا ایک شخص کھڑے ہو کر پانی پی رہا ہے تو انہوں نے کہا اس پانی کو قے کر دے۔ اس شخص نے کہا کس لئے میں قے کروں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا "کیا تمہیں اچھا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے ساتھ بلی پانی پئے۔" اس شخص نے کہا میں اچھا نہیں جانتا۔ فرمایا بلاشبہ تیرے ساتھ جس نے پانی پیا ہے وہ بلی سے بدتر ہے کہ وہ شیطان ہے۔"

اور حضور ﷺ کی عادت شریفہ تھی آپ تین سانسوں میں پانی نوش فرماتے اور فرماتے کہ یہ سیراب کرنے والا، پسندیدہ تر اور شفا بخشنے والا ہے۔ ہر سانس میں منہ سے پیالہ جدا کرتے پھر سانس لیتے۔ اور پیالے میں پھونکنے سے منع فرماتے۔ اور جب دہن شریف سے پیالے کو قریب لاتے تو بسم اللہ پڑھتے۔ اور جب جدا فرماتے تو حمد بجالاتے۔ اس طرح تین مرتبہ کرتے۔ اور روایت میں ہے کہ پہلے سانس کے بعد فرماتے الحمد للہ دوسرے سانس کے بعد الحمد للہ رب العالمین اور تیسرے سانس کے الحمد للہ رب العالمین الرحمٰن الرحیم۔ یہ دعا بھی پینے کے بعد ماثور ہے۔ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَهٗ عَذْبًا فُرَاتًا بِرَحْمَتِهٖ وَلَمْ یَجْعَلْهُ مِلْحًا اُجَاجًا بِذُنُوْبِنَا" نیز مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے پانی کو چوس چوس کر پیو۔

اور غٹ غٹ کر کے نہ پیو اور اس سے معلوم ہوا کہ لوٹے کی ٹوٹی خوب منہ کے اندر نہ لینی چاہئے۔ جیسا کہ لوگ کرتے ہیں یہ ممنوع ہے اس لئے کہ مص یعنی چسکی ہونٹوں اور لبوں سے ہوتی ہے لیکن ٹوٹی کو منہ سے علیحدہ رکھنا یا منہ سے دور رکھنا بھی چسکی کے معنی کے موافق نہیں ہے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مہمانوں سے کھانے کیلئے اصرار فرماتے اور بار بار کہتے ایک مرتبہ ایک شخص کو دودھ پلانے کے بعد اس سے بار بار فرمایا "اِشْرَبْ اِشْرَبْ" اور پیو اور پیو۔ یہاں تک کہ اس شخص نے قسم کھا کر عرض کیا۔ قسم ہے اس خدائے برتر کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا اب اور گنجائش نہیں ہے۔ اسے بخاری نے روایت کیا۔ اور جب آپ جماعت کو کھانا کھلاتے پلاتے تو آپ ان سب کے بعد تناول فرماتے۔ مطلب یہ کہ ابتدا میں تناول نہ فرماتے آخر میں ان کے ساتھ موافقت فرماتے۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ جب دسترخوان بچھایا جائے تو چاہئے کہ جب تک سب فارغ نہ ہوں نہ تو اٹھے اور کھانے سے ہاتھ نہ کھینچے اگرچہ سیر ہو چکا ہو۔ کیونکہ یہ ساتھی کی شرمندگی کا موجب ہے اور ممکن ہے کہ ابھی اسے کھانے کی احتیاج باقی ہو اور اگر کوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کرتا اور میزبانی کا شرف پاتا اور کوئی اور شخص آپ کے پیچھے پیچھے آجاتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم میزبان کو خبر کر دیتے کہ یہ شخص میرے ساتھ چلا آیا ہے اگر تم چاہو تو لوٹ جائے۔ (الحدیث)

اکابر و پیشواؤں کے ساتھ خدام و توابع اور طفیلی ہوتے ہیں اور یہ جائز ہے اور اس حدیث کا اقتضاء یہ ہے کہ صاحب خانہ کو بتا کر اس سے اجازت لے لے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی جماعت کے ساتھ کھانا تناول فرماتے تو جب تک ان کیلئے دعائے خیر نہ فرماتے باہر تشریف نہ لاتے اور فرماتے: اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَهُمْ فِيْمَا رَزَقْتَهُمْ وَاغْفِرْ لَهُمْ وَارْحَمْهُمْ۔

نوع دوم۔ در لباس مبارک

وصل: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ کریمہ، لباس شریف میں وسعت اور ترک تکلف تھا۔ مطلب یہ کہ جو پاتے زیب تن فرما لیتے اور تعیین کی تنگی اختیار نہ فرماتے۔ اور کسی خاص قسم کی جستجو نہ فرماتے۔ اور کسی حال میں عمدہ و نفیس کی خواہش نہ فرماتے۔ اور نہ ادنیٰ و حقیر کا تکلف فرماتے۔ جو کچھ موجود و میسر ہوتا پہن لیتے۔ اور جو لباس ضرورت کو پورا کر دے اسی پر اکتفا فرماتے۔ اکثر حالتوں میں چادر پیرہن اور ازار ہوتا جو کہ سخت اور موٹے کپڑے کے ہوتے اور پشمینہ بھی پہنتے۔ منقول ہے کہ آپ کی چادر شریف میں متعدد پیوند لگے ہوئے تھے۔ جسے آپ اوڑھا کرتے تھے۔ اور فرماتے میں بندہ ہی ہوں اور بندوں ہی جیسا لباس پہنتا ہوں اسے شیخین نے روایت کیا ہے۔ اگر کبھی شاہان عجم عمدہ اور نفیس بیش بہا ہدیے میں بھیجتے تو ان کی تالیف قلوب کی خاطر زیب تن فرماتے مگر جلد ہی بدن شریف سے اتار دیتے۔ اور لوگوں کو عطا فرما دیتے۔ اور لوگوں میں انصاف اور علو ہمتی کے پیش نظر تقسیم میں برابری فرماتے۔ اور عمدہ و نفیس پہننا اور اس کے ساتھ مزین ہونا اور اس پر فخر و مباہات کرنا صاحبانِ شرف و جلالت کے شایانِ شان نہیں ہے۔ بلکہ عورتوں کی صفات اور ان کی نشانیاں ہیں۔ لیکن صاف ستھرا اور پاکیزہ لباس رکھنا اور اس میں میانہ روی اختیار کرنا ہم جنسوں کے مشابہ ہونا محمود ہے یہ خلافِ مروت نہیں ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مومن کی تمام خوبیوں میں لباس کا ستھرا رکھنا اور کم پر راضی ہونا بہت پسند ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم میلے اور گندے کپڑوں کو مکروہ و ناپسند جانتے تھے۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا جو بہت میلے اور گندے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ فرمایا کیا یہ شخص کوئی ایسی چیز نہیں رکھتا جس سے یہ کپڑوں کو دھو لے اور آپ نے ایک شخص کو دیکھا جس

کے بال الجھے ہوئے اور میل بھرا ہوا ہے اور بری حالت میں ہے۔ فرمایا کیا تم میں کوئی ایسا آیا ہے؟ مطلب یہ کہ شیطان ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تزئین میں تکلف اور مبالغہ کو بھی محمود نہ جانتے تھے۔

سفر السعادۃ میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ کریمہ، لباس میں ترک تکلف تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد لوگ دو قسموں میں بٹ گئے بعض نے تزئین و آرائش اور نفیس لباس پہننے کو اختیار کیا اور وہ اس کے دلدادہ ہو کر رہ گئے اور بعض نے سخت و درشت لباس پہننے اور خستہ حالت میں رہنے کو اختیار کیا۔ اور وہ اسی میں مست ہو کے رہ گئے۔ یہ دونوں روشیں، طریقہ نبوی کے خلاف ہیں میانہ روی، عدمِ فریفتگی اور عدم تکلف ہر حالت میں محمود ہے اس میں شک نہیں کہ اسلاف کی سیرت اور ان کے علماء وزہاد اور عبادت گذاروں کی عادت سادہ لباس تھی۔ اور حدیثوں میں بھی اس کی مدح و تعریف اور ترغیب آئی ہے۔ اور مروی ہے کہ: اَلْبَذَاذَةُ مِنَ الْاِیْمَانِ خستہ حالی ایمان میں سے ہے اور آراستگی، تحسین ہیئت اور صاف ستھرے کپڑوں کے باب میں بھی حدیثیں آئی ہیں۔ اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تکبر و غرور کی مذمت فرماتے تو صحابہ عرض کرتے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آدمی پسند کرتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں اور اس کی جوتیاں عمدہ ہو۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے: اِنَّ اللّٰهَ جَمِیْلٌ یُّحِبُّ الْجَمَالَ اَلْکِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ بلاشبہ اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند فرماتا ہے۔ اور تکبر حق تعالیٰ سے سرکشی کرنا ہے۔ مطلب یہ کہ لباس و ہیئت میں تجمل و تحسین مستلزم تکبر نہیں ہے کبر تو حق تعالیٰ کے ساتھ سرکشی کرنا ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ نَظِیْفٌ یُّحِبُّ النَّظَافَةَ " بلاشبہ اللہ پاک وصاف ہے اور وہ پاکی وصفائی کو پسند فرماتا ہے۔ ایک صحابی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس حال میں دیکھا کہ میرے جسم پر کم قیمت کپڑے تھے۔ فرمایا کیا تیرے پاس از قسم مال ہے؟ میں نے عرض کیا ہاں! اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر قسم کے مال و دولت سے نوازا ہے۔ اونٹ بھی ہیں اور بکریاں بھی ہیں۔ فرمایا پھر تو خدا کی نعمت اور اس کی بخشش کو تمہارے جسم سے ظاہر ہونا چاہئے۔ مطلب یہ کہ تونگری کی حالت کے مناسب کپڑے پہنو۔ اور خدا کی نعمت کا شکر ادا کرو۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے تو چاہئے کہ خدا کی نعمت کا شکر ادا کرو۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال دیا ہے تو چاہئے کہ خدا کی نعمت کا اثر تمہارے جسموں سے دیکھا جائے اور اس کی عنایتیں تم سے ظاہر ہوں۔ اور الجھے ہوئے بالوں والے پریشان حال سے فرمایا کیا یہ شخص کوئی ایسی چیز نہیں پاتا ہے جس سے اپنے سر کو تسکین دے۔ اور اس شخص کو دیکھا جس پر میلے اور غلیظ کپڑے تھے۔ فرمایا کیا یہ شخص کوئی ایسی چیز نہیں پاتا ہے جس سے اپنے کپڑوں کو دھولے۔ مروی ہے کہ اللہ پسند فرماتا ہے کہ بندے پر اپنی نعمتوں کا اثر دیکھے۔ لہٰذا یہ ظاہری جمال و آرائش اس شکر نعمت کا موجب ہے جو جمال باطن ہے اور "لِبَاسُ التَّقْوٰی" کا اشارہ اسی جانب ہے۔ حق سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا: "یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِکَ خَیْرٌ" "اے بنی آدم ہم نے تم پر ایسا لباس اتارا جو تمہاری شرمگاہوں کو چھپاتا اور زینت بخشتا ہے اور تقوے کا لباس یہ بہت بہتر ہے۔ لہٰذا آدمی کو چاہئے کہ اپنے ظاہر و باطن کو صاف ستھرا اور پاک رکھے اور دل و زبان کو صدق و اخلاص کے زیور سے آراستہ بنائے اور اعضاء و جوارح کو زیور طاعت و نظافت سے مزین کرے۔ اسی مقام پر نجاستوں اور ناپاکیوں سے بدن کی طہارت کا حکم اور مکروہ بالوں کو مونڈنا یعنی بغلوں کے بال اور موئے زیر ناف کو صاف کرنا، ختنے کرانا۔ ناخنوں کو ترشوانا وارد ہوا ہے۔ یہ سب باتیں مسنون ہیں اور فطرت اس کی خواستگار ہے۔ فطرت کے معنی گزشتہ نبیوں کی سنتیں ہیں۔ اس کا مدار نیت پر ہے۔ اگر عمدہ لباس پہننے سے مقصود، نفسانیت، کبر، غرور، دنیاوی کروفر کا اظہار، آرائش، شوکت نفس، فقراء پر فوقیت دکھانا، ان کے دلوں کو مجروح کرنا ہے تو مذموم اور بہت قبیح ہے۔ جیسا کہ منافقوں کی مذمت میں آیا ہے وَاِذَا رَاَیْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ اور جب تم انہیں دیکھو تو ان کے اجسام تمہیں حیرت میں ڈال دیں اور حدیث پاک میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے:

"اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَاَمْوَالِکُمْ وَاِنَّمَا یَنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ۔" بیشک اللہ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تو تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔ جیسا کہ مواہب میں مسلم کی حدیث سے مروی ہے اور بعض روایتوں میں آیا ہے کہ "اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ وَیَنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَنِیَّاتِکُمْ۔" بیشک اللہ تمہاری صورتوں اور تمہارے عملوں کو نہیں دیکھتا۔ وہ تو تمہارے دلوں اور تمہاری نیتوں کو دیکھتا ہے۔ اگر اس تجمل و تحسین سے تمہاری نیت، اظہار نعمت، شوکت علم، عزت دین، جمال وحال اور دینی احکام کی پیروی ہے تو ممدوح و محمود ہے۔ بکثرت علماء زہاد اور عابدوں نے نفیس ترین اور عمدہ ترین لباس پہنا ہے۔ اور ان کی نیت اس میں نیک تھی۔ چنانچہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وفود کیلئے تجمل فرماتے اور جمعہ وعیدین کیلئے بھی آرائش فرماتے تھے اور مستقل جدا لباس محفوظ رکھتے تھے علماء فرماتے ہیں کہ اس قسم کا لباس پہننا ایسا ہے جیسے قتال کیلئے ہتھیار لگانا۔ اور بیش بہا اور فاخر لباس پہننا اور ان چیزوں میں بڑائی اور کروفر دکھانا جو کلمۃ اللہ کی برتری اور دین کی فتح مندی کو شامل ہے، حقیقۃً یہ اعداء دین پر غلظت اور ان کو جلانے اور کڑھانے کیلئے ہے

بعض حضرات ایسا نفیس لباس اس لئے پہنتے ہیں کہ دولت مندی اور ثروت ظاہر ہو تاکہ ان کی جانب حاجت مند اور سائل متوجہ ہوں۔ اور اپنی ضرورتیں حاصل کر سکیں اسی کی مانند ادنیٰ و حقیر لباس پہننے میں بھی تفصیل کی جاتی ہے کہ اگر خست، بخل یا لوگوں کے اموال میں لالچ اور احتیاج دکھانے کی بنا پر پہنے تو مذموم و مقبوح ہے۔ اور اگر زہد اور دنیاوی زیب و زینت اور اس کے ساز و سامان سے عدم رغبت اور جو میسر ہو اس پر قناعت و ایثار کرنے کی وجہ سے پہنے تو محمود و حسن ہے۔ اور جس کی نیت ان دونوں سے خالی ہو وہ نہ مذموم ہوگی اور نہ محمود (کذافی المواہب)

ظاہر یہ ہے کہ یہ قسم دائرہ اباحت سے خارج ہوگی۔ بلکہ زیب و زینت کی تمام صورتوں میں فضیلت و استحباب میں تو کلام ہے لیکن اصل اباحت میں کلام نہیں ہے۔

مواہب لدنیہ میں ایک کلام بطریق سوال لاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ سلف صالحین کی سیرت بدہیئت اور لباس کی کہنگی میں رہی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ صوفیائے شاذلیہ اپنے لباس میں حسن و جمال اور زیب و زینت کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ حالانکہ ان کا طریقہ سنت کا اتباع اور سلف صالحین کی اقتداء ہے۔ اس کے جواب میں اسے نقل کرتے ہیں جو بعض عرفاء نے جامع، مفید اور فیصلہ کن بحث فرمائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ سلف صالحین نے جب دیکھا کہ اہلِ غفلت اور دنیا میں مشغول ہونے والے ظاہری زیب و زینت میں مصروف رہتے ہیں اور دنیاوی مال و متاع پر فخر و مباہات کرتے ہیں اور اس پر اطمینان رکھتے ہیں تو ان حضرات صوفیاء نے ان کی مخالفت کی روش اس قصد و ارادہ سے فرمائی کہ ظاہر کر دیں کہ جس چیز کو یہ غافل لوگ اتنا عزیز جانتے ہیں وہ کتنی حقیر و ذلیل ہے۔ اور حق تعالیٰ نے اس کی حقارت بیان فرمائی ہے۔ اور جس چیز کے اہل غفلت اتنے محتاج و ضرورت مند ہیں وہ ان سے بے نیاز مستغنی ہیں اور ان کی مرغوب و محبوب چیزوں سے نفرت و زہد اختیار کیا اور جو کچھ خدا نے ان حضرات قدس کو مرحمت فرمایا ان نعمتوں پر شکر گذار ہوئے اور جب اس حال پر زمانہ دراز گذر گیا اور اس عرصہ میں فساد نے راہ پائی اور اس کی حقیقت کے جاننے میں دل سیاہ ہو گئے اور غفلت کی راہ نے دوسرا رخ اختیار کیا اور کچھ لوگوں نے بدہیئتی اور لباس کی بوسیدگی کے پردے میں تحصیل دنیا میں حیلہ جوئی شروع کر دی اور معاملہ برعکس ہو گیا اور جو طریقہ ترک دنیا کا تھا وہ خود تحصیل دنیا کا ذریعہ بن گیا تو بعض محققین اہل طریقت نے جیسے مشائخ شاذلیہ اور ان کے ان پیروں نے جو ان کے مذہب پر چلتے ہیں اسے ترک کر دیا اور بدہیئتی اور لباس کی کہنگی کی روش کو چھوڑ دیا۔ اور اس امر کو حکمت و حقیقت کی نظر سے سلف صالحین کی موافقت سمجھنے لگے اور ان کی مخالفت نہیں سمجھی۔ اگرچہ ظاہر بینوں کو یہ مخالف نظر آیا۔

استاد ابوالحسن شاذلی جو سلسلہ شاذلیہ کے رئیس و مقتدا ہیں ارشاد فرماتے ہیں کہ جو کوئی ان بدہیئتوں میں سے اس پر اعتراض کرتا

ہے اسے یہ جمال ہیئت اور تجمل لباس جواب دیتا ہے کہ اے شخص! میری یہ ہیئت اور میرا یہ لباس زبان حال سے الحمد للہ کہتا ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ مجھے مخلوق سے مستغنی بنایا ہے اور تیری وہ ہیئت اور تیرا وہ لباس پکار پکار کر کہتا ہے کہ مجھے اپنی دنیا سے کچھ دو۔ ان شاذلیوں کے افعال، دائر بر حکمت، مبنی بر معنی اور مقرون بہ نیت ہیں۔ اب ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس مبارک کے بیان اور اس کے انواع میں چند وصل بیان کرتے ہیں۔

عمامہ نبوی: وصل: جاننا چاہئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمامہ شریف نہ اتنا وزنی و بڑا ہوتا جس سے سر مبارک پر بار معلوم ہوتا اور نہ اتنا چھوٹا اور ہلکا ہوتا کہ سر مبارک پر تنگ ہو۔ مروی ہے کہ عمامہ شریف چودہ گز شرعی سے متجاوز نہ ہوتا۔ اور کبھی سات گز شرعی ہوتا۔ شرعی گز ایک ہاتھ کا ہے۔ جو بیچ کی انگلی سے کہنی تک ہے اس کی مقدار دو بالشت ہے یعنی چوبیس انگل۔ بمقدار "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" کے حروف کی گنتی کے۔ یہ چوبیس حروف ہیں۔

اور بعض مقامات میں جیسے حوض کو ناپنے میں، ذراع کرماسی یعنی کپڑے ناپنے کے گز کا بھی اعتبار کیا گیا ہے۔ یہ گز ہر قوم اور ہر زمانہ میں رائج ہے۔ (جو تین فٹ یا ۳۶۔ انچ کا ہوتا ہے۔) لیکن اس کا اعتبار، عمامہ میں بھی جائز ہو سکتا ہے۔ (واللہ اعلم)

علماء فرماتے ہیں کہ قدر معہود پر کچھ زیادہ کرلے تو اس میں مسامحت کی جاتی ہے اور وہ جو ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ عمامہ، مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان حاجز ہے یعنی امتیاز ہے تو وہ عمامہ غدبہ یعنی شملہ کے ساتھ ہے جیسا کہ سیاق حدیث اس میں شاہد ہے (غدبہ یا شملہ اسے کہا جاتا ہے جو عمامہ کے سرے کو دونوں شانوں کے درمیان چھوڑا جاتا ہے) اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عمامہ تھا جس کا نام "سحاب" رکھا ہوا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جتنے کپڑے، گھوڑے اور سواری کے جانور تھے ہر ایک کے اپنے تجویز کردہ نام ہوتے تھے جیسا کہ آخر کتاب میں آئے گا اور عمامہ کے نیچے سر مبارک سے چمٹی ہوئی ٹوپی ہوتی تھی۔ یہ ٹوپی سر سے پست و پیوست تھی بلند نہ تھی۔ طاقیہ (جسے آج کل کلا کہتے ہیں) کی مانند اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ٹوپی سفید تھی۔ مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہمارے اور مشرکوں کے درمیان فرق، ٹوپیوں پر عمامہ باندھنا ہے۔ یہ عبارت دو معنی کا احتمال رکھتی ہے ایک یہ کہ ہمارے عمامے ٹوپیوں پر باندھے جاتے ہیں اور ان کے عمامے ٹوپیوں پر نہیں ہوتے دوسرے معنی یہ کہ وہ بغیر عماموں کے ٹوپیاں پہنتے ہیں اور مراد پہلے ہی معنی ہیں اس لئے کہ عمامہ پہننا مشرکوں سے بھی ثابت ہے۔ (واللہ اعلم)

اور جب عمامہ باندھتے تو سدل فرماتے۔ یعنی سرا چھوڑتے۔ اسے ترمذی نے شمائل میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا۔ مسلم نے اتنا زیادہ کیا کہ: "قَدْ اَرْخٰی طَرَفَهَا بَیْنَ کَتِفَیْهِ" بے شک عمامہ کے سروں کو دونوں شانوں کے درمیان لٹکاتے۔ اسے عذابہ، ذوابہ اور شملہ بھی کہتے ہیں اور اسے سنت عمامہ کہتے ہیں۔ نیز حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم عمامہ باندھنے میں تدویر یعنی گولائی فرماتے۔ اور دستار کے پیچ کو سر مبارک پر لپیٹتے اور اس کے سرے کو عمامہ سے اڑستے اور دوسرے کو چھوڑتے اور لٹکاتے تھے۔ صحیح مسلم میں عمرو بن حریث کی حدیث مروی ہے کہ کہا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر شریف پر اس حال میں دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک پر سیاہ عمامہ تھا اور اس کے ایک سرے کو دونوں شانوں کے درمیان چھوڑا ہوا تھا اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ رونق افروز ہوئے تو سر مبارک پر سیاہ عمامہ تھا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ذوابہ یعنی شملہ کا ذکر نہیں ہے یہ دلالت کرتی ہے کہ ذوابہ ہر جگہ دائمی نہ تھا۔ (کذا فی المواہب) بلکہ حدیث بخاری میں ہے کہ روز فتح مکہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوئے تو سر مبارک پر خود تھا۔ علماء فرماتے ہیں کہ دخولِ مکہ کے وقت جسم اطہر پر ہتھیار لگائے ہوئے تھے اور سر مبارک پر خود تھا اور دستار نہ تھی اور

ہر جگہ اس کی مناسبت سے لباس زیب تن فرماتے تھے۔ بعض علماء نے دونوں قولوں کے درمیان اس طرح تطبیق دی ہے کہ عمامہ خود کے اوپر تھا۔ اور قاضی عیاض رحمہ اللہ نے جمع میں فرمایا کہ اول دخول مکہ کے وقت سر مبارک پر خود تھا اور داخل ہونے کے بعد سیاہ عمامہ خود کے اوپر باندھا بدلیل قول عمرو بن حریث کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور آپ کے سر مبارک پر سیاہ عمامہ تھا اس لئے کہ خطبہ کعبہ کے دروازے پر تھا جس وقت کہ فتح مکمل ہو گئی ابن اعرابی کہتے ہیں کہ جمع میں بہ نسبت اول کے یہ اولیٰ واظہر ہے۔ مکمل تذکرہ فتح مکہ کے ضمن میں آئے گا۔ (انشاء اللہ)

حضرت عبداللہ بن عوف رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہیں کہ میرے سر پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمامہ باندھا تو میری پشت پر دونوں شانوں کے درمیان سرا لٹکایا۔ مروی ہے کہ بدر و حنین کے دن فرشتے مسلمانوں کی مدد کیلئے آئے۔ تو اسی طرح پر عمامہ باندھے ہوئے تھے۔

علماء فرماتے ہیں کہ کم سے کم شملہ چار انگل ہے اور زیادہ سے زیادہ نصف کمر تک۔ اس سے زیادہ اسبال میں داخل ہے جو حرام و مکروہ ہے اور عذبہ یعنی شملہ کی جگہ تحنیک بھی مروی ہے۔ تحنیک یہ ہے کہ شملہ کو بائیں جانب سے تالو اور ٹھوڑی کے نیچے سے نکال کر داہنی جانب عمامہ اڑس لینا علماء فرماتے ہیں کہ بغیر تحنیک اور عذبہ کے عمامہ باندھنا مکروہ ہے یہ اس تقدیر پر ہے کہ یہ سنت موکدہ ہے۔ اگر مراد کراہت تنزیہی لیں تو اس کا مآل ترک اولیٰ اور ترک افضل ہو گا۔ (واللہ اعلم)

پیرہن مبارک اور تہبند شریف۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرہن مبارک کی آستین پہنچے تک ہوتی تھی اس سے زائد لمبی، سرعت حرکت اور گرفت میں مانع ہوتی تھی۔ اور اس سے کم ہاتھ کو گرمی و سردی سے نہیں بچاتی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام افعال و اوضاع میں معانی و حکمتیں ہوتی ہیں جو اعتدال و مناسبت پر مبنی ہیں۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرہن اور چادر مبارک کا دامن نصف پنڈلیوں تک ہوتا تھا اور تہبند کو گٹوں سے نیچا نہ رکھتے تھے اور گویا انصاف لفظ جمع کے ساتھ اس طرف اشارہ ہے کہ نصف کی حقیقت جو وسط حقیقی ہے شرط نہیں ہے۔ طبرانی سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھا کہ میرا تہبند گٹوں سے نیچے ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابن عمر(رضی اللہ عنہ)، جو کپڑا زمین سے چھو جائے وہ آتش دوزخ میں ہے اور بخاری میں ہے کہ تہبند کا جو حصہ ٹخنوں کے نیچے ہے وہ آگ میں ہے یہ حکم مردوں کیلئے ہے اور عورتوں کو لٹکانا اور لمبا رکھنا جائز ہے۔ اور جب سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عورتیں کیا کریں؟ فرمایا ایک بالشت تک بڑھالیں۔ عرض کیا اب بھی پاؤں برہنہ رہتے ہیں تو فرمایا ایک ہاتھ تک بڑھالیں۔ اس سے زیادہ نہ کریں۔ یہ حکم تہبند اور قمیص کے دامن کا ہے۔ ظاہر ہے کہ زمین سے دامن چھوانا عورتوں کیلئے جائز ہے۔

جاننا چاہئے کہ اسبال یعنی لٹکانا تہبند کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ قمیص اور عمامہ کو بھی شامل ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں اس کی صراحت آئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسبال، تہبند، قمیص اور عمامہ میں ہے جو کوئی ان میں بطریق رعونت و تکبر گھسیٹتا ہے وہ...... (الحدیث) لیکن اکثر حدیثوں میں اسبال، تہبند میں آیا ہے یہ کثرت وجود کے اعتبار سے ہے اور لفظ ثوب کے ساتھ بھی مطلق آیا ہے لیکن حدیث کے مفہوم کا وجود، عمامہ میں مخفی رہتا ہے تو اس سے مراد عذبہ یعنی شملہ کی حد سے درازی ہے۔ اور آستین کو بڑھانا جیسا کہ اہل حجاز کی عام عادت ہے وہ بھی اس حکم میں داخل ہے۔

صاحب مواہب، ابن قیم سے نقل کرتے ہیں انہوں نے کہا یہ فراخ و دراز آستینیں تھیلیوں کی مانند اور برجوں کی مانند عمامے باندھنے کی رسم نو ایجاد ہے۔ نہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا نہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیا۔ یہ سنت کے خلاف، غرور و تکبر

کے زمرے میں ہے۔ اور بعض دیگر علماء سے نقل کر کے کہتے ہیں کہ کسی اہلِ فہم وبصیرت پر مخفی نہیں ہے کہ یہ لمبی لمبی آستینیں جو عام طور پر لوگوں میں رواج پاگئی ہیں اس میں اسراف اور مال کا ضیاع ہے جس کی ممانعت کی گئی ہے لیکن لوگوں کی ایک اصطلاح بن گئی ہے کہ ہر قوم کے کچھ شعار اور علامتیں ہوتی ہیں۔ جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن ان میں جو چیز، خیلا یعنی غرور و تکبر کے طریقہ پر ہے اس کے حرام ہونے میں کوئی شک نہیں ہے اور جو چیز بطریقِ عادت ہے اس میں حرمت اس وقت تک نہیں ہے جب تک کہ اس حد تک نہ پہنچے جس کا حکم لباس میں درازی و کشادگی میں ممانعت سے متعلق ہے اور قاضی عیاض رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ جو عادت کے اقوال، درازی و کشادگی کی حرمت و کراہت میں صریح ہیں لیکن لفظِ عادت و معتاد کے داخل کرنے میں ایک قسم کے جواز کا اشارہ ہے۔ اس میں انہیں معذور گردانتے ہیں۔

حرمین شریفین زادھما اللہ تعظیما وتشریفا کے بعض اکابر سے سنا گیا ہے وہ فرماتے ہیں لباس کا یہ انداز ہمارا عرف و شعار ہو گیا ہے اگر نہ کریں تو ہم پہچانے نہ جائیں اور ہماری عزت ختم ہو جائے لیکن کلام اس میں ہے کہ ایسا عرف و شعار کیوں بنایا گیا ہے۔ جو خلافِ سنت ہے واللہ اعلم۔ بہر تقدیر تہبند وغیرہ میں اسبال و درازی کی حرمت و کراہت کے سلسلے میں جو کچھ آیا ہے وہ خیلاء تکبر اور تزئین کے قصد کے ساتھ مقید ہے۔ اور جہاں ایسا قصد نہ ہو مثلاً سردی وغیرہ سے بچنا یا کوئی اور عذر وغیرہ تو وہ اس حکم میں داخل نہیں ہے۔ حدیث مبارک میں آیا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی عادت و وضع ایسی ہو گئی تھی کہ آپ کا تہبند نیچے لٹکا کرتا تھا اور اسبال ہی کی صورت میں بیٹھ جایا کرتے تھے۔ جب اس بارے میں ممانعت واقع ہوئی تو آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اظہار کیا کہ میرے تہبند کی یہ حالت ہے میں کیا کروں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم ان میں سے نہیں ہو جو مغرور متکبر لوگوں کی عادت بنی ہوئی ہے۔

جاننا چاہئے کہ اس جگہ ازار کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے جس کے معنی تہبند کے ہیں لیکن وہ ازار جو عجمیوں کے عرف میں ہے اور اہل عرب اسے سراویل کہتے ہیں اور جسے ہم پائیجامہ کہتے ہیں۔ اس میں اختلاف ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پہنا ہے یا نہیں۔ اس پر بعض علماء نے جزم و یقین کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نہیں پہنا ہے اور ابو یعلیٰ موصلی اپنی مسند میں بسند ضعیف، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت لاتے ہیں وہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ایک دن بازار گیا تو حضور بزاز کی دکان میں تشریف فرما ہوئے پھر ایک سراویل (پائجامہ) چار درہم میں خریدا اور اہل بازار کا ایک وزان یعنی تولنے والا تھا جو درہم کو تولا کرتا تھا اس سے حضور نے ارشاد فرمایا وزن کر اور خوب اچھی طرح ٹھیک وزن کر اس پر اس وزان نے کہا میں نے یہ بات کسی سے نہیں سنی۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے وزان سے فرمایا افسوس ہے تجھ پر۔ تو نہیں جانتا آپ ہمارے نبی ہیں۔ پھر تو وہ ترازو چھوڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی طرف جھکا اور چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کو بوسہ دے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک کھینچ لیا۔ اور فرمایا اے فلاں! ایسا عجمی لوگ اپنے بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ میں بادشاہ نہیں ہوں میں تمہیں میں کا ایک شخص ہوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سراویل لے لی۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے چاہا کہ میں اٹھا لوں۔ فرمایا مال کا مالک زیادہ حق دار ہے کہ وہ خود اپنے مال کو اٹھائے مگر یہ کہ وہ کمزور یا مجبور ہو۔ اور اٹھانے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اسے مسلمان بھائی کی مال کے لے جانے میں مدد دینی چاہئے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا پہننے کیلئے سراویل خرید فرمائی ہے۔ فرمایا ہاں! میں اسے سفر و حضر اور دن اور رات میں پہنوں گا۔ اس لئے کہ مجھے خوب ستر پوشی کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اس سے بہتر ستر پوش دوسرا لباس نہیں دیکھا اس حدیث کو بکثرت محدثین نے بسند ضعیف روایت کیا ہے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کو خریدنا صحت کے ساتھ ثابت ہے۔ اور ہدایہ میں ہے کہ اس کا خریدنا پہننے کیلئے تھا۔

روایت کیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پہنا اور آپ کی اجازت سے صحابہ نے بھی پہنا۔ (واللہ اعلم)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا محبوب ترین لباس قمیص مبارک تھی۔ اگرچہ تہبند اور چادر شریف بھی بہ کثرت زیب تن فرماتے تھے لیکن قمیص کا پہننا زیادہ پسندیدہ تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیرہن مبارک سوتی اور تنگ دامن و آستین والا تھا اور آپ کی قمیص مبارک میں تکمے یعنی گھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ بلاشبہ علماء محدثین اور دیار عرب کے تمام حصوں میں معروف ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قمیص مبارک میں سینہ کے مقام پر جیب تھی۔ اور یہ قمیص سنت ہے۔ یہ جو ماوراء النہر اور ہندوپاکستان کے لوگوں میں معروف و مشہور ہے کہ گردن کے دونوں طرف تکمہ لگاتے ہیں عرف عرب میں یہ عورتوں کے ساتھ مشہور ہے۔ اور مردوں کے سینہ پر تکمے ہوتے ہیں اور ان شہروں میں اصطلاح اس کے برعکس ہے۔

حکایت:۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن میں حرم شریف میں ایک ہندی رفیق کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جس کی قمیص میں ہمارے ملک کے دستور کے مطابق تکمے لگے ہوئے تھے تو ایک عربی عالم بار بار میرے آگے آتا جاتا اور اس ہندی شخص کو دیکھتا۔ اس عرب سے کہا گیا یا سیدی کیا دیکھتے اور کیا جستجو فرماتے ہو؟ اس عالم نے کہا اس شخص کو شرم نہیں معلوم ہوتی کہ عورتوں جیسا لباس پہنے حرم الٰہی میں بیٹھا ہوا ہے۔

معاویہ بن قرہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آیا تا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کروں اس وقت میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرہن شریف کے تکمے کھلے ہوئے ہیں تو میں نے آپ کی قمیص مبارک کی جیب میں ہاتھ ڈال کر مہر نبوت کو چھوا۔ اسے ترمذی نے روایت کیا۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث بتا رہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قمیص مبارک میں جیب تھی اور جسے اس کا علم نہیں وہ اس کے برعکس خیال کرتا ہے (انتہیٰ)

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر شریف کی لمبائی چار گز شرعی اور اس کا عرض دو گز شرعی اور ایک بالشت تھا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو آپ ازار لئے ہوئے تھے جو جنبش کرتا تھا۔ مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تہبند کو سامنے کی جانب لٹکاتے۔ اور عقب میں اونچا رکھتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زیر ناف تہبند باندھے دیکھا ہے اور آپ کی ناف ظاہر تھی اور میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ناف کے اوپر تہبند باندھے دیکھا ہے ابوبردہ بن ابی موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ہمارے لئے درشت مرقع تہبند اور چادر نکال کر دکھائی اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حالت کے ساتھ ان کپڑوں میں رحلت فرمائی ہے۔ سیدہ اسماء بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ شریف تھا جب ان کا وصال ہوا تو اسے میں نے لے لیا اور ہم بیماروں کی شفا کی خاطر اسے دھو کر پلاتے تھے۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رومی جبہ تنگ آستین کا پہنا ہے اور وضو کے وقت دستہائے مبارک کو آستین سے نکال کر جبہ کو کندھوں یا پشت پر ڈال لیتے اس کے بعد ہاتھوں کو دھوتے۔ یہ حالت سفر کی تھی کیونکہ سفر میں آپ تنگ لباس پہنا کرتے تھے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حرہ پہننے کو پسند فرماتے تھے۔ یہ ایک قسم کی چادر ہے جس میں سرخ دھاریاں تھیں۔ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چاندنی رات میں دیکھا اور آپ کے جسم اطہر پر سرخ جوڑا تھا تو میں کبھی آپ کو دیکھتا تھا، اور کبھی چاند کو۔ میرے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاند سے زیادہ حسین تھے براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے کسی کو نہ دیکھا ایک روایت

میں ہے کہ کسی چیز کو نہ دیکھا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سرخ جوڑے میں آپ سے زیادہ حسین ہو۔ ایک روایت میں ہے کہ میں نے کسی خمدار زلفوں والے کو سرخ جوڑے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ خوشتر نہیں دیکھا۔ اس کی تحقیق حلیہ شریف کے ضمن میں گزر چکی ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عیدین اور جمعہ میں اپنے سرخ حلہ کو پہنا کرتے تھے۔ حلہ جوڑے کو کہتے ہیں جس میں چادر اور تہبند ہوتا ہے۔ حلہ یعنی جوڑا دو کپڑے کو کہتے ہیں۔ یا اس کپڑے کو جو استر دار ہو۔ اور حمراء یا احمر اس کپڑے کو کہتے ہیں جس میں سرخ دھاریاں ہوں۔ جیسا کہ آج بھی ہمارے ملک میں ہوتا ہے۔ اور یہی وہ چادر شریف ہے جو "بردیمانی" کے نام سے مشہور ہے کیونکہ اس میں سرخ دھاریاں تھیں۔ اس سے وہ خالص سرخ ہونا مراد نہیں ہے۔ جس کی ممانعت کی گئی ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے جسم پر سرخ رنگ کا لباس دیکھ کر فرمایا یہ کفار کا لباس ہے اسے نہ پہنو۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اس وقت میرے جسم پر سرخ رنگ کا لباس تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے اسے کہاں سے لیا ہے۔ میں نے عرض کیا میری بیوی نے میرے لئے بنا ہے فرمایا اسے جلا دو۔

بعض لوگوں کو اس حدیث سے اشتباہ ہوتا ہے کہ سرخ لباس جائز ہو گا یہ خطا ہے سرخ سے مراد وہی ہے کہ سرخ دھاریاں تھیں۔ اسی طرح سبز رنگ کے بارے میں حضرت ابی رمثہ کی حدیث واقع ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے آپ کے جسم اطہر پر دو سبز چادریں تھیں اور عطاء بن ابی یعلیٰ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ طواف میں سبز چادر شریف سے اضطباع کئے ہوئے تھے۔ اس سے مراد ایسی چادر ہے جس میں سبز دھاریاں تھیں۔ اگرچہ یہ جگہ خاص سبز ہونے کا بھی احتمال رکھتی ہے۔ لیکن دیار عرب میں یہی معنی مشہور و معروف ہیں اور زرد رنگ بھی اسی معنی میں ہے کہ زرد رنگ کی دھاریاں تھیں۔ بعض لوگ حلہ یعنی جوڑے کے معنی ریشمی کپڑا سمجھتے ہیں۔ یہ بھی خطا ہے۔ تحقیق وہی ہے جو مذکور ہو چکی ہے۔

صاحب مواہب نے امام نووی سے سرخ رنگ کے بارے میں علماء کا اختلاف نقل کیا ہے۔ چنانچہ صحابہ و تابعین اور ان کے بعد کے علماء کی ایک جماعت نے مباح قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس کے قائل، امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہم اللہ ہیں۔ لیکن امام مالک نے فرمایا ہے کہ غیر سرخ لباس افضل ہے۔ اور ایک روایت میں سرخ کپڑا گھروں میں اور سراؤں میں پہننا جائز رکھا ہے۔ اور محفلوں اور بازاروں میں مکروہ قرار دیا ہے۔ اور ایک جماعت اس پر ہے کہ یہ مکروہ بکراہت تنزیہی ہے۔ اور ممانعت کو اسی پر محمول کرتے ہیں۔ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سرخ جوڑا پہننا ثابت ہو چکا ہے۔ اس کا جواب دیا جا چکا ہے۔ یعنی خالص سرخ نہ تھا۔ بلکہ سرخ دھاریاں تھیں اور بعض نے اس ممانعت کو حج و عمرے کے احرام پہننے والوں پر محمول کیا ہے یہ بھی ایک تکلف ہے اس تخصیص پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور مذہب حنفی میں بھی کئی قول ہیں مگر صحیح یہ ہے کہ یہ مکروہ بکراہت تحریمی ہے اور اس کے ساتھ بکراہت نماز جائز ہے۔ اور شیخ قاسم حنفی جو ائمہ احناف اور ان کے محققین میں سے ہیں مصر میں تھے انہوں نے تحقیق کی ہے کہ سرخ لباس رنگ کی بنا پر مکروہ ہے۔ خواہ معصفر ہو یا غیر معصفر۔

صاحب مواہب کہتے ہیں کہ بیہقی نے "معرفت سنن" میں مسئلہ کا اتفاق کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ امام شافعی نے ایک شخص کو مزعفر

یعنی زعفران میں رنگے ہوئے کپڑے سے منع کیا ہے اور معصفر کو مباح قرار دیا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا میں نے معصفر کپڑے پہننے کی اجازت اسی بنا پر دی ہے کہ میں نے کسی ایک کو ایسا نہ پایا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت اس بارے میں بیان کرے۔ بجز اس قول کے جو علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس سے منع فرمایا اور ہم نہیں کہتے کہ تمہیں بھی منع کیا ہے اور بیہقی فرماتے ہیں کہ بلاشبہہ ایسی حدیثیں وارد ہیں جو علی العموم مخالفت پر دلالت کرتی ہیں اور بیہقی نے مسلم کی حدیث بیان کی کہ "یہ کفار کے لباس میں سے ہے" اس کے بعد بیہقی نے اور حدیثیں بیان کر کے کہا کہ اگر یہ حدیثیں امام شافعی رحمہ اللہ کو پہنچتیں تو یقیناً وہ اس کے قائل ہو جاتے۔ اس کے بعد بیہقی نے اپنی سندوں کے ساتھ ذکر کیا کہ امام شافعی رحمہ اللہ سے یہ بات صحت کو پہنچی ہے کہ آپ نے فرمایا جس وقت میرے قول کے خلاف کوئی حدیث صحت کو پہنچے تو اس حدیث پر عمل کرو اور میرے قول کو چھوڑ دو اور بیہقی فرماتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے مزعفر میں سنت کا اتباع کیا ہے اور فرمایا میں نے جو اس شخص کو منع کیا ہے وہ زعفرانی رنگ کے ساتھ ہے اور میں اسے حکم دیتا ہوں کہ وہ زعفرانی رنگ کو دھو ڈالے۔ حالانکہ ان کی متابعت معصفر میں اولیٰ تھی (انتہیٰ)

لہٰذا معلوم ہوا کہ معصفر اور مزعفر کپڑا ممنوع ہے۔ اور حدیث صحیح میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مزعفر سے باز رہنے کا حکم دیا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زرد رنگ سے کپڑا رنگا ہے۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ زعفران سے اپنے کپڑوں کو رنگا کرتے تھے۔ یعنی اپنی قمیص مبارک اور اپنے عمامہ کو۔ اسے دمیاطی نے روایت کیا ہے۔ اور ابو داؤد کے نزدیک اس طرح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لباس کو زعفران سے رنگا کرتے تھے یہاں تک کہ عمامہ کو بھی۔ اسی طرح حضرت زید بن اسلم ابن سلمہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے بھی حدیث روایت کی گئی ہے۔ لیکن علماء فرماتے ہیں کہ یہ حدیثیں، ممانعت کی حدیثوں سے معارض نہیں ہوتیں یا یہ منسوخ ہیں (واللہ اعلم)۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سفید لباس پہننے کو پسند رکھتے تھے۔ اور فرماتے حسین ترین لباس، سفید کپڑوں کا ہے چاہئے کہ تم میں سے اسے زندہ لوگ بھی پہنیں اور اپنے مردوں کو بھی اس کا کفن دیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کالی کملی بھی اوڑھا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صبح کے وقت باہر تشریف لے جاتے تو آپ پر کالی کملی ہوتی اور عمامہ شریف کے ذکر میں گزر چکا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن داخل ہوئے تو سر مبارک پر سیاہ عمامہ تھا اور سیاہ لباس مستحب ہے۔ اور مذہب حنفی بھی یہی ہے۔ اور پشمینہ یعنی اونی کپڑے بھی پہنتے تھے۔ لیکن تطلیس، جس کی تعریف یہ ہے کہ سر پر چادر اس طرح اوڑھنا کہ چادر کے دونوں کنارے کندھوں پر پڑے رہیں تو اس کے بارے میں ابن قیم جوزی نے کہا ہے کہ یہ مکروہ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے اور نہ اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بلکہ مسلم کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ دجال کے ساتھ ستر ہزار اصبہان کے یہودی نکلیں گے جن کے اوپر طیالسہ ہوگا۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ایک جماعت دیکھی ہے۔ جن پر طیالسہ تھا۔ پھر حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کیا عجب ہے کہ یہود ان کے مشابہ ہوں، جس کی خبر دی گئی ہے۔ اور ابو داؤد و حاکم کی حدیث میں ہے کہ "مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" جس نے جس قوم کی مشابہت اختیار کی وہ اسی میں سے ہے۔ اور ترمذی کی حدیث میں ہے "لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَشَبَّهَ بِغَيْرِنَا" وہ ہم میں سے نہیں جس نے ہمارے غیروں کی مشابہت اختیار کی اور وہ جو ہجرت کی حدیث میں آیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر اس روز تشریف لائے تو چادر لپیٹے ہوئے تھے تو یہ چھپانے کے لئے تھا تاکہ کوئی آپ کو پہچان نہ سکے۔ اس لئے نہیں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی (انتہیٰ) ابن قیم نے یہ بات جو کہی ہے خطا ہے کیونکہ علماء کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے کہ ضرورت کی بنا پر یہ عمل

تھا، اور عادت نہیں تھی۔ اس لئے کہ سہل بن ساعدی کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکثر چادر لپیٹا کرتے تھے اسے بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔ نیز بیہقی شعب الایمان میں اور ابن سعد طبقات میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ لفظ ہیں کہ "کَانَ یُکْثِرُ التَّقَنُّعَ" حضور اکثر چادر لپیٹا کرتے تھے۔ لہٰذا یہ حدیث اور اس کے علاوہ دیگر حدیثیں ابن قیم کے قول کو رد کر رہی ہیں جو یہ کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے کہ چادر لپیٹی، یہ بھی اس حدیث سے مروی ہے جسے حاکم نے مستدرک میں بشرط بخاری قرہ بن کعب سے روایت کیا ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک فتنہ کا ذکر کرتے سنا اور اس کا بہت جلد رونما ہونا فرمایا۔ اتنے میں ایک شخص چادر لپیٹے اور خود کو چھپائے گزرا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس دن یہ شخص ہدایت پر ہوگا۔ پھر میں کھڑا ہوا۔ تاکہ اس شخص کو دیکھوں کہ وہ شخص کون ہے۔ تو دیکھا کہ وہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تھے اور سعید بن منصور، اپنی سنن میں ابو العلاء سے روایت کرتے ہیں۔ ابو العلاء بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام حسن بن علی رضی اللہ عنہ کو اپنے سر پر چادر ڈالے منہ لپیٹے نماز پڑھتے دیکھا ہے اور ابن سعد، سلمان بن مغیرہ سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے امام حسن رضی اللہ عنہ کو چادر میں ڈھانپے ہوئے دیکھا ہے۔ اور ایک روایت میں آیا ہے کہ میں نے امام حسن کو اندقی طیلسان یعنی چادر اوڑھے دیکھا ہے ابن قیم نے یہ جو یہود کے قصہ سے بیان کیا ہے اس کے بارے میں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس سے استدلال اس وقت صحیح ہے جبکہ طیالسہ یہود کا شعار ہو۔ بلاشبہ اب زمانے کے طور و طریق بدل چکے ہیں۔ لہٰذا یہ اب عام اباحت میں داخل ہوگا۔ اور شیخ عزالدین بن عبدالسلام فرماتے ہیں کہ جو عادت مسلمانوں میں عام طور پر رائج ہو جائے اس کا چھوڑنا بے مروتی ہے یا جیسا کہ فرمایا۔ کہتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا انکار چادر کے رنگ کی بنا پر تھا کہ وہ زرد تھی۔ یہ سب مواہب لدنیہ میں مذکور ہے۔ اور کبائر مشائخ و صلحاء سے منقول ہے کہ وہ چادر سے ڈھانپا کرتے تھے اور بہجۃ الاسرار میں ہے "وَکَانَ الشَّیْخُ عَبْدُ الْقَادِرِ یَتَطَلَّسُ" حضور غوث الاعظم رضی اللہ عنہ خود کو چادر سے ڈھانپا کرتے تھے۔ غالباً ابن قیم کا انکار اسی پر تھا۔ اور حضور غوث الاعظم رضی اللہ عنہ کے فعل شریف کی بنا پر اس کے انکار میں مبالغہ تھا اس لئے کہ ابن جوزی اور ان کے پیرو کار حضور غوث الاعظم رضی اللہ عنہ کے انکار میں گرفتار تھے۔ تاب اللہ علیہم واللہ اعلم

اور چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں میں اطیب و الطف تھے اس لئے کہ اس کی علامت آپ کے بدن شریف میں ظاہر تھی کہ آپ کے جسم اطہر سے لگنے کی وجہ سے آپ کے کپڑے میلے نہ ہوتے تھے۔ اور نہ آپ کے لباس مبارک میں جوں پڑتی تھی اور نہ کپڑوں پر اور نہ آپ کے جسم اطہر پر مکھی بیٹھتی تھی جیسا کہ حدیث مبارک میں آیا ہے لیکن اس حدیث سے اشکال کیا جاسکتا ہے جسے امام احمد نے اپنی مسند میں اور ترمذی نے شمائل میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ جس وقت ان سے دریافت کیا گیا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شانہ اقدس میں تشریف فرما ہوتے تو کیا کیا کرتے تھے انہوں نے فرمایا "کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُفْلِی ثَوْبَہٗ وَیَحْلِبُ شَاتَہٗ وَیَخْصِفُ نَعْلَہٗ۔" یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کپڑوں میں جوں تلاش کرتے اور اپنی بکری کا دودھ دوہتے۔ اور اپنی نعلین مبارک کو سیا کرتے تھے۔ علماء فرماتے ہیں کہ شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑوں میں کسی دوسرے شخص سے جوں آگئی ہو بغیر اس کے کہ بدن لطیف سے پیدا ہوئی ہو اور یہ بات بھی ممکن ہے کہ یوں کہا جائے کہ اس جگہ لفظ "فلی" کا اطلاق خس و خاشاک کے چننے پر اور چیونٹیوں کے تلاش کرنے پر ہے جو زمین سے عموماً کپڑوں میں چڑھ آتی ہیں، بطور مجاز ہو۔ یہ بھی ایک "فلی" کی ہی صورت ہے مطلب یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لباس مبارک کی دیکھ بھال فرمایا کرتے اور اس طرح پاک و صاف فرماتے تھے جس طرح عام طور سے لوگ کپڑوں میں جوں تلاش کرتے ہیں۔ اس مسکین (صاحب مدارج النبوت) کے ذہن میں یہی معنی بیٹھتے اور قرار پکڑتے ہیں۔ (واللہ اعلم بحقیقۃ الحال، علی وجہ الکمال)۔ مواہب میں اسے اس طرح تعبیر کرتے ہیں

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تکریم کے لحاظ سے جوں آپ کو ایذا نہ دیتی تھی مگر یہ عبارت جوں کی ایذا کی نفی تو ظاہر کرتی ہے لیکن اس کے وجود کی نفی ظاہر نہیں کرتی۔ ممکن ہے کہ ملزوم کی نفی سے لازم کی نفی کی طرف اشارہ ہو۔

انگشتری مبارک۔ وصل: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لباسہائے مبارک میں سے انگشتری بھی تھی۔ جسے آپ پہنا کرتے تھے۔ صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتری چاندی کی تھی۔ اور وہ انگشتری آپ کے دست مبارک میں رہی آپ کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں رہی ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں اس کے بعد حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں رہی۔ یہاں تک کہ وہ بیرارلیس میں گر پڑی۔ بیرارلیس ایک کنوئیں کا نام ہے جو مسجد قبا کی جانب ہے۔ ترمذی میں ہے کہ یہ انگشتری مُعیقب کے ہاتھ سے بیرارلیس میں گر پڑی، مُعیقِب، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خادم کا نام تھا۔ یہ بھی صحابی ہیں (رضی اللہ عنہ) مروی ہے کہ اس انگشتری کو بہت تلاش کیا گیا اور کنوئیں کا پانی تک نکالا گیا اور اسے صاف کیا گیا مگر دستیاب نہ ہوئی۔ علماء فرماتے ہیں کہ اس انگشتری میں کچھ اسرار تھے جس سے کارہائے ملک و ملت کا انتظام وابستہ تھا۔ جس طرح کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگشتری میں صفت تھی۔ کیونکہ اس انگشتری کے گم ہو جانے کے بعد ان کے ملک میں تفرقہ و فتور نے راہ پائی جیسا کہ مشہور ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتری گم ہو جانے کے بعد تفرقے اور فتنے ظہور پذیر ہوئے۔ اور اس کی ابتداء حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل و شہادت سے ہوئی اور قیامت تک فتنے اور خون خرابے ہوتے رہیں گے۔ نیز صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتری مبارک چاندی کی تھی اور اس میں حبشی نگینہ تھا۔ حبشی کے معنی میں کئی قول ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ سنگ سیاہ تھا بعض کہتے ہیں کہ وہ پتھر تھا جو حبشہ میں ہوتا ہے اور اس کی کان حبشہ میں تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کا بنانے والا حبشی تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم انگشتری کے رنگ کو ہتھیلی کی جانب رکھتے اور متعدد حدیثوں میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کے ہاتھ میں لوہے کی انگوٹھی دیکھی۔ فرمایا کیا بات ہے کہ میں تیرے پاس جہنمیوں کا زیور دیکھتا ہوں اس کے بعد اس سے فرمایا چاندی کی انگوٹھی بنا اور اسے ایک مثقال یعنی ساڑھے تین ماشے سے زیادہ نہ کر۔ اور ایک روایت میں ہے کہ پورے ساڑھے تین ماشہ نہ کرنا۔ یعنی اس سے کچھ کم رکھنا۔ اسی طرح سے ایک شخص آیا اس کے ہاتھ میں پیتل کی انگوٹھی تھی جس سے بتوں کو ڈھالا جاتا تھا۔ پیتل چونکہ سونے کا ہم رنگ ہوتا ہے اس لئے عربی میں پیتل کو (شبہ) کہتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے کیا ہوا کہ بتوں کی بو پاتا ہوں۔ اس پر اس شخص نے انگوٹھی کو پھینک دیا۔ اور ترمذی کی حدیث میں "من صفر" (زرد رنگ) آیا ہے صفر کے معنی بھی پیتل کے ہیں۔ اسی طرح رانگ اور پیتل کی انگوٹھی مکروہ ہے۔ اور لوہے کی انگوٹھی کا جائز ہونا بظاہر صحیحین کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت سے فرمایا جس نے اپنے نفس کو شوہر کے سپرد کیا کہ: "اُطْلُبْ وَلَوْ خَاتَمًا مِنْ حَدِيْدٍ ۔" مانگو اگرچہ لوہے کی انگوٹھی ہو۔ اس حدیث سے جواز پر استدلال صحیح نہیں کیونکہ یہ ضعیف ہے اور اس لئے بھی کہ اس سے اس کا پہننا معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ مراد قلیل و حقیر چیز ہے۔ اور سنن ابو داؤد میں مُعیقِب سے باسناد جید مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتری لوہے کی تھی جس پر چاندی لپیٹی ہوئی تھی۔ (واللہ اعلم)

اب رہی سونے کی انگوٹھی تو اس میں صحیحین میں براء ابن عازب اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کی انگوٹھی کو منع فرمایا ہے۔ نیز صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کی انگوٹھی بنوائی۔ اس کے بعد صحابہ نے بھی سونے کی انگوٹھیاں بنوائیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف

لائے اور دست مبارک سے اِس انگوٹھی کو نکال کے پھینک دیا۔ اور صحابہ نے بھی نکال کے پھینک دیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کی انگوٹھی بنوانے سے منع فرمایا۔ یہی ہے ائمہ اربعہ اور اکثر علما کا مذہب۔ اور یہ جو بعض صحابہ سے منقول ہے کہ وہ سونے کی انگوٹھی رکھتے تھے "غریب" ہے جسے بخاری نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ ابی اسید، بدری صحابی کے ہاتھ سے ان کی موت کے وقت لوگوں نے سونے کی انگوٹھی اتار دی۔ (واللہ اعلم)

ایک روایت میں ہے کہ جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی سونے کی انگوٹھیاں نکال کے پھینکیں تو کسی صحابی نے اسے نہ اٹھایا۔ بعض نے کہا بھی کہ کیوں نہیں اٹھاتے تمہارا مال ہے انہوں نے جواب دیا ہم اسے ہرگز نہ اٹھائیں گے جس کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی اور اسے مکروہ جانا ہے۔

عقیق کی انگوٹھی کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم عقیق کی انگوٹھی پہنو اور داہنا ہاتھ زینت کا زیادہ مستحق ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ عقیق کی انگوٹھی پہنو کیونکہ یہ محتاجی کو دور کرتا ہے۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ وہ مبارک ہے اور سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے عقیق کی انگوٹھی پہنی وہ خیر دیکھے گا۔ اور حدیثیں بھی مروی ہیں لیکن علماء فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیق کی انگوٹھی پہننے کے بارے میں کچھ ثابت نہیں ہے۔ اور امیر المومنین حضرت علی مرتضٰی سے مرفوعاً مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یاقوت زرد کی انگوٹھی پہننا طاعون سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔

اور چاندی کے نگ کی انگوٹھی کے بارے میں بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انگوٹھی بھی چاندی کی تھی اور نگ بھی چاندی کا تھا اور مسلم میں ہے کہ انگوٹھی چاندی کی تھی اور نگ حبشی تھا جیسا کہ گزرا علماء فرماتے ہیں کہ ممکن ہے دو انگوٹھی ہوں۔ ایک ایسی اور دوسری ویسی۔ کبھی اسے پہنتے اور کبھی اسے۔ اور انگوٹھی کے نقش کے بارے میں صحیح مسلم میں حضرت انس سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی اور اس میں "محمد رسول اللہ" نقش کرایا۔ اور لوگوں کو منع فرما دیا کہ اپنی انگوٹھیوں میں اسے نقش نہ کریں۔ اور بخاری و مسلم میں ہے کہ انگوٹھی کا نقش تین سطر میں تھا۔ ایک سطر میں محمد، دوسری سطر میں رسول، اور تیسری سطر میں اللہ۔ اور فتح الباری میں ہے کہ ظاہر یہ ہے کہ کتابت اس طرح ہوگی کہ محمد کی سطر اوپر اور رسول کی سطر درمیان میں اور اس کے بعد اللہ، اور فرمایا (لیکن بعض مشائخ کا یہ کہنا ہے) کہ اسم جلالت اوپر تھا اور اسم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نیچے اور درمیان میں رسول تھا۔ میں نے کسی حدیث میں اس کی تصریح نہ پائی۔ بلکہ بخاری کی روایت کا ظاہر اس کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ کہا گیا ہے کہ سطر اول محمد، سطر ثانی رسول اور سطر ثالث اللہ، جیسا کہ صاحب مواہب نے فرمایا۔ لیکن انگوٹھی پہننے کے باب میں اکثر اخبار و آثار اس طرح ہیں کہ داہنے ہاتھ میں بھی پہننا مروی ہے۔ اور بائیں ہاتھ میں بھی۔ اور صاحب مواہب فرماتے ہیں کہ خواہ داہنے ہاتھ میں پہنے خواہ بائیں ہاتھ میں جائز ہے البتہ لوگوں کا اس میں اختلاف ہے کہ کون سے ہاتھ میں افضل ہے بعض کہتے ہیں کہ بائیں ہاتھ میں یہ نص امام احمد رحمہ اللہ کی ہے اور صالح بن امام احمد رحمہ اللہ کی روایت میں ان سے مروی ہے کہ میرے نزدیک بائیں ہاتھ میں پہننا اچھا ہے اور یہی مذہب امام مالک رحمہ اللہ کا ہے کہ بائیں ہاتھ میں پہنے۔ اسی طرح امام احمد و امام شافعی کا مذہب ہے۔ اور امام احمد رحمتہ اللہ کا ظاہر مذہب بھی یہی ہے۔ (واللہ اعلم)

صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اس انگلی میں انگشتری پہنتے تھے اور بائیں ہاتھ کی چھنگلیا کی طرف اشارہ

کیا۔ اسی طرح ابوداؤد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔ بعض حفاظ حدیث بیان کرتے ہیں کہ بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننا عام صحابہ وتابعین سے مروی ہے اور بعض علماء داہنے ہاتھ کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ قول حضرت ابن عباس اور حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہم اجمعین کا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہننے کو روایت کرتے ہیں اس لئے بعض حضرات کہتے ہیں کہ ممکن ہے کبھی داہنے ہاتھ میں پہنتے ہوں اور کبھی بائیں ہاتھ میں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ بائیں ہاتھ میں پہننا دونوں میں آخری ہے۔ یعنی داہنے ہاتھ میں پہننا منسوخ ہے۔ اور حق یہ ہے کہ اس کی صحت میں کلام ہے۔ یہ سب باتیں مواہب مذکور ہیں۔

اور بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی انگشتری میں یادداشت کیلئے دھاگہ باندھتے تھے۔ تاکہ فراموش نہ کرسکیں۔ دو انگوٹھی یا زیادہ پہننا مکروہ ہے۔ خصوصاً چاندی کی۔ صاحب مواہب فرماتے ہیں کہ عبارت سے کراہت ظاہر ہوتی ہے یعنی حرام نہیں ہے۔

دراصل انگوٹھی پہننے میں بھی اختلاف ہے اکثر اس کو مباح رکھتے ہیں اور غیر مکروہ یعنی جائز اور بعضے بقصد زینت مکروہ قرار دیتے ہیں اور بعض مطلقاً مکروہ کہتے ہیں مگر بادشاہ، صاحب سلطنت اور صاحب حکم کیلئے مکروہ نہیں ہے۔ حدیث میں بھی ایسا ہی آیا ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جو انگوٹھی بنوائی تھی وہ اسی غرض کیلئے تھی۔ مطلب یہ کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہوں اور امرائے وقت یعنی قیصرو کسریٰ اور نجاشی کو فرمان لکھنا چاہا تو آپ سے عرض کیا گیا کہ یہ لوگ بغیر مہر کے خط کو قبول نہیں کرتے اور نہ اسے پڑھتے ہیں اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھی بنوائی اور اس میں محمد رسول اللہ نقش کرایا۔ اور ابن عبدالبر نے مطلقاً کراہت نقل کی ہے۔ اور وہ حدیث لائے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھی بنوائی مگر پہنی نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ چندروز پہنی پھر اتار دی۔ (واللہ اعلم)

خفین شریف۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے موزے پہنے ہیں اور اس پر مسح کرنا صحت کو پہنچا ہے۔ ترمذی نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ نجاشی شاہ حبش نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے بطور نذرانہ سیاہ و سادہ دو جوڑے موزے بھیجے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پہنا اور ان پر مسح فرمایا۔ مغیرہ بن شعبہ سے مروی ہے کہ حضرت دحیہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دو موزے بھیجے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پہنا۔

نعلین مبارک۔ وصل:۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نعلین شریف پہنا کرتے تھے اگر پاؤں کو بالکل ڈھانپ لے تو وہ موزہ کہلاتا ہے ورنہ نعلین کہتے ہیں۔ بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نعلین دو قبال کی تھیں۔ قبال جوتی کے فیتوں کو کہتے ہیں اور فیتے و تسمے دو انگلیوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ ترمذی نے شمائل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ دو تسمے تھے جو دوہرے تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں جو کوئی جوتی پہننا اسے چاہئے کہ پہلے دائیں پیر سے شروع کرے اور جب اتارے تو بائیں سے (الحدیث) اور حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جوتی پہن کر چلنے سے منع فرمایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر عادی عمل ہے اور گرنے کا احتمال رکھتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ایسا بعض امراض کے پیدا کرنے کا باعث ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کاشانہ میں ایک نعل مبارک پہنی ہے۔ احتمال ہے کہ ایسا شاید کسی چیز کو اٹھانے کیلئے کیا ہو اور فاصلہ کم ہو اور ایک جانب کے پاؤں ملوث ہو جانے کا خطرہ ہو تب انہوں نے ایسا دیکھا کہ اسی جانب نعل شریف پہنے ہوئے ہیں اور یہ بھی احتمال ہے کہ بیان جواز کیلئے ہو خصوصاً ایسی صورت حال میں۔ اور مواہب میں ابوداؤد و ترمذی سے منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر جوتی پہننے سے منع فرمایا ہے اور بعض علماء نے نعلین

شریف کی تمثال ونقشے میں علیحدہ رسالے لکھے ہیں اور اس سے برکت ونفع اور فضل حاصل ہونا بیان کیا ہے۔ اور مواہب میں اس کا تجربہ لکھا ہے کہ مقام درد پر نعلین شریف کا نقشہ رکھنے سے درد سے نجات ملتی ہے اور پاس رکھنے سے راہ میں لوٹ مار سے محافظت ہو جاتی ہے اور شیطان کے مکر وفریب سے امان میں رہتا ہے اور حاسد کے شر وفساد سے محفوظ رہتا ہے مسافت طے کرنے میں آسانی ہوتی ہے اس کی تعریف و مدح اور اس کے فضائل میں قصیدے لکھے گئے ہیں۔

بستر مبارک۔ وصل: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر مبارک کے بارے میں صحیحین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر مبارک جس پر آپ استراحت فرماتے تھے چمڑے کا تھا جس میں کھجور کے درخت کے ریشے کوٹے ہوئے بھرے تھے اور بیہقی نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا انہوں نے فرمایا میرے پاس ایک انصاری عورت آئی اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر شریف دیکھا کہ دوتہ کی ہوئی ٹاٹ کا بستر ہے تو اس عورت نے میرے پاس ایسا بستر بھیجا جس میں اون بھری ہوئی تھی جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور اسے ملاحظہ فرمایا تو فرمایا اے عائشہ رضی اللہ عنہا یہ کیا ہے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلاں انصاری عورت میرے پاس آئی تھی اس نے آپ کا بستر شریف دیکھا تو یہ بستر اس نے بھیج دیا۔ فرمایا اسے واپس کر دو اے عائشہ رضی اللہ عنہا! اس کے بعد فرمایا اگر میں چاہتا تو اللہ تعالیٰ میرے ساتھ سونے چاندی کے پہاڑ حاضر کر دیتا۔ مطلب یہ کہ میرا بستر میرا زہد اور میری ریاضت ہے۔ فقر و ناپیدی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اپنے رب کی محبت میں اور اس کی رضا میں میں نے اسے اختیار کیا ہے۔ امام احمد نے اپنی مسند میں ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم چٹائی پر آرام فرما تھے اور چٹائی کا نشان آپ کے پہلو مبارک پر پڑا ہوا تھا اس پر انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کاش کہ آپ اس سے بہتر و نرم بستر پسند فرماتے؟ فرمایا مجھے دنیا سے کیا لینا، میرا قصہ اور میری داستان، اور دنیا کی داستان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی سوار گرمی میں سفر کر رہا ہو پھر ستانے کیلئے کچھ دیر ایک درخت کے نیچے بیٹھ جائے اس کے بعد وہ سفر کو چل دے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ایک گرم کوٹھری میں (گویا کہ وہ حمام ہے) چٹائی پر سو رہے تھے اور اس کا نشان آپ کے پہلوئے مبارک پر پڑ گیا۔ میں یہ حالت دیکھ کر رونے لگا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا بات ہے۔ کس نے تمہیں رلایا اے عبداللہ رضی اللہ عنہ! میں نے عرض کیا قیصر و کسریٰ تو دیبا و حریر کے فرش پر سوئیں اور آپ چٹائی پر۔ فرمایا اے عبداللہ رضی اللہ عنہ! "روؤ نہیں ان کیلئے دنیا ہے اور ہمارے لئے آخرت۔" اس حدیث کا مضمون حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس سے زیادہ مفصل مذکور ہے۔

فرمایا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم چٹائی پر استراحت فرما رہے تھے اس وقت آپ کے جسم اطہر پر بجز تہبند کے کچھ نہ تھا اور چٹائی کے نشان آپ کے پہلوئے اقدس پر پڑ گئے تھے اور آپ کے کاشانۂ اقدس کے گوشے میں ایک صاع کے برابر جو پڑے ہوئے تھے۔ اور ایک کھال دیوار پر آویزاں تھی۔ یہ دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے خطاب کے فرزند! کس چیز نے تمہیں رلایا۔ میں نے عرض کیا" یا نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں کیوں کر نہ روؤں جب کہ قیصر و کسریٰ تو باغوں اور نہروں میں سونے کے تختوں پر دیبا و حریر کے بستر پر سوئیں اور آپ خدا کے نبی چٹائی پر اس حال میں آرام فرمائیں۔ فرمایا اے ابن خطاب! کیا تم اس پر راضی نہیں کہ ان کیلئے دنیا ہے اور ہمارے لئے آخرت۔ ایک اور روایت میں ہے کہ چٹائی پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہوئی تھی اور سر مبارک کے نیچے ٹاٹ کا تکیہ کھجور کی چھال سے بھرا ہوا رکھا تھا، مروی ہے کہ فرمایا یہ وہ قوم ہے جن کو دنیا میں اچھی

اچھی چیزیں دینے میں جلدی کی گئی ہے۔ اور ہم وہ قوم ہیں جنہیں آخرت میں اچھی اچھی چیزیں دینے کیلئے دیر کی گئی ہے۔ منقول ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے بستر بچھا دیا جاتا تو اس پر آرام فرمالیتے تھے ورنہ زمین پر ہی استراحت فرمالیتے تھے۔

نوع سوم۔ در نکاح مبارک

وصل: اب ہم حضور اکرم ﷺ کے نکاح اور جماع کے بارے میں عادت کریمہ کا ذکر کرتے ہیں جاننا چاہئے کہ جماع، حفظ صحت کے اسباب میں سے ہے اور منی کا روکنا اور اس کے اخراج سے باز رہنا اور اس کی عادت بنالینا، ضعف قویٰ اور ان کی رگوں کی خشکی اور قسم قسم کے امراض ردیہ کے پیدا ہونے کا موجب و باعث ہے۔ مثلاً وسواس، جنون اور مرگی وغیرہ لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ قوت اور اعتدال مزاج کے ساتھ ہو اور اس میں زیادتی اور کثرت نہ ہو۔ جس کی قوت زیادہ ہے اسے ترک جماع بہت زیادہ مضر ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت تمام مردوں سے زیادہ تھی۔ ابن سعد نے طاؤس و مجاہد سے روایت کیا ہے کہ آپ کو چالیس مردوں کے جماع کی قوت دی گئی تھی۔ ایک روایت میں ہے کہ جنتی چالیس اور چند مردوں کے کھانے پینے اور جماع کی قوت دی گئی ہے امام احمد و نسائی اور حاکم نے زید بن ارقم کی حدیث مرفوعاً روایت کی ہے کہ ایک جنتی مرد کو سو مردوں کے کھانے پینے اور شہوت و جماع کی قوت دی جاتی ہے۔ صفوان بن سلیم سے مرفوعاً مروی ہے کہ جبریل علیہ السلام ایک دیگ پکی ہوئی لائے اور میں نے اس میں سے کچھ کھایا تو مجھے چالیس مردوں کے جماع کی طاقت دی گئی اور بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ وہ دیگ ہریسہ کی تھی۔ محدثین ان حدیثوں کو وضعی قرار دیتے ہیں جیسا کہ گزرا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ نکاح کرو کیونکہ جس کی ازواج زیادہ ہیں وہ سب سے افضل ہے۔ یا تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب اشارہ ہے یا عام بات ہے شیخ ابن حجر فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی خوبی بیان کرنا ہے۔ بندۂ مسکین (صاحب مدارج) کہتا ہے کہ مراد تمام امت ہے کیونکہ اس میں اتفاق ہے کہ اہل عرب، مردوں میں جماع کی قوت پر فخر و مباہات کرتے تھے۔ اور یہ بات مسلم ہے اور اس سے زیادہ کیا دلیل ہوگی کہ حضور سید الانبیاء صلوات اللہ علیہ وعلیہم اس فعل کو شرف بخشتے تھے اور وظیفہ نکاح کی زیادتی میں حد چار آزاد عورتیں ہیں اور اسے مباح کیا گیا ہے۔ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس جہان سے تشریف نہ لے گئے جب تک کہ آپ کے لئے جتنی چاہیں عورتیں حلال نہ ہوئیں اور آپ میں ازواج کی محبت پیدا کی گئی۔ فرمایا: "اَصْبِرُ عَنِ الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ وَلَا اَصْبِرُ عَنْهُنَّ" ۔ "میں کھانے پینے سے تو رک سکتا ہوں لیکن ازواج سے نہیں رک سکتا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے چار خصلتوں میں لوگوں پر فضیلت دی گئی ہے سماحت[1] (جود و سخا) کثرتِ جماع[2]، شجاعت[3] اور شدتِ گرفت[4] اسے طبرانی نے روایت کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں سے جماع کی قوت انسانیت کا کمال ہے۔ اور حضرت خلیل اللہ صلوٰت اللہ تعالیٰ وسلامہ علیہ جو کہ ابو الملت اور امام الحنفاء ہیں اور حضرت سارہ رضی اللہ عنہا جو کہ جہان کی تمام عورتوں میں سب سے زیادہ حسین و جمیل تھیں اور حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا جو ان کی زوجہ تھیں آپ ہاجرہ رضی اللہ عنہا سے صحبت کیلئے روزانہ براق پر شام سے تشریف لاتے تھے کیونکہ ان سے آپ کو خاص لگاؤ اور محبت تھی اور ان سے صبر کی تاب کم تھی اور حضرت داؤد علیہ السلام کی ننانویں بیبیاں تھیں انہیں اچھا معلوم ہوا کہ سو کی تعداد پوری ہو جائے۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام ننانوے ازواج پر تشریف لے جاتے اور آپ کے صلب میں سو مردوں کی طاقت تھی۔ یہ ان کا معجزہ تھا ان کی تین سو بیبیاں اور ایک ہزار باندیاں تھیں۔ (کذافی المواہب)

اس جگہ یہ وہم نہ کرنا چاہئے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس خصوص میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فوقیت تھی اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتنے فضائل ہیں کہ ان فضائل کے پہلو میں یہ محو و مستور ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جماع کو بقدر کفایت اختیار فرماتے تھے اور حضرت سلیمان علیہ السلام نبی اور بادشاہ تھے اور انہیں ایسا ملک دیا گیا جو ان کے بعد کسی کو نہ دیا گیا۔ اور عورتوں کی یہ کثرت تعداد بھی ان کے ملک کی قسم میں سے تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبوت، عبودیت اور فقر کو اختیار کئے ہوئے تھے اور یہ قوت جماع جو آپ کو حاصل تھی معجزے میں داخل ہے کہ ایک رات میں تمام ازواج مطہرات پر دورہ فرماتے وہ ازواج گیارہ تھیں اور ایک روایت کے مطابق نو تھیں۔ یہ قوت کثرت سے روزے رکھنے اور صوم وصال فرمانے اور شدت بھوک میں اپنے شکم اطہر پر پتھر باندھنے کے باوجود ہے۔ اور عادت کے مطابق کھانے پینے کی قسم سے مقویات کا استعمال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں نادر تھا یا معدوم۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن و جمال، رنگت کا نکھار اور رخ انور کی چمک دمک کی حالت جو کہ عام طور سے لذیذ و مشتہی کھانوں کے استعمال اور نرم و نازک لباسوں کے پہننے اور مخملی بستر پر سونے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ تمام باتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے عالم ظاہر میں نہ تھیں اس کے باوجود عالم ظاہر میں آپ کی یہ حالت معجزات میں سے ہے البتہ بعض انبیاء کرام علیہم السلام اصلاح وقت کی خاطر اور حکم الٰہی سے عدیم النکاح اور قلیل الازواج بھی گزرے ہیں۔ لیکن ان میں یہ شان اور یہ کثرت نہ ہوتی اور اس میں ان کے مبالغہ کرنے کو عیب و نقص کی نظر سے نہ دیکھنا چاہئے "حَاشَا لِلّٰہِ وَعِیَاذًا بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ۔" بلکہ دوسروں کے اعتبار سے ان میں اس فضیلت و کمال کے وجود کو زیادہ افضل و اکمل ماننا چاہئے۔ اور بعض متقشف زاہد جن میں جہالت اور رہبانیت کی صفت ثابت ہے اس معاملہ میں حسن اعتقاد و معقولیت کے برعکس راہ چلتے ہیں اور اس خصلت کو محض لذات حسیہ سے خیال کرتے ہیں اور وہ یہ نہیں جانتے کہ اس میں ایسے اسرار و فوائد اور منافع مضمر ہیں جو اس کے ماسوا میں نہیں ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل مبارک حسن لطافت اور کثرت ازواج کے وجود کی دلیل کافی ہے نکاح و جماع کے فوائد و منافع بہت ہیں ان میں سے عمدہ ترین، سلسلہ تناسل اور نوع انسانی کا دوام اور اس کی بقا ہے یہ سلسلہ اس وقت تک رہے گا جب تک خدا کو منظور ہے۔ اس کے سوا قضاء حاجت، حصول لذت و شوق مباشرت اور تمتع بہ نعمت الٰہی ہے اور یہ ایسی نعمت و منفعت ہے جو جنت میں بھی ہوگی۔ لیکن وہاں سلسلہ تناسل اور اخراج منی نہ ہوگی۔ اس کے سوا منی کے روکنے سے متعدد امراض پیدا ہوتے ہیں اور اس کے منافع میں سے یہ بھی ہے کہ نگاہ میں تیزی اور منی کا اخراج ہوتا ہے جس سے ضرر رساں چیزوں کا ازالہ ہو کر صحت کی حفاظت ہوتی ہے جیسا کہ گزرا اور عورت و مرد کا نفس کسی گناہ میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہتا ہے۔ اور عورت و مرد کی محبتِ نکاح کے فوائد میں سے یہ ہے کہ بیویوں کے حقوق کی ادائیگی میں زیادہ تکلیف اٹھائی جاتی ہے اور ان کی کج خلقی اور دکھ دینے والی باتوں پر صبر کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ وہ فائدہ ہے جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتم و اشد طریقہ سے حاصل فرماتے تھے کیونکہ یہ اتم و اکمل عبادت ہے۔ کیونکہ اس میں بہت زیادہ اجر و ثواب ہے اور مذہب حنفی میں مجرد رہنے سے مطلق نکاح کرنا افضل ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو اس کی ترغیب دی ہے چنانچہ فرمایا، محبت کرنے والی اور بچے پیدا کرنے والی عورت سے نکاح کرو اس لئے کہ میں روز قیامت اپنی امت کی کثرت اور ان کی زیادتی پر دیگر امتوں پر فخر و مباہات فرماؤں گا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا میں عورتوں سے صحبت کرتا ہوں باوجود ان کی جانب میلان نہ ہونے کے۔ اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ میری پشت سے اسے پیدا فرمائے جس کی وجہ سے روز قیامت دیگر امتوں کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کثرت امت پر فخر فرمائیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو روزہ رکھنے کا حکم فرمایا جو نکاح کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو کیونکہ روزہ، قوت باہ کو توڑتا اور اس کے مادہ کو فنا کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اجر و ثواب میں روزے

سے نکاح اعظم ہے اس لئے کہ حضور نے روزہ رکھنے کا حکم اسی بنا پر فرمایا کہ وہ نکاح کی استطاعت نہ رکھتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ جب نکاح سے امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی کثرت مقصود ہو تو نکاح افضل ہو گا۔ بلاشبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے اور رہبانیت سے مراد ترک نکاح ہے۔ اگر ترک نکاح افضل ہوتا تو یقین ہے کہ ہمارے دین میں جو سب دینوں سے افضل و برتر ہے اسے مشروع کیا جاتا۔

وجہ حکمت کثرت تزویج رسول صلی اللہ علیہ وسلم: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کثرت سے نکاح فرمانا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے اس کا مقصد اندرون خانہ کے احکام کی تبلیغ تھی اور یہ کہ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوبیاں معلوم ہوں۔ اور آپ کی اس سیرت پاک سے مطلع ہو جائیں جس پر مرد مطلع نہیں ہو سکتے اس لئے کہ حضور ﷺ کی بعض ازواج مطہرات ایسی تھیں جن کے باپ اور چچا مر چکے تھے، مثلاً سیدہ ام صفیہ رضی اللہ عنہا اور ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے والد اس زمانے میں رسول خدا کے دشمن تھے وغیر ذالک۔ اگر یہ ازواج مطہرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور آپ کے کمال حسن خلق پر مطلع نہ ہوتیں تو انسانی طبیعتیں اپنے آباء و اقارب کی طرف مائل ہونے کا اقتضاء کرتیں لہٰذا ازواج کی کثرت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور آپ کے ظاہری و باطنی کمالات کا اظہار و بیان ہے۔ (صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین)

تنبیہ: حدیث مبارک حُبِّبَ إِلَيَّ مِنْ دُنْيَاكُمْ ثَلَاثٌ (مجھے تمہاری دنیا کی تین چیزیں محبوب کی گئی ہیں) یہ حدیث اسی طرح تمام زبانوں پر مشہور ہے۔ لیکن امام غزالی، احیاء العلوم میں اور صاحب کشاف ۷ر ۸ آل عمران کی تفسیر میں اور فقہ کی اکثر کتابوں میں اس طرح واقع ہوا ہے۔ اس عبارت پر ایک اعتراض وارد ہے وہ یہ کہ "نماز دنیا میں سے نہیں ہے" اس کے جواب میں ارباب تحقیق، محدثین فرماتے ہیں کہ طرق حدیث کے تتبع و تلاش کے بعد ہمیں پتہ چلا ہے کہ حدیث میں لفظ ثلث نہیں ہے۔ لہٰذا اعتراض جاتا رہتا ہے اور اکثر طرق میں لفظ "من الدنیا" بھی نہیں ہے۔ اس تقدیر پر تو اعتراض وارد ہی نہیں ہوتا۔ ہم نے اس معنی کی تحقیق اور اس حدیث کی شرح اور اس کے معنی و نکات کا بیان مشکوٰۃ شریف کی شرح میں کر دیا ہے۔ وہاں دیکھنا چاہئے۔

خواب و استراحت رسول صلی اللہ علیہ وسلم: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند، بقدر اعتدال تھی۔ قدر ضرورت سے زیادہ آپ سویا نہ کرتے تھے اور نہ آپ قدر ضرورت سے زیادہ اپنے آپ کو باز رکھا کرتے تھے اسی ضمن میں یہ ہے، جو حدیثوں میں بھی مروی ہے کہ جو چاہتا کہ خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھے تو وہ آپ کو خواب میں پاتا۔ اور جو چاہتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں دیکھے تو وہ آپ کو نماز میں پاتا۔ مطلب یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قیام بھی فرماتے اور خواب بھی فرماتے جیسا کہ نوافل و عبادات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی اور کبھی رات میں خواب بھی فرماتے۔ پھر اٹھ کر نماز پڑھتے اس کے بعد پھر سو جاتے اسی طرح چند مرتبہ سوتے اور اٹھتے تھے اس صورت میں بھی یہ بات درست ہے کہ جو خواب میں دیکھنا چاہتا وہ بھی دیکھ لیتا اور جو بیدار دیکھنا چاہتا وہ بھی دیکھ لیتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں داہنی جانب قبلہ رو ہو کر آرام فرماتے تھے۔ رخسار شریف کو داہنی ہتھیلی پر رکھتے اور بصورت تعریس ہاتھوں کو کھڑا کر کے ہتھیلی پر سر مبارک رکھتے تاکہ بیداری اور نماز کیلئے کھڑے ہونے میں آسانی ہو اور داہنی جانب کو ابتداء خواب میں اختیار فرمانا جیسا کہ مشہور ہے اس وجہ سے ہے کہ بائیں جانب میں دل معلق رہے اور جب بائیں پہلو سویا جائے گا تو دل راحت و آسائش میں رہے گا۔ لہٰذا نیند گہری آئے گی اور جب دائیں پہلو پر سویا جائے گا تو دل کو بے چینی رہے گی۔ اور دل کا داہنی طرف لٹکے رہنے کی وجہ سے اور اس کی بے قراری سے نیند گہری نہ آئے گی اور وہ قرار و آرام کی خواہش میں رہے گا۔ اگرچہ

نیند کی زیادتی اور زیادہ سونا میں کھانے کے ہضم اور اس کو تحلیل کرنے میں مددگار ہے لیکن داہنی جانب سونا قیام لیل اور نماز کیلئے اٹھنے میں زیادہ معین ہے۔

لہٰذا جو لوگ صحتِ بدن اور قلب صنوبری کے خواہاں ہیں جیسے اطباء تو وہ بائیں جانب سوتے ہیں۔ اور جو لوگ قلب معنوی کی صحت اور حیات حقیقی کے خواہاں ہیں وہ داہنی جانب سونے کو اختیار کرتے ہیں جیسا کہ متقی حضرات داہنی جانب سونے کو اختیار کرتے ہیں۔ اور ان میں یہ نکتہ مشہور ہے۔

صاحب مواہب بیان فرماتے ہیں کہ اس علت کے بیان کرنے میں کچھ کلام ہے اس لئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قلبِ اطہر محو خواب نہ ہوتا تھا خواہ دائیں جانب سوئیں یا بائیں جانب۔ یہ حکم آپ کیلئے دائمی طور پر ثابت ہے اور اس نکتہ کی علت درست نہیں ہے۔ مگر اس کیلئے صحیح ہے جس کا دل بھی سوتا ہو۔ لہٰذا بہترین علت حصول برکت ہے کیونکہ یہ آپ کی عادت شریفہ تھی۔ چونکہ آپ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّيَامُنَ فِيْ كُلِّ شَيْئٍ (حدیث) بیشک اللہ ہر چیز میں داہنی جانب کو پسند فرماتا ہے یا مقصد تعلیم وارشاد امت ہے کہ ان کا دل اس طرح سو جاتا ہے۔ (انتہٰی)

اور یہ کہنا مقصود ہوگا کہ دل کی بیداری وہوشیاری دائیں ہاتھ پر سونے کی صورت میں اقوی وشدید تر ہوگی بسبب اضطراب اور طبیعت کے عدم مزاحمت کے جو مذکور ہوا۔ اور جب بائیں جانب آرام فرماتے ہوں تو کمتر اور سست تر ہوتا ہے چونکہ اس میں طبیعت کی مزاحمت ہے اس لحاظ سے بعض چیزوں میں اور بعض وقتوں میں حضور ﷺ کی ذات اقدس میں طبعی طور پر یہ داخل تھا۔ لہٰذا بیداری ہر دو صورت میں حاصل ہے اور اس صورت میں سب سے زیادہ ان حضرات کا ظاہر مقصود یہی بتانا ہوگا۔ البتہ ان کی ظاہر عبارت ایسا وہم پیدا کرتی ہے۔ واللہ اعلم

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "تَنَامُ عَيْنِيْ وَلَا يَنَامُ قَلْبِيْ" میری آنکھیں سوتی ہیں اور میرا دل جاگتا ہے، صحیح ہے اسے بخاری نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ وتر پڑھنے سے پہلے سو جاتے ہیں اس پر فرمایا: تَنَامُ عَيْنَايَ وَلَا يَنَامُ قَلْبِيْ

صاحب مواہب فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر کے نہ سونے کا سبب یہ ہے کہ جب دل قوی ہوتا ہے تو سوتے میں وہ زندہ رہتا ہے اور جب بدن سوتا ہے تو وہ جاگتا رہتا ہے۔ اور یہ حالت اور یہ کیفیت سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود تھی۔ اور یہ ہر اس شخص میں اللہ تعالیٰ پیدا فرما دیتا ہے جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع ومحبت کی سعادت حاصل ہے۔ منقول ہے کہ صاحب مواہب خود، صاحبان معارف وحقائق میں سے ایک بزرگ کامل شخص تھے وہ فرماتے ہیں عَيْنِيْ تَنَامُ وَلٰكِنْ قَلْبِيْ وَاللّٰهِ لَا يَنَامُ " میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن میرا دل خدا کی قسم نہیں سوتا اور کیونکر سوتا۔

وَكَيْفَ يَنَامُ عَاشِقٌ صلى مُسْتَهَامٍ نَاظِرًا اِلٰى وَجْهِ الْحُبِّ شَاخِصٌ عَلَى الدَّوَامِ

مخفی نہ رہے کہ صاحب مواہب لدنیہ نے جو اولیائے کرام کیلئے محبت الٰہی جل جلالہ اور متابعت حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اندازے پر قلب کی زندگانی اور دل کے نہ سونے کو لازمہ وثمرہ اور حیات کا نتیجہ قرار دیا ہے اس میں کلام نہ ہونا چاہئے اگرچہ اس حالت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسروں کے درمیان اشتراک صوری پایا جاتا ہے۔ ان کی یہ گفتگو اور انداز تعبیر ہمیں ناگوار معلوم ہوتا ہے اگر واقعتاً اولیاء کرام کیلئے یہ صورت صحیح ہے تو اس کے احکام کا ترتب مثلاً وضو کا نہ ٹوٹنا اور دیگر احکام ان پر منتفی ہوں گے کیونکہ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے ہے سنا گیا ہے کہ عہد رسالت کے قریب زمانے میں بعض صوفیا

اپنی ولایت کے پندار میں خواب سے اٹھتے ہی بغیر وضو کئے نماز پڑھنے لگتے تھے اور اس مسئلہ میں ادعائے فقاہت بھی کرتے تھے کیونکہ علت مشترک ہے جو قیاس کو صحیح بناتا ہے حالانکہ یہ جہالت کی نشانی ہے اس لئے کہ قیاس کی شرط یہ ہے کہ منصوص علیہ کے حکم کے ساتھ مختص نہ ہو وباللہ التوفیق وہ اتنا نہیں جانتے کہ حدیث لاینام قلبی پر لیلتہ التعریس میں سو جانے کی حدیث سے جو ایک وادی میں نماز صبح سے سورج نکلنے اور اس کے گرم ہونے تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اور لشکریوں کا سوتے رہنا اور بیدار نہ ہونا اعتراض کرتے ہیں کہ اگر بیدار رہتے تھے تو سورج نکلنے کا پتہ کیوں نہ چلا۔ امام نووی نے اس اعتراض کے دو جواب دیئے ہیں ایک یہ کہ قلب اپنے متعلقات کا ہی ادراک کرتا ہے لذاتِ مسرت اور رنج والم وغیرہ محسوسات کا ادراک نہ کرتا یعنی اس کا نہیں جو آنکھیں دیکھتی ہیں اور طلوع وغروب کا ادراک آنکھ کا کام ہے اور آنکھ تو خود سو رہی تھی اگرچہ قلب بیدار تھا اس کی مثال یوں سمجھو کہ کوئی بیدار تو ہے لیکن آنکھیں بند ہیں تو وہ طلوع آفتاب کو نہ جان سکے گا اگرچہ وہ خود بیدار تھا دوسرا جواب اس طرح دیتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حالتیں ہیں ایک یہ حالت کہ آپ کا قلب بیدار رہے اور یہ حالت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثر و بیشتر تھی اور دوسری حالت وہ ہے جبکہ دل بھی محو خواب ہوتا تھا۔ چنانچہ لیلتہ العریس کا واقعہ اسی دوسری حالت کا ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ پہلا جواب ہی صحیح اور قابل اعتماد ہے اور دوسرا ضعیف ہے۔ مطلب یہ کہ مذہب مختار یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قلبِ اطہر ہمیشہ ہی بیدار رہتا تھا اور ہر حالت میں ثابت و برقرار رہتا تھا اور حدیث کی عبارت بھی اسی مفہوم و مطلب پر واقع ہے۔ بعض لوگ اب بھی اعتراض کرتے ہیں کہ اگرچہ طلوع کا تعلق آنکھ سے ہے اور قلب اس کا ادراک نہیں کرتا لیکن اتنا تو معلوم ہونا چاہئے کہ وقت بہت ہو گیا ہے اس لئے کہ طلوع فجر کی ابتدا سے آفتاب کے طلوع ہونے تک مدت طویل ہے یہ کیسے پوشیدہ رہ سکتا ہے۔ بجز اس شخص کے جو نیند میں مستغرق ہو۔ فتح الباری میں کہا گیا ہے کہ یہ استحالہ اور استبعاد مردود ہے اس لئے کہ ممکن ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قلبِ انور اس وقت وحی میں مستغرق ہو اس سے خواب میں مستغرق ہونا لازم نہیں آتا۔ جس طرح کہ بیداری کی حالت میں القائے وحی کے وقت استغراق کا عالم ہوتا تھا اور حکمت اس فعل کے ذریعہ شریعت اور حصول اتباع کا بیان تھا اور یہ بات آپ کے منصب رفیع کیلئے زیادہ صحیح ہے جس طرح کہ نماز میں سہو کے وقوع پر علماء کہتے ہیں اسی بنا پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین فرماتے ہیں کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں ہوتے تھے تو ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بیدار نہیں کرتے تھے اس لئے کہ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کس حال میں اور کس مقام میں ہیں لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نسیان کی وجہ یہی تھی۔ قلبِ انور کے سو جانے کے باعث نہ تھا۔ بلکہ ایک حالت سے دوسری حالت کی جانب متوجہ ہو جانے کے باعث تھا۔ یا اس سے بھی بلند تر مقام کے باعث تھا وہ یہ کہ تاکہ ہم لوگوں کیلئے سنت بن جائے جیسا کہ صاحب مواہب نے قاضی ابو بکر عربی مالکی سے نقل فرمایا ہے۔

بعض صوفیاء یہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ابتلا میں اس وجہ سے پڑنا پڑا کہ آپ نے اپنی تدبیر پر اعتماد کیا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اس پر مقرر فرمایا اور رب تبارک و تعالیٰ کی تقدیر کے سپرد نہ فرمایا حالانکہ یہ بات بھی بالکل بودی اور کمزور ہے۔ اس لئے کہ یہ توثیق و توکیل اور تاکید و اہتمام حق سبحانہ و تعالیٰ کے حکم کو بجالانے کیلئے تھا نہ کہ تدبیر پر بھروسہ کرنا۔

اور بعض یہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے ارشاد: "لاینام" کے معنی یہ ہیں کہ مجھ پر وضو ٹوٹنے کی حالت پوشیدہ نہیں رہتی مطلب یہ کہ میں نیند میں اتنا مستغرق نہیں ہوتا ہوں کہ حدث کے وجود کا پتہ ہی نہ معلوم ہو۔ گویا کہ یہ قائل دل کی بیداری کو وضو کے ٹوٹنے کی حالت کے ادراک کے ساتھ مخصوص جانتا ہے۔ حالانکہ یہ بھی بعید ہے اس لئے کہ حضور ﷺ کا ارشاد "میری آنکھیں سوتی ہیں اور میرا دل بیدار رہتا ہے۔" یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس سوال کے جواب میں کہ انہوں نے عرض کیا

تھا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ وتر پڑھنے سے پہلے سو جاتے ہیں؟ حالانکہ یہ سوال وضو کے ٹوٹنے کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا بلکہ مطلق سوال ہے جو وتر سے متعلق ہے۔ پس آپ کی بیداری کو دل سے متعلق ہونے پر محمول کیا جائے۔ اور حدیث کی ظاہر عبارت مطلق حال پر مشتمل ہے۔ بغیر ایک حال سے دوسری حالت کے ساتھ مقید کرنے کے۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جو کچھ تم باتیں کرتے ہو میں سب سنتا ہوں اس کا حق جواب وہی ہے جو شیخ ابن حجر نے دیا ہے۔ حضور ﷺ نے منہ کے بل اوندھے لیٹ کر سونے سے منع فرمایا ہے۔ سنن ابوداؤد میں مروی ہے کہ حضور ﷺ ایک شخص پر گزرے جو اپنے منہ کے بل اوندھا سو رہا تھا اس پر حضور ﷺ نے اپنے پائے اقدس سے ٹھوکر مار کر فرمایا "اٹھ بیٹھ جا یہ جہنمیوں کا سونا ہے۔"

صاحب مواہب لدنیہ فرماتے ہیں کہ چت لیٹ کر سونا بہت برا ہے اور منہ کے بل اوندھے ہو کر سونا تو بہت ہی بدتر ہے۔ کہا گیا ہے کہ بغیر سونے کی غرض کے استراحت کیلئے چت لیٹنا نقصان دہ نہیں ہے۔

امام غزالی احیاء العلوم میں فرماتے ہیں کہ سونے کی چار ہیئتیں ہیں۔ چت لیٹنا، معبروں کیلئے ہے جو آسمان اور اس کے ستاروں کو دیکھتے ہیں اور اس کی نشانیوں پر غور کرتے ہیں۔ اور داہنے پہلو پر سونا عابدوں اور شب بیداروں کیلئے ہے۔ اور بائیں پہلو پر سونا پر خوروں کیلئے ہے جو کھانے کے ہضم کیلئے راحت و آرام حاصل کرتے ہیں۔ اور منہ کے بل اوندھے سونا بدبختوں اور احمقوں کیلئے ہے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی فرش پر اور کبھی چمڑے پر، کبھی ٹاٹ پر، اور کبھی زمین پر سوتے تھے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرش یعنی بستر چمڑے کا تھا جس میں کھجوروں کے درخت کی چھال بھری ہوئی تھی یہ وہ عاداتِ کریمہ تھیں جو کھانے پینے اور لباس و نکاح اور خواب سے متعلق تھیں۔ جنہیں مواہب لدنیہ سے نقل کیا گیا ہے اور اس ضمن میں جزئیات، آداب وابواب وغیرہ بہت ہیں۔ جسے کتاب شرح سفر السعادۃ اور شرح مشکوٰۃ وغیرہ میں بیان کر دیا گیا ہے اور بقدر ضرورت اس جگہ اسی پر اکتفا کیا گیا ہے فقط۔

(الحمد للہ کہ مدارج النبوۃ کی جلد اول کا ترجمہ ختم ہوا)